مقالات و فتاویٰ

شیخ الحدیث مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمہ اللہ

تحقیق وتخریج
حافظ ابو مریم مدنی حفظہ اللہ

تقدیم
فضیلۃ الشیخ ڈاکٹر صہیب حسن حفظہ اللہ

مکتبۃ الفضیل بن عیاض
کراچی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

معزز قارئین توجہ فرمائیں!

کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب ....

- عام قاری کے مطالعے کے لیے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد اپ لوڈ (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کی خاطر ڈاؤن لوڈ، پرنٹ، فوٹو کاپی اور الیکٹرانک ذرائع سے محض مندرجات نشرواشاعت کی مکمل اجازت ہے۔

☆ تنبیہ ☆

- کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی ممانعت ہے۔
- ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی و شرعی جرم ہے۔

﴿اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں﴾

- نشرواشاعت، کتب کی خرید وفروخت اور کتب کے استعمال سے متعلقہ کسی بھی قسم کی معلومات کے لیے رابطہ فرمائیں۔

kitabosunnat@gmail.com

www.KitaboSunnat.com
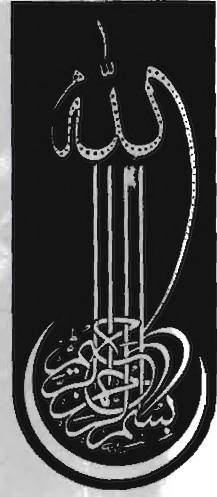
اللہ

کے نام سے شروع کرتا ہوں

جو بڑا ہی مہربان، نہایت رحم کرنیوالا ہے۔

مقالات و فتاویٰ

شیخ الحدیث مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمہ اللہ

تحقیق و تخریج
حافظ ابو مریم مدنی حفظہ اللہ

تقدیم
فضیلۃ الشیخ ڈاکٹر صہیب حسن حفظہ اللہ

مکتبۃ الفضیل بن عیاض
کراچی

مقالات و فتاوی

شیخ الحدیث مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمہ اللہ

تحقیق و تخریج
حافظ ابو مریم مدنی حفظہ اللہ

تقدیم
فضیلۃ الشیخ ڈاکٹر صہیب حسن حفظہ اللہ

اشاعت اول .... مارچ 2016ء

تعداد 1100

مکتبۃ الفضیل بن عیاض
کراچی

فہرست مضامین

1 فتاویٰ

2 مقالات

3 شخصیات ووفیات

4 مقدمات اور تبصرہ جات

5 مکاتیب

6 نظمِ جماعت کے متعلق ہدایات و اخبارات

7 دروس و تقاریر

پیش لفظ

فضیلۃ الشیخ ڈاکٹر صہیب حسن حفظہ اللہ

پچھلی صدی کے نصف اول میں جہاں برصغیر نے ایک سے ایک قد آور سیاست دان کو دیکھا ہے، وہاں صحافت، وکالت، شعر و شاعری میں بھی صفِ اول کی شخصیتوں کا جُھرمٹ اپنے دامن میں سجا رکھا ہے، اور اساطینِ منبر و محراب اور کاروانِ علم و معرفت کی بات ہو تو ایسی ضوفشاں مثالیں سامنے آئیں گی، جن کے شعور و آگہی کی تمازت ابھی تک دلوں کو گرماتی نظر آتی ہے۔

آسمانِ علم و فضل کے انھی تاباں و درخشاں ستاروں میں ہمارے ممدوح مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمہ اللہ بھی ہیں، جن پر صرف گوجرانوالہ نہیں، بلکہ سرزمینِ پاک کا ایک ایک ذرّہ فخر کر سکتا ہے۔ راقم الحروف کے زمانۂ طالب علمی میں اور مدینہ منورہ روانگی (۱۹۶۲ء) سے قبل جماعتِ اہلِ حدیث کے جن مقتدر علما کے نام سے آشنائی تھی، ان میں مولانا سید داود غزنوی اور مولانا محمد اسماعیل سلفی سرِفہرست تھے۔

مولانا داود غزنوی کی رحلت (۱۶/ دسمبر ۱۹۶۳ء) کے بعد ''الاعتصام'' کے ایک شمارے میں "إخاء أربعین سنة" کے عنوان سے ان کے ایک تعزیتی مضمون کا نظر سے گزرنا یاد ہے، چوں کہ جامعہ اسلامیہ، مدینہ منورہ سے فراغت (۱۹۶۶ء) کے بعد میں اپنی دعوتی و تدریسی سرگرمیوں کی بنا پر وطنِ عزیز سے دور ہوتا گیا، اس لیے اکابرینِ جماعت اہلِ حدیث سے وہ قربت کے تعلقات استوار نہ ہو سکے، جو وہاں رہنے کی بنا پر حاصل رہے ہوتے۔

میں برادرم علی حسن خان (حال کیمبرج، انگلینڈ) کا تہ دل سے شکر گزار ہوں کہ انھوں نے مولانا کے مقالات، فتاویٰ اور دوسری تحریرات پر مشتمل مجموعہ نگارشات کو طباعت سے پہلے میرے سپرد کیا، تاکہ میں بطورِ تقریظ چند الفاظ رقم کر سکوں۔

مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ اگر یہ مضامین میری نظر سے گزرے نہ ہوتے تو میں اُن کی عظمت اور علمی فضیلت کا کما حقہ ادراک کرنے سے قاصر رہتا۔

مولانا کے فتاویٰ کا حصہ مختصر ہے، کل اڑتیس (۳۸) فتاویٰ نقل کیے گئے ہیں، لیکن مقالات کا تنوع کئی ایسے عناوین کا احاطہ کیے ہوئے ہے، جن سے ان کی اعلیٰ پائے کی فقاہت و درایت کا بہ خوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ کتاب ایک عہد کی تاریخ ہے۔

یہاں تقسیمِ ہند سے پہلے اکابرینِ اہلِ حدیث کی کانگریس میں شمولیت کے سربستہ راز کی حکمت سے بھی پردہ اُٹھایا گیا ہے۔ جماعتِ دیوبند سے اشتراک واختلاف کے مختلف پہلوؤں کو بھی آشکار کیا گیا ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد جمعیت اہلِ حدیث کی تاسیس اور اراکینِ جماعت کو نظم وضبط میں پرونے کے سلسلے میں مولانا داود غزنوی کی انتھک مساعی کی بھی مدح وستایش ہے۔ پنجاب اور کراچی کے بعض علما کے ساتھ اختلافات کا بھی جائزہ موجود ہے۔ رفض و بدعات کے سرخیل افراد کی علمی لغزشوں اور فکری کوتاہیوں کا خوب پوسٹ مارٹم کیا گیا ہے۔ مولانا کا صریرِ خامہ قادیان کے نبی کاذب اور اس کی ذرّیت کو بھی آڑے ہاتھ لیتا ہے۔

گو دیوبندی فکر اور جماعتِ اسلامی کے نظریات پر حدودِ ادب میں رہتے ہوئے ردّ وقدح بھی کی گئی ہے، لیکن وطنِ عزیز پاکستان میں کلمۂ اسلام کو بلند و بالا رکھنے کی خاطر مشترکہ امور میں تعاون کی راہیں تلاش کرنے کے عمل کو بھی نمایاں طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔

مکاتیب کے ضمن میں میرے والد مرحوم مولانا عبدالغفار حسن کے ساتھ چند خطوط بھی اس کتاب کی زینت بنے ہیں، جسے حکایتِ وصل وفصل کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔

تین خطوط اس زمانے کے ہیں، جب والدِ گرامی جماعتِ اسلامی سے منسلک تھے اور مولانا اسماعیل رحمہ اللہ کانگریس سے اپنے تعلق کا دفاع اور والد مرحوم کے جماعت سے تعلق کو تنقید کی کسوٹی پر تول رہے تھے، پھر ۵۹ء میں والدِ گرامی کو جامعہ سلفیہ لائل پور (حالیہ فیصل آباد) میں بہ حیثیت معلّم ومربی خوش آمدید کہتے ہوئے نظر آتے ہیں اور پھر ایک سال بعد اُن کے جامعہ سلفیہ کو الوداع کہنے پر جہاں درد بھرا شکوہ کرتے نظر آتے ہیں، وہاں آیندہ تعاون کی خواہش کا بھرپور اظہار بھی کرتے ہیں۔

یہ کتاب تمام وابستگانِ مسلکِ اہلِ حدیث کے لیے گراں قدر تحفہ ہے اور خاص طور پر اسلام کے تقدس اور بقا کے لیے دوسرے مسالک کے اہلِ علم کے ساتھ ادب واحترام کے تقاضوں کو ملحوظ رکھنے، اختلافی امور میں حدودِ ادب کا خیال رکھنے اور باہمی گفتگو اور بات چیت میں اپنی زبان کو ہمز ولمز اور سبّ وشتم سے پاک رکھنے میں علمائے حق کے کردار کو بہ حیثیت راہبر و راہنما نمایاں کرنے میں بہت ممد ومعاون ثابت ہوسکتی ہے۔

اللہ تعالیٰ اُن سب کو جزائے خیر دے، جو اس بیش قیمت کتاب کے منتشر مضامین کو یکجا کرنے اور زیورِ طباعت سے آراستہ کرنے میں پیش پیش رہے ہیں۔

کتبه المفتقر إلی رحمة ربّه

صہیب حسن

لندن

۹/ ربیع الأول ۱۴۳۷ھ

۱۲/ دسمبر ۲۰۱۵ء

تقدیم[1]

فضیلۃ الشیخ مولانا محمد الاعظمی ﷾

(سابق شیخ الجامعۃ العالیۃ العربیۃ، مئو)

متحدہ ہندوستان کی بلند پایہ علمی و دینی ممتاز ہستیوں میں شیخ الحدیث مولانا محمد اسماعیل سلفی ﷫ کی ذاتِ گرامی اپنی علمی، فکری، تحقیقی اور دعوتی کارناموں کے لحاظ سے ایک امتیازی شان کی مالک تھی۔ علومِ اسلامیہ میں جامعیت کا حال یہ تھا کہ بیک وقت وہ مفسر، محدث، فقیہ، مفتی، مورخ، ادیب، خطیب، معلم، محقق، مبصر، مصنف اور صحافی ہونے کے ساتھ عظیم مفکر اور سیاست دان بھی تھے۔ کتاب و سنت کی روشنی میں پیچیدہ مسائل حل کرنے میں ان کو مجتہدانہ بصیرت حاصل تھی۔

تقسیمِ ہند سے پہلے غالباً ۱۹۴۳ء میں جامعہ اسلامیہ فیض عام مئو کا ایک عظیم الشان جلسۂ عام، مسلم انٹر کالج مئو کے میدان میں منعقد ہوا تھا۔ راقم الحروف نے اسی جلسے میں اس جامع العلوم والفنون عالم کو سادہ لباس میں بلند آہنگ خطاب کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ اندازِ خطاب، لب و لہجہ اور قد و قامت کی دھندلی تصویر اب بھی ذہن میں کسی قدر محفوظ ہے، چوں کہ ان دِنوں مَیں جماعتِ ثانیہ کا طالبِ علم تھا، اس لیے ان کی عالمانہ تقریر کے فہم و شعور سے قاصر تھا۔

تقسیمِ ہند کے بعد ۱۹۵۶ء میں جامعہ عالیہ عربیہ مئو کی انتظامیہ نے ایک عظیم الشان جلسہ منعقد کرنے کی تجویز پاس کی اور اس میں مولانا سلفی کو بطورِ مہمانِ خصوصی مدعو کرنے کے لیے شیخ الحدیث مولانا عبیداللہ رحمانی مبارکپوری ﷫ کے ذریعے کوشش کی گئی۔ شیخ الحدیث موصوف گوجرانوالہ مراسلت کرتے رہے اور ہم لوگوں کو صورتِ حال سے آگاہ کرتے رہے۔ اس سلسلے کے چند خطوط ''نقوشِ شیخ رحمانی'' میں شائع ہو چکے ہیں،[2] ان خطوط

---

[1] یہ مقدمہ حضرت سلفی ﷫ کے ''فتاویٰ سلفیہ'' کے ہندوستانی اِڈیشن پر لکھا گیا تھا، جو افادیت کی بنا پر زیرِ نظر مجموعہ میں شاملِ اشاعت کیا جا رہا ہے۔

[2] یہ ان خطوط کا مجموعہ ہے، جو شیخ الحدیث مولانا عبیداللہ مبارک پوری ﷫ نے مولانا اعظمی کے نام لکھے تھے۔ اس کے صفحات (۱۷ تا ۲۱) میں مولانا سلفی کی ہندوستان آمد کے متعلق چار خطوط ہیں۔

سے یہ خوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مولانا سلفی ہندوستان آنے اور جلسہ عالیہ میں شرکت کرنے کی خواہش و کوشش کے باوجود حصولِ پاسپورٹ سے محروم ہونے کے باعث تشریف نہ لا سکے، غالباً ان ایام میں وہ نظر بند تھے اور ان کے کہیں آنے جانے پر پابندی تھی۔

تقسیمِ ہند نے جماعت اہلِ حدیث کو نسبتاً زیادہ نقصان پہنچایا، اس کا متحدہ مرکزی پلیٹ فارم ''آل انڈیا اہلِ حدیث کانفرس'' انتشار کا شکار ہوگیا، بالخصوص اہلِ حدیثانِ ہند اپنے اساطینِ جماعت اور قد آور علما کی قیادت سے بھی محروم ہوگئے، لیکن اس جماعتِ حقہ ومنصورہ کی بقا وفلاح زمان ومکان میں محدود اور فلاں وفلاں میں محصور نہیں ہے۔ آفات وحوادث سے کھیلتے ہوئے اپنا سفر جاری رکھنا اس کا دائمی شعار ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی زبانِ وحی ترجمان سے اس کو نصرت، حمایت اور سربلندی کی ضمانت حاصل ہے۔ ارشاد ہے:

«لا تزال طائفة من أمتي ظاهرين، لا يضرم من خذلهم (من خالفهم) حتى يأتيهم أمر الله» وفي رواية: «لا تزال طائفة من أمتي منصورين» الحديث

تقسیمِ ہند کی قیامت خیزیاں جب فرو ہونا شروع ہوئیں تو جماعتی شیرازہ بندی کا عمل دونوں ملکوں (ہند و پاک) میں شروع ہوا اور مرکزی جمعیت اہلِ حدیث ہند اور مرکزی جمعیت اہلِ حدیث پاکستان کے نام سے دعوتِ کتاب وسنت کا کارواں نشاتِ ثانیہ کی شان وشوکت کے ساتھ میدانِ عمل میں رواں دواں ہوگیا۔ ان دونوں جمعیتوں کے درمیان مکانی فصل کبھی علمی وفکری وصل میں مانع نہیں ہوا۔ علمی صحیفوں اور کتابوں کے تبادلے اور حق کے دفاعی وسائل سے استفادے کے سلسلے کسی نہ کسی نوع سے باہم مربوط ہیں۔ فللّٰہ الحمد.

دیکھیے مولانا سلفی رحمہ اللہ وغیرہ کی تصانیف مملکتِ پاکستان میں اشاعت پذیر ہوتی ہیں اور ہندوستان پہنچ جاتی ہیں، یہی نہیں، بلکہ وہ جدید کتابت وطباعت سے آراستہ ہو کر افادۂ عام کا ذریعہ بنتی ہیں۔ پھر ان کی افادیت کا دائرہ عجم سے عرب تک وسیع کرنے کی سعی بلیغ کی جاتی ہے، چناں چہ مولانا سلفی کی علمی تالیفات سے ''حیاۃ النبی''، ''زیارتِ قبور'' اور ''تحریک آزادیٔ فکر اور شاہ ولی اللہ دہلوی کی تجدیدی مساعی'' کے عربی میں تراجم ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری کی عربی تحریر کا شاہکار ہیں۔ آخر الذکر کتاب کے عربی ترجمے کا نام ''حركة الانطلاق الفكري و جهود الشاه ولي الله الدهلوي في التجديد'' ہے۔

یہ تینوں عربی تراجم عرصہ پہلے جامعہ سلفیہ بنارس سے شائع ہو کر مقبولِ عجم وعرب ہونے کا شرف حاصل کر چکے ہیں، اسی طرح ڈاکٹر ازہری کے قلم سے مولانا سلفی رحمہ اللہ کے چار علمی مقالات کے عربی تراجم جامعہ سلفیہ بنارس میں زیرِ طبع ہیں۔ امید ہے جلد منظرِ عام پر آ جائیں گے۔ إن شاء اللہ تعالیٰ۔[1]

---

[1] یہ مولانا سلفی رحمہ اللہ کی کتاب ''حجیتِ حدیث'' میں مذکور چار مقالات کے عربی ترجمے کی طرف اشارہ ہے، جو ترجمے کے بعد ←

مولانا سلفی کی علمی خدمات اور قلمی نقوش میں ان کے دینی، علمی اور تحقیقی فتاویٰ کی بھی خاصی تعداد ہے۔ یہ فتاویٰ شروع میں بصورتِ مقالات جریدہ ''الاعتصام'' لاہور وغیرہ میں شائع ہوا کرتے تھے۔ پھر اس کے شماروں سے نقل کر کے ان کا مجموعہ بنام ''فتاویٰ سلفیہ'' لاہور سے شائع ہوا۔ جب اس کے کچھ نسخے ہندوستان میں پہنچے تو دینی اور علمی حلقوں میں اس کی ضرورت وطلب اتنی زیادہ ہوگئی کہ مکتبہ ترجمان دہلی کو ۱۹۹۱ء میں اس مجموعے کا دوسرا اڈیشن شائع کر کے قدر دانوں کے ہاتھوں میں پہنچانے کا اعزاز حاصل ہوا۔

یہ فتاویٰ گونا گوں محاسن اور نوع بنوع رنگ و بو سے مرصع ہیں۔ ایک طرف ان میں دینی پیچیدہ مسائل کو کتاب وسنت کی روشنی میں عالمانہ و مجتہدانہ انداز میں حل کیا گیا ہے اور بیشتر مسائل کا پسِ منظر بیان کر کے اصل صورتِ مسئلہ کا تحقیقی جواب دیا گیا ہے، دوسری طرف معاصر فرقوں اور تحریکوں کی جانب سے سلفی فکر و مسلک پر ہونے والے حملوں کے دفاع کی سنجیدہ کوشش کی گئی ہے۔

ان فتاویٰ کی ایک انفرادی شان یہ ہے کہ طرزِ نگارش شگفتہ اور ادیبانہ ہے۔ عام فتاویٰ کے خشک اور تقشفانہ لب و لہجے سے جداگانہ ان میں ادبِ لطیف و ظریف اور انشا پردازی کی جھلکیوں نے فنِ افتا کو ایک فصیحانہ اسلوب عطا کیا ہے۔ اس کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو۔

ڈاڑھی کے مسئلے میں ''تجمل'' کے عنوان سے لکھتے ہیں:

''آغاز سبزہ سے جو جمالیاتی کیفیت اس لیل و نہار کے اجتماع میں پائی جاتی ہے اور نگاہیں، جس قدر حظ اس قدرتی منظر سے پاتی ہیں، اسے اس مصنوعی شور زمین سے کوئی نسبت ہی نہیں... اس مصنوعی سپیدے میں بالوں کی سیاہ کھونٹیاں گویا حسن کی سیاہ قبریں ہیں، جو اس کے ماتم کی زندہ اور جاوید دعوت ہے ... جب چہرہ قدرتی جمال کی رعنائیوں سے سرشار ہو، جوانی کی سج دھج پورے جوبن پر ہو، تازہ خون کی سیلاب آمیز موجیں چہرے پر مچل رہی ہوں، ان قدرتی عساکر کو حضری اور مصنوعی اسلحہ سے مسلح کرنا تحصیلِ حاصل ہے، سچ جانیے کہ یہاں تو بالوں کی پر پیچ پراگندیاں چہرۂ دل آرام پر مشاطہ کی حیثیت رکھتی ہیں....''

فقہ و فتاویٰ کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ زمان و مکان کے حالات و ظروف کا اثر شرعی مسائل و احکام پر بھی ہوتا ہے۔ حافظ ابن القیم رحمہ اللہ نے ''إعلام الموقعین'' میں اس پر مفصل و مدلل بحث کی ہے۔ مولانا سلفی ان کا لحاظ و اہتمام کرتے ہوئے فتوے میں توسع کی راہ پر چلتے ہیں، یہاں تک کہ ہند و پاک میں اسلامی و شرعی

← اب کویت سے شائع ہو چکے ہیں۔ اسی طرح مولانا سلفی رحمہ اللہ کے ایک مقالے ''امام بخاری کا مسلک'' کا عربی ترجمہ بھی مولانا صلاح الدین مقبول حفظہ اللہ کے قلم سے کویت ہی میں اشاعت پذیر ہوا ہے۔ وللہ الحمد۔

مسائل و معاملات کی حلت وحرمت اور جواز وعدمِ جواز کو ایک پیمانے سے نہیں پرکھتے، جیسا کہ بعض فتاویٰ میں مولانا نے صراحت کے ساتھ اس کا تذکرہ کیا ہے۔

فتاویٰ سلفیہ کے جو دو ہندی و پاکستانی اِڈیشن سامنے آئے ہیں، ان کا طرزِ کتابت وطباعت قدیمی ہے، اب مکتبۃ الفہیم مئو، اس مجموعے کو جدید تفصیلی فہرست، نئی کمپیوٹر کتابت اور عمدہ طباعت سے آراستہ کر کے شائع کر رہا ہے۔ اس مکتبے کی اشاعتی خدمات اب کسی تعارف کی محتاج نہیں ۔ یہی کیا کم ہے کہ دینی وسلفی فکر کی کتابوں اور نایاب علمی سرمایوں کو عمدہ ترتیب اور ضروری تحقیق وتخریج کے ساتھ دیدہ زیب شکل میں شائع کرنے کی جہودِ متواصلہ نے دوسرے معاصر مکتبات کو حیرت زدہ کر دیا ہے۔ اس نے قلیل مدت میں احیاء التراث کی جو مثالی خدمت انجام دی ہے، وہ اہلِ علم کے نزدیک بہر حال لائقِ ستایش اور قابلِ داد کارنامہ ہے۔

مضامین ومسائل میں پہلے اِڈیشنوں کی طرح اس زیرِ اشاعت اِڈیشن میں بھی فقہی ترتیب کا اہتمام نہیں کیا گیا ہے۔ کاش عقائد، عبادات، عقود و معاملات وغیرہ ہر موضوع کے فتاوے یکجا کر کے الأول فالأول کے سلیقے سے ترتیب دیے گئے ہوتے تو اس جدید اِڈیشن کی معنویت وافادیت میں گراں قدر اضافہ ہو جاتا۔[1] اُمید ہے کہ آیندہ اشاعت میں اس کی تلافی کی کوشش کی جائے گی۔ إن شاء اللّٰہ.

یہ مجموعہ فتاویٰ مفتی حضرات اور عام اہلِ علم کے لیے یکساں طور پر مفید اور راہنمائی کی قوت رکھتا ہے۔ دوسری طرف اس میں دینی وعلمی مسائل کو کتاب وسنت کی روشنی میں جس شگفتگی اور خوش اسلوبی سے حل کیا گیا ہے، یہ عصرِ حاضر کے جدید ذہنوں کو حق کی طرف مائل کرنے کی کشش کا بھی حامل ہے، اس پر مزید مکتبۃ الفہیم کی جدید کاری اور تزئینِ کتابت وطباعت نے اس کشش کو سوا کر دیا ہے۔

اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ اس قیمتی مجموعے کو ہر خاص و عام کے لیے مفید اور نافع بنائے اور اس کے مولف مرتب، ناشر اور قاری کو خیرِ کثیر اور اجرِ جزیل سے نوازے۔ آمین

العبد الفقیر لرحمۃ اللّٰہ القدیر

محمد اعظمی

۲۲ر جمادی الاخریٰ ۱۴۲۷ھ = ۱۹ر جون ۲۰۰۶ء

---

[1] زیرِ نظر مجموعے میں اس امر کا اہتمام کیا گیا ہے اور تمام فتاویٰ فقہی ترتیب پر درج کیے گئے ہیں۔

مقدمة التحقيق

شیخ الحدیث مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمہ اللہ کی نگارشات کا یہ چوتھا اور آخری مجموعہ قارئین ذی وقار کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ قبل ازیں اس سلسلے کے تین مجموعات اشاعت پذیر ہو چکے ہیں:

1. مقالاتِ حدیث (صفحات: ۷۰۴): اس میں حضرت سلفی رحمہ اللہ کے دفاعِ حدیث سے متعلقہ تیرہ مقالات اور نگارشات کو جمع کیا گیا ہے۔ اس کی طبعِ اول فروری ۲۰۰۹ء کو منظرِ عام پر آئی اور پھر اضافہ جات کے ساتھ اس کا دوسرا اِڈیشن جولائی ۲۰۱۲ء کو شائع ہوا تھا۔
2. نگارشات (صفحات: ۷۰۴): اس مجموعے میں تحریکِ اہلِ حدیث کے تعارف اور دفاع پر مشتمل حضرت سلفی رحمہ اللہ کی چالیس تحریرات کو مدون کیا گیا ہے۔ یہ کتاب مارچ ۲۰۱۱ء کو منصۂ شہود پر آئی۔
3. مجموعہ رسائل (صفحات: ۵۴۸): اس میں مختلف موضوعات سے متعلق حضرت سلفی رحمہ اللہ کے دس رسائل کو شامل کیا گیا ہے۔ یہ مجموعہ مارچ ۲۰۱۲ء میں طبع ہوا تھا۔

مجموعہ مقالات وفتاویٰ:

زیرِ نظر مجموعے میں حضرت سلفی رحمہ اللہ کی باقی ماندہ مختلف و متنوع نگارشات کو شائع کیا جا رہا ہے، جس کی تفصیل ذیل میں ملاحظہ فرمائیں:

1 فتاویٰ:

اس باب میں شامل فتاویٰ کی تعداد 38 ہے، جو عقائد، عبادات اور دیگر معاملات سے متعلق ہیں۔ اس میں عقیدے سے متعلق فتاویٰ کی تعداد 9 ہے۔ طہارت ونماز سے متعلق 13 فتاویٰ، زکات وصدقات سے متعلق 4 فتاویٰ، شادی اور نکاح سے متعلق 6 فتاویٰ اور وراثت وغیرہ سے متعلق متفرق فتویٰ جات کی تعداد 6 ہے۔

اس سے قبل حضرت سلفی رحمہ اللہ کے ایک شاگرد مولانا منیر احمد سلفی مرحوم نے اپنے ادارے اسلامک پبلشنگ ہاؤس لاہور (۱۹۸۷ء) کی طرف سے ''فتاویٰ سلفیہ'' کے نام سے ایک مجموعہ شائع کیا تھا، جس میں فتاویٰ کے ساتھ حضرت سلفی رحمہ اللہ کے بعض مضامین و مقالات بھی مندرج ہیں۔ ہم نے اس باب میں صرف مختلف مسائل سے متعلق ان کے فتویٰ جات ہی کو شامل کیا ہے، جس میں ہمیں دستیاب ہونے والے کچھ اضافی فتاویٰ

بھی مذکور ہیں۔ یہ تمام فتویٰ جات ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور میں شائع ہوئے ہیں، البتہ ہمیں تراویح سے متعلق حضرت سلفی رحمہ اللہ کا ایک قلمی فتویٰ بھی ملا ہے، جو اس سے پہلے کہیں شائع نہیں ہوا تھا۔

حضرت سلفی رحمہ اللہ فتویٰ لکھنے میں عموماً تفصیل سے کام لیتے ہیں اور نصوص کے ساتھ تفاسیر، شروح اور فقہی ولغوی مآخذ ومصادر کی روشنی میں زیرِ بحث مسئلے کو ہر پہلو سے منقح کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کے فتاویٰ سے نماز میں آنحضرت ﷺ کا تصور، ننگے سر نماز، دیہات میں نمازِ جمعہ کا مسئلہ اور قربانی کے دن وغیرہ کے متعلق ان کے فتویٰ جات دیکھے جاسکتے ہیں، جو متعدد صفحات پر مشتمل ہیں۔ البتہ بعض جگہ فتویٰ لکھنے میں اختصار سے بھی کام لیا ہے، حتی کہ چند فتویٰ جات تو دو تین سطروں پر مشتمل ہیں۔

زیرِ نظر باب میں مذکور فتاویٰ کی تعداد 38 ہے، لیکن اگر مکاتیب کے ضمن میں مذکور استفسارات کے جوابات کو شمار کیا جائے تو یہ تعداد بڑھ جاتی ہے، مثلاً: مکاتیب کے حصے میں مولانا فضل حق ہاشمی کے نام حضرت سلفی رحمہ اللہ کے اکیس خطوط ہیں۔ ان میں مولانا فضل حق ہاشمی نے اپنے خطوط کے ضمن میں ① تسبیح ② ضعیف حدیث پر عمل اور روایت بالمعنی ③ نکاحِ تبادلہ ④ سیدہ عائشہ کے غسل والی حدیث ⑤ متعہ کی حلت وحرمت ⑥ سورج کا سجدہ کرنا ⑦ نمازی کے آگے سے عورت کا گزرنا ⑧ بچے کی والدین سے مشابہت کا سبب ⑨ تصدیقِ قلبی اور ایمان ⑩ وتر کے متعلق استفسارات بھی کیے ہیں، جن کے جواب میں حضرت سلفی رحمہ اللہ نے ان مسائل پر روشنی ڈالی ہے، لیکن چوں کہ ان کا اصل مقام خطوط کا باب تھا، اس لیے انھیں اپنے محل ہی پر رکھا گیا ہے۔

2 مقالات:

اس میں 26 مقالات اور مضامین شامل ہیں، جو مختلف موضوعات کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔

- ایک مضمون عقیدے سے متعلق ہے، جس میں یہ بحث کی گئی ہے کہ غیر اللہ کے نام کی نذر مانا ہوا جانور شرعی طریقے پر ذبح کرنے سے علی الاطلاق حلال نہیں ہوتا۔ یہ تحریر دراصل مولانا عبدالواحد غزنوی رحمہ اللہ کے ایک فتوے سے متعلق ہے، جس میں انھوں نے لکھا تھا کہ اگر ایسا جانور زندہ ہو اور مسلمان کے قبضے اور ملکیت میں آجائے تو اللہ رب العزت کی تعظیم وتوحید کے ساتھ بسم اللہ پڑھ کر اسے ذبح کیا جائے تو وہ حلال ہوگا۔ اس فتوے کے مجمل ہونے کی بنا پر عوام میں غلط فہمی پیدا ہونے کا خطرہ تھا اور اس وقت ایسا ہوا بھی، جس کے نتیجے میں حضرت سلفی رحمہ اللہ نے مذکورہ بالا مضمون لکھا اور وضاحت کی کہ کن صورتوں میں ایسا جانور حلال ہے اور کب ناجائز۔

مولانا غزنوی رحمہ اللہ کا یہ فتویٰ ہفت روزہ ''توحید'' امرتسر (۲۷/ مارچ ۱۹۲۹ء) میں شائع ہوا تھا اور حضرت سلفی رحمہ اللہ کا یہ مضمون بھی ''توحید'' امرتسر (یکم مئی ۱۹۲۹ء) میں اشاعت پذیر ہوا، جو بعد ازاں ہفت روزہ

''الاعتصام'' لاہور (۱۷رجنوری ۱۹۸۶ء) میں دوسری بار طبع ہوا۔

❁ پھر اس کے بعد فقہی مسائل سے متعلق تین مضامین ہیں۔ پہلا ڈاڑھی کی اہمیت اور مقدار کے متعلق ہے کہ ڈاڑھی کتنی بڑی ہونی چاہیے؟ اس کے بعد رویتِ ہلال کے متعلق دو مقالات ہیں، جن میں عہدِ حاضر میں رؤیتِ ہلال کے متعلق جدید ذرائع اور وسائل کے متعلق تفصیل سے لکھا ہے اور اس سلسلے میں جمود وتقلید پر قائم رہتے ہوئے مقلدین کے ذہنی وساوس اور وہمی خطرات کی خوب خبر لی ہے۔

❁ بعد ازاں مرزائیت کے سلسلے میں دو مضمون ہیں، جن میں مرزا غلام احمد کے اخلاق وعادات کا جائزہ لیا ہے اور اس کے عجیب وغریب دعاوی کا تذکرہ کیا ہے۔

❁ شیعہ سنی مصالحت کے متعلق دو تحریریں ہیں، جس میں دونوں کے درمیان اتحاد وتعاون کی راہ میں حائل مشکلات کا جائزہ لیا ہے اور بتایا ہے کہ ان کی موجودگی میں یہ اتفاق قطعاً پائیدار نہیں ہوسکتا۔ اسی ضمن میں حضرت سلفی رحمہ اللہ نے اپنے استاد محترم مولانا ابراہیم میر سیالکوٹی کے بعض تسامحات کا بھی جائزہ لیا ہے۔

❁ پھر اختلاف اور حدودِ ادب، فقہ اور تفقہ، اسلافِ کرام اور تقلیدِ جامد کے کرشمے، امام ابن تیمیہ اور فاتحہ خلف الامام اور ہمارے تعلقات حضرات دیوبند سے، کے عنوان سے احناف کے متعلق سلسلہ مضامین کو جمع کیا گیا ہے۔

آخر الذکر حضرت سلفی رحمہ اللہ کا ایک نایاب اور غیر مطبوع مضمون ہے، جس کا قلمی نسخہ ہمیں محترم جناب ضیاء اللہ کھوکھر کے توسط سے حاصل ہوا ہے۔ دراصل یہ مضمون حضرت سلفی رحمہ اللہ نے ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور کے مدیر مولانا محمد اسحاق بھٹی رحمہ اللہ کو اشاعت کے لیے دیا تھا، لیکن وہ کہیں ان کے کاغذات میں دبا رہ گیا اور شائع نہ ہوسکا۔ طویل مدت کے بعد مولانا اسحاق بھٹی رحمہ اللہ کو یہ مضمون ملا تو ان سے جناب ضیاء اللہ کھوکھر نے اشاعت کے لیے لے لیا اور اس طرح یہ قیمتی تحریر ہم تک پہنچ گئی۔ جزاهم الله خيراً وبارك فيهم.

❁ اس کے بعد بریلوی عقائد اور مسائل سے متعلق چار مضامین زیرِ نظر مجموعے میں مندرج ہیں، جن میں میلاد اور بریلوی حضرات کے بعض اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے۔ اس کے بعد چار مضامین حرمِ مکہ کی تاریخ، ایک مثالی خاندان کی یادگار، ریگستانِ عرب کی اہمیت اور عہدِ نبوت میں عید کے متعلق ہیں۔

❁ اس کے بعد ایک مضمون مالیر کوٹلہ ہند میں ایک اہلِ حدیث مسجد کے تنازع سے متعلق ہے، جو وہاں کے اہلِ حدیث حضرات اور جماعت اسلامی کے کار پردازان کے درمیان واقع ہوا تھا۔ اس تحریر میں پیش آمدہ نزاع کے متعلق مولانا ابو الکلام آزاد کے فیصلے کو سراہا گیا ہے اور جماعتِ اسلامی کے حضرات سے اختلاف کو طول دینے سے گریز کی درخواست کی گئی ہے۔

❁ اس کے بعد پانچ مضامین جماعتی نظم اور مختلف تنظیمی امارتوں سے متعلق ہیں، جن میں نظمِ جماعت کی اہمیت

کے ساتھ ساتھ بعض وقتی جماعتی امارتوں کو شرعی امارتوں کے رنگ میں پیش کرنے کی مذمت کی ہے اور ان کے نقصانات سے آگاہ کیا ہے اور باہم مل کر کام کرنے اور افتراق و انتشار سے دور رہنے کی بھی تلقین کی ہے۔

- آخر میں مناظرات سے متعلق ایک مضمون ہے۔ اس تحریر کا پسِ منظر یہ ہے کہ ہفت روزہ ''تنظیم اہلِ حدیث'' روپڑ (یکم دسمبر ۱۹۳۲ء) میں حضرت سلفی رحمہ اللہ کا ایک مضمون بعنوان ''جماعت کے ماضی اور حال پر ایک نظر اور مستقبل کے لیے لمحہ فکریہ کی ضرورت'' شائع ہوا تھا،[1] جس کے آخر میں مناظرات کے سلبی پہلوؤں پر بھی تنقید کی گئی تھی۔ اس کے جواب میں حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمہ اللہ نے ہفت روزہ ''اہلِ حدیث'' امرتسر (۱۶ دسمبر ۱۹۳۳ء) میں ایک مضمون لکھا، جس میں مناظرات کی افادیت اور سلف سے اس کے ثبوت میں کچھ دلائل ذکر کیے۔ اس کے جواب الجواب میں حضرت سلفی رحمہ اللہ نے یہ تحریر لکھی، جس میں مناظروں کی شرعی و افادی حیثیت پر روشنی ڈالی اور مسلکی دعوت کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں بعض مفید پہلو ذکر کیے۔ یہ مضمون ہفت روزہ ''تنظیم اہلِ حدیث'' روپڑ (۵ شوال ۱۳۵۱ھ) میں شائع ہوا تھا۔

3 شخصیات و وفیات:

اس باب میں 11 شخصیات کی وفات پر لکھے گئے حضرت سلفی رحمہ اللہ کے مضامین اور شذرات کو شامل کیا گیا ہے، جن میں سب سے طویل تحریر مولانا داود غزنوی رحمہ اللہ کے متعلق ہے، جو "إخاء أربعين سنة" کے عنوان سے ہے۔ بعض ازاں ملک امام خان نوشہروی، مولانا نور حسین گرجاکھی، ملک ہدایت اللہ سوہدروی، مولانا اسحاق رحمانی، مولانا عبدالحمید حمید پوری، حافظ حمید اللہ دہلوی، مولانا عبدالغنی لالہ موسیٰ، مولانا حسین احمد مدنی اور سیٹھ نظام الدین گوجرانوالہ کی وفات کے بعد لکھے جانے والے مضامین شامل ہیں۔

4 مقدمات وتبصرہ جات:

اس میں 35 کتب اور مضامین و رسائل پر حضرت سلفی رحمہ اللہ کے قلم سے رقم کردہ مقدمات، تبصرہ جات اور افتتاحی تحریریں جمع کی گئی ہیں، جن میں اہم ترین کتب ترجمۃ القرآن از مولانا ثناء اللہ امرتسری، شرف اصحاب الحدیث، معیار الحق، اکمل البیان، نتائج التقلید، کالا پانی اور مولانا احمد دین گکھڑوی کی چار کتابیں برہان الحق، فضائل سید العالمین، سیرت سید العالمین اور نجات الاسلام شامل ہیں۔ اس باب میں "حسن البیان"

[1] یہ مضمون ''نگارشات'' (ص: ۱۹۳) میں شائع ہو چکا ہے۔ حضرت سلفی رحمہ اللہ کا یہ جواب الجواب ہمیں اس وقت نہیں مل سکا تھا، اس لیے اب اسے زیرِ نظر مجموعے کی زینت بنایا جا رہا ہے۔

(تالیف: مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی) اور "نصرة الباري" (تالیف: عبدالرؤف جھنڈا نگری) پر حضرت سلفی رحمہ اللہ کے لکھے ہوئے مقدمات کو شامل نہیں کیا گیا، کیوں کہ وہ اس سے پہلے مولانا سلفی رحمہ اللہ کے حجیتِ حدیث پر مشتمل مضامین کے مجموعے "مقالاتِ حدیث" میں شائع ہو چکے ہیں۔

5 مکاتیب:

پانچویں باب میں حضرت سلفی کے مختلف خطوط شامل ہیں، جو انھوں نے اپنے زمانے کے نامور علما اور اصحابِ علم و فضل کے نام لکھے تھے۔ ان مکاتیب کی تعداد 80 ہے۔ ان میں مولانا داود غزنوی کے نام ایک خط اور مولانا عبدالستار حسن عمر پوری کے نام سات خطوط شامل ہیں۔ علاوہ ازیں اس باب میں مولانا ثناء اللہ امرتسری اور مولانا غلام رسول مہر کے نام ایک ایک خط، مولانا عبدالرؤف جھنڈا نگری کے نام پانچ، مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کے نام دو، مولانا عبدالعلیم ماہر کے نام چھے، مولانا نذیر احمد رحمانی املوی کے نام دس، مولانا محمد اسحاق بھٹی کے نام تیرہ اور مولانا فضل حق ہاشمی میانوالی کے نام اکیس خطوط شامل ہیں۔ ان کے علاوہ مختلف حضرات کے نام بعض خطوط بھی جمع کیے گئے ہیں۔

حضرت سلفی رحمہ اللہ ہر خط کا جواب دینے کا خاص اہتمام کیا کرتے تھے اور اس طرح آپ نے بہت سے خطوط لکھے، مثلاً: صرف مولانا عبدالرؤف جھنڈا نگری کے نام ہی مولانا سلفی نے تقریباً یک صد خطوط لکھے،[1] لیکن تلاشِ بسیار کے باوجود ہمیں ان کا خطوط کا صرف اتنا حصہ ہی دستیاب ہو سکا، جو قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ اس سلسلے میں ہم ان تمام افراد کے ممنون ہیں، جنھوں نے ان مکاتیب کی فراہمی میں ہمارے ساتھ کسی طرح کا بھی تعاون کیا۔ جزاهم الله خيراً.

6 نظم جماعت کے متعلق ہدایات و اخبارات:

شیخ الحدیث مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمہ اللہ پہلے جمعیت اہلِ حدیث کے ناظم رہے اور مولانا داود غزنوی رحمہ اللہ کی وفات کے بعد جمعیت کی امارت کے منصبِ جلیل پر فائز ہوئے۔ نظامت و امارت کے دوران میں آپ نظم جماعت کی اصلاح کے سلسلے میں اراکینِ جماعت کے نام مختلف ہدایات و توجیہات دیتے رہے، جن کو زیرِ نظر باب میں جمع کیا گیا ہے۔

اس سلسلے میں پہلے تو جمعیت و جماعت کے قواعد و ضوابط کے سلسلے میں کچھ تحریریں ہیں، بعد ازاں جماعت میں انتشار و افتراق پیدا کرنے والے بعض لوگوں کی ناشائستہ حرکتوں کے متعلق کچھ نگارشات شامل

[1] جیسا کہ انھوں نے ہفت روزہ "الاعتصام" لاہور (۱۰/ مئی ۱۹۶۸ء) میں مطبوع اپنے ایک خط میں ذکر کیا ہے۔

ہیں۔ علاوہ ازیں جامعہ سلفیہ فیصل آباد کی تعمیر، نظام اور نصاب، مختلف مساجد کی تعمیر و ترقی اور دعوتی پروگراموں کے متعلق متنوع تحریریں اس باب میں جمع کی گئی ہیں۔

7 دروس و تقاریر:

اس باب میں حضرت سلفی رحمہ اللہ کے دروسِ قرآن اور تقاریر کو شامل کیا گیا ہے، جو ان کے مطبوع خطبات بعنوان ''خطباتِ سلفیہ'' میں شامل نہیں تھیں۔

اس میں سب سے پہلے محترم جناب فیض لدھیانوی کے مرتب کردہ حضرت سلفی رحمہ اللہ کے درسِ قرآن کے مختلف نوٹس ہیں، جو انھوں نے جامعہ محمدیہ چوک نیائیں گوجرانوالہ میں حضرت سلفی رحمہ اللہ کے بعد نمازِ فجر درسِ قرآن میں شامل ہو کر تحریر کیے تھے۔ ان نوٹس کی تعداد 131 ہے۔ اس کے بعد مختلف مواقع پر حضرت سلفی رحمہ اللہ کے دیے گئے دروس، خطبات اور تقاریر کو جمع کیا گیا ہے، جن کی تعداد 18 ہے۔

زیرِ نظر مجموعے کے مختلف ابواب میں مذکورہ بالا مقالات وغیرہ کو جمع کیا گیا ہے اور یہی نگارشات اب تک ہمیں دستیاب ہو سکی ہیں۔ ان کے علاوہ اگر حضرت سلفی رحمہ اللہ کی مزید تحریریں ہمیں مل سکیں تو کسی اور مجموعے میں انھیں بھی شائع کیا جائے گا۔ إن شاء اللہ۔ اس سلسلے میں ہم نے کوشش کی ہے کہ مولانا سلفی رحمہ اللہ کی چھوٹی بڑی تمام نگارشات کو جمع کیا جائے۔ ممکن ہے بعض حضرات کے نزدیک کچھ وقتی تحریریں قابلِ اشاعت نہ ہوں، لیکن ہمارے نزدیک ہر تحریر کی پہلی اہمیت تو یہی ہے کہ وہ امامِ سلفیت کے قلم سے نکلی ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ ہر تحریر میں کسی نہ کسی پہلو سے افادیت اور نصیحت کا سامان موجود ہے، جس کی بنا پر اسے زیرِ نظر مجموعے میں شامل کیا گیا ہے۔

ان نگارشات کی خدمت اور تصویب و تحقیق میں ہم نے ہر ممکن کوشش کی ہے، جن میں احادیث و آثار کی تحقیق، عربی و فارسی عبارات کا اصول سے مقارنہ اور ان کے تراجم کا اہتمام کیا ہے۔ تاہم بشری تقاضے کے تحت غلطی اور خطا کا امکان موجود ہے۔ اگر کسی غلطی اور کمی بیشی پر اطلاع ہوئی تو ان شاء اللہ اسے اگلے اِڈیشن میں دور کر دیا جائے گا۔

آخر میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے اس عمل کو اپنی رضا کے لیے خالص بنائے اور اسے تمام معاونین کے لیے ذخیرۂ آخرت بنائے۔ اس سلسلے میں ہمارے ساتھ جن بھائیوں نے کسی قسم کا علمی و عملی تعاون کیا ہے، ہم ان کے تہہ دل سے شکر گزار ہیں کہ ان کے اشتراک سے یہ عمل پایۂ تکمیل کو پہنچا ہے۔ جزاھم اللہ خیراً۔

وصلی اللہ و سلم علی خیر خلقه محمد، وعلیٰ آله، وأصحابه أجمعین.

حافظ ابو مریم مدنی

۳۰/۳/۱۴۳۷ھ = ۱۱/۱/۲۰۱۶ء

فتاویٰ

1- حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بن باپ کی ولادت اعجازی شان کی تھی:[1]

سوال براہِ مہربانی مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات روانہ فرمائیں، کیونکہ ان پر ایمان کا دارومدار ہے اور نمازیں ضائع ہونے کا خطرہ ہے۔ یہ خالص دینی معاملہ اور حکم ہے: ﴿فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ [النحل: ۴۳]

اگر نمازیں برباد ہو رہی ہوں اور آپ جواب نہ دیں تو پھر قیامت کے دن آپ جواب دہ ہوں گے، اس لیے خالص فی سبیل اللہ اپنی تحقیق اور علم کے مطابق جواب دے کر ممنون فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے گا۔

1 کیا حضرت عیسیٰ کو بغیر باپ کے ماننا ایمانیات سے ہے؟ یعنی وہ چیزیں جن پر ایمان لانا ضروری ہے۔ اگر ان میں سے ایک کو بھی نہ مانے تو آدمی کافر ہو جاتا ہے، جیسے چھے چیزیں: اللہ تعالیٰ، فرشتے، کتابیں، رسل، تقدیر، مرنے کے بعد اٹھنا ہے تو کیا حضرت عیسیٰ کو بغیر باپ کے ماننا بھی اسلامی عقائد میں داخل ہے؟

2 جو شخص حضرت عیسیٰ کو بغیر باپ کے نہ مانے اور ان کا باپ ثابت کرے، کیا وہ کافر ہے؟ یہاں ایک عالم نے اس پر ایک بڑی کتاب لکھی ہے، جس میں انھوں نے ثابت کیا ہے کہ حضرت عیسیٰ کا باپ تھا اور وہ بغیر باپ کے پیدا نہیں ہوئے۔

3 اگر ایسا شخص کافر نہیں تو ایسے شخص کے پیچھے نماز پڑھنا جائز ہے؟

4 کیا ایسے شخص کو کسی مسجد کا خطیب اور امام مقرر کرنا جائز ہے؟ عام لوگ اس کے پیچھے نماز اور جمعہ پڑھتے ہیں۔

5 یہ شخص اس بات پر بضد ہے کہ بغیر باپ کے پیدا ہونا حضرت عیسیٰ کی توہین ہے (اس طرح کہ) اگر آپ کو کوئی کہے کہ آپ کی کنواری ماں اور بہن نے بچہ جنا ہے تو ایسی کنواری کو لوگ کیا کہیں گے اور اس بچے کو لوگ کیا کہیں گے؟

براہِ مہربانی مفصل جواب روانہ فرمائیں، تاکہ ہم کہیں نمازیں نہ ضائع کرتے رہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے گا۔ (راجہ غلام احمد، مدرس شاہ دولی دروازہ گجرات)

جواب مکرم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

1 مکتوب ملا۔ حق اور باطل کی پہچان کا یہ طریقہ صحیح نہیں کہ ہر چیز کو ایمانیات کے پیمانے ہی سے ناپنا شروع کر دیا جائے۔ اگر اس پیمانے میں نہ آئے تو اس کے لیے کھلی چھٹی سمجھ لی جائے۔ یہ طریق ملحدین کا ہے۔

[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۴ ستمبر ۱۹۷۰ء)

عوام میں شکوک پیدا کرنے کے لیے وہ ایسے سوالات بناتے رہتے ہیں۔ قادیانی بھی یہی کہتے تھے کہ حیاتِ مسیح، اِمکانِ نبوت، ایمانیات میں شامل ہیں؟ آیا معجزات کی تاویل یا انکار کفر ہے؟

یہ عقیدہ کہ "حضرت مسیح علیہ السلام کا باپ تھا" اس قدر غلط اور جہالت آمیز ہے کہ پرانے ملحدین کو بھی اس کے اظہار کی جرأت نہیں ہوئی تھی۔ میری دانست میں سر سید احمد خان سے پہلے کسی بڑے سے بڑے بے دین کو بھی قرآنِ عزیز کی آیات متعلقہ پیدائشِ مسیح کی تحریف میں یہ جرأت نہیں ہوئی، جو گجراتی ملحد[1] کو ہوئی، اس نوع کی تحریف بے باک ملحد ہی کر سکتا ہے۔

[2] میں اس عالم صاحب کو مدت سے جانتا ہوں۔ یہ مولوی فضل الٰہی وزیر آبادی رحمہ اللہ کے عقیدت مند تھے اور سید احمد بریلوی شہید رحمہ اللہ کی زندگی اور رجعت کے قائل تھے۔ مجاہدینِ چمرقند کے مال پر خوب گل چھرے اڑائے۔ پہلی دفعہ غالباً ۱۹۱۴ء کی جنگ کے بعد چند دن گرفتار ہوئے۔ پولیس کی گرفت سے گھبرا کر تائب ہوئے۔ جماعتِ مجاہدین کو چھوڑ کر مولوی عبدالوہاب دہلوی رحمہ اللہ صدر جماعت غربا اہلِ حدیث کے مرید ہوئے۔ ان کے مدرسے میں مدرس ہوئے، ان کی قیادت میں وعظیں کہتے رہے۔ نزاع کی وجہ سے وہاں سے بھی الگ ہو گئے۔ مولانا عبدالوہاب رحمہ اللہ کی حمایت میں مولانا محمد صاحب جونا گڑھی رحمہ اللہ اور باقی بعض علمائے اہلِ حدیث سے ذلت آمیز شکست کے بعد دہلی چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔

ان ایام میں حافظ محمد رمضان کا انتقال ہوا تھا۔ جماعت کو آدمی کی تلاش تھی۔ یہ میرا گناہ ہے کہ ان عالم صاحب کی اقامت کے لیے معاملہ طے کیا، راستہ ہموار کیا اور یہ کڑوے پانی کا چشمہ یہاں سے بہنے لگا۔ ابتدا میں چند رسالے بعض جزوی مسائل کے متعلق لکھے۔ قلم صاف نہ تھا، نہ زبان ہی اچھی تھی، اس سے وہ شہرت حاصل نہ ہو سکی جس کے وہ خواہش مند تھے۔ اس کے بعد انھوں نے معجزات کا انکار کرنا شروع کر دیا، اس پر متعدد رسائل لکھے۔ خیال تھا کہ علما رد کریں گے، تحریری سوال و جواب کا سلسلہ چل نکلے گا۔ اس میں بھی کوئی علمی مواد نہ تھا۔ کسی نے رد کی طرف توجہ ہی نہ دی۔ مسئلہ جوں کا توں رہ گیا۔

اب اس نے ولادتِ مسیح کی اعجازی نوعیت کا انکار کیا ہے۔ اب تک تو اسے اہلِ علم نے قابلِ خطاب نہیں سمجھا۔ آپ ایسے حضرات معلوم نہیں کیوں بے قرار ہیں؟ آپ ان عالم صاحب سے دریافت فرمائیں کہ اگر کوئی حضرت مسیح علیہ السلام کی پیدائش کو اعجازی سمجھے اور یہ عقیدہ رکھے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے پیدا ہوئے، عادی طور پر ان کی پیدائش نہیں۔ وہ کہاں تک مجرم ہے؟ کافر ہے یا نہیں؟ اگر وہ بھی مسلمان ہی ہے تو ان حضرات کو اس کے قبول کرنے میں کیا تکلیف ہے؟

---

[1] اس سے مراد حافظ عنایت اللہ گجراتی ہیں۔

3 ملحد اور بے دین کی اقتدا درست نہیں اور عالم صاحب کے متعلق حجاز کے علما نے کفر کا فتویٰ دیا ہے۔

4 جب امام نہیں بن سکتا تو خطیب کیسے بن سکے گا؟ نمازِ جمعہ بھی نمازِ پنج گانہ کی طرح فرض ہے۔

5 بلا باپ پیدا ہونا تو اللہ تعالیٰ کی قدرت کا کرشمہ ہے اور وہ اس پر قادر ہے۔ آدم علیہ السلام کو ماں باپ دونوں کے بغیر پیدا کیا، لیکن حضرت مسیح علیہ السلام کو ایسے شخص کی طرف منسوب کرنا، جو اُن کا فی الحقیقت باپ نہیں، ماں اور بیٹے دونوں کی توہین اور ان پر بدکاری کی تہمت ہے۔ آپ کے عالم صاحب یہودی معلوم ہوتے ہیں۔ یہودی حضرت مریم کے متعلق یہی کہتے ہیں!

ان سے کہیے کہ کوئی آیت یا کوئی حدیث، گو ضعیف ہی ہو، عالم صاحب دکھا دیں۔ اگر عالم صاحب کو کوئی کہے کہ آپ کی اہلیہ نے فلاں آدمی سے بچہ جنا ہے، یہ کہاں تک خوش ہوں گے؟ صرف باپ ہونا خوبی نہیں۔ صحیح باپ ہونا خوبی ہے۔ اگر عالم صاحب کی اہلیہ کوئی ایسی غلطی کر کے ان کو کہتی کہ آپ نہ سہی بہر طور اس بچے کا باپ تو ہے، تو کیا فتویٰ ہوتا؟

حقیقت یہ ہے کہ ایسے شخص کی اقتدا بے دین اور ملحد ہی کر سکتا ہے۔

2- اہلِ وہاب کا مذہب اور نماز میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تصور[1]

[گوجرانوالہ، محلہ اسلام آباد کی مسجد کی بنیاد مرحوم حاجی خدا بخش صاحب نے محلے کے بعض دوسرے لوگوں کے ساتھ مل کر رکھی تھی، لیکن اس کے نظم ونسق میں زیادہ دخل بریلوی حضرات کا رہا۔ عام طور پر یہاں کی امامت و خطابت ایسے حضرات کے قبضے میں رہی جو بریلویت کے ترجمان تھے، اس کے باوجود کہ وہ اپنے مسلک کے پابند بھی تھے اور مبلغ بھی، شہر اور محلے میں باہم مسلمانوں میں منافرت نہ تھی۔ مختلف مکاتبِ فکر باہم ملتے جلتے تھے۔ ایک دوسرے کی اقتدا میں نماز بھی ادا کر لیتے تھے۔ کوئی بھی کسی کو بری نظر سے نہیں دیکھتا تھا۔ تمام مکاتبِ فکر کے یکجا جمعہ پڑھنے کا فیصلہ بھی اسی مسجد میں ہوا تھا۔ یہ تحریک مرحوم بابو عطا محمد صاحب کی مساعی اور کارکنوں کی کوششوں کی مرہونِ منت تھی۔ صاحبزادہ فیض الحسن بھی ان مجالس میں شریک ہوئے۔ اس وقت صاحبزادہ احراری تھے، بریلویت کا چسمہ نہیں لیا تھا۔ یہ اجتماعی جمعے کافی عرصہ تک جاری رہے۔

اب اس مسجد میں کچھ عرصے سے ایک بزرگ ابوداود، محمد صادق صاحب امامت و خطابت کے فرائض انجام دے رہے ہیں، ان حضرات کا خمیر کوٹلی لوہاراں کی مٹی سے اٹھایا گیا اور لائل پور کی بریلوی مہر لگا کر انھیں گوجرانوالہ محلہ اسلام آباد میں متعین کیا گیا۔ ہمیں ان حضرات کو زیادہ قریب سے دیکھنے کا موقع نہیں ملا، ان کے

---

[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۳ر نومبر ۱۹۶۷ء)

اعمال سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ بے چارے علم و اخلاق کے لحاظ سے بے حد مفلس اور مفلوک الحال ہیں، بلکہ یتیم! حسد، کبر اور مسلمانوں میں تفریق اندازی اور شقاق ان کے محاسن کا خاص حصہ ہیں۔ یہ اپنی ان عادات کی وجہ سے اپنے حلقے میں بھی بدنام ہیں۔ خود ان کے ہم خیال بھی ان کی عادت سے نالاں ہیں۔ چند آبرو باختہ لڑکے ان کے اردگرد جمع ہیں، ان کی وجہ سے بریلوی شرفا کی آبرو بھی ان سے محفوظ نہیں۔ ان کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ ان کے عقیدت مند ان کے سوا کسی کی بات سنیں نہ ان تہمتوں کی تحقیق کی جائے، جو وہ اپنے حلقہ اثر میں اپنے خلاف مکاتبِ فکر کے متعلق تراشتے رہتے ہیں۔

اپنی اس تہمت تراشی اور زبان درازی کی وجہ سے وہ قانونی طور پر سزا بھی پا چکے ہیں۔ یہ سزا سپریم کورٹ تک بھی معاف نہ ہو سکی، غالباً کچھ تخفیف ہوئی۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں فتویٰ بازی کی پاداش میں گرفتار ہوئے، غالباً سفارشی معافی کے بعد رہا ہوئے۔ مولانا غلام اللہ صاحب پر اتہام لگایا، کیس ہوا، معافی مانگی۔

خدا کا شکر ہے کہ ان کے حلقۂ اثر کے ایک بزرگ نے ایک تہمت کے متعلق تحقیق کی کوشش کی ہے۔ ان کا سوال بعینہٖ اور اس کا جواب ذیل میں درج کیے جاتے ہیں، امید ہے مولوی صادق صاحب انھیں معاف فرما دیں گے۔

ہماری طرف سے بریلوی حضرات کے لیے صدائے عام ہے، ان کے ہاں جو تہمتیں ہمارے متعلق تراشی جائیں، ہم سے تحقیق کریں۔ ہم کوشش کریں گے کہ ان کو حقیقتِ حال سے آگاہ کیا جائے۔ ہم مرزا عمر بیگ صاحب کے مکرر شکر گزار ہیں کہ انھوں نے ہمیں حق کے اظہار کا موقع دیا۔ [احسان الٰہی ظہیر]

سوال مولانا و مفتی محمد اسماعیل صاحب (صدر جماعت اہلِ حدیث مغربی پاکستان) چوک نیائیں گوجرانوالہ

السلام علیکم۔ کیا آپ یہ مطلع فرما کر ممنونِ احسان فرمائیں گے کہ کیا آپ (تمام اہلِ وہاب) کا عقیدہ ہے کہ اگر رسولِ مقبول ﷺ کا خیال نماز میں آجائے تو یہ خیال (نعوذ باللہ) گدھے اور بیل سے بدتر ہے، حالانکہ سورت فاتحہ میں ان نیک لوگوں کا ذکر ہے، جن کو نیک اعمال کے بدلے انعامات ملے اور برے لوگوں کو بداعمال کے بدلے ان پر عذاب نازل ہوئے؟ اسی طرح التحیات للہ میں رسولِ کریم ﷺ پر سلام پڑھا جاتا ہے، اپنے اور نیک لوگوں پر بھی، اور دعا ''رَبِّ اجْعَلْنِي'' میں اپنا، اپنی اولاد، ماں باپ اور تمام مومنوں کا ذکر آتا ہے۔ درود پاک میں رسولِ کریم ﷺ اور ان کی اولاد اور ابراہیم علیہ السلام اور ان کی اولاد پر درود پڑھا جاتا ہے؟

دعا گو: مرزا عمر بیگ نظامی، ۱۹/ اسلام آباد، گوجرانوالہ

جواب محترم مرزا عمر بیگ صاحب، زادعمرکم، السلام علیکم!

آپ کا مکتوب بدست سعید صاحب ملا۔ مسرت ہوئی کہ آپ حضرات نے ان مسائل کی تحقیق کرنے کی

کوشش فرمائی، جو عموماً ہمارے بریلوی علما اور ان کے حاشیہ نشین عوام سے کہتے رہتے ہیں، حالانکہ دوسرے فریق کو ان کا علم بھی نہیں ہوتا اور یہ حضرات جلسوں اور منبروں پر ان کا اعلان فرمارہے ہوتے ہیں۔ یہ طریق بہت اچھا ہے، اس سے آپ کو بھی بصیرت حاصل ہوگی اور یہ حضرات بھی منبر و مجلس کی ذمے داریوں کو محسوس کریں گے اور بلا تحقیق دوسروں کو تہمت باندھنے سے پرہیز کریں گے۔

اب جواباً ترتیب وار ہماری گزارشات سنیے:

1. اہلِ وہاب کوئی مذہب نہیں، نہ ہم لوگ اہلِ وہاب یا وہابی کہلانا پسند کرتے ہیں۔ نجد کے ایک مشہور عالم کا نام محمد بن عبدالوہاب تھا، اس نے نجد اور قرب و جوار کے علاقوں میں وعظ و نصیحت کے ذریعے اصلاح کی کوشش کی۔ لوگوں کو شرک، قبر پرستی، بدعات اور غلط رسوم سے روکا۔ لوگوں نے ان کی سخت مخالفت کی، حتی کہ ان کے والد عبدالوہاب عالم ہونے کے باوجود ان کی مخالفت کرتے رہے۔ کئی سال کی محنت اور ہجرت کے بعد آلِ سعود نے ان کے ساتھ تعاون کیا۔ آہستہ آہستہ لوگوں نے ان کی بات کو سمجھا اور ان کے والدِ بزرگوار کو بھی محسوس ہوا کہ ان کا بیٹا صحیح کہتا ہے۔

ان کو طعن کے طور پر لوگ وہابی کہتے ہیں، لیکن در اصل وہ لوگ حنبلی ہیں۔ فقہ میں وہ امام احمد رحمہ اللہ کو اپنا پیشوا مانتے ہیں۔ جس طرح ہمارے ملک میں عام لوگ حنفی ہیں، نجد میں اکثر لوگ حنبلی کہلاتے ہیں۔ وہابی نہ کوئی مذہب ہے اور نہ فرقہ؛ محض ایک تحریک تھی، جس کا زور بے دینی کی وجہ سے اب ان علاقوں میں ٹوٹ رہا ہے، جس طرح ساری دنیا میں دین داری کم ہو رہی ہے۔ ہمارے بریلوی مولوی جس کے مخالف ہو جائیں، اسے ''وہابی'' کہہ کر بدنام کرتے ہیں۔ یہ در اصل سنتِ انگریز ہے!!

ہم لوگ نہ اہلِ وہاب ہیں نہ وہابی۔ ہم آنحضرت ﷺ کو آخری نبی مانتے ہیں اور صرف ان کی اطاعت کو نجات کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ چاروں اماموں کو اپنا پیشوا سمجھتے ہیں۔ چاروں فقہی مسالک کو یکساں اور برابر سمجھتے ہیں، ان میں جو مسئلہ قرآن و سنت کے موافق ہو، اسے قبول کرتے ہیں اور ان تمام فرقوں سے اپنے آپ کو الگ سمجھتے ہیں۔ قبر پرستی، بت پرستی، پیر پرستی سے پرہیز کرتے ہیں اور اسے اسلامی تعلیمات کے خلاف سمجھتے ہیں۔ قبروں اور خانقاہوں پر میلوں اور عرسوں کو بھی ناپسند کرتے ہیں اور بزرگوں کو اس طرح فروخت کرنا اور اپنا پیٹ پالنا گناہ خیال کرتے ہیں۔

آنحضرت ﷺ کا تصور:

آنحضرت ﷺ کا نماز میں تصور کرنا یا نہ کرنا؛ یہ عقائد کا مسئلہ نہیں۔ عقائد کی کتابوں میں اس کا کوئی ذکر

نہیں۔ عقائد کی مشہور کتابیں شرح عقائد نسفی، عقیدہ طحاویہ، شرح عقیدہ اصفہانیہ، عقیدہ صابونیہ، خیالی، عبد الحکیم اور شرح مطالع ہیں۔ یہ عقائد کی کتابیں عام کتب خانوں میں ملتی ہیں۔ کسی میں یہ عقیدہ موجود نہیں۔ معلوم نہیں بریلوی مولوی صاحبان نے یہ عقیدہ کہاں سے بنایا؟ صحیح بات یہ ہے کہ نماز خشوع اور عاجزی سے پڑھی جائے۔ نماز میں جو کچھ پڑھا جائے، اس کے مفہوم و مطلب کی طرف توجہ رکھنی چاہیے۔ باقی پریشان خیالات سے ہر نمازی بچنے کی کوشش کرے۔ اگر خیالات دل میں آئیں تو دل میں أعوذ یا لا حول پڑھے اور خیالات کی آمد کو روکے۔[1]

غلطی کی وجہ:

قریباً ایک سو سال سے زیادہ عرصہ ہو رہا ہے، ایک بزرگ سید احمد بریلوی ہوئے۔ یہ حنفی المذہب تھے۔ نہایت پرہیز گار ولی اللہ تھے۔ انھوں نے سکھوں اور انگریزوں کے ساتھ جہاد کا فیصلہ کیا۔ بہت سے لوگوں نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔ بڑے بڑے عالم بھی ان کے مرید تھے۔ اس سلسلے میں مولانا اسماعیل بن شاہ عبد الغنی بن شاہ ولی اللہ اور مولانا عبد الحی بڈھانوی حنفی ان کے عقیدت مند تھے۔

مولانا اسماعیل صاحب اہلِ حدیث تھے۔ سید احمد صاحب حنفی بریلوی صوفی بزرگ تھے، انھوں نے تصوف میں ایک کتاب لکھوائی، جس کا نام ''صراطِ مستقیم'' ہے۔ یہ کتاب فارسی میں ہے، اس کے چار باب ہیں۔ اس کے دو باب کا ترجمہ مولوی عبد الحی صاحب بڈھانوی حنفی نے کیا ہے، اس کے دوسرے باب میں، جس کا ترجمہ مولانا عبد الحی صاحب نے کیا ہے، ایک ایسی عبارت موجود ہے، جس میں بریلوی حضرات کو مغالطہ ہوا اور وہ عبارت کو صحیح نہیں سمجھ سکے۔ اصل عبارت اور اس کا مفہوم آگے آئے گا، لیکن مہربانی فرما کر آپ دو چیزیں ذہن میں رکھ لیں، سید احمد بریلوی رحمہ اللہ بھی حنفی ہیں اور مولانا عبد الحی صاحب بڈھانوی بھی حنفی ہیں۔ شاہ اسماعیل صاحب رحمہ اللہ نہ اس کتاب کے مصنف ہیں نہ اس باب کے مترجم۔ یہ تو تاجر کتب حضرات کی ہوشیاری ہے کہ انھوں نے شہرت کی وجہ سے کتاب پر شاہ اسماعیل صاحب کا نام لکھ دیا اور بریلوی حضرات کی لاعلمی کا نشانہ بن گئے، حالانکہ وہ بے چارے بالکل بے قصور ہیں اور شاہ صاحب کے نام اور اہلِ حدیث ہونے کی وجہ سے جماعت اہلِ حدیث بھی بدنام ہوگئی، حالانکہ ہماری کسی کتاب میں یہ مسئلہ مرقوم نہیں۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ ہم ان بزرگوں کو اختلافِ مسلک کے باوجود نیک اور بزرگ سمجھتے ہیں، لیکن ان کو پیغمبر یا اپنا امام نہیں مانتے۔ ان میں سے بعض حضرات کی اور بھی تصنیفات ہیں، جن میں ہر قسم کے مسائل پائے جاتے ہیں، ان میں غلط بھی ہیں اور صحیح بھی۔ ہم ان حضرات میں سے کسی کے مقلد نہیں، ان کو اچھے عالم اور بزرگ سمجھتے ہیں۔ بریلوی حضرات معلوم نہیں، یہ غلط بیانی کیوں کرتے ہیں کہ یہ حضرات ہمارے امام ہیں؟

---

[1] دیکھیں: صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۲۰۳) ولفظہ: ((فإذا أحسسته فتعوذ باللّٰہ منه، واتفل علیٰ یسارك ثلاثا))

آپ یقین فرمائیں، ان کی کتابیں ہمارے لیے حجت ہیں نہ یہ بزرگ ہمارے امام۔ اب ہمارا فرض نہیں کہ میں اصل عبارت کی تشریح کروں یا مغالطے کا اظہار، لیکن آپ کی تسکین کے لیے اصل عبارت اور اس کا مطلب عرض کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔

سید احمد رحمہ اللہ کا مقصد یہ ہے کہ نماز پوری توجہ سے ادا ہونی چاہیے، اس میں خیالات اور وسوسوں کو قریب نہیں آنے دینا چاہیے، خصوصاً ایسے خیالات جن سے خدا تعالیٰ کی بزرگی اور عظمت میں فرق آئے، کیونکہ عبادت میں پہلی چیز خدا تعالیٰ سے محبت اور اس کی عظمت اور برتری ہے اور دوسری چیز عبادت میں انسان کا عجز و انکسار اور حاجت مندی کا اظہار ہے، ان دو چیزوں میں جن خیالات سے نقص پیدا ہو، اللہ کی عزت و برتری میں فرق آئے یا انسان اپنے آپ کو بڑا سمجھے اور اس کے دل میں تکبر آجائے، وہ خیالات درست نہیں۔

عبادت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر بطورِ "عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ" آئے تو کوئی حرج نہیں، اس لیے کہ یہ اللہ کی عظمت سے نہیں ٹکراتا، بلکہ اس میں ان کی عبدیت اور رسالت کا اقرار ہے، اسی طرح مغضوب اور منعم علیہ گروہوں کے خیال سے بھی اللہ کی عظمت میں فرق نہیں آتا۔ انعام بھی احتیاج ہے اور غضب میں ان نافرمانیوں کی تحقیر ہے، اس لحاظ سے یہ خیال اللہ کی عظمت سے نہیں ٹکراتا، لیکن اگر کسی ولی، بزرگ یا نبی کا خیال آجائے تو ان کی عظمت، ان کی بزرگی کا خیال اور تصور اللہ تعالیٰ کی عظمت اور بزرگی سے ٹکرائے گا، آپ اس کے لیے "أعوذ" پڑھ سکتے ہیں نہ "لاحول"۔ اس کے خلاف اگر بیل گدھے یا کسی ذلیل اور حقیر چیز کا خیال آجائے، آپ فوراً "لاحول" یا "أعوذ" پڑھ کر اسے دور کر دیں گے، اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اور عزت اس سے متاثر نہیں ہوگی۔

سید صاحب رحمہ اللہ کا مقصد یہ ہے، وسوسہ کوئی بھی نماز میں نہ آنا چاہیے نہ ہی لانا چاہیے، لیکن بعض وسوسے نماز میں زیادہ خلل پیدا کرتے ہیں بعض کم، صوفیانہ لحاظ سے سید صاحب نے واقعی عجیب نکتہ بیان فرمایا ہے، لیکن کند ذہن آدمی جو اتنی گہرائی تک نہ جا سکے، وہ کفر کے فتوے لگانا شروع کر دے گا۔ مقابلہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی اور گاؤ دخر میں نہیں، مقابلہ وسوسے کے نقصان اور مضرت میں ہے۔ ایک شخص کہتا ہے کہ گرم لوہا جلانے کے لحاظ سے گرم پانی سے زیادہ مضر ہے۔ مقابلہ لوہے اور پانی کی قیمت میں نہیں ہوگا، بلکہ لوہے اور پانی میں گرمی کی تاثیر کا ہوگا۔ سید صاحب رحمہ اللہ نے اس عمیق اور لطیف بات کو سمجھانے کے لیے متعدد صفحے لکھے ہیں، لیکن بریلوی علما کا بغض ذہن کچی بات سمجھنے میں حائل ہوگیا۔ سید صاحب رحمہ اللہ کی پوری بات سمجھنے کے لیے اگر آپ پسند فرمائیں تو اصل کتاب بھیج دوں، ممکن ہے اللہ تعالیٰ آپ کا ذہن کھول دے۔ سید صاحب نے یہ بھی فرمایا ہے کہ طبائع کے لحاظ سے وسوسے کا اثر ہر طبیعت پر مختلف ہوتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایسے بزرگ نماز میں لشکر

مرتب فرما لیتے تھے،[1] ان کی نماز میں ان کے خشوع پر کوئی اثر نہیں پڑتا، اس لیے بزرگوں اور اہل اللہ کی ریس کر کے اپنی نماز نہیں خراب کرنی چاہیے۔

سید صاحب رحمہ اللہ نے وسوسے کی دو قسمیں بیان فرمائی ہیں۔ ایک وسوسہ لا علاج ہے، اس کے لیے یا تو اللہ تعالیٰ سے دعا کرے یا کسی کامل پیر کی صحبت میں کچھ عرصہ گزارے۔ دوسرا قابل علاج ہے، اس کا علاج ذکر فرمایا ہے۔ سید صاحب فرماتے ہیں:

''اور جو کچھ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نماز میں سامانِ لشکر کی تدبیر کیا کرتے تھے، سو اس قصے سے مغرور ہو کر اپنی نماز کو تباہ نہ کرنا چاہیے۔ ؎

کارِ پاکاں را قیاس از خود مگیر
گرچہ ماند در نوشتن شیر و شِیر[2]

حضرت خضر علیہ السلام کے لیے کشتی توڑنے اور بے گناہ بچے کو مار ڈالنے میں بڑا ثواب تھا اور دوسروں کے لیے نہایت درجے کا گناہ ہے۔ جناب فاروق رضی اللہ عنہ کا وہ درجہ تھا کہ لشکر کی تیاری آپ کی نماز میں خلل نہیں ڈالتی تھی،[3] اس لیے کہ وہ تدبیر اللہ جل شانہ کے الہامات سے آپ رضی اللہ عنہ کے دل میں ڈالی جاتی تھی اور جو شخص خود کسی امر کی تدبیر کی طرف متوجہ ہو، خواہ وہ امر دینی ہو یا دنیاوی، تو یہ صورت بالکل اس کے برخلاف ہے۔ اور جس شخص پر یہ مقام کھل جاتا ہے، وہ جانتا ہے، ہاں بمقتضائے ﴿ظُلُمٰتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ﴾ زنا کے وسوسے سے اپنی بیوی سے مجامعت کا خیال بہتر ہے اور شیخ یا اس جیسے اور بزرگوں کی طرف، خواہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہوں، اپنی ہمت کو لگا دینا، اپنے بیل اور گدھے کی صورت میں مستغرق ہونے سے زیادہ برا ہے، کیونکہ شیخ کا خیال تو تعظیم اور بزرگی کے ساتھ انسان کے دل میں چمٹ جاتا ہے اور بیل اور گدھے کے خیال میں نہ

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١/ ٤٠٨) تعليقاً. مصنف ابن أبي شيبة (٢/ ١٨٦) تغليق التعليق (٢/ ٤٤٨)

[2] نیک لوگوں کے عمل کو اپنے اوپر قیاس نہ کر، اگرچہ شَیر (درندہ) اور شِیر (دودھ) ایک ہی طرح لکھے جاتے ہیں۔

[3] مگر یہ علی الاطلاق صحیح نہیں، بلکہ بعض اوقات اس قسم کے خیالات حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نماز میں بھی خلل ڈال دیتے تھے، چنانچہ ہمام بن حارث روایت کرتے ہیں کہ ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مغرب کی نماز پڑھائی اور قراءت چھوڑ گئے۔ فارغ ہونے کے بعد نمازیوں نے کہا: آپ قراءت چھوڑ گئے ہیں۔ فرمایا: میں ایک تجارتی قافلے کے متعلق سوچ رہا تھا، جسے میں نے مدینے سے رخصت کیا اور شام تک پہنچایا۔ پھر دوبارہ قراءت کے ساتھ نماز پڑھائی اور فرمایا: جس نماز میں قراءت نہیں، وہ نماز نہیں۔ فاروق اعظم سے ثقہ راویوں نے یہ واقعہ مختلف الفاظ سے نقل کیا ہے، جسے حافظ ابن حجر نے مختلف حالات پر محمول کیا ہے۔ (فتح الباری طبع دہلی: ۵/ ۶۳۴) محمد اسحاق، عفي عنه.

تو اس قدر چسپیدگی ہوتی ہے نہ تعظیم، بلکہ حقیر اور ذلیل ہوتا ہے اور غیر کی یہ تعظیم اور بزرگی شرک کی طرف لے جاتی ہے۔ حاصل کلام یہاں وسوسوں کے تفاوت کا بیان کرنا مقصود ہے۔"

اصل کتاب فارسی میں ہے، میں نے بقدرِ ضرورت ترجمہ نقل کر دیا ہے۔

سید صاحب یہاں آنحضرت ﷺ اور بزرگوں کی عظمت اور بزرگی کا ذکر کرتے ہیں، بریلوی مولوی صاحبان نے اسے توہین بنا ڈالا۔ سمجھ الٹ جائے تو اس کا کوئی علاج نہیں۔ ومن يضلل فلا هادي له!

اس امر پر تمام مسلمان متفق ہیں کہ نماز خشوع اور إنابت سے ادا کرنی چاہیے۔ وسوسے اور خیالات نماز میں نقصان پیدا کرتے ہیں۔ یہی مسئلہ سید صاحب رحمہ اللہ نے ذکر فرمایا۔ سید صاحب رحمہ اللہ نے اس کی وضاحت فرمائی کہ ردّی اور حقیر چیزوں کا خیال اس لیے زیادہ مضر نہیں کہ ان کی کوئی اہمیت نہیں۔ معزز اور محبوب چیزیں زیادہ مضر ہیں کہ ان کی عزت اور محبت دل پر غالب ہوتی ہے۔ آپ ان بریلوی علمائے کرام سے فرمائیں کہ ان کے ہاں کیا صورت ہوگی، کیا گاؤ وخر کے تصور سے نماز میں صرف نقص پیدا ہوگا اور بزرگوں کے تصور سے نماز پر کوئی اثر نہیں پڑے گا یا بریلوی حضرات خشوع کی نماز میں ضرورت ہی نہیں سمجھتے؟ آپ کے ہاں کافر، مشرک، یہودی، عیسائی، مجوسی کے تصور میں فرق نہیں، سب یکساں ہیں۔ آپ کے سوال کے آخری حصے سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کے ہاں کوئی چارہ ہی نہیں۔ بہر حال سید صاحب رحمہ اللہ نماز میں خشوع ضروری سمجھتے ہیں اور خیالات اور وسوسوں کو ناپسند کرتے ہیں۔ وسوسوں میں بھی فرق کرتے ہیں، بعض زیادہ مضر اور بعض کم، اور اس میں مقابلہ آنحضرت ﷺ کی ذاتِ بابرکات اور (معاذ اللہ) گاؤ وخر میں نہیں، بلکہ اچھے اور برے، مُضر وسوسوں میں مقابلہ ہے۔

ایک فقہی نظیر:

ذہن کو صاف کرنے کے لیے میں چاہتا ہوں کہ آپ فقہائے حنفیہ رحمہم اللہ کی ایک دو تصریحات پر غور فرمائیں:

"لَوْ نَظَرَ الْمُصَلِّي إِلَى الْمُصْحَفِ، وَقَرَأَ فَسَدَتْ صَلَاتُهُ لَا إِلَىٰ فَرْجِ امْرَأَةٍ لِشَهْوَةٍ، لِأَنَّ الْأَوَّلَ تَعْلِيمٌ وَتَعَلُّمٌ فِيهَا، لَا الثَّانِي" (الأشباه والنظائر، ص: ۷۷۰)

"اگر نماز پڑھنے والا قرآن میں دیکھ کر پڑھے تو اس کی نماز (احناف کے نزدیک) فاسد ہو جائے گی، کیوں کہ اس میں تعلیم وتعلم ہے، لیکن اگر عورت کی شرم گاہ کو شہوت سے دیکھے تو نماز فاسد نہیں ہوگی۔"

مولوی احمد رضا صاحب لکھتے ہیں:

"اگر عورت کو طلاق رجعی دی تھی، ہنوز عدت نہ گزری۔ یہ نماز میں تھا کہ عورت کی فرجِ داخل پر نظر پڑ گئی اور شہوت پیدا ہوئی، پھر رجعت ہوگئی اور نماز میں فساد نہ آیا۔" (فتاویٰ رضویہ: ۱/ ۶۷)

مولوی صادق صاحب اور دوسرے بریلوی مولوی صاحبان سے دریافت فرمائیں: کیا شرم گاہ قرآن سے افضل

ہے؟ قرآن سے نماز فاسد ہے، شرم گاہ کے ملاحظے سے نماز پر کوئی اثر نہ پڑے۔ شامی اور مراقی الفلاح میں بھی یہ مسئلہ موجود ہے۔[1] جو توجیہ آپ کے بزرگ اس کے لیے کریں گے، اسی قسم کا عذر سید احمد شہید رحمہ اللہ کے لیے بھی ہوگا۔

دوسرا مسئلہ:

قَالَ إِمَامٌ بَعْدَ شَهْرٍ: كُنْتُ مَجُوسِيًا، فَلَا إِعَادَةَ عَلَيْهِ، وَلَوْ قَالَ: صَلَّيْتُ بِغَيْرِ وُضُوءٍ أَوْ فِي ثَوْبٍ نَجِسٍ، أَعَادُوا، إِنْ كَانَ مُتَيَقِّنًا" (الاشباه، ص: ٧٢٠)

"اگر امام ایک ماہ امامت کے بعد کہتا ہے کہ میں مجوسی تھا، مقتدی کو نماز لوٹانے کی ضرورت نہیں، لیکن اگر امام کہے کہ میں نے بے وضو یا پلید کپڑے میں نماز پڑھائی ہے تو بصورتِ یقین بے وضو نماز لوٹانی پڑے گی۔"

اب اگر آپ پر یہ الزام لگایا جائے کہ آپ مجوسی آتش پرست کو بے وضو مسلمان سے بہتر سمجھتے ہیں، آپ اسے پسند کریں گے؟ اگر یہاں فقہا رحمہم اللہ کی توجیہات صحیح سمجھی جا سکتی ہیں تو سید احمد صاحب رحمہ اللہ کے ارشاد کی بھی توجیہ ہوسکتی ہے۔ آپ اپنے علما سے دریافت فرمائیں۔ مجھے خطرہ ہے، اگر آپ نے مسائل میں تحقیق شروع کی تو محلے میں آپ کا مقاطعہ کرایا جائے گا اور مسجد میں آپ کا داخلہ بند ہو جائے گا۔

ہم جس طرح ائمہ اربعہ اور فقہائے مذاہب کو اپنا بزرگ سمجھتے ہیں، ان کے علوم سے فائدہ اٹھاتے ہیں، اسی طرح سید احمد شہید رحمہ اللہ اور مولانا عبدالحی صاحب رحمہ اللہ کو بھی باوجود حنفی ہونے کے اپنا بزرگ اور عالم سمجھتے ہیں، ان کی جو باتیں قرآن و حدیث اور مصالح کے مطابق ہوں، انھیں قبول کرتے ہیں۔ جو سمجھ میں نہ آئیں، انھیں نظر انداز کر دیتے ہیں، لیکن ان کو برا بھلا نہیں کہتے، نہ ان کو انبیا کی طرح واجب الاطاعۃ جانتے ہیں۔

﴿رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ [الحشر: ٥٩]

میں آخر میں آپ کا پھر شکر گزار ہوں کہ آپ نے تحقیق کرنے کی جرأت فرمائی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

3- ملاقات کے وقت دست و پابوسی کی شرعی حیثیت:

سوال بزرگوں کے دست و پابوسی کی شرعی حیثیت کیا ہے؟[2]

---

[1] رد المحتار (١/ ٦٢٩) مراقي الفلاح (ص: ١٥٢)

[2] ہفت روزہ "الاعتصام" لاہور (۴/ دسمبر ۱۹۵۳ء)

جواب محترم زادمجدکم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

مکتوب جوابی ملا۔ سوال کسی قدر تفصیل طلب ہے، اس لیے کارڈ کے بجائے ملفوف لکھ رہا ہوں۔ امید ہے گزارشات پر ہر فرقہ نوازی سے بچ کر انصاف پسندی سے غور کیا جائے گا۔

1 اصل مسئلے پر غور کرنے سے پہلے ایک قاعدہ سمجھ لیجیے کہ اسلام زندگی کا ایک مکمل نظام ہے، جس کی تکمیل آنحضرت ﷺ کے قول، فعل اور سنت سے قریباً ۲۳ سال میں ہوئی۔ آپ کسی معاملے کو اس کے پس منظر اور عوامل سے الگ کر کے اس سے استنباط یا اس پر عمل کی کوشش فرمائیں گے، تو بہت ممکن ہے کہ مقاصدِ دینی سے انحراف کے مترادف ہو۔ اعمال میں اباحت، استحباب یا سنت کا فیصلہ کرنے سے پہلے آنحضرت ﷺ کے ۲۳ سال کا عمل اور عام طریقۂ زندگی نظر انداز نہیں کیا جائے گا، ورنہ اسلام ایک کھیل بن جائے گا اور یہ جزدی مباحث ختم ہونے میں نہیں آئیں گے، اور ایسی چیزیں آپ کے سامنے آئیں گی، جن پر عمل کرنا آپ کے لیے ناممکن ہوگا۔

2 اب اصل سوال پر غور فرمایئے! ہاتھ اور پاؤں چومنے کا واقعہ پوری عمر میں آنحضرت ﷺ کو دو دفعہ پیش آیا۔

ایک دفعہ چند یہودیوں نے آنحضرت ﷺ سے امتحان کے طور پر بعض سوالات دریافت کیے اور جوابات کو خلاف توقع صحیح پا کر آنحضرت ﷺ کے ہاتھ اور پاؤں چوم لیے۔ اسے امام ترمذی نے اپنی جامع میں ذکر فرمایا ہے۔[1] (تحفة الأحوذي: ٣/ ٤٠٠)

دوسرا واقعہ وفد عبد القیس کا ہے۔ وہ نو مسلم ہو کر ملاقات کے لیے تشریف لائے تو انھوں نے آنحضرت ﷺ کے ہاتھ اور پاؤں کو بوسہ دیا۔[2] (أبو داود)

ممکن ہے تلاش سے ایک آدھ واقعہ اور بھی دستیاب ہو جائے۔[3] اس واقعہ سے نہ اس فعل کا استحباب ثابت ہوتا ہے نہ وجوب۔ زیادہ سے زیادہ جو چیز ثابت ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ یہود اور ناواقف نومسلموں نے ایسا کیا، اس پر آنحضرت ﷺ خاموش رہے۔ عام طور پر صحابہ کی یہ عادت نہ تھی۔ ہاتھوں کے بوسے کا ذکر تو بعض صحابہ رضی اللہ عنہم سے ملتا ہے۔[4] لیکن پاؤں چومنے کی عادت قطعاً نہ تھی۔

---

① سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٧٣٣، ٣١٤٤) سنن النسائي، رقم الحديث (٤٠٧٨)

② سنن أبي داود، رقم الحديث (٥٢٢٥) اس کی سند میں اُم ابان بنت وازع مجہول ہے۔

③ دیکھیں: التلخيص الحبير (٤/ ٩٣) ایک واقعہ میں صحابہ کرام کے نبی کریم ﷺ کے ہاتھ پاؤں کو بوسہ دینے کا ذکر ملتا ہے۔ سنن أبي داود رقم الحديث (٢٦٤٧) لیکن اس کی سند بھی یزید بن ابی زیاد کی وجہ سے ضعیف ہے۔

④ دیکھیں: الأدب المفرد (ص: ٣٣٨) سنن البيهقي (٧/ ١٠١) نصب الراية (٤/ ٣٢٤) فتح الباري (١١/ ٥٦) السلسلة الصحيحة (١/ ٢٩٨)

3 پھر پاؤں چومنے کے یہ دو واقعے صرف آنحضرت ﷺ کو پیش آئے۔ باقی عام صحابہ رضی اللہ عنہم نے آپس میں کبھی ایسا نہیں کیا۔ میری نظر میں تو ایک واقعہ بھی ایسا نہیں، جس میں آنحضرت ﷺ کے سوا کسی صحابی نے دوسرے کے پاؤں چومے ہوں، اسی بنا پر علامہ شاطبی رحمہ اللہ نے ایک توجیہ میں اسے آنحضرت ﷺ کی خصوصیت فرمایا ہے:

"أحدهما: أن يعتقدوا فيه الاختصاص، ومرتبة النبوة تسع فيها ذلك كله للقطع بوجود الالتماس من الخير والبركة... إلى أن قال: بخلاف غيره من الأمة، وإن حصل له من نور الاقتداء به والاهتداء بهديه ما شاء الله إلا أنه لا يبلغ مبلغه على حال توازيه في مرتبته، ولا تقاربه، فصار هذا النوع مختصاً به..." (الاعتصام للشاطبي: ٣/ ١٣٦)

"یعنی ایسی تعظیم آنحضرت ﷺ کی خصوصیت تھی، کیونکہ مقامِ نبوت میں ایسی خیر و برکت کی گنجایش ہے، دوسرے آدمی کو آپ کی اقتدا سے گو کچھ برتری حاصل ہو جائے، مگر وہ اس مرتبے کے قریب بھی نہیں جا سکتا، اس لیے یہ آپ ﷺ کی عادت تھی کہ صحابہ کے ساتھ برابر بیٹھتے، چنانچہ بعض اوقات اجنبی آدمی کو حضرت کی پہچان میں دقت ہوتی اور اسے دریافت کرنا پڑتا۔"

4 یہودی اور اس اجنبی وفد نے جو کچھ کیا، آنحضرت ﷺ نے اسے روکا نہیں، بلکہ خاموش رہے، لیکن کبار صحابہ جیسے عشرہ مبشرہ یا اصحابِ بدر رضی اللہ عنہم میں سے کسی نے آپ ﷺ کے پاؤں کو کبھی بوسہ نہیں دیا، اس سے ظاہر ہے کہ اگر یہ مستحسن ہوتا تو صحابہ عام طور پر اس پر عمل فرماتے، آنحضرت ﷺ اس کی تلقین فرماتے، امت میں تواتر سے اس کا رواج اور عمل ہوتا، حالانکہ معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین، تبع تابعین، ائمہ رحمہم اللہ کسی سے بھی یہ ثابت نہیں کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کے پاؤں کو بوسہ دیتے ہوں۔

5 اس کی وجہ صرف اسی قدر معلوم ہوتی ہے کہ اگر کوئی ناواقف شخص ایسا فعل کرے اور مصلحتاً کوئی عالم یا بزرگ اس پر خاموش رہے تو یہ خاموشی جرم نہیں۔ نو مسلم اور نو وارد وفود کو اگر اس طرح ٹوکا جائے تو ان میں تنگ دلی پیدا ہونے کا خطرہ ہوسکتا ہے، اس لیے مناسب ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو بتدریج تعلیم دی جائے، مگر ظاہر ہے کہ ایسے اعمال میں شریعت کا رجحان ناپسندیدگی کی طرف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے امور نہ صحابہ رضی اللہ عنہم اور نہ ائمہ میں قابلِ عمل قرار پائے نہ امت میں ان پر تعامل ہوا۔ اگر اس باب میں تھوڑی سی رخصت دی جائے تو عامۃ الناس اس میں غلو شروع کر دیتے ہیں۔ امام شاطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"ولأن العامة لا تقتصر في ذلك علىٰ حد، بل تتجاوز فيه الحدود، وتبالغ

بجهلها في التماس البركة..." (الاعتصام: ۳/ ۱۳۷)

"یعنی عوام ایسے معاملات میں غلو شروع کر دیتے ہیں اور جائز حد سے گزر جاتے ہیں، اس لیے ذریعے کے طور پر یہ امور ممنوع قرار پائے اور اس وقت بھی نادرست اور ممنوع ہیں۔"

6 مذکورہ دونوں احادیث جو ہاتھ چومنے کے متعلق ہیں، ایک میں یہ عمل یہودیوں نے کیا، حالانکہ وہ آنحضرت ﷺ کو نبی سمجھتے تھے نہ آپ ﷺ کا احترام کرتے تھے، انھوں نے آنحضرت ﷺ کے جوابات کی صحت کا اقرار کیا یا آنحضرت ﷺ کی نبوت کو بھی صحیح سمجھا، مگر انھیں ایمان نصیب نہیں ہوا، اس لیے ان کے اس فعل کے بارے میں آنحضرت ﷺ یہ سمجھتے تھے کہ یہ تعظیم منافقانہ ہے، لہٰذا ان کی کوئی پروا نہیں کی اور صحابہ نے کبھی آرزو نہیں کی کہ وہ ان منافق یہودیوں کی طرح آنحضرت ﷺ کی تعظیم کریں۔

دوسرا واقعہ ان ناواقف لوگوں کا ہے، جو قبیلہ عبد القیس سے تعلق رکھتے تھے اور نو مسلم تھے۔

تعجب ہے یہود اور نو مسلموں کے اس فعل سے استدلال فرمایا جا رہا ہے، جو عمر میں ایک ایک دفعہ ان کو پیش آیا اور آنحضرت ﷺ نے بھی اس پر پسندیدگی کا اظہار نہیں فرمایا، بلکہ مصلحتاً خاموش رہے اور کبار صحابہ اور آنحضرت ﷺ کا طریقِ عمل جو مدت العمر رہا، اس کی طرف توجہ نہیں دی جاتی۔ آنحضرت ﷺ نے اہلِ فارس کے قیامِ تعظیم کو بھی ناپسند فرمایا۔ ارشاد ہے:

«لَا تَقُوْمُوْا كَمَا تَقُوْمُ الْأَعَاجِمُ»[1]

عجمی اپنے امرا اور بزرگوں کے لیے کئی کئی دفعہ قیام کرتے، جب بھی وہ کھڑے ہوتے، یہ بیچارے قیام کرتے اور یہ واقعہ دن میں کئی کئی دفعہ پیش آتا۔ آنحضرت ﷺ نے اس سے سختی کے ساتھ منع فرمایا، نیز جو اس قیام کو پسند کرے، اسے جہنم کا مستحق قرار دیا:

«مَنْ أَحَبَّ أَنْ يَتَمَثَّلَ لَهُ النَّاسُ قِيَامًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ»[2] (مشکوۃ)

"جو شخص پسند کرے کہ لوگ اس کے لیے سرو قد کھڑے ہوں، اسے اپنا مقام جہنم میں سمجھنا چاہیے۔"

صرف قیامِ استقبال کی اجازت مرحمت فرمائی، جو خود آنحضرت ﷺ اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا معمول تھا،

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (۵۲۳۰) اس کی سند میں ابو مرزوق ضعیف اور بعض دیگر علل ہیں، جن کی بنا پر یہ حدیث ضعیف ہے، البتہ اس معنی میں یہ حدیث صحیح ہے: «ما كان شخص في الدنيا أحب إليهم رؤية من رسول الله ﷺ، وكانوا لا يقومون له لما يعلمون من كراهيته لذلك» (سنن الترمذي، رقم الحديث (۲۷۵٤) نیز دیکھیں: صحيح مسلم، رقم الحديث (٤١٣)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (۵۲۲۹) سنن الترمذي، رقم الحديث (۲۷۵۵) مشكاة المصابيح (۳/ ۱۷)

جیسا کہ سنت سے ظاہر ہے۔[1] آنحضرت ﷺ کی عام زندگی، جس میں اس قدر انکساری اور تواضع موجود ہے، اس کو دیکھتے ہوئے یہ کیسے سمجھ لیا جائے کہ آنحضرت ﷺ پابوسی پسند فرماتے تھے؟!

7 آنحضرت ﷺ کی سیرت سے آپ کو معلوم ہوگا کہ آپ ﷺ اپنے گھر میں ڈول اور جوتے تک کو پیوند لگایا کرتے تھے،[2] وہ اپنی ذات کو پابوسی کے لیے کیونکر پیش فرما سکتے تھے؟ صحابہ فرماتے ہیں، آنحضرت ﷺ اپنے رفقا میں اس طرح رہتے تھے، جیسے ان میں سے ایک ہوں۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آپ کی سیرت کے متعلق فرمایا:

"وَاللّٰهِ مَا يُخْزِيْكَ اللّٰهُ أَبَداً، إِنَّكَ لَتَحْمِلُ الْكَلَّ، وَتَقْرِي الضَّيْفَ، وَتَكْسِبُ الْمَعْدُوْمَ، وَتُعِيْنُ عَلٰى نَوَائِبِ الْحَقِّ"[3] (بخاری)

''اللہ تعالیٰ آپ کو ضائع نہیں فرمائے گا۔ آپ غیروں کے لیے دکھ اٹھاتے ہیں، مہمانوں کی تواضع کرتے ہیں، نادار لوگوں کو کما کر دیتے ہیں اور حق کی راہ میں مصائب برداشت فرماتے ہیں۔''

جو لوگ پابوسی کے خواہش مند ہوں یا اسے پسند کرتے ہوں، وہ اتنا ایثار اور قربانی کہاں کر سکتے ہیں؟

8 اگر استدلال کا یہ طریق پسند کر لیا جائے اور آنحضرت ﷺ کی زندگی کے اتفاقات اور نوادر کو سنت یا استحباب کا مرتبہ دینے کا فیصلہ کر لیا جائے تو بڑی مشکل پیش آئے گی۔ احادیث میں ایسے واقعات ملتے ہیں کہ بعض اوقات آنحضرت ﷺ کا خون بہہ گیا، چنانچہ مالک بن سنان نے اُحد کے دن آنحضرت ﷺ کے زخم کا خون چوس کر پی لیا۔[4] اسی طرح ایک دن آنحضرت ﷺ نے سنگی لگوائی اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سنگی سے نکلا ہوا خون پی گئے۔[5] (شفا قاضی عیاض: ۱/ ۱۴۱)

قاضی عیاض فرماتے ہیں: "ولم ينكر عليه" آنحضرت ﷺ نے خون پینے کو برا نہ سمجھا۔

کیا ہمارے دوست جو قدم بوسی کرانے کے لیے بے قرار رہتے ہیں، اپنے احباب کو خون عطا فرمانے کے لیے بھی تیار ہوں گے؟ کیا خانقاہی نظام آنحضرت ﷺ اور صحابہ کے اِن اعمال پر غور کرے گا؟ آج تک تو یہ اتفاقات اور نوادر ان بزرگوں کی نظر سے غائب ہی رہے!!

---

1. سنن أبي داود، رقم الحديث (٥٢١٧) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٨٧٢)
2. مسند أحمد (٦/ ١٢١)
3. صحيح البخاري، رقم الحديث (٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٠)
4. سنن سعيد بن منصور (٢/ ٢٢١) یہ حدیث منقطع ہے۔ دیکھیں: التلخيص الحبير (١/ ٣١)
5. مسند البزار، رقم الحديث (٢٢١٠) اس کی سند میں ہنید بن قاسم مجہول ہے۔ بعض دیگر اسانید سے بھی یہ حدیث مروی ہے، لیکن ان کے طرق میں بھی ضعف اور جہالتِ رواۃ ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: البدر المنير لابن الملقن (١/ ٤٧٦)

9 صلح حدیبیہ کے وقت جب کفار کے نمایندے نے آنحضرت ﷺ سے کہا: "إني أریٰ وجوهاً منكرة" یعنی یہ مختلف قبائل کے آدمی جنگ میں آپ کے کام نہیں آسکیں گے۔ تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے آنحضرت ﷺ کے وضو کا پانی اور گلے کا بلغم ہاتھوں ہاتھ لے لیا اور بدن پر مل لیا، چنانچہ عروہ بن مسعود ثقفی یہ دیکھ کر بہت متاثر ہوئے اور کہا کہ میں نے کسریٰ اور قیصر کے دربار دیکھے ہیں، میں نے وہاں کے درباریوں کو اپنے بادشاہوں کا اتنا عقیدت مند نہیں پایا، جس قدر آنحضرت ﷺ کے ساتھی آپ ﷺ کی عزت کرتے ہیں۔[1]

یہ اتفاق ہوا اور ایک دفعہ ہوا، جسے مصلحتاً برداشت کیا گیا، اس سے یہ استدلال صحیح نہیں ہوگا کہ حضرات مریدین اپنے پیر صاحبان کے ناک اور گلے کا بلغم چاٹنا شروع کر دیں اور اسے عزت سے تعبیر کریں!!

قاضی عیاض فرماتے ہیں:

"وقد روي نحو هذا في امرأة شربت بوله، فقال: لن تشتكي وجع بطنك أبدا"[2]

(صححه الدارقطني، شفا: ۱/ ۱۴۱)

"ایک عورت نے آنحضرت ﷺ کا پیشاب پی لیا، آنحضرت ﷺ نے فرمایا: تمھیں پیٹ کا درد نہیں ہوگا۔"

بعض نے اس عورت کا نام ام ایمن بتایا ہے اور بعض نے کچھ اور۔ ان روایات میں (بشرطیکہ یہ صحیح بھی ہوں) جن نادر واقعات کا ذکر آیا ہے، یہ محض اتفاق ہے۔ کوئی عقلمند بھی اس سے یہ استدلال نہیں کرے گا کہ بزرگوں کا پیشاب پینا سنت ہے۔ ہمارے بریلوی دوستوں کی روش اس معاملے میں بہت غلط ہے اور جذبات بے حد رکیک۔ مجھے خدشہ ہوتا ہے کہ کوئی صاحب پیشاب پر قیاس کر کے پاخانے کی اِباحت کا دعویٰ نہ کر دے!!

آنحضرت ﷺ کے فضلات پاک ہوں یا پلید، ان کے استعمال کی عادت کا کہیں ثبوت نہیں ملتا۔ صحابہ، تابعین، ائمہ اربعہ رحمہم اللہ میں کوئی بھی ان فضلات کا استعمال مستحب نہیں سمجھتا۔ یہی حال قدم بوسی کا ہے۔ جو اتفاقاً پیش آ گیا، اس سے اس کے مسنون یا مباح ہونے کا استدلال کرنا جہالت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو سوء فہم اور غلو فی الدین سے بچائے اور حق بات کو سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

4- حدیث «لَوْلَاکَ لَمَا خَلَقْتُ الْأَفْلَاکَ» کا جائزہ:[3]

سوال اخبار گہر بار "الاعتصام" (مجریہ ۷/ مارچ ۱۹۵۲ء) میں ایک مضمون جناب مولانا عبدالقیوم صاحب ندوی

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (۲۵۸۱)

[2] المستدرك (٤/ ٧٠) المعجم الكبير (۲۵/ ۸۹) اس کی سند میں ایک راوی ابو مالک ضعیف اور سند منقطع ہے۔ دیکھیں: التلخيص الحبير (۱/ ۳۱) السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (۱۱۸۲)

[3] ہفت روزہ "الاعتصام" لاہور (۱۶/ مئی ۱۹۵۲ء)

کا بعنوان ''حقوق العباد'' شائع ہوا ہے۔ اکثر و بیشتر مختلف عنوانات سے فاضل مضمون نگار کے مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں، جو ممدوح کی نیک نیتی، اخلاص اور جذبہ خدمتِ دین کے روشن و بین ثبوت ہیں۔ اللہ تعالیٰ فاضل ممدوح کے نیک کاموں اور ان کے نیک ارادوں کی بہتر جزا دے اور خدمتِ دینِ متین کی زیادہ سے زیادہ توفیق بخشے۔ آمین

متذکرہ بالا مضمون میں رسول اللہ ﷺ کے حقوق سے متعلق جو یہ جملہ استعمال فرمایا گیا ہے کہ ''آپ کے حقوق مخلوقات میں سب سے زیادہ ہیں کہ آپ ﷺ ہی کائنات کی پیدائش کی وجہ ہیں۔''

تحقیق طلب ہے کہ آیا یہ جملہ کسی صحیح حدیث کا ترجمہ ہے یا صرف مسلمانوں کے ایک فرقے میں مشہور اور زبان زد ہونے کی وجہ سے استعمال کر لیا گیا ہے؟ اگر واقعتاً اس کی کوئی حقیقت ہے تو صحتِ روایت کی تحقیق سے محقق فرمایا جائے (پھر سر تسلیم خم ہے) ورنہ ''الاعتصام'' میں اس قسم کے غیر صحیح عقائد کا چھپنا اور اس پر کوئی نوٹ نہ دیا جانا بلاشبہ محلِ شبہ ہے اور معیار ''الاعتصام'' کے خلاف بھی۔ جب ''الاعتصام'' مسلکِ اہلِ حدیث کا داعی اور ترجمان ہے تو ادارہ ''الاعتصام'' کو شائع ہونے والے مضامین پر ایک نظر دوڑا لینی چاہیے، تاکہ معلوم ہو جائے کہ اس مضمون میں کون سی بات مسلکِ اہلِ حدیث سے کھٹکی ہوئی ہے۔ آزادیِ تحریر کے یہ معنی تو نہیں ہونے چاہئیں کہ ہر مضمون کو ''الاعتصام'' میں بغیر تنقید و نوٹ کے جگہ دے دی جائے، خواہ وہ مضمون کسی عقیدے سے تعلق رکھتا ہو؟ (خاکسار ایم، آر خاں پٹنہ، انڈیا، خریدار: ۵٦۵)

جواب مولانا عبدالقیوم صاحب ندوی کے مضمون میں یہ فقرہ «لَوْلَاكَ لَمَا خَلَقْتُ الْأَفْلَاكَ» کا ترجمہ ہے۔ اصولِ محدثین کے مطابق یہ حدیث صحیح نہیں۔ بلکہ صحیح تر یہ ہے کہ یہ اقرب إلی الوضع ہے۔ قال العلامة محمد طاهر في التذكرة:

"لَوْلَاكَ لَمَا خَلَقْتُ الْأَفْلَاكَ. قَالَ الصغانِيُ: موضوع" (ص:٨٦)

بعض حضرات کا خیال ہے کہ حدیث بلحاظ تحقیقِ محدثین تو ثابت نہیں ہے، لیکن اس کا مضمون صحیح ہے۔[1] یہ خیال فن سے الگ ہے۔ معلوم نہیں مولانا عبدالقیوم ندوی نے اسے بلاتفصیل کیوں لکھ دیا اور ادارہ الاعتصام نے کیوں اسے چھپنے دیا؟!

---

[1] اگر اس آیت کریمہ: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ﴾ [الذاريات: ٥٦] کو دیکھا جائے تو بلحاظ مضمون بھی یہ موضوع روایت درست معلوم نہیں ہوتی۔ نیز دیکھیں: الفوائد المجموعة (ص: ٣٢٦) السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٢٨٢)

5,6,7,8,9۔ حضور ﷺ کا دنیا میں تشریف لانا اور بعض مبتدعانہ خیالات:[1]

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیانِ شرع متین ان مسائل کے بارے میں:

① بعض علمائے دیوبند فرماتے ہیں کہ میرے درس میں حضور ﷺ تشریف فرما ہوتے ہیں اور فرماتے ہیں: ”صَدَقْتَ صَدَقْتَ“ مجھے کسی کے درس میں لطف نہیں آتا، صرف تمھارے درس میں مزہ آتا ہے۔ کیا حضور ﷺ واقعی دنیا میں آتے ہیں اور درس سنتے ہیں؟

② علمائے اہلِ حدیث میں سے ایک صاحب فرماتے ہیں کہ ایک دن حضور ﷺ میری بیٹھک میں تشریف لائے، اس وقت میں جاگتا تھا اور کتاب لکھ رہا تھا۔ کیا یہ صحیح ہے؟ حضور ﷺ مولویوں کے گھر تشریف لاتے ہیں؟

③ علمائے دیوبند راوی ہیں کہ بعض بزرگ مر گئے، مگر مرنے کے بعد کھڑ کھڑا کر آئے اور ایک بزرگ بعد از مرگ بولے: احمد علی! کیا یہ ممکن ہے؟ مردہ بول سکتا ہے یا ہنس سکتا ہے؟

④ درودِ تاج پڑھنا جائز ہے یا یہ شرک والا درود ہے؟ ایک اہلِ حدیث مولوی صاحب نے بتایا کہ جائز ہے، کوئی حرج نہیں۔ اس میں خاص باتیں یہ ہیں: حضور پرنور ﷺ مانع بلا، وبا، الم، قحط و مرض ہیں۔ یہ قرآن کے خلاف ہے۔ یہ صفتیں خدا کی ہیں۔ حضور ﷺ میں نہ تھیں۔

⑤ آزر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے باپ تھے یا چچا؟ ایک اہلِ حدیث مولوی صاحب چچا بیان کرتے ہیں۔

جواب آپ کے سوالات کے متعلق کچھ عرض کرنا مشکل ہے، اس لحاظ سے نہیں کہ سوالات میں کوئی خاص اِشکال ہے، صرف اس لیے کہ عوام میں اہلِ توحید و سنت کے متعلق مغالطہ پیدا کیا گیا ہے کہ یہ لوگ نہ تصوف سے آشنا ہیں، نہ کرامات کے قائل ہیں، نہ اہلِ توحید میں کوئی دلی ہوا ہے، اور بعینہ یہ خیال یہ لوگ حضرات اکابر دیوبند کے متعلق رکھتے ہیں۔ یہ سب تعصب کی کارفرمائی ہے۔ حقیقت ہو یا نہ ہو، ایک دوسرے پر طعن علما کی بھی عادت سی ہوگئی ہے، اس عادت سے شاید ہی علما کا کوئی طبقہ محفوظ ہو، اس کا لازمی اثر ہے کہ ایسے حضرات اپنے منہ سے اپنی تعریف کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ عوام کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے مبالغہ آمیزی شروع ہو جاتی ہے۔ قرآنِ عزیز نے ایسے لوگوں کی مذمت فرمائی ہے، جو دوسروں سے اپنی تعریف سننا پسند کریں: ﴿ يُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا ﴾ [آل عمران: ۱۸۸]

لیکن یہاں یہ حال ہے کہ اپنے ہی منہ سے اپنی تعریف شروع کر دیتے ہیں، حالانکہ قرآنِ عزیز نے

[1] ہفت روزہ ”الاعتصام“ لاہور (۱۲؍ جنوری ۱۹۲۸ء)

صراحتاً اس سے منع فرمایا ہے:

﴿ فَلَا تُزَكُّوا أَنفُسَكُمْ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقَى ﴾ [النجم: ٣٢]

''اپنے منہ سے اپنی تعریف نہ کرو، اللہ تعالیٰ اہلِ تقویٰ کو خوب جانتا ہے۔''

جہاں تک مجھے معلوم ہے، دیوبند کے اکابر میں یہ عادت نہ تھی، لیکن اب نئے حضرات اس میدان میں اتر رہے ہیں۔ وہ درس و تدریس کے ساتھ بیعت و ارادت کا کام بھی کرتے ہیں اور یہ سارا کام کاروباری انداز سے ہوتا ہے۔ فإلیٰ اللہ المشتکیٰ. گویا اللہ تعالیٰ اور آنحضرت ﷺ، فداہ ابی و امی، بھی ان حضرات کے کاروبار کا سرمایہ ہیں۔ إنا للہ و إنا إلیہ راجعون!

① جہاں تک آپ کے پہلے سوال کا تعلق ہے تو آنحضرت ﷺ بجسدہ الاطہر اس دنیا میں تشریف نہیں لاتے، نہ وہ ہر مقام پر حاضر و ناظر ہیں، نہ ان کو دنیوی زندگی حاصل ہے۔ برزخی زندگی کی شرعاً یہ نوعیت نہیں کہ اس دنیا سے قطع تعلق کے بعد پھر وہ اس دنیا میں آئیں اور ان حضرات کے مواعظ اور دروس سنیں، جن کے علم کی حیثیت آنحضرت ﷺ کے علم کے سامنے پرکاہ کے برابر بھی نہیں۔

آنحضرت ﷺ علمِ نبوت کی وجہ سے ان نظری بلکہ وہمی علوم سے قطعی بے نیاز ہیں، پھر آنحضرت ﷺ ان دروس سے کیوں استفادہ فرمائیں؟ پھر ان کی تصدیق فرمائیں اور تصدیق کی آواز بھی یہی حضرات حاضرین کے کان تک پہنچائیں۔ عجیب معاملہ ہے۔ اگر آنحضرت ﷺ کی اس دنیا میں واپسی کا ذرہ بھر بھی امکان ہوتا یا آپ ﷺ ۔فداہ روحی۔ اس معاملے میں کسی خدائی قانون کے پابند نہ ہوتے تو واقعہ حرہ میں ضرور تشریف لاتے اور اس سانحہ کو روک لیتے۔ سقیفہ بنو ساعدہ میں تشریف لا کر خلافت کا فیصلہ بذاتِ خود فرماتے۔ واقعہ کربلا کو ناممکن بنا دیتے۔ مختار ثقفی کا فتنہ قطعاً نمودار نہ ہو سکتا۔ حجاج بن یوسف کے مظالم کا کوئی امکان ہی نہ رہتا۔

اگر وعظ و نصیحت سننا ہی حضرت کا مقصود ہوتا تو حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی رضی اللہ عنہم کے خطبات ضرور سنتے اور ''صَدَقْتَ'' اور ''مرحبا'' کی سند عطا فرماتے۔ حضرات ائمہ اربعہ رحمہم اللہ کی فقہوں میں اختلافی مسائل میں بذاتِ خود فیصلہ فرما کر اختلافات ختم فرما دیتے۔ امام بخاری رحمہ اللہ اور دوسرے ائمہ حدیث کو حدیث کے صحت و سقم کے متعلق براہِ راست ہدایات فرماتے اور نتیجتاً نہ علمِ جرح و تعدیل کی ضرورت ہوتی نہ اصولِ حدیث اور اصولِ فقہ کے ان اَسفار و دفاتر کی ضرورت باقی رہتی!!

حافظ ابن جوزی، شیخ عبد القادر حنبلی، جنید، شبلی رحمہم اللہ اور دیگر اکابر ائمہ تصوف سے ملتے یا یہ حضرات آنحضرت ﷺ سے ملتے اور یہ حضرات اپنی تصانیف اور ملفوظات میں ان ملاقاتوں کا تذکرہ ضرور فرماتے، مگر ان مقدس بزرگوں سے ایسی کوئی شیخی منقول نہیں۔

وائے بر ایں دعوائے اسلام و دیں بود بے شبلی و نہ جنید ایں چنیں[1]

ظاہر ہے کہ آنحضرت ﷺ کی اس طرح تشریف آوری کا شرعاً کوئی ثبوت نہیں۔ ابن قیم رحمہ اللہ کی کتاب "الروح" اور حافظ سیوطی رحمہ اللہ کی "شرح الصدور" شیخ عبدالحق کی "مدارج النبوۃ" اور "مواهبِ لدنیہ" وغیرہ میں بعض بزرگوں کے متعلق اس سے ملتی جلتی کہانیاں مرقوم ہیں، لیکن یہ قصے شرعی حجت نہیں۔ گذشتہ ایام میں جب آنحضرت ﷺ کی حیات یا موت کی بحث احبابِ دیوبند میں چھڑی تھی تو مدعیانِ حیات کا انحصار حضراتِ دیوبند کی ایسی ہی بعض تحریرات پر تھا۔ معلوم ہے کہ اس قدر اہم اعتقادی مسئلے کے لیے یہ کہانیاں مفید نہیں ہوسکتیں۔ تصوف قدیم اور ائمہ سنت کے ارشادات میں آنحضرت ﷺ کی اس طرح کی زندگی کا قطعی پتا نہیں چلتا اور نہ کسی وعظ میں آنحضرت ﷺ تشریف لائے، نہ درس سن کر "صَدَقْتَ" کی سند عطا فرمائی!

تصوف جدید میں (جس کا رواج اب دنیائے دیوبند میں عام ہو رہا ہے اور جا بجا بیعت کی دکانیں جمائی جا رہی ہیں) ایسی باتیں سننے میں آ رہی ہیں۔ اگر کوئی مثال یا کشفی صورت نظر بھی آ جائے تو ان میں اچھے لوگ اسے عوام کے سامنے ذکر نہیں کرتے اور نہ اس ریا و سمعہ سے اپنی دکان کو رونق دینے کی کوشش کرتے ہیں، اس لیے کہ یہ چیزیں ظنی ہیں، ان میں شیطانی وسوسوں کا کافی حد تک اِمکان ہے۔

② اگر کسی نام کے اہلِ حدیث کو بھی اسی قسم کا جنون سمایا ہے تو اسے دماغی ہسپتال بھجوانے کی کوشش کیجیے، تاکہ نہ خود برباد ہو اور نہ دوسروں کو تباہ کرنے کی کوشش کرے۔ اس قسم کے قصے بعض خوابوں کی صورت میں بعض حضرات سے منقول ہیں، لیکن خواب شرعی حجت نہیں، البتہ یہ ممکن ضرور ہے کہ کوئی بزرگ خواب میں نظر آئے اور کوئی ہدایت یا نصیحت فرمائے، مگر وہ خواب ہی ہوگا، شرعی دلیل نہ ہوگا۔

③ قرآن اور سنت میں میری ناقص رائے کے مطابق کوئی ایسا واقعہ نہیں ملتا۔ آنحضرت ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم ہمارے لیے اسوہ ہیں۔ مولانا احمد علی مرحوم کے متعلق ان کے ورثا سے دریافت فرمالیں، وہ ہنسے تھے یا نہیں؟ موت کے بعد کچھ فرمایا تھا یا نہیں؟ مرحوم کی قبر سے خوشبو پھیلنے کی بڑی شہرت تھی، وہ بھی گپ ہی ثابت ہوئی۔ جب تک عرقِ گلاب اور عطر کا اثر قائم رہا، جو ان کے عقیدت مندوں نے قبر پر گرایا تھا، خوشبو آتی رہی، وہ عشاق اپنے اپنے مشاغل میں مصروف ہوگئے تو خوشبو جاتی رہی۔ اب مرحوم کے کچھ بے وقوف مرید مرحوم کی قبر پر پھول ڈالتے ہیں اور قبر کے پاس تسبیحات پڑھتے ہیں۔ یہ جہالت ہے۔ مولانا کے ورثا کو چاہیے کہ اس بدعت کو بزور بند کریں۔

مولانا مرحوم کی ابتدائی زندگی بڑی مجاہدانہ تھی، ان کے مواعظ میں سادگی اور توحید نمایاں تھی۔ جوں جوں

---

[1] "اسلام اور دین کے اس دعوے پر افسوس ہے کہ شبلی و جنید کے بغیر یہ کیا ہے۔"

مرحوم جدید تصوف میں پھنستے گئے، وہ رنگ جاتا رہا۔ بریلوی پیروں کی طرح عام دست بوسی اور رسمی آداب مرحوم پر غالب آ گئے، نہ پہلا زہد رہا نہ ہر وعظ میں توحید کا رنگ غالب رہا، تاہم مرحوم کا وجود غنیمت تھا۔ آج کے حضراتِ دیوبند تو روز بروز بریلوی حضرات کے قریب تر ہو رہے ہیں، البتہ مولانا حسین علی کے تلامذہ اس سے کافی حد تک محفوظ ہیں، مگر تصوف مستحدث ان میں بھی راسخ ہو رہا ہے۔

ہمارے سادہ لوح اہلِ حدیث حضرات کو دیوبند کے موحد اور متساہل حضرات میں امتیاز کرنا چاہیے۔ اب ان میں اکثر حضرات رسمی پیری مریدی بطورِ کاروبار کر کے بریلوی حضرات کی طرح خانقاہی نظام کو اپنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ کوشش کرتے ہیں کہ اہلِ حدیث علما سے لوگوں کو متنفر کریں۔ جب بریلوی اور اہلِ حدیث اختلافات کا تذکرہ آئے تو یہ عموماً شرک پسند حضرات کو اہلِ توحید پر ترجیح دیتے ہیں۔ اہلِ کتاب کی طرح ﴿هٰٓؤُلَآءِ اَهۡدٰى مِنَ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا سَبِيۡلًا﴾ [النساء: ۵۱] کہہ کر اپنے دل کو مطمئن کر لیتے ہیں اور شرک پسند حضرات کی خوشنودی حاصل کرتے ہیں۔

دوسری طرف ہمارے سادہ لوح اہلِ حدیث حضرات چونکہ اس نئی پالیسی سے بے خبر ہیں اور وہ پرانے تصورات کے مطابق ان حضرات کی ان کہانیوں اور تزکیہ و توحید کے دعووں سے غلطی کھا کر ان دعاوی کو صحیح سمجھنے لگتے ہیں، بایں ہمہ چند افراد اب بھی احبابِ دیوبند میں ایسے موجود ہیں، جن کے دل میں توحید کے لیے ایک سوز اور تڑپ پائی جاتی ہے، ان کا انداز بھی کاروباری نہیں۔ مجھے احبابِ دیوبند سے حسنِ ظن ہے، ان میں دین کی خدمت اور توحید کا جذبہ کہیں کہیں پایا جاتا ہے، مگر یہ نئی پالیسی جو جدید دنیائے دیوبند میں فروغ پا رہی ہے، اس سے بے خبر نہیں رہنا چاہیے۔ بزرگوں کے متعلق یہ قصے اور کہانیاں، جن کا سائل نے ذکر کیا ہے، اسی جدید پالیسی کا نتیجہ ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ تصوفِ جدید کے بہت بڑے ماہر اور ترجمان ہیں، ان کے ابنائے کرام اور تلامذہ پر بھی یہ ذوق غالب ہے، اس کے باوجود وہ تصوفِ جدید کے رسوم سے متنفر اور خائف ہیں۔ اپنے وصیت نامہ میں وصیت نمبر (۳) کے آخر میں فرماتے ہیں:

''نسبتہائے صوفیہ غنیمت کبریٰ است و رسومِ ایشاں ہیچ نمے ارزد و ایں سخن گراں خواہد بود اما مرد کارے فرمودہ اند بر حسبِ آں مے باید گفت و برگفتہ زید و عمرو تعریج نمے باید کرد''

(ملحقہ عقد المجید، ص: ۱۱۶)

''صوفیہ کی نسبتیں غنیمتِ کبریٰ ہیں، لیکن ان کی (از قسم ایجادِ بندہ) رسم و رواج کی کوئی قیمت نہیں۔ میری یہ تصریح گراں ضرور گزرے گی، مگر جس کام پر مقرر ہوں، اس کے مطابق گفتگو کرنا لازم ہے،

زید وعمرو کی بات کا کچھ اعتبار نہیں۔"

اسی وصیت نمبر (۳) کے شروع میں فرماتے ہیں:

"وصیت دیگر آں ست کہ دست در دست مشائخ ایں زماں کہ بانواع بدعت مبتلا ہستند ہرگز نباید داد و بیعت ایشاں نباید کرد و بغلو عام مغرور نباید بود و نہ بکرامات زیرا کہ اکثر غلو عام سبب رسم است و امورِ رسمیہ را بحقیقت اعتبارے نیست وکرامات فروشان ایں زماں ہمہ الا ما شاء اللہ طلسمات و نیر نجات را کرامات دانستہ اند" (ص:۱۱۴)

"اس زمانے کے مشائخ کی بیعت نہیں کرنا چاہیے۔ یہ لوگ مختلف قسم کی بدعات سے ملوث ہیں اور ان کے عام غلو سے دھوکا نہیں کھانا چاہیے، نہ ان کی کرامات پر توجہ دینی چاہیے۔ یہ غلو رسوم کا نتیجہ ہے اور رسمی چیزوں کی حقیقت کے مقابلے میں کوئی قیمت نہیں، اس زمانے کے کرامت فروش طلسمات اور شعبدہ بازیوں کو کرامت سمجھتے ہیں۔"

آپ نے تینوں سوالات میں جن بعض دیوبندی اور اہلِ حدیث حضرات کا ذکر فرمایا ہے، یہ وہی حضرات ہیں جن کو شاہ صاحب نے کرامت فروشی کا خطاب دیا ہے۔ أعاذنا اللہ منھم!

④ مسنون اور ماثور درود کے ہوتے ہوئے اس قسم کے مصنوعی درود کو کوئی اہمیت نہیں دینی چاہیے۔ درود تاج میں مشرکانہ الفاظ کے علاوہ اس کی عبارت زبان کے لحاظ سے بھی غلط ہے۔ حافظ ابن القیم رحمہ اللہ نے "جلاء الأفھام" اور حافظ سخاوی نے "القول البدیع" اور نواب صدیق حسن خان نے "نزل الأبرار" میں درود شریف کے متعدد صیغے درج فرمائے ہیں اور ان کی اسانید پر بحث فرمائی ہے، جو صحیح احادیث سے ثابت ہیں، انھیں پڑھنا چاہیے۔ بعض بزرگوں نے درود تاج کی بڑی اہمیت بیان کی ہے اور اس کے لیے اجازت بھی دی ہے، لیکن کوئی شرعی دلیل ذکر نہیں فرمائی، اس لیے مشکوک و مشتبہ وظائف سے پرہیز بہتر ہے۔

⑤ قرآن عزیز نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد کا نام آزر ذکر فرمایا ہے۔ بعض لوگ انھیں چچا کہتے ہیں، اس میں کچھ شک نہیں کہ چچا کو بھی باپ کہا جاتا ہے، لیکن اس کے لیے قرینہ ہونا چاہیے، ورنہ "اَب" کا حقیقی معنی باپ ہی ہوتا ہے۔

عہد نامۂ قدیم (تورات، تواریخ نمبر: ۱، باب نمبر: ۱) میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے باپ کا نام "تارخ" لکھا ہے اور لوقا (باب نمبر: ۳) میں ان کا نام "ترہ" مرقوم ہے۔ اگر عہد نامۂ قدیم اور عہد نامۂ جدید کے بیانات کو کچھ اہمیت دی جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ ان کا نام آزر تھا اور تارخ اور ترہ ان کے لقب ہوں گے۔ بہر کیف

قرآنِ عزیز کے بیان کو ترجیح ہے۔

صحیح یہی ہے کہ ان کا نام آزر تھا۔ اس معاملے میں زیادہ مغالطہ آمیزی شیعہ حضرات کی جانب سے کی جاتی ہے، اس لیے کہ وہ آزر کے کفر سے گھبراتے ہیں، جس کی قرآنِ عزیز نے صراحت فرمائی ہے۔ اہلِ سنت کے نزدیک باپ بیٹے کے خیالات میں اختلاف کوئی بات نہیں۔[1] اللہ تعالیٰ جو چاہیں کر سکتے ہیں: ﴿يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَ يُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ﴾ [الروم: ۱۹]

10- وضو کے بغیر قرآنِ مجید پڑھنا:

سوال کیا بغیر وضو کے قرآنِ مجید ہاتھ میں لے کر پڑھنا درست ہے؟[2]

جواب قرآن مجید باوضو پڑھنا افضل ہے، بغیر وضو بھی پڑھا جا سکتا ہے، البتہ جنابت ہو تو مَس [چھونا] درست نہیں۔

11- ننگے سر عادتاً نماز پڑھنا:[3]

سوال ① بدن پر کپڑے ہوتے ہوئے اور صرف سر پر سے ٹوپی یا پگڑی اتار کر رکھ دینی اور کوئی عذر بھی نہ ہو اور ہمیشہ اس طرح نماز پڑھنا، اگرچہ فرض نماز باجماعت مسجد میں ہو، اس کے لیے شرعاً کیا حکم ہے؟ کیا اس طرح نبی ﷺ یا صحابہ رضی اللہ عنہم سے ثبوت ملتا ہے؟ اگر ملتا ہے تو عبارت مع صفحہ تحریر فرمائیں۔

② ننگے سر نماز پڑھنا افضل ہے یا سر ڈھانک کر نماز پڑھنا افضل ہے؟ اگر سر ڈھانک کر نماز پڑھنا افضل ہے تو اس کی دلیل پیش فرمایئے گا۔ (عبداللہ: خطیب جامع مسجد اہلحدیث، ڈیرہ غازی خاں)

جواب متذکرہ صدر سوال پر تین وجوہ سے غور کیا جا سکتا ہے:

① مطلق جواز اور اِباحت کے لحاظ سے۔

② افضلیت، یعنی آنحضرت اور صحابہ کے عام عمل کے لحاظ سے۔

③ حرمت اور عدمِ جواز کے لحاظ سے۔

نماز میں سترِ مغلظ (مبرز اور شرم گاہ) کا ڈھانپنا بالاتفاق ضروری ہے۔ ان میں سے اگر کوئی حصہ ننگا ہو تو نماز نہیں ہوگی اور ان اعضا کو ننگا رکھنا شرعاً حرام ہے۔

بہز بن حکیم عن ابیہ عن جدہ مرفوعاً مروی ہے:

---

[1] یعنی اگر بیٹا مسلمان ہے تو باپ کافر ہو سکتا ہے، وکذا بالعکس، جیسے حضرت نوح علیہ السلام اور ان کا بیٹا۔[مولف]

[2] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۱۱رفروری ۱۹۵۸ء)

[3] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۴ر دسمبر ۱۹۵۹ء)

«اِحْفَظْ عَوْرَتَكَ إِلَّا مِنْ زَوْجَتِكَ أَوْ مَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ» [1] (رواه الخمسة إلا النسائي)

''بیوی اور مملوکہ کے سوا اعضائے ستر دیکھنے کا کسی کو موقع نہ دے۔''

امام شوکانی فرماتے ہیں:

"والحق وجوب ستر العورة في جميع الأوقات إلا وقت قضاء الحاجة و إفضاء الرجل إلى أهله" اھ (نيل الأوطار: ٢/ ٦٤)

حدِ ستر میں اہلِ علم مختلف ہیں۔ جمہور ناف سے گھٹنے تک ڈھکنا ضروری سمجھتے ہیں۔ بعض صرف ران ڈھانپنا واجب سمجھتے ہیں۔ امام احمد اور امام مالک سے ایک روایت میں آیا ہے:

"اَلْعَوْرَةُ: اَلْقُبُلُ وَالدُّبُرُ فَقَط" (نيل الأوطار: ٢/ ٦٤)

غرض ستر کی جو حد بھی اہلِ علم کے نزدیک ہے، اگر اسے ننگا رکھا جائے تو نماز نہیں ہوگی۔ اعضائے ستر کو ویسے بھی ننگا رکھنا درست نہیں، نماز میں تو قطعاً حرام ہے اور ناجائز ہوگا۔

سر چونکہ بالاتفاق اعضائے ستر میں نہیں، اس لیے اگر کسی وقت ننگے سر نماز پڑھی جائے تو نماز بالاتفاق جائز ہوگی، اس کے لیے نہ بحث کی ضرورت ہے، نہ احادیث کی ٹٹول کی ضرورت، جس طرح کوئی پنڈلی، پیٹ، پشت وغیرہ اعضا ننگے ہوں، نماز جائز ہے، ننگے سر بھی درست ہے، لیکن اسے عادت نہیں بنانا چاہیے۔ امام اگر نماز کے بعد پاؤں آسمان کی طرف کرے یا مقتدی کوئی ایسی حرکت کریں، حدیث میں اس سے رکاوٹ ثابت نہیں ہوگی، لیکن عقل مند ایسا کرنے سے پرہیز کرے گا۔ ننگے سر کی عادت بھی قریباً اسی نوعیت کی ہے۔ جواز کے باوجود ایسی عادات عقل و فہم کے خلاف ہیں۔ عقلمند اور متدین آدمی کو اس سے پرہیز کرنا چاہیے۔

آنحضرت ﷺ، صحابہ کرام اور اہلِ علم کا طریق وہی ہے، جو اب تک مساجد میں متوارث اور معمول بہا ہے۔ کوئی مرفوع صحیح حدیث میری نظر سے نہیں گزری، جس سے اس عادت کا جواز ثابت ہو، خصوصاً باجماعت فرائض میں، بلکہ عادت مبارک یہی تھی کہ پورے لباس سے نماز ادا فرماتے تھے۔ امام بخاری فرماتے ہیں:

"بَابُ وُجُوْبِ الصَّلَاةِ فِي الثِّيَابِ، وقالَ اللّٰهُ تعالىٰ: ﴿خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ﴾ وَمَنْ صَلّٰى مُلْتَحِفًا فِيْ ثَوْبٍ وَّاحِدٍ، وَيُذْكر عن سلمة بن الأكوع أن النبيﷺ قال: يَزُرُّهُ وَلَوْ بِشَوْكَةٍ. فِيْ إِسْنَادِهِ نَظَرٌ..." (صحيح البخاري مع الفتح: ١/ ٣١٨، مطبوعه مصر)

امام بخاری کا مطلب یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ زینت کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ اعضائے ستر ڈھانپنے کے

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٠١٧) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٧٩٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٩٢٠)

علاوہ اچھے کپڑوں میں نماز ادا کی جائے۔ عام ذہن کے لوگوں کو اس قسم کی احادیث سے غلطی لگی ہے کہ ایک کپڑے میں نماز ادا کی جائے تو سر ننگا رہے گا، حالانکہ ایک کپڑے کو اگر پوری طرح لپیٹا جائے تو سر ڈھکا جا سکتا ہے۔

اس مضمون کی احادیث ام ہانی، ابو ہریرہ، جابر بن عبداللہ، سلمہ بن اکوع، عمر بن ابی سلمہ، طلق بن علی رضی اللہ عنہم وغیرہ سے صحیح بخاری، سنن ابی داود وغیرہ دواوینِ سنت میں موجود ہیں،[1] لیکن کسی میں سر ننگا رکھنے کا ذکر نہیں، خصوصاً جس میں عادت یا کثرتِ عمل ثابت ہو۔ پھر احادیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ صورت یا تو صرف اظہارِ جواز کے لیے ہے یا کپڑوں کی کم یابی کی وجہ سے، ان حالات سے جواز یا اباحت تو ثابت ہو سکتی ہے، سنت یا استحباب ظاہر نہیں ہوتا۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے:

«أَوَ لِكُلِّكُمْ ثَوْبَانِ؟»[2] (أبو داود: ١/ ٢٤٠)

طلق رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے:

«أَوَ كُلُّكُمْ يَجِدُ ثَوْبَيْنِ»[3] (أبو داود مع عون: ١/ ٢٤١)

''کیا سب کو دو کپڑے میسر آ سکتے ہیں؟''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اثر میں مزید تفصیل ملتی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''قام رجلٌ إلىٰ النبي ﷺ فَسَأَله عَنِ الصَّلَاةِ في الثوب الواحد فقال: أو كلكم يجد ثوبين؟ ثم سَأَل رجل عمرَ فقال: إذا وسع الله فَأَوْسِعُوا، جمع رجل عليه ثيابَه، صلىّٰ رجلٌ في إزار ورِداءٍ، في إِزَارٍ وَ قَمِيص، قال: وأحسبه، قَالَ: في تبان ورداء''[4] (صحيح بخاري: ١/ ٣٢٤)

''ایک شخص نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کھڑا ہوا اور اس نے ایک کپڑے میں نماز پڑھنے کے متعلق سوال کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تم میں سے ہر ایک کے پاس دو کپڑے موجود ہیں؟ پھر اس نے حضرت عمر سے ایک کپڑے میں نماز کے متعلق دریافت کیا، حضرت عمر نے فرمایا: جب اللہ تعالیٰ وسعت دے تو نماز میں بھی وسعت سے کام لینا چاہیے۔ اس کے بعد حضرت عمر نے حسبِ استطاعت نماز

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤٥۔ ٣٥١) سنن أبي داود، رقم الحديث (٦٢٥، ٦٣٥)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٦٢٥)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (٦٢٩)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٥٨)

میں لباس کی مختلف قسموں کا ذکر فرمایا۔"

حضرت عمر کا ارشاد حکم ہو یا صرف خبر، اس میں کپڑوں کی قلت اور عدمِ استطاعت صراحتاً سمجھ میں آتی ہے، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اگر پورے کپڑے میسر ہو سکیں اور کوئی مانع نہ ہو تو تکلف سے مسکنت کا اظہار نہیں کرنا چاہیے۔

ابن منیر فرماتے ہیں:

"الصحيح أنه كلام في معنى الشرط، كأنه قال: إن جمع رجل عليه ثيابه فحسن" اهـ (فتح الباري: ١/ ٣٢٤)

یعنی اگر ایک سے زائد کپڑے نماز میں استعمال کرے تو بہتر ہے۔

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں:

"وفي هذا الحديث دليل علىٰ وجوب الصلاة في الثياب لما فيه من أن الاقتصار على الثوب الواحد كان لضيق الحال، وفيه أن الصلاة في الثوبين أفضل من الثوب الواحد، وصرح القاضي عياض بنفي الخلاف في ذلك" اهـ (فتح الباري: ١/ ٣٢٤)

اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ (مستطیع کے لیے) زیادہ کپڑوں میں نماز پڑھنا واجب ہے، کیونکہ ایک کپڑے کی اجازت صرف ضیق کی وجہ سے تھی اور یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ نماز میں دو کپڑے استعمال کرنا افضل ہے۔

غرض کسی حدیث سے بلا عذر ننگے سر نماز کو عادت اختیار کرنا ثابت نہیں۔ محض بے عملی یا بد عملی یا کسل کی وجہ سے یہ رواج بڑھ رہا ہے، بلکہ جہلا تو اسے سنت سمجھنے لگے ہیں۔ العیاذ باللّٰہ!

اس کی تائید دوسری احادیث سے بھی ہوتی ہے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر فرماتے ہیں:

« إِذَا صَلَّى أَحَدُكُمْ فَلْيَأْتَزِرْ وَلْيَرْتَدْ » (سنن كبرىٰ: ٢/ ٢٣٥)

نافع فرماتے ہیں، عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما مرفوعاً فرماتے تھے:

« إذا صلىٰ أحدُكم فليلبَس ثوبَيه فَإِنَّ اللّٰهَ عز و جل أَحَقُّ أَنْ يُزَيَّنَ لَهُ ... »[1]

(سنن كبرىٰ: ١/ ٢٣٦)

نافع فرماتے ہیں، عبداللہ نے فرمایا: نماز دو کپڑوں میں پڑھو، اللہ کی بارگاہ میں زینت سے حاضر ہونا زیادہ مناسب ہے۔

نافع فرماتے ہیں: میں ایک دن اونٹوں کی گھاس کے سلسلے میں نماز سے پیچھے رہ گیا۔ عبداللہ بن عمر آئے تو میں ایک ہی کپڑے میں نماز پڑھ رہا تھا۔ حضرت عبداللہ نے فرمایا: کیا تمھارے پاس دو کپڑے نہیں؟ میں نے

[1] نیز دیکھیں: سنن أبي داود، رقم الحديث (٦٣٥) الثمر المستطاب للألباني (ص: ٢٨٧)

عرض کیا: دو بھی موجود ہیں۔ آپ نے فرمایا:

"أرأيتَ لو بعثتك إلىٰ بعض أهل المدينة، أكنتَ تذهب في ثوب واحد؟ قلت: لا۔ قال: فاللّٰه أحق أن يتجمل له أَم الناس؟..." (سنن البيهقي: ١/ ٢٣٦)

''اگر میں مدینے میں کسی کے پاس تمھیں بھیجتا تو تم ایک کپڑے میں جاتے؟ میں نے عرض کیا: نہیں۔ فرمایا: اللہ کی بارگاہ میں زینت سے حاضر ہونا زیادہ مناسب ہے۔''

ان احادیث میں سر ڈھانپنے کی صراحت نہیں، لیکن دو کپڑوں سے سر ڈھانپنے کا امکان زیادہ ہوجاتا ہے۔ کپڑا موجود ہوتو ننگے سر نماز ادا کرنا یا ضد سے ہوگا یا قلتِ عقل سے!!

نیز یہ ثابت ہوتا ہے کہ اچھے کپڑوں کے ساتھ تجمّل سے نماز پڑھنا مستحب اور مسنون ہے۔ آیت: ﴿خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ﴾ کے مضمون کی بھی اسی سے وضاحت ہوجاتی ہے۔

ابو داود میں ایک اثر ہے، جس سے شاید کوئی کم سواد آدمی استدلال کرے:

"حدثنا عبد اللّٰه بن محمد الزهري ثنا سفيان بن عيينة قال: رأيت شريكا صلىٰ بنا في جنازة العصر، فوضع قلنسوته بين يديه يعني في فريضته"[1]

(أبو داود مع عون: ١/ ٢٥٦)

یعنی شریک نے فرضوں کی نماز بوقتِ عصر ٹوپی اتار کر پڑھی اور ٹوپی اپنے سامنے رکھی۔

اول تو یہ نہ مرفوع حدیث ہے نہ کسی صحابی کا اثر۔

دوم: معلوم نہیں یہ شریک کون بزرگ ہیں: شریک بن عبداللہ نخعی تبع تابعی ہیں یا شریک بن عبداللہ بن ابی نمر تابعی؟ ان دونوں میں کم وبیش ضعف ہے، لیکن یہ ان کا عمل ہے، جو کسی طرح بھی قابلِ حجت نہیں۔

سوم: امام ابو داود نے اسے "بابُ الْخَطِّ إِذَا لم يَجِدْ عَصاً" میں ذکر فرمایا ہے، جس سے ظاہر ہے کہ یہاں ضرورتاً سر ننگا رکھا گیا ہے، کیونکہ جب انھیں سترہ بنانے کے لیے کوئی چیز نہ ملی تو انھوں نے سترے کا کام ٹوپی سے لے لیا۔ ضرورت اور عذر سے سر ننگا رکھا جائے تو اس میں بحث نہیں، بحث اس میں ہے کہ فیشن اور عادت کے طور پر نماز میں سر ننگا رکھنا کہاں تک درست ہے؟

حافظ عینی نے شرح بخاری میں مختلف مذاہب کے ذکر میں تفصیل سے کام لیا ہے۔ ان کی بحث کا خلاصہ بھی یہی ہے کہ ایک کپڑے میں نماز پڑھنا درست ہے، لیکن جب وسعت ہو، کپڑے میسر آسکیں تو پھر ایک پر اقتصار مستحسن نہیں۔ حافظ ابن قدامہ مقدسی فرماتے ہیں:

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٦٩١) شریک نخعی ضعیف ہے، البتہ شریک بن عبداللہ بن ابی نمر حسن الحدیث ہے۔

"الفصل الثاني في الفضيلة: وهو أن يصلي في ثوبين أو أكثر، فإنه إذاً أبلغ في الستر، يروىٰ عن عمر رضي الله عنه أنه قال: إذا وسع الله فأوسعوا" اهـ

(مغني ابن قدامة، مع الشرح: ١/ ٦٢١)

"یعنی فضیلت اس میں ہے کہ دو یا دو سے زیادہ کپڑوں میں نماز ادا کرے، کیوں کہ اس میں ستر اور پردہ زیادہ ہوگا۔ حضرت عمر کا ارشاد ہے: جب اللہ مال میں وسعت فرمائیں تو آدمی کو وسعت سے کام لینا چاہیے۔"

اس کے بعد تمیمی کا قول ذکر فرمایا ہے:

"الثوب الواحد يجزئ، والثوبان أحسن، والأربع أكمل: قميص و سراويل وعمامة وإزار" اهـ (مغني ابن قدامه: ١/ ٦٢١)

"ایک کپڑا جوازِ نماز کے لیے کافی ہے، دو کپڑے بہتر ہیں، چار ہوں تو نماز اور کامل ہوگی: قمیص، پاجامہ، پگڑی اور ازار۔"

ان تمام گزارشات سے مقصد یہ ہے کہ سر ننگا رکھنے کی عادت اور بلا وجہ ایسا کرنا اچھا فعل نہیں۔ یہ عمل فیشن کے طور پر روز بروز بڑھ رہا ہے، یہ اور بھی نامناسب ہے۔ آنحضرت ﷺ کے زمانے میں پگڑی کے متعلق تحنیک کا رواج تھا، یعنی پگڑی کا ایک لپیٹ گردن کے نیچے سے باندھتے تھے۔ آج کی عربی پگڑیاں اور ہماری پگڑیاں اس وقت کی پگڑیوں سے وضع میں مختلف ہیں۔ ایسی پگڑی کا اتارنا تو اور بھی مشکل معلوم ہوتا ہے۔ وللتفصيل وقت آخر. ویسے یہ مسئلہ کتابوں سے زیادہ عقل و فراست سے متعلق ہے۔ اگر اس جنسِ لطیف سے طبیعت محروم نہ ہو تو ننگے سر نماز ویسے ہی مکروہ معلوم ہوتی ہے۔ ضرورت اور اضطرار کا باب اس سے الگ ہے۔

12- وتر کے بعد دو رکعت بیٹھ کر پڑھنا:[1]

سوال عشا کے وتر کے بعد دو رکعت نفل بیٹھ کر پڑھنا کسی حدیث سے ثابت ہے یا نہیں؟

جواب نوافل پڑھتے وقت بیٹھنے کا ذکر بعض احادیث میں آیا ہے،[2] مگر یہ اختیاری ہے۔ کھڑے ہو کر بھی پڑھ سکتا ہے، نوافل نہ پڑھے تو بھی درست ہے۔

---

[1] ہفت روزہ "الاعتصام" لاہور (۱۱ر فروری ۱۹۶۸ء)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١١٠٦)

13- کیا دیہات میں نمازِ جمعہ فرض ہے؟[1]

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے کے بارے میں کہ نمازِ جمعہ گاؤں میں ہو سکتی ہے یا نہیں؟ ہمارے ہاں بعض لوگ گاؤں میں بھی جائز کہتے ہیں۔ اگر یہ غلط ہے تو کیوں؟

جواب جمعہ شہر اور دیہات میں، جہاں ادا کرنا ممکن ہو، فرض ہے۔ قرآنِ عزیز میں ارشاد ہے:

﴿ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰی ذِكْرِ اللّٰهِ وَ ذَرُوا الْبَیْعَ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾ [الجمعة: ٩]

اس آیت میں عام اہلِ ایمان کو مخاطب فرمایا گیا ہے کہ جمعہ کے دن جب اذان ہو تو کاروبار (تجارت وزراعت) چھوڑ کر نماز کے لیے توجہ اور پوری کوشش سے آؤ، اللہ تعالیٰ کا ذکر کثرت سے کرو، کامیابی کا راز یہی ہے۔

اس اذان سے وہی اذان مراد ہے، جو جمعہ کے دن بوقتِ خطبہ دی جاتی ہے۔

حافظ ابن العربی فرماتے ہیں:

"قال بعض العلماء: كون الصلاة الجمعة ههنا معلوم بالإجماع، لا من نفس اللفظ. وعندي أنه معلوم من نفس اللفظ بنكتة، وهي قوله: ﴿مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَةِ﴾ وذلك يفيده؛ لأن النداء الذي يختص بذلك اليوم هو نداء تلك الصلاة، فأما غيرها فهو عام في سائر الأيام، ولو لم يكن المراد به نداء الجمعة لما كان لتخصيصه بها وإضافته إليها معنىً ولا فائدة" (أحكام القرآن لابن العربي: ٢/ ٢٥٦)

"بعض علما کا خیال ہے کہ یہاں سے نمازِ جمعہ مراد لینا الفاظ کا مفاد نہیں، بلکہ اجماع سے ثابت ہے۔ ابن عربی فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک آیت کا مفاد یہی ہے، کیونکہ اذان کے ساتھ یوم الجمعۃ کی تخصیص کا مقصد یہ ہے کہ اس سے مراد وہ اذان ہے، جس کا تعلق نمازِ جمعہ سے ہے۔ باقی اذانیں سب دنوں میں عموماً ہوتی رہتی ہیں، اگر نمازِ جمعہ مراد نہ ہوتی تو اس تخصیص اور تعیین کا کوئی فائدہ نہیں۔"

اسی طرح بیع کا تذکرہ بھی ایک ضروری اور اہم شغل کے طور پر کیا گیا۔ اگر جمعہ کی اذان کے وقت کھیتی باڑی یا کوئی دوسرا کام ہو رہا ہو تو اسے بھی ترک کرنا ضروری ہے۔ یہاں ابن العربی نے بعض ائمہ سے اختلاف کا ذکر بھی فرمایا ہے، جن کے نزدیک نکاح، ہبہ، صدقہ وغیرہ امور اذانِ جمعہ کے وقت فسخ نہیں ہوتے، اس کے بعد فرماتے ہیں:

---

[1] ہفت روزہ "الاعتصام" لاہور (١٩، ٢٦ فروری، ٤، ١١ مارچ ١٩٦٠ء)

"والصحيح فسخ الجميع، لأن البيع إنما منع للاشتغال وگ، فكل أمر يشغل عن الجمعة من العقود كلها فهو حرام شرعا" (أحكام القرآن: ٢/ ٢٥٧)

"صحیح یہ ہے کہ جس قدر امور عقود وغیرہ جمعہ سے مشغول اور غافل کریں، وہ شرعاً حرام ہیں۔"

"قال عطاء: تحرم الصناعات كلها"[1]

قسطلانی فرماتے ہیں:

"يحرم البيع ونحوه من العقود مما فيه تشاغل عن السعي" (إرشاد الساري: ٢/ ١٧٤)

غرض جہاں بھی جمعہ فرض ہوگا، وہاں بیع وشرا اور عقود و زراعت وغیرہ جملہ مشاغل ممنوع ہونگے۔ بیع سے خرید وفروخت بلحاظِ شغل مقصود ہے، شہر یا دیہات اور قصبات میں جو مشاغل ادائے جمعہ سے مانع ہوں، وہ امر ﴿فَاسْعَوْا﴾ کے منافی ہیں اور ﴿وَذَرُوا الْبَيْعَ﴾ سے ان کا ترک مقصود ہے۔ مناظرات کے دور کی یہ نکتہ سنجی ہے کہ بیع سے مراد صرف خرید وفروخت ہے اور دیہات کے رہنے والوں کو اس سے مستثنیٰ قرار دے دیا گیا ہے، اس لیے کہ دیہات میں خرید وفروخت نہیں ہوتی۔ آنحضرت ﷺ نے جمعہ کے متعلق احادیث میں جو تاکید فرمائی ہے، اس میں شہر اور دیہات میں امتیاز نہیں فرمایا۔

1 عن أبي هريرة وابن عمر قالا: سمعنا رسول اللهﷺ علىٰ أعواد منبره: « لينتهين أقوام عن ودعهم الجمعات أو ليختمن الله علىٰ قلوبهم، ثم ليكونن من الغافلين » (مسلم)[2]

"آنحضرت ﷺ نے منبر پر فرمایا: لوگ جمعہ کو ترک کرنا چھوڑ دیں، ورنہ ان کے دلوں پر مہر کی جائے گی اور انھیں غافلوں میں شمار کیا جائے گا۔"

2 عن أبي الجعد الضمري قال: قال رسول اللهﷺ: « من ترك ثلاث جمع تهاونا بها، طبع الله علىٰ قلبه »[3] (أبو داود، نسائي، ترمذي، ابن ماجه، منتقىٰ: ٢/ ٧)

"جو آدمی تین جمعے سستی سے چھوڑ دے، اس کے دل پر مہر کر دی جاتی ہے۔"

---

[1] صحيح البخاري مع القسطلاني (٢/ ١٧٥)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٦٥)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٠٥٢) سنن الترمذي، رقم الحديث (٥٠٠) سنن النسائي، رقم الحديث (١٣٦٩) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١١٢٥)

③ عن عبد الله بن عمرو عن النبي ﷺ: «الجمعة علىٰ كل من سمع النداء»[1] (أبو داود)

''جو جمعہ کی اذان سنے اس پر جمعہ فرض ہے۔''

④ عن طارق بن شهاب قال: قال رسول اللهﷺ: «الجمعة حق واجب علىٰ كل مسلم في جماعة إلا علىٰ أربعة: عبد مملوك، أو امرأة، أو صبي أو مريض»[2]

(أبو داود، منتقىٰ: ٢/ ٨)

''جمعہ ہر مسلمان پر فرض ہے، البتہ غلام، عورت بچے اور بیمار پر فرض نہیں۔''

دیکھیں! اَعذار کے لحاظ سے بعض لوگوں کو آپ ﷺ نے مستثنیٰ فرمایا ہے، لیکن ظرف و مقام کے لحاظ سے کوئی استثنا نہیں فرمایا، حالانکہ اس قسم کے استثنا کے لیے یہ مناسب موقع تھا۔

⑤ عن جابر أن رسول اللهﷺ قال: «من كان يؤمن بالله واليوم الآخر فعليه الجمعة يوم الجمعة إلا مريض أو مسافر أو امرأة أو صبي أو مملوك، فمن استغنىٰ بلهوٍ أو تجارة، استغنىٰ الله عنه، والله غني حميد»[3] (دارقطني)

''جس کا اللہ تعالیٰ اور آخرت پر ایمان ہے، جمعہ کے دن اس پر جمعہ ضروری ہے، بیمار، مسافر، عورت، بچے اور غلام اس سے مستثنیٰ ہیں۔ جو آدمی غفلت یا کاروبار کی وجہ سے استغنا کرے، اللہ اس سے مستغنی ہے۔''

⑥ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ بن مسعود سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے نمازِ جمعہ سے جدا رہنے والوں کے گھروں کو جلا ڈالنے کا قصد فرمایا۔[4] (مسلم، منتقیٰ: ٢/ ٦)

ایک مناظر ذہن کے لیے بحث کی گنجایش ہے کہ ان احادیث میں دیہات کا تذکرہ صراحتاً نہیں، لیکن احادیث کے مقاصد پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ جمعہ کی نماز اور اس میں وعظ و تذکیر کو زیادہ سے زیادہ عام فرمانا چاہتے ہیں اور اس سے اِغماض کرنے والوں سے نفرت فرماتے ہیں۔

---

① سنن أبي داود، رقم الحديث (١٠٥٦) اس کی سند میں ابو سلمہ بن نبیہ اور اس کا استاد عبداللہ بن ہارون مجہول ہیں۔ البتہ یہ حدیث موقوفاً صحیح ہے۔ دیکھیں: مصنف ابن أبي شيبة (١/ ٢٠٥) سنن البيهقي (٣/ ١٧٣)

② سنن أبي داود، رقم الحديث (١٠٦٧)

③ سنن الدارقطني (٢/ ٣) اس کی سند میں ابن لہیعہ اور معاذ بن محمد انصاری ضعیف ہیں۔ نیز یہ حدیث ایک اور سند سے بھی مروی ہے، لیکن اس میں عبدالعظیم بن حبیب سخت ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: المعجم الأوسط (٧/ ٣٥٤) مجمع الزوائد (٢/ ٣٨٣) لسان الميزان (٤/ ٤٠) البتہ مسافر پر جمعہ فرض نہیں ہے۔

④ صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٥٢)

ﮎ عن أبي هريرة رضي الله عنه عن النبي ﷺ قال: «ألا هل عسىٰ أن يتخذ أحدكم الصبة من الغنم علىٰ رأس ميل أو ميلين فيتعذر عليه الكلأ فيرتفع، ثم تجيء الجمعة فلا يجيئ ولا يشهدها، وتجيء الجمعة فلا يشهدها، وتجيء الجمعة فلا يشهدها حتى يطبع علىٰ قلبه»[1] (ابن ماجه)

''تم سے کوئی میل دو میل دور اپنی بکریوں کا ریوڑ لے جائے، پھر گھاس نہ ملنے کی وجہ سے وہ اوپر چلا جائے اور تین جمعے غیر حاضر رہے، ایسا نہیں ہونا چاہیے، ایسے آدمی کے دل پر مہر کر دی جائے گی۔''

ان احادیث میں صحیح اور ضعیف روایات موجود ہیں، جو مفہوم کے لحاظ سے ایک دوسرے کی موید ہیں، ان سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر آدمی، جس کے لیے جمعہ ادا کرنا ممکن ہو، اس پر واجب ہے کہ نمازِ جمعہ میں حاضر ہو۔ یہی ان احادیث کی روح ہے۔

دیہات اور فقہائے حنفیہ رحمہم اللہ:

مذاہبِ ائمہ کی تصریحات سے ظاہر ہوتا ہے کہ صرف فقہاے حنفیہ رحمہم اللہ اہلِ دیہات کو جمعہ کی حاضری سے مستثنیٰ قرار دیتے ہیں، بلکہ سختی سے روکتے ہیں۔ غلام، مریض اور مسافر کے متعلق خود فقہا رحمہم اللہ کی تصریح موجود ہے کہ اگر یہ لوگ جمعہ میں حاضر ہو جائیں تو ظہر ان سے ساقط ہو جائے گی، مگر دیہات کو جمعہ سے محروم رکھنے پر معلوم نہیں کیوں اصرار ہے؟!

۱۹۴۷ء کی ہجرت کے بعد مولوی الیاس مرحوم کے معتقدین جہاں اقامت پذیر ہوئے ہیں، ان کا دتیرہ ہے کہ وہ جمعہ کو روکنے کی سرتوڑ کوشش کرتے ہیں۔ اگر اہلِ دیہات کو مسافر وغیرہ کی طرح اجازت دے دی جائے کہ وہ دیہات میں جمعہ ادا کر لیں تو ان سے ظہر ساقط ہو جائے گی تو شرعی احکام سے قطع نظر اس میں تھوڑی سی معقولیت ہوتی، لیکن بعض دیہات میں تو ان تبلیغی حضرات نے جمعہ کے متعلق ہنگامہ برپا کر دیا، پارٹیاں بن گئیں، حالانکہ اہلِ دیہات پر جمعہ کی فرضیت کے متعلق قرآن اور سنت میں کافی ذخیرہ موجود ہے اور جمعہ سے روکنے کے لیے تو کچھ بھی نہیں!!

امام بخاری رحمہ اللہ صحیح میں فرماتے ہیں:

"باب الجمعة في القرىٰ والمدن... عن ابن عباس: إن أول جمعة جمعت بعد جمعة في مسجد رسول الله ﷺ في مسجد عبد القيس بجواثى من البحرين"[2]

---

[1] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١١٢٧) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢٦٥٦)

[2] صحيح البخاري مع فتح الباري (٢/ ٢٥٩)

''یعنی مسجدِ نبوی کے بعد سب سے پہلا جمعہ قبیلۂ عبد القیس نے مقام جواثی میں پڑھا، جو علاقہ بحرین میں ایک گاؤں ہے۔''

وکیع فرماتے ہیں: "قرية من قرى البحرين" (صحيح البخاری مع الفتح: ۲/ ۲۵۹)

حافظ فرماتے ہیں:

"إشارة إلىٰ خلاف مَنْ خص الجمعة بالمدن دون القرىٰ، وهو مروي عن الحنفية، وأسنده ابن أبي شيبة... عن حذيفة عن علي" (صحيح البخاري مع الفتح: ۲/ ۲۵۹)

''امام بخاری رحمہ اللہ نے ان حضرات سے اختلاف فرمایا ہے، جو صرف شہروں میں جمعہ جائز سمجھتے ہیں دیہات میں درست نہیں سمجھتے۔ ابن ابی شیبہ نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی یہ مسلک نقل کیا ہے۔''

اس کے بعد حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اثر ذکر فرمایا ہے:

"إنه كتب إلىٰ أهل البحرين أن جمعوا حيثما كنتم"[1]

''آپ رضی اللہ عنہ نے بحرین والوں کو حکم دیا: تم جہاں بھی ہو، جمعہ ضرور پڑھو۔''

بیہقی رحمہ اللہ نے لیث بن سعد سے نقل فرمایا ہے:

"كل مدينة أو قرية فيها جماعة، أمروا بالجمعة، فإن أهل مصر وسواحلها كانوا يجمعون الجمعة علىٰ عهد عمر وعثمان بأمرهما، وفيهما رجال من الصحابة، وعند عبدالرزاق بإسناد صحيح عن ابن عمر أنه كان يرىٰ أهل المياه بين مكة والمدينة يجمعون فلا يعيب عليهم"[2]

لیث بن سعد فرماتے ہیں: ہر بستی اور شہر میں جہاں مسلمانوں کی جماعت ہو، وہاں جمعہ ادا کرنا چاہیے۔

اس کے بعد امام بخاری نے یہ حدیث ذکر فرمائی ہے:

«كُلُّكُمْ رَاعٍ، وَكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ...»[3]

''تم سب اپنے حلقہ اقتدار میں حاکم ہو اور تم سے تمھاری رعیت کے متعلق باز پرس ہوگی۔''

ابن منیر فرماتے ہیں: اس حدیث سے ظاہر ہے کہ جمعہ کے لیے نہ امیر شرط ہے نہ شہر، بلکہ دیہات میں

---

[1] مصنف ابن أبي شيبة (۱/ ۴۴۰)

[2] فتح الباري (۲/ ۳۸۰) نیز دیکھیں: مصنف عبد الرزاق (۳/ ۱۷۰) سنن البيهقي (۳/ ۱۷۸)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (۸۵۲)

جمعہ کی اجازت ظاہر ہوتی ہے۔[1]

اسی طرح اسعد بن زرارہ کی روایت سے ظاہر ہے، وہ نقیع الخضمات میں جمعہ پڑھایا کرتے تھے۔[2] یہ بستی مدینہ منورہ سے قریباً ایک میل ہے۔

ان آثار کا تذکرہ حافظ شوکانی نے "نیل الأوطار" میں اور حضرت مولانا شمس الحق نے عون المعبود میں بھی فرمایا ہے۔[3] امام بیہقی رحمہ اللہ نے ان تمام آثار کا تذکرہ سنن کبریٰ (۳/ ۱۷۹، ۱۷۸) میں اپنی سند سے فرمایا ہے۔ ان آثار سے ظاہر ہوتا ہے، اس وقت عام دیہات بلکہ ڈیروں میں بھی جمعہ بلانکیر ہوتا تھا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم میں گو حضرت علی رضی اللہ عنہ وغیرہ اس کے خلاف تھے، لیکن وہ ردکنے کی کوشش نہیں کرتے تھے۔ غالباً یہ سنت حضرات دیوبند سے شروع ہوئی ہے، جس کا اِحیا جابجا مولوی الیاس کی تبلیغی جماعت کر رہی ہے۔ إنا للہ وإنا إلیه راجعون!!

حافظ خطابی معالم السنن (۱/ ۲۴۵) میں اسعد بن زرارہ کی حدیث ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

"وفي الحديث من الفقه أن الجمعة جوازها في القریٰ كجوازها في المدن والأمصار، لأن حرة بني بياضة يقال: قرية علیٰ ميل من المدينة"

''اس حدیث میں فقہی نکتہ یہ ہے کہ دیہات میں جمعہ اسی طرح جائز ہے، جس طرح چھوٹے اور بڑے شہروں میں، کیونکہ حرہ بنی بیاضہ مدینے سے ایک میل پر ایک گاؤں ہے، جہاں اسعد بن زرارہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے جمعہ پڑھایا کرتے تھے۔''

حافظ ابن القیم نے "تهذيب السنن" (۲/ ۱۰) میں اس کی صراحت فرمائی ہے۔ حرہ بنی بیاضہ کا تذکرہ شروحِ حدیث سبل السلام، فتح العلام، عون المعبود وغیرہ میں مرقوم ہے۔[4] یہ واقعی چھوٹی سی بستی ہے اور یہ خیال کہ یہ امر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مخفی رہا، ناممکن ہے۔ اسعد بن زرارہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت سے چند دن پہلے جمعہ پڑھایا تھا، اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ تشریف لے آئے تو مشکل ہے کہ اتنی جلدی کا واقعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سمعِ گرامی تک نہ پہنچا ہو۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کی عادت تھی کہ وہ چھوٹی چھوٹی دین کی باتیں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ضرور ذکر کرتے تھے۔ اتنا اہم واقعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک نہ پہنچا ہو، ناممکن ہے۔

اسعد بن زرارہ کی حدیث کے متعلق ابن حزم فرماتے ہیں:

---

[1] فتح الباري (۲/ ۳۸۱)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (۱۰۶۹)

[3] نيل الأوطار (۳/ ۲۷۱) عون المعبود (۳/ ۲۸۰)

[4] سبل الأوطار (۳/ ۲۸۳) عون المعبود (۳/ ۳۸۲)

"أما الشافعي فإنه احتج بخبر صحيح روينا من طريق الزهري" (المحلیٰ: ٥/ ٤٧)

صحیح احادیث سے صراحتاً اور قرآنِ عزیز اور اقوالِ صحابہ رضی اللہ عنہم سے دیہات میں جمعہ کا ثبوت جب ملتا ہے تو بعض اہلِ علم جن تک یہ اطلاع نہیں پہنچی یا وہ اسے اس طرح نہیں سمجھ سکے، جس طرح اسے باقی ائمہ نے سمجھا ہے تو ان کے مقلدین کو دیہات میں جمعہ ادا کرنے سے روکنے کا حق نہیں۔ ہاں اگر وہ خود پابندیِ تقلید میں نہیں پڑھنا چاہتے تو وہ مختار ہیں۔

مذاہبِ ائمہ:

ابن حزم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"ويصليها المسجونون والمختفون ركعتين في جماعة بخطبة كسائر الناس، وتصلىٰ في كل قرية صغرت أم كبرت" (المحلیٰ: ٥/ ٤٩)

"قیدی اور مفرور لوگ دو رکعت خطبے کے ساتھ ادا کریں اور بستی چھوٹی ہو یا بڑی، اس میں جمعہ درست ہے۔"

دوسرے مقام پر فرماتے ہیں:

"قال بعض الحنفيين: لو كان ذلك لكان النقل به متصلا"

"اگر جمعہ دیہات میں جائز ہوتا تو تواتر اور تعامل سے اس کا ثبوت ملتا۔"

ابن حزم رحمہ اللہ اس کے جواب میں فرماتے ہیں:

"فيقال له: نعم، قد كان ذلك، حتى قطعه المقلدون بضلالهم عن الحق، وقد شاهدنا جزيرة ميورقة يجمعون في قراها، حتى قطع ذلك بعض المقلدين لمالك، وباء بائثم النهي عن صلاة الجمعة، وروينا أن ابن عمر كان يمر علىٰ المياه، وهم يجمعون فلا ينهاهم عن ذلك، و عن عمر بن عبدالعزيز أنه كان يأمر أهل المياه أن يجمعوا، ويأمر أهل كل قرية لا ينتقلون بأن يؤمر عليهم أمير يجمع بهم" (المحلیٰ: ٥/ ٥٢)

"ان حضرات سے کہنا چاہیے کہ واقعی جمعہ تمام دیہات میں ہوتا تھا اور اس کا تعامل موجود تھا، یہاں تک کہ بعض غلط کار مقلدین نے اسے بند کرا دیا اور جمعہ سے روکنے کی معصیت اپنے ذمے لے لی۔ ابن عمر پانیوں اور ڈیروں پر لوگوں کو جمعہ پڑھتے دیکھتے تھے اور منع نہیں فرماتے تھے۔ عمر بن

عبدالعزیز نے اہلِ میاہ کو جمعہ ادا کرنے کا حکم دیا اور ہر بستی کو، جس کی اقامت مستقل ہو، حکم دیا کہ ان کا امیر جمعہ پڑھائے۔''

پھر فرماتے ہیں:

''ومن أعظم البرهان عليهم أن رسول اللهﷺ أتى المدينة، وإنما هي قرى صغار مفرقة، بنو مالك بن النجار في قريتهم حوالي دورهم أموالهم ونخلهم، و بنو عدي بن النجار في دارهم كذلك، وبنو مازن ابن النجار كذلك، و بنو سالم كذلك، وبنو ساعدة كذلك، وبنو الحارث ابن الخزرج كذلك، وبنو عمرو بن عوف كذلك، وبنو عبد الأشهل كذلك، وسائر بطون الأنصار كذلك، فبنىٰ مسجده في مالك بن النجار فجمع فيه في قرية ليست بالكبيرة، ولا مصر هنالك، فبطل قول من ادعىٰ أن لا جمعة إلا في مصر، وهذا الأمر لا يجهله أحد، لا مؤمن ولا كافر، بل هو نقل الكواف من شرق الأرض إلى غربها، وبالله التوفيق''

(المحلى: ٥/ ٥٤)

''دیہات میں جمعہ سے روکنے والوں کے خلاف بڑی عظیم الشان دلیل یہ ہے کہ جب آنحضرت ﷺ مدینہ منورہ میں تشریف لائے تو یہ خود چھوٹی چھوٹی بستیوں کی صورت میں تھی۔ بنو مالک بن نجار کا مال اور کھجوروں کے باغ الگ تھے۔ بنو عدی بن نجار اور بنو مازن کے اموال اور زمینوں کا بھی یہی حال تھا۔ بنو سالم، بنو ساعدہ، بنو حارث بن خزرج اور بنو عمرو بن عوف اور بنو اشہل بھی اسی طرح الگ الگ دیہاتی زندگی بسر کرتے تھے۔ انصار کے تمام قبائل اسی طرح زندگی گزارتے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے مسجد کی بنیاد بنو مالک بن نجار میں رکھی اور جمعہ قائم فرمایا۔ یہ چھوٹی سی آبادی تھی۔ یہاں کوئی شہر آباد نہیں تھا۔ یہ صورتِ حال ہر مسلمان اور کافر پر ظاہر ہے، بلکہ مشرق ومغرب کے مورخین نے اسے نقل کیا ہے۔''

ہجرت کی طویل حدیث سے، جسے ابن سعد، ابن کثیر، ابو القاسم سہیلی وغیرہ نے تفصیلاً نقل فرمایا ہے، ظاہر ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی ناقہ جب قبیلے کے میدان کے سامنے سے گزری تو ہر قبیلے نے آنحضرت ﷺ کو ان کے ہاں قیام کی دعوت دی۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:« ذروها فإنها مأمورة » (اسے چھوڑ دو، یہ حسب الحکم جا رہی ہے) چنانچہ ناقہ پہلے بنو مالک کی بستی میں سہل اور سہیل دو یتیم بچوں کے مربد کے سامنے بیٹھ گئی، پھر

ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے صحن کے سامنے بیٹھ گئی، انھوں نے پالان اٹھا کر رکھ لیا اور آنحضرت ﷺ یہیں بطورِ مہمان فروکش ہوئے۔[1] (ابن سعد، البداية والنهاية، الروض الأنف، سيرة ابن هشام)

اس سے ظاہر ہے کہ مدینہ خود مصر جامع نہیں تھا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اثر کے مطابق تو برسوں اس پر مصر جامع کی تعریف صادق نہ آسکی۔

"وكل مدينة جامعة فهي الفسطاط، ومنه قيل لمدينة مصر التي بناها عمرو بن العاص: الفسطاط" (فرائد اللغة: ٢٨١)

"مدینہ جامعہ مصر ایسے شہر کو کہتے ہیں، جس کی بنا عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے رکھی تھی۔"

حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ جو تمام اہلِ توحید میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں، جمعہ کے اجتماع اور فی الجملہ مدینے کا تذکرہ فرمانے کے بعد لکھتے ہیں:

"أقول: وذلك لأنه لما كان حقيقة الجمعة إشاعة الدين في البلد، وجب أن ينظر إلىٰ تمدن وجماعة، والأصح عندي أنه يكفي أقل ما يقال فيه قرية، لما روي من طرق شتىٰ يقوي بعضها بعضا: خمسة لا جمعة عليهم، وعد منهم أهل البادية،[2] قال ﷺ: الجمعة علىٰ خمسين رجلا.[3] أقول: الخمسون يتقرىٰ بهم قرية. قال ﷺ: الجمعة واجبة علىٰ كل قرية"[4] (حجة الله البالغة: ٢/ ٣٠)

"جمعہ کا مقصد شہری آبادیوں میں دین کی اشاعت ہے، اس لیے جماعت اور مدینہ کا لحاظ رکھنا ضروری ہوا۔ میرے نزدیک کم از کم، جسے قریہ کہا جائے، جمعہ کے لیے کافی ہے۔ آنحضرت ﷺ سے باختلافِ طرق مروی ہے، جو ایک دوسرے کے موید ہیں: پانچ قسم کے لوگوں پر جمعہ نہیں، ان میں خانہ بدوش بادیہ نشینوں کو شمار فرمایا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: پچاس آدمیوں پر جمعہ فرض ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں: اسی تعداد پر قریہ کا لفظ بولا جاتا ہے۔ آنحضرت کا ارشاد ہے: ہر بستی پر جمعہ واجب ہے۔"

---

[1] طبقات ابن سعد (١/ ٢٣٧) البداية والنهاية (٣/ ١٩٦) الروض الأنف للسهيلي (١/ ٢٣٥) السيرة لابن هشام (١/ ٤٩٤)

[2] المعجم الأوسط (١/ ٧٢) اس کی سند میں رشدین بن سعد اور ابراہیم بن حماد ضعیف ہیں۔ نیز یہ حدیث ایک دوسری سند سے بھی مروی ہے، لیکن اس میں حفص بن سالم سخت ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٣٥٥٥)

[3] المعجم الكبير (٧٩٥٢) اس کی سند میں جعفر بن زبیر راوی متروک ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (١٢٠٣)

[4] یہ حدیث بھی سخت ضعیف، بلکہ موضوع ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (١٢٠٤)

ایک تلخ حوالہ بھی سن لیجئے:

"ازیں جا معلوم شد کہ اشتراطِ شے زائد بر نماز ہائے فرض برائے ایں نماز مثل امام اعظم و مصر جامع و عددِ مخصوص و نحو آں مستند صحیح ندارد دلیلے بر استحبابش نیست چہ جائے وجوب تا بشرطیت چہ رسد" (دليل الطالب إلىٰ أرجح المطالب، ص: ٢٦٢)

''جمعہ کے لیے امیر، مصر جامع اور عدد معین کے لیے کوئی صحیح دلیل ثابت نہیں ہوئی۔ وجوب یا شرط تو بڑی بات ہے، ان کے استحباب کی بھی کوئی دلیل نہیں ملتی۔''

جمعہ سے روکنا اور اس قسم کی دھاندلی کی جراَت فرقہ وارانہ دھڑے بندیوں ہی سے ہو سکتی ہے، اس لیے مناسب ہے کہ بعض دوسرے فقہائے مذاہب کی آرا پر بھی غور کر لیا جائے۔

(۱) مغنی ابن قدامہ کے شارح فرماتے ہیں:

"وأهل القرية لا يخلون من حالين: أما أن يكون بينهم وبين المصر أكثر من فرسخ، لم يجب عليهم السعي إلى الجمعة، وحالهم معتبر بأنفسهم فإن كانوا أربعين اجتمعت فيهم الشرائط فعليهم إقامة الجمعة، ولهم السعي إلى مصر، والأفضل إقامتها في قريتهم، لأنه متى سعىٰ بعضهم احتل علىٰ الباقين إقامة الجمعة، وإذا أقاموا حضروها جميعا..." (الشرح الكبير لمغني ابن قدامة: ٢/ ١٤٨)

اس کے قریب قریب ابن قدامہ نے مغنی (۲/ ۱۷۱) میں ذکر فرمایا ہے۔

''اگر بستی اور شہر میں ایک فرسنگ کا فرق ہو تو ان کے لیے شہر جانا ضروری نہیں، بلکہ ان کے ذاتی حالات کی بنا پر فیصلہ ہوگا۔ اگر وہ چالیس ہوں تو ان میں جمعہ کی شرائط پائی جائیں گی، ان پر جمعہ فرض ہوگا۔ اگر پسند کریں تو شہر میں پڑھیں، مگر افضل یہ ہے کہ وہ گاؤں میں پڑھیں، کیونکہ اگر کچھ شہر چلے جائیں تو باقی لوگوں کے جمعہ میں خلل واقع ہوگا۔ اگر وہ گاؤں میں پڑھیں تو سب لوگ جمع ہو جائیں گے۔''

(۲) ابن رشد مالکی شروطِ جمعہ کے ذکر میں فرماتے ہیں:

طبری کا خیال ہے کہ ایک امام اور ایک مقتدی ہو تو ان پر جمعہ فرض ہے۔ بعض نے فرمایا ہے کہ امام کے علاوہ دو آدمی ہوں تو جمعہ فرض ہوگا۔ حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امام کے علاوہ تین آدمی ہوں تو جمعہ فرض ہوگا۔ امام احمد رحمہ اللہ اور شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ چالیس ہوں تو جمعہ فرض ہوگا۔ بعض نے تیس افراد کا تعین فرمایا ہے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں:

"ومنهم من لم يشترط عددا، ولكن رأيهم أنه يجوز بما دون الأربعين، ولا يجوز بالثلاثة والأربعة، وهو مذهب مالك، وحدهم بأنهم الذين يمكن أن تتقرىٰ بهم قرية" (بداية المجتهد: ١/ ١٤٤)

"بعض نے کوئی عدد متعین نہیں فرمایا، لیکن ان کا خیال ہے کہ چالیس آدمی ضروری نہیں، لیکن تین اور چار افراد سے بھی جمعہ نہیں ہوگا۔ امام مالک رحمہ اللہ کا یہی مذہب ہے اور یہ تحدید اس لیے ہے کہ اس مقدار سے قریہ کا مطلب پورا ہو جاتا ہے۔"

③ باجی موطا کی شرح میں استیطان کی تفصیل فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

"وأما موضع الاستيطان فإنما يعني به المصر والقرية" (باجی: ١/ ١٩٦)

نیز لکھتے ہیں:

"أما القرية فإن مالكا رحمه الله جعلها في ذلك بمنزلة المصر" (حوالہ مذکورہ)

امام مالک شہر اور دیہات کو جمعہ کے معاملے میں مساوی سمجھتے ہیں۔

④ امام شافعی کتاب الام میں فرماتے ہیں:

"سمعت عددا من أصحابنا: تجب الجمعة علىٰ أهل دار مقام إذا كانوا أربعين رجلا، وكانوا أهل قرية فقلنا به... إلى أن قال: وروي أنه ﷺ كتب إلى أهل قرى عرينة أن يصلوا الجمعة والعيدين..." (كتاب الأم: ١/ ١٦٩)

"ہمارے رفقا کا خیال ہے کہ جس بستی میں چالیس آدمی اقامت پذیر ہوں، اس گاؤں والوں پر جمعہ فرض ہے۔ مجھے اس کے خلاف کوئی حدیث نہیں ملی، اس لیے میں نے یہی قول پسند کیا ہے۔"

⑤ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"تجب الجمعة علىٰ من أقام في غير بناء كالخيام وبيوت الشعر ونحوها، وهو أخذ في قول الشافعي، وحكىٰ الأزجي رواية عن أحمد: ليس علىٰ أهل البادية جمعة، لأنهم ينتقلون فأسقطها عنهم، وعلل بأنهم غير مستوطنين، و قال أبو العباس في موضع آخر: يشترط مع إقامتهم في الخيام ونحوها أن يكونوا يزرعون كما يزرع أهل القرية" (الاختيارات العلمية، ص: ٤٧)

"اہلِ خیام اگر خیموں وغیرہ میں اقامت اختیار کر لیں تو ان پر جمعہ واجب ہوگا۔ یہ امام شافعی رحمہ اللہ

ہی کے قول سے ماخوذ ہے۔ اَزَجی نے امام احمد سے روایت فرمایا ہے: اہلِ بادیہ پر جمعہ فرض نہیں، کیونکہ وہ مختلف مقامات میں منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ ابو العباس فرماتے ہیں: اگر وہ زراعت کا کام شروع کرلیں تو وہ مقیم تصور ہوں گے۔‘‘

میں نے ائمہ اجتہاد اور ان کے بعض متبعین کے اقوال دو مقاصد کے لیے نقل کیے ہیں: اول یہ کہ اس اختلاف میں ائمہ کا موقف اور ان کے دلائل معلوم ہو جائیں۔ دوم ایسے اختلاف میں جہاں ہر امام اور عالم کے پیشِ نظر کچھ دلائل اور نظریات ہوں، وہاں ایک مقلد یہ تو کرسکتا ہے کہ اپنی کم علمی کی وجہ سے اپنے مسلک کی پابندی کرے، لیکن دوسرے کو روکنا یا دھاندلی کرنا، نہ شرعاً درست ہے نہ عرفاً، جیسے کہ دیہات میں بعض مقامات میں ہورہا ہے، نیز ایک امام کے اَتباع اگر جبراً اپنا مسلک منوانے کی کوشش کریں گے تو دوسرا بھی یہی روش اختیار کرے گا تو ملک کا امن تباہ ہوگا۔ باہمی آویزش بڑھے گی اور یہ ہنگامے کسی امام کے نزدیک بھی درست نہیں۔

فقہائے حنفیہ کے نزدیک جب چار آدمی جمعہ پڑھ سکتے ہیں تو شہر پر زور دینا اور اس کے لیے ہنگامہ بپا کرنا غیر معقول معلوم ہوتا ہے۔ شہر کی شرط کا حاضری پر کچھ تو اثر ہونا چاہیے، چار آدمی تو چھوٹے سے چھوٹے گاؤں میں بھی جمع ہوسکتے ہیں۔ فقہائے حنفیہ کے مسلک کے مطابق ان دونوں باتوں میں کوئی مطابقت نہیں پائی جاتی۔

جمعہ کب فرض ہوا؟

عموماً فقہائے حنفیہ اور شوافع رحمہم اللہ نے فرضیتِ جمعہ پر سورت جمعہ کی آیت: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نُودِيَ لِلصَّلَاةِ مِن يَوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ﴾ سے استدلال فرمایا ہے۔ سورت جمعہ جمہور ائمہ اسلام کے نزدیک مدینہ منورہ میں نازل ہوئی، جیسے زرکشی اور سیوطی اور مصنف المبانی نے مقدمہ تفسیر میں بیان فرمایا ہے، اس لیے بعض علما کا خیال ہے، جمعہ مدینہ منورہ میں فرض ہوا۔ حرہ بنی بیاضہ میں آنحضرت ﷺ کی آمد سے قبل اسعد بن زرارہ نے جمعہ پڑھایا۔ آنحضرت ﷺ نے عمرو بن سالم کی بستی میں جمعہ پڑھایا، بنو مالک بن نجار کے ڈیرے پر مسجدِ نبوی کی تعمیر فرمائی، اس وقت حسبِ ارشاد ائمہ تاریخ و سیر مدینہ خود ایک گاؤں تھا، اس کے بعد جواثی میں جمعہ ہوا، جو بحرین کا ایک گاؤں ہے، بظاہر اس وقت یہ جمعے سب دیہات ہی میں پڑھے گئے، ان آثار سے بظاہر یہی ثابت ہوتا ہے کہ جمعہ کی فرضیت کہیں ہو، لیکن مکہ میں اس کی اقامت کا موقع نہ مل سکا۔ اسعد بن زرارہ نے ہجرت سے پہلے حرہ بنی بیاضہ میں نمازِ جمعہ ادا فرمائی اور اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی کہ یہ مقام شہر ہے یا گاؤں؟ اسعد بن زرارہ نے کعب بن لؤی کی عادت کے مطابق پڑھا ہو یا آنحضرت ﷺ کے ارشاد کے مطابق، بہر حال حرہ بنی بیاضہ شہر نہیں۔

قریہ۔ مدینہ۔ مصر:

علامہ قسطلانی ارشاد الساری میں فرماتے ہیں:

"القرية: واحدة القرىٰ، كل مكان اتصلت فيه الأبنية، واتخذ قراراً، ويقع ذلك علىٰ المدن وغيرها، والأمصار: المدن الكبار، واحدها مصر، والكفور القرىٰ الخارجة عن المصر، واحدها كَفر بفتح الكاف" (إرشاد الساري: ٢/ ١٦٦)

"قریٰ، قریہ کی جمع ہے۔ یہ اس جگہ کو کہا جاتا ہے، جہاں مکان باہم ملے ہوئے ہوں اور لوگ وہاں قرار پذیر ہوں۔ کبھی قریہ کا لفظ قصبہ وغیرہ پر بھی بولا جاتا ہے اور مصر بڑے شہر کو کہا جاتا ہے۔ شہر سے باہر کی بستیوں کو کَفر کہتے ہیں۔"

"فرائد اللغة" میں اماکن اور ان کے امتیازات کی زیادہ وضاحت کی ہے:

"القرية: كل مكان اتصلت فيه الأبنية، واتخذ قراراً، ويقع ذلك علىٰ المدن وغيرها، والأمصار: المدن الكبار، واحدها مصر، والمدرة القرية والمدينة. يقال: فلان سيد مدرة، والكفور: القرىٰ الخارجة عن المصر ... والقصبة: المدينة أو معظم المدن، والقرية والبلد كلاهما اسم لما هو داخل الربص، وكل مدينة جامعة فهو فسطاط..." (ص: ٢٨١)

ان عبارات سے ظاہر ہے کہ یہ نام الگ ہیں۔ ایسے اضافی ناموں کے متعلق لغت میں کوئی قطعی حد نہیں، اس لیے کسی وقت بعض ناموں کا استعمال دوسرے ناموں کی جگہ ہو جاتا ہے، لیکن یہ اِطلاق حقیقی نہیں ہوگا، بلکہ تسامح کے طور پر ہوگا۔ بحث کو طول دینا مطلوب ہو تو علما کے لیے چنداں مشکل نہیں، لیکن حقیقت یہی ہے کہ قریہ کا لفظ مدینہ سے چھوٹی بستی پر بولا جاتا ہے۔ مدینہ عموماً قصبہ کے مرادف ہے، خصوصاً جب قریہ کا لفظ مدینہ کے بالمقابل بولا جائے تو اس سے مراد یقیناً گاؤں ہی ہوگا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اثر "لا جمعة ولا تشريق إلا في مصر جامع"[1] (عبدالرزاق) کے مطابق جس سے یہ اختلاف شروع ہوا ہے، جمعہ نہ دیہات میں ہو سکتا ہے، نہ قصبات میں، نہ چھوٹے شہروں میں، اس کے لیے تو مصر جامع یعنی فسطاط کے سوا کوئی چارہ معلوم نہیں ہوتا۔ احناف رحمہم اللہ نے اس میں لچک کہاں سے پیدا فرمائی؟ لغت کے لحاظ سے تو مصر جامع بغداد، لاہور، دہلی ایسے شہروں پر بولا جانا چاہیے اور وہیں جمعہ ہونا چاہیے۔

---

[1] مصنف عبد الرزاق (٣/ ١٦٨)

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اثر کا مفاد تو اس سے چھوٹے شہروں میں پورا نہیں ہو سکتا۔

احناف کرام کا موجودہ طرزِ عمل نہ قرآن عزیز کے مطابق ہے نہ احادیث سے اس کی تائید ہوتی ہے، نہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اثر سے یہ مطلب حاصل ہوتا ہے، یہ بظاہر کچھ مصالح پر مبنی معلوم ہوتا ہے۔ حضرات علما نے جس طرف چاہا، مسئلے کا رخ پھیر دیا۔ اثرِ علی رضی اللہ عنہ صرف بحث ونظر کے لیے ہے، عمل کے لیے نہیں ہے۔ یہی حال حضرات احناف کا خطبہ جمعہ کے متعلق ہے۔ وہ عربی کے سوا خطبہ درست نہیں سمجھتے، لیکن جب وقت کی مصالح نے مجبور کیا تو دو کے بجائے تین خطبے وضع فرما لیے۔ عربی میں تیسرا خطبہ وقتی مصالح کی نذر کر دیا گیا، اس بدعت کے لیے اس طرح گنجایش ہوگی، جس طرح اثر حضرت علی رضی اللہ عنہ میں توسیع سے پیدا کر لی گئی!!

مصر کیا ہے؟

اس کے بعد سوال پیدا ہوتا ہے کہ مصرِ جامع کی تعریف کیا ہے؟ فقہاے حنفیہ رحمہم اللہ کے ہاں اب تک اس کا مفہوم متعین نہیں ہو سکا:

1. "والمصر عند أبي حنيفة رحمه الله: كل بلدة فيها ملك وأسواق، ولها رساتيق، و وال لرفع الظلم، وعالم يرجع إليه في الحوادث، وعن أبي يوسف: كل موضع له أمير وقاض، ينفذ الأحكام، وهو مختار الكرخي، وأيضا: أن يبلغ سكانه عشرة آلاف" (إرشاد الساري: ٢/ ١٦٧)

2. "المصر: هو ما لا يسعهم أكبر مساجد أهله المكلفين بها... أيضا: وظاهر المذهب أنه كل موضع له أمير وقاض، يقدر على إقامة الحدود" (در مختار: ١/ ٨٣٥)

3. شامی پہلی تعریف کے متعلق فرماتے ہیں:

"هذا يصدق علىٰ كثير من القرىٰ" (رد المحتار: ١/ ٨٢٥)

4. علامہ کاسانی فرماتے ہیں:

"وأما المصر الجامع فقد اختلفت الأقاويل في تحديدها، ذكر الكرخي أن المصر الجامع ما أقيمت فيه الحدود، ونفذت فيه الأحكام، وعن أبي يوسف روايات ذكر في الإملاء: كل مصر فيه منبر وقاض، ينفذ الأحكام، ويقيم الحدود، فهو مصر جامع تجب الجمعة علىٰ أهله، وفي رواية: قال: إذا اجتمع في قرية من لا يسعهم مسجد واحد، بنىٰ لهم الإمام جامعا، ونصب لهم من

يصلي بهم الجمعة، وفي رواية: لو كان في القرية عشرة آلاف أو أكثر، أمرتهم بإقامة الجمعة فيها، وقال بعض أصحابنا: المصر الجامع ما يتعيش فيه كل محترف بحرفته من سنة إلىٰ سنة من غير أن يحتاج إلى الانتقال إلى حرفة أخرى، وعن أبي عبد الله البلخي: أحسن ما قيل فيه: إذا كانوا بحال لو اجتمعوا في أكبر مساجدهم لم يسعهم ذلك، حتى احتاجوا إلى بناء مسجد الجمعة، فهذا مصر تقام فيه الجمعة. قال سفيان الثوري: المصر الجامع ما يعده الناس مصرا عند ذكر الأمصار المطلقة، وسئل أبو القاسم الصفار عن حد المصر الذي تجوز فيه الجمعة فقال: أن تكون لهم منعة، لو جاءهم عدو قدروا علىٰ دفعه... إلى أن قال: وروي عن أبي حنيفة أنه بلدة كبيرة، فيها سكك وأسواق، ولها رساتيق، وفيها والٍ يقدر علىٰ إنصاف المظلوم من الظالم بحشمه وعلمه أو علم غيره" (بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع للكاساني: ١/ ٢٥٩)

''مصرِ جامع کی تعریفیں مختلف ہیں۔ کرخی فرماتے ہیں: جس میں حدیں جاری ہوں اور اَحکام نافذ ہوں۔ امام ابو یوسف رحمہ اللہ سے کئی روایات ہیں: جس میں منبر ہو اور قاضی ہو اور حدیں نافذ ہوں۔ جس کی مسجد میں وہاں کے لوگ نہ سما سکیں۔ جس کی آبادی دس ہزار کی ہو یا اس سے بھی زیادہ۔ بعض اصحاب نے فرمایا: جس میں ہر صنعت کار یا کاریگر اپنی صنعت پر پورا سال گزر اوقات کر سکے۔ جس میں وہاں کی بڑی مسجد میں وہاں کے رہنے والے نہ سما سکیں۔ سفیان ثوری فرماتے ہیں: جس کا ذکر مطلقاً شہروں کے تذکرے میں آجائے۔ ابو القاسم صفار فرماتے ہیں: جہاں دشمن کے دفاع کے لیے سامان موجود ہو۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: جس میں بازار، کوچے اور محلے ہوں اور بادشاہ ہو، جو ظالم اور مظلوم میں دادرسی کر سکے۔''

اس اختلاف سے ظاہر ہے کہ نہ شارع نے یہ شرط عائد فرمائی ہے نہ مصر کی کوئی جامع تعریف فرمائی ہے، نہ اس کی ضرورت تھی۔ علما نے اپنے ماحول کے لحاظ سے یہ تعریفیں کی ہیں، اس لیے یہ اختلاف اور دھاندلی بالکل قدرتی ہے، اس میں اہلِ علم پر کوئی الزام نہیں۔ خرص و تخمین کا ہمیشہ یہی حال ہوتا ہے۔ پانی نکالنے والے ڈول کا بھی قریباً یہی حال ہے!!

گزارش صرف اس قدر ہے کہ جب ایک چیز کی حقیقت متعین ہی نہیں، اس کے متعلق یہ تشدد کیوں ہو؟

ان تعریفات میں بعض ایسی ہیں، جو آج کل بڑے بڑے شہروں پر صادق نہیں آتیں اور بعض چھوٹے چھوٹے گاؤں پر صادق آتی ہیں۔ رہا شہر کو گاؤں بنانا یا گاؤں کو شہر بنانا، ان تعریفات کا ادنیٰ کرشمہ ہے!!

خطبہ کا مقصد:

احادیث میں آیا ہے کہ آنحضرت ﷺ خطبے میں وعظ اور نصیحت فرماتے تھے،[1] کیوں کہ جمعے کے اجتماع سے یہ فائدہ حاصل کرنا، خطبہ جمعہ کا اہم مقصد ہے۔ بعض احادیث میں آیا ہے:

"اشتد غضبه وعلا صوته" خطبے میں آنحضرت ﷺ کی آواز بلند ہوجاتی اور چہرہ مبارک پر ناراضی کے آثار نمایاں ہوجاتے، گویا آپ ﷺ کسی لشکر کو آنے والے خطرات سے ڈرا رہے ہیں۔[2]

اگر یہ مقصد درست ہے تو معلوم نہیں عورتوں اور اہلِ دیہات کو اس فیضان سے محروم رکھنے کی کیوں کوشش فرمائی جاتی ہے؟ کسی زمانے میں مسلمان بادشاہ پر زور تھا، پھر عورتوں کو روکنے پر زور تھا، اب یہ دونوں چیزیں مدہم پڑ گئی ہیں۔

حضرات دیوبند جو فقہ حنفی پر عمل کے زیادہ مدعی ہیں، ان کے ہاں بھی بعض جگہ جمعات میں عورتیں آنے لگی ہیں اور عام مجالس میں تو اب کوئی پابندی نہیں۔ تعجب ہے دیہات کی آبادیٰ سے دونوں حضرات ناراض ہیں۔ تبلیغی مجالس میں دیہاتی شریک ہوتے ہیں، لیکن جمعہ کے لیے ان پر پابندی بدستور ہے!!

حضرت الامام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا علم و فضل، زہد و تقویٰ، دقتِ نظر، وسعتِ ادراک، اسلام اور اس کے مصالح کے متعلق ان کے گہرے احساسات؛ تاریخ اور علم رجال کی ایک مسلمہ حقیقت ہے، لیکن یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ جمعہ کے مسئلے میں دیہات پر یہ سختی کیوں ضروری سمجھی گئی؟ دیہاتیوں کے کاروبار کا یہی تقاضا ہے کہ ان کو اگر انتظام ہو سکے تو وہاں جمعہ پڑھنے کی اجازت دی جائے۔ وہ اگر شہر میں آئیں تو انھیں میلوں کا سفر طے کر کے آنا ہوگا۔ اہلِ شہر کے لیے کاروبار کے معاملے مین یہ ترجیح سمجھ میں نہیں آتی۔ معلوم ہے کہ اہلِ شہر کی مالی حالت اچھی ہوتی ہے۔ وہ اگر دن کا کچھ حصہ عبادت میں صَرف کریں، اس کے لیے سفر کر کے دوسری جگہ چلے جائیں تو اس میں معقولیت اور سنجیدگی معلوم ہوتی ہے۔ دیہاتی بے چارے میلوں شہر کی طرف بھاگیں، عقلاً اچھا معلوم نہیں ہوتا۔ اب ان کے لیے حنفی مذہب کی رُو سے دو ہی راہیں ہیں، یا وعظ و نصیحت سے ہمیشہ کے لیے محروم رہیں، پورے ماہ میں چار دفعہ بھی کلمۂ حق نہ سن سکیں یا پھر کاروبار کا نقصان برداشت کریں اور میلوں سفر کریں، جانوروں کو بھوکوں ماریں!!

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٨٦٢)

[2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٨٦٧)

معلوم ہوتا ہے حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور ان کے تلامذہ کرام نے یہ حکم بعض مصالح کی بنا پر دیا ہوگا، جس طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عمر کا آخری دور فسادات اور ہنگاموں کا دور تھا۔ ممکن ہے عراق کی دیہاتی آبادی کے لیے یہ حکم اس لیے دیا گیا ہو کہ وہ مفسدانہ اجتماعات سے بچے رہیں۔ اموی مبلغین کی آتش بیانیاں دیہاتی ذہن کو ماؤف نہ کر سکیں، ان حالات میں ''لا جمعة ولا تشريق إلا في مصر جامع'' وقتی مصالح کے مطابق ہوسکتا ہے، لیکن فقہائے کرام کا اسے دائمی اور شرعی حکم قرار دینا قطعی سمجھ میں نہیں آتا۔ عفا اللّٰہ عنا وعنهم.

البتہ وقتی حکم ہو تو سمجھ میں آتا ہے، حضرت امام رحمہ اللہ کا زمانہ بھی اموی حکومت کے وداع اور عباسی حکومت کی آمد ہے۔ ایسے اوقات میں دیہاتی آبادی کے لیے مناسب ہے کہ اس میں ہنگامے نہ ہوں۔

حاصل کلام:

حضرت امام علیہ الرحمۃ کے اَتباع کو یہ تو حق ہے کہ وہ جمعہ نہ پڑھیں، لیکن جو لوگ پڑھنا چاہیں، انھیں روکنا کسی طرح مناسب نہیں، خصوصاً جب کہ قرآنِ عزیز کی صراحت میں کوئی استثنا نہیں۔ سنتِ مرفوعہ صحیحہ میں اس تخصیص کی کوئی دلیل نہیں۔ ائمہ ثلاثہ، بلکہ تمام ائمہ اہلِ دیہات پر جمعہ فرض سمجھتے ہیں۔ فقط فقہائے حنفیہ سے بھی عوام اور متاخرین ہی اس قسم کی بے دلیل باتوں پر زور دیتے ہیں، حضرت امام اور ان کے اصحاب سے بھی اس تشدد کی کوئی سند نہیں ملتی۔

شبہات:

مناسب ہے ان شبہات کا بھی مختصر تذکرہ آجائے، جن کی بنا پر متاخرین کو اس نامناسب تشدد کی جراَت ہوئی۔ انھوں نے دیہات کے اہلِ اسلام کو قرآن اور سنت کے فیوض سے محروم رکھنے کی جراَت مندانہ کوشش کیوں کی؟

قبا میں جمعہ:

سیوطی فرماتے ہیں:

''ومن أمثلته أيضا: آية الجمعة فإنها مدنية، والجمعة فرضت بمكة'' (الإتقان: ١/ ٣٨)

''جن آیات کا حکم پہلے تھا، آیتِ اس کے بعد نازل ہوئی، جمعہ کے متعلق آیت ہے۔ یہ سورۃ مدینہ منورہ میں نازل ہوئی اور جمعہ مکہ مکرمہ میں فرض ہو چکا تھا۔''

فقہائے حنفیہ رحمہم اللہ کا خیال ہے کہ جمعہ جب مکہ مکرمہ میں فرض ہو چکا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے بعد قبا میں کیوں جمعہ نہ پڑھا اور اہلِ قبا کو کیوں جمعہ کا حکم نہ فرمایا؟ اس کی وجہ ظاہر ہے، قبا گاؤں تھا، وہاں جمعہ فرض نہ تھا۔

جواباً گزارش ہے کہ آپ کی ارشاد فرمودہ تعریفات کے پیشِ نظر تو اس وقت مدینہ منورہ بھی دیہات ہی

تھا، اسے شہر کہنا مشکل ہے۔ آنحضرت ﷺ کے منبر کے تذکرے میں صراحتاً آیا ہے کہ جب آنحضرت ﷺ کو منبر کی ضرورت محسوس ہوئی، اس وقت مدینہ منورہ میں ایک ہی بڑھئی تھا۔

عمارہ بن غزیہ روایت فرماتے ہیں:

"كان رسول اللهﷺ يخطب إلى خشبة، فلما كثر الناس، قيل له: لو كنتَ جعلتَ منبراً؟ قال: وكان بالمدينة نجار واحد، يقال له: ميمون" (فتح الباري: ٢/ ٢٧)

یعنی ان دنوں مدینے میں لکڑی کا کام کرنے والا ایک ہی آدمی تھا۔ یہ واقعہ ہجرت کے بعد کا ہے، اس وقت بھی گاؤں میں ایک ہی نجار تھا، اس سے اندازہ فرمائیے! یہ کتنا بڑا شہر ہوگا؟ اس لیے قبا اور مدینہ منورہ کے متعلق قریہ یا شہر کی بحث قبا میں جمعہ نہ پڑھنے کی علت قرویت کو قرار دینا اس میں کوئی استدلالی اہمیت معلوم نہیں ہوتی، البتہ بحث کو لمبا کیا جا سکتا ہے۔

اس سے قبل ابن حزم رحمہ اللہ نے وہاں کی قبائلی زندگی کا تفصیلی تجزیہ فرمایا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مدینہ چند قبائلی ڈیروں کے مجموعہ کا نام تھا، جو الگ الگ اپنی زمینوں پر آباد تھے۔ یہ آبادی کا انداز پہاڑی علاقوں میں خاص دیہاتی قسم کا ہے۔ آج بھی آزاد کشمیر میں ایسے دیہات موجود ہیں، جو میلوں میں پھیلے ہوئے ہیں اور وہ حقیقتاً گاؤں ہی کہلاتے ہیں۔

قبا میں قیام:

آنحضرت ﷺ کے سفرِ ہجرت اور قیامِ قبا کے متعلق مختلف روایات آئی ہیں۔ صحیح بخاری کی ایک روایت میں "بضع عشرة" (دس سے اوپر) حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں چودہ دن مرقوم ہے۔ کلبی اور ابن حبان کی روایت میں جزماً چار دن فرمایا ہے۔ بعض روایات میں تین دن بھی آیا ہے۔ بنی عمرو بن عوف کے بعض بزرگ بائیس دن قیام کا تذکرہ فرماتے ہیں۔ امام زہری سے تین دن کا قیام منقول ہے۔ ابن اسحاق پانچ دن فرماتے ہیں۔ (فتح الباري: ٣/ ٤٧٥، ٤٧٦)

1. ابن قیم فرماتے ہیں:

"ثم قدم رسول اللهﷺ المدينة فأقام بقباء في بني عمرو بن عوف، كما قاله ابن إسحاق يوم الاثنين ويوم الثلاثاء ويوم الأربعاء ويوم الخميس، أسس مسجدهم، ثم خرج يوم الجمعة فأدركته الجمعة في بني سالم ابن عوف فصلاها في المسجد الذي في بطن الوادي، وكانت أول جمعة صلّاها في المدينة، وذلك

قبل تأسيسه مسجده" (زاد المعاد: ١/ ٩٩)

"آنحضرت ﷺ مدینہ منورہ میں حسبِ روایتِ ابن اسحاق بنوعمرو بن عوف کی بستی میں سوموار سے خمیس تک رہے اور مسجد قبا کا سنگِ بنیاد رکھا۔ جمعہ کے دن وہاں سے رخصت ہوئے اور سب سے پہلا جمعہ بنوسالم بن عوف میں پڑھا۔ یہ مسجد نبوی کی تعمیر سے پہلا جمعہ تھا۔"

2. ابن سعد فرماتے ہیں:

"قالوا: أقام رسول الله ﷺ بين عمرو بن عوف يوم الاثنين والثلاثاء والأربعاء والخميس، وخرج يوم الجمعة فجمع في بني سالم، ويقال: أقام في بني عمرو بن عوف أربع عشرة ليلة" (طبقات ابن سعد: ١/ ٢٣٦، مطبوعہ بیروت جدید)

"آنحضرت ﷺ بنوعمرو بن عوف میں سوموار سے خمیس تک رہے، جمعہ کے دن نکلے، جمعہ بنوسالم میں پڑھا اور کہا گیا ہے کہ بنوعمرو بن عوف میں چودہ دن قیام فرمایا۔"

3. حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے بھی یہ تمام روایات ذکر فرمائی ہیں۔ (البداية والنهاية: ٣/ ١٩٨ أيضاً: ٣/ ٢١٢)

ابن کثیر رحمہ اللہ نے، جہاں آپ ﷺ نے جمعہ ادا فرمایا تھا، اس مقام کا نام وادی رانوناء لکھا ہے۔

4. مسعودی (۳۴۶ھ) فرماتے ہیں:

"وكان مقامه بقباء يوم الاثنين والثلاثاء والأربعاء والخميس، وسار يوم الجمعة ارتفاع النهار... إلى أن قال: حتى أدركته الصلاة في بني سالم فصلىٰ بهم يوم الجمعة" (مروج الذهب: ٢/ ٢٨٦)

مسعودی نے باقی روایات کا ذکر ہی نہیں فرمایا۔ ابوالقاسم سہیلی نے بھی قریباً سابقہ روایات کا ذکر فرمایا اور خلافِ عادت ان روایات میں تطبیق کی کوشش نہیں فرمائی۔ (روض الأنف: ٢/ ١١، ١٠)

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ان تواریخ کو مرتب کرنے کی کوشش فرمائی ہے، لیکن تطبیق دینے کی طرف توجہ نہیں دی۔ انھوں نے واقعات اس طرح مرتب فرمائے ہیں: آنحضرت ﷺ کا مکہ سے نکلنا (۲۳/ صفر) غارِ ثور سے نکلنا (یکم ربیع الاول)، قبا میں داخل ہونا (۸/ ربیع الاول) قبا میں قیام ۱۴ دن، مدینہ منورہ میں داخلہ (۲۲/ ربیع الاول) حسبِ روایات کلبی داخلہ مدینہ (۱۳/ ربیع الاول)۔ (فتح الباري: ٧/ ٢٤٤)

اخباری نکتہ نظر سے کلبی کی روایت وزنی معلوم ہوتی ہے۔ آنحضرت ﷺ جن مقاصد کے لیے مکہ مکرمہ سے نکلے تھے، ان کی اہمیت کے پیشِ نظر بنوعمرو بن عوف میں دو ہفتے قیام کوئی معنی نہیں رکھتا۔ دو چار دن ستانے

کے بعد ممکن عجلت کے ساتھ حضرت کو منزل مقصود پر پہنچ کر کام شروع کرنا چاہیے اور ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اپنی تبلیغی مساعی کو تیز تر کر دینا چاہیے۔ یہ مقصد ابن سعد کی روایت سے بہت حد تک مطابقت رکھتا ہے، اس روایت کے مطابق کوئی جمعہ ضائع نہیں ہوتا اور پہلا جمعہ پانچویں دن بنو سالم میں آیا، جو قریباً ایک سو صحابہ رضی اللہ عنہم کی معیت میں ادا فرمایا گیا۔

محدثانہ نقطۂ نظر سے صحیح بخاری کی روایت کو ترجیح ہونی چاہیے۔[1] رہا جمعہ کا سوال تو ظاہر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسافر تھے۔ عرب کی قبائلی آبادی، ان کی تعداد، جنگی قوت، جرأت اور حوصلہ مندی کا جائزہ لینا ضروری تھا۔ روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہر قبیلہ خواہش مند تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے محلے میں قیام فرمائیں، اس لیے یہ سوچنا بھی ضروری تھا کہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قیام کہیں قبائلی رقابت کو بیدار نہ کر دے۔ یہی رقابت باہمی عداوت کی آگ کے لیے ہوا کا کام نہ دینے لگے۔ یہ سوچنا از بس ضروری تھا کہ غلط مقام، غلط رفقا کا انتخاب ساری عمر کے لیے مصیبت نہ بن جائے، اس لیے ظاہر ہے کہ یہ ایام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بطورِ مسافر تذبذب میں گزارے۔ جب اقامت ہی یقینی نہ ہو، جمعہ کیسے فرض ہوا اور اس کی ادائیگی کیونکر ضروری ہو؟!

مشہور قول کے مطابق جمعہ مکہ میں فرض ہوا، لیکن ناہموار حالات کی وجہ سے ادا کرنے کی نوبت نہ آئی۔ اہلِ قبا کو ممکن ہے، ابھی فرضیت کا علم ہی نہ ہو، اس لیے یہ خیال کہ دیہی آبادی کی وجہ سے جمعہ نہیں پڑھا گیا، بالکل بے معنی سی بات معلوم ہوتی ہے۔ جب اسعد بن زرارہ کے جمعہ کے متعلق اہلِ علم کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ یہ جمعہ فرضیت کی بنا پر نہیں پڑھا گیا، بلکہ یہ کعب بن لؤی کی سنت کے طور پر تھا، جو عروبہ کے نام سے ہر ہفتے میں ایک اجتماع قرار پاتا تھا، اس لیے اہلِ قبا یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اگر نہ پڑھیں تو اس کی وجہ سفر یا لاعلمی تو ہوسکتی ہے، لیکن قرویت نہیں۔ اگر جمعہ کی فرضیت مدینہ منورہ میں ہو تو مسئلہ اور بھی واضح ہو جاتا ہے۔

ان روایات میں اخباری نقطۂ نظر ہو یا محدثانہ نظر، احناف کے مسلک کی تائید کے لیے اس میں کوئی گنجایش معلوم نہیں ہوتی۔ یہ بالکل ایسا ہے جیسے عرفات اور منیٰ میں جمعہ نہیں پڑھا جاتا نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھا، نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے رفقا نے، اس لیے کہ حاجی مسافر ہوتے ہیں، ان مقامات میں سفر کے لیے جمع تقدیم کی بھی اجازت ہے اور جمع تاخیر کی بھی۔ بعض حضرات نے عرفات اور منیٰ کو دیہات سمجھ کر عمومِ آیت: ﴿ يَاۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴾ کے لیے مخصص قرار دیا ہے۔ اب تو عرفات اور منیٰ میں آبادی ہے۔ حجۃ الوداع میں ترکِ جمعہ کی وجہ یا تو جنگل ہوگا یا سفر، دیہات کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۳۶۹٤)

غرض یہ ہے کہ آپ بنی عمرو بن عوف کے دعویٰ (۱۴ دن قیام) کو قبول فرمائیں یا ابن سعد کی روایت کو، احناف کے مسلک کو اس سے کچھ فائدہ نہیں۔

علامہ سمہودی (۱۰۱۱ھ) نے "وفاء الوفاء بأخبار دار المصطفیٰ ﷺ" جلد اول کے کئی اوراق میں ان اجتہادی اور محدثانہ روایات کو پھیلا دیا ہے، جس سے اس مقدس سفر کے کئی گوشے جستجو کی دعوت دیتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ کی دور اندیشی، معاملہ فہمی، علم تاویل الاحادیث میں اس کامل بشر، علیه الف تحية و سلام، کی مہارتِ تامہ معلوم ہوتی ہے اور علومِ نبوت کے عملی آثار و عواقب کا پتا چلتا ہے۔ جس طرح مکہ مکرمہ سے ہجرت کا مرحلہ کئی سال کی سوچ بچار کے بعد عمل میں آیا تھا، پوری عمر اقامت کے لیے جو مقام اختیار کیا جانے والا تھا، اس کے نشیب و فراز پر غور بھی اسی طرح اور اسی قدر ضروری تھا۔ ﴿وَ قُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّ اَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ﴾ کی ابدی صداقت کے لیے جس قدر قدرتی ذرائع مہیا کیے جا سکتے تھے، آنحضرت ﷺ، فداہ أبي و أمي، نے اپنی خداداد صلاحیت کو اس کے لیے صرف فرما دیا۔ اللهم صل و سلم عليه ما ظلت الخضراء وما اغبرت الغبراء.

سمہودی نے زیادہ تر حافظ ابن حجر وغیرہ کا تتبع فرمایا ہے۔ کچھ نئے معلومات بھی فراہم کیے ہیں، ان سے ان مشکلات کا پتا چلتا ہے جن کے عبور میں اتنا وقت صرف ہونا کوئی بڑی بات نہیں۔ سمہودی بحوالہ تاریخ صغیر بخاری حضرت انس رضی اللہ عنہ سے نقل فرماتے ہیں:

"حتى أقبل هو وصاحبه فكمنا في بعض جوانب المدينة، وبعثا رجلا من أهل البادية يؤذن بهما"

دوسری روایت میں ہے: "فكمنا في خرب المدينة" (وفاء الوفاء: ۱/ ۱۸۲)

یعنی آنحضرت ﷺ مدینہ منورہ پہنچ کر مدینے کے بعض ویرانوں میں چھپ کر بیٹھ گئے اور ایک بدوی کو بھیجا کہ انصار کو حضرت کے آنے کی اطلاع دے دے۔ (انصار نے تمام خطرات پر بقدرِ ضرورت قابو پا لیا تھا، اس لیے) قریباً پانچ سو آدمی آنحضرت ﷺ کے استقبال کے لیے آ گئے، اس کے باوجود آنحضرت ﷺ نے مدینے کے بجائے قبا میں بنو عمرو بن عوف کے پاس قیام فرمایا۔

سمہودی فرماتے ہیں: جب آنحضرت ﷺ کی ناقہ ابو ایوب رضی اللہ عنہ کے مکان کے سامنے بیٹھ گئی (یہ مکان بالکل اسی جگہ کے سامنے تھا، جہاں مسجد نبوی تعمیر ہوئی) تو جبار بن صخر خفیہ طور پر پاؤں سے ناقہ کو ٹھکور رہے تھے، جنھیں حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ نے تاڑ لیا اور ترشی سے انھیں روک دیا اور فرمایا: "يا جبار! لو لا الإسلام لضربتك بالسيف" اگر اسلام کا احترام مانع نہ ہوتا تو میں تمھیں تلوار سے درست کر دیتا، تم ناقہ کو اس لیے

کھجاتے ہو کہ آگے چلی جائے؟

سمہودی نے ایک اور خطرے کا بھی تذکرہ فرمایا ہے:

"لما نزل رسول الله ﷺ في بني عمرو بن عوف، وكان بين الأوس والخزرج ما كان من العداوة، وكانت الخزرج تخاف أن تدخل دار الأوس، وكانت الأوس تخاف أن تدخل دار الخزرج" (وفاء الوفاء: ۱/ ۱۷۸)

"آنحضرت ﷺ بنو عمرو بن عوف کے ہاں تشریف فرما تھے۔ اوس اور خزرج میں باہم عداوت تھی۔ خزرج کو خطرہ تھا کہیں اوس کے ہاں نہ اتر جائیں۔ اوس ڈرتے تھے کہیں خزرج کے ہاں نزول نہ ہو جائے۔"

آنحضرت ﷺ کی توجہات سے ان کا دھڑا بھاری ہو جائے۔ ان قبائلی رقابتوں کے ہوتے ہوئے ظاہر ہے کہ آنے والے مہمان کے لیے کسی قدر دور اندیشی اور معاملہ فہمی کے علاوہ نفسیاتی رجحانات کے متعلق سوچنے کی ضرورت ہے۔

اسعد بن زرارہ آنحضرت ﷺ سے چند دن قبل مدینہ منورہ تشریف لائے تھے، لیکن انھوں نے بعاث کے ہنگامے میں نبتل بن حارث کو قتل کیا تھا۔ آنحضرت ﷺ نے دریافت فرمایا کہ اسعد بن زرارہ کہاں ہے؟ سعد بن خیثمہ وغیرہ نے عرض کیا کہ حضرت اس نے ہمارا آدمی قتل کیا تھا، حسبِ قاعدہ وہ ہمارا مفرور ہے، چنانچہ رات کے دھند لکے میں اسعد بن زرارہ تشریف لائے، انھوں نے اپنا سر منہ لپیٹا ہوا تھا۔ حضرت ﷺ نے فرمایا: تم رات کو آئے ہو، حالانکہ ہمسایہ قبیلے کے ساتھ تمھارے تعلقات کافی ناخوشگوار ہیں۔ اسعد نے فرمایا: حضرت! جناب کی آمد کی خبر پا کر صورتِ حال کچھ بھی ہو، مجھے خدمتِ گرامی میں پہنچنا تھا۔

چنانچہ حضرت اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ وہیں شب باش ہوئے اور صبح واپس چلے گئے۔ آنحضرت ﷺ نے سعد بن خیثمہ، رفاعہ اور مبشر ابنائے منذر سے فرمایا کہ اسعد بن زرارہ کو پناہ دے دو، انھوں نے از راہِ کرامت فرمایا: آپ ان کی پناہ کا اعلان فرما دیں، ہماری طرف سے خود بخود پناہ ہو جائے گی۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: آپ ہی لوگوں کو پناہ کا اعلان کرنا چاہیے، چنانچہ سعد بن خیثمہ نے پناہ کا اعلان کیا اور صبح اسعد بن زرارہ کے گھر چلے گئے اور ان کی کمر میں ہاتھ ڈالے ظہر کے وقت بنو عمرو بن عوف میں لے آئے۔ یہ دیکھ کر قبیلہ اوس نے ایک اجتماعی اعلان کیا: "قالوا: يا رسول الله! كلنا له جار" (ہم سب نے اسعد کو پناہ دے دی)[1]

اس صلح وسلام کے پیغام بر نے یہ پندرہ دن آیندہ کے لیے زمین ہموار کرنے میں صرف فرمائے۔

---

[1] وفاء الوفاء (۱/ ۱۹۵)

فكان شغله ﷺ من عبادة في عبادة.

اتنے مقدس اور اہم التوا کو شہر اور گاؤں کی بحث بنانا ان مقدس خدمات کو کوڑیوں کے نرخ بیچنے کے مرادف ہوگا اور ابھی تک چونکہ جمعہ کی فرضیت کا اعلان بھی خاص اہمیت سے نہیں ہوا تھا، اس لیے اہلِ قبا نے اگر جمعہ نہ پڑھا ہو تو اسے جرم کیا، فروگزاشت بھی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ گو سمہودی نے سرسری طور پر ایک روایت ذکر فرمائی ہے:

"قيل: إنه كان يصلي الجمعة في مسجد قباء في إقامته هنالك، والله أعلم" (ص:۱۸۳)

''آنحضرت ﷺ جب تک قبا میں رہے، مسجدِ قبا ہی میں جمعہ ادا فرماتے رہے۔''

بعض حضرات نے قبا میں اِقامت کو دیہات میں عدمِ فرضیتِ جمعہ کے متعلق بڑی مستند دستاویز سمجھ کر ذکر فرمایا ہے، اس لیے مجھے کسی قدر تفصیل سے خطرات، ان کے متعلقہ تدابیر کا ذکر کرنا پڑا، ورنہ قبائلی حالات کو دیکھیے، حضرات فقہائے عراق ﷺ کا یہ استدلال چنداں پختہ معلوم نہیں ہوتا۔

حالات کی سازگاری:

آنحضرت ﷺ نے جب یہاں کے حالات کو ہموار فرما کر اصل منزل کی طرف کوچ فرمایا، اب چونکہ اقامت کا مسئلہ طے ہو چکا تھا کہ قبا کے بجائے مدینہ منورہ میں ہوگی، جمعہ کا وقت بنو سالم میں آیا، آنحضرت ﷺ نے بلا توقف جمعہ ادا فرمایا، کیونکہ اب یہ عظیم الشان مسافر اقامت کا فیصلہ فرما چکا تھا۔ (اللهم صل وسلم عليه) بنو سالم سے چلنے کے بعد ناقہ نے بنی الحبلی کا رخ کیا تو عبداللہ بن ابی نے بڑی وقاحت سے کہا:

"اذهب إلىٰ الذين دعوك فانزل عليهم" (وفاء: ۱۸۳)

''ان کے ہاں اترو، جن لوگوں نے تمھیں بلایا ہے۔''

اس شریر النفس کے علاوہ زمین ہموار ہو چکی تھی۔ تمام قبائل نے اقامت کے لیے پیش کش فرمائی۔ ناقہ چلتی گئی۔ آنحضرت ﷺ فرماتے رہے: "دعوها فإنها مأمورة" اسے چھوڑ دو، یہ حسب الحکم جا رہی ہے، چنانچہ موجودہ مسجدِ نبوی کے پاس حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے مکان کے بالمقابل ناقہ تھم گئی، آنحضرت ﷺ اتر گئے۔ ابو ایوب رضی اللہ عنہ نے سامان اپنے مکان میں رکھ لیا۔ یہ دو منزلہ مکان بقول بعض مورخین تبع الاول نے آنحضرت ﷺ ہی کے لیے بنایا تھا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: "الرجل مع رحله" آدمی اپنے سامان کے ساتھ ہوتا ہے۔ ابو ایوب کے گھر چلے گئے اور یہ فقرہ ایک ضرب المثل بن گیا۔[1]

گزارش:

فقہی اختلافات رہے ہیں اور رہیں گے۔ اَفہام اور طبائع کے اختلاف کا یہ قدرتی نتیجہ ہے، ہر فریق کو

[1] وفاء الوفاء (۱/ ۲۰۲)

حق ہے کہ اپنے مکتبِ فکر کے لیے حمایت حاصل کرے، لیکن اس کش مکش میں نبوت اور اس کے عالی قدر مقاصد کو اپنی پستیوں کے ساتھ ملانے کی سعی مناسب نہیں۔ قبا کی اقامت، اس کی مدت، مدینے کے ماحول اور قبائلی زندگی: ایسے مسائل ہیں جو آنحضرت ﷺ کی نبوت کے ساتھ حکمت کا پتا دیتے ہیں، جو کتاب کے ساتھ آنحضرت ﷺ کو عطا فرمائی گئی تھی، اسے فقہی موشگافیوں کی نذر کرنا کسی طرح بھی مناسب نہیں۔

"لا جمعة ولا تشريق" اور عدد کی تخصیص:

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس اثر پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے۔ احناف اور شوافع نے اس پر خوب خوب زور آزمائیاں کی ہیں۔ احناف کا منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن اور سنت کی عام اور صریح نصوص کا فیصلہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اثر کی روشنی میں کیا جائے، اس لیے کبھی وہ اسے حکما مرفوع فرماتے ہیں، کبھی قرآن و سنت کو مجمل قرار دے کر اثرِ علی رضی اللہ عنہ کو بطورِ تفسیر ان پر مسلط فرمانا چاہتے ہیں۔ معلوم ہے یہ سب ہاتھ کی صفائی ہے یا زبان کی ساحری اور اصطلاحات کی ہیرا پھیری۔ شوافع کا اعتراض واقعی وزنی تھا کہ آپ حضرات قرآن کی تخصیص کے لیے خبرِ واحد صحیح کو بھی پسند نہیں فرماتے، ادھر اپنا مطلب آیا تو سارا کام حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اثر سے لے لیا، اس الزام سے بچنے کے لیے یہ تمام حیلے تراشے گئے۔ والحقيقة وراء ذلك، كما هي تنظر نادمة خزيانة.

ادھر شوافع اسی اثر کو خارج البلد کرنا چاہتے ہیں اور اس معاملے میں ائمہ حدیث سے بھی انھیں خاصی مدد ملی ہے۔ واقعہ بھی یہی ہے کہ آثار سے تائید تو حاصل کی جا سکتی ہے، لیکن مسائل کا ثبوت تو بہر کیف کتاب و سنت ہی کا مرہونِ منت ہونا چاہیے۔ اثرِ علی رضی اللہ عنہ بصورتِ ثبوت بھی اس کی حیثیت صحابہ کے بعض تفردات کی ہوگی، جیسے عبداللہ بن مسعود کی تشبیک یا فاتحہ اور معوذتین کے متعلق قرآن سے علیحدگی کا خیال، ابن عباس کے نزدیک متعۃ النکاح کا جواز، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی متعۃ الحج سے رکاوٹ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا اِتمامِ صلوۃ فی السفر، حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مبتدعین کو جلانا، ابو ذر رضی اللہ عنہ کا اکتناز کے متعلق تشدد: ایسے تفردات کو اساس قرار دے کر ظواہرِ کتاب و سنت کی تاویل تحقیقی مشغلہ نہیں ہے، اس لیے حضرات شوافع یہاں تک تو حق بجانب معلوم ہوتے ہیں، لیکن بعینہٖ اسی قسم کی جمعہ کے متعلق چالیس کے عدد کی پابندی خود حضرات شوافع کے ہاں موجود ہے، جس کے متعلق وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ اس کا کوئی ثبوت نہیں۔ دونوں طرف بزرگ ہیں۔ اہلِ علم ہیں، ہم کیا عرض کر سکتے ہیں؟ اثر کی حقیقت صرف اس قدر ہے۔

"الحديث الأول عن النبي قال: لا جمعة ولا تشريق ولا فطر ولا أضحى إلا في مصرٍ جامع. قلت: غريب مرفوعاً"

اس کے بعد اثر کی مختلف اسانید کا ذکر فرمانے کے بعد فرماتے ہیں:

"وهذا إنما يرویٰ عن علي موقوفاً، فأما النبيﷺ فإنه لا يرویٰ عنه في ذلك شيئ" (نصب الراية: ١/ ١٩٥)

''حدیث "لا جمعة ولا تشريق" اثرِ علی مرفوعاً آنحضرت ﷺ سے ثابت نہیں، آنحضرت ﷺ سے اس مفہوم کی کوئی روایت ثابت نہیں۔''

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے موقوفاً یہ اثر ثابت ہے۔ حافظ عینی اور امام بیہقی اپنے اپنے مکاتبِ فکر کی تائید وحمایت میں جس قدر سرگرم ہیں، وہ معلوم ہے، لیکن اس مسئلے میں امام بیہقی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اثر کی جو توجیہ فرمائی ہے، اس سے ان کی محدثانہ روش کا پتا چلتا ہے۔ وہ حضرت علی کے باقی آثار کے ساتھ تطبیق دیتے وقت مصرِ جامع اور قریہ کے معنی میں توازن فرمانا چاہتے ہیں:

"قال الشيخ: والأشبه بأقاويل السلف وأفعالهم في إقامة الجمعة في القرى التي أهلها أهل قرار، ليسوا بأهل عمود ينتقلون، أن ذلك مراد علي بن أبي طالب"

اس کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اثر مع سند نقل فرمایا ہے:

"لا جمعة ولا تشريق إلا في مصر جامع" (سنن البيهقي: ٣/ ١٧٩)

امام بیہقی فرماتے ہیں کہ جمعہ کے متعلق ائمہ اسلام کے قول وفعل سے یہ صحیح معلوم ہوتا ہے کہ جمعہ اس قریہ میں قائم ہونا چاہیے، جہاں لوگ اقامت پذیر ہوں، خیموں کی طنابیں اکھیڑ کر جابجا منتقل ہونے کے عادی نہ ہوں، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اثر "لا جمعة ولا تشريق إلا في مصر جامع" میں مصرِ جامع سے اس نوعیت کے قریٰ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مقصد معلوم ہوتے ہیں۔

احناف رحمہم اللہ کے ملفوظات میں بھی تاحال نہ قریہ کی تعریف طے ہوسکی ہے نہ مصرِ جامع کی۔ اگر امام بیہقی کی تفسیر قبول کر لی جائے تو ممکن ہے معاملہ ختم ہوجائے۔ میری ناقص رائے میں ائمہ اربعہ رحمہم اللہ کا اصل مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ جمعہ میں اجتماعیت قائم رہے، اس لیے بعض نے مصرِ جامع کا ذکر فرمایا ہے، بعض نے چالیس کے عدد پر زور دیا۔ بعض نے ضروری سمجھا کہ مکانات کی دیواریں باہم ملی جلی ہوں۔ نقطۂ نظر یہ ہے کہ اجتماع ہوسکے۔ اگر شرائط کا زور خطیب کی اہلیت اور طریقِ خطابت پر ہوتا تو یہ مقصد بہتر طور پر حاصل ہوتا۔ اچھا خطیب چھوٹی بستی میں اپنی جاذبیت سے اجتماع کی صورت بنا لیتا ہے۔ کم فہم خطیب مصرِ جامع میں بھی انتشار بپا کر سکتا ہے۔ شرائطِ جمعہ میں خطیب کو بہت کم اہمیت دی گئی ہے، حالانکہ اچھا خطیب اجتماعیت کی روح ہوتا ہے۔

میں نے اثرِ علی رضی اللہ عنہ کے متعلق گزارشات کو طول نہیں دیا۔ امام احمد اسے ضعیف فرمائیں اور ابن حزم اسے صحیح فرمائیں، بہر حال وہ ایک صحابی کا فتویٰ ہے، اس سے ہوگا کیا؟ خود احناف کے نزدیک بھی ایسے آثار مذہب کی بنیاد نہیں بن سکتے، خصوصاً جب باقی صحابہ رضی اللہ عنہم سے اس کا اختلاف بھی ثابت ہو۔ عمومِ قرآن اور سنتِ صحیحہ مرفوعہ سے بھی اس کی تائید نہ ہوتی ہو، ایسے اثر کے متعلق طویل بحث سے کیا فائدہ؟

جمعہ کے دن عوالی سے آنا:

”عن عائشة زوج النبيﷺ: كان الناس ينتابون الجمعة من منازلهم والعوالي فيأتون في الغبار...“ (صحيح البخاري: ١/ ٤٨٩، مطبوعه هند، أبو داود مع عون: ١/ ٤٠٨)

”حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: لوگ جمعہ کے دن اپنے گھروں اور قریبی گاؤں سے پے بہ پے آتے، ان کے پاؤں پر غبار جم جاتا۔“ الخ

بعض حضرات کو شبہہ ہوا کہ ”ینتابون“ کا لفظ بھی آیا ہے۔ نوبت بنوبت آنے کا مطلب یہ ہے کہ جمعہ ان پر فرض نہیں۔ کوئی آیا کوئی نہ آیا۔ مسئلے کو ایک طالب علم کی طرح سوچا جائے تو زیادہ مشکل نہیں۔ حدیث میں منازل اور عوالی بواسطہ عطف ”ینتابون“ کا ظرف ہیں۔ عوالی وہ بستیاں ہیں، جو تین سے آٹھ میل تک مدینہ منورہ کے قرب و جوار میں تھیں۔ منازل سے مراد وہ مکان ہیں، جو اہلِ مدینہ کے مہاجر اور انصار بطورِ مسکن استعمال فرماتے تھے۔ اگر تناوب کا مفہوم وہی لیا جائے جو علمائے احناف مراد لیتے ہیں تو جمعہ مدینے میں بھی فرض نہیں ہوگا، کیونکہ اپنے گھروں سے بھی لوگ باری باری آتے ہوں گے اور یہ فرضیت کے منافی ہے!!

لغت کی رو سے انتیاب کا معنی ہے: پے بہ پے آنا، یعنی عجلت کے ساتھ ہر آدمی ایک دوسرے کے پیچھے علی التوالی چلا جائے:

1. ”انتابت السباع المنهل: رجعت إليه مرة بعد أخرى“[1] (المصباح المنير)

”درندے گھاٹ پر یکے بعد دیگرے آتے جاتے رہے۔“

2. ”انتابهم انتياباً: أتاهم مرة بعد أخرىٰ“ (أقرب الموارد، ج:٢)

وہ ان کے پاس بار بار آیا۔

3. ”وانتابهم انتيابا: أتاهم مرة بعد أخرىٰ“[2] (القاموس المحيط، ج:١)

---

[1] المصباح المنير للفيومي (ص: ٣٢٣)

[2] القاموس المحيط (ص: ١٧٩)

تناوب میں تقسیم اور نوبت کا مفہوم غالب ہوتا ہے۔ ہوسکتا ہے وحدتِ ماخذ کی وجہ سے دونوں لفظ ایک دوسرے کے مفہوم میں مستعمل ہوں، لیکن اس حدیث میں دونوں کا معنی "مرة بعد أخرىٰ" ہوگا، کیونکہ منازل سے آنے میں کسی کا نہ آنا سمجھ میں نہیں آسکتا۔

اس مفہوم کے مطابق یہ حدیث فرضیتِ جمعہ کی دلیل ہوگی، فرق محل کا ہوگا۔ عوالی اور قریٰ پر جمعہ فرض ہوگا۔ جو لوگ مدینہ منورہ پہنچیں، جو ایسا نہ کر سکیں، انھیں لازماً اپنی جگہ پر فرض کو ادا کرنا ہوگا۔ یہ بحث کہ عوالی میں غیر مستطیع حضرات نے جمعہ ادا فرمایا یا نہیں؟ اس پر برائے بحث کو جھگڑا کیا جا سکتا ہے، لیکن معقولیت کا تقاضا نہیں۔ بعض ائمہ نے قریب اور بعید عوالی میں بھی فرق فرمایا ہے، یعنی قریب کے لوگ شہر پہنچنے کی کوشش کریں، دور کے لوگ اپنی اپنی جگہ جمعہ ادا فرمائیں، اس میں بھی معقولیت معلوم ہوتی ہے، لیکن اہلِ قریٰ کو صرف قرویت کی وجہ سے محروم رکھنا اور فریضہ جمعہ میں انھیں نظر انداز کرنا، کسی طرح بھی مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ یقیناً جو لوگ مدینہ منورہ میں نہیں آ سکے، وہ گاؤں میں فرض ادا کریں گے۔

مسئلہ جمعہ میں مد و جزر:

ہمارے ملک میں ابتدا میں جمعہ سے اس لیے انکار کیا گیا کہ اس کا حاکم مسلمان نہیں۔ جب ملک میں جمعہ شروع ہوگیا تو یہ شرط بھی ڈھیلی کر دی گئی۔ بزرگوں سے سنا ہے کہ آزاد علاقے میں چونکہ کوئی مستند حکومت نہ تھی، مرحوم ملا مفیدی صاحب کو اس لیے وہابی فرمایا گیا کہ وہ جمعہ پڑھتے تھے اور تشہد میں رفعِ سبابہ فرماتے تھے۔

پھر زور دیا گیا کہ خطبہ عربی میں ہونا چاہیے، ترجمہ کرنا درست نہیں، مگر کچھ لوگ خطبہ عربی زبان میں دیتے رہے، اس لیے ایک نئی بدعت ایجاد فرمائی گئی، یعنی تین خطبے دیے جانے لگے، ایک اردو میں، دو عربی میں، لیکن اس مد و جزر میں عورتوں کے لیے جمعہ اور عید کی حاضری بدستور شجرِ ممنوعہ رہی، لیکن بعض لوگوں نے حسب ارشادِ پیغمبر ﷺ عورتوں کو اجازت دی۔ اب مجبوراً یہ شرط بھی استرخا کی نذر ہو رہی ہے۔ بعض مساجد میں عورتیں آتی ہیں۔ بریلوی مساجد میں چونکہ وعظ میں موسیقی کی سی حالت پائی جاتی ہے، اس لیے وہاں کثرت سے عورتیں شریک ہوتی ہیں۔

اب بحمد اللہ دیہات میں اکثر جمعہ ہو رہا ہے، لیکن بحث کے لیے اب بھی یہ موضوع شاید کچھ کارآمد ہو، اس لیے بہر حال دیوبندی حلقوں میں اس کا خاصا چرچا ہے۔ ہندوستان میں سب سے قبل حضرت شیخ الکل امام المحدثین حضرت مولانا سید نذیر حسین صاحب نے فتویٰ دیا کہ دیہات میں جمعہ درست ہے، اس کے جواب میں حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی نے "أوثق العریٰ" لکھی اور حضرت ائمہ احناف کے متعارف مسلک کی تائید فرمائی، اس کے جواب میں "کسر العریٰ" مولانا محمد سعید صاحب بنارسی نے لکھی اور مولانا ابو المکارم مئوی

نے "هداية الورىٰ" ارقام فرمائی۔ ان دونوں کے جواب میں حضرت مولانا محمود الحسن صاحب دیوبندی رحمہ اللہ نے "أحسن القرىٰ" کافی گرم کتاب لکھی۔ ادلہ سے زیادہ طعن و تشنیع پر زور دیا گیا۔ یہ مولانا کی جوانی کا شہکار ہے، مالٹا سے واپسی کے بعد مولانا نے یہ مباحث بالکل ترک فرما دیے تھے، بلکہ حسبِ روایت مولانا عبد القادر قصوری رحمہ اللہ ان مساعی پر تاسف فرماتے تھے۔ رحمه الله رحمة واسعة.

"أحسن القرى" کا جواب مولانا عبدالرحمٰن صاحب بقاغازی پوری نے لکھا، اس کتاب کا نام ہے: "سُرَّ من رأى في بحث الجمعة في القرىٰ" یہ کتاب اپنے موضوع پر شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔ عموماً کتاب کے اندازِ تحریر میں متانت ہے۔ کہیں معمولی تیزی آ گئی ہے، ورنہ خوب کتاب ہے، اس کے بعد خاموشی ہوگئی، کوئی قابلِ اعتنا اور علمی کتاب نہیں لکھی گئی، جس سے علمی حلقوں میں کچھ ہلچل پیدا ہو۔ اب ۴۷ء کی ہجرت کے بعد گوڑ گانواں اور علاقہ میوات کی تبلیغی مجالس والے حضرات کہیں کہیں تھوڑی بہت حرکت پیدا کر دیتے ہیں، ورنہ جمعہ بتدریج دیہات میں پڑھا جا رہا ہے، لوگ اپنے حلقوں میں تبلیغ کا فرض ادا کر رہے ہیں۔ والله يهدي من يشاء إلىٰ صراط مستقيم.

14- تعددِ جمعہ:[1]

سوال ایک بستی کی مسجد اہلحدیث میں عرصہ ایک صدی سے جمعہ ہو رہا ہے۔ بعض جماعتی دوستوں نے ذاتی اختلافات کی وجہ سے اس کے بالمقابل دو بیگھہ کے فاصلے پر عیدگاہ میں نئی مسجد کی بنیاد ڈالی اور علیحدہ جمعہ شروع کر دیا۔ کئی سال تک جمعہ ہوتا رہا، مگر اس نئی مسجد کے امام صاحب، جو اصل تنازع کے بانی تھے، کی وفات کے بعد پھر جمعہ اس نئی مسجد میں بند ہوگیا اور تمام جماعتِ اہلحدیث کے افراد قدیمی مسجد میں نمازِ جمعہ ادا کرتے رہے۔

اب متوفی امام صاحب کا لڑکا علمِ دین حاصل کر کے اور سندِ فراغ کے بعد تشریف لے آیا ہے۔ اس نے اس بنا پر دوبارہ جمعہ علیحدہ شروع کر دیا ہے کہ میں اپنے والد صاحب کی مسجد کو آباد کروں گا، جبکہ جماعت کی اکثریت اسے کہتی ہے کہ تم قدیمی مسجد میں جمعہ پڑھاؤ، ہم آپ کے پیچھے جمعہ و عیدین ادا کریں گے، مگر وہ اپنے والد کی مسجد کے آباد کرنے پر اصرار کرتے ہیں اور وہ بھی جمعہ و عیدین کی علیحدگی کے انداز پر۔ ان حالات میں استفسار ہے:

1. قدیمی مسجد کے مقابلے میں دو بیگھہ کے فاصلے پر نئی مسجد کی بنیاد جائز ہے یا نہیں؟
2. اس نئی مسجد میں جمعہ شروع کرنا درست ہے؟ (محمد اسماعیل ذبیح، جلال پور، پیر والا)

---

[1] ہفت روزہ "الاعتصام" لاہور (۱۳/ اکتوبر ۱۹۶۹ء)

جواب اگر صورتِ سوال درست ہے تو پہلی (قدیمی) مسجد ہی جامع رہنی چاہیے۔ موجودہ مولوی صاحب کے والد بزرگوار کا فعل بھی شرعاً مناسب نہ تھا، جس سے جماعت میں تفریق ہوئی۔ ان کے فرزند کو جماعت میں اتحاد پیدا کرنا اور پہلی غلطی کی تلافی کرنا چاہیے۔ مزید تفریق کا موجب بننا علم کی شان نہیں۔

تعددِ جمعات ضرورتاً درست ہے، لیکن یہ کوئی تعدد کے لیے وجہ جواز نہیں کہ مرحوم والد نے جمعہ پڑھایا تھا، اس لیے اسے پھر قائم کیا جائے، بلکہ علم کا تقاضا تو یہ ہے کہ جماعت میں اتفاق کرایا جائے۔ ﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ﴾ [الحجرات: ۱۰]

15- خطبہ جمعہ کی طوالت:[1]

سوال ایک مولوی صاحب جمعہ کا طویل خطبہ دیتے ہیں، یہاں تک کہ قد سے سایہ بڑھ جاتا ہے، یعنی ظہر کا وقت بھی فوت ہو جاتا ہے، لیکن مولوی صاحب خطبہ بند نہیں کرتے۔ آخر موذن اقامت کہتا ہے تو مولوی صاحب بعد نماز موذن کو کہتے ہیں کہ تم نے شریعت میں بڑا جرم کیا ہے کہ میری تبلیغ بند کی ہے اور اب میری مرضی ہے، جب خطبہ بند کروں، تم نے کیوں اقامت کہی؟

براہِ کرم قرآن و حدیث کی رو سے جواب دے کر بذریعہ "الاعتصام" آگاہ فرمائیں۔

جواب اتنا لمبا خطبہ بے وقوفی کی علامت ہے۔[2] اگر نماز کا وقت نکل رہا ہو تو خطبہ دینا گناہ ہے۔ ایسے خطیب کو پکڑ کر منبر سے اتار دینا چاہیے۔

16- نمازِ تراویح کی رکعات:[3]

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے کے بارے میں کہ صلاۃ تراویح شبِ رمضان میں فرض اور وتر کے مابین کتنی رکعت پڑھنی چاہیے؟ ہم اپنے گاؤں میں مع وتر گیارہ رکعت پڑھتے ہیں۔ کیا اس صلاۃِ تراویح کا کہیں کتبِ احادیث میں وجوب بھی پایا گیا ہے یا نہیں اور معین تعدادِ رکعت کتبِ احادیث سے کس طرح جائز ہے؟

ہمارے گاؤں کے باشندگان باوجود بے علم ہونے کے ہر وقت اعتراض کرتے رہتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ بیس رکعت پڑھنی چاہیے، کوئی کہتا ہے کہ آٹھ رکعت پڑھنی چاہیے۔

---

[1] ہفت روزہ "الاعتصام" لاہور

[2] دیکھیں: صحیح مسلم، رقم الحدیث (۸۶۹)

[3] یہ قلمی فتویٰ مجھے مولانا نذیر احمد بھلروی (ٹاہلی والی مسجد گوجرانوالہ) کی لائبریری سے ملا تھا۔

اس لیے نہایت ادب سے گزارش ہے کہ آج رات کو جملہ اہلِ اسلام نے ﴿فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ إِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ﴾ کو مدِنظر رکھ کر آپ کی خدمتِ اقدس میں ایک شخص معراج دین نامی قوم کشمیری بھیجا ہے، آپ برائے مہربانی اس فتوے کا مفصل جواب کتبِ احادیثِ معتبرہ سے فرمائیں کہ اس نمازِ تراویح کا جواز کس طرح چاہیے؟ حدیث بھی تحریر فرما دیں، جس طرح اہلِ اسلام کی تسلی مناسب سمجھیں فرما دیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے جزاے خیر عطا فرمائے اور آپ کو جنت نصیب کرے۔

جواب تراویح واجب تو کسی کے نزدیک بھی نہیں۔ نفلی نماز ہے۔ پیغمبر ﷺ کا عموماً اس پر عمل تھا کہ وتروں سمیت گیارہ رکعت پڑھتے تھے۔ صحیح بخاری میں ہے:

عن أبي سلمة أنه سأل عائشة: كيف كانت صلاة رسول اللهﷺ في رمضان؟ فقالت: ما كان رسول اللهﷺ يزيد في رمضان ولا في غيره علىٰ إحدىٰ عشر ركعة، يصلي أربعا فلا تسئل عن حسنهن وطولهن، ثم يصلي أربعاً فلا تسئل عن حسنهن وطولهن، ثم يصلي ثلاثا. قالت عائشة: فقلت يا رسول الله أتنام قبل أن توتر؟ فقال: «يا عائشة! إن عيني تنامان، ولا ينام قلبي»[1] [پارہ: ۵، ص: ۶۰۷]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور ﷺ رمضان اور غیر رمضان میں گیارہ رکعت سے زیادہ نہیں فرماتے تھے اور بہت لمبی لمبی پڑھتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بھی آپ نے ابی بن کعب کو گیارہ رکعت پڑھانے کا حکم فرمایا۔[2] مشکاۃ شریف (ص: ۱۰۷) میں صراحتاً موجود ہے۔

حضور ﷺ کا اپنا طریقہ تو یہی تھا، جو اوپر لکھا گیا ہے۔ بعض صحابہ نے بیس اور اس سے زیادہ بھی پڑھی ہیں اور نفلوں کے متعلق کوئی پابندی نہیں فرمائی، اس لیے زیادتی میں کچھ حرج نہیں، بلکہ نفلی نماز سمجھ کر اگر گیارہ سے بھی کم پڑھی تو شرعاً گناہ گار نہیں۔ سنتِ نبوی ﷺ وہی ہے، جو صحیح بخاری کی حدیث میں بیان ہوا۔ نفل سمجھ کر کم یا زیادہ کرے تو اس سے نزاع یا جھگڑا نہیں کرنا، البتہ جو لوگ سنت یا ضروری سمجھ کر پڑھتے ہیں، ان کو سمجھانا چاہیے کہ وہ نفل سمجھ کر پڑھیں۔ بہرصورت ایسے مسائل میں نزاع اور جھگڑا خصوصاً رمضان شریف کے دنوں میں اچھا نہیں۔ تعداد کے بجائے آہستہ اور اطمینان سے لمبی رکعتیں پڑھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ قرآن مجید زیادہ پڑھا جائے، رکوع سجود لمبا ہو، ارکان اطمینان سے ادا کیے جائیں، عجلت کی نماز نہ پڑھیں۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (۱۰۹۶) صحيح مسلم، رقم الحديث (۷۳۸)

[2] موطأ الإمام مالك (۱/ ۱۱۵)

17- عیدالاضحیٰ کے بعد قربانی کتنے دن تک درست ہے؟[1]

سوال کیا فرماتے ہیں اہلِ علم اس مسئلے میں کہ عیدالاضحیٰ کے بعد قربانی کرنا کتنے دن تک درست ہے؟ مذاہبِ ائمہ اور احادیث سے اس کی وضاحت کی جائے۔

جواب اس مسئلے میں ائمہ کے قریباً سات قول ہیں:

1. عید کے بعد دو دن۔ امام مالک، امام ابوحنیفہ، امام احمد رحمہ اللہ کا یہی مسلک ہے۔
2. عید کے بعد تین دن۔ عطا، حسن بصری، امام اوزاعی، امام شافعی، ابوثور رحمہم اللہ وغیرہ کا یہی قول ہے۔
3. عید کے بعد چھے دن تک۔ یہ قتادہ کا مذہب ہے۔
4. دس دن تک۔ یہ ابن تین کا خیال ہے۔
5. ذوالحجہ کے بیس دن۔ یعنی آخر ماہ تک، حسن بصری، عمر بن عبدالعزیز، سلیمان بن یسار، ابومسلم بن عبدالرحمان۔
6. عام شہروں میں صرف ایک دن اور منیٰ میں تین دن۔ سعید بن جبیر، جابر بن زید۔
7. صرف عید کے دن۔ ابن سیرین، حمید بن عبدالرحمٰن۔

(عمدة القاري: ١٠/ ٦٣، نيل الأوطار: ٥/ ٢١٦، مغنى ابن قدامه مع الشرح: ١١/ ١١٤، فتح الباري: ٢٣/ ٣٢٥)

ان مذاہب سے سب سے پہلا اور دوسرا مذہب عامۃ المسلمین میں معمول بہا ہے۔ فقہائے حنفیہ کا رجحان پہلے مسلک کی طرف ہے۔ ہمارے ملک میں چونکہ عام لوگ حنفیہ ہیں اور وہ دوسرے مسلک کو ناپسند کرتے ہیں، اس لیے ضرورت محسوس ہوئی ہے کہ دوسرے مسلک کی وضاحت کی جائے، تاکہ کم علم اور جاہل لوگ عامۃ المسلمین میں منافرت نہ پھیلا سکیں اور مسلمان جس مسلک پر چاہیں عمل کریں۔

دوسرے مسلک کے دلائل:

① امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”والأضحية جائزة يوم النحر وأيام منىٰ كلها، لأنها أيام النسك...“

”قربانی منیٰ کے تمام دن جائز ہے، کیونکہ یہ حج کے ایام ہیں۔“

پھر فرماتے ہیں:

”فإن قال قائل: ما الحجة في أن أيام منىٰ أيام أضحى كلها؟ قيل: كما كانت

---

[1] ہفت روزہ ”الاعتصام“ لاہور (۲۷ راگست، ۳ر ستمبر ۱۹۵۴ء)

الحجة بأن يومين بعد يوم النحر يومي ضحية، فإن قال قائل: فكيف ذلك؟ قيل: نحر النبيﷺ وضحّى في النحر فلما لم يحظر علىٰ الناس أن يضحوا بعد يوم النحر بيوم أو يومين، لم نجد اليوم الثالث مفارقا لليومين قبله، لأنه ينسك فيه ويرمىٰ كما ينسك ويرمىٰ فيهما، فإن قال: فهل في هذا من خبرٍ؟ قيل: نعم عن النبيﷺ فيه دلالة سنة" (كتاب الأم: ۲/ ۱۹۱ طبع مصر، ۱۳۸۸ھ)

''اگر پوچھا جائے کہ اس کی کیا دلیل ہے کہ سارے ایامِ منیٰ (۱۰/ سے ۱۳/ ذوالحجہ تک) میں قربانی درست ہے؟ جواب یہ ہے کہ عید کے بعد دو دن قربانی جس دلیل سے درست ہے، اسی دلیل سے تیسرے دن بھی جائز ہے۔ آنحضرت ﷺ نے خود تو قربانی عید کے دن فرمائی۔ اس کے بعد نہ دو دن کے لیے قربانی سے روکا، نہ تیسرے دن کے لیے، یعنی تیرہ تاریخ کے لیے گیارہ اور بارہ سے کوئی الگ حکم دیا، بلکہ جب احکامِ حج میں وہ ان کے ساتھ برابر ہے تو قربانی میں ان سے بلا دلیل الگ کیوں کیا جائے؟ اگر پوچھا جائے کہ اس کے متعلق کوئی حدیث ہے تو جواب یہ ہے کہ ہاں آنحضرت ﷺ سے سنت میں اس پر دلیل موجود ہے۔''

مختصر مزنی (۵/ ۲۱۴ بر حاشیہ کتاب الام) میں بھی مختصراً اس کی تائید موجود ہے۔

④ ابن قدامہ مغنی میں اس مسلک کے متعلق فرماتے ہیں:

"روي عن علي: آخره آخر أيام التشريق، وهو مذهب الشافعي، وقول عطاء والحسن، لأنه روي عن جبير بن مطعم أن النبيﷺ قال: أيام منىٰ كلها منحر"

(۱۱/ ۱۱٤)

''ذبح آخر ایامِ تشریق تک درست ہے۔ امام شافعی، عطا، حسن بصری کا یہی مذہب ہے اور اس کی دلیل جبیر بن مطعم کی حدیث ہے۔''

③ امام شوکانی رحمہ اللہ جبیر بن مطعم کی حدیث پر گفتگو کے بعد فرماتے ہیں:

"وقد استدل بالحديث علىٰ أن أيام التشريق كلها أيام ذبح، وهي يوم النحر وثلاثة أيام بعده، وقد تقدم الخلاف فيها في كتاب العيدين، وكذلك روي في الهدي عن علي أنه قال: أيام النحر يوم الأضحىٰ وثلاثة أيام بعده، وكذا حكاه النووي عنه في شرح مسلم، وحكاه أيضاً عن جبير بن مطعم و ابن عباس و عطاء و الحسن

البصري وعمر بن عبدالعزيز و سليمان بن موسىٰ الأسدي فقيه أهل الشام ومكحول والشافعي وداود الظاهري، وحكاه صاحب الهدي عن عطاء والأوزاعي وابن المنذر، ثم قال: وروي من وجهين مختلفين يشد أحدهما الآخر عن النبيﷺ أنه قال: كل منىٰ منحر، وكل أيام التشريق ذبح، وروي من حديث جبير ابن مطعم، وفيه انقطاع، ومن حديث أسامة بن زيد عن عطاء عن جابر، قال يعقوب بن سفيان: أسامة بن زيد عند أهل المدينة ثقة مأمون" اھ

(نيل الأوطار: ٥/ ٢١٦)

"یہ حدیث دلیل ہے اس امر کی کہ تمام ایامِ تشریق میں ذبح درست ہے، یعنی یوم النحر اور اس کے بعد تین دن۔ زاد المعاد میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ قربانی عید کے تین دن بعد تک درست ہے اور اسی طرح نووی نے مسلم کی شرح میں لکھا ہے اور جبیر بن مطعم اور ابن عباس، عطاء، حسن بصری، عمر بن عبدالعزیز، سلیمان موسیٰ اسدی سے، جو شام کے فقیہ ہیں، مکحول، امام شافعی اور داود ظاہری رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے۔ ابن قیم رحمہ اللہ نے عطا، اوزاعی اور ابن منذر رحمہم اللہ کا مذہب بیان کیا ہے، پھر فرمایا: یہ حدیث دو طریق سے مروی ہے، جو ایک دوسرے کے لیے تقویت کا موجب ہیں۔ جبیر بن مطعم کے طریق میں انقطاع ہے۔ جابر کی حدیث اسامہ بن زید کے طریق سے مروی ہے اور یعقوب بن سفیان کہتے ہیں کہ اسامہ بن زید اہلِ مدینہ میں بہت ثقہ ہیں۔"

④ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں: "قال ابن بطال تبعاً للطحاوي: لم ينقل عن الصحابة غير هذين القولين" "صحابہ سے ان دو مذاہب کے سوا کوئی منقول نہیں۔"

اور دوسرے قول (قربانی چار دن ہے) کو جمہور کا قول فرماتے ہیں:

"وحجة الجمهور حديث جبير بن مطعم، رفعه: فجاج منىٰ منحر، وفي كل أيام التشريق ذبح" أخرجه أحمد، لكن في إسناده انقطاع، ووصله الدارقطني ورجاله ثقات" اھ (فتح الباري: ٥/ ٣٢٣، ٣٢٥ طبع دهلي)

"جمہور کی دلیل جبیر بن مطعم کی مرفوع حدیث ہے: سارے ایامِ تشریق میں ذبح کرنا درست ہے۔ اسے امام احمد رحمہ اللہ نے روایت فرمایا، اس کی روایت میں انقطاع ہے اور دار قطنی نے اسے موصول بیان فرمایا ہے، اس کے رجال ثقہ ہیں۔"

⑤ امام زیلعی "نصب الراية" میں اس حدیث کے متعلق فرماتے ہیں:

"الحديث السابع: قال ﷺ: "أيام التشريق كلها أيام ذبح. قلت: رواه أحمد في مسنده، وابن حبان في صحيحه في النوع الثالث والأربعين من القسم الثالث من حديث عبد الرحمن بن أبي حسين عن جبير بن مطعم عن النبي ﷺ قال: كل أيام التشريق ذبح، و عرفة كلها موقف... وقد ذكرناه بتمامه في الحج، ورواه البزار في مسنده، وقال: ابن أبي حسين لم يلق جبير بن مطعم، و رواه البيهقي في المعرفة، ولم يذكر فيه انقطاعاً، وأخرجه الدارقطني في سننه عن أبي معيد عن سليمان ابن موسىٰ عن عمرو بن دينار عن جبير بن مطعم مرفوعاً، وأبو معيد ـبمثناةـ فيه لين، وأخرجه هو والبزار عن سويد بن عبدالعزيز عن سليمان بن موسىٰ عن نافع بن جبير بن مطعم عن أبيه مرفوعاً. قال البزار: لا نعلم قال فيه: عن نافع بن جبير عن أبيه إلا سويد بن عبد العزيز، وهو ليس بالحافظ، ولا يحتج به إذا انفرد ..."[1]

''اس حدیث کو احمد نے مسند احمد میں اور ابن حبان نے صحیح میں ذکر کیا ہے، لیکن اس میں انقطاع ہے۔ عبدالرحمٰن بن ابی حسین، جبیر بن مطعم سے نہیں ملا۔ بیہقی نے اسے معرفۃ السنن والآثار میں ذکر فرمایا ہے اور انقطاع کا ذکر نہیں فرمایا۔ دارقطنی نے ابو معید کے طریق سے ذکر کیا ہے۔ ابو معید میں معمولی ضعف ہے۔ دارقطنی اور بزار نے سوید بن عبدالعزیز کے طریق سے ذکر کیا ہے، لیکن سوید ثقہ نہیں، انفراد کی صورت میں یہ حجت نہیں۔ احمد اور بیہقی رحمہما اللہ نے سلیمان بن موسیٰ کے طریق سے روایت کی ہے، یہ بھی منقطع ہے۔ ابن عدی نے کامل میں بواسطہ معاویہ بن یحییٰ صدفی، ابو سعید خدری سے نقل فرمایا۔ معاویہ بہت ضعیف ہیں، اس سند کو بعض نے موضوع کہا ہے۔''

جبیر بن مطعم کی حدیث مختلف طرق سے مقطوع، مرفوع، ثقات، ضعاف؛ سب سے مروی ہے۔ تمام طرق میں کچھ نہ کچھ نقص ہے، مگر اس کے باوجود مجموع طرق سے ثابت ہوتا ہے کہ حدیث کی کچھ نہ کچھ حقیقت ضرور ہے، اس لیے ائمہ حدیث کا رجحان اسی طرف ہے، کیونکہ باقی مسلک یا تو بالکل بے دلیل ہیں یا ان کی بنیاد محض آثار ہیں اور ان میں غرابت بھی ہے، چنانچہ امام زیلعی نصب الرایہ میں حضرت عمر، علی، ابن عباس کے

[1] نصب الراية (٤/ ٢٧٨)

آثار کا ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: "غريب جداً"[1] اس میں بہت ہی غرابت ہے۔ (نصب الراية: ٢/ ٢١٣)

ظاہر ہے امام شافعی رحمہ اللہ کا مسلک جمہور کا مسلک ہونے کے علاوہ دلیل کے لحاظ سے بھی نسبتاً مضبوط ہے، اس لیے اس مسلک پر عمل درست ہے اور انکار جہالت!

امام بیہقی نے جبیر بن مطعم کی حدیث کے تمام طرق کا ذکر کیا ہے اور معاویہ بن یحییٰ صدفی کے طریق میں ابو سعید اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما دونوں سے نقل کیا ہے۔ ابن عباس، حسن، عطا، عمر بن عبدالعزیز، سلیمان بن موسیٰ اور مکحول کے آثار کی اسانید بھی ذکر کی ہیں، جن سے مجموعی طور پر اس مسلک کے ماخذ کی قوت معلوم ہوتی ہے۔
(سنن البيهقي: ٨/ ٢٩٥)

علامہ ترکمانی حنفیہ کے لیے متعصب مشہور ہیں، وہ بھی فرماتے ہیں: "لم يصح في هذا الباب عن النبي ﷺ شيئ" (٨/ ٢٩٧) یعنی آنحضرت ﷺ سے اس مسئلے میں دونوں طرف کوئی حدیث ثابت نہیں، سارا مدار آثارِ صحابہ رضی اللہ عنہم پر ہے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں کسی مسلک پر انکار دیانتِ علمی کے خلاف ہے۔

علامہ ہیثمی جبیر بن مطعم کی حدیث کے بعد فرماتے ہیں:

"رواه أحمد، وروىٰ الطبراني في الأوسط عنه: أيام التشريق كلها ذبح، ورجال أحمد وغيره ثقات" (مجمع الزوائد: ٤/ ٢٤)

یعنی احمد اور طبرانی نے اوسط میں اس حدیث کو ذکر کیا ہے اور احمد وغیرہ کے رجال ثقہ ہیں۔

حافظ دارقطنی نے حدیثِ جبیر بن مطعم کو مرفوعاً ذکر کیا ہے اور صاحبِ التعلیق المغنی نے نصب الرایۃ کا اقتباس نقل فرمایا ہے، جس سے حدیثِ جبیر بن مطعم کا مقام ظاہر ہو جاتا ہے اور اس کے ساتھ احناف کے مسلک اور ان کے دلائل کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ دیانتدار آدمی کے لیے دونوں مسلکوں میں ترجیح کے وجوہ آشکار ہو جاتے ہیں، معاملے کی تہہ تک پہنچنے میں کوئی دشواری نہیں، مگر تنگ دل اور متعصب کے لیے نصوص بھی کفایت نہیں کر سکتے۔

حافظ ابن القیم فروع میں حنبلی ہیں اور حنابلہ کا مسلک اس مسئلے میں احناف ہی سے ملتا ہے، مگر دلیل کی قوت کے پیشِ نظر ان کی رائے کا رجحان امام شافعی اور ائمہ حدیث کی طرف ہے۔ وہ پوری جرأت کے ساتھ اس مسلک کی حمایت کرتے ہیں۔

(٦) مختصر بحث کے بعد فرماتے ہیں:

"وقد قال علي بن أبي طالب: أيام النحر: يوم الأضحىٰ و ثلاثة أيام بعده، وهو مذهب إمام أهل البصرة الحسن، وإمام أهل مكة عطاء بن أبي رباح، و إمام

[1] امام زیلعی "نصب الراية" میں یہ الفاظ ضعیف یا سخت ضعیف کے متعلق بولتے ہیں۔

أهل الشام الأوزاعي، وإمام فقهاء أهل الحديث الشافعي رحمه الله، واختاره ابن المنذر، ولأن الثلاثة تختص بكونها أيام منىٰ وأيام الرمي وأيام التشريق، ويحرم صيامها فهي إخوة في هذه الأحكام، فكيف تفترق في جواز الذبح بغير نص ولا إجماع؟ وروي من وجهين مختلفين يشد أحدهما الأخر عن النبي ﷺ أنه قال: كل منىٰ منحر، وكل أيام التشريق ذبح، وروي من حديث جبير بن مطعم، وفيه انقطاع، ومن حديث أسامة بن زيد عن عطاء عن جابر، قال يعقوب بن سفيان: أسامة بن زيد عند أهل المدينة ثقة مأمون"[1]

بعض کم فہم اور متعصب حضرات سارا زور جبیر بن مطعم کی حدیث اور اس پر جرح میں صَرف کر دیتے ہیں، حالانکہ جبیر بن مطعم کی حدیث استدلال کی بنیاد نہیں بلکہ مؤید ہے۔ اصل بنیاد دونوں مسلکوں میں مشابہت ہے۔ جہاں دونوں کا ذکر ہے، وہاں تیسرے سے روکنے کا کوئی قرینہ نہیں اور ایامِ منیٰ میں تشابہ اور مضاہات ظاہر ہے، اس لیے حافظ رحمہ اللہ نے جبیر بن مطعم کی حدیث کا ذکر صرف تذکرتاً اور تائیداً کیا ہے، اسے اساسِ استدلال قرار نہیں دیا۔ یہ وہ انصاف پسندی ہے جو تقلید و جمود کے بعد کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ وہ امام احمد کے مسلک کو جانتے ہیں، مگر دلائل کی رو سے اسے رد کر رہے ہیں۔ یہی وہ حضرات ہیں، جن سے ایمان اور دیانت کی سرزمین ہمیشہ سرسبز و شاداب رہے گی۔ رضي الله عنهم وأرضاهم.

الحافظ مجد الدین ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے جبیر بن مطعم کی حدیث کے طرق ذکر کر کے فرمایا:

"هذه الطرق التي روي بها كلها منقطعات، ولكن رواه ابن حبان في صحيحه موصولًا بنحو هذا المتن" (منتقیٰ الأخبار: ٢/ ٣٠٨)

''یہ تمام طرق منقطع ہیں، لیکن ابن حبان نے یہ متن موصول بیان کیا ہے۔'' (یہ عبارت منتقی کے مصری نسخے میں ہے، غالباً ہندوستانی نسخے میں نہیں)

اس سے ظاہر ہے کہ ابن حبان نے اس متن کو موصولاً بیان کیا ہے، گویا انقطاع کی علت جاتی رہی۔ اگر یہ صحیح ثابت ہوجائے تو یہ مسلک بہت زیادہ مضبوط ہوجائے گا۔ اس وقت کسی مسلک پر تنقید کرنا مقصود نہیں، ویسے بھی موضوع بہت طویل ہوگیا۔ تلخیص الحبیر اور الدرایہ فی تخریج احادیث الہدایہ سے استفادہ اسی لیے نظر انداز کر دیا گیا ہے، لیکن علامہ ترکمانی کی روش عجیب ہے، وہ اپنے مخالف کو کبھی نہیں بخشتے اور نہ کسی کو جائز رعایت دینے

[1] زاد المعاد (١/ ٢٤٦) یہ عبارت مع اردو ترجمہ امام شوکانی رحمہ اللہ کے حوالے میں آ چکی ہے۔ [مولف]

کے لیے آمادہ ہوتے ہیں، لیکن اپنے مسلک کی تمام کمزوریوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش فرماتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے جیسے، بقول ابن قیم و علامہ ترکمانی، اس موضوع پر کوئی حدیث مرفوع نہیں ملتی یا یہ جرح سے خالی نہیں۔ علامہ طحاوی کا ارشاد کہ ''ابن عباس کے قول کی سند جید ہے۔'' یہ بھی محض تسکینِ قلب کا سامان ہے، ورنہ ابن حزم چونکہ بقیہ ذوالحجہ میں قربانی کے قائل ہیں، اس لیے انھوں نے دونوں مسالک کے آثار پر بھی گفتگو فرمائی ہے اور اُن کی اسانید کا جائزہ لیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ امت کا تعامل دونوں مسالک میں پایا جاتا ہے اور صحابہ و تابعین دونوں مسالک پر عمل کرتے تھے، بلکہ عبداللہ بن عباس اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے دونوں مسلک مروی ہیں۔ محلی (۷/ ۳۷۷) میں آثار کی اسانید پر بحث فرمائی۔ من شاء فليرجع إليه

زرقانی نے شرح موطا میں امام شافعی رحمہ اللہ کا مسلک ذکر فرما کر ابن حبان کی حدیث کو ذکر کیا ہے، اس کی سند پر جرح نہیں کی، البتہ اپنے مسلک کے مطابق اس کی توجیہ کرنے کی ناکام کوشش کی ہے۔ (زرقانی ۳/ ۷۹ مطبوعہ مصر)

18,19- میت کے لیے دعا کی شرعی حیثیت اور چہار شنبہ کی تعطیل:[1]

سوال ① مرنے والے کے لیے کیسے دعائے مغفرت کی جائے اور اس کے لواحقین کو اس کے مرنے کے بعد سنتِ نبویہ ﷺ کے ماتحت کیا کچھ کرنا چاہیے؟ نیز یہ جو عام طور پر تیسرا، دسواں اور چالیسواں وغیرہ دنیا کرتی ہے، کیا یہ جائز ہے؟ اگر نہیں تو اسے کیوں رائج کیا گیا ہے؟

② یہ آخری چہار شنبہ کی جو تعطیل منائی جاتی ہے تو یہ دن کیوں منایا جاتا ہے؟ اس روز مسلمان کو کیا کرنا چاہیے؟ کیا یہ بھی ویسے ہی رسم و رواج ہے؟

جواب ① موت کے بعد میت کے لیے دعا اور صدقہ یقیناً مفید ہیں۔ جنازہ خود میت کے لیے دعا ہے، لیکن صدقہ اور دعا کے لیے کسی خاص وقت کا تعین شرعاً ثابت نہیں۔ موت کے بعد میت کے گھر بیٹھ کر عموماً دعاؤں کا تانتا باندھ دیا جاتا ہے، ہر آنے والا دعا کے لیے اس انداز سے درخواست کرتا ہے، گویا وہ اپنی حاضری نوٹ کرا رہا ہے۔ ایک سیکنڈ میں دعا ختم ہوتی ہے اور حقہ اور گپوں کا دور شروع ہو جاتا ہے، اور دعا کے وقت بھی دل حاضر نہیں ہوتا، حالانکہ دل کی توجہ دعا کے لیے ازبس ضروری ہے: «لا يقبل الله من قلب لاه»[2] اللہ غافل دل کی دعا منظور نہیں فرماتا۔

میت کے لیے دعا ہر وقت بلا تخصیص کی جا سکتی ہے اور زندوں کی طرف سے یہی بہترین صلہ ہے، جو

---

[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۱۱ر جنوری ۱۹۵۲ء)

[2] دیکھیں: الترمذي، رقم الحديث (۳۴۷۹)

میت کو دیا جاتا ہے، بشرطیکہ سنت کے مطابق ہو۔تعزیت کا مطلب گھر والوں کی تسکین ہے۔ دعا اگر مجلس کے بجائے انفراداً کی جائے تو دعا کا مقصد بہت طور پر پورا ہو سکتا ہے۔غرض یہ تین دن کا جلسہ دعائیہ سنت میں ثابت نہیں، ان مجالس میں حقہ اور بھی ان کے مقصد کو برباد کر دیتا ہے۔قرآن مجید کا ثواب ہدیتاً میت کو دینا اس میں اختلاف ہے۔بعض لوگ اسے مفید سمجھتے ہیں۔ میری نظر میں اس کی کوئی دلیل نہیں۔ اگر یہ امر مستحسن ہوتا تو آنحضرت ﷺ کے وصال کے بعد بیسیوں قرآن کا ثواب ہدیہ کرتے، لیکن سنت میں آنحضرت ﷺ سے ایک دفعہ بھی قرآن پڑھنا ثابت نہیں۔

تیسرا، دسواں، چالیسواں؛ یہ تمام امور بدعتِ سیئہ ہیں۔ آنحضرت ﷺ اور ائمہ اسلام رحمہم اللہ میں سے اس کے متعلق ایک حرف بھی ثابت نہیں۔ اَحناف میں اس کا رواج حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے اسم گرامی پر ایک تہمت ہے۔

۴ آخری چہار شنبہ کوئی اسلامی تہوار نہیں۔ یہ محض جہلا کی ایک رسم ہے۔مسلمانوں کی کوئی تاریخی یادگار اس سے وابستہ نہیں۔

20- کیا کفن پر کلمہ یا عہد نامہ وغیرہ لکھنا درست ہے؟[1]

سوال ہمارے علاقے میں رواج ہے کہ مردے کے کفن پر کلمہ شریف اور عہد نامہ وغیرہ لکھتے ہیں اور یوں بیان کرتے ہیں کہ جب مردے سے قبر میں سوالات ہوتے ہیں تو مردہ اپنے کفن سے دیکھ کر کلمہ شریف پڑھ دیتا ہے، تب فرشتے بول اٹھتے ہیں کہ بس ہمارے سوالوں کا جواب ہو گیا اور پھر اسی وقت اس کی قبر میں جنت کی طرف کھڑکی کھول دی جاتی ہے۔

اس کے متعلق پہلا سوال یہ ہے کہ کیا اس عقیدے کا ثبوت مطابق مسلکِ اہلِ سنت والجماعت ملتا ہے یا نہیں؟

دوسرا سوال یہ ہے کہ آنحضرت سرکارِ دو عالم ﷺ کے پیراہنِ مبارک پر کلمہ شریف یا عہد نامہ لکھا گیا ہے یا نہیں؟ اگر لکھا گیا ہے تو کس نے لکھا؟ اگر نہیں تو کیوں؟

تیسرا سوال یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی شادی شدہ صاحبزادیوں میں سے کسی صاحبزادی کا حضور ﷺ کی زندگی میں انتقال ہوا ہے یا نہیں؟ اگر ہوا ہے تو ان کے پیراہنِ مبارک پر حضور سرکارِ دو عالم ﷺ نے خود کلمہ شریف یا عہد نامہ لکھا ہے یا کسی صحابی کو لکھنے کا حکم فرمایا ہے یا حضور ﷺ کے سامنے آپ کی صاحبزادیوں کے پیراہنِ کفن پر کلمہ شریف یا عہد نامہ لکھا گیا اور حضور ﷺ نے سکوت فرمایا؟

[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۱۱؍ جنوری ۱۹۵۲ء)

چوتھا سوال یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کے بعد چاروں خلفاے راشدین بالترتیب خلیفہ ہوئے اور دارالبقاء کی طرف رحلت فرما گئے۔ آیا ان کے پیراہنِ کفن پر کلمہ شریف یا عہد نامہ وغیرہ لکھا گیا ہے یا نہیں؟ اگر لکھا گیا ہے تو کس نے لکھا ہے؟ اگر نہیں تو کیوں؟

ان سوالات کا جواب قرآنِ مجید اور صحیح حدیث کی روشنی میں دیا جائے۔ والسلام

جواب کفن پر کلمہ توحید یا کوئی عہد نامہ لکھنا شرعاً ثابت نہیں، نہ اس کا ذکر قرآن میں ہے نہ سنت میں۔ اللہ تعالیٰ کا مخلوق سے عہد ہے:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا﴾ [الکھف: ۱۰۷]

''جنت کی نعمتیں ان لوگوں کو عطا کی جائیں گی، جن کے پاس ایمان اور عمل صالح کا سرمایہ موجود ہوگا۔''

اعتقاد کی صحت اور عملی زندگی کی صلاحیت؛ یہ یقین اور عمل کی چیز ہے، لکھنے سے یہ چیز پیدا نہیں ہوتی۔ بے عمل قومیں حیلے بہانے کر کے اس سے نجات حاصل کرنا چاہتی ہیں اور یہ اللہ اور اس کے قانون کے ساتھ دھوکا ہے، جو مومن کے لیے مناسب نہیں اور نہ اللہ تعالیٰ دھوکے میں آ سکتا ہے۔ یہ چیز کم علم علما کی پیدا کی ہوئی ہے اور اس کی شرعاً کوئی دلیل نہیں، پھر یہ حیلہ جاہل کو کیا فائدہ دے گا، جو پڑھ ہی نہیں سکتا؟ اگر لکھے پڑھے کافر کے کفن پر یہ عہد نامہ یا کلمہ لکھا تو کیا اسے فائدہ دے گا؟ یقیناً نہیں۔ آنحضرت ﷺ کے کفن مبارک پر ایک حرف نہیں لکھا گیا اور وہاں ضرورت ہی کیا تھی؟ کیا آنحضرت ﷺ کو کلمہ بھی یاد نہ تھا؟!!

آنحضرت ﷺ کی لڑکیوں میں سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی اہلیہ محترمہ آنحضرت کی زندگی میں فوت ہوئیں، ان کے پیراہن یا کفن پر کچھ نہیں لکھا گیا۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا انتقال آپ ﷺ کے ہاتھوں میں ہوا، ان کے کفن پر بھی کچھ نہیں لکھا گیا۔

آنحضرت ﷺ کے چاروں خلفا بلکہ ہزاروں صحابہ جو آپ کی زندگی میں فوت ہوئے یا آنحضرت ﷺ کے بعد جن کا انتقال ہوا، کسی کے کفن پر کچھ نہیں لکھا گیا۔ ایمان اور نیک اعمال کے سوا موت کے لیے کوئی چیز مفید نہیں۔ یہ عہد نامہ کیا بلا ہے؟ ہمارے ہاں تو اس کا کوئی ذکر نہیں۔ معلوم نہیں آپ کے علاقے سے اللہ تعالیٰ نے کون سا نیا عہد فرمایا ہے؟!

21- قبروں پر پھول چڑھانے کی رسم قبیح:[1]

مخدومنا حضرت مولانا محمد اسماعیل (گوجرانوالہ) رحمہ اللہ کے رسالہ ''زیارتِ قبور'' میں ہے:

[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۱۹ ستمبر ۱۹۶۹ء)

''ہمارے ملک کے تعلیم یافتہ حضرات کی ذہنی کیفیت عجیب ہے، جو چیز یورپ سے آئے، اسے تو آنکھیں بند کر کے مان لیتے ہیں اور اسلام کے مسائل سامنے آجائیں تو سرتا سر بحث بن جاتے ہیں۔ یورپ میں رواج ہے کہ قبروں پر پھول چڑھاتے ہیں۔ ان حضرات میں دینی شعور تو کم ہے، مگر یہ حضرات اہلِ مغرب کی تقلید بغیر سوچ سمجھے کر رہے ہیں۔ جہاں جاؤ پھول چڑھ رہے ہیں، حالانکہ معلوم ہے کہ اس سے میت کو کوئی فائدہ نہیں، جیسے چراغ کی روشنی سے میت کو روشنی نہیں مل سکتی، پھول کی خوشبو سے میت کو کوئی فائدہ نہیں، لیکن یہ رسم یورپ سے آئی ہے، اس لیے بابو لوگ اس پر ضرور عمل کریں گے۔ عقل و دانش کا تقاضا ہے کہ ان رسوم کو جذبات سے بالا ہو کر دانش مندی سے ان پر غور کیا جائے۔ اب بڑھتے بڑھتے یہ رسم یہاں تک عام ہوگئی ہے کہ بادشاہوں اور وزرا کے دوروں میں مرنے والوں کی قبروں پر پھول چڑھانا خیر سگالی کا ایک جزو قرار دیا گیا ہے۔ اب یہ رسم ان حلقوں میں خاص دنیا داری بن چکی ہے، لیکن خانقاہی حلقوں میں اسے دین اور شریعت سمجھا جاتا ہے۔''

(رسالہ ''زیارتِ قبور''، ص: ۲۴، ۲۵)

اس پر میں نے حضرت ﷫ کی خدمت میں ایک عریضہ لکھا:

''بریلوی حضرات بزرگوں کی قبروں پر پھول چڑھانے کے لیے اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں، جس میں ذکر ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک دفعہ دو قبروں پر سبز ٹہنیاں رکھی تھیں اور فرمایا کہ ان کے خشک ہونے تک ان کے عذاب میں تخفیف رہے گی؟''

ذیل کا مکتوبِ گرامی اسی کے جواب میں ہے، جس پر ''۲،۳، ۱۹۶۱ء'' کی تاریخ درج ہے۔

(محمد عصمت اللہ قلعوی از لاہور)

جواب محترم مکرم زاد مجدک! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

۱ مکتوبِ گرامی ملا۔ آپ نے ایک دینی معاملے میں یاد فرمایا۔ اس کے لیے شکریہ قبول فرمائیں۔ اصل مسئلے کے متعلق گزارش ہے کہ قبور کے متعلق قطعی صحیح علم وحی سے ہوسکتا ہے اور یہ پیغمبر ﷺ کی خصوصیت ہے، اس کے علاوہ جو لوگ دعویٰ کرتے ہیں، یا تک بندی ہے یا دکانداری، اس لیے اس کا علاج بھی پیغمبر ﷺ ہی کا کام ہے، ہمارا اور آپ کا کام نہیں۔ اپنے بزرگوں کے متعلق یوں ہی فیصلہ کر لینا کہ وہ عذاب میں مبتلا ہوں گے۔ صحیح نہیں۔

۲ یہ علاج آنحضرت ﷺ کا معجزہ ہے، نہ تو اس کی ہر ایک کو اجازت دی جا سکتی ہے نہ پیغمبر کے سوا کسی کو معجزات عطا کیے جاتے ہیں، اس لیے جو بھی اس قسم کا دعویٰ کرے، اس کا دعویٰ صحیح نہیں ہوگا۔

3 معجزات پر قیاس کرنا شرعاً درست نہیں، کیونکہ معجزات انسانی عقل وفکر سے بالا ہوتے ہیں۔ جس کی وجہ ہمیں خود بھی معلوم نہیں، اس پر ہم دوسری چیز کو کیسے قیاس کر سکتے ہیں؟

4 آنحضرت ﷺ سے یہ عمل ساری عمر میں ایک دفعہ ثابت ہوا ہے۔ دوبارہ کسی جگہ آنحضرت ﷺ نے اس پر عمل نہیں فرمایا۔ اگر یہ عمل قیاسی اور عام طور پر مفید ہوتا تو آنحضرت ﷺ تمام لوگوں کو حکم فرماتے کہ تم ایسا کرو۔ آنحضرت ﷺ رحمۃ للعالمین تھے، مگر آپ سے یہ حکم دوسری دفعہ ثابت نہیں ہوا، پس آنحضرت ﷺ کے عمل سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ معاملہ ان دو قبروں کے لیے تھا، عام نہیں، ورنہ یہ عمل امت میں بطورِ سنت جاری رہتا۔

5 معجزات کو امت نے کبھی سنت یا استحباب کا مرتبہ نہیں دیا۔ صحیح مسلم میں ہے، ایک دفعہ کھانا کم تھا اور کھانے والے زیادہ، آنحضرت ﷺ نے کھانے میں لب مبارک ڈالا، اللہ تعالیٰ نے برکت فرمائی،[1] مگر صحابہ رضی اللہ عنہم نے اسے وہیں تک محدود رکھا۔ آٹے اور ہانڈی میں تھوکنا سنت نہیں سمجھا۔ آنحضرت ﷺ نے انگشت سے چاند کے دو ٹکڑے فرمائے، لیکن امت نے اسے بطورِ ثواب کبھی نہیں کیا کہ رات کو انگشت سے چاند کو اشارہ کریں۔ حدیبیہ میں صحابہ رضی اللہ عنہم نے آنحضرت ﷺ کے تھوک کو منہ اور ہاتھوں پر ملا،[2] مگر یہ آنحضرت ﷺ کی خصوصیت تھی۔ آج ہمارے یہ بریلوی دوست کسی فقیر یا عالم کا تھوک منہ پر نہیں ملتے۔ پس تمام معجزات کا یہی حال ہے۔ وہ پیغمبر کی خصوصیت ہوتے ہیں، امت کے لیے سنت نہیں ہوتے، نہ ان پر قیاس کیا جاتا ہے۔ وہ وہیں تک محدود ہوتے ہیں، جہاں تک شریعت نے انھیں محدود رکھا۔

آپ اس پر پھر غور فرمایئے! آنحضرت ﷺ کا صرف ایک دفعہ عمل، صحابہ اور تابعین کا پورا دور اس سے خالی ہے۔ امت نے پورے تیرہ سو سال اس پر عمل نہیں فرمایا۔ یہ عمل چودھویں صدی میں شروع ہوا، جبکہ یورپ نے پھول چڑھانا شروع کیا۔ اگر کسی کو اس پر عمل کرنا ہو تو انگریز کی سنت سمجھ کر کر لے۔ حدیث سے استدلال مخمل پر ٹاٹ کے پیوند کی طرح ہوگا۔ امید ہے یہ مختصر گزارش مسئلہ سمجھنے کے لیے کافی ہوگی۔ اگر مزید وضاحت کی ضرورت ہو تو بلا تکلف فرمایئے۔

6 اگر یہ مسئلہ قیاسی ہو اور بریلوی ذہن سے اسے سمجھا جائے تو جن قبرستانوں میں سایہ دار درخت ہیں، پھلواڑیاں لگی ہوئی ہیں، ان کو تو عذاب ہونا نہیں چاہیے، نہ ٹہنیاں خشک ہوں اور نہ ان کو عذاب، ویسے بھی عذاب صرف خزاں میں ہو، موسم بہار میں تو ہر قبرستان میں سبزی ہو جاتی ہے۔ اس لیے عذاب کے فرشتے

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٣٨٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٠٤٠)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٥٨١)

بالکل فارغ رہنے چاہئیں، گویا خدا تعالیٰ کا سارا کارخانہ سزا و جزا چند درختوں اور پھولوں نے روک دیا۔ یہ نظریہ کس قدر مضحکہ خیز ہوگا؟!

22- دعائے تعزیت میں ہاتھ اُٹھا کر فاتحہ کہنا:[1]

سوال متوفی کے متعلقین کے پاس جا کر ہاتھ اُٹھا کر فاتحہ کہنی جائز ہے؟ (شیخ عبدالواحد ریاست بہاولپور)

جواب میت کے لیے دعا مفید ہے، لیکن یہ مروج دعا، جو تین دن تک رسماً کی جاتی ہے، اس کا کوئی ثبوت نہیں، اس مسئلے کا ذکر نہ حدیث میں ہے نہ مذاہبِ ائمہ میں۔ رضوان اللہ علیہم أجمعین.

محمد اسماعیل

گوجرانوالہ

23,24,25- زمین کا عشر اور بیت المال:[2]

سوال (۱) پاکستان میں غیر مسلموں کی متروکہ زمین (جس پر حکومتِ پاکستان نے مہاجرین کو آباد کیا ہے) کی پیداوار پر عشر ہے یا نہیں؟ جب کہ ہم مہاجرین تین گنا معاملہ ادا کرتے ہیں، زمین نہری ہو یا چاہی، اور خراجی زمین کے متعلق بھی وضاحت فرمائیں کہ پاکستانی زمین خراجی ہے یا نہیں؟

(۲) ہمارے چک نمبر (۸) میں جماعت نے اپنا بیت المال قائم کیا ہوا ہے۔ کیا اس میں جو اُجناس یا روپیہ جمع ہو، وہ آیندہ سال تک ختم ہو جانا چاہیے یا بچ بھی رہے تو کوئی حرج نہیں؟

(۳) اگر بیت المال میں سے کسی ایسے شخص کو اناج یا روپیہ بطور قرضِ حسن دیا جائے تو جائز ہے یا نہیں، جو ایسا غریب نہیں ہے کہ صدقے کا مستحق ہو اور وقتی ضرورت بھی ہے، پھر وہ قرض ادا بھی کر سکتا ہے؟

ان سوالات کے جوابات قرآن و حدیث کے دلائل سے نہایت وضاحت کے ساتھ بیان فرمائیں، تا کہ ہماری جماعت کا اختلاف دور ہو۔ احمد الدین (ناظم جماعت اہلِ حدیث نمبر ۸، گ، ب لائل پور)

جواب متذکرہ بالا سوالات کے متعلق کوئی صریح حدیث میری نظر میں نہیں ہے۔ میں اپنا فہم عرض کر رہا ہوں، اس لیے آپ کو اس پر قانع ہونے کی ضرورت نہیں، بہتر ہے کہ تسکین کے لیے علما کی طرف رجوع کر لیا جائے۔

(۱) پاکستان میں بعض زمینوں کی ملکیت متنازع فیہ ہے۔ جب تک دونوں حکومتیں فیصلہ نہ کریں، یہاں کی زمین کے متعلق حتمی طور پر کچھ کہنا مشکل ہے۔ الاٹ منٹوں کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ بتدریج مستقل ملکیت

[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۲ر نومبر ۱۹۵۱ء)

[2] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۲۱ر ستمبر ۱۹۵۱ء)

کی طرف رجحان ہو رہا ہے۔ معاملے کی شرح میں اس قدر اضافہ، یہ ظالمانہ فعل ہے، جس پر حکومت کو نظر ثانی کرنی چاہیے، اس کے باوجود صحیح مسلک کے مطابق ان پر عشر واجب ہوگا۔ حکومت لاعلمی کی وجہ سے معاملہ تو خراج کی طرح وصول کر رہی ہے، جو اسے انگریز کی وراثت میں ملا ہے، حالانکہ زمین کی نوعیت پر سب سے پہلے غور کرنا چاہیے تھا۔ چونکہ معاملہ زمین کی رقم کے مصارف اور عشر و زکوۃ کے مصارف الگ الگ ہیں، اس لیے معاملے کی اس کثرت کے باوجود عشر اور زکوۃ کی فرضیت برقرار رہے گی۔

② بیت المال میں زکوۃ آ جانے کے بعد اسے اس سال میں ختم کرنا ضروری نہیں، بلکہ حسبِ ضرورت ختم کرنا چاہیے۔ بیت المال کے مصارف کی نوعیت کا تعین حکومت کا فرض ہے، یا ان لوگوں کا جو بیت المال کا انتظام کریں۔

③ زکوۃ کے مصارف قرآن میں متعین اور معلوم ہیں، اسے ان میں صرف کرنا ضروری ہے:

﴿إِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَ الْمَسٰكِيْنِ﴾ [التوبة: ٦٠]

قرض دینے کے متعلق کوئی نص نظر میں نہیں، لیکن اگر اس عمل سے فقرا اور مساکین کے حقوق کو نقصان نہ پہنچے تو کوئی حرج معلوم نہیں ہوتا۔ فقرا اور مساکین کی ضرورت کو بروقت پورا ہونا چاہیے۔

26- مسجد میں زکات یا فطرانہ دینا:[1]

سوال زکوۃ یا فطرانہ مسجد کے کام میں دینے کا کیا حکم ہے؟

جواب زکوۃ، صدقہ فطر مساکین اور فقرا کا حق ہے، مساجد پر صَرف کرنا درست نہیں۔

27- غیر شرعی رسوم و رواج والی شادی میں شرکت کرنا:[2]

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیانِ شرع متین کہ ایک رشتے دار مشرک بدعتی جاہل کی شادی ہوتی ہے، جس میں بہت سی بدعات پر عمل کیا جاتا ہے، مثلاً: گانے، بجانے، قوالیاں مولود وغیرہ، بلکہ بہت سی ان کے علاوہ اور بدعتیں ہوتی ہیں اور کھانے کے بعد دولہا کو لاکر دعوت والے لوگوں سے پیسے وصول کرتے ہیں۔ اب ایسی شادی کی اگر کوئی مسلمان موحد بوجہ ان بدعتوں کے دعوت قبول نہیں کرتا تو اسے رشتے سے خارج اور اس سے لین دین ختم کر دیتے ہیں۔ ہمارے لیے ایسی شادی کی دعوت قبول کرنا اور کھانا کھانا کیسا ہے؟

جواب آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے:

---

① ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۱۱؍ فروری ۱۹۶۸ء)

② ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۱۱؍ فروری ۱۹۶۸ء)

«كل محدثة بدعة، وكل بدعة ضلالة»[1]

''دین میں ہر نئی چیز بدعت ہے اور بدعت گمراہی کا راستہ ہے۔''

«لا يقبل الله لصاحب بدعة صرفا ولا عدلا»[2]

''بدعتی کے فرض ونوافل قابلِ قبول نہیں۔''

ایسی شادیوں میں شریک نہیں ہونا چاہیے، بلکہ ایمانی غیرت کا ثبوت دینا چاہیے اور جہلا کی تلخیوں سے نہیں گھبرانا چاہیے۔

28- عدت کے دوران میں نکاح کرنا:[3]

سوال زید کی بیوی ناراض ہوکر میکے چلی گئی، زید نے اسے دو طلاقیں دے دیں، تین ماہ کا عرصہ ہوگیا ہے، اب زید اپنی بیوی کو واپس لانا چاہتا ہے۔ کیا پہلا نکاح کافی ہے یا نکاحِ ثانی کی ضرورت ہے؟

جواب اگر تین حیض پورے ہوچکے ہیں تو رجوع تجدیدِ نکاح سے ہوگا اور اگر تین حیض پورے نہ ہوئے ہوں تو سابق نکاح کفایت کرے گا، تجدید کی ضرورت نہیں۔ ﴿وَ الْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ﴾ [البقرة: ٢٢٨] ''اور وہ عورتیں، جنھیں طلاق دی گئی ہے، اپنے آپ کو تین حیض تک انتظار میں رکھیں۔''

29- زانی مرد اور زانی عورت کا نکاح کرنا:[4]

سوال ایک لڑکی کا ناجائز تعلق زید کے ساتھ ہوگیا۔ زید سے اسے حمل رہ گیا۔ لڑکی کے والدین نے اس کا نکاح بکر کے ساتھ کر دیا۔ لڑکی بچہ پیدا ہونے کے بعد پھر حاملہ ہوگئی:

1. کیا یہ نکاح جائز ہے؟
2. اگر جائز نہیں تو کیا اب بحالتِ موجودہ نکاح ہوسکتا ہے؟

جواب حاملہ کا نکاح صورتِ مستفسرہ میں احناف کے نزدیک زید اور بکر دونوں سے درست ہے، لیکن بکر کو ایامِ حمل میں مقاربت کی اجازت نہیں۔ صحیح مسلک یہ ہے کہ ایسے نکاح درست نہیں۔ قرآن عزیز نے دونوں کے لیے شرط لگائی ہے:

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٦٠٧)

[2] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٩) اس کی سند میں محمد بن محصن راوی کذاب ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (١٤٩٣)

[3] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (یکم فروری ۱۹۵۲ء)

[4] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (یکم فروری ۱۹۵۲ء)

﴿ مُحۡصِنِيۡنَ غَيۡرَ مُسٰفِحِيۡنَ وَ لَا مُتَّخِذِىۡۤ اَخۡدَانٍ﴾ [المائدة: ٥]

اور اسی طرح عورت کے متعلق فرمایا:

﴿ مُحۡصَنٰتٍ غَيۡرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخۡدَانٍ﴾ [النساء: ٢٥]

نکاح کے وقت عورت اور مرد دونوں کو پاکباز ہونا چاہیے۔

یہ کلمات مقامِ نکاح میں بمنزلہ شرط ہیں، اس لیے جب تک عورت کی پاکیزگی کا نکاح کے وقت یقین نہ ہو، یہ شرط ناپید ہوگی۔ بدکار عورت بھی اگر نکاح کرے تو اسے اتنا وقفہ ملنا چاہیے، جس میں عورت کی سچی توبہ کا یقین ہو جائے۔ قرآنِ عزیز میں اللہ تعالیٰ نے زانی اور زانیہ کے طبعی رجحانات کا ذکر فرما کر آخر میں فرمایا:

﴿وَحُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ﴾ [النور: ٣]

''اہلِ ایمان کے لیے ایسے نکاح نادرست ہیں اور حرام ہیں۔''

سنن ابو داود میں ابو مرثد غنوی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اسلام سے پہلے ان کا تعلق ایک بدکار عورت سے تھا، جس کا نام عناق تھا۔ فرماتے ہیں:

"جئت إلى النبي ﷺ فقلت: يا رسول الله! أنكح عناقاً؟ قال: فسكت عني، فنزلت: ﴿الزَّانِيَةُ لاَ يَنْكِحُهَا اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ﴾ فدعاني فقرأها علي، وقال: لا تنكحها"[1]

(مطبع مجتبائی: ١/٢٨٧)

''میں نے آنحضرت ﷺ سے عرض کیا کہ کیا میں عناق سے نکاح کر لوں؟ آپ خاموش رہے، پھر یہ آیت نازل ہوئی: ﴿الزَّانِيَةُ لاَ يَنْكِحُهَا اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ﴾ آپ نے یہ آیت سنا کر فرمایا کہ اس سے نکاح مت کرو۔''

دوسری روایت میں حضرت بصرہ انصاری سے مروی ہے، فرماتے ہیں:

"إنه نكح امرأة فوجدها حبلىٰ وفرق بينهم"[2] (١/ ١٩٧)

''بصرہ نے ایک عورت سے نکاح کیا، اسے ناجائز حمل تھا، آپ ﷺ نے ان دونوں میں تفریق کرا دی۔''

اس سے ظاہر ہے کہ شرعاً ایسے نکاح درست نہیں ہیں۔ نکاح ایک مقدس تعلق ہے، جس کا مقصد عصمت اور پاکیزگی پیدا کرنا ہے۔ اگر اس گندگی میں بھی نکاح کی اجازت دی جائے تو نکاح کی تقدیس اور نسب کی صحت مخدوش ہو جائے گی۔

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٠٥١) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣١٧٧) سنن النسائي، رقم الحديث (٣٢٢٨)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢١٣١) یہ حدیث ابن جریج کی تدلیس کی وجہ سے ضعیف ہے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے سورت نور اور فتاویٰ میں اس پر تفصیل سے لکھا ہے،[1] اسی طرح حافظ ابن قیم نے زاد المعاد میں اس نکاح کے ناجائز ہونے کی صراحت فرمائی ہے۔[2]

30- حرمتِ مصاہرت:[3]

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل میں:

مثلاً زید نے اپنی زوجہ کی حقیقی خالہ سے ناجائز خیال سے دست درازی کی، لیکن صحبت نہیں کر سکا اور زید اپنی بیوی کو ابھی تک گھر نہیں لایا، صرف نکاح کیا ہے۔ اب وہاں کے حنفی علما کہتے ہیں کہ زید پر اس کی بیوی حرام ہوگئی، حرمتِ مصاہرت کے طور پر... جناب سے التماس ہے کہ قرآن و حدیث کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں: کیا زید اپنی بیوی کو گھر لا کر آباد کر سکتا ہے؟ (منور خان، ساکن گھینہ، ضلع و تحصیل مظفر آباد، آزاد کشمیر)

جواب جمہور علمائے محدثین کے نزدیک حرمتِ مصاہرت سے حلال چیز حرام نہیں ہوسکتی۔ حدیث شریف میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے: "قالت: قال رسول الله ﷺ: « لا يفسد الحلال بالحرام » (دارقطني: ٤٠٢) "حرام کی وجہ سے حلال فاسد نہیں ہوگا۔" اس حدیث کی سند ضعیف ہے، عثمان بن عبد الرحمان وقاصی متروک ہے۔

اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

« لا يحرم الحرام الحلال »[4] (دارقطني: ٤٠٢)

"التعليق المغني" میں ہے: "إسناده أصلح منه" اس کی سند حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت سے بہتر ہے۔ بخاری رحمہ اللہ نے اسے تعلیقاً حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ذکر فرمایا ہے۔ سہیلی نے بواسطہ عکرمہ اسے موصولاً ذکر فرمایا:

"رجل غشي أم امرأته قال: تخطى حرمتين، ولا يحرم عليه امرأته، وإسناده صحيح"[5] (التعليق المغني: ٤٠٣)

---

① مجموع الفتاویٰ (٣٢/ ١١٣)

② زاد المعاد (٥/ ١٠٤)

③ ہفت روزہ "الاعتصام" لاہور (٢٤، جون ١٩٦٨ء)

④ سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٠١٥) سنن الدارقطني (٣/ ٢٦٨) امام بوصیری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "في إسناده عبد الله بن عمر [العمري] وهو ضعيف" نیز اس کی سند میں اسحاق بن محمد فروی بھی ضعیف ہے۔

⑤ نیز دیکھیں: سنن البيهقي (٧/ ١٦٨) یہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔

”اس نے دو حرام کام کیے، زنا کی حرمت اور بیوی کی ماں کی حرمت، مگر اس کی بیوی اس پر حرام نہیں، سعد بن حبیب، زہری وغیرہ ائمہ سے بھی اس طرح مروی ہے۔“

احناف کے نزدیک حرمتِ مصاہرت کا مسئلہ ان احادیث کے خلاف ہونے کے علاوہ بڑا ہی غیر فقہی معلوم ہوتا ہے۔ مصاہرت کا تعلق شرعاً حلال اور جائز نکاح کے بعد ہی ہوسکتا ہے۔ زنا کی صورت میں مصاہرت نہیں ہوگی۔ خالہ کے ساتھ اگر نکاح کیا جاتا تو شرعاً نا درست ہوتا۔ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے: «لا تنكح امرأة علىٰ خالتها»[1] ”خالہ اور بھانجی کو نکاح میں جمع نہ کیا جائے۔“

زنا کے احکام تو شرعاً حدود کی صورت میں ہیں اور پھر اس صورت میں زانی نے عیاشی کی اور سزا بے چاری معصومہ کو ملی، اس کا نکاح ٹوٹ گیا۔ اگر یہ زانی حد سے بچ جائے تو احناف بھی اجازت دیتے ہیں کہ وہ زانی موطوءہ سے نکاح کرے۔ زانی تو مزے میں رہا، ایک گئی دوسری آ گئی، اس لیے اسے حرمتِ مصاہرت قرار دینا ایسی چیز ہے، جس پر فقہائے حنفیہ کو نظر ثانی کرنی چاہیے۔ مصاہرت تو صحیح شرعی نکاح سے ہوگی۔ زانی کے لیے حرام اور ناجائز راہ سے حلال نکاح کی راہ کھل گئی، اس زانیہ سے نکاح کر لیا، سزا تو اسے ملی، جس نے کوئی غلطی نہیں کی، لیکن اسے فقہاے حنفیہ کے حکم سے نئے خاوند کی تلاش میں نکلنا پڑا۔

زنا کو اگر مصاہرت کا حکم دیا جائے تو زانیہ کو مہر ملنا چاہیے، اس پر عدت ہونی چاہیے، اسے زانی کی میراث ملنی چاہیے۔ یہ بے چاری تو فوائد سے محروم ہوگئی اور بلا گناہ اسے سزا ملی۔ فقہاے حنفیہ رحمہم اللہ کا یہ فیصلہ درایت کے بالکل خلاف ہے اور صحیح نہیں معلوم ہوتا، اس حرام کا اثر حلال پر نہیں ہوگا۔ فقہاے حنفیہ رحمہم اللہ کا فیصلہ تحلیل بالحلالہ بھی اسی طرح درایت کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو تین طلاق دے تو قرآنِ عزیز کا فیصلہ ہے:

﴿فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ﴾ [البقرة: ٢٣٠]

وہ کسی دوسرے خاوند کے ساتھ صحیح شرعی نکاح کرے، پھر وہ اپنی مرضی سے طلاق دے یا اس کی وفات ہو جائے تو یہ پہلے خاوند سے نکاح کر سکے گی۔ نہایت ہی معقول اور صحیح فیصلہ ہے، لیکن فقہاے حنفیہ فرماتے ہیں، گو حلالہ نا درست ہے: «لعن الله المحلل والمحلل له»[2] لعنت ہے حلالہ کرنے کرانے والے پر۔ لیکن اگر حلالہ کر لیا جائے تو عورت اس وقت پہلے خاوند پر حلال ہو جائے گی اور اس سے نکاح کر سکے گی!!

تین طلاق دینے میں خاوند نے غلطی کی، سزا عورت کو ملی۔ وہ کچھ عرصے کے لیے دوسرا شوہر تلاش کرے،

---

[1] دیکھیں: صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٤٠٨)

[2] سنن أبي داود، رقم الحدیث (٢٠٧٦)

پھر حلالہ حرام اور نادرست ہونے کے باوجود جائز نکاح کا ذریعہ بن گیا۔ پہلی صورت میں زنا نے حلال بیوی کو حرام کر دیا، دوسری صورتِ حلالہ میں مطلقہ ثلاثہ کے حرام نکاح کو حلال کر دیا۔ دونوں فیصلے فقہ کے ہیں اور دونوں درایت کے خلاف ہیں۔ صریح اور صحیح احادیث کے بھی موافق نہیں۔

محمد اسماعیل، کان اللہ لہ

(گوجرانوالہ۔ ۱۷ر فروری ۱۹۶۸ء)

31- بیوی کو نان ونفقہ نہ دینا:

سوال آٹھ سال ہوئے، ہندہ کا زید سے نکاح ہوا تھا، اس اثنا میں ہندہ بہت دفعہ اپنے سسرال گئی، مگر زید آوارہ ہو کر گھر سے باہر نکل کھڑا ہوتا۔ اگر دس روز گھر رہتا تو چھے ماہ باہر آوارہ گردی میں گزارتا اور خالی ہاتھ گھر واپس آ جاتا اور اگر بیس روز گھر پر ٹھہرا تو سال بھر باہر آوارگی میں گھومتا پھرا۔ بالفاظِ دیگر اپنی بیوی سے نہ تو تعلقاتِ زناشوئی قائم رکھتا ہے اور نہ نان ونفقہ کی کفالت کرتا ہے، اسے بہترا کہا گیا کہ آخر ہندہ سے کیا گناہ ہوا ہے کہ اس کے حقوق پورے نہیں کرتے؟ ناصح کے سامنے ہاں ہوں کر کے بات ٹال دیتا ہے، مگر عملی طور پر حسبِ عادت نہ تو ہندہ کو چھوڑتا ہے اور نہ آباد ہی کرتا ہے تو آپ قرآن وحدیث کی روشنی میں اس مسئلے کو حل فرمائیں۔

جواب صورتِ مسئولہ میں زید متعنت ہے۔ قرآن عزیز نے ایسے تمام معاملات میں ایک جامع اصول مقرر فرما دیا ہے: ﴿وَ لَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا﴾ [البقرۃ: ۲۳۱] ''عورتوں کو اس طرح پابند نہ کرو کہ ان کو نقصان اور ضرر پہنچے اور تمھاری طرف سے ان پر زیادتی تصور ہو۔''

نیز فرمایا:

﴿وَ بُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا﴾ [البقرۃ: ۲۲۸]

''ان کے خاوند واپسی کے زیادہ حقدار ہیں، بشرطیکہ وہ اصلاح کا ارادہ کریں۔''

گو اگر ایسے قرائن ثابت ہو جائیں، جن سے معلوم ہو کہ خاوند دستور کے مطابق آباد نہیں کرنا چاہتا تو مرد سے حقِ رجوع سلب کر لیا جائے گا:

﴿فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ﴾ [البقرۃ: ۲۲۹]

''یا دستور سے معاشرت کرو یا احسان ومروت سے عورت کو چھوڑ دو۔''

پھر ارشاد فرمایا: ﴿وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ [البقرۃ: ۱۹] یعنی گھر کے معاملات معروف سے پورا کرو۔ نیز

فرمایا: ﴿لَهُ رِزْقُهُنَّ وَ كِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ [البقرة: ۲۳۳] ''عورت کو لباس اور خوراک دستور کے ساتھ ملنا چاہیے۔''

ان تمام آیات میں بیوی کے اخراجات، عام معاشرت کی ذمے داری مرد پر ڈال دی گئی ہے اور اس عرف کو حکم کی حیثیت دی گئی ہے۔ اگر نزاع پیدا ہو تو اسے عرف کے مطابق طے کیا جائے گا، لیکن کھانا اور لباس بہر حال خاوند کے ذمے ہوگا۔ ہندہ کو آنحضرت ﷺ نے اجازت مرحمت فرمائی کہ وہ اپنے اخراجات خاوند کے مال سے اس کی اجازت کے بغیر بھی لے سکتی ہے۔[1] صحیح مسلم میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے عرفات میں خطبہ فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا:

«ولهن عليكم رزقهن وكسوتهن بالمعروف»[2]

''عورت کے کھانے اور لباس کی ذمے داری خاوند پر ہے۔''

حکیم بن معاویہ قشیری اپنے باپ سے روایت فرماتے ہیں:

"قلت: يا رسول الله ما حق زوجة أحدنا عليه؟ قال: تطعمها إذا أكلت، وتكسوها إذا اكتسيت، ولا تضرب الوجه، ولا تقبح، ولا تهجر إلا في البيت"[3]

(أحمد، أبو داود، ابن ماجه)

''میں نے دریافت کیا کہ بیوی کا کیا حق ہے؟ فرمایا کہ اپنی طرح اس کے کھانے اور لباس کا انتظام کرو۔ منہ پر مت مارو اور اس کا قباحت سے تذکرہ مت کرو اور ناراض ہو کر گھر سے نہ نکالو۔''

یہ خطبہ غالباً حجۃ الوداع کا ہے، جس سے ظاہر ہے کہ یہ تمام ذمے داریاں خاوند پر واجب ہیں، یہ مضمون ''فتاویٰ شیخ الاسلام'' (۳/۲۳۲) سے ماخوذ ہے۔

ظاہر ہے کہ کھانے کی ضرورت زن وشوئی کے تعلقات سے کہیں زیادہ ضروری ہے۔ جب عنین کے لیے فسخ کی شرعاً باتفاقِ ائمہ اجازت ہے تو متعنت، جو جان کر اپنی بیوی کو اخراجات میں تنگ کرتا ہے، بطریقِ اولیٰ فسخ کا مستحق ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے: «تقول المرأة: إما تطعمني وإما إن تطلقني...»[4] (۲/ ۸۰٦) ''یا مجھے کھانا دو یا مجھے طلاق دو۔''

اس تفصیل سے ظاہر ہے کہ جب خاوند نان ونفقہ کی کفالت نہ کر سکے تو عورت کو طلاق کا مطالبہ کرنے کا

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۵۰٤۹) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۷۱٤)

[2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۲۱۸)

[3] مسند أحمد (٤/ ٤٤٧) سنن أبي داود، رقم الحدیث (۲۱٤۲) سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (۱۸۵۰)

[4] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۵۰٤۰) یہ ایک مرفوع روایت کے بعد سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے اپنے ذکر کردہ الفاظ ہیں، مرفوع روایت کا حصہ نہیں، جیسا کہ صحیح بخاری کی مذکورہ بالا روایت کے بعد ہی سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے اس کی صراحت کی ہے۔

حق ہے۔ فقہائے حنفیہ رحمہم اللہ کو اس میں اختلاف تھا، لیکن اب انھوں نے بھی موجودہ حالات میں دوسرے ائمہ کے اقوال پر عمل کرتے ہوئے جوازِ فسخ کی اجازت مرحمت فرمائی ہے۔ اب یہ مسئلہ متفقہ سمجھنا چاہیے۔ قاضی حالات کی تحقیق کرے، اگر تعنت ثابت ہو جائے تو نکاح فسخ کرایا جائے۔ تفصیل کے لیے کتبِ فقہ الحدیث کی طرف رجوع کیا جائے۔[1]

32- بچے کی پرورش کے اخراجات:[2]

سوال ایک شخص کی بیوی تین یا چار سالہ ایک بچی چھوڑ کر فوت ہوگئی اور اس کے خاوند نے وہ بچی یہ کہہ کر اس کی نانی کے سپرد کر دی کہ تم اس کو پالو، جب یہ بڑی ہو جائے گی تو میں اس کا تمام خرچ دے کر تم سے واپس لے لوں گا، یا لڑکی کو تمھارے ہی پاس رہنے دوں گا۔ اب لڑکی کی غریب نانی نے اس کی سات سال پرورش کی، مگر لڑکی کا والد اب لڑکی کو اس کی نانی سے جبراً چھیننا چاہتا ہے اور اس غریب کو اس کے اخراجات دینے سے انکار کرتا ہے، اس صورت میں شریعتِ اسلامی کا کیا حکم ہے؟ (محمد یعقوب گھلن ہلمار، ضلع لاہور)

جواب صورتِ مسئولہ میں اس لڑکی کا خرچ اس کے باپ پر عائد ہوتا ہے اور اس کی نانی نے جو پرورش کی ہے، اس کا نتیجہ یہ تو نہ ہونا چاہیے کہ وہ خرچ بھی برداشت کرے، اسی قسم کے مسائل میں اللہ تبارک و تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ عَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَ كِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا﴾ [البقرة: ٢٣٣]

[اور وہ مرد جس کا بچہ ہے، اس کے ذمے معروف طریقے کے مطابق ان (عورتوں) کا کھانا اور ان کا کپڑا ہے۔ کسی شخص کو تکلیف نہیں دی جاتی مگر جو اس کی گنجایش ہے، نہ ماں کو اس کے بچے کی وجہ سے تکلیف دی جائے]

چھٹی صدی ہجری کے مشہور محدث امام ابوبکر محمد ابن العربی المالکی "أحکام القرآن" میں اس آیتِ کریمہ پر لکھتے ہیں:

"فیه دلیل علیٰ وجوب نفقة الولد علی الوالد لعجزه وضعفه" (أحکام القرآن: ١/ ٨٦)

آیتِ کریمہ سے یہ معلوم ہوا کہ پرورش کرنے والی بیچاری کو تکلیف دینا ناجائز ہے۔

---

① دیکھیں: فتح الباري (٩/ ٥٠١) نیل الأوطار (٧/ ٨٢)

② ہفت روزہ "الاعتصام" لاہور (١٦/ مئی ١٩٥٢ء)

حدیث میں ہے: «يقول لك ابنك: أنفق علي، إلىٰ من تكلني؟»[1]

(أحكام القرآن بحواله صحيح البخاري)

اس حدیث سے بھی والد پر نفقہ کا وجوب ثابت ہوتا ہے، لہٰذا والد کو چاہیے کہ وہ لڑکی کی نانی کو خرچہ ادا کرے۔ هذا ما عندي والله أعلم.

33- وراثت میں لڑکی کا حصہ:[2]

سوال اس مسئلے میں شریعتِ اسلامیہ ہماری کیا راہنمائی کرتی ہے کہ زید نے دو عورتوں سے شادی کی، لیکن ان دونوں سے اولاد نہیں ہوئی، پھر تیسری شادی ہندہ سے کی۔ یاد رہے ہندہ مذکورہ زید سے شادی کرنے سے قبل بکر اور عمرو سے شادی کر کے قطع تعلق کر چکی ہے۔ بکر سے ہندہ کے ہاں دو لڑکے پیدا ہوئے اور عمرو کے گھر تقریباً چھے سال کی مدت گزاری، لیکن کوئی اولاد وغیرہ نہیں ہوئی۔ اب ہندہ نے زید سے شادی کی۔ شادی کے ڈیڑھ سال بعد اس کے ہاں لڑکی ہوئی، جس کے متعلق زید کے رشتے داروں اور دیگر گاؤں والوں کی شہادت ہے کہ لڑکی ولد الحرام ہے اور بعض یہ بھی کہتے ہیں کہ ہندہ بغیر شادی کے زید کے گھر رہی ہے۔ لڑکی جوان ہوئی۔ زید نے اس کی شادی اپنے بھتیجے کے لڑکے سے کر دی اور لڑکی کو عام رسم و رواج کے مطابق جہیز بھی دیا۔ اب زید فوت ہو چکا ہے اور اس کی جائیداد افسران نے ذیل کے طریقے پر تقسیم کی:

لڑکی کو زید کی جائیداد سے نصف اور اس کی تینوں بیویوں کو باقی نصف سے آٹھواں حصہ اور باقی جائیداد دوسرے رشتے داروں میں تقسیم کر دی۔

اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ آیا شرعاً یہ تقسیم صحیح ہے اور مذکورہ لڑکی زید کی جائیداد کی جائز حقدار ہے یا نہیں؟

نوٹ: اس لڑکی کے بعد ہندہ نے زید کے گھر تقریباً ۱۸ سال گزارے، لیکن پھر اولاد نہیں ہوئی۔

(محمد سلیمان انصاری، گوجرانوالہ)

جواب زید کی لڑکی کو بحکم ﴿وَ اِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ﴾ [النساء: ۱۱] نصف ملنا چاہیے اور زید کی تینوں بیویوں کو کل جائیداد سے آٹھواں حصہ دینا چاہیے، جیسے قرآن مجید میں ہے: ﴿فَاِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ﴾ [النساء: ۱۲]۔ اور باقی ماندہ زید کے عصبات کو ملنی چاہیے۔ حدیث میں ہے:

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۵۰۴۰) یہ الفاظ بھی مرفوع روایت کا حصہ نہیں، بلکہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے بیان کردہ تشریحی الفاظ ہیں، جیسا کہ انھوں نے خود ہی یہ الفاظ بیان کرنے کے بعد وضاحت فرمائی ہے۔

[2] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۱۱ر جولائی ۱۹۵۲ء)

«ألحقوا الفرائض بأهلها فما بقي فهو لأولیٰ رجل ذكر»[1]

واقعی لڑکی میراث کی مستحق ہے۔«الولد للفراش و للعاهر الحجر»[2] اور تہمت لگانے والے حد کے لائق ہیں۔

حافظ محمد گوندلوی، مولانا محمد اسماعیل صاحب

34- حقہ نوشی:[3]

سوال حقہ نوشی کے متعلق قرآن و حدیث کی رو سے صحیح صحیح فتویٰ عنایت کریں کہ شریعت میں اس کا کیا حکم ہے: گناہ صغیرہ ہے یا کبیرہ؟ قطعی حرام ہے یا نہیں؟ اگر حرام ہے تو کس حدیث کی رو سے؟

جواب حقہ آنحضرت ﷺ کے زمانے میں نہیں تھا، اس لیے محرمات منصوصہ کی طرح اس کا تذکرہ زبانِ رسالت مآب سے مشکل ہے، لیکن ایک چیز ظاہر ہے کہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ پیاز وغیرہ بدبودار چیزیں استعمال کر کے مسجد میں نہ آؤ، اس سے ملائکہ کو اذیت ہوتی ہے،[4] تمباکو کی بو پیاز وغیرہ سے زیادہ مکروہ ہے، اس لیے حقہ نوش کی مسجد میں حاضری اور نماز با جماعت اس حدیث کی رو سے ناپسندیدہ ہوگی۔ سنا ہے کہ حقہ کی بدبو منہ سے نہیں جا سکتی، نیز عادتاً پینے والے اتنا وقفہ نہیں کر سکتے، جس سے بدبو دور ہو جائے، لہٰذا سائل کو حقہ اور نماز میں سے ایک چیز کو ترجیح دینی ہوگی۔

اس بارے میں علمائے امت کے دو مسلک ہیں۔ بعض اسے مباح کہتے ہیں اور بعض حرام۔ مباح کہنے والوں کا خیال ہے کہ اس کی حرمت کے متعلق کوئی صریح نص نہیں۔ مانعین کا خیال ہے کہ اصول کے طور پر اس کی حرمت کا ذکر حدیث شریف میں آیا ہے:

"عن أم سلمة قالت: نهیٰ رسول الله ﷺ عن كل مسكر ومفتر"[5] (ابو داود: ۳/ ۳۷۰)

''آنحضرت ﷺ نے ہر مست کرنے والی اور فتور پیدا کرنے والی چیز سے منع فرمایا ہے۔''

اس اصل کی بنا پر علما کا خیال ہے اور تجربے سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ تمباکو حقہ میں استعمال کرنے سے فتور آ جاتا ہے۔ سائل کی بے قراری، بار بار چھوڑنا اور پھر شروع کرنا، اس کی دلیل ہے۔ فتور ہی کے لیے یہ اضطراب ہوتا ہے، تاہم یہ مسئلہ بحث طلب ہے۔ میرا ذاتی رجحان حرمت کی طرف ہے، مگر فتوے کے طور پر ایسا کہنا مشکل

---

① صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٣٥١) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦١٥)

② صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٣٦٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٥٧)

③ ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۱۱ر جنوری ۱۹۵۲ء)

④ صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٦٣)

⑤ سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٦٨٦) مسند أحمد (٦/ ٣٠٩)

ہے، اس کی مضرت اور برائی کا اقرار تو شاید اس کے تمام پینے والے بھی کرتے ہیں، اس لیے جو چیز متفقہ طور پر بری ہو، اسے چھوڑ ہی دینا بہتر ہے، بنا بریں آپ کے لیے یہی بہتر ہے کہ ہمیشہ کے لیے حقہ چھوڑ دیں۔

حدیثِ ام سلمہ رضی اللہ عنہا (جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے) میں شہر بن حوشب میں کلام ہے۔ امام مسلم نے ان پر گفتگو فرمائی ہے۔ امام احمد اور یحییٰ بن معین اور امام بخاری نے ان کی توثیق فرمائی ہے۔ ترمذی ان کی حدیث کو صحیح فرماتے ہیں۔[1] تضعیف کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ حدیث حسن سے کم نہیں، اس لیے قابلِ عمل ہے اور حقہ نوشوں کے لیے مقامِ غور!

35- تکبیر پڑھ کر بندوق سے شکار:[2]

سوال اگر تکبیر پڑھ کر بندوق چلائی جائے اور آدمی کے پہنچنے سے پہلے ہی شکار جانبر نہ رہے تو کیا وہ شکار ذبح ہے۔ (شیخ عبدالواحد ریاست بہاولپور)

جواب اگر تکبیر پڑھ کر بندوق چلائی گئی اور ذبح سے پہلے موت طاری ہوگئی تو جانور حلال ہے، جیسے شکاری جانوروں کے متعلق احادیث میں آیا ہے۔ بندوق تیر کے قائم مقام ہے، اس کا حکم بھی وہی ہے، اگر ذبح کا موقع مل جائے تو ذبح کرنا ضروری ہے۔

محمد اسماعیل، گوجرانوالہ

36- نسوار سے روزہ ٹوٹنا:[3]

سوال کیا نسوار سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے؟ گزارش ہے کہ ہمارے ہاں جھگڑا چل رہا ہے کہ نسوار سونگھنے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے یا نہیں؟ آپ اس کا پورا جواب دے کر شکریے کا موقع دیجیے۔

(محمد اسلم چک: ۳۲، ص۔ب، ضلع لائل پور)

جواب نسوار سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے، اس میں اختلاف کی کوئی وجہ معلوم نہیں۔ نسوار میں استنشاق لازمی ہے، جس سے وہ ایک طرف دماغ پر اثر کرے گی اور دوسری طرف حلق سے نیچے اترنا لازمی ہے۔ نسوار میں خود قوتِ جذب اس قدر ہے کہ وہ حلق سے ضرور نیچے پہنچتی ہے۔

لقیط بن صبرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢١٢١) تهذيب التهذيب (٤/ ٣٢٤)

[2] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۲/ نومبر ۱۹۵۱ء)

[3] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۲۰/ جون ۱۹۵۲ء)

«وبالغ في الاستنشاق إلا أن تكون صائماً» [1] (ابو داود، نسائي، دارمي، ترمذي)

''روزے دار کو وضو کرتے وقت پانی چڑھانے میں مبالغہ نہیں کرنا چاہیے۔''

اس حدیث سے ظاہر ہے کہ استنشاق صوم کے منافی ہے، نسوار عربی میں نشوق کو کہتے ہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ اس میں استنشاق ضروری ہے۔ اس لیے نسوار بلاشبہ ناقضِ روزہ ہے۔

37- مروجہ ٹائم ٹیبل کے مطابق روزہ رکھنا اور افطار کرنا: [2]

سوال کیا فرماتے ہیں علماے دینِ متین وشرع شریف اس مسئلے میں کہ آج کل کے مروجہ ٹائم ٹیبل کے مطابق روزہ رکھنا اور چھوڑنا شریعتِ محمدیہ ﷺ میں جائز ہے یا نہیں؟ اگر جائز ہے اور اس کا انکار درست نہیں تو اس کی کیا دلیل ہے؟ اگر چند منٹ دلی کی تسلی کے لیے بعد میں چھوڑا یا چھڑایا جائے تو کیا روزہ مکروہ ہو جاتا ہے؟

نیز واضح فرمایا جائے کہ روزہ چھوڑنے کا وقت شریعت میں کونسا ہے اور حضور اکرم ﷺ نے جو فرمایا ہے: «لا یزال الناس بخیر ما عجلوا الفطر» اس کا مطلب کیا ہے؟ اس حدیث شریف کی رُو سے جلدی کرنا کہاں تک درست ہے؟ (۲ر شعبان ۱۳۸۵)

(احقر العباد: مولوی شیر محمد۔ مدرس چک نمبر ۶۵۴/۵ گ ب۔ تحصیل جڑانوالہ۔ ضلع لائل پور)

جواب حدیث کا مطلب یہی ہے کہ جب غروبِ آفتاب کا یقین ہو جائے تو فوراً روزہ کھول دے۔ ٹائم ٹیبل عموماً حساب سے بنائے جاتے ہیں۔ ان کے مطابق روزہ کھولا جائے تو کوئی حرج نہیں۔ اگر حساب کا ماہر غلط سمجھتا ہے تو اسے صحیح وقت شائع کرنا چاہیے۔ احتیاطاً اگر ایک دو منٹ تاخیر ہو جائے تو اسے خوانخواہ محلِ نزاع نہیں بنانا چاہیے۔

38- قرآن مجید کا نظم میں ترجمہ: [3]

سوال قرآنِ مجید کا شعر ونظم میں ترجمہ کرنا درست ہے؟

جواب اَشعار میں ترجمہ صحیح طور پر نہیں ہوتا اور اس طرح مفہوم غلط ہو جانے کا امکان ہوتا ہے، البتہ ترجمانی کے طور پر ایسے اَشعار، جن میں قرآن کا مطلب پوری طرح بیان ہو گیا ہو، پڑھنے میں کوئی حرج نہیں۔

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٤٢) سنن الترمذي، رقم الحديث (٧٨٨) سنن النسائي، رقم الحديث (٨٧) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٠٧)

[2] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۱۱ر فروری ۱۹۶۸ء)

[3] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۱۱ر فروری ۱۹۶۸ء)

مقالات

کیا غیر اللہ کے نام کی نذر مانا ہوا جانور شرعی طریق پر ذبح کرنے سے حلال ہو جاتا ہے؟

ایک فتویٰ متعلقہ ''نذر لغیر اللہ''، ''توحید'' (۱۵ر شوال ۱۳۴۷ھ) کی اشاعت میں شائع ہوا ہے، جس کا ماحصل یہ تھا کہ اگر نذر لغیر اللہ اسلامی قبضے میں آ کر تعظیماً لوجہ اللہ ذبح کی جائے تو حلال ہے۔ فتویٰ بہت مختصر اور مجمل ہے، جس سے عوام میں غلط فہمی کا اندیشہ اور خطرہ ہے، بلکہ بعض لوگوں نے جلسہ منٹگمری پر ذکر کیا کہ کیا مولوی صاحب موصوف نذر لغیر اللہ کو حلال سمجھتے ہیں؟ یہی خیال اس تحریر کا محرک ہوا، ورنہ حضرت الشیخ کے مضمون پر کوئی تنقید مقصود نہیں۔ مقصود صرف اسی مفہوم کا اظہار ہے، جو حضرت مفتی صاحب مذکور کے الفاظ میں مستور ہے اور ان کے دلائل اقتضاءً اس پر دلالت کرتے ہیں، لیکن عوام اس کے فہم سے قاصر ہیں۔ فتویٰ مذکور میں کہا گیا ہے:

''اگر وہ زندہ مسلمان کے قبضہ اور ملک میں آ کر بہ نیتِ تعظیم رب العالمین عزوجل اور بہ نیتِ توحید رب العالمین سبحانہ وتعالیٰ اس کو ذبح کرے "بسم اللہ اللہ أکبر" کے ساتھ تو اب وہ حلال ہوگا۔''

قبضے کی چار صورتیں:

عبارتِ مسطور میں طریقِ قبضہ کی وضاحت از حد ضروری ہے کہ وہ چیز جو مسلمان کے قبضے میں ہے:

1. بیع و شرا کے ساتھ آئے۔
2. یا ہبہ و ہدیہ کے ساتھ۔
3. یا مسلمان اس پر غصب و نہب سے قابض ہو یا غنیمت و فے سے۔
4. یا میراث و ترکہ کے سبب موحد اس پر قابض و متصرف ہو جائے۔

میرے خیال میں صورتِ اول و ثانی میں وہ چیز حلال نہیں ہوگی اور نہ یہ اخذ و اِعطا درست ہوگا۔

حرمت کی پہلی وجہ:

اولاً: اس لیے کہ بائع یا ہبہ کرنے والا اگر ان لوگوں میں سے ہے، جو اس قسم کی حرام نذر و نیاز کو بحیثیتِ مجاورینِ قبور یا خدامِ اَصنام کے مشرکین سے قبول کر کے پھر آگے بیچ دیتے ہیں یا ہبہ کر دیتے ہیں تو ظاہر

ہے کہ نہ تو ان کی بیع درست اور نہ ان کا ہبہ، اس لیے کہ ان مجاورینِ قبور اور خدّامِ اَصنام کا قبضہ ان جانوروں پر جائز طریق پر نہیں ہوتا، ان کو آگے بیچنے یا ہبہ کرنے کا حق نہ ہوگا، جیسے چوری، ڈاکا زنی، لوٹ کھسوٹ اور سلب و نہب سے کسی چیز پر قبضہ کر کے آگے بیچنا یا ہبہ کرنا صحیح نہیں ہے، کیونکہ چور کا قبضہ ہی نہیں تو اس کے بعد کے تصرفات کیسے صحیح ہوں گے؟ اسی طرح نذر لغیر اللہ کے ذریعے جو چیز کسی مجاور یا خادمِ صنم کے ہاتھ آئے گی، اس پر اس کا قبضہ ناجائز اور خلافِ شرع ہوگا، تو جب یہ قبضہ ناجائز ہے تو قبضہ کے تصرفات یعنی بیع اور ہبہ کیسے جائز ہوگا؟

حرمت کی دوسری وجہ:

ثانیاً: جس طرح مجاورینِ قبور یا خدامِ اَصنام کا ان نذور لغیر اللہ پر قبضہ اور پھر اس کے بعد بیع یا ہبہ ناجائز ہے، اسی طرح کسی دوسرے شخص کے لیے ان مجاورین وغیرہ سے خریدنا بھی ناجائز ہے، اس لیے کہ اس میں علانیہ ان کی مشرکانہ رسوم کی حوصلہ افزائی ہے اور ان کی تجارت کے فروغ کا سامان مہیا کرنا ہے۔ اس کا معنی تو یہ ہے کہ موحدین ہی مشرکین کی گرم بازاری کا سبب بن جائیں اور ان کی تجارت مٹانے کے بجائے ان کے ممد و معاون بن جائیں اور اثم و عدوان کے لیے تعاون کریں، حالانکہ قرآن کریم فرماتا ہے:

﴿وَ تَعَاوَنُوْا عَلَی الْبِرِّ وَ التَّقْوٰی وَ لَا تَعَاوَنُوْا عَلَی الْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ﴾ [المائدۃ: ۲]

[اور نیکی اور تقویٰ پر ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ اور زیادتی پر ایک دوسرے کی مدد نہ کرو]

نیز فرمایا:

﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾

[آل عمران: ۱۱۰]

[تم سب سے بہتر امت چلے آئے ہو، جو لوگوں کے لیے نکالی گئی، تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے منع کرتے ہو]

حرمت کی تیسری وجہ:

آیت: ﴿اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَ الدَّمَ وَ لَحْمَ الْخِنْزِيْرِ﴾ [البقرۃ: ۱۷۳] میں مسلمانوں کو دو قسم کے محرمات سے روکا گیا ہے۔ ایک وہ جس میں حرمت اصلی و ذاتی ہے، جیسے: مردار اور خون وغیرہ۔ دوم وہ جس میں حرمت عارضی ہے، جیسے: نذر لغیر اللہ۔ قسمِ اول کے استعمال کی اجازت بجز اضطرار شرعاً غیر ممکن ہے۔ قسمِ دوم میں جب تک وہ عارض، جو حرمت کی علت ہے، زائل نہ ہو جائے، وہ چیز حلال کیسے ہو سکتی ہے؟ غرض آیت: ﴿مَآ اُهِلَّ﴾ میں ثبوت محمول بشرط وصف الموضوع ضروری ہے۔ کما هو شأن الشروط العامة.

جب تک موضوع سے وصف عنوانی منفک نہ ہو جائے، حرمتِ عارضہ بالحمول موضوع کے لیے وجوباً اور ضرورتاً ثابت ہوگی، وگرنہ نہیں۔ پس ہر ایسی تبدیلی جو علتِ حرمت کو زائل کر دے، حلت کی طرف منتج ہوگی اور جو تبدیلی علتِ حرمت پر موثر نہ ہو، مفیدِ حلت نہیں ہو سکتی۔

حدیث بَریرہ رضی اللہ عنہا:

بریرہ رضی اللہ عنہا کی حدیث سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ صدقہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر حرام تھا اور بریرہ رضی اللہ عنہا پر حلال۔ جب گوشت عقدِ صحیح کے ساتھ بریرہ رضی اللہ عنہا کی مِلک میں آ گیا تو بریرہ کے ارادۂ ہبہ نے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم، فداہ ابی وامی، کے لیے علتِ حرمت (صدقہ) کو بالکل ناپید کر دیا، اسی لیے فرمایا: «لَهَا صَدَقَةٌ وَلَنَا هَدْيَةٌ» [1] گویا علتِ حرمت زائل ہونے کے بعد نصِ حرمت اسے شامل ہی نہیں ہوگی، اس کی مثال بالکل استحالۂ نجاست کی سی ہے۔

استحالۂ نجاسات اور اقوالِ فقہا:

استحالۂ نجاسات میں فقہا رحمہم اللہ نے اختلاف فرمایا ہے، مثلاً: خنزیر، مُردار جب نمک میں گر کر نمک ہو جائیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وہ پاک نہیں ہو سکتے۔ امام مالک رحمہ اللہ کا ایک قول بھی یہی ہے اور جمہور حنابلہ کا رجحان بھی اسی طرف ہے۔ حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وہ پاک ہو جاتے ہیں۔ اہل الظاہر کا بھی یہی مذہب ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ کا بھی ایک قول اسی طرف ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ سے بھی ایک روایت اس کے موافق آئی ہے۔ اس تمام توضیح کے بعد شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ مذہبِ ثانی کے متعلق فرماتے ہیں:

"وهذا هو الصواب المقطوع به، فإن هذه الأعيان لم تتناولها نصوص التحريم لا لفظاً ولا معناً، فليست محرمة ولا في معنى المحرم، فلا وجه لتحريمها، بل تتناولها نصوص الحل، فإنها من الطيبات، وهي أيضاً في معنى ما اتفق علىٰ حله، فالنص والقياس يقتضي تحليلها" (فتاویٰ ابن تیمیة: ۲۱/ ۷۰)

یعنی ان اشیا کا بوجہ تبدیل و استحالہ پاک ہونا قطعاً و یقیناً صحیح ہے، کیونکہ ان پر نصِ حرمت: ﴿إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ﴾ شامل ہی نہیں، بلکہ نصِ تحلیل: ﴿أُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبَاتُ﴾ میں یہ چیز شامل ہو جائے گی۔

ٹھیک اسی طرح جب نذر لغیر اللہ میں کوئی ایسی تبدیلی واقع نہ ہو جو نذر ماننے والے کے ارادے کو بدل دے، وہ چیز نصِ تحریم میں داخل ہو کر حرام ہی رہے گی۔

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (۱۴۲۲)

جواز کی پہلی صورت:

لیکن نذر ماننے والا اگر خود اس ناجائز نذر کو قبر یا بت کی بھینٹ چڑھانے سے پیشتر کسی کے پاس بیچ دے یا ہبہ کر دے تو وہ شے حلال ہو جائے گی، کیونکہ اس صورت میں نذر ماننے والے نے اپنے ارادۂ نذر کو فسخ کر دیا ہے اور دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہیے کہ اس نے نذر لغیر اللہ کی نیت تبدیل کر کے اس کی جگہ بیع یا ہبہ کی نیت کر لی ہے۔ پس تبدیلِ نیت کی وجہ سے حرمتِ عارضہ بھی زائل ہو جائے گی اور حلتِ اصلیہ عود کر آئے گی۔ والأحكام تدور مع العلل.

جواز کی دوسری صورت:

اسی طرح اگر غیر اللہ کے نام پر نذر مانے ہوئے جانوروں پر مسلمانوں کا قبضہ بصورتِ ثالث یعنی غصب یا غنیمت کے ذریعے حاصل ہو تو بلاشبہہ وہ نذر حلال ہو جائے گی۔ غالباً فتویٰ مذکور میں حضرت مفتی صاحب نے اپنے دلائل میں ایسی صورت کو پیشِ نظر رکھا ہے، چنانچہ آپ نے فتوحاتِ صحابہ رضی اللہ عنہم اور فتح سومنات اور «الإسلام يعلو و لا يعلى عليه»[1] اور «الإسلام يهدم ما كان قبله»[2] کا ذکر فرمایا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قبضہ بصورتِ غلبہ و علو اہلِ اسلام ہونا چاہیے، نہ یہ کہ مسلمان مغلوبانہ یا مساویانہ حیثیت سے قابض ہوں، جیسے ہبہ کہ اس میں ایک طرح کا احسان ہوتا ہے اور اس میں مسلم موحد غالب اور اعلیٰ کی حیثیت نہیں رکھتا، بلکہ ادنیٰ کی حیثیت رکھتا ہے، اور بیع کہ اس میں بحیثیتِ بائع و مشتری دونوں مساویانہ حیثیت رکھتے ہیں۔ پس یہ دونوں صورتیں جواز کی ہیں اور فتویٰ حلت جو حضرت الشیخ المحترم کی طرف سے توحید میں شائع ہو چکا ہے، غالباً انھی پر مشتمل ہے اور جو دلائل آپ نے دیے ہیں، وہ اسی کی طرف راہنمائی کرتے ہیں۔

جواز کی تیسری صورت:

البتہ اگر نذر لغیر اللہ پر قبضہ بصورتِ میراث ہو اور ورثا موحد ہوں تو اجتہاد کے لیے گنجایش ہے۔ میرے خیال میں راجح یہ ہے کہ اس مال کی حیثیت اموال مغصوبہ و مسروقہ و مستحصلہ بالرشوۃ کی ہے، جس وقت غاصب، چور اور راشی توبہ کر لے۔ اگر وہ اس کے مالکوں کو جانتا ہو تو حق حقدار کو پہنچانا چاہیے اور اگر مالک غیر معلوم ہو تو ایسے اموال کو قومی ضروریات اور عمومی انتفاع کی جگہوں میں خرچ کر دینا چاہیے یا غربا اور مساکین میں تقسیم کر دینا چاہیے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اسے فتاویٰ (۲۸/ ۵٦۵، ۵٦٦) میں کسی قدر تفصیل سے فرمایا ہے اور حقِ ورثا کے

---

(1) سنن الدارقطني (٣/ ٢٥٢)

(2) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٢١)

لیے حدیث «ردها عليك الميراث»[1] سے بھی استدلال کیا جا سکتا ہے، گو بلحاظ تقویٰ صورتِ اول راجح ہے۔

حضرت الشیخ نے مضمون کے اخیر میں فرمایا ہے کہ آیت: ﴿مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَیْرِ اللّٰهِ﴾ کے معنی گذشتہ دلائل سے یہی معلوم ہوتے ہیں، جو غیر اللہ کی شرکیہ نیت پر ذبح کیا جائے وہی حرام ہے اور اگر وہ بے جان اور غیر زندہ چیز ہے تو جو اس مشرکانہ نیتِ تقرب الی غیر اللہ پر تقسیم کیا جائے وہی حرام ہے۔

اس عبارت سے بھی مولانا نے دو امور کی طرف توجہ دلائی ہے:

① ایک وہی جس کا پہلے ذکر آ چکا ہے کہ جب تک نیت غیر اللہ قائم رہے گی، حرمت دور نہ ہوگی۔

② یہ کہ ﴿اُهِلَّ﴾ کو صرف مذبوح چیزوں پر محصور کرنا صحیح نہیں، بلکہ ﴿اُهِلَّ لِغَیْرِ اللّٰهِ﴾ قابلِ ذبح اور غیر قابلِ ذبح سب کو شامل ہے۔

نذر لغیر اللہ کا غصب وغیرہ:

نذر لغیر اللہ کے غصب وغیرہ کے متعلق میں نہیں کہہ سکتا کہ علما کی کیا رائے ہو؟ لیکن جہاں تک فہم فاتر میں آتا ہے، اُس کی دو صورتیں ہیں: ایک تو یہ کہ اسی نذر پر غصب یا سرقہ اتفاقاً پڑ جائے، اس صورت میں وہ چیز حلال ہو جائے گی۔ لرفع العلة. البتہ ثواب نہیں ہوگا اور اگر ان افعال کا ارتکاب اس لیے کیا جائے کہ یہ چیز حلال حرام ہونے سے بچ جائے اور ناذر کو بھی گناہ کا موقع نہ ملے تو اس صورت میں علاوہ حلت کے ثواب عظیم بھی ہوگا، جیسے: حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے واقعات سے ظاہر ہوتا ہے: ﴿ لَاَکِیْدَنَّ اَصْنَامَکُمْ بَعْدَ اَنْ تُوَلُّوْا مُدْبِرِیْنَ﴾ [الأنبياء: ٥٧]

نیز فرمایا: ﴿فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا اِلَّا کَبِیْرًا لَّهُمْ﴾ [الأنبياء: ٥٨]

نیز حدیثِ ابو مرثد[2] سے بھی اس اصول پر صحیح روشنی پڑتی ہے، لیکن ایسے امور کے لیے نصبِ امام اور لزومِ جماعت ضروری ہے اور یہی ایک نکتہ مسلمانوں کی موجودہ بیماریوں کا واحد علاج ہے۔[3]

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١١٤٩)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٠٥١)

[3] ہفت روزہ ''توحید'' امرتسر (یکم مئی ۱۹۲۹ء) و ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۱۷ جنوری ۱۹۸۶ء)

ڈاڑھی کتنی بڑی ہو؟

داڑھی کے خلاف آج کل ایک عالم گیر نفرت ہے۔ مشرکینِ فرنگ، مشرکینِ مجوس و ہنود اور مشرکینِ یہود، مشرکینِ اسلام کے ساتھ اس نفرت میں پوری طرح متفق ہیں۔ والمتفرنجون لهم بعد ذلك ظهير. اور اہلِ علم اس میں متساہل اور خاموش، روشن خیالی کی آرزو میں روشن ضمیری سے دستکش ہونے کے لیے عملاً تیار!

ملک کے اہم مسائل کی آڑ میں تعلیم یافتہ طبقہ مصر ہے کہ سنتِ نبوی کی جگہ انھیں سنتِ یورپ پر عمل کے لیے کھلا چھوڑ دیا جائے۔ وقت کے اہم مسائل کو حل کرنے کا یہ عجیب حیلہ ہے اور ایک حیرت انگیز انکشاف۔ گویا وقت کے اہم اور موسم کے مشکل مسائل کا حل صرف چہرے کے چند بالوں کے اڑا دینے پر موقوف ہے۔ ہم ایسے قدامت پسندوں کے لیے اس منطقی ربط کا سمجھنا قطعی ناممکن ہے، جو ان مسائل اور بالوں میں پایا جاتا ہے، اس لیے ترقی پسند حضرات کی ہر سرزنش بجا اور برمحل!

اصلاح اور اثر:

اسلام نے ایک جامع دعوت دنیا کے سامنے پیش فرمائی ہے، جس میں اعتقاد، عمل اور جو آثار ان پر مترتب ہوتے ہیں، سب کو یکساں ملحوظ رکھا ہے اور ہر ایک کو دعوت میں مناسب جگہ دی ہے۔ اسلام کی نظر میں وضع کی درستگی اصلاحِ قلب کا لازمی سا اثر ہے۔

«إن في الجسد مضغة إذا صلحت صلح الجسد كله، وإذا فسدت فسد الجسد كله، ألا وهي القلب»[1]

یہ تو ہوسکتا ہے کہ وضع درست ہو اور دل درست نہ ہو، لیکن یہ مشکل ہے کہ دل درست ہو اور وضع پر اس کا کچھ اثر نہ پڑے، اسی لیے ان آثار کی تبدیلی پر کوئی سزا نہیں دی گئی۔ اعتقاد و عمل کے بعد کھلا چھوڑ دیا گیا ہے، تاکہ اس کا اثر خود بخود ظاہر ہو۔

اصلاحِ وضع میں داڑھی کے بالوں کو شرعاً خاص اہمیت حاصل ہے۔ آنحضرت ﷺ نے اسے فطری

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٥٩٩)

عادت قرار دیا ہے۔ بعض احادیث میں خصائلِ فطرت پانچ آئی ہیں۔[1] (بخاری) بعض میں ان کی کل تعداد دس بتائی گئی ہے۔[2] (مسلم، أبو داود) صحیح یہ ہے کہ اس سے بھی زیادہ ہیں۔ دائیں اور بائیں ہاتھ کے کاموں کا امتیاز اسی قسم کا تہذیبی مسئلہ ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس دور تک انبیا اور صلحا ان عادات کے پابند رہے اور ان عادات کی پابندی کو امتِ اسلامیہ کا شعار قرار دیا گیا۔

شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں:

"أقول: هذه الطهارات منقولا عن إبراهيم عليه السلام متداولة في طوائف الأمم الحنيفية لله أشربت في قلوبهم، و دخلت في صميم اعتقادهم، عليها محياهم، وعليها مماتهم عصرا بعد عصر، ولذلك سميت بالفطرة، وهذه شعار الملة الحنيفية، ولا بد لكل ملة من شعائر يعرفون بها..." (حجة الله البالغة: ١/ ١٨٢، ٢/ ١٩١، مصری)

''یہ پاکیزہ عادتیں حضرت ابراہیم علیہ السلام سے منقول ہیں۔ تمام موحد قومیں ان کی پابند ہیں، ان لوگوں نے دل سے اسے پسند کیا اور ان کے معتقدات کی یہ عادتیں جزو بن گئیں۔ ہر ملت کے لیے ایسے نشانات کی ضرورت ہے، جن سے وہ پہچانے جائیں اور ضروری ہے ان کی وضع اس کی نظیر ہے۔''

غرض اگر ملت کا دینی مزاج درست ہوگا تو یہ نشانات یقیناً اسے پسند ہوں گے۔ اگر دینی مزاج بگڑ جائے تو ان مقدس عادتوں سے خود بخود انحراف شروع ہو جاتا ہے۔ مزاجِ ملت کے لیے ایسے شعارات نبض کا حکم رکھتے ہیں۔ اللهم وفقنا لما تحب وترضیٰ.

مسئلے کی اہمیت:

ان شعائر کے ترک سے خروج عن الملۃ یا ارتداد تو لازم نہیں آتا، لیکن انبیا اور دانش ورانِ فطرت کی راہ سے انحراف ضرور ہو جاتا ہے۔ ان دس خصلتوں میں تجمل اور نظافت کا بہت حد تک خیال رکھا گیا ہے، اسی سے نظافت پسند غیر مسلموں نے بھی نظافت کے نقطہ نگاہ سے ان عادات کی پابندی کی۔ کلمة الحكمة ضالة الحكيم.[3]

مشرکینِ ہنود اور فرنگی تہذیب کی آمیزش نے عوام میں داڑھی بڑھانے کے متعلق عجیب قسم کے خیالات پیدا کر دیے ہیں۔ ایک مختصر سی جماعت کے سوا، جو اس کو دینی شعار سمجھتی ہے، عوام کی غلط روی اس معاملے میں واضح

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٥٥٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٧)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦١) سنن أبي داود، رقم الحديث (٥٣)

[3] مشكاة المصابيح (١/ ٤٧) میں ان الفاظ سے ایک حدیث سنن ترمذی سے منقول ہے، لیکن سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٨٧) کے الفاظ « ضالة المؤمن » ہیں اور اس کی سند بھی ضعیف ہے۔

ہے۔ کسی نائی کی دکان پر چند منٹ ٹھہر کر دیکھیے کہ وہاں کاٹ چھانٹ کے کتنے نمونے بنتے ہیں اور کتنے خوش منظر چہرے حجام کی بارگاہ میں پیش ہوتے ہیں اور چھل چھلا کر فرسودگی سے واپس ہوتے ہیں۔ إن في ذلك لعبرة!

گناہ کے عموم سے بے حسی اس قدر بڑھ گئی ہے کہ عوام تو خیر عوام ہیں، علما بھی ان مسائل پر گفتگو کرنے سے ہچکچاتے ہیں۔ احادیثِ اِعفا کی تاویل اس طرح کی جاتی ہے کہ مداہنت کا واہمہ بھی نہ ہو، روشن خیالی بھی قائم رہے اور موجودہ فیشن پرستی کے لیے سندِ جواز بھی حاصل ہو جائے!!

اصحابِ عزیمت:

ایسے حالات میں اصحابِ عزیمت کی رفتار تیز ہو جانی چاہیے۔ سننِ نبویہ پر بوقتِ فساد عمل کرنے سے سو شہید کا ثواب فرمایا ہے۔[1] سنت کی ترویج اور اس اجرِ عظیم کے لیے اس سے بہتر وقت کون سا ہوگا؟ روشن خیالی وہی درست ہوگی، جس کے ساتھ روشن ضمیری ہاتھ سے نہ جائے۔ ضرورت ہے امر بالمعروف کے تمام ذرائع اس وقت جمع کر دیے جائیں، تاکہ عوام کم از کم اتنا تو محسوس کریں کہ وہ غلطی کر رہے ہیں اور ان کے دلوں میں اعمالِ صالحہ اور سننِ صحیحہ کے لیے جستجو اور خلش باقی رہے۔ وہ گناہ کو گناہ سمجھ کر کریں اور غلطی کو غلطی سمجھیں۔ اس مسئلے پر لکھتے وقت میں خود بھی سوچتا ہوں کہ اسے پڑھ کر عوام کے تاثرات کیا ہوں گے؟ جبکہ علما کا شیوہ بھی تساہل کی انتہا کو پہنچ چکا ہے۔ یورپ زدہ ذہن تو شاید یہ سننا بھی گوارہ نہ کریں کہ داڑھی شعائرِ اسلام سے ہے۔ تاہم میں بے امید نہیں۔ چند آدمی بھی اس جمودِ عام میں اس سنت کے صحیح مقام کو سمجھ جائیں تو اس ظلمستان میں غنیمت ہوگا۔

اس معاملے میں احادیثِ صحیحہ کا منشا:

1. عن ابن عمر عن النبي ﷺ قال: «خالفوا المشركين! وفروا اللحىٰ، وأحفوا الشوارب»[2] (صحيح بخاري مع الفتح: ١/ ٢٧٣)

2. أيضاً عنه: قال رسول الله ﷺ: «انهكوا الشوارب، و أعفوا اللحىٰ»[3] (حواله مذكوره)

3. عنه أيضا: أنه أمر بإحفاء الشوارب وإعفاء اللحية.[4] (صحيح مسلم، أبو داود: ١/ ١٢٩)

---

[1] الكامل لابن عدي (٢/ ٩٠) اس کی سند میں حسن بن قتیبہ اور اس کا استاد عبدالخالق بن منذر سخت ضعیف اور مجہول ہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٣٢٦) البتہ ایک صحیح حدیث ان الفاظ «إن من ورائكم أيام الصبر، للمتمسك فيهن يومئذ بما أنتم عليه أجر خمسين منكم» کے ساتھ مروی ہے۔ دیکھیں: السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٤٩٤)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٥٥٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٩)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٥٥٤)

[4] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٩) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤١٩٩)

4 عن عائشة قالت: قال رسول الله ﷺ: «عشر من الفطرة: قص الشوارب وإعفاء اللحية...»[1]

5 عن أبي هريرة قال: قال رسول الله ﷺ: «جزوا الشوارب، وأرخوا اللحى، وخالفوا المجوس»[2] (أبو داود، مسلم: ١/ ١٢٩)

6 وفي حديث: «أحفوا الشوارب وأوفوا اللحى»[3] (مسلم: ١/ ١٢٩)

7 وفي شمائله ﷺ: أنه كان كث اللحية.[4] (شمائل ترمذي)

ان احادیث کا مفاد یہ ہے کہ لبوں کے بال منڈا دیے جائیں یا جڑ سے کٹوا دیے جائیں اور داڑھی پوری طرح بڑھائی جائے۔ احادیثِ زیرِ قلم سے داڑھی بڑھانا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ بعض احادیث میں یہ ذکر بصیغہ امر آیا ہے اور بعض میں بلفظِ امر، اور خود آنحضرت ﷺ کی ریش مبارک بہت بھاری تھی۔ وجوب و اباحت کی اصطلاحی مباحث کو نظر انداز کر کے بھی کسی حکم کا جو مفاد ہوسکتا ہے اور امر ان الفاظ سے جن نتائج کا خواہش مند ہوسکتا ہے، ان سے اِغماض نہیں کیا جا سکتا۔

جب یہ معلوم ہے کہ آنحضرت ﷺ کی اطاعت امت پر فرض ہے، آنحضرت ﷺ کے سوا کسی کی اطاعت پر امت مجبور نہیں، آنحضرت ﷺ کی صحیح صریح احادیث کی موجودگی میں کسی دوسرے شخص کے عمل کو اہمیت نہیں دی جا سکتی اور نہ تعارض یا ترجیح کسی دوسرے کا حق ہے۔ اگر تاویل کی ضرورت ہو تو امت کے اقوال و اعمال میں ہونی چاہیے، پیغمبر ﷺ کو امت کے تابع نہیں کرنا چاہیے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم ہوں یا عام افرادِ امت؛ مقامِ نبوت کی تقدیس کو نہیں پہنچ سکتے۔ اطاعت کا عہد آنحضرت ﷺ سے کیا گیا ہے، اَفرادِ امت سے نہیں۔

نصِ حدیث:

حدیث میں اس مفہوم کو پانچ الفاظ سے تعبیر فرمایا گیا ہے:

① أوفوا، ② أعفوا، ③ أرخوا، ④ أرجوا، ⑤ وفروا.

1 امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"معنىٰ كلها تركها علىٰ حالها، هذا هو الظاهر من الحديث الذي يقتضيه الألفاظ، وهو الذي قاله جماعة من أصحابنا وغيرهم من العلماء" (شرح صحيح مسلم: ١/ ١٢٩)

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦١)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٠)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٩)

[4] الشمائل للترمذي (٨)

''ان تمام الفاظ کا یہ مطلب ہے کہ داڑھی اپنی حالت پر چھوڑ دی جائے اور حدیث کا بظاہر یہی مطلب ہے اور علما کی ایک جماعت کا بھی یہی قول ہے۔''

2 قال في مجمع البحار (٣/ ٤٠٣): "فيه أمر بإعفاء اللحىٰ، وهو أن يوفر شعرها ولا يقص كالشوارب..." اس میں داڑھی بڑھانے کا حکم ہے۔ دوسرے مقام پر فرماتے ہیں:

"ومعنىٰ الكل تركها علىٰ حالها، ويكره حلقها وقصها..."

ان تمام الفاظ کا یہ مطلب ہے کہ داڑھی کو اپنی حالت پر چھوڑ دیا جائے، نہ کترایا جائے، نہ منڈایا جائے۔

3 قال النووي: "اتركوها، ولا تتعرضوا لها بتغيير" (شرح صحيح مسلم: ١/ ١٢٩)

''داڑھی کو اپنے حال پر چھوڑ دو اور اس میں کوئی تبدیلی نہ کرو۔''

"قال الطبري: ذهب قوم إلى ظاهر الحديث فكرهوا تناول كل شيئ من اللحية من طولها وعرضها"

''ایک جماعت نے حدیث کے صریح مفہوم کو پسند فرمایا اور طول و عرض سے کٹانا ناپسند کیا ہے۔''

"قال عياض: يكره حلق اللحية وقصها وتحريقها..."

''قاضی عیاض فرماتے ہیں: داڑھی منڈانا کترانا اس میں کمی کرنا ناجائز ہے، لیکن طولِ فاحش میں کمی درست ہے۔''

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ بھی ظاہر حدیث کے خلاف ہے۔

مفہوم لغوی:

اب إعفاء، إرخاء، إيفاء، إرجاء، توفير کے لغوی معنی پر غور فرمایئے، ان الفاظ میں تکثیر و تکمیل کے معنی کو ملحوظ رکھا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ مفہوم کمی اور نقص کے منافی ہے، جو حلق اور تقصیر کا لازمی مفاد ہے۔

إعفاء کا لغوی معنی:

1 صاحب الجامع الصحیح رحمہ اللہ نے لغوی شہادت کے طور پر آیت سورۃ اعراف کا ذکر فرمایا ہے: "حتى إذا عفوا: كثروا، وكثرت أموالهم" یعنی ان کے مال اولاد میں بڑی کثرت ہوئی۔

2 "قال ابن قتيبة: حتىٰ عفوا أي كثروا، ومنه الحديث، أن رسول الله ﷺ أمر أن تحفىٰ الشوارب وتعفىٰ اللحىٰ أي توفر"

''عفو کے معنی کثرت کے ہیں اور حدیث «أعفوا اللحىٰ» کا بھی یہی مطلب ہے۔''

3 ابن دقیق العید فرماتے ہیں:

”حقيقة الإعفاء الترك، وترك التعرض للحية يستلزم تكثيرها“ (فتح الباري: ١/ ١٧٣)

4 ”عفا الشيئ: كثر، وفي التنزيل: حتى عفوا أي كثروا، ويقال: عفوت الشعر عفوا وعفيته وأعفيته عفيا: تركته حتى يكثر ويطول، ومنه: أحفوا الشوارب، وأعفوا اللحى“[1] (المصباح المنير مختصراً)

5 قال الراغب: ”أعفيت كذا أي تركته يعفو ويكثر، ومنه قيل: أعفوا اللحىٰ، والعفاء: ما كثر من الوبر والريش...“[2] (مفردات القرآن)

6 نواب صدیق حسن خاں رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”مراد باعفا گزاشتن ریش برحال اوست بدون حلق و تقصیر یا تکثیر و انبوہ کردن او“ (هداية السائل، ص: ١٢)

پھر فرماتے ہیں:

”ابو حنیفہ رحمہ اللہ گفتہ اعفاء لحیہ ترک اوست تا آنکہ انبوہ و بسیار شود“ (ص: ١٢)

7 ”قال عياض: قوله: أمر بإعفاء اللحىٰ أي بتوفيرها. يقال: عفا الشيئ إذا كثر، ويقال فيه: أعفيت الشيئ وعفيته إذا أكثرته، وتفسيره في الحديث الآخر: وفروا اللحىٰ، ومنه في الحديث الآخر: إذا دخل صفر وعفا الوبر...“ (مشارق الأنوار: ٢/ ٩٨)

كذا في القاموس، والمنجد، والنهاية، وأقرب الموارد، و غير ذلك من كتب اللغة وشروح الحديث.

ان تمام حوالوں کا منشا یہ ہے کہ عفو کے معنی لغت میں تکثیر اور انبوہ کے ہیں اور داڑھی کے معاملے میں آنحضرت ﷺ کا یہی مقصود ہے، کیونکہ اسلامی وضع میں یہ ایک اہم اسلامی شعار ہے۔

داڑھی بڑھانا آنحضرت ﷺ کا حکم ہے، اس کی کوئی حد مقرر نہیں فرمائی اور اس کی ضرورت بھی نہ تھی۔ یہ تو فطرت کا طبعی فعل ہے، اس کے لیے قانونی حد مقرر نہیں کی جا سکتی۔ کہیں چند بالوں تک یہ قصہ ختم ہو جاتا ہے اور کہیں پوری چھاتی اس کی لپیٹ میں آ جاتی ہے، البتہ کترانا چونکہ انسانی فعل ہے، اس کی تحدید ضروری ہے اور دلیل بذمہ مدعی۔

---

[1] المصباح المنير (٢/ ٤١٩)

[2] مفردات القرآن (٢/ ١٠٥)

اِرخاء کا لغوی معنیٰ:

اِرخاء، رخاء، استرخاء، رخوہ؛ قریب المعنی الفاظ ہیں، جن میں نرمی اور وسعت ملحوظ ہے۔ "فرس رخاء أي وسيع الجري". "أرخوا اللحية" کا معنی یہ ہوگا کہ اسے اپنی طبعی رفتار سے لٹکنے اور بڑھنے کا موقع دیا جائے۔

اِیفاء کا لغوی معنیٰ:

وفا، ایفا، توفی؛ یہ الفاظ تکمیل و اِتمام کی تعبیر کے لیے مستعمل ہوئے ہیں:

"قال الراغب: الوافي الذي بلغ التمام. يقال: درهم واف، وكيل واف، وأوفيت الكيل والوزن، الموفون بعهدهم"[1] وغیرہ امثلہ میں اِتمام و تکمیل کا مفہوم ظاہر ہے، گویا ریش کا شرعاً کامل رکھنا ضروری ہے۔ كذا في دواوين اللغة.

اِرجاء کا لغوی معنیٰ:

اِرجاء، اس کے معنی تاخیر اور مہلت کے ہیں۔ ﴿وَ اٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ﴾ "أرجوا اللحیٰ" اسی محاورے سے ماخوذ ہے، یعنی بالوں کو چھوڑ دو، اس تاخیر کے لیے بڑھنا ضروری ہے اور یہی شارع علیہ السلام کا مقصود ہے۔

توفیر کا لغوی معنیٰ:

"وفر، وفور، توفير. الوفر: المال التام. يقال: وفرت كذا: تممته وكملته، وقال تعالیٰ: ﴿فَاِنَّ جَهَنَّمَ جَزَآؤُكُمْ جَزَآءً مَّوْفُوْرًا﴾ ووفرت عرضه: إذا لم تنقصه"[2] (مفردات القرآن)

"وفروا اللحیٰ" صحیح بخاری کے الفاظ ہیں، جس کا مطلب ہوگا کہ داڑھی کو مکمل کرو۔ اِتمام و تکثیر اس کے معنی میں ضروری ہیں۔ مصباح، مختار الصحاح و دیگر کتبِ لغت ان معانی پر متفق ہیں۔ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم زبان جانتے تھے تو پھر ان الفاظ میں تاویل کی گنجایش نہیں۔ ان مرفوع احادیث کا مطلب تو یہی ہے کہ داڑھی کو اپنی طبعی حد تک پہنچنا چاہیے، نہ اس میں منڈانے کی گنجایش ہے اور نہ قصرِ فاحش کی، بلکہ یہ سبزہ اپنی طبعی رفتار سے بڑھنا چاہیے اور اسے چہرے کی زینت رہنا چاہیے۔

جہاں تک صحیح احادیث کا تعلق ہے، کوئی حدیث منڈانے یا کترانے کے جواز میں میری نظر سے نہیں گزری۔ جامع ترمذی میں ایک حدیث بواسطہ "عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده" بایں الفاظ مروی ہے:

---

[1] مفردات القرآن (۲/ ۵۲۵)

[2] مصدر سابق (۲/ ۵۲٤)

"إن النبي ﷺ كان يأخذ من لحيته من عرضها و طولها"[1] (ترمذی مع تحفة: ٤/ ١١)

''آنحضرت ﷺ داڑھی کے طول و عرض سے کچھ بال لے لیا کرتے تھے۔''

یہ حدیث بشرطِ صحت پراگندہ بالوں کے کترانے کی دلیل ہو سکتی ہے، لیکن حدیث میں کئی وجوہ سے کلام ہے:

① حدیث عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ ایسی نہیں جس سے بصورتِ انفراد کوئی حکم ثابت ہو سکے۔[2]

② اگر اس میں نکارت نہ بھی پائی جائے تو بھی صحیحین کی احادیث اس کے خلاف ہیں۔

③ اس کی سند میں عمر بن ہارون راوی ہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ان کی یہ روایت بالکل بے اصل اور منکر ہے۔

④ عمر بن ہارون منفرد ہیں اور ان کا کوئی متابع نہیں۔

⑤ عمر بن ہارون تفرد کے علاوہ ضعیف ہیں۔ عبد الرحمٰن بن مہدی، امام احمد اور نسائی فرماتے ہیں: یہ متروک الحدیث ہیں۔ یحییٰ بن معین فرماتے ہیں: کذاب اور خبیث ہے۔ ابو داود فرماتے ہیں: ثقہ نہیں۔ ابن مدینی اور دارقطنی فرماتے ہیں: سخت ضعیف ہے۔[3] (میزان الاعتدال و تقریب)

ایسی روایات سے نہ کوئی مسئلہ ثابت ہو سکتا ہے اور نہ ترجیح ہی دی جا سکتی ہے۔

شعار المشرکین:

آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے: «خالفوا المشركين»[4] اس کی تفسیر میں مجوس اور یہود دونوں کا ذکر آیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مشرکین میں منڈانے اور کترانے کی دونوں عادتیں تھی، آنحضرت ﷺ نے ان کی مخالفت کے لیے حکم فرمایا، بلکہ تاکید فرمائی کہ ہم اپنی وضع ان سے جدا رکھیں۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٧٦٢) اس کی سند میں واقع راوی ''عمر بن ہارون'' کو امام ابن معین نے ''کذاب'' کہا ہے، اس لیے علامہ البانی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو موضوع قرار دیا ہے۔ دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٢٨٨)

[2] عمرو بن شعیب کی حدیث میں اگرچہ محدثین کا اختلاف منقول ہے، لیکن راجح قول کے مطابق انفراداً بھی ان کی حدیث حسن ہوتی ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رأيت أحمد بن حنبل و علي بن المديني وإسحاق بن راهويه وأبا عبيدة وعامة أصحابنا يحتجون بحديث عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده، ما تركه أحد من المسلمين... فمن الناس بعدهم" (تهذيب التهذيب: ٨/ ٤٤) نیز حافظ ذہبی فرماتے ہیں: "لسنا نقول: إن حديثه من أعلىٰ أقسام الصحيح، بل هو من قبيل الحسن" (ميزان الاعتدال: ٣/ ٢٦٨)

[3] ميزان الاعتدال (٣/ ٢٢٨) تقريب التهذيب (٤٩٧٩)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٥٥٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٩)

"وقد حدث قوم يحلقون لحاهم، وهو أشد مما نقل عن المجوس أنهم كانوا يقصونها" (فتح الباري: ١٠/ ٢٧٢)

"ایک قوم نے داڑھی منڈانا شروع کیا اور یہ مجوس سے زیادہ برے ہیں، کیونکہ وہ (مجوس) کتراتے تھے۔"

ان حوالوں سے ظاہر ہے کہ مشرکین عموماً کترانے کے عادی تھے۔ منڈانے کا زیادہ رواج حافظ ابو شامہ کے زمانے میں ہوا۔ مجوس میں منڈانے کی عادت کم تھی، گویا حدیث: « خالفوا المشركين » میں کترانے کو برا سمجھا گیا، اس کے باوجود یہ دونوں فعل ناجائز ہیں اور ممنوع۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مشرکین میں قصرِ فاحش کا رواج تھا، اسی سے بعض سلف نے قبضہ کو قصر کی آخری حد سمجھا، اس سے کم کرنا مشرکین کی مشابہت ہے، جس سے حدیث میں بصراحت روکا گیا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مشرکین کی وضع اور زی کے سخت مخالف تھے، جیسے ان کے مکاتیب سے واضح ہے۔[1] کیونکہ جب اسلام زندگی کے تمام شعبوں میں راہنمائی فرماتا ہے تو پھر وضع کا شعبہ اس راہنمائی سے کیوں محروم ہو؟ علامہ طیبی فرماتے ہیں:

"قصر اللحية من صنع الأعاجم، وهو اليوم شعار كثير من المشركين كالإفرنج والهنود، ومن لا خلاق له في الدين من الفرق الموسومة بالقلندرية"

(مجمع البحار: ٤٠٣)

"داڑھی کٹانا اکثر فرنگیوں اور ہنود مشرکوں کی عادت ہے اور ایک بے دین فرقہ قلندریہ کا بھی یہی شیوہ ہے۔"

جب مشرکین میں قصر کا رواج زیادہ تھا تو منڈانے کے ساتھ کترانا بطریقِ اولیٰ ممنوع ہوگا۔ مجوزینِ قصر کے نزدیک اس چیز کا خیال رکھنا ضروری ہوگا کہ قبضہ سے کم نہ ہو، کیونکہ یہی قصرِ فاحش ہے، جو مشرکین کرتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی مشابہت سے روکا۔

اگر قصر کا معیار ہر شخص کی صوابدید کو قرار دیا گیا تو حدیث: « خالفوا المجوس » بالکل بے مقصد رہ جائے گی۔ آخر وہ کون سا قصر ہے، جس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے اور حدیثِ نہی کا انطباق قصر کے کون سے افراد پر ہوگا؟ حضراتِ قاصرین سنجیدگی سے تحدیدِ قصر پر غور فرمائیں۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم:

سنتِ صحیحہ کے بعد جہاں تک عمل و اعتقاد کا تعلق ہے، کسی دوسرے شخص کی طرف توجہ کی ضرورت باقی نہیں رہتی، تاہم صحابہ رضی اللہ عنہم کے مقام کی رفعت معلوم ہے، ان کے اعمال و ارشادات تسکینِ قلب میں اضافے کا موجب ہیں، اس لیے مذاہبِ صحابہ رضی اللہ عنہم کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

---

[1] مصنف عبد الرزاق (١١/ ٨٤)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ:

"عن جابر رضی اللہ عنہ: كنا نعفي السِّبالَ إلا في حج أو عمرة"[1] (أبو داود مع بذل المجهود: ٥/ ٧٩)

"حج یا عمرے کے سوا ہم داڑھی کے بال بڑھایا کرتے تھے۔"

سِبال "سَبَلہ" کی جمع ہے۔ شوارب کے آخری بالوں کو بھی کہا جاتا ہے اور سامنے کے بالوں کو بھی، جو سینے پر پھیلاتے ہیں۔[2] یہاں دوسرا معنی مراد ہے۔ الفاظِ حدیث سے جمہور صحابہ کے دائمی عمل کا پتا چلتا ہے کہ ان میں کٹانے کا رواج نہ تھا، بلکہ سب بڑھایا کرتے تھے۔ قرینِ قیاس بھی یہی ہے، کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مرفوعاً بشرطِ صحت کترانا ثابت نہیں۔

حضرات عمر و عثمان رضی اللہ عنہما

نواب صدیق حسن فرماتے ہیں:

"لیکن عمر و عثمان و علی رضی اللہ عنہم را ریش دراز زاید برقبضہ بود و ایں ناظر در ارسال ست و لہٰذا فقہا ارسال را مباح درشتہ اند۔ و درلحیۂ مبارک نبویہ آمدہ "كث اللحية يملأ صدره" یعنی انبوہ ریش کہ پر میکرد سینہ را" الخ (ہدایۃ السائل، ص: ١٢)

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٢٠١) بعض اہلِ علم نے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے، کیوں کہ اس کی سند میں ابو زبیر مدلس ہے اور "عن" سے بیان کرتا ہے اور کثیر التدلیس راوی میں یہ احتمال ہوتا ہے کہ اس نے بیان کردہ روایت کو اپنے شیخ سے نہ سنا ہو، لیکن اس اثر کی سند میں تدلیس کارگر نہیں ہے، کیوں کہ "المحدث الفاصل" (٤٩٤) میں اس بات کی صراحت موجود ہے کہ یہ روایت متصل ہے اور ابو زبیر نے یہ حدیث جابر رضی اللہ عنہ سے سنی ہے۔ امام رامہرمزی اس حدیث کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "وقرأ أبو الزبير علىٰ جابر" لہٰذا یہ سند متصل ہے اور اس میں تدلیس و انقطاع کا احتمال بھی نہیں ہے۔ حافظ ابن حجر نے بھی ابو داود والی سند کو حسن کہا ہے۔ دیکھیں: فتح الباري (١٠/ ٣٥٠)

علاوہ ازیں یہ حدیث مصنف ابن أبي شيبة (٨/ ٥٦٣) میں قتادہ بھی جابر رضی اللہ عنہ سے بیان کرتے ہیں۔ اس کی سند میں ابو ہلال راوی ہے، جو "صدوق فيه لين" ہے اور یہ متابعات و شواہد کے قابل ہے، اس لیے اس سند سے بھی مذکورہ بالا ابو زبیر والی روایت کو تقویت ملتی ہے۔ قتادہ کی روایت جابر رضی اللہ عنہ کے صحیفے سے ہوتی ہے، اس لیے وہ بھی معتبر ہے۔ دیکھیں: تهذيب الكمال (٢٣/ ٤٩٨) یہاں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ اس روایت میں اس عمل کو عموماً صحابہ کرام کا عمل بتاتے ہیں، کسی فردِ واحد کا نہیں۔ بعض اہلِ علم تو کسی صحابی سے ایسے صیغے "كنا نفعل كذا" کے ساتھ مروی روایت کو حکماً مرفوع کہتے ہیں۔ اگرچہ یہ ائمہ اصول کے درمیان ایک اختلافی مسئلہ ہے۔ نیز عطا بن رباح تابعی سے صحیح سند سے مروی ہے: "كانوا يحبون أن يعفوا اللحية إلا في حج أو عمرة" (مصنف ابن أبي شيبة: ٨/ ٥٦٢) لیکن ان تمام آثار کو دیکھتے ہوئے یہ امر بھی ملحوظِ خاطر رہے کہ وہ ایسا صرف حج یا عمرے میں کیا کرتے تھے، عام اوقات اور حالات میں نہیں۔

[2] مجمع البحار (جلد: ٢) [مولف]

''حضرت عمر، عثمان، علی کی داڑھیاں قبضہ سے زیادہ تھیں۔ یہ ارسال کی دلیل ہے، اس سے فقہا نے ارسال کی اجازت فرمائی ہے۔ آنحضرت ﷺ کے لحیہ کے بارے میں مرقوم ہے کہ حضرت ﷺ کی داڑھی سینے پر چھائی ہوئی تھی۔''

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ وہ حج اور عمرے سے جب فارغ ہو کر احرام کھولتے تو داڑھی کے زائد بال کٹوا دیتے:

"وكان ابن عمر إذا حج أو اعتمر قبض علىٰ لحيته، فما فضلَ أَخذَه"

(الجامع الصحيح: ١/ ٢٧٢، أيضاً: زرقاني مع الموطأ)

صحابہ عموماً اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما خصوصاً اتباعِ سنت میں مشہور ہیں، لیکن ان کا یہ فعل سنتِ صحیحہ کے خلاف ہے:

1. اس لیے کہ موقوف آثار سننِ صحیحہ سے متعارض نہیں ہو سکتے۔
2. صحابہ رضی اللہ عنہم کا اجماع یا جمہور صحابہ اگر عملاً کسی سنتِ صحیحہ کے خلاف ہوں تو حدیث کے مطلب پر غور کی ضرورت ہے، لیکن افراد کے اختلاف میں سنتِ صحیحہ پر کوئی اثر نہیں ہوسکتا۔ پیشِ نظر مسئلہ بھی اسی نوعیت کا ہے۔
3. عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما حدیث اِعفاے لحیہ کے راوی ہیں۔ ائمہ حدیث اور جمہور ائمہ اسلام کے نزدیک مرفوع صحیح حدیث ہی معمول بہا ہوگی۔ (خلافا لجمهور الحنفية)

امام شوکانی فرماتے ہیں:

"ولا يضره عمل الراوي بخلافه خلافا لجمهور الحنفية وبعض المالكية، لأنا متعبدون بما بلغ إلينا من الخبر، ولم نتعبد بما فهمه الراوي، ولم يأت من قدم عمل الراوي علىٰ روايته بحجة تصلح للاستدلال"

(إرشاد الفحول: ٥٣، و كتاب الإحكام لابن حزم)

''راوی کا عمل حدیث کے خلاف حدیث کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا (خلافا للحنفية) ہم اتباعِ حدیث کے پابند ہیں، فہمِ راوی کے پابند نہیں۔ جو لوگ عملِ راوی کو مقدم سمجھتے ہیں، ان کے پاس کوئی دلیل نہیں۔''

4. بعض لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ ابن عمر صرف حج یا عمرے ہی میں ایسا کرتے تھے۔

(شرح الزرقاني، ص: ٢٥٠)

جامع صحیح میں بھی یہ تخصیص موجود ہے، جہاں یہ تخصیص نہیں، ممکن ہے تصرفِ رواۃ سے ایسا ہوا ہو۔

⑤ سابقہ گزارشات ظاہر معنی کی بنا پر تھیں، اس کا یہ معنی بھی ہو سکتا ہے کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما داڑھی کے پراگندہ بالوں کو اطراف لحیہ سے پکڑ کر درست فرما دیا کرتے تھے، اس اثر میں قبضہ سے مراد پیمائشی قبضہ نہیں، جیسے قرآن میں ہے: ﴿ثُمَّ قَبَضْنٰهُ اِلَيْنَا قَبْضًا يَّسِيْرًا﴾ یہاں قبض بمعنی اخذ آیا ہے۔

"وأنكر ابن التين ظاهر ما نقل عن ابن عمر فقال: ليس المراد أنه كان يقتصر على قدر القبضة من لحيته، بل كان يمسك عليها فيزيل ما شذ منها فيمسك من أسفل ذقنه بأصابعه الأربعة" (فتح الباري: ١/ ٣٧٣)

"ابن عمر رضی اللہ عنہ کا یہ منشا نہیں کہ قبضہ سے زائد داڑھی کاٹ دی جائے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ حضرت عبداللہ ذقن کے نیچے کے بال چاروں انگلیوں سے پکڑ کر کاٹ دیا کرتے تھے، یعنی پراگندہ بال طول و عرض سے لے لیا کرتے تھے۔"

یہ معنی احادیثِ صحیحہ سے متعارض نہیں ہوتا۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا جذبہ اتباعِ سنت اسی معنی کا مقتضی ہے۔ جذبہ اتباعِ سنت سے خلافِ سنت کو سنت ثابت کرنا مضحکہ خیز استدلال ہے۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے داڑھی کٹوانے سے اگر کترانا سنت ہو سکتا ہے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، فداه أبي و أمي، کا حکم اور عمل داڑھی بڑھانا سنت نہ ہوگا؟ آیا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی سنت کی محبت زیادہ تھی؟ العجب!!

تفرداتِ صحابہ رضی اللہ عنہم:

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے صراحتاً کوئی سنت ثابت ہو تو صحابہ رضی اللہ عنہم کے اختلاف سے اس پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کا شغف بالسنۃ سنتِ ثابتہ کے خلاف استعمال نہیں ہونا چاہیے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم سنت کے عاشق تھے، ان کا عمل اسی صورت میں دلیل ہو سکتا ہے، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے صراحتاً اس باب میں کچھ ثابت نہ ہو۔ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے صراحت آ جائے تو اصل سنت وہی ہوگی۔

- بعض صحابہ بیس رکعت تراویح پڑھتے تھے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ تعداد ثابت نہیں۔
- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ کی تین طلاقوں کو ایک سمجھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انھیں تین ہی نافذ فرمایا۔[1] (مسلم)
- حضرت عمر رضی اللہ عنہ متعۃ الحج کو ناپسند کرتے تھے۔[2] (مسلم)

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٧٢)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٢٤٩)

- عروہ بن زبیر لڑکا ہو یا لڑکی؛ ایک ہی بکری کافی سمجھتے تھے۔[1] (موطأ مع زرقاني: ٣/ ٩٨)
- عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بھی عقیقہ میں عروہ بن زبیر سے متفق تھے۔ (شرح الزرقاني: ٣/ ٩٨)
- ابراہیم بن حارث چڑیا کے ساتھ عقیقہ جائز جانتے تھے۔[2] (موطأ: ٣/ ٩٨)
- عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ رکوع میں تشبیک کے قائل تھے، حالانکہ سنتِ صحیحہ اس کے خلاف ہے۔[3] (ترمذي وغيره)
- بعض صحابہ مرغی اور انڈے تک کی قربانی جائز جانتے تھے۔[4] (محلی ابن حزم)
- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا عورت کی ولایت کو جائز سمجھتی تھیں۔[5] والحديث على خلافه

ایسے مسائل میں صحابہ کے عمل سے سنت ثابت نہیں ہوگی اور نہ صحابہ رضی اللہ عنہم پر طعن کیا جائے گا۔ ﴿تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾ [البقرہ: ١٣٤]

جنگِ جمل اور جنگِ صفین نے اس حقیقت کو اور بھی واضح کر دیا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ایک اثر فتح الباری میں مجملاً آیا ہے، حافظ رحمہ اللہ نے اسے طبری کے حوالے سے ذکر فرمایا ہے اور سند نہیں لکھی۔[6] عمدۃ القاری میں اس کی تھوڑی سی تفصیل فرمائی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک آدمی کو دیکھا، اس کی داڑھی بہت لمبی اور پراگندہ تھی، آپ نے اس کی داڑھی کاٹ دی۔ علامہ عینی نے یہ روایت بصیغہ تمریض ذکر فرمائی ہے۔[7] امام احمد رحمہ اللہ نے مسندِ عمر میں اس کا ذکر نہیں فرمایا۔

یوں بھی اس کا تعلق پراگندگی کے ساتھ ہے، اس میں داڑھی کے چھوٹے یا بڑے ہونے کا ذکر بالاصالہ

---

[1] موطأ الإمام مالك (١٠٧٢)

[2] موطأ الإمام مالك (١٠٧٠)

[3] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٠)

[4] محلی ابن حزم (٧/ ٣٧٠)

[5] دراصل موطأ الإمام مالك (٢/ ٥٥٥) میں ایک اثر مروی ہے کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنی بھتیجی حفصہ کی شادی کروائی، جب کہ ان کے والد عبدالرحمن ملکِ شام میں تھے۔ لیکن حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ اس میں یہ صراحت نہیں کہ سیدہ عائشہ نے بذاتِ خود ولی بن کر نکاح کروایا تھا، بلکہ حضرت عائشہ سے صحیح اثر میں مروی ہے کہ انھوں نے اپنے ایک بھتیجے کی شادی کرائی اور جب عقدِ نکاح کا وقت آیا تو ایک مرد کو حکم دیا اور اس نے نکاح کروایا۔ پھر سیدہ عائشہ نے فرمایا کہ ''عورت کو نکاح کرانے (ولایت) کا اختیار حاصل نہیں ہے۔ دیکھیں: فتح الباري (١/ ٩/ ١٨٦)

[6] فتح الباري (١٠/ ٣٥٠)

[7] عمدة القاري (٢٢/ ٤٦)

نہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مقصد یہ ہے کہ گندا نہیں رہنا چاہیے، بلکہ اس اثر سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت داڑھی کٹانے کا رواج نہیں تھا۔ لوگ سنت کے مطابق داڑھی بڑھاتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اگر اسے گندا نہ دیکھتے تو کٹانے کی ضرورت محسوس نہ کرتے، پہلے ذکر آچکا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ریش مبارک بھی قبضہ سے زیادہ تھی۔

اسی طرح حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے متعلق مذکور ہے کہ وہ قبضہ سے زیادہ کترا دیا کرتے تھے۔[1] یہ اثر بھی بے سند ہے اور محدثین نے اس قسم کے آثار پر اعتماد نہیں فرمایا، نہ ہی ان کی اسانید کے متعلق کوئی ذمہ داری لی ہے۔ اگر صحیح سند سے ان کا ثبوت مل بھی جائے تو احادیث سے تعارض کی صورت میں صحیح احادیث کو ترجیح دی جائے گی۔

ایک مرسل روایت کا ذکر صاحب اتحاف النبلاء نے بحوالہ فوائد ابن قیم ذکر فرمایا۔ ابن قیم رحمہ اللہ کی فوائد اور بدائع الفوائد چھپ چکی ہے، ان میں ایسی کوئی حدیث نہیں ملی۔ ویسے یہ روایت بواسطہ ابو صالح السمان (ذکوان) مرقوم ہے۔ ابو صالح اَوساط تابعین سے ہیں، ۱۰۱ھ میں انتقال فرمایا، اس لیے حدیث مرسل ہوگی۔ مرسل کی حجیت ائمہ حدیث اور اہلِ حدیث کے نزدیک معلوم ہے۔ جن صحیح روایات کا ذکر ہم اوپر کر آئے ہیں، آثار و مراسیل کا یہ مختصر اور مشکوک ذخیرہ ان کے مقابل معرضِ حجت میں نہیں آسکتا۔

موجودہ فیشن:

جہاں تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کا تعلق ہے، حلق اور قصرِ فاحش معصیت ہیں اور کبیرہ گناہ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صریح احکام کی مخالفت۔ تعجب یہ ہے کہ عوام کی بدعملی کے سبب اکثر پڑھے لکھے لوگوں نے بھی اس میں تاویل شروع کر دی اور عوام کی خوشنودی کے لیے تاویل اور حیل کا افتتاح فرما دیا، تاکہ عوام میں ان کی روشن خیالی کا چرچا ہو۔

مشرکینِ مجوس میں قصرِ فاحش کا عام رواج تھا اور « خالفوا المشركين » فرما کر اسی قصر سے روکا گیا۔ اگر قصر کی تحدید شرعاً نہ کی جائے تو حدیث « أعفوا اللحٰی » بے معنی ہو کر رہ جائے گی، کیونکہ جنسِ اِعفاء تو قصر اور حلق کی ہر صورت میں پائی جاتی ہے۔ جب تک مشرکین کے قصر کو سمجھ نہ لیا جائے، اس کی کوئی صورت ذہن میں نہ آجائے، ان کی مخالفت کا بھی کوئی مقصد نہیں ہوسکتا۔ حدیث "خالفوا" اور حدیثِ اعفاء صرف ایک قضیہ مفروضہ ہو کر رہ جائیں گی، اس مقام پر عوام کے ساتھ بعض اہلِ علم بھی مبتلا ہیں، اس لیے میں چاہتا ہوں کہ اس مقام کو صحیح طور پر سمجھ لیا جائے۔ ﴿لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ وَيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْۢ بَيِّنَةٍ﴾ [الأنفال: ٤٢]

متذکرہ دونوں صورتیں قطعی طور پر خلافِ سنت ہیں۔ ترکِ سنت چونکہ کفر نہیں، اس لیے عموماً مجلسی طور

[1] مصنف ابن أبي شيبة (٨/ ٥٦٢) اور "الترجل" للخلال (٩٧) میں یہ اثر باسند موجود ہے اور اس کی سند بھی حسن ہے۔

پر اسے گوارا کیا جاتا ہے اور شاید اسی وجہ سے یہ معصیت روز بروز بڑھ رہی ہے، اس تساہل کو جواز و اباحت کی دلیل نہ سمجھا جائے۔ ہمارے معمولات میں اس قسم کی چیز حقہ ہے، اس کی حرمت میں بعض اہل علم کو تأمل ہے، لیکن اس کی مضرت میں کوئی اختلاف نہیں اور اس کا غیر مفید ہونا قریبا مسلّم ہے، اور سوسائٹی میں اس کا استعمال اس کثرت سے ہے کہ بعض وقت سوسائٹی کی ذہنی افتاد پر افسوس ہوتا ہے، تاہم کثرتِ استعمال اور اس بلیہ کے عموم کو اس کے جواز یا استحسان کی دلیل قرار نہیں دیا جا سکتا، بلکہ اصحابِ عزیمت کا فرض ہے کہ معاشرے میں ایسی خرابیوں کے وقت اصلاحِ حال کی پوری کوشش فرمائیں۔

بلیک مارکیٹ، ذخیرہ اندوزی، منافع بازی، سود کی بعض صورتیں؛ ہمارے معاشرے میں عام ہو رہی ہیں۔ رشوت، کنبہ پروری ہمارے ذمے دار طبقے کا عام روگ ہے، لیکن اسے جواز یا اباحت کی دلیل نہیں تصور کیا جا سکتا۔ زیرِ قلم مسئلے ہی کو دیکھیے، آپ اس کے خلاف کہیں تو لوگ تعجب انگیز نگاہوں سے آپ کی طرف دیکھیں گے، لیکن یہ جواز کی دلیل نہیں قرار دی جا سکتی۔

بعض لوگ قبضہ سے زائد کٹوا دیتے ہیں، جس کے لیے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے اثر سے استدلال کیا گیا۔ آثار کی بحث بلحاظ ثبوت پہلے گزر چکی ہے۔

نواب صدیق حسن رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''ہمچنیں بعضی از اہلِ علم حکایت ایں فعل از جماعتے از تابعین و استحسانش از شعبی و ابن سیرین نقل کردہ اند، ومذہب ابو حنیفہ رحمہ اللہ و محمد رحمہ اللہ نیز ہمیں ست کہ طولِ لحیہ بقدرِ قبضہ باید وقطع ماورای او واجب باشد'' (هداية السائل، ص: ١٢)

''تابعین کی ایک جماعت کا بھی یہی خیال ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور صاحبین کا بھی یہی مذہب ہے کہ قبضہ سے زائد کٹا دینا ضروری ہے۔''

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس مسئلے میں کوئی حدیث منقول نہیں۔ کٹانے کے باب میں یہی حد ہے، جسے فعلِ صحابہ رضی اللہ عنہم کی بنا پر مباح کہا جا سکتا ہے، گو عام صحابہ کا عمل اس کے خلاف ہے، چنانچہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا اثر بروایتِ ابو داود پہلے گزر چکا ہے۔

داڑھی کے طول و عرض سے بکھرے ہوئے بال کترا دینا یہ صورت درست ہے اور حدیثِ اِعفاء کے خلاف بھی نہیں۔ سننِ ابن ماجہ میں اصول کے طور پر اس کا ذکر آیا ہے:

"باب كراهية الشعر. عن وائل بن حجر قال: رآني النبي ﷺ، ولي شعر طويل، فقال: ذباب ذباب. فانطلقت فأخذته، فرآني النبي ﷺ فقال: إني لم أعنك،

وھذا أحسن"[1] (ابن ماجه، أصح المطابع، ص: ٢٦٧)

''آنحضرت ﷺ نے میرے بال لمبے لمبے دیکھے تو فرمایا: یہ دمیں کیسی ہیں؟ میں نے جا کر بال کٹوا دیے۔ حضرت ﷺ نے دیکھ کر فرمایا: میں نے تمھیں نہیں کہا تھا، لیکن یہ بہتر ہے۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اثر کا مفاد بھی یہی معلوم ہوتا ہے اور وائل بن حجر رضی اللہ عنہ کی حدیث کا ضعف کے باوجود اسی قدر مفاد ہے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما کے اثر کا جو معنی ہم نے پہلے لکھا ہے، اس کا بھی یہی مطلب ہے۔ احادیثِ اِعفاء اور آثار قطعِ لحیہ میں اس سے تطبیق بھی ہو جاتی ہے۔

تجمل کے نقطۂ نظر سے:

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس مسئلے میں حسن کے نقطۂ نظر سے بھی گفتگو ہونی چاہیے۔ لباس کے معاملے میں شارع نے اسے کافی حد تک ملحوظ رکھا ہے۔ «إن اللہ جمیل، یحب الجمال»[2] سے اس اصل کا پتا چلتا ہے۔ اس اصول کے پیشِ نظر اگر بحیثیتِ مسلمان بحث کی جائے تو تجمل کی صحیح صورت تو وہی ہوگی، جسے آنحضرت ﷺ نے پسند فرمایا، لیکن اگر عشق کی طغیانیاں اور حسن کی سرمستیاں کسی ساحلی تحدید کی پابند نہ رہ سکیں تو اتنا تو سوچنا پڑے گا۔ حسن و تجمل کے لیے دنیا کے پاس کوئی قطعی قانون تو ہے نہیں۔ یہ بالکل وقتی اور اضافی چیز ہے۔ متمدن شہروں میں فیشن ہفتوں کا مہمان ہوتا ہے، اس لیے مصنوعی حسن و تجمل کی تلاش میں حسن سازج کی حدود کو پھاندنا مناسب نہیں۔ حسن و تجمل کو جزوی حیثیت ہی دی جا سکتی ہے، لیکن اس کے لیے قدرت کے اٹل قانون سے پیہم جنگ کوئی خوشگوار مشغلہ نہیں۔

اس اجمال کی تفصیل یوں سمجھیے کہ آغازِ سبزہ سے جو جمالیاتی کیفیت اس لیل و نہار کے اجتماع میں پائی جاتی ہے اور نگاہیں جس قدر حظ اس قدرتی منظر سے پاتی ہیں، جو اس سیاہی اور سپیدی کے امتزاج سے پیدا ہوتا ہے، اسے اس مصنوعی شور زمین سے کوئی نسبت ہی نہیں، جسے پر تکلف تراش خراش کے بعد پوڈر اور کریم کی مدد سے پیدا کیا جاتا ہے، اس مصنوعی سپیدہ میں بالوں کی سیاہ کھونٹیاں گویا حسن کی سیاہ قبریں ہیں، جو اس کے ماتم کی زندہ اور جاوید دعوت ہے۔ عوام کا ذوق ویسے بھی کوئی اہمیت نہیں رکھتا، لیکن استدلال و بحث کے مقام پر تو عوامی رجحانات کی کوئی قیمت ہی نہیں اور حسن کی اس ریاکارانہ نمائش میں عوام کے عامیانہ جذبات کے سوا کچھ بھی نہیں، جس پر ایک عقلمند غور و فکر کر سکے یا سوچنے کی تکلیف کرے!

---

[1] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٦٣٦)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٩١)

بڑھاپے میں، جب کہ جمال وتزین کا چراغ طلوعِ سحر کا پتا دے رہا ہو، چہرے کی جھریاں بکھر کر قیافے کی پریشانیوں کی غمازی کر رہی ہوں، چند بالوں کی پریشانی سے پریشان ہو کر موسیٰ ومقراض کی دیوانہ وار احتیاج صرف پریشان خیالی ہی نہیں، بلکہ عقل کی پراگندگی کا بھی پتا دیتی ہے اور جب چہرہ قدرتی جمال کی رعنائیوں سے سرشار ہو، جوانی کی سج دھج پورے جوبن پر ہو، تازہ خون کی سیلاب آمیز موجیں چہرے پر مچل رہی ہوں، ان قدرتی عساکر کو حضری اور مصنوعی اسلحہ سے مسلح کرنا تحصیلِ حاصل ہے۔ سچ جانیے کہ یہاں تو بالوں کی پرپیچ پراگندگیاں چہرہ دل آرام پر مشاطہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ آج کی یہ پریشانی اور ان سیاہ ناگوں کے پرپیچ بل اور بے ترتیب پریشانی حسن و جمال کی آخری معراج ہے، اس پریشانی کی حفاظت کے لیے عاشق اور شاعر شانہ سے برسرِ پیکار ہیں کہ وہ اس پریشانی کو پریشانی سے بچانے کے لیے......... کس دعوے سے کہا جاتا ہے ؏

حاجتِ مشاطہ نیست روئ دلآرام را [1]

کتنا ظلم ہوگا شانہ کے ساتھ اس کھلی جنگ کے بعد حسن کا تمام اثاث البیت استرے اور قینچی کی نذر کر دیا جائے، ایسے حسن پرستوں سے حسن کی یہ فریاد کس قدر برمحل ہوگی۔ ؏

چو دیدم عاقبت خود گرگ بودی [2]

یہاں یورپ کی تقلید کا جنون اس قدر سوار ہے کہ اگر کہیں پیرس کی آوارہ مزاج حسن بدوش لیڈیوں نے سر منڈانے کا فیصلہ کر لیا تو یہاں بلا تامل آمین کہہ دی جائے گی اور عورت کی چوٹی اور مرد کا چہرہ دونوں پاش پاش ہوتے نظر آئیں گے۔ تجربہ شاہد ہے کہ ان ماہرانِ جمالیات کی متاعِ گراں بہا تقلیدِ یورپ کے سوا کچھ بھی نہیں۔ ہم ایسے قدامت پسند تقلید ونقل کی ان زنجیروں کو کیونکر توڑ سکتے ہیں؟!

مجھے حسنِ مصنوع سے عداوت نہیں، جہاں تک فطرت کی سادگی کا تعلق ہے، یہ بال ایک نوجوان چہرے کی عصمت وآبرو ہیں، اس پرنائی کو دست درازی کا کوئی حق نہیں، اس آبرو کو پامال کرنا معصوم فطرت پر ایک ظلم ہے۔ جہاں تک اس موضوع کا فطرت کی صنعت کاری سے تعلق ہے، میں نے جو عرض کیا، وہ قطعی صحیح ہے اور اگر اختلاق وتصنع پر ہی اصرار ہے تو ہر صناع وحراف کو حق ہے کہ اپنی رائے پر اعتماد کرے اور وہ آزاد ہے کہ قدرت کے پیدا کردہ حسن میں جو تحریف وتبدیل کر سکتا ہے، کر گزرے۔ ﴿فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ﴾ [3]

---

[1] ''خوبصورت چہرے کو آرایش گر خاتون (کے بناؤ سنگھار) کی ضرورت نہیں ہے۔''

[2] ''جب دیکھا کہ انجام کار تو بھی بھیڑیا ہی نکلا۔''

[3] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۱۰، ۱۷، ۲۴ فروری ۱۹۵۰ء)

رویتِ ہلال اور مشینی آلات[1]

اس سال شعبان کی آخری تاریخ کو مطلع ابر آلود تھا۔ لاہور اور اس کے نواحی علاقوں میں ابر محیط تھا، چنانچہ رمضان المبارک کا چاند نظر نہ آ سکا، لیکن سرِ شام اور نو بجے تک کافی مقامات سے اطلاعات آ گئیں کہ اکثر مقامات پر چاند واضح طور پر دیکھا گیا اور بڑی کثرت سے دیکھا گیا ہے، جسے یقینی اطلاع کہا جائے تو مبالغہ نہیں ہوگا، لیکن یہ اطلاعات چونکہ ریڈیو وغیرہ مشینی اور سرکاری ذرائع سے آئی تھیں، اس لیے بعض اہلِ علم نے انھیں غیر مستند سمجھا اور روزہ نہیں رکھا۔

یکم رمضان کو جمعہ تھا۔ بعض حضرات نے بڑی جسارت کی اور بوقتِ خطبہ لوگوں کو روزہ توڑنے پر مجبور کیا، اس سے عامۃ المسلمین میں کافی تشویش پیدا ہوئی۔ بعض مقامات پر نزاع نے ہنگامے کی صورت اختیار کر لی۔ علما کے عقیدت مندوں نے عقیدت مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مخالف فریق کے علما کو برا بھلا بھی کہا۔ بعض مقامات پر اپنی پوزیشن صاف کرنے کے لیے اشتہارات تقسیم کیے گئے، انعامات کا اعلان کیا، جبکہ بعض لوگوں نے روزہ توڑنے سے انکار کیا، اس قسم کی جرأت اور علمی نمایش کے بعد ایسے حالات کا پیدا ہونا قدرتی امر تھا، اس لیے ضرورت محسوس ہوئی کہ رویتِ ہلال کے مسئلے پر کتاب وسنت اور نئے حالات کی روشنی میں غور کیا جائے۔ ان گزارشات کا مقصد کسی کی تردید یا تائید نہیں، بلکہ صورتِ حال کا بقدرِ امکان جائزہ لینا ہے اور صحیح شرعی پوزیشن کی تلاش۔

شریعت میں رویتِ ہلال اور اس کی تصدیق کے لیے مختلف راہیں اختیار فرمائی گئی ہیں:

(1) مطلع صاف ہو اور چاند واضح طور پر نظر آ جائے تو اس صورت میں یہ خبر ہی رؤیت کی تصدیق کے لیے کافی ہے۔ جن لوگوں نے چاند نہ دیکھا ہو، انھیں دیکھنے والوں کی اطلاع پر اعتماد کرنا چاہیے اور اگر کسی جگہ کسی عذر کی وجہ سے یا کوئی معذور چاند نہ دیکھ سکے تو اسے اس رؤیتِ عامہ پر اعتماد کرتے ہوئے اس ظن کو قبول

---

[1] مولانا مرحوم نے جب یہ مضمون (اپریل ۱۹۶۷ء) لکھا، اس وقت حکومت کے زیرِ اہتمام مرکزی رویتِ ہلال کمیٹی قائم نہ ہوئی تھی اور اس بنا پر رمضان المبارک یا عیدین کے مواقع پر کبھی مختلف مکاتبِ فکر میں اختلاف و انتشار کی صورت پیدا ہو جاتی تھی، لیکن آج کل بحمد اللہ یہ صورت پیدا نہیں ہوتی، اس لیے کہ مرکزی رویتِ ہلال کمیٹی کے فیصلے کے مطابق چاند ہونے یا نہ ہونے کا باقاعدہ اعلان کر دیا جاتا ہے، تاہم مولانا مرحوم کے قلم سے نکلے ہوئے یہ مضمون اپنا ایک علمی مقام رکھتے ہیں اور عوام و خواص کے لیے ان میں بہت کچھ افادیت موجود ہے۔ (منیر احمد سلفی)

کرنا چاہیے، جسے شارع حکیم نے ایسے مواقع پر احکام کے لیے کافی سمجھا ہے۔

علامہ علاؤ الدین حصکفی فرماتے ہیں:

"وقبل بلا علة جمع عظيم يقع العلم الشرعي وغلبة الظن بخبرهم، وهو مفوض إلىٰ رأي الإمام من غير تقدير بعدد" (الدر المختار: ١/ ١٥٢)

"ایسی جماعت کی اطلاع جس سے گمان ہو کہ چاند طلوع ہوگیا ہے، قبول کر لی جائے گی، امام یا حاکم کا فیصلہ اس میں کافی ہے اور شرعاً کوئی تعداد اس کے لیے معین نہیں۔"

غرض حکام تک چاند ہونے کی اطلاع بھیجنا اور اس بارے میں ان کا فیصلہ کافی ہے، اس کے بعد کسی شرعی شہادت کی ضرورت نہیں۔

(۲) مطلع ابر آلود ہو یا افق پر غبار آ گیا ہو اور بعض مقامات پر اکثر لوگ چاند نہ دیکھ سکیں تو رؤیت ثابت کرنے کے لیے شہادت کی ضرورت ہوگی۔ امام احمد، ابن مبارک فرماتے ہیں کہ ایک شہادت کافی ہوگی۔ امام شافعی رحمہ اللہ سے بھی ایک روایت اسی طرح ہے:

"وقال في القديم والجديد: تقبل من عدل واحد، وهو الصحيح لما روى ابن عمر: تراءى الناس الهلال فأخبرت النبيﷺ أني رأيته، فصام رسول اللهﷺ وأمر الناس بالصيام، ولأنه إيجاب عبادة فقبل من واحد احتياطا"[1]

(المهذب قلمی نسخه كتاب الصيام)

"امام شافعی رحمہ اللہ کا قدیم و جدید قول یہ ہے کہ ایک عادل گواہ کی شہادت کافی ہوگی اور یہی صحیح ہے، چنانچہ عبداللہ بن عمر سے مروی ہے، لوگ چاند دیکھ رہے تھے، میں نے چاند دیکھ کر آنحضرت ﷺ کو اطلاع دی، آپ ﷺ نے میری شہادت پر خود بھی روزہ رکھا اور لوگوں کو بھی حکم دیا، اور چونکہ اس سے ایک عبادت واجب ہوتی ہے، اس لیے احتیاط کے طور پر ایک ہی شہادت قبول فرمائی۔"

امام شافعی رحمہ اللہ سے ایک اور روایت دو شہادتوں کے متعلق بھی آئی ہے۔ (نیل الأوطار: ٤/ ١٩٠) فقہائے حنفیہ کا رجحان بھی رمضان کے متعلق ایک شہادت کی طرف ہے۔ امام طحاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"ويقبل في الشهادة علىٰ رؤية هلال رمضان رجل واحد مسلم أو امراة واحدة مسلمة أينما شهد بذلك وحده قبلت شهادته عليه عدلا كان الشاهد بذلك أو غير عدل بعد أن يكون يشهد أنه رآه خارج المصر وأنه رآه في المصر، وفي

---

[1] المهذب للشيرازي (١/ ١٧٩)

السماء علة تمنع العامة التساوي في رؤيته"

(مختصر الطحاوي، ص: ٥٦، شامي: ٢/ ١٤٣ أيضاً، بدائع: ٢/ ٨١)

''مطلع صاف نہ ہو تو ایک مرد یا ایک عورت کی شہادت کافی ہے، اس کے لیے عدالت بھی ضروری نہیں، اس میں ایک عورت کی شہادت مرد کے برابر ہوگی۔''

علامہ علاؤ الدین ابو بکر مسعود کاسانی فرماتے ہیں، چونکہ اس اطلاع کا اثر اطلاع دینے والے پر بھی پڑتا ہے، اس لیے یہ شہادت نہیں خبر ہے:

"وليس هذا بشهادة، بل هو إخبار بدليل أن حكمه يلزم الشاهد"

(البدائع والصنائع للكاساني: ٢/ ٨١)

معلوم ہوا کہ خبر کے لیے خبر دینے والوں کی تعداد ضروری نہیں۔ اگر فقہائے حنفیہ رحمہم اللہ کی یہ توجیہ قبول کر لی جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ایک آدمی کی اطلاع پر بھی رؤیت کی تصدیق ہو سکتی ہے، فقہائے حنفیہ رحمہم اللہ کی نظر اس مسئلے میں انسانی نفسیات پر ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ انسان بلا ضرورت جھوٹ نہیں بولتا۔ رمضان کے چاند کی اطلاع میں کسی کا کوئی ذاتی فائدہ نہیں، اس لیے اس خبر میں جھوٹ کا کوئی شائبہ نہیں ہوسکتا۔ امام طحاوی کے ارشاد کو فقہائے حنفیہ نے عدالت کے معاملے میں ظاہر روایات کے خلاف فرمایا ہے۔

(البدائع والصنائع للكاساني: ٢/ ٨١)

(۳) کہیں چاند نظر آ جائے۔ کسی دوسرے شہر میں ابر، غبار یا کسی عارضے کی وجہ سے چاند نظر نہ آسکے تو ظاہر ہے کہ اس صورت میں اطلاع کے لیے خبر دی جا سکتی ہے۔ بعینہٖ شہادت یا عدالت تو دوسرے شہر میں منتقل نہیں ہو سکے گی۔ اگر خبر اور اطلاع کو ساقط الاعتبار سمجھا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ چاند جہاں دیکھا جائے، وہیں روزے رکھے جائیں، دور یا قریب اطلاع کا کچھ فائدہ نہیں۔ شہادت اور خبر کے اصطلاحی فرق سے اس قدر غلط فائدہ اٹھانا پسندیدہ طریقہ نہیں۔ رمضان المبارک کی فضیلت کے پیشِ نظر یہ ٹیکنیکل فرق کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ جب ایک اطلاع ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف منتقل کی جائے اور وہ قابلِ اعتماد ذرائع سے مل جائے تو اس پر یقین کرنا چاہیے۔ اصطلاحی مباحث میں الجھنا نہ دیانتاً درست معلوم ہوتا ہے نہ اس سے شارع حکیم کے مقاصد کو کچھ فائدہ پہنچتا ہے۔

علامہ کاسانی محدود بالقذف کی شہادت رویتِ ہلال کے متعلق فرماتے ہیں:

"وروى أبو يوسف عن أبي حنيفة أن شهادته برؤية الهلال لا تقبل، والصحيح أنها تقبل، وهو رواية الحسن عن أبي حنيفة لما ذكرنا أنها خبر، وليس بشهادة،

وخبره مقبول، وتقبل شهادة واحد عدل علىٰ واحد عدل في هلال رمضان بخلاف الشهادة علىٰ الشهادة في سائر الأحكام، أنها لا تقبل ما لم يشهد علىٰ شهادة رجل واحد رجلان أو رجل وامرأتان لما ذكرنا أن هذا من باب الإخبار لا من باب الشهادة، ويجوز إخبار رجل عدل كما في رواية الإخبار" (بدائع: ۲/ ۲۱)

"جس شخص کو حدِ قذف لگائی گئی ہو، امام ابو یوسف رحمہ اللہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے نقل فرماتے ہیں کہ ہلال کے معاملے میں اس کی شہادت مقبول نہیں ہوگی۔ صحیح یہ ہے کہ ہلال کے متعلق (باقی احکام کے خلاف) اس کی شہادت مقبول ہوگی، کیونکہ یہ دراصل خبر اور اطلاع ہے، شہادت نہیں، اسی طرح ایک عادل آدمی کی شہادت کی اطلاع دوسرا عادل آدمی رویتِ ہلال کے متعلق دے سکتا ہے، (بخلاف دوسرے احکام کے) کیونکہ یہ خبر ہے، شہادت نہیں اور خبروں کے متعلق شہادت کی شرائط اور پابندیاں شرعاً ملحوظ نہیں رکھی گئیں۔"

رویتِ ہلال کے متعلق ایک شہادت پر اعتماد احادیثِ صحیحہ میں بصراحت موجود ہے۔ سنت کے دفاتر اس سے بھرے پڑے ہیں، بخوفِ طوالت یہاں ان کا تفصیلی تذکرہ ضروری نہیں سمجھا گیا۔ جو لوگ کتاب و سنت میں سلف کی راہ سے سوچتے اور سمجھتے ہیں، الحمد للہ وہ اس قسم کی اُلجھی ہوئی راہوں سے کافی حد تک محفوظ ہیں، گو فقہائے حنفیہ رحمہم اللہ نے گواہ کی عدالت کے متعلق امام طحاوی کے ارشاد کو ظاہر روایات کے خلاف سمجھا ہے، لیکن انسانی نفسیات کے لحاظ سے یہ قول کافی حد تک معقولیت پر مبنی ہے۔ ہلالِ رمضان کے معاملے میں خبر دینے والے کے عادل ہونے کو اس قدر اہمیت نہیں ہونی چاہیے، اس میں نہ عوام جھوٹ کی ضرورت محسوس کرتے ہیں نہ خواص، نہ حکومت کو اس سے کچھ فائدہ پہنچتا ہے نہ حکام کو۔ اگر اس قسم کا کوئی خطرہ کہیں پیدا ہو تو اہلِ علم علل کے مطابق احکام بدل سکتے ہیں۔ الأحكام تدور مع العلل.

ریڈیو اناؤنسر کا عادل ہونا:

ریڈیو کا تذکرہ جب بعض علما اور اربابِ فتویٰ کی زبان پر آتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ریڈیو کوئی بہت بڑا جھوٹا "آدمی" ہے۔ جب وہ کوئی اطلاع دے تو حضرات علما کو خود محتاط ہو جانا چاہیے، اس میں اس حد تک معقولیت بھی ہے کہ عموماً جو لوگ اس محکمے میں کام کرتے ہیں، وہ متدین نہیں ہوتے، إلا ما شاء اللہ۔ اس لیے ان کی اطلاع پر اعتماد نہیں ہونا چاہیے۔ شہادت کے معاملے میں تدین ضروری ہے اور شہادت کی شرائط کا لحاظ بھی ضروری ہے، لیکن معلوم ہونا چاہیے کہ اطلاعات کو نشر کرنے کا معاملہ شہادت سے مختلف ہے۔ حکومت یا

ریڈیو کے ناشر اطلاعات میں بلا وجہ غلط بیانی نہیں کرتے۔ حکومت غیر مسلم ہو تو اس معاملے میں بے اعتنائی کا امکان تو ہو سکتا ہے، مگر عمداً جھوٹ یا غلط بیانی کا سوال وہاں بھی پیدا نہیں ہوتا۔ اب جبکہ حکومت خود مسلمانوں کی ہے، گو آئین کے لحاظ سے وہ سرِدست کاملاً اسلامی نہیں، لیکن اس کے اربابِ بست وکشاد بہر حال مسلمان ہیں اور ان میں اہلِ علم بھی ہیں، پھر حکومت یا حکام کو ایسی اطلاعات کے غلط نشر کرنے میں کچھ ملکی یا سیاسی فائدہ بھی نہیں، ان حالات میں اس قسم کی بدگمانی کی کوئی وجہ نہیں۔

محکمہ ریڈیو کے اربابِ کار شہادت کے ناقل ہیں یا دوسرے مقامات کی اطلاعات کے راوی ہیں اور خاص طور پر جب حکومت نے یہ ذمے داری لی ہے کہ وہ ایسی اطلاعات پوری تصدیق کے بعد نشر کرے گی، انگریز کے زمانے میں جس بے اعتنائی کا خطرہ تھا، اب بظاہر اس کا بھی کوئی کھٹکا نہیں رہا تو دیانت دارانہ سوچ بچار کا تقاضا یہ ہے کہ مشینی آلات اور حکومت کے فیصلوں پر بدلتے ہوئے حالات کی روشنی میں غور کیا جائے اور ان پر اعتبار کیا جائے۔ بریلوی حضرات اگر اس معاملے میں غور فرمائیں تو وہ مجبور ہیں، ان کی یہ عادت ہے، لیکن تعجب ہے کہ بعض دوسرے لوگوں نے بھی جو کچھ اس سال کیا ہے، اس کی ان سے اُمید نہ تھی۔ رات روزہ نہ رکھا گیا ہو تو اس موقف میں کچھ جان ہے، مگر بوقتِ جمعہ بھرے مجمع میں روزہ توڑنے کے لیے کہا جائے اور اس پر زور دیا جائے، یہ نہ دیانت کا تقاضا ہے نہ اخلاق کا۔ اگر یہ ضروری تھا تو کہہ دیا جاتا کہ نفلی روزے کی نیت کر لی جائے۔ فقہائے حنفیہ کے نزدیک شک کے دن نفلی روزہ درست ہے، مگر یہاں تو شک کا سوال ہی نہیں۔ شک کے جراثیم تو بعض حضرات نے زورِ تقریر اور قوتِ فتویٰ سے پیدا کیے، ورنہ اطلاعات قابلِ وثوق تھیں۔ روزہ رکھنے میں کچھ حرج نہیں تھا۔ چاند کی بلندی اور غروب میں دیر سے یہ حقیقت اور بھی واضح ہوگئی تھی، تاہم اب تک فتوے لیے جا رہے ہیں اور روزہ رکھنے والوں کو مطعون کیا جا رہا ہے۔ واقعہ کی صحت کے بعد ٹیکنیکل الفاظ پر زور اور ان اصطلاحات کو شریعت کا مقصد اور مدار قرار دینا بھلا معلوم نہیں ہوتا، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ حقیقت شناس لوگوں کا اعتماد علمائے کرام پر سے اٹھ جائے گا اور ان کی قوتِ فکر عوام کی نظر میں مطعون ہوگی۔

ظروف واحوال کا لحاظ:

علمائے حق ہمیشہ اپنے فتووں میں ظروف واحوال کا خیال رکھتے رہے ہیں۔ اجتہاد کے اختلافات میں کافی حد تک یہی حقیقت ہے۔ فقہائے حنفیہ کا طریقِ عمل اس معاملے میں اور بھی کھلا ہوا ہے۔ مفقود الخبر کے متعلق انھوں نے موالک کے قول کو قبول فرمایا۔ قرآن وسنت کی تعلیم پر اُجرت کے متعلق انھوں نے شوافع، موالک اور حنابلہ کی تحقیقات کو قبول فرما کر ملک پر اور عامۃ المسلمین پر احسانِ عظیم کیا ہے۔ مولانا اشرف علی تھانوی ﷫ کی مرتبہ کتاب "الحیلة الناجزة للحليلة العاجزة" اس باب میں چھپ چکی ہے۔ رویتِ ہلال کے متعلق بھی

اگر اسی حقیقت پسندی سے کام لیا جائے تو اس کے نتائج بہت ہی مفید ہوں گے۔

اختلافِ مطالع کے متعلق اصحابِ متون نے جو روش اختیار فرمائی تھی، متاخرین نے اس کے خلاف کو پسند کیا اور اختلافِ مطالع کو کسی حد تک قبول فرمایا۔

علامہ ابن عابدین شامی نے رویتِ ہلال کے متعلق جب آسمان صاف ہو، خبر دینے والوں کی تعداد کا ذکر فرمایا ہے، فقہائے عظام کی متعدد روایات کا ذکر کیا ہے، امام کی روایت کو ترجیح دیتے ہوئے ایک بڑے پتے کی بات کہی ہے۔ فرماتے ہیں:

"أقول: أنت خبير بأن كثيرا من الأحكام تغيرت لتغير الأزمان، ولو اشترط في زماننا الجمع العظيم لا يصوم الناس إلا بعد ليلتين أو ثلاث لما هو مشاهد من تكاسل الناس، بل كثيرا ما رأينا هم يشتمون من يشهد بالشهر، ويؤذونه، وحينئذ فليس في شهادة الاثنين من بين الجم الغفير حتى يظهر غلط الشاهد، فاتفقت علة ظاهر الرواية فتعين الإفتاء بالرواية الأخرىٰ" (شامي: ٢/ ١٤٢)

"تمھیں معلوم ہے کہ اکثر احکام زمانے کی تبدیلی کی وجہ سے بدل جاتے ہیں۔ لوگوں کی سستی اور بے توجہی کو دیکھیے، اگر چاند دیکھنے کے لیے جمِ غفیر کی شرط لگائی جائے تو لوگ رمضان میں دوسری اور تیسری تاریخ ہی کو روزہ رکھ سکیں گے۔ ہم نے دیکھا ہے لوگ اسے گالیاں دیتے ہیں، جو انھیں رمضان کی آمد کا پتا دے، اس لیے دو آدمیوں کی اطلاع کو کافی سمجھنے میں کوئی تفرد نہیں اور ظاہرِ روایت کے خلاف فتویٰ دینے میں کوئی حرج معلوم نہیں ہوتا۔"

پچھلے بزرگوں کی طرح اگر ظروف و احوال اور تغیراتِ زمانہ کی روشنی میں قدما کے فتووں پر سوچنے کی عادت ڈال لی جائے تو ترکِ تقلید کے نام پر اہلِ حدیث کے ساتھ جو بلا وجہ تلخی پیدا کر لی گئی ہے، یہ آسانی سے ختم ہو سکتی ہے۔ یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ متاخرین کا علم متقدمین ہی سے ماخوذ ہے، اس لیے آپ اور ہم انھیں ائمہ کے خوشہ چین ہیں، اسی خوشہ چینی میں اہلِ حدیث اور احناف کا انداز کسی قدر مختلف ہے۔ اگر فکر و نظر میں تھوڑی سی وسعت پیدا کر لی جائے، جس طرح قرنِ اول میں تھی، تو تلخی ختم ہو سکتی ہے اور پاک و ہند کے اہلِ حدیث نے اس سے زیادہ کوئی جرم نہیں کیا۔

مشینی آلات کا استعمال روز بروز اس قدر عام ہو رہا ہے کہ اس کے استعمال کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ آپ حضرات بھی تبلیغی امور میں ان سے استفادہ فرماتے ہیں۔ تمام اخبارات جن کی خبروں پر زندگی کی بہت سی ضروریات کا انحصار ہے، ان مشینی آلات ہی کی مرہون ہیں۔ موت اور زندگی کے متعلق اطلاعات کا صحیح ترین

ذریعہ یہی ہے۔ جلسوں کی حاضری، مختلف ممالک کی اطلاعات انہی ذرائع سے حاصل ہوتی ہیں، آپ اور ہم؛ سب ان پر یقین کرتے ہیں۔ روزہ افطار کے وقت سائرن بجتا ہے، ہم بلاشبہہ روزہ افطار کرتے ہیں اور کسی عدالتی شہادت کا مطالبہ نہیں کرتے۔ کاروباری لوگ کروڑوں روپے کا کاروبار ان آلات کے اعتماد پر کرتے ہیں۔ ٹیلیفون پر لاکھوں سے زائد روپے کے سودے روزانہ ہوتے ہیں، وہاں ہماری قوتِ اعتماد کو کوئی ٹھیس نہیں لگتی۔

غرض دینی اور دنیوی امور میں ہم ان آلات پر اعتماد کرتے ہیں، آخر رویتِ ہلال میں کون سی نزاکت ہے کہ ان کی زبان سے اطلاع آجائے تو ہم سرتاپا اعتراض بن جاتے ہیں؟

ایک معقول آدمی کی نظر میں یہ بڑی مضحکہ خیز پوزیشن ہے، یقیناً بعض اوقات ان آلات کے ذریعے غلطی ہونے کا بھی امکان ہے تو اس کی اصلاح کے لیے ہمیں سوچنا چاہیے نہ کہ ایک مفید چیز کو خواہ مخواہ اپنے اوپر حرام ٹھہرا لینا چاہیے۔

آخر میں ادباً گزارش ہے کہ ان آلات کے اعتماد اور ان کی اِفادی حیثیت کو برقرار رکھنے کے بارے میں عقل مندی سے غور فرمایئے اور عوام کو تشویش سے نکالنے کی کوشش کیجیے۔[1]

[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۱۷ / مارچ ۱۹۶۱ء)

رویتِ ہلال اور خبر وشہادت کی بحث

اس سال [اپریل ۱۹۶۷ء] شعبان اور رمضان کی آخری تاریخوں میں آسمان ابر آلود تھا۔ مغربی پاکستان کے وسطی علاقوں میں چاند نظر نہ آسکا۔ رمضان کا چاند کراچی سے سکھر تک بڑی کثرت سے دیکھا گیا۔ آزاد کشمیر کے قریبی علاقوں میں بھی مطلع صاف تھا اور چاند نظر آ گیا تھا، چنانچہ تمام مکاتبِ فکر کے دانشمند لوگوں نے ریڈیو اور ٹیلی فون کی اطلاع پر روزہ رکھا۔ بعض حضرات کو صحیح اطلاع نہ پہنچ سکی، انھوں نے روزہ نہ رکھا۔ بعض وہم پرست حضرات نے رکھے ہوئے روزے بھرے مجمع میں تڑوا دیے اور اسے دین کی بہت بڑی خدمت تصور کیا۔

رمضان کی آخری تاریخ کو عید کا چاند حسبِ بیان اخبارات، لاہور اور کراچی میں چند آدمیوں نے دیکھا، مقامی طور پر شہادت ہوئی اور اس کی اطلاع دوسرے شہروں کو بھی دی گئی۔ اطلاع کے ذرائع وہی مشینی تھے، البتہ کہیں کسی نے اِصالتاً دریافت کر لیا اور اطمینان کے بعد مغربی پاکستان کے اکثر حصوں میں عید ہوگئی، لیکن کراچی میں عید صرف سرکاری حلقوں نے منائی۔ عوام سرکاری اطلاعات پر مطمئن نہیں ہوئے، تاہم باقی اکثر شہروں میں اس شہادت کی اطلاع دے دی گئی اور عام طور پر عید ہفتے کے دن منائی گئی، لیکن بعض مقامات پر عید کے دن بدستور روزہ رکھا گیا۔

غرض عید کے موقع پر بعض حلقوں میں خاصی بے اطمینانی رہی۔ بعض مُلا قسم کے بزرگوں نے اشتہار بازی سے اپنے آپ کو مشہور کرنے کا اچھا موقع تلاش کیا، لیکن اس میں شک نہیں کہ بے اطمینانی ضرور ہوئی۔ اس بے اطمینانی کے اسباب میں سرکاری حلقوں کی ذمے داری بھی کچھ کم نہیں، لیکن عموماً اس کا احساس نہیں فرمایا گیا۔ بہر حال جہاں خبر رسانی کے ذرائع موجود تھے، وہاں احساس ناپید تھا اور جہاں احساس کی فراوانی تھی، وہاں ذرائع موجود نہ تھے۔

کئی سوال:

قدرتی طور پر اس وقت کئی سوال پیدا ہوگئے، مثلاً:

(1) کیا تار، خط، ریڈیو، ٹیلی فون اور ٹیلی ویژن وغیرہ خبر رسانی کے ذرائع شرعاً قابلِ اعتماد اور درست ہیں اور جو واقعات ان ذرائع سے معلوم ہوں، انھیں قبول کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

2 رویتِ ہلال کے لیے شرعاً شہادت ضروری ہے یا خبر اور اطلاع پر بھی روزہ رکھا جا سکتا ہے؟

3 عوام اگر مطمئن ہو کر عید منا لیں اور حکومت کے ادارے فیصلہ کر دیں تو کیا کسی شخص کے لیے انفراداً ان کی مخالفت درست ہے؟

ان سوالات پر غور کرنے سے پہلے ایک حقیقت کو سمجھ لینا چاہیے اور وہ یہ ہے کہ اس قسم کے عوامی مسائل کی ذمے داری اصلاً حکومت پر ہے۔ اربابِ حکومت کا مذہب اگر اسلام نہ ہو تو بھی عوام کی ضرورت کے پیشِ نظر اس کا صحیح اہتمام ہونا چاہیے اور اس طرح ہونا چاہیے، جس سے عوام مطمئن ہوں اور ان الفاظ سے ہونا چاہیے، جو اسلام نے اس کے لیے مقرر فرمائے ہیں، نیز ان لوگوں کی شمولیت سے ہونا چاہیے، جن پر لوگوں کو مذہبی معاملات میں اعتماد ہو اور وہ اس کی شرعی اہمیت کو سمجھتے ہوں۔

ڈائریکٹر محکمہ موسمیات کراچی نے اپنے بیان میں فرمایا ہے:

''گو میرا فرض نہیں تھا، لیکن میں دونوں گواہ لے کر مولانا احتشام الحق صاحب کے پاس گیا۔''

یہ اندازِ گفتگو کیا ہے؟ جب آپ ایک ایسا اعلان فرماتے ہیں، جس سے بحیثیتِ مسلمان مولانا احتشام الحق وغیرہم کا براہِ راست تعلق ہے، پھر مولانا احتشام کی شخصیت ایسی ہے، جس پر عامۃ المسلمین کو اعتماد ہے تو آپ ان کو اعتماد میں لیے بغیر کیوں اعلان فرماتے ہیں؟ اخلاقاً، شرعاً اور بحیثیتِ ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ آپ کا فرض ہے کہ اعلان سے قبل ان حضرات سے رابطہ قائم کریں اور ان کو مطمئن کریں۔

ہم نے ڈائریکٹر محکمہ موسمیات اور مولانا احتشام الحق صاحب کے اخباری بیانات پڑھے ہیں، ہمارا تاثر یہ ہے کہ چاند یقیناً دیکھا گیا، لیکن ان بیانات اور ان میں اختلاف سے اقتدار اور خود داری کی جنگ نمایاں ہے۔

علما نے چاند نہیں دیکھا۔ عوام کے پاس وہ ذرائع نہیں، جو محکمہ موسمیات کے پاس ہیں تو اس صورت میں صحیح طریقِ کار یہ تھا کہ جہاں دو افسر دور بین سے چاند دیکھ رہے تھے، وہاں مولانا احتشام الحق یا مفتی محمد شفیع صاحب بھی دور بین استعمال فرما لیتے، اس سے دور بین کا کون سا پرزہ گھس جاتا؟ علما کا اطمینان بہر حال محکمہ والوں کو کرا لینا چاہیے تھا۔

پھر یہ کیا الفاظ ہیں: ''کراچی میں چاند ہو گیا، ڈھاکہ میں چاند نہیں ہوا۔''

یہ الفاظ شرعی شہادت کے لحاظ سے قطعی غیر مبہم ہیں۔ محکمہ موسمیات کے ڈائریکٹر مسلمان ہیں، انھیں معلوم نہیں، شہادت میں مبہم الفاظ کا استعمال نہ شرعاً درست ہے نہ قانوناً، اس کے لیے واضح الفاظ ہونے چاہئیں، مثلاً: چاند فلاں مقام پر دیکھا، فلاں فلاں صاحب نے خود دیکھا، وہ فلاں بزرگ ہیں، ان کا مختصر سا تعارف ہو جانا چاہیے۔ اس دفعہ جو بھی تھوڑا بہت انتشار ہوا ہے، اس میں محکمہ موسمیات کی بے اعتنائی کو زیادہ دخل ہے۔ وہ اگر بروقت

ذمے دار حضرت سے رابطہ قائم فرما لیتے تو نہ ان کو تکلیف ہوتی نہ عید منانے کے سلسلے میں ملک میں بے اطمینانی ہوتی۔

آپ غور فرمائیں! اگر سائنسدان چاند کو عبور کر کے اس سے کہیں آگے نکل جائیں تو رویتِ ہلال کی شرعی یا عرفی حیثیت میں کیا فرق پیدا ہو سکتا ہے؟ وہ تو بہر حال نظر آئے گا۔

اب پیش آمدہ سوالات کے متعلق شرعی مقاصد کے لحاظ سے عرض ہے:

(1) اصل چیز کسی اطلاع پر یقین اور اطمینان ہے۔ یہ اطمینان کسی طرح حاصل ہو جائے، شارع حکیم کا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔ اگر حالات شہادت کے مقتضی ہوں تو شہادت کی شرائط پوری ہونی چاہئیں اور اگر یہ مقصود کسی دوسرے طریق سے پورا ہو جائے تو ذرائع کی بحث عبث ہے، اس میں بظاہر مکاتبِ فکر میں کوئی اختلاف نہیں۔

جن لوگوں نے رمضان یا عید کے چاند کی اطلاع کو صرف اس لیے رد کیا ہے کہ ریڈیو، تار یا ٹیلیفون کے ذریعے سے یہ اطلاع آئی ہے، ان حضرات نے عقل و دانش سے جنگ لڑی ہے۔ اب یہ ذرائع ہماری زندگی کا جزو بن چکے ہیں اور آیندہ روز بروز ان کا اعتبار بڑھ رہا ہے۔ جب ٹیلیفون پر ایک آدمی کی آواز کو لوگ پہچانتے ہیں تو ٹیلیفون کی خبر پر بے اعتمادی کیوں کی جائے؟ کبھی کبھی چونکہ آوازیں مل جاتی ہیں، اس لیے حقیقت کو اوہام کی نظر کر دیا جائے؟

یہ فکر و نظر کے استعمال کا معقول طریقہ نہیں۔ یہ کس قدر غیر معقول بات ہوگی کہ ہم لوگ دنیا کے تمام معاملات میں ان چیزوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں، موت اور زندگی کے حوادث میں خطوط لکھتے ہیں، تار دیتے ہیں، ٹیلیفون سے استفادہ کرتے ہیں اور ان ذرائع سے آئی ہوئی خبر کو صحیح سمجھتے ہیں، جلسوں کی تواریخ کی اطلاع ڈاک سے ہوتی ہے، دوسرے ذرائع سے پیغام بھیجے جاتے ہیں، ہمیں ان کے قبول کرنے میں کوئی تامل نہیں ہوتا اور اکثر یہ اطلاعات صحیح ہوتی ہیں۔

پورا رمضان سائرن بجتا رہا، سب لوگ اس پر روزہ افطار کرتے رہے۔ سائرن بجتا یا گولہ چلتا تو سحری بند ہو جاتی، حالانکہ سائرن کی آواز میں اشتباہ اور اِبہام کی زیادہ گنجایش ہے، لیکن ریڈیو اور ٹیلیفون کے مخالف سائرن پر یقین کرتے ہوئے سحری بند بھی کرتے رہے اور روزہ افطار بھی کرتے رہے، مگر جہاں تک چاند کا تعلق ہے، یہ ذریعہ جھوٹا سمجھا جائے، یہ کس قدر غیر معقول بات ہے؟ میرا یہ مطلب نہیں کہ اس میں مغالطے کی کوئی گنجایش نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان تمام ذرائع میں قرائن اور احوال کی وجہ سے اگر ظنِ غالب ان خبروں کی صحت کے متعلق ہو جائے تو اسے قبول کرنا چاہیے۔ کسی خبر کو صرف اس لیے رد کر دینا کہ وہ فلاں ذریعے سے آئی ہے، قطعاً غیر معقول ہے۔

فقہائے اسلام کی نظر میں یہ شہادت علی الشہادت کی صورت ہو سکتی ہے۔ کسی مقام پر اگر ہلالِ رمضان دیکھا گیا

تو ریڈیو نے اس شہادت کو نقل کر دیا۔

علامہ علاؤ الدین ابوبکر بن مسعود کاسانی (۵۸۷ھ) محدود بالقذف کے متعلق فرماتے ہیں:

”روی أبو یوسف عن أبي حنیفة أن شهادته برؤیة الهلال لا تقبل، والصحیح أنها تقبل، وهو روایة الحسن عن أبي حنیفة لما ذکرنا أن هذا خبر ولیس بشهادة، وخبره مقبول، وتقبل شهادة واحد عدل علی واحد عدل في هلال رمضان“

(البدائع والصنائع: ۲/ ۸۱)

”مقذوف کے متعلق حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے دو روایات ہیں، امام ابو یوسف فرماتے ہیں: یہ شہادت مقبول نہیں۔ حسن بن زیاد فرماتے ہیں: مقبول ہے۔ کاسانی فرماتے ہیں: یہ صحیح ہے۔ فرماتے ہیں: یہ خبر ہے، شہادت نہیں (ایسی خبر سے گویا رویتِ ہلال ثابت ہوسکتی ہے) نیز یہ ایک عادل گواہ پر دوسرے عادل کی شہادت ہے، جو ہلالِ رمضان کے متعلق قبول کر لی جائے گی۔“

اس عبارت سے ظاہر ہے جس طرح شہادت سے ہلالِ رمضان کی رؤیت ثابت ہوسکتی ہے، اسی طرح ایک صحیح اور عادل آدمی کی خبر سے بھی ہوسکتی ہے، لہٰذا بعض حضرات کا شہادت کے لیے اصرار فقہا کے موقف سے بے خبری پر مبنی ہے۔ عفا اللّٰہ عنا وعنهم

اصل چیز قرائن ہیں۔ اگر ایک یا دو شہادتیں مل جائیں، لیکن اس کے ساتھ ایسے قرائن بھی مل جائیں، جن سے یہ ثابت ہو کہ یہ گواہ غلط کہتے ہیں تو اس صورت میں یہ شہادت بھی مسترد ہو جائے گی۔ اصل چیز صحیح اطلاع ہے۔ ذرائع اصل بحث نہیں۔ اگر قرائن موجود ہوں تو غیر عادل اور غیر ثقہ کی روایت بھی مقبول ہوگی، کیونکہ ضعیف اخبار کو کلیتاً مسترد نہیں کیا گیا۔

اصطلاحی شہادت پر اصرار اور خبر سے انکار کرنا منکرینِ حدیث کے ہاتھوں کو مضبوط کرے گا، کیونکہ احادیث کا سارا سلسلہ ہی اخبار پر مبنی ہے۔ اگر اخبار کو ساقط الاعتبار یا مشکوک سمجھا جائے تو پورا فنِ حدیث غیر معتبر اور غیر مستند سمجھا جائے گا۔ احادیث کی صحت یا ضعف کا انحصار ثقہ یا کمزور راویوں کی اخبار اور اطلاعات پر ہی تو ہے۔

رویتِ ہلال کے متعلق خبر کی حجیت اور استشہاد پر تمام فقہا اور محدثین متفق ہیں، اس لیے ریڈیو اور ٹیلیفون کی خبروں کو کلی طور پر مسترد کرنا بے خبری کی دلیل ہے، البتہ جب شہادت کا موقع ہو تو شہادت پر ہی اعتماد ہوگا۔ مقصودِ کلام یہ ہے کہ واقعہ کی تصدیق ہو جائے اور تصدیق کا ذریعہ خواہ کوئی بھی شہادت یا خبر ہو، پھر یہ اطلاع ریڈیو سے ہو یا فون سے یا کوئی اور مصدقہ طریقِ اطلاع ہو، سب صحیح ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ریڈیو اور دوسرے سرکاری محکموں میں کام کرنے والے لوگ عام طور پر متدین نہیں

ہوتے، لیکن اس میں ان آلات کا کیا قصور ہے؟ یہ تو حکومت کا فرض ہے کہ وہاں متدین آدمی رکھے یا کم از کم وہ اس قسم کے اعلانات متدین اہلِ علم حضرات سے کرائے۔ بایں ہمہ اس دفعہ بعض دیوبندی اور اکثر بریلوی دوستوں نے بے چارے ٹیلیفون اور ریڈیو کی جو گت بنائی ہے، وہ معقول اور پسندیدہ طریق نہیں۔

2 خبر اور شہادت میں واقعی فرق ہے، لیکن جہاں تک کسی معاملے میں کی تصدیق و توثیق کا تعلق ہے، ان دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ فرق اس میں ہے کہ بعض لوگ اگر خبر دیں مقبول ہوگی، لیکن ان کی شہادت مقبول نہیں۔ اکیلی عورت شہادت نہیں دے سکتی، خبر دے سکتی ہے، اس لیے جہاں تک رویتِ ہلال کی توثیق اور تصدیق کا تعلق ہے، اس میں دونوں مفید اور موثر ہیں، لہٰذا شرعاً بعض مواقع پر رؤیتِ ہلال میں خبر سے استفادہ کیا گیا ہے اور بعض اوقات شہادتِ شرعی کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ایک اعرابی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دی کہ میں نے چاند دیکھا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ روزے کا اعلان کر دو۔[1]

فقہائے حنفیہ فرماتے ہیں، یہ شہادت نہیں خبر ہے۔ کاسانی فرماتے ہیں:

"لأن هذا ليس بشهادة، بل هو إخبار بدليل أن حكمه يلزم الشهادة"

(البدائع والصنائع: ۲/ ۸۱)

"یہ شہادت نہیں بلکہ خبر ہے، کیونکہ اس کا اثر خبر دینے والے پر بھی پڑتا ہے۔"

اسی طرح مقذوف اگر چاند ہونے کی شہادت دے تو قبول کر لی جائے گی، کیونکہ یہ خبر ہے، شہادت نہیں، اس سے ظاہر ہے کہ فقہائے عراق کے نزدیک بھی خبر سے چاند کی تصدیق ہو سکتی ہے۔

ایک بہت بڑے بزرگ کے ارشادات بھی سنیے، وہ محلیٰ میں فرماتے ہیں:

"مسئلة ۷۵۷: من صح عنده بخبر من يصدقه من رجل واحد او امرأة واحدة عبد أو حر أو أمة أو حرة فصاعدا أن الهلال قد رأى البارحة في آخر شعبان ففرض عليه الصوم، صام الناس أو لم يصوموا" (محلی ابن حزم: ۲/ ۲۳۵)

"اگر مصدقہ خبر مل جائے کہ ایک مرد یا ایک عورت، غلام یا آزاد نے گزشتہ رات چاند دیکھ لیا ہے تو اس پر روزہ فرض ہے، لوگ روزہ رکھیں یا نہ رکھیں۔"

اس کے بعد فرماتے ہیں:

"امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور امام شافعی رحمہ اللہ رمضان کے چاند میں تو ہمارے ساتھ اتفاق فرماتے ہیں، مگر

[1] سنن أبي داود، رقم الحدیث (۲۳۴۰، ۲۳۴۱) اس حدیث کی سند ضعیف ہے اور یہ روایت بھی مرسل ہے۔

شوال کے متعلق ان کا خیال ہے کہ دو آدمیوں کی شہادت ضروری ہے۔"

ابن حزم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ کھلا ہوا تناقض ہے اور مسئلہ بے دلیل ہے۔ پھر فرماتے ہیں:

"فأما نحن فخبر الكافة مقبول في ذلك، وإن كانوا كفارا أو فساقا، لأنه يوجب العلم ضرورة" (محلی: ۲/ ۲۳٦)

"ہمارے ہاں تو چاند کے معاملے میں فاسق اور کافر کی اطلاع بھی درست ہے، کیونکہ اسی سے بقدرِ ضرورت علم ہو جاتا ہے، بشرطیکہ یہ اطلاع عامۃ الناس دیں۔"

اہلِ علم کی وسعتِ ظرف اور رفعتِ خیال ملاحظہ فرمایئے اور سوچیے کہ آپ کہاں ہیں اور اہلِ علم کی پروازِ تحقیق کہاں؟

ابن حزم رحمہ اللہ کی پوری بحث آثار کے لحاظ سے قابلِ غور ہے۔ انسانی نفسیات کا تقاضا ہے کہ صحیح خبر کو قبول کیا جائے، خواہ کہیں سے بھی آئے۔

مغنی ابن قدامہ کے شارح فرماتے ہیں:

"وإن أخبره برؤية الهلال من يثق بقوله لزمه الصوم، وإن لم يثبت ذلك عند الحاكم، لأنه خبر بوقت العبادة يشترك فيه المخبر والمخبر أشبه الخبر عن رسول الله ﷺ والخبر عن دخول وقت الصلاة" (المغني: ۲/ ۹)

"اگر کوئی ثقہ آدمی چاند کی اطلاع دے تو روزہ واجب ہوگا، گو حاکم اس اطلاع کو مسترد کر دے، کیونکہ یہ عبادت کے وقت کی اطلاع ہے، اس میں خبر دینے والا اور جسے خبر دی گئی ہے، برابر ہیں۔ یہ احادیث روایت کرنے یا نماز کے وقت کی اطلاع دینے کے مشابہ ہے۔" (جس میں صرف موذن کی اطلاع کافی ہوتی ہے)

اس کے بعد فرماتے ہیں:

"اگر یہ اطلاع کسی عورت کی زبانی ہے تو قیاس یہ ہے کہ یہ بھی مقبول ہوگی۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور شافعی رحمہ اللہ کا بھی یہی مذہب ہے۔ (مگر شافعی رحمہ اللہ سے ایک روایت اس کے خلاف بھی ہے) کیوں کہ یہ ایک دینی اطلاع ہے۔ یہ حدیث کی روایت یا سمتِ قبلہ کی اطلاع یا نماز کے وقت کی خبر کے مشابہ ہے، جیسے وہاں صرف خبر کافی ہے، چاند کے متعلق بھی خبر ہی کافی ہے۔"

آج کل بڑے شہروں میں سائرن کی آواز اور قصبات میں موذن کی آواز یا نوبت کی آواز پر روزہ رکھا

اور افطار کیا جاتا ہے۔ یہ خبر ہے، شہادت نہیں۔ فقہائے حنابلہ کے نزدیک ہلال کا معاملہ بھی بعض وقت اسی نوعیت کا ہوتا ہے۔ بعض ائمہ نے بڑی صراحت سے خبر کی حجیت کا اعتراف فرمایا ہے۔ وہ ہلال کے بارے میں ایک شہادت کے متعلق جس قدر احادیث آئی ہیں، انھیں خبر پر محمول فرماتے ہیں اور اسے شہادت سمجھتے ہی نہیں۔ فقہائے عراق بھی اس توجیہ میں پیش پیش ہیں، جیسا کہ سابقہ منقولات سے ظاہر ہے اور فقہائے اہلِ حدیث بھی اس مسئلے میں فقہائے عراق رحمہم اللہ کے ہم نوا ہیں۔

خطابی فرماتے ہیں:

"وقد روي عن عمر بن الخطاب من طريق عبد الرحمن بن أبي ليلى أنه أجاز شهادة رجل في أضحى أو فطر، و مال إلى هذا القول بعض أهل الحديث، وزعم أن باب رؤية الهلال باب الإخبار فلا يجري مجرىٰ الشهادات، ألا ترى أن شهادة الواحد مقبولة في رؤية هلال شهر رمضان فكذلك يجب أن تكون مقبولة في هلال شهر شوال" (معالم السنن: ۲/ ۱۰۱)

"عبد الرحمٰن بن ابی لیلیٰ سے مروی ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عید الاضحیٰ یا عیدِ فطر کے چاند میں ایک آدمی کی شہادت کو قبول فرمایا۔ بعض اہلِ حدیث کا بھی یہی خیال ہے کہ رؤیتِ ہلال کا مسئلہ از قبیلِ اخبار ہے، از بابِ شہادت نہیں، اس لیے اس میں شہادت کی پابندیاں ملحوظ نہیں رکھی جا سکتیں۔ جس طرح رمضان میں ایک آدمی کی شہادت مقبول ہے، شوال کے چاند میں بھی اسے مقبول ہونا چاہیے۔"

گویا احناف، اہلِ حدیث، حنابلہ؛ ہلالِ رمضان کے متعلق خبر ہی کو کافی سمجھتے ہیں۔ عام حالات میں اس کے لیے شہادت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ خطابی کا خود رجحان چونکہ موالک کی طرف ہے، اس لیے وہ اپنا اختلاف ظاہر فرمانے کے بعد فرماتے ہیں:

"لكن بعض الفقهاء ذهب في أن رؤية هلال شهر رمضان خصوصا من باب الإخبار، وذلك لأن الواحد العدل فيه كاف عند جماعة من العلماء" (معالم السنن: ۲/ ۱۰۱)

"لیکن بعض فقہا ہلالِ رمضان کا مسئلہ اخبار ہی کی قسم سے سمجھتے ہیں، اسی لیے ایک شہادت پر کفایت فرماتے ہیں، گویا ان کے نزدیک اطلاع خبر کی قسم سے ہے۔"

پھر (۲/۱۰۲) فرماتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے نزدیک ہلالِ رمضان کے متعلق ایک ہی آدمی کی شہادت کافی ہے، اگرچہ وہ غلام ہو یا لونڈی، اسی طرح ایک عورت کی شہادت بھی کافی سمجھتے

ہیں۔ امام ظاہر روایت کے خلاف مرد، عورت، غلام، لونڈی، عادل، غیر عادل میں اطلاع کو کافی سمجھتے ہیں، کیونکہ یہ دراصل شہادت ہے ہی نہیں، بلکہ خبر اور اطلاع ہے۔

ان نقول سے واضح ہوتا ہے کہ ہلالِ رمضان کے لیے شہادت ضروری نہیں، البتہ فقہائے حنفیہ کے نزدیک ظاہر روایت کے مطابق مخبر کا ثقہ ہونا ضروری ہے، لیکن امام طحاوی یہ بھی ضروری نہیں سمجھتے۔

ایک لطیفہ:

اس قسم کے مضامین میں شاید مقامی تذکرہ بھلا نہ لگتا ہو، لیکن بطورِ لطیفہ اور واقعہ کے یہ غالباً نامناسب بھی نہ ہوگا کہ بعض اچھے بھلے اہلِ علم اور سمجھ دار حضرات پر بھی ٹیلی فون وغیرہ کی خبر سے کس قسم کی کیفیت طاری ہوجاتی ہے۔

معلوم ہے اس سال ۲۹ ر رمضان کو مطلع ابر آلود تھا۔ چاند کے متعلق تشویش تھی۔ عشا کی نماز پڑھ رہے تھے کہ ریڈیو نے اطلاع دی کہ کراچی میں چاند ہوگیا ہے۔ تقریباً بارہ تیرہ آدمی ہمارے ہاں مسجد میں اعتکاف کر رہے تھے۔ وہ اعتکاف ختم کرنے کے لیے دریافت کر رہے تھے۔ میں اس قدر ذمے داری لینے کے لیے تیار نہ تھا، اس لیے کوشش کی کہ لاہور یا کراچی سے رابطہ قائم کیا جائے اور صورتِ حال دریافت کی جائے۔ پوری کوشش کے باوجود کراچی سے رابطہ قائم نہ ہو سکا۔ دفتر مرکزی جمعیت اہلِ حدیث میں صدرِ محترم مولانا سید محمد داود صاحب غزنوی (صدر مرکزی جمعیت اہلِ حدیث) رات کو تقریباً گیارہ بجے مل سکے۔ مولانا نے فرمایا: جامعہ اشرفیہ کے مہتمم مولانا مفتی محمد حسن صاحب اور مولانا مفتی محمد جمیل کے پاس قابلِ اعتماد شہادت آ گئی ہے، اس لیے مولانا ابوالبرکات صاحب کے سوا پورے لاہور میں ہفتے کے دن عید کا فیصلہ ہوگیا ہے۔ اس ساری گفتگو میں مولانا عبدالواحد صاحب (خطیب جامع مسجد گوجرانوالہ) وہیں موجود تھے۔ میں نے انھیں پیغام بھیج کر بلا لیا تھا کہ جو فیصلہ ہو؛ اتفاق سے ہو۔ میں نے رسیور مولانا عبدالواحد صاحب کو دے دیا تاکہ مولانا خود مولانا غزنوی سے براہِ راست گفتگو فرما لیں۔ میں نے اس کے بعد مولانا عبدالواحد صاحب سے عرض کیا کہ اب تو شرعاً عید کا فیصلہ ہفتے کے دن ہوجانا چاہیے۔ مولانا نے فرمایا: ہاں مجھے تو یقین ہوگیا، لیکن ذرا معاملہ شریعت کے مطابق ہوجائے۔ میں مولانا کی یہ بات سمجھ نہ سکا کہ اب شریعت کے ساتھ مطابقت کا کیا مطلب ہے؟

میں خاموش رہا۔ ایک بہت بڑا ہجوم یہ گفتگو سن رہا تھا، ان سب نے کہنا شروع کر دیا کہ عید کل ہوگی۔

صبح مجھے یہ سن کر تعجب ہوا کہ مولانا عبدالواحد صاحب دو تین حضرات کے ہمراہ رات لاہور گئے اور مولانا مفتی محمد جمیل صاحب سے مل کر اُن کی زبانی چاند دیکھنے کی اطلاع لائے، پھر ان کو اطمینان ہوا۔

میں اسے لطیفہ سمجھتا ہوں۔ مولانا عبدالواحد صاحب پڑھے لکھے سمجھ دار آدمی ہیں۔ اب دو ہی باتیں ہو سکتی ہیں، یا تو مولانا کو مولانا سید محمد داود غزنوی رحمہ اللہ پر اعتماد نہیں تھا یا پھر فون کے بجائے مولانا محمد جمیل صاحب

سے بالمشافہہ بات سننا چاہتے تھے۔ میری رائے میں اس توثیق کی حیثیت وہم سے زیادہ نہیں۔ فون پر آواز پہچان کر لاہور جانا، پھر اسے شریعت کی مطابقت سے تعبیر کرنا؛ ایک پڑھے لکھے سنجیدہ آدمی کے لیے نامناسب ہے اور اگر یہ فون سے گھبراہٹ ہے تو اور بھی معیوب اور مضحکہ خیز ہے، پھر یہاں کے بریلوی بزرگ، جنھوں نے یکم رمضان المبارک کو جمعہ کے دن روزے تڑوائے تھے، وہ اپنے ایک مرید کی جیپ لے کر لاہور گئے اور اپنے کسی بریلوی بزرگ سے مل کر عید لائے اور تقریباً سات بجے تک ان کے مقتدی روزے سے رہے۔ ان کی اپنی بریلوی عید بریلوی جیپ میں سوار ہو کر آئی تو ان بے چاروں کی جان میں جان آئی۔

علما میں یہ تعصب، باہم بے اعتمادی اور بغض یا پھر وہم پرستی اور ریڈیو یا فون کے نام سے دشمنی؛ نہ کوئی علمی کارنامہ ہے نہ عقل و شعور کا تقاضا۔ حضرات علما ہی وسعتِ ظرف کے داعی ہیں، یہی توہمات میں مبتلا ہو جائیں تو عوام کا خدا حافظ!

ان حالات میں پڑھے لکھے اور باشعور حضرات ان توہم پرستوں کا اگر مذاق اڑائیں تو وہ حق بجانب ہیں۔ بریلوی حضرات سے تعجب نہیں، لیکن حضراتِ دیوبند کی یہ ریڈیو یا فون دشمنی میری سمجھ میں بالکل نہیں آتی۔ اللهم وفقنا لما تحب وترضى.

3 آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے:

«والفطر يوم تفطرون، و الأضحٰى يوم تضحون»[1] (ترمذي)

یعنی بادشاہ یا عامۃ المسلمین جب افطار کا فیصلہ کر لیں یا عید منائیں تو ان کے ساتھ اتفاق کرنا چاہیے۔

حافظ مقدسی مغنی کی شرح میں فرماتے ہیں:

وعنه رواية ثالثة أن الناس تبع للإمام، فإن صام صاموا، وإن أفطر أفطروا، وهو قول الحسن وابن سيرين، لقول النبي ﷺ: «الصوم يوم تصومون والفطر يوم تفطرون والأضحٰى يوم تضحون» قيل معناه: إن الصوم والفطر مع الجماعة ومعظم الناس. قال الترمذي: حديث حسن غريب" (المغني مع الشرح: ٣/ ٥)

"لوگ اس معاملے میں امام کے تابع ہیں۔ متذکرہ صدر حدیث کا یہی مطلب ہے کہ عوام اور امیر المسلمین کے ساتھ اتفاق کرنا چاہیے، اختلاف اور تفریق پیدا کرنے سے بچنا چاہیے۔"

مقصد شارع حکیم کا یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلے میں تفریق پسند ذہن اسلام کے خلاف ہے۔ اگر عامۃ المسلمین روزہ رکھ لیں تو تڑوانا درست نہیں اور اگر عید سمجھ کر افطار کر لیں تو ان کو روزے پر مجبور نہیں کرنا چاہیے۔

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٦٩٧) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٦٦٠)

ہمارے ہاں گوجرانوالہ کے ایک بریلوی مولوی صاحب نے کراچی کی صحیح اطلاع کے باوجود روزے تڑوا دیے تھے۔ وہ اپنے ضمیر کی چوری اور اپنی غلط روش کو چھپانے کے لیے اشتہاروں کی بھرمار کر رہے ہیں، گویا وہ اپنی غلطی کے خلا کو اشتہاروں سے پُر فرما رہے ہیں اور وہ یہ ثابت کرنے کی کوشش فرما رہے ہیں کہ ایک صحیح اطلاع چونکہ ریڈیو یا فون کے ذریعے سے آئی ہے، اس لیے چاند ہوا ہی نہیں۔

گویا ایک صحیح واقعہ اگر ان آلات کی معرفت معلوم ہو جائے تو وہ واقعہ واقعہ ہی نہیں ہوتا۔ اگر تار یا فون کی معرفت کسی کی موت یا پیدایش کی اطلاع آ جائے تو حضرت مولانا کے نزدیک یہ واقعہ ہوا ہی نہیں، نہ کوئی مرا، نہ کوئی پیدا ہوا۔ ایسے عقلمندوں کا خدا حافظ![1]

عید اور وحدتِ ملت:

۲۹؍ رمضان کے ریڈیو سے معلوم ہوا کہ ڈھاکہ میں چاند نظر نہیں آیا، لیکن کمشنر صاحب مشرقی پاکستان نے وہاں بھی عید کا اعلان کر دیا۔ معلوم نہیں کیوں کیا گیا؟

بات یہ ہے کہ اختلافِ مطلع ایک حقیقت ہے۔ وحدتِ ملت کی دلیل صرف عید ہی کو تصور کرنا حقائق سے مطابقت نہیں۔ اگر ڈھاکہ میں عید اتوار کو ہو جاتی تو اس سے ملت کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ موسمیات کے محکمہ ہی سے دریافت فرمائیے، اگر ڈھاکہ کا مطلع مغربی پاکستان سے مختلف ہے تو ان لوگوں کو عید پر کیوں مجبور کیا جائے؟ کمشنر صاحب ہزاروں روزے تڑوانے یا رکھنے کا گناہ اپنے ذمے کیوں لیں؟ یہ نہ شرعاً درست ہے نہ عقلاً۔ محکمہ موسمیات اس کا فتویٰ نہیں دے سکتا ہے۔

مسلمان بحمد اللہ پوری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں، ان سب کا ایک دن عید منانا ممکن ہی نہیں اور نہ یہ وحدت شرعاً مطلوب ہے۔ حجاز، مصر اور شام میں عید جمعہ کو ہو تو وحدتِ ملت کو کچھ نقصان نہیں۔ ڈھاکہ میں چاند نظر نہ آنے کی وجہ سے اگر عید اتوار کو ہو تو اس میں وحدتِ ملت کو کون سا نقصان پہنچ سکتا ہے؟ بلکہ وحدتِ ملت اس میں ہے کہ ملت کے اَحکام اور قواعد کی صحیح پابندی کی جائے۔ دانشمندی یہ ہے کہ جب اتنی دور کے منطقہ میں چاند نظر نہیں آیا تو معاملے کو اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ طے شدہ مسائل کے خلاف پبلک سے کچھ کہنا حکومت کے وقار کا تقاضا ہرگز نہیں۔[2]

---

[1] ان سطور میں بعض علمائے کرام کی طرف سے دینی معاملات پر غور و فکر کا جو انداز سامنے آتا ہے، وہ یقیناً ان حضرات کے شایانِ شان نہیں، لہٰذا اس آئینے میں اپنی تصویر دیکھنے کے بعد علما کو چاہیے کہ جدید اَحوال و ظروف میں مسائلِ دین کی تعبیر، جس علم و تحقیق اور وسعتِ ظرف کا تقاضا کرتی ہے، وہ اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کریں، تاکہ امتِ مسلمہ کی نگاہ میں ان کا اعتماد اور ان کے منصب کی افادیت برقرار رہ سکے۔ [مولف]

[2] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۷؍ اپریل ۱۹۶۷ء)

مرزا غلام احمد صاحب
معمولی اخلاق کی روشنی میں

نبوت انسانی کمالات کا آخری زینہ ہے، اس لیے پیغمبر کو جہاں وہ خوبی اور خصوصیت عطا فرمائی جاتی ہے، جسے نبوت سے تعبیر فرمایا گیا ہے، وہاں سے وہ کمالات بھی عطا ہوتے ہیں، جو ایک کامیاب انسان کے لیے ضروری ہیں۔

ایک نقاد جہاں اسے انبیا کے معیار سے پرکھنے کا حق رکھتا ہے، وہاں اسے اچھے، کامیاب اور شریف انسانوں کے معیار سے بھی پرکھ سکتا ہے، بلکہ انسانی شرافت کے معیار پر اگر کوئی شخص کامیاب نہ ہو سکے تو معیارِ نبوت پر پرکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سابقہ انبیا اور ان کی قوموں کے واقعات قرآنِ عزیز میں بکثرت موجود ہیں، مخالفین نے نامناسب القاب سے پیغمبر کو مخاطب کیا، مگر پیغمبر نے نہ کبھی گالیاں دیں اور نہ ہی اپنے مخالفین کو غیر موزوں القاب سے مخاطب فرمایا۔

خدا تعالیٰ کا پیغام سخت الفاظ میں ہو یا اس کا لب و لہجہ رحمت آمیز ہو، بہر حال پیغمبر فریضۂ رسالت کو انجام دے گا۔ پیغامبری کے فرائض میں وہ کبھی کوتاہی نہیں کرتا، لیکن اپنی ذات کے لیے اس کے مزاج میں انتقام کا خفیف سے خفیف جذبہ بھی نہیں پایا جاتا۔

- "ما انتقم رسول الله لنفسه قط"[1] (مسلم)

"آنحضرت ﷺ نے اپنا ذاتی بدلہ کبھی کسی سے نہیں لیا۔"

- "لم يكن فاحشا ولا متفحشاً"[2] (ترمذي)

"آنحضرت ﷺ نہ عادتاً فحش کہتے اور نہ تکلف سے ہی کبھی ایسا کرتے۔" اللهم صل وسلم عليه وعلىٰ آله وأصحابه أجمعين.

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٤٠٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٢٧)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٣٦٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٢١) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٠١٦)

حسنِ خلق عام انسانی شرافت کا ایک معیار ہے، لیکن پیغمبر میں اس خوبی کا ہونا اور بھی ضروری ہے۔ اگر کوئی نبوت کا مدعی عام شرافت کے معیار پر بھی پورا نہ اترے تو اس کی نبوت سے بحث کرنا بے ضرورت مشغلہ ہوگا اور بس!

مرزا غلام احمد صاحب قادیانی شروع میں مناظر تھے۔ اگرچہ ان کا مناظرانہ مذاق بھی کچھ بلند نہ تھا، تاہم وہ آب و ہوا اور موسم کے لحاظ سے پنڈت دیانند اور پادری آتھم صاحب سے کسی طرح کم نہ تھے۔ ایک کھاتے پیتے خاندان میں، جس نے انگریز کی حمایت میں اکثر دادِ شجاعت دی ہو، اگر کوئی نوجوان لکھنے پڑھنے کی مشق بہم پہنچا لے تو اس کے دماغی توازن پر جو متکبرانہ اثر ہوسکتا ہے، وہ ظاہر ہے۔ مرزا صاحب جب مخالفین کے خلاف کچھ لکھتے یا فرماتے تو ان کی تقریر و تحریر میں ایک فوجی خاندان کی سی تعلیاں کافی حد تک نمایاں ہوتیں۔ تبلیغ و اِشاعت کی چند حقیر کوششوں کے بعد انھیں مجدد بننے کی آرزو ہوئی اور مہدی بننے کے لیے بھی انھوں نے ہاتھ پاؤں مارے۔ جے سنگھ بہادر بننے کی بھی سعی فرماتے رہے۔ آخر میں انھوں نے نبوت کو شرفِ قبول بخشا اور ختمِ نبوت کی دیوار کو نقب لگانے کا فیصلہ فرما لیا۔

ان دعاوی پر الگ الگ بحث طولِ عمل ہوگا۔ کتاب و سنت کی نصوص اور ان کی تاویل و توجیہ جو ہمارے قادیانی دوست فرماتے ہیں، شاید ناظرینِ ''الاعتصام'' کو اس سے چنداں دلچسپی نہ ہو۔

مرزا صاحب اور عام انسانی شرافت:

اس لیے مناسب ہوگا کہ مناظرانہ انداز سے بچتے ہوئے انھیں عام اخلاقی معیار پر سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ مجھے احمدی دوستوں سے اُمید ہے کہ عصبیت سے الگ ہو کر وہ مرزا صاحب کو سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ ممکن ہے کہ انھیں انبیا کے معیار پر پرکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہو!

میں نے عرض کیا ہے کہ انبیا اپنے مخالفین کو گالیاں نہیں دیتے۔ انھیں لغت پر اتنا عبور ہوتا ہے کہ اظہارِ مطلب کے لیے بہتر سے بہتر الفاظ مہیا فرما لیتے ہیں، لیکن افسوس ہے کہ مرزا صاحب زبان کے استعمال میں کچھ زیادہ کامیاب نہیں ہیں۔ وہ جب ناراض ہوتے ہیں تو گالیاں دینا شروع کر دیتے ہیں اور گالیاں بھی گھٹیا قسم کی:

''حرامی''، ''حرامزادہ''، ''حلال زادہ نہیں''، ''ولد الحلال نہیں''، ''ولد الحرام بننے کا شوق''، ''نیک زادہ''۔

رسالہ ''انوار الاسلام'' (ص: ۲۷، ۲۸، ۳۲، ۳۴، ۴۰، ۴۱) میں ان الفاظ کا تذکرہ مرزا صاحب نے بار بار کیا ہے۔

❁ ایک مقام پر فرماتے ہیں:

''کون اس فیصلے کے لیے بلا توقف سعی کرتا ہے اور کون ولد الحرام بننے پر راضی ہوتا؟'' (ص: ۴۱)

✿ البدر (۲۰ر دسمبر ۱۹۰۶ء، ص: ۵، کالم: ۳) نور القرآن حصہ دوم میں فرماتے ہیں:

''یہ نہایت شرارت اور خباثت اور حرامزادگی ہے۔''

✿ اشتہار ملحقہ شہادۃ القرآن انگریزوں سے جہاد کا ذکر فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس سے انگریزی حکومت نے جہاد کیا۔ میں سچ سچ کہتا ہوں کہ محسن کی بدخواہی کرنا ایک حرامی اور بدکار آدمی کا کام ہے۔''

✿ منشی سعد اللہ مرحوم لدھیانوی کے متعلق لکھا: ''یا ابن بغاء'' (تتمہ انجام آتھم، ص: ۲۸۲)

تتمہ حقیقۃ الوحی (ص: ۲۰) میں اس کا ترجمہ بھی کر دیا ہے: ''بازاری عورت کا بیٹا''

احمدی مناظر اسے باغی سے مشتق کہا کرتے ہیں۔ مرزا صاحب کے ترجمے سے یہ توجیہ بھی ختم ہو جاتی ہے۔ آئینہ کمالات میں مولانا محمد حسین صاحب بٹالوی کے متعلق بھی یہی الفاظ کہے گئے ہیں۔

آئینہ کمالاتِ اسلام (ص: ۴۳۵) میں اپنے تمام مخالفین کو مخاطب فرماتے ہیں:

"كل مسلم يقبلني ويصدق دعوتي إلا ذرية البغايا"

''ہر مسلمان میری دعوت کو قبول کرتا ہے، مگر بازاری عورتوں کی اولاد اسے قبول نہیں کرتی۔''

مخالفین پر ناراضگی تو ہو سکتی ہے۔ ایک عامی آدمی کا مزاج کنٹرول سے باہر ہو جائے، ممکن ہے، لیکن شرافت سے اتنا گرے کہ گالیاں دینا شروع کر دے، یہ حرکت ایک شریف انسان سے سرزد نہیں ہو سکتی۔

جو گالیاں مرزا صاحب کے کلام میں عموماً استعمال ہوئیں، ان کی کوئی توجیہ سمجھ میں نہیں آ سکی۔ احمدی دوست اکثر اپنے عقیدے سے بے خبر ہیں۔ جب ان سے مسیح کی موت کے سوا کوئی دوسرا مسئلہ دریافت کیا جائے تو ان کا پارہ فوراً تیز ہو جاتا ہے۔ تقلیدِ جامد کا نتیجہ یہی ہو سکتا ہے، اس لیے وہ حقیقت تک پہنچنے سے پہلے لڑائی جھگڑے کی صورت پیدا کر لیتے ہیں۔ سوچنا یہ ہے کہ اگر یہ فحش گوئی مطلب سمجھے بغیر کوئی عامی آدمی کر لے تو کہا جا سکتا ہے کہ جہالت کا تقاضا ہے، لیکن ایک پڑھے لکھے شریف آدمی کے منہ سے یہ لفظ نکلے، وہ کسی کو حرامی یا حرامزادہ کہے اور اسے اس کا یقین نہ ہو تو جھوٹا ہوگا۔ اسے حدِ قذف میں اسی درے لگیں گے۔ اگر یہ واقع صحیح ہو تو زانی رجم یا دروں کا مستحق ہوگا۔ یہ ایسا لفظ نہیں کہ اسے بے سوچ کہا جائے۔ تحسبونه هينا وهو عند الله عظيم.

پھر اس لفظ کو بظاہر عقیدے سے کوئی تعلق نہیں۔ ایک کافر صحیح النسب ہو سکتا ہے اور ایک مسلمان نسبتاً مشکوک ہو سکتا ہے۔ آج ایک احمدی مسلمان ہو جائے تو وہ احمدی نقطۂ نظر سے کافر و مرتد ہو سکتا ہے، لیکن نسب پر اس کا کوئی اثر نہیں ہو سکتا۔ آج خلیفہ محمود اس نتیجے پر پہنچیں کہ مرزا صاحب اپنے دعاوی میں سچے نہ تھے، اس

سے انکار مذہب غلط، عقیدہ خراب تو کہا جا سکتا ہے، لیکن ان کے نسب پر طعن نہیں کیا جا سکتا۔ مرزا سلطان احمد مرزا صاحب کے بڑے بیٹے تھے۔ وہ احمدی نہیں تھے، لیکن ہم ان کے نسب پر شبہہ نہیں کر سکتے۔ مرزا غلام احمد کے والد بزرگوار مرزا غلام مرتضیٰ مرزا صاحب کی نبوت پر ایمان نہیں لا سکے۔ وہ اپنے فرزندِ ارجمند کے ان دعاوی کی بلندیوں کو ملاحظہ نہیں فرما سکے۔ وہ عام مسلمانوں کی طرح احمدیت سے کافر ہوں، ہوسکتا ہے، لیکن ان کے نسب کی صحت پر شبہہ نہیں ہوسکتا۔

اسی طرح مولوی سعد اللہ مرحوم مرزا صاحب کا انکار کریں، ان کے نسب پر شبہہ نہیں کیا جا سکتا۔ مولانا محمد حسین، پادری آتھم، تمام وہ مسلمان جو مرزا صاحب کو اپنے دعاوی میں سچا نہیں مانتے، ان پر ایک احمدی کفر کا فتویٰ دے سکتا ہے، لیکن ان کے نسب پر طعن نہیں کر سکتا۔

اِزالہ اوہام (ص: ۷۲۳، ۷۲۴) میں ۱۸۵۷ء کے انقلاب کا ذکر فرما کر مرزا صاحب فرماتے ہیں:

''ان لوگوں نے چوروں، قزاقوں اور حرامیوں کی طرح اپنی محسن گورنمنٹ پر حملہ کرنا شروع کیا۔''

۵۷ء کی تحریک کیا تھی؟ مجھے اس پر کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ وہ مقدس قربانیاں اس امر کی محتاج نہیں کہ انگریز کے خود کاشتہ پودے ان کی تقدیس کریں۔ دہلی اور میرٹھ کی سرزمین خود اس کی شاہد ہے اور رب السموات ان کی پاکیزگی کا گواہ۔ مجھے یہ سوچنا ہے اور اپنے احمدی دوستوں سے دریافت کرنا ہے کہ ۵۷ء کے مجاہدین نے کون سی چوری کی؟ وہ کیوں قزاق بنے اور انھوں نے کون سی حرام کاری کی؟ ایک نبوت کا مدعی، تجدید کا دعویٰ کرنے والا اور مہدیت کی بلندیوں پر سرفرازی کا خواہشمند اس قدر خلافِ واقعہ کیوں لکھے؟ اگر اس کا دماغ درست ہے تو دو ہی صورتیں سمجھی جا سکتی ہیں، یا تو وہ جھوٹ بولتا ہے یا بداخلاق ہے۔ جس شخص کا اخلاق اتنا پست ہو، جس کی زبان عام شریف انسانوں کی شرافتوں سے بھی فروتر ہو، اسے نبی، مجدد یا مہدی کیونکر مانا جائے؟ إن في ذلك لعبرة!![1]

---

[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۲۱ر اپریل ۱۹۵۰ء)

مرزا غلام احمد قادیانی

اپنے دعاوی کی روشنی میں

مرزا غلام احمد قریباً ۱۸۴۰ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مرزا حکیم غلام مرتضیٰ معمولی قسم کے طبیب تھے۔ اپنے حالات کی وجہ سے نہ تو وہ مرزا صاحب کو دینی تعلیم کسی اچھی درس گاہ میں دلوا سکے نہ دنیوی تعلیم کے لیے کسی سکول یا کالج کا رُخ کر سکے۔ مختصر سا مطب اور ایک معمولی طبیب اُس وقت کی تعلیم کے مصارف کہاں برداشت کرسکتا تھا؟

ابتداءً سادہ قرآن مجید پڑھنے کے بعد ادھوری سی طب پڑھائی، اس کے بعد اپنے خاندان میں اپنے حقیقی ماموں کی بیٹی مسماۃ حرمت بی بی سے شادی ہوگئی اور اٹھارہ انیس سال کی عمر میں ایک شیعی المذہب معلم محمد گل علی سے منطق وغیرہ کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ مرزا صاحب کا بڑا لڑکا سلطان احمد اسی حرمت بی بی کے بطن سے تھا۔ اس کے بعد مرزا غلام احمد صاحب تلاشِ معاش کے سلسلے میں لاہور، امرتسر، سیالکوٹ وغیرہ کی طرف نکل گئے۔

سیالکوٹ میں مرزا صاحب کے ایک ہندو دوست لالہ بھیم سین تھے۔ ان کی وساطت سے سیالکوٹ کچہری میں عرضی نویسی کرنے لگے اور لالہ بھیم سین سے مل کر مختار کا امتحان دیا۔ لالہ بھیم سین کامیاب ہوگئے اور مرزا صاحب فیل ہوئے۔ اسی افسوس میں عرائض نویسی بھی چھوڑ دی اور واپس قادیان چلے گئے۔

ان دنوں لاہور، امرتسر میں آریہ سماج کا بڑا زور تھا۔ پنڈت دیانند لیکھ رام وغیرہ سماجی مبلغین نے کہرام مچا رکھا تھا۔ مولانا محمد حسین صاحب بٹالوی اور دوسرے علمائے اسلام، سماجی پرچاریوں سے تحریری مناظرات اور تقریری گفتگوئیں کرتے رہتے تھے۔ مرزا صاحب دراصل کوئی آسان کام کرنا چاہتے تھے، جس سے آمد زیادہ ہو اور مغل نوابوں کے انداز سے زندگی بسر کرسکیں، اس لیے ان کی نگاہ میں پیری مریدی بہتر پیشہ تھا، چنانچہ دعوائے تجدید کے ایام میں ایک دفعہ ہوشیار پور گئے اور چلا کشی کی، لیکن اس میں بھی اس فن کے ماہرین کے سوا کامیابی مشکل ہوتی ہے۔ اسے ادھورا چھوڑ کر مذہبی چیر پھاڑ کی طرف توجہ کی۔ دعوائے تجدید اور الہامات پر قسمت آزمائی شروع کی۔ علومِ دین، منطق، فلسفہ، طب، تصوف: سب اُدھورے تھے۔ اس کم علمی

اور ادھورا پن کا اثر مرزا صاحب کی پوری زندگی میں نمایاں رہا۔

مرزا صاحب نے ذاتی مطالعے سے کچھ عربی، کچھ فارسی اور دینیات کی بعض کتابوں پر عبور حاصل کر لیا تھا، مگر نہ تربیت صحیح تھی نہ فارسی اچھی لکھ سکتے تھے، بلکہ ان زبانوں میں ان کے مرید مولوی عبدالکریم اَعرج، مولوی محمد احسن امروہی، مولوی غلام رسول راجیکی اور حکیم نور دین وغیرہ ان سے بہتر لکھ سکتے تھے۔ مرزا صاحب کے اکثر مضامین ان کی لفظی اور معنوی نظر ثانی کے بعد پریس میں جاتے تھے۔ اس کے باوجود کبھی نظر ثانی رہ جاتی اور الہام کی ساخت چونکہ مرزا غلام احمد کی ہوتی، اس لیے الہامات غلط نکلتے۔ ان کی مرمت اور تاویل کے لیے قادیانی عوام اور علما کو بڑی دقت ہوتی، جس کا اثر خود مقامِ نبوت پر بھی پڑتا۔ مرزا صاحب کے عقیدت مند نبوت کو مجموعہ شکوک و تاویلات سمجھتے اور مرزا صاحب کی آبرو کو قائم رکھنے کے لیے کمزور اور پھسپھسی تاویلات کرتے۔ عیسائیوں سماجیوں کی مجالس میں تمام انبیا کا مذاق اڑایا جاتا۔

ہمارے ہاں گوجرانوالہ میں ایک میاں نصیر الدین بڑے پختہ قادیانی تھے اور مرزا صاحب کے بڑے عقیدت مند تھے۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ مرزا صاحب کا پہلے انبیائے حق سے مقابلہ درست نہیں۔ مرزا صاحب تھرڈ کلاس نبی تھے۔ کوئی پیش گوئی سمجھ میں ہی نہیں آتی۔ کوئی غلط نکلی، کوئی درست ہوگئی، اس لیے مرزا صاحب کی ہر پیش گوئی کو سچ ثابت کرنے کی کوشش کرنا بے فائدہ ہے اور نبیوں کی یہ کلاس پرانی ہے، اب بظاہر مرزا صاحب سے شروع ہو رہی ہے، اس لیے پہلے انبیا سے مقابلہ کر کے پہلے صادق انبیا کو نیچے لانا یا مرزا صاحب کو اوپر لے جانے کی کوشش کرنا بالکل بے معنی اور وقت کو ضائع کرنا ہے۔ سابقہ انبیا کا مقام اور ہے اور مرزا صاحب اور ان کی کلاس کا مقام اور۔ وہ اسی تقسیم سے بڑی جلدی پیچھا چھڑا لیتے تھے۔

ہم تو انبیا علیہم السلام کو کلی طور پر سچا سمجھتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ سچے نبی کی کوئی پیش گوئی بھی غلط نہیں ہوسکتی، ورنہ قرآنِ عزیز کے ارشاد: ﴿ثُمَّ صَدَقْنَاهُمُ الْوَعْدَ﴾ [الأنبياء: ٩] کا کچھ مطلب نہیں رہے گا، مگر قادیانی حضرات میاں نصیر الدین صاحب کی تشریح کو اگر قبول کر لیں تو کم از کم انھیں توہینِ انبیا کا مرتکب نہیں ہونا پڑے گا۔

چند مثالیں:

1 معلوم ہے مرزا صاحب کی پہلی شادی مسماۃ حرمت بی بی سے قریباً ۱۸۵۴ء میں ہوئی اور پھر ۱۸۵۶ء میں خان بہادر مرزا سلطان احمد ان کے بطن سے پیدا ہوئے، پھر اس کے ہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی اور بیچاری معلقہ رہی۔ ایک پیغمبر کے لیے اس قسم کی بے انصافی کس قدر معیوب ہے؟ جو شخص خدا تعالیٰ کی طرف سے انسانی حقوق کے تحفظ کے لیے آیا ہو، وہ خود انسانی حقوق کی اِضاعت کا مجرم ہو، پھر سگے ماموں کی لڑکی،

صلہ رحمی کے لحاظ سے بھی یہ کبیرہ گناہ ہے۔

اب ہمارے قادیانی دوست مرزا صاحب کو بچانے کے لیے کبھی حضرت ابراہیم اور حضرت ہاجرہ کی آڑ لیتے ہیں، کبھی حضرت لوط اور حضرت نوح علیہ السلام کی بیویوں کی بحث چھیڑ لیتے ہیں، اس سے بہتر ہے کہ وہ اپنے لیے ان کوئی قسم تصور کریں۔

2 پھر مرزا غلام احمد صاحب نے اپنی دوسری اہلیہ نصرت جہاں بیگم کی خوشنودی اور مرزا سلطان احمد اور اس کی والدہ کو اپنے ترکے سے محروم کرنے کے لیے ایک حیلہ بنایا، جس کی تفصیل اس طرح ہے کہ مرزا صاحب نے اشتہار دیا کہ میں اسلام کی مدد کے لیے تیس جلدوں میں ایک کتاب لکھ رہا ہوں، جس کا نام ''براہین احمدیہ'' ہوگا، لیکن اس کی اشاعت کے لیے میرے پاس پیسے نہیں، اس لیے میں اپنی تمام زمین مکان وغیرہ منقول جائیداد اپنی اہلیہ نصرت جہاں کے پاس اس شرط پر رہن رکھتا ہوں کہ اگر میں یہ جائیداد مدت مقررہ میں فک نہ کر سکا تو اسی زرِ رہن مبلغ دس ہزار روپے میں بحق نصرت جہاں بیگم بیع تصور ہوگی۔ اس وقت یہ قانون ''بیع بالوفاء'' کے نام سے رائج تھا، جسے غالباً انگریزی حکومت نے بھی ظالمانہ سمجھ کر منسوخ کر دیا، مگر مرزا صاحب نے اس سے فائدہ اٹھا کر اپنی پہلی اولاد کو محروم کر دیا۔

ہمارے قادیانی دوست مرزا غلام احمد کے اس کردار کو درست ثابت کرنے کے لیے ایسی توجیہات بیان کرتے ہیں، جس سے مرزا غلام احمد تو کیا بچیں گے، پہلی نبوتوں اور سابق انبیا علیہم السلام کے مقام پر بھی حرف آتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

''جو شخص کسی جائز وارث کو محروم کرے، وہ جنت کی بو نہیں پائے گا۔''

قادیانی حضرات کبھی تو یہ فرماتے ہیں کہ مرزا سلطان احمد آخر عمر میں قادیانی ہوگیا تھا۔ کبھی فرماتے ہیں: وہ اگر قادیانی ہو جاتا تو اسے ضرور جائداد کا حصہ ملتا۔ کبھی فرماتے ہیں: نبیوں کی جائیداد نہیں ہوتی، وہ جو چھوڑیں صدقہ ہوتا ہے، لیکن مرزا صاحب کی ساری جائیداد ان کی ثانوی اولاد نے سنبھال لی، پہلی اولاد کو کچھ نہیں ملا۔ بہتر ہے کہ مرزا غلام احمد کو نئی قسم کی چیز سمجھ لیا جائے، وہ جو چاہیں کریں، ان پر الزام نہ ہو اور سابق انبیا علیہم السلام قادیانی الزامات سے محفوظ رہیں۔

3 مرزا غلام احمد صاحب پہلی اہلیہ سے دل برداشتہ تھے۔ وہ بچاری بصورتِ معلقہ وقت گزار رہی تھی۔ آخر ۱۸۸۴ء میں مرزا صاحب نے ایک نوعمر باکرہ لڑکی مسماۃ نصرت جہاں بیگم سے شادی کی۔ اس کے والد کا نام ناصر نواب تھا۔ یہ بچارے نام کے نواب تھے۔ نکاح کے بعد جلد ہی بوریا بستر سمیٹ کر دہلی سے قادیان

آ گئے اور اولاد کے قدموں میں لڑکی کے گھر ڈیرے ڈال دیے۔

اسی اثنا میں ہشیار پور جا کر چلہ کشی کا خیال پیدا ہوا، ان ہی ایام میں نئی بیگم صاحبہ باامید ہوگئی۔ مرزا صاحب نے عبداللہ سنوری سے کہا تھا کہ خدا مجھ سے دیر دیر تک باتیں کرتا رہتا ہے۔ اس چلّے میں ایک لڑکے کی پیدائش کا الہام ہوا، جس کا نام ''عنموئیل'' ہوگا، چنانچہ ۲۰ فروری ۱۸۸۶ء کو مرزا صاحب نے مرزا عنموئیل کی پیدائش کا اعلان بذریعہ اشتہار کر دیا اور اس کے لیے کئی القاب کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا:

''مظهر الحق والعلاء، كأن الله نزل من السماء''

لوگوں نے جب مذاق اڑایا تو ۲۲ مارچ ۱۸۸۶ء کو ایک اور اشتہار میں بتایا: یہ بچہ ایک عظیم الشان نشان ہوگا اور اسی سے آنحضرت ﷺ کی صداقت ظاہر ہوگی۔ مسیح علیہ السلام کے احیائے موتی کے معجزے سے بھی زیادہ پُروقار ہوگا، البتہ میعاد میں توسیع کر کے کہا کہ ۹ سال کے اندر اندر ہوگا۔

پھر ۸/ اپریل ۱۸۸۶ء کو ایک اور اشتہار دیا کہ یہ موعود لڑکا بڑی جلدی ہونے والا ہے (چالاکی یہ تھی کہ بیوی تو حاملہ ہی ہے۔ اگر اسی حمل سے لڑکا پیدا ہوگیا تو اس کا نام عنموئیل رکھ کر ڈھنڈورا پٹوا دیں گے اور اگر مقصد اسی حمل سے حل نہ ہوا تو مریدوں کو ۹ سال کی مزید امید میں ڈال دیں گے) مگر ہزار امیدوں اور دعاؤں کے بعد حمل وضع ہوا تو عنموئیل کی جگہ لڑکی پیدا ہوئی۔ غیر مسلموں نے اسلام کا مذاق اڑایا اور مسلمانوں نے مرزا کا۔

مرزا صاحب پھر کوشش اور دعائیں کرنے لگے کہ بیوی پھر امید سے ہو، چنانچہ گود ہری ہونے کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ ۷/ اگست ۱۸۸۷ء کو مرزا صاحب کے ہاں نصرت بیگم کے بطن سے لڑکا پیدا ہوا اور مرزا صاحب نے ۸/ اگست ۱۸۸۷ء کو اشتہار دیا کہ ۸/ اپریل ۱۸۸۶ء کی پیشگوئی کے مطابق وہ عظیم الشان لڑکا جس کا نام عنموئیل ہے، آج ۱۲ بجے رات پیدا ہوگیا۔ مرزا صاحب نے یہ اشتہار خوشخبری کے عنوان سے فخریہ شائع کیا، لیکن بدنصیبی ملاحظہ فرمائیے کہ مرزا عنموئیل صاحب قریباً ۱۵ ماہ زندہ رہ کر ۴/ نومبر ۱۸۸۸ء کو بوڑھے ابا کو داغ مفارقت دے گیا۔ عنموئیل اور ''كأن الله نزل من السماء'' کی امیدیں خاک میں مل گئیں۔ مرزا صاحب اسلام کا نام لے کر غیر مسلموں کو تمسخر کا موقع دیتے رہے۔ مولانا محمد حسین صاحب بٹالوی نے انھیں تنبیہ کی کہ وہ اس قسم کی مضحکہ خیز پیش گوئیاں ترک کر دیں۔ مرزا صاحب ان سے بھی بگڑنے لگے۔

معلوم ہے کہ خرص و تخمین سے پیشگوئیاں کرنا سچے اور پاکباز لوگوں کا کام نہیں، پھر پیشگوئی جھوٹی نکلنے پر ہیرا پھیری کرنا، سچے انبیا کو مرزا غلام احمد کی سطح پر لانے کی کوشش کرنا، ملک میں خلفشار کے سوا اس میں کوئی فائدہ نہیں۔ اب بعض قادیانی دوست مرزا محمود صاحب خلیفہ ثانی کو عنموئیل بنانے کی کوشش کر رہے ہیں، حالانکہ

یہ بے چارے اس مدت کے کافی عرصہ بعد پیدا ہوئے، جو عنمو ئیل کے لیے ان کے ابا نے مقرر کی تھی اور ان کی پیدائش کے وقت مرزا صاحب نے ان کو عنمو ئیل نہیں کہا، اس لیے کہ پہلی لڑکی اور مرنے والے عنمو ئیل کے بعد مایوس ہو گئے اور وہ چاہتے تھے کہ لوگ عنمو ئیل کو بھول بھی جائیں۔ ایسے کم سواد بزرگوں کو اگر سابقہ صادق انبیا کی فہرست میں شامل کر لیا جائے تو تمام انبیا غیر مسلم قوموں کی نظر میں مذاق بن جائیں گے، بلکہ اس قسم کے کمزور مدعی، جن کے وعدے اور پیش گوئیاں مشکوک ہوں، سارے عقلمندوں کی نظر میں ساقط الاعتبار ہوں گے۔

مرزا صاحب خود بھی نبوت کے سلسلے میں مطمئن نہیں تھے۔ پہلی تصانیف میں آنحضرت ﷺ کو اسی معنی میں خاتم النبیین سمجھتے رہے، جس معنیٰ میں عامۃ المسلمین انھیں آخری نبی سمجھتے تھے۔ مجدد، مصلح، مسیح موعود ابن مریم، آدم، شیث، نوح، ابراہیم، اسحاق، اسماعیل، یوسف، موسیٰ، برہم اور تارمیکائیل اور گوپال وغیرہ دعاوی کرتے رہے، انھیں اپنے متعلق یقین نہیں تھا کہ وہ کیا ہیں؟ اشتہار ''ایک غلطی کا ازالہ'' میں خیال ہوا کہ بیوقوفوں کا جائزہ لیں کہ وہ نبوت کو بھی گوارا کرتے ہیں یا نہیں؟ چنانچہ اس اشتہار سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا جی تو نبوت کے لیے مستعد تھا، مگر وہ گھبراتے تھے اور علما کی گرفت سے ڈرتے تھے۔ ایک مقام پر فرماتے ہیں:

''میں نے نبوت یا رسالت سے انکار صرف ان معنوں سے کیا ہے کہ میں مستقل طور پر کوئی شریعت لانے والا نہیں ہوں اور نہ مستقل طور پر نبی ہوں۔''

گویا اپنے آپ کو غیر مستقل قسم کا نبی سمجھتے ہیں۔ یہ اشتہار مرزا صاحب نے ۵/نومبر ۱۹۰۱ء کو دیا، گویا چھپتے ہوئے غیر مستقل نبی رسول کا دعویٰ ہو گیا۔

4 عام قادیانی معیارِ صداقت کے مطابق مرزا صاحب کو سچا ہونے کے لیے ابھی کئی سال اور جینا چاہیے تھا، کیونکہ ان کے ہاں سچے نبی کو ۲۳ سال ضرور زندہ رہنا چاہیے۔ (اربعین، ص: ۴۔ ۶) لیکن مرزا صاحب کا ۲۶/مئی ۱۹۰۸ء میں انتقال ہوا۔ دعوائے نبوت کے بعد قریباً ۶، ۷ سال زندہ رہے۔ غرض انتہائی شوق کے باوجود نہ مسلمانوں کے معیار پر صحیح اترتے ہیں نہ قادیانی معیار پر۔ ایسے آدمی کو صادق انبیا کا مماثل کیسے سمجھ لیا جائے؟

5 پہلے انبیا علیہم السلام خصوصاً جن کا قرآنِ عزیز میں ذکر ہے، ہر ایک نے دعوائے نبوت اس طرح واضح فرمایا کہ اس کی امت کو اس میں کوئی اشتباہ نہیں ہوا، لیکن مرزا صاحب کی موت کے تھوڑے عرصہ بعد قادیانی حضرات دو حصوں میں بٹ گئے۔ لاہوری جماعت کا خیال ہے کہ وہ نبی نہیں تھے۔ مولوی محمد علی، مولوی احسن امروہی، خواجہ کمال الدین، مولوی صدر الدین وغیرہ اکابر، جو برسوں مرزا صاحب کے ساتھ رہے، وہ ان کے دعوائے نبوت کا کھلا انکار کرتے ہیں۔ قادیانی حضرات کو ان کی نبوت پر اصرار ہے۔ استدلال میں

دونوں مرزا صاحب کی کتابیں پیش کرتے ہیں، جس سے ظاہر ہے، مرزا صاحب خود اپنے دعوے کے متعلق مطمئن نہیں تھے۔ان کے بیان میں تذبذب ہے۔

6 جب مرزا صاحب کی پیش گوئیوں کے غلط ہونے کا ذکر ہوا تو مرزا صاحب اور ان کے خلفا نے پہلے انبیا پر نکتہ چینی شروع کر دی۔ جب دعووں کا موقع آیا تو ایک نہیں کئی دعوے کر دیے۔ عراق کی کرشمہ سازیاں برسرِ کار آ گئیں۔ سچے لوگوں کے قول وعمل میں تفاوت نہیں ہوتا۔ مرزا صاحب میں بعض ایسی کمزوریاں ہیں، جو راست بازوں میں نہیں ہوتیں۔ نبوت تو بڑی چیز ہے، عام با اخلاق اور اصحابِ مروت میں بھی ان کا شمار مشکل ہے۔ عفیفہ محمدی بیگم بنت مرزا احمد بیگ سے نکاح نہ ہونا تو مشہور ہے۔ مرزا صاحب نے جس انداز سے اس کے رشتے کا اپنے لیے مطالبہ کیا، وہ طریق کسی بامروّت اور با اخلاق آدمی کے لیے مناسب نہیں۔

مرزا غلام حسین، مرزا غلام احمد کے عم زاد بھائی تھے، جو عرصہ سے مفقود الخبر تھے، ان کی زمین ان کی اہلیہ کے نام منتقل ہوچکی تھی اور یہ مرزا احمد بیگ ہشیار پوری کی ہمشیرہ تھیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ یہ زمین اپنے بھتیجے مرزا احمد بیگ کے لڑکے کے نام منتقل کروادیں۔ مرزا احمد بیگ اس مقصد کے لیے مرزا غلام احمد کے پاس آئے کہ وہ اس ہبہ نامہ پر دستخط کر کے قانوناً اس کی تکمیل کر دیں۔ مرزا صاحب نے سودا شروع کر دیا کہ تم محمدی بیگم کا نکاح مجھ سے کر دو، میں اس ہبہ نامہ کی تکمیل کروں گا۔ شریف آدمی ایسی شرائط سے کبھی رشتے نہیں کرتے۔ دیہات کے دور افتادہ تعلیم سے بے بہرہ علاقوں میں اس قسم کے رشتے ہوتے ہیں، جسے وہاں کے شرفا بھی پسند نہیں کرتے۔

نکاح تو مرزا صاحب کا اب بھی نہیں ہوا، بلکہ اس ''صغیرة السن حسناء'' سے تعلق کی حسرت قبر میں مرزا صاحب کے ساتھ دفن ہوگئی، مگر زمین دے دینے کے بعد مرزا احمد بیگ کی منت کرتے، ناکامی کے باوجود اخلاق و مروت کے لحاظ سے مرزا صاحب بدنام نہ ہوتے۔ نکاح نہ ہونا تھا نہ ہوا اور اب تو امید بھی خاک میں مل گئی۔ اس عفیفہ نے مرزا سلطان احمد کے ساتھ بڑی وفاداری اور ٹھاٹھ سے زندگی گزاری۔ یہ تو شرط کا معاملہ تھا، اس کے بعد طلب وتحریص کے لیے جو راہ مرزا صاحب نے اختیار فرمائی، وہ بھی شرافت و مروت کے خلاف تھی۔ خدا کا فیصلہ تو تھا ہی نہیں، اگر تھا تو وہی کہ نکاح مرزا سلطان احمد سے ہو۔ ایک دھاندلی تھی۔ ناکامی کی صورت میں چپ ہوجاتے تو کسی حد تک شریفانہ فعل ہوتا۔ یہ ہنگامہ آرائی، اشتہار بازی تو قطعاً نامناسب تھی۔

غرض مرزا غلام احمد کی پوری زندگی تاریکیوں کا مجموعہ ہے، ان کے معاملات کے بعض حصے اخلاقی کمزوریوں اور بے مروتی و بدزبانی سے بھرپور ہیں، انھیں پیمبر مان لینے سے مقامِ نبوت کی سربلندیاں یکسر ختم ہو جائیں گی۔

دو صدیوں کا موازنہ:

اٹھارویں صدی کے اواخر تک ہندوستان میں بڑے بڑے عالم اور پاکباز لوگ موجود تھے۔ سید احمد شہید اور ان کے محترم رفقا، جن کے کردار نے دنیا میں صحابہ کے کارنامے زندہ کر دیے۔ مولانا سید نذیر حسین، مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا مملوک علی، نواب صدیق حسن خان، مولانا عبداللہ الغزنوی اور ان کے ابنائے کرام، مولانا غلام رسول صاحب قلعہ میہاں سنگھ، مولانا حافظ عبدالمنان صاحب وزیر آبادی وغیرہم رحمہم اللہ، ذکر و فکر کے حلقوں میں بھی بڑے بڑے باکمال حضرات موجود تھے، ان اکابر سے کسی کو دعوائے نبوت کا خیال تک بھی نہیں آیا، اس لیے کہ وہ مقامِ نبوت کی بلندیوں کو سمجھتے تھے۔

مرزا صاحب کے دعوے کے بعد جب ان کی کمزوریاں، غلط کاریاں سامنے آئیں اور دفاع میں قادیانی حضرات نے جو راہ اختیار کی، اس سے اس قسم کے نبی بارش کی طرح برسنے لگے۔ جن میں بعض حضرات مرزا صاحب سے بھی گئے گزرے ہیں۔ معلوم ہوا ہے کہ یہ باکمال لوگ برسوں اور قرنوں کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔

قرنہا باید کہ تا صاحب دلے پیدا شود
بایزید اندر خراساں یا اویس اندر قرن[1]

اور یہاں جھوٹوں کی فروانی ملاحظہ فرمایئے:

① چراغ الدین جمونی۔ ② ظہیر الدین اروپی۔ ③ محمد بخش قادیانی۔ ④ یار محمد وکیل ہشیار پوری۔ ⑤ عبداللہ تیماپوری۔ ⑥ سید عابد علی۔ ⑦ عبداللطیف گناچوری۔ ⑧ ڈاکٹر محمد صدیق بہاری۔ ⑨ ماسٹر احمد سعید سمبڑیالی۔ ⑩ احمد نور کابلی۔ ⑪ نبی بخش پسروری۔ ⑫ عبداللہ پٹواری چیچہ وطنی۔ ⑬ فضل احمد چنگا بنگیالی۔ ⑭ غلام احمد مصلح موعود و قدرت ثانی۔ ⑮ خواجہ اسماعیل لندن۔ ⑯ سید محبوب شاہ گوجرانوالہ۔

ان سولہ جھوٹے بزرگوں کے کچھ حالات، الہامات، تاویلات اور حیلوں کا ذکر نہ کیا جائے تو مضمون میں یقیناً تشنگی رہے گی، لیکن مضمون پہلے کچھ لمبا ہو گیا، صحت بھی زیادہ کام کی اجازت نہیں دیتی، اس لیے آپ یوں سمجھیے کہ ان حضرات میں اکثر قادیانی ہیں، انھیں الہامات کا فیضان مرزا صاحب سے ورثے میں ملا ہے۔

---

[1] ''صدیوں کے بعد کوئی خدا شناس پارسا جنم لیتا ہے، خراساں میں بایزید بسطامی اور قرن میں اویس''

تاویلات اور ہیرا پھیری میں یہ مرزا صاحب کے ہی ظل و بروز ہیں۔

یہ حضرات ان مرزا صاحب کو بھی نبی مانتے ہیں۔ میں نے آخری بزرگ سید محبوب شاہ کو دیکھا ہے۔ حلوائی کا کام کرتے تھے۔ دو بیویاں تھیں۔ ایک بہت زیادہ معمر تھی، اس کے متعلق ان کا خیال تھا کہ زیادہ تر آسمان پر رہتی ہے۔ اس کو بھی الہامات ہوتے ہیں۔ ایک بالکل نو عمر تھی، بمشکل سولہ سترہ سال کی ہوگی۔ شاہ صاحب ستر پچھتر کے پس و پیش تھے، ان کا خیال تھا کہ اگر ضرورت ہو تو خاوند اپنا اسسٹنٹ رکھ سکتا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ مولوی نور حسین صاحب گرجاکھی بھی نبی ہیں۔ ان کا الہام تھا: ''دو رسول رسالت کرن'' کبھی کبھی نماز پڑھتے تھے۔ روزہ نہیں رکھتے تھے۔ چھوٹی اہلیہ کو بھی نبوت کا عارضہ ہونے لگا تھا، الہامات شروع ہوگئے۔ شاہ صاحب کی موت کے بعد ایک ہم عمر جوان سے شادی ہوگئی اور عیالداری میں مشغول ہوگئی۔ الہام وغیرہ کی فرصت ہی نہیں ملتی، نبوت کا عارضہ بھی اب نہیں رہا۔ صحت مند ہے۔ ساری مصیبت مقامِ نبوت کے ساتھ اس مذاق کی وجہ سے پیش آئی، جو مرزا غلام احمد اور ان کے عقیدت مندوں نے اختیار کیا۔ أعاذنا اللّٰہ منھا[1]

[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۹ر نومبر ۱۹۸۴ء)

شیعہ سنی مصالحت اور اس کی مشکلات پر ایک نظر

حاجة في نفس يعقوب

شیعہ سنی منازعات مفکرینِ اسلام کے لیے مدتوں دردِ سر کا موجب رہے۔ سید جمال الدین، سید عبدہ، سید رشید رضا ایسے مشاہیر اربابِ فکر نے اس راہ میں دردمندانہ مساعی انجام دیں، لیکن نتائج کے لحاظ سے یہ کوششیں ناکام ہوئیں، جس کے بظاہر دو سبب تھے:

(۱) عموماً صلح کی خواہش اہلِ سنت مفکرین ہی کی طرف سے کی گئی۔ دوسری طرف سے کبھی ان کوششوں کا مذاق اڑایا گیا، کبھی اس کا جواب خاموشی سے دیا گیا، کبھی شرائط کی بھول بھلیوں میں اسے الجھا دیا گیا۔

(۲) علمائے اہلِ سنت نے صلح میں ناجائز خوشامد کی ضرورت نہیں سمجھی اور نہ ہی اپنے اصول نظر انداز کر کے صلح کی پیش کش کی۔ اختلاف چونکہ پرانا ہے اور اصولی، اس لیے جب تک طرفین اصول قربان کرنے کی جراَت نہ کریں، شیعہ سنی صلح از بس مشکل ہے، بلکہ ناممکن۔ مصالحت اور سمجھوتے پر تو غور کیا جا سکتا ہے، لیکن اتحاد و اتفاق کا مسئلہ ٹیڑھا ہے۔

''درِ نجف'' میں سید اِمداد حسین صاحب نے اس موضوع پر کوئی مضمون لکھا، جس سے ہمارے پرانے کرم فرما بزرگ مولانا محمد ابراہیم صاحب میر سیالکوٹی کے حساس دل پر رقت طاری ہوگئی۔ مولانا نے نقاہت اور دیرینہ علالت کے باوجود ایک مضمون لکھ دیا، جو اس وقت ایک پمفلٹ کی صورت میں ہمارے پیشِ نظر ہے۔ حضرت مولانا معمر ہونے کے ساتھ عرصے سے علیل ہیں اور ۴۷ء کے بعد کچھ ایسے غیر معمولی حوادث میں گھرے، جس سے مزاج گرامی کا تاثر ضروری ہے۔ پیشِ نظر پمفلٹ، اس کا مضمون، ترتیب، طریقِ استدلال؛ ہر چیز اس تاثر کی شاہد ہے اور حضرت مولانا اس معاملے میں یکسر معذور!

زیرِ قلم گزارشات کا مقصد اس پمفلٹ پر تنقید نہیں اور نہ ہی پمفلٹ میں کوئی ایسی چیز موجود ہے، جسے تنقید کی کسوٹی پر پرکھا جائے، بلکہ ان گزارشات کا مقصد شیعہ سنی سمجھوتے میں مولانا کی اِعانت ہے۔ مولانا کی شخصیت اور ان کی سابقہ خدمات کی بدولت بہت ممکن ہے کہ مولانا المحترم کے غلط یا صحیح فیصلوں کا جماعت پر اثر پڑے۔

شیعہ سنی نزاع کا اثر:

شیعہ سنی نزاع کے آغاز سے تھوڑی دیر پہلے مسیلمہ نے یمن کے اطراف میں اسلام کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور ایسی نبوت کا اعلان کیا، جس میں آنحضرت ﷺ کی نبوت کا اقرار جزوی حیثیت رکھتا تھا اور یہ صلح جویانہ روش اسلام کے جرأت آمیز حملوں سے بچنے کے لیے ایک منافقانہ روش تھی، ورنہ مسیلمہ اور اس کے رفقا کو اسلام سے کوئی ہمدردی نہ تھی۔

مسیلمہ نے نمازوں میں بھی کمی کی۔ پانچ کے بجائے تین نمازوں کی فرضیت کا اعلان کیا۔ بعض عیاشی کی راہیں بھی کھول دیں۔ دراصل یہ اسلام کے عملی اور اخلاقی معیار کے لیے چیلنج تھا۔ عرب جو تھوڑی دیر پہلے عیاشیوں میں مبتلا تھے، آنحضرت ﷺ نے انھیں تقویٰ اور طہارت کا پابند بنایا۔ مسیلمہ نے انھیں شرعاً ان پابندیوں سے آزاد کرنے کی کوشش کی اور اس کے ساتھ ہی انھیں قبائلی عصبیت نے اتنا بدحواس کیا کہ ان کے سنجیدہ لوگ فخریہ کہتے تھے: كاذب ثقيف أولىٰ من صادق قريش!

جس جاہلی عصبیت کو آنحضرت ﷺ نے دفن فرما دیا تھا، مسیلمہ نے اسے پھر سے زندگی بخشنے کی کوشش کی۔ حضرت ابوبکر کے تدبر اور مخلصانہ مساعی نے اس فتنے کو ہمیشہ کی نیند سلا دیا، ورنہ مسیلمہ کی یہ فساد آمیز تحریک، کفر کی ان تمام امراض کو اپنی آغوش میں لیے ہوئے تھی، جن کے لیے اسلام کے زیر سایہ ابھرنا ناممکن تھا اور یہ اسلام کے بالمقابل ایک متوازی نظام تھا، جسے جلد ہی موت سے ہمکنار ہونا پڑا۔ والحمد لله رب العالمين

شیعہ تحریک کا تاثر:

شیعہ تحریک قربِ عہد کی وجہ سے سابقہ تحریک کا ثنی معلوم دیتی ہے۔ عبداللہ بن سبا نے قریباً وہی راہیں اختیار کیں، جو مسیلمہ نے اختیار کی تھیں۔ اہلِ بیت کی محبت کی آڑ میں قبائلی برتری کا جاہلی تصور کارفرما تھا، جسے اسلام یکسر ختم کر چکا تھا۔ إن أكرمكم عند الله أتقاكم.

متعہ کو نکاح کے مساوی اہمیت دے کر عیش پسند حضرات کے لیے ایک راہ ہموار کی گئی، جس سے اخلاقی خرابیوں کا پیدا ہونا یقینی ہے۔ تقیہ کو دینی اہمیت دے کر انڈر گراؤنڈ تحریک کی داغ بیل ڈال دی۔ مسیلمہ اور اس کی جماعت آنحضرت ﷺ کی نبوت کو کیوں کر قبول کر سکتے تھے؟ محض ظاہر داری اور پردہ پوشی کے لیے ایک راہ تھی۔

اسی پسِ منظر کو سامنے رکھتے ہوئے شیعہ سنی اتحاد، بلکہ اتفاق کا معاملہ تو ناممکن ہے، البتہ سمجھوتے کی راہوں پر غور ہوسکتا ہے۔ یہ ایک پرانا مرض ہے، اس لیے سوچنا چاہیے کہ اس ناسور یا دق کو کیوں کر گوارا کیا جائے؟

زیرِ قلم گزارشات کا یہی مقصد ہے۔ شیعہ حضرات بھی اس صاف گوئی کو گوارا فرمائیں۔ اپنی تاریخی

فروگذاشتوں پر غور فرمائیں۔ کفر و اسلام کی آویزش میں ان کی روش عامۃ المسلمین کے ساتھ کیا رہی؟ سقوطِ بغداد اور علامہ ابن العلقمی کی داستانِ غداری کتنی شرمناک ہے؟ محقق طوسی اور ابن سینا کے تقیے نے اہلِ سنت سے کیا معاملہ کیا؟ اس تلخ حقیقت کو میں نے عمداً مختصر کیا، تاکہ اس کی تلخی کو ہلکا کیا جا سکے۔

حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب میر بھی غور فرمائیں! ایسا نہ ہو کہ غنائم اور جنگی فتوحات کو صلح کی میز پر کھو دیں۔ پیشِ نظر پمفلٹ میں بھی یہی رجحان پایا جاتا ہے۔ توقع ہے کہ یہ تلخ حقائق فریقین کے لیے مفید ثابت ہوں گے اور ہر ایک اپنے موقف کو سمجھ کر قدم رکھے گا۔

جب اسی ملک میں رہنا ہے تو کم از کم ایسے مسائل، جن کا اخلاق پر براہِ راست اثر پڑ سکتا ہے یا جن مسائل سے بے اعتمادی پیدا ہوسکتی ہے یا جن اعمال سے باہمی رنجش میں اضافہ ہوسکتا ہے، فریقین کو ان سے پرہیز کرنا ہوگا۔ ان مصالح کو ملحوظ رکھ کر ہمیں آگے بڑھنا چاہیے۔

حضرت مولانا ابراہیم صاحب کے متعلق ہمیں معلوم ہے کہ جب لیگ پراپاگنڈہ کے لیے نکلے تھے تو انھوں نے قادیانیوں کو بھی اسلام کی صفوں میں لا کھڑا کیا تھا۔ تبرائی شیعوں کی حمایت میں آسمان و زمین کے قلابے ملا دیے تھے۔ اپنی تقاریر میں ایسی باتیں فرمائی تھیں، جن پر حضرت مولانا آج خود ہی نادم ہیں۔ ایسے غیر معتدل بزرگوں کے لیے مناسب ہے کہ اجتماعی فیصلوں اور جماعتی سمجھوتوں میں آمریت کے بجائے شوریٰ سے کام لیں۔ ادارہ ''الاعتصام'' سے جناب کو ہزار کد ہو، جناب کو حق ہے کہ ان پر بے وقت اور بے محل برسیں، مگر ایسے معاملات میں جماعت کے ہر فرد کی رائے کا احترام ضروری ہے۔

ادارہ ''الاعتصام'' کے سامنے بحمد اللہ ایک مقصد ہے اور اس کے سفر کی ایک منزل۔ ہم اپنے مقاصد تک پہنچنے کے لیے اپنے سفر کو جاری رکھیں گے، نہ آپ کی بے ہنگام مذمت ہمیں روک سکتی ہے اور نہ ہی جناب کی ستایش کی یہاں چنداں ضرورت ہے۔

نکاح یا متعہ:

ازدواجی زندگی انسانی فطرت کا ایک واجبی تقاضا ہے، اس تقاضے کو پورا کرنے کے لیے مہذب دنیا میں ہمیشہ کوئی نہ کوئی قانون رہا، اسی قانون کا دوسرا نام نکاح ہے۔ عیاش طبائع نے اکثر کوشش کی کہ ان پابندیوں کو توڑ کر عیاشی کا سامان بہم پہنچائیں، اس کی دونوں صورتیں موجود ہیں۔ کبھی کھلی اباحیت اور کبھی نکاح کے نام سے عیاشی کو قانون کی صورت دی گئی۔

جاہلی عربوں میں متعارف طریقے کے ازدواجی زندگی کے قریباً پانچ طریق مروج تھے: ① متعہ۔

② شغار۔ ③ استبضاع۔ ④ سفاح۔ ⑤ خدن۔

ایران کی سرحدوں کا اباحی فرقہ جو اباحیتِ مطلقہ کا قائل تھا، ان کا خیال تھا کہ نکاح میں حلال و حرام اور جائز و ناجائز بے سود پابندیاں ہیں اور انسانی آزادی ان پابندیوں کی متحمل نہیں۔

اسلام نے اس متعارف نکاح کے علاوہ باقی تمام طریقے حرام اور ناجائز قرار دیے، اور اس نکاح میں عورت پر جو مظالم توڑے جاتے تھے، بیوی کے حقوق کو جس طرح پامال کیا جاتا تھا، اس پر کڑی قانونی پابندیاں عائد فرما دیں، تاکہ نسب کی حفاظت اور عورت کا احترام قائم رہے اور انسانی معاشرہ دنیا میں بلند حیثیت اختیار کرے۔ حیوانی جذبہ انسانی قانون کا پابند ہو کر دنیا میں دائمی امن کا موجب ہو سکے۔

اسلام کی نظر میں متعہ ایک غیر اخلاقی اِزدواجی طریقہ ہے، جسے قباحت کی بنا پر اسلام نے ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔ جاہلی عادت کے طور پر اسلامی قلمرو میں یہ کچھ عرصہ جاری رہا، اس کے بعد اسے آنحضرت ﷺ نے ہمیشہ کے لیے ختم فرما دیا۔ اللھم صل علیٰ محمد وعلیٰ آل محمد. معلمِ اخلاق نے اس وحشیانہ عادت سے بکرات روکا، تا آنکہ وہ ہمیشہ کے لیے متروک قرار دی گئی۔

اب آپ متعہ اور نکاح کے احکام پر ایک نظر ڈالیں اور فیصلہ کریں کہ اسلامی تقدیس کا تقاضا کیا ہے؟ مملکتِ پاکستان میں اگر متعہ خانوں کا آغاز ہو جائے تو آیا اخلاقی طور پر وہ موجودہ چکلوں کا نعم البدل نہیں ہوں گے اور ان سے زیادہ تباہی اور اخلاقی انارکی نہیں پھیلے گی؟ موجودہ چکلے اس ذہن سے چل رہے ہیں کہ عورتیں سیاہ کار ہیں اور یہاں جو کچھ ہو رہا ہے، یہ جرم ہے اور فسق، لیکن متعہ خانوں کا مقصد یہ ہوگا کہ یہ شرعاً درست ہے اور موجبِ ثواب!!

شرعی نکاح:

- متعدد بیویاں رکھنا درست ہے، لیکن اگر ان میں انصاف نہ ہو سکے تو پھر ایک سے زیادہ کی اجازت نہیں۔ (۴/۳)[1]
- عورتوں کو مہر کی رقم بطورِ عطیہ دو (یعنی اس میں سودے کی روح پیدا نہ ہونے پائے) اگر بیوی مہر کا کوئی حصہ بخوشی معاف کر دے تو کوئی حرج نہیں اور یہ قطعاً ناجائز ہے کہ تم عورتوں پر جبری قبضہ جما لو اور نہ ہی مال کے طمع میں انھیں حسبِ منشا نکاح سے روک سکتے ہو، البتہ انھیں بے حیائی کا حق نہیں۔ تم اپنی بیویوں سے اچھا سلوک کرو۔ اگر یہ تعلق تمھیں ناپسند ہی ہوا تو بھی اللہ اسے بابرکت کرے گا۔ (۴/ ۱۹)
- اگر تم دوسری بیوی گھر میں لانا چاہتے ہو تو تم مہر کی رقم کتنی ہی ہو، اس سے ایک پائی واپس نہیں لے سکتے،

① دیکھیں: سورۃ النساء [آیت: ۳]

یہ بہت بڑا جرم ہے۔ (۴/ ۲۰)

- بیان کردہ محرمات کے علاوہ باقی تمام رشتے درست ہیں۔ اس شرط سے کہ تم مہر صحیح طور پر ادا کر دو اور فریقین سے بدکار، فسق کا مرتکب نہ ہو (ورنہ نکاح درست نہیں ہوگا) فریقین میں نہ سفاح پایا جائے نہ خدن۔ (۴/ ۲۰)
- میاں بیوی میں اگر اختلاف پیدا ہو جائے تو طرفین سے ایک ایک حکم مقرر کیا جائے، اللہ تعالیٰ اصلاح کی توفیق عطا فرمائے گا، اگر فریقین اس کے آرزومند ہوں۔ (۴/ ۳۰)
- عورتیں کھیتی ہیں، اس مقصد کے پیشِ نظر تم ان سے جس طرح چاہو مباشرت کرو اور اللہ سے ڈرو۔ (۲/ ۱۲۲)
- عورتوں کے بھی اسی طرح حقوق ہیں، جیسے مردوں کے، لیکن مردوں کو کسی قدر برتری ہے۔ (۲/ ۱۲۹)
- جب عورتیں طلاق کی عدت پوری کر لیں تو وہ اپنے مستقبل کے متعلق پوری طرح آزاد ہیں۔ کسی کو حق نہیں کہ انھیں روکنے کی کوشش کرے، جو ایسا کرے وہ ظالم ہے۔ (۲/ ۲۳۱)
- طلاق وقت پر دو اور عدت کو شمار کرو اور جب تک کوئی بداخلاقی ظاہر نہ ہو، انھیں مکان سے مت نکالو۔ (۱/ ۶۵)
- عورتوں کو اپنی توفیق کے مطابق رہایش کا مکان دو، انھیں کسی قسم کی تکلیف مت دو، اگر مطلقہ حاملہ ہو تو تا وضع حمل خاوند اس کے اخراجات برداشت کرے۔ (۶۵/ ۶)

یہ اسلامی نکاح کا مختصر تذکرہ ہے جو شیعہ سنی میں مروج ہے، اس میں تقدیس کے تمام پہلو محفوظ کر لیے گئے ہیں، جس کا ملخص یہ ہے:

1. نکاحِ شرعی ایک تا زندگی دائمی تعلق ہے، اس کے لیے کوئی مدت معین نہیں۔
2. اس میں مہر ایک عطیہ ہے، اس میں سودے کا شائبہ نہیں ہونا چاہیے۔
3. یہ ایک پاکیزہ عہد ہے، اس میں کوئی ایسی شرط مقبول نہیں جو اس کی تقدیس کے منافی ہو، جیسے: متعہ، شغار وغیرہ۔
4. بیوی کو بھی ویسے ہی حقوق حاصل ہیں جیسے شوہر کو، البتہ مرد کو برتری کا مقام حاصل ہے۔
5. شوہر مہر کی ایک پائی بھی بلا رضا مندی واپس نہیں لے سکتا، علیحدگی دیر سے ہو یا یہ ناگریز صورتِ حال جلد پیش آ جائے۔
6. مہر کی رقم ایک عطیہ ہے، اس کا تعین فریقین کی رضا مندی پر ہے۔
7. بیوی کی تمام ضروریات کا شوہر کفیل ہوگا۔
8. اگر کبھی اس تعلق کے ٹوٹنے کا خطرہ ہو تو طرفین سے ایک ایک حکم مقرر ہوگا، جو ممکن طور پر مصالحت کی

کوشش کرے گا، تاکہ یہ عقد ٹوٹنے نہ پائے۔

9 اگر کبھی علیحدگی ناگریز ہو تو اس کے لیے وقت مقرر ہے اور ایک قانون۔

10 بدکاروں اور بداخلاق لوگوں سے یہ تعلق قائم نہیں ہوگا۔ ﴿وَحُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ فریقین پاکباز ہوں اور سفاح و خدن سے بالکلیہ محفوظ۔

متعہ اور اس کی حقیقت:

① "لَا تَكُوْنُ الْمُتْعَةُ إِلَّا بِأَجَلٍ مَّعْلُوْمٍ وَأَجْرٍ مَّعْلُوْمٍ" اھ (کافی: ۲/ ۱۹۳)

''متعہ میں مدت اور پیسے طے ہو جانا ضروری ہے۔''

② "أَتَزَوَّجُكَ مُتْعَةً كَذَا وَكَذَا يَوْمًا بِكَذَا وَكَذَا درهما لَا تَرِثُنِيْ وَلَا أَرِثُكَ" (کافی: ۲/ ۱۹۳)

''میں تم سے اتنے دن کے لیے اتنے پیسوں میں متعہ کرتا ہوں، نہ تم میری وارث، نہ میں تمھارا وارث۔''

③ "لَا تَضَعُ فَرْجَكَ إِلَّا مَنْ تَأْمَنُ عَلٰى دَرَاهِمِكَ" (کافی: ۲/ ۱۹۳)

''پہلے رقم کے متعلق تسکین ہو جائے تو زن وشوئی کے تعلقات قائم ہونے چاہییں۔''

④ حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے حضرت امام جعفر سے دریافت فرمایا کہ اگر متعہ اچھی چیز ہے تو آپ کی خاندانی عورتیں اس اجر سے کیوں محروم ہیں؟ امام جعفر نے فرمایا:

"لَيْسَ كُلُّ الصَّنَاعَاتِ يُرْغَبُ فِيْهَا، وَإِنْ كَانَتْ حِلًّا، لٰكِنْ لِلنَّاسِ أَقْدَارٌ وَمَرَاتِبُ يَرْفَعُوْنَ بِهَا" (کافی: ۲/ ۱۹۱)

''تمام پیشے ہر آدمی نہیں کرسکتا، بلکہ ہر ایک کے لیے مراتب اور مقامات ہیں۔'' گویا متعہ شرفا کا کام نہیں!

اسی طرح عبداللہ بن عمیر نے امام جعفر پر اعتراض فرمایا تو امام خاموش ہو گئے۔

⑤ ممتوعہ کی حیثیت لونڈی کی ہے، اس کا شمار ان چار میں نہیں ہوسکتا، جن کی اسلام نے اجازت مرحمت فرمائی ہے۔ پوچھا گیا:

"كَمْ تَحِلُّ مِنَ الْمُتْعَةِ؟ قَالَ: مَا شِئْتَ، وَصَاحِبُ الْأَرْبَعِ يَتَزَوَّجُ مِنْهُنَّ مَا شَاءَ مِنْ غَيْرِ وَلِيٍّ وَلَا شُهُوْدٍ، وَإِنِ انْقَضَى الْأَجَلُ كَانَتْ مِنْهُ بِغَيْرِ طَلَاقٍ" (کافی: ۲/ ۱۹۱)

جس قدر عورتوں سے چاہے متعہ کرے۔ جب مدت پوری ہو جائے گی، عورت طلاق کے بغیر ہی الگ ہو جائے گی اور اس نکاح میں نہ ولی کی ضرورت ہے نہ گواہوں کی۔

⑥ امام جعفر فرماتے ہیں: چاہے ہزار عورت سے متعہ کرے، یہ تو محنت مزدوری کی بات ہے، جسے وسعت ہو، کرے۔

⑦ اگر عورت متعہ کرے، لیکن مقررہ دن پوری حاضری نہ دے سکے تو امام جعفر فرماتے ہیں کہ حساب کر کے پیسے کاٹ لیے جائیں۔ امام جعفر رحمہ اللہ نے شاید خود کبھی متعہ نہ کیا ہوگا، ورنہ جانتے ہوتے کہ یہ حساب کتنا مشکل ہے!!

خشک متعہ:

⑧ "سَمِعْتُ أَبَا عَبْدِ اللّٰهِ عَلَیْہِ السَّلَام يَقُوْلُ: لَا بَأْسَ أَنْ يَّتَمَتَّعَ بِالْبِكْرِ مَا لَمْ يُفْضِ إِلَيْهَا كَرَاهِيَةَ الْعَيْبِ عَلٰى أَهْلِهَا" الخ (کافی: ۲/ ۲۶۶)

"بکر سے متعہ کرے، لیکن مباشرت نہ کرے، اس کے گھر والے اسے عیب تصور کریں گے۔" یعنی بکر سے خشک متعہ کرے!

⑨ "عَنْ أَبِي عَبْدِ اللّٰهِ عَلَیْہِ السَّلَام قَالَ: قُلْت لَهُ: رَجُلٌ جَاءَ إِلٰى امْرَأَةٍ فَسَأَلَهَا أَنْ تُزَوِّجَهُ نَفْسَهَا فَقَالَتْ: أُزَوِّجُكَ نَفْسِي عَلٰى أَنْ تَلْتَمِسَ مِنِّي مَا شِئْتَ مِنْ نَظَرٍ وَالْتِمَاسٍ، وَتَنَالُ مِنِّي مَا يَنَالُ الرَّجُلُ مِنْ أَهْلِهِ إِلَّا أَنَّهُ لَا تُدْخِلُ فَرْجَكَ فِي فَرْجِي وَتَلَذُّ بِمَا شِئْتَ فَإِنِّي أَخَافُ الْفَضِيحَةَ. فَقَالَ: لَيْسَ لَهَا إِلَّا مَا تَشْتَرِطُ" (کافی: ۲/ ۱۹۰)

ترجمہ کسی عالم سے دریافت فرمالیں۔ مقصد یہ ہے کہ متعہ میں بعض اوقات خشک ملاقات پر ہی اکتفا کرنا ہوگا۔ متعہ کے متعلق حضراتِ شیعہ کی ان مستند نصوص سے ذیل کے نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں:

① متعہ وقتی نکاح ہے۔

② یہ اجارہ ہے، جس کی اجرت مقرر ہوگی۔

③ یہ نکاح اس نوعیت کا نہیں، جس میں چار کی تحدید ہو۔

④ امام جعفر اپنے اعزہ و اقارب میں اس حرفت کو شرافت کے منافی سمجھتے ہیں۔

⑤ جتنے دن کے لیے متعہ کیا گیا ہو، اگر عورت کی طرف ان سے کچھ بقایا رہ جائے تو مرد حساب سے اتنے پیسے کاٹ لے گا۔ (کیونکہ بہر حال یہ ایک سودا ہے)

⑥ متعہ کی کوئی حد نہیں۔ یہ حرفت اور پیشہ کی قسم ہے۔

⑦ اس میں طلاق کی ضرورت نہیں۔

⑧ اس میں فضیحت کے خطرے سے اگر خشک متعہ پر کفایت کی جائے تو درست ہے۔

⑨ متعہ میں وراثت نہیں، البتہ اگر اولاد ہو جائے تو اس کی تربیت مرد کے ذمے ہوگی۔

⑩ یہ نکاح والدین کے لیے عار کا موجب ہو سکتا ہے۔

نکاح کے مقدس عہد کی شرائط اور اس کے گرد و پیش پر ایک نظر ڈالیے اور متعہ کی شرائط کو بھی ایک نظر ملاحظہ فرمائیے۔ جو مذہب نکاح کو رواج دیتا ہے اور زنا کو جرم قرار دیتا ہے، وہ متعہ کے فارمولا کو کیونکر قبول کر سکتا ہے؟ اگر شیعہ اپنے مذہب کے مطابق متعہ خانے کھولنے کا مطالبہ کریں تو اسلامی اخلاق میں اس اجازت کے لیے کہاں تک گنجائش ہے؟ میں شیعہ حضرات سے خطاب نہیں کر رہا، انھیں اپنے خیالات پر پابندی کا حق ہے، لیکن یہ اخلاقی فارمولا کیا اسلامی تقدیس کے ساتھ چل سکتا ہے؟ کیا متعہ کا نظام نکاح کی ضد نہیں؟!

میں نے بعض شیعی نصوص کا ترجمہ نہیں کیا۔ مختصر مطلب بیان کرنے پر کفایت کی ہے۔ ایسے مسائل کے بیان میں فی الجملہ کسی قدر عریانی ہو جاتی ہے اور ایسا ہونا ناگریز ہے۔ تمام مسالک میں جب ان ازدواجی مسائل کا تذکرہ آئے گا تو اس کی وضاحت کے لیے بیان میں عریانی سے چارہ نہیں۔

اصل مقصد یہ ہے کہ متعہ جن اخلاق کے لیے زمین ہموار کرے گا، جو شخص سینکڑوں عورتوں سے بطورِ تمتع دادِ عیش دے گا، اس کے اخلاق میں وہ قناعت اور پاکیزگی نہیں رہ سکتی، جو صحیح شرعی نکاح سے پیدا ہو سکتی ہے، اس لیے شیعہ سنی سمجھوتے میں ان اخلاقی مقادیر کا خیال رکھنا ضروری ہوگا، ورنہ یہ ''خشک وتر ملاقاتیں'' اخلاق کا جنازہ اٹھا دیں گی اور حضرات شیعہ کا نظامِ اخلاق اسلامی نکاح کے ساتھ نہیں چل سکے گا۔ مولانا ابراہیم صاحب صلح کی پیغامبری فرماتے ہوئے ان مشکلات پر غور فرمالیں!

سلفِ امت کو گالیاں:

باہمی اختلافات سے کوئی دور خالی نہیں۔ دنیوی معاملات میں اختلاف ہمارا روز مرہ کا تجربہ ہے۔ صحیح اور غلط دونوں قسم کی آرا سے سابقہ پڑتا ہے۔ دین کا معاملہ بھی اس سے مختلف نہیں۔ جہاں تک اجتہاد و فکر کا تعلق ہے، اس میں اختلاف ناگزیر ہے۔ دین کا معاملہ سمجھ کر عامیانہ ذہن اس میں تشدد کی طرف مائل ہو جاتے ہیں، جو مناسب نہیں، بلکہ آزادیِ فکر کا تقاضا یہ ہے کہ ہر ایک کو اپنی صواب دید کے مطابق عمل کرنے کا موقع دیا جائے اور رواداری کی حدود کو توڑنے کی کوشش نہ کی جائے۔ افسوس ہے کہ عوام اس حقیقت کو نہیں سمجھتے۔

شیعہ سنی اختلاف نیم سیاسی اختلاف ہونے کے علاوہ اجتہادی ہے۔ صورتِ حال کے سمجھنے میں وقت کے اکابر علما سے مسامحت ہوئی۔ عفا اللہ عنا وعنھم. اس مسامحت میں نہ ہی اہلِ بیت لغزش سے بچ سکے نہ ہی

ان کا فریقِ مخالف۔ نزاع کے بعد کچھ ایسی ناگریز صورتِ حال پیدا ہوئی، جس میں ایک حد تک اعتذار کی گنجائش ہے۔ منافقین کی ہیزم کشی کا معاملہ تو خیر دوسرا ہے، صحابہ اور اکابر اہلِ علم اور اصحابِ سنت اس میں اجتہاداً معذور تھے، لیکن حضراتِ شیعہ نے انھیں خالص دینی حیثیت دی اور اسے امورِ منصوصہ کی طرح قطعی الدلالۃ قرار دے کر اجتہاد و فکر کی راہیں بند کر دیں اور پھر استدلال کے بجائے تبرا اور سب و شتم کی راہ اختیار کی اور پھر اس سب و شتم کو دینی حیثیت دے کر ثواب و اجر کا مقام دے دیا۔ أعاذنا اللّٰہ من سوء الفھم!

اس اخلاقی معرکے میں حضراتِ شیعہ کا مقام:

اسلام نے بتوں اور بت پرستوں کو گالیاں دینے سے روکا۔ آنحضرت ﷺ نے اپنے دشمنوں کو دعائیں دیں، ان کی عداوتوں پر عفو کا خط کھینچ دیا۔ ابو سفیان رضی اللہ عنہ ایسے مخالفین کو اسی حلم نے آغوشِ عاطفت میں لے لیا۔ اللھم صل وسلم علیه. لیکن یہاں کی دنیا دیکھیے:

1. "سَمِعْنَا أَبَا عَبْدِ اللّٰهِ عليه السلام وَهُوَ يَلْعَنُ أَرْبَعَةً مِّنَ الرِّجَالِ وَأَرْبَعًا مِّنَ النِّسَاءِ. فلان وفلان وفلان و معاوية، ويسميهم وفلانة وفلانة وهند وأم الحكم أخت معاوية" (فروع کافی: ۱/۲۰۳)

"ہم نے ابو عبداللہ سے سنا، چار آدمیوں پر لعنت بھیجتے تھے، فلاں، فلاں، فلاں اور حضرت معاویہ اور چار عورتوں پر لعنت بھیجتے تھے، فلانۃ، فلانۃ اور ہند اور ام الحکم، یعنی حضرت معاویہ کی ہمشیرہ۔"

2. "وَلِلّٰهِ وَرَاءَ هٰذَا الْعَالَمِ سَبْعُوْنَ أَلْفَ عَالَمٍ، فِيْ كُلِّ عَالَمٍ سَبْعُوْنَ أَلْفَ أُمَّةٍ، كُلُّ أُمَّةٍ أَكْثَرُ مِنَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ، لَا هَمَّ لَهُمْ إِلَّا اللَّعْنُ عَلٰى أَبِيْ بَكْرٍ وَعُمَرَ وَعُثْمَانَ"

"اس عالم کے علاوہ ستر ہزار عوالم خداوند تعالیٰ نے پیدا فرمائے ہیں اور ہر عالم میں ستر ہزار اُمتیں موجود ہیں۔ ہر اُمت کی تعداد جنوں اور انسانوں کی مجموعی تعداد سے زیادہ ہے، ابوبکر، عمر، عثمان پر لعنت کے سوا ان کا کوئی کام نہیں۔"

3. "إِنَّ عَائِشَةَ وَحَفْصَةَ كَافِرَتَانِ مُنَافِقَتَانِ مُخَلَّدَتَانِ فِي النَّارِ" (۳/۳۹۱)

"عائشہ اور حفصہ دونوں کافر اور منافق ہیں اور ہمیشہ جہنم میں رہیں گی۔"

4. "قَالَ الْبَاقِرُ: يَا سَدِيْرُ! أُرِيْكَ الصَّادِّيْنَ عَنْ دِيْنِ اللّٰهِ، فَأَشَارَ إِلٰى أَبِيْ حَنِيْفَةَ وَسُفْيَانَ الثَّوْرِيِّ، وَهُمْ حِلَقٌ فِي الْمَسْجِدِ، فَقَالَ: هٰؤُلَاءِ الصَّادُّوْنَ عَنْ دِيْنِ اللّٰهِ بِلَا هُدًى مِنَ اللّٰهِ وَلَا كِتَابٍ مُّنِيْرٍ، إِنَّ هٰؤُلَاءِ الْأَخَابِثَ لَوْ حُبِسُوْا فِيْ بُيُوْتِهِمْ لَأَتَى النَّاسُ إِلَيْنَا وَلَأَخْبَرْنَاهُمْ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ" (الوشیعۃ، ص: ۵۰)

''امام باقر نے سدیر سے کہا کہ دیکھو! اللہ کی راہ سے روکنے والے یہ ہیں اور امام ابوحنیفہ اور سفیان ثوری کی طرف اشارہ فرمایا اور وہ حلقہ درس میں تشریف فرما تھے۔ امام باقر نے کہا کہ یہ لوگ بلا دلیل اللہ کی راہ سے روکتے ہیں، یہ خبیث (معاذ اللہ) لوگ اگر اپنے گھروں میں بند ہو جائیں تو لوگ ہمارے پاس آنے جانے لگیں تو پھر ہم انھیں آنحضرت ﷺ کی بات بتاتے۔''

کافی، وافی، تہذیب، استبصار وغیرہ میں اس قسم کے حوالوں کی کثرت ہے اور اس کا اثر شیعہ ذہن پر بہت زیادہ ہے۔ شیخ موسیٰ جار اللہ روسی ترکستان کے جید اور مستند اہلِ علم سے ہیں، وہ اسی صدی میں ایران کی شیعہ معاشرت کا تذکرہ فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

''وَأَوَّلُ شَيْئٍ سَمِعْتُهُ وَأَكْثَرُ شَيْئٍ أَنْكَرْتُهُ فِي بِلَادِ الشِّيْعَةِ هُوَ لَعْنُ الصِّدِّيْقِ وَالْفَارُوْقِ وَأُمَّهَاتِ الْمُؤْمِنِيْنَ: السَّيِّدَةِ عَائِشَةَ وَالسَّيِّدَةِ حَفْصَةَ، وَلَعْنُ الْعَصْرِ الْأَوَّلِ كَافَّةً فِي كُلِّ خُطْبَةٍ وَفِي كُلِّ حَفْلَةٍ وَمَجْلِس الْبَدْءِ وَالنِّهَايَةِ، وَفِي دِيَابِيْجِ الْكُتُبِ وَالرَّسَائِلِ، وَفِي أَدْعِيَةِ الزِّيَارَاتِ كُلِّهَا حَتّٰى فِي الْأَسْقِيَةِ، وَمَا كَانَ يَسْقِي سَاقٍ إِلَّا وَيَلْعَنُ، وَمَا كَانَ يَشْرَبُ شَارِبٌ إِلَّا وَيَلْعَنُ، وَأَوَّلَ كُلِّ حَرَكَةٍ وَعَمَلٍ هُوَ الصَّلَاةُ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّآلِ مُحَمَّدٍ وَّ اللَّعْنُ عَلَى الصِّدِّيْقِ وَالْفَارُوْقِ وَ عُثْمَانَ وَالَّذِيْنَ غَصَبُوْا حَقَّ أَهْلِ الْبَيْتِ وَظَلَمُوْهُمْ'' (الوشيعة)

''ایران میں مَیں نے سب سے پہلی جو بہت بری بات سنی، وہ حضرت صدیق اور حضرت فاروق رضی اللہ عنہما پر لعنت تھی اور امہات المومنین عائشہ اور حفصہ رضی اللہ عنہما اور عصرِ اول کے تمام مقتدر بزرگوں سے بھی یہی معاملہ تھا اور یہ تذکرہ ہر مجلس، ہر خطبے کی ابتدا اور آخر میں کیا جاتا۔ کتابوں کے دیباچوں اور زیارات کی دعاؤں کا بھی یہی حال تھا، یہاں تک کہ قہوہ خانوں میں قہوہ پلانے والا بھی ان بزرگوں پر لعنت کرتا اور پینے والا بھی لعنت کرتا اور ہر کام کی ابتدا درود سے ہوتی اور اس کے بعد اصحابِ ثلاثہ پر لعنت ہوتی۔'' إنا لله!

اب مولانا سوچ لیں کہ رقتِ قلب اور مہدی حسن صاحب کے مضامین سے ان کے تاثر کے نتائج کیا ہوں گے؟

تقیہ اور حضراتِ شیعہ:

حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب مہدی حسن صاحب کے مضمون سے اس قدر متاثر ہوئے کہ وہ شیعہ سنی

صلح کے لیے انتہائی تکلیف اور نقاہت کے باوجود تیار ہوگئے، بلکہ ان کے ارشاداتِ گرامی سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حضراتِ شیعہ سے اتحاد و اتفاق کے لیے تیار ہیں اور سلفِ اُمت سے سات اکابر کو بھی صلح کے انتظامات میں کھینچ لائے ہیں۔

اتحاد اور صلح تو بڑی چیز ہے، سمجھوتہ اور کمپرومائز کے لیے جس صاف دلی کی ضرورت ہے، شیعہ دوستوں سے اس کی بھی امید نہیں۔ ان کے مسئلہ تقیہ میں ایک خوبی ہے، اعمال میں تو شاید اسے مقامِ رخصت میں کوئی جگہ مل جائے، لیکن وہاں علم و تبلیغ بھی اس کے حملوں سے محفوظ نہیں، بلکہ تقیہ کے متعلق ارشاد ہے:

"اَلتَّقِیَّةُ تِسْعَةُ أَعْشَارِ الدِّیْنِ، لَا دِیْنَ لِمَنْ لَا تَقِیَّةَ لَهٗ، وَالتَّقِیَّةُ فِيْ كُلِّ شَیْئٍ إِلَّا فِي النَّبِیْذِ وَالْمَسْحِ عَلَی الْخُفَّیْنِ" (كافي مع صافي: ٤/ ١٣)

''تقیہ میں دین کے ۹ حصے ہیں۔ تقیہ کے بغیر دین نہیں۔ نبیذ اور مسح علی الخفین کے سوا تمام معاملات میں تقیہ ضروری ہے۔''

"كَانَ الصَّادِقُ یَقُوْلُ: اَلتَّقِیَّةُ مِنْ دِیْنِ اللّٰهِ، أَمَرَ اللّٰهُ عِبَادَهٗ بِهَا فِيْ كُلِّ مِلَّةٍ، شَرَعَ اللّٰهُ التَّقِیَّةَ فِي الْأَقْوَالِ وَالْأَفْعَالِ وَفِي السُّكُوْتِ عَنِ الْحَقِّ حِفْظًا لِلنَّفْسِ وَالْمَالِ وَإِبْقَاءً لِلدِّیْنِ، وَلَوْلَا التَّقِیَّةُ لَبَطَلَ دِیْنُ اللّٰهِ، وَانْقَرَضَ أَهْلُهٗ" (الوافي وغيره)

''تقیہ دینِ الٰہی ہے۔ ہر ملت میں یہ خداوندی حکم موجود ہے۔ تقیہ اقوال، اعمال؛ سب میں ضروری ہے، اس میں مال و جان کی حفاظت ہے اور دین کا بقا ہے۔ اگر تقیہ نہ ہوتا تو دین اور دیانتدار لوگ سب ختم ہو چکے ہوتے۔''

یہ ارشاد امام جعفر صادق ایسے متقی اور صالح بزرگ کی طرف منسوب ہے اور کتنا گھٹیا نظریہ ہے۔ اصحابِ عزیمت اس نصیحت پر ہنس دیں گے!

ہر دانش مند آدمی جو اہلِ بیت کے صبر و استقلال اور ثباتِ قول و فعل سے آشنا ہے، وہ یقین کرے گا کہ یہ امام جعفر پر تہمت ہے۔ واللہ حفیظہ عن ھذہ المزخرفات!

نیز لکھا ہے:

"وَقَالَ الصَّادِقُ: سَمِعْتُ أَبِيْ یَقُوْلُ: لَا وَاللّٰهِ لَیْسَ عَلٰی وَجْهِ الْأَرْضِ شَیْئٌ أَحَبَّ إِلَیْنَا مِنَ التَّقِیَّةِ، اِتَّقُوا اللّٰهَ عَلٰی دِیْنِكُمْ وَاحْجُبُوْهُ بِالتَّقِیَّةِ، فَإِنَّهٗ لَا إِیْمَانَ لِمَنْ لَا تَقِیَّةَ لَهٗ، أَبَی اللّٰهُ إِلَّا أَنْ یُّعْبَدَ سِرًّا، أَبَی اللّٰهُ فِيْ دِیْنِهٖ لَنَا وَلَكُمُ التَّقِیَّةَ" (الكافي)

''امام صادق اپنے والد بزرگوار سے نقل فرماتے ہیں کہ تمام روئے زمین پر تقیہ سے کوئی چیز ہمیں زیادہ پسند نہیں۔ دین کے معاملے میں اللہ سے ڈرو اور اس پر تقیہ کا حجاب ڈال دو۔ جس میں تقیہ نہیں، اس میں ایمان نہیں (کتمانِ ایمان کا نام ایمان کتنا اچھا نظریہ ہے! تسمیہ بالضد کی بہترین مثال ہے) خدا کا حکم ہے کہ ہم اور آپ تقیہ کریں۔''

استدلال:

''مَا بَلَغَتْ تَقِيَّةُ أَحَدٍ تَقِيَّةَ أَصْحَابِ الْكَهْفِ، إِنَّهُمْ كَانُوا يَشْهَدُونَ الْأَعْيَادَ وَيَشُدُّونَ الزَّنَانِيرَ فَأَعْطَاهُمْ أَجْرَهُمْ مَرَّتَيْنِ، مَرَّةً لِلْإِيمَانِ وَمَرَّةً لِلْعَمَلِ بِالتَّقِيَّةِ'' اھ

''اصحابِ کہف تقیہ پر بہترین کاربند تھے۔ عیدوں میں حاضر ہوتے اور زنار پہنتے، اللہ تعالیٰ نے ان کو دو اجر دیے: ایمان کا اجر اور تقیہ کا اجر۔''

''قَالَ الصَّادِقُ: كَانَتْ طَائِفَةٌ آمَنَتْ بِمُحَمَّدٍ وَأَخْفَتْ إِيمَانَهَا تَقِيَّةً فَنَزَلَتْ: أُولَٰئِكَ يُؤْتَوْنَ أَجْرَهُمْ مَرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوا''

''بعض لوگ آنحضرت ﷺ پر ایمان لائے اور ایمان کو مخفی رکھا، ان کے حق میں یہ آیت نازل ہوئی کہ ان لوگوں کو دوگنا اجر دیا جائے گا، اس لیے کہ یہ صابر ہیں۔''

یہ تمام شیعی نصوص ہیں۔ حضراتِ شیعہ دیانتاً اور شرعاً ان کے پابند ہیں اور اس پابندی کا انھیں حق ہے۔ شرعاً وہ مجبور ہیں کہ اس ہدایت پر عمل کریں۔ جب تک حق بات کو نہ چھپائے، کوئی شیعہ متدین نہیں ہوسکتا۔

ان کلمات میں حق و باطل کی آمیزش کر دی گئی ہے۔ عبادت ریا کے ڈر سے مخفی رکھی جائے تو کوئی حرج نہیں۔ یہ چیز اہلِ سنت کے نزدیک بھی پسندیدہ ہے اور اس قسم کا اِخفا شرعاً مستحسن ہے۔ صدقات میں اِخفا اور کتمان مناسب ہے، اگر یہ تقیہ ہے تو اس پر کوئی بھی اعتراض نہیں۔ ہلاکت اور خطرات میں اگر کوئی شخص سچی بات نہیں کہہ سکا تو گو کتمانِ حق پسندیدہ نہیں، مگر درست ہے۔ ایسا شخص قابلِ عفو ہے، لیکن یہاں عزیمت اور اظہارِ حق مستحسن ہے: ''لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ وَإِنْ قُتِلْتَ أَوْ حُرِّقْتَ''[1] ''شرک مت کرو، گو تمھیں جلا دیا جائے یا قتل کر دیا جائے۔''

مصلحتاً بعض اَسرار کا اِخفا کچھ وقت کے لیے درست ہے۔ نا اہل لوگوں سے کوئی بات مخفی رکھی جائے تو حرج نہیں۔ اگر اصطلاحاً حضراتِ شیعہ اسے تقیہ تصور کرتے ہوں تو علی حدِ مراتب اس کی اجازت ہے، لیکن اگر

[1] مسند أحمد (٥/ ٢٣٧) صحيح الترغيب، رقم الحديث (٥٧٠)

تبلیغ و تذکیر میں بھی کتمانِ حق کا وتیرہ اختیار کیا جائے تو ناجائز اور حرام ہے اور معلوم ہے کہ خطرات اسی میں ہیں۔ انبیا نے وعظ و تذکیر میں کبھی تقیہ اختیار نہیں فرمایا، ان حالات میں اگر کتمان جائز ہو تو اظہارِ حق کی نوبت ہی کب آئے گی؟!

اسی طرح اگر لوگوں سے ڈر کر عبادت اور صحیح طریقوں کو چھپایا جائے تو ان طریقوں کی اشاعت کا وقت کب آئے گا؟ جب سنت چھپانا ہی سنت تصور کیا جائے تو سنت پر عمل کا وقت کب آئے گا؟ سنن کی اشاعت کے لیے بہر حال یہ نقصان برداشت کرنا ہوگا، لیکن امام صاحب فرماتے ہیں:

”وَقَالَ: دَعُوْا رَفْعَ أَيْدِيْكُمْ فِي الصَّلَاةِ إِلَّا مَرَّةً وَّاحِدَةً حِيْنَ نَفْتَحُ الصَّلَاةَ، فَإِنَّ النَّاسَ قَدْ شَهَرُوْكُمْ بِذٰلِكَ“ (الروضة: ۳/ ۳)

رکوع میں رفع یدین چھوڑ دو، لوگ تمھیں اس سے معلوم کر لیں گے۔

فرمائیے! ان معمولی معاملات پر اگر تقیہ کارفرما ہو تو اہم سیاسی اور دینی امور میں وہ طغیانی آئے گی کہ الامان! کوئی معاہدہ قابلِ اعتماد نہ ہوگا اور کسی دینی معاملے کے متعلق یہ معلوم کرنا مشکل ہوگا کہ یہ دیانتاً ہو رہا ہے یا تقیہ کے طور پر ہو رہا ہے؟!

یہاں یہ حال ہے کہ روز مرہ کے مسائل میں بھی تقیہ دامن گیر ہے۔ خالص صحابہ اور رفقا بھی ائمہ سے گھبراتے ہیں کہ کہیں اس مسئلے میں تقیہ نہ ہو۔ زرارہ فرماتے ہیں:

”كُنْتُ أَكْرَهُ أَنْ أَسْأَلَهُ إِلَّا خَالِيًا خَشْيَةَ أَنْ يُفْتِيَنِي مِنْ أَجْلِ مَنْ يَحْضُرُ بِالتَّقِيَّةِ“

(کتاب المواریث، ص: ۲)

”میں امام جعفر سے لوگوں کی موجودگی میں مسئلہ نہیں پوچھتا تھا، ڈرتا کہ کہیں تقیہ سے جواب نہ دیں۔“

جن آیات سے استدلال کیا گیا ہے اور جس انداز سے کیا گیا ہے، مضحکہ خیز ہے، لیکن اس موضوع سے بحث کرنا اس وقت خارج از بحث ہے، کیونکہ اس وقت خطاب شیعہ دوستوں سے نہیں۔ انھیں حق ہے کہ اپنے طریقِ فکر کے مطابق بحث و نظر کی راہیں اختیار کریں۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ حکومتِ پاکستان میں جو مقام حضراتِ شیعہ اور اربابِ قادیانی کو حاصل ہے، وہ دوسرے کسی کثیر التعداد فرقے کو بھی حاصل نہیں۔

غرض تقیہ سے مختلف مفہوم متصور ہو سکتے ہیں۔ حضراتِ شیعہ نے تبلیغ، عبادت وغیرہ اساسی امور میں تقیہ کو نہ صرف جائز اور مباح تصور کیا ہے، بلکہ اسے افضل اعمال سے تعبیر کیا ہے:

”قَالَ أَبُوْ عَبْدِ اللّٰهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ: اَلتَّقِيَّةُ مِنْ دِيْنِ اللّٰهِ. قُلْتُ: مِنْ دِيْنِ اللّٰهِ؟ قَالَ: إِيْ وَاللّٰهِ! مِنْ دِيْنِ اللّٰهِ، وَلَقَدْ قَالَ يُوْسُفُ (عَلَيْهِ السَّلَامُ) أَيَّتُهَا الْعِيْرُ إِنَّكُمْ لَسَارِقُوْنَ، وَاللّٰهِ مَا سَرَقُوْا

شَيْئًا، وَلَقَدْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ: إِنِّي سَقِيمٌ، وَاللّٰهِ مَا كَانَ سَقِيمًا" (صافي: ۲/ ۱۴)

''تقیہ اللہ کا دین ہے۔ یوسف علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تقیہ کیا، نہ کنعان کا قافلہ چور تھا نہ حضرت ابراہیم بیمار تھے (حضرت یوسف ایسے بادشاہ کا تقیہ کرنا عجیب استدلال ہے اور حضرت ابراہیم ایسے راست گو کے متعلق تقیہ کا تذکرہ خوب ہے)۔''

مندرجہ بالا گزارشات سے تقیہ کے متعلق مندرجہ ذیل نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں:

① تقیہ دین میں اساسی حیثیت رکھتا ہے۔

② حضرت یوسف علیہ السلام بادشاہت کے بعد تقیہ کرتے تھے۔

③ حضرت ابراہیم علیہ السلام اس اعلان کے باوجود، جس کا تذکرہ قرآنِ عزیز میں ہے، تقیہ فرماتے رہے۔

④ تقیہ رخصت نہیں، بلکہ عزیمت ہے۔

⑤ مسائل کے اظہار میں تقیہ درست ہے۔

⑦ تبلیغ واشاعتِ دین میں تقیہ صحیح ہے۔

⑧ علم کے اظہار میں، عمل بالسنہ میں اور عبادت میں بھی تقیہ درست ہے۔

یہ تقیہ تو حضراتِ شیعہ کے نزدیک ہے، اب ائمہ سنت کے نزدیک تقیہ کی حیثیت دیکھیے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"أَمَّا الرَّافِضَةُ فَأَصْلُ بِدْعَتِهِمْ عَنْ زَنْدَقَةٍ وَإِلْحَادٍ، وَتَعَمُّدُ الْكَذِبِ فِيهِمْ كَثِيرٌ، وَهُمْ يُقِرُّوْنَ بِذٰلِكَ حَيْثُ يَقُوْلُوْنَ: دِيْنُنَا التَّقِيَّةُ، وَهُوَ أَنْ يَّقُوْلَ أَحَدُهُمْ بِلِسَانِهِ خِلَافَ مَا فِيْ قَلْبِهِ، وَهٰذَا هُوَ الْكَذِبُ وَالنِّفَاقُ" (منهاج السنة: ۱/ ۱۵)

''بدعتِ رفض میں اصل شے الحاد اور بے دینی ہے اور عمداً جھوٹ بولنے کی عادت ان حضرات میں بہت زیادہ ہے اور وہ اس کا اقرار بھی کرتے ہیں، کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ تقیہ ہمارا دین ہے اور تقیہ اسی چیز کا نام ہے کہ انسان زبان سے وہ چیز کہے جو اس کے دل میں نہ ہو اور یہ تقیہ جھوٹ اور نفاق کا دوسرا نام ہے۔''

امام جعفر صادق فرماتے ہیں:

"ذُكِرَتِ التَّقِيَّةُ يَوْمًا عِنْدَ عَلِيِّ بْنِ الْحُسَيْنِ فَقَالَ: وَاللّٰهِ لَوْ عَلِمَ أَبُوْ ذَرٍّ مَا فِيْ قَلْبِ سَلْمَانَ لَقَتَلَهُ وَلَكَفَّرَهُ، لَقَدْ آخَى اللّٰهُ بَيْنَهُمَا"

’’علی بن حسین نے فرمایا: اگر ابو ذر، سلمان فارسی کے دل کی بات جانتے تو انھیں کافر سمجھ کر قتل کر دیتے، حالانکہ ان میں بھائی چارہ تھا۔‘‘

یہ کفر تقیہ کی بدولت چھپا رہا۔ إنا لله! ظاہر و باطن کا تفاوت شیعی تقیہ کا مفہوم ہے۔ ائمہ شیعہ بھی تقیہ کو حق کا قسیم سمجھتے تھے۔ ابو بصیر قنوت کے متعلق امام جعفر سے نقل فرماتے ہیں:

’’فَقَالَ: رَحِمَ اللّٰهُ أَبِيْ، إِنَّ أَصْحَابَ أَبِيْ أَتَوْهُ فَسَأَلُوْهُ فَأَخْبَرَهُمْ بِالْحَقِّ، ثُمَّ أَتَوْنِيْ شِكَاكًا فَأَفْتَيْتُهُمْ بِالتَّقِيَّةِ‘‘ (فروع کافي: ۱/ ۲۰۱)

’’میرے والد نے حق مسئلہ بتایا، جب وہ دوبارہ میرے پاس بصورتِ شک آئے تو میں نے تقیہ سے مسئلہ بتایا۔‘‘

مسلکِ اعتدال:

تقیہ کے معنوی عموم میں بعض ایسے مفہوم آ گئے ہیں، جن میں چنداں شرعی قباحت نہیں ہے، بلکہ مستحسن اور مندوب ہیں، اس لیے ہمیں لفظِ تقیہ سے چڑ نہیں، بلکہ اس طغیانی اور بے اعتدالی سے اختلاف ہے جو ائمہ شیعہ اور حضراتِ شیعہ سے اس معاملے میں منقول ہے، ورنہ تقیہ کے بعض معانی کے پیشِ نظر بعض سنی بزرگوں نے بھی فرمایا ہے:

’’مَا مِنْ مَذْهَبٍ إِلَّا وَلِلتَّقِيَّةِ فِيْهِ قَدَمٌ رَاسِخٌ‘‘ (شرح العقائد)

اس لیے لفظی بحث اور مناظرانہ چھان پھٹک کی یہاں ضرورت نہیں۔ حقائق کی روشنی میں معاملہ واضح ہے کہ جب دین اور شریعت کے معاملے میں اور بھی کھل کھیلنے کے مواقع میسر آئیں گے، ان حالات میں کوئی صلح اور سمجھوتہ کہاں تک ممکن ہوگا؟!

اور جب غلط گوئی کے جواز کے لیے دینی حجت مل جائے تو قوم کے اخلاق کی مقادیر میں کہاں تک انحطاط اور سفلگی رونما ہوگی؟ اس لیے بہتر ہے کہ ہمارے مولانا محض رقتِ قلب کا شکار نہ ہو جائیں، بلکہ مستقبل کے اثرات اور نتائج پر بھی غور فرما لیں ع

مرد آخربیں مبارک بندہ ایست[1]

شیعی نصوص کے ذکر سے میرا مقصد حضراتِ شیعہ سے مخاصمت نہیں اور نہ ان پر الزام، بلکہ مقصد یہ ہے کہ حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب میر سیالکوٹی اور ان ایسے رفیق القلب بزرگ معاملات کو ان کی اصل سرزمین میں ملاحظہ فرما سکیں اور طبیعت پر قابو پانے کی کوشش کریں۔ شیعہ سنی مفاہمت میں کوئی ایسی راہ نہ اختیار کی

[1] ’’انجام اور آخرت پر نظر رکھنے والا شخص بڑا مبارک بندہ ہے۔‘‘

جائے جو پوری تاریخ پر اثر انداز ہو اور اس کے تلخ نتائج کا الزام جماعت کو دیا جائے۔ مولانا کا پیشِ نظر رسالہ مقامِ اعتدال اور مولانا کی سابقہ روایتی ثقاہت سے بہت ہی پست ہے۔ اللھم مقلب القلوب ثبت قلوبنا علیٰ طاعتك و دینك.

حضرت مولانا اس عمر میں اس موضوع پر نہ لکھتے تو بہتر ہوتا۔ حبِ اہلِ بیت صحیح ہے، لیکن اس کے لیے رفض و تشیع کی اجازت نہیں دی جا سکتی ؎

نظیری را بمحفل بردم و گویا غلط کردم مرا رسوائے عالم ساخت چشم گریہ[1]

قرآنِ عزیز کا اجارہ:

شیعی لٹریچر اس روحانی انداز میں ہے کہ سنی اور اسلامی تعلیمات اس کی قطعی متحمل نہیں۔ اہلِ بیت کی طرف بعض دعاوی کی نسبت اس طرح کی گئی ہے جو انبیا کے اخلاق سے بہت بعید ہے۔ اسلام اور قرآنِ عزیز نے جس تواضع کی تلقین فرمائی ہے، اہلِ بیت کے دعاوی، حسبِ تذکرہ شیعی لٹریچر، اس کے بالکلیہ منافی ہیں، اس لٹریچر کو پڑھنے کے بعد یقین نہیں آتا کہ خاندانِ نبوت ایسی انانیت اور سرکشی کا دعویٰ کرے۔ ملاحظہ ہو:

"سَمِعْتُ أَبَا جَعْفَرٍ علیہ السلام يَقُوْلُ: مَا ادَّعٰى أَحَدٌ مِّنَ النَّاسِ أَنَّهُ جَمَعَ الْقُرْآنَ كُلَّهُ كَمَا أُنْزِلَ إِلَّا كَذَّابٌ، وَمَا جَمَعَهُ وَحَفِظَهُ كَمَا نَزَّلَهُ اللّٰهُ إِلَّا عَلِيُّ بْنُ أَبِي طَالِبٍ وَالْأَئِمَّةُ مِنْ بَعْدِهِ علیہم السلام" (أصول كافي مع شرح صافي: ۳/ ۱۵۸)

"جو شخص یہ دعویٰ کرے کہ اس کے پاس مکمل قرآن مجید موجود ہے، وہ جھوٹا ہے۔ حضرت علی کے سوا نہ کسی نے قرآن جمع کیا نہ حفظ کیا (گویا پوری امت قرآن کے علم اور حفظ سے محروم ہے)۔"

مولانا محمد ابراہیم صاحب قرآن کے شغف میں مشہور ہیں اور شیعی ملفوظات میں اس دفعہ کو جھوٹا فرمایا گیا ہے، اس لب و لہجے کے ساتھ سمجھوتہ کہاں تک اور کیونکر ممکن ہے، یہ سوچنے کی چیز ہے۔

"سَمِعْتُ أَبَا عَبْدِ اللّٰهِ علیہ السلام يَقُوْلُ: وَاللّٰهِ إِنِّيْ لَأَعْلَمُ كِتَابَ اللّٰهِ مِنْ أَوَّلِهِ إِلٰى آخِرِهِ كَأَنَّهُ فِيْ كَفِّيْ، خَبَرُ السَّمَاءِ وَخَبَرُ الْأَرْضِ وَخَبَرُ مَا كَانَ وَمَا هُوَ كَائِنٌ، قَالَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ: فِيْهِ تِبْيَانُ كُلِّ شَيْئٍ" (كافي مع صافي: ۳/ ۱۶۰، حصه أصول)

"امام جعفر فرماتے ہیں: میں کتاب از اول تا آخر جانتا ہوں، گویا آسمان زمین، ما کان اور ما یکون کی خبریں میرے ہاتھ میں ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "فِيْهِ تِبْيَانُ لِكُلِّ شَيْئٍ" یہاں علومِ قرآنی کے

[1] "نظیری کو محفل میں لے جا کر میں نے بہت بڑی غلطی کی، اس نے تو مجھے دنیا میں رسوا کر کے رکھ دیا۔"

ساتھ ماکان وما یکون پر قبضہ کا دعویٰ فرمایا گیا ہے اور استدلال میں "فیه تبیان لکل شيء" کا ذکر فرمایا ہے۔ شاید ضمیر مجرور کا مرجع امام جعفر ہوں گے؟

حضرت مولانا اگر اپنے دیرینہ عقیدہ اہل حدیث پر قائم ہیں اور غیب کو خدا تعالیٰ کی خصوصیت تصور فرماتے ہوں، یہاں ماکان اور مایکون کے علم کا دعویٰ فرمایا گیا ہے۔ مولانا دانشمند ہیں، عقیدہ کا مسئلہ ہے، کوئی مناسب حل سوچ لیں ع

شیخ بھی راضی رہے راضی رہے شیطان بھی

معاملہ بہر کیف مشکل ہے۔ امید ہے حضرت مولانا رقتِ قلب اور شدتِ علالت کے باوجود آخری عمر میں بازی نہیں ہار دیں گے۔ اللہ تعالیٰ جناب کو استقامت عطا فرما دے اور توحید و سنت پر ثباتِ قدم نصیب ہو۔

حضراتِ شیعہ ایک اسلامی فرقہ ہیں، ان کا دعویٰ بھی یہی ہے کہ وہ مسلمان ہیں، لیکن اندازِ گفتگو اور ادعا سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تعلیمات اسلامی تعلیمات سے بالکل الگ ہیں۔ اسلامی تعلیمات میں عجز و انکسار اور تواضع کی تلقین فرمائی گئی ہے۔ انبیا تک کا یہ حال ہے۔ ﴿سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ﴾ [البقرة: ٣٢] ملائکہ کا اعترافِ عجز قرآنِ عزیز میں موجود ہے۔ لیکن اوپر کی تعلیمات میں تمام علوم کے متعلق مخالفانہ قبضہ کا دعویٰ کیا گیا ہے۔ قرآن اگر علومِ سنت کے لیے اساس و بنیاد کا حکم رکھتا ہے تو پھر سوچنے کی چیز ہے کہ یہ احادیث اور حضراتِ شیعہ کا لٹریچر کہاں سے ماخوذ ہے؟ قرآنِ عزیز اور تمام اسلامی تعلیمات میں ایسے دعاوی کی حوصلہ افزائی نہیں فرمائی گئی، اس سے ایک گونہ یقین ہوتا ہے کہ یہ ذخیرہ یقینی اور حتمی نہیں، اس کے مآخذ قرآنِ عزیز اور اسلام کے اساسی اصول نہیں، بلکہ اس کے مآخذ کچھ قبائلی جذبات ہیں اور کچھ نسبی عصبیت، کچھ انتقامی اثرات، جنھیں مذہب کی صورت دے دی گئی ہے۔ آپ کسی شیعہ دوست سے گفتگو فرمائیں، اہلِ بیت، تعزیہ اور دوسرے تاریخی حوادثات کے متعلق وہ اس انداز سے بات چیت کرے گا، گویا وہ کسی دوسری دنیا کا آدمی ہے۔

مولانا کے اتفاقاً آج کل مدیر "در نجف" سے اچھے مراسم ہیں، لیکن آج سے چند سال قبل مولانا کو یاد ہوگا کہ ان کی رائے مدیر محترم کے متعلق کیا تھی؟ حضرت شیخ الاسلام مولانا ثناء اللہ صاحب کے متعلق مدیر "در نجف" جس سنجیدگی کا مظاہرہ فرماتے تھے، اسے مولانا محمد ابراہیم صاحب سے بہتر کون جانتا ہے؟!

حبِ اہلِ بیت:

اہلِ بیت سے محبت اہلِ سنت کے نزدیک ضروری ہے، اس میں نہ کسی پر احسان ہے نہ خوشامد۔ آنحضرت ﷺ سے محبت جزوِ ایمان ہے اور اہلِ بیت سے محبت آنحضرت ﷺ کی محبت کا ایک حصہ ہے۔ اہلِ بیت ہمارے ہاں

حضراتِ شیعہ کی طرح کوئی مخصوص اجارہ نہیں، بلکہ تمام بنو ہاشم کو شامل ہے۔ آلِ عباس، آلِ علی، آلِ جعفر، آلِ عقیل، آلِ حارث، ازواجِ مطہرات، اسامہ بن زید رضی اللہ عنہم وغیرہ سب اہلِ بیت ہیں۔

آیتِ تطہیر میں بیویوں کے بعد حضرت علی، حسن، حسین، فاطمہ رضی اللہ عنہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا سے شامل ہوئے، ان کے مقام کو سمجھنا، احترام کرنا، ان کی بدگوئی سے بچنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ یہ محبت کسی کا اجارہ نہیں اور نہ ہی اس کے عوض ہم شیعہ حضرات سے صلح کی بھیک مانگنا چاہتے ہیں۔ شیعہ صلح کریں یا نہ کریں اور اس صلح پسندی کا کوئی نتیجہ مرتب ہو یا نہ ہو، بہر حال اہلِ بیت سے محبت ضروری ہے۔

حضرت جابر بن عبداللہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عرفہ کے دن خطبہ دیا اور فرمایا:

«يَا أَيُّهَا النَّاسُ! إِنِّي قَدْ تَرَكْتُ فِيكُمْ مَا إِنْ أَخَذْتُمْ بِهِ لَنْ تَضِلُّوا: كِتَابُ اللّٰهِ وَعِتْرَتِي أَهْلُ بَيْتِي»[1] (ترمذي)

''میں تم میں دو ایسی چیزیں چھوڑ رہا ہوں کہ جب تک تم انھیں تھامے رہو گے تم بھولو گے نہیں، وہ دو چیزیں اللہ کی کتاب اور میری اولاد اہلِ بیت ہیں۔''

زید بن ارقم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«كِتَابُ اللّٰهِ حَبْلٌ مَّمْدُودٌ مِّنَ السَّمَاءِ إِلَى الْأَرْضِ وَعِتْرَتِي أَهْلُ بَيْتِي، وَلَنْ يَّتَفَرَّقَا حَتّٰى يَرِدَا عَلَيَّ الْحَوْضَ»[2] انتهٰى ملخصاً (ترمذی)

''اللہ کی کتاب آسمان سے ایک رسی لٹکائی گئی ہے اور میری اولاد اور اہلِ بیت یہ کتاب اللہ سے تا قیامت الگ نہیں ہوں گے۔''

کتاب اللہ کے ساتھ دائمی التزام کتنی بڑی فضیلت ہے۔ اس حدیث میں اہلِ بیت کی منقبت ہی نہیں، بلکہ سادات کا ایک امتیازی نشان بھی بتا دیا گیا ہے۔ نسب میں غلطی ہو سکتی ہے، لیکن یہ نشان واضح ہے کہ سید وہی ہو سکتا ہے، جو کتاب اللہ کا عملاً پابند ہو۔ ایسے سادات سے بغض یقیناً ایمان اور دیانت سے بغض ہوگا۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباس سے فرمایا کہ تم سوموار کے دن بچوں سمیت میرے پاس آنا، میں تمھارے لیے بہترین دعا کروں گا، چنانچہ ہم سب تعمیلِ ارشاد میں حاضر ہوئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں کساء پہنائی اور برکت و مغفرت کے لیے دعا فرمائی۔[3] (ترمذي)

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (۳۷۸٦)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (۳۷۸۸)

[3] سنن الترمذي، رقم الحديث (۳۷٦۲)

کیا اچھا ہو کہ اہلِ عبا کے ساتھ اصحابِ کساء کو بھی شامل فرما لیا جائے، تا کہ مصالحت کی راہ زیادہ واضح ہو جائے۔

"عَنْ أَبِي حَبَّةَ الْبَدْرِيِّ قَالَ: كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَوْمَ حُنَيْنٍ لَا يَنْظُرُ فِي نَاحِيَةٍ إِلَّا رَأَى أَبَا سُفْيَانَ بْنَ الْحَارِثِ يُقَاتِلُ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: إِنَّ أَبَا سُفْيَانَ خَيْرُ أَهْلِي"[1]

رواه الطبراني في الكبير والأوسط، وإسناده حسن. (مجمع الزوائد: ۹/ ۲۷٤)

"ابو حبہ بدری فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ حنین کے دن جس طرف دیکھتے، ابوسفیان کو لڑتے دیکھا، آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ابوسفیان ہمارے اہل سے بہترین آدمی ہے۔"

ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے ابتدائی اعمال کتنے ہی غلط کیوں نہ ہوں، حنین میں ان کی جاں نثاری ان کی سچی توبہ کی دلیل ہے اور اسی جاں نثاری کی بدولت فخرِ کائنات ﷺ نے « خَيْرُ أَهْلِي » کا خطاب عطا فرمایا۔ حضرت ابو سفیان رضی اللہ عنہ کی اہلیت سے ان کے خاندان پر جو اثر پڑے گا، اس سے گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ « لَنْ يَتَفَرَّقَا حَتّٰى يَرِدَا عَلَيَّ الْحَوْضَ » کا معیار سب جگہ صحیح ہوگا۔

اسامہ بن زید، حضرت عباس، ابن عباس، حمزہ، جعفر رضی اللہ عنہم سارے ہی بزرگ ہیں، جو آنحضرت ﷺ کے اہل ہیں۔ میں نے اہل کے معنی میں عموم کو عمداً ذکر نہیں کیا اور اس سے اَتباع مراد نہیں لیے، کیونکہ مصلحت اور سمجھوتے میں یہ انتہا پسندانہ خیالات مقبول نہ ہوں گے۔ اعمال کی بہتری کی راہ سب کے لیے کھلی ہوئی ہے۔

اہلِ بیت کے مناقب اور مفاخر میں احادیثِ نبویہ کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ میں نے اختصار کے طور پر چند اشارات کیے ہیں۔ مولانا سے بہتر اس ذخیرے کو کون جانتا ہے؟ اہلِ سنت اس محبت پر عقیدتاً مجبور ہیں۔ یہ شیعہ حضرات پر احسان نہیں، اپنا فرض ہے۔ حضرت امام ابوحنیفہ، امام شافعی، امام مالک، امام احمد بن حنبل، ابن ابی ذئب رحمہم اللہ وغیرہ بزرگوں کے ارشادات ہم تک نہ پہنچتے تو بھی ہم اہلِ بیت سے محبت کرتے، اس لیے حبِّ اہلِ بیت کی رشوت دے کر حضراتِ شیعہ سے مصالحت کی خواہش کرنا قطعی غلط ہے اور یہ سودا قطعی غیر مفید ہے۔ فرض کیجیے، حضرت مولانا میر سیالکوٹی اور سید امداد حسین صاحب کسی اچھے نتیجے پر نہ پہنچ سکیں، جیسے کہ امید ہے اور جس کا اظہار مدیرِ درنجف "معاذ اللہ" کے فقرے سے فرما چکے ہیں، ہم پھر بھی اہلِ بیت سے محبت کریں گے۔

البتہ رفض و تشیع سے مصالحت، یہ دوسرا مسئلہ ہے۔ اختلاف محبت میں نہیں، محبت کی کیفیت میں ہے۔ شیعہ کا طریقِ محبت اہلِ بیت نے کبھی پسند نہیں کیا، بلکہ تعزیہ کا یہ طریق کہ بزرگانِ اہلِ بیت کی نارسائیوں کا

[1] المعجم الكبير (۲۲/ ۳۲۷) المعجم الأوسط (٦/ ۳۳۰) المستدرك (۳/ ۲۸۵)

تذکرہ سرِ بازار ہو، اہلِ سنت نے اسے کبھی پسند نہیں کیا۔ لَيْسَ مِنَّا مَنْ ضَرَبَ الْخُدُوْدَ وَشَقَّ الْجُيُوْبَ وَدَعَا بِدَعْوَى الْجَاهِلِيَّةِ.[1]

بالکل یہی اختلاف مسیحیت اور اسلام میں ہے۔ اہلِ اسلام نے کبھی حضرت مسیح علیہ السلام کی توہین نہیں کی، لیکن مسیحی حضرات مسیح علیہ السلام کی تعظیم کے لیے جو طریق اختیار کرتے ہیں، اسلام اسے پسند نہیں کرتا۔ محبت کے اظہار اور اس کی کیفیت میں اختلاف ہے، اس میں محبت کی نفی نہیں۔

ہمارے بریلوی بزرگ اہل اللہ کی محبت کے مدعی ہیں۔ ہم بھی ان بزگوں سے محبت کرتے ہیں، لیکن محبت کے جوش میں نہ ہم بدعت کے لیے آمادہ ہوتے ہیں اور نہ ہی ہم بزرگوں اور ان قبور کو سجدہ کرتے ہیں۔ ہمارے نزدیک نصاریٰ اور حضراتِ شیعہ اور بریلوی حضرات کا طریقِ محبت بغض کے مرادف ہے، اس میں ان بزرگوں کی توہین ہے، اس لیے اہلِ حق نے اس طریقِ محبت کو کبھی پسند نہیں فرمایا، بلکہ اسے محبت کہنا ہی غلط ہے۔

عیسائیوں سے رفعِ نزاع کے لیے ہم مسیح علیہ السلام کی محبت کا کبھی واسطہ نہیں دیتے اور نہ ہی یہود کا تعاون حاصل کرنے کے لیے حضرت موسیٰ اور عزیر علیہما السلام کی محبت کا واسطہ دینا چاہتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کے لیے ایک معیار ہمارے سامنے موجود ہے، اس لیے احبابِ بریلی سے تعلقات کی استواری کے لیے اس کی ضرورت نہیں کہ ہم انھیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا واسطہ دیں، جب معلوم ہے کہ یہ طریقِ محبت ہی غلط ہے۔

محمد بن عبداللہ بن حسن اور حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ خلیفہ منصور عباسی کے دورِ حکومت میں تھے۔ ائمہ اسلام اس طریقِ حکومت سے تنگ آچکے تھے۔ اسلام کا شورائی نظام قریباً آمریتِ مطلق کی صورت اختیار کر رہا تھا، عامۃ المسلمین کا حقِ نامزدگی ولایتِ عہد نے غصب کر لیا تھا، اس کے ساتھ ملوک کے استبداد نے اہلِ حق کی زبانوں پر تالے ڈال دیے تھے۔ دور اندیش اہلِ علم مستقبل کی مشکلات کے تصور سے کانپ اٹھے، وہ ان تمام بدعملیوں کو دیکھ رہے تھے، جو ایک مستبد نظام سے پیدا ہو سکتی ہیں۔ حکومتِ وقت کچھ تملق اور خوشامد پرست علما میں گھر چکی تھی کہ وہاں حریت پسند اربابِ فکر کی نہ ضرورت تھی اور نہ ہی ان کی پروا۔

سرزمینِ کوفہ:

ان تمام غلط اور استبدادی مظاہروں کے لیے سرزمینِ کوفہ بے حد موزوں تھی۔ یہ مشرقی شہر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی کا صحیح مصداق تھا:

«هُنَالِكَ الزَّلَازِلُ وَالْفِتَنُ، وَهُنَالِكَ يَطْلُعُ قَرْنُ الشَّيْطَانُ»[2]

---

1. صحيح البخاري، رقم الحديث (١٢٣٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٣)
2. صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٦٨١)

آنحضرت ﷺ نے ایک دفعہ مشرق کی طرف اشارہ کر کے فرمایا تھا کہ یہ فتنوں اور زلزلوں کی سر زمین ہے۔ یہ زمین شیطان کی سر بلندیوں کے لیے آماج گاہ ہے، چنانچہ خلافتِ فاروقی سے شروع ہو کر یہ زمین فسادات اور خطرات کی سرزمین رہی ہے۔ ایک حدیث میں نجد کا ذکر بھی ہے، جس سے مراد نجد العراق ہے، اس لیے ظاہر ہے کہ یہ پیشین گوئی اس سر زمین میں ظہور پذیر ہوتی رہی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کے خلاف ریشہ دوانیوں کے لیے یہی زمین مرکز بنی رہی۔ خوارج کی اکثر سرگرمیاں بھی اسی سر زمین میں پیدا ہوئیں اور پروان چڑھیں، بالآخر فنا کے گھاٹ اتر گئیں۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے خلاف ایک جھوٹی شکایت اہلِ کوفہ ہی کی طرف سے کی گئی۔ فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے شکایت کو غلط سمجھتے ہوئے بھی حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو بدل دیا اور دوسرا گورنر بھیج دیا۔[1] حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی دور بین نگاہیں اس سنگلاخ زمین کی انتقامی سازشوں سے خوب آگاہ تھیں۔ یوں بھی ایک سرحدی مقام ہونے کی وجہ سے ضروری تھا کہ یہاں مختلف الخیال اربابِ فکر جمع ہوں، جو اپنے فکر کی اِشاعت کے لیے میدان ہموار کریں، دوسرے کے افکار کو توڑیں اور اس تصادم میں ایسے فاسد الفطرت نوجوانوں کا پیدا ہونا قدرتی ہے، جو ہر شرارت کے سرغنہ بن سکیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مدینہ منورہ سے منتقل ہو کر کوفہ آنا بھی شاید اسی لیے ہو کہ ان فتنوں پر براہِ راست قابو پا سکیں اور قصہ زمین برسرِ زمین نبٹنے میں زیادہ سہولت ہو، لیکن یہ انتقالِ مکانی کی تدبیر اس وقت عمل میں لائی گئی، جب کہ معاملہ تقدیر کے ہاتھ میں جا چکا تھا اور تدبیر کی ساری ہوشمندیاں فتنہ انگیزوں کی بدحواسیوں کا شکار ہو چکی تھیں۔

سیدنا الامام:

جس قدر یہ زمین سنگلاخ تھی، اسی قدر وہاں اعتقادی اور عملی اِصلاح کے لیے ایک آئینی آدمی کی ضرورت تھی، جس کے علم و عقل کی پہنائیاں اس سر زمین کے مفاسد کو سمیٹ لیں۔ میری ناقص رائے میں یہ آئینی شخص حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تھے، جن کی فقہی موشگافیوں نے اعتزال و تجہم کے ساتھ رفض و تشیع کو بھی ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ اللهم ارحمه، واجعل الجنة الفردوس مأواه.

حضرت الامام کا سیاسی موقف:

حضرت امام رحمہ اللہ کو جہاں دین کے فقہی معاملات میں ایک اعجازی مقام حاصل تھا، وہاں وہ وقت کی سیاست سے بھی بے خبر نہ تھے۔ وہ ان مؤثرات کو خوب سمجھتے تھے، جن سے ایک غلط حکومت ماحول کو متاثر کر سکتی ہے، اس لیے حضرت امام جہاں اپنے دار الافتاء میں مجتہدانہ انداز سے کتاب و سنت کے بعض مقاصد کی تکمیل

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٢٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٤٥٣)

فرماتے تھے، وہاں ایک ماہر سیاستدان کی طرح حکومتِ وقت کی نارسائیوں اور کمزوریوں سے بھی واقف اور باخبر تھے اور حکومت بھی اس موثر شخصیت اور اس کے دور رس اثرات سے واقف تھی۔ حضرت امام کی قوتِ نفوذ اور عوام میں حضرت امام کی مقبولیت حکومت سے پوشیدہ نہ تھی اور نہ ہی حضرت امام اپنی اس ہمہ گیر قوت سے بے خبر تھے، اس لیے ناممکن تھا کہ کوئی موقع حضرت امام کی نظروں سے اوجھل ہو جائے۔

حضرت امام کے مخالف، بلکہ دشمن بھی ان خوبیوں سے ناواقف نہیں تھے۔ اگر اس دورِ پرفتن میں یہ مقدس شخصیت سرزمینِ کوفہ میں موجود نہ ہوتی تو شاید اس سرزمین کا حشر عاد وثمود یا قومِ لوط علیہ السلام جیسا ہوتا۔ ﴿وَمَا قَوْمُ لُوْطٍ مِّنْكُمْ بِبَعِيْدٍ﴾ [هود: ٨٩]

علامہ زمخشری اعتقاداً مائل بہ اعتزال ہیں، لیکن فروع میں وہ حنفی ہیں۔ فرماتے ہیں:

"وَكَانَ أَبُوْ حَنِيْفَةَ يُفْتِي سِرًّا بِوُجُوْبِ نُصْرَةِ زَيْدِ بْنِ عَلِيٍّ رضي الله عنهما، وَحَمْلِ الْمَالِ إِلَيْهِ وَالْخُرُوْجِ مَعَهُ عَلَى اللِّصِّ الْمُتَغَلِّبِ الْمُتَسَمِّيْ بِالْإِمَامِ وَالْخَلِيْفَةِ كَالدَّوَانِيْقِيِّ، وَقَالَتْ لَهُ امْرَأَةٌ: أَشَرْتُ عَلَى ابْنِيْ بِالْخُرُوْجِ مَعَ إِبْرَاهِيْمَ وَمُحَمَّدِ ابْنَيْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ الْحَسَنِ حَتّٰى قُتِلَ، فَقَالَ: لَيْتَنِيْ مَكَانَ ابْنِكِ"[1] (كشاف: ٧٤، سورة بقرة)

"حضرت امام ابوحنیفہ در پردہ زید بن علی کی مالی اور جانی اعانت کا فتویٰ دیتے تھے اور منصور دوانیقی ایسے چور کے مخالف تھے۔ ایک عورت نے حضرت امام سے فرمایا کہ میرا لڑکا آپ کے فتوے کے مطابق محمد اور ابراہیم بن عبداللہ بن حسن کے ساتھ شہید ہوگیا۔ حضرت امام نے فرمایا: کاش میں اس کی جگہ ہوتا۔"

حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور خلیفہ منصور:

حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ ۸۰ھ میں (حسبِ روایت صحیحہ) پیدا ہوئے اور ۱۵۰ھ میں انتقال فرمایا، اسی مدت میں اموی حکومت نے دم توڑا اور عباسی حکومت نے اس کی جگہ لے لی۔ اکثر ائمہ اسلام نے اس انقلاب میں کوئی اہم حصہ نہیں لیا۔ حکومت کے امیدواران کا شخصی کیریکٹر اور اس انقلاب کے اسباب و دواعی ان کے سامنے تھے۔ محض اسلام کے نام پر وہ کسی کے ہاتھ نہیں کھیلے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان بزرگوں کی نگاہ میں نہ تو مروان الحمار کی ذاتی بردباری قابلِ تعریف تھی اور نہ ہی عبداللہ السفاح پہلے عباسی بادشاہ کی ہوش مندی میں ان کے لیے کوئی جاذبیت تھی، ان کی نظر میں یہ انقلاب "گاؤ آمد و خر رفت" سے زیادہ وقیع نہ تھا۔ ائمہ اسلام ان دونوں سلسلوں پر غیر مطمئن تھے، حالانکہ یہ دونوں سلسلے بظاہر سنت کا دم بھرتے تھے، مگر ائمہ اسلام کی دور اندیش نگاہیں ان کے شخصی

---

[1] تفسير الكشاف (١/ ٢١١)

اعمال اور اخلاق سے آگاہ تھیں، اس لیے وہ بدستور ایک صحیح شرعی اور دینی حکومت کے لیے ساعی اور منتظر رہے۔

ظاہر ہے کہ جب اموی اور عباسی خلفا کی ظاہری سنیت انھیں مطمئن نہ کرسکی تو وہ کسی رافضی حکومت پر کس طرح مطمئن ہوسکتے تھے؟ یہ ہمارے علما کی سادگی اور قصورِ فکر ونظر ہے کہ وہ ۴۷ء کے انتخابات میں بعض غالی اور تبرائی شیعوں کی مدح وثنا میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتے رہے اور پورے ہندوستان میں دورے کر کے اہلِ توحید اور اربابِ سنت کی مخالفت کرتے رہے۔ اپنوں سے دشمنی اور غیروں سے دوستی! یہ عجیب سادگی تھی، اس سادگی کا خدا حافظ، لیکن حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور حضرت امام مالک رحمہ اللہ طمع، تحریص اور رعب وتخویف سے بالا تھے۔ وہاں مردم شناسی کا جوہر خلفا اور امرا تک کے اخلاق اور ذاتی معائب پر محیط تھا۔

توازنِ طبیعت:

ان مقتدر بزرگوں کے مزاج میں اس قدر توازن تھا کہ انتہائی ناگزیر حالات کے باوجود توازن بگڑنے نہیں پایا۔ خلیفہ منصور کی لغزشیں نظر میں تھیں، لیکن نظام کے ساتھ وابستگی میں خلل نہیں۔ احکام کی پابندی بھی ہوتی رہی، تنقید کا سلسلہ بھی جاری رہا، اہل اور مناسب آدمی کی تلاش اور جستجو بھی رہی۔

"قَالَ الْخَطِيبُ: بَلَغَنِي عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ خَلَفٍ وَكِيعٍ أَنَّ أَبَا حَنِيفَةَ النُّعْمَانَ ابْنَ ثَابِتٍ كَانَ يَتَوَلَّى الْقِيَامَ بِضَرْبِ لَبِنِ الْمَدِينَةِ وَعَدِّهِ حَتَّى فَرَغَ مِنَ اسْتِتْمَامِ بِنَاءِ حَائِطِ الْمَدِينَةِ مِمَّا يَلِي الْخَنْدَقَ" (تاريخ بغداد: ۱/ ۷۱)

"حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ شہر کی اینٹیں بنواتے اور گنتے رہے، یہاں تک کہ شہر کی فصیل ختم ہوگئی۔"

اس روایت کی تائید "البداية والنهاية" سے بھی ہوتی ہے۔ ملاحظہ ہو: البداية (۱۰/ ۹۷) ابن کثیر فرماتے ہیں: یہ دیوار ۱۴۴ھ میں ختم ہوئی۔

معلوم ہوتا ہے کہ خلیفہ منصور نے حضرت امام کو عہدہ قضا کے لیے مجبور کیا، حضرت امام نے انکار فرمایا۔ منصور نے حلف اٹھایا کہ تمھیں بہر حال حکومت کے ساتھ تعاون کرنا پڑے گا۔ حضرت امام نے عارضی طور پر عمارت میں تعاون قبول فرمالیا۔ اس کشیدگی میں ممکن ہے کہ جیل جانے کا مرحلہ بھی آیا ہو، لیکن حضرت امام کے جیل میں انتقال کی خبر چنداں موثق معلوم نہیں ہوتی۔

حضرت امام کی دانش مندی کا تقاضا بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ جب تک کوئی بہتر آدمی سامنے نہ آجائے، خواہ مخواہ ایجی ٹیشن کیوں کی جائے؟ محض جنگ کے لیے جنگ تو کوئی خوبی نہیں اور نہ بے مقصد ایجی ٹیشن سے ملک کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ صرف تخریب اور بدامنی سے انقلاب کو قریب لانا یہ اشتراکی طریقِ کار ہے۔ اہلِ حق

ناگزیر حالات کے بغیر بدامنی کی حمایت نہیں کرتے اور نہ ہی اہلِ علم حق پرست شرفا کے ساتھ عداوت مول لیتے ہیں، بلکہ اہلِ حق فساق اور معصیت پیشہ لوگوں سے نہ تعلق جوڑتے ہیں اور نہ ہی ان پر اعتماد کرتے ہیں۔

اس لیے حضرت امام ابوحنیفہ، منصور سے اختلاف کے باوجود جائز امور میں اس کی اعانت فرماتے رہے۔ منصور اور ابن ہبیرہ وغیرہ کو امر بالمعروف فرماتے رہے۔ ابن ابی ذئب اور حضرت امام مالک رحمہ اللہ کی بھی یہی روش رہی، ان حالات میں حضرت امام کی موت کا مسئلہ بصورتِ قید غور طلب ہے۔

محمد بن عبداللہ بن حسن:

محمد بن عبداللہ کو اہلِ مدینہ نے توجہ دلائی، بلکہ مجبور کیا کہ وہ منصور کی حکومت کے خلاف تحریکِ حریت کی قیادت فرمائیں اور جس قدر جلد ممکن ہو، اس نظام کو ختم کیا جائے۔ خلیفہ منصور خلفاے عباسیہ میں سے دوسرے خلیفہ ہیں۔ اپنے بھائی سفاح کی موت کے بعد مسندِ خلافت کو ۱۳۶ھ میں زینت بخشی۔ منصور بڑا ہشیار اور فصیح البیان اور لسان مقرر تھا۔ محمد بن عبداللہ سے اس کی مکاتبت اس کی ادبی مہارت پر زندہ شاہد ہے۔ لیکن اس کے دینی رجحانات سفاح سے بہتر نہ تھے۔ مسندِ خلافت پر متمکن ہونے کے بعد اس نے اپنے مخالفین پر کڑی نگرانی کی اور لطیف حیلوں سے ان کو مروا دیا۔ ان سیاسی دشمنوں میں اچھے اور برے سب لوگ شامل تھے، اس لیے ائمہ اسلام کی ایک صحیح شرعی نظام کے لیے تشنگی ایک قدرتی امر تھا۔ امن و اطمینان کے لیے ضروری تھا کہ ایک دینی نظام ملک کے طول و عرض میں کارفرما ہو، اس کام کے لیے محمد بن عبداللہ بن حسن بن علی رضی اللہ عنہم زیادہ موزوں معلوم ہوئے اور ان کی حکومت کے لیے خفیہ کوششیں شروع ہوئیں۔ یہ پورا خاندان حکومت کی نظروں میں معتوب ٹھہرا۔ محمد اور ان کا بھائی ابراہیم دونوں روپوش ہوگئے۔ محمد تو مدینہ منورہ ہی میں رہے اور ابراہیم بصرہ میں چلے گئے اور ان کے بہت سے اعزہ و اقربا بڑی مسکنت کی موت مرے۔ یہ سانحہ بھی کربلا سے کچھ کم نہیں۔ معلوم نہیں مظلوموں کے حامی یہاں کیوں خاموش ہیں؟!

محمد بن عبداللہ کے مذہب کے متعلق ائمہ تاریخ اور رجال نے صراحت نہیں فرمائی، لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شیعہ نہیں تھے۔ اس کے مندرجہ ذیل قرائن ہیں:

(1) محمد بن عبداللہ نے اپنی تحریک کا آغاز مدینہ منورہ سے کیا اور مدینے کے لوگوں نے ہی انھیں اس پر آمادہ کیا، یہاں تک کہ وہ اس پر آمادہ ہوگئے۔ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں:

"لَمْ یَزَلِ النَّاسُ أَھْلُ الْمَدِیْنَةِ وَغَیْرُھُمْ یُؤَنِّبُوْنَ مُحَمَّدَ بْنَ عَبْدِ اللّٰہِ فِيْ إِخْفَائِہٖ وَعَدَمِ ظُھُوْرِہٖ حَتّٰی عَزَمَ عَلَی الْخُرُوْجِ" (البدایۃ: ۱۰/ ۸۳)

''اہلِ مدینہ اور دوسرے لوگ محمد بن عبداللہ کو اس کی روپوشی پر ملامت کرتے رہے، یہاں تک کہ

اس نے حکومت کی مخالفت کا قطعی فیصلہ کر لیا اور وہ میدان میں آ گئے۔"

2 امام مالک رحمہ اللہ نے ان کی حمایت کا فیصلہ کیا اور لوگوں کو ان کی حمایت کے لیے کہا:

"قَدْ رَوَىٰ ابْنُ جَرِيْرٍ عَنِ الْإِمَامِ مَالِكٍ أَنَّهُ أَفْتَى النَّاسَ بِمُبَايَعَتِهِ، فَقِيْلَ لَهُ: فَإِنَّ فِي أَعْنَاقِنَا بَيْعَةً لِلْمَنْصُوْرِ؟ فَقَالَ: إِنَّمَا كُنْتُمْ مُكْرَهِيْنَ وَلَيْسَ لِمُكْرَهٍ بَيْعَةٌ" (البداية: ١٠/ ٤٤)

"امام مالک رحمہ اللہ نے محمد بن عبداللہ کی بیعت کا فتویٰ دیا، لوگوں نے کہا: ہم منصور کی بیعت کر چکے ہیں؟ امام رحمہ اللہ نے فرمایا: وہ جبراً تھی اور جبری بیعت کا کوئی اثر نہیں۔"

3 حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے بھی ان کی حمایت کی۔ گویا اصحابِ مدینہ اور علمائے کوفہ دونوں ان کی تائید میں متفق تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں امام اور ان کے رفقا رفض کی حمایت پر کیسے جمع ہو سکتے تھے اور اگر خلافِ سنت نظام ہی کو اختیار کرنا ہوتا تو پھر منصور اس سے بہتر تھا۔

4 اور مروان الحمار کے عہدِ حکومت میں عبد اللہ بن حسن کی بیعت خود خلیفہ منصور کر چکا تھا اور معلوم ہے کہ عباسی امرا میں رفض کے لیے کوئی جگہ نہیں۔

5 محمد بن عبداللہ نے اپنا نائب عثمان بن محمد بن خالد کو مقرر کیا اور قاضی عبدالعزیز بن مطلب کو قضا پر اور پولیس کا محکمہ عثمان بن عبداللہ بن عمر بن الخطاب کے سپرد کیا اور دیوان العطاء پر عبداللہ بن جعفر بن عبداللہ کو مقرر فرمایا۔[1] ان تمام حضرات میں کوئی بھی رافضی یا شیعہ نہیں۔

6 ان کے اساتذہ کا تذکرہ حافظ ابن کثیر نے صفحہ (۹۴) میں کیا ہے، ان میں کوئی بھی شیعہ نہیں، مثلاً عبداللہ، نافع، ابو الزناد۔ نسائی اور ابن حبان نے انھیں ثقہ فرمایا ہے۔ حافظ ابو عوانہ نے انھیں خارجی فرمایا ہے، لیکن یہ خارجی مذہبی نسبت نہیں، بلکہ غالباً منصور کے خلاف خروج کی وجہ سے لغتاً خارجی کہا گیا ہے۔ حافظ ابن حجر نے تہذیب التہذیب میں بھی ابو عوانہ کا یہ قول ذکر فرمایا ہے اور اسے رد کر دیا ہے۔[2]

7 خود شیعہ حضرات نے بھی محمد بن عبداللہ کو نہ سیاسی اہمیت دی ہے نہ دینی، بلکہ شیعی نوشتوں نے انھیں اور ان کی تحریک کو پسندیدہ نظر سے نہیں دیکھا اور حضرت مولانا محمد ابراہیم سے بہتر کون جانتا ہے کہ قدماء اہلِ بیت میں سے کوئی بھی شیعہ نہ تھا۔ شیعہ فرقہ بالمعنی المتعارف المصطلح صدیوں بعد کی پیداوار ہیں، گو اہلِ بیت نبوت علیہم السلام اس وقت کے رفقا سے بھی خوش نہ تھے اور نہ ہی اس وقت کے شیعہ حضرات نے ان بزرگوں کا صحیح طور پر ساتھ ہی دیا، بلکہ تقیہ کے غلط مفہوم نے انھیں ہمیشہ مستور اور مخفی رہنے کی عادت ڈال دی اور وہ

---

[1] البداية والنهاية (١٠/ ٨٤)

[2] دیکھیں: تهذيب التهذيب (٩/ ٢٢٤)

کبھی کھل کر اہلِ بیت کی اعانت نہ کر سکے۔

حضرات بزرگانِ اہلِ بیت نے بادل نخواستہ یہ رائے قائم فرمائی کہ ''خَذَلَتْنَا شِيْعَتُنَا''غرض یہ شیعیت مذہبی اور دینی سے زیادہ سیاسی شیعیت تھی، اس لیے محمد بن عبداللہ کی حمایت اور ائمہ اسلام کی ان کے ساتھ ہمدردیاں وحدتِ خیال ہی کی بنا پر تھیں، ایک شرعی اور دینی نظام کی تشکیل کے لیے تھیں، اس کا تعلق شیعہ سنی وحدت سے نہیں تھا، بلکہ اگر یہ تحریک محمد بن عبداللہ کے علاوہ کوئی سا آدمی بھی شروع کرتا، جس کا تعلق اہلِ بیت سے نہ ہوتا تو بھی ائمہ اسلام اس کی گردِ راہ کو آنکھوں کا سرمہ بناتے۔

عبداللہ بن حسن بن حسن رحمہ اللہ:

یہ مشہور تابعی ہیں۔ اپنے والد اور حضرت فاطمہ بنت حسین اور عبداللہ بن جعفر سے ان کا سماع ثابت ہے۔ کتبِ رجال میں پورے خاندان میں سے کسی کے متعلق بھی تشیع کا شبہہ نہیں کیا گیا۔ عبداللہ بن حسن کے تلامذہ میں سفیان ثوری رحمہ اللہ اور امام مالک رحمہ اللہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ ان کا احترام فرماتے تھے۔ یحییٰ بن معین فرماتے ہیں: ''ثقة صدوق''۔ ابراہیم بن عبداللہ کا تذکرہ رواۃِ حدیث میں نمایاں نہیں ہے۔ غرض پورے خاندان میں تشیع کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ ائمہ اسلام کا تعاون ایک اصولی تعاون تھا، چنانچہ پچھلے انتخابات میں مولانا محمد ابراہیم صاحب نے کرامت علی صاحب کی اعانت فرمائی۔

ہم جانتے ہیں کہ مولانا شیعہ نہیں، نہ ہی شیعہ کو حق پر سمجھتے ہیں، صرف سیاسی نظریے میں مولانا کو کرامت علی صاحب سے اتفاق تھا، اس لیے مولانا نے ہندوستان بنارس وغیرہ میں اپنے محسنوں سے بگاڑ لی۔ یہاں پر کرامت علی صاحب کے لیے اپنے پرانے ساتھیوں سے برسرِ پیکار ہوگئے اور گوجرانوالہ پر دو دفعہ حملہ آور ہوئے۔

اب بھی شائد وہی اثر ہے کہ مولانا کا رجحان اہلِ تشیع کی طرف روز بروز بڑھ رہا ہے۔ تعجب ہوا کہ بقولِ ''درِ نجف'' مولانا ''درِ نجف'' اپنی مسجد میں تقسیم فرماتے ہیں۔ إنا لله وإنا إليه راجعون!

آخر عمر میں یہ رجحانات افسوس ناک ہیں۔ ''الاعتصام'' پر ناراضگی کے لیے کچھ غلط یا صحیح وجہ یہ بھی تھی، مگر تعجب یہ ہے کہ مولوی عبدالمجید صاحب مدیر جریدہ ''اہلِ حدیث'' سوہدرہ منتیں کرتے مارے گئے اور یزیدی روح سے ممتاز فرما دیے گئے۔ ؎

محتسب کا نام بھی آ گیا زیرِ احتساب
مجلسِ اہلِ جام میں منکرِ جام آ گیا[1]

[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۳۱ راگست، ۲۱ ستمبر ۱۹۵۱ء)

شیعہ اور سنی علما کے لیے دعوتِ فکر
شیعہ سنی نظریات کی روشنی میں

شیعہ سنی تعلیمات پر غور کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ دونوں تعلیمات میں ایسے بنیادی اختلاف ہیں، جن میں تطبیق دینا کافی مشکل ہے۔ شیعہ پریس بدقسمتی سے ایسے ہاتھوں میں ہے جو سنجیدگی سے کسی معاملے پر غور کرنے کا عادی نہیں ہے۔ پچھلے دنوں حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب میر سیالکوٹی کے بعض ارشادات پر، جو شیعہ سنی نزاع کے متعلق تھے، میں نے اپنا نقطہ نظر بذریعہ ''الاعتصام'' عرض کیا تھا، اس میں حضراتِ شیعہ سے قطعاً خطاب نہ تھا، بلکہ حضرت مولانا سے ادباً گزارش تھی کہ جس تسامح اور سہل انگاری سے جناب کام لے رہے ہیں، آیا شیعی تعلیمات میں اس تسامح سے کسی فائدے کی امید کی جاسکتی ہے یا ان متضاد تعلیمات میں کوئی تطبیق بھی ممکن ہے؟

شیعہ تعلیمات میں بعض ایسے مسائل بنیادی طور پر موجود ہیں، جن کی موجودگی میں شیعہ سنی اتحاد اور اتفاق کا بہت کم امکان ہے۔ جب تک طرفین میں سے ایک فریق اپنے اصول کو قربان نہ کرے، شیعہ سنی اتحاد ناممکن ہے۔ مداہنت سے جو صلح ہوگی، وہ غلط ہونے کے علاوہ ناپائیدار بھی ہوگی۔

مولانا ہمارے ہیں۔ ہم ان کا احترام کرتے ہیں۔ ہم ان پر شکر رنجی کریں یا ان کی کرم فرمائیوں کی وجہ سے کوئی جسارت کر بیٹھیں، یہ ہمارا گھر کا مسئلہ ہے۔ مدیر ''در نجف'' یا کسی دوسرے بزرگ کے لیے اخلاقاً اس میں مداخلت کا حق نہیں، خصوصاً جب اندازِ سخن بحیثیتِ اہلحدیث ہو۔ ہم حضرت مولانا سے یہی گزارش کر رہے تھے کہ عقیدہ اہلحدیث کے لحاظ سے شیعہ سنی مصالحت ناممکن ہے۔ اس موضوع پر ہم نے بعض ایسے مسائل کے متعلق بطورِ مثال نشاندہی کی تھی جو شرعاً اور اخلاقاً باہمی مصالحت سے مانع تھے۔

آج کل شیعہ پریس مولانا جعفر حسین صاحب اور مولوی کفایت حسین صاحب سے اسلام کے دستوری مسائل سے متعلق برسرِ پیکار ہے، لیکن ہم نے اس میں مداخلت کی ضرورت نہیں سمجھی۔ وہ ان کا اپنا گھریلو مسئلہ ہے، حالانکہ ہم مولانا جعفر حسین صاحب اور مولانا کفایت حسین صاحب کو مظلوم سمجھتے ہیں اور شیعہ پریس انھیں ناحق دق کر رہا ہے اور اس ساری ہنگامہ خیزی کے پیچھے کوئی جذبہ رقابت کام کر رہا ہے، لیکن یہ چونکہ خالص شیعہ حضرات کا اندرونی مسئلہ ہے، اس لیے ہم اس میں خاموش ہیں۔

در نجف:

مدیر ''در نجف'' ہماری گزارشات سے بر اَفروختہ ہوگئے۔ وہ اگر ہمیں گالیاں دیتے تو ہم گوارا کرتے، لیکن حضرت مدیر نے حضرت المغفور مولانا ثناء اللہ صاحب، حضرت المحترم مولانا محمد حسین صاحب بٹالوی اور حضرت شیخ الاسلام امام المسلمین ابن تیمیہ حرانی رحمہ اللہ کی شان میں بے ادبی کی۔ یہ اندازِ بحث اخلاقی پستی کا ترجمان ہے۔ کوئی مذہبی جماعت اس اخلاقی انحطاط پر فخر نہیں کر سکتی۔

اس اخلاقی کمزوری کے باوجود اگر کچھ اصل موضوع پر فرمایا ہوتا تو ہم اس پر غور کرتے۔ مدیر محترم کے طویل و عریض مباحث پر غور کرنے سے بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ شیعہ سنی اتحاد ناممکن ہے اور یہی گزارش ہم نے حضرت مولانا سیالکوٹی سے کی تھی۔ تقیہ یا متعہ کا تذکرہ بطورِ بحث و تحقیق نہیں آیا تھا۔

اگر اس مسئلے پر کسی شیعہ عالم نے لکھا تو ہم وعدہ کرتے ہیں کہ نہایت سنجیدگی سے ہم اس پر غور کریں گے۔ مدیر ''در نجف'' ہمارے بزرگ ہیں اور ہمارے کرم فرما، ہم ان مباحث میں اُلجھنے کی انھیں تکلیف نہیں دیں گے۔ معلوم ہے کہ پانی بلونے سے کوئی فائدہ نہیں، ہمارا جواب وہی ہے، جو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو دیا تھا: إِنْ قُلْتُ لَمْ أَقُلْ إِلَّا مَا تَكْرَهُ، وَلَيْسَ لَكَ عِنْدِي إِلَّا مَا تُحِبُّ.[1]

مقطوع اور ناقص حوالوں کی کشید سے کوئی مسئلہ ثابت نہیں ہوا کرتا۔ صحیح راہ تحقیق کی یہ ہے کہ پہلے اسلام کے مزاج کو سمجھنا چاہیے اور ان مقاصد پر غور کرنا چاہیے، جو بوقتِ تشریع اسلام کے پیش نظر تھے، اس کے بعد مسئلے کے قائلین اور مخالفین کی طرف توجہ دینا چاہیے اور وجوہِ ترجیح کو ادلہ شرعیہ کے معیار پر پرکھنا چاہیے۔ ایک چیز دین کے مزاج سے متصادم ہے، اس کے قائلین کی طویل یا مختصر فہرست قائلین کی غلطی یا عدمِ اطلاع کا پتا دے سکتی ہے، اسلام اور دین کے مزاج کی تبدیلی کے لیے مفید نہیں ہوسکتی۔

فرض کیجیے! دس آدمی شہادت دیتے ہیں کہ زید نے آگ کھالی۔ اس شہادت پر غور کرنے سے پہلے ہمیں سوچنا ہوگا کہ آیا انسان آگ کھا سکتا ہے اور مزاجِ بشریت اس کا متحمل ہے کہ وہ آگ کو بطورِ خوراک کے استعمال کرے یا آگ کا مزاج اس استعداد کا حامل ہے کہ وہ کسی انسان کی غذا بن سکے۔ اگر مسئلہ یہیں ختم ہوجائے تو حوالوں کی بحث بے سود ہے۔ انسانی علوم میں سہو، نسیان، سوءِ فہم، قلتِ علم؛ ساری چیزیں موجود ہیں۔ ایسے حوالوں کے متعلق انتہائی طور پر یہی کہا جا سکتا ہے کہ قائل سے غلطی ہوئی ہے، وہ اجتہادِ صحیح کے نتائج پر نہیں پہنچ سکا۔ بھول، خطا، نسیان، قلتِ علم؛ ہر چیز ممکن ہے۔ اس کلیے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ سب لوگ شامل ہیں۔

[1] تاریخ دمشق (۳۹/۳۶۴۔۳۶۵)

﴿وَ مَاۤ اُبَرِّئُ نَفۡسِیۡ اِنَّ النَّفۡسَ لَاَمَّارَۃٌۢ بِالسُّوۡٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیۡ اِنَّ رَبِّیۡ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ﴾ [یوسف: ۵۳]

متعہ میں جس طرح ایک عورت بلا قید متعدد مردوں سے اختلاط کرتی ہے، آیا اسلام کا مزاج اس کا متحمل ہے؟ اہلِ بیت اور ائمہ نے اپنے عزیز و اقارب میں اس کی اجازت مرحمت فرمائی؟ ممتوعہ اولاد کا اعزاز اور حقِ ارث منکوحہ اولاد کی طرح تسلیم فرمایا؟ نکاح کی پابندیوں سے جو عورت کو اخلاقی اعزاز حاصل ہوتا ہے، خاوند کی محبت آمیز نگاہیں اس معصومہ کو جس اعزاز سے دیکھتی ہیں، آیا ممتوعہ بیوی بھی اسی نگاہ سے دیکھی جا سکتی ہے؟ اور اگر اس دفع الوقتی کو معصوم نکاح کا مقام حاصل نہ ہو تو بحث کے لیے بحث کوئی مفید مشغلہ نہیں، حالانکہ مسئلے کی نوعیت یہ ہے کہ مدیر ''در نجف'' ہماری تسکین کے لیے حوالہ کشی کی تکلیف فرما رہے ہیں اور قلبی کیفیت یہ ہے کہ سر جھکائے ہوئے پیشانی سے پسینہ صاف کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ''حقیقت یہ ہے کہ متعہ وغیرہ سے ہمیں بھی کوئی خاص دلچسپی نہیں۔'' ''وغیرہ'' اور ''خاص'' اور بھی دلچسپ ہیں۔ معلوم نہیں، محترم کی متعہ وغیرہ سے دلچسپی کب سے کم ہو رہی ہے؟ اگر ابتداے عمر سے ہے تو فطرت کی ترجمانی ہے اور اگر اب یہ جادو ہو گیا ہے تو ''وقتِ پیری....'' کا معاملہ ہوگا، یہ کوئی خوبی نہیں!!

امام اور اس کا مقام:

شیعہ سنی تعلیمات میں امام کا موقف اور مقام اسی طرح محلِ اختلاف ہے۔ قرآنِ حکیم کا ارشاد ہے:

﴿وَ جَعَلۡنَا مِنۡهُمۡ اَئِمَّۃً یَّهۡدُوۡنَ بِاَمۡرِنَا لَمَّا صَبَرُوۡا وَ کَانُوۡا بِاٰیٰتِنَا یُوۡقِنُوۡنَ﴾ [السجدۃ: ۲٤]

''ہم نے (بنی اسرائیل) کو امام بنایا، وہ ہمارے حکم سے راہنمائی کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ مصائب پر صبر اور آیاتِ الٰہیہ پر یقین ان کا دائمی شیوہ رہا۔''

یہاں صبر و یقین کے بعد وہ اوامرِ الٰہیہ کا مبلغ ہے اور بس!

بعض ائمہ کے متعلق فرمایا:

﴿وَ جَعَلۡنٰهُمۡ اَئِمَّۃً یَّدۡعُوۡنَ اِلَی النَّارِ﴾ [القصص: ٤٠]

یعنی بعض لوگوں کی امامت اس لیے ہے کہ وہ آگ کی طرف دعوت دیں۔

امام جہنم کا داعی بھی ہو سکتا ہے اور جنت کی بھی دعوت دے سکتا ہے۔ امامت بذاتِ خود اچھی بھی ہے اور بری بھی۔ جنت کے داعی وہی لوگ ہیں جو خدا تعالیٰ اور پیغمبر کی اطاعت کی دعوت دیں اور جہنم کے داعی وہ لوگ ہیں جو لوگوں کو اپنی برتری کی طرف دعوت دیں، اپنے اوصاف کا مظاہرہ کریں۔ ﴿ثُمَّ یَقُوۡلَ لِلنَّاسِ کُوۡنُوۡا عِبَادًا لِّیۡ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ﴾ [آل عمران: ۷۹]

وہ لوگوں کو کہتے ہیں کہ ہماری برتری پر یقین کرو۔ اگر ائمہ خود اپنی ذات کے لیے دعوت دیں تو وہ بھی مجرم ہیں اور ان کے معتقد اگر ان کی مبالغہ آمیز تعریف کریں اور ''مریدان مے پرانند'' کا معاملہ ہو تو بھی شیطانی دعوت کی دلیل ہے۔

اہلِ سنت میں امام:

اہل السنہ میں امام کا ٹھیک یہی مرتبہ ہے، نہ اس کے لیے گناہ سے معصوم ہونا ضروری ہے نہ غلطی سے پاک ہونا۔ اس کے اجتہادات صحیح ہوں یا غلط، قابلِ اجر ہیں، لیکن ظاہر ہونے کے بعد ان کی اطاعت ضروری نہیں ہے نہ ہی ان کے اتباع کا حکم۔ امام امیرِ قوم ہے یا امامِ نماز، وہ ایک طے شدہ راہ کا داعی ہے۔ اس کا علم کسی دوسرے علم سے ماخوذ ہے۔ اگر وہ اس طے شدہ راہ سے عمداً سرِ مو انحراف کرے، اسے اپنی جگہ سے الگ کر دیا جائے۔ نماز کی امامت سے شروع ہو کر تختِ حکومت تک، اس کی یہی پوزیشن ہے۔ قوم اس کی اقتدا پر خوش نہ ہو تو مولانا کو امامت سے معزول کر دیا جائے گا، مثلاً کفرِ بواح کا ارتکاب کرے یا نماز کو بالکل ترک کر دے تو ان حالات میں امارت قائم نہیں رہے گی، بلکہ امیر یا امام کو معزول کر دیا جائے گا۔

ویسے بھی اہلِ سنت کے نزدیک امیر کو قوم کے مشوروں کا پابند ہونا چاہیے۔ آنحضرت کو حکم دیا گیا ہے: ﴿وَ شَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ﴾ [آل عمران: ١٥٩] پیش آمدہ امور میں اپنے رفقا سے مشورہ کرو۔ عامۃ المسلمین کی تعریف فرمائی: ﴿وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ﴾ [الشوریٰ: ٣٨] ان کے کام مشورے سے طے پاتے ہیں۔

حضرت ابو ہریرہ فرماتے ہیں:

''مَا رَأَيْتُ أَحَداً أَكْثَرَ مَشُوْرَةً لِّأَصْحَابِه مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ'' [1] (معالم السنن، جلد: ٤)

''میں نے آنحضرت ﷺ سے زیادہ مشورہ کرتے کسی کو نہیں دیکھا۔''

اہلِ سنت کے نزدیک امام کو منصوص امور میں نصوصِ شرعیہ کا پابند ہونا چاہیے اور غیر منصوص امور میں اسے زیادہ سے زیادہ قابلِ اعتماد رفقا کے مشورے پر عمل کرنا چاہیے۔

اہلِ سنت کے نزدیک امارت نبوت کی طرح منصوص نہیں ہوتی، اس کے نصب و عزل میں عامۃ المسلمین کی آرا کو دخل ہے، اس کے اَعمال پر رعایا کو تنقید کا حق ہے اور کوئی ظالم و بے دین اس مسند پر قائم نہیں رکھا جا سکتا۔ ﴿لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ﴾ [البقرۃ: ١٢٤] میں یہ چیز بطورِ اصول کے پیشِ نظر رہے گی۔ کسی ظالم کو امت یہ مسند تفویض نہیں کرے گی۔ امیر وجوبِ اطاعت کے باوجود اہلِ سنت کے نزدیک تنقید و محاسبے سے بالا

[1] دیکھیں: سنن الترمذي (٤/ ٢١٣) سنن البیهقي (٩/ ٢١٨) حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رجاله ثقات إلا أنه منقطع" (فتح الباري [illegible])

نہیں، اس کے اعمال کو کتاب وسنت کے معیار پر پرکھا جائے گا۔ پیغمبر کی طرح اس کا ہر قول وفعل امت پر حجت نہیں، بلکہ امیر اور امت دونوں خدا اور رسول کے سامنے جواب دہ ہیں: ﴿فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ﴾ [النساء: ٥٩]

نزاع کے وقت بادشاہ اور رعیت دونوں کو کتاب وسنت کے سامنے خم ہونا پڑے گا۔

امام کی معصومیت:

اہلِ سنت کے نزدیک بالاتفاق امیر کی یہی حیثیت ہے اور یہی معقول ہے، جبکہ اس پر نہ وحی ہوتی ہے نہ الہام ہوتا ہے، نہ وہ نبوت کا مدعی ہے نہ اس کے لیے شرعاً عصمت ثابت ہے، ان حالات میں نہ وہ شوریٰ سے مستغنی ہوسکتا ہے نہ تنقید سے بالا۔ کسی تاویل سے بھی اسے اگر یہ حیثیت دی جائے تو ختمِ نبوت کا اقرار بالکل بے مقصد ہوجائے گا اور ختمِ نبوت کا عقیدہ بالکل بے جان ہوجائے گا۔ مامون، منصور، واثق، متوکل اور ابن ہبیرہ کے اعمال پر ائمہ سنت نے جس طرح محاسبہ فرمایا ہے، اس سے اہلِ سنت کا مسلک واضح ہے۔

تعلیماتِ شیعہ:

تعلیماتِ شیعہ میں صورتِ حال بالکل الگ ہے، ان کے ہاں ائمہ کی طرف وحی ہوتی ہے:

"أصل: قُلْتُ: اَلْإِمَامُ مَا مَنْزِلَتُهٗ؟ قَالَ: يَسْمَعُ الصَّوْتَ وَلَا يَرٰى وَلَا يُعَايِنُ الْمَلَكَ"
(الصافي الحجة: ٣/ ٢٩)

''امام فرشتے کی آواز سنتا ہے، لیکن اسے دیکھتا نہیں ہے۔''

"وَالْأَئِمَّةُ لَمْ يَفْعَلُوْا شَيْئًا وَلَا يَفْعَلُوْنَهٗ إِلَّا بِعَهْدٍ مِّنَ اللّٰهِ وَأَمْرٍ مِنْهُ لَا يَتَجَاوَزُوْنَهٗ"
(ص: ١٣٥)

''ائمہ خدا تعالیٰ کے عہد کے بغیر کوئی کام نہیں کرتے۔''

گویا حضراتِ شیعہ کے نزدیک امام کا علم براہِ راست خدا کے علم سے ماخوذ ہے۔ اسے فرشتہ دیکھنے کی بھی ضرورت نہیں، بلکہ نصوصِ شیعہ کا مفاد تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ائمہ کو سہو ہوتا ہے نہ نسیان، ان کا علم جبریل کے توسط سے بھی بالاتر ہے، حالانکہ انبیا کا علم جبریل کے واسطے سے ہے۔ حضراتِ شیعہ کے نزدیک ائمہ کا مقام انبیا سے بھی برتر ہے۔ ﴿كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ﴾ [الكهف: ٥]

امام ہر وقت موجود رہتا ہے:

"قُلْتُ لِأَبِي عَبْدِ اللّٰهِ: يَكُوْنُ الْأَرْضُ لَيْسَ فِيْهَا إِمَامٌ؟ قَالَ: لَا. قُلْتُ: يَكُوْنُ إِمَامَانِ؟ قَالَ: لَا إِلَّا وَأَحَدُهُمَا صَامِتٌ" (الصافي شرح الكافي: ٣/ ٣٥)

''کیا ایسا ممکن ہے کہ زمین میں کوئی امام نہ ہو؟ فرمایا: ایسا نہیں ہوسکتا۔ میں نے عرض کیا: کیا ایک وقت میں دو امام ہو سکتے ہیں؟ فرمایا: ایک کو چپ رہنا پڑے گا (جیسے آنحضرت ﷺ کے زمانے میں علی رضی اللہ عنہ خاموش رہے)۔''

لیکن معلوم ہے کہ حضرت موسیٰ اور ہارون دونوں امام بیک وقت کام کرتے رہے۔

اس قول سے ظاہر ہے کہ امام ہر وقت موجود ہوتا ہے، زمین کبھی امام سے خالی نہیں ہوتی۔ پھر فرماتے ہیں:

''قَالَ أَبُو عَبْدِ اللّٰهِ، قَالَ: سَمِعْتُهُ يَقُولُ: لَوْ لَمْ يَكُنْ فِي الْأَرْضِ إِلَّا اثْنَانِ لَكَانَ الْإِمَامُ أَحَدَهُمَا'' (۳/ ۳۸)

اگر دنیا میں دو ہی دو آدمی رہ جائیں تو ایک ان میں ضرور امام ہوگا۔

ان شیعی نصوص سے ذیل کے نتائج ظاہر ہوتے ہیں:

1. حضرات شیعہ کے نزدیک امام پر وحی نازل ہوتی ہے اور وہ خدا کا کلام سنتے ہیں۔
2. امام سے زمین کبھی خالی نہیں ہوتی۔
3. یہ سلسلہ قیامت تک رہے گا۔ اگر دو آدمی بھی دنیا میں رہ جائیں گے تو ایک ضرور امام ہوگا۔

ان ارشادات کے بعد غور فرمایئے کہ ختم نبوت یا انقطاع وحی کا کوئی مقصد باقی رہ جاتا ہے اور قادیانیت کا جرم اس سے کہاں تک زیادہ ہے؟ یا یہ ناسور صرف پرانا ہونے کی وجہ سے برداشت کیا جا رہا ہے؟ مجھے معلوم ہے کہ شیعہ ختم نبوت کے قائل ہیں، مگر ادباً گذارش ہے کہ اس سے فائدہ؟!

شیعہ سنی مصالحت پر غور کرنے والے آیا اس خلیج کو پاٹنے کی کوئی تجویز پیش کریں گے؟ حضراتِ شیعہ ناراض نہ ہوں، بلکہ کوئی عملی تجویز ارشاد فرمائیں، تاکہ اس پر غور ہو سکے۔ گالیاں دراصل مسئلے کا حل نہیں۔ میری آرزو ہے کہ شیعہ پریس پر حضرات علما کا بھی اقتدار ہو، تاکہ مسائل کی علمی تقادیر پر بھی غور ہو سکے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے حضراتِ شیعہ میں کوئی مفکر نہیں دیکھا۔ جذبات سے وقتی ہیجان تو ہوسکتا ہے، مگر طمانیتِ قلب حاصل نہیں ہوسکتی۔

آنحضرت ﷺ اور حضرت علی:

''عَنْ أَبِي بَصِيرٍ قَالَ: قُلْتُ لِأَبِي عَبْدِ اللّٰهِ: إِنَّمَا أَنْتَ مُنْذِرٌ، وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ، فَقَالَ: رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ الْمُنْذِرُ، وَعَلِيٌّ الْهَادِيُّ'' (حجة، ص: ۷۰)

ارشاد ہوتا ہے کہ قرآن عزیز نے جس منذر اور ہادی کا ذکر فرمایا ہے، اس میں منذر تو آنحضرت ﷺ

ہیں اور حضرت علی ہادی ہیں۔ گویا آنحضرت ﷺ صرف منذر ہیں اور تمام اقوام کی ہدایت حضرت علی کے ذمے ہے۔ غور طلب مسئلہ یہ ہے کہ دونوں سے افضل کون ہے؟ پھر آیا سیاق و سباق اس تفسیر کا متحمل بھی ہے؟ آیت کا مفہوم بلحاظ سیاق و سباق تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں منذر اور ہادی دونوں آنحضرت ﷺ کی صفات ہیں۔ ہمارے محترم بزرگ حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب غور فرمائیں، آیا قرآن کا مفاد یہی ہے جو (حسبِ روایتِ شیعہ) حضرت امام جعفر نے فرمایا؟

ابو عبداللہ فرماتے ہیں:

"فِي قَوْلِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ: ﴿وَ لِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا﴾ قَالَ: نَحْنُ وَاللّٰهِ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰى الَّتِي لَا يَقْبَلُ اللّٰهُ مِنَ الْعِبَادِ عَمَلًا إِلَّا بِمَعْرِفَتِنَا" (كافي، توحيد: ٢/ ٢٢٢)

ہم یعنی اہلِ بیت ہی اسماے حسنیٰ ہیں۔ تمام مخلوق کے اعمال ہماری معرفت ہی قبول ہو سکتے ہیں۔ گویا خدا تعالیٰ کوئی عمل قبول ہی نہیں فرما سکتے۔ اگر یہ پابندی فی الواقعہ صحیح ہو تو پھر خدائی کہاں باقی رہی؟!

بارش اور پھلوں کا سبب:

ابو عبداللہ فرماتے ہیں:

"إِنَّ اللّٰهَ خَلَقَنَا فَأَحْسَنَ خَلْقَنَا، وَصَوَّرَنَا فَأَحْسَنَ صُوَرَنَا، وَجَعَلَنَا عَيْنَهُ فِي عِبَادِهِ وَلِسَانَهُ النَّاطِقَ فِي خَلْقِهِ وَيَدَهُ الْمَبْسُوطَةَ عَلٰى عِبَادِهِ بِالرَّأْفَةِ وَالرَّحْمَةِ، وَ وَجْهَهُ الَّذِي يُؤْتٰى مِنْهُ، وَبَابَهُ الَّذِي يَدُلُّ عَلَيْهِ، وَخُزَّانَه فِي سَمَائِهِ وَأَرْضِه، بِنَا أَثْمَرَتِ الْأَشْجَارُ وَ أَيْنَعَتِ الثِّمَارُ، وَجَرَتِ الْأَنْهَارُ، بِنَا يَنْزِلُ غَيْثُ السَّمَاءِ وَيَنْبُتُ عَشِيْبُ الْأَرْضِ، وَبِعِبَادَتِنَا عُبِدَ اللّٰهُ، وَلَوْلَا نَحْنُ مَا عُبِدَ اللّٰهُ" (كافي، توحيد: ٢/ ٢٢٣)

یعنی اہلِ بیت خدا کی آنکھ ہیں اور وہی اس کی زبان اور رحمت کا ہاتھ ہیں، وہی حضرات اس کا منہ ہیں اور دروازہ جہاں سے اس کی ملاقات ہو سکتی ہے۔ زمین اور آسمان میں وہی اس کے خزانچی ہیں، درختوں کے پھل، پھلوں کا پکنا اور دریاؤں کا چلنا، بارشوں کا برسنا، گھاس کا اگنا ہماری وجہ سے ہے۔ اگر ہم نہ ہوتے تو خدا کی عبادت ہی نہ ہوتی۔

قرآن مجید میں بارش برسانا، درخت اُگانا، پھل پیدا کرنا، دریا چلانا، آسمان اور زمین کے تمام مغیبات کے خزانوں کا مالک اللہ تعالیٰ کو قرار دیا گیا ہے اور یہاں یہ سب چیزیں اہلِ بیت کے قبضہ و اقتدار میں ہیں، حتی کہ خدا تعالیٰ کو ان کا ممنون ہونا چاہیے کہ اگر یہ بزرگ نہ ہوتے تو خدا کو کون پوچھتا اور خدائی کا کاروبار کیسے چلتا؟!

قرآنِ عزیز میں ارشاد ہے:

﴿ وَ لَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ سَخَّرَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۝ اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَ يَقْدِرُ لَهٗ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝ وَ لَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ نَّزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ مَوْتِهَا لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ﴾ [العنکبوت: ٦١ تا ٦٣]

مشرکینِ عرب کا بھی اس بات پر اتفاق تھا کہ آسمان اور زمین کا مالک و خالق اللہ ہی ہے۔ سورج اور چاند کی تسخیر اسی کی قدرت کی کرشمہ سازی ہے۔ رزق کی تنگی اور پھیلاؤ بھی اسی کے علم کا نتیجہ ہے۔ آسمان سے پانی اتار کر اس نے زمین کو زندہ کیا۔ یہ کفارِ مکہ مانتے تھے، لیکن اکثر ان میں سے بے عقل ہیں۔ نیز فرمایا:

﴿وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ جَنّٰتٍ وَّحَبَّ الْحَصِيْدِ ۝ وَالنَّخْلَ بٰسِقٰتٍ لَّهَا طَلْعٌ نَّضِيْدٌ ۝ رِّزْقًا لِّلْعِبَادِ وَاَحْيَيْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا كَذٰلِكَ الْخُرُوْجُ﴾ [ق: ٩ تا ١١]

''ہم نے آسمان سے بابرکت پانی اتارا اور اس سے باغ کھیتیاں اور لمبی کھجوریں پیدا کیں، جن پر کھجوروں کی تہیں لگی ہوئی ہیں، زمین کی اسی زندگی سے آخرت کی زندگی پر بھی یقین ہو جانا چاہیے۔''

قرآنِ مجید ان تمام مظاہرِ قدرت کو خدا تعالیٰ کی طرف براہِ راست منسوب فرماتا ہے اور اس معاملے میں نہ کسی امام کا واسطہ اور ذریعہ مذکور ہے نہ کسی عالم اور صوفی کا، حتیٰ کہ کسی پیغمبر کی مداخلت بھی اس میں گوارا نہیں فرمائی گئی۔ براہِ راست اسی کی کرشمہ سازیاں ہیں، بلکہ وہاں تو یہاں تک ارشاد ہے کہ حضراتِ ائمہ عظام اور اولیائے کرام اور حضراتِ اہلِ بیت سے کوئی بھی ان چیزوں کی پیدایش کے وقت موجود نہ تھا:

﴿مَاۤ اَشْهَدْتُّهُمْ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ لَا خَلْقَ اَنْفُسِهِمْ وَ مَا كُنْتُ مُتَّخِذَ الْمُضِلِّيْنَ عَضُدًا﴾ [الکہف: ٥١]

ائمہ اہلِ بیت تو بہر حال آنحضرت ﷺ کے بعد پیدا ہوئے، ان کا زمانہ کافی بعد کا ہے۔ آسمان، زمین، بادل، درخت، پھل، عباداتِ الٰہی کی محفلیں ہزارہا سال پہلے دنیا میں موجود تھیں۔ تعجب ہے کہ یہ تمام خزائن خازن حضرات کے توسط کے بغیر ہی تقسیم ہوتے رہے۔ دنیا کی عبادتیں حضراتِ ائمہ کی بے خبری ہی میں آسمان پر جاتی رہیں۔ انبیا، صلحا اپنے اعمال کی جزا کے مستحق قرار پاتے رہے۔ اعمال انسان کرتا ہے، اس کی قبولیت، اس کے شرائط و کوائف سب اللہ تعالیٰ کو معلوم ہیں اور انبیا کو معلوم ہے کہ ان کی شرائع میں کس عبادت کا کونسا مقام ہے، پھر اس رد و قبول میں اہلِ بیت اور ائمہ حضرات کو بے ضرورت مداخلت کی تکلیف دینا کچھ بھلا معلوم نہیں دیتا۔

قرآن کا طالب علم ان شیعی نصوص اور قرآن کی نصوص سن لینے کے بعد حیرت زدہ ہو جاتا ہے۔ انسانی فہم تو اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ یہ سارا لٹریچر مشکوک ہے اور مشتبہ۔ توحید کا مضمون پورے قرآن میں پھیلا ہوا ہے اور وہ اس میں کسی لچک اور نرمی کی اجازت نہیں دیتا۔

﴿ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا وَ اِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ﴾ [البقرة: ١٣٧]

ہدایت کی ایک ہی صورت ہے کہ وہ تمھاری طرح ایمان لائیں۔

﴿قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَ مَنِ اتَّبَعَنِيْ﴾ [یوسف: ١٠٨]

''یہ میری ہی راہ ہے، جس کی طرف میں پوری بصیرت کے ساتھ دعوت دے رہا ہوں۔''

نور کیا ہے؟

آیت سورۂ توبہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

''اَلنُّوْرُ: فَاطِمَةُ، مِصْبَاحٌ: اَلْحَسَنُ، اَلزُّجَاجَةُ: اَلْحُسَيْنُ، شَجَرَةٌ مُبَارَكَةٌ: إِبْرَاهِيمُ، نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ: إِمَامٌ بَعْدَ إِمَامٍ''

کہیں نور سے مراد حضرت علی ہیں۔ کہیں تمام ائمہ کو نور کا مصداق بتایا گیا ہے۔ کہیں ہر امامِ وقت کو نور فرمایا گیا ہے۔ حضرت علی کی ولایت کو بھی نور سے تعبیر فرمایا ہے، امارت کو بھی نور کا عنوان دیا گیا ہے۔

آنحضرت ﷺ اور علی رضی اللہ عنہ:

''عَنْ أَبِيْ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ: مَا جَاءَ بِهِ عَلِيٌّ عليه السلام أُخِذَ بِهِ، وَمَا نَهٰى مِنْهُ انْتَهٰى عَنْهُ، جَرٰى لَهُ مِنَ الْفَضْلِ مِثْلُ مَا جَرٰى لِمُحَمَّدٍ ﷺ الْفَضْلُ عَلٰى جَمِيْعِ مَنْ خَلَقَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ، اَلْمُتَعَقِّبُ عَلَيْهِ فِيْ شَيْئٍ من احكامه كَالْمُتَعَقِّبِ عَلَى اللّٰهِ وَرَسُوْله، وَالرَّادُّ عَلَيْهِ فِيْ صَغِيْرَةٍ أَوْ كَبِيْرَةٍ عَلٰى حد الشِّرْكِ بِاللّٰهِ، كَانَ أَمِيْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ بَابًا لِلّٰهِ الَّذِيْ لَا يُؤْتٰى إِلَّا مِنْه، وَسَبِيْلَهُ الَّذِيْ مَنْ سَلَكَ بِغَيْرِهٖ هَلَكَ'' (٣/ ٨٤)

''حضرت علی جو فرمائیں، اس کی اطاعت کی جائے۔ جن چیز سے روکیں، اس سے رکنا ضروری ہے۔ حضرت علی کو ساری مخلوق پر اس قدر فضیلت ہے، جس قدر آنحضرت ﷺ کو حاصل ہے۔ آپ کے احکام کا تعاقب اللہ اور آنحضرت ﷺ پر تعاقب کے برابر ہے اور آپ کی چھوٹی یا بڑی بات کو رد کرنا شرک ہے۔ امیر المومنین کے سوا جو راہ ہے اس میں تباہی کے سوا کچھ نہیں۔''

قرآنِ عزیز نے آنحضرت ﷺ کے متعلق فرمایا تھا:

﴿ وَمَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا﴾ [الحشر: ۷]

لیکن یہاں یہ حکم حضرت علی کے متعلق دیا گیا ہے!!

1. حضرت علی پر تعاقب درست نہیں ہے۔
2. حضرت علی جو بھی فرمائیں، اس کے خلاف کہنا شرک ہے۔ (یہاں شرک کا استعمال عجیب ہے)
3. حضرت علی کی راہ کے سوا سب گمراہی کی راہیں ہیں۔ (گویا آنحضرت ﷺ بھی!)

سوچنا یہ ہے کہ اس کے بعد نبوت کی ضرورت ہے؟ اور اس کے بعد نبوت کی حیثیت کیا ہے؟ اگر حضرت علی کا کوئی قول آنحضرت ﷺ کے ارشاد سے متصادم ہو تو ترک کس کو کیا جائے؟ اگر آنحضرت ﷺ کے ارشاد کو ترجیح دی جائے تو "سَبِیْلَهُ الَّذِيْ مَنْ سَلَكَ بِغَيْرِهِ هَلَكَ" کا مصداق تو نہ ہوگا؟ اس نص کی موجودگی میں نبوت اور امامت میں محض لفظی فرق ہی باقی رہے گا، حقیقت میں دونوں برابر ہوں گی، بلکہ امامت کا مقامِ الوہیت پر بھی جزوی سا قبضہ ہوگا۔

ارکان الارض:

"الأئمة جعلهم الله أركان الأرض أن تميد بأهلها، و حجة الله علىٰ من فوق الأرض ومن تحت الثرى" (أصول كافي، ص: ۸۵)

''ائمہ زمین میں ارکان (پہاڑ) کی طرح ہیں، تاکہ وہ ہل نہ سکے اور ائمہ زمین کے اوپر آباد ہونے والی مخلوق کے لیے بھی حجت ہیں اور تحت الثریٰ کے لیے بھی۔''

تحت الثریٰ کے لیے حجت خوب رہی، آیا وہاں آبادی ممکن ہے اور پھر وہ خطابِ شرعی کی اہلیت بھی رکھتے ہیں؟ آنحضرت ﷺ کی نبوت تو آسمان و زمین تک ہی محدود تھی، ائمہ کا مقام اس لحاظ سے آنحضرت ﷺ سے بھی سوا ٹھہرا۔

حضرت علی فرماتے ہیں:

"أنا قسيمُ الجنة والنار، وأنا الفاروق الأكبر، أنا صاحب العصا و الميسم" الخ
(حجة: ۳/ ٤٥)

میں جنت اور دوزخ کو تقسیم کروں گا۔ میں فاروقِ اکبر ہوں۔ میرے پاس حضرت موسیٰ کا عصا ہے اور حضرت سلیمان کی مہر۔''

کس قدر جامعیت ہے اور کس قدر وسیع اختیارات ہیں!!

اسی روایت کے بعض الفاظ میں فرمایا:

"مَا يَعْزُبُ عَنِّي مَا غَابَ" "کوئی غیب مجھ سے پوشیدہ نہیں ہے۔"

گویا حضراتِ ائمہ علمِ غیب سے بھی پوری طرح واقف ہیں۔ قرآنِ مجید میں ارشاد ہے:

﴿وَ عِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ﴾ [الأنعام: ٥٩]

"اللہ کے سوا غیب کوئی نہیں جانتا۔"

لیکن ان نصوص کی موجودگی میں ایمان کا خدا حافظ! پھر اسی روایت میں آیا ہے:

"إِنِّي لَصَاحِبُ الْعَصَا وَالْمِيْسَم، وَالدَّابَةُ الَّتِي تُكَلِّمُ النَّاسَ" (حجة: ٣/ ٩٠)

"میں ہی دابۃ الارض ہوں۔" سبحان اللہ! ائمہ شیعہ کیا کچھ ہیں؟!

یہ بھی ارشاد ہوتا ہے کہ امامت کا شرف، شرفِ نبوت کے برابر ہے۔ یہ خدا اور رسول کی خلافت ہے اور حسن اور حسین کی میراث، پھر ارشاد فرماتے ہیں:

"الإمام يحل حلال الله ويحرم حرام الله" "امام کو حلال وحرام کا اختیار ہے۔"

امامت کے ان اوصاف پر مزید غور فرمائیے:

"الأئمة إذا شاؤا أن يعلموا شيئا أعلمهم الله إياه، وهم يعلمون متى يموتون، ولا يموتون إلا باختيارهم، وهم يعلمون علم ما كان وما يكون، ولا يخفى عليهم شيء" (ص: ١٢٥، ١٢٦)

"امام جب کوئی چیز جاننا چاہیں، خدا انھیں بتا دیتا ہے، انھیں موت کا وقت معلوم ہوتا ہے، اور وہ اپنی مرضی سے مرتے ہیں۔ وہ لوگوں کی طرح موت پر مجبور نہیں ہیں اور ما کان وما یکون سے پوری طرح واقف ہیں۔"

ان تعلیمات پر اہلِ سنت کو سوچنا چاہیے کہ کہاں تک وہ ان سے مطمئن ہو سکتے ہیں اور ائمہ سنت کے مسلک میں ان کے لیے کہاں تک گنجایش ہے؟ اسلامی تعلیمات کی تطبیق ان تعلیمات سے کہاں تک ممکن ہے؟

ائمہ پر اعمال کا عرض:

"إن أعمالكم تعرض عليَّ في كل يوم وليلة، فاستعظمت ذلك فقال: أما تقرأ كتاب الله عز و جل: وقل اعملوا فسيرى الله عملكم ورسوله والمؤمنون؟ قال: هو والله علي بن أبي طالب" (حجة: ٣/ ١٤٠)

"امام رضا فرماتے ہیں کہ تمھارے اعمال مجھ پر صبح وشام پیش کیے جاتے ہیں۔ مجھے یہ مستبعد معلوم

ہوا تو فرمایا: تم نے قرآن نہیں پڑھا کہ اللہ اور رسول اور مومن تمھارے اعمال دیکھیں گے۔ خدا کی قسم! اس سے حضرت علی مراد ہیں۔''

یہ محکمہ معلوم نہیں کب سے حضراتِ علما کے سپرد فرمایا گیا ہے؟ یہ اعمال صرف شیعہ حضرات کے ہیں یا ساری دنیا کے؟ اس کے لیے معلوم نہیں کتنا سٹاف رکھا گیا ہے؟ ہم تو ہفتے کے بعد عرضِ اعمال کی روایات کو بھی قابلِ اعتماد نہیں سمجھتے تھے، یہاں روز مرہ کا مسئلہ ہے اور وہ بھی ایک ہی آدمی سے متعلق؟!

جفر الجامعہ اور مصحفِ فاطمہ:

جفر الجامعہ اور مصحفِ فاطمہ کے متعلق عجیب ارشاد ہے۔ جفر تو ایک گائے کا چمڑا ہے، جس میں علم بھرا گیا ہے اور الجامعہ اونٹ کی ٹانگ کی طرح ستر ہاتھ لمبی کتاب ہے، اس میں دنیا کے تمام معاملات مرقوم ہیں اور مصحفِ فاطمہ در اصل عزا کے کلمات تھے جو جبریل آنحضرت ﷺ کے انتقال کے بعد حضرت فاطمہ کو بتاتے رہے، ان میں ان کی اولاد کے متعلق ہونے والے واقعات کا بھی تذکرہ تھا۔ حضرت علی انھیں چپکے سے لکھتے رہے۔ یہ مصحف تمھارے قرآن سے تین گنا بڑا ہے، اس میں اس قرآن کا ایک حرف بھی نہیں۔ (حجۃ: ۳/ ۱۸۰ تا ۱۸۴)

اہلِ بیت کے پاس تمام انبیا کے معجزات تھے۔ عصائے موسیٰ اور وہ اسی طرح سبز ہے، جس طرح وہ اس وقت سبز تھا، جب اسے موسیٰ علیہ السلام نے درخت سے کاٹا تھا۔ اسے اگر بلایا جائے تو بولتا ہے اور وہ ہر چیز کو کھا جائے گا، اس کا منہ چالیس ہاتھ کھلا ہوگا۔ (حجۃ: ۳/ ۱۶۳)

یہ شیعہ حضرات کے نزدیک اصول دعقیدے کی چیزیں ہیں اور اہلِ سنت شاید اسے سن کر ہنس دیں۔ فرمایئے! اتحاد و اتفاق کی صورت کیا ہو؟

اسمِ اعظم کا علم:

اسمِ اعظم کے کل ۷۳ حرف ہیں۔ ۷۲ اہلِ بیت کو معلوم ہیں اور خدا تعالیٰ کو پورے ۷۳ حروف معلوم ہیں۔ آنحضرت کو بھی ۷۳ ہی معلوم ہیں۔ (حجۃ: ۳/ ۱۶۱)

پھر ارشاد ہوتا ہے:

''من قال إنه جمع القرآن كلّه سوىٰ علي بن أبي طالب فقد كذب'' (حجة: ۲/ ۱۸۵)

''جس نے کہا کہ حضرت علی کے سوا کسی نے سارا قرآن جمع کیا ہے، وہ جھوٹا ہے۔''

اب اہلِ سنت سوچ لیں کہ وہ ان اصولوں پر کہاں تک متفق ہو سکتے ہیں اور حضرات شیعہ بھی سوچ لیں کہ وہ کہاں تک مراعات دے سکتے ہیں؟ اس کے بعد فریقین کے مفکر فیصلہ فرما سکیں گے کہ کیا یہ دونوں

جماعتیں مل سکتی ہیں؟!

بعض شیعہ جرائد تعزیے کے تماشے میں عوام کی شرکت سے یہ سمجھ رہے ہیں کہ شیعہ سنی اتحاد ہو گیا اور دنیا روشن خیال ہو گئی۔ یہ بچوں کی سی بات ہے۔ جب تک حقائق کو سمجھ کر ایک جماعت دوسری کے قریب نہ ہو، مصالحت کبھی پائیدار نہیں ہوتی۔ آج سے چند سال پہلے ہندو مسلم اتحاد اسی انداز سے ہوا۔ فریقین نے ایک دوسرے کو جذبات میں آکر سمجھنے کی کوشش نہ کی، اس کے نتائج کس قدر تلخ ہوئے؟ سن ۴۷ء کا انقلاب اس کا گواہ ہے۔ لاکھوں جانیں ضائع ہوئیں اور ہزاروں عصمتیں برباد ہوئیں، اس لیے اس تماشائے اتحاد پر خوش ہونا عقلمندی نہیں۔ ہم اس موضوع پر لکھتے رہیں گے، تاکہ فریقین کے لیڈر جذبات سے بالا رہ کر حقائق پر سمجھنے کی کوشش کریں۔

شعائرِ الٰہیہ کی توہین:

تعزیے کی موجودہ صورت نہ اہلِ سنت کے نزدیک درست ہے نہ حضراتِ شیعہ کی مستندات اس کھیل کی تائید کرتی ہیں۔ یہ ایک بزنس ہے، جسے بزنس ہی کے نقطہ نظر سے کیا جا رہا ہے۔ اس میں مصارف سے خاصی زیادہ آمدن ہو جاتی ہے۔ معقول اور سنجیدہ آدمی آرام سے چلتے ہیں، عوام اور مزدور بے چارے پیٹ پیٹ کر بے حال ہو جاتے ہیں۔ اژدہام کی حیثیت تماشائیوں کی ہوتی ہے۔ عورتوں کی شرکت اور اس کے نتائج سے ایک شریف آدمی کی گردن شرم سے جھک جاتی ہے۔ یہ رسمی عزا پوری قوم کے اخلاق کے لیے موت کا پیغام ہے اور مداہنت اور دیوثی کا اس سے کامل مرقع ملنا مشکل ہوگا۔

حضرت امام حسین کی شہادت ایک مقدس اور درد انگیز سانحہ ہے، لیکن اس کے ساتھ یہ نقالی اور بازاری تماشا بدترین توہین ہے۔ عبادت اور شہادت کی نقالی، ممکن ہے شیعہ اسے جائز سمجھیں۔ اہلِ سنت تو اسے کسی طرح بھی جائز نہیں سمجھتے۔ یہ معصیت ہے اور کبیرہ گناہ اور شعائر اللہ کی بدترین توہین۔ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ اس سے بڑا ظلم نہیں ہو سکتا کہ جو قربانی ظلم کے مقابلے میں کامل ایثار اور خلوص سے دی گئی تھی، آج اسے ذاتی منفعت کے لیے ایک بزنس اور تماشے کی صورت دے دی گئی ہے!!

اہلِ سنت کو حضراتِ اہلِ بیت سے سچی محبت ہے۔ وہ کبھی گوارا نہیں کریں گے کہ ایک مقدس امام کی مقدس قربانی کے ساتھ یہ بد مذاقی کی جائے۔

مہاجرین کی آمد اور حکومت کی مشکلات کے سبب دو تین سال اس بیہودگی کے خلاف آواز نہیں اٹھائی گئی۔ ہمارے محترم معاصر ''دعوت'' نے اس پر بڑی سنجیدگی سے لکھا ہے۔ حکومت، شیعہ لیڈر اور اہلِ سنت کے اصحابِ اثر اس چیز پر سوچ لیں کہ ہم تعزیے کی عرفی صورت کو امام حسین اور اہلِ بیت کی توہین سمجھتے ہیں، سرِ بازار اس اخلاقی انارکی کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ حکومت کو بھی لائسنس دیتے وقت غور کر لینا چاہیے۔

یہ عجیب صلح ہے کہ شیعہ حضرات تو اپنی غلط نوازیوں سے ایک اِنچ سر کنے کے لیے تیار نہیں ہیں، اہلِ سنت کی مساجد کے سامنے اس طرح امام حسین کی توہین کی جاتی ہے اور اہلِ سنت سے وسعتِ ظرف کی اپیل بھی کی جاتی ہے۔

کیا ساری روشن خیالی اہلِ سنت ہی کے لیے الاٹ کر دی گئی ہے؟ شیعہ حضرات بھی تو کچھ روشن خیالی اور وسعتِ ظرف کا ثبوت دیں۔ وہ تعزیہ ایسے محلوں اور گھروں سے لے جائیں، جہاں شیعہ حضرات کی کثرت ہے۔ ہم جب عزا کی اس صورت کو کبیرہ گناہ سمجھتے ہیں تو ہمیں اس کی نمایش پر کیوں مجبور کیا جاتا ہے؟!

بچارے ذوالجناح کی جس طرح مٹی پلید کی جا رہی ہے، یہ ہمارے اور شیعہ حضرات کے لیے شرمناک ہے۔ ٹانگے کا گھوڑا کرائے پر لے کر وقت نکال لیا جاتا ہے۔ کیا امام حسین جنگ میں کرائے کا گھوڑا لے کر شریک ہوئے تھے؟ ہم سب کو ان خرافات پر شرم آنی چاہیے۔ شہادت ایسی مقدس عبادت کو فجار و فساق کے ہاتھوں تماشا بنا دینا شہادت ایسے شعائر کی توہین ہے، جسے گوارا نہیں کیا جائے گا۔

شیعہ تعلیمات میں اخلاقی کمزوریاں:

شیعی لٹریچر پاکستان میں بہت کم دستیاب ہوتا ہے اور جو ملتا ہے، وہ اتنا گراں ہے کہ ایک متوسط الحال آدمی کے لیے اس کا خریدنا کافی مشکل ہے۔ میرے پاس بھی کافی اور ایک آدھ کتاب کے سوائے کوئی کتاب نہیں۔ اس لٹریچر کے مطالعہ میں میری حیثیت ایک طالب علم کی ہے۔ اگر شیعہ اہلِ علم ان گزارشات پر غور فرما کر سنجیدگی سے جواب دیں تو ممکن ہے مجھے اس سے کچھ فائدہ ہو سکے۔

شیعی جرائد جن ہاتھوں میں ہیں، یہ تبلیغی لحاظ سے قطعی غیر موزوں ہیں۔ یہ بیچارے نہ اپنا مسلک سمجھتے ہیں، نہ دوسرے کا مطلب سمجھنے کی کوشش فرماتے ہیں۔ گالیاں دے کر حق طلب آدمی کا منہ بند کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے ان حضرات سے کسی علمی مشکل کے حل کی امید رکھنا بے سود ہے۔ گالیاں تو کسی مسئلے کا حل نہیں۔ جن لوگوں کا مبلغِ علم یہ ہو کہ متعۃ النکاح کے جواز میں متعۃ الحج کی روایات پیش فرمانا شروع کر دیں، ایسے متنازع فیہ مسائل کے حل کی کیا امید رکھی جائے، جس میں دو طرفہ بصیرت کی ضرورت ہو؟ اسی امید پر کہ شاید کوئی نیک دل اور عقلمند شیعہ ان مخلصانہ گزارشات پر غور کرے، بحوالہ ''الاعتصام'' پیش کی جا رہی ہیں۔

مذہب میں اخلاق کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ جس طرح اسلام کو اخلاقی تعلیمات کی وجہ سے باقی مذاہب پر فوقیت اور برتری حاصل ہے، اسی طرح اسلامی فرقوں میں حق و باطل کے امتیاز میں اخلاق کا معیار کافی اہمیت رکھتا ہے۔ فقہی جزئیات میں ہر فرقے کے فقہا نے بعض اوقات اس معیار کو نظر انداز فرمایا ہے۔ ان کی لغوی توجیہات اور منطقی دلائل کو علمی طور پر کتنی اہمیت دی جائے، اخلاقی طور پر اس میں تساہل یقیناً نامناسب ہے۔ فقہ الحدیث کے موضوع پر لکھنے والے اہلِ علم نے بھی بعض جگہ لغزش کھائی ہے۔

فقہائے حنفیہ:

ہدایہ اور فقہ حنفیہ کے دوسرے متون اور شروح میں کتاب الحدود پڑھتے وقت ''من أتی بهیمة فلا حد علیه'' [1] اور ''من عمل عمل قوم لوط فلا حدّ علیه'' [2] ازیں قسم کے مسائل کا ذکر آتا تو حضرات اساتذہ اور شراح کے بیانات میں فقہ اور ادب کے بہت سے مفید معلومات حاصل ہوتے۔ ''اِدرَؤا الحدودَ بالشبهات'' اور اقسامِ شبہات سے بہت سی مشکلات حل ہوتی ہیں، لیکن اس نقطہ نوازی سے جو اخلاقی اثرات پیدا ہوئے، طلبہ ان مباحث سے جس طرح متاثر ہوئے، اس سے اخلاقی انحطاط کی بہت ہی راہیں پیدا ہوئیں۔ حیلے تراشے جاتے، اس کا اثر طلبہ کی اخلاقی حالت پر بھی پڑتا۔ جن میں قرآنِ عزیز اور سنت کی تعلیمات کا اثر غالب ہوتا، وہ اس اخلاقی تشنگی کو بری طرح محسوس کرتے اور منطقی اور لغوی مباحث مزید تشنگی کا موجب ہوتے۔ جدید تصنیفات میں بعض کتابیں فقہ الحدیث کے موضوع پر لکھی گئی ہیں، ان میں کسی فقہی مسلک کو تقلیداً گو اختیار نہیں کیا گیا، لیکن یہ کمی ان میں پھر بھی نمایاں ہے کہ فقہی اور لغوی موشگافیوں میں اخلاقی مقادیر کا پورا لحاظ نہیں رکھا گیا۔

شیعہ تعلیمات کی بعض خوبیاں:

میں نے چند دنوں سے شیعہ لٹریچر کو اسی اخلاقی نقطہ نظر سے دیکھنا شروع کیا تو جہاں متعہ ایسے غیر اخلاقی مسائل دیکھنے میں آئے، وہاں بعض خوبیاں بھی معلوم ہوئیں۔ گو میں مسلکِ شیعہ سے بہت دور ہوں، مگر تنقید میں خوبی کا اقرار نہ کرنا، علمی دیانت کے خلاف ہے۔ فقہ حنفیہ اور فقہ الحدیث دونوں میں بعض جگہ یہ کمی ہے۔ غیر فطری سلوک سے جس قدر نفرت ایک ذہن میں ہونا چاہیے، وہ ہماری فقہی نصوص سے پیدا نہیں ہوتی۔ قرآن اور سنت میں یہ پہلو بہت واضح ہے:

﴿ اِلَّا عَلٰى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۞ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعَادُوْنَ﴾ [المؤمنون: ٦، ٧]

''اپنی بیویوں، مملوکہ عورتوں کے سوا جو شخص کوئی دوسری راہ اختیار کرے، ایسے لوگوں کا شمار حدود اللہ کے توڑنے والوں میں ہوگا۔''

حدیث شریف میں لوطی کے قتل کا فتویٰ دیا گیا ہے۔ [3] جانوروں سے جو شخص بدفعلی کرے، حدیث میں

---

[1] الهداية (ص: ٣٤٤) فتح القدير (٥/ ٢٦٥)

[2] الهداية (٢/ ١١٢)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٤٦٢) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٤٥٦)

فاعل اور مفعول دونوں کو قتل کا حکم دیا گیا ہے۔[1] مگر ہماری فقہی روایات اسی لحاظ سے تشنہ ہیں۔ شیعی روایات میں یہ نقص کم نہیں ہے، چنانچہ امام جعفر صادق سے مروی ہے:

"حرمة الدبر أعظم من حرمة الفرج، إن الله أهلك أمة بحرمة الدبر، ولم يهلك الله بحرمة الفرج" (كافي: ٢/ ٢٢٦)

امام جعفر فرماتے ہیں:

"قال: قال رسول اللهﷺ: من جامع غلاماً جاء جنبا يوم القيامة لا ينقيه ماء الدنيا" الخ (حواله مذكوره)

"لوطی قیامت کے دن جنبی ہوگا اور ساری دنیا کا پانی بھی اسے پاک نہیں کر سکے گا اس پر اللہ کے فرشتے لعنت کرتے ہیں۔ اس فعل سے عرش پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔ لوطی کو جہنم کے ہر درجے میں رکھا جائے گا، یہاں تک کہ اسفل السافلین میں گرایا جائے گا۔"

اس حدیث کے بیان سے نبوت کا نور تو معلوم نہیں ہوتا، لیکن لواطت سے نفرت کے لیے اچھا طریقِ بیان اختیار فرمایا گیا ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

"اللواط ما دون الدبر هو الكفر" (حواله مذكور) "لواطت قطعی کفر ہے۔"

کتنا سنگین فتویٰ ہے۔ کفر کا مفہوم ان افعال پر کہاں تک صادق آتا ہے؟ یہ دوسری بحث ہے، مگر اخلاقی اثر کا انکار نہیں کیا جا سکتا، اس کے بعد کافی میں ابو بصیر سے ایک مبسوط روایت نقل کی ہے، جس میں لواطت کے شیوع کی کیفیت مذکور ہے۔ حدیث کے الفاظ اور طریقِ بیان سے تو گپ سی معلوم ہوتی ہے، تاہم لواطت کی شناعت اسی سے ظاہر ہے، اس کے علاوہ بھی شیعی احادیث میں اس فعل کی برائی بڑی صراحت سے مرقوم ہے۔

اسی طرح استمنا بالید اور جانوروں سے بدکاری کو بھی زنا سمجھا گیا ہے۔ (كافي: ٢/ ٢٣٤)

اسی طرح زنا کی مذمت میں اخلاق کی بہترین تعلیم دی گئی ہے۔ زنا کو فقر، چہرے کی بے رونقی، اللہ کی ناراضگی اور خلود فی النار کا موجب فرمایا گیا ہے۔ یہ تعلیمات قابلِ تعریف ہیں۔

دوسرا رخ:

لیکن ایک دوسرے لحاظ سے شیعہ کی تعلیمات اخلاقی پستی کا موجب ہیں اور تعجب ہوتا ہے کہ اسلام کے ساتھ تعلق کے بعد یہ تعلیمات کیونکر دی جا سکتی ہیں؟!

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٤٦٤) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٤٥٥)

علی بن سوید فرماتے ہیں، میں نے حضرت علی سے عرض کیا:

"إني مبتلیً بالنظر إلیٰ الوجوه الجميلة فيعجبني النظر إليها؟ فقال: يا علي! لا بأس إذا عرف الله من نيتك الصدق، وإياك والزنا، فإنه يمحق البركة، ويهلك الدين" (فروع كافي: ٢/ ٢٣٥)

"مجھے خوبصورت عورتیں دیکھنے کا مرض ہے۔ فرمایا: کچھ حرج نہیں، خدا تعالیٰ تمھاری نیت کو جانتا ہے، لیکن زنا سے بچنا، اس سے دین اور برکت دونوں ضائع ہو جاتے ہیں۔"

نظر بازی زنا کا پیش خیمہ ہے، اس اجازت کے بعد زنا سے بچنا مشکل ہے۔ اسلام نے اسی لیے پردے کو ضروری قرار دیا ہے۔ عورتوں کو حکم دیا کہ وہ اپنے گھروں میں ٹھہرنے کی کوشش کریں۔ (أحزاب)

پردے کے بعد عورتوں کو دیکھنے کا سوال کیونکر پیدا ہوتا ہے؟ پھر ایسی غلط عادت کی حوصلہ افزائی حضرت علی کے لیے کہاں تک مناسب ہے؟ مجھے اس حدیث کی سند کا تو علم نہیں، مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی نسبت حضرت علی کی طرف درست نہیں، اسی عادت کا اثر ہے کہ تعزیے کے جلوس اور سینہ کوبی کے ساتھ مسلسل نظر بازی ہوتی رہتی ہے اور ان مجالس کی رونق کا سبب ہی اخلاقی خرابی ہے۔

مسئلہ عزا کے متعلق ہماری رائے ڈھکی چھپی نہیں، لیکن جو لوگ ان مجالس کو جائز سمجھتے ہیں، ہماری ان سے گزارش ہے کہ اخلاق پر اتنا رحم تو فرمائیں کہ مجالسِ عزا میں عورتوں کا آنا قطعی بند کر دیں۔ اگر ان کی حاضری ضروری ہو تو ان کی مجالس مردوں سے بالکل جدا ہوں۔ یہ مشترک رونا ترک کر دیا جائے اور اجتماعی محفلیں بند ہو جانی چاہییں۔

غیر فطری سلوک:

عموماً سنتے تھے کہ شیعہ حضرات بیوی سے غیر فطری سلوک کو جائز سمجھتے ہیں، لیکن دل قبول نہیں کرتا تھا۔ خیال تھا کہ عصبیت سے لوگ شیعہ کو بدنام کرتے ہیں، جیسا کہ بعض شیعہ جرائد اہلِ سنت اور اہلِ حدیث کے متعلق جھوٹی تہمتیں شائع کرتے رہتے ہیں، جن کا ہمارے ہاں نام و نشاں بھی نہیں۔ فرقہ وارانہ عصبیت میں ایسی چیزیں مشہور ہو جاتی ہیں، لیکن مجھے تعجب ہوا کہ شیعہ لٹریچر میں اس کا جواز موجود ہے۔ کافی "باب محاش النساء" میں یہ دو اثر مرقوم ہیں:

"عن أبي عبدالله علیه السلام قال: سئلتُ عن إتيان النساء في أعجازهن فقال: هي لعبتك فلا تؤذها" اهـ (٢/ ٢٣٤)

''میں نے پوچھا کہ آیا جنسی خواہش کو غیر فطری سلوک سے پورا کر لیا جائے؟ فرمایا: یہ تیرا کھلونا ہے، اسے ایذا نہ دو۔''

اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر عورت اس سے اذیت محسوس نہ کرے تو کچھ حرج نہیں۔ جب مذہباً اجازت ہوتو اس بیچاری کے لیے چارہ ہی کیا ہے؟ ایذا کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

۲۔ دوسرا اثر حضرت رضا سے منقول ہے:

''إن رجلا من مواليك أمرني أن أسألك عن هابك، واستحيٰ منك أن يسألك. قال: وما هي؟ قلت: الرجل يأتي امرأته في دبرها؟ قال: ذلك له، قلت له: فأنت تفعل؟ قال: إنا لا نفعل ذلك''

''آپ کا ایک غلام پوچھتا ہے کہ وہ اپنی عورت کی دُبر سے خواہش کی تکمیل کر سکتا ہے؟ فرمایا: درست ہے۔ کہا: آپ بھی ایسا کرتے ہیں؟ کہا: ہم ایسا نہیں کیا کرتے۔''

اختلاف اور حدودِ ادب

امام ابو یوسف رحمہ اللہ کا اندازِ بحث

خلیفہ ہارون الرشید نے امام ابو یوسف رحمہ اللہ سے کچھ مسائل دریافت کیے، حضرت امام رحمہ اللہ نے اس کے جواب میں جو کچھ لکھا، وہ "کتاب الخراج" کے عنوان سے مصر میں شائع ہوا ہے۔ یہ جوابات تقریباً اڑھائی سو صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں۔ اُس زمانے کے مالی نظام کا بہت حد تک تعارف اس کتاب کی بدولت ہو جاتا ہے اور حضرت امام کی دفتری نظر کا بھی اس سے اندازہ ہوتا ہے۔

امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور امام مالک رحمہ اللہ دونوں سے علم حاصل کیا ہے، چنانچہ ان کے مسلک میں دونوں کے طریقِ فکر کی جھلک ہے۔ وہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے بڑی متانت سے اختلاف فرماتے ہیں اور ان کے مسلک پر بعض جگہ کڑی تنقید بھی کرتے ہیں۔ انھوں نے مسلک کی صحت کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل گفتگو فرمائی ہے، لیکن دامنِ ادب کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔

گھوڑے کا حصہ:

1 غنیمت کی تقسیم کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگِ بدر میں گھوڑے کے لیے دو حصے عطا فرمائے اور پیدل لڑنے والوں کو ایک ایک حصہ دیا۔

اسی طرح حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

"شهدت أنا وأخي مع رسول الله ﷺ حنينا، ومعنا فرسان لنا فضرب لنا رسول الله ﷺ ستة أسهم: أربعة لفرسينا، وسهمين لنا"[1]

"یعنی ہم دونوں بھائی اپنے اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر حنین کی لڑائی میں شریک ہوئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں چھ حصے عنایت فرمائے، دو دو گھوڑوں کے اور ایک ایک ہمارا اپنا حصہ۔"

حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا مسلک اس کے خلاف ہے، وہ فرماتے ہیں: جانور کو آدمی پر ترجیح نہیں دی

[1] كتاب الخراج لأبي يوسف (ص: ٥١) سنن الدارقطني (٤/ ١٠١)

جا سکتی، اس لیے گھوڑے اور آدمی کو برابر برابر حصہ ملے گا۔ اس عقلی دلیل کے ساتھ وہ ایک اثر سے بھی استدلال فرماتے ہیں کہ شام کی کسی جنگ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے کسی عامل (کارندہ) نے گھوڑے اور مجاہد کو برابر کا حصہ دیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے قبول فرمایا۔ فرماتے ہیں:

"قال أبو يوسف: كان الفقيه المقدم أبو حنيفة رحمه الله يقول: للرجل سهم وللفرس سهم، وقال: لا أفضل بهيمة على رجل مسلم، ويحتج بما حدثناه عن زكريا بن الحارث عن المنذر بن أبي خميصة الهمداني أن عاملا لعمر بن الخطاب قسم في بعض الشام، للفارس سهم، وللرجل سهم، فرفع ذلك إلى عمر فسلمه وأجازه" (الخراج، ص:٢٢)

حضرت امام کے لیے "فقیہ مقدم" کا لفظ کتنا بھلا معلوم ہوتا ہے۔ خطابات کی بھرمار بھی نہیں فرمائی اور شیخ کے مقام کی رفعت کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ رحمه الله، ورضي عنهما ما أحسن سذاجتهم وأدق في العلوم أفكارهم!

حضرت امام ابو یوسف رحمہ اللہ امام صاحب رحمہ اللہ کے اس استدلال سے مطمئن نہیں ہیں، اس لیے وہ حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی دلیل کے ہر پہلو پر گفتگو فرماتے ہیں۔ ارشاد ہے:

"وما جاء من الأحاديث والآثار أن للفرس سهمين، وللرجل سهم أكثر من ذلك و أوثق، و العامة عليه، وليس هذا على وجه التفضيل، ولو كان على وجه التفضيل ما كان ينبغي أن يكون للفرس سهم وللرجل سهم، لأنه قد سوى بهيمة برجل مسلم، إنما هذا على أن يكون عدة الرجل أكثر من عدة الآخر، وليرغب الناس في ارتباط الخيل في سبيل الله، ألا ترى أن سهم الفرس يرد على صاحب الفرس فلا يكون للفرس دونه، والمتطوع وصاحب الديوان في القسمة سواء" (الخراج، ص:٢٢)

① جن احادیث میں گھوڑے کے دو حصے اور مجاہد کے ایک حصے کا ذکر ہے، وہ صحیح بھی ہیں اور زیادہ بھی۔

② جمہور کا بھی یہی مسلک ہے (یعنی شیخ محترم منفرد ہیں)

③ یہ تقسیم اظہارِ فضیلت کے لیے نہیں، ورنہ ایک مسلمان کا ایک گھوڑے کے برابر ہونا بھی توہین سے خالی نہیں۔

④ اصل مقصد یہ ہے کہ جنگ کی تیاری ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر کی جائے، تاکہ اس میں آخرت کے علاوہ دنیوی فائدہ بھی ہو۔

⑤ لوگ گھوڑوں کی پرورش پر زیادہ توجہ دے سکیں۔

⑥ گھوڑے کا حصہ بھی گھوڑے کو نہیں دیا جاتا، جو کچھ گھوڑے کو ملے گا، وہ بھی تو مالک ہی کو ملے گا۔

⑦ رضا کار اور عمالِ حکومت تقسیم میں برابر ہیں، اس لیے فضیلت کی بحث برمحل نہیں۔ امیر المومنین جس قول پر چاہے عمل کرے اور جسے عامۃ المسلمین کے لیے مفید سمجھے، اسے قانونی صورت دے دے۔

قابلِ غور معاملہ یہ ہے کہ بحث میں نہ تو طنز ہوا ہے اور نہ ہی ذاتیات کا ذکر۔ حضرت الامام کے مسلک کے تمام پہلوؤں پر شاگردِ رشید نے تنقیدی نظر فرمائی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ کوئی پہلو بھی سلامت نہیں رہا، لیکن غیر سنجیدہ ایک لفظ بھی زبان پر نہیں آیا۔ دوسری طرف ہمارا یہ طریقِ بحث معلوم نہیں، کب سے شروع ہوا ہے کہ پوری بحث ذاتیات میں الجھی رہتی ہے اور ذاتی عداوت کے ساتھ ایک نئی مخاصمت کا آغاز ہوجاتا ہے۔ بڑے اور چھوٹے سب ایک ہی مرض کے مریض ہیں۔ فإلی اللہ المشتکی!

زمین کی بٹائی:

2 زمین کی بٹائی کے متعلق اہلِ علم میں اختلاف ہے۔ اہلِ حجاز اور اہلِ مدینہ سفید زمین کا بٹائی پر دینا مکروہ سمجھتے ہیں، لیکن اگر زمین میں کچھ کھجوریں اور درخت ہوں اور ان درختوں کے ساتھ سفید زمین بھی ہو، جس میں کھیتی ہو سکے تو اسے بٹائی پر دینا جائز سمجھتے ہیں۔

حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سفید زمین اور درختوں کے ساتھ ملحقہ زمین دونوں میں بٹائی ناپسند فرماتے ہیں اور ابن ابی لیلیٰ رحمہ اللہ دونوں صورتوں کو جائز اور درست سمجھتے ہیں۔

حضرت امام اسے اجارہ فاسدہ سمجھتے ہیں، ان کے نزدیک ثلث (تہائی) اور ربع (چوتھائی) سے اجرت کی مقدار کا تعین نہیں ہوتا اور اجرت مجہول ہو تو اجارہ فاسد ہوتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ چوتھائی یا تہائی حصے میں مزدور کو غلے کی اتنی تھوڑی مقدار ملے، جو اس کی محنت کا صحیح معاوضہ نہ ہو اور مزدور نقصان میں رہے۔ یہ قطعی غلط ہے کہ حضرت امام رحمہ اللہ زمین کی ملکیت ہی کے منکر ہیں۔ یہی زمین اگر نقد روپے پر دے دی جائے تو اس میں کوئی اختلاف نہیں، کیونکہ اس سے شرح اجرت کا تعین ہوجاتا ہے اور مزدور کا نفع نقصان واضح ہوجاتا ہے۔

حضرت امام ابویوسف رحمہ اللہ اس مسئلے میں امام شافعی رحمہ اللہ (اہلِ حجاز) اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ (اہلِ کوفہ) دونوں سے اختلاف رکھتے ہیں۔ وہ اس مسئلے میں اہلِ حدیث اور امام ابن ابی لیلیٰ رحمہ اللہ کے ہم نوا ہیں۔ موصوف حضرت امام کے دلائل پر متانت سے بحث فرماتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

"فأحسن ما سمعناه في ذلك ـ واللہ أعلم ـ أن ذلك كله جائز مستقيم صحيح،

وهو عندي مثل مال المضاربة، قد يدفع الرجل إلى الرجل المال مضاربة بالنصف والثلث فيجوز، وهذا مجهول، لا يعلم ما مبلغ ربحه، وليس فيه اختلاف بين العلماء فيما علمت، وكذلك الأرض عندي هي بمنزلة المضاربة: الأرض البيضاء منها والنخل والشجر سواء" (الخراج، ص: ۱۰۵)

''صحیح یہ ہے کہ بٹائی کی دونوں صورتیں بالکل صحیح اور درست ہیں، اس کی نظیر مضاربت ہے۔ ایک شخص دوسرے شخص کو مال دیتا ہے کہ وہ کام کرے، منفعت کا نصف یا ثلث اس سے طے پا جاتا ہے۔ یہ مضاربت باتفاقِ ائمہ درست ہے، حالانکہ اس میں نفع مجہول ہے۔ ثلث یا نصف میں کس قدر فائدہ حاصل ہوگا؟ اس کی مقدار معلوم نہیں۔ زمین کی بٹائی کا بھی یہی حال ہے۔ سفید زمین ہو یا باغ حضرت امام ابو یوسف کے نزدیک دونوں برابر ہیں اور درست۔''

امام ابو یوسف رحمہ اللہ کا مسلک حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے خلاف ہے۔ وجہ اختلاف کا اظہار فرماتے ہوئے شاگردِ رشید نے حدودِ ادب کو ملحوظ رکھا ہے۔ حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے استدلال میں جو نقص تھا، اسے واضح کیا ہے، لیکن طنز و تشنیع سے بالکلیہ دور رہے ہیں۔ رحمهم الله رحمة واسعة.

تقلید یا ترکِ تقلید:

ہمارے ملک میں تقلید اور ترکِ تقلید کی بحث تقریباً ایک صدی سے جاری ہے۔ فریقین نے باہمی مناظرات میں سیکڑوں اوراق لکھ ڈالے ہیں، باہمی مقدمات میں ہزاروں روپے صرف ہوگئے ہیں، مگر حقیقت اس سے زیادہ نہیں کہ اہلِ حدیث کی یہ خواہش ہے کہ ائمہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے ارشادات اور فتاویٰ کو استشہاد میں وہ مقام نہ دیا جائے کہ اس پر مزید بحث کی گنجایش نہ رہے، بلکہ ان کو وقتی تقاضوں کی حیثیت دی جائے اور ابدی تعلیم اور دائمی استناد کی حیثیت صرف وحی، یعنی قرآنِ عزیز اور سنتِ نبوی کو ہی حاصل ہونی چاہیے۔

ائمہ اسلام کا علم طریقِ فہم میں معاون ہوسکتا ہے اور وقت کے تقاضوں اور ان کی نوعیت کو سمجھنے میں مدد دے سکتا ہے، ان بزرگوں کی حیثیت اساتذہ کی سی ہے اور ان کے علوم بلاشبہہ ہمیں راہنمائی دے سکتے ہیں، ان کے اختلافات سے ان وقتی تقاضوں کی اہمیت معلوم کی جاسکتی ہے، جس کی بنا پر ان بزرگوں کو اختلافات کی ضرورت محسوس ہوئی اور اس قسم کے تقاضوں کی بنا پر اگر آج بھی اہلِ علم باہم یا ائمہ متقدمین سے اختلاف کریں تو ان کو اس کی اجازت ہونی چاہیے۔

لیکن اس ضمن میں ایک عجیب لغزش ہوئی۔ ائمہ کی محبت اور اپنے اساتذہ اور بزرگوں کی اُلفت نے مخالفین پر

طعن کے لیے راہ کھول دی اور ایک دوسرے کے علم وفہم پر حملے ہونے لگے۔ احناف نے امام شافعی رحمہ اللہ کے علم وفضل کے متعلق ایسے الفاظ استعمال فرمائے، جو حضرت امام شافعی رحمہ اللہ کے مقام کے لحاظ سے قطعاً نامناسب تھے، اسی طرح حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے علم وفضل پر دوسری جانب سے حرف گیری کی گئی، جس سے امام رحمہ اللہ کا مقام کہیں بلند تھا۔ موالک اور حنابلہ میں بھی بعض اہلِ علم اس حرف گیری سے نہ بچ سکے، اس غلط روی کی مثالیں کتبِ اصولِ فقہ سے بکثرت مل سکتی ہیں۔

اہلِ حدیث نے اسی بے اعتدالی کی بنا پر ترکِ تقلید کی دعوت دی، تاکہ محبت میں غلو دوسرے ائمہ کے متعلق بدظنی کا سبب نہ بنے۔ ایک امام یا بزرگ سے دلی تعلق یا ربط اس حد تک نہ پہنچے، جس سے دوسرے بزرگ یا امام سے بدگمانی پیدا ہو، لیکن افسوس ہے کہ یہ علاج خود مرض کی صورت اختیار کر گیا اور ائمہ کے اجتہادی مسائل کو اَغلاط تصور کیا گیا۔ ان کے علمِ حدیث پر دل خراش عنوان قائم کر کے بعض حضرات نے بالکل وہی صورت پیدا کر دی ہے، جس سے بچنے کے لیے ترکِ تقلید کا نسخہ تجویز کیا گیا تھا۔ کسی نے "الجرح علی البخاري" لکھ کر انتقام کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی اور اس طرح ایک خالص علمی مشغلہ یکایک انتقامی جنگ کی صورت اختیار کر گیا اور نیک دل ائمہ ہماری باہمی کدورتوں کا تختہ مشق بن گئے۔ إنا للّٰہ وإنا إلیه راجعون. اور یہ روش زمانے کے ہزارہا تھپیڑوں کے باوجود ختم نہیں ہو سکی۔

حضرت امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے تحقیقی ارشادات ہم ایسے طالب علموں کے لیے بہترین راہنما ہیں۔ اگر بحث نفسِ مسئلہ تک محدود رہے اور تنقید کی گرفت دلائل سے آگے نہ بڑھے تو میں سمجھتا ہوں کہ بحث میں تلخی پیدا نہیں ہو سکتی۔ بحث کی یہی ایک صورت ہے، جو دلوں تک رسائی حاصل کر سکتی ہے۔ ائمہ سلف سے حضرت امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے یہ ارشادات بہترین عملی نمونہ ہیں۔ رحمه اللّٰه ورضي عنه وأرضاه.

امام کا اندازِ خطاب:

حضرت امام ابو یوسف رحمہ اللہ کاشتکاری کی بحث کا آغاز فرماتے ہوئے اپنے دونوں مخالفین (شوافع اور احناف) کا ان الفاظ میں ذکر کرتے ہیں:

"فإن أصحابنا من أهل الحجاز و أهل المدينة على كراهة ذلك وإفساده"

(الخراج، ص: ۱۰۵)

یعنی ہمارے حجازی رفقا سفید زمین کے اجارے کو پسند نہیں فرماتے، بلکہ اسے فاسد سمجھتے ہیں۔

"وأما أصحابنا من أهل الكوفة فاختلفوا في ذلك"

''اور ہمارے کوفہ کے رفقا اس معاملے میں حجازیوں سے مختلف ہیں۔ وہ سفید زمین اور باغ کے جواز اور عدمِ جواز کو ایک ہی حیثیت میں رکھتے ہیں۔''

اختلافی مسائل کی تحقیق میں اپنے دونوں مخالفوں کے لیے "أصحابنا" کا خطاب کس قدر بھلا معلوم ہوتا ہے۔ یہ لفظ دلی صفائی کا کتنا بہترین ترجمان ہے۔ کاش! ہم لوگ جب ان بزرگوں کے علم سے فائدہ حاصل کرتے ہیں تو ان کے اخلاق سے بھی بہرہ مند ہونے کی کوشش کریں!

اپنی رائے کے اظہار میں جس سادگی کا اظہار فرمایا ہے، اسے بھی ملاحظہ فرمائیے:

''قال أبو يوسف: فكان أحسن ما سمعناه في ذلك ـوالله أعلمـ أن ذلك جائز مستقيم، اتبعنا الأحاديث التي جاءت من رسول اللهﷺ في مساقاة خيبر، لأنها أوثق عندنا و أكثر وأعم مما جاء في خلافها من الأحاديث'' (الخراج، ص:١٠٦)

''ہمارے نزدیک سفید زمین اور باغ دونوں کا بٹائی (ثلث یا نصف) پر دینا درست ہے، کیونکہ خیبر کی زمین اور اس کی بٹائی کے متعلق جو احادیث آئی ہیں، صحیح اور زیادہ عام ہیں اور اس کے خلاف جو احادیث وارد ہوئی ہیں، وہ صحت، کثرت اور عموم میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتیں، اس لیے جوازِ اجارہ میں عموم کو ترجیح ہے۔''

دلائل کی ترجیح میں مخالفین پر طعن تو کہیں رہا، ان کے ذکر کی بھی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ حضرت امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے اس اسوہ سے اہلِ حدیث اور احناف دونوں کو خصوصاً اور دوسرے اہلِ علم کو عموماً سبق حاصل کرنا چاہیے۔

زکات اور غیر مسلم:

اگر کوئی غیر مسلم ایسی زمین خریدے جس پر عشر واجب ہے تو حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اب اس پر عشر کی جگہ خراج واجب ہوگا اور یہ خراج اس سے بدلا نہیں جائے گا، گو وہ مسلمان ہی سے کیوں نہ خریدی گئی ہو۔ یعنی حضرت امام کے نزدیک خراجی زمین مسلمان کے قبضے میں بھی آجائے تو وہ عشری نہیں ہوگی، اس کا معاملہ زکوۃ کی صورت میں نہیں لیا جائے گا، بلکہ خراج کی صورت میں لیا جائے گا، اس کے برعکس حضرت حسن بصری رحمہ اللہ اور عطا رحمہ اللہ کا مذہب یہ ہے کہ جب تک یہ زمین غیر مسلم کے قبضے میں ہوگی، اس پر عشر سے دوگنا رقم عائد ہوگی اور یہی اس کا خراج ہوگا، لیکن جب یہ زمین مسلمان خریدے یا اس کا غیر مسلم مالک مسلمان ہو جائے تو اس پر بھی عشر ہی وصول کیا جائے گا۔ امام ابو یوسف، حضرت حسن اور عطاء کے مسلک کو پسند فرماتے ہیں:

''فكان قول الحسن و عطاء أحسن عندي من قولِ أبي حنيفة''

حضرت امام کے استدلالِ گرامی کا جواب ارشاد ہوتا ہے:

"ألا ترى أن المال يكون للمسلم للتجارة فيمر به على العاشر فيجعل عليه ربع العشر فإذا اشتراه ذمي فمرّ به على العاشر لتجارة، جعل عليه نصف العشر ضعف ما على المسلم، فإن عاد إلى مسلم جعلت فيه ربع العشر، فهذا مال واحد، يختلف الحكم فيه على من يملكه فكذلك الأرض من أرض العشر"

(الخراج، ص: ١٤٥)

''امام ابو یوسف فرماتے ہیں کہ زمین کی بذاتِ خود کوئی حیثیت نہیں، بلکہ یہ مالک کے تابع ہے۔ جیسے تجارت کا مال اگر مسلمان اسے چنگی سے لے کر گزرے تو اسے ربع العشر (چالیسواں حصہ) دینا ہوگا اور اگر یہی مال غیر مسلم خریدے تو اس سے نصف العشر (بیسواں حصہ) لیا جائے گا، پھر اگر مسلمان خریدے تو اس سے چالیسواں حصہ وصول ہوگا۔''

غرض مالک کی تبدیلی سے خراج و عشر کی نوعیت بھی بدلتی رہے گی۔ حضرت امام اس میں مالک کو زمین کے تابع فرماتے ہیں، جو درست نہیں۔ مخالف کے نقطۂ نظر کو سمجھ لینے کے بعد جب اصل دلیل پر بحث کی جائے اور نقطۂ نظر کی وضاحت ہو جائے تو طعن و تشنیع کے بغیر ہی مسئلہ صاف ہو جاتا ہے۔ سلف کا یہی انداز تھا۔ امام ابو یوسف رحمہ اللہ کی ''کتاب الخراج'' میں اس کے بہت سے نظائر موجود ہیں، مگر افسوس ہے کہ آج ہمارے علما معمولی اختلافات پر عبوساً قمطریراً بنے پھرتے ہیں اور اس کا نام ''تقویٰ'' رکھا جاتا ہے۔ فإلى الله المشتكى![1]

[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۲۶ رمئی ۱۹۵۰ء)

فقہ اور تفقہ

لغت کے لحاظ سے لفظِ فقہ کا مفہوم یہ ہے:

''ظاہری علم سے مخفی علم تک رسائی حاصل کرنا۔''[1] (مفرداتِ راغب)

قرآنِ عزیز نے فقہ اور تفقہ کے الفاظ بہت سے مقامات پر ذکر فرمائے ہیں۔ سورت توبہ میں اسے جہاد کے بالمقابل مقام دیا ہے:

﴿فَلَوْ لَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَ لِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ﴾ [التوبة: ١٢٢]

یہاں فقہ سے مراد وہ تمام علوم ہیں جو دینِ اسلام کے فہم میں مدد دے سکتے ہیں۔ قرآن، سنت اور تمام علومِ خادمہ حسبِ مراتب اس میں شامل ہیں، گویا آیت میں سفر کی دو قسمیں شمار کی گئی ہیں: ① جہاد کے لیے۔ ② طلبِ علم کے لیے۔ اسی طرح حدیث میں ہے:

«من يرد الله به خيرا يفقهه في الدين»[2] (الحديث)

یعنی جس سے اللہ تعالیٰ بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے، اسے دین میں فہم عطا فرما دیتا ہے۔

''الفقه ـ بالكسر ـ: العلم بالشيء، والفهم له والفطنة، و غلب على علم الدين لشرفه، و فقه ككرُم وفرِح''[3] (القاموس، أقرب الموارد، مجمع البحار وغيره)

یعنی فقہ بکسر القاف علم و فہم اور دانشمندی کو کہتے ہیں۔ فقہ کا لفظ عموماً علمِ دین پر اس کی شرافت کی وجہ سے بولا جاتا ہے۔ یہ ''کرُم'' اور ''فرِح'' دونوں طرح مستعمل ہوتا ہے۔

امام ابوبکر احمد بن علی الخطیب البغدادی (۴۶۳ھ) فقہ اور فقیہ کا لغوی اور عرفی مفہوم ذکر فرماتے ہیں:

''قال ثعلب أحمد بن يحيي النحوي: يقال: فقِه الرجل: إذا كمل، و فقُه: إذا شدا

---

[1] المفردات في غريب القرآن (ص: ٣٨٤)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧١) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٣٧)

[3] القاموس المحيط (مادة: فقه)

شيئا من الفقه ... قال ابن قتيبة الدينوري: الفقه في اللغة: الفهم. يقال: فلان لا يفقه قولي. قال الله تعالىٰ: ﴿وَ اِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَ لٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ﴾ أي لا تفهمونه، ثم يقال للعلم: الفقه، لأنه عن الفهم يكون العالم، و للعالم فقيه، لأنه إنما يعلم بفهمه، على مذهب العرب في تسمية الشيئ بما كان له سبباً. قال أبوبكر محمد بن قاسم الأنباري: قولهم: رجل فقيه، معناه: عالم، وكل عالم بشيء فهو فقيه فيه، من ذلك قولهم: يفقه ولا ينقه، معناه: ما يعلم، ولا يفهم. يقال: نقهت الحديث أنقهته: إذا فهمته. يقال: نقهت من المرض أنقه. ومن الفقه قولهم: قال فقيه العرب، معناه: عالم العرب، ومن ذلك قوله تعالىٰ: ﴿لِيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ﴾ معناه: ليكونوا علماء به" (الفقيه والمتفقه قلمي، ص: ٢٩ تا ٧٧)[1]

یعنی احمد بن یحییٰ (ثعلب) نحوی فرماتے ہیں: "فقه الرجل" (بالکسر) اس وقت کہتے ہیں جب کامل ہو جائے اور فقُہ (بالضم) اس وقت کہتے ہیں جب فقہ میں سے فی الجملہ واقفیت حاصل ہو جائے۔ ابن قتیبہ دینوری فرماتے ہیں: فقہ کے معنی سمجھ ہے۔ کہا جاتا ہے: "فلان لا یفقه قولي" فلاں بندہ میری بات نہیں سمجھتا۔ قرآنِ عزیز میں ﴿لَا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ﴾ کے معنی ہیں: "لا تفهمون" (یعنی) علم، فقہ اور فہم ایک ہی چیز ہے۔ عربی زبان میں علم اور فقہ ایک ہی چیز ہے۔ یہ مسبب کو سبب کا نام دیا گیا ہے۔ علامہ انباری فرماتے ہیں: فقیہ کے معنی عالم ہے، ہر عالم فقیہ ہوتا ہے۔ "یفقه ولا ینقه" محاورہ ہے۔ "جانتا ہے، سمجھتا نہیں۔" "نقهت" بھی "فهمت" کا مترادف ہے، اسی طرح مریض کو ناقہ کہا جاتا ہے۔ "فقیه العرب" کے معنی عالم العرب ہیں۔ ﴿لِيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ﴾ کے معنی ہیں: "وہ عالم ہو جائیں۔"

غرض قرآنِ مجید نے فقہ اور علم کو ہم معنی استعمال فرمایا ہے۔ ائمہ کی مروجہ فقہیں گو علم ہیں، مگر یہ نزولِ قرآن کے وقت موجود ہی نہیں تھیں، اس لیے ﴿لِيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ﴾ سے یہ اصطلاحی فقہ مراد نہیں لی جا سکتی۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ایک روایت:

حافظ ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً ذکر فرمایا:

[1] اب یہ کتاب مطابع القصیم (الریاض) نجد سے طبع ہو گئی ہے، مطبوعہ (۱/ ۳) ملاحظہ ہو۔ [ع۔ ح] نیز دیکھیں: الفقيه والمتفقه (١/ ٧٦) دار ابن الجوزي الدمام.

« ألا أنبئكم بالفقيه كل الفقيه؟ » قالوا: بلىٰ. قال: « من لم يقنط الناس من رحمة الله، ولم يؤيسهم من روح الله، ولم يؤمنهم من مكر الله، ولا يدع القرآن رغبة عنه إلىٰ ما سواه. ألا لا خير في عبادة ليس فيه تفقه، ولا علم ليس فيه تفهم، ولا قراء ة ليس فيها تدبر » (جامع بيان العلم وفضله: ٢/ ٤٤)

یعنی پورا ''فقیہ'' وہ ہے جو لوگوں کو اللہ کی رحمت سے بے امید نہ کرے اور اللہ کی تدبیر سے بے خوف نہ ہونے دے اور اور قرآنِ عزیز سے اعراض کر کے دوسری طرف متوجہ نہ ہو جائے۔ تفقہ کے بغیر عبادۃ نہیں، فہم کے بغیر علم نہیں اور تدبر کے بغیر قراءت کوئی چیز نہیں۔

امام غزالی وغیرہ کا نقطہ نظر:

علامہ چلپی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"قال الغزالي: إن الناس تصرفوا في اسم الفقه فخصوه بعلم الفتاوىٰ، والوقوف على دقائقها وعللها، واسم الفقه في العصر الأول كان يطلق على علم الآخرة، ومعرفة دقائق آفات النفوس، والاطلاع على علم عظم الآخرة وحقارة الدنيا. قال تعالىٰ: ﴿لِيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَ لِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ﴾ والإنذار بهذا النوع من العلم دون تفاريع الفقه كالسلم والإجارة" اهـ (كشف الظنون: ٢/ ٩١)

یعنی غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: لوگوں نے فقہ کے لفظ میں تصرف کر کے علمِ فتاویٰ کی موشگافیوں پر بولنا شروع کر دیا ہے۔ قرنِ اول میں فقہ کا لفظ آخرت کے علم، نفس کی آفات، دنیا کی حقارت اور آخرت کی عظمت کے تصور پر بولا جاتا تھا۔ آیت: ﴿لِيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ﴾ وغیرہ میں لفظ (مروجہ) فقہ کی تفریعات بیع سلم اور اجارہ پر نہیں بولا گیا، کیونکہ فقہ کے ذخائر اس وقت موجود نہ تھے۔

ابجد العلوم (۲/ ۵۶۹) میں ہے:

"الفقه: معرفة النفس ما لها وما عليها. هكذا نقل عن أبي حنيفة، والمراد بالمعرفة: إدراك الجزئيات عن دليل فخرج التقليد"

اس کے بعد مالہا وما علیہا کی تشریح فرماتے ہوئے فقہ میں علمِ کلام اور علم الاخلاق، تصوف اور فقہ اصطلاحی سب کو شامل فرمایا ہے۔

فقہائے حدیث: ایک مستقل مکتبِ فکر:

ابن ندیم (۲۸۵ھ) نے فہرست میں فقہائے مذاہب کے بعد فقہاء المحدثین و اصحاب الحدیث کا ذکر فرمایا ہے۔ فرماتے ہیں:

”الفن السادس من المقالة السادسة في أخبار العلماء وأسماء ما صنفوه من الكتب، ويحتوي على أخبار فقهاء الحديث“

یعنی چھٹا باب فقہائے محدثین کے فکر اور ان کی مصنفات کے تذکرے میں۔

اس باب میں ابن ندیم نے قریباً ۶۴ ائمہ کا ذکر فرمایا ہے، جن میں سفیان ثوری (۱۶۱ھ) عبدالرحمان بن ابی الزناد (۱۷۴ھ) سفیان بن عیینہ (۱۹۸ھ) امام وکیع بن الجراح (۱۹۷ھ) یحییٰ بن آدم (۲۰۳ھ) مکحول شامی (۱۱۶ھ) امام دارمی (۱۵۷ھ) عبداللہ بن مبارک (۱۸۱ھ) ابو داود طیالسی (۲۲۷ھ) امام احمد بن حنبل (۲۴۱ھ)[1] اسحاق بن راہویہ (۲۳۰ھ) امام بخاری (۲۵۶ھ) امام مسلم بن حجاج قشیری (۲۵۸ھ) علی بن مدینی (۲۵۸ھ) یحییٰ بن معین (۲۳۳ھ) امام ابو داود سلیمان بن اشعث سجستانی (۲۷۵ھ) امام ابو عیسیٰ ترمذی (۲۷۹ھ) وغیرہم کے اسمائے گرامی نقل فرمائے ہیں، احناف، موالک، شوافع، متبعینِ ائمہ اربعہ کے علاوہ جریری (امام طبری) مکتبِ فکر کے علاوہ محدثین کا تذکرہ کرنا ظاہر ہے کہ یہ بھی ایک مکتبِ فکر تھا، جس کی راہیں مسائل کے اثبات اور استنباط میں باقی ائمہ سے مختلف تھیں، اور سب ائمہ سنت کی نظر میں نہ صرف کہ پوری عزت اور احترام کی نظر سے دیکھی جاتی تھیں، بلکہ تمام ائمہ اور ان کے اَتباع اس مکتبِ فکر اور ان کی علمی خدمات کو استناد اور استحسان کی نگاہ سے دیکھتے اور ائمہ حدیث مذکورہ مکاتبِ فکر اور ان کے مسائل پر تنقید فرماتے تھے۔ ادھر یہ لوگ بھی کوشش فرماتے تھے کہ اہلِ حدیث کو ان پر تنقید کا موقع نہ دیں۔

افسوس! آج کے ”علمی“ حلقوں میں وہ تنقیدات مطاعن تصور ہونے لگی ہیں، اور یہ سب تقلید اور جمود کی کارفرمائیاں ہیں!![2]

---

1. ابن ندیم نے امام احمد کا سنہ وفات ۱۳۳ھ لکھا ہے، جو بداہتاً غلط ہے۔ ۱۶۴ھ تو امام رحمہ اللہ کی پیدائش ہے۔ یہ ابن ندیم سے سہو معلوم ہوتا ہے۔ [مولف]
2. ہفت روزہ ”الاعتصام“ لاہور (۷؍جولائی ۱۹۷۲ء)

اسلافِ کرام کا مطلوب احترام

اور

تقلیدِ جامد کے کرشمے

اپنے اسلاف کرام رحمہ اللہ کا ادب ضروری ہے اور اخلاق کا بھی یہ اہم مسئلہ ہے۔ مشہور حدیثِ نبوی ہے:
«لَیْسَ مِنَّا مَنْ لَّمْ یَرْحَمْ صَغِیْرَنَا، وَ لَمْ یُوَقِّرْ کَبِیْرَنَا»[1] (مشکوۃ)
یعنی جو چھوٹوں پر رحم نہ کرے اور بڑوں کا احترام نہ کرے، وہ ہم میں سے نہیں۔
اس سے ظاہر ہے کہ ادب بڑی ضروری چیز ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ عموماً مذہبی گروہ اور فرقے آپس میں اس چیز کا لحاظ نہیں رکھتے، بلکہ جن اکابر ائمہ سے مسلک میں اختلاف ہو، ان سے کم درجے کے لوگ ان کے متعلق بے ادبی کا اظہار کرتے ہیں اور پھر اسے خوبی بلکہ سچائی سمجھا جاتا اور اس ناروا تعصب کو حق گوئی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ غالباً یہ کمزوری تقلیدِ جامد کی پیداوار ہے۔ یہ کسی ایک بزرگ کے ساتھ غیر معتدل اور مفرط محبت کا شاید تقاضا ہے کہ اپنے مقلد کے مخالفین سے بغض ہو جاتا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

شوافع:

امام الحرمین ابو المعالی عبدالملک بن عبداللہ الجوینی رحمہ اللہ[2] (۴۷۸ھ) فقہ شافعی کے بہت بڑے ترجمان ہیں۔ ان کی رہایش نیشا پور میں تھی۔ جب ان کے والد کا انتقال ہوا، ان کی عمر بیس برس تھی۔ یہ اسی وقت اپنے والد کی مسند پر تعلیم و تدریس کا کام کرنے لگے۔ بعدہٗ یہ بیت اللہ چلے گئے۔ چار سال تک وہاں ٹھہرنے کے بعد واپس نیشا پور آ گئے، پھر یہیں تیس سال تک درس و تدریس میں مشغول رہے۔ آپ شافعی فقہ کے بہت بڑے ماہر اور ترجمان تھے۔

معلوم ہوتا ہے پانچویں صدی ہجری کے قریب اس علاقے میں شافعیت کو بہت عروج تھا۔ امام الحرمین

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (۱۹۱۹)

[2] ان کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو، مثلاً: وفیات الاعیان (۲/۳۴۴) یہ جوین کی طرف منسوب ہیں، جو نیشا پور کی طرف ایک گاؤں تھا۔ [ع۔ ح]

نہ صرف درس دیتے رہے، بلکہ اس دیار میں محراب اور منبر پر بھی ان کا ہی قبضہ تھا۔

واضح رہے کہ امام الحرمین کے لقب سے دو آدمی مشہور ہیں، ایک حنفی قاضی ابوالمظفر یوسف الجرجانی، جو فقہ حنفی کے بڑے ماہر امام تھے۔ دوسرے یہی ابوالمعالی عبدالملک بن عبداللہ امام الحرمین، جو شافعی تھے۔

(الفوائد البهية، ص: ٢٤٦ طبع مصر)

آخر الذکر شافعی مسلک کے بے حد عقیدت مند ہیں، جیسا کہ اس موضوع پر ان کی ایک کتاب "مغيث الخلق في ترجيح القول الحق" نام سے پتا چلتا ہے، جو انھوں نے شافعی فقہ اور مسلک کی فقہ حنفی پر ترجیح میں لکھی ہے، جس میں اگرچہ حضرت امام ابوحنیفہ کا ذکر بڑے احترام سے کیا گیا ہے، تاہم استحقار اس سے ٹپکتا ہے، جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا یہ تقلیدِ جامد کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے، جس کی کمی احناف میں بھی نہیں، بلکہ باقی مکاتبِ فکر کے فقہا سے حنفیہ میں بے ادبی کے اس قسم کے جراثیم زیادہ ہیں۔

بہرحال امام الحرمین جوینی فرماتے ہیں:

"فإن الشافعي كان عالماً في الأصول والفروع واللغات و أنواع العلوم، و أبو حنيفة لم يكن له قدم مترسخة في بعض هٰذه العلوم على ما لا يكاد يخفىٰ، و كان أبو حنيفة ذا فن واحد" (ص٢٣ مغيث الخلق طبع مصر ١٣٥٣ھ)

دوسرے مقام پر فرماتے ہیں:

''امام شافعی جامع العلوم اور نسبتاً قریشی ہیں۔ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے: ائمہ قریش سے ہوں گے اور قریش سے آگے مت بڑھو۔ ان شواہد سے معلوم ہوتا ہے ان کا مذہب غیر سے بہتر ہے:

"وأبو حنيفة نبطي لا عربي، والشافعي عربي فضلًا أن يكون قرشياً من قريش" (ص: ٣٢)

بعض اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

"لأبي حنيفة أصول باطلة مقطوع بها منها... الخ"

اس کے بعد ان کے مسئلہ ''استحسان'' اور ''قیاس'' کے مخالف خبر واحد کے انکار کا ذکر کیا ہے۔ (ایضاً، ص: ٣٢)

آگے چل کر لکھتے ہیں:

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ حضرت عمر فاروق، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اور حضرت انس رضی اللہ عنہم ایسے کبار صحابہ کی روایات کو رد فرما دیتے ہیں، حالانکہ بقول امام شافعی جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہ ان کے درّے نے زمین میں قرار دسکون پیدا کر دیا تھا، جب حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کو برقرار رکھا تو آپ حضرات (حنفیہ) اسے کیسے رد کر سکتے ہیں؟ (ایضاً، ص: ٣٣)

ایک جگہ حدیث میں امام شافعی کی وسعتِ نظر کا ذکر کر کے حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے متعلق لکھتے ہیں:

"كانت بضاعته من علم الحديث مزجاة" (أيضاً، ص:٣٥)

"ان کی نظر فنِ حدیث میں ناقص تھی۔"

پھر امام شافعی اور امام ابوحنیفہ کی دقتِ نظر کے تقابل کے سلسلے میں حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی دقتِ نظر کا اعتراف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"و لكن نظر الشافعي أدق، فالإمامان ـ رحمهما الله تعالىٰ ـ دققا نظريهما إلا أن دقيقة أحدهما تلائم الأصول و القواعد والأساس، و نظر أبي حنيفة، وإن دق، إلا أنه لا يوافق الأصول، و يخالفها و يحيد عنها، و أكثر نظره يخالف الكتاب والسنة والآثار وإجماع الأمة" اهـ

خلاصہ یہ کہ امام شافعی کی نظر دقیق اور اصول کے مطابق ہے، جب کہ حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی دقتِ نظر اصول سے مطابقت نہیں کھاتی، نیز کتاب و سنت، آثار اور اجماعِ امت کے خلاف ہے۔ (ص ۳۷۔ ۳۸)

اس کے بعد بعض مسائلِ فقہ حنفیہ کا اصولی جائزہ لیا ہے اور تفصیلی بحث کی ہے، اس کے بعد نتیجے کے طور پر فرماتے ہیں:

اسی لیے امام ابو یوسف رحمہ اللہ اور محمد رحمہ اللہ نے اپنے استاد کی دو تہائی مذہب میں مخالفت فرمائی ہے اور اکثر مسائل میں شافعی رحمہ اللہ کا ساتھ دیا ہے:

"فلهذا استنكف محمد بن الحسن و أبو يوسف عن متابعته في ثلثي مذهبه، و وافقا الشافعي في أكثر المسائل" (ص:٤٤)

اسی ضمن میں یہ بھی لکھا ہے کہ امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہما اللہ امام شافعی رحمہ اللہ سے استفادہ فرماتے تھے اور ان کی انتہائی عزت کرتے تھے:

"و يجلسان بين يديه كأن على رؤوسهما الطير" (ص:٤٦)

"وہ امام شافعی کے سامنے سر جھکا کر خاموش بیٹھتے تھے۔"

بعدہ ہارون الرشید رحمہ اللہ کے دربار کی بعض مجالس کا ذکر کیا ہے۔ ہارون کے دربار میں امام شافعی کی عزت اور توقیر سے امام ابو محمد اور امام ابو یوسف کو حسد ہوا۔ وہ دربار میں امام شافعی کو ذلیل کرنا چاہتے تھے، مگر معاملہ الٹ ہو گیا اور انھیں خفت ہوئی۔ (ص:۴۶)

سلطان محمود بن سبکتگین[1] کا ذکر کیا کہ وہ پہلے حنفی تھے۔ قفال شاشی[2] کی دو رکعت نماز، جو انھوں نے بدرجہ اقل حنفی مذہب کے مطابق پڑھائی، دیکھ کر سلطان شافعی ہو گئے۔ (ص ۵۷ تا ۵۹)

یہ وہی قصہ ہے جسے ابن خلکان[3] نے اسی کتاب "مغيث الخلق" سے نقل کیا ہے، جس سے فی الواقع حنفی مذہب سے نفرت ہوتی ہے اور یہ نماز کی ایسی صورت ہے جسے برداشت کرنا مشکل ہے۔ اس کے بعد امام الحرمین نے حنفی مذہب کے نماز حج، صوم، نکاح، املاک، معاملات، زکات، جنایات وغیرہ کا تفصیلی جائزہ لیا ہے اور حنفی اور شافعی کے مسائل کا تقابل کیا ہے اور شافعی مسلک کو ترجیح دی ہے۔

اس طویل تفصیلی جائزے کے بعد امام الحرمین لکھتے ہیں:

"و لسنا نذكر هٰذا للتعصب، بل هم الذين كانوا يبالغون في التعصب على الشافعي رحمه الله حتى أخبر الشافعي أن محمد بن الحسن و أبا يوسف كانا يدعوان الله تعالىٰ و يقولان: اللهم أمت الشافعي فأنشد، و قال:

تمنى رجال أن أموت و إن أمت
فتلك سبيل لست فيها بأوحد
فقل للذي خلاف الذي مضىٰ
تهيأ لأخرىٰ مثلها فكان قد

یعنی یہ باتیں حقیقتِ حال کی وضاحت کے طور لکھی گئی ہیں، کسی تعصب کے سبب نہیں، کیونکہ امرِ واقع یہ ہے کہ یہ (حنفی) حضرات امام شافعی سے تعصب رکھتے ہیں، جیسا کہ امام شافعی رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ امام ابو یوسف اور امام ابو محمد بددعا کیا کرتے تھے کہ شافعی مر جائیں، جس پر امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا: کئی آدمی میری موت کی آرزو کرتے ہیں، اگر میں مر جاؤں تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہوگی، جو لوگ پیچھے رہ رہیں ہیں ان سے کہہ دو: وہ بھی اس کے لیے تیار رہیں۔"

اس کے بعد ہارون الرشید کی مجلس میں کچھ مسائل کا ذکر کیا ہے، جن کا جواب امام ابو یوسف نہ دے سکے۔ اسانید کے لحاظ سے یہ واقعات کہاں تک صحیح ہیں، اس وقت اس سے بحث نہیں، اگر یہ درست ہیں تو یقیناً یہ مناقشہ ان تعلقات کی پیداوار ہے جو ایک فریق کو اپنے فریق سے تھے۔ اگر یہ واقعات غلط ہیں تو

---

[1] متوفی ۴۲۲ھ۔ ان کے حالات کے لیے دیکھیے، مثلاً: ابن خلکان (۴/ ۲۶۲۔ ۲۶۹) طبع محی الدین عبدالحمید [ع۔ ح]

[2] ابوبکر محمد بن علی القفال الکبیر الشافعی کے حالات کے لیے دیکھیے: ابن خلکان (۳/ ۳۳۸) طبع مذکور [ع۔ ح]

[3] وفیات الاعیان (۴/ ۲۶۷) طبع مذکور۔ [ع۔ ح]

امام الحرمین رحمہ اللہ ایسے بڑے فقیہی امام سے اس کا ارتکاب انتہائی عصبیت ہوگی، جس کی بنیاد تقلید شخصی اور اس پر جمود کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتی۔

احناف:

فقہ شافعی اور اسی قسم کے مجادلات کا لٹریچر ہمارے ملک میں کم ہے۔ ممکن ہے شوافع میں امام الحرمین سے بھی زیادہ کسی نے حنفیہ پر تنقید کی ہو۔ اس کے بالمقابل جہاں تک احناف کرام کا تعلق ہے، یہ عرض کیے بغیر چارہ نہیں کہ بے ادبی کی یہ جنس ان کے ہاں زیادہ اور عام ہے۔

علامہ محمد زاہد کوثری مرحوم:

علامہ مذکور قریبی زمانے کے عالم ہیں، ان کی نظر رجال اور متون پر خاصی ہے، لیکن ان کی ساری فنی مہارت شوافع اور اہلِ حدیث کے خلاف صرف ہوئی۔ مرحوم کوثری بلا کے متعصب[1] ہیں۔

تخریجِ زیلعی کے مقدمہ اور ان کی کتاب احقاق الحق وغیرہ اور حواشی اور رسائل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔ اپنے رسالے "إحقاق الحق" کے صفحہ (۵۔۴) میں امام الحرمین کے متعلق فرماتے ہیں:

"علا جلالة قدره بين الشافعية و كثرت مؤلفاته في الفقه والأصول، لاخبرة له بالحديث" (بحواله تنبيه الباحث السري للعلامة محمد المغربي، ص: ٤٩)

حالانکہ بعض فنون میں کمال اور بعض میں کمزوری احناف میں بھی موجود ہے۔ صاحبِ ہدایہ پر ان کی جلالتِ قدر کے باوجود نقلِ روایت میں اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ امام بزدوی اور ان کی اصول کے شارح علامہ عبدالعزیز بخاری کی بھی یہی حالت ہے، اس میں امام الحرمین منفرد نہیں، لیکن علامہ کوثری ان پر اس لیے ناراض ہیں کہ وہ ہمارے امام شافعی رحمہ اللہ سے بے حد عقیدت رکھتے ہیں۔

شیخ ملا جیون رحمہ اللہ:

اورنگ زیب عالمگیر کے استاد ہیں، اسم گرامی احمد ہے۔ اپنے وقت کے مشاہیر سے ہیں۔ اورنگ زیب انھیں بڑی عزت سے دیکھتے تھے۔ متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ تفسیر احمدی اور نور الانوار ان کی مشہور تصانیف سے ہیں۔ نور الانوار اصولِ فقہ میں درسی اور متداول کتاب ہے، ان کا انتقال ۱۱۳۰ء میں ہوا۔

شیخ ان امور کا ذکر کرتے ہوئے جو اہلیت (خطاب) کی راہ میں حائل ہوتے ہیں، فرماتے ہیں کہ ان

[1] اس قدر کہ بعض اہلِ علم ان کو "مجنون ابی حنیفہ" کہا کرتے تھے۔ (تعليق بدع التفاسير، ص: ۱۷۰ از شیخ عبداللہ غماری)

[ع۔ح]

میں بعض سماوی (غیر اختیاری) ہیں اور بعض کسبی (اختیاری)۔ کسبی کی تفصیل میں انھوں نے جہل کی مختلف اقسام ذکر فرمائی ہیں:

"جهل باطل، جهل صاحب الهوىٰ، جهل باغي، جهل المجتهد بالكتاب أو بالسنة"

آخری قسم کی مثال میں فرماتے ہیں:

"كجهل الشافعي في حل متروك التسمية عامدا قياساً على متروك التسمية ناسياً"

(نور الأنوار، ص: ۲۹۸)

اس کے بعد امام داود ظاہری رحمہ اللہ کی اجتہادی جہالت کا ذکر فرمایا کہ وہ بعض احادیث کی بنا پر امہاتِ اولاد کی (جن لونڈیوں کی گود میں اپنے مالک کی پشت سے اولاد ہو) بیع کو جائز سمجھتے ہیں اور امام شافعی رحمہ اللہ کی دوسری اجتہادی جہالت یہ ہے کہ وہ ایک گواہ اور قسم کے ساتھ بناءًا علی الحدیث مدعی کے دعوے کو ثابت سمجھتے ہیں۔

حضرت ملا جیون رحمہ اللہ کی جلالتِ قدر کے باوجود یہ ترکیب عجیب ہے کہ "مجتہد ہو اور جاہل" پھر اس جہالت کا تعلق کتاب اللہ سے ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے جاہل بھی اور مجتہد بھی۔ خوب رہی! کیا مقامِ اجتہاد کے ساتھ یہ مذاق اور اس کی توہین نہیں؟

نبوت کے بعد مجتہد کا امت میں جو علمی مقام ہے، معلوم ہے۔ کیا اس رفعت کے باوجود اسے بوقتِ ضرورت جاہل بھی کہا جا سکتا ہے؟ اگر فرعی اور اجتہادی مسائل میں کسی امام سے اختلاف کیا جائے یا کسی جزئی پر تنقید کی جائے تو آسمان سر پر اٹھا لیا جائے کہ یہ بے ادبی ہے اور خود حضرت اسے جہالت سے تعبیر فرمائیں تو کوئی چرچا نہیں ہوتا۔

اس پر عجیب شان سے فرماتے ہیں:

"و قد نقلنا كل هذا على نحو ما قال أسلافنا، و إن كنا لم نجترئ عليه"

(نور الأنوار، ص: ۲۹۸)

یعنی ہم نے اپنے بزرگوں کی نقل کی ہے، ورنہ ہم یہ جرأت نہیں کر سکتے تھے۔

امام شافعی اور امام داود رحمہما اللہ کی شان میں اس سے زیادہ اور کیا گستاخی کی جا سکتی تھی؟ لیکن جیسا کہ ہم نے ابتدا میں عرض کیا کہ یہ سب تقلیدِ جامد کی برکت ہے، ورنہ جرأت واقعی مشکل ہے۔ امام جوینی کا اندازِ تنقید آپ پڑھ چکے ہیں، وہ اس قدر عریاں نہیں۔ ہمارے برادرانِ احناف اس معاملے میں واقعی دلیر ہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ ایسی مسلمہ شخصیت کو جاہل کہنا ان کے ہاں معمول کی بات ہے!!

مسئلہ متروک التسمیہ:

اب لگے ہاتھوں اس مسئلے پر غور فرمائیں کہ حضرت امام شافعی کا اس میں جرم کیا ہے اور اس اجتہاد میں

کون سی جہالت برتی ہے؟

مسئلہ یہ ہے کہ اگر ذبیحہ پر اللہ تعالیٰ کا نام نہ لیا جائے تو اس کا کیا حکم ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿لَا تَأْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ﴾ [الأنعام: ۱۲۱]

''جس چیز پر اللہ کا نام نہ لیا جائے، اسے مت کھاؤ۔''

اس کے عموم میں وہ چیزیں بھی شامل ہیں جن پر بتوں کا نام لیا گیا، وہ بھی شامل تھیں جن پر بھول اور نسیان کی وجہ سے نام نہیں لیا جا سکا اور وہ اشیا بھی جن پر عمداً اللہ کا نام نہیں لیا گیا۔ فقہائے احناف نے آیت کے عموم سے بھول کر متروک التسمیۃ مستثنیٰ کیا ہے، یعنی اگر کسی جانور کو ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لینا بھول جائے تو وہ حلال ہے۔ چونکہ کسی عموم سے ایک فرد جب خاص کر لیا جائے تو عام کی قطعیت ختم ہو جاتی ہے اور وہ ظنی ہو جاتا ہے، چنانچہ اصولِ فقہ میں اس کی صراحت موجود ہے:

''فإن لحقه خصوص معلوم أو مجهول لا يبقى قطعيا'' (نور الأنوار، ص: ٦٨)

یعنی اگر کسی معلوم یا مجہول مخصص کی وجہ سے عام میں تخصیص آجائے تو ظنی ہو جائے گا، اپنے مشمولات پر اس کا اطلاق قطعی نہیں ہوگا۔

اب سنیے کہ حضرت امام شافعی کا جرم صرف اس قدر ہے کہ اس ظنی نص سے انھوں نے ایک فرد کی اور تخصیص کر لی، جو اصول کے مطابق بالکل درست ہے، یعنی متروک التسمیۃ نسیاناً جس طرح حلال ہے، اسی طرح عمداً متروک التسمیۃ بھی حلال ہے، اگرچہ اس مسئلے میں زیادہ ٹھوس مسلک امام مالک رحمہ اللہ کا ہوگا، جو ان سب صورتوں میں ذبیحہ حرام سمجھتے ہیں، تاہم امام شافعی رحمہ اللہ کی رائے غلط ہو سکتی ہے، اس لیے کہ مجتہد خطا کر سکتا ہے لیکن اسے جہالت سے تعبیر کرنا بہت ہی نامناسب ہے۔

ایسے ہی امام داود ظاہری رحمہ اللہ پر ناراضگی اور جہالت کا فتویٰ بھی کسی طرح مناسب نہ ہوگا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے اواخر تک تو امہات الاولاد کی فروخت بوقتِ ضرورت جائز تھی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس بیع کو حکماً روک دیا۔ فرمائیے! اس میں جہالت کی کیا بات ہوئی؟ بیسیوں روایات کی مخالفت خود فقہاے احناف رحمہم اللہ کرتے ہیں اور صحیح احادیث تک کو نظر انداز کر جاتے ہیں، اس زعم میں کہ ان سے مدعا ثابت نہیں، بس اس طرز کو غلط تو کہا جا سکتا ہے، تاہم جہالت کہنا ائمہ کی شان میں بڑی جسارت ہے، لیکن تقلید کی وجہ سے انتقامی جذبے کے سوا اس کا موجب اور کیا ہو سکتا ہے؟

شاہد ویمین:

مسئلے کی صورت یوں ہے کہ مقدمات جب عدالت میں پیش ہوں تو ان کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں:

① مدعی کے پاس مکمل شہادت موجود ہو یا ② مدعی کے پاس شہادت بالکل موجود ہی نہ ہو، ③ مدعی کے پاس شہادت ناقص موجود ہو۔ پہلی صورت میں مدعا علیہ حلف دے گا۔

«البينة على المدعي، واليمين على من أنكر»[1] اس نص کا تعلق ان دو صورتوں سے ہے، ناقص شہادت سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ وہ شہادت کی دوسری ایک مستقل صورت ہے۔ یعنی مدعی کے پاس اگر صرف ایک گواہ ہو تو مدعی کو یہ رعایت دی گئی ہے کہ وہ ایک شہادت کے ساتھ ایک قسم کھا جائے تو قاضی کو فیصلہ اس کے حق میں کرنا چاہیے، بشرطیکہ قاضی شہادت کی صحت کا یقین کرے۔ اگر شہادت قاضی کی نظر میں مشتبہ ہو جائے تو کوئی بھی صورت ہو، شہادت موثر نہیں ہوتی۔ حضرت امام شافعی رحمہ اللہ کا فتویٰ (جن کے ساتھ دوسرے ائمہ بھی ہیں) اس مشہور صحیح حدیث کی رو سے ہے:

"عن ابن عباس رضي الله عنهما أن رسول الله ﷺ قضىٰ بيمين و شاهد"[2] رواه مسلم.

(مشكاة المصابيح)

یعنی بروایت ابن عباس رضی اللہ عنہما رسول اللہ ﷺ نے ایک گواہ کی صورت میں دوسرے گواہ کے بجائے مدعی سے قسم لے کر فیصلہ صادر فرما دیا۔

بنا بریں حضرت امام شافعی رحمہ اللہ اور بعض دوسرے ائمہ نے شاہد اور یمین کو موثر سمجھا۔ فقہائے محدثین بھی اس کے موید ہیں۔ فقہائے عراق اسے موثر نہیں سمجھتے۔ انھیں یہ حق ہے کہ اسے قبول نہ فرمائیں، لیکن جہالت کا فتویٰ تو بڑی ہلکی بات ہے اور بے حد نامناسب!![3]

---

① سنن البيهقي (۱۰/ ۲۵۲) نیز دیکھیں: سنن الترمذي، رقم الحديث (۱۳۴۱)

② صحيح مسلم، رقم الحديث (۱۷۱۲)

③ ہفت روزہ "الاعتصام" لاہور (۱۱ر اگست ۱۹۷۲ء)

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور مسئلہ فاتحہ خلف الامام

اختلاف اگر دیانت اور نیک نیتی سے ہو تو بسا اوقات اس سے مفید نتائج پیدا ہو سکتے ہیں۔ چناں چہ ائمہ کرام کے اختلافات اسی قسم کے ہیں، جن سے اسلام کو کافی فائدہ پہنچا۔ مسئلہ قراءتِ خلف الامام بھی اسی قسم کا ہے۔ کچھ شک نہیں کہ اس میں مدت سے اختلاف رہا ہے۔ علمائے امت نے اپنے فہم و استعداد کے مطابق اپنے عندیے کا اس میں ذکر کیا اور پڑھنے اور نہ پڑھنے کے متعلق انھوں نے کوئی نہ کوئی راہ اپنے لیے پسند فرمائی۔ رضي الله عنهم وأرضاهم.

علمائے دیوبند کی علمی خدمات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ انھوں نے اپنے مسلک کے مطابق جہاں اور علمی خدمات انجام دیں، وہاں انھوں نے اختلافیات میں بھی اپنے لہجے پر کافی لکھا۔ پہلے بزرگوں نے تحریروں میں اپنے مسلک کی گو حمایت کی ہے، لیکن ہم اعتراف کرتے ہیں کہ وہاں متانت اور قوتِ استدلال کے ساتھ ہی خیانت سے بچنے کی کوشش کی گئی اور عموماً استدلال میں خیانت کی گندگی سے قلم کو آلودہ نہیں کیا گیا، لیکن موجودہ دور کے بزرگانِ دیوبند افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس خیانت سے بچ نہیں سکے۔

چناں چہ مولوی بدر عالم صاحب کی تقریر میں نے اپنے کانوں سے سنی اور بعض دیوبند کے خوشہ چینوں کی تحریریں اس وقت بھی میرے پیشِ نظر ہیں، جس میں حضرت شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے خیالات سے مسئلہ فاتحہ میں اسی نامناسب طریق پر استدلال کیا گیا ہے، حالاں کہ بداہتاً معلوم ہے کہ حضرت شیخ الاسلام کے ارشادات نہ حضرات علمائے دیوبند کے نزدیک حجتِ شرعی ہیں اور نہ قارئینِ فاتحہ کے نزدیک واجب الاطاعت۔ پھر اس سے استدلال اور اس پر یہ زور کون سی قوتِ اجتہاد کی نمایش ہے؟

اور اے کاش کہ حضرت شیخ الاسلام کے خیالات ہی صحیح طور پر بیان کر کے پھر اپنے سے کوئی وجہ ترجیح سوچ لی جاتی۔ شیخ الاسلام کا مسلک اس مسئلے میں قریب قریب حنابلہ کے مسلک کے مطابق ہے، جسے وہ جمہور کا مسلک قرار دیتے ہیں۔ میری ان معروضات کا مقصد شیخ کے کلام سے کوئی استفادہ نہیں، صرف یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ آج کل کے دیوبندی علما جو مقصد شیخ کے کلام سے حاصل کرنا چاہتے ہیں، شیخ اس سے بَری ہیں۔ وہ اس مسئلے میں ایسی رائے رکھتے ہیں، جو نہ قارئینِ فاتحہ کے بالکل موید ہے اور نہ تارکینِ قراءت کے موافق، بلکہ وہ

اپنے مقام پر دونوں کو ڈانٹتے ہیں۔

شیخ الاسلام کی نگاہ میں تو حنفی اور اہلِ حدیث دونوں غلطی پر ہیں، اس لیے بہ حوالہ شیخ الاسلام کسی ایک کو بھی دوسرے پر الزام نہیں دینا چاہیے۔ چناں چہ شیخ الاسلام اس مسئلے پر تفصیلی گفتگو فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

"وأصول الأقوال ثلاثة: طرفان ووسط، فأحد الطرفين أنه لا يقرأ خلف الإمام بحال، والثاني: أنه يقرأ خلف الإمام بكل حال، والثالث، و هو قول أكثر السلف: إنه إذا سمع قراء ة الإمام أنصت ولم يقرأ، فإن استماعه لقراءة الإمام خير من قراء ته (إلى أن قال) هذا قول جمهور العلماء، كمالك و أحمد بن حنبل و جمهور أصحابهما، وطائفة من أصحاب الشافعي وأبي حنيفة، وهو القول القديم للشافعي، وقول محمد بن الحسن"[1]

یعنی مسئلہ قراءتِ خلف الامام میں تین قول ہیں: ① ہر حال میں پڑھنا ② کسی حال میں نہ پڑھنا ③ تیسرا قول جو اکثر کا خیال ہے، وہ یہ کہ اگر قراءتِ امام کو سنے تو نہ پڑھے اور چپ رہے، کیوں کہ اس صورت میں استماع، قراءت سے افضل ہے اور اگر امام کی آواز کو نہ سنے تو پڑھے۔ جمہور علما کا یہی مذہب ہے۔ امام مالک اور امام احمد رحمہ اللہ اور ان کے اکثر اَتباع اور بعض شوافع اور بعض احناف بھی اسی طرف گئے ہیں۔ امام شافعی کا قولِ قدیم بھی یہی ہے اور امام محمد رحمہ اللہ (شاگرد امام ابوحنیفہ) کا بھی یہی خیال ہے۔

اس کے بعد شیخ الاسلام فرماتے ہیں:

"والمقصود هنا القراءة خلف الإمام، فنقول: إذا جهر الإمام استمع لقراء ته، فإن كان لا يسمع لبعده أنه يقرأ في أصح القولين، وهو قول أحمد، وإن كان لا يسمع لصممه أو كان يسمع همهمة الإمام، ولا يفقه ما يقول، ففيه قولان في مذهب أحمد وغيره، والأظهر أنه يقرأ ... الخ"

یعنی جب امام آواز سے پڑھے تو امام کی قراءت کو سنے اور اگر دور ہونے کے سبب سن نہیں سکتا تو صحیح یہی ہے کہ اسے پڑھنا چاہیے اور اگر بہرا پن سے نہیں سن سکتا یا صرف امام کی آواز کی گھن گھناہٹ کو سنتا ہے اور سمجھ نہیں سکتا تو اس میں دو قول ہیں: ظاہر یہ ہے کہ اس صورت میں پڑھنا چاہیے۔

اس کے بعد شیخ الاسلام نے اس مسلک کو بیان کیا کہ مانعینِ قراءت کے مردہ جسموں میں جان ڈال دی

① مجموع الفتاویٰ (۲۳/ ۲۶۵)

ہے۔ مختلف احادیثِ قراءت پر جرح فرمائی ہے، بعض مناسب تاویلات کی ہیں۔ اس ضمن میں شیخ رحمہ اللہ نے حدیثِ ابی موسیٰ و ابی ہریرہ رضی اللہ عنہما کی زیادت «وإذا قرأ فأنصتوا»[1] کو بہ حوالہ صحیح مسلم بیان فرمایا ہے اور حدیثِ ابی ہریرہ پر امام مسلم کے کلام کو بھی بالاستیعاب ذکر کیا ہے۔

آخری الفاظ جو شیخ رحمہ اللہ نے اس معرکے میں ارشاد فرمائے ہیں، وہ اس چیز کا پتا دیتے ہیں کہ شیخ رحمہ اللہ کا اس وقت تک رجحان حنابلہ کی طرف بہ نسبت محققین مستقلین کے زیادہ ہے، ورنہ تحقیقی نظر کے بعد جس کا اعتراف شیخ نے اپنے رسالہ "مناسك الحج" کے شروع میں کیا ہے، یہ تشدد غیر ممکن ہے۔ رحمه الله و رضي الله عنه وأرضاه.

"فإذا كانوا مشغولين عنه بالقراءة فقد أمر أن يقرأ على قوم لا يستمعون لقراءته، وهو بمنزلة من يحدث من لا يستمع لحديثه، ويخطب من لا يستمع لخطبته، وهذا سفه، تنزه عنه الشريعة، ولهذا روي في الحديث: مثل الذي يتكلم، والإمام يخطب كمثل الحمار يحمل أسفاراً[2] فهكذا إذا قرأ والإمام يقرأ عليه"!

''جب مقتدی اپنی قراءت کے ساتھ امام کی قراءت سے مشغول ہوں تو گویا امام کو ایسی قوم کو سنانے کا حکم ہوا، جو اس کی سنتے ہی نہیں۔ یہ ایسا ہے جیسے ایسے آدمیوں سے گفتگو کرنا، جو اس کی نہیں سنتے یا ایسے لوگوں میں خطبہ کہنا، جو اس کی طرف توجہ نہیں دیتے اور یہ بے وقوفی ہے، جس سے شریعت پاک ہے۔ اسی لیے حدیث میں مروی ہے، جو شخص خطبے میں باتیں کرے، اس کی مثال ایسی ہے، جیسے گدھے پر کتابوں کا بوجھ لادا جائے، پس اسی طرح ہوگا، جب کوئی شخص پڑھے، جبکہ امام اس کو سنا رہا ہے۔''

یہ وہ زور دار الفاظ ہیں، جنھیں آج کل بزرگانِ دیوبند بڑے مسالے لگا کر خطبوں میں، مجلسوں میں، مناظروں میں بڑے اہمیت سے ذکر کرتے ہیں۔ جہاں تک حضرت شیخ کی رائے کا تعلق ہے، میں اسے تسلیم کرتا ہوں کہ شیخ جہری نمازوں میں قراءتِ مقتدی کے مخالف ہیں، جیسے حنابلہ کا مسلک ہے۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ وہ شیخ کی رائے کا اگلا حصہ بالکل نظر انداز کر جاتے ہیں، جو انھوں نے سری نمازوں میں پڑھنے کے متعلق لکھا ہے (یا جہری نمازوں میں امام سے دور ہونے کی صورت میں یا جہری نمازوں کی سری رکعتوں کی بابت لکھا ہے)۔ شیخ کے بیان فرمودہ دلائل سے کسی ایک کے ساتھ جسے صحیح سمجھے، تمسک کرنا معیوب نہیں، آخر علمی چیزیں اہلِ علم کی

[1] دیکھیں: صحیح مسلم، رقم الحدیث (٤٠٤)

[2] مسند أحمد (١/ ٢٣٠) اس کی سند میں ''مجالد بن سعید'' ضعیف ہے۔

امانت ہیں۔ حیثما وجدها فهو أحق بها.

لیکن شیخ کی رائے کے کسی حصے سے استدلال اور ان سے خلاف کا ترک امانت، دیانت اور عدالت کی بدترین توہین ہے، جس کا آج کل بزرگانِ دیو بند عموماً ارتکاب فرما رہے۔ عفا اللّٰه عنهم.

اہلِ حدیث بھی عموماً علمائے دیو بند پر اعتماد کرتے تھے، عام نزاعی مسائل میں ان کا حکم تسلیم کر لیا جاتا تھا، لیکن اب اس چیز کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ آج کا دیو بند وہ پہلا دیو بند نہیں، جس کی شرافت و دیانت قابلِ اعتماد تھی، بلکہ آج کا دیو بند متعصبین کی ایک ایسی منڈلی ہے، جو فرقہ پرستی کے جنون میں ان تمام اوصاف کو نظر انداز کر دیتے ہیں، جن کا ہونا ایک انسان کے لیے اور خصوصاً ایک عالم کے لیے از بس ضروری ہے ؎

مشکلے دارم ز دانشمند مجلس باز پرس   توبہ فرمایاں چرا خود توبہ کمتر میکنند

کئی سال سے شیخ الاسلام کے فرامین کا یہ حصہ جو علمائے دیو بند کے موافق ہے، ان کی تقاریر میں زینتِ محفل ہو رہا ہے، لیکن وہ حصہ جو ان بزرگوں کے خلاف ہے، اس کو بیان کرتے ان کو کبھی نہیں سنا گیا، اس لیے ان کے چند اقتباسات ذکر کر دینا غیر مناسب نہ ہوگا، تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ حضرت شیخ الاسلام کی رائے اور نام سے فائدہ اٹھانا کہاں تک صحیح ہے؟!

شیخ کا مسلک:

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ شیخ ابتداءً پورے حنبلی تھے اور فتاوے کا اکثر حصہ انھوں نے اسی مسلک کے موافق لکھا ہے۔ ترکِ حنبلیت کا اعلان انھوں نے بہت بعد میں کیا ہے، جب کہ قلعہ مصر میں قید تھے۔ چناں چہ مجموعہ رسائل (ص: ۳۵۵) میں فرماتے ہیں:

"كنت كتبت منسكاً أوائل عمري فذكرت فيه أدعية كثيرة، وقلدت في الأحكام من تبعه قبلي من العلماء، و كتبت في هذا ما تبين لي من سنة رسول الله ﷺ"

یعنی پہلے مناسک الحج میں نے علما کی تقلید میں لکھے اور اب جو لکھ رہا ہوں، یہ سنت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے لکھ رہا ہوں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ پہلے پہل اصحابِ تحقیق سے نہ تھے اور مجموعہ فتاویٰ ان کی ساری عمر کے فتوے ہیں، کچھ اوائلِ عمر کے اور کچھ تحقیق کے بعد۔ اس مسئلے میں بھی حضرت شیخ رحمہ اللہ نے مسلکِ حنابلہ کی تائید کی ہے۔ پہلے جہری میں ترکِ قراءت کا ذکر ہوا ہے اور اس کے بعد سری نمازوں میں پڑھنے کے متعلق ارشاد ہوتا ہے:

"وأما الفصل الثاني، وهو القراءة إذا لم يسمع قراء ة الإمام، كحال مخافتة

---

(1) ''مجھ کو ایک اشکال ہے، ذرا دانش مند مجلس سے پھر پوچھو: توبہ کی تلقین کرنے والے خود کم تر توبہ کیوں کرتے ہیں۔''

الإمام وسكوته، فإن الأمر بالقراءة والترغيب فيها يتناول المصلي أعظم مما يتناول غيره، فإن قراءة القرآن في الصلاة أفضل منها خارج الصلاة"

یعنی جب امام کی قراءت کو نہ سنے، جیسے امام کے اخفا اور سکوت کے وقت، پس یقیناً قراءت کا حکم اور اس میں ترغیب نمازی کو غیر نمازی سے زیادہ شامل اور نماز میں قرآن پڑھنا بیرون نماز سے افضل ہے۔

اس کے بعد شیخ نے قراءتِ قرآن کے فیصلے کا ذکر کیا ہے، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث اور فتویٰ اور بعض دوسری احادیث جن سے قراءت خلف الامام کا ہونا ثابت ہوتا ہے، بیان فرمائے ہیں، یہاں تک کہ ایک جگہ فرماتے ہیں:

"وفي السنن عن ابن مسعود قال: كانوا يقرؤون خلف النبيﷺ فقال: خلطتم علي القرآن... وهذا لا يكون ممن قرأ في نفسه بحيث لا يسمعه غيره... وإنما يكون ممن أسمع غيره، وهذا مكروه لما فيه من المنازعة لغيره، لا لأجل كونه قارئا خلف الإمام، وأما مع مخافتة الإمام فإن هذا لم يرد حديث في النهي عنه (إلى أن قال) والقارئ هنا لم يعتض عن القراء ة باستماع فيفوته الاستماع والقراء ة جميعاً" (ص: ١٤٩)

''عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ صحابہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے پڑھا کرتے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم نے مجھ پر قرآن مجید کو خلط کر دیا ہے۔ اور معلوم ہے کہ یہ اختلاط آہستہ پڑھنے سے نہیں ہوسکتا، جب کہ غیر اس کو سنتا ہی نہیں۔ یہ اسی صورت میں ہوسکتا ہے، جب غیر تک آواز پہنچے اور یہ حقیقتاً مکروہ ہے، اس لیے کہ امام سے تنازع ہے نہ کہ مطلق قراءت خلف الامام کی وجہ سے، لیکن جب امام آہستہ پڑھے تو اس صورت میں پڑھنے سے کسی حدیث میں نہی وارد نہیں ہوئی۔ (یہاں تک کہ فرمایا کہ) سری میں اگر مقتدی نہ پڑھے تو اس نے قراءت اور اس کے عوض استماع دونوں کو ضائع کر دیا، پس اس نے قراءت اور سننا دونوں فوت کر دیے۔''

ایک اصول:

اس کے بعد شیخ الاسلام ایک اصول ذکر فرماتے ہیں کہ جو ذکر امام آہستہ کرے، وہ مقتدی کو بھی کرنا چاہیے، جیسے تسبیح، تشہد، دعا وغیرہ تو قراءت بہ طریقِ اولیٰ مقتدی کو کرنا ہوگی:

"فجميع الأذكار التي يشرع للإمام أن يقولها سراً، يشرع للمأموم أن يقولها سرا، كالتسبيح في الركوع والسجود، و كالتشهد والدعاء، و معلوم أن القرآن

أفضل من الذكر والدعاء، فلأي معنى لا تشرع له القراءة في السر، وهو لا يسمع قراءة السر، ولا يؤمن على قراءة الإمام في السر؟" (فتاویٰ، ص: ۱۴۹)

اس کے بعد حضرت شیخ الاسلام نے سری نمازوں میں پڑھنے کے متعلق ایک عجیب استدلال فرمایا، جو آیت ﴿اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ﴾ سے استدلال کرنے والوں کے لیے بہت کچھ موجب بصیرت ہوگا۔ فرماتے ہیں:

"وأيضاً فإن الله سبحانه لما قال: ﴿اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَ اَنْصِتُوْا﴾ [الأعراف: ٢٠٤] قال: ﴿وَ اذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّ خِيْفَةً وَّ دُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَ الْاٰصَالِ وَ لَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ﴾ [الأعراف: ٢٠٥] وهذا أمر للنبي ﷺ ولأمته... الخ"

یعنی خداوند تعالیٰ نے جہاں ﴿اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ﴾ کے ساتھ روکا ہے، وہاں آیت ﴿وَ اذْكُرْ رَّبَّكَ﴾ کہہ کر پڑھنے کا حکم بھی دیا ہے۔ آخر میں فرمایا:

"وهذا الأمر يتناول الإمام و المأموم والمنفرد بأن يذكره سراً في نفسه بالغدو والآصال، وهو يتناول صلاة الفجر والظهر والعصر فيكون المأموم مأمورا به بذكر به في نفسه، لكن إذا كان مستمعاً كان مأموراً بالاستماع، وإن لم يكن مستمعاً كان مأموراً بذكر ربه في نفسه، والقرآن أفضل الذكر، كما قال تعالىٰ: ﴿وَ هٰذَا ذِكْرٌ مُّبٰرَكٌ اَنْزَلْنٰهُ﴾ [الأنبياء: ٥٠] وقال تعالىٰ: ﴿وَ قَدْ اٰتَيْنٰكَ مِنْ لَّدُنَّا ذِكْرًا﴾ [طٰه: ٩٩] وقال: ﴿وَ مَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّ نَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى﴾ [طٰه: ١٢٤] وقال: ﴿مَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ مِّنْ رَّبِّهِمْ مُّحْدَثٍ اِلَّا اسْتَمَعُوْهُ وَ هُمْ يَلْعَبُوْنَ﴾ [الأنبياء: ٢]" (٢/ ١٥٠)

یعنی آیت ﴿وَ اذْكُرْ رَّبَّكَ﴾ میں امر امام مقتدی منفرد سب کو شامل ہے اور حکم ہے کہ صبح شام اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا جائے، لیکن جب سنا جا سکے تو پھر سننے کا امر ہے اور قرآنِ مجید سے افضل کوئی ذکر نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: قرآن مجید برکت والا ذکر ہے، جس کو ہم نے اُتارا ہے۔ نیز فرماتا ہے: اے محمد (ﷺ)! ہم نے تجھے اپنی طرف سے ذکر (قرآنِ مجید) دیا۔ نیز فرماتا ہے: جو لوگ اللہ تعالیٰ کے ذکر (قراءتِ خلف الامام) سے اعراض کرتے ہیں۔ ان کے لیے تنگ زندگی ہے اور وہ قیامت کے دن اندھے اٹھائے جائیں گے...الخ"[1]

---

[1] ہفت روزہ "تنظیم اہلِ حدیث" روپڑ (۱۵ر ستمبر ۱۹۳۳ء)

ہمارے تعلقات... حضراتِ دیوبند سے

حضرت مجدد الفِ ثانی ؒ عملاً حنفی تھے، لیکن مکتوبات کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دو چیزوں کے سخت مخالف تھے، ایک تو وہ فقہی جمود کو ناپسند کرتے ہیں۔ دوسرے ان کو بدعات سے بے حد نفرت ہے۔ یہ دونوں چیزیں فقہ حنفی کو زندہ رکھنے کے لیے بھی ضروری ہیں۔ جمود میں عقیدت مندی کا مظاہرہ تو ہوتا ہے، لیکن اس عقیدت مندی کی عمر کچھ زیادہ نہیں ہوتی۔ مغل دور نے ان دونوں بیماریوں کو زیادہ سے زیادہ بڑھنے کا موقع دیا۔ آج کل فتویٰ نویسی میں یہ عادت ہو چکی ہے کہ سائل دریافت کرتا ہے کہ فلاں مسئلے میں علمائے دین و مفتیانِ شرع متین کیا فرماتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ سائل دین اور شریعت کا فیصلہ طلب کرتا ہے۔ اس کے جواب میں قرآنِ عزیز کی کوئی آیت صراحتاً، عبارتاً یا اشارتاً مرقوم ہونی چاہیے، اسی طرح حدیث سے بھی جو کچھ لکھا جائے، وہ اسی اصول سے لکھنا چاہیے۔ اگر قرآن اور حدیث سے یہ مقصد حاصل نہ ہو سکے تو مفتی کو یہ ظاہر کر دینا چاہیے، قرآن و سنت میں مسئلہ بہ ظاہر موجود نہیں، لیکن فلاں امام یا بزرگ کا خیال اس طرح ہے۔ اس کے بعد فقہ حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی سے عقیدت ہو تو علما کو اس کا تذکرہ کھل کر کرنا چاہیے، لیکن سائل کے ذہن کو غلطی میں نہیں ڈالنا چاہیے کہ جو کچھ اسے بتایا گیا ہے، شریعت یہی ہے۔

سائل کو اجازت ہونی چاہیے کہ اگر وہ مطمئن نہ ہو تو شریعت ختم نہیں ہوئی، اس کی تلاش کے لیے اور مواقع بھی ہیں۔ مالکی، شافعی اور حنبلی بھی شریعت ہی کی تعبیرات ہیں، لیکن ان تعبیرات میں سے کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ ان میں سے کسی ایک تعبیر کو کلیتاً شریعت سمجھے یا اس کے علاوہ باقی تعبیرات کو مظنون اور اَقرب اِلی الغلط کہے، لیکن ہمارے ہاں اہلِ علم کی عادت ہے کہ ایسے سوالات کے جواب میں اپنے خیالات یا اپنے اکابر کی آرا اور اپنی فقہیات کے دفاتر کے حوالوں سے فتویٰ لکھ دیتے ہیں۔

عامی سائل یہ سمجھتا ہے سوال کا جواب آ گیا اور جو کچھ مجھے بتایا گیا ہے، شریعت اور دین یہی ہے۔ حالاں کہ یہ ایک نیک دل مجتہد کی تعبیر ہے اور اس تعبیر کے علاوہ باقی مجتہدین کی تعبیرات بھی اتنی ہی توجہ کی مستحق ہیں جیسے یہ تعبیر۔ اس ترجمانی اور دوسرے ائمۂ اجتہاد کی ترجمانی میں قطعاً کوئی فرق نہیں۔ یہ جمود کی دعوت ہے، جو ائمۂ اجتہاد کے نام سے دی جا رہی ہے۔ دیوبند ایسی مستند درس گاہ میں بھی یہی ہو رہا ہے۔ اس

کمزور اساس کے باوجود دوسروں پر تیز اور تند فتوے دیے جاتے ہیں۔ حضرت مجدد الفِ ثانی اسی جمود کو ناپسند فرماتے تھے، جس کا اثر ان کے رفقا اور متوسلین پر کافی تھا۔ بعض ان میں سے سینے پر ہاتھ باندھتے اور رفع الیدین پر عمل کرتے تھے۔

حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کا مشن:

حضرت محدث دہلوی رحمہ اللہ بھی بظاہر حنفی ہونے کے باوجود اسی مشن کے داعی تھے۔ فاتحہ خلف الامام کے متعلق ظروف واحوال کے لحاظ سے ان کی کس قدر معتدل رائے ہے:

"وإن كان مأموما وجب عليه الإنصات والاستماع، فإن جهر الإمام لم يقرأ إلا عند الإسكاتة، فإن خافت فله الخيرة، فإن قرأ فليقرأ الفاتحة قراءة لا يشوش على الإمام، وهذا أولى الأقوال عندي، وبه يجمع بين أحاديث الباب" اھ

(حجة الله البالغة: ٢/ ٧)

"مقتدی کے لیے ضروری ہے کہ خاموشی سے امام کی قراءت کو سنے اور اگر امام جہر سے پڑھ رہا ہو تو سکتوں میں پڑھے اور اگر امام آہستہ پڑھ رہا ہو تو مقتدی کو اختیار ہے، جیسے چاہے پڑھے، لیکن یہ قطعاً نہیں ہونا چاہیے کہ مقتدی امام کی قراءت میں تشویش اور خلجان کا موجب بنے، میرے نزدیک یہی قول بہتر ہے اور اسی طرح احادیث میں تطبیق ہو سکتی ہے۔"

انتہا پسند اہلِ حدیث اور دیوبندی ممکن ہے شاہ صاحب کے ارشاد کو پسند نہ فرمائیں، لیکن شاہ صاحب نے حنفی ہونے کے باوجود پرانے جمود کو تار تار کر دیا ہے اور عملاً ایک ایسی راہ کھول دی ہے، جس سے فقہی جمود ٹوٹتا ہے اور عصبیت ختم ہو جاتی ہے۔

اسی طرح رفع الیدین کے متعلق کس قدر دلچسپ فیصلہ فرماتے ہیں:

"والذي يرفع أحب إلي ممن لا يرفع؛ فإن أحاديث الرفع أكثر و أثبت"

(حجة الله البالغة: ٢/ ٨)

"رفع الیدین کرنے والا نہ کرنے والے سے مجھے زیادہ پسند ہے، کیوں کہ رفع الیدین کی احادیث زیادہ بھی ہیں اور پختہ بھی۔"

میرا مقصد اس وقت ان مسائل کی تحقیق نہیں، بلکہ مقصود یہ ہے کہ ان اصحابِ احیا و تجدید نے کس حکیمانہ انداز سے جمود کو توڑا اور بحث و نظر اور فقہی مسائل میں بانداز اجتہاد سوچنے کی دعوت دی۔ مجدد صاحب رحمہ اللہ سے لے کر شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ تک یہ مقصد قدم قدم پر نکھرتا گیا۔ مقلد اور غیر مقلد دونوں ناپسندیدہ لفظ ہیں،

معلوم نہیں ہنگامہ آرائی کے لیے یہ دونوں لفظ کیوں پسند کیے گئے؟ اصل حقیقت تو صرف اس قدر تھی کہ صدیوں کے فقہی جمود اور رسمی حنفیت کی جگہ آزادیِ فکر کی بنیاد رکھی جائے، عنوان کے طور پر وہ حنفی کہلائیں یا شافعی، لیکن اسے حق کی راہ میں حائل نہیں ہونا چاہیے، بلکہ اگر کوئی حنفی یا شافعی اپنے مسلک کے خلاف کسی حدیث پر عمل کرنا چاہے تو حنفیت یا شافعیت کو سنت کی راہ میں حائل نہیں ہونا چاہیے۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے آیتِ کریمہ: ﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ غَلَبُوْا عَلٰٓى اَمْرِهِمْ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِمْ مَّسْجِدًا﴾ [الکھف: ۲۱] کی تفسیر میں قبور و مشاہد کے پاس مساجد کی تعمیر کا ذکر فرمایا ہے۔ اس ضمن میں اپنے وقت کے مقتدر اہلِ حدیث سلفی العقیدہ عالم علامہ فاخر الہ آبادی کا تذکرہ کس قدر محبت آمیز الفاظ میں فرمایا:

"هذه الآية تدل على جواز بناء المسجد ليصلى فيه عند مقابر أولياء الله قصداً للتبرك بهم، وقد كان الشيخ الأستاذ محمد فاخر المحدث رحمه الله يكره ذلك مستدلًا بما رواه مسلم عن أبي الهياج... الخ" (تفسیر مظهري، سورة كهف، ص: ۲۳)

حضرت مجدد الفِ ثانی رحمہ اللہ اور حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ اور اُن کے ابنا و تلامذہ کرام کو آپ حنفی فرمائیں یا دیوبندی، اُنھیں آپ صوفی فرمائیں یا مولوی، لیکن ان کے ہاں یہ جمود کہیں نہیں ملتا، جس کی دعوت آج دیوبند، سہارنپور یا بریلی سے دی جا رہی ہے۔

تحریک اہلِ حدیث یا سلفیت:

اس میں بھی شک نہیں کہ ہندوستان میں عقیدہ سلف کی دعوت اور فقہی فروع میں حزبی جمود کے خلاف اب تک جو کچھ ہوا، اس کا سرچشمہ زیادہ تر یہی مقدس گروہ ہے۔ یقیناً اس تحریک کو شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور حافظ ابن القیم، ابن کثیر، حافظ ابو شامہ، عز بن عبدالسلام اور علمائے یمن سے بھی بہت کچھ ملا، لیکن گیارھویں صدی کے آغاز سے بارھویں کے اواخر تک یہ لٹریچر ہندوستان میں نہیں پہنچا تھا۔ کہیں خال خال اگر تھا تو وہ بھی بے پروائی اور نفرت کی نذر ہو رہا تھا۔ بے خبری کی انتہا ہے کہ مولانا عبدالحلیم، مولانا عبدالحی صاحب لکھنوی کے والد، ایسے باخبر عالم شیخ الاسلام ابن تیمیہ کو مجسمہ سمجھتے تھے۔ (حواشی ملاحسن)

اگر یہ حضرات دیوبندی مسلک اور تحریک کے بانی تصور کیے جا سکتے ہیں تو ان ایام میں تحریکِ اہلِ حدیث کا داعی بھی ان کے سوا کوئی نہیں۔ اگرچہ ظروف و حالات کی نزاکت کی وجہ سے بعض احادیث پر عمل نہیں فرما سکے، لیکن ان احادیث پر عمل کے لیے راہیں ان ہی حضرات نے ہموار فرمائی ہیں۔ فرق صرف اس قدر ہوا ہے وہ حضرات عامل بالحدیث لوگوں کو دیکھ کر خوش ہوتے تھے، اس لیے کہ یہ لوگ ان کے مقاصد کی کامیابی کی عملی دلیل

تھے، لیکن آج کے بعض دیوبندی بزرگ عمل بالحدیث کو انتہائی نفرت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ان کی حنفیت مصلحت اور وقت کا جبری تقاضا تھا، یہاں فقہی جمود کو ائمہ مجتہدین کی مجتہدانہ مساعی کا نعم البدل تصور کیا جاتا ہے۔ وہاں یہ کوشش تھی کہ ہر قدم عمل بالکتاب والسنۃ کی طرف بڑھے، یہاں یہ صورتِ حال ہے کہ علم و تحقیق اگر کہیں برائے نام آ بھی جائے تو اس پر جمود کا بپتسمہ ضروری ہے، وہ علم کے نام سے نہیں، بلکہ کسی عالم کے نام سے آنا چاہیے۔

تحریک کی رفتار اور اس کے مراحل:

حضرت مجدد الفِ ثانی نے جب تجدید و اصلاح کا علم ہاتھ میں لیا، اس وقت اکبر اور دارِشکوہ کی لادینی حرکات کا غبار اُفق پر موجود تھا۔ مغل بادشاہ اس قدر غلط نہ سہی، لیکن دربار سے حرم سرا تک بدعات میں ملوث تھے۔ بعض کی دین داری رفض و تشیع کی آلایشوں سے آمیز تھی، اس لیے سنت اور اس کے حامیوں کے لیے اس ماحول میں کوئی خوش گوار مستقبل نہیں تھا، البتہ یہ ضرور تھا کہ حکومت، برائے نام سہی، مسلمان تھی۔ اسلام کی سرپرستی اور اس سے وابستگی کو پسند کرتی تھی، لیکن لادینی اور بدعی اعمال کی وجہ سے خاندان میں خلفشار اور باہمی رقابتیں روز بہ روز بڑھ رہی تھیں۔ علما کو اس سے غرض نہ تھی کہ پسِ پردہ کیا ہو رہا ہے؟ وہ صرف یہ چاہتے تھے کہ اقتدار اسلام کے ہاتھ میں ہونا چاہیے، اس لیے بادشاہوں کی نصیحت اور خیر خواہی کے سوا انھیں کوئی سروکار نہ تھا، لیکن شاہی خاندان کی رقابتیں آخر رنگ لائیں، باہمی جنگوں کی وجہ سے بیرونی مداخلت کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ اس لیے اس خالص دینی تحریک کے پروگرام میں اقتدار کے تحفظ اور اسے پختہ رکھنے کا مزید اضافہ کرنا پڑا۔ اب یہ تحریک دینی کے ساتھ نیم سیاسی بھی تھی۔

شاہ صاحب کی تصانیف اور مکاتیب کا جائزہ لیا جائے تو اس کے مندرجہ ذیل اہم عناصر محسوس ہوتے ہیں:

1. فقہی جمود کی جگہ وسعتِ ظرف اور رواداری پیدا کرنا۔
2. بدعات کی مخالفت اور سنت کی حمایت۔
3. قرآن اور سنت کو بلحاظِ نظام ملک پر مسلط کرنا۔
4. پوری تحریک میں رفض کے ساتھ سمجھوتے کی کبھی کوشش نہیں کی گئی۔

شاہ ولی اللہ کے انتقال ۱۱۷۶ھ کے بعد راہنمائی اور مسندِ درس و افتا شاہ عبدالعزیز صاحب کے سپرد کی گئی۔ اس کے ساتھ ہی تحریک ایک نئے دور میں داخل ہو گئی۔ مغل حکومت بتدریج کمزور ہو کر قریباً مفلوج ہو گئی اور بعض دوسری طاقتوں نے ہوشیاری سے اقتدار پر قبضہ کرنا شروع کر دیا، اس لیے شاہ عبدالعزیز صاحب اور اُن

کے رفقا نے کھلے طور پر غیر مسلم متسلطین کی مخالفت شروع کی، اس وقت پہلا نمبر سکھوں کا تھا، دوسرا انگریزوں مرہٹوں وغیرہ کا۔

شاہ عبدالعزیز صاحب کی رحلت کے بعد علم و افتا کی مسند پر ان کے بھائی شاہ رفیع الدین وغیرہ کام کرنے لگے، لیکن ردِ بدعات اور سیاسی امور کی ذمے داری سید احمد شہید، مولانا اسماعیل شہید اور مولانا عبدالحی بڈھانوی وغیرہم کے سپرد ہوگئی اور تحریک ایک خطرناک سیاسی دور میں داخل ہوگئی۔ بوریا نشین فقیروں نے سکھوں کے تہور اور انگریزی تدبیر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور جو چیز اب تک نظریات کی صورت میں وعظ و افتا کی زینت ہو رہی تھی، اب وہ سیف و سنان کی روشنی میں میدانِ کارزار کی زینت بن گئی۔ جہاد کی جو تلقین خطوط اور افتا میں حکمت سے کی جا رہی تھی، اب ان اقوال نے احوال و اعمال کی شکل اختیار کر لی۔

تحریکِ حریت اور مختلف دینی نظریات:

اس وقت اسلام کے نام سے چار جماعتیں ہندوستان میں موجود تھیں: اہلِ حدیث، دیوبندی، بریلوی اور شیعہ۔ اس تحریک کی بنیاد چوں کہ توحید و سنت پر تھی، اس لیے سید احمد شہید کے عساکر میں اہلِ حدیث اور دیوبندی مکتب خیال کے آدمی شامل تھے، بریلوی اور شیعہ حضرات اس میں بالکل شامل نہ تھے، بلکہ وہ کھلی مخالفت کرتے رہے، ان کے فتوے میدانِ جنگ تک پہنچتے رہے اور بددلی اور اختلاف کا موجب بنتے رہے۔

دیوبندی سے میری مراد مدرسہ دیوبند نہیں، بلکہ وہ مکتبِ خیال ہے، جس کی اشاعت کے لیے مدرسہ دیوبند کی تاسیس عمل میں آئی، یعنی کتاب و سنت کو حضرت امام ابو حنیفہ اور اُن کے تلامذہ کے نقطۂ نظر سے سمجھنا اور اس اندازِ فکر کو نظر و فکر کی اساس قرار دینا، جو فقہ العراق کی تاسیس کے وقت حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور اُن کے ارشد تلامذہ کے پیشِ نظر تھا، یعنی صحیح حنفی مسلک جو بدعاتِ عملی اور اعتقادی آمیزش سے پاک اور صاف ہو۔ ورنہ معلوم ہے کہ اس تحریک کے شباب و انحطاط کے دونوں وقتوں میں مدرسہ دیوبند کا منصوبہ بھی کسی کے حاشیہ خیال میں نہ تھا۔ اس لیے دیوبندی سے مراد وہی لوگ ہیں، جو فہم میں فقہاے عراق رحمہم اللہ کے مسلک کے پابند ہوں اور بدعات اور ان کے مبادی سے اُنھیں نفرت ہو۔ اس لحاظ سے حضرت مجدد الفِ ثانی اور اُن کی مجددانہ مساعی سے دو قسم کے اہلِ علم متاثر ہوئے، ایک گروہ نے فقہ العراق کی پابندی کے ساتھ بدعات سے پرہیز کی اور عقیدتاً وہ فقہاے عراق کی راہ کے پابند رہے۔ دوسرے گروہ نے فروعی تقلید اور فقہ عراق کی تخصیص سے انکار کر دیا، لیکن عقیدتاً سلف صالحین کا اتباع کیا اور اعمال میں بدعات سے پرہیز کی۔ یہ دونوں راہیں سرہندی اثرات اور ولی اللّٰہی تلقین کی پیداوار تھیں۔

سید احمد شہید کے رفقا:

سید احمد شہید کے لشکر میں دونوں مکاتبِ فکر کے آدمی شامل تھے۔ شاہ اسماعیل رحمہ اللہ کا رجحان اہلِ حدیث کی طرف تھا۔ خود سید احمد رحمہ اللہ اور مولوی عبدالحی بڈھانوی کا رجحان حنفی مکتبِ فکر کی طرف تھا، لیکن ایسی کوئی شہادت نہیں ملتی کہ لشکر میں ان فروعی مسائل یا تقلید اور ترکِ تقلید پر کبھی باہم نزاع تک نوبت پہنچی ہو۔

سید احمد شہید رحمہ اللہ نے اپنے امالی (صراطِ مستقیم) میں اتباعِ سنت کی جس طرح ترجمانی فرمائی ہے، کوئی اہلِ حدیث بھی اس سے آگے نہیں جا سکتا۔

سفرِ حج سے واپسی کے بعد یہ مقدس گروہ ہجرت کے لیے پابرکاب ہوگیا۔ یہ ہجرت بھی فریضۂ جہاد اور اقامتِ دین کے لیے تھی۔ ان کی مالی اعانت بھی اسی خیال کے لوگ کرتے رہے۔ بنگال، بہار، یوپی، سی پی، سندھ اور پنجاب کے اہلِ توحید کا پورا تعاون ان لوگوں کو حاصل تھا۔ انھی مقامات سے رضا کار جاتے تھے اور یہیں سے ان کی ضروریات کے لیے روپیہ فراہم ہوتا تھا۔ یہیں ان کے سفرا کسی طمع کے بغیر ہزاروں میل کا سفر کر کے یہ روپیہ سرحد پار اپنے مرکز کو پہنچاتے تھے اور عام طور پر اس میں ایک پائی خیانت کا شبہ نہیں ہوا۔

معرکہ حق و باطل کی یہ کشمکش پورے اڑھائی سال جاری رہی۔ عشق اور سرمستیوں کا یہ پرشکوہ قافلہ شرارت، عیاری، غدر اور شرانگیز فتوؤں کی ہنگامہ آرائی اور شور و شغب میں اپنی منزلِ مقصود کی طرف بڑھتا ہوا بالا کوٹ کے سربفلک پہاڑوں میں آکر اُتر گیا۔ سامنے پہاڑ کی چوٹی پر سکھوں کی فوج تھی۔ جسے غدار گجروں اور پٹھانوں کی اعانت حاصل تھی۔ پہاڑ کے دامن میں بالا کوٹ کی مسجد کے صحن اور بستی کے اطراف میں بے نوا فقیر شہادت کے انتظار میں ڈیرے ڈالے ہوتے تھے۔ ۲۴؍ ذیقعدہ ۱۲۴۶ھ مطابق ۶؍ مئی ۱۸۳۱ء جمعہ کے دن دونوں لشکروں میں مقابلے کی ٹھن گئی، ہر چند جنگی تدبیر کے لحاظ سے یہ مقام لڑائی کے لیے موزوں نہ تھا۔ تدبیر کا فتویٰ یہی تھا کہ جنگ کے لیے حالات سازگار نہیں، لیکن عشق کو ان فتوؤں سے چڑ تھی۔ جمعہ کی صبح ہی کو لوگوں نے دیکھا کہ سید احمد کے تیور بدلے ہوئے ہیں۔ وہ کفر کی فوجوں کو سامنے دیکھ کر پیچھے ہٹنے کے لیے قطعاً تیار نہ تھے۔ چناں چہ جنگ کا بگل بج گیا۔ پروانے شہادت کے شوق میں بے قراری کے ساتھ آگے بڑھنے لگے۔ ٹھیک جمعہ کے وقت حضرت سید احمد اور شاہ اسماعیل یکے بعد دیگرے شہید ہوئے۔ شہادت کے خون نے کفر کے فتوؤں کی سیاہی دھو کر رکھ دی۔ حق و باطل کی یہ کشمکش ایک خاص موڑ پر پہنچ کر چند ماہ کے لیے رُک گئی۔ یہ شہادت کا موڑ تھا، جس کے لیے برسوں آنکھیں منتظر تھیں۔

دو مکاتبِ فکر کی علاحدگی:

ذیقعدہ ۱۲۴۶ھ کے بعد جماعت کی راہنمائی اور قیادت حضراتِ صادق پور کی طرف منتقل ہو گئی۔ مولانا ولایت علی رحمہ اللہ صاحب صادق پوری نے جماعت کی تمام ذمے داریاں اپنے سر پر لے لیں، اس وقت سکھ فوج میں انگریز بطورِ ملازم یا رضا کار کام کر رہے تھے۔ یہ دونوں طاقتیں مجاہدین کو اپنا مخالف سمجھتی تھیں۔ سکھ کمزور ہو رہے تھے اور انگریز حکمتِ عملی سے ملک پر قابض ہو رہے تھے۔ مجاہدین بھی دونوں کو اپنا مخالف سمجھتے تھے۔

مولانا ولایت علی، شاہ شہید رحمہ اللہ سے زیادہ متاثر تھے، ان کے رجحانات ترکِ تقلید کی طرف تھے۔ اتباعِ سنت اور عمل بالحدیث طبیعت پر غالب تھا، اس کے بعد بالالتزام مجاہدین کی قیادت مسلسل ایسے لوگوں کے ہاتھ میں رہی، جن پر عمل بالحدیث کا شوق غالب تھا۔ آج تک جماعتِ مجاہدین پر یہی ذہن غالب ہے، لیکن فروعی مسائل کو وہاں کبھی اس قدر اہمیت نہیں دی گئی، جس سے یہ مسائل محلِ نزاع قرار پائیں۔ اس کے بعد پوری جماعت میں فقہ العراق کا رجحان کم ہوتا گیا، بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس وقت اکابر احناف تحریک سے دستکش ہو گئے اور جو لوگ جماعت سے تعلق رکھتے تھے، وہ بھی پھر پچھلی صفوں میں چلے گئے۔ بظاہر حنفی مکتبِ فکر کا جماعت کے ساتھ نمایاں تعلق نہ رہا، یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ یہ علاحدگی فقہی رجحانات کی وجہ سے تھی یا اس وقت انگریز کے ظالمانہ تشدد کی وجہ سے۔

۶ رمئی ۱۸۳۱ء سے ۱۸۵۷ء کے معرکہ حریت تک اور اس کے بعد آج تک جماعتِ مجاہدین کا نظام ساداتِ صادق پور اور اُن کے ہم خیال لوگوں کے ہاتھ میں رہا۔ حنفی مکتبِ فکر کے لوگ نمایاں طور پر سامنے نہیں آئے۔ ۱۸۵۷ء کا معرکہ انگریز کمپنی کی ظالمانہ بد اعمالیوں کا قدرتی نتیجہ تھا۔ یہ تحریک پورے ملک کی تحریک تھی، اسے احناف یا اہلِ حدیث سے کوئی خاص نسبت نہ تھی، اس میں مسلم اور غیر مسلم سب شامل تھے، بلکہ خیر آبادی خاندان نے اپنی پرانی غلطی کو محسوس کیا، جو وہ اپنے اساتذہ اور اُن کے خاندان کے خلاف اس سے پہلے کر چکے تھے۔ مولانا خیر آبادی نے اس وقت اس ہنگامے کو جہاد قرار دیا اور انگریز کے خلاف لڑنے کا فتویٰ دیا، جس کی پاداش میں اُنھیں عبور دریائے شور کی سزا دی گئی، اس تحریک میں مجاہدین نے بھی کوئی نمایاں حصہ نہیں لیا۔

مولوی رحمت اللہ اس وقت دہلی تشریف لائے، جب ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ دم توڑ رہا تھا۔ بہادر شاہ صورتِ حالات سے مایوس تھے۔ ان حالات کا جائزہ لینے کے بعد مولانا رحمت اللہ حجاز چلے گئے۔ مجاہدین کا ساتھ وہ اس لیے نہیں دینا چاہتے تھے کہ تحریک کی قیادت اہلِ حدیث کے قبضے میں چلی گئی تھی۔ حاجی امداد اللہ صاحب کا رجحان بریلویت کی طرف تھا، لیکن طریقت میں وہ حضراتِ دیوبند کے شیخِ طریقت تھے۔ حضرت مولانا

محمد قاسم ؒ نے ''آبِ حیات'' میں ان کا تذکرہ بڑے احترام سے فرمایا، بلکہ آبِ حیات کی اشاعت حاجی صاحب کے ایما سے ہوئی، اس سفر میں ''آبِ حیات'' مولانا محمد قاسم صاحب کے پاس تھی۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں بدنظمی آگئی تھی اور اس کا مطمعِ نظر اقامتِ دین نہیں تھا، بلکہ قومی آزادی اور نیشنل قسم کی حکومت اس ہنگامے میں پیشِ نظر تھی۔ اس لیے مجاہدین نے بھی اس میں نمایاں حصہ نہیں لیا، بلکہ وہ اپنی تحریک کو اپنے طے شدہ نظم کے مطابق چلاتے رہے۔ انگریز روز بہ روز پنجاب کی طرف بڑھ رہا تھا اور اس کے سامنے ان اہلِ توحید مجاہدین کے سوا کوئی منظم تحریک نہ تھی، اس لیے انگریز کی مخالفت اور سخت ہوگئی۔ اس نے اس تحریک کے خلاف پروپیگنڈہ اور لڑائی کا بازار گرم کر دیا، ادھر حضرت مولانا محمد قاسم نے مدرسہ دیوبند کی تاسیس فرمائی اور اپنے مسلک کی علمی خدمت پوری مستعدی سے شروع فرما دی۔ دیوبند، سہارنپور، میرٹھ وغیرہ میں مدارس قائم کیے گئے۔ درسِ نظامی کی تعلیم اور حنفی مسلک کی اعانت کے لیے پورے انہماک سے کام شروع کیا گیا۔ ان بزرگوں کی ان مخلصانہ کوششوں کے ساتھ تحریکِ جہاد کی اعانت اور سرپرستی کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ یہ ساری ذمے داری اس وقت پٹنہ کے صادق پوری حضرات ہی اُٹھائے ہوئے تھے۔

ان حالات کا اثر:

ان حالات میں جب کہ انگریز کا اثر بڑھ رہا تھا، پرانے رفقا علاحدگی اختیار کر چکے تھے۔ نہ صرف علاحدگی بلکہ وہ ایسے جمود کی دعوت میں مشغول ہوگئے، جس کی مخالفت مجدد الفِ ثانی سے شاہ ولی اللہ ؒ تک تحریکِ توحید کی جان تھی۔ یہ حضرات بے شک حنفی تھے، لیکن ان میں فقہی جمود نہیں تھا۔ حضرت شاہ ولی اللہ ؒ کی وصیت ان کے سامنے تھی۔ تفہیمات (۲/ ۲۴۰) میں ہے:

> ''وصیت اول این فقیر چنگ زدن است بکتاب و سنت در اعتقاد و عمل و پیوستہ بتدبیر ہر دو مشغول شدن و ہر روز حصہ از ہر دو خواندن و اگر طاقت خواندن ندارد ترجمہ ورقی از ہر دو شنیدن و در عقائد مذہبِ قدما اہل سنت اختیار کردن و از تفصیل و تفتیش آنچہ سلف تفتیش نہ کردند اعراض نمودن و بتشکیکاتِ معقولیان خام التفات نکردن و در فروع پیروی علماء محدثین کہ جامع باشند میاں فقہ و حدیث کردن و دائماً تفریعاتِ فقہیہ را بر کتاب و سنت عرض نمودن آنچہ موافق باشد در حیز قبول آوردن والا کالائی بد بریش خاوند دادن، امت را ہیچ وقت از عرض مجتہدات بر کتاب و سنت استغناء حاصل نیست و سخن متقشفہ فقہاء کہ تقلید عالمی را دستاویز ساختہ تتبع کتاب و سنت را ترک کردہ اند نشنیدن و بدیشان التفات نہ کردن و قربتِ خدا جستن بدوری ایشاں۔''

''فقیر کی پہلی وصیت یہ ہے کہ اعتقاد اور عمل میں کتاب و سنت کے ساتھ تمسک کرے اور ان دونوں کو اپنا مشغلہ قرار دے، اور ہر دو سے کچھ حصہ روزانہ پڑھے اور اگر پڑھ نہ سکے تو چند اوراق کا ترجمہ سنے، اور عقائد میں سلف اہلِ سنت کی روش اختیار کرے اور ائمہ سلف کی طرح موشگافیوں سے بچے اور خام کار معقولیوں کی شک آفرینیوں سے بچے، اور فرعی مسائل میں ان محدثین کا اتباع کرے جو حدیث اور فقہ دونوں سے پوری طرح واقف ہوں، اور فقہی مسائل کو ہمیشہ کتاب و سنت پر پیش کرے، جو موافق ہو اسے قبول کرے ورنہ بالکلیہ نظر انداز کر دے۔ اُمت کو اپنے اجتہادات کو کتاب و سنت پر پیش کرنے سے کبھی استغنا حاصل نہیں ہوا، اور ضدی قسم کے فقیہ حضرات، جنھوں نے بعض اہلِ علم کی تقلید کو دین کا سہارا بنا رکھا ہے اور کتاب و سنت سے اعراض ان کا شیوہ ہے، کی بات تک نہ سننا اور ان کی طرف نگاہ مت اٹھانا اور ان سے دور رہنے میں ہی خدا کا قرب تلاش کرنا۔''

ان موثرات کی وجہ سے اہلِ حدیث یا شاہ شہید کے رفقا تین حصوں میں بٹ گئے۔ صادق پوری حضرات تحریک کی روح پر قائم تھے۔ جہاد کا علم ہاتھ میں لیے پشاور، بالاکوٹ اور ہری پور کے پہاڑوں میں سکھوں اور انگریزوں سے پٹ رہے تھے اور جہاں تک ممکن تھا، توحید و سنت کی اشاعت اور بدعات کی مخالفت کرتے تھے، لیکن درس و تدریس، فقہی مباحث اور حزبی اختلافات سے بالکل الگ تھے اور حقیقت یہ ہے کہ اس کے لیے ان کے پاس فرصت کہاں تھی؟

دوسرے گروہ نے ائمہ حدیث کے مسلک کے مطابق مدارس قائم کیے۔ تقلیدِ مروج اور جمود کے خلاف درس و افتا کی مجالس پر پوری توجہ مرکوز کر دی۔ اس مسند پر حضرت شاہ اسحاق رحمہ اللہ کے بعد حضرت شیخ الکل مولانا السید محمد نذیر حسین دہلوی صاحب بیٹھ گئے اور اس ایک مقدس شخصیت نے اس راہ میں اتنا کام کیا، جس قدر وقت کے بڑے بڑے مدارس اور دارالعلوم نہ کر سکے۔ یہ بہ ظاہر تحریکِ جہاد سے بالکل الگ تھے، لیکن ان کی ہمدردیاں تحریکِ جہاد کے ساتھ قائم تھیں، لیکن مصلحتاً وہ پچھلی صفوں میں چلے گئے، غالباً اس لیے کہ وہ اطمینان سے کوئی علمی کام کر سکیں اور سنتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت سلفی انداز میں کر سکیں۔

میاں صاحب کے تلامذہ کے حالات پر غور کیا جائے تو یہ چیز بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ ان کے تلامذہ میں مولانا رحیم آبادی، مولانا حافظ عبداللہ صاحب غازی پوری، مولانا عین الحق اور مولانا محمد ابراہیم صاحب آروی ایسے فحول اہلِ علم موجود رہے، جنھوں نے تحریکِ جہاد کے ساتھ استخلاصِ وطن کے لیے تمام عمر تعاون فرمایا۔ حضرت مولانا عبدالجبار صاحب غزنوی، مولانا حافظ عبدالمنان صاحب وزیر آبادی، مولانا شمس الحق صاحب ڈیانوی

وغیرہم خالص علمی آدمی تھے۔ تحریک کے ساتھ ہمدردیاں تھیں، لیکن زیادہ توجہ درس و تدریس، تصنیف و تالیف کی طرف تھی۔ تیسرا فریق مولانا بٹالوی صاحب، یہ بہ ظاہر انگریز کے معاون تھے۔ تحریکِ جہاد کے پہلے مخالف تھے۔ تقریر و تحریر میں وہ اپنے نظریے کا اظہار کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ انگریزی تسلط کے بعد اب ان سے تعاون کرنا چاہیے۔ اب لڑنا اور حکومت کو بدگمان رکھنا صحیح پالیسی نہیں، وہ اس معاملے میں سرسید احمد خاں مرحوم کے ہم خیال تھے، لیکن وہ اس راہ میں اکیلے تھے، جماعتی طور پر تو ان کی کبھی حمایت نہیں کی گئی۔ انفرادی طور پر علما سے شاید ایک آدھ آدمی ان کا ہم خیال ہو۔

حضرات دیوبند سے تعلقات:

جہاں تک سیاسی نظریات کا تعلق تھا، اکابرِ دیوبند مئی ۱۸۳۱ء کے بعد تحریکِ جہاد سے قریباً دست کش ہو گئے، پھر وہ ۱۹۱۴ء کی جنگ کے بعد قریباً ۱۹۱۸ء میں تحریکِ خلافت کے ساتھ پھر سیاسیات میں آئے۔ شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب اور مولانا حسین احمد رحمہما اللہ نے ترکی کے ساتھ تعلقات جوڑنے کی کوشش کی، لیکن ترکی ۱۹۱۴ء کی جنگ کے بعد اتنا کمزور ہو گیا تھا کہ اس نے قبائے خلافت ہی اتار کر پھینک دی، اس کا اثر پوری دنیا کی اسلامی سیاسیات پر پڑا۔ ہندوستان کی مجلسِ خلافت بھی قریباً بے جان ہو کر رہ گئی۔ اس کی جگہ بتدریج کانگریس، مجلسِ احرار وغیرہ نے لے لی۔

اہلِ حدیث پر انگریز کی مخالفت کا جنون اس طرح سوار تھا کہ وہ قلتِ عدد کے باوجود ہر محاذ پر لڑتے رہے۔ کانگریس، مجلسِ احرار، مجلسِ خلافت اور مسلم لیگ اور دیگر جماعتوں میں اپنی بساط کے مطابق کام کرتے رہے۔ کبھی اہلِ حدیث، غیر اہلِ حدیث کا خیال ذہن میں نہیں آنے دیا۔ انگریز کی مخالفت ان کے مزاج میں سمو دی گئی تھی اور اس کے ساتھ ہی تحریکِ جہاد کے ساتھ ان کا پورا پورا تعاون تھا۔ مولانا عبدالقادر مرحوم قصوری، مولانا ابو الکلام آزاد مرحوم، مولانا سید محمد داود غزنوی، مولانا عبدالاول غزنوی مرحوم، مولانا فضل الٰہی وزیر آبادی مرحوم، مولانا ولی محمد فتوحی والا مرحوم اور اکبر شاہ سخانہ مرحوم سیاسی تحریکات کے شباب میں بھی سید احمد شہید اور مولانا شاہ اسمٰعیل شہید کی امانت کو اپنے سینوں سے لگائے ہوئے تھے۔

انہی ایام میں مرحوم مولانا محمد علی قصوری اسلامیہ کالج کے چند نوجوانوں کے ساتھ سرحد سے پار نکل گئے۔ مجاہدین سے ملے اور کابل وغیرہ کی خاک چھانتے پھرے۔ رحمهم الله وتقبل الله أعمالهم.

یہ محض جماعتی اعمال کا مختصر سا جائزہ ہے۔ اس پرانی داستان کا استقصا نہ مطلوب ہے نہ ممکن۔ اصل مطلب ان طویل گزارشات سے حضراتِ دیوبند اور تحریکِ اہلِ حدیث کے جوڑ اور توڑ کا جائزہ ہے۔ معلوم ہوتا

ہے کہ تحریکِ جہاد اور سید احمد کے سلسلے سے بظاہر علیحدگی صرف اس لیے تھی کہ انگریز نے شیعہ اور بریلوی بزرگوں کی تائید سے اہلِ توحید کے لیے وہابی کا لقب تجویز کیا۔ یہ لفظ ترکی نے موحدینِ نجد کے لیے تجویز کیا تھا۔ ترکی سے انگریزوں نے مستعار لیا، سچ یہ ہے کہ حضراتِ دیوبند کے لیے یہ لقب کچھ موزوں بھی تھا، اس لیے کہ حنبلیت اور حنفیت کا کچھ جوڑ ملتا ہے۔ اب تک بھی نجد میں سلفی حضرات کے علاوہ وہاں کے لوگ حنبلیت کو حنفیت سے زیادہ قریب سمجھتے ہیں، لیکن معلوم نہیں یہ بزرگ اس لقب سے گھبرا کیوں گئے؟

ہمارے بعض دیوبندی دوستوں نے اہلِ حدیث کو بھی وہابیت میں شامل فرمانے کی کوشش کی، ہم اسے گو غلط سمجھتے ہیں، لیکن بحمداللہ ہمارے ہاں اس سے گھبراہٹ نہیں ہوتی۔ نجد میں بھی آلِ شیخ کے بعض اکابر کے سوا عموماً سلفیت روز بروز مقبول ہو رہی ہے۔ شاہی خاندان تو مدت سے سلفی ہے۔ الا ماشاء اللہ۔ جہاں داری کے لیے اس قسم کی وسعت ویسے بھی ضروری ہے۔ پاکستان کو اگر اسلامی آئین کے لیے تیار ہونا ہے تو لزومِ تقلید اور فقہی فروع میں شخصی افکار پر اصرار بے حد مضر ہو گا۔ ممکن ہے اس جمود کا نتیجہ پاکستان اور ہندوستان میں اسی طرح ظاہر ہو، جس طرح ترکی اور روسی ترکستان میں ظاہر ہو چکا ہے۔

وہابی کون ہے؟ اس وقت اس سے بحث نہیں، زیرِ غور یہ معاملہ ہے کہ تحریکِ جہاد سے علیحدگی کے بعد تحریکِ دیوبند میں کس قدر انقلاب آئے۔ اکابر سے اصاغر تک سیاسی اور دینی افکار نے کس قدر کروٹیں لیں، دیوبند کے اساتذہ اور تلامذہ، شیوخ اور مریدین میں ان افکار کی وجہ سے کس قدر کشمکش رہی۔ مولانا حسین احمد رحمہ اللہ، مولانا انور شاہ رحمہ اللہ، حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ اور مولانا اشرف علی صاحب رحمہ اللہ کے سیاسی افکار میں کس قدر اختلاف تھا۔ مولانا حسین علی صاحب مغفور، مولانا احمد علی صاحب لاہوری، مولانا عبیداللہ صاحب سندھی رحمہ اللہ کے دینی اور تفسیری افکار میں کس قدر بعد ہے۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کے خلفا میں باہمی تعلقات کی نوعیت کیا ہے؟ افکار کے اس مدوجزر میں یہ فیصلہ کہ کون سے افکار دیوبندیت کی حدود میں شامل ہیں اور کون سے خارج؟

پھر اسی اخراج و تخریج میں کون سے اصول اور اساسی حقائق کارفرما ہیں۔ ان تمام فکری، دینی اور سیاسی اختلافات کے باوجود یہ سب حضرات دیوبندی ہیں تو انبیا علیہم السلام کے متعلق حیاتِ برزخی کے قائلین نے کون سا جرم کیا ہے کہ انھیں اس نام سے علیحدہ کرنے کے لیے حنفیوں کے اخبارات میں مسلسل جنگ لڑی جا رہی ہے اور چند ناکردہ گناہ مخلصین کو معتوب کیا جا رہا ہے کہ وہ ان راہوں پر کیوں نہیں چلتے جن کی نشان دہی چند سیاسی قمار بازوں نے دیوبند کے عنوان سے کی ہے، اور تعجب ہے کہ دیوبند کے مستند حلقے برسوں سے یہ تماشا دیکھ رہے ہیں اور زیرِلب مسکرانے سے زیادہ وہ کوئی ذمہ داری محسوس نہیں فرماتے۔ تعجب اس پر ہے کہ ان سیاسی شعبدہ بازوں کو یہ اختیارات کس نے تفویض کیے ہیں کہ وہ مسندِ افتا پر بیٹھ کر مسلک سے نصب و عزل کے پروانے تقسیم فرمائیں۔

سیاسیات میں شکست اور ناکامی کے بعد اکابرِ دیوبند نے ان حضرات کو کن مصالح کی بنا پر یہ خدمت تفویض فرمائی ہے۔ کیا یہ ساری ہنگامہ آرائی حضرات اکابر کی نگرانی میں ہو رہی ہے؟

۱۹۵۳ء میں اتحاد کا ان حضرات پر اس قدر سخت حملہ تھا کہ قادیانیوں کے سوا باقی ساری دنیا کو وہ متحد دیکھنا چاہتے تھے۔ مولانا ابو الحسنات اور حافظ خادم حسین کی اقتدا میں نمازیں ہوتی رہیں۔ مولانا سید محمد داود غزنوی، منیر انکوائری میں ان کی نیابت فرماتے رہے اور دیوبندیت بالکل محفوظ رہی۔ محمد علی جالندھری کے ایمان میں خلل آیا نہ حضرت مولانا غلام غوث کا وضو ٹوٹا۔ اس وقت مولانا غلام اللہ خان کا روپیہ حلال تھا اور وہ دیوبندی تھے۔ اس وقت مولانا خیر محمد جالندھری ثم ملتانی کے دارالافتاء میں اس کی ضرورت محسوس نہ ہوئی کہ ان اربابِ اعتزال کو دیوبندیت کے حصار سے باہر کیا جائے۔

منیر رپورٹ کی اشاعت کے بعد معاً احساس ہوا کہ دیوبندیت خطرے میں ہے۔ مولانا غلام اللہ اور سید عنایت اللہ شاہ اسے ختم کر دیں گے۔ دو سپاہی بیکار پریشان پھر رہے ہیں۔ انھیں دیوبندیت کی حفاظت کے لیے متعین کر دیا جائے۔ کہیں غلام اللہ اسے اٹھا کر نہ لے جائے اور حفاظت بھی ان سپاہیوں کے سپرد ہوئی جن کی اپنی دیوبندیت بھی مشکوک ہے۔ آخر ان بے چاروں میں کون سی صلاحیت ہے جس کی وجہ سے یہ اہم ذمے داری ان کے سپرد کی گئی۔ محمد علی بریلوی کی اقتدا کرے، مولانا ابو الحسنات کے پاؤں میں بیٹھے اس کے ایمان میں کوئی خلل نہیں، غلام اللہ آنحضرت کو خاتم النبیین اور افضل الرسل سمجھے، اسے دیوبندیت سے خارج کر دینا چاہیے۔

خرد کو کہہ رہے ہیں جنون جنون کو خرد
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

اہلِ حدیث اور دیوبندی:

گذشتہ ایام میں مولانا غلام اللہ خان کے ساتھ بیچارہ مدیر 'الاعتصام' بھی گرفت میں آگیا اور اس کے ساتھ مولانا سید محمد داود صاحب غزنوی نگران ''الاعتصام'' بھی۔ مولانا بھی قسمت کے دھنی ہیں۔ جن بچوں کو بطورِ رضا کار بھرتی کیا تھا، پوری توجہ سے انسانوں میں بیٹھنا، بولنا سکھایا تھا، وہ شاگرد بھی حضرت الاستاذ پر ہاتھ صاف کر رہے ہیں:

إذا كان الطباع طباع سوءٍ فلا أدب يفيد ولا أديب

مسئلہ حیات النبی میں مولانا غلام اللہ خان صاحب کی رائے معقول تھی، ہر عقل منداس کی تائید اور حمایت پر مجبور تھا۔ دیوبند سے مولانا عامر عثمانی نے اس کی تائید کی۔ پاکستان سے میں نے بھی اس کے متعلق ایک مبسوط

مضمون لکھا، جو لاہور کے ایک موقر علمی ماہواری مجلّے میں شائع ہوا۔ قریباً ایک سال بعد ضلع لاہور کی کسی جمعیت نے اسے شائع کر دیا، اس حق گوئی کے سزا میں راقم الحروف پر نظرِ عنایت ہوگئی۔ حیات النبی پر معقولیت سے گفتگو کی بجائے آج سے پہلے کی ایک تقریظ کہیں سے ہاتھ آ گئی، اسے بنیاد قرار دے کر پوری جماعت کو دھر لیا گیا۔ بھیڑیا بکری کو کھانا چاہتا ہے۔ اس ظلم کے لیے معقول وجہ نہ تھی، اس لیے حیلہ تراشا گیا کہ تم نے ہمیں گذشتہ سال گالیاں کیوں دی تھیں۔

أ أنت الذي من غير شيئ شتمتني فقال: متى ذا؟ قال: عام أول

فقال: ولدت العام بل رمتِ غدرة فهاك فكلني لا هنالك مأكل

(دیوانِ قیس)

یہی حال اس بحث میں بے چارے مدیر ''الاعتصام'' کا ہوا، وہ ہاتھ جوڑ کر منتیں کرتے ہیں، بڑے فلسفیانہ انداز سے اتحاد کا فلسفہ سمجھاتے ہیں۔ ادھر خانزادہ نے پہلی دفعہ بندوق داغنے کا فیصلہ کیا ہے۔ بے چارے مدیر ''الاعتصام'' کی کون سنے، سب سے مشکل یہ ہے کہ مجرم تو میں ہوں، معذرت بیچارہ مدیر ''الاعتصام'' کر رہا ہے۔ میرا یہ حال ہے میں چھے ماہ کی پابندی کے ساتھ قلم بند بھی ہوں۔ اختلافی موضوعات پر لکھنے کی اجازت نہیں۔ ادھر ''اسلام کا پیغام'' یہ ہے کہ ''الاعتصام'' کے نگران اور جمعیت اہلِ حدیث کا ناظم دونوں گردن زدنی ہیں۔ مولوی اسحاق بے چارے فرماتے ہیں کہ سولہ سال کی بات ہے، گڑے مردے نہیں اُکھاڑنے چاہییں۔

پر لطف بات یہ ہے نزلہ عضوِ ضعیف پر گرنا شروع ہوتا ہے۔ مولوی اشرف سندھو مصنف ''نتائج التقلید'' مدیر ''الاعتصام'' کی نظر میں آگئے۔ سارا ادب اسی غریب پر جھاڑ دیا۔ یقیناً مولوی اشرف دیہاتی ہے۔ اپنی جماعتی تفریق میں اس کے جرائم ناقابلِ عفو ہیں۔ نتائج التقلید کا لب ولہجہ یقیناً تلخ ہے۔ اس کتاب کے بعض مقامات واقعی طبع سلیم کے لیے ازحد ناخوشگوار ہیں۔ لیکن مولوی محمد اشرف کے سارے عیوب مدیر ''الاعتصام'' کو اس وقت محسوس ہوئے جب مدیر ''پیغامِ اسلام'' نے انھیں اخلاق کے نیزے پر رکھ لیا۔ کاش مولانا اسحاق کبھی اس سے پہلے بھی مولوی اشرف صاحب کو یہ وعظ فرماتے۔ مولوی اشرف صاحب کی فرد گذاشتوں کے باوجود وہ اس سزا کے مستحق نہیں، جو مدیر ''الاعتصام'' نے ان کو اخبار کے متعدد شماروں میں دی ہے۔ مولانا غلام غوث کا قصاص مولانا سندھو سے لینا؛ یہ کہاں کا انصاف ہے؟! مولوی اشرف نے مجھے بھی جنگ کی دعوت دی ہے، لیکن میں اس کا جواب نہیں دینا چاہتا۔ میں جانتا ہوں کہ وہ مظلوم ہے اور انھیں الجہر بالسوء کا پورا حق حاصل ہے۔

میری تقریظ:

رہا میری تقریظ کا معاملہ، میں مدیر ''الاعتصام'' کی ہمدردی اور مدافعت کے لیے ان کا شکر گزار ہوں،

لیکن میں اصولاً ان سے متفق نہیں۔ اصولاً مجھے مدیر ''پیغامِ اسلام'' یا ''ترجمانِ اسلام'' سے اتفاق ہے۔ جو چیز آج سے سولہ برس پہلے صحیح ہے، اسے آج بھی صحیح ہونا چاہیے اور جو سولہ برس قبل غلط ہے، اسے آج بھی غلط ہی ہونا چاہیے۔ مجھے اس تقریظ کی روح اور مقاصد سے آج بھی اتفاق ہے، لیکن لب و لہجہ کے متعلق مجھے یاد ہے کہ مولانا اشرف سندھو نے کسی مجلس میں فرمایا تھا کہ میں نے اس میں کچھ ترمیم کی ہے۔ اگر ان کے پاس میری قلمی تقریظ کا اصل مسودہ نکل آئے تو معاملہ درست ہو سکتا ہے۔ اگر یہ لب و لہجہ میرے قلم کا ہو تو مجھے ان شاء اللہ اظہارِ افسوس میں تامل نہ ہوگا۔ حضرت مولانا اشرف علی صاحب کے متعلق جس انداز میں لکھا گیا ہے، ان کے مقامِ رفیع کے بالکل منافی ہے۔ لیکن جہاں تک مولانا اشرف علی رحمہ اللہ نے اپنے خواب اور اس کی تعبیر کے سلسلے میں شیخ الکل سید نذیر حسین دہلوی کے متعلق لکھا ہے، وہ یقیناً شیخ الکل پر ظلم ہے۔[1] جہاں تک اخلاقِ حسنہ کا تعلق ہے حضرت مولانا حکیم الامت کے لیے یہ انداز قطعاً نامناسب تھا۔ حضرت حکیم الامت علم اور عمر دونوں لحاظ سے شیخ الکل کے بچوں کے برابر تھے۔ اخلاقاً بھی ان کے لیے حضرت میاں صاحب کے متعلق ایسے خیالات کے اظہار سے پرہیز مناسب تھا۔ جہاں تک واقعات کا تعلق ہے، مولانا رشید احمد صاحب اور مولانا عبدالحی لکھنوی، میاں صاحب کے علم و فضل، زہد و تقویٰ اور تفقہ فی الدین کے معترف تھے۔ مولانا اشرف علی رحمہ اللہ کا مقام ان اکابر دیوبند سے زیادہ نہیں۔ خواب کوئی خدا کی وحی نہیں تھی نہ ہے۔ مولانا اس کی الٹی سیدھی تعبیر کے لیے مجبور تھے اور یہ تعبیر بھی اپنے ہی خیالات کا عکس ہے۔ مولانا اسے از قبیل احلام تصور فرماتے۔ مناسب تھا وہ تعبیر کی کوشش ہی نہ کرتے۔ غرض اس تقریظ میں بحکم حدیث «أنزلوا الناس منازلهم»[2] حضرت میاں صاحب کے مقام کا احترام ملحوظ تھا۔ آیندہ بھی حضرت میاں صاحب کے خلاف کوئی قلم اور زبان اگر کھلے گی تو ہمیں معذور سمجھا جائے، ہم حضرت میاں صاحب کا احترام ان کے معاصرین اور منازعین سے کہیں زیادہ سمجھتے ہیں۔ اکابر دیوبند ہوں یا اعاظم بریلی، ہماری عقیدت شیخ الکل سے ہے اور ان شاء اللہ رہے گی۔ ما دام الحق معه.

حضرت مولانا اشرف علی رحمہ اللہ کا احترام، ان کی علمی خدمات، ان کا تصوف میں اپنا مقام ہے، لیکن میاں صاحب ایسے اکابر اہلِ حق کا حمایتِ سنت، اشاعتِ حدیث اور ان سارے معاملات میں متانت اور اعتدال ایک ایسا جوہر ہے جس میں میاں صاحب کے معاصر اور میاں صاحب کے ناقدین میں کوئی بھی ان کی ہمسری نہیں کر سکتا۔ اس لیے اب بھی قطعی رائے ہے کہ مولانا اشرف علی صاحب رحمہ اللہ کی تعبیر غلط ہے۔ اس چھاچھ میں روغن

---

[1] یہ خواب اور اس کے متعلق مولانا تھانوی کی تعبیر کے متعلق تفصیل کے لیے اسی مجموعے کا صفحہ (٥٧٩) ملاحظہ کریں۔

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٨٤٢) امام ابو داود رحمہ اللہ اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: ''ميمون لم يدرك عائشة'' یعنی اس کی سند منقطع ہے۔

بھی تھا اور ٹھنڈک بھی اور شفاء لما فی الصدور بھی، مولانا نے اسے ناپسند فرمایا، یہ قسمت کی بات ہے ؎

نظر اپنی اپنی پسند اپنی اپنی

مدیر ''الاعتصام'' اس میں کوئی مدافعت نہ فرمائیں۔ میاں صاحب اور ان کے علم کی توہین ناقابلِ برداشت ہے۔ آپ ''نتائج التقلید'' کے مولف کو مشورہ دیجیے کہ الفاظ میں کچھ تبدیلی کر دیں، مفہوم درست۔ احبابِ دیوبند کو حضرت مولانا اشرف علی کی تعبیر پر نظر ثانی کرنی چاہیے، یہ تعبیر قطعاً غلط ہے۔

حضراتِ دیوبند سے تعلق:

جہاں تک عقیدۂ توحید میں اتفاق کا تعلق ہے، حضراتِ دیوبند اصاغر ہوں یا اکابر، جب وہ اس عقیدے کے پابند ہوں، ہماری آنکھیں ان کے لیے فرشِ راہ ہیں۔ وہ ہمیں اور ہمارے اکابر کو اچھا کہیں یا برا، ہمیں ان سے محبت ہے اور اس کے لیے کوئی معاوضہ مطلوب نہیں، یہ تعلق ''الحب لله و البغض في الله'' کے ماتحت رہے گا اور یہ کسی پر احسان نہیں، دیانت کا تقاضا ہے۔ اسی طرح سیاسی نظریات کے ماتحت جن بزرگوں نے سید شہید کی تحریک کے ساتھ اتفاق اور تعاون فرمایا، اس کے بعد ملک سے انگریز کو نکالنے اور استخلاصِ وطن کے لیے جن بزرگوں نے کوششیں کیں، وہ انتہائی احترام کے مستحق ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی قربانیاں قبول فرمائے اور ان کے درجات کو بلند فرمائے۔

۱۹۳۰ء کے بعد حضرت حکیم الامت کے خلاف ابنائے دیوبند میں جو تحریک پیدا ہوئی تھی، اس کی تفصیلات بحمدللہ اب تک ذہن میں ہیں۔ لب و لہجے سے اختلاف کے بعد ہماری مخلصانہ رائے ہے کہ حضرت حکیم الامت کے مخالف اسوقت حق بجانب تھے۔ شكر الله مساعيهم.

مولانا اشرف علی صاحب رحمہ اللہ کا موقف اسلامی مفاد کے لحاظ سے بھی چنداں صحیح نہ تھا۔ میاں صاحب کے معاملے میں بھی ہماری رائے بالکل اسی قسم کی ہے جو اس وقت ابنائے دیوبند کی رائے مولانا اشرف علی صاحب رحمہ اللہ کے متعلق تھی۔ اس کے لیے نہ کسی معذرت کی ضرورت ہے نہ کسی کی ناراضی سے گھبرانے کی ضرورت۔ حضرت شیخ الکل سے ہماری عقیدت کو کوئی آدمی نہیں توڑ سکتا، نہ ہم سے یہ مداہنت گوارا ہوگی۔ اس لیے مدیر ''الاعتصام'' کی ساری عذر داریاں بصد شکریہ واپس ہیں۔ أما حب ليلىٰ فلا أتوب.

دیوبندیت کا تجزیہ:

اعتقادی اور سیاسی تعلق کے بعد پھر شخصی تعلق رہ جاتا ہے۔ گوجرہ ضلع لائل پور میں مولوی اسماعیل شیعہ ہیں، وہ بھی دیوبندی کہلاتے ہیں۔ ہمارے ہاں نوشہرہ میں مولوی سیف الرحمان غالی قسم کے رافضی ہیں، وہ بھی

دیوبندی مشہور ہیں۔ گوجرانوالہ میں مولوی بشیر حسین صاحب اپنے نام کے ساتھ فاضلِ دیوبند لکھتے ہیں۔ عقیدے کے لحاظ سے بریلویوں سے چند قدم آگے ہیں۔ ٹیکسلا میں مولوی بشیر ہیں وہ بھی دیوبندی، یہاں قاضی نور محمد اور قاضی شمس الدین صاحب حیات النبی کے مسئلے میں برزخی حیات کے قائل ہیں۔ یہاں صرف دیوبندی نسبت سے فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ یہاں شخصی حالات کے لحاظ ہی سے معاملہ ہوسکتا ہے۔

شہر گوجرانوالہ میں مولانا محمد چراغ صاحب نہایت شریف، خاموش اور بے ضرر آدمی ہیں۔ اپنے مسلک پر پختگی کے باوجود نہایت بے تعصب اور روادار بزرگ ہیں، تلمذ میں گو وہ بھی دیوبندی ہیں۔ یہاں اس وقت قدرتی طور پر تعلقات میں تفاوت ہوگا۔ اپنی صوابدید اور معلومات کی بنا پر تعلقات کے جوڑ توڑ کا فیصلہ ہوگا۔

یہاں ایک اور بزرگ ہیں وہ بھی دیوبندی ہیں، لیکن ان کے ہاں اہلِ حدیث کی اقتدا کا عقدہ لاینحل ہے، ان کے ہاں ڈھیلا امامت کی اہم شرائط سے ہے اور طہارت کے تمام اسباب و ذرائع سمٹ سمٹا کر ڈھیلے میں سموئے ہوئے ہیں۔ جب تک ازار بند منہ میں لے کر ڈھیلا نہ کیا جائے، امامت کی شرط پوری نہیں ہوتی۔ طہارت بالکل ناتمام رہتی ہے۔ اس قسم کے عقلا سے صرف دیوبندیت کی بنا پر معاملہ کرنا مشکل ہے۔

مدیر ''الاعتصام'' کا وعظ اتحاد و اتفاق کے متعلق بہت خوب ہے، مگر دیوبندی کی جب تک کوئی جامع تعریف نہ ہو، ان کے ارشاد کی تعمیل ممکن نہیں۔

حضرت قبلہ مولانا احمد علی صاحب:

طلبِ علم کے زمانے میں مولانا احمد علی صاحب لاہوری کا وعظ سنا کرتے تھے۔ وہ فرمایا کرتے تھے، میری ایک آنکھ اہلِ حدیث ہے اور ایک آنکھ حنفی۔ لیکن اب مدت سے مولانا نے ایک آنکھ بالکل بند کر لی ہے۔ جب سے سندھ میں آنا جانا ہوا ہے، مولانا نے اہلِ حدیث سے نظر پھیر لی ہے اور پیری مریدی کے فروغ کی طرف مولانا زیادہ توجہ دینے لگے ہیں۔ سنا ہے جمعے کے دن منبر پر یا منبر کے پاس کھڑے ہو جاتے ہیں اور مریدین حلقہ بنا کر مولانا کے ہاتھ چاٹتے دوسری طرف نکل جاتے ہیں۔ ہم نے یہ بدعت اکابر دیوبند میں سنی ہے نہ علمائے سلف میں۔ کبھی کبھار دست بوسی تو سمجھ میں آسکتی ہے، لیکن اس وضع کا تو ایک سنی المسلک کے لیے سمجھنا کافی مشکل ہے۔ اب دیوبندیت کی بنا پر تو ان مخترعات کو جواز و اباحت کی سند نہیں دی جا سکتی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کو دیکھا کہ وہ ایک خاص رنگ کے کپڑے پہنتے تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''أنتم أصحاب رسول اللّٰه يقتدى بكم'' ''تم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہو، لوگ تمھیں اقتدا کی نظر سے دیکھتے ہیں۔'' کوئی ایسی خلافِ سنت بات نہیں کرنا چاہیے، جس سے عوام میں غلط فہمی پیدا ہو۔ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ

کو صرف اس لیے سرزنش فرمائی کہ وہ پیش پیش چل رہے تھے اور لوگ ان کے پیچھے۔

جب مولانا احمد علی صاحب نے اپنی روش اور عادات بدل لی ہیں تو ان پر وہ اعتماد نہیں رہنا چاہیے جو اس وقت تھا، جب مولانا توحید کے داعی اور سنت کے متبع تھے۔ مجھے اپنی تقریظ کے ان الفاظ پر اصرار ہے۔ جب تک مولانا اپنی روش نہ بدلیں، اہلِ توحید و سنت کو مولانا پر اعتماد نہیں کرنا چاہیے۔

یہی حال مولانا خیر محمد صاحب کا ہے۔ وہ رحمانیہ سے الگ ہونے کے بعد اہلِ حدیث کو بے حد نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ مولوی محمد علی جالندھری کو یہ نفرت مولانا سے ورثے میں ملی ہے۔ مولانا کے تلامذہ میں یہ عصبیت بدرجہ غایت ہے۔ پاکستان آنے کے بعد اس کے اظہار میں کسی قدر محتاط ہو گئے ہیں، لیکن ان کے متعلقین ان کی طرف سے ترجمانی کا فرض ادا کرتے رہتے ہیں۔ ایسے حضرات کے معاملے میں ان کی ذاتی عادات کے لحاظ سے جہاں تک ان کے اچھے عقاید کا تعلق ہے وہ قابلِ احترام ہیں اور جہاں تعصب اور بغض بالسنّت کی راہ پر چلیں، اہلِ سنت و متبعینِ کتاب و سنت کو ان سے پرہیز کرنا چاہیے۔ تقریظ میں میری گزارشات کا یہ حصہ قابلِ توجہ ہے۔ اس پر طرفین کو توجہ دینی چاہیے، جس نے اس تعصب کی ابتدا کی ہے، وہی ذمہ دار ہے۔ البادي أظلم.

مولانا محمد حسن صاحب سنبھلی:

یہ حضرت علم اور وسعتِ معلومات کے لحاظ سے قابلِ احترام ہیں، لیکن تعصب میں آج کے متعصبین کے مورثِ اعلیٰ ہیں۔ ان حضرت نے ''شرح عقائد نسفی'' پر حاشیہ لکھا ہے، جس کا نام ''نظم الفرائد'' ہے۔ یہ کتاب مطبع انوارِ محمدی میں چھپی اور ۱۳۰۳ھ میں لکھی گئی۔ صفحہ ۱۰۲ میں امام شوکانی کی تصانیف میں غالباً ابن تیمیہ کی کسی عبارت کے متعلق فرماتے ہیں کہ اس میں تجسیم کی نفی پائی جاتی ہے اور تشبیہ سے بھاگ کر تعطیلِ صفات کی راہ اختیار کرنا غلط ہے۔ اس پر محترم محشی کوثر میں ڈھلی ہوئی زبان استعمال فرماتے ہیں:

و خلفاء هذه الأمة أربعة: ابن تيمية وابن القيم والشوكاني، فيقولون ثلاثة رابعهم كلبهم، وإذا انضم إليهم ابن حزم و داود الظاهريان صاروا ستة، و يقولون خمسة سادسهم كلبهم رجماً بالغيب، و خاتم المكلبين مثله كمثل الكلب إن تحمل عليه يلهث وإن تتركه يلهث ...الخ

محشی محترم کے غصے کا یہ حال ہے کہ ان بزرگوں سے کسی کو کتا کہنے کے لیے باقی کو اصحابِ کہف تصور کر لیا ہے۔ جس مسئلے پر یہ ناراضگی اور جوش آ رہا ہے، اس میں ائمہ اربعہ اور صحابہ اور تابعین اسی طرف گئے ہیں، جو

شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور ان کے رفقا نے فرمایا ہے۔ مدیر ''الاعتصام'' ہی فرمائیں کہ بے چارے اہلِ حدیث ایسے بزرگوں کا کہاں تک احترام کریں اور آپ کے مواعظِ حسنہ کی تعمیل کیونکر ہو؟ یہ ایک درسی کتاب کا حاشیہ ہے، جو طلبہ اسے پڑھیں گے، ان کے ذہنی تاثرات ابن تیمیہ، ابن قیم، ابن حزم اور داود ظاہری کے متعلق کیا ہوں گے اور ان کو گالیاں دینے کی کس قدر جرأت ہوگی اور حضرت محشی کو کس قدر اجر ملے گا؟!

یہی حضرت مولانا محمد حسن صاحب عفا اللہ عنہ ایک جگہ اہلِ حدیث کا ذکرِ خیر ان الفاظ میں فرماتے ہیں:

''و خرجت عليه من الزاوية المنفرجة طائفة كسبية قنوجية مجسمة فرعونية مشبهة آكلة من اكساب أبضاع نسائها محدثة ضراط البدع و فسائها محتوفة الوقيعة في أئمة الأمة ورؤسائها ...الخ (نظم الفرائد، ص: ۱۴۱)

مغلظات کا بھی فن ہے اور ہر آدمی شاید اس فصاحت سے نہ دے سکے۔ نواب صدیق حسن خان مرحوم سے مولانا کو خاص رنج ہے۔ معلوم ہوتا ہے مرحوم سے کوئی آرزو ہوگی، جو پوری نہ ہو سکی۔ مولانا گزر چکے ہیں، اللہ تعالیٰ انھیں معاف فرما دے۔ ایک درسی کتاب کا محشی اس طرح دماغی توازن کھو دے تو پھر انسانیت کا خدا حافظ۔ ایسے بزرگوں کے متعلق بطورِ معذرت یہی کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی کتابیں عام نہیں ہوئی تھیں اور جماعتِ اہلِ حدیث کا بھی اس وقت آغاز تھا، ممکن ہے مولانا کو مسلکِ اہلِ حدیث کے متعلق صحیح معلومات نہ ہوں، مگر یہ اندازِ گفتگو کیا ہے؟

غور طلب مسئلہ یہ ہے کہ اس قسم کی تلخی کی ابتدا کہاں سے ہوئی؟ سانحہ بالاکوٹ تک تو تلخی نظر نہیں آتی۔ ذہن دو موجود تھے۔ ''تنویر العینین'' اور ''تذکیر الاخوان'' کا زمانہ ''تقویۃ الایمان'' سے ملتا جلتا ہے، لیکن باہم تلخی فرعی مسائل کے متعلق اہلِ حدیث کے مستند حلقوں کی طرف سے سب سے پہلی چیز ''معیار الحق'' ہے۔ اس میں گفتگو کا انداز بالکل علمی ہے۔ طعن و تشنیع کا نام تک نہیں، اس لیے معلوم ہوتا ہے کہ تلخی کی ابتدا اہلِ حدیث کی طرف سے نہیں۔ مدیر ''الاعتصام'' کو دیکھنا چاہیے کہ بظاہر جس فریق نے تلخی کا آغاز کیا اور پھر اب تک تلخی کر رہا ہے، بہتر تھا کہ آپ ان کو وعظ فرماتے۔ آپ نے سارا زور بے چارے مولوی اشرف پر لگا دیا۔ ایک سادہ دل آدمی تو یہی سمجھے گا کہ ایک دیہاتی بے چارا لاہوریوں کے نرغے میں پھنس گیا ہے۔ پوری طرح علم و ادب کے شکنجے میں کس کر پریشان کیا گیا اور جب بغہ سے لے کر لاہور تک ہوش مندوں نے بلاوجہ تیور بدلے تو مدیر ''الاعتصام'' ہنس کر ان حضرات سے بغل گیر ہوئے اور مصافحہ کرنے کے لیے تیار ہو گئے، سچ ہے:

صلت على الأسدِ و ملت عن النقد

اقتدا کا جواز یا عدم جواز:

''پیغامِ اسلام'' کا اس وقت سارا زور اسی پر صرف ہو رہا ہے کہ اہلِ حدیث کی اقتدا درست نہیں۔ یہ کوئی ایسی بحث نہیں جس کے لیے مدیر ''الاعتصام'' یا اہلِ حدیث حضرات بے قرار ہوں۔ اگر مولوی محمد علی جالندھری یا مولانا غلام غوث اہلِ حدیث کی اقتدا میں نماز نہیں پڑھنا چاہتے، نہ پڑھیں، اہلِ حدیث مساجد کی رونق پر اس کا کیا اثر پڑ سکتا ہے۔ بحمداللہ اہلِ حدیث مساجد میں اپنے ہی آدمی نہیں سما سکتے۔ ان دوستوں کو تکلیف دینے کی ضرورت ہی نہیں۔

طہارت اور تقلید:

طہارت نماز کے لیے ضروری ہے، اس میں کوئی اختلاف نہیں، اس کی نوعیت جو بھی ہو، ہر مسلمان کوشش کرتا ہے کہ وہ نماز طہارت سے ادا کرے، وہ اپنی بساط کے مطابق نماز طہارت ہی سے ادا کرتا ہے۔ اب جو حضرات اختلاف کو بڑھانا چاہتے ہیں، وہ طہارت کے لیے ڈھیلا ضروری سمجھتے ہیں، حالانکہ ڈھیلا طہارت کا ایک ذریعہ ہے، مقصد نہیں۔ ہمارے مفتی حضرات نے اسے مقصد قرار دے لیا ہے۔ وہ جب جواز یا عدمِ جواز اقتدا کی بحث شروع کرتے ہیں تو طہارت کی بجائے ڈھیلے کو مقصد قرار دے لیتے ہیں، حالانکہ یہ علم و دیانت کے خلاف ہے۔

اگر کوئی شخص پانی، کاغذ، کپڑے سے صفائی پر مطمئن ہو جائے تو ڈھیلے پر اصرار کرنا مضحکہ ہوگا۔ یہ تمام فقہا کے نزدیک مسلم ہے، اس میں کوئی اختلاف نہیں۔

بعض ڈھیلے پر بھی مطمئن نہیں ہوتے۔ وہ ڈھیلا کرتے وقت رانوں کو بھیڑنا اور اعضائے بول کو شکنجے میں کسنا ضروری سمجھتے ہیں۔ ڈھیلا کرتے وقت عجیب عجیب حرکتیں کرتے ہیں، یہ وہم پرستی ہے یا دیانت سے گریز۔ اصل مسئلے میں کسی کو نہ گریز ہے نہ اختلاف، مگر جب بحث برائے بحث کا فیصلہ ہی کر لیا جائے تو ایسے حضرات کا خدا حافظ۔

اسی قسم کا ایک فتویٰ بعض اخبارات میں مفتی محمد شفیع صاحب کا بھی نظر سے گزرا۔ مفتی صاحب معقول آدمی ہیں۔ اچھے بھلے سمجھدار آدمی معلوم ہوتے ہیں، معلوم نہیں افتا کے وقت ان پر کیا کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ پاکستان میں آنے کے بعد بعض علما نے کوٹھیاں وغیرہ بنالی ہیں۔ فلش سسٹم بیت الخلاء بن گئے ہیں، قریباً ڈھیلے کا مسئلہ عملاً ختم ہو چکا ہے۔ مگر فتووں کی رونق کے لیے یہ حال ہے کہ ابھی ڈھیلے چل رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان حضرات کو صحیح بات لکھنے اور سمجھنے کی توفیق دے۔

اقتدا اور تقلید:

اس قسم کے فتووں میں تقلید اور ترکِ تقلید کا مسئلہ بھی آ گیا ہے، حالانکہ مجوزینِ تقلید کے استدلال کی انتہا یہ ہے کہ وہ تقلید کو مجبوراً پسند فرماتے ہیں۔ ﴿فَسْئَلُوْٓا اَھْلَ الذِّکْرِ اِنْ کُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ کو اگر کوئی سادہ لوح تقلید کی دلیل سمجھے تو ظاہر ہے کہ لاعلمی کی مجبوری ہی کی بنا پر ہوگی۔ قیاس اور رائے کے متعلق ائمہ اصول نے صراحت فرمائی ہے کہ یہ مردار ہے، اس کی ضرورت اس وقت ہوگی جب کتاب وسنت اور اجماع سے کوئی چیز نہ ملے:

"و نحن نقول بما روي عن أئمتنا: إن الرأي ميتة، إذا اضطررت إليها أكلتها"

(أحسن الحواشي، ص: ۸۷)

رائے کا مقام دین میں مردار کی طرح ہے۔ اس کا کھانا اضطرار اور مجبوری سے ہوگا۔ اور یہ عام اہلِ علم کی رائے کا حال ہے۔ تقلید تو ایک شخص کی رائے ہوگی، اسے لاعلمی کی مجبوری ہی سے قبول کیا جائے گا۔ ایسی اضطراری اشیا آپ لوگ اقتدا کے جواز اور عدمِ جواز میں بطورِ بہانہ استعمال کرتے ہیں۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے علم دیا ہے، اس کا تو کچھ لحاظ فرماتے۔ تقلید کو کوئی سمجھدار آدمی یہ اہمیت نہیں دے سکتا۔ بقول مصنف احسن الحواشی آپ صحتِ اقتدا کے لیے ایسی چیز کو ضروری سمجھتے ہیں جس کی حیثیت ائمہ اصول کے نزدیک زیادہ سے زیادہ مردار کی ہے!!

سیاسی ناکامی:

اگر اس قسم کی بہکی ہوئی باتیں پٹے ہوئے اور ناکام سیاست دان کرتے تو شاید ہم اس کی پروا بھی نہ کرتے۔ جب پڑھے لکھے حلقوں سے ایسی باتیں آتی ہیں تو دکھ بھی ہوتا ہے اور افسوس بھی۔ "پیغامِ اسلام" مولانا احمد علی صاحب کی نگرانی میں شائع ہوتا ہے اور یہ سب بے اعتدالیاں حضرت ہی کی نگرانی میں ہو رہی ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ مولانا کی دو آنکھوں سے صرف ایک ہی آنکھ کام کر رہی ہے۔ آنکھ ہوتے ہوئے اگر کام نہ کرے تو اس کی جواب دہی مولانا ہی پر ہوگی۔ مولانا کا فرض ہے کہ دونوں آنکھیں استعمال فرمائیں۔

مولانا کو خوب معلوم ہے کہ ناکام سیاست دان کسی کے ددست نہیں۔ آپ اپنی نگرانی کو یا تو صحیح طور پر استعمال فرمائیں یا پھر نگرانی واپس لے لیں، آپ اللہ کے نزدیک بری ہو جائیں گے، مرید خوش ہوں یا نہ ہوں، ورنہ اِن حضرات کی معیت جہاں بھی پہنچی، اسی نے ڈبویا۔

حاصل گزارشات:

۔ حضراتِ دیوبند سے بعض امور میں جہاں تک اعتقادی اتفاق کا تعلق ہے، اس کے لیے کسی سفارش کی

ضرورت نہیں، سیاسی نظریات اور اتحادِ عمل میں احترام ہے اور ہونا چاہیے۔ فروعی اختلافات کتنے ہی کیوں نہ ہوں اور یہ ناکام سیاستدان اسے کتنا ہی ابھارنے کی کوشش کریں، یہ احترام قائم رہے گا، اس کے لیے نہ ان کے جھکنے کی ضرورت ہے نہ آپ کی منتوں کی۔ یہ احترام ایسے حقائق پر مبنی ہے، جسے تعبیری ہوشیاریاں ناپید نہیں کر سکتیں۔ معلوم ہے کہ نفس الامری حقائق اعتبارات کے رہین نہیں ہوتے، لیکن جہاں تک مفتی حضرات کی تعبیری شعبدہ بازیاں اور سے پیدا ہونے والے تلخ نتائج کا تعلق ہے، اس سے جماعت متاثر ہوگی۔ جب تک دونوں طرف سے اربابِ بست وکشاد بے لگام حضرات کے منہ میں لگام نہیں دیں گے، یک طرفہ منتیں مفید نہیں ہوں گی۔

جہاں تک ناقص معلومات کا تعلق ہے، طعن وتشنیع ان حضرات ہی کی طرف سے ہوئی ہے۔ بعض جگہ مقارنت کی وجہ سے ذاتی رنجشوں نے مذہب کا رنگ لے لیا ہے اور بلاوجہ الجہاد کی صورت اختیار کر لی۔

ایک قابلِ احترام بزرگ کی بات سنیے:

''ولعمري إفساد هؤلاء الملاحدة و إفساد إخوانهم الأصاغر المشهورين بغير المقلدين الذين سموا أنفسهم بأهل الحديث، و شتان ما بينهم و بين أهل الحديث، قد شاع في جميع بلاد الهند و بعض بلادِ غير الهند فخربت به البلاد، و وقع النزاع و العناد'' (الآثار المرفوعة في الأحاديث الموضوعة، ص: ٢٤٨)

''نیچریوں کے چھوٹے بھائی غیر مقلد، جو اہلِ حدیث کے نام سے مشہور ہیں، کہاں یہ لوگ کہاں اہلِ حدیث۔ یہ مسلک ہند اور بیرونِ ہند میں بہت پھیل گیا ہے، اس سے ملک میں فساد بپا ہوگیا ہے۔''

جہاں تک واقعات کی شہادت ہے، ان حضرت کو نواب صدیق حسن خان مرحوم سے کچھ ذاتی رنجش تھی، لیکن غور فرمائیں پوری جماعت غصے کی لپیٹ میں آ گئی۔ اللهم إني أعوذ بك من الفتن ما ظهر منها و ما بطن.

جب تک یہ حضرات زبان پر کنٹرول نہ کریں، صلح کے وعظ کیا کر سکیں گے؟ گذشتہ ایام میں ایک صاحب اپنا دلی بغض نکالنا چاہتے تھے، منہ چھوٹا تھا بڑی بات کہنا چاہتے تھے، کوئی بہانہ نہیں ملتا تھا۔ انہوں نے دل کا غبار نکالنے کے لیے کسی اشتہار کی آڑ لے کر جو اگلنا تھا اگل دیا اور اکابرِ جماعت کے متعلق جو لب ولہجہ اختیار کیا، انتہائی غیر محتاط اور غیر معتدل ہے۔ پھر اس پر اکابرِ دیوبند کی تقاریظ ہیں۔ بعض نے اس مبالغہ آمیزی سے کام لیا کہ ان رسمی اور بعض دل آزار مباحث کو حرفِ آخر کہہ دیا۔ جب تک اس قسم کی بے اعتدالیاں نہ رکیں، مدیر ''الاعتصام'' کے لجاجت آمیز وعظ خوشگوار فضا پیدا نہیں کر سکتے۔ اس لیے اس کے سوا چارہ نہیں کہ ہر ایک صاحب سے شخصی طور پر معاملہ کیا جائے۔ اسے دیوبندی اور غیر دیوبندی کی بحث بنا کر اختلاف کی خلیج کو وسیع نہ کیا

جائے۔ ایسے بزرگ اس وقت بھی موجود ہیں، جو اپنے مسلک پر انتہائی پختگی کے باوجود اختلافی امور میں محتاط ہیں، مثلاً سید عنایت اللہ شاہ صاحب گجرات، مولانا حسین علی صاحب واں بھچراں، مولانا مفتی محمد حسن صاحب مد ظلہ العالی۔ یہ حضرات اختلاف خیالات کے باوجود قابلِ صد احترام ہیں۔ ان کی روش خود ادب و احترام کی مقتضی ہے۔ مولانا احمد علی صاحب جماعت اہلِ حدیث میں اسی طرح احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ عموماً اہلِ حدیث جلسوں میں انھیں بلایا جاتا، ان کی تقاریر شوق سے سنی جاتی تھیں۔ اب پیری مریدی کی ذمے داریوں نے انھیں اپنی روش بدلنے پر مجبور کر دیا۔ اب ان کی تقاریر کا انداز بدل گیا ہے۔ ان کے مواعظ اور تقاریر کا انداز قریباً حافظ جماعت علی شاہ صاحب سے ملتا جلتا ہے۔ بزرگوں کے علوم کا تذکرہ وہ اس انداز سے فرماتے ہیں، جیسے کوئی بریلوی بزرگ علمِ غیب کا مسئلہ بیان کر رہا ہو۔ یہ دین کا معاملہ ہے، اس میں کسی مداہنت اور دوستی کو حائل نہیں ہونا چاہیے۔ مولانا کی روش اس دن سے اور بھی خراب ہو گئی ہے، جب سے ان کے مراسم ابن الوقت حضرات سے زیادہ ہو رہے ہیں۔ ''خدام الدین'' کا علمی معیار بھی روز بروز گر رہا ہے۔ وہ کتاب و سنت یا فقہ حنفیہ کا ترجمان ہونے کے بجائے مولانا کی مدح و ستایش کا ذریعہ بن کر رہ گیا ہے۔

مدیر ''الاعتصام'' سے ان تلخ اور طویل گزارشات کی اس لیے ضرورت ہوئی کہ معاملہ جماعت کی پالیسی کا تھا۔ ان مقالات کا اثر مولانا محمد اشرف سندھو کی جماعت کے عوام اور خواص پر اچھا نہیں پڑا، اس لیے امید ہے وہ اس تنقیدی تلخی کو معاف فرما دیں گے۔

قابلِ ضبط کتابیں
بریلوی حضرات سے مودبانہ گزارش

دو عملی چھوڑ دیجیے:

کسی دیوبندی جریدے کے مدیر نے ''قہر القادر'' نامی کتاب میں بدزبانی کی وجہ سے حکومت کو توجہ دلائی ہے کہ وہ اسے ضبط کر لے۔ گوجرانوالہ کے ایک بریلوی جریدے نے اس تجویز کو قبول کرتے ہوئے مزید چند کتابوں کی ضبطی کے لیے حکومت سے استدعا کی ہے۔ یہ کتابیں بعض علمائے دیوبند کی ہیں، بعض شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ کی، بعض سید احمد شہید رحمہ اللہ کی اور بعض شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب رحمہ اللہ کی۔

ہم نے ''قہر القادر'' دیکھی ہے نہ باقی کتب بالاستیعاب پڑھی ہیں، البتہ حوالوں میں جن مسائل کی نشاندہی کی گئی ہے، وہ قرآن اور سنت کے بالکل موافق اور ائمہ سنت کے مسلمات میں سے ہیں۔ بریلوی مدیر نے حوالوں کا اختصار کرتے ہوئے انھیں غلط بیانی اور افترا کی حد تک پہنچا دیا ہے۔

بریلوی حضرات سے ہماری گزارش ہے کہ وہ دو عملی چھوڑ دیں۔ اگر ان اعتقادات اور مسائل سے ان کو دکھ ہوتا ہے اور ان کے جذبات مجروح ہوتے ہیں تو ہمیں ان سے پوری ہمدردی ہے، لیکن صحیح راہ یہ ہے کہ وہ قرآنِ حکیم کی ضبطی کے لیے حکومت سے مطالبہ فرمائیں!!

کتابیں بالفرض ضبط ہو گئیں، لیکن قرآنِ عزیز ضبط نہ ہوا تو آپ کے جذبات بدستور مجروح ہوتے رہیں گے۔ یہ دو عملی مناسب نہیں۔ عوام سے ڈر کر آپ قرآنِ عزیز کے خلاف آواز نہیں اٹھاتے اور جو کتابیں قرآنِ عزیز سے ماخوذ ہیں، ان کی ضبطی کے لیے آپ ہنگامہ بپا کر رہے ہیں!!

اس مطالبے میں کوئی استواری نہیں۔ دل کڑا کیجیے اور اصل مطالبے پر ڈٹ کر حکومت پر زور دیجیے۔ قدمائے مکہ آپ سے زیادہ دانش مند اور معاملہ فہم تھے، ان کا مطالبہ بے حد صاف اور جراَت مندانہ تھا۔ یعنی:

﴿ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ﴾ [یونس: ۱۵] (کوئی اور قرآن لاؤ یا اسے بدل دو)

اپنے بزرگوں کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے گھبرانا نہیں چاہیے، اس لیے اصل مطالبہ سامنے آنے دیجیے۔

بریلوی ذہن:

ہمیں پہلی دفعہ معلوم ہوا اور مسرت ہوئی کہ بریلوی حضرات نے ایک معقول مطالبے کو (گو بادلِ ناخواستہ ہی سہی) قبول فرمالیا، ورنہ جہاں تک ہمارا تجربہ ہے، ہمارے بریلوی دوستوں کو معقول بات سننے کی بھی عادت نہیں، کہنا تو بڑی بات ہے، ان حضرات کے ذہن علم اور عقل دونوں سے ناآشنا رہے ہیں۔

بریلوی فرقے کی عمر قادیانی حضرات سے زیادہ نہیں۔ مولانا احمد رضا خاں صاحب ۱۲۷۲ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۳۴۰ھ میں انتقال فرمایا۔ اس فرقے کا آغاز مولانا صاحب نے فرمایا۔ مولانا کی تصانیف سے لے کر مولانا نعیم الدین، مولانا دلدار علی شاہ تک اکابرِ جماعت کی تصانیف پر غور فرمایئے، علم و دانش کے سوا وہاں آپ کو سب کچھ ملے گا۔ ان حضرات کی تصنیفات سے طعن و تشنیع کو الگ کر دیا جائے تو ایک تہائی بھی باقی نہیں رہ جائے گی۔

اس لیے ہم بریلوی جریدے کے مدیرِ محترم کو مبارک باد عرض کرتے ہیں کہ انھوں نے اپنے اکابر کی عادت کے خلاف ''قہر القادر'' کی ضبطی کی تجویز قبول فرمالی۔

اعتقادات کا جائزہ:

اب ہم ان اعتقادات کا جائزہ لینا چاہتے ہیں، جن کی وجہ سے بریلوی حضرات کے دل مجروح ہو رہے ہیں، اس کے ساتھ قرآنِ عزیز اور سنت سے ان نصوص کا مختصر تذکرہ بھی کریں گے، جن سے ان عقائد کی تائید ہوتی ہے، تاکہ ہمارے محترم مخاطب محسوس فرمائیں کہ ان کتابوں کی ضبطی سے ان کا مقصد پورا نہیں ہوگا۔ ان کے مجروح دلوں کو اسی صورت اطمینان نصیب ہوسکتا ہے کہ قرآنِ عزیز کے تیس پارے اور سننِ صحیحہ کے دفاتر ضبط ہوں یا صفحہ ہستی سے ناپید ہو جائیں!!

پہلا عقیدہ:

1 ''تقویۃ الایمان'' (ص: ۲۲) کی عبارت سے جو مطلب شاہ صاحب رحمہ اللہ کی طرف منسوب کیا گیا ہے اور اس میں جس طرح قطع و برید کی گئی ہے، اسلامی شرافت اور دیانت کے خلاف ہے۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ کا فرمان یہ ہے:

''چابیاں جس کے پاس ہوں، خزانہ اسی کے قبضہ میں ہوتا ہے۔ جب چاہے، خزانہ صرف کر سکتا ہے۔ جب غیب کی چابیاں اللہ کے پاس ہیں تو غیب کے خزانے بھی اسی کے قبضہ میں ہوں گے۔''

شاہ صاحب رحمہ اللہ کا منشا یہ ہے کہ علومِ غیبیہ کا استحضار اور ان پر کلی تصرف؛ یہ اللہ کی خصوصیت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ علوم نہ کسی کو عطا فرمائے ہیں نہ کسی کو بالذات حاصل ہیں۔ جزوی طور پر اللہ تعالیٰ جب چاہتا

ہے، جس کو چاہے عطا فرما دیتا ہے۔

میں مانتا ہوں کہ یہ عقیدہ آپ کو ناگوار اور ناپسند ہے، اس لیے آپ کے جذبات مجروح ہو سکتے ہیں، لیکن اس کا کیا علاج کہ قرآنِ عزیز شاہ صاحب رحمہ اللہ کی پوری پوری تائید فرماتا ہے؟

① ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ﴾ [الأنعام: ٥٩]

''مفاتح'' اسم آلہ اور ظرف دونوں کی جمع ہے، اس کا معنی چابی اور خزانہ دونوں ہو سکتے ہیں۔ یہ جمع کثرت کے اوزان سے ہے، جس کا مدلول وہ کلی علوم ہیں جن کا احاطہ انسان کے لیے محال ہے۔ ارشادِ خداوندی کا منشا یہ ہے کہ غیب کے خزانے اس کے پاس ہیں اور ان کا علم صرف اسی کو ہے۔ استثنا نفی کے بعد آتا ہے، جس کا مفاد حصر ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی بھی غیب نہیں جانتا۔ آیت کا عموم ذاتی اور عطائی دونوں کو شامل ہے۔ اب تحریفِ معنوی کا ارتکاب وہ حضرات کریں گے، جو عطائی کو مستثنیٰ کرنے کی کوشش کریں گے!

② نیز فرمایا:

﴿قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ وَمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ﴾ [النمل: ٦٥]

''آسمانوں اور زمین میں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی بھی غیب نہیں جانتا۔ وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ انھیں حساب کے لیے کب اٹھایا جائے گا؟''

اس آیت میں ﴿اِلَّا﴾ نفی کے بعد آیا ہے، اس کا منطوق بھی حصر ہے، یعنی اللہ کے لیے غیب کو ثابت فرمایا اور غیر سے نفی فرمائی۔

③ ارشاد فرمایا:

﴿ قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّ لَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ وَ لَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ وَ مَا مَسَّنِيَ السُّوْٓءُ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّ بَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ﴾ [الأنعام: ١٨٨]

''ان سے کہہ دو! میں اللہ کی مشیت کے بغیر کسی کو فائدہ یا نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ اگر میں غیب جانتا تو میں کثرت سے خیر جمع کر لیتا اور مجھے کوئی تکلیف نہ ہوتی، میں اہلِ ایمان کے لیے صرف نذیر اور بشیر ہوں۔''

بریلوی مدرسۂ فکر کے جذبات اس سے یقیناً مجروح ہو سکتے ہیں، لیکن اس کی ذمے داری شاہ شہید رحمہ اللہ پر

نہیں، بلکہ رب العزت اور قرآن عزیز پر ہے، اس لیے بارگاہِ ایزدی میں عرض فرمائیے کہ ﴿ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ﴾ یہ قرآن بدل دو، ہمیں اس قرآن کی ضرورت نہیں یا کوئی اور قرآن لے آؤ!!

جب تک یہ مطالبہ منظور نہ کرا لیا جائے، کسی کتاب کی ضبطی مفید نہیں ہوگی۔ کتاب وسنت پر نظر رکھنے والے اور توحید کے عاشق کچھ نہ کچھ لکھتے رہیں گے، جس سے آپ کے جذبات مجروح ہوتے رہیں گے۔ آپ کی یہ ناتمام مساعی جذبۂ توحید کی سرمستیوں کو کم نہیں کر سکیں گی۔ ع

یہ وہ نشہ نہیں جسے ترشی اتار دے

اس لیے مناسب ہے، ساری بریلوی دنیا مل کر قرآنِ عزیز کا کوئی علاج کرے!!

[۲] اس میں صفحہ (۵۵) کے حوالے سے آپ نے فرمایا ہے: ''اللہ کے مکر سے ڈرنا چاہیے۔''

آپ کو لفظِ مکر کی اضافت حق تعالیٰ شانہٗ کی طرف کھٹک رہی ہے، یہ تکلیف آج سے چند سال قبل پنڈت دیانند کو بھی ہوئی تھی۔ (ستیارتھ پرکاش، ۱۴ اسملاس، ص: ۶۹۰)

لفظِ مکر کی لغوی تشریح بھینس کے سامنے بین بجانے کے برابر ہے۔ آپ حضرات ادبی ذوق سے محروم ہیں۔ آپ کے ہاں غالباً وہ پرزہ ہی ناپید ہے، جس سے ادبی لطافت کا احساس ہوتا ہے، لیکن قرآن عزیز کا کیا کیجیے گا، وہ فرماتا ہے:

① ﴿وَ مَكَرُوْا وَ مَكَرَ اللّٰهُ وَ اللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ﴾ [آل عمران: ٥٤]

''ان لوگوں نے مکر کیا اور اللہ نے مکر کیا اور اللہ کا مکر بہترین رہا۔''

② ﴿فَلَا يَاْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ﴾ [الأعراف: ٩٩]

''خسارہ پانے والے ہی اللہ کے مکر سے بے خوف ہوتے ہیں۔''

③ ﴿وَمَكَرُوْا مَكْرًا وَّمَكَرْنَا مَكْرًا وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ﴾ [النمل: ٥٠]

''ان لوگوں نے مکر کیا، ہم نے مکر کیا، لیکن وہ بے شعور تھے۔''

④ ﴿فَلِلّٰهِ الْمَكْرُ جَمِيْعًا﴾ [الرعد: ٤٢] ''تمام تر مکر اللہ کے لیے ہے۔''

قرآنِ عزیز میں مکر کا جو بھی مفہوم لیں گے، وہی وہابیوں اور دیوبندیوں کی طرف سے سمجھ لیجیے! اصل مرض آپ کے لیے قرآن ہے، جیسے ہو سکے اسے ضبط کرائیے!!

[۳] صفحہ (۶) سے صفحہ (۹) تک آپ نے تقویۃ الایمان کے مختلف اقتباسات پر رنج کا اظہار فرمایا ہے۔ آپ اپنی رائے میں مختار ہیں، لیکن سچ عرض کروں، اگر خدا تعالیٰ سے تھوڑا بہت تعلق بھی باقی ہوتو ان صفحات

میں توحید کا ایک سمندر ہے۔ میں آپ کا ممنون ہوں، آپ کی وجہ سے میں نے ان صفحات کو بار بار پڑھا۔ سبحان اللہ! کتنا مدلل اور کس قدر پر لطف کلام ہے! میرے جیسے خشک مزاج آدمی پر ایک کیفیت طاری ہوگئی۔ آپ نے یہاں بھی اختصار کو خیانت کی حد تک پہنچا دیا ہے۔ اگر آپ پورا کلام نقل فرما دیتے تو آپ کو اپنی رائے پر ندامت ہوتی۔ آپ نے جو ذلیل الفاظ شاہ شہید رحمہ اللہ کے متعلق استعمال کیے ہیں، آپ کا ضمیر آپ کو ملامت کرتا اور آپ کے اَتباع بھی غلطی سے بچ جاتے۔ آپ کا نظریہ پڑھ کر ﴿يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّ يَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا﴾ کی تصدیق ہوتی ہے۔ جب خدا کا کلام بعض طبائع کے لیے گمراہی کا موجب ہو جاتا ہے تو شہید رحمہ اللہ بچارا کون ہے؟

شہید رحمہ اللہ کا مقصد یہ ہے کہ شرک صرف یہی نہیں کہ دو برابر کے خداؤں پر یقین رکھا جائے، بلکہ کسی انسان کو حاضر ناظر، عالم الغیب، متصرف جاننا، حق تعالیٰ کی صفاتِ خاصہ کسی دوسرے میں تصور کرنا، یہ خیال کرنا کہ کسی کی وجاہت یا محبت سے اللہ تعالیٰ متاثر ہوتا ہے اور اسے سفارش قبول کرنا ضروری ہو جاتا ہے؛ یہ بھی شرک ہے۔ ذاتِ حق کی صفاتِ خاصہ نہ کسی میں ذاتی طور پر پائی جاتی ہیں، نہ عطا و توہب سے ان میں کوئی اللہ تعالیٰ کا شریک ہو سکتا ہے۔ الفاظ کی کھینچ تان سے تھوڑا ہٹ کر سوچیے، اس سے کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔

قدمائے عرب کے عقائد کا قرآنِ حکیم نے جہاں تذکرہ فرمایا ہے، اس سے ظاہر ہے کہ وہ بالاستقلال متعدد الٰہوں کے قائل نہیں تھے، بلکہ اللہ تعالیٰ کے علم، تصرف، الوہیت اور صفات میں وہ اپنے اولیا کو خدا کا عطائی شریک سمجھتے تھے اور یہ سارے پاپڑ وہ اس لیے بیلتے تھے کہ اس سے ان کو اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہو اور ان بزرگوں کی شفاعت سے ان کے مقاصد پورے ہوں:

(1) ﴿مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى﴾ [الزمر: ۳]

''ہم ان کی پرستش صرف اس لیے کرتے ہیں کہ یہ ہمیں اللہ تعالیٰ سے قریب کر دیں۔''

(2) ﴿هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ﴾ [یونس: ۱۸]

''اللہ کے پاس یہ ہمارے شفیع ہیں۔''

قرآن عزیز نے اس عذر کو قبول نہیں فرمایا، بلکہ اس عقیدے کو شرک ہی فرمایا اور انھیں ملامت کا مستحق سمجھا۔

آپ کی طرف سے اہلِ توحید پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ یہ لوگ بتوں کی آیات کو انبیا اور اولیاء اللہ چسپاں کر دیتے ہیں۔ (رضائے مصطفیٰ، ص: ۲، کالم: ۱)

اولاً: تو گزارش ہے کہ کافر، مشرک یا اولیاء اللہ کسی کا نام نہیں، یہ صفات ہیں، جن کا فیصلہ عمل ہی سے ہوتا ہے۔

دوم: آیات میں بتوں کی تصریح نہیں۔ آپ کو کس نے حق دیا ہے کہ کوئی آیت بتوں کو دلائیں اور کوئی ولیوں کو عنایت فرمائیں؟

سوم: الفاظ جب عام ہوں تو انھیں کسی دور کے ساتھ خاص کر دینا، اس کا ٹھیکیدار آپ کو کس نے بنایا ہے؟

قرآن کا آپ کے پاس کیا علاج ہے؟ وہ تقویۃ الایمان کے مصنف کی تائید فرماتا ہے:

﴿اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَ مَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ﴾ [التوبۃ:۳۱]

''ان لوگوں نے اپنے علما اور فقیروں کو اللہ کے سوا اپنا رب بنایا اور حضرت مسیح علیہ السلام کو، انھیں یہ حکم تھا کہ وہ صرف اللہ کی عبادت کریں، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اللہ تعالیٰ ان کے شرک سے پاک ہے۔''

یہ مولوی، فقیر اور حضرت مسیح علیہ السلام بت تو نہیں تھے۔ یہ تو عالم، ولی اور نبی ہی تھے، اور یہ ربوبیت اطاعت اور انقیادِ احکام اور حلال و حرام کے لحاظ سے تھی۔ یہاں تقلیدی جمود کو شرک فرمایا، جو آج کل زیادہ تر بریلوی فرقے ہی میں پایا جاتا ہے۔

﴿اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا﴾ [مریم:۹۳]

''آسمان اور زمین کے سب بزرگ اللہ کے سامنے غلام بن کر حاضر ہوں گے۔''

کسی پڑھے لکھے آدمی سے دریافت فرمایئے: ''مَن'' اور ''ما'' میں کیا فرق ہے؟

﴿وَ يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَ لَا يَنْفَعُهُمْ وَ يَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ﴾ [یونس:۱۸]

''اللہ کے سوا ان چیزوں کی پرستش کرتے ہیں جو انھیں نہ نقصان دے سکتی ہیں، نہ فائدہ اور یہ انھیں اپنا سفارشی کہتے ہیں۔''

یہاں معبودوں کو ''ما'' سے تعبیر فرمایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کے سوا معبود بت ہو یا ولی، مولوی ہو یا پیغمبر، جن ہو یا پری، بھوت ہو یا پریت، پیپل ہو یا کیکر؛ یہ عبادت شرک ہوگی، جو ایسا کرے مشرک۔

اب قرآن تو تقویۃ الایمان کے مصنف کی تائید فرماتا ہے، آپ کے دل مجروح ہوتے ہیں تو استغاثہ قرآن کے خلاف ہونا چاہیے، بچارے شہید رحمہ اللہ کو گالیاں دینے سے کیا فائدہ؟!

۴ بت بھی تو اولیاء اللہ اور بزرگوں ہی کے تھے۔ لات، منات، سواع، یغوث، یعوق، نسر اپنے وقت میں بزرگانِ دین اور اولیاء اللہ ہی تو تھے۔[1] (ترمذی، بخاری، ابن کثیر، خازن، ابن جریر، تفسیر عزیزی، مظہری وغیرہ)

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٤٦٣٦) تفسیر ابن کثیر (٤/ ٥٤٨)

یہ فلسفہ بیان فرما دیجیے! جب ولی کا بت بن جائے تو اس کی عبادت شرک بن جاتی ہے اور جب ولی کی قبر بن جائے تو شرک جائز ہو جاتا ہے!!

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام ایسے اولو العزم انبیا؛ جب ان کے بت بنا دیے جائیں تو ان کی عبادت شرک ہو جائے اور قرآن مجید کی آیات کا انطباق ان پر درست ہو جائے اور یہ روح بے تصرف ہو کر رہ جائے، نہ لڑکا دے سکے نہ لڑکی، نہ روٹی دے نہ پانی، لیکن جب خواجہ ہجویری اور خواجہ عطار پر قبہ بن جائے تو ان کو سجدہ کرنا زمین بوسی قرار پائے اور مرادیں دینے لگیں، ان کے پاس لڑکے لڑکیوں کا سٹاک سمجھا جائے اور ان کی روح مریدوں کے گھروں تک ان کا تعاقب کرتی پھرے اور بعض اوقات تو نیند تک حرام کر دے۔ یہ تصرف روح میں ہے یا پتھر اور قبر میں؟

اگر تصرف روح میں ہے تو بت اور قبر کا حکم یکساں ہونا چاہیے۔ یہ دونوں جگہ بے قرار رہے اور مریدوں کے ہاں گھر گھر پھرتی رہے اور قرآن کی ان آیات کے لیے، جن میں شرک سے روکا گیا ہے، کوئی اور محمل تلاش کر لیا جائے۔

اگر روح کی قوت پتھر کی وجہ سے سلب ہو چکی ہے یا اس کے اختیارات واپس لے لیے گئے ہیں تو سنگِ مرمر کی قبروں کا کیا حکم ہے؟ ان ولیوں کی روح سے بھی کچھ بن آتا ہے یا نہیں؟ یا قبر کے پتھر اور بت کے پتھر میں بھی کچھ فرق ہے؟ کیا نبی یا ولی کا بت بن جانے کے بعد اس کی نبوت یا ولایت واپس لے لی جاتی ہے؟

صاحبِ تقویۃ الایمان کی بات سمجھ میں آتی ہے، وہ قبر اور بت دونوں کی عبادت کو شرک سمجھتے ہیں، دونوں پر نذر و نیاز چڑھانا حرام سمجھتے ہیں اور آیاتِ توحید اور نفی عن الشرک کو دونوں مقام پر ناطق سمجھتے ہیں۔ آپ کے ہاں شرک کے معاملے میں بتوں اور قبروں میں فرق ہے، اس کا معما حل فرمایئے!!

بدبودار غلط بیانی:

بریلوی مدیر نے شاہ شہید پر تہمت لگائی ہے کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کی توحید کا ذکر فرماتے ہوئے باقی ''ایمانیات'' سے روکا ہے۔ یہ قطعی غلط ہے، شاہ شہید رحمہ اللہ کی عبارت کا قطعاً یہ مفاد نہیں۔ اللہ تعالیٰ سے ڈریئے، افترا کبیرہ گناہ ہے۔ ﴿اِنَّمَا يَفْتَرِي الْكَذِبَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ﴾ [النحل: ۱۰۵]

دوسری غلط بیانی:

صفحہ (۷) کے ایک حوالے میں آپ نے لکھا ہے کہ شاہ شہید رحمہ اللہ بارادہ ایصالِ ثواب اور نذر وغیرہ کو بھی شرک سمجھتے ہیں۔ یہ قطعاً غلط ہے اور شاہ صاحب پر تہمت اور ضمیر کی چوری۔ یہ اس سے بھی ظاہر ہے کہ

''ایصالِ ثواب کے لیے'' فقرہ آپ نے قوسین میں کر دیا ہے۔ لوگوں سے آپ ڈرتے ہیں کہ آپ کو جھوٹا نہ کہیں، لیکن ایک ولی پر تہمت لگانے سے آپ کو خوف محسوس نہیں ہوا! ﴿لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا﴾ [المائدۃ: ۸]

شاہ صاحب رحمہ اللہ کی کسی عبارت سے آپ ''ایصال ثواب'' کو شرک ثابت کر دیں تو آپ کو منہ مانگا انعام دیا جائے گا۔

اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو معاف فرمائے، جن کا پیشہ ہی یہ ہے کہ وہ اہلِ حق اور اولیاء اللہ پر اِفترا کرتے ہیں۔

دوسرا عقیدہ:

حضرت شہید رحمہ اللہ نے قبر کے لیے تعبدی سفر کو ناپسند فرمایا۔ وہ اسے حج کے مماثل سمجھتے ہیں اور ایسے سفروں کو غیر مشروع سمجھتے ہیں۔ قبروں اور استھانوں میں الٹے پاؤں چلنا فطرتِ انسانی کے خلاف سمجھتے ہیں، جب تک شرعاً کسی مقام کی حرمت ثابت نہ ہو، اپنی طرف سے اس کی حرمت اور شرافت کا دعویٰ کرنا، شاہ صاحب رحمہ اللہ واقعی اسے ناجائز سمجھتے ہیں۔ اگر بریلوی حضرات کو اس سے دُکھ ہوتا ہے تو آپ کی ذاتی رائے ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے، تین مساجد کے علاوہ عبادت اور ثواب کے لیے سفر نہ کیا جائے: «لا تشد الرحال إلا إلیٰ ثلاثة مساجد» [1] صحیح حدیث ہے۔ مقتدر ائمہ سے یہ عقیدہ منقول ہے، جیسے: عبداللہ بن مسعود، ابن قیم، ابن تیمیہ، شوکانی، محمد بن اسماعیل امیر یمانی، علامہ آلوسی صاحب جلاء العینین، حضرت شاہ ولی اللہ۔ البتہ بعض اہلِ علم کی رائے اس کے خلاف ہے، ان کے ہاں یہ سفر درست ہے، اس وقت ہمارا مطلب کسی مسلک کی ترجیح نہیں، بلکہ یہ گزارش کرنا مطلوب ہے کہ یہ مسئلہ فقہی ہے، اس میں اختلاف کیا جا سکتا ہے، ایسے مسائل میں تکفیر یا فتویٰ بازی کہاں درست ہے؟

اسی طرح الٹے پاؤں چلنا فطری وضع کے خلاف ہے۔ قرآن مجید فرماتا ہے:

﴿اَفَمَنْ يَّمْشِيْ مُكِبًّا عَلٰى وَجْهِهٖٓ اَهْدٰٓى اَمَّنْ يَّمْشِيْ سَوِيًّا عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾ [الملک: ۲۲]

''اوندھا چلنے والا ہدایت پر ہے یا سیدھا چلنے والا؟''

قدرت نے منہ اور پاؤں کا رخ ایک طرف رکھا ہے۔ جو اُلٹے پاؤں چلتا ہے، وہ فطرت سے بھی جنگ کرتا ہے۔

شاہ شہید رحمہ اللہ سیدھی بات فرمائیں، آپ کو وہ ناگوار ہوتی ہے۔ آپ کی اس ناگواری کا علاج نہ دیوبندی

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۱۱۳۲) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۳۹۷)

کر سکتے ہیں اور نہ حکومت، آپ کی قدرت سے جنگ ہے اور ناراضگی شاہ صاحب رحمہ اللہ پر!!

آنحضرت ﷺ سے زیادہ قابلِ عزت کون ہے؟ کوئی ایک واقعہ بتائیے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم آنحضرت ﷺ کی زیارت کے بعد اُلٹے پاؤں چلے ہوں؟ آپ حضرات سوچیں! آپ کو ہر اچھی بات بری کیوں معلوم ہوتی ہے؟ جہاں آنحضرت ﷺ نے الٹا چلنے کا حکم دیا ہے، وہاں حکم کی پابندی پر کسی کو اعتراض نہیں۔

پیغمبر کو سجدہ:

شاہ صاحب رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ پیغمبر کو سجدہ کرنا شرک ہے۔ بریلوی حضرات نے شاہ صاحب پر اعتراض کیا کہ آدم کو فرشتوں نے سجدہ کیا۔ بھائیوں نے یوسف علیہ السلام کو سجدہ کیا، حالانکہ شاہ صاحب نے اس سوال کا جواب (ص: ۴۲، مطبوعہ لاہور) دے دیا ہے، اس وقت اس کی اجازت ہوگی، اب نہیں۔ آنحضرت ﷺ کی بعثت کے بعد ہر قسم کے سجدے غیر کے لیے حرام قرار پائے۔

اللہ تعالیٰ اور مخلوق:

شاہ صاحب فرماتے ہیں: ہر مخلوق، بڑا ہو یا چھوٹا، وہ اللہ تعالیٰ کی شان کے آگے چمار سے بھی ذلیل ہے۔ (ص: ۱۵)

بات سیدھی ہے، مگر ٹیڑھی عقل کا یہ حال ہے کہ وہاں پہنچ کر ہر چیز ٹیڑھی ہو جاتی ہے۔ ہمارے بریلوی دوست مخلوق کی وکالت کرتے ہیں کہ مخلوق کی توہین ہوگئی اور یہ توہین شاہ شہید رحمہ اللہ نے کی۔ لیکن قرآن مجید فرماتا ہے:

﴿ اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اِلَّاۤ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا﴾ [مريم: ٩٣]

''آسمان اور زمین کے سب لوگ اللہ کے سامنے ذلیل ہو کر پیش ہوں گے۔''

﴿ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ﴾ [الفاطر: ٥١]

''اے لوگو! تو سب محتاج ہو، بے نیاز صرف اللہ ہے۔''

بریلوی حضرات کا مقابلہ قرآن سے ہے اور اللہ تعالیٰ سے! دیکھیے ان کی کوششوں سے قرآن کب ضبط ہو؟!

مختار یا اختیار:

شاہ صاحب نے تقویۃ الایمان میں کسی جگہ لکھا ہے کہ مختارِ مطلق صرف اللہ ہے، مخلوق نبی ہوں یا ولی، عالم ہوں یا جاہل؛ کسی کے اختیار میں کچھ نہیں، جو ہوتا ہے اللہ کی مشیت سے ہوتا ہے۔ انبیا صلحا کے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ حقیقت یہی ہے جو شاہ صاحب رحمہ اللہ نے فرمائی۔ واقعی کسی مردے یا زندہ کو پکارنا فائدہ نہیں دیتا۔ یہ

پکار بے کار ہے۔ یہ لوگ کسی کے نفع اور نقصان کے مالک نہیں ہیں۔ فرمایا:

﴿ قُلْ اِنَّمَآ اَدْعُوْا رَبِّیْ وَلَآ اُشْرِكُ بِهٖٓ اَحَدًا ۝ قُلْ اِنِّیْ لَآ اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا ۝ قُلْ اِنِّیْ لَنْ یُّجِیْرَنِیْ مِنَ اللّٰهِ اَحَدٌ وَّلَنْ اَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا﴾ [الجن: ۲۰ تا ۲۲]

''ان سے کہہ دو! میں صرف اللہ سے مانگتا ہوں اور کسی کو اس کا شریک نہیں سمجھتا، مجھے تمھارے نفع اور نقصان کا بھی اختیار نہیں، مجھے اللہ سے کوئی نہیں بچا سکتا اور نہ اس کے سوا میرے لیے کوئی پناہ کی جگہ ہے۔''

﴿ قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِیْ ضَرًّا وَّ لَا نَفْعًا اِلَّا مَاشَآءَ اللّٰهُ﴾ [یونس: ۴۹]

''میں اپنے نفع اور نقصان کا بھی مالک اور مختار نہیں ہوں۔''

پورے قرآن مجید میں یہ مضمون بھرا پڑا ہے۔ یقیناً قرآنِ مجید کا یہ طریقِ بیان آپ حضرات کے لیے دلخراش ہے۔ آپ کے اعتقادات کو اس سے گزند پہنچتا ہے، اس لیے اگر پورا قرآن ممکن نہ ہو تو کم از کم سورت اخلاص، معوذتین، سورت کافرون، سورت نوح، سورت جن، سورت نحل، سورت یوسف وغیرہ کی ضبطی کے لیے کوشش کرنا چاہیے!!

اس کوشش میں اگر آپ حضرات کامیاب ہوگئے تو تقویۃ الایمان مع کتاب التوحید خود بخود ختم ہو جائے گی۔ مولانا رشید احمد، اشرف علی، شاہ شہید، محمد بن عبدالوہاب تو بچارے ناقل ہیں۔ جب اصل ضبط ہوگیا، نقل خود بخود ضبط ہو جائے گی۔ آپ کے ہاں ولیوں اور بزرگوں کی کمی نہیں، ان کی وساطت سے کوشش فرمایئے کہ قرآنِ عزیز کے یہ دل خراش حصے یوں ہی منسوخ ہو جائیں!!

نہ رہے بانس نہ بجے بانسری!

آنحضرت ﷺ کی عظمت اور بڑائی:

شاہ صاحب رحمہ اللہ نے فرمایا ہے: انسان آپس میں سب بھائی ہیں۔ جو بڑا بزرگ ہے، وہ بڑا بھائی ہے، سو اس کی بڑے بھائی کی سی تعظیم کیجیے۔ (ص: ۶۷)

پھر فرمایا: اولیا، انبیا، امام، امام زادے، پیر، شہید، یعنی جتنے اللہ کے مقرب بندے ہیں، وہ سب انسان ہیں اور بندے عاجز اور ہمارے بھائی، مگر اللہ نے ان کو بڑائی دی، وہ بڑے بھائی ہوئے، ہم کو ان کی فرمانبرداری کا حکم ہوا ہے۔ (ص: ۶۷)

آنحضور ﷺ نے خود فرمایا:

«اعبدوا ربكم وأكرموا أخاكم»[1] (مشكوة)

''یعنی رب کی عبادت اور اپنے بھائی (آنحضرت ﷺ) کی عزت کرو۔''

قرآنِ عزیز نے بھی انبیا علیہم السلام کو بھائی سے تعبیر فرمایا:

① ﴿وَ اِلٰی عَادٍ اَخَاھُمْ ھُوْدًا﴾ [الأعراف: ٦٥] (ہود علیہ السلام عاد کے بھائی)

② ﴿وَ اِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاھُمْ صٰلِحًا﴾ [الأعراف: ٧٣] (صالح علیہ السلام قومِ ثمود کے بھائی)

شاہ صاحب نے ان کی برتری اور راہنمائی کی وجہ سے ان کو بڑا بھائی فرمایا ہے۔

③ ﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ﴾ [الحجرات: ١٠] (مومن بھائی ہیں)

ایمانی اخوت کے لحاظ سے بھی اہل اللہ اور انبیا بڑے اور بزرگ ہیں، اس لیے کہ ہم لوگوں کو ایمان اور ہدایت ان کی وجہ سے ملے ہیں، اس لیے وہ بڑے ہیں۔

شاہ صاحب رحمہ اللہ نے لکھا ہے: ہمارے پیغمبر ﷺ سارے جہان کے سردار ہیں، اللہ کے نزدیک ان کا مرتبہ سب سے بڑا ہے۔ الخ

شاہ صاحب رحمہ اللہ نے اللہ تعالیٰ کی شان کے متعلق فرمایا ہے: اللہ کی شان یہ ہے کہ ایک آن میں ایک ''کن'' سے چاہے تو کروڑوں نبی اور ولی، جن اور فرشتے، جبریل علیہ السلام اور محمد کے برابر پیدا کر دے اور ایک دم میں سارا عالم عرش سے فرش تک الٹ پلٹ کر ڈالے۔ (ص: ٣٤)

سبحان اللہ! کس قدر ایمان افروز ارشادات ہیں! ایک مومن موحد کا اس سے ایمان تازہ ہوتا ہے۔

قرآن مجید فرماتا ہے: اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ قرآن مجید میں بار بار فرمایا ہے، اس نے آسمان، زمین اور ساری کائنات کو پیدا کیا، پھر فرمایا:

﴿وَ اِذَا قَضٰٓی اَمْرًا فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ﴾ [البقرۃ: ١١٧]

''یعنی وہ جب کسی امر کا فیصلہ فرمائے تو اسے کن کہہ کر پیدا کر دیتا ہے۔''

مومن موحد، جس کا اللہ تعالیٰ پر ایمان ہے، ان توحید آمیز کلمات سے اس کے ایمان کو تازگی ملتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی قدرت و جبروت پر اس کا ایمان پختہ ہوتا ہے۔ حضرات اولیاے کرام بھی مقامِ توحید کو ٹھیک اسی طرح سمجھتے ہیں، جس طرح شاہ شہید رحمہ اللہ نے فرمایا۔

شیخ شرف الدین احمد بن یحییٰ منیری (٧٤٧ھ) ٣٥ ویں مکتوب میں فرماتے ہیں:

''گر خواہد در ہر لحظہ صد ہزار چوں محمد ﷺ بیافریند و ہر نفسے از انفاسِ ایشاں مقام قاب قوسین دہد

---

[1] مسند أحمد (٦/ ٧٦) اس کی سند میں علی بن زید بن جدعان ضعیف ہے۔

جلال او ذرہ زیادہ نگردد واگر خواہد در ہر نفسے ہزار چوں فرعون بیافرینند تا دعویٰ ﴿اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى﴾ کنند واز جمال وکمالِ او ذرہ کم نہ گردد۔'' (ص:۹۶)

''اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو ہر لحہ آنحضرت ﷺ فداہ ابی و امی کی طرح بلند مرتبہ ہزاروں پیدا فرمائے اور ہر گھڑی میں انھیں قاب قوسین کے مقام مرحمت فرمائے، اس کے جلال و جبروت میں ایک ذرہ کا اضافہ نہیں ہوگا اور اگر وہ چاہے تو ہر سانس میں ہزاروں فرعون پیدا فرمائے، جو ﴿اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى﴾ کا دعویٰ کریں تو اس کے حسن و جمال میں ذرہ بھر کمی نہیں آئے گی۔''

پھر فرماتے ہیں:

''واگر خواہد ہر کہ در روئے زمین کافرے ومشرکیست در دریاہائے رحمت غرق کند از صفتِ قہر او ذرہ کم نگردد واگر خواہد ہر کہ در عالم نبی و ولی است ہمہ را دریک سلسلۂ قہر کشد خالداً ومخلداً در عذاب الیم بدارد از صفت رحمت او ذرہ کم نگردد'' (مکتوبات: ۹۷)

''اگر وہ چاہے تو دنیا کے تمام کفار ومشرکین کو اپنی رحمت کے سمندر میں غوطہ دے دے تو اس کی صفتِ قہر سے ایک ذرہ بھی کم نہ ہوگا اور اگر چاہے تو تمام انبیا اور اولیا کو اپنے قہر میں مبتلا کر دے اور ہمیشہ کے لیے دردناک عذاب میں گرفتار فرما دے تو اس سے اس کی رحمت میں بھی قطعاً کوئی کمی نہیں آئے گی۔''

کس قدر بے ادبی ہے!! (معاذ اللہ)

بریلوی سنت و جماعت والے حضرات کے عقائد کو ضرور ان کتابوں سے نقصان ہوگا، ان کے عقائد مجروح ہوں گے۔ اگر حکومتِ پاکستان واقعی ان حضرات کو خوش کرنا چاہتی ہے تو اسے چاہیے کہ ان کتابوں کے ساتھ قرآنِ عزیز اور سنت کے دفاتر اور اہلِ سنت صوفیوں کی کتابوں کا بھی بندوبست کرے، تاکہ بچارے بریلوی آرام کی نیند سو سکیں۔ ان بچاروں کی پریشانی واقعی قابلِ صد ہزار رحم ہے!!

آخر میں تقویۃ الایمان کے متعلق فرمایا ہے:

''ساری کی ساری کتاب میں اسی قسم کی گستاخی اور بیباکی کا مظاہرہ ہے اور شانِ رسالت و نبوت کا انکار کیا گیا ہے۔ یہ کتاب ایک فتنہ ہے، جس کی نحوست نے مسلمانوں کی وحدت کو پارہ پارہ اور اتفاق واتحاد کو ریزہ ریزہ کر دیا ہے اور اس کے باعث جگہ جگہ فتنہ برپا ہے۔'' (رضائے مصطفیٰ)

کتاب میں گستاخی وغیرہ تو قطعاً نہیں، البتہ حفظِ مراتب کی تلقین کھلے طور پر کی گئی ہے۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ کا مطلب یہ ہے کہ اولیا کو انبیا کا مقام مت دو اور انبیا کو اللہ تعالیٰ کا مقام دے کر اللہ کو اپنے مقام سے معطل نہ کرو۔ البتہ یہ درست ہے کہ اس کتاب سے بریلوی مسلمانوں کی وحدت پارہ پارہ ہوگئی اور بریلویت ریزہ ریزہ ہو کر رہ گئی۔

شاہ شہید رحمہ اللہ کی آواز واقعی سخت ہے۔ عالم اور مجدّد میں یہی فرق ہے کہ علما اپنی آواز سے بولتے ہیں، مجدّد وقت کی آواز ہوتا ہے۔ وہ اس آواز سے بولتا ہے، وقت جس کا تقاضا کرتا ہے، بریلوی حضرات کو شکایت تو خیر ہے ہی، بعض اہلِ حدیث اور دیوبندی علما نے بھی تقویۃ الایمان کے لب و لہجے کو سخت سمجھا۔ یہ حضرات صلح کل اور عافیت کوش ہیں، انھیں معلوم نہیں اگر شہید رحمہ اللہ آپ کی آواز سے بولتے تو ان کی آواز بھی آپ حضرات کی طرح بے اثر ہوتی!

شہید رحمہ اللہ کی آواز نے بہروں کو سنایا، گونگے بولنے لگے۔ جو آنکھوں سے معذور تھے، وہ اس کی برکت سے دیکھنے لگے۔ حیران دلوں کو اس سے اطمینان نصیب ہوا۔ فقیروں، قبروں، درختوں، پیروں، ملاؤں کی پرستش سے اللہ تعالیٰ نے انھیں مخلصی عنایت فرمائی۔ اس لیے واقعی بریلوی گھروں میں اختلافات بڑھ گئے۔ باپ، بیٹا، میاں، بیوی، بھائی بھائی سے جدا ہوگئے۔ وہی ہوا جو علم و بصیرت کی روشنی میں جہالت کے ساتھ ہوتا ہے۔ سورج کے طلوع سے رات کے اندھیروں پر جو گزرتی ہے، وہی بریلوی حضرات پر گزری۔ علم و بصیرت کی آمد نے یہاں کی دنیا بدل دی۔

قرآنِ عزیز نے بنی اسرائیل کے متعلق فرمایا:

﴿فَمَا اخْتَلَفُوْا حَتّٰی جَآءَ هُمُ الْعِلْمُ اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ﴾ [یونس: ۹۳]

”بنی اسرائیل میں اختلاف تب پیدا ہوا، جب علم و بصیرت نے ڈیرے ڈال دیے، اب ان کا فیصلہ قیامت ہی کو ہوگا۔“

جب حق کا حملہ باطل کی بستیوں پر ہوتا ہے تو اس کا قدرتی اثر یہ ہوتا ہے کہ باطل پرستوں میں انتشار رونما ہوتا ہے۔ حرص و آز اور درہم و دینار، دہن و کام کے بندے جب اپنا مفاد خطرے میں دیکھتے ہیں تو اس کی حفاظت کے لیے اپنی اپنی راہ لیتے ہیں، اس کا نتیجہ انتشار، پریشانی اور سراسیمگی ہوتا ہے، یہی اثر قرآنِ عزیز اور آنحضرت کی آمد نے بنی اسرائیل اور بنی اسماعیل پر کیا، جس کا اعتراف ابوجہل نے محاربہ بدر سے پہلے ان لفظوں سے کیا: ”إن محمداً شتت أمر العرب“[1]

یہی حال شاہ شہید رحمہ اللہ کی آواز سے ہند کے شرکستان میں ہوا۔ مدیرِ محترم کی رائے سے ہمیں اتفاق ہے کہ تقویۃ الایمان کی آمد سے بریلوی سنت اور بریلوی جماعت کے متوسلین میں انتشار پیدا ہوا، لیکن یہ قصور تقویۃ الایمان

[1] تاریخ دمشق (۳۸/۲۴۳)

کا نہیں۔ یہ ''نحوست'' علم و بصیرت سے ظاہر ہوئی، اس لیے ضروری ہے کہ دنیا سے علم و دانش کو ضبط کر لیا جائے، اخلاص و دیانت کو نظر بند کر دیا جائے، حق و صداقت کو پھانسی پر لٹکا دیا جائے۔ یقیناً بریلوی حضرات کو اس سے آرام ملے گا!!

﴿فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَ لٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ﴾ [الحج: ٢٢]

''آنکھوں کا بے نور ہونا، چنداں مضر نہیں، سب سے بڑی مصیبت دلوں کی بربادی ہے۔''

ما شكل أن القيود غل الأرجل

إن القيود على العقول فتاك الشكل

اگر حکومت عقل و دانش، اخلاص و دیانت اور علم و بصیرت کو ضبط کرنے کے لیے آمادہ ہو جائے تو اہلِ توحید بسر و چشم تیار ہیں۔ ع

سرِ دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی[1]

لیکن بریلوی حضرات کو یقین ہونا چاہیے کہ حکومت آپ کی آرزو کو پورا کرنے پر قادر نہیں، اس میں یہ ہمت ہی نہیں کہ وہ قدرت کے اٹل قانون کا مقابلہ کرے۔ ارشاد ہے:

﴿وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّ لٰكِنْ يُّضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ وَ لَتُسْئَلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾ [النحل: ٩٣]

''اگر اللہ تعالیٰ چاہتے، تم سب ایک جماعت ہو جاتے، لیکن اس کی مشیت اس دنیا میں یہ ہے کہ اہلِ ہدایت اور گمراہ دونوں یہاں بسیرا رکھیں اور تمھارے اعمال کی بابت تم سے آخرت میں سوال جواب ہوں گے۔''

مٹی میں ملنا:

آنحضرت ﷺ نے قیس بن سعد رضی اللہ عنہ کو فرمایا:

«أرأيت لو مررت بقبري أكنت تسجد له؟» فقلت: لا فقال «فلا تفعلوا»[2] (مشكوة)

''بتاؤ! جب تم میری قبر پر گزرو گے تو کیا تم اس پر سجدہ کرو گے؟ میں نے عرض کیا: قطعاً نہیں، اس پر فرمایا: پھر زندگی میں بھی مجھے سجدہ نہ کرو۔''

شاہ صاحب رحمہ اللہ نے اس حدیث کے تشریحی نوٹ میں فرمایا ہے:

---

1. ''تمھاری خنجر آزمائی کے لیے دوستوں کا سر حاضر ہے۔''
2. سنن أبي داود، رقم الحديث (٢١٤٠) اس کی سند میں ''شریک بن عبداللہ نخعی'' ضعیف ہے۔

''میں ایک دن مر کر مٹی میں ملنے والا ہوں تو کب سجدے کے لائق ہوں؟''

مٹی میں ملنے کے دو ہی مطلب ہو سکتے ہیں: قبر میں دفن ہونا، کیونکہ قبر مٹی ہی میں بنائی جاتی ہے۔ یہ معنی بالکل درست ہے۔ آنحضرت ﷺ کا وصال ہوا، انتقال کے بعد جسمِ اطہر کو سپردِ خاک فرمایا گیا۔ اُم سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ہمیں آنحضرت ﷺ کی موت کا اس وقت یقین آیا، جب قبر کھودتے وقت ہم نے ہتھیاروں کی آواز سنی۔[1] اس معنی سے جو آدمی دفن ہوتا ہے، وہ مٹی میں مل جاتا ہے، یہی مفہوم یہاں قرین قیاس ہے، چونکہ حدیث میں قبر ہی کا ذکر ہے۔

یہ اثر منقطع ہے۔ اگر اس کا مطلب جسم کا مٹی ہو کر مٹی میں مل جانا ہے، تو یہ معنی غلط ہے اور قرائن بتاتے ہیں کہ شاہ صاحب کا یہ مطلب نہیں۔ ان کا مطلب قبر میں دفن ہونا ہے۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ ایسے عالم سے یہ غلطی کیسے ہو سکتی ہے، جبکہ حدیث میں صراحتاً موجود ہے:

«إن الله حرم على الأرض أن تأكل أجساد الأنبياء»[2] (مشكوة)

''انبیا کے جسموں کو کھانا زمین پر حرام ہے۔''

تاہم اگر شاہ صاحب رحمہ اللہ کا مطلب یہی سمجھا جائے تو بداہتاً غلط ہے۔ شاہ صاحب انسان ہیں، بھول سکتے ہیں۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ معصوم نہیں۔

کتاب التوحید:

تقویۃ الایمان کو کتاب التوحید کا ترجمہ کہنا تو قطعاً غلط ہے، البتہ یہ صحیح ہے کہ دعوت ایک ہی ہے، جو ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں نے دی۔ اگر یہ حقیقت ہے تو الفاظ کی بحث بے سود ہے۔ حقیقت کا اعتراف کیجیے۔ الفاظ کا انتخاب وقت کے لحاظ سے مولف کے اجتہاد پر موقوف ہوتا ہے۔ اپنے مخاطب کی قوتِ فکر کے مطابق اسے الفاظ پسند کرنے پڑتے ہیں، یہ اس کی نیت کا مسئلہ ہے۔ مجھے کتاب التوحید بالاستیعاب پڑھنے کا موقع نہیں ملا، اندازہ یہ ہے کہ محمد بن عبدالوہاب کا ماحول اسماعیل بن عبدالغنی کے ماحول سے کافی مختلف تھا۔ محمد بن عبدالوہاب کے قلم اور تلوار دونوں کا رخ ایک ہی طرف رہا، اس کے قلم کو شکوہ نہیں کہ تلوار نے میرا ساتھ نہیں دیا۔ لیکن شاہ شہید رحمہ اللہ کے قلم کو یہ بجا شکوہ ہے کہ اسماعیل کی تلوار نے قلم کو تنہا چھوڑ دیا۔ تلوار ہمیشہ سکھوں اور انگریزوں سے مخاطب رہی اور اسماعیل کے قلم کو بعض اوقات دونوں ڈیوٹیاں دینی پڑیں، دونوں ذمے داریاں بقدرِ امکان اٹھانی پڑیں۔

---

[1] موطأ الإمام مالك (١/ ٢٣١)

[2] سنن النسائي، رقم الحديث (١٣٧٤)

اگر شاہ شہید رحمہ اللہ کی تلوار کا رخ کچھ دیر بریلی اور بدایوں کی طرف ہوجاتا اور قلم کو اس طرح تلوار کی رفاقت نصیب ہوجاتی تو ان حلوے کے شیروں کو قلم سے شکوہ نہ ہوتا۔ مصیبت تو یہی تھی کہ سکھ اور انگریز دونوں بریلی اور بدایوں کی پشت پر تھے، اس لیے قلم کا محاذ تلوار کے محاذ سے زیادہ سخت تھا اور اسماعیل کے قلم نے جس زمین کو فتح کیا، وہ تلوار کے میدان سے زیادہ سنگ لاخ تھے۔

جو سپاہی بیک وقت چار محاذوں پر لڑ رہا ہو، اس کی تلخ نوائیوں کا شکوہ دیوبند سے ہو یا بریلی یا بدایوں سے ہو یا دہلی سے، بے انصافی ہے۔ ؎

گفتگوئے عاشقاں در باب رب جذبۂ عشق است نے ترکِ ادب[1]

شہید رحمہ اللہ کی مشکلات کا جائزہ لبِ جو بیٹھ کر کر لینا بے انصافی ہے۔ مناسب یہی ہے کہ بریلی اور بدایوں کے حریف اور دیوبند اور دہلی کے رفقا اس معاملے میں خاموش ہوجائیں۔ ''إنما یعرف البلاء من به یبتلیٰ''۔ جو لوگ وقت پر مفید نہیں ہوسکے، وہ مضر کیوں ہوں؟

کتاب التوحید اور تقویۃ الایمان کے تقابل کی بحث بے سود ہے۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو ان کے اعمال کی بہتر جزا دے۔ ﴿تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ لَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ وَ لَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ﴾ [البقرۃ: ١٣٤]

صراطِ مستقیم:

''صراطِ مستقیم'' کے مصنف شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ نہیں ہیں، جیسے کہ کتاب کے دیباچے سے ظاہر ہے۔ یہ دراصل سید احمد شہید رحمہ اللہ کے ارشادات ہیں، جن کی ترجمانی فارسی زبان میں شاہ شہید رحمہ اللہ اور حضرت مولانا عبدالحی رحمہ اللہ نے فرمائی، اس کتاب کے کل چار باب ہیں۔ پہلا اور چوتھا باب شاہ شہید رحمہ اللہ نے لکھا، دوسرا اور تیسرا باب حضرت مولانا عبدالحی نے رقم فرمایا اور اسی فارسی ترجمانی کے بعد حضرت سید احمد رحمہ اللہ کو سنا کر اس امر کی تسکین فرمائی کہ ان کا مقصد ادا ہوگیا۔

اس لیے اس کتاب کو شاہ شہید رحمہ اللہ کی تصنیف کہنا غلط ہے۔ سید شہید رحمہ اللہ کی تصدیق کے بعد اس کے الفاظ اور معنی کی ذمے داری ترجمان حضرات سے زیادہ سید احمد رحمہ اللہ پر پڑتی ہے۔ بریلوی حضرات اسے شاہ شہید رحمہ اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں، یہ واقع میں غلط ہے۔ بریلی مدیر نے قابلِ ضبط کتابوں کا تذکرہ کرتے وقت اسے شاہ صاحب رحمہ اللہ کی تصنیف ظاہر کیا ہے، یہ غلط بیانی ہے۔

---

[1] ''عاشقوں کی گفتگو رب تعالیٰ کے بارے میں ہے، یہ جذبۂ عشق ہے ترکِ ادب نہیں ہے۔''

تحریکِ حریتِ فکر اور حریتِ وطن اور تحریکِ اعتصام بالسنۃ اسی تحریک کے اہم اجزا تھے، جو گیارھویں صدی کے اواخر سے آج تک مختلف محاذوں پر کام کرتی رہی، اس کے بانی یقیناً سید احمد شہید رحمہ اللہ تھے، لیکن اس کے روحِ رواں شاہ شہید رحمہ اللہ تھے۔ جب تک شاہ شہید زندہ رہے، تحریک کے ہر حصے میں سید صاحب کے ساتھ پیش پیش رہے۔ شہادت کے بعد اس کی تمام تر ذمے داریاں پٹنوی خاندان نے سنبھال لیں۔ یہ حضرات شاہ شہید رحمہ اللہ سے زیادہ متاثر تھے اور کھلے اہلِ حدیث تھے، اس لیے ہندوستان کے اہلِ بدعت، سکھوں اور انگریزوں نے ہر گناہ کو (ان کے خیال سے) شاہ شہید رحمہ اللہ اور جماعتِ اہلِ حدیث پر چسپاں کرنے کی کوشش کی۔ صرف ایک حوالے کی وجہ سے پوری کتاب شاہ شہید رحمہ اللہ کے نام لگا دی گئی، حالانکہ یہ حوالہ دوسرے باب میں ہے، جو مولانا عبدالحی رحمہ اللہ کے قلم کا مرہونِ منت ہے، شاہ شہید رحمہ اللہ کو اس سے کوئی تعلق نہیں۔ انھوں نے دوسرا اور تیسرا باب من وعن لکھ دیا، اس میں کوئی تغیر اور تبدیلی نہیں فرمائی۔ یہ اظہارِ حقیقت کے طور پر عرض کیا گیا، اعتراضات سے طبیعت پر بحمداللہ کوئی بار نہیں۔

شاہ شہید رحمہ اللہ کے علم وفضل کے اعتراف کے باوجود ہم ان کا مقام ائمہ مجتہدین رحمہم اللہ سے کم سمجھتے ہیں۔ ائمہ مجتہدین کے ارشادات کو جب من وعن قبول نہیں کیا جاتا تو ان بزرگوں کی ہر بات کی ذمے داری ہم پر کیوں عائد ہوگی؟ نہ شاہ اسماعیل معصوم ہیں، نہ سید احمد، نہ مولانا عبدالحی رحمہم اللہ۔

اصل کتاب کے متعلق گزارشات:

صراطِ مستقیم تصوف کی کتاب ہے۔ تصوف پر دو دور گزر چکے ہیں، ایک دور قرونِ خیر کا، تمام صحابہ اور عموماً تابعین اور ائمہ اسلام صوفی تھے، ان کے ہاں تصوف زہد و ورع، دنیا سے ایک گونہ بے رغبتی کا نام ہے۔ یہاں نہ چلہ کشی ہے نہ دم کشی کی ورزشیں، نہ طویل مراقبے؛ یہاں ان تمام کمیوں اور سارے خلا کو پاٹنے کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت یا اس زمانے کا قرب کفایت کرتا ہے۔ جہاد اور دوسرے اعمال کی وجہ سے یہ دور ان مصنوعی اور مصطلح ورزشوں سے مستغنی رہا۔ عمهم الله برحمته، وأدخلهم بحبوحة الجنة.

مصطلح تصوف:

قرونِ وسطیٰ میں تصوف زمانہ نبوت سے بہت دور آ گیا، اس دوری کے سبب سے نبوت کی برکات کا اثر کم ہوتا گیا، اس وقت اہلِ علم نے اس کمی کو پورا کرنے کے لیے کچھ وظائف اور کچھ مراقبے وضع فرمائے۔ بعض کوائف کے اظہار اور تفہیم کے لیے کچھ اصطلاحات وضع فرمائیں اور اس سلسلے میں اسلام کے سوا دوسرے مذاہب کی رہبانیت سے بھی استفادہ کیا۔ یہ چیزیں اس وقت دین نہیں سمجھی جاتی تھیں، بلکہ ضرورتاً ان سے استفادہ کیا گیا۔ قلب پر ان کا کچھ نہ کچھ اثر ہوا، اس پر مفید نتائج مرتب ہوئے۔ اسی اثر کا نتیجہ تھا کہ امام غزالی

ایسے یگانۂ روزگار نے نظامیہ کی صدر مدرسی سے مستعفی ہو کر دمشق کے جنگلوں میں پناہ لی اور اس تنہائی اور خلوت میں مصطلح راہوں سے خدا کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے اور یہ راہ فلسفہ اور کلام کی راہ سے ان کے لیے زیادہ اطمینان کا موجب ہوئی۔ یہ راہ سنت نہ سہی، فی الجملہ مفید تھی، بشرطیکہ ان ورزشوں کو محض ذریعہ سمجھا جائے، دین اور شریعت تو نہ تصور کیا جائے۔

دکان داری:

آج جس دور سے ہم گزر رہے ہیں، اس میں تصوف نے بزنس اور دکان داری کی صورت اختیار کر لی ہے اور تصوف کے پردے میں زنا کاری، حرام خوری اور منشیات کی تجارت ہو رہی ہے۔ یہ دین کے قائد، زہد اور ترکِ دنیا کے رہنما؛ گندی قسم کے دنیا پرست ہیں۔ یہاں بیعت اور خانقاہ اور وجد و حال کی مجالس دکان کے سامان سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ عوام کو دھوکا دینے کے لیے یہ سب ہم رنگ زمین جال ہیں۔ بریلوی حضرات میں تو اس سلسلے نے انتہائی ذلیل صورت اختیار کر لی ہے۔ پیر کا فسق و فجور دیکھ کر بھی دم مارنے کی اجازت نہیں دی جاتی، گویا یہاں پہنچ کر امر بالمعروف کی ساری ذمے داریاں ختم ہو جاتی ہیں۔ یہ تصوف مستحدث ہے، اس کا نہ شرعاً احترام ہے نہ آبرو، بلکہ اگر اس ملک میں اسلامی اور شرعی قانون رائج ہو تو یہ لوگ چوروں اور ڈاکوؤں کی طرح تادیب اور تعزیر کے مستحق قرار پائیں۔

کتاب ''صراط مستقیم'' قرونِ وسطی کے تصوف کی یادگار ہے، اس میں مختلف قسم کے اوراد، مشقیں اور تصوف کی اصطلاحات پر گفتگو فرمائی گئی ہے۔ سید شہید رحمہ اللہ نے اس پر بہت سی بدعات کی اصلاح بھی فرمائی ہے۔ تصورِ شیخ ایسی مشرکانہ بدعات سے روکا ہے، تاہم یہ کہنا مشکل ہے کہ اس میں جو کچھ ہے، وہ تصوفِ مسنون ہے، اس لیے سید صاحب رحمہ اللہ اور شاہ صاحب رحمہ اللہ سے انتہائی عقیدت کے باوجود اس کے پورے الفاظ کی ذمے داری لینا مشکل ہے۔

اخلاق کی اصلاح:

یہ ایک علمی کتاب ہے۔ اخلاق کی اصلاح کے لیے بہترین مجموعہ ہے۔ دینی ذہن اور شریعت کے ساتھ رابطے کے لیے نہایت اچھی کتاب ہے، اس سے بہترین اخلاق کی تلقین ہوتی ہے۔ ایسی کتاب کے ضبط کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، البتہ تصوف کی گہرائیوں میں جا کر اس سمندر نے ایسے موتی پیدا کیے ہیں، جن کو پیر پرستی کا عادی عامی ذہن پورے طور پر سمجھ نہیں سکتا۔ مناسب تو یہ تھا کہ اسے کند ذہن اور جہالت نواز حضرات سے چھپایا جاتا، مگر اس کا کیا علاج کہ پریس نے اسے حدیثِ محفل بنا کر رکھ دیا، اس لیے ہر کس و ناکس اس کے متعلق اظہارِ خیال کے لیے آمادہ

ہوگیا، چنانچہ ہمارے بریلوی حضرات نے اسے الزام اور استدلال دونوں طریق سے استعمال کیا۔ اب بریلوی مدیر نے مشورہ دیا ہے کہ یہ کتاب بھی ضبط کر دی جائے اور اس کی اشاعت ''قہر القادر'' کے ساتھ ممنوع قرار دی جائے۔

اصل شبہہ:

سید صاحب رحمہ اللہ نے نماز میں حضورِ قلب پر زور دیا ہے اور مختلف وساوس سے بچنے کی تاکید فرمائی ہے۔ وساوس کے لیے علاج تجویز فرمائے ہیں، اس ضمن میں سید صاحب رحمہ اللہ نے ایک نکتہ پیدا فرمایا ہے، وہ یہ کہ معمولی قسم کی ذلیل چیز کا خیال اگر دل میں آجائے تو اسے رفع کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی۔ انسان حقارت سے اسے نظر انداز کر سکتا ہے، لیکن قابلِ عزت و احترام بزرگوں کی طرف دل کی مشغولیت بڑھ جاتی ہے، اسے روکنے میں دقت ہوگی، اس کا احترام اس کے دفاع میں حائل ہوگا، دل نماز سے ہٹ کر اس طرف مشغول ہو جائے گا، اس سے نماز میں خلل واقع ہوگا، وہ ہر کس و ناکس کے تصور کو گاؤ وخر سے تعبیر فرماتے ہیں۔

وہ فرماتے ہیں کہ مقامِ تعبد میں دل کو پوری یکسوئی سے اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ کرنا چاہیے، یہاں نہ معمولی خیالات کے لیے گنجایش ہونی چاہیے نہ انبیا و اولیا کا تصور مقامِ تعبد میں حائل ہونا چاہیے، بلکہ غایت احترام کی وجہ سے بزرگوں کی طرف دھیان کا جانا نماز اور حقیقتِ عبادت کے لیے زیادہ مضر ہے۔

مسئلہ صاف ہے۔ مثبت طریق پر بریلوی حضرات کو سمجھانے کی بے حد کوشش ہوئی اور پورے یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ ان کے علما سمجھتے ہیں کہ جو فرمایا گیا ہے، حقیقتاً درست ہے۔

وہ عوام اور جہلا کو بدگمان کرنے کے لیے اسے عوام کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ خواص کو اس کی حقیقت معلوم ہے کہ اس میں کچھ نہیں، اس لیے مثبت طور پر میں اس وقت اس کے متعلق کچھ نہیں کہنا چاہتا، میں الزامی طور پر عرض کرنا چاہتا ہوں۔ کند ذہن اور شرارت پسند طبائع کے لیے عموماً یہ طریق مفید ثابت ہوتا ہے، اس طرح ان کی قوتِ فکر بیدار ہو جاتی ہے۔

اصل سوال یہ ہے کہ سید احمد صاحب نے گاؤ وخر اور انبیا اور اولیا کے خیالات کا تقابل کیا ہے اور انبیا کے خیال کو گاؤ وخر سے نماز میں زیادہ مضر سمجھا ہے، ایک عامی ذہن کو واقعی یہ تقابل کھٹکتا ہے۔

''الأشباه والنظائر'' فقہ کی مسلمہ کتاب ہے۔ بریلوی حضرات اسے پورے یقین اور اعتماد سے مانتے ہیں، اس میں مرقوم ہے:

''ولو نظر المصلي إلى مصحف، وقرأ منه، فسدت صلاته، لا إلىٰ فرج امرأة بشهوة'' (ص: ٤٣٤)

''یعنی نمازی قرآن کو دیکھ کر پڑھے تو اس کی نماز ٹوٹ جائے گی، عورت کی شرمگاہ کو شہوت سے

دیکھے تو نماز نہیں ٹوٹتی۔"

قاضی فرماتے ہیں:

"إذا قرأ المصلي من المصحف فسدت صلاته في قول أبي حنيفة رحمه الله، ولو نظر إلى فرج المطلقة طلاقا رجعيا شهوة، يصير مراجعا، ولا تفسد صلاته" (١/ ١١١ مصری)

یعنی اگر مطلقہ رجعیہ کی شرمگاہ کو شہوت سے دیکھے تو رجوع ہو جائے گا، نماز فاسد نہیں ہوگی۔

"وكذا لو نظر المصلي إلى فرج امرأة بشهوة، حرمت عليه أمها وابنتها، ولا تفسد صلاة في رواية" (١/ ١١١ مصر)

"اگر آدمی کسی عورت کی شرمگاہ شہوت سے دیکھے تو اس کی ماں اور بیٹی اس پر حرام ہو جائے گی، لیکن نماز فاسد نہیں ہوگی۔"

"ولو نظر إنسان من تحت القميص (أي عورة المصلي) لا تفسد صلاته" (ص: ١١١)

"اگر آدمی قمیص کے نیچے سے نمازی کی شرمگاہ دیکھے تو اس کی نماز فاسد نہیں ہوگی۔"

"ولو قبلت المصلي امرأة ولم يشتهها لم تفسد صلاته" (١/ ١١١)

"عورت کسی نمازی کا بوسہ لے لے اور اسے شہوت نہ آئے تو نماز فاسد نہیں ہوگی۔"

ان ملفوظات پر غور کرنے سے چند چیزیں ثابت ہوتی ہیں:

1. یہاں قرآنِ حکیم کی قراءت کا تقابل عورت کی شرمگاہ، مرد کی شرمگاہ اور عورت کے بوسے سے کیا گیا ہے۔
2. فتویٰ یہ دیا گیا ہے کہ قرآن پڑھنے سے نماز فاسد ہوتی ہے، شرمگاہ کی زیارت سے نماز نہیں ٹوٹتی۔
3. شرمگاہ پر نظر سے رجوع اور حرمتِ مصاہرت تو ثابت ہو جاتی ہے، مگر نماز پر کوئی اثر نہیں ہوا اور قرآن کا اثر فوراً نماز پر ہوتا ہے اور نماز فاسد ہو جاتی ہے۔
4. عورت مرد کا بوسہ لے تو عدمِ اشتہا کی صورت میں نماز پر اثر نہیں پڑے گا۔

"لم یشتهها" کی قید قابلِ غور ہے۔ اگر کسی پڑھے لکھے دیوبندی نے آپ کو سمجھا دیا تو شاید شہید رحمہ اللہ کے متعلق بدگوئی سے آپ کو نجات مل جائے۔

مولانا اشرف علی اور دیگر علمائے دیوبند کی کتابوں کا جواب بارہا دیا جا چکا ہے۔ آپ کا سارا زور تقویۃ الایمان پر تھا، اس کے متعلق اختصار سے عرض کر دیا گیا۔ ولو استزدتم فلدینا مزید۔[1]

[1] ہفت روزہ "الاعتصام" لاہور (۲۷/ دسمبر، ۴، ۱۱/ اکتوبر ۱۹۵۷ء)

آنحضرت ﷺ کا یومِ پیدائش اور چند غلط فہمیوں کا ازالہ

اسلام کے مزاج کا تقاضا ہے کہ وہ اشخاص سے زیادہ ان کارناموں کی عزت کرتا ہے، جو کسی بڑے شخص سے صادر ہوں، اس لیے صحابہ رضی اللہ عنہم، تابعین، تبع تابعین اور ائمہ ہدی رحمہم اللہ میں سے کسی نے بھی کسی بڑے آدمی کا جنم دن یا موت کا دن منانے کی کوشش نہیں فرمائی۔ اس رسم کی اسلام میں اگر کچھ اہمیت ہوتی تو اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم کی پیدائش کے دن ضرور ہی منائے جاتے۔

عوام نے پیدائش کے دن کو میلاد سے تعبیر کیا اور موت کے دن کو عرس کا نام دیا، لیکن یہ رسم صدیوں بعد بنائی گئی، اور عموماً ایسی رسوم کا اہتمام وہی لوگ کرتے ہیں، جنھیں ان سے کچھ نہ کچھ مالی فائدہ ہوتا ہو۔ عوام بے چارے عقیدت کی وجہ سے خسارے ہی میں رہتے ہیں۔

ابتدائے اسلام سے اکابرِ اسلام کی پیدائش اور موت کے دن منانے کا اہتمام کیا جاتا تو شاید سال کا کوئی دن بھی کسی میلاد شریف یا عرس شریف سے خالی نہ ہوتا۔ امت میں بحمد اللہ پاک لوگوں کی کمی نہیں تھی۔ اگر ان کے واقعات اور حوادث کو بطورِ ایام منایا جاتا تو یقیناً بہت سے ضروری اور اچھے کاموں کے لیے وقت ہی نہ بچتا۔ سارا وقت مرنے والوں کے احترام اور اہتمام میں گزر جاتا۔ زندوں کی اصلاح اور تعمیر کے لیے شاید ہی تھوڑا بہت وقت نکلتا۔ رجال، سیرت اور وفیات کی کتابوں میں اپنے اکابر کے تذکرے پڑھیے، اور پھر ملاحظہ فرمائیے، کیا ان سب حضرات نے اعراس اور موالید کے اہتمام فرمائے؟ شاید گداگر اور ملّا حضرات تو اس کاروبار کو کر گزریں کہ انھیں اس سے کافی حد تک معاشی سہولتیں میسر آجاتی ہیں، لیکن عامۃ المسلمین کے لیے اس میں بے کاری اور تباہی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

یہ رسم اہلِ اسلام میں غیر مسلم قوموں کی تقلید سے آئی۔ مغربی قومیں غالباً پیدائش کے دن مناتی ہیں، مگر مشائخ اور اکابر کے مرنے پر ان کے ہاں بھی عرس کا کوئی انتظام نہیں۔ عرس کی رسم شاید ہندوؤں میں بھی نہ ہو۔ یہ صرف دکاندار قسم کے متاخر صوفیوں نے ایجاد کی، جس کا نتیجہ قبر پرستی کی صورت میں ظاہر ہو رہا ہے۔

محفلِ میلاد:

یہ وہ چیز ہے، جسے ان حضرات نے کفر اور اسلام میں فرق کرنے والی شے تصور کیا ہے کہ جو اس رسم میں

شریک نہ ہو، اسے ابلیس کا ساتھی سمجھتے ہیں۔ آج کل یہ رسم بھی غیر مسلم فرقوں کی نقالی میں منائی جا رہی ہے۔ قرونِ خیر اور ائمہ اسلام سے اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ کم علم ملا اسے غیر مسلموں کی تقلید ہی میں مناتے ہیں۔

حافظ ابو شامہ (متوفی ۶۶۳ھ) نے "الباعث على إنكار البدع والحوادث" میں فرمایا:

"أول من فعل هذا بالموصل: الشيخ عمر بن محمد الملا أحد الصالحين المشهورين، وبه اقتدى صاحب أربل"

یعنی سب سے پہلے میلاد منانے کا فعل ملا عمر بن محمد نے، جو مشہور نیک آدمی تھا، شروع کیا۔

واضح رہے یہ بدعت قریباً ۶۰۴ھ میں ایجاد ہوئی۔ ملا عمر بن محمد موصل کے رہنے والے تھے۔ اربل موصل کے قریب ہے، یہاں کے رئیس ابو سعید مظفر الدین ابو الحسن علی بن سبکتگین نے اسے بہت نمایاں کیا اور اس بدعت کو بہت فروغ دیا۔ مورخ ابن خلکان ملک مظفر الدین کوبوری کے بہت ہی ممنون معلوم ہوتے ہیں کہ انھوں نے اسے کافی پھیلا کر ذکر کیا ہے اور اس کے محاسن میں لکھتے ہیں:

"لم يكن له لذة سوى السماع فإنه كان لا يتعاطى المنكر" (ابن خلكان: ۲/ ۲۳۶)

''وہ سماع سے محظوظ ہوتا تھا اور برائیوں کو پسند نہیں کرتا تھا۔''

اس کے بعد ابن خلکان نے محفلِ میلاد کا مبسوط تذکرہ مزے لے لے کر کیا ہے، فرماتے ہیں:

اوائلِ محرم میں بغداد، موصل، جزیرہ، سنجار، نصیبین اور عجم کے شہروں سے فقیہ، صوفی، واعظ، قاری اور شاعر آنے شروع ہو جاتے تھے اور ملک مظفر الدین ان کے لیے چار چار پانچ پانچ منزل لکڑی کے خیمے لگواتا تھا۔ سب سے بڑا خیمہ بادشاہ کا ہوتا۔ باقی ارکانِ دولت کے خیمے ہوتے اور اوائلِ صفر میں انھیں سجایا جاتا۔ مغنی اور ڈراما کرنے والے، مختلف قسم کے کھلاڑی یہاں فروکش ہوتے اور لوگ کاروبار ترک کر کے ان محفلوں میں مشغول ہو جاتے۔ بادشاہ ہر خیمے کے پاس سے عصر کے بعد گزرتے، گانا سنتے اور ڈرامے دیکھتے۔

تمام رات گانا سننے کے بعد صبح شکار کے لیے چلے جاتے اور میلاد ایک سال ۸ ربیع الاول کو مناتے اور ایک سال ۱۲ ربیع الاول کو۔ یہ اس لیے کہ آنحضرت ﷺ کی ولادت میں اختلاف ہے۔ پھر اونٹ اور گائے اور بکریاں سجا کر نکالتے اور ان پر طبل اور گانے بجانے کا سامان لاد کر میدان میں لے آتے، پھر انھیں ذبح کر کے پکانا شروع کر دیتے، پھر میلاد کی رات سماع کی محفلیں گرم ہوتیں اور شمعیں جلائی جاتیں۔ میلاد کی صبح صوفی صاحبان کو قطاروں میں کھڑا کر کے ان کے سروں پر خلعتوں کے بُگچے رکھ دیتے اور بادشاہ لکڑی کے خیمہ لگانے والوں اور صوفی صاحبان اور ان کے ساتھ فوجوں کا نظارہ دیکھتے۔ (۲/ ۴۳۷)

اس بادشاہ کے عہد میں ابو الخطاب عمرو بن دحیہ بن خلیفہ نے ایک کتاب "التنوير في مولد السراج المنير"

لکھی، جس میں موضوعات اور اکاذیب جمع کیے اور ایک ہزار روپیا انعام پایا۔

یہ کوکبوری جب حلوہ یا کوئی میوہ کھاتے تو بقیہ ان صوفی نقرا اور شیوخ کو بھیج دیتے اور اکیلے کھانا پسند نہیں کرتے تھے۔ مظفر الدین کوکبوری کا انتقال ۶۳۰ھ میں ہوا۔ یہ بدعت ساتویں صدی ہجری کے شروع میں یا چھٹی صدی کے آخر میں شروع ہوئی۔ حافظ ابن کثیر نے ۶۳۰ھ کے واقعات میں مظفر الدین کوکبوری کے تذکرے میں وہاں کے بعض مصارف کا ذکر کیا ہے، پانچ ہزار جانور بھنا ہوا، دس ہزار مرغی، ایک لاکھ پرند، تیس ہزار پلیٹ حلوہ شریف اور بڑے بڑے صوفی صاحبان اس محفل میں شریک ہوتے۔ ظہر سے صبح تک قوالی ہوتی، صوفی صاحبان قوالی سنتے اور ناچتے۔

ابن کثیر فرماتے ہیں: مظفر الدین اس محفل پر ہر سال تیس ہزار دینار صَرف کرتے تھے۔[1]

کوکبوری ''سنت'':

مروجہ محفلِ میلاد آنحضرت ﷺ یا صحابہ رضی اللہ عنہم سے ثابت نہیں، البتہ اس کو مظفر الدین کوکبوری اور ملا عمر بن محمد کی سنت سمجھنا چاہیے، نیز یہ امید رکھنی چاہیے کہ اس میں مزید کچھ اضافے ہوئے ہوں گے۔ کوکبوری نے تو اتنا کرم کیا کہ شہر سے باہر میدان میں یہ میلا رچایا، جس کا جی چاہا چلا گیا، جس نے ناپسند کیا، نہ گیا۔ اب بازاروں کا چکر کاٹنا، یہ اضافہ غالباً مرحوم عبدالمجید قرشی مقیم پٹی نے کیا۔ اور ہمارے ملا حضرات نے آنحضرت ﷺ کی مسجد کی شبیہ اور قوالیوں کے ساتھ فلمی گانوں کا اضافہ کر کے اس تماشے کو دو آتشہ کر دیا ہے۔ حکومت نے ملا حضرات کے لیے کھانے کا تو انتظام نہیں کیا، البتہ اسے جاہل امیروں کے سپرد کر کے خود الگ ہوگئی، اور صورت یہ ہوگئی ہے کہ کوکبوری سنت پر عمل فرماتے ہوئے اس میں ناچ اور رقص کا اور اضافہ ہوگیا اور بڑے بڑے سفید ریش ملا صاحبان بیل گاڑیوں پر تشریف رکھے ہوئے ناچتے اور رقص کرتے ہیں!!

دور اندیش اہلِ علم:

اس پر جہاں گوشت اور حلوے کے عاشق کوکبوری سنت پر عمل کرتے ہوئے اربل کی اس محفل میں شکم پروری کے لیے پہنچے تھے، وہاں دور اندیش اور سنتِ نبوی پر عمل کے عاشق اس ہنگامۂ لحم وحلوے کے خلاف تنقید کا بھی فرض انجام دے رہے تھے، مثلاً: علامہ ابن الحاج اور شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور حافظ ابن القیم رحمہ اللہ اور علامہ شاطبی مولف ''الاعتصام'' وغیرہم رحمہم اللہ۔

امام ابو عبداللہ محمد بن محمد العبدری (المتوفی ۷۳۷ھ) المعروف بابن الحاج نے اس بدعت کے متعلق

---

[1] البدایة والنهایة (۱۳/ ۱۳۷)

تفصیلاً لکھا ہے اور ساتویں صدی کے اواخر تک محفلِ میلاد کے ضمن میں جس قدر بدعات رونما ہو چکی تھیں، ان کا مفصل تذکرہ فرمایا ہے:

"فصل في المولد: ومن جملة ما أحدثوه من البدع مع اعتقادهم أن ذلك من أكبر العبادات و إظهار الشعائر: ما يفعلونه في شهر ربيع الأول من المولد، وقد احتوى على بدع و محرمات جملة، فمن ذلك استعمالهم المغاني، ومعهم آلات الطرب من الطار المصرصر والشبابة وغير ذلك مما جعلوه آلة للسماع..." (المدخل لابن الحاج: ١/ ٢٦١)

''لوگوں کی پیدا کردہ بدعات سے ایک بدعت محفلِ مولد بھی ہے، جسے یہ ربیع الاول میں رچاتے ہیں اور محفلِ قوالی کے علاوہ طنبور طار اور دوسرے گانے بجانے کے آلات استعمال کرتے ہیں، جو محرمات میں شامل ہیں۔''

دوسرے مقام پر فرماتے ہیں:

"وقد تقدم أنه إذا أطعم الإخوان ليس إلا بنية المولد، إن ذلك بدعة"

''بعض لوگ اس گانے بجانے کے بجائے قرا اور فقرا کو کھانا کھلاتے ہیں، لیکن یہ کھانا مسکین کی خدمت کے ارادے سے نہیں، بلکہ مولد کی نیت سے ہوتا ہے، لہٰذا یہ بھی بدعت ہے۔''

''بعض لوگ اس دن بخاری پڑھتے ہیں۔ گو حدیث پڑھنا پڑھانا عمل ہے، لیکن خاص اسی دن میں اس نیت سے کیا جائے تو یہ بھی بدعت ہے۔''

''بعض لوگ بعض رسوم اور مسرت کے مواقع پر اپنے دوستوں کو تنبول کے طور پر روپے دے دیتے ہیں، اب واپس مانگتے شرماتے ہیں تو وہ محفلِ میلاد کے بہانے سے اپنا روپیا وصول کرتے ہیں۔''

اس کے بعد ابن الحاج نے مولد کے بہانے سے جمع زر کی کئی قسمیں بیان فرمائی ہیں اور ان سب کو بوجوہ حرام اور گناہ لکھا ہے۔ (ص: ۲۸۰)

اس کے علاوہ بھی بہت سے علما نے اس عمل کو بدعت اور حرام لکھا ہے۔ اگر ضرورت ہوئی تو اس کی تفصیل کسی دوسرے موقع پر دی جائے گی۔

معلوم ہو چکا ہے کہ ساتویں صدی کے آغاز ۶۰۴ھ میں یہ بدعت شروع ہوئی۔ صدی ختم ہونے تک اس میں بیسیوں قسم کے منکرات پیدا ہو گئے اور پھر برسوں تک یہ بدعت متروک رہی۔ اب انگریز کے آخری دور میں

ہندوؤں کے بزرگوں کے جنم دن کی تقلید میں اسے پھر سے شروع کیا گیا۔ حکومت نے لاعلمی کی وجہ سے اسے دین کا مسئلہ سمجھ کر اس میں نیم سا تعاون کیا۔ اب ملا حضرات نے پھر اسی پیٹ کے دھندے کو اپنا کر پیٹ اور محفل کی رونق کا سامان مہیا کر دیا ہے، حالانکہ آج کل اس میں اور مفاسد پائے جا رہے ہیں، مثلاً: عورتوں کی بے آبروئی اور فواحش کی گرم بازاری، اس طرح یہ محفل بدکاری کا پیش خیمہ بن رہی ہے اور آنحضرت ﷺ کے ساتھ عقیدت کے نام پر فسق و فجور کو رواج دیا جا رہا ہے۔

کم علم ملا حضرات اپنے انتقامی جذبات کی تسکین بھی اسی بہانے سے کر لیتے ہیں۔ بیل گاڑیوں پر بیٹھ کر اہلِ توحید کی مساجد اور مجالس کے سامنے ہنگامہ آرائی کر کے بداخلاقی کا ثبوت دیتے ہیں اور یہ سب کچھ حکومت کے تعاون کی آڑ میں ہو رہا ہے۔

میرے نزدیک یہ فعل بدعت ہے، اس میں کتنی بھی تقدیس پیدا کرنے کی کوشش کی جائے، میں اسے گناہ سمجھتا ہوں، لیکن ہم ایسے اسلامی ملک میں رہ رہے ہیں، جس کے حکام اور اربابِ اقتدار اسلام کی تعلیمات سے بے خبر ہیں۔ یہاں ان بدعات کو اسلام پسندی کے ثبوت میں پیش کیا جاتا ہے، پھر اس میں فواحش کا ارتکاب ہوتا ہے اور ہم ان کو بجبر روکنے پر قادر نہیں۔

اندریں حالات اصل مطالبہ تو ہمارا یہی ہے کہ مسلمانوں کی حکومتِ پاکستان کو اسلام کے خلاف سب چیزیں بند کر دینی چاہئیں، لیکن عوام اگر اپنے کم علم مولویوں کے بہکاوے میں آ کر ان غیر اسلامی اشغال و اعمال کو ''اسلامی'' قرار دینے پر ہی مصر ہیں تو حکومت میں پڑھے لکھے لوگ بھی آخر موجود ہیں، انھیں اصل حقیقت کو سمجھ کر اس پر عمل کرانے کے لیے انتظامیہ کی مشینری کو حرکت میں لانا چاہیے، لیکن ظاہر ہے کہ اربابِ اقتدار کو مذکورہ بالا ظاہر و باہر بات کا موجودہ حالات میں باور کرانا سخت مشکل ہے، اس لیے پچھلے دنوں میں نے ایک پریس کانفرنس بلا کر نفسِ مسئلہ سے قطع نظر صرف معاشرتی نقطہ نظر سے اربابِ اقتدار کو جھنجھوڑنے کی غرض سے چند تجاویز پیش کیں، جن سے مقصد یہ تھا کہ اس گناہِ عظیم کو کسی وجہ سے حکومت اگر فوری طور پر روک نہیں سکتی تو اس کو کم از کم اپنے اور ہر شریف آدمی کے نقطۂ نگاہ ہی سے دیکھنا چاہیے کہ اس میں بدعات کے ساتھ شرک اور فواحش کی دن بدن کثرت ہوتی جا رہی ہے اور بہت سی قومی دولت بھی ضائع کی جا رہی ہے، سرِدست اس پر ہی قدغن لگائی جائے۔

نیز ان بدعاتِ شنیعہ سے بدکاری اور عریانی کے ان نئے رجحانات کو بھی خارج کیا جائے، تاکہ برائی کے دلدادہ اور بدقماش افراد کو کھل کھیلنے کا موقع نہ مل سکے۔

علاوہ ازیں ان بدعات کی تبلیغ و اشاعت ایسے انداز سے جاہل ملاؤں کا ایک طبقہ کرتا ہے، جس سے

مسلمانوں میں تفرقہ بڑھتا ہے اور فرقہ وارانہ تعصب کی آبیاری ہوتی ہے اور "ظلمات بعضها فوق بعض" کے مصداق برائی کی تہوں میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔

لیکن افسوس ہے کہ اولاً تو پریس نے ہم سے تعاون نہیں کیا اور جس نے کیا بھی تو اس نے میری تجاویز کو ایسے عجیب وغریب انداز میں شائع کیا، جو میرا مقصد نہ تھا، جس سے بہت مغالطے پیدا ہو گئے۔ خود ہمارے اپنے آرگن نے ان تجاویز کی اشاعت میں نہ صرف یہ کہ احتیاط نہیں کی، بلکہ اس میں غلطیاں بھی کیں۔

مثلاً ''الاعتصام'' میں میری طرف منسوب بیان میں لکھا کہ ''پہلے قوالی نہیں ہوتی تھی۔'' حالاں کہ جیسا کہ آپ نے ملاحظہ فرمایا، کوکبوری صاحب نے، جو اول المبتدعین تھے، قوالی اور قوالی جیسی حرکتوں کو محافلِ میلاد میں لازم رکھا، جسے وہ شوق سے سنتا تھا۔

اس ضمن میں میری رائے بالکل واضح ہے کہ عوام کے سامنے میلاد کی محفلوں کے بدعت ہونے کی وضاحت تقریروں اور تحریروں کے ذریعے سے ضرور کی جائے، اور بحمد اللہ ہماری جماعت نے بالخصوص ہمیشہ کی ہے، لیکن جو لوگ اس بدعت کو چھوڑنے کے لیے کسی طرح تیار نہ ہوں تو ان کو اس پر آمادہ کرنے کی کوشش کی جانی چاہیے کہ خدا کے لیے فواحش، عریانی، قومی دولت کے ضیاع اور تفرقہ پردازی سے تو یہ ''عاشقانِ رسول'' ان محفلوں کو بچائے رکھیں!! ع

اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا[1]

---

[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۴ ستمبر ۱۹۶۴ء)

حرمِ مکہ اور اُس کے تاریخی حوادث

﴿ إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَهُدًى لِّلْعَالَمِينَ ﴾ [آل عمران: ٩٦]

''اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے جس گھر کی سب سے پہلے بنیاد رکھی گئی، وہ مکہ میں ہے، اس میں دنیا والوں کے لیے برکت اور ہدایت ہے۔''

حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے آنحضرت ﷺ سے دریافت کیا: سب سے پہلے دنیا میں کس مقام کی بنیاد رکھی گئی؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''مسجدِ حرام کی''۔ میں نے عرض کیا: اس کے بعد؟ فرمایا: ''مسجد اقصیٰ کی۔'' میں نے عرض کیا: ان دونوں میں کس قدر مدت تھی؟ فرمایا: ''چالیس سال۔'' میں نے عرض کیا: اس کے بعد کونسی مسجد تعمیر ہوئی؟ فرمایا: ''اس کے بعد ساری دنیا مسجد ہے، جہاں وقت آ جائے نماز پڑھ لو۔''[1]

(بخاري، مسلم، ابن کثیر: ١/ ٢٥٣، فتح البیان: ٢/ ٧٧)

ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: اس کی تعیین آسمان کی پیدائش سے بھی دو ہزار سال پہلے کی گئی۔

(فتح البیان: ٢/ ٧٧)

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: مکان پہلے بھی تھے، لیکن عبادت اور ذکرِ الٰہی کے لیے سب سے پہلے اسی مسجد کی تخصیص کی گئی ہے۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اور حضرت علی کے آثار میں اختلاف ہے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما تمام دنیا میں پہلا مکان مسجدِ حرام کو سمجھتے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خیال میں معابد اور مساجد سے تقدم مسجدِ حرام کو ملا اور اس کے چالیس سال بعد مسجدِ اقصیٰ کی بنیاد رکھی گئی۔[2]

ایک مرفوع حدیث عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، جس میں صراحت ہے کہ بیت اللہ کی پہلی تعمیر حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا نے کی۔ یہ حدیث ابن لہیعہ کے تفردات سے ہے۔ اہلِ حدیث کے نزدیک بلحاظِ سند اس کی کوئی اہمیت نہیں۔[3] حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ارشادِ گرامی اقرب الی الفہم ہے کہ عبادت اور ذکر کے لیے سب سے پہلے یہی گھر متعین فرمایا گیا۔

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٣١٨٦) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٥٢٠)

[2] دیکھیں: تفسیر ابن کثیر (١/ ٥٠٨)

[3] دیکھیں: تفسیر ابن کثیر (١/ ٥٠٨)

تعمیرِ اول کے متعلق آثار میں اختلاف ہے۔ بعض میں ملائکہ کا ذکر ہے اور بعض میں حضرت آدم علیہ السلام کا۔ تعمیر کرنے والا کوئی ہو، بہر حال یہ تعمیر حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پہلے کی ہے۔ اس تعمیر کے چالیس بعد بیت المقدس کی تعمیر عمل میں آئی۔ اس سے صحیح بخاری کی حدیث کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے، ورنہ حضرت ابراہیم اور حضرت داود کی تعمیر میں تو صدیوں کا فرق ہے۔

اس پر طوفان کا اثر:

اس کے بعد طوفانِ نوح کی وجہ سے یہ عمارت بالکل ناپید ہوگئی اور اس کا کوئی نام و نشان باقی نہ رہا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب ان میں توحید کی اشاعت شروع فرمائی، قوم نے مخالفت کی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام فلسطین پہنچے، حضرت اسماعیل پیدا ہوئے، حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی دونوں بیویوں (سارہ اور ہاجرہ علیہما السلام) میں ناچاقی ہوگئی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے احکامِ الٰہی کے مطابق حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کو حجاز کی غیر آباد سرزمین میں آباد کیا۔ حکمتِ الٰہی کا تقاضا تھا کہ فاران کی چوٹیاں اور صفا و مروہ کی وادیاں اس کے نور سے جگمگائیں اور خدا تعالیٰ کے نوشتے ان وادیوں کے متعلق پورے ہوں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کو مسجدِ حرام کے پاس ٹھہرایا۔ اس مختصر اور مخلص کنبے کو اس اجاڑ اور بے آب و گیاہ میدان میں چھوڑا۔ حضرت ہاجرہ علیہا السلام نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو واپس ہوتے دیکھ کر دریافت کیا: "آللّٰه أَمَرَكَ بِهٰذَا؟" (کیا یہ اللہ کا حکم ہے؟) حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: "نَعَمْ" (ہاں)۔ متوکل بیوی نے فرمایا: "إِذاً لَا يُضَيِّعُنَا"[1] (یعنی وہ ہمیں اس وقت برباد نہیں فرمائے گا)۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام مختلف اوقات میں یہاں آتے جاتے رہے اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ہدایات دیتے رہے۔ اسی اثنا میں کعبۃ اللہ کی تعمیر ہوئی۔ ابو القاسم سہیلی فرماتے ہیں:

"بیت اللہ جہاں اس وقت تعمیر ہے، یہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی رہایش گاہ اور ان کی بکریوں کا باڑہ تھا۔"[2]

اسی اثنا میں ذبح کا واقعہ پیش آیا اور قربانی کی سنت قائم فرمائی گئی۔ ان ہی ایام میں جرہم اور ان کے چچیرے بھائی قطورا یہاں آکر آباد ہوگئے۔ حضرت ہاجرہ نے اس شرط پر آبادی کی اجازت دی کہ "لَا حَقَّ لَكُمْ فِي الْمَاءِ"[3] کہ زمزم کے چشمے میں تمھیں ملکیت کے حقوق نہیں ہوں گے، اس شرط پر یہاں آباد ہوگئے۔ یہ لوگ یمن میں باہمی لڑائیوں سے تنگ آکر نکلے تھے۔ یہاں پر پانی کا مستقل اور دوامی انتظام دیکھ کر آباد

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣١٨٤)

[2] الروض الأنف (ص: ٣٣٥)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٢٣٩)

ہوگئے۔ سہیلی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ جرہم نے موجودہ مکے کی مشرقی جانب ڈیرے ڈال دیے اور قطورا نے نیچے کے حصے میں رہنا شروع کیا اور موجودہ حرم کا جوار حضرت اسماعیل علیہ السلام کے حصے میں آیا۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام نے جرہم میں دو شادیاں کیں۔ جرہم اور قطورا نے اپنے اپنے مقام پر قبائلی انداز کی دو حکومتیں قائم کر لیں اور پورے ٹھاٹھ سے رہنے لگے۔

جرہم کے سردار کا نام مضاض بن عمرو تھا اور قطورا کے بادشاہ کا نام سمیدع تھا۔ بنو اسماعیل کا تعلق قدرتی طور پر جرہم سے رہنا چاہیے تھا۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بیٹے کا نام نابت تھا۔ نابت بن اسماعیل کے زمانے تک بیت اللہ کا نظم و نسق بنو اسماعیل میں رہا۔ زمزم اور بیت اللہ کی یہی لوگ نگہداشت کرتے رہے۔ حافظ ابو القاسم سہیلی کی تحقیق کے مطابق اس وقت بیت اللہ قدِ آدم بلا سقف دیواریں تھیں۔

بنو جرہم اور بیت اللہ:

بنو اسماعیل کے بعد بیت اللہ کی صیانت و حفاظت بنو جرہم کی طرف منتقل ہوگئی، بالآخر بنو جرہم نے بیت اللہ کی صیانت کو شکم پروری کا ذریعہ بنا لیا۔ بیت اللہ کی خدمت اور حفاظت کے لیے جو صدقات بیت اللہ کے خزانے میں جمع تھے، خود کھا گئے۔ بیت اللہ کے سامنے ایک گڑھا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس لیے بنایا تھا کہ لوگ اس میں کعبہ کے لیے ہدیے ڈال دیا کریں۔ اسی میں سونے کی کافی مقدار جمع تھی۔ بنو جرہم یہ سب کچھ کھا گئے۔ یہ بالکل وہی طریقہ تھا جو آج کل ہمارے خانقاہی نظام میں ہو رہا ہے۔ مجاور خانقاہوں کی آمدنی پر گزر بسر کرتے ہیں، حالانکہ لوگ ہدایا وہاں آنے والے غربا اور مساکین کے لیے دیتے ہیں۔ استخوان فروشی اور صدقات خوری ہمارے خانقاہی نظام میں معزز مشغلہ ہے۔ یہی کچھ بنو جرہم نے کیا۔ بنو اسماعیل دب چکے تھے۔ ان کے لیے خاموشی کے سوا چارہ نہ تھا۔

اس بدنظمی اور بے اعتدالی کی وجہ سے زمزم کا کنواں بھی بند ہوگیا۔ حضرت اسماعیل کی یادگار یہ چشمۂ فیض بھی جرہم کے دورِ استبداد میں بھر دیا گیا۔

جرہم اور بنو خزاعہ میں جنگ:

اسی اثنا میں جب کہ بنو جرہم حرمِ کعبہ میں بدعنوانیاں کر رہے تھے، یمن میں سد مآرب (یمن کا پُل) ٹوٹ گیا، اس پُل میں برساتی چشموں کا پانی جمع رہتا تھا، جس سے یمن کی زمین سیراب ہوتی تھی، جس کا تذکرہ قرآنِ عزیز نے سورت سبا میں فرمایا ہے۔[1] یمن کی قبائلی رقابتوں کی وجہ سے اس پُل کی مرمت کئی سال تک نہ

[1] دیکھیں: سورۃ سبأ [آیت: ١٦]

ہو سکی۔ بالآخر یہ پُل ٹوٹ گیا اور یمن کی سرسبز اور شاداب بستیوں اور باغوں کو بہا کر لے گیا، اور یمن کے بادشاہ اور کھاتے پیتے لوگ وہاں سے بھاگ نکلے، اور کسی دوسرے وطن کی تلاش کرنے لگے۔

قبیلہ خزاعہ کا سردار حارثہ بن ثعلبہ مع قبیلہ حجاز کی پہاڑیوں میں آ نکلا۔ پانی کے جانور دیکھ کر اسے محسوس ہوا کہ ان خشک پہاڑوں میں پانی کی سوتیں معلوم ہوتی ہیں، چنانچہ صفا و مروہ کے پاس پہنچے تو پانی کا دائمی چشمہ دیکھا۔ بنو جرہم کے سرداروں سے عرض کیا کہ وہ عارضی طور پر انھیں یہاں ٹھہرنے کی اجازت دیں، وہ اپنا آدمی کسی وطن کی تلاش میں بھیجیں گے، جس وقت مناسب ٹھکانا مل گیا، وہ یہاں سے چلے جائیں گے۔ یہ بات معمولی تھی، لیکن جرہم کے سرداروں نے ان کی درخواست کو ٹھکرا دیا اور بڑے غلط لہجے سے اس عرضداشت کو مسترد کر دیا۔

حارثہ بن ثعلبہ خزاعی کو یہ اندازِ گفتگو بے حد ناگوار گزرا اور اس نے حالات کی ناسازگاری اور وطن سے غربت کے باوجود فیصلہ کیا کہ وہ بنو جرہم سے لڑے گا اور کسی قیمت پر وہ حجاز سے نہیں جائے گا، چنانچہ دونوں طرف سے قبائلی لشکر مسلح ہو کر نکلے۔ جنگ میں بنو جرہم کو شکست ہوئی اور خزاعہ حرمِ مکہ پر قابض ہو گئے اور بنو جرہم کو مکہ مکرمہ سے بالکل نکال دیا اور قتلِ عام کیا، اس جنگ میں بنو اسماعیل بالکل غیر جانبدار رہے، انھوں نے دونوں میں سے کسی کی اعانت کی نہ ہی کسی کی مخالفت کی، اور خزاعہ بلا مزاحمت حرم پر قابض ہو گئے اور جرہم کے بقیۃ السیف مع حارث بن مضاض مقام قنونا میں اقامت پذیر ہوئے۔ جرہم اور خزاعہ میں اس قدر عداوت بڑھی کہ ایک دفعہ حارث بن مضاض کا اونٹ کھو گیا، وہ اس کی تلاش میں حرمِ مکہ میں آیا تو عمرو بن لحی نے اعلان کیا کہ جہاں کوئی جرہمی ملے، اسے قتل کر دیا جائے۔ حارث بھاگ کر حرم کی حد سے نکل گیا اور اس کا اونٹ ذبح کر کے تقسیم کر دیا گیا۔ حارث کے سامنے پرانی یادیں تازہ ہو گئیں، بیت اللہ میں اپنی حکومت کا نقشہ سامنے آ گیا، اس نے آج کی بے کسی کا موازنہ کرتے ہوئے کہا ؎

كأن لم يكن بين الحجون إلى الصفا
أنيس ولم يسمر بمكة سامر

"مجھے حجون سے صفا تک کوئی آشنا نہ ملا اور نہ ہی مکے کے کسی قصہ گو سے ملاقات ہوئی۔"[1]

یہ عمرو بن لحی وہی ہے جس نے بیت اللہ میں بت پرستی کو رواج دیا، اس ملعون کو آنحضرت ﷺ نے معراج کی رات جہنم میں دیکھا۔ پیٹ کی انتریوں کے بل، کولھو کے بیل کی طرح چکر کاٹ رہا تھا۔[2]

یہ پہلا شخص ہے جس نے توسل کا غلط مفہوم سمجھا اور توسل کو عبادت غیر اللہ کا ذریعہ بنایا۔ آج بھی اس

---

[1] دیکھیں: البداية والنهاية (١٠/ ١٩٧)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٣٣٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٥٦)

کے سیکڑوں شاگرد دنیا میں موجود ہیں، جو دنیا کو شرک کی تعلیم دے رہے ہیں اور عوام بچارے اسے توسل شمار کر رہے ہیں۔

وکم من عائب قولا صحیحاً   وآفته من الفهم السقیم ①

بنائے کعبہ مختلف ادوار میں:

اگر حضرت آدم علیہ السلام کو بیت اللہ کا بانی اول مان لیا جائے تو آج تک کعبہ کی تعمیر چھے دفعہ ہو چکی ہے:

پہلے معمار: آدم علیہ السلام۔

دوسرے معمار: شیث علیہ السلام۔

تیسرے معمار: حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام۔

چوتھے معمار: ساداتِ قریش۔

یہ تعمیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کے بعد ہوئی، یعنی آنحضرت کی بعثت سے پانچ سال پہلے۔ اسی تعمیر میں حجرِ اسود کے رکھنے پر روسائے قریش کے باہم تصادم کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کمال دانش مندی سے مصالحت کی صورت پیدا فرما دی۔ عليه ألف ألف تحية وسلامٌ.

اس وقت کفارِ مکہ کو بیت اللہ کی تعمیر میں بعض مشکلات پیش آئیں، انھوں نے عہد کیا کہ بیت اللہ پر حلال روپیا خرچ کیا جائے۔ سود اور غلط ذرائع سے کمایا ہوا روپیا بیت اللہ پر نہ لگایا جائے، اس لیے روپیا بہت کم مل سکا، تعمیر کے اخراجات میں دقت پیدا ہو گئی۔

پھر لکڑی ملنا مشکل ہو گئی۔ چھت کے لیے تلاش کے باوجود حسبِ منشا لکڑی نہ مل سکی۔ اتفاقاً جدہ کی بندرگاہ پر رومی تاجر آئے، ان کی کشتی ٹوٹ گئی۔ یہ کشتی آبنوس سے بنائی گئی تھی۔ ان سے یہ لکڑی خریدی گئی، لیکن یہ لکڑی پوری چھت کے لیے کافی نہ تھی۔ ان وجوہ کی بنا پر سات ہاتھ جگہ زیرِ تعمیر مکان سے خارج کر دی گئی، جو آج کل حطیم یا حجر کے نام سے مشہور ہے۔ اسی میں میزابِ کعبہ اترتا ہے، جو ادعیہ کی قبولیت کا مقام ہے۔

پانچویں معمار: عبداللہ بن زبیر۔

حضرت عبداللہ بن زبیر کی خلافت میں بیت اللہ جل گیا تھا۔ حریق کی وجہ سے اس کی دیواریں بالکل بوسیدہ ہو گئی تھیں، اس لیے عبداللہ بن زبیر نے از سرِ نو تعمیر کا فیصلہ کیا۔

حافظ ابو القاسم سہیلی نے اس حریق کے دو سبب ذکر کیے ہیں:

اول یہ کہ جبل ابو قبیس سے ایک چنگاری آئی، جس سے غلافِ کعبہ جلنے لگا، اس آگ نے دیکھتے دیکھتے

① کتنے لوگ صحیح بات کی عیب جوئی کرنے والے ہوتے ہیں، جبکہ ان کی اصل مصیبت کم عقلی ہوتی ہے۔

پوری عمارت کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

دوسری وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ ایک عورت مجمر میں عود جلا کر لائی، تا کہ غلاف کعبہ کو خوشبو لگائے، اس مجمر سے غلابِ کعبہ کو آگ لگ گئی۔[1]

تیسری وجہ یہ بھی بتائی گئی ہے کہ حجاج بن یوسف کی منجنیق کی آتش بازی سے کعبہ جل گیا۔

یہ الگ تحقیقی بحث ہے کہ کعبہ کیسے جلا؟ کس نے جلایا؟ بہر کیف یہ حریق ایسا تھا کہ تجدیدِ تعمیر کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ بعض اہل الرائے کا اس وقت بھی خیال تھا کہ صرف مرمت کرا دی جائے اور از سر نو تعمیر نہ کی جائے، کیونکہ اس کے لیے بیت اللہ کو گرانا پڑے گا، جسے وہ پسند نہیں کرتے تھے، لیکن عبداللہ بن زبیر نے آخری فیصلہ فرمایا کہ پوری عمارت بدل دی جائے، چنانچہ دیواریں بنیادوں تک گرا دی گئیں اور قواعدِ ابراہیمی پر تعمیر شروع کی گئی۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے: قریش کی بدگمانیوں کا خطرہ نہ ہوتو میں کعبہ کا نقشہ بدل دوں، حطیم کو اصل عمارت میں شامل کر دوں، مشرق اور مغرب کی طرف دروازے کھول دوں، تا کہ آنے جانے والوں کی وجہ سے ازدہام نہ ہو۔ لوگ ایک طرف سے داخل ہوں اور دوسری طرف سے نکل جائیں اور دروازے زمین کی سطح سے ملا دیے جائیں، تا کہ داخلے کے لیے سیڑھی کی ضرورت نہ رہے۔[2]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بعض مصالح کی بنا پر یہ اہم تبدیلی نہ فرما سکے۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کے سامنے اس قسم کا کوئی کھٹکا نہ تھا، انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پسندیدہ نقشے کے مطابق تکمیل فرما دی۔ رضي اللّٰه عنه وأرضاه.

چھٹے معمار: عبدالملک بن مروان۔

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما عمارت ختم کر چکے، خلیفہ یزید بن معاویہ رضی اللہ عنہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ عبدالملک بن مروان کے حکم سے حجاج بن یوسف نے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کے خلاف لشکر کشی کی۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما شہید ہوئے۔ حجاج نے تعمیرِ کعبہ کے متعلق عبدالملک بن مروان سے مشورہ کیا۔ عبد الملک نے کہا: ''لسنا من تخليط أبي خبيب في شيء'' ہم ابن زبیر رضی اللہ عنہما کی غلط کاریوں کے ذمے دار نہیں۔ کعبہ کو اسی طرح تعمیر کیا جائے، جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تھا، ابن زبیر رضی اللہ عنہما کی جدید اصلاحات کو بدل دیا جائے۔

حافظ سہیلی اور ابن کثیر کے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے، یہ پورے کعبہ کی تعمیر نہ تھی، بلکہ یہ ضروری اور اہم تبدیلیاں تھیں، جن سے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کی خصوصیات کو مٹا کر اہلِ مکہ کے نقشے کو قریباً قائم کر دیا گیا، یعنی سطح اونچی کر دی گئی، عقبی دروازہ بند کر دیا گیا اور حطیم کو خارج کر دیا گیا، باقی عمارت وہی ہے جو عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما

---

[1] الروض الأنف (ص: ٩٥)

[2] مصدر سابق.

نے تعمیر فرمائی تھی۔ حجاج اور عبدالملک کی چیرہ دستیوں کے باوجود اللہ تعالیٰ نے عبداللہ بن زبیر کا صدقہ جاریہ قائم رکھا۔ اس کے بعد حارث بن ابی ربیعہ نے عبدالملک کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث سنائی تو اُسے افسوس ہوا کہ اگر حدیث کا علم اسے پہلے ہو جاتا تو عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کے نقشے کو بدستور قائم رہنے دیتا۔[1]

ساتواں معمار: ابو جعفر خلیفہ منصور کا خیال ہوا کہ وہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کی طرح بیت اللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اساس پر قائم کر دے، لیکن حضرت امام مالک رضی اللہ عنہ آڑے آگئے اور فرمایا:

"أنشدك الله يا أمير المؤمنين أن تجعل هٰذا البيت ملعبة للملوك بعدك"

(الروض الأنف: ١/ ١٢٨)

"امیر المومنین! آپ بیت اللہ کو آنے والے بادشاہوں کے لیے کھیل نہ بنائیں، ہر بادشاہ اسے گراتا اور بناتا رہے گا۔"

غرض اس وقت کی موجود عمارتِ کعبہ حجاج کی بعض ترمیمات کے ساتھ دراصل عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما ہی کی تعمیر ہے۔

توسیع اور ترمیم:

البتہ مختلف اوقات میں بیت اللہ کی توسیع ہوتی رہی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بہت سے مکانات خرید کر بیت اللہ کے صحن میں شامل فرما دیے۔ مزید توسیع حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمائی۔ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے توسیع بھی فرمائی اور اسے پختہ بھی کیا، اس کے بعد عبدالملک بن مروان نے مزید ترمیمات کیں اور ولید بن عبدالملک نے اس کی خوبصورتی میں اضافہ کیا، چھت درست کرا دی، میزاب کو پختہ کرایا اور سنگِ مرمر کا فرش لگوایا۔

۲۷۰ھ میں شامی دیوار کی ترمیم کی گئی، پھر ۵۴۲ھ، پھر ۶۱۹ھ، پھر ۶۷۸ھ، پھر ۸۱۴ھ میں اسی شامی دیوار میں مرمت کی ضرورت محسوس ہوئی۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں: اب ۸۲۲ھ میں میزاب قابلِ مرمت ہو رہا ہے، جس کا اہتمام ملک موید باللہ کر رہے ہیں۔

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں: میں نے ۸۲۴ھ میں حج کیا تو میں نے دیکھا کہ میزاب چنداں قابلِ ترمیم نہیں تھا۔ ۸۲۵ھ میں بیت اللہ کی چھت خراب ہوگئی تھی، یہاں تک کہ ۸۲۷ھ میں چھت کی پوری طرح مرمت کر دی گئی اور اسے سفید پتھر سے درست کرایا گیا۔ آخر میں حافظ فرماتے ہیں:

"ومما يتعجب منه أنه لم يتفق الاحتياج في الكعبة إلى الإصلاح إلا فيما صنعه الحجاج، إما من الجدار الذي بناه في الجهة الشاميه" الخ

(فتح الباري: ٣/ ٢٩١ مصر)

---

[1] مصدر سابق۔

''یہ عجیب اتفاق ہے کہ آج تک جس قدر ترمیم ہوئی ہے، وہ شامی دیوار اور میزاب وغیرہ میں ہوئی ہے، جسے حجاج نے بنایا۔ یمنی دیوار میں کبھی مرمت کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ زیب و زینت کے طور پر بادشاہ مختلف اوقات میں کچھ نہ کچھ کرتے رہے۔''

اس کے بعد بھی جہاں تک بیت اللہ کی اصلاح کا تعلق ہے، یہ سیاہ سادہ پتھر آج بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یاد کو تازہ کر رہے ہیں۔ تعمیر اور اصلاح و ترمیم میں امت نے اس کی سادگی کو قائم رکھا، ورنہ یہ عمارت سونے سے بنائی جا سکتی تھی، لیکن جو جذب اور کشش اس سادگی میں ہے، وہ آج کی حضری عمارتوں میں نہیں۔ یہ تاریخی یادگار بہتر ہے سادہ رہے، اس کے پتھروں کی سیاہی سیاہ دلوں میں جلا پیدا کر سکتی ہے۔ آج تک یہ عمارت اپنی سادگی کے باوجود دلوں کے لیے جاذب ہے اور معاصی کے لیے اسپنج۔ آج بھی یہ اپنی سادہ شان کے ساتھ قائم ہے۔

حال کی ترمیم اور تعمیر:

امامِ اہلِ سنت حضرت شیخ امام عبدالعزیز بن سعود رحمہ اللہ کے دورِ حکومت میں حرمِ مدینہ کے بعض ستون اپنی جگہ سے نیچے ہو گئے۔ امامِ حرم کی محبتِ نبوی ﷺ جوش میں آئی، کروڑوں روپیا خرچ فرما کر حرمِ مدینہ کو دنیا کی قابلِ دید عمارتوں کے لیے قابلِ رشک بنا دیا۔ سنا ہے بعض ملوک نے انھیں لاکھوں روپے کی اس فنڈ میں پیش کش کی، مگر انھوں نے یہ تمام بوجھ اپنی جیب پر برداشت فرمایا اور عملی نظیر قائم فرمائی کہ اہلِ توحید و سنت کو آنحضرت ﷺ کے ساتھ کس قدر محبت ہے، جبکہ ایک طبقے کی محبت صرف نذر و نیاز اور گانے تک محدود رہے۔ سچ ہے ؎

خلق الله للحروب رجالًا ورجالًا لقصعة وثريد

''کچھ لوگ میدانِ کارزار کے لیے پیدا کیے گئے ہیں اور کچھ حلوے اور گوشت کے لیے۔''

اس کے بعد جلالۃ الملک سعود بن عبدالعزیز۔أیدہ اللہ۔ نے حرمِ مکہ میں اضافہ فرمایا اور صفا و مروہ کے بازار تک حدودِ مسجد میں شامل فرما کر حجاج کے لیے ہر ممکن سہولت پیدا فرما دی۔ اللہ تعالیٰ حجاز پر اس محبِ توحید و سنت خاندان کی حکومت کو تا قیامت قائم رکھے۔ ان کے اور ان کے خلفا کو سنت اور توحید کی دلی محبت عطا فرمائے۔

سنا ہے شاہ سعود بیت اللہ کی تعمیر بہترین مہندسوں کی نگرانی میں کرا رہے ہیں۔ کروڑوں روپیا صَرف فرما رہے ہیں۔ کہتے ہیں اگر یہ عمارت حسبِ نقشہ تکمیل تک پہنچ گئی تو دنیا کے عجائبات سے ہوگی۔ خدا تعالیٰ اس کے شرف حرمت کو قائم رکھے۔

یہ تمام معلومات طبری (جلد ۱) ابن کثیر (جلد ۲) الروض الانف (ج ۱) فتح الباری (جلد ۳) فتح البیان (جلد ۲) تفسیر ابن کثیر (جلد ۲) سے ماخوذ ہیں۔[1]

---

[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۳۔۱۰ ارجون ۱۹۶۰ء)

ایک مثالی خاندان کی یادگار

﴿وَ اِذِابۡتَلٰۤی اِبۡرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ قَالَ اِنِّیۡ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا قَالَ وَ مِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ قَالَ لَا یَنَالُ عَهۡدِی الظّٰلِمِیۡنَ﴾ [البقرة: ١٢٤]

''اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو چند احکام دے کر آزمایا، وہ اس میں پورے اُترے تو فرمایا: میں نے تمھیں دنیا کی امامت بخش دی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: اور میری اولاد؟ فرمایا: ظالموں کو یہ انعام نہیں دیا جا سکتا۔''

حضرت ابراہیم علیہ السلام بابل میں پیدا ہوئے۔ آپ کی پیدائش ایک معزز خاندان میں ہوئی۔ توحید کے سوا اس خاندان میں دنیا کی ساری وجاہتیں موجود تھیں۔ دینی قیادت کے باوجود یہ لوگ توحید کے تصور اور صفاتِ باری کے فہم سے نا آشنا تھے۔ وہ بت پرست تھے، بت فروش تھے۔ یہ سب کچھ ہونے کے باوجود یہ حضرات خدا سے بے خبر تھے۔ وسائل کی تلاش، وسائل کی شناخت، انواع و اقسام کے وسائل کی ساخت ان کی معیشت کا جز تھا، اور یہ عجیب بات تھی کہ ان وسائل کے ذریعے جس ذات تک وہ پہنچنا چاہتے تھے، اس کی ذات اور اس کی صفات سے ناواقف تھے۔ مشرک قوموں میں یہ سب سے بڑی مصیبت ہے کہ وہ راہ کو منزل سمجھتے ہیں اور اسباب و ذرائع کو مقصد۔ بچارے ساری عمر سفر کر کے تھک جاتے ہیں اور منزل سامنے نہیں آتی۔

قرآنِ عزیز نے ان کی عملی زندگی کا ماحصل دو لفظوں میں واضح فرمایا ہے: ﴿عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ﴾ [الغاشية: ٣] وسائل کی پرستش کر کے تھک گئے اور منزل تک رسائی سے پہلے ہار گئے اور نتیجہ یہ ہوا کہ ساری کوشش غارت ہوگئی۔

﴿وَقَدِمۡنَاۤ اِلٰی مَا عَمِلُوۡا مِنۡ عَمَلٍ فَجَعَلۡنٰهُ هَبَآءً مَّنۡثُوۡرًا﴾ [الفرقان: ٢٣]

''ہم ان کے اعمال کو غبار کی طرح اُڑا دیں گے۔''

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا پورا خاندان اسی وسائل پرستی کا مریض تھا۔ معاشی مجبوریوں نے اسے اور بھی دو آتشہ کر دیا تھا، اور ان کی قوتِ ارادی حق کی تلاش سے محروم ہوگئی۔

اس وقت بعض لوگ بت پرستی کے ساتھ ستاروں کی پرستش بھی کرتے تھے۔ سورج اور چاند کو اپنی زندگی کے عوامل میں موثر اور متصرف یقین کرتے تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی گفتگو میں قوم کی ان دونوں کمزوریوں

کا علاج حکیمانہ اور حاکمانہ انداز سے فرمایا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اکیلے ہونے کے باوجود حضرت ابراہیم کو اپنی ذات پر پورا اعتماد تھا اور اپنی صداقت اور کامیابی پر پورا یقین۔ کس وثوق سے فرماتے ہیں:

﴿ تَاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ بَعْدَ اَنْ تُوَلُّوْا مُدْبِرِيْنَ ﴾ [الأنبياء: ٥٧]

''خدا کی قسم! میں موقع پاتے ہی تمھارے ان بتوں کا تیا پانچا کر دوں گا۔''

چنانچہ موقع پاتے ہی بتوں کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا:

﴿ فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا اِلَّا كَبِيْرًا ﴾ [الأنبياء: ٥٨]

''بڑے بت کے سوا سب کو ریزہ ریزہ کر دیا۔''

اپنے معبودوں کی یہ درگت دیکھ کر ان کا خیال فوراً حضرت ابراہیم کی طرف گیا:

﴿ سَمِعْنَا فَتًى يَّذْكُرُهُمْ يُقَالُ لَهٗ اِبْرٰهِيْمُ ﴾ [الأنبياء: ٦٠]

''ایک نوعمر لڑکا ابراہیم نامی ان ٹوٹے ہوئے بزرگوں کے متعلق کڑوی کسیلی باتیں کرتا تھا۔''

یہ سنتے ہی زعمائے قوم نے حکم دیا:

﴿ فَاْتُوْا بِهٖ عَلٰٓى اَعْيُنِ النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَشْهَدُوْنَ ﴾ [الأنبياء: ٦١]

''اس نوجوان کو سرِ مجلس لاؤ اور جھوٹی سچی شہادت قائم کرو۔''

تاکہ اگر کیس ثابت ہو جائے تو اسے سزا دی جائے۔ چنانچہ حضرت ابراہیم ان وسائل پرستوں کی عدالت میں پیش ہوئے۔ حضرت سے پوچھا گیا:

﴿ ءَاَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا يٰٓاِبْرٰهِيْمُ ﴾ [الأنبياء: ٦٢]

''ہمارے ٹھاکروں کے ساتھ یہ حرکت کس نے کی؟''

حضرت ابراہیم نے نہایت معقول اور برجستہ جواب دیا:

﴿فَسْـَٔلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ﴾ [الأنبياء: ٦٣]

''یہ حضرات اگر کچھ فرما سکتے ہیں تو یہی بتا دیں، انھیں کیا ہوا؟ کون توڑ گیا؟''

پنچایت سرنگوں ہوگئی۔ عدالت پر سکتہ طاری ہوگیا۔ حقیقت پسندی نے دامن تھام لیا۔ صحیح بات زبان پر آ گئی:

﴿لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هٰٓؤُلَآءِ يَنْطِقُوْنَ﴾ [الأنبياء: ٦٥]

''ابراہیم! تم جانتے ہو، یہ بیچارے بول تو نہیں سکتے۔''

اس حقیقت پسندانہ جواب کے بعد حضرات ابراہیم نے کس شانِ تمکنت کے ساتھ فرمایا ہوگا:

﴿أُفٍّ لَّكُمْ وَ لِمَا تَعْبُدُوْنَ﴾ [الأنبياء: ٦٧]

’’تمھاری اور تمھارے معبودوں کی حالت انتہائی افسوسناک ہے۔‘‘

ایسے خداؤں کو پوجتے ہو جو اپنی مظلومیت کی سرگزشت بھی نہیں سنا سکتے؟!

اس کے بعد عدالت نے جو فیصلہ کیا، معلوم ہے۔ ایسی عدالتیں یہی کچھ کیا کرتی ہیں، لیکن شانِ استغنا اور اقامتِ حجت اور قوتِ استدلال نے اس وقت کی قوتِ فکر اور فقہ و درایت کو ایک دفعہ جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ وہ عناد کے باوجود لاجواب ہوگئے۔

ہیاکلِ سماویہ:

بابل کے شرک پسند عقلا زمین کے اصنام و تماثیل کا جوڑ آسمان کے بتوں سے جوڑتے تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس طریقِ فکر کو بھی کاری ضرب لگا دی۔ پیغمبر کے استدلالِ فکر کی صحت اور روانیِ فکر قابلِ غور ہے۔ قوم کو احمق اور پاگل نہیں کہا، بلکہ سرِ دست مشرک اور بے ایمان بھی نہیں فرمایا، بلکہ ’’مجارات مع الخصم‘‘ کے مطابق ان کے خیالات کے ساتھ کھلا تصادم نہیں کیا۔ بلکہ تھوڑی دیر کے لیے اسے تسلیم فرما لیا:

﴿فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ﴾ [المائدة: ٧٦]

’’رات کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں جب ستاروں کو دیکھا تو فرمایا: تمھارے خیال کے مطابق یہ میرا رب ہے، لیکن کچھ عرصے کے بعد جب ستارہ ڈوب گیا، تو فرمایا: یہ ڈوبنے والا خدا تو مجھے منظور نہیں۔‘‘

میں ایسے خداؤں کو کیسے قبول کرلوں، جو دن ہوتے موت کی آغوش میں سو جاتے ہیں؟

﴿فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّيْنَ﴾ [المائدة: ٧٧]

’’چاند کو دیکھ کر فرمایا: میرا خدا اس کو ہونا چاہیے، جب وہ بھی ڈوب گیا تو فرمایا: ان گم کردہ راہ لوگوں سے میں خدا تعالیٰ کی راہنمائی کے ساتھ ہی بچ سکتا ہوں۔‘‘

﴿فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّيْ هٰذَآ اَكْبَرُ فَلَمَّآ اَفَلَتْ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ۝ اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّ مَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ﴾ [المائدة: ٧٨]

’’سورج کی چمک دمک اور بڑائی دیکھ کر فرمایا: یہ رب ہے۔ جب وہ بھی غروب ہوگیا تو فرمایا: میں تمھارے شرک سے بیزار ہوں۔ میں اپنا رخ اس ذاتِ اقدس کی طرف پھیر رہا ہوں، جس نے آسمان اور زمین کو پیدا

فرمایا، میں ان جھمیلوں سے یکسو ہو رہا ہوں اور میں مشرک نہیں ہوں۔''

تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ بت شکنی کا واقعہ بابل میں پیش آیا اور نمرود کا مناظرہ بھی اسی سرزمین میں ہوا۔ بتوں کی خدائی اور نمرود کی خدائی دونوں تقلیدِ جامد کی پیداوار تھے، جو ایک محقق کی تنقید کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہوگئے، اور یہ تاریخی مناظرہ نمرود ایسے کند ذہن بادشاہ سے اسی جگہ ہوا۔

ستاروں کی خدائی اور ان کے افول کی بحث کلدانیوں کے ساتھ حران میں پیش آئی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حکیمانہ گفتگو نے ان ہیکل پرست فلسفیوں کو خاموش اور دم بخود کر دیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جرأت اور حکمت آموز اور اس کے ساتھ صلح پسندانہ اندازِ گفتگو ہجرت اور ترکِ وطن میں یکساں اپنا کام کرتا رہا۔ حق و صداقت کی دندناتی ہوئی آواز نے کہیں بھی مصلحتِ وقت کی آغوش میں پناہ نہیں لی۔ جو فرمانا تھا، صاف فرمایا اور اس انداز سے فرمایا کہ اس کے خلاف کوئی اخلاقی اعتراض نہیں کیا جا سکا۔

ایسے ماحول میں رائے عامہ کی مخالفت کا تصور بھی مشکل تھا، مگر یہاں وہ سب کچھ علی الاعلان فرمایا گیا، جس کا سوچنا بھی شاید ناممکن ہوتا۔

بمنبر نتواں گفت آنچہ بر دار تواں گفت [1]

حضرت ابراہیم اور ان کے رفقا:

حضرت ابراہیم، ناحور اور ہاران سگے بھائی تھے۔ والد کا نام آزر تھا، جسے تاریخ اور پرانے صحیفوں میں تارخ کے نام سے یاد کیا گیا۔ حضرت ابراہیم کے چچا کا نام بھی ہاران تھا۔ حضرت لوط اور حضرت سارہ ان کی اولاد تھے۔ حضرت ابراہیم کی شادی حضرت سارہ سے ہوئی، اور ہاران حضرت ابراہیم کے بھائی اور چچا ہاران دونوں بابل ہی میں انتقال کر گئے۔[2]

قوم کی مخالفت اور حالات کی ناسازگاری کی بنا پر تین مقدس افراد کا قافلہ ہجرت کے لیے تیار ہوگیا، یعنی حضرت ابراہیم، حضرت سارہ اور حضرت لوط۔ غالباً اسی سفر میں مصر کے ظالم بادشاہ کی نظر بد لی، اس نے حضرت سارہ کی عصمت پر ہاتھ ڈالنا چاہا، مگر حضرت سارہ کی عصمت اور عفت سے وہ اس قدر مرعوب ہوا کہ اس کا ہاتھ ان کی طرف نہ بڑھ سکا، بلکہ شاہی خاندان کی ایک عصمت مآب لڑکی حضرت کے ساتھ بطورِ خادم بھیج دی اور حضرت ابراہیم پورے اعزاز کے ساتھ اپنی منزل کی طرف روانہ ہوگئے۔[3]

---

1. جو گھر میں کہا جا سکتا ہے، وہ منبر پر نہیں کہا جا سکتا۔
2. دیکھیں: البداية والنهاية (١/ ١٤٠)
3. دیکھیں: صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٠١٤)

یہ قافلہ، جو بڑی بے سروسامانی کے ساتھ دین کی حفاظت کے سلسلے میں گھر سے نکلا تھا، منزل بہ منزل بڑھتا گیا اور ارضِ مقدس میں اقامت پذیر ہوگیا۔ یہاں پہنچ کر اللہ تعالیٰ نے حضرت ہاجرہ کے بطن سے حضرت اسماعیل علیہ السلام عطا فرمائے۔ اس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام اسی سال کے قریب تھے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت ہاجرہ کو اپنی زوجیت کے لیے قبول فرمالیا تھا۔

یہاں پہنچ کر سفر کی صعوبتوں اور پے بہ پے آزمایشوں کے باوجود حضرت ابراہیم اپنے مقصد کو نہیں بھولے، بلکہ آتے ہی دین کی تبلیغ واشاعت کا کام پوری سرگرمی سے شروع فرمادیا۔

تبلیغی مراکز:

یہاں پہنچ کر حضرت ابراہیم نے تین مراکز قائم فرمائے:

1. سدوم کی بستیوں میں حضرت لوط علیہ السلام کو ٹھہرایا۔
2. حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل کو فاران کی پہاڑیوں میں ٹھہرنے کا حکم دیا اور وقتاً فوقتاً ان کی خبر گیری فرماتے اور ہدایات دیتے رہے۔ بنو جرہم کی آمد سے یہ پہاڑیاں اور پُر رونق ہوگئیں۔ حضرت ہاجرہ جو تنہائی میں اپنا وقت گزار رہی تھیں، ایک پُر رونق فضا محسوس فرمانے لگیں۔ حضرت اسماعیل کی شادی بھی یہیں ہوئی، ذبح کا واقعہ یہی پیش آیا، یہیں عربی زبان پروان چڑھی، جو بتدریج علمی اور عالمی زبان قرار پائی۔ آج تک یہ زبان دنیا میں اپنا مقام کیے ہوئے ہے۔
3. ارضِ مقدس فلسطین وغیرہ علاقوں میں حضرت ابراہیم نے خود تبلیغ اور اشاعتِ دین کا آغاز فرمایا، اس مرکز میں حضرت اسحاق آپ کے معاون اور جانشین تھے۔ تمام انبیاے بنی اسرائیل کا تعلق اسی شجرہ طیبہ سے تھا:

«كانت بنو إسرائيل تسوسهم الأنبياء، كلما هلك نبي خلفه نبي»[1] (مسلم)

بنی اسرائیل کی سیاسی سرپرستی اور دینی سرپرستی دونوں انبیا کے سپرد تھی، ان میں یکے بعد دیگر نبی آتے رہے۔ قرآنِ عزیز نے ان کامیابیوں میں حضرت ابراہیم کے ایک اور اعزاز کا بھی ذکر فرمایا:

﴿ وَ جَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِ النُّبُوَّةَ وَ الْكِتٰبَ ﴾ [العنكبوت: ٢٧]

''ہم نے حضرت ابراہیم ہی کی اولاد میں نبوت اور کتاب کو محصور کر دیا۔''

حضرت ابراہیم کے بعد کوئی نبی کسی دوسرے سلسلۂ نسب سے نہیں ہوا۔ ابن کثیر فرماتے ہیں:

''وجعل في ذريته النبوة والكتاب، فكل نبي بعث بعده فهو من ذريته، وكل كتاب

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٢٦٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٤٢)

نزل من السماء على نبي من الأنبياء من بعده فعلى أحد نسله وعقبه خلعة من الله وكرامة له حين ترك بلاده وأهله وأقرباءه، وهاجر إلى بلد يتمكن فيها من عبادة ربه عز و جل" (البداية والنهاية: ١/ ١٤٩)

''حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد جو نبی مبعوث ہوا اور جو کتاب اتری، وہ حضرت ہی کی اولاد میں نازل ہوئی۔ یہ وہ عزت و کرامت کا خلعت تھا جو ترکِ اقربا اور اہل سے علیحدگی اور ہجرت کی بنا پر عطا فرمایا گیا، کیونکہ ہجرت سے حضرت ایسے مقام میں پہنچ گئے، جہاں وہ پورے اطمینان سے اللہ تعالیٰ کی عبادت کر سکتے تھے۔''

ابن کثیر نے یہ صراحت ابی بن کعب، ابو العالیہ اور قتادہ وغیرہم سے نقل فرمائی ہے اور دراصل یہ قرآن حکیم ہی کی منشا ہے۔ ﴿فِيْ ذُرِّيَّتِهِ﴾ ظرف کے تقدم سے حصر ظاہر ہے، اس لیے کسی فعل یا کسی ایسے بزرگ کو جس کا حضرت ابراہیم ۔على نبينا وعليه السلام۔ سے نسباً تعلق نہ ہو، نبوت کی غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔ قرآن عزیز کی یہ صراحت حضرت ابراہیم کی اولاد کے لیے نبوت اور کتاب کو خاص فرما رہی ہے۔ اور واقعات بھی اس کے شاہد ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد جس قدر انبیا مبعوث ہوئے، وہ یا بنو اسحاق سے تھے یا بنو اسماعیل سے، اور اس میں ﴿لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ﴾ کا اصل اپنی جگہ پر قائم رہا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد:

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد کا معاملہ اپنی جگہ ایک معجزہ ہے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حضرت اسحاق علیہ السلام کی بشارت دی گئی تو حضرت سارہ بھی سن رہی تھیں۔ آپ نے بڑے عجیب انداز سے فرمایا:

﴿ءَ اَلِدُ وَ اَنَا عَجُوْزٌ وَّ هٰذَا بَعْلِيْ شَيْخًا﴾ [هود: ٧٢]

''کیا عمر رسیدہ بڑھیا کے ہاں اولاد ہوگی اور میاں کا بھی یہ حال ہے کہ بڑھاپے کی سرحدوں کو عبور فرما رہے ہیں!''

فرشتے نے بھی ایمان افروز جواب دیا:

﴿رَحْمَتُ اللّٰهِ وَ بَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ اِنَّهٗ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ﴾ [هود: ٧٣]

''اس گھر پر خدا تعالیٰ کی رحمت ہے، وہ حمد و مجد کا سزاوار ہے، خداوندی رحمت کو عام مادی اسباب پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔''

یہ اعجاز یہیں ختم نہیں ہوا، بلکہ اس کے بعد حضرت ابراہیم نے دو شادیاں اور کیں، ان سے اللہ تعالیٰ نے کافی

اولاد مرحمت فرمائی، جس کی تفصیل ائمہ تاریخ نے اس طرح فرمائی ہے:

ازواج	اولاد
1 ہاجرہ	اسماعیل علیہ السلام
2 سارہ	اسحاق علیہ السلام
3 قنطورا	مدین۔ زمران۔ سرج۔ یشان۔ نشق۔ ایک نامعلوم الاسم
4 حجون	کیسان۔ سورج۔ امیم۔ لوطان۔ نافس

(البدایہ، ص: ۱۷۵ بحوالہ ابوالقاسم سہیلی: کتاب التعریف والاعلام)[1]

ان پر جو برکات حضرت اسحاق اور حضرت اسماعیل اور ان کی اولاد پر عطا فرمائی گئیں، باقی اولاد کے متعلق تاریخ کے صفحات خاموش ہیں۔

قرآنِ عزیز نے سورت مریم میں جہاں حضرت ابراہیم اور ان کے والد بزرگوار کا مکالمہ یا تبلیغی وعظ ذکر فرمایا ہے، وہاں والد کی تلخ کلامی کے بعد فرمایا:

﴿فَلَمَّا اعْتَزَلَهُمْ وَ مَا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَ كُلًّا جَعَلْنَا نَبِيًّا﴾ [مریم: ۴۹]

اس کے بعد حضرت موسیٰ، حضرت ہارون، حضرت اسماعیل اور دیگر ابراہیمی انبیا اور حضرت آدم اور حضرت نوح اور ان کی اولاد کا ذکر فرمایا، یہ اس کی تصدیق ہے کہ جب کوئی خدا کے لیے ہجرت کرے، اربابِ فسق و فجور اور اصحابِ شرک و بدعت سے مقاطعہ کرے تو اللہ اسے اکیلا نہیں چھوڑتا۔

بابل اور حران کا مہاجر بیکسی اور سراسیمگی میں اپنے آپ کو خدا کے سپرد کرتا ہے، اللہ تعالیٰ نے کئی امتوں کا باپ بنایا اور کئی ملکوں میں اس کا نام بلند ہوا۔ دنیا کی تمام قومیں اس پر سلام بھیجتی ہیں۔ ﴿وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ۝ سَلٰمٌ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ﴾

یہ مثالی خاندان ہے جس نے اپنی قربانیوں کی وجہ سے زمین اور آسمان میں نام پیدا کیا، دنیا میں علم و عمل اور خدمت کی مثال قائم کی۔[2]

---

[1] دیکھیں: البدایة والنهایة (۱/ ۱۷۵)

[2] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (یکم اپریل ۱۹۶۶ء)

اسلامی مرکزیت کے لیے
ریگستانِ عرب کا انتخاب کیوں ہوا؟

امتِ اسلامیہ کی تاریخ اور کوائفِ حکومت پر غور کرنے کے ساتھ جب ان فتوحات پر غور کیا جائے، جو عرب یا دیگر مسلم فاتحین نے اطرافِ عالَم میں کیں، ان اموال وخزائن پر ایک نگاہ ڈالی جائے، جو فاتحینِ اسلام نے اقوامِ عالَم پر نثار کیے اور ان آثارِ باقیہ پر ایک اچھلتی ہوئی نظر کر لی جائے، جو اس بے سرو سامان قوم نے آتی دنیا کے لیے صفحہ عالَم پر چھوڑے، جن کی پُرسوز اور زہرہ گداز آواز ہم سیہ بختان کے سامنے اپنی سطوتِ ماضیہ کا مرثیہ ان الفاظ میں کہہ رہی ہے ؎

تِلْكَ آثَارُنَا تَدُلُّ عَلَيْنَا فَانْظُرُوْا بَعْدَنَا اِلَى الْآثَارِ

قرطبہ کی یونیورسٹیاں، بغداد کے علمی ادارے، ہندوستان کی فلک بوس مسجدیں اور سربفلک قلعے؛ ایک ایک کو دیکھتے جایئے اور اپنے اسلاف کے زندہ جاوید آثار میں تھوڑی دیر کے لیے اپنے آپ کو کھو دیجیے تو آپ کو ان کی دماغی رفعت، نکتہ رس طبیعت، معاملہ فہم ذہانت اور حساس دلوں کا پتا چلے گا۔ مستقبل اور حال کتنا ہی مایوس کن کیوں نہ ہو، مگر ماضی اتنا شاندار ہے کہ حال و استقبال کی نارسائیاں ماضی کے دامن میں پناہ لے کر مایوسیوں پر غالب آ رہی ہیں۔ مورخ کا دل ان حالات سے اس قدر متاثر ہوگا کہ وہ عالَم کی مقتدر اقوام میں شاید ہی اتنی تاریخی عظمت کسی قوم میں پائے، جو ان بادیہ پیما بدوؤں کو دنیا میں حاصل ہوئی۔

تاریخ کے طالب علم کی حیرت:

مستقبل کی ان عظیم الشان عظمتوں، ان حیرت زار رفعتوں کو دیکھ کر تاریخ کا طالب علم اس یقین پر پہنچے گا کہ یہ اعجازی ترقیاں کسی ایسی قوم سے غیر ممکن ہیں جس کا ماضی اتنا قابلِ رشک نہ ہو، جتنا کہ اس کی ترقیات کا موجب ہو سکے۔ وہ یقیناً ان حیران کن نظاروں کی بنیاد کے لیے کسی ایسی اساس کا منتظر ہوگا جس کی عظمت سے کم از کم اس آنے والے دَور کی جھلک نمایاں ہو۔ وہ کسی ایسے قیاس کی ٹوہ لگائے گا جس سے ایسے نتائج کا امکان ہو، لیکن اس کا کیا علاج کہ یہاں عقل کا مزاج ہی اعجاز کی تربیت کا مرہونِ منت ہے۔ جہاں فطرت ہی یہ ہے کہ ریگ کے ذرّوں سے پتھروں کا کام لیا جائے۔ جھونپڑیوں میں بیٹھ کر پُرشکوہ سلطنتوں کو خاک میں ملانے کے

منصوبے سوچے جائیں۔ کسریٰ کے سر بفلک ایوانوں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے۔ جو ٹوٹے ایسا ٹوٹے کہ جوڑا نہ جائے۔ پیٹ پر بے شک پتھر بندھے ہوں، بھوک جسم سے گزر کر قوتِ حیات کو پیامِ جنگ دے رہی ہو، لیکن یہ ممکن نہیں کہ صداقت کے دلدادہ باطل کے سامنے سرنگوں ہو جائیں۔ حق کے لیے انتہائی صعوبت برداشت کی جا سکتی ہے، مگر باطل سے شکست کا تخیل یہاں محال بالذات ہے، اور یہ سب کچھ دنیائے اسباب کے ساتھ پوری بے اعتنائی سے کیا گیا۔ دنیائے اسباب نے اپنی خدمات خود بخود پیش کیں، کاروانِ عمل نے اس کے لیے اس کی کوئی خوشامد نہیں کی۔

ریگستانِ عرب کا انتخاب کیوں ہوا؟

اسلام کی ان ترقیات کی ابتدا ایک مورخ کو دقفِ حیرت کر دے گی کہ اس عظیم الشان مستقبل کا ماضی اس قدر سادہ ہے کہ وہاں پر آنے والی حضریت کا کوئی اثر نہیں ملتا۔ پیغمبرِ اسلام مکہ میں پیدا ہوئے، والد کی موت کا صدمہ ہوا، شرفِ یتیمی سے سرفرازی ہوئی۔ والدہ کا سایہ سر سے اُٹھا۔ والد کے کندھوں کے ساتھ والدہ کی گود بھی رخصت ہوگئی ؎

ترکِ مال و ترکِ جان و ترکِ سر
در رہِ عشق است اول منزلے[1]

بوڑھے دادا نے بڑی دلجوئی سے ہونہار پوتے کی تربیت و پرورش کی، مگر وہ بھی اس شیریں پودے کا پھل نہ کھا سکے۔ ان کی موت کا صدمہ پہلے صدمات پر مستزاد تھا۔ مالکانِ قضا و قدر کا منشا ہی یہ تھا کہ صدمات کے دریاؤں اور مایوسیوں کے سمندروں کو چیر کر ساحلِ مراد کو پانے کی مشق ہو۔ پوری دنیا کا پاسبان، آسایشوں کے سائے سے کچھ زیادہ مانوس نہ ہونے پائے۔ آنے والے امتحانات آزمودہ کار فطرت پر کوئی بار نہ ڈال سکیں، بلکہ مصائب کے سمندروں کی موجیں ساحلِ عزم سے ٹکرائیں اور پاش پاش ہو کر رہ جائیں۔ عزم و ارادے کی سنگین چٹانیں اس کے مقابلے کے لیے پوری طرح تیار ہوں۔

مصائب کے اس مربوط سلسلے کو دیکھتے ہوئے نہ تو رہنمائے عالم ﷺ کی افتادِ طبیعت کا علم حاصل کرنا چنداں مشکل ہے اور نہ ہی خدا تعالیٰ کے اس انتخاب کی مصلحت کو پا لینا بھی کوئی بڑی بات ہے۔ رومی امپائر کی عیاشیاں عجمی حکومت کی مسرفانہ روایات ایک بین حقیقت تھی، جو غربا اور مساکین کے لیے اتنی ہی بڑی مصیبت تھی، جس قدر آج کل کی یورپین تہذیب۔ اس لیے اس وقت اس سے بہتر کوئی علاج نہ تھا کہ جو چیز متمرد اقوام کی نگاہ میں سب سے بہتر اور قابلِ فخر چیز ہے، اسے اپنے پروگرام میں کوئی اہم مرتبہ ہی نہ دیا جائے۔ ﴿لَوْلَا

---

[1] مال و جان اور خواہش کو چھوڑ دینا راہِ عشق کی اولین منزل ہے۔

نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ﴾ ایسے بودے اور مادی اعتراضات کو ﴿اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ﴾ کے منہ توڑ جواب سے ختم کر دیا جائے۔

دنیا کی تازگی:

دنیا کی زیب و زینت یقیناً اہلِ دنیا کی نگاہ میں سرمایہ صد افتخار ہے، لیکن اسلام کی تعلیم میں اسے کوئی خاص مرتبہ نہیں دیا گیا۔ نہ اس کے آنے پر کوئی خوشی منائی گئی، نہ اس کے ضائع ہو جانے پر کوئی مجلسِ عزا منعقد ہوئی۔ اخلاق کو دیانت کے بعد اگر مال و دولت کی فراوانی سے کچھ مل گیا تو یہاں مسیحیت کی طرح اس سے کوئی نفرت نہیں، اس سے قومی ضروریات کو پورا کیا جانا چاہیے، جماعت کے تعمیری پروگرام کی اس سے تکمیل ہونی چاہیے۔ اگر اخلاق اور دیانت کی دولت کے ساتھ حیاتِ دنیوی کی فراوانی مہیا نہیں ہو سکتی تو بلا سے۔ اس کے لیے ایک ایماندار کو طلب ہی کب تھی کہ اس کے نہ ملنے پر افسوس ہو۔ اسے مطلوب مل چکا، جس کے لیے سعی و طلب تھی، وہ چیز میسر آ گئی۔ انعام نہیں ملا تو مالک کی مرضی، اس سے کوئی جھگڑا نہیں۔

عنایت اللہ مشرقی کا احمقانہ نظریہ:

پچھلے دنوں مسٹر مشرقی کا مقدمۂ تفسیر دیکھنے کا موقع ملا، جس میں انھوں نے یورپین اقوام کو مسلم قرار دیا ہے، اس لیے کہ بجلی کی لائنیں ان کے قبضے میں ہیں، لوہے کی کانیں ان کے زیرِ تصرف ہیں۔ نہریں ان کی حکمت سے چل رہی ہیں، دریاؤں کو انھوں نے پابہ زنجیر کر دیا ہے۔ قرآن کا ایک طالب علم اس نظریے کو قرآن کے نکتۂ نگاہ سے دیکھ کر متحیر ہوگا اور وہ محسوس کرے گا کہ قرآنِ حکیم پر یہ کتنا ظلم ہے کہ جس نظریے کو قرآن حکیم یہود کی طرف منسوب کرتا ہے، جیسے: ﴿يٰلَيْتَ لَنَا مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ قَارُوْنُ اِنَّهٗ لَذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ﴾ میں واضح کیا گیا ہے۔ قرآن کا مفسر اسے عین اسلام قرار دیتا ہے۔ حقیقتِ اسلام اسی ﴿زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا﴾ کو تسلیم کرتا ہے۔ روحِ اسلام سے اس مجرمانہ غفلت کے باوجود اس قماش کے ملحد سمجھتے ہیں کہ ہماری قیادت ہی اسلامی رفعت کا موجب ہوگی۔ دورِ انحطاط ہماری ملحدانہ تجاویز ہی سے رفع ہوگا۔ فیا للعجب!!

① کعبہ معظمہ کا محلِ وقوع، ریگستانِ عرب بنائے اسلام کی مرکزیت کے لیے اسے مختص فرما لیا گیا، حالیکہ ثروتِ دنیا، اسبابِ عیش و تنعم سے کوئی جاذب بھی یہاں پر موجود نہ تھا، بلکہ ساری چیزیں عیش و تنعم کی ضد اور منافی تھیں، لیکن دعاے ابراہیم علیہ السلام ﴿رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ وَ ارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ﴾ نے وہ جاذبیت پیدا کی کہ ابرہہ کے ہاتھی، قرامطہ کی شریرانہ چیرہ دستیاں، یورپین طاقتوں کی دسیسہ کاریاں،

کوئی چیز بھی اس جاذبیت کو کم نہ کر سکی، بلکہ حرمِ کعبہ کی سادگی میں وہ کشش ہے جو دنیا کے عظیم الشان دار الخلافوں اور سر بفلک عمارتوں میں نہیں۔ جس صادق عقیدے کا مظاہرہ حرمِ کعبہ سے کیا جاتا ہے، دنیا کی کسی مقدس جگہ کو یہ برتری حاصل نہیں۔ آج کل تو مصر نہیں یورپ کی توجہ خود بخود اس سادگی کی طرف منعطف ہو رہی ہے، جس کی عملی تعبیر حرمِ کعبہ کی سادگی اور ریگستانِ عرب کی بے آبی ہے، اور کچھ شک نہیں کہ قناعت سے زیادہ کوئی بہتر سرمایہ حیات نہیں، جس کی ترجمانی موسسِ اسلام نے جزیرۃ العرب کی مرکزیت میں پنہاں فرما دی۔ اسلام نے اپنی رفعت کے وقت اپنی غربت کو کبھی فراموش نہیں کیا:

«مَا الفَقْرُ أَخْشٰی عَلَیْکُمْ، وَلٰکِنْ أَخْشٰی عَلَیْکُمْ أَنْ تُبْسَطَ عَلَیْکُمُ الدُّنْیَا»[1]

(۲) نیز ایک مقصد اس میں یہ بھی تھا کہ کہیں زر پرست اور دنیا طلب قومیں اپنے دندانِ آز کے لیے لقمہ تر بنانے کی آرزو میں اسے جنگ جدل کی آماجگاہ نہ بنا لیں۔ ہندوستان ایسی سرزمین صرف اپنے ہی لیے موجبِ مصیبت نہیں، بلکہ ہم دیکھتے ہیں، اس نقص کو محفوظ کرنے کے لیے تمام وہ ممالک مصیبت میں مبتلا ہیں، جنھیں اس کی راہ سے بھی تھوڑا بہت تعلق ہے۔ مصر، فلسطین، یمن، عقبہ، عمان وغیرہ مقامات، برطانیہ کی نگاہ میں صرف اسی لیے ابدی غلامی کے مستحق ہیں کہ مالکانِ قضا و قدر نے انھیں ہندوستان کے راستے پر کیوں جگہ دی۔ وہاں کے رہنے والوں کا یہی جرم ہے کہ وہاں کے رہنے والوں نے اپنے قیام و توطن کے لیے وہ جگہ کیوں اختیار کی، جو برطانی شکاریوں کی راہ گزر ہے۔ اگر جزیرۃ العرب کو بھی یہ خوشنودی حاصل ہوتی تو جزیرۃ العرب امن گاہ ہونے کے بجائے دوسری دنیا کے لیے بے امنی کا سبب ہوتا۔ نہ صرف یہ بلکہ دنیا کی حریص طاقتیں اسے میدانِ جنگ بناتیں اور تباہ و برباد کر دیتیں۔

﴿اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً وَكَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ﴾ [سباء: ٣٤]

افساد و تخریب کی مشق حرمِ محترم پر بھی کی جاتی۔ اس وقت یہ حالت ہے کہ کوئی شریر طاقت بظاہر وہاں پر اپنے لیے کوئی فائدہ نہیں دیکھتی، اس لیے وہ جگہ نسبتاً محفوظ ہے۔

(۳) بیت اللہ کی اس جاذبیت کے ساتھ جو دعاے ابراہیم کے سبب سے اسے حاصل ہوئی، ضروری تھا کہ ایسے خدام کی ایک جماعت وہاں پر موجود رہے، جو آنے والے مہمانوں کی ضروریات کو پورا کرے اور اس ذمے داری کو محسوس کرے، جو ایک میزبان کے لیے ضروری اور واجبی ہے۔ اور ذمے داری کا صحیح احساس بمقتضاے فطرت اسی وقت ہو سکتا ہے، جب طرفین کو ایک دوسرے کی احتیاج ہو۔ متمول اور ذی ثروت

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۳۷۹۱) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۹۶۱)

خدمت گزاری کو کبھی برداشت نہیں کر سکتے۔ اس لیے علاقے کی آب و ہوا ہی ایسی وضع ہوئی۔ وہاں سرمایہ داری اور تمول کے امکانات بہت ہی کم ہیں۔

اس سلسلے میں ترکی سلاطین کی سادگی نے اہلِ حرم کی محبت میں اتنا غلو کیا کہ انھیں انعامات اور عطیوں سے ایسا مستغنی کیا کہ وہ حجاج کی خدمت اور محنت کے معاوضے کے بجائے حجاج کو اپنی جاگیر تصور کرنے لگے۔ اس کے نتیجے میں آپ دیکھیں گے کہ حجاز کی سرزمین میں سوال اور بخشیش کا دروازہ کھل گیا۔ آپ معلمین سے شروع ہو کر بددی تک نگاہ ڈالیں، آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ لوگ مزدوری سے زیادہ بخشیش کو پسند کرتے ہیں۔ آپ کو ہر طرف بخشیش بخشیش کی آوازیں سنائی دیں گی، اسی کا نتیجہ تھا کہ شریف حسین کے زمانہ حکومت میں حجاز درندوں کا ایک جنگل تھا، جو بے کھٹکا حاجیوں سے جائز اور ناجائز ذرائع سے اپنی بخشیش وصول کرتے تھے۔

تاریخِ اسلام میں شریف حسین مرحوم کا دَور حجاز میں بدترین دور ہے، جس میں حجاز کی حرمتیں پامال ہوئیں۔ اندرونی امن سالہا سال تک ناپید رہا، حرمِ کعبہ پر انگریزی افواج کی گولیاں پڑیں۔ قلعہ شکن توپوں نے اس سرزمین مقدس کو اپنی زد میں لیا، جہاں سونے والی ہرن کو جگایا نہیں جاتا تھا کہ کہیں اس کے امن میں خلل نہ پڑے، لیکن انگریزی فوج کی توپوں نے کعبہ کی عمارات کو متزلزل اور زمین بوس کر دیا۔

سلطان ابنِ سعود کا دَورِ حکومت:

حکومتِ خلافت راشدہ کے بعد امن و آسایش کے لحاظ سے سلطان المعظم عبدالعزیز بن سعود ـ أیدہ اللہ بنصرہ۔ کا دورِ حکومت بہترین دَور ہے، جس میں شریف حسین مرحوم کی ساری کوتاہیوں کا کفارہ ہو رہا ہے۔ بے نظیر امنِ حجاز ہے۔ یورپین حکومتوں کے نظام ان ساری کاغذی خوبیوں کے باوجود، جو ان میں پائی جاتی ہیں، حجاز کے امن و امان کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ محمد عربی ﷺ کے خادم آج پوری قوت کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ہم سے بہتر کوئی شخص حکومت نہیں کر سکتا۔ ہمارا فوجداری قانون اتنا مکمل ہے جس کی نظیر بلحاظِ نتائج ساری دنیا کے پاس نہیں۔ انسانی نفسیات کا جتنا صحیح معاملہ اس قانون کے مقنن نے کیا ہے، اتنا کسی دوسرے قانون ساز نے نہیں کیا۔ ﴿وَفِي ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ﴾

عظمۃ السلطان سے ایک مودبانہ گزارش:

ہم حکومتِ حجاز کی مشکلات کو یقیناً اس قدر نہیں سمجھ سکتے جس قدر عظمۃ السلطان ان سے آگاہ ہیں، لیکن دنیا کے حالات، کسبِ معاش کے لحاظ سے اتنے مختلف نہیں کہ ایک ملک دوسرے کو اصولی مشورہ بھی نہ دے سکے۔

جناب والا کی ان برکتوں کے ساتھ جو حجاز پر محیط ہیں، سب سے بڑی برکت یہ ہے کہ آپ حجاز کے باشندوں کو محنت و مشقت کا عادی بنا رہے ہیں، تجارت اور حرفت کی طرف انھیں رغبت دلا رہے ہیں، لیکن اس

سے بھی زیادہ توجہ کی ضرورت ہے، تا کہ اہلِ حجاز کلی طور پر اپنی معاش اپنے ہاتھ سے پیدا کریں اور حجاج کی خدمت محض جذبہ دینی کے ماتحت کریں۔ جیسے نجد کا بدو تطوعاً جنگی خدمت کے لیے سر بکف گھر سے نکل پڑتا ہے، حجاز کے ساکنین حجاج کو اپنی مذہبی ذمے داری تصور کریں۔ اس کے بعد آپ کے ٹیکس کم ہو جائیں گے۔ مصارف گھٹ جائیں گے، حجاج کی تعداد بڑھ جائے گی، جائز منفعت کی راہیں کھلیں گی، سائلینِ مکہ مکرمہ اپنی مصنوعات فروخت کریں گے، ان کا ہاتھ سفلیٰ کی بجائے علیا ہوگا۔ وہ اپنے اسلاف کی طرح خود دار ہوں گے، قوم فروشی کا کھٹکا تک نہ ہوگا، اپنے ملک و ملت کا زیادہ احساس کما حقہ رکھیں گے ... اور اسلام کے لیے اس کا مرکز اور زیادہ فخر و مباہات کا موجب ہوگا۔ دنیا انھیں زیادہ عزت کی نگاہ سے دیکھے گی۔

آپ حضریتِ جدیدہ کی مفید ایجادات کا کھلے طور پر استعمال کریں، دائرلیس کے کھنبے جابجا موجود ہوں، ٹیلیفون کی کثرت ہو۔ ریل زمین کے چپے چپے پر چلے، سڑکیں صاف ستھری ہوں، حمل و نقل کے وسائل سے بہترین فوائد حاصل کریں۔ منکرات کو کلی طور پر ملک بدر کر دیا جائے ... سادہ کھانے اور سادہ پہننے کی عادت بدستور موجود رہے۔ کتاب و سنت کی تعلیم کے ساتھ ساتھ علم و حکمت کے چشمے حجاز میں جاری ہوں، مگر یورپ کی عیاشیوں کو حکماً ملک بدر کر دیا جائے۔ صاحبزادے ہر حال میں آپ کے نقشِ قدم پر چلیں۔ زادکم اللہ عزاً و رفعةً، وجعلکم فخراً لمن مضىٰ ولمن يأتي بعدكم.

حضور کی ذاتِ ستودہ صفات دنیائے اسلام کے لیے عموماً اور اہلِ حجاز و النجد و ملحقاتہا کے لیے خصوصاً نعمت غیر مترقبہ ہے۔ رب العزت کا کروڑ بار شکر ہے، جس نے اپنی عنایات بے غایات سے آپ کو فرمانروائے حجاز منتخب کیا اور خدمتِ حرمین شریفین کے جلیل القدر عہدے پر سرفراز کیا۔ آپ کے ذریعے سے حجازِ مقدس کو شرک و بدعت کی آلایشوں سے پاک کیا اور حدودِ شرعی کا نفاذ کیا۔ خداوند قدوس آپ کے ظلِ ہمایونی اور دورِ میمونی کو قیامت تک قائم رکھے اور آپ کے حاسدوں اور مخالفوں کو خائب و خاسر کرے ؎

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين.[1]

---

[1] ہفت روزہ "تنظیم اہلِ حدیث" روپڑ (۱۵۔۲۲/ اکتوبر ۱۹۳۷ء)

عید ... عہدِ نبوت میں

آنحضرت ﷺ کی بعثت کے وقت عرب کے اس خطے میں وہ ساری برائیاں موجود تھیں، جو کسی مٹنے والی قوم میں ہوسکتی ہیں، ان میں بت پرستی موجود تھی۔ وہ شرک پر مصر تھے، ان کی بداخلاقیاں اس قدر بڑھ چکی تھیں کہ وہ خود ان سے تنگ آچکے تھے، ان کے اخلاق پر دوگونہ غلامی کے اثرات تھے۔ ابراہیمی کہلانے کے باوجود خوشی اور غمی کے ایام میں عادات و اطوار میں وہ دوسروں کے نقال اور مقلد تھے۔ ایک طرف ان پر رومن امپائر اثر انداز تھی، دوسری طرف فارسی شاہنشاہیت اور یہودی ساہوکاروں کے اثرات اس کے علاوہ تھے۔ عید کے معاملے میں وہ مجوسی عیدوں کے پابند تھے۔ کسی قوم کی ذلت کی یہ انتہا ہے کہ وہ غم اور خوشی میں دوسروں کی نقال ہو، اس کی اپنی قوم اور اپنی تاریخ اس معاملے میں کوئی راہنمائی نہ کرے، یا قومی مآثر کو ویسے ہی چھوڑ چکی ہو۔

آنحضرت کی بعثت:

آنحضرت ۔فداہ أبي و أمي۔ کی بعثت نے عرب میں ایک ایسا انقلاب برپا فرمایا، جس سے زندگی کے تمام گوشے متاثر ہوئے۔ شرک کی جگہ توحید نے لے لی۔ بت پرستی کی جگہ ایک اللہ کی عبادت کا ذوق پیدا ہوا۔ غلامی کی کڑیاں ایک ایک کر کے ٹوٹنے لگیں، حتیٰ کہ فارسی عیدوں کو بھی خیرباد کہہ دیا گیا۔ نوروز کے اثرات سے ذہن پاک ہوگئے۔ آنحضرت کے ارشادِ گرامی کے ایک ایک فقرے پر غور فرمایئے کہ آپ نے صنادیدِ عرب کو کس قدر استقلال بخشا اور انھیں ذہنی استقلال سے کس قدر اونچا کر دیا کہ جن کے وہ نقال تھے، ان کے مقتدا بن گئے۔

عن أنس بن مالك قال: كان لأهل الجاهلية يومان في كل سنة، يلعبون فيهما، فلما قدم النبي ﷺ المدينة، قال: «كان لكم يومان تلعبون فيهما، وقد أبدلكم الله بهما خيرا منهما: يوم الفطر ويوم الأضحى»[1] (سنن النسائي: ٥/ ١٨٦)

''حضرت انس فرماتے ہیں: زمانۂ جاہلیت میں عرب نے سال میں عید کے دو دن مقرر کر رکھے تھے، جن میں کھیلتے اور خوشی کرتے تھے۔ آنحضرت جب مدینہ منورہ تشریف لائے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ان دو دنوں کے بجائے، جن میں تم عید سمجھ کر کھیلتے ہو، اللہ تعالیٰ نے تمھیں دوسرے دو دن

[1] سنن النسائي، رقم الحديث (١٥٥٦)

بدل دیے: عید الفطر اور عید الاضحیٰ۔“

اس حدیث سے کئی مسائل ثابت ہوتے ہیں:

① خوشی اور مسرت زندگی کا جزو ہے۔ چہرے میں عبوست، مزاج کی خشکی، یہ دیانتداری اور تقویٰ کی نشانی ہے نہ ہی اسلام نے زندگی کے اس انداز کو پسند فرمایا ہے۔ آنحضرت ـفداه أبي و أمي۔ بے حد خوش مزاج تھے۔ بچوں تک سے مذاق فرماتے، بوڑھوں سے خوش طبعی کی باتیں کرتے، پھر عجیب یہ ہے کہ اس مذاق میں نہ فحش ہوتا نہ جھوٹ، بظاہر خوش طبعی اور مذاق ہوتا اور مقصد صحیح ہوتا۔ ایک آدمی نے آنحضرت سے سواری کے لیے اونٹ طلب کیا، آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

«لأحملنك على ولد الناقة» ”میں تمھیں اونٹ کے بچے پر سوار کروں گا۔“

سائل پریشان ہوا۔ اس نے کہا: حضرت! میں بچے کو کیا کروں گا؟ حضرت نے فرمایا:

«هل تلد الجمل إلا الناقة؟»[1] ”اونٹ بھی تو اونٹنی کا بچہ ہی ہوتا ہے!“

ایک ابوعمیر نامی بچے کی چڑیا مرگئی، آپ نے مزاحاً فرمایا:

«يا أبا عمير! ما فعل النغير؟»[2] ”ابوعمیر! تمھاری چڑیا کو کیا ہوا؟“

ہمارے بعض علما اور صوفی حضرات چہرے کی عبوست کا نام تقویٰ اور زہد سمجھتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ بہت خوش مذاق تھے، اس کے ساتھ طبیعت کا رجحان فحش کی طرف قطعاً نہ تھا۔ «لم يكن فاحشاً ولا متفاحشا»[3] (شمائل)

② دوسری قوموں کی نقالی قطعاً پسند نہیں فرماتے تھے۔ حدیث شریف کے الفاظ: «قد أبد لكم الله بهما خيرا» سے ظاہر ہے، آنحضرت ﷺ نے سابقہ رواج کو یکسر بدل دیا اور قومی استقلال کے لیے ضروری ہے کہ غیر مسلم قوموں کی نقالی اور فساق اور اہلِ فجور کے تشابہ سے بچا جائے۔ یہی ایسا مقام ہے، جہاں عصبیت کی ضرورت ہے، قومیں اسی طرح قوموں کو ہضم کر جاتی ہیں۔ آج ہمارے ہاں تعلیم یافتہ اور یورپ زدہ طبقہ اسی نقالی کا مریض ہے۔ کوئی فیشن کتنا قبیح کیوں نہ ہو، ہمارے نوجوان اور ہماری مستورات فوراً اس پر لپکتی ہیں۔ اس کا نتیجہ ہے، اس جدت پسندی نے اسلامی رسوم وعوائد کے ساتھ وابستگی کم کر دی ہے اور اس عصبیت کا فقدان ہمیں اسلام کی روح سے بھی ناآشنا کر رہا ہے۔

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٩٩٨) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٩٩١)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٧٧٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢١٥٠)

[3] دیکھیں: الشمائل المحمدية (٣٤٨) صحيح ابن حبان (٢/ ٢٢٥) نیز دیکھیں: صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٣٦٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٢١)

ہمارے ایک خاص فرقے نے ملک میں کئی بدعتیں ایجاد کی ہیں، اسلام اور ائمہ اسلام کے اسوہ میں اس کی کوئی سند نہیں، اس لیے وہ غیر مسلم اقوام کی سنت سے استناد کرتے ہیں، حالانکہ غیر مسلم قوموں کی عادات ہمارے لیے قطعاً اقتدا اور استدلال کے قابل نہیں۔ شبِ براءت کی چراغاں، آتشبازی اور میلاد کے جلوس؛ کسی دینی اساس پر مبنی نہیں اور اب تو یہ عادات تفاحش اور بے حیائی کی حد تک پہنچ رہے ہیں۔ اگر اس تفاحش کو بروقت نہ روکا گیا تو یقیناً مزید خطرات کا موجب ہوگا۔

③ جاہلیت کی عیدوں میں عبادت اور ذکرِ الٰہی کا کہیں پتا نہیں چلتا۔ زیادہ سے زیادہ اس میں شاعری کی راہ سے زبان کی خدمت ہوتی تھی، اور وہ بھی آیندہ جنگ کا پیش خیمہ ہوتا تھا۔ آنحضرت ۔فداہ أبي و أمي۔ نے عید کے موقع پر مختصر سی عبادت و ذکرِ الٰہی کا التزام فرمایا۔ مردوں اور عورتوں کو تاکید فرمائی کہ وہ عید کے اجتماع میں شریک ہو جائیں، لیکن اس اجتماع کو بھی جاہلی جلوسوں سے ممتاز رکھا، بلکہ ہر آدمی انفرادی طور پر مقامِ عید پر پہنچ کر نماز میں شریک ہو۔ نماز سے فارغ ہو کر انفرادی طور پر واپس گھر پہنچ جائے۔ نہ جلوس نکلنے کے لیے مقام کا تعین فرمایا نہ جلوس کے اختتام کے لیے کوئی میدان مقرر فرمایا گیا۔ اجتماع کو صرف عبادت تک محدود رکھا۔ اللهم صل وسلم عليه.

پورے دن کی مسرت لباس، خوراک، خوش طبعی کی انفرادی مجالس تک محدود ہوگئی اور ہنگامہ بپا نہ کیا گیا۔

بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ چھوٹی بچیاں پرانے جنگوں کے واقعات کو اشعار اور نظموں کی صورت میں خوش الحانی سے پڑھتی تھیں، اس میں بھی مبالغہ آمیزی، غلو اور فحش گوئی ممنوع تھی۔ ایک لڑکی نے آنحضرت ﷺ کی نعت میں فرمایا:

وفينا نبي يعلم ما في غد[1]

''ہمارے نبی کل کی باتیں جانتے ہیں۔''

اسے روک دیا۔ چھوٹے بچے، نابالغ بچیاں اپنے قومی محاسن اور مشاعر کو نظموں میں پڑھیں، خوش آوازی سے پڑھیں، اس میں کچھ حرج نہیں ملی۔ ذہن کو عبوست اور بدمزاجی سے بچانا چاہیے، یہی عید کی روح ہے۔

ایک عید بھوک کی یادگار ہے۔ رمضان المبارک خوراک کے غیر معتاد نظام کے ساتھ ختم ہوا، اس امتحان میں کامیابی کے بعد ایک دن مسرتوں کے لیے وقف ہوگیا۔ دوسری عید میں حضرت ابراہیم، حضرت اسماعیل، حضرت ہاجرہ کی جفاکشی اور ہجرت اور ان مصائب میں کامیابی پر مسرت فرمائی گئی، اس پاکیزہ خاندان کی

① صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٧٧٩)

وفاداریوں اور صبر آزمائیوں کو تاریخی حیثیت عنایت فرما کر بقا و دوام عطا فرمایا گیا۔ ﴿وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ۝ سَلٰمٌ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ﴾ [الصافات: ۷۹]

ملت کو اغیار کی نقالی سے بچایا اور اپنی تاریخ کو عملاً زندہ فرما دیا گیا۔ اکابر کی قربانیاں آنے والوں کے لیے اسوہ اور زندگی کا پیغام بن گئیں۔ عید کے موقع پر اظہارِ مسرت کے لیے جنگی مشقوں کی اجازت مرحمت نہیں فرمائی۔ تھوڑے عرصے کے لیے یہ مشقیں صحنِ مسجد کی زینت بنیں، اور جہاد اور دفاع کے پیشِ نظر مرد تو اُسے دیکھتے ہی تھے، عورتوں کو بھی اجازت دی گئی کہ اگر وہ پسند کریں تو اس دلنواز منظر کو ملاحظہ کریں۔ مجاہد پیدا کرنے والی مائیں جہاد کی عملی تربیت اور دفاع کی کارگزاریوں سے دلشاد ہوں اور اس انداز سے کہ اس کا اخلاق پر بھی کوئی اثر نہ پڑے۔

ضرورت ہے کہ آج کی عید کو زندہ عید کی صورت دی جائے۔ ہمارے ہاں عید کی خوشی میں خباثت اور بد اخلاقی کے معمل کھل جاتے ہیں۔ دن میں کئی کئی شو ہوتے ہیں، اخلاقی انارکی سے نوجوان ذہن ماؤف ہوتا ہے۔ عیاشی کی راہ سے طبائع پر دہن اور جبن کا استیلا ہوتا ہے۔ نوجوان جرأت و شجاعت کے بجائے ذلیل حرکات پر اُتر آتے ہیں۔ جو کچھ ان شیطانی گھروندوں میں دیکھتے ہیں، اسے عملی صورت دے کر اپنے لیے موت اور ماں باپ کے لیے شرمساری کے سامان مہیا کرتے ہیں۔ یہ معکوس ترقی ہے، جس کی طرف اکابرِ ملت اور قیادتِ کبریٰ کو جلد سے جلد توجہ دے کر اس کی اصلاح کرنی چاہیے۔ معلوم ہے کہ یہ کام نہ علما کا ہے نہ عوام کا، عوام کے اخلاق کی حفاظت کے لیے حکومت کو قانون بنانا چاہیے، اور ایک اسلامی مملکت کی تشکیل ناممکن ہے، جب تک اس میں اخلاق کے تحفظ کو واجبی مقام نہ دیا جائے۔

عیاش حکومتیں چونکہ حظوظِ نفس کے لیے قائم ہوتی ہیں، وہ اس کی تکمیل کے لیے اپنی مشینری کو حرکت میں لاتی ہیں، ان کا پورا قانونی ڈھانچہ اسی اساس پر قائم ہوتا ہے۔ جو حکومت اسلام کے نام پر قائم ہو، اس کا پورا مزاج اسلامی ہونا چاہیے، نہ وہ غم میں غیر مسلموں کی نقل کرے، نہ وہ خوشی میں اپنے مزاج اور معیارِ اخلاق کو بدلے، اسے پہلے بھی مسلم ہونا چاہیے اور آخر میں بھی مسلم، اس کے تمام انسانی حقوق کے لیے ضروری ہے کہ اسلام کے ارشادات پر پورے اُتریں اور خدا تعالیٰ کی اطاعت اور آنحضرت ﷺ کے اتباع میں ہر کام کریں۔[1]

[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۷/ اپریل ۱۹۶۷ء)

مسجد اہلحدیث مالیر کوٹلہ اور امام الہند مولانا آزاد
جماعتِ اسلامی سے ادباً گزارش

عرصہ ہوا، مالیر کوٹلہ کی جماعتِ اہلِ حدیث میں نزاع ہوا۔ جماعت کے بعض افراد جماعتِ اسلامی سے متاثر تھے اور بعض غیر متاثر تھے، اس نزاع کا اثر ہم لوگوں تک بھی پہنچا۔ اس وقت جو سمجھ میں آیا، نصیحت کے طور پر احبابِ مالیر کوٹلہ سے عرض کر دیا گیا، لیکن احبابِ مالیر کوٹلہ نے بوقتِ ضرورت استعمال کے لیے اسے محفوظ رکھا۔

معاملہ بڑھتا رہا۔ حکومت نے مداخلت کی اور بالآخر معاملہ حضرت امام الہند کے ہاتھ میں چلا گیا۔ حضرت مولانا کی جلالتِ قدر سے یہ امید نہ تھی کہ وہ کوئی جانبدارانہ فیصلہ فرمائیں۔

حضرت مولانا کا فیصلہ:

حضرت مولانا کا فیصلہ جب اخبارات میں آیا تو ہم لوگوں کو اس سے بے حد مسرت ہوئی۔ حضرت مولانا کے فیصلے میں دینی بصیرت، سیاسی بالغ نظری کے علاوہ جماعتی نفسیات کو بھی پوری طرح ملحوظ رکھا گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی جماعتِ اہلِ حدیث اور جماعتِ اسلامی کے وقار کو بھی اس سے کوئی صدمہ نہیں پہنچا تھا، بلکہ ضمناً دونوں جماعتوں کے موقف اور ان کی اہمیت بھی اس سے ظاہر ہوتی تھی، اور دونوں کے لیے مولانا کے فیصلے میں احترام کے جذبات موجود تھے، اور ظاہر ہے کہ حضرت مولانا کے سوا ان مصالح کو کوئی دوسرا شاید صحیح طور پر ملحوظ بھی نہ رکھ سکتا۔

یقین تھا کہ جماعت کے دونوں گروہ اس فیصلے پر مطمئن ہو جائیں گے اور کوئی نزاعی مسئلہ باقی نہیں رہے گا۔ شرعی ادب اور اخلاقی رفعت کا تقاضا بھی یہی تھا کہ اس فیصلے کے خلاف کوئی آواز نہ اُٹھتی۔ ہندوستان کے ماحول میں مسلمانوں کی آبرومندی بھی اسی میں تھی کہ فیصلہ طوعاً قبول کر لیا جائے۔

کتابچہ:

مگر میری تعجب کی کوئی حد نہ رہی، جب مالیر کوٹلہ سے بذریعہ ڈاک ایک کتابچہ موصول ہوا، جس میں مولانا کے فیصلے پر تنقید کی کوشش کی گئی ہے۔ تنقید نہیں، بلکہ ایک قابلِ احترام شخصیت پر کیچڑ اُچھالنے کی یہ ناتمام کوشش ہے۔ ثالث تسلیم کر لینے کے بعد یہ اندازِ تنقید نہ شرعاً درست ہے نہ اخلاقاً۔ اس کا یہ اثر ہوگا کہ آیندہ کوئی

شریف آدمی آپ کو پوچھے گا بھی نہیں کہ آپ میں وجہ نزاع کیا ہے اور اخلاق کی دنیا میں آپ کی کوئی قیمت نہ ہوگی۔

1 یہ تنقیح بالکل بے معنی ہے کہ نزاع اہلِ حدیث کے دو گروہوں میں ہے۔ جماعتِ اسلامی کا دامن اس سے بالکل پاک ہے۔ نزاع کا ایک سبب تو بہر حال یہ ہے کہ جماعتِ اہلِ حدیث کا ایک گروہ جماعتِ اسلامی سے متاثر ہے اور دوسرا نہیں۔ مولانا کے فیصلے سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے۔ مولانا نے فیصلے کے آغاز میں لکھا ہے کہ جماعت کے دونوں فریق چاہتے ہیں کہ معاملہ آپ کے سامنے پیش ہو۔ الخ (کتابچہ، ص: ۴۴)

صفحہ (۴۵) میں بھی مولانا نے اسے دہرایا ہے، بالآخر یہ تفرقہ یہاں تک بڑھا کہ بعد میں دو جماعتیں ہوگئیں، ہماری دانست میں نہ مولانا پر کوئی الزام عائد ہوتا ہے، نہ جماعتِ اسلامی کا دامن اس آویزش سے پاک ہی ہوسکتا ہے۔

2 مولانا نے کہاں فرمایا ہے کہ مساجد میں سیاسیات کا ذکر نہ آنا چاہیے۔ اس کے لیے مولانا کے خلاف کتابچہ کے مولف نے الہلال اور البلاغ کی ورق گردانی کی بے فائدہ تکلیف فرمائی۔ فیصلے میں متعدد مقامات پر سیاسی کے ساتھ مذہبی جماعتوں کا بھی ذکر فرمایا، جس کا مقصد بالکل واضح ہے کہ مختلف افکار کی حامل جماعتیں مذہبی ہوں یا سیاسی؛ اُن کو دوسرے طریقِ فکر کی مساجد کا استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ اس میں شک نہیں کہ جماعتِ اسلامی سے متاثر حضرات اہلِ حدیث بھی ہوں تو ان کا طریقِ فکر غیر متاثر حضرات سے یقیناً مختلف ہوگا۔ اس لیے کسی فریق کو دوسرے کی مساجد پر قابض ہونے کی کوشش کرنا مناسب نہیں۔ اگر متاثر حضرات کے پاس کوئی مسجد ہو تو غیر متاثر فریق کو اصولاً اس پر قابض ہونے کی سعی نہیں کرنی چاہیے۔ وقت کی سیاسی تحریکات سے بے تعلقی کا تذکرہ مولانا کے فیصلے میں ضرور ہے۔ کتاب و سنت کی سیاست سے اجتناب کی تلقین مولانا نے نہیں فرمائی۔ ہوسکتا ہے کہ کوئی وقتی سیاسی نظریہ مولانا کی نظر میں کتاب و سنت سے ماخوذ نہ ہو۔ اس پر آپ حضرات کو اپنے اپنے نظریات پر غور فرمانا چاہیے۔ اس کا یہ مطلب کیسے سمجھا گیا کہ مولانا مساجد میں سیاسی تذکرہ مناسب نہیں سمجھتے؟ مولانا کے فیصلے کا مطلب یہ ہے کہ لادینی سیاسیات میں مسجد، منبر اور دین کی پناہ نہیں لینا چاہیے۔

3 مولانا کے فیصلے میں اس تہمت کے لیے بھی کوئی گنجایش نہیں کہ مولانا آزاد مسلکِ اہلِ حدیث کو ایک فرقہ یا پارٹی تصور فرماتے ہیں۔ پھر مولانا کے فیصلے سے اسے خواہ مخواہ کشیدہ کرنے کی کوشش کرنا ایک نازیبا کوشش ہے۔ مولانا کے فیصلے میں اگر کوئی ایسی چیز تھی بھی تو اس پر غیر متاثر حضرات کو احتجاج کا حق تھا۔ آپ حضرات نے تو مودودی صاحب کے نظریات سے کچھ نہ کچھ استفادے کی کوشش فرمائی ہے۔

مَیں نے مولانا کا فیصلہ بار بار پڑھا ہے، مجھے کوئی ایسی چیز نظر نہیں آئی، جس سے یہ سمجھا جائے کہ اہلِ حدیث

کوئی فرقہ ہے یا ان کا مقصد کتاب و سنت کے سوا کچھ اور بھی ہے، بلکہ ان کا مقصد تو یہ ہے کہ مسلکِ اہلِ حدیث کو ''وقتی'' سیاست کی آمیزش سے پاک رکھنا چاہیے۔

اس لیے احبابِ مالیرکوٹلہ سے ادباً گزارش ہے کہ وہ اس قسم کے کتابچوں کی اشاعت بند فرمائیں۔ مولانا پر خواہ مخواہ کیچڑ اُچھالنے کی سعی نہ کریں، بلکہ آپ حضرات کو مولانا کا ممنون ہونا چاہیے کہ مولانا کے فیصلے نے آپ سب حضرات کو عدالتوں کی خجالت سے بچا دیا۔

مولانا سے خلش:

ہمیں علم ہے کہ جماعتِ اسلامی کے اکابر سے لے کر اصاغر تک مولانا آزاد سے دیرینہ خلش رکھتے ہیں۔ کبھی اُن کے علم پر اعتراض ہوتا ہے، کبھی ان کی عربیت پر بحث ہوتی ہے، کبھی اُن کے سیاسی نظریات پر چہ میگوئیاں ہوتی ہیں۔ میرا خیال تھا کہ یہ بیماری صرف پاکستانی اکابر تک محدود ہوگی، مگر آپ کے کتابچے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی جماعتِ اسلامی کا ذہن بھی مولانا کے متعلق صاف نہیں۔

مجھے دُکھ ہوا کہ مولانا کے ارشادات سے کھینچ تان کر وہ بات نکالی جا رہی ہے جو شاید مولانا کے وہم میں بھی نہ ہو۔ یہ تو شکر ہے کہ مولانا عام علما کی طرح ذکاوتِ حس کے مریض نہیں، ورنہ کبھی کی ایک جنگی صورت پیدا ہوگئی ہوتی۔ کون نہیں جانتا کہ اہلِ علم میں ایک طبقہ چھچھور پن کو حمیتِ دینی کا نام دے کر ہر بے عنوانی کر سکتا ہے؟ جماعتِ اسلامی کو کتابچہ میں اس لہجہ سے بچنا چاہیے تھا، مگر افسوس کہ وہ نہیں بچ سکی۔ مولانا کے فیصلے سے مولانا محمد امین صاحب[1] یا بعض دوسرے دو چار دوستوں کو ذاتی طور پر تکلیف ہونا قدرتی بات ہے، اور ثالث بھی مجبور ہے، وہ دونوں مخالف فریقوں کو کیسے خوش کر سکتا ہے؟ اصلاحِ ذات البین کے پیشِ نظر اس تکلیف کو گوارا کرنا چاہیے۔

علماے کرام کے فتوے:

مولانا کے فیصلے میں جماعتِ اسلامی کے عقائد یا ان کی اقتدا کے متعلق نفیاً یا اثباتاً کوئی معمولی اشارہ بھی نہیں، مگر کتابچہ کا کافی حصہ اُن فتووں سے بھر دیا گیا ہے، جن سے جماعتِ اسلامی کو شاید کچھ فائدہ پہنچ سکتا ہو، اور یہ فتوے غالباً مولانا کے فیصلے سے بہت پہلے کے حاصل کیے گئے ہیں۔ مولانا کے فیصلے کے ساتھ ان کا کوئی

[1] مولانا محمد امین اثری، جو اس مسجد کے امام تھے اور جماعتِ اسلامی سے متاثر۔ انھی کی بنا پر مسجد میں نزاع کی صورت پیدا ہوئی تھی۔ آپ محدثِ ہند علامہ محمد عبدالرحمن مبارک پوری کے برادر بزرگوار حکیم محمد شفیع کے فرزند تھے اور بعمر چار سال والد کی وفات کے بعد آپ کی تربیت مولانا مبارک پوری ہی کے سایہ عاطفت میں ہوئی۔ آپ ۲۰۰۰ء کو فوت ہوئے۔ ہندوستان کے معروف محقق اور عالم دین غازی عزیز مبارک پوری آپ ہی کے صاحبزادے ہیں۔

جوڑ نہ تھا۔ جوڑ لگانے کے لیے مولوی عبداللطیف صاحب کی تقریر کا تذکرہ یوں ہی ڈالا گیا، حالانکہ رفعتِ اخلاق کا تقاضا یہ تھا کہ اس قسم کی تیز اور مبالغہ آمیز تقریر کا ذکر بھی نہ کیا جاتا، خصوصاً جبکہ جماعت کے سنجیدہ حضرات نے اس قسم کا کوئی فتویٰ آپ کے خلاف نہیں دیا تھا، مگر پروپیگنڈے کی عادت بھی ایک مرض ہے۔ جو لوگ اس کے مریض ہیں، وہ کوئی نہ کوئی بہانہ نکال لیتے ہیں۔ ان فتوؤں کی حیثیت پروپیگنڈے سے زیادہ نہیں۔ جس ذہن سے میں نے فتویٰ دیا تھا، مجھے اس کا یہ مصرف معلوم ہوتا تو میں اس کے اس طرح استعمال کی کبھی اجازت نہ دیتا۔ باقی حضرات کے متعلق نہیں کہا جا سکتا کہ وہ دعایت کے اس طریقے کو پسند فرماتے ہیں یا نہیں؟

بعض اکابر علمائے اہلِ حدیث کے فتوے:

علما کے فتوؤں میں مولانا نذیر احمد صاحب، مولانا عبدالجلیل رحمانی، مولانا عبیداللہ صاحب رحمانی، مولانا داود صاحب اور مولانا رضاء اللہ صاحب کے فتوے کافی احتیاط سے لکھے گئے ہیں۔

ان میں اکثر حضرات نے مسلکِ اہلِ حدیث کے ساتھ مولانا مودودی اور ان کی تحریک کا بھی پورا پورا احترام ملحوظ رکھا ہے۔ جماعتِ اسلامی پر اگر تنقید کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تو اس کے اظہار میں الفاظ کے متعلق خاصا بخل ان حضرات کے پیشِ نظر رہا ہے۔ مولوی عبداللطیف کو جس طرح آڑے ہاتھوں لیا گیا ہے، اس کا عُشر عشیر بھی جماعتِ اسلامی کے متعلق مرقوم نہیں، جس کی طرف مصنف کتابچہ نے صفحہ (۱۱) پر توجہ دلائی ہے۔ مفتی کے لیے میرے دل میں پورا احترام ہے، ان کی دقتِ نظر اور وسعتِ مطالعہ کا مجھے اعتراف ہے، ان کے تفقہ فی الدین اور تقوے کا مجھے پورا پورا احساس ہے۔ اپنی بے مائیگی اور قلتِ معرفت کے ساتھ اپنی نارسائیوں سے بھی بے خبر نہیں ہوں، اس کے باوجود ان اہلِ علم کی آرا، اور حضرت امام الہند کے فیصلہ کن ارشادات میں جو فرق محسوس ہو رہا ہے، اس کی افادی حیثیت میں کوئی خفا نہیں۔

جماعت کا موقف:

میں نے کئی سال تک جماعتِ اسلامی کا لٹریچر بڑی عقیدت مندی سے پڑھا۔ مولانا ابو الاعلیٰ سے ذاتی تعارف بھی ہے اور تھوڑے بہت مراسم بھی۔ دستور کے مسئلے میں ان سے پورا پورا تعاون رہا۔ کبھی مخالفت کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔

ہندوستان میں جماعتِ اہلِ حدیث کا شاندار ماضی میرے سامنے ہے۔ وہ تمام خدمات میری نظر میں ہیں، جو احیائے دین کی راہ میں حافظ عبداللہ صاحب غازی پوری اور مولانا عبدالعزیز صاحب رحیم آبادی کے انتقال تک جماعت کے پیشِ نظر رہیں۔ ان کی ایک ایک کڑی میری نظر میں ہے۔ مَیں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں

کہ احیاے دین کی راہ میں جو قربانیاں ہمارے اکابر نے کی ہیں، ان کی نظیر کسی دوسری جماعت میں نہیں۔ اس وقت بھی ہم نے اس مقصد کے لیے جو کچھ کیا ہے، گو ہم نے اس کی تشہیر نہیں کی، مگر اپنی بساط کے لحاظ سے کم نہیں۔ اگر اس میں کوئی کمی ہے تو اس کی ذمے داری ان حضرات پر ہے جو اپنا موقف چھوڑ کر دوسری سٹیجوں کے لیے پابرکاب اور چشم براہ رہتے ہیں۔

حضرات علما کا تاثر:

حضرات علما نے جماعتِ اسلامی کے متعلق جن خیالات کا اظہار فرمایا، وہ انتہائی حزم و احتیاط پر مبنی ہے۔ یہی علم و دیانت کا تقاضا بھی ہے، لیکن اس احتیاط میں جماعتی نفسیات کو نظر انداز کر دیا گیا ہے، اور یہی وہ خوبی ہے جو حضرت امام الہند کے فیصلے میں نمایاں ہے، جسے جماعتِ اسلامی کے اربابِ حل و عقد نے ناپسند فرما کر حضرت مولانا پر کیچڑ اُچھالنا شروع کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو حضرات کسی دوسری جماعت سے متاثر ہوتے ہیں اور اس قدر متاثر ہوتے ہیں کہ وہ دوسری میں شامل ہو جاتے ہیں، اپنے ماحول کے بجائے دوسرا ماحول بدلنے کے لیے آمادہ ہو جاتے ہیں، وہ لازماً اپنے مزاج میں اتنی لچک پیدا کر لیتے ہیں، جس سے دوسرے قلب میں فٹ ہونا انھیں چنداں گراں معلوم نہیں ہوتا۔ یہ باور کرنا پڑے گا کہ ان کی وابستگی جماعت سے اس قدر قائم نہیں رہتی جو جماعت کے ایک مخلص کارکن میں ہو سکتی ہے۔ مزاج، ذہن، طریقِ فکر میں جب تک نمایاں تبدیلی نہ ہو، دوسرے ماحول میں سازگار ہونا مشکل ہوتا ہے، خصوصاً اہلِ حدیث؛ جن کے مزاج میں سنت کے ساتھ ایک معیاری محبت، توحید سے والہانہ وابستگی، بدعات سے اجنبیت اور تنفر، کتاب و سنت کے ساتھ علی نہج السلف رابطہ؛ یہ ایسی خصوصیات ہیں کہ دوسری جماعت میں اجتماعی طور پر اس مزاج کا پایا جانا مشکل ہے، اس لیے کوئی مخلص اہلحدیث بھی اپنی صفوں سے الگ ہو جائے، جماعت کے ساتھ تاریخی ربط تو مانا جا سکتا ہے، لیکن سلفی مزاج کا صحیح طور پر قائم رہنا مشکل ہے۔

مولانا نذیر احمد صاحب اور برادرِ محترم مولانا عبیداللہ صاحب رحمانی کے ارشادات میں یہ چیز قریباً نظر انداز ہوگئی ہے۔ وہ یہ تصور نہیں فرما سکے کہ دوسری جماعت کے تاثر کے بعد نفسیات میں کتنا بڑا انقلاب رونما ہوتا ہے؟!

پاکستان کے متاثرین:

پاکستان میں بہت سے اہلِ حدیث حضرات جماعتِ اسلامی سے متاثر ہیں۔ ان کی میری نظر میں خاص طور پر عزت و احترام ہے۔ یہ حضرات جماعتِ اسلامی سے دیرینہ متاثر ہیں، اس کے ساتھ عملاً اور عقیدتاً بھی اہلِ حدیث ہیں۔ بعض حضرات خاندانی طور پر مسلکِ اہلحدیث کے محسن ہیں، ان کے بزرگوں نے مسلکِ اہلحدیث کی مدتوں

خدمت کی ہے اور ہم لوگ ان کے احسان سے سبکدوش نہیں ہو سکتے۔ یہ حضرات جماعتِ اسلامی کے سرگرم کارکن ہیں، لیکن جماعت اہلِ حدیث کے لیے وہ ٹھنڈے کارکن بھی نہیں، ان کے علم و فضل، مال و دولت سے جماعت کو اتفاق ہے، تاکہ فائدہ پہنچے، ان کے عقیدے میں اب بھی کوئی فرق نہیں، وہ سنت کے عملاً پابند ہیں، لیکن اب اس پابندی میں تعدیہ نہیں۔ جماعتِ اسلامی کے نظام میں وہ اپنے مسلک کی تبلیغ کر ہی نہیں سکتے۔ تاثر کے بعد ان کے رجحانات بہت حد تک مغلوب ہو چکے ہیں۔ جماعتِ اسلامی کی حیثیت ایک عوامی جماعت کی ہے، وہ اپنے حلقہ اثر میں روافض تک کو شامل کرنا اور رکھنا چاہتے ہیں۔ اگر قادیانی کفر بازی کا مشغلہ چھوڑ دیں تو شاید جماعتِ اسلامی ان سے بھی روابط پیدا کرنے کی سعی کرے۔ صحیح المزاج اہلِ حدیث جو امر بالمعروف کی ذمے داریوں کو سمجھتا ہو، یقیناً جماعتِ اسلامی کے موجودہ نظام میں سازگار مقام حاصل نہیں کر سکتا اور نہ وہ اپنے عقیدے میں رسوخ رکھتے ہوئے جماعتِ اسلامی میں مدغم اور منضم ہو سکتا ہے۔

مولانا عبدالغفار حسن ہوں یا مولانا محمد امین، وہ جماعتِ اسلامی کے رکن ہوتے ہوئے کبھی اس ذہن اور مزاج کی اشاعت نہیں فرما سکتے، جس کی دعوت صدیوں سے جماعتِ اہلحدیث نے دی ہے۔ یہی جماعتی نفسیات ہیں جن کو حضرت امام الہند کے نکتہ رس نگاہ نے بھانپا اور یہ جرأت مندانہ فیصلہ دیا کہ مولوی محمد امین صاحب کو جماعتِ اہلحدیث کا منبر استعمال نہیں فرمانا چاہیے۔ مولانا کا فیصلہ ایک اصولی فیصلہ ہے۔ اگر کوئی جامد اہلِ حدیث جماعتِ اسلامی کے منبر پر قبضہ کرتا تو مولانا یقیناً یہ فیصلہ دیتے کہ اہلِ حدیث کو جماعتِ اسلامی کے منبر پر قابض نہیں ہونا چاہیے۔ تعجب ہے کہ ایسے اساسی اور بنیادی فیصلے پر مالیر کوٹلہ کی جماعتِ اسلامی یا اس سے متاثر اہلِ حدیث حضرات کو مولانا کا یہ فیصلہ ناگوار ہو رہا ہے!!

ہم میں اکثر ایسے لوگ موجود ہیں جو جماعتِ اسلامی کی دستوری مساعی کو عزت کی نظر سے دیکھتے ہیں، ان کے ساتھ بوقتِ ضرورت پورا تعاون کیا ہے، لیکن ہم نے بحمد اللہ کبھی سوچا بھی نہیں کہ ہمیں جماعتِ اسلامی میں انضمام یا اشتراک کی ضرورت ہے!!

انفرادی اشتراک:

جماعتِ اسلامی کے لیے بھی یہی مناسب ہے کہ وہ اہلحدیث رفقا کو توڑنے اور جماعتِ اہلِ حدیث کے خلاف پروپیگنڈا کی کوشش نہ کریں۔ اگر ان کو جماعت کا اجتماعی تعاون حاصل ہو جائے تو اس انفرادی اشتراک سے کہیں بہتر ہے، لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ دونوں جماعتوں کے اربابِ حل و عقد تیز مزاج لوگوں کا پورا احتساب کریں اور ایسی کوئی چیز نہ ہونے دیں، جس سے دونوں جماعت میں تصادم کا امکان ہو سکے۔

مالیر کوٹلہ کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ انڈیا کی جماعتِ اسلامی میں ایسے لوگوں کی کمی ہے، جو تدبر

سے باہمی تصادم کو سدھار سکیں۔ اس کتابچہ کی اشاعت سے میرے اس خیال کی مزید تائید ہوتی ہے۔ یہ کتابچہ ایک مذموم کوشش ہے، جس سے اصلاح کے بجائے فساد کی زیادہ امید کی جا سکتی ہے اور مولانا کو اس میں لپیٹنا اور بھی شرارت آمیز کوشش ہے، جس سے پرہیز ضروری ہے۔ مولانا محمد امین صاحب کی خدمت میں مودبانہ گزارش ہے کہ وہ اپنے جذبات کو قابو میں رکھ کر اپنے خداداد علم و شرافت سے دونوں فریق کو شر سے بچائیں۔

اور علماے اہلِ حدیث سے گزارش ہے کہ ہر نئی تحریک میں آپ حضرات شریک ہونے کی کوشش نہ کریں، بلکہ باہم سر جوڑ کر بیٹھنے کی کوشش فرمائیں اور جو کام کرنا ہو، اجتماعی طور پر ﴿وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ﴾ [الشوریٰ: ۳۸] کے اصول پر کریں۔ ایسی انفرادی بھاگ دوڑ سے نہ آپ کی آبرو میں اضافہ ہوگا اور نہ دین ہی کو کچھ فائدہ ہوگا۔

آخر میں مودبانہ گزارش ہے کہ اس سمع خراشی میں اگر کوئی لفظ سمع گرامی پر گراں گزرا ہو تو میں اس کے لیے معافی چاہتا ہوں۔[1]

[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۱۸/ فروری ۱۹۵۵ء)

عائلی قوانین اور جمعیتِ اہلِ حدیث

عائلی سفارشات جمہور کی مخالفت کی وجہ سے اپنی نیند سو گئیں۔ اس وقت کی حکومت انھیں نافذ نہ کر سکی۔ فوجی انقلاب اور آرڈی نینس کے سائے میں بعض ترمیمات کے ساتھ ان کو پھر زندگی ملی۔ ہمارے ملک کی آزاد منش مستورات بلکہ مکشوفات نے صدرِ مملکت سے مل کر دین پسند طبقے اور ملک کے شرفا کی خواہشات کے علی الرغم ملک میں انھیں نافذ کرایا اور جب تک مارشل لاء ملک پر محیط رہا، ان قوانین پر بادلِ ناخواستہ عمل ہوتا رہا۔ مارشل لاء ہٹ جانے کے بعد عائلی قوانین کا رائے عامہ سے پھر تصادم ہوا اور ملک کی سیاسی اور اقتدار کی حریف جماعتوں نے اس سے فائدہ اٹھایا اور یہ ان کا حق تھا، چنانچہ صوبائی اسمبلی نے ان کے واپس لینے کی سفارش کر دی اور اب بھی شاید کسی بڑے آدمی کے سہارے یہ قوانین اپنی زندگی کے دن گزار رہے ہیں، اس سہارے کی تلاش میں بھی ہماری ان بہنوں کی مساعی کا خاصا دخل ہے، جن کی اصطلاح میں آزادی اور آوارگی دو مترادف اور ہم معنی لفظ ہیں۔

صنفِ نازک کے مصائب:

جہاں ان قوانین کے طریقِ نفاذ پر ہمیں جائز اعتراض ہے، وہاں عورتوں کے مصائب اور روز مرہ کے پیش آمدہ حوادث سے بھی صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔ حقیقتاً ہماری گھریلو زندگی میں خرابیاں ہیں۔ آوارہ مزاج اور بد کردار عورتوں کے ساتھ شریف اور پاکباز عورتیں بھی ان ناہموار حوادث کا شکار ہو رہی ہیں، ان کی دادرسی نہ کرنے کا یہ معنی ہوگا کہ گندم کے ساتھ گھن بھی پستا رہے۔ اقتدار کی حریف جماعتیں جس انداز سے تصادم کر رہی ہیں، اس سے خطرہ ہے کہ مفید اور ضروری چیزیں بھی انتقام کی نذر ہو جائیں، اور اگر ایسا ہوا تو یہ ایک سانحہ ہوگا۔

آج سے کئی سال پہلے ۱۹۳۹ء میں کاظمی بل اُس وقت کی بعض خرابیوں کی اصلاح کے لیے علما کے مشورے سے پاس ہوا تھا، اسی طرح حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ نے "الحيلة الناجزة للحليلة العاجزة" لکھی، اس کی بعض جزئیات میں انھوں نے فقہ شافعی، مالکی اور حنبلی سے استفادہ فرمایا، کیونکہ فقہ حنفی ان حالات میں معاشرے کی وقتی ضرورت کا ساتھ نہیں دے سکتی تھی۔

انصاف پسند علما نے ہمیشہ امت کے مصائب کو دردمندی کی نگاہ سے دیکھا اور اگر ضرورت محسوس ہوئی تو

تقلید کی پابندیوں کو توڑ کر انھوں نے وقت کی ضرورت کا ساتھ دیا۔ مولانا تھانوی رحمہ اللہ کی یہ کوشش اور کاظمی بل ارتداد کی کثرت کو روکنے کا ایک بنیادی اور اساسی ذریعہ تھے، اس بل کے پاس ہونے سے ملک میں ارتداد کی تعداد نفی کے برابر ہوگئی، اس وقت کی انگریزی حکومت نے بھی اسے منظور کر لیا اور یوں صلح و آشتی اور علما کی دور اندیشی سے یہ مسئلہ ایک حد تک خوش اسلوبی سے طے ہوگیا۔ کاظمی بل میں قاضی کے مسلمان ہونے کی شرط نہیں قبول کی گئی تھی، جس پر بعض اہلِ علم مصر تھے۔

پیشِ نظر قوانین میں بھی اقتدار سے ٹکرانے کے بجائے مناسب یہ ہے کہ اربابِ اقتدار اور ملک کے بہی خواہ معاشرے کی اصلاح اور عائلی ضرورتوں اور نقائص کے متعلق سر جوڑ کر بیٹھیں اور ان قوانین پر نظرِ ثانی کریں، مفید چیزیں لے لی جائیں اور خلافِ شریعت قوانین نظر انداز کر دیے جائیں۔

اہلِ حدیث اور ان کا مزاج:

جماعتِ اہلِ حدیث چونکہ اقتدار کی حریف نہیں۔ انگریزی اقتدار کے سوا ہم نے کسی اقتدار کے ساتھ بطورِ حریف تصادم نہیں کیا، البتہ تاریخ بتاتی ہے کہ اہلِ حدیث ہر زمانے میں ہر اقتدار کے نقاد ضرور رہے ہیں۔ اس راہ میں انھوں نے بڑی سے بڑی اذیت برداشت کر لی، لیکن تنقید سے دست بردار نہیں ہوئے۔ ائمہ حدیث نے یہ فرض اس وقت بھی ادا کیا، جب اقتدار کی زمام کافی حد تک امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے ہاتھ میں تھی اور اس وقت بھی ادا کیا جب اقتدار پر قبضہ مامون اور واثق کا تھا، لیکن یہ اقتدار کے حریف کبھی نہیں بنے، بلکہ شاہی درباروں سے کہیں دور بسیرا کیا۔ رحمهم الله

مسائل پر غور کرتے وقت بھی اہلِ حدیث کا مزاج یہ ہے کہ نہ وہ اندھا دھند کسی چیز کو قبول کرتے ہیں نہ مسترد۔ مناسب یہی ہے کہ مسائلِ شرعیہ پر غور کرتے ہوئے سیاسی مصالح سے بالا ہو کر ادلۂ شرعیہ اور مصالحِ اُمت کی روشنی میں غور کیا جائے۔ انھوں نے جب ائمۂ اسلام کی تقلید کو اپنا معمول قرار نہیں دیا تو سیاسی رقابت کو ذہن میں کیوں جگہ دی جائے؟ قاضی حفیظ اللہ کا مضمون میں نے دیکھا ہے، وہ شاید کسی اخبار سے متاثر ہو کر لکھا گیا ہے۔ مودودی صاحب کی خواہش تھی کہ مولانا غزنوی رحمہ اللہ کے خلاف اہلِ حدیث حضرات لکھیں۔ ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ قاضی احمد اللہ صاحب کے بعد یہ خاندان جماعتِ اسلامی سے از بس متاثر ہے اور مسلکِ اہلِ حدیث سے بہت ہٹ چکا ہے۔

منکرینِ سنت:

جماعتِ اسلامی کے اخبارات نے طعن کے طور پر فرمایا ہے کہ عائلی قوانین کی حمایت منکرینِ سنت پرویزی کر

رہے ہیں یا اہلِ حدیث۔ یہ طعن انصاف پسندی پر مبنی نہیں۔ منکرینِ سنت قریباً ان قوانین کی پوری کھیپ کو مانتے ہیں، جبکہ اہلِ حدیث نے ان میں سے صرف چند اشیا کو پسند کیا ہے اور وہ بھی من وعن نہیں، ان میں بھی ہنوز ترمیم کی ضرورت ہے۔ یہی مسلکِ اہلِ حدیث کا مزاج ہے۔ وہ فرعی مسائل میں وہی چیزیں قبول کرتے ہیں، جو سنت کے مطابق ہوں اور اَوفق بالمصالح۔

جمعیتِ اہلِ حدیث کی قرار داد:

اس ضمن میں جو مضمون مولانا غزنوی کے قلم سے شائع ہوا ہے، وہ جمعیت کی ایک قرار داد کا نتیجہ ہے۔ قرار داد میں فیصلہ کیا گیا تھا کہ علما کا ایک بورڈ عائلی قوانین پر غور کر کے اپنی رپورٹ پیش کرے۔ اس قرار داد پر بعض معزز رفقا نے قانونی بحث کی ہے اور ظاہر فرمایا ہے کہ اس قرار داد کی قانونی نوک پلک درست نہیں۔ جہاں تک میرا خیال ہے، اگر یہ درست ہے تو اس پر بحث عاملہ یا شوریٰ میں ہونی چاہیے، اخبار کے صفحات اس کے لیے موزوں مقام نہیں۔ اچھی اچھی مجالس میں دیکھا گیا ہے، انتہائی کوشش کے باوجود قانونی خامیاں رہ جاتی ہیں، اس کا اصل علاج رفقا کا اعتماد ہے، اس باہمی اعتماد ہی کی بنا پر جماعتی نظم ونسق کا سفر اپنی آخری حدود تک جاری رہ سکتا ہے۔ بورڈ کی میٹنگ کئی گھنٹے ہوتی رہی اور پیشِ نظر مسئلے کے مختلف پہلو تھے جن پر غور کیا گیا اور اصحابِ فکر نے اپنے افکار سے مستفید فرمایا۔

جہاں تک میرا حافظہ میری مدد کرتا ہے، بورڈ اس امر پر متفق تھا کہ ہماری راہ ان جماعتوں سے مختلف ہونی چاہیے، جو حکومت کے ساتھ اقتدار کی حریف ہیں۔ ہمارے غور کا انداز سیاسی نہیں بلکہ علمی ہونا چاہیے۔ رجسٹریشن کے متعلق قریباً سب کا اتفاق تھا کہ اس میں کوئی خطرہ ہو تو اس کی ممکن اصلاح کے بعد رجسٹریشن کو قبول کر لینا چاہیے۔ تعددِ ازواج پر پابندی کے متعلق آرا مختلف تھیں۔ بعض احباب معاشرے کی بے اعتدالیوں کو دیکھتے ہوئے اس حق میں تھے کہ پابندی عائد ہوجائے اور عورت کی مظلومت کا تھوڑا بہت جو علاج ہو سکے، ہوجانا چاہیے۔ زیادہ تر یہی رجحان تھا، لیکن بعض حضرات زیادہ دور اندیشی سے کام لے رہے تھے، ان کا خیال تھا کہ موجودہ برسرِ اقتدار طبقے پر دین کے معاملے میں اعتبار نہیں کیا جا سکتا، اس لیے ان کے توسط سے کوئی پابندی عائد نہیں ہونی چاہیے۔ اربابِ اقتدار اسے حسبِ عادت غلط استعمال کریں گے، اس کے علاوہ یہ طبقہ اسلام اور اس کی حدود سے قطعی نا آشنا ہے اور مطلق جاہل۔ طلاق کے اثر کے لیے نوے دن کی قید لگا کر ان حضرات نے مضحکہ خیز لاعلمی کا ثبوت دیا ہے، اس لیے ایسے اربابِ اقتدار کو دین کے متعلق کوئی اختیار تفویض نہیں ہونا چاہیے۔ یہ خطرہ کافی حد تک ہے بھی صحیح، لیکن خطرہ کہاں نہیں؟ سیاسیات، معاشیات، معاشرتی امور میں اربابِ اقتدار کی لاعلمی، بے اعتنائی خرابی کا موجب ہو رہی ہے۔ جب اقتدار ہے تو وہ اچھا یا برا اپنا کام کرے گا اور موجود

حالات میں بجبوری اقتدار کا واسطہ لینا ہی پڑے گا، اس لیے جو ملتا ہے لے لینا چاہیے اور باقی کے لیے کوشش جاری رہنی چاہیے۔

غرض بورڈ کے ممبر تعددِ ازدواج کی خرابیوں پر متفق تھے، اس کی اصلاح کے لیے اگر کچھ قیود عائد کی جائیں تو وہ اس کو بھی مانتے تھے، یعنی بیماری بھی نظر میں تھی اور اس کے علاج کی ضرورت بھی محسوس ہو رہی تھی۔ اختلاف اس میں تھا کہ طبیب کون ہو؟ موجودہ اقتدار کی معالجانہ حیثیت سب کے نزدیک مشتبہ یا مشکوک ہے، بلکہ یہ لوگ یقینی طور پر اس کے اہل نہیں، لیکن بورڈ کی اکثریت کی رائے یہ تھی کہ جب دوسرا بہتر طبیب موجود نہیں تو جو موجود ہے، اس سے بقدرِ ضرورت فائدہ حاصل کرنا چاہیے۔

قرارداد کن راہوں سے آئی؟ اس کی آئینی حیثیت کیا ہے؟ اس پر بحث کی جا سکتی ہے، لیکن اس میں شک نہیں کہ اس قرارداد کی روشنی میں بورڈ بنا، پھر دفتر کی دعوت پر یہ سب حضرت جمع ہوئے اور طویل غور و فکر کے بعد بورڈ کی اکثریت تعددِ ازدواج پر پابندی کے حق میں تھی۔ مسائل کے متعلق ووٹنگ کی کوئی حیثیت نہیں۔ اگر کوئی مسئلہ بالاتفاق طے ہو جائے تو اس کے متعلق بھی دیانتداری سے اختلاف ہوسکتا ہے۔ اس معاملے میں کسی کو پابند کرنا درُست نہیں، اس لیے اس پر ووٹ نہ ہوئے، لیکن بورڈ کی اکثریت پابندی کے حق میں تھی اور چونکہ ابھی کچھ مُباحث باقی تھے، اس لیے ان پر بحث آیندہ میٹنگ تک ملتوی کر دی گئی۔ بعد ازاں مولانا غزنوی علیل ہوگئے اور بورڈ کی میٹنگ نہ بلائی جا سکی۔ مولانا نے اچھا کیا، اپنی طرف سے بیان دے دیا، اس کے بعد بہتر تھا کہ بیان بازی کا سلسلہ شروع نہ ہوتا۔

مولانا عطاء اللہ صاحب:

عائلی قوانین کے متعلق مولانا عطاء اللہ صاحب نے یہ پوزیشن اختیار فرمائی کہ عائلی قوانین کو بعض دوسری جماعتوں کی طرح کلیتاً مسترد کر دیا جائے اور اس سے کوئی چیز قبول نہ کی جائے۔ مولانا موجودہ اربابِ اقتدار سے بالکل مایوس تھے، وہ ان کی اصلاحات کو جزوی طور پر بھی قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ یہ خطرہ یقیناً ہر دین پسند ذہن میں پایا جاتا ہے۔ ہماری رائے تھی کہ "خذ ما صفا و دع ما کدر" پر عمل کیا جائے۔ اس میں کسی پر کوئی ملامت نہیں کی جا سکتی۔ ہر آدمی کے سوچنے کا ایک طریقہ ہوتا ہے، وہ اسی طرح سوچتا ہے۔ ﴿قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ فَرَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ اَهْدٰى سَبِيْلًا﴾ [بني إسرائيل: 84]

مولانا ایک اور سبب سے بھی مجبور تھے، جس کا تذکرہ انھوں نے اپنے بیان میں فرمایا ہے۔ عائلی قوانین کے نفاذ کے بعد مولانا مودودی صاحب نے مختلف علما کی ایک میٹنگ بلائی، تاکہ اجتماعی طور پر سوچا جائے۔ مولانا غزنوی سفر سے آئے تھے۔ تھکاوٹ کی وجہ سے نہ جا سکے، انھوں نے مولانا عطاء اللہ صاحب کو بھیج دیا۔ اب

یہاں دونوں حضرات کو مغالطہ ہو۔ مولانا عطاء اللہ صاحب یہ سمجھے کہ میری حیثیت نمایندے کی ہے، اس لیے انھوں نے وہاں دستخط فرماتے ہوئے صدر جمعیت اہل حدیث لاہور ارقام فرمایا۔ حضرت الامیر کا خیال ہے کہ مولانا کو حالات کا جائزہ لینے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ دل کا حال تو اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے، لیکن بظاہر یہ اجتہادی غلطی ہے، جس کا سبب ایک دوسرے پر اعتماد ہے۔ نہ مولانا نے مولوی عطاء اللہ صاحب کے حدودِ عمل کا تذکرہ فرمایا نہ مولانا عطاء اللہ صاحب نے اپنے موقف کی وضاحت فرمائی۔

میری ناقص رائے یہ ہے کہ صورتِ حال کچھ بھی ہو، مولانا عطاء اللہ صاحب نے جیسے فرمایا ہے کہ معاملہ پالیسی کا ہے۔ اگر یہ درست ہے تو دستخط کرنے سے پہلے نہ صرف حضرت الامیر سے استصواب ضروری تھا، بلکہ دوسرے رفقا سے مشورہ بھی ضروری تھا۔ غیر مشروط تصدیق ہمارے جماعتی مزاج کے خلاف ہے۔ ہم موجوہ نظامِ حکومت کے نقاد ہیں، سیاسی حریف نہیں۔ ہمارا موقف سیاسی سے زیادہ دینی ہے۔ ہماری سیاست بحمد اللہ دین کے تابع ہے۔ دستخط کرنے کے بعد مولانا عطاء اللہ صاحب یہی راہ اختیار فرما سکتے تھے، جو انھوں نے اختیار فرمائی، اس لیے کہ وہ رفقا سے پہلے اپنا موقف متعین فرما چکے تھے، تاہم یہ ایسا موقف تھا، جس پر باقی ساتھی ان کا ساتھ نہ دے سکے۔ مولانا عطاء اللہ صاحب کے لہجے میں تکدر اور ناراضی کی بو نہ ہوتی تو ان چند حروف کے لکھنے کی ضرورت نہ تھی۔

تعجب ہے ایک طرف تو مولانا عطاء اللہ صاحب یہ فرماتے ہیں کہ عائلی قوانین کے متعلق جمعیتِ اہلِ حدیث نے کوئی پالیسی طے نہیں کی، دوسری طرف اس کی تنسیخ کے مسودے پر غیر مشروط دستخط کر دیتے ہیں اور ساتھ ہی اپنا سرکاری عہدہ (یعنی صدر جمعیت اہلِ حدیث شہر لاہور) تحریر فرماتے ہیں۔

اس کے برعکس مولانا سید محمد داود صاحب غزنوی کا طرزِ عمل ملاحظہ ہو کہ باوجودیکہ بورڈ کی اکثریت ان سے متفق تھی، لیکن انھوں نے اپنے نام سے مضمون شائع کیا اور اپنی سرکاری حیثیت استعمال نہیں فرمائی۔

صحیح طریقِ کار:

اب بھی مناسب یہ ہے کہ حکومت ان قوانین میں یا تو ترمیم کر دے یا انھیں من وعن واپس لے لے اور مستند علما کو جمع کر کے معاملہ ان کے سپرد کر دے، اور چند وکلا یا معاملہ فہم حضرات کو ان کے ساتھ کر دے اور ان کی سفارشات افہام و تفہیم کے بعد قبول کر لی جائیں۔ ایسے معاملات میں خود پسندی اور استکبار نہ حکومت کے لیے مفید ہے، نہ علما اور اصحابِ فکر کے لیے۔

اصل مسئلہ:

رہا اصل مسئلہ تو اس پر بہر حال غور کرنا ہوگا، اس راہ میں عدل کو قائم رکھنے کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے تفسیر سورت بقرہ (ص: ۵۰۷) میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد، جو کتابیات کے ساتھ نکاح سے روکنے کے متعلق ہے، قریباً تین اسانید سے ذکر فرمایا ہے اور ان میں سے ایک سند کو صحیح قرار دیا ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ تفسیری اور اخباری اسانید ائمہ حدیث کے پائے کی نہیں ہوسکتیں۔ اسانید کی نوعیت کچھ بھی ہو، واقعہ ہوا ہے۔ حضرت حذیفہ اور طلحہ بن عبیداللہ نے بھی کسی کتابیہ سے نکاح کیا تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ان دونوں بزرگوں کے متعلق اطلاع ملی، آپ رضی اللہ عنہ سخت ناراض ہوئے اور حکم دیا کہ یہ عورتیں ان سے علیحدہ کر دی جائیں۔ آپ کا خیال یہ تھا کہ اگر یہ عادت چل نکلی تو مسلمان لڑکیوں کے لیے دقت پیدا ہو جائے گی۔

حافظ ابن جریر فرماتے ہیں:

”وإنما کره لطلحة وحذیفة رحمة الله علیهم نکاح الیهودیة والنصرانیة حذرا من أن یقتدي بهما الناس في ذلك فیزهدوا في المسلمات أو لغیر ذلك من المعاني فأمرهما بتخلیتهما“ (تفسیر ابن جریر: ۲/ ۲۲۲)

”حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ اور حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کو آپ نے کتابیہ کے ساتھ اس لیے روکا تھا کہ مسلمان ان کی اقتدا میں اگر کتابیات کے ساتھ نکاح شروع کر دیں تو مسلمان عورتوں سے بے رغبتی ہو جائے گی یا کسی دوسرے سبب سے آپ نے انھیں روکا اور کتابیات کو الگ کرنے کا حکم دیا۔“

اس کے بعد حضرت شقیق سے باسند نقل فرمایا کہ حضرت حذیفہ نے یہودیہ سے نکاح کیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے علیحدگی کا حکم دے دیا۔ حضرت حذیفہ نے پوچھا: کیا یہ نکاح حرام ہے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: حرام نہیں، میں چاہتا ہوں کہ تم ان کے بجائے مسلمان عورتوں سے نکاح کرو۔

اس کے بعد ابن جریر فرماتے ہیں:

”هذا الخبر، وإن کان في إسناده ما فیه، فالقول لإجماع الجمیع علی صحة القول به أولیٰ من خبر عبد الحمید بن بهرام“ (تفسیر ابن جریر: ۲/ ۲۳۲)

”اس حدیث کی سند میں گو ضعف ہے، لیکن اجماع اس پر ہے کہ کتابیات سے نکاح درست ہے، لیکن یہ نہیں ہونا چاہیے کہ کتابیات کو مسلمان عورتوں پر ترجیح دی جائے۔“

اسناد کے مباحث اپنی جگہ، لیکن یہ واقعہ ہوا ہے۔ اس کی وجہ یہی ہو جو بعض روایات میں مذکور ہے یا اس کے سوا کوئی اور وجہ ہو، بہر کیف حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حلال سمجھتے ہوئے اس میں مداخلت فرمائی اور اس سے روکا۔

سوید بن غفلہ، ابو حنظلہ مکی اور عبداللہ بن زبیر سے مروی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ابو جہل کی لڑکی کے ساتھ نکاح کا ارادہ کیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے متعلق اجازت چاہی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اس کی

اجازت نہیں۔ فاطمہ میری لختِ جگر ہے، اس کی ایذا میری ایذا ہے۔ (مستدرك حاكم: ٣/ ١٥٨)

بعض روایات میں اس طرح آیا ہے: "لَا أُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللّٰهُ" (میں حلال کو حرام نہیں کرتا) لیکن اللہ کے رسول کی لڑکی اللہ کے رسول کے دشمن کی لڑکی کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتی، اس حدیث سے دوسرے نکاح میں رکاوٹ سمجھ میں آتی ہے۔ حلال بھی سمجھا، لیکن اجازت مرحمت نہیں فرمائی۔ یہ حدیث بھی صحیح ہے اور معاملہ بھی آنحضرت ﷺ کے گھر کا ہے۔ خواہش مند حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں، مگر اجازت نہیں ملی۔

حضرت فاطمہ کی زندگی میں حضرت علی نے پھر دوسری شادی کا خیال نہیں فرمایا۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے انتقال کے بعد کئی نکاح کیے اور اولاد بھی ہوئی۔

حکومت کے اختیارات:

اب یہ سوال رہ جاتا ہے کہ کسی جائز اور مباح امر کو بعض مقاصد یا مصالح کی بنا پر حکومت روک سکتی ہے یا نہیں؟ یہ دراصل آئینی یا نظریاتی بحث ہے۔ آئینی جماعتیں ان نظریات پر بحث کر سکتی ہیں، لیکن عملاً اس چیز کا کوئی اثر نہیں۔ بااختیار لوگ اپنا کام کرتے ہیں اور نظریات پر بحث ہوتی رہتی ہے۔

اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ موجودہ اربابِ اقتدار واقعی اس کے اہل نہیں کہ ان پر دین کے معاملے میں اعتماد کیا جائے، لیکن مسئلے کی صورت میں یہی مناسب ہے کہ معاشرے کی بے اعتدالیوں کو ختم کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ اصلاحات کو بروئے کار لایا جائے، تاکہ اس مظلوم طبقے کے ساتھ زیادہ سے زیادہ انصاف ہو سکے۔ بنا بریں ہمارے خیال میں حکومت کی بے اعتدالیوں پر تنقید کے ساتھ ساتھ "یکے بگیر و دیگرے را دعویٰ کن" کے مطابق عمل مفید رہے گا۔[1]

---

[1] ہفت روزہ "الاعتصام" لاہور (٢٠ ستمبر ١٩٦٣ء)

دعوۃ الإخوان

اہلِ حدیث کی دعوت ہندوستان میں قریباً ۱۱۱۳ھ میں شروع ہوئی۔ ابتدا میں نشر و اشاعت کی یہ سہولتیں مہیا نہ تھیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب اور ان کے خاندان کی تصانیف اور تدریس ہی اس وقت آلہ مکبر الصوب کا نعم البدل تھیں۔ حضرت شاہ صاحب کی تصانیف بھی اپنے ماحول سے کافی متاثر ہیں۔ حجۃ اللہ البالغہ اور باقی تصانیف میں بہت فرق ہے۔ حضرت شاہ صاحب کے تصوف میں بہت سی ایسی چیزیں موجود ہیں، جن کی اصل بہ صراحت سنتِ صحیحہ میں نہیں مل سکتی۔ ریاضت کی بعض مشقیں قولِ جمیل سے شروع ہو کر صراطِ مستقیم مولفہ حضرت سید احمد شہید رحمہ اللہ تک کم و بیش ایسی ہیں، جن کا سلف سے ثبوت نہیں ملتا ہے۔ تفہیماتِ الٰہیہ میں بعض ایسی چیزیں موجود ہیں، جنھیں دیکھ کر تعجب ہوتا ہے۔ حضرت شاہ صاحب کے ملفوظات اور ان کے مقامِ تسنن کی رفعت میں تطبیق کافی وقت کا موجب ہو جاتی ہے۔

تجدید اور نبوت:

مقامِ تجدید اور مقامِ نبوت میں یہ بھی ایک تفاوت ہے کہ پیغمبر کی نگاہ عزیمت و رخصت کے لحاظ سے پورے ماحول پر ہوتی ہے۔ نتائج و عواقب پورے انشراح کے ساتھ پیغمبر کے سامنے ہوتے ہیں۔ ظرف و حال پر پیغمبر پوری طرح حاوی ہوتے ہیں۔ کبھی چھوٹی سی چھوٹی جزئیات پر کڑی گرفت فرمائی جاتی ہے، کبھی ہمارے نکتہ نگاہ سے اہم امور نظرِ عفو و مسامحت ہو جاتے ہیں۔ ایک خطیب کو "ومن یعصھما" کی ضمیر میں خدا و رسول کو جمع کرنے پر "بئس الخطیب"[1] فرمایا۔ حالاں کہ اگر ظرفِ خطابت کو نظر انداز کر دیا جائے تو بہ ظاہر چنداں اہم نہ تھا۔ اور میدانِ حدیبیہ میں وضو کے پانی اور تبوک پر صحابہ کی منازعت اور ہاتھوں ہاتھ لے جانے کو بالکل گوارا فرما لیا،[2] حالاں کہ یہ ساری عمر میں اپنی نوعیت کا ایک ہی واقعہ ہے، جو سفرائے مکہ کے سامنے پیش آیا۔ بعض نو وارد لوگوں کو پاؤں پر جھکتے دیکھ کر خاموشی فرمائی اور کہیں جھک کر سلام کرنے پر سختی سے مواخذہ فرمایا۔[3]

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۸۷۰)

[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۱۸٦)

[3] جیسے بعض یہودیوں اور وفد عبدالقیس نے ہاتھ پاؤں کو بوسہ دیا تو ان کو منع نہیں کیا۔ (سنن الترمذي، رقم الحدیث: ۳۱٤٤، نیز دیکھیں: سنن أبي داود، رقم الحدیث: ۵۲۲۵) لیکن سلام کے وقت جھکنے سے منع فرمایا۔ دیکھیں: سنن الترمذي، رقم الحدیث (۲۷۲۸)

صلى الله عليه وعلىٰ آله وأصحابه وسلم.

اس کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں کہ مقتضیاتِ وقت کوملحوظ رکھتے ہوئے جہاں جس قسم کے خطرات تھے، ان کا سدِ باب فرمایا، اور جہاں خطرات اس قدر اہم نہ تھے، انھیں نظر انداز فرما دیا۔ ظاہر بین نگاہیں اسے تعارض کہہ سکتی ہیں، لیکن دراصل تعارض کے لیے کوئی جگہ نہیں۔

مجدد کا مقام:

مجدد کے سامنے زندگی کے صرف بعض گوشے آتے ہیں، جن کی اصلاح اس کے پیشِ نظر ہوتی ہے۔ وہی اس کی توجہ کا مرکز بن جاتے ہیں اور کئی اہم چیزیں نظر انداز ہوجاتی ہیں، جن کی اصلاح کے لیے کسی دوسری تحریکِ تجدید کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ حضرت شاہ صاحب بھی اس کلید سے مستثنیٰ نہیں۔ ایک محقق حضرت شاہ صاحب کی تصانیف سے اسی طرح استفادہ کرسکتا ہے۔ اصل معیار کتاب اللہ اور سنت کا سادہ مفہوم رہنا چاہیے۔

حضرت مجدد سرہندی رحمہ اللہ اور شیخ محمد طاہر پٹنوی کی مساعی کو اگر اجمالی سمجھا جائے تو شاہ صاحب سے اس کی تفصیل کا آغاز سمجھنا چاہیے۔ حجۃ اللہ البالغہ، انصاف اور عقد الجید کے پڑھنے والے سمجھ سکتے ہیں کہ یہ دعوت کسی فرقے یا گروہ کے لیے نہ تھی۔ حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی ایسے فرعی اور فقہی گروہوں میں سے بھی شاہ صاحب کے دل میں کسی کے لیے عصبیت نہیں۔ وہ مسائل میں صرف دلائل کی بنا پر گفتگو فرماتے ہیں۔ اصولِ فقہ تک، شاہ صاحب کی تنقید سے نہیں بچ سکے۔

صاحبِ ہدایہ اور علامہ سرخسی رحمہم اللہ شاہ صاحب کی نگاہِ تنقید سے نہیں نکل سکے۔ اس لیے جہاں تک میرا ناقص علم میری راہ نمائی کرتا ہے، میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اہلِ حدیث کوئی فرقہ نہیں، بلکہ اسلام کی وہ صحیح تعبیر ہے، جسے طریقہ سلف یا مسلکِ صحابہ کے مرادف سمجھنا چاہیے۔ اہلِ حدیث مبلغین کو بھی محتاط رہنا چاہیے۔ اگر وہ اسے فرقے کا رنگ دیں گے تو وہ اپنے مخالفین کی نادانستہ حمایت کریں گے۔

ایک انقلابی حادثہ:

اس خاموش تحریک کا اثر اسلامی زندگی کے دو پہلوؤں پر پڑ رہا تھا: تقلیدی جمود کی تخریب اور دلیل و برہان کے لیے اضطراب۔ جس کی پہلی چوٹ بدعات پر پڑتی تھی، جو ہندو اثرات سے اسلامی خاندانوں میں عام ہو رہی تھیں۔ دوم ایک ایسے نظام کی تلاش، جو ٹھیک کتاب وسنت کی تعلیمات کے مطابق ہو اور زندگی کے تمام گوشوں پر حاوی ہو۔ یورپین مدبر اس اٹھتی ہوئی حرکت کے اسباب و دواعی اور نتائج وعواقب سے بے خبر نہ تھے۔ اس تحریک کی خاموشیوں کو توڑنے کے لیے ۱۸۵۷ء کے حوادث یک بیک سامنے آگئے۔ ملک میں ایک

حرکت ہوئی۔ حکومت کے نکتہ نگاہ میں ایک معاندانہ انقلاب ہوا۔ ہندوستان کے اہلِ علم اور تصوف پیشہ حضرات کے اعمال پر مصلحانہ تنقید کی تلخیوں نے صورتِ حال کو اور بھی خطرناک بنا دیا۔ ایک مختصر سی فوج کو دو محاذوں پر لڑنا پڑا۔ دو زبردست فوجوں نے ایک نہایت مختصر اور امن پسند بستی پر حملہ کر دیا، تا کہ اسے آخری نیند سلا دیں۔

وہابیت:

وہابی کا لفظ اس وقت حکومت کے لیے خاص طور پر اشتعال کا موجب تھا، جس کی وضع کا فخر ترکی حکومت کو تھا۔ ترک کے مدبرین نے اسے نجد کی دینی اور اصلاحی تحریک کے لیے استعمال کیا۔ اس تحریک کا آغاز شیخ عبدالوہاب نے فرمایا، جو نجد کے ایک راسخ الخیال اور وقت شناس عالم تھے۔ اس کی تکمیل شیخ محمد اور خاندانِ سعود کی مساعی سے ہوئی۔ اس لفظ کے ساتھ محاربات کی ایک طویل اور درد انگیز داستان سامنے آ جاتی ہے۔ ترک مدبرین کی لاعلمی نے اس بے ضرر غیر سیاسی تحریک کو بے حد خطرناک بنا دیا اور ترک علما کی عاقبت نااندیشی اور جمود نے اسے قوت اور سیاسی اقتدار بخشا۔ اس کا مختصر تذکرہ علامہ شوکانی رحمہ اللہ نے "البدر الطالع بمحاسن من بعد القرن السابع" میں بہ ضمن ترجمہ شریف غالب اور بعض دوسرے تراجم میں فرمایا ہے۔

ہماری سرکار دولت مدار نے وہابیت کا پارسل منگا کر بریلی، بدایوں، لاہور وغیرہ میں تقسیم فرمایا، تا کہ ہندوستان کی تحریکِ توحید کی تادیب کے لیے اسے بوقتِ ضرورت استعمال کیا جا سکے۔ ہمارے پیشہ ور صوفی اور علما نے اسے ضرورتاً استعمال کیا۔ عوام اس سے مشتعل ہونے لگے۔ آن کی آن میں ملک میں ایک جدال کی صورت پیدا ہوگئی۔ مسلمانوں کی متحدہ صفوں میں انتشار پیدا ہوگیا۔ ان مشتعلین کی قیادت مولوی فضل حق خیر آبادی مرحوم اور مولانا احمد رضا خاں بریلوی اور مولانا خیر الدین فرماتے رہے!

وقت کی تدبیر:

اس وقت یہی مناسب سمجھا گیا کہ حکومت اور عوام کے سامنے وضاحت سے آ جائے کہ ہندوستان کی تحریکِ توحید کے لیے یہ نسبت بالکل غلط اور خلافِ واقع ہے۔ نجد کی تحریک کے لیے حنبلیت لازی ہے اور یہاں کسی کی تقلید کے لیے بھی کوئی جگہ نہیں۔ غالباً یہی وہ وقت ہے، جب کہ اخوانِ دیوبند، آزادیِ ہند کے پروگرام کو نظر انداز فرما کر حنفیت کی الگ دنیا بسانے کی فکر میں لگ گئے، تا کہ وہ جہاں وہابیت سے بَری ہوں، وہاں ان مصائب اور ذمے داریوں سے بھی بچ نکلیں، جو ان مصائب کا موجب ہو سکتی تھیں۔ ادھر گرفتارانِ بلا بھی اس غلط فہمی میں مبتلا ہوگئے کہ شاید حکومت معصومانہ غلطی کر رہی ہے۔ ممکن ہے یہ غلطی رفع ہونے کے بعد حکومت آزادیِ ہند

اور اشاعتِ توحید کا راستہ کھلا چھوڑ دے۔ اہلِ حدیث علما سے ان مساعی میں مولانا محمد حسین بٹالوی مرحوم پیش پیش تھے۔ آزاد خیال حضرات سے اختلافِ مسلک کے باوجود سرسید احمد خان مرحوم کی کوشش کو غلط کہیے یا صحیح، واقعہ کی صحت کے بعد ان مساعی میں نہ کوئی شرعی نقص ہے نہ کوئی عیب۔ نظام باطل ہی کیوں نہ ہو، اس سے جائز استفادے میں شرعاً کوئی حرج نہیں سمجھتا۔ میں چاہتا ہوں کہ علما اس پر مذاکرات لکھیں، تاکہ مسئلہ واضح ہو جائے۔ اس تدبیر میں کسی قدر کامیابی ہوئی یا تحریک کے گرم عنصر کو ٹھنڈا کر دیا گیا۔ بہر کیف فضا میں کسی قدر سکون ضرور آ گیا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اس کوشش سے حکومت کے شکوک رفع ہوئے یا پیدا بھی ہوئے تھے یا نہیں۔ لیکن عوام میں یہ بدنامی اب تک کم و بیش موجود ہے۔ معاملے کی نوعیت یہی ہے۔ اسے واقعہ کا اظہار فرمایئے یا ''نئے نام کی سرکاری تصدیق''۔ میرا خیال ہے کہ جن مصائب میں اس وقت وہ لوگ مبتلا تھے، آج کے نئے مجاہدین بھی اگر ہوتے، یہی کچھ کرتے، جو اس وقت کیا گیا۔ بلکہ اگر یہ کوشش نہ کی جاتی اور حکومت اپنے جنون میں جماعت کو کچل کر رکھ دیتی تو شاید ہمارے نقاد اس جرأت کو انتہائی بے وقوفی سے تعبیر فرماتے ؎

تعجبت من هذا الزمان وأهله فما أحد من ألسن الناس يسلم

میری گزارش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ کوشش غلط ہے یا صحیح، اس کے خلوص میں شبہہ نہیں، اور اس حقیقت میں بھی شبہہ نہیں کہ ہندوستان کی تحریکِ توحید نجد کی تحریک کا تتمہ یا ضمیمہ نہیں۔ اس لیے جو ہوا اظہارِ حقیقت تھا، غلط بیانی نہیں۔ آج بھی بعض مقامات میں یہ حال ہے کہ اگر وہاں کے عوام نہیں، پڑھے لکھے حضرات بھی یہ سن پائیں کہ کوئی شخص ان خیالات سے متاثر ہو گیا ہے، اس وقت پہلا حملہ تو یہی ہوگا کہ اسے مسجد سے نکالا جائے اور دوسرا یہ کہ اس سے مقاطعہ کیا جائے۔ میرا اپنا یہ حال ہے کہ مَیں نے پورے سات سال ایک روشن خیال مجسٹریٹ پیر صاحب کے فتوے کی بنا پر نماز اپنے مکان کی چھت پر پڑھی۔ فتوے کی شدت کا یہ حال تھا کہ مجھے اقتدا کی بھی اجازت نہ تھی۔ مجھے تو عقیدتاً انگریزی عدالت سے نفرت تھی، لیکن اگر ان حالات میں کوئی شخص اس باطل نظام سے استفادہ کرے تو یہ کس درجے کا کفر ہوگا؟ بینوا توجروا.

غرض وہابی تحریک میں ہزار خوبیاں ہوں، ہندوستان کی تحریک اس سے الگ اور ایک مستقل تحریک ہے۔ اس میں دینی اصلاح کے ساتھ سیاسی سر بلندی لازمی جزو ہے۔ نجد کی تحریک میں سیاست کو ترک مدبروں کی غلطی نے داخل کیا۔ وہاں غلطی کامیاب ہوئی۔ ایک دینی حکومت کی بنیاد رکھ دی گئی۔ یہاں حضرات علما کے فتوے، کامیاب ہوئے۔ تحریک ایک پہلو سے تاحال ناکام ہے، لیکن دوسرے پہلو سے تحریک بہت سے مشکل مراحل کو طے کر چکی ہے۔ اب آپ کو اختیار ہے کہ واپس نہ آنے والے ماضی پر بحث کریں یا آنے والے مستقبل کی تعمیر کا

فکر فرمائیں اور وقت کے مطابق کوئی بہتر پروگرام سوچیں اور اس پر عمل کی کوشش کریں۔ آنے والے ہندوستان میں عن قریب تحریکات کا ایک سیلاب آئے گا۔ ان میں لا دینی تحریکات بھی ہوں گی اور صالح تحریکات بھی۔ ہمیں فیصلہ کرنا ہے کہ ان میں جذب ہو کر حوادثِ زمانہ کی منشا کو پورا کرنا ہے یا دینی مقاصد کی طرف بڑھنا اور انھیں حاصل کر کے خدا کے نزدیک سرخرو ہونا ہے۔ ﴿لَا یَنَالُ عَھْدِی الظّٰلِمِیْنَ﴾ [البقرۃ: ۱۲۴] اور ﴿یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَکُمْ﴾ [التوبۃ: ۳۹] کی سزا بھی موجود ہے اور ﴿عَلَیْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِیْنَ﴾ [الروم: ۴۷] کی بشارت بھی!

وَ لَا تَکُوْنُوْا کَالَّتِیْ نَقَضَتْ غَزْلَھَا:

آخری گزارش یہ ہے کہ جس تحریک کو ہم نے بے حد قربانیوں کے بعد ملک میں مانوس کیا ہے، اسے چھوڑنا اور توڑنا دانش مندی نہ ہوگا۔ آل انڈیا اہلِ حدیث کانفرنس کا نظام جو بحمد اللہ پورے ہندوستان میں پھیلا ہوا ہے، اس کے نقائص کو دور کیا جائے اور اسے مفید تر بنایا جائے۔ میں یقین کرتا ہوں کہ نئی امارتوں اور قیادتوں سے اب بھی یہ بہتر اور مفید ہو سکتا ہے۔ نئی قیادتوں میں فٹ ہونے کے لیے ہمیں بے حد بدلنا پڑے گا۔ مسلمہ خیالات کو بسا اوقات غلط یا غیر ضروری سمجھنا پڑے گا۔ قائدین کی کمزوریوں کو چھپانے کے لیے حیل تلاش کرنے پڑیں گے۔ اس رجعت قہقری سے بہتر ہوگا کہ ہم یہیں سے قدم بڑھانے کی کوشش کریں اور کم از کم اس احساسِ کمتری سے بچیں، جو دوسری غیر متوازن تحریکات میں جانے کے بعد ہم میں خود بہ خود پیدا ہونے لگتا ہے۔ ماضی کی روشنی کو ہم مستقبل کی درخشانی ہی سے قائم رکھ سکتے ہیں اور دینی تحریکات کی رعایت بھی کر سکتے ہیں اور احساسِ کمتری سے بھی بچ سکتے ہیں۔

آل انڈیا اہلِ حدیث کانفرنس:

آل انڈیا اہلِ حدیث کانفرنس کے اندرونی اختلافات سے میں بے خبر نہیں ہوں اور کون سا ادارہ ہے، جس میں اختلاف نہیں؟ وجوہِ اختلاف کی صحت پر غور ہو سکتا ہے۔ حزبِ مخالف کے خلوص کی قدر کی جا سکتی ہے۔ ان دیرینہ اور مخلصانہ مساعی کی داد دی جا سکتی ہے، لیکن کسی متوازی نظام کا تحمل ناممکن ہوگا۔ یہ ایک ایسا فعل ہوگا، جس کا محاسبہ دنیا اور آخرت میں ہمیں دینا ہوگا۔ تفریق بین المسلمین کی ذمے داری اپنے سر پر لینا آسان نہیں، نہ اس کی پاداش کا تحمل ممکن۔ فرض کیجیے کہ میں ایک آدمی کے ساتھ مل کر نہیں بیٹھ سکتا، اس لیے کہ اس کے مزاج سے میرا مزاج مختلف ہے۔ میں اس سے الگ ہو گیا ہوں، لیکن پوری جماعت کو اس کی سزا نہیں دے سکتا۔ اس لیے ہمیں اس اختلاف کو ختم کرنے کے لیے جلد سے جلد تیار ہو جانا چاہیے۔ جن لوگوں سے پچیس سال مل کر کام کیا گیا ہو، آج ان سے یہ تلخی کوئی معقول عذر نہ ہوگا۔

ان گزارشات کے ساتھ میں چاہتا ہوں کہ پورے ہندوستان کے نوجوان کانفرنس کے کام میں دلچسپی لیں اور اسے ایک مقتدر قابلِ قدر اور ایک نمایندہ جماعت بنانے کی کوشش کریں۔ ابھی اس موضوع پر مجھے بہت کچھ کہنا ہے، لیکن جہاں ادارہ اخبار ''اہلِ حدیث'' کی کرم فرمائی کا ممنون ہوں، وہاں مجھے ان کی مشکلات کا احساس بھی ہے، ورنہ مقصد کی پنہائی کا یہ حال ہے:

نہ حسنش غایتے دارد نہ سعدی را سخن بپایاں　　　بمیرد تشنہ مستقی و دریا ہم چناں باقی[1]

[1] ''نہ اس کے حسن کی کوئی انتہا ہے نہ سعدی کے کلام کی، پانی کا طلب گار پیاسا مر گیا اور دریا اسی طرح باقی ہے۔''
ہفت روزہ ''اہلِ حدیث'' امرتسر (۲۲ر جون ۱۹۴۵ء)

نظامِ جماعت اور امارتِ مروجہ

مورخہ ۲۶ رمئی و جون ۴۴ء کے جریدہ ''اہلِ حدیث'' میں مولوی عبدالرؤف صاحب کا ایک مضمون بطورِ مذاکرہ علمیہ شائع ہوا، جس میں ان کا ذاتی رجحان مروجہ امارت کی طرف ہے۔ حضرت مدیرِ محترم کی طرف سے اس پر ایک مختصر سا تنقیدی نوٹ دیا گیا، جس میں مروجہ امارات کے تاریک پہلوؤں کی نشان دہی کی گئی ہے۔ حضرت مولانا اگر اپنے ارشادات کو کچھ مفصل ذکر فرما دیتے تو شاید پیشِ نظر گزارشات کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوتی۔ زیرِ قلم گزارشات حضرت محترم کے ارشادات کی ایک معنی سے تفصیل و تشریح ہے۔ نفعنا اللّٰہ بطول بقائه، و وفقنا الاستفادة من لوامع علومه الساطعة.

مروجہ امارات مصطلح امر سے خالی ہیں، کیوں کہ امرِ مصطلح کے لیے قوت ضروری ہے۔ محض لغوی اطلاق مقصدِ شرع کے لیے کافی نہیں، اس لیے آج کل مروجہ امارتیں مفید ہونے کے بجائے مضر ہو رہی ہیں اور جمع کلمہ کے بجائے مزید انتشار کا موجب ہو رہی ہیں۔ ان میں نفع کے بجائے نقصان زیادہ ہے اور راقم الحروف کو اس باب میں ایک حد تک تجربہ ہے۔

اس میں شک نہیں کہ قرونِ خیر میں آج کل کا آئینی اور جمہوری نظام موجود نہ تھا۔ نظامِ اسلام میں انتخاب اور شوریٰ کے بعد امیر کو کافی اختیارات حاصل ہیں اور قرونِ خیر میں نظام کی صورت نظامِ امارت ہی کی تھی۔

دفاترِ سنت میں لزومِ جماعت اور اطاعتِ امیر کے متعلق بہت تاکید فرمائی گئی ہے، لیکن نصوص میں امارت کی بہ ظاہر دو ہی قسمیں معلوم ہوتی ہیں: امارتِ خلافت اور امارتِ سفر۔ چوں کہ ان دونوں امارتوں کے ظروف بالکل جدا جدا ہیں، اس لیے ہر ایک کے احکام اور مواقع بھی الگ الگ ہیں، ان میں خلط کرنے کی ضرورت کبھی محسوس نہیں کی گئی۔

(۱) امارتِ خلافت میں پوری دنیائے اسلام کی راہنمائی و قیادت ایک ہی امیر کے سپرد ہونی چاہیے۔ یہاں تعدد کو بالکل جائز نہیں سمجھا گیا۔ پہلی صدی کے اواخر میں جب خلافتِ امویہ کی جگہ جبراً خلافتِ عباسیہ نے لے لی تو بعض اموی امرا نے اندلس میں اپنی حکومت قائم کر لی، جو بہ ظاہر عباسی حکومت سے بالکل جدا تھی، لیکن یہ اس ماحول کا لازمی نتیجہ تھی، شرعاً اس کے لیے کوئی جواز کی وجہ نہ تھی، بلکہ مندرجہ ذیل شواہد سے

معلوم ہوتا ہے کہ امیر ایک ہی ہوسکتا ہے:

«إذا بويع لخليفتين فاقتلوا الآخر» رواه مسلم عن أبي سعيد.[1]

و أيضاً: «من أتاكم، وأمركم جميع على رجل واحد، يريد أن يشق عصاكم أو يفرق جماعتكم فاقتلوه»[2] مسلم عن عرفجة، وكذلك عن عبد الله بن عمر.

یعنی ایک امیر کی موجودگی میں اگر کوئی دوسرا شخص الگ امارت بنانے کی کوشش کرے تو اسے قتل کر دینا چاہیے۔

حضرت ابوبکر کی بیعت کے وقت انصار کے مطالبے "منا أمير و منكم أمير" کے جواب میں حضرت ابوبکر کے ارشاد "نحن الأمراء و أنتم الوزراء" (بخاري: ۷/ ۳۰) سے واضح ہوتا ہے کہ وحدتِ امیر پر صحابہ کا اجماع تھا۔ سعد بن عبادہ کا تخلف عن البیعۃ اور حضرت عمر کا انکار اس کی حقیقت اور بھی نمایاں کر دیتا ہے۔ (طبقات ابن سعد: ۷/ ۱۵ مطبوعہ لیدن پریس)

(۲) حضرت علی اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہما کی نزاع، کربلا کے خونی حوادث، اسلامی تاریخ کا یہ تاریک ترین حصہ اس حکم کی تعمیل کا نتیجہ ہے۔

غرض خلافت و امارت کی یہ دو لازمی خصوصیتیں ہیں:

اولاً: دو امیر ہو نہیں سکتے۔

ثانیاً: اگر کوئی دوسرا مدعی ہو تو واجب القتل ہے۔

(۳) منتخب امیر کی بیعت سے جو لوگ الگ رہیں یا بیعت توڑ دیں، ان کی موت جاہلیت کی موت ہوگی:

«ليس أحد يفارق الجماعة شبراً فيموت إلا مات ميتة جاهلية»[3]

(متفق عليه، عن ابن عباس)

غرض اگر خوش قسمتی سے کہیں ایسی جماعت موجود ہو جائے تو اس کی مخالفت کرنا یا اس سے علاحدگی جاہلیت اور بدعت کی موت ہوگی۔ لزومِ جماعت کی احادیث میں بے حد تاکید آئی ہے۔ اگر کوئی امارت شرعی آج کل موجود ہے تو اس سے علاحدہ رہنے والے موتِ جاہلیت کے سزاوار ہوں گے، ان کے ساتھ سیاستاً کوئی رعایت نہیں ہونی چاہیے۔ اگر اربابِ حل و عقد کسی حبشی غلام کو بھی منتخب کر دیں تو اس کی اطاعت ضروری ہوگی۔

آج کل جس قدر امرائے بے امر اور نوابانِ بے ملک ہندوستان میں امارت کے دعوے فرما رہے ہیں،

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (۱۸۵۳)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (۱۸۵۲)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٦٤٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (۱۸۴۹)

ان میں کوئی انتخاب بھی اربابِ حل وعقد نے نہیں کیا، بلکہ اپنے خیال کے چند افراد جمع کر کے کوئی صاحب تختِ امارتِ موہوبی پر قابض ہوجاتے ہیں۔ میرے خیال میں ان امارتوں میں کوئی امارت بھی شرعی نہیں کہلا سکتی۔

④ لازماً شرعی امارت میں ایسا شخص امیر منتخب ہونا چاہیے، جو دین سے پورا واقف ہونے کے ساتھ سیاسیاتِ عالم کا پورا ماہر ہو، تاکہ وہ سیاسیاتِ عالم میں اپنا اور اپنی جماعت کا موقف دیکھ سکے۔ ائمہ مساجد اور علما و مدرسین کرام اس کے مستحق نہیں کہ ان کے سر مبارک پر تاجِ خلاف رکھ دیا جائے اور دل کو تسکین دی جائے کہ امارتِ شرعیہ قائم ہوگئی اور موتِ جاہلیت کا کھٹکا ختم ہوگیا!!

⑤ اس انتخاب کی ذمے داری مذہبِ صحیح کے مطابق صرف ان ہی لوگوں پر ہے، جو وسعتِ نظر اور غزارتِ علم میں اپنے مقام کو سمجھتے ہوں، تاکہ وہ اپنے حالات کے مطابق اپنا پروگرام مرتب کر سکیں اور سیاسیاتِ عالم پر گہری نظر رکھتے ہوئے اپنی راہِ عمل تجویز کر سکیں۔ اس انتخاب میں ہر آدمی ووٹر نہیں بن سکتا اور نہ ہی عامۃ المسلمین پر اس انتخاب کی ذمے داری عائد ہوتی ہے۔

قال النواب في إكليل الكرامة (ص: ٩) و أيضاً (ص: ٧٥):

"إذا تقرر أن هذا النصب واجب بإجماع، فهو من فروض الكفاية، و راجع إلى اختيار أهل العقد والحل فتعين عليهم نصبه، وتجب على الخلق جميعاً طاعته"

یعنی یہ انتخاب اربابِ بست وکشاد کا کام ہے، عامۃ المسلمین کا نہیں۔ عامۃ المسلمین صرف اطاعت کے مکلف ہیں۔

مولانا نے فرمایا ہے کہ آج کل امارت اور حکومتِ الٰہیہ کی تحریکیں شروع ہو رہی ہیں۔ جماعتِ اہلِ حدیث کو بھی اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ أو كما قال. میرے خیال میں امارتِ شرعیہ کوئی موسمی چیز نہیں اور نہ ہی کسی مخصوص اسلامی جماعت سے متعلق ہے، جس کے لیے اس قسم کی فصلی اور حزبی دعوت دی جائے۔ یہ تمام دنیائے اسلام کا فرض ہے، جس کی ذمے داری اربابِ حل وعقد پر ڈالی گئی ہے۔

⑥ اس امیر کا عزل اور علاحدگی کفرِ بواح کے سوا نہیں ہوسکتی۔ معاصی اور کبائر کے ارتکاب سے امیر کو معزول نہیں کیا جا سکتا۔

امارتِ سفر:

امارتِ سفر اس سے بالکل جدا ہے، اس میں متعدد امیر ہو سکتے ہیں، جو اختتامِ سفر کے بعد خود بہ خود معزول ہوجاتے ہیں۔ ان کے انتخاب کا تعلق اربابِ بست وکشاد سے نہیں، بلکہ رفقائے سفر سے ہے، یا خلیفہ کے ساتھ

عسکری ضرورتوں کے لیے، اس امارت کی عمر قصرِ صلاۃ کے برابر ہوگی، جہاں نماز پوری پڑھی گئی، حضرت امیر کی ذمے داریاں ختم ہوگئیں۔

مروجہ امارتیں اور اُن کا نظام ترکیبی:

آج کل کی امارتوں میں جہاں تک امیر کی اطاعت اور ان کے ذاتی حقوق کا تعلق ہے، وہ اپنے زمانے کے خلیفہ ہارون الرشید ہیں، لیکن جہاں تک ان ذمے داریوں کا تعلق ہے، وہ بے چارے بالکل غیر مستطیع ہیں۔ ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ کی مکمل تصویر۔ جہاں تک تحصیلِ زکات اور بیت المال پر قبضے کا تعلق ہے، ہمارے امرا کے اختیارات بالکل مکمل ہیں، لیکن اجراے حدود و تقسیمِ زکات، حدودِ اسلامیہ کی حفاظت اور حقوقِ مسلمین کی حفاظت کا تعلق ہے، وہ انگریزی حکومت کے ادنیٰ غلام ہیں اور ان کے پروگرام کا پورا نقشہ صرف لفظ "إن شاء اللّٰہ" پر ختم ہوجاتا ہے ؎

وإذا تكون كريهة أُدعىٰ لها   وإذا يحاص الحيص يدعىٰ جندب

اور صرف امارتِ سفر کی آڑ لے کر اپنی تمام یا بعض ذمے داریوں سے سبکدوش ہوجاتے ہیں۔ امارت کے اس مکسچر کو میں بالکل نہیں سمجھ سکا۔ ان امارتوں میں نہ تو انتخاب صحیح ہے نہ امیر اہل ہے۔ محض کمپنیاں ہیں، جو عموماً دکان داری کے اصولوں پر کام کرتی ہیں۔ ایسی امارتیں اپنے نظامِ ترکیبی کے لحاظ سے جاہل نظام سے بہت قریب ہیں۔ اس لیے جب تک اُن کا نظام درست نہ ہو اور نظام کی تنفیذ کے لیے مناسب قوت نہ ہو، ان کی طرف دعوت دینا جماعت کی غلط راہنمائی کے مرادف ہوگا۔

یہ صحیح ہے کہ امیر کی کوئی منطقی تعریف شارع سے منقول نہیں اور نہ ہی ایسی عرفی چیزوں کی کوئی جامع مانع تعریف ممکن ہے، لیکن عرف اور محاورے میں خود بہ خود ایسی تعیین ہوجاتی ہے۔ بادشاہ اور بادشاہی کے مختلف مدارج؛ اس کی منطقی جامع مانع تعریف کرنا مشکل ہے، لیکن عرف میں ائمہ مساجد اور تجار اور پیشہ ور لوگوں پر اس کا اطلاق نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح لفظِ امارت اور امیر کی گو جامع مانع تعریف نہ ہو، لیکن عرفاً اس کا اطلاق ائمہ مساجد اور علماے کرام پر نہیں ہوسکتا، کیوں کہ یہاں حقیقتِ امر بالکل ناپید ہے۔

میری مخلصانہ رائے ہے کہ ان بے امر امرا اور بے ملک بادشاہوں کی ایک کانفرنس بلائی جائے اور ان سے گزارش کی جائے کہ یہ حضرات ایک جا جمع ہونے کی کوشش کریں، تاکہ اس حقیقتِ باطلہ میں یہ ظاہری انتشار تو نہ رہے، ورنہ اس جدی کھیل کو بالکل بند کر دیا جائے، تاوقتیکہ مناسب قوت نہ حاصل ہو جائے، اس کے لیے دعوت نہ دی جائے۔ اور مولانا عبدالرؤف ایسے اپنی قلم اور زبانی قوتوں کو جمع کلمۃ المسلمین میں صرف فرمائیں۔ ایسی کمزور اور منتشر امارتیں انتشار کی دعوت ہیں۔

مسندِ احمد کی حدیث:

مولوی عبدالرؤف صاحب نے مسندِ احمد کے حوالے سے ایک حدیث ان الفاظ میں نقل فرمائی ہے:

«لا يحل لثلاثة يكونوا بفلاة من الأرض إلا أمروا عليهم أحدهم»[1]

مولانا نے اس کا ترجمہ بھی اس انداز سے فرمایا ہے کہ کہیں بھی تین آدمی ہوں، ان کو ایک امیر بنانا چاہیے۔ میں نے مسندِ احمد سے اس کی سرسری تلاش کی ہے، مسند عبداللہ بن عمر میں مجھے نہیں ملی۔ امید ہے کہ حضرت مولانا مسند احمد کی طرف مراجعت کے بعد صحیح حوالے یا سندِ حدیث کے متعلق مطلع فرمائیں گے۔

حدیث کے مضمون کا تعلق اگر امارتِ خلافت سے ہے تو بجائے نظام کے یہ حدیث دعوتِ انتشار ہوگی اور متفق علیہ احادیث سے متعارض، جن میں زور دیا گیا ہے کہ امیر ایک ہی ہونا چاہیے اور اگر اس کا تعلق امارتِ سفر سے ہے، جیسے حدیث کے الفاظ کا مقتضا ہے تو اسے اصل مسئلہ امارت میں پیش کرنا بے سود ہے۔ اس وقت پیشِ نظر امارتِ خلافت ہے نہ کہ امارتِ سفر۔

غالباً مولانا نے یہ حدیث "إكليل الكرامة" کے حوالے سے نقل فرمائی ہے۔ مقامِ شکر ہے کہ نواب مرحوم اسے امارتِ سفر کے متعلق سمجھتے ہیں:

"روى الإمام أحمد في المسند عن عبد الله بن عمر: لا يحل لثلاثة يكونون بفلاة من الأرض إلا أمروا عليهم أحدهم. فأوجبﷺ في الاجتماع القليل العارض في السفر تنبيهاً بذلك على سائر أنواع الاجتماع"

یعنی سفر کی عارضی ضرورتوں کے لیے جب امیر ضروری ہے تو باقی بڑے اجتماعات میں بطریقِ اولیٰ امیر ضروری ہوگا۔

اس سے کسی کو انکار نہیں، امیر ہونا چاہیے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہر شہر اور ہر قصبے میں امارت قائم ہو جائے ؎

فتفرقوا شيعا فكل قبيلة فيها أمير المؤمنين و منبر

شرعی اصطلاح کے غلط استعمال سے ایک یہ بھی کھٹکا ہے کہ طبائع اس جھوٹ پر مطمئن ہو جائیں اور اصل امارتِ شرعیہ کی تشکیل ہی معرضِ التوا میں ڈال دی جائے۔ جو لوگ ان مروجہ امارتوں میں شامل ہیں، وہ کچھ اس طرح قانع ہو جاتے ہیں کہ دنیا کے واقعات کتنے ہی تبدیل ہو جائیں، ان حضرات کی طمانیت میں بہت کم جنبش آتا ہے۔

---

[1] مسند أحمد (١/ ٢٧٥) یہ حدیث مسند عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما میں ہے۔

''امارتِ کبریٰ'' کا قیام یوں بھی پھولوں کی سیج نہیں، لیکن انگریزی نظام کی تاریخی ذمے داریوں نے اسے ہندوستان میں اور بھی مشکل تر کر دیا ہے، اس لیے ان کمزور اور فنی امارتوں کو اگر کھلی اجازت دے دی جائے تو عیش پسند حضرات ان دولت خیز اور مفید امارتوں میں کسی صلاحیت کو پسند نہیں کریں گے، چہ جائے کہ کوئی تبدیلی انھیں بے بس کر سکے یا دوسرے کی ماتحتی پر انھیں مجبور ہونا پڑے، حالاں کہ تحریکِ اہلِ حدیث کا اہم مقصد یہی ہے کہ دنیا میں بہترین اسلامی نظام قائم کیا جائے۔ باقی اختلاف فرعی حیثیت رکھتے ہیں۔

خانقاہیں اور اصلاحِ نفس کے معمل:

نظامتِ خلافت کے مضمحل ہونے کے بعد اصلاحِ نفس کے لیے خانقاہوں اور اصطلاحی تصوف کو استعمال کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس سلسلے میں بہت سے مردانِ کار پیدا ہوئے، مگر کون نہیں جانتا کہ آج ان اداروں کی دکان داری سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں۔ ان کارخانوں کی پیداوار اچھے سرمایہ دار پیر موجود ہیں، جو اصلاحِ نفس کی گدیوں کے ساتھ کونسلوں اور اسمبلیوں کی کرسیوں پر بھی قابض ہیں، اور وہ امت کے لیے اس قدر مضر ثابت ہو رہے ہیں، جس قدر خیال نہیں کیا جا سکتا۔ ان زکات اندوز امارتوں کا حشر بھی اس سے بہتر نہ ہوگا۔ اس لیے اس تحریک کو اس وقت تک بند کر دیا جائے، جب تک اس کے لیے کوئی بہتر ظرف نہ پیدا ہو جائے۔

صحیح طریقِ کار:

آج کل کی مروجہ امارتیں اور آئینی جمہوری انجمنیں غیر شرعی ہونے میں برابر ہیں۔ شرعی حیثیت سے دونوں میں خرابیاں ہیں۔ دونوں میں بعض پہلو ایسے موجود ہیں، جن کی موجودگی میں کسی کو بھی شرعی نہیں کہا جا سکتا۔ جاہلی موت سے بچانے میں دونوں قاصر ہیں۔ اس لیے مروجہ امارتیں اور انجمنیں تعاون سے کام کریں۔ جہاں انجمنیں اچھا کام کر رہی ہیں، وہاں امارتیں ان کے زیرِ ہدایت کام کریں، جہاں کوئی امارت اچھا کام کر رہی ہے، انجمنیں اس کے ماتحت کام کرنے سے گریز نہ کریں۔ قواعد و ضوابط میں ایسی تبدیلیاں کر دی جائیں، جن میں موجودہ مشکلات کا حل بھی ہو سکے، مثلاً امیر کے لیے وقت کی تحدید، مجلسِ شوریٰ کا تعین، رائے عامہ سے تعارف کے لیے نمایندگی کا اصول۔ اس قسم کی اور اصلاحیں دونوں نظاموں میں کر دی جائیں، تاکہ آپس میں تصادم نہ ہو۔ آپس کا تصادم بالکل ترک کر دیا جائے۔ امتزاج و تعاون سے کام کیا جائے اور قومی اور مضبوط نظام کی طرف قدم اٹھایا جائے۔ ممکن ہے اس غلامستان میں کوئی اچھا کام ہو سکے۔

عموماً امارتوں کے حسابات گندے ہوتے ہیں۔ حضرات امرا سے گزارش کی جائے کہ اس پر کڑی نگرانی

کریں، ورنہ ایسے لوگوں کو پبلک میں بدنام کر دیا جائے، تاکہ لوگ دھوکے سے بچ سکیں۔

حضرات امرا ماتحتی سے نہ بچیں۔ انسان مدنی الطبع ہے۔ وہ دوسروں کے تعاون سے مستغنی نہیں ہوسکتا، اس لیے وہ امارت کے باوجود ان لوگوں سے مشورہ کریں، جو سلسلہ امارت میں ان کے ساتھ شریک نہیں۔ امیر عبدالعزیز بن سعود کی امارت علی علاتہا ان امارتوں سے بہتر ہے، جو انگریز بہادر کے زیرِ سایہ اُگ رہی ہیں۔ اگر ممکن ہو تو ان امارتوں کا تعلق سلطان ابن سعود سے کر دیا جائے۔ ممکن ہے ان مطلق العنان امرا میں کچھ صلاحیت ہو سکے۔

حضرات امرا مولانا مودودی کا لٹریچر پڑھیں، ان کا نظام اور لٹریچر افراط وتفریط سے ایک حد تک پاک ہے، ان کو اپنے نظام پہ اتنا اصرار بھی نہیں، جتنا افراد اہلِ حدیث کو اپنی امارتوں پر ہے۔ هذا، وقد بقيت خبايا في زوايا، وسنعود لكشف الأستار عن وجوهها إن مست بنا حاجة إلى ذلك.

مسئلہ امارت

اوائلِ جولائی میں مَیں نے مولوی عبدالرؤف صاحب کے مضمون متعلقہ امارت پر تنقیداً کچھ عرض کیا تھا، جس کا جواب مولوی صاحب موصوف کی طرف سے اواخر جولائی میں شائع ہوا۔ موصوف نے ایک چیز کو واضح فرمایا ہے کہ وہ مروجہ امارتوں کے حامی نہیں۔ ان کے مضمون کو خواہ مخواہ ان کی حمایت میں سمجھ لیا گیا۔ جس ظرف اور نہج میں مولانا نے لکھا تھا، اس سے اس کے سوا کیا نتیجہ نکل سکتا تھا؟ مگر مؤصوف کے اس قول کے بعد کہ وہ مروجہ امارتوں کے حامی نہیں، یہ معاملہ ختم ہو جاتا ہے۔

مَیں شرعاً ان امارتوں کو غلط سمجھتا ہوں اور جماعت کے لیے مہلک۔ ان میں نہ انتخاب صحیح نہ امرا اہل نہ حسابات صحیح۔ فی الجملہ نظم کے نام پر بدنظمی کا ایک مظاہرہ ہے۔ میں شکر گزار ہوں کہ موصوف ان مروجہ امارتوں کی حمایت نہیں فرماتے، بلکہ وہ اس سے کچھ بہتر امارت کی تشکیل چاہتے ہیں، جس پر مفصل بحث تو اسی وقت ممکن ہوگی، جب وہ کوئی نظام پیش فرمائیں گے۔ اس وقت ان کے ارشادات سے جو مجمل نقشہ سمجھا جا سکتا ہے، اس میں بعض امور بحث ونظر کے محتاج ہیں۔

امارت وسیاسی قوت:

موصوف نے جواب میں اس موضوع پر زیادہ زور دیا ہے کہ امارت کے لیے سیاسی قوت ضروری نہیں، لیکن میری گزارشات کا جو ملخص دیا ہے، مجھے افسوس ہے کہ اس میں روایت بالمعنی کی احتیاط سے کام نہیں لیا گیا۔ ورنہ موصوف کو "منهاج السنة" اور "إزالة الخفاء" کی طرف رجوع کی ضرورت ہی نہ ہوتی اور نہ ہی

خلافتِ علوی کے حوادث اشتباہ کے سبب بنتے۔ میں نے قطعاً یہ دعویٰ نہیں کیا کہ امیر کو کلی اطاعت و انقیاد حاصل ہو اور بلادِ اسلامیہ کی حفاظت کی پوری طاقت اور مکمل اختیار رکھتا ہو۔ میں نے اپنی گزارشات میں بار بار مناسب طاقت کا ذکر کیا ہے۔

سو اسے اب بھی میں ضروری سمجھتا ہوں۔ اگر محترم کے ملخص سے "کلی"، "پوری"، "مکمل" کے الفاظ نکال دیے جائیں تو "منھاج" اور "إزالة" کے حوالے بالکل بے ضرورت اور خارج از بحث ہو جاتے ہیں۔ میرا مسلک اس میں وہی ہے، جو تمام ائمہ سنت کا ہے، بلکہ ہر عقل مند جو امارت کے مفہوم اور مقاصد کو سمجھتا ہے، وہ اسے قبول کرے گا۔ قوت کی کمی بیشی ہو سکتی ہے۔ حکومتوں کے نظام کی ابتدا اور انتہا میں فرق ہوتا رہتا ہے، لیکن یہ کلی مشکک کسی نہ کسی صورت میں امارت کے لیے ضروری رہی۔ جو لوگ حضرت ابوبکر، حضرت عثمان، حضرت علی، مروان الحمار اور مستعصم باللہ کی امارت کو مانتے ہیں، وہ مکمل اور کلی کے الفاظ کو اس بے پروائی سے کیسے استعمال کر سکتے ہیں؟

مجھے موصوف کی دعوت کے اس حصے سے واقعی اختلاف ہے، جس میں آپ نے فرمایا ہے کہ "یہ کچھ ضروری نہیں کہ حکومتِ کافرہ کے ملکی نظم و آئین میں مداخلت اور تصرف کرنا بھی امیر کی ذمے داری سمجھی جائے۔" میں نے ایسی امارت کو مخنث کہا تھا۔ مجھے اس مفہوم کے لیے جو مناسب لفظ آپ فرمائیں، وہی قبول کر لوں گا، لیکن اس امارت کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں۔ مسٹر گاندھی، مسٹر جناح ملک کے نظم و آئین میں دخل دیں، اس کے لیے صعوبتیں برداشت کریں، مگر جماعتِ حقہ اہلِ حدیث کے امیر صاحب "استطاعت" کے زیرِ سایہ آرام کی نیند سوئیں۔ میں اسے واقعی لفظِ امیر کے ساتھ مضحکہ سمجھتا ہوں۔ اگر امیرِ شریعت کا نظم انگریز اور کافر حکومت کی منظوری یا کم از کم استرضا ہی سے طے ہونا ہے تو اس مذاق کے لیے اس شرعی لفظ کو کیوں استعمال کیا جائے؟ ملک میں بہت سے ادارے بھی کچھ کر رہے ہیں!

قوت کے متعلق ائمہ اسلام کا مسلک:

شیخ الاسلام ابن تیمیہ اپنی کتاب "السياسة الشرعية في إصلاح الراعي والرعية" میں فرماتے ہیں:

"فإن الولاية لها ركنان: القوة والأمانة (إلى أن قال) فالقوة في أمارة الحرب ترجع إلى شجاعة القلب وإلى الخبرة بالحروب، والمخادعة فيها فإن الحرب خدعة" (ص:٦)

”ولایت کے دو رکن ہیں: قوت اور امانت، اور ہر امیر کی قوت اس کے مقام کے لحاظ سے ہوگی۔
امیرِ حرب کے لیے ضروری ہے کہ وہ بہادر ہو اور لڑائی کی چالوں سے واقف ہو۔“

پھر صفحہ (۷) میں فرماتے ہیں:

”والقوة في الحكم بين الناس: إلى العلم بالعدل الذي دل عليه الكتاب والسنة، وإلى القدرة على تنفيذ الأحكام“

”اور قاضی کے لیے ضروری ہے کہ وہ کتاب و سنت کی روشنی میں انصاف کرے اور اپنے احکام کے نفاذ کی اس میں قوت ہو۔“

امام اپنے مرتبے کے لحاظ سے قوت کو امارت کا رکن قرار دیتے ہیں۔ موصوف کوئی ایسی دلیل پیش فرمائیں کہ کبھی کسی کمزور بے سیاست کو بطورِ امیر شرعی تسلیم کیا گیا ہو۔ مروان الحمار اور مستعصم کمزور تھے، مگر جب تک رہے، اپنے ملک کی سیاسیات میں دخل دیتے رہے اور اپنی بساط کے موافق مدافعت کرتے رہے۔ حضرت خالد کو قیادتِ عساکر میں حضرت ابوذر پر ترجیح اسی قوت کی بدولت تھی۔

پھر صفحہ (۱۲) میں فرماتے ہیں:

”فالمقصود من إرسال الرسل وإنزال الكتب أن يقوم الناس بالقسط في حقوق الله وحقوق خلقه، ثم قال تعالىٰ: ﴿وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَأْسٌ شَدِيْدٌ... الخ﴾ فمن عدل عن الكتاب قوّم بالحديد، و لهذا كان قوام الدين بالمصحف والسيف“

”انبیا کی بعثت اور کتبِ الٰہی کے بھیجنے سے مقصد یہ ہے کہ لوگ خدا اور مخلوق کے حقوق میں انصاف کریں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَأْسٌ شَدِيْدٌ...﴾ جو کتاب اللہ سے الگ ہوگا، اسے تلوار سے سیدھا کیا جائے، کیوں کہ دین کا قوام قرآن اور تلوار سے ہے۔“

امیر اور خلیفہ جب پیغمبر کا جانشین ہے، اسے اس ذمے داری سے کیسے سبکدوش کیا جائے؟ اپنی قوت کے موافق معاملات میں دخل دینا پڑے گا۔

شیخ الاسلام حضرت ابوسعید، حضرت ابوہریرہ کی حدیث متعلقہ امارتِ سفر اور حدیث عبداللہ بن عمرو کا ذکر بحوالہ مسند احمد فرما کر لکھتے ہیں کہ سفر کی طرح باقی اجتماعات میں بھی نظم کی ضرورت ہے:

”لأن الله تعالىٰ أوجب الأمر بالمعروف و النهي عن المنكر، ولا يتم ذلك إلا بقوة و أمارة“

’’امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی قوت اور امارت کے سوا نہیں ہوسکتا۔‘‘

شیخ الاسلام کی نگاہ میں تو مجالسِ وعظ کے لیے بھی قوت و سیاست کی ضرورت ہے اور جناب امارت کو بھی اس سے خالی فرمارہے ہیں۔ چوں کہ شیخ الاسلام نے اس کتاب میں ان امرا کا ذکر فرمایا ہے، جو خلیفۃ المسلمین اور امیر عام کے ماتحت ہوں، اس لیے آخر میں وہ امیر عالم کو بھی ان نصوص کا مصداق تصور فرماتے ہیں:

’’والقاضي اسم لمن قضیٰ بين اثنين، وحكم بينهما سواء كان خليفة أو سلطاناً أو والياً أو نائباً‘‘ (ص: ٧)

’’قاضی کا لفظ شرعاً خلیفہ، سلطان اور والی، نائب سب کو شامل ہے۔ صحابہ سے اس طرح منقول ہے۔‘‘

اس لیے تنفیذِ احکام وغیرہ شروط سب کے لیے ضروری ہیں۔ ’’شرح العقائد النسفية‘‘ میں ہے:

’’ويشترط أن يكون من أهل الولاية المطلقة الكاملة سائساً أي مالكاً للتصرف في أمور المسلمين بقوة رأيه وَرَوِيّته و معونة بأسه و شوكته، قادرا بعلمه وعدله وكفايته وشجاعته على تنفيذ الأحكام وحفظ حدود الإسلام وإنصاف المظلوم من الظالم‘‘[1]

یعنی امیر کے لیے ضروری ہے کہ اس میں ولایتِ کاملہ کے اوصاف پائے جائیں، وہ سیاست دان ہو، یعنی اپنی رائے اور قوت وشوکت کی وجہ سے مسلمانوں کے امور میں تصرف کر سکے اور اپنے علم و شجاعت کی وجہ سے اپنے احکام کی تنفیذ اور اسلام کے حدود کی حفاظت اور ظالم اور مظلوم میں انصاف پر اسے قدرت حاصل ہو۔‘‘

آخر میں فرماتے ہیں:

’’إذ الإخلال بهذه الأمور مخل بالفرض من نصب الإمام‘‘ (ص: ٢٣٤، ٢٣٥)

’’ان شروط میں خلل اس فرض کے منافی ہے، جس کے لیے امام مقرر کیا گیا ہے۔‘‘

حضرت شاہ ولی اللہ ’’حجة الله‘‘ (٢/ ١١١) میں فرماتے ہیں:

’’اعلم أنه يشترط في الخليفة أن يكون عاقلًا بالغاً حراً ذكراً شجاعاً ذا رأي وسمع وبصر ونطق، وممن سلّم الناس شرفه و شرف قومه، ولا يستنكفوا عن طاعته، قد عرف منه أنه يتبع الحق في سياسة المدينة، هذا كله يدل عليه العقل، واجتمعت عليه أمم بني آدم على تباعد بلدانهم واختلاف أديانهم على اشتراطها لما رأوا أن هذه الأمور لا تتم المصلحة المقصودة إلا بها‘‘

[1] شرح العقائد النسفية (ص: ١٥٥)

’’خلیفہ کے لیے شرط ہے کہ عاقل، بالغ، بہادر، دانش مند اور معاملہ فہم ہو۔ لوگ اس کی اور اس کی قوم کی شرافت کو تسلیم کرتے ہوں اور اس کی اطاعت سے نفرت نہ کریں، اور معلوم ہو کہ وہ سیاست اور نظمِ ملک میں حق کا متبع ہوگا۔ یہ تمام شرائط عقلاً ضروری ہیں۔ تمام قومیں اختلافِ ادیان و مذاہب کے باوجود اس پر متفق ہیں، کیوں کہ ان شرائط کے بغیر مصالح مقصودہ پوری ہی نہیں ہوسکتیں۔‘‘

شرح مواقف (ص: ۷۳۱) میں فرمایا:

”مقصد ثان في شروط الإمامة: شجاع قوي القلب ليقوى على الذب عن الحوزة“

امام کو بہادر ہونا چاہیے، تاکہ حوزہ ملت سے مدافعت کر سکے۔

قاضی ابویعلی محمد بن حسین الفراء الحنبلی (المتوفی ۴۵۸ھ) فرماتے ہیں:

”أما أهل الإمامة فيعتبر فيهم أربع شروطٍ... الثالث: أن يكون قيما بأمر الحرب والسياسة وإقامة الحدود، لا تلحقه رأفة في ذلك، والذب عن الأمة“[1]

(الأحكام السلطانية)

’’تیسری شرط یہ ہے کہ امام لڑائی اور سیاستِ کاملہ پر ہو اور اقامتِ حدود میں نرمی نہ کرے اور امت سے مدافعت کر سکے‘‘

اس کے بعد حافظ ابویعلی نے دس مقاصد کا ذکر کیا، جن کا تعلق قوت اور غلبے سے ہے۔ میں نے اختصاراً اسے ترک کر دیا ہے۔ ناظرین ملاحظہ فرمالیں۔ ائمہ کی ان نصوص کے بعد امید ہے کہ طبیعت میں شرط اور مقصد کا تغایر نہیں کھٹکے گا، کیوں کہ شرعاً اس میں تغایر ہے، تضاد نہیں۔ موصوف اس پر نظرِ ثانی فرمائیں گے۔

حافظ ابن حزم ”محلی“ (۷/ ۳٦۲) میں فرماتے ہیں:

”وصفة الإمام أن يكون مجتنباً للكبائر مستتراً بالصغائر عالما بما يخصه، حسن السياسة، لأن هذا هو الذي كلف، ولا معنى لأن يراعى أن يكون غاية الفضل، لأنه لم يوجب ذلك قرآن ولا سنة“

’’امام کے لیے ضروری ہے کہ سیاستِ حسنہ میں پورا عالم ہو، کیوں کہ یہ اس کی خصوصیت ہے اور اسی کے لیے یہ تکلیف دی گئی ہے۔ غایت فضیلت کی رعایت کرنے کا کوئی معنی نہیں، امیر کے لیے نہ اسے قرآن نے واجب فرمایا نہ سنت نے۔‘‘

قرآنِ عزیز میں ﴿إِذْ قَالُوا لِنَبِيٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ﴾ [البقرة: ۲٤٦] سے معلوم

---

[1] الأحكام السلطانية (ص: ۲۰)

ہوا کہ نبی کی موجودگی میں امیر کی ضرورت قتال کے لیے محسوس کی گئی۔ ﴿لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ﴾ [البقرة: ٢٤٢] میں بھی بے کار اور کمزور امیروں کو ظالم فرمایا گیا ہے، جو نااہلیت کے باوجود امارت کے شوقین ہوں، جیسے کہ آج کل ہم اپنی جماعت میں دیکھ رہے ہیں۔ أعاذنا الله من ذلك!

لفظِ امیر خود مشعر ہے کہ اسے امر سے خالی نہیں ہونا چاہیے۔ « وَكُلُّكُمْ رَاعٍ وَ كُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ »[1] سے واضح ہے کہ جو راعی رعایا کی ضروریات پر قادر نہیں، اسے راعی کہلانے کا کوئی حق نہیں۔ معلوم نہیں امارت کے شوقین ان نصوص پر کیوں غور نہیں فرماتے؟!

ائمہ اسلام کی ان تصریحات سے امارت بلا سیاست وقوت کی حقیقت واضح ہوجاتی ہے۔ جو چیز اپنے مقاصد سے خالی ہو، اس کی حقیقت جسم بے روح سے زیادہ نہیں۔ ائمہ سلف نے اس شرط کو تفصیلاً اور اجمالاً ذکر فرمایا ہے، کیوں کہ اس وقت کمزور امارتوں کے مفاسد واضح نہ تھے اور نہ ہی مسلمان اتنے کم سواد تھے کہ ایک بے حقیقت چیز کو اتنا بڑا نام دے دیں۔ مجاز کو بھی حقیقت کے ساتھ کچھ ربط ہوتا ہے، ہماری امارتوں میں اتنا بھی ربط نہیں۔

امام شوکانی رحمہ اللہ کے زمانے میں یہ مفاسد غالباً واضح ہو چکے تھے، اس لیے ان کا ارشاد بہت مفصل اور واضح ہے، جسے نواب صدیق حسن خاں رحمہ اللہ نے "إكليل الكرامة بمقاصد الإمامة" (ص: ٧٠) میں ذکر فرمایا ہے:

"قال الشوكاني في وبل الغمام: وعندي أن ملاك أمر الإمامة والسلطنة وأعظم شروطها وأجل أركانها أن يكون قادراً على تأمين السبل وإنصاف المظلومين من الظالمين، و متمكناً من الرفع عن المسلمين إذا دهمم أمر يخافونه كجيش كافرٍ أو باغ غير متقاعد عن ذلك، ولا متثبط ولا عاجز، ولا مشغول بملاذه مؤثراً للدعة والسكون، فإذا كان بهذه المثابة فهو السلطان الذي أوجب الله طاعته، وحرم مخالفته، بل هذا الأمر هو الذي شرع الله له نصب الأئمة والسلاطين، وجعل ذلك من أعظم مهمات الدين، ولا يضر الإمام نقص شرط أو أكثر من شروط ذكروها مهما كان قائماً بما ذكرناه، فليس للمسلمين حاجة في إمام قاعد في مصلاه، ممسك سبحته موثراً لمطالعة الكتب العلمية، يدرس فيها لطلبة عصره، مصنف في مشكلاتها، متورع عن سفك الدماء والأموال، و المسلمون يأكل بعضهم بعضاً، ويظلم قويهم ضعيفهم، ويضطهد شريفهم وضيعهم، فإن الأمر إذا كان بهكذا لم يحصل من الإمام والسلطنة شيئ لعدم وجود الأهم

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٨٥٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٢٩)

الأعظم الذي شرعتا له، وهذا الكلام لا يعقله إلا أفراد من أهل العلم"

''امام شوکانی فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک امارت میں چوٹی کی بات اور سب سے بڑی شرط اور سب سے اعلیٰ رکن یہ ہے کہ امیر راستوں کے امن اور مظلوموں سے انصاف اور مسلمانوں سے مدافعت پر قدرت رکھتا ہو۔ جب ان پر کوئی خوف یا کفار اور باغیوں کے لشکر حملہ آور ہوں تو امیر سست اور کمزور اور امن پسند اپنے آرام میں مشغول نہ ہو۔ ایسے ذمے دار اور مضبوط امیر کی اطاعت کو اللہ تعالیٰ نے واجب فرمایا، اس کی مخالفت کو حرام فرمایا، بلکہ نصبِ امیر کا اصل مقصد یہی ہے اور اسی کو ضروریاتِ دین سے قرار دیا ہے۔ اگر یہ شرط موجود ہو تو باقی شرائط میں کمی چنداں مضر نہیں۔ مسلمانوں کو ایسے امام کی ضرورت نہیں، جو مصلے پر بیٹھا ہاتھ میں تسبیح لیے ہوئے کتابوں کے مطالعے میں مشغول ہو۔ طالب علموں کو درس دے اور کتابوں کی مشکلات کو حل کرے اور لوگوں کے مال اور خون کے معاملے میں بے حد پرہیز گار ہو، لیکن مسلمان ایک دوسرے کو کھاتے رہیں۔ طاقتور کمزوروں کو تباہ کریں اور دولت مند غریبوں کو برباد کریں، اور حضرت الامیر ہاتھ پر ہاتھ رکھے اس منظر کو دیکھا کریں۔ اگر امیر ایسا ہی بے کار اور کمزور ہو تو حکومت اور سلطنت سے کچھ حاصل نہیں، کیوں کہ اس میں اصل مقصد ہی ناپید ہے۔ اس بات کو خال خال اہلِ علم ہی سمجھ سکتے ہیں۔''

حضرت امام کی نگاہ میں امارت تعبد محض نہیں، بلکہ اس کے ساتھ کچھ شرائط اور ضروریات ہیں۔ اگر وہ پوری نہ ہوں تو صرف لفظ کو زندہ رکھنے سے کچھ حاصل نہیں۔ اسی کتاب کے صفحہ (٧٦) میں فرماتے ہیں:

''جو امام اپنی ذمے داریوں کے تحمل سے عاجز ہو، اس کے لیے شورش بغاوت نہیں ہوگی۔''

نظری دلیل:

اس توضیح کے بعد مجھے اس کی ضرورت نہیں رہتی کہ موصوف کی نظری یا نقلی دلیل کے متعلق کچھ عرض کروں، کیوں کہ وہ نظر اور نقل دونوں خارج از بحث ہیں، لیکن اتماماً للفائدہ اس کے متعلق مختصر سی گزارش کرنا چاہتا ہوں:

اول: فقہا کا یہ مشورہ شرعی حجت نہیں۔

دوم: ان بزرگوں نے اسے بعض وقتی ضروریات کے لیے بطورِ نظام فرمایا ہے، وہ اسے شرعی امارت نہیں سمجھتے، جس سے تخلف موتِ جاہلیت کا موجب ہو اور زیرِ بحث امارتِ شرعیہ ہے، جیسے کہ جناب کے ٢٦رمئی کے مضمون سے واضح ہے، چناں چہ یہ مشورہ شاہ عبد العزیز صاحب نے ہندوستان کو دیا ہے، حالاں کہ خلافتِ شرعیہ ساری دنیا کے لیے ہے اور ایسے وقت میں دیا، جب کہ ترکی خلافت بہتر حالت میں تھی۔ اگر اسے خلافتِ شرعیہ کہا جائے تو شاہ صاحب کا مشورہ بغاوت کا مشورہ ہوگا۔ وحاشا عن ذلك.

میں نے بھی اپنی سابقہ گزارشات میں عرض کیا تھا، اس لفظی امارت سے مجھے کوئی گھبراہٹ نہیں۔ مجھے صرف اس کی شرعی حیثیت سے انکار ہے۔ اس تناقض کو ثابت کرنے کے لیے موصوف نے میرے مفہوم میں عجیب سا معنوی تصرف فرمایا ہے، جس کا مجھے افسوس ہے۔ روایت بالمعنی میں بے حد احتیاط کی ضرورت ہے۔

سوم: جناب کے طریقۂ نظر کا تتبع کرتے ہوئے اگر میں اس طرح معارضہ کروں کہ جناب کے ارشاد فرمودہ امارت محض تحصیلِ حاصل ہے، کیوں کہ جناب فرماتے ہیں:

''مغلوب اور محکوم مسلمانوں کے لیے ایسے امیر کی ضرورت ہے، جو خود محکوم اور مغلوب ہو اور وہ اس محکومی کے خلاف کوئی کوشش نہ کرے۔''

تو فقہا کے ارشاد کا مفہوم جناب کے نقطۂ نظر سے اس طرح ہوا:

اے محکوم اور مغلوب مسلمانو! تم اپنے میں سے ایک محکوم اور مغلوب مسلمان کا نام امیر رکھ لو، جو تمھاری محکومی و بے کسی میں تمھاری کوئی مدد نہ کر سکے۔ وھذا کما تریٰ.

اصل معاملہ یہ ہے کہ مقہور اور منتشر اور بے کس مسلمانوں کو مشورہ دیا گیا ہے کہ تم لوگ اپنی طاقتوں کو جمع کر کے اپنے میں سے ایک ایسے شخص کو امیر مقرر کرو، جو اپنی حسبِ استطاعت تمھاری سیاسی اور غیر سیاسی راہنمائی کرے، اور اس میں کوئی تناقض نہیں۔

حضرت حذیفہ کی حدیث کا مفاد یہ ہے کہ زمانۂ شر میں جماعت کے ساتھ رہنا چاہیے، کیوں کہ دعاۃِ شر کے فتنوں سے جماعت ہی بچا سکتی ہے، اور جناب کے حسبِ ارشاد وہ کمزور امیر جو شر کے دفعہ کرنے پر قادر نہیں ہے تو اس کا ساتھ دینے سے فائدہ ہی کیا؟ شر تو خلافتِ صدیقی میں بھی پیدا ہوئے اور فاروقی میں بھی، مگر دفعہ کر دیے گئے۔ محض شر اور اَشرار کا وجود فقدانِ قوت کو مستلزم نہیں۔ غایت یہ کہ وہ کسی وقت کمزور ہو اور اس میں شرعاً کوئی محذور نہیں، بلکہ حدیثِ حذیفہ کا مفاد تو یہ ہے کہ زمانہ شر میں کوئی ایسا وقت آ جائے کہ کوئی جماعت نہ ہو، جو ان ضروریات کو پورا کرے، جن کا ذکر اوپر آیا ہے تو اس وقت مصنوعی اور ڈمی جماعتیں بنانے کی کوشش نہیں کرنا چاہیے، بلکہ اس وقت صحیح تجویز یہ ہے:

« فاعتزل الفرق کلها، ولو أن تعض علی أصل شجرة حتی یدرکك الموت وأنت علی ذلك »[1] (متفق علیه)

''اس وقت ان تمام مصنوعی فرقوں کو چھوڑ کر جنگل کی راہ لو اور تا موت بایں حالت رہو۔''

اگر کمزور اور بے مقصد امارتیں بنانے کی اجازت ہوتی تو حضور فرماتے کہ تم اپنے گاؤں یا شہر میں اپنی

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۳٤۱۱) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۸٤۷)

امارتیں بنالو۔ اس لیے حدیثِ حذیفہ کا وہ مفاد نہیں، جو حضرت مولانا لے رہے ہیں۔ حدیثِ حذیفہ میں ایسی امارتوں پر رد ہے۔

حدیثِ عبداللہ بن عمرو مجھے مل گئی تھی۔ مَیں نے اپنا عندیہ اس کے متعلق مولانا المحترم کو جلدی ہی بھیج دیا تھا، مگر کسی مصلحت سے وہ شائع نہیں ہو سکا۔ حدیث یقیناً امارتِ سفر کے متعلق ہے۔ نواب صدیق حسن خاں مرحوم نے "ظفر اللاضي" میں احادیثِ سفر کے ضمن میں اسے ذکر کیا ہے۔[1]

شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے بھی اس سے سفر کی امارت مراد لی ہے، البتہ اس کے مقصد کے پیشِ نظر باقی اجتماعات میں بھی امارت کا مشورہ دیا ہے۔ اگر یہ امارت اپنے شروط و مقاصد کو پورا کرے تو شرعی ہوگی، جس میں شامل ہونا ضروری ہوگا، ورنہ ایسے امیروں کی حیثیت صدرِ مجلس کی ہوگی، جیسے مَیں نے عرض کیا۔ خود حدیث میں "بأرض فلاة" سے سفر کا پتا چلتا ہے۔ حدیث کی سند میں ابن لہیعہ ہیں:

"وابن لهيعة ضعيف عند أهل الحديث. ضعفه يحيىٰ بن سعيد القطان وغيره من قبل حفظه"[2] (ترمذي)

حافظ ذہبی فرماتے ہیں:

"يذكر حديثه في المتابعات، و لا يحتج به" (تذكرة الحفاظ: ١/ ٢٣٩)

یہ حدیث امارت کے سفر کے علاوہ ان مصنوعی امارتوں کے لیے دلیل نہیں ہو سکتی۔

خلاصہ کلام:

زیرِ قلم مباحثے میں امارت کی تین قسمیں ہو سکتی ہیں:

1. امارتِ کبریٰ جسے امارتِ عامہ یا خلافت کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ نہ ہندوستان میں ممکن ہے اور نہ ہی موجودہ حالات میں اس کی کوئی امید۔
2. دوم: امارتِ مروجہ جو آج کل جماعت اہلِ حدیث میں جا بجا اُگ رہی ہیں۔ یہ شرعی نہیں ہیں۔ میں انھیں وقت کا مہلک مرض سمجھتا ہوں۔ سو امید رکھتا ہوں کہ اہلِ علم اس کے متعلق اپنا فرض ادا کریں۔ مولوی عبدالرؤف صاحب بھی فرماتے ہیں کہ میں اس کا حامی نہیں ہوں۔ جزاه الله۔
3. سوم: ایسی امارت جو سیاست، قہر، تغلب سے خالی ہو (جیسے کہ امارتِ کبریٰ میں یہ شرط ہے) لیکن مروجہ امارتوں سے بہتر اور منظم ہو۔ مولوی عبدالرؤف صاحب اس کی دعوت دیتے ہیں۔ میں نے موصوف کے

[1] ظفر اللاضي بما يجب في القضاء على القاضي (ص: ٩)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (١٠) یہ حدیث اگرچہ اس سند سے ضعیف ہے، لیکن امارتِ سفر کی دوسری احادیث کی بنا پر حسن ہے۔

ارشادات سے اس کا جو نقشہ سمجھا ہے، میں اسے غیر شرعی سمجھتا ہوں اور اس کی حیثیت انجمن سے کچھ زیادہ نہیں۔ ایسی امارت میں شمولیت موتِ جاہلیت سے نہیں بچا سکتی، بلکہ اجتماع کے لیے ذریعہ ہے۔ اگر مولانا اس کا مفصل پروگرام جماعت کے سامنے پیش فرمائیں تو مجھے اپنی رائے پر اصرار نہ ہوگا۔ اگر وہ ان مقاصد کو پورا کرے، جیسے امام شوکانی نے فرمایا ہے۔

اگر فقدانِ استطاعت کے عذر سے شرائط و مقاصد میں کمی ممکن ہے تو تعجب نہیں کہ یہ استطاعت نفسِ امارت کے نقصان کے لیے بھی عذر ہو سکے۔

مَیں نے اپنی گزارشات مفصل عرض کر دی ہیں اور غالباً میری طرف سے یہ آخری گزارشات ہوں گی۔[1]

[1] ہفت روزہ ''اہلِ حدیث'' امرتسر (۱۳ر اکتوبر ۱۹۴۴ء)

نظمِ جماعت اور اس راہ کی مشکلات

نظمِ جماعت کے متعلق ہمدرد حضرات کے گرامی خیالات نظر سے گزرتے رہے۔ حال ہی میں مولانا خیری اور برادرِ محترم قمر صاحب بنارسی کے ملفوظات بھی معلومات میں اضافے کا موجب ہوئے۔ اہلِ حدیث کانفرنس ہمارا سب سے پرانا اجتماعی ادارہ ہے، لیکن بدقسمتی سے اس کی رفتار ع

من از بالا پناس ے ترنم

کے اصول پر ترقی کر رہی ہے۔ محترم ڈاکٹر سید محمد فرید صاحب (ایم۔ ایل۔ اے) کے سوال اور حافظ حمید اللہ صاحب کے جواب میں کتنا ہی بین السطور کیوں نہ ہو، مگر وہ اس ترقی معکوس کی غمازی ضرور فرما رہے ہیں۔

پیشِ نظر حالات کا جائزہ:

اس وقت جماعت میں مختلف عناصر انتشار کا موجب ہو رہے ہیں۔ بعض جگہ گھریلو قسم کی امارتیں شرعی امارت کے نام سے تفریق کا موجب ہو رہی ہیں، حالاں کہ ایسی ناتمام خانگی امارتوں کا شرعاً کوئی ثبوت نہیں، جہاں ایک مطلق العنان جیب کا نام بیت المال رکھ لیا جائے۔ ایک دو مولوی صاحب چند اسباق پڑھا دیں اور کسی صاحب کا نام ''امیر المومنین'' رکھ دیا اور بس!!

اسی طرح بعض جدید تحریکات انہی مقاصد کے لیے کام کر رہی ہیں، جو جماعت اہلِ حدیث کی ہندوستانی نشأۃ کے پیشِ نظر تھے۔ یعنی ہندوستان میں ایک معتدل دینی نظامِ حکومت کی ترویج واستحکام، جو کتاب وسنت کی روشنی میں مرتب کیا جائے اور وہ دنیا کے مختلف مذاہب اور مناہج میں عدل اور امن کا کفیل ہو۔ سید شہید رحمہ اللہ کی مجاہدانہ مساعی میں یہی اہم مقصد تھا، جسے شاید ہم بھول رہے ہیں۔ اسی طرح بعض سیاسی تحریکات کی جاذبیت بھی نوجوان برادران اور عامل طاقتوں کے لیے کشش کا موجب ہو رہی ہے۔ کام کرنے والے لوگ جہاں کوئی حرکت دیکھتے ہیں، اس کی طرف لپکتے ہیں، اور یہاں ہمارے مقدس ادارہ اہلِ حدیث کانفرنس میں آٹھ مدرسوں کی اعانت اور آٹھ مبلغوں کی تبلیغی مساعی سب سے بڑا کام ہے اور بس۔

ان حالات کا تقاضا تھا کہ آنے والی نسلیں کام کے لیے کسی دوسرے میدان کی تلاش میں نکلیں اور جہاں انھیں عملی دلچسپیاں ملیں، وہیں تسکین پائیں اور آباد ہو جائیں۔ میں یہ مانتا ہوں کہ یہ راہ غلط ہے۔ ہمیں اپنی

صلاحیتیں جماعت اور اپنے اصول کی حمایت میں صَرف کرنی چاہیے اور کبھی قلب پر یاس و قنوط کا قبضہ نہیں ہونا چاہیے، لیکن ہماری قیادت کے پاس ان آثارِ قدیمہ کی حفاظت کے سوا جب کوئی کام ہی نہیں تو آخر متحرک اور عامل طبیعتیں کدھر جائیں؟

جماعت کے سیاسی مسلک کے تعین میں ہماری قیادت اور ہمارے بزرگوں نے اس سراسیمگی اور پریشان خیالی کا ثبوت دیا ہے کہ اس پر شرم محسوس ہوتی ہے۔ انھوں نے سیاسی قیادت میں ایسی راہیں اختیار فرمائی ہیں، جو مسلکِ اہلِ حدیث سے براہِ راست ٹکراتی ہیں۔ جماعتی کیرکٹر پر ان کا بے حد برا اثر ہو رہا ہے۔ غیر مسلم قیادت (بصورتِ فرض) جماعتی اخلاقیات پر اتنی موثر نہیں ہو سکتی، جس قدر کہ اسلامی لیکن لا دینی قیادت۔ جب عوام خواص کی اس پریشانی کو دیکھتے ہیں تو لازماً انھیں مسلک کے اعتقادات اور اعمال سے بے تعلقی سی پیدا ہو جاتی ہے، اور یہ ایک نفسیاتی اثر ہے، جسے روکنا مشکل ہے۔ ان حالات میں وہ لوگ دوسری تحریکات سے وابستگی پیدا کر لیتے ہیں، جس سے ہمارے بزرگوں کو رنج پہنچتا ہے، بلکہ ہم ایسے کم سواد بھی دُکھ محسوس کرتے ہیں۔

موجودہ تجزیہ:

لیکن صورتِ حال کے اس تجزیے کے بعد یہ کوئی قطعاً قابلِ ملامت نہیں سمجھے جا سکتے۔ انھیں یقینی طور پر معذور تصور کرنا چاہیے، کیوں کہ صدیوں نہیں، بلکہ برسوں تک بھی کسی جماعت کو محض تخریبی پروگرام اور عصبیت کے جذبات پر قائم نہیں رکھا جا سکتا۔ ابتداءً یہ چیزیں جاذب ہوتی ہیں، لیکن بہ تدریج یہ جاذبیت کم ہوتی جاتی ہے۔ خصوصاً جب کہ وقتی مسائل انقلابی اور اجتماعی انداز میں سامنے آ جائیں۔ ایسے وقت میں قیادت کا فرض ہے کہ ایسے سیلاب سے خود ہی بچے اور دوسروں کو بھی بچائے، اور جماعت کے سامنے کھلا پروگرام رکھے اور اربابِ بست و کشاد کے مشورے سے جماعت کے لیے مناسب مسلک معین کرے۔ اکابرِ جماعت کو وقتی اور وطنی سیاسیین کی خوشامد کے لیے دشت بدشت اور کوبکو پھرنے سے پرہیز کرنا چاہیے۔ ایسا کرنے سے ان کے وقار کو نقصان پہنچے گا اور ان کی قوتِ فکر کا توازن مشتبہ تصور ہوگا، اور جماعت دوسرے سیاسی گروہوں کا خیمہ بن کر رہ جائے گی۔ اس کے بعد نہ کسی ملیح تعریض کا اثر ہوگا اور نہ کسی تبرا اور براءت کا۔ جب ایک شخص کی صحتِ فکر پر اعتماد ہی نہیں تو اس کی ناراضگی اور رضامندی کی کیا قیمت ہو سکتی ہے؟

حضرت مولانا ثناء اللہ صاحب کا مشورہ:

۱۱؍ محرم ۱۳۶۶ھ کے ''اہلِ حدیث'' میں حضرت مولانا مدظلہ نے ایک حکیمانہ مشورہ دیا تھا کہ مشترک امور میں مل لیا جائے اور اہلِ منطق کی طرح جنس کے مرتبے میں نوعی اور صنفی امتیازات سے اِغماض کیا جائے۔ اگر

جماعت کا اپنا کوئی سیاسی مسلک نہیں اور ہم سیاسیات میں کتاب و سنت کی اصولی راہنمائی سے محروم ہیں تو حضرت مولانا کا مشورہ آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے، کیوں کہ ہمیں بہر حال ہر چلتے نظام کا خیمہ بن کر گزر کرنا ہے۔ اگر دنیا میں حق غالب ہو تو ہمیں اس کا ساتھ دینا ہے اور اگر باطل سربلند ہو تو ہمیں کسی نہ کسی حیلے سے اسے بھی خوش رکھنا ہے۔ غرض اس صورت میں حضرت مولانا مدظلہ کی تجویز مناسب ہے اور امن بخش۔

اگر جماعت کو ایک مفہوم تصور کر لیا جائے تو حضرت مولانا کے حسبِ ارشاد مفہوم کی یہ منطقی تقسیم اور ہر ایک خواص و ممیزات کا تصور ذہنی طور پر کیا جا سکتا ہے۔ اس میں کوئی دقت پیدا نہیں ہوتی، لیکن ادباً گزارش ہے کہ عملی سیاسیات میں یہ ذہنی تقسیم اور باطنی تجزیہ کامیاب نہیں ہوگا۔ میں نے یہ رائے خود حضرت مولانا مدظلہ کے طریقِ عمل سے قائم کی ہے۔ وحسبه لنا قدوة.

آج سے چند سال پیشتر حضرت محترم کا رجحان قوم پرور حلقوں کی طرف تھا، وہ جمعیت علماے ہند کے ممبر تھے۔ ''ملکی مطلع'' میں پوری سنجیدگی اور احتیاط کے باوجود ترقی پسند خیالات چھن چھن کر نمایاں ہوتے تھے۔ اب جبکہ مسلم لیگ نے عوام پر انقلابی اثر کیا ہے اور وہ ایک ہیجان اور شورش کی صورت اختیار کر چکی ہے، حضرت کی رائے کا رجحان لیگ کی طرف ہے، ان کی ملیح تعریضات پردے میں بے پردہ ہوتی جا رہی ہیں۔ حضرت مولانا سیالکوٹی کی روش کا تذکرہ میں نے عمداً نہیں کیا۔ ان کے مزاجِ گرامی کا مدو جزر نوع و صنف کے امتیازات تو بجائے خود رہے، انتہائی خلوص کے ساتھ پوری منطق کو بھی بہا لے جا سکتا ہے۔ اس لیے ان کی ذاتِ گرامی سے گلہ ہے نہ شکایت، سمندر کا بہاؤ ہندسے کے پیمایشی حدود و قواعد کا پابند نہیں۔ كل ميسر لما خلق له.

تاہم اس خیال کے سمجھنے میں کوئی دقت نہیں کہ عملاً ایسی باریک بینی مشکل ہوگی، خصوصاً عوام میں، جب کہ عملی سیاسیات میں اجتماعی ہیجان اور ثورۃ رونما ہو۔ محرم کے ''اہلِ حدیث'' میں قمر صاحب بے ساختہ فرما رہے ہیں کہ وہ کیا ہیں۔ مولانا خیرمی موجد حزب اللہ پکار رہے ہیں۔ ان کا سیاسی موقف کہاں ہے؟ کسی کو کیا کہوں، میں خود چھپ نہیں سکتا۔ ظاہر ہے کہ میری راہ مسلم لیگ سے بحمد اللہ بالکل الگ ہے۔

دو راہیں:

اس لیے میری دانست میں اہلِ حدیث کا واقعی کوئی سیاسی مسلک ہے تو اس کی کھلی دعوت دینا چاہیے، جو اسے قبول نہ کرے، اسے کاٹیے اور اسے کاٹنے میں ہچکچاہٹ نہیں ہونی چاہیے۔ جب راہیں ہی الگ الگ ہوں تو اقامتِ سفر کی آرزو بے سود ہے، اور وقتی اور ظاہری اجتماع لا حاصل ہے۔ ﴿كُلٌّ يَعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ﴾ [الإسراء: ٨٤] کے مطابق ہر فریق کو اپنی راہ پر چلنے میں آزاد ہونا چاہیے۔

مجھے یقین ہے کہ اہلِ حدیث کا مسلک موجودہ سیاسی حرکات سے بالکل الگ ہے۔ ہمارے اکابر اسے کیوں ظاہر نہیں فرماتے، اسے میں نہیں جانتا۔ اتنا یقین ہے کہ اگر اسے کھل کر جماعت کے سامنے نہ رکھا گیا تو عند اللہ بڑی سخت مسئولیت ہوگی۔ مَیں قمر صاحب ایسے رفقاے وضاحت سے کہنا چاہتا ہوں، نہ خود چھپیے نہ حق کو چھپایئے، کمر باندھیے اور دوسرے دوستوں کو آزاد چھوڑ دیجیے۔ وہ اپنے طریق پر کام کریں اور آپ اپنی راہ پر چلیں۔ وقت بتائے گا کہ کون منزل پر پہنچا اور کون راستے میں کھو گیا۔ اگر دیانت اور اخلاص موجود ہے تو رفقا کی قلت و کثرت سے نہ گھبراہٹ ہونی چاہیے نہ مسرت۔ مسافر کا کام راستے کے کنکروں کو روندنا ہے، ان سے ڈرنا نہیں۔ ﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ﴾ [التوبة: ۱۲۰]

دوسری راہ:

لیکن اگر جماعت اہلِ حدیث کو سیاسیات سے الگ رکھ کر ہی چلنا ہے تو میں اسے مشکل ضرور سمجھتا ہوں، تاہم چاہتا ہوں کہ اس کا ایک مرتبہ اور تجربہ کر لیا جائے۔ میں ذاتی طور پر ملتان کانفرنس کے بعد اس راہ کی صحت پر یقین نہیں رکھتا۔ تاہم مجھے مسلکِ اہلِ حدیث سے والہانہ شیفتگی مجبور کرتی ہے کہ اسی غلط راہ کا احباب کے ساتھ پھر تجربہ کر دوں ع

مجھ کو بتوں سے عشق ہے کافر نہیں ہوں میں

میں فارورڈ بلاک نہیں، اعتدال پسندی کے ساتھ چلنے کو تیار ہوں، مگر دیکھتا ہوں کہ رفقاے سفر ہیں کہاں؟

اگر اس راہ پر چلنا ہے تو ذیل کی گزارشات کی پابندی کے لیے عہد کرتا ہوں:

1. حضرات قائدینِ جماعت موجودہ سیاسی گروہوں سے بالکل جدا رہیں۔ ان کی مزید حمایت میں نہ کوئی تعریض کی جائے اور نہ کوئی دعایت (پروپیگنڈا)۔
2. انتخابات کا یا تو بالکل مقاطعہ کیا جائے، جیسے مولانا مودودی کی جماعت نے کیا، یا عوام کو ان کی صوابدید پر چھوڑ دیا جائے۔ مقامی حالات کے مطابق جو چاہیں اور جیسے چاہیں، کریں۔ مرکز اس میں کوئی مداخلت نہ کرے۔ شخصی معاملے سے اسے زیادہ اہمیت نہ دی جائے، البتہ انتخابات میں اخلاقی برائیوں سے قطعی پرہیز کی جائے۔ جماعت کے کیرکٹر پر کوئی حرف نہیں آنا چاہیے۔
3. جماعت کے اربابِ بست و کشاد موجودہ سیاسی جماعتوں کے ممبر تک نہ بنیں اور نہ ہی دوسروں کو اس کی ترغیب دیں۔ عوام جو کچھ کریں، شخصی طور پر کریں۔
4. جو لوگ دفتر کے ساتھ تعاون کریں، وہ بھی وطنی سیاسیات کی کسی پارٹی کے ساتھ اشتراک نہ کریں۔

5 اہلِ حدیث کانفرنس کے نظام کے متعلق فیصلہ کیا جائے کہ آیا وہ جمہوری ہوگا یا آمریت کے طریق پر۔ جو بھی فیصلہ ہو، اس پر صحیح عمل کیا جائے۔ یہ دونوں نظام غیر اسلامی ہیں، لیکن نیک دل اور صالح ہاتھوں میں ہوں تو مفید ہو سکتے ہیں۔ خالص دینی نظام شاید کفر کی عمل داری میں نہ چل سکے۔

میں نے یہ گزارشات خواص کے متعلق اس لیے کی ہیں کہ میرے خیال میں عوام جماعت کی حالت خواص سے بدرجہا بہتر ہے۔ خواص جن اسباب ودواعی کے ماتحت ان تحریکات میں شامل ہوئے، عوام کے وہم و گمان میں بھی وہ چیزیں نہیں آسکتیں۔ عوام کی قوتِ یقین میں استقامت زیادہ ہے اور وہ نظم کے سلسلے میں ہر قیمت ادا کرنے پر آمادہ ہیں۔

دلی میں حرکت:

ماسٹر حفیظ الرحمٰن صاحب پٹیالوی کی مساعی سے اہلِ حدیث کانفرنس کے مرکزی دفتر میں کچھ حرکت ہوئی۔ صاحب الخیر سیٹھ عبد السبحان نے بھی کچھ دوڑ دھوپ کی۔ آل انڈیا اہلِ حدیث کانفرنس کا اجلاس دہلی میں بلایا گیا۔ ماسٹر صاحب کے کچھ باقاعدہ کچھ بے قاعدہ اشتہارات نے ہمیں بھی پراُمید کر دیا اور ہم سر کے بل دہلی پہنچے۔ قریباً ہر صوبے کے کچھ اربابِ فکر اور دردمند وہاں آئے ہوئے تھے۔ حضرت مولانا ثناء اللہ صاحب کی صدارت میں اجلاس ہوا۔ مجلسیں ہوئیں، شوریٰ میں کافی گرما گرمی کے بعد کچھ تجویزیں ہوئیں، جس کے نتیجے میں مجلسِ عمل بنی۔ مولانا عبد الوہاب صاحب آروی صدر قرار پائے۔ ہر صوبے میں کام کی ذمے داریاں تفویض کی گئیں۔

پنجاب میں مَیں نے تھوڑا بہت کام اپنی بساط کے موافق کیا۔ دوسرے صوبوں کا حال تو معلوم نہیں، پنجاب میں جماعت کے عوام کی حالت نہایت امید افزا ہے۔ درس وتدریس کی مشغولیت کے سبب کوئی دورہ نہیں کر سکتا۔ اپنے محدود تعارف کے مطابق فرصت کے وقت غالباً دو ماہ خط کتابت سے جو کچھ کیا، اس کے نتیجے میں صرف ۴ آنے فیس ممبری کے طور پر مجھے ۷۵۰ روپے وصول ہوئے، جو تا حال بمد امانت میرے پاس ہیں۔ اس معاملے میں نہ مرکزی دفتر نے کوئی خاص امداد کی نہ جماعت کے اخبارات نے۔ دفتر سے آیندہ پروگرام کے متعلق دریافت کیا، کوئی جواب نہ ملا۔ صدر مجلسِ عمل کو لکھا، وہاں بھی صبر وسکون ہی کا درس تھا۔ چند دنوں کے بعد صوبائی انتخابات شروع ہوئے، الیکشن کی ہما ہمی نے سارا معاملہ برباد کر کے رکھ دیا۔ اب نہ مولانا عبد الوہاب صاحب کچھ فرماتے ہیں نہ حافظ حمید اللہ صاحب کے منہ میں زبان ہے۔

مولانا خیری کے ارشادات کے بعد مولانا نے فرمایا کہ نظمِ جماعت کے متعلق خاموشی پر افرادِ اہلِ حدیث کی پرسش ہوگی۔ ادباً گزارش ہے کہ کون سے افراد کو؟ حافظ حمید اللہ صاحب، حاجی عبد الکریم صاحب، حاجی بشیر الدین صاحب، مولانا شرف الدین صاحب، مولانا عبد الوہاب صاحب، مولانا یونس صاحب، مولانا عبد الوکیل صاحب،

خود جنرل سیکرٹری صاحب کو یا ہم مساکین اور خدام کو؟ حسبِ مرتبہ پرسش تو ضرور ہونی چاہیے، لیکن یہ بزرگانِ ملت اگر محاسبے سے بچ نکلے تو ہم گناہگار اس معاملے میں ان شاء اللہ زیادہ خطرے میں نہیں ہوں گے۔

مولانا آروی سے:

میرے پاس قریباً ساڑھے سات صد روپیا جماعت کی امانت موجود ہے۔ مجلسِ عمل کے اجلاس میں فیصلہ ہوا تھا کہ یہ رقم مرکزی دفتر کو نہ دی جائے، بلکہ صوبے میں مرکز کی ہدایت کے مطابق صَرف کی جائے۔ اب یا تو مرکز سے کوئی ہدایت دی جائے یا صاحبِ صدر باجلاس کوئی فیصلہ فرمائیں۔ ورنہ میں یہ روپیا جماعت اہلِ حدیث گوجرانوالہ کے سپرد کر دوں گا۔ یعنی امانت دوسرے امین کے سپرد ہو جائے گی۔ شخصی طور پر اس رقم پر قابض رہنا حدیث «اِتَّقُوْا مَوَاضِعَ التُّهَم»[1] کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔ اُمید ہے صاحبِ صدر ضرور توجہ فرمائیں گے۔[2]

---

[1] حافظ عراقی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "لم أجد له أصلًا" (تخریج أحادیث الإحیاء: ۳/ ۱۷)

[2] ہفت روزہ ''اہلِ حدیث'' امرتسر (۲۴، ۳۱ر جنوری ۱۹۴۶ء)

بزرگوں کا شکوہ اور حقیقتِ حال کا جائزہ

مولانا عبدالعلی پیغمبر پوری کے ایک مضمون پر ''اہلِ حدیث'' امرت سر اور ''اہلِ حدیث گزٹ'' دہلی میں گفتگو شروع ہوئی اور بہ تدریج تلخ تعریضات تک پہنچ گئی۔ زیرِ قلم گزارشات اسی ماحول کے متعلق ہیں۔ ﴿اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ وَ مَا تَوْفِیْقِیْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ﴾ [هود: ۸۸]

مستقبل کے پروگرام کی تکمیل کے لیے ماضی کے اعمال کا جائزہ لینا ایک حد تک ضروری ہے، لیکن اس میں طعن و تعریض کی تلخیاں بالکل بے سود ہیں۔ اسی اندازِ گفتگو سے قوتِ فکر میں تعطل پیدا ہوتا ہے اور سوچ و تدبر کے لیے جس دماغی ٹھنڈک کی ضرورت ہے، اس میں گرمی پیدا ہو کر دماغ کے مزاج کو بدل دیتی ہے۔

تحریک اہلِ حدیث کی موجودہ رفتار کتنی ہی غلط کیوں نہ ہو اور اربابِ بست و کشاد اسے تبلیغ کے ریشمی رومالوں میں لپیٹنے کی کتنی ہی کوشش کیوں نہ کریں، تاریخ کی لازوال شہادت اسے چھپنے نہیں دے گی کہ مغل حکومت کی تباہی یا تبدیلی کے بعد اربابِ فکر اور جماعت کے مقتدر اصحابِ نظر کے سامنے دو مقصد تھے:

1. مغلوں کے فرسودہ اور لادینی نظام کی جگہ ہندوستان میں ایسا نظامِ حکومت قائم کرنا، جس کی بنیاد کتاب و سنت پر ہو۔ اس مقصد کے لیے ''حجة اللّٰه البالغة'' اساس اور بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے، جس میں شرعی نظام کے مصالح اور حکمتوں کو ذہن نشین کرنے کی کوشش فرمائی گئی ہے۔

2. دوسرا مقصد بدعتِ تشیع اور نفاق کی مخالفت تھا۔ اکبر کی مداہنت اور شاہجہان اور دارا شکوہ کی بے عملی اور لاعلمی نے بدعتِ رفض کے لیے بہت حد تک میدان ہموار کر دیا تھا۔ یہ سرقہ اور عیاری اہلِ سنت کے اربابِ فکر سے مخفی نہ تھی۔ اس لیے ہندوستان کی تحریکِ توحید کا دوسرا مقصد رفض اور اس کی منافقانہ سازشوں کی نشان دہی قرار پایا۔ تحفہ اثنا عشریہ اور ازالۃ الخفاء ایسی مایہ ناز تصانیف اسی مقصد کی تکمیل کے لیے بطورِ ذریعہ اہلِ علم کے سامنے ہیں۔

۵۷ء کی تحریک نے صاحب بہادر کے مزاج کو اتنا برہم کر دیا تھا، وہ حضرات شیعہ اور بریلوی بزرگوں کے سوا کسی پر اعتماد نہیں کرتے تھے۔ ان حالات میں پہلے مقصد کے لیے کوشش کرنا موت کی بازی لگانے کے مرادف تھا۔ علمائے حق کے لیے یہ سودا بھی چنداں گراں نہ تھا۔ وہ بڑی خوشی سے اس کے لیے ایک دفعہ سر دھڑ کی

بازی لگا دیتے، لیکن سر سید احمد خاں صاحب نے اس وقت ایک بالکل جدا پروگرام ملک کے سامنے رکھ دیا۔ انھوں نے انگریز سے تعاون اور انگریزی تہذیب کو زندہ رکھنے کے لیے کالج کی بنیاد رکھ دی، اسی پروگرام نے ملک میں طوفان کی صورت اختیار کر لی۔

۵۷ء کی قربانیوں اور جانبازیوں سے تھکے ہوئے قدرتی طور پر آرام اور کچھ ستانے کے خواہش مند تھے۔ سر سید کے پروگرام میں یہ دونوں مطلب ہی نہیں، بلکہ بہ ظاہر نیند (اور دراصل موت کا سامان) موجود تھا۔ ایسے وقت میں علما کی کون سنتا تھا اور اہلِ حق کی وقعت کہاں تک ہو سکتی تھی، جب کہ ان کا راستہ پرخار تھا اور مہالک سے معمور بھی۔ سر سید کی راہ میں بہ ظاہر آرام تھا۔ شکم پروری کی امید تھی۔ انجام کچھ بھی ہو، مگر بہ ظاہر اس میں کوئی خطرہ نہ تھا۔

اس صورتِ حال کا نتیجہ:

اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ بہ ظاہر پہلا پروگرام ترک کر دیا گیا۔ دینی مدارس کی بنیاد رکھی گئی۔ حضرت میاں صاحب مرحوم نے ایک ایسے انقلاب کی بنیاد رکھی، جو دریا کی سطح سے بھی زیادہ ہموار تھا۔ اگر شریر طاقتیں حکومت کے تعاون سے ایک متوازی نظام کھڑا نہ کر دیتیں تو تعجب نہ تھا کہ یہ مدارس دونوں مقاصد کے کفیل ہوتے۔ تاہم حضرت شیخ الکل نے دینی انقلاب کے لیے ایسی زمین تیار فرمائی، جس کی نظیر کم ملے گی۔ زہد و تقویٰ میں حضرت عبداللہ غزنوی اور حضرت الفقیہ الزاہد مولانا عبدالجبار غزنوی کی تربیت فرمائی۔ اربابِ قلم میں مولانا محمد حسین بٹالوی اور بقیۃ السلف مولانا شمس الحق صاحب ڈیانوی اور حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب مبارکپوری ایسے خلف الصدق مغفور کی بہترین یادگار ہیں، اور مولانا محمد بشیر صاحب سہوانی اور حضرت الاستاد مولانا حافظ عبدالمنان صاحب وزیر آبادی۔ برد اللہ مضجعهما۔ ایسے اصحاب التدریس کا نام لیا جا سکتا ہے، اور حضرت مولانا امام عبدالعزیز صاحب رحیم آبادی اور حضرت حافظ عبداللہ صاحب غازی پوری ایسے مجاہدین بھی اسی درس کی پیداوار تھے۔ لیس علی اللہ بمستنکر أن یجمع العالم في واحد.

یہ سب کچھ حسبِ اقتضائے وقت تھا، مگر نہ ہندوستان میں شرعی نظام قائم ہوا نہ جماعت کا آئینی نظم۔ میری دانست میں اس وقت قادیان کی طرح شاید دکان تو بن سکتی تھی، لیکن دینی انقلاب کے لیے ایک ادارے کا قیام وقت کی حکومت کبھی گوارا نہیں کر سکتی تھی۔ تلامذہ کی جان نثاریاں تھیں اور رفقا کی عقیدت مندیاں بھی، مگر جس چیز کی طلب تھی وہ یقیناً نہیں تھی، کیوں کہ حضرت میاں صاحب ایسا نہیں کر سکتے تھے۔ وقت اس کا معاون نہ تھا۔

بے بسی کی انتہا:

سر سید مرحوم کے متوازی نظام نے اہلِ حق کی آواز کو اتنا پست کر دیا تھا کہ حضرت نواب محسن الملک رحمہ اللہ

اور ڈپٹی نذیر احمد صاحب ایسے دیدہ در بھی میاں صاحب رحمہ اللہ کا ساتھ چھوڑ کر سرسید کے دامن سے لپک گئے۔ ان حالات میں جب عوام اور خواص اپنے اور بیگانے ایک حق پرست کا دامن چھوڑ دیں تو حضرت میاں صاحب اس سے زیادہ کیا کرتے، جو انھوں نے کیا؟

آج بعض علما کو دیکھیے! ایک اصول کے لیے پوری محفل میں تنہا اپنی کہنے پر مُصر ہیں۔ کل جب یہ غبار آلود مطلع صاف ہوگا اور دنیا صحیح طور پر سوچے گی تو میں اور آپ جیسے لوگ ان حضرات کو الزام دیں گے، لیکن یہ انصاف نہیں ہوگا۔ یہ بے بسی کا دور ہے، جس سے اہلِ حق کو دوچار ہونا ہی پڑتا ہے۔ اس موقع پر اچھے اچھے پکار اُٹھتے ہیں: ﴿مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ﴾ [آل عمران: ۵۲]

دوسرا دور:

حضرت میاں صاحب کے تلامذہ نے ہر نہج پر کام کیا۔ حضرت نواب صدیق حسن خاں مغفور نے اہلِ توحید کے لیے خزانوں کے منہ کھول دیے۔ مگر مخالفین کی طاقت اس سے بھی زیادہ تھی، اور بڑی مشکل یہ تھی کہ حکومت کی عقابی نگاہیں اہلِ توحید کی نقل و حرکت پر کڑی نگرانی کر رہی تھیں۔ اس لیے اس دور میں توحید و سنت کی معصومانہ تبلیغ اور درس و تدریس کے شغل اور مذہبی انجمنوں کی غیر مربوط سی صورت کے سوا کچھ نہ ہوسکا۔

چندہ سرسید لیتے تھے، نوکر انگریزوں کو ملتے تھے اور چند قانع لیکن نادار بوریا نشین اہلِ حق کے حصے میں آئے تھے۔ وہ اربابِ دولت کی نفرت بھری نگاہوں کو تاڑتے تھے اور حکومت کی ترچھی نظریں ان سے پوشیدہ نہ تھیں، اور دنیا کی حقارت آمیز سرگوشیوں سے بے خبر نہ تھے، مگر خاموشی سے دنیا کے اعزاز سے بے نیاز ہوکر اپنی راہ پر جا رہے تھے اور بالکل مطمئن۔ معلوم نہیں کیوں؟ ﴿أُولٰٓئِكَ عَلَیْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ رَحْمَةٌ وَ أُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ﴾ [البقرۃ: ۱۵۷]

نئے حال اور نئے تقاضے:

عین اس وقت جب کہ جماعت کی قوتیں منتشر تھیں اور دنیا ہماری موت کی منتظر، عالم کی فضا میں چند نئی تبدیلیاں ہوئیں۔ امریکن مشنری سفید رنگ، لیکن سیاہ دل خالص مذہبی لباس میں بالکل سیاسی مقاصد کے لیے ہندوستان میں مسیحی پیغام لے کر وارد ہوئے اور ایک نئی فکر دامن گیر ہوگئی۔ اس کے ساتھ ہی پنڈت دیانند جی نے ہندو مذہب کے لیے آریہ سماج کی تحریک شروع کی۔ اسلام کے خلاف ان کا یہ جارحانہ اقدام تھا۔ اس کے ساتھ ہی قادیان ضلع گورداسپور میں مرزا غلام احمد جی نے نبوت اور تجدید کا بہت بڑا بیوپار شروع کیا۔ اسی دکان میں چھوٹے موٹے اور بھی سودے تھے، مگر یہ دو چیزیں ایسی تھیں، جن کی مذہب کے بازار میں بہت زیادہ مانگ

تھی۔ اس وقت اور بھی بعض چھوٹی بڑی تحریکوں سے اہلِ حق کو اُلجھنا پڑا۔ صحیح سمجھیے یا غلط، لیکن ان تحریکات کی مخالفت اور موافقت میں آج کل کے عرفی اور جدلی مناظرات کو بہت زیادہ دخل تھا۔ یہی ایک خدمت تھی، جو کوئی جماعت اپنے افراد کی کرسکتی تھی۔ جماعت کے عمل یا بے عملی کے لیے یہی مناظرات معیار قرار پائے۔

مجھے انکار نہیں کہ ان مناظرات سے جماعتی ذہن میں انتشار پیدا ہوا۔ قوتِ فکر کو محض الفاظ پر قناعت کی عادت ہوگئی۔ طبائع چٹکلوں کو دلائل سمجھنے لگیں، لیکن اس میں شبہہ نہیں کہ اس سے فائدہ بھی ہوا۔ اس وقت کی بیماریوں کا فی الجملہ یہ بھی ایک علاج تھا۔ یہ وقت حضرت مولانا ابو الوفا ثناء اللہ صاحب کے عنفوانِ شباب کا تھا اور محترم کی نقاد طبیعت کو اس فن کے ساتھ خاص موزونیت بھی تھی۔ محترم نے اس نہج پر پورے اسلامی ہند کی خدمت کی۔ اپنی متاع اس راہ میں صَرف فرما دی۔ سارے ہند میں جماعت کو نیک نام کیا، جہاں گئے، کبھی چھپنے کی کوشش نہیں فرمائی۔

یہ یقیناً مولانا کی ذاتی اور انفرادی کوشش تھی، لیکن اس سے جماعت کو بہ حیثیتِ جماعت فائدہ ہوا۔ اس معاملے میں حنفی اور اہلِ حدیث دونوں کی نگاہیں حضرت محترم کے سوا کہیں نہیں ٹکتی تھیں۔ سچ پوچھیے تو طبائع کا سکون ہی مولانا کے اسمِ گرامی سے تھا۔ مجلس ان کے بغیر سجتی نہ تھی ؎

ہر چند ہو مشاہدہ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ذکر ساغر و مینا کیے بغیر

اس فن میں حضرت مولانا نے قریباً سارے اسلامی ہند کی ذمے داری اپنے سر پر لے لی۔ چند اور بزرگوں نے بھی اس خدمت کے لیے تکلف فرمایا، مگر ’’إن التخلق یأتي دونه الخُلُق‘‘ کا معاملہ ہی ہوتا رہا۔ مناظرات میں سنجیدگی، حسنِ ذوق، ملاحتِ تکلم، جودتِ تعریض؛ حضرت مولانا کے مخصوص محاسن تھے، جن کا اعتراف مولانا کے دشمنوں کو بھی تھا۔ سچ یہ ہے کہ فنِ کلام اور حسنِ ذوق میں مولانا صرف اکیلے تھے، جن پر جماعت فخر کرسکتی ہے۔

نظامِ جماعت:

ایک شخص نے پورے اسلامی ہند کا بوجھ اپنے سر پر لے لیا یا اس کی صلاحیتوں پر نظر رکھتے ہوئے قوم نے ان پر پورا اعتماد کیا، بہر حال ایک انار و صد بیمار کی صورت ہوگئی۔ اس لیے یقیناً نظم جماعت ہمارے یا مولانا پیغمبر پوری کے حسبِ منشا نہ ہوسکا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اکیلا آدمی کیا کیا کرتا؟ مولانا اپنے طبعی رجحانات کے مطابق پیش آمدہ مسائل کا فیصلہ فرماتے یا ہماری آج پیدا ہونے والی ضرورتوں کی تکمیل فرماتے۔ اسی ماحول میں

اگر مولانا عبدالجبار اور مولانا پیغمبر پوری بھی ہوتے تو شاید اسی ''دکان داری'' کو پسند فرماتے، جسے آج وہ ناپسند فرما رہے ہیں، اور شاید جو مولانا نے کیا، ہم سے نہ ہو سکتا۔ میں مانتا ہوں اس راہ میں غلطیاں ہوں گی۔ من ذا الذي ما ساء قط، ومن له الحسنیٰ فقط؟ مگر ظروف و حالات کے لحاظ سے جو کچھ ہوا، مفید ہوا۔ کوشش یقیناً انفرادی ہے، لیکن جماعت اس کی افادی حیثیت سے انکار نہیں کر سکتی۔

وقت کی ضرورت:

اب وقت کی ضرورت یہ نہیں کہ چھوٹے بڑوں کو چھیڑیں یا بزرگ چھوٹوں پر تعریضات کریں۔ ضرورت اس چیز کی ہے کہ پرانی غلطیوں کو ترک کیا جائے۔ صحیح تجربات کی بنا پر مستقبل کا پروگرام بنایا جائے۔ ''اہلِ حدیث'' اور ''گزٹ'' میں جو طریق اختیار فرمایا گیا ہے، اس سے جماعت کو کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ جس گزرے ہوئے وقت پر آپ تاسف فرما رہے ہیں، اس وقت عوام کے سامنے یہی کچھ مشاغل تھے، مناظرات تھے، جلسے تھے، تقاریر تھیں۔ اس طریق پر جو ہوا، وہ اس وقت غیر مفید نہ تھا۔ مولانا کی تصانیف مولانا کی ذاتی محنت کا نتیجہ ہیں۔ ان سے تجارتی فائدہ بھی مولانا کو ہی ہوا، مگر اخلاقی اور علمی فائدہ تو ہندوستان کے اطراف و اکناف تک پہنچا۔ غرض یہ ایک مختصر اور مفید لٹریچر ہے، جس کی افادی حیثیت سے انکار حقائق اور واقعات کی تکذیب ہوگی۔

اب ہوا کا رخ پلٹ چکا ہے۔ مجالس اور مناظرات کی دل کشی کم ہو رہی ہے۔ سیاسی کشمکش نے فضا میں اور بھی تکدر پیدا کر دیا ہے۔ اب نئے اسالیب پر تصنیف و تالیف کے ادارے قائم ہونے چاہییں۔ حدیث اور شروحِ حدیث کے نوادر پریس میں آنے چاہییں، ان کی اشاعت ایسے طریق سے ہونی چاہیے کہ وہ ارزاں سے ارزاں نرخوں پر اہلِ علم تک پہنچ سکیں۔

اگر انگریز بہادر ہندوستان سے رخصت ہو تو نصابِ تعلیم ایسا مرتب کیا جائے، جو دین اور دنیا کی دونوں ضرورتوں کا کفیل ہو سکے۔ دہلی میں ایک ایسے دار الارشاد کی بنیاد رکھے کہ حضرت میاں صاحب کی روح کو راحت ملے اور توحید و سنت کی اشاعت صحیح طریق پر ہو۔ انقلاب تو بہر حال آ ہی رہا ہے، لیکن وہ ایسی راہوں سے آئے کہ اس میں کمیونزم اور اشتراکیت کے گندے جراثیم کی آمیزش نہ ہو سکے۔ بے دین قیادت کے ہاتھ میں انقلاب کی زمامِ اختیار نہ ہو۔ آنے والے نظام میں کتاب اللہ اور سنت کی روشنی زیادہ سے زیادہ اثر انداز اور ضوفگن ہو۔

مولانا عبدالجبار سے گزارش:

جناب کے وجودِ گرامی اور تجربات سے امید تھی کہ موتمر اور کانفرنس کے اختلافات کی خلیج کو جلد سے جلد پاٹ دیں گے۔ امرائے دہلی بھی آپ کے کام سے یہ محسوس کریں کہ ان کا کام موتمر اور کانفرنس پر حکومت نہیں،

بلکہ ان کا مقام خدمت ہے۔ مگر افسوس ہے کہ اب جو راہ اختیار کی جا رہی ہے، یہ ترکستان کی ہے۔ کعبہ کا مسافر اس راہ کا راہ نورد نہیں ہوسکتا۔ آپس کی جنگ میں وقت کو ضائع نہ فرمائیے اور ایسی صورت نہ کیجیے کہ جماعت میں مزید خلفشار کا اضافہ ہو۔ ﴿تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ لَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ وَ لَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾ [البقرة: ١٣٤]

حضرت مولانا سے بھی ادباً گزارش ہے کہ سابقہ عمارت پر جس کی تعمیر میں جناب کا بہت کچھ دخل ہے، مزید اضافہ فرمائیے۔ ایسا نہ ہو کہ جناب اپنی آنکھوں کے سامنے تخریب کے منظر دیکھیں۔ اللھم وفقنا لما تحب و ترضی۔[1]

---

[1] ہفت روزہ ''اہلِ حدیث'' امرتسر (۲ مئی ۱۹۳۷ء)

آج کل کے مناظروں کی افادی اور شرعی حیثیت پر ایک نظر

اور

جماعت کے لائحہ عمل میں ایک اہم تبدیلی کی ضرورت

میرا خیال ہے کہ موجودہ مناظرات اور بالفاظِ صحیح تر مجادلات کی ابتدا مرزا غلام احمد قادیانی آنجہانی سے پڑی، انھوں نے ''براہین'' کے زمانے سے آخر عمر تک اس پیشے کی بدولت کافی سرمایہ پیدا کر لیا۔ آج کل پھر اُن کی جماعت اس بے ہودگی اور دماغی عیاشی کی سب سے زیادہ مشاق ہے۔ آریہ سماج کا دماغی توازن بھی احمدی جماعت کے قریب قریب ہے، انھوں نے اس حرفت کو خوب چمکایا۔ دونوں جماعتوں کے لیڈروں نے دماغی عیاشیوں سے کافی سرمایہ حاصل کیا۔

اخلاق پر اس کا اثر:

ان دونوں جماعتوں کے دماغ پر یہ جنون اس قدر سوار ہے کہ اگر کچھ مدت ان کو یہ غذا نہ ملے تو وہ آپس میں لڑنے لگتے ہیں۔ ہنسی اور مذاق کے لحاظ سے یہ مجالس تھیٹر سے کم نہیں۔ اسی لیے حاضری کے لحاظ سے دونوں جگہیں اپنی نظیر آپ ہیں۔ جھوٹ کی کثرت، آپس کی جنگ، دھوکا دینا، بغض رکھنا؛ یہ ان مجالس کے لوازم سے ہو چکا ہے۔ خلوص اور للّٰہیت صرف نام کے لیے رہ گئی ہے۔ حاضرین کی بے نتیجہ شمولیت کا یہ حال ہے کہ وہ اسے ایک تماشا گاہ سے زیادہ حیثیت نہیں دیتے ؏

تک دیکھ لیا دل شاد کیا اور چل نکلے

اہلِ دانش کی نگاہ:

سنجیدہ اور عاقبت اندیش نگاہوں نے اس اکھاڑہ بازی کو معیوب سمجھا اور اسے تضییعِ وقت سے زیادہ اہمیت نہیں دی۔ اکبر مرحوم نے ان مجالس کی غیر افادی حیثیت کو خوب ملاحت سے بیان فرمایا ہے۔ ؎

مذہبی بحث میں نے کی ہی نہیں فالتو عقل مجھ میں تھی ہی نہیں

اس مرض کا عموم:

عوام کو چوں کہ ان مجالس سے کافی دلچسپی تھی، اس لیے تمام جماعتیں زود یا بدیر اس میدان میں کود پڑیں۔ مذہب کے مقدس نام، پھر انبیا اور اہلِ حق کی توہین ہوتی ہے، جن کو سب سے زیادہ غیور ہونا چاہیے تھا، وہ انبیا، اہل اللہ اور مسائلِ حقہ کی تضحیک سن کر کرسی پر ٹیک لگائے بڑی شاندار مسکراہٹ اور ہنگامہ خیز تبسم سے اپنی فراخ حوصلگی اور وسعتِ ظرف کے ثبوت مہیا فرماتے ہیں۔ فإنا للّٰه وإنا إليه راجعون.

جماعت اہلِ حدیث جو ملک کی معتدل اور سیاسی حیثیت سے ایک صحیح الخیال اور عاقبت اندیش جماعت تھی، وہ بھی اس سیلاب میں بہہ نکلی۔ اس ساری مناظرہ بازی کا اثر یہ ہوا کہ سارا ملک ہنگامہ کار زار ہو گیا۔ مذہب کے مقدس نام پر کشت خون ہونے لگا۔ سینکڑوں معصوم جانیں بلاقصور ان موثرات کی بدولت خاک وخون میں لوٹتی نظر آنے لگیں۔ فسيعلم الذين ظلموا أي منقلب ينقلبون.

سیاسی تحریکات:

اس ہنگامہ خیزی پر کچھ زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ حکومت کی استبداد پرور روش نے خصوصاً عالمگیر جنگ کے بعد موت کی نیند سونے والوں کو بیداری کی نعمت سے ہم کنار کر دیا۔ جدل ومرا کے بے پایاں بیابانوں میں سراسیم پھرنے والے، امن وآشتی، صلح وسکون کی بستیوں کا پتا پوچھنے لگے۔ ملک کو آنے والے مصائب سے بچانے کے لیے متحدہ کوشش کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ اس لیے ضروری تھا کہ ہوا کا رُخ بدلے، چناں چہ بدلا اور خدا کا شکر ہے کہ ان جھگڑا کمپنیوں کی سرد بازاری کے ساتھ ہی دِلوں کی توجہ اتفاق واتحاد کی طرف ہوئی اور حسبِ ضرورت اتحادِ عمل پیدا ہونے لگا۔

میری حیرت:

جب حالات یہ تھے تو مجھے حیرت ہوئی کہ جمعیت تنظیم اہلِ حدیث (جس کے موقر ادارے میں مخلص رفقا کے ساتھ مجھے بھی کام کرنے کا موقع ملا ہے اور آیندہ اس کا ارادہ ہے) کی ششماہی رپوٹ شائع ہوئی، جس میں جہاں کچھ تعمیری چیزیں تھیں، وہاں ان تخریبی مجالس کو بھی کافی اہمیت کے ساتھ ذکر کیا گیا تھا۔ اس لیے مجھے ضرورت محسوس ہوئی کہ میں چند حقیر خیالات اپنے رفقائے کار کے سامنے رکھوں، ممکن ہے آیندہ لائحہ عمل کی تجویز میں ہم کسی مفید نتیجے پر پہنچ سکیں۔ وما ذلك على اللّٰه بعزيز.

چناں چہ چند معروضات مورخہ ۲ر شعبان "تنظیم اہلِ حدیث" میں لکھیں[1] اور آج بھی گویا اس کی دوسری

[1] یہ مکمل مضمون حضرت سلفی رحمہ اللہ کے ایک مجموعہ "نگارشات" (ص: ۱۹۳) میں شائع ہو چکا ہے۔

قسط سے جناب کی سمع خراشی کرنا چاہتا ہوں۔ آج کی صحبت میں ان مجالس کے فوائد اور بصورتِ موجودہ ان کی شرعی حیثیت کا تذکرہ ہوگا، جیسے عنوان سے ظاہر ہے۔

محلِ نزاع کی تعیین:

آج کل لفظِ مناظرہ ''کلمة حق أُرِيْدَ بِهَا الْبَاطِلَ'' کا مصداق ہو رہا ہے۔ اسی سے میری سابقہ معروضات کو جہاں بہت سے لوگوں نے پسند فرمایا ہے، وہاں بعض بزرگوں نے غلط سمجھ کر اظہارِ خفگی فرماتے ہوئے ان مناظرات کو ثابت کرنے کے لیے استدلال کی کوشش بھی فرماتے ہوئے مناظرہ کو سنتِ انبیا اور عملِ سلف قرار دیا ہے۔ مجھے بھی ان سے اختلاف نہیں، لیکن آج کل کے مناظرات کو مناظراتِ سلف سے تعبیر کرنا صرف قلبِ حقیقت ہی نہیں، بلکہ ائمہ سلف رحمہم اللہ پر ظلم ہے۔

یہ معلوم ہے کہ سلف کے مناظرات بعض اَنا دضد وتعجب سے خالی ہوتے تھے۔ وہاں صرف حقیقت کی تلاش مقصود ہوتی تھی۔ اس لیے صرف دو مختلف الخیال آدمی بیٹھ کر منزلِ مطلوب تک پہنچ سکتے ہیں۔ ایسے مناظروں کو نہ تصفیہ شرائط کی چنداں تکلیف ہوتی ہے، نہ پولیس کی احتیاج، نہ عوام کے ہجوم کی ضرورت، نہ منٹوں اور گھنٹوں کی تعیین کا مخمصہ، نہ انتخابِ صدر میں جھگڑا۔ بلکہ فیصلے تک نہ پہنچنے کی صورت میں بھی نقضِ امن کا قطعاً کوئی خطرہ نہیں ہوتا ہے۔

بلکہ اگر یہ گفتگو کسی وقت مجمع میں بھی ہو جائے تو اشتعال کا کوئی اندیشہ نہیں ہوسکتا، مجمع کا اشتعال عموماً مناظروں کی بدنیتی یا طریقِ گفتگو کی ناہمواری سے ہوتا ہے۔

ایک سوال:

اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ اگر مناظرے کے لیے حق پرست دنیا میں موجود ہوں یا واقعات میں کوئی ایسی صورت پیدا ہونا ممکن نہ ہو، جیسے کہ آج کل قریب قریب یہی حالت ہے تو ایسی صورت میں آیا ایک شریر کو کھلی اجازت دے دی جائے کہ وہ جس طرح چاہے عوام کے عقائد کو برباد کرے؟

میرے خیال میں اس کا حل دو طریق سے ہوسکتا ہے:

اولاً: صحیح تعلیم کی اشاعت، مذہبی زبان کی ترویج، جس کی طرف سے مدت ہوئی، جماعتِ اہلِ حدیث غافل ہوچکی ہے۔ یہی شکایت تھی، جو میں نے پہلے کی تھی، جس کی تلخی نے دور تک ناگوار اثر کیا۔ میرا عقیدہ ہے کہ اگر عربیت کی اشاعت کا حسبِ ضرورت صحیح انتظام ہو جائے تو احمدی، اہلِ قرآن، اہلِ بدعت اپنی موت آپ مر جائیں گے۔ بجز چند فروعی مسائل کے کوئی قابلِ توجہ نزاع نہیں رہ جائے گی، جس پر کفر و اسلام کا انحصار کیا جا سکے اور ایسے اختلاف کا وجود قطعاً امت کے لیے مضرت رساں نہیں ہوگا۔

دوسرا طریق:

دوسرا طریق وہی ہے، جسے اسلام نے پورے تیرہ سو سال کی فاتحانہ اور کامیاب مصالحانہ مساعی کے بعد ﴿اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرٌ﴾ [الحج: ٣٩] کی صورت میں ان لوگوں کے لیے پیش فرمایا جو صرف حق کے منکر ہی نہ تھے، بلکہ سچائی کی راہ میں ایک عظیم الجثہ چٹان تھے، جس کا توڑنے اور پاش پاش کرنے کے سوا کوئی دوسرا علاج نہیں۔ کیوں کہ یہاں اصلاحِ عقائد کا سوال نہیں رہ جاتا، افہامِ تفہیم کے لیے گنجایش ہی نہیں ہوتی، وہاں شرارت کا راسخ کا الفلاع مطلوب ہے اور وہ نہ تو طنزیہ الفاظ سے ہوسکتا ہے اور نہ مناظرانہ تمسخر سے، اُس کے لیے تو توہ کا مظاہرہ ہی کارآمد ہوسکا۔ پس ایسے مخالفین سے ساری دنیا کے علما پورے عالم مناظرہ جمع فرما دیجیے، پوری ایک صدی صرف ایک شخص کو سمجھانے پر صَرف فرما دیجیے۔ میں آپ سے عرض کروں گا کہ وہاں مکمل ناکامی کے سوا کوئی نتیجہ نہیں ہوگا۔ جیسے آج کل مناظروں میں دیکھا جا رہا ہے۔ اسی سے قرآنِ حکیم نے ایسے لوگوں کو ﴿اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا﴾ کہہ کر اپنے مصالحانہ پروگرام سے بالکل الگ کرایا ہے۔ پس ایسے حالات میں وقت اور روپیہ کو مناظرات میں صَرف کرنا، کوئی فائدہ نہیں دے سکتا، لیکن یہی وہ مقام ہے، جہاں پر مدعیانِ سنتِ انبیا اور متبعانِ طریقۂ سلف کی قوت افتا قلم اور دوات میں ہی۔ آلاتِ جہاد کے حصر کا فتویٰ دینے پر مجبور ہوگی۔ حضرت العلما اس راہ کی مشکلات پر غور کرتے ہوئے بھی تھرا اُٹھتے ہیں: ''تا بہ عمل چہ اسد'' اس سے میں نے سابق مضمون میں پہلے طریق کی طرف توجہ دلائی: جماعت کو صحیح تعلیم کی اشاعت میں ہمہ تن مصروفِ عمل ہونا چاہیے اور مجالسِ جدل سے حسبِ امکان بچنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ لعل الله يحدث بعد ذلك أمرا.

مناظراتِ سلف تخریبی نہیں:

ایسے مناظرات جو طریقِ سلف اور سنتِ انبیا کے مطابق ہوں، ان میں تخریب کا خطرہ ہی نہیں، نہ ان میں اضاعتِ مال ہے۔ ایسی مجالس سالہا سال میں شاید کوئی ایک ہو جائے، پوری زندگی میں متبعِ حق کو شاید ہی ایک دو دفعہ ایسی گفتگو سے سابقہ پڑے۔

حال ہی میں حضرت مولانا ابو الوفا ثناء اللہ صاحب نے ایک مضمون اہلِ حدیث علما کی مناظرانہ کوششوں کے متعلق سپردِ قلم فرمایا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان ابتدائی ایام میں جبکہ اہلِ حدیث طاقت ور تھے، فحول علماے اہلِ حدیث کو اپنی ساری ساری زندگی میں ایک دو دفعہ سے زیادہ مناظرے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی، وہ بھی مخالفین کی طلب پر اور اس کی وجہ ظاہر ہے، کیوں کہ اس میں شرکا اپنی ذاتی ضرورت کے لیے جائیں گے نہ

کہ فوائد اور ضروریات کے لیے۔ یہ چیز بطورِ پیشہ وحرفت استعمال نہیں ہوتی اور نہ مناظروں کو ایسے اشتہاروں کی ضرورت ہوگی کہ خادمِ شریعت وہابیوں، دیوبندیوں، مرزائیوں سے مناظرہ کے لیے ہر وقت تیار رہتا ہے اور نہ ہی تقریرِ فیس کی مصیبت ہوگی۔ آہ ؎

ہر بو الہوس نے حسن پرستی شعار کی اب آبروئے دیدہ اہلِ نظر گئی

اسی صورت میں خادم مخدوموں کو خود ٹٹول لیں گے اور اہلِ حق سیراب کن چشموں کی ٹوہ یقیناً لگا لیں گے۔ ایسے مناظرات میں نہ نزاع ہے نہ تخریب، اس لیے یہ جائز تھے، اب ہیں اور آیندہ رہیں گے۔ یہ فطرت کا مطالبہ ہے اور روح کی غذا۔ اسی کا نام قرآنِ حکیم نے حجت، برہان، بینہ اور سلطان رکھا ہے۔ فرمایا:

﴿هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِيْنَ﴾ [البقرة: ١١١]

اور فرمایا: ﴿إِنْ عِنْدَكُمْ مِّنْ سُلْطَانٍ بِهٰذَا أَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ [يونس: ٦٨]

نیز فرمایا: ﴿لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ﴾ [الأنفال: ٤٢]

اور فرمایا: ﴿فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ﴾ [الأنعام: ١٤٩]:

علمائے حق کی دُور اندیشی:

ان صحیح مناظرات میں بھی علمائے حق کی دور اندیشی کا یہ عالم ہے کہ وہ اسے بھی فروعِ فقہیہ تک ہی محدود رکھنا پسند کرتے ہیں۔ قرآن کی مشکلات اور صفات کی دقائق اور متکلمین کی نکتہ نوازیوں میں پڑنا ان کے ہاں خالی از خطر نہیں۔ حافظ ابو عمرو ابن عبد البر اپنی نفیس ترین کتاب "جامع" (٢/ ٩٨) میں ابو امامہ کی مرفوع حدیث: «ما ضل قوم بعد هدى إلا لقنوا الجدل»[1] یعنی ہدایت کے بعد قوموں کی گمراہی جدل و مناظرہ ہی ہوتی ہے، کے بعد فرماتے ہیں:

"وتناظر القوم وتجادلوا في الفقه، ونهوا عن الجدال في الاعتقاد، لأنه يؤول إلى الانسلاخ من الدين، ألا ترىٰ مناظرة بشر في قوله جل و عز: ﴿مَا يَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلٰثَةٍ إِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ﴾ حين قال: هو بذاته في كل مكان. فقال له خصمه: هو في قلنسوتك، وفي حشك، وفي جوف حمارك. تعالىٰ الله عما يقولون. حكى ذلك وكيع، وأنا والله أكره أن أحكي كلامهم قبحهم الله فمن هذا وشبهه نهى العلماء"[2]

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٢٥٣)

[2] جامع بيان العلم (٢/ ١٩٩)

''علما نے فقہی مسائل میں مناظرہ ومجادلہ کی اجازت دی ہے اور اعتقاد میں ان مناظرات سے روکا ہے، کیوں کہ اس کا نتیجہ بسا اوقات ارتداد ہوتا ہے۔ بشر مریسی کا مناظرہ آپ نے نہیں سنا، جب کہ آیت ﴿مَا يَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ﴾ پر گفتگو ہوئی تو بشر نے کہا: خدا تعالیٰ بالذات ہر جگہ ہے۔ اس کے مخالف نے کہا: کیا وہ تمھاری ٹوپی میں ہے؟ آپ کے پاخانہ میں ہے؟ کیا وہ تیرے گدھی کے پیٹ میں ہے؟ معاذ اللہ. وکیع نے یہ بیان کیا ہے، لیکن میں اس کی حکایت بھی مناسب نہیں سمجھتا، اس قسم کے مناظروں سے علما نے منع فرمایا ہے۔''

نیز ''جامع'' (۹۲/۲) میں فرمایا:

"ونهى السلف عن الجدل في الله وفي أسمائه وصفاته"

یعنی علمائے امت نے اللہ اور اس کے اسما وصفات میں مناظرے سے منع فرمایا ہے۔

حضرت امام مالک رحمہ اللہ کا بھی فتویٰ نقل فرما کر حافظ ابن عبدالبر لکھتے ہیں:

"والذي قاله مالك رحمه الله، عليه جماعة الفقهاء والعلماء قديما و حديثاً من أهل الحديث والفتوىٰ، وإنما خالف ذلك أهل البدع والمعتزلة وسائر الفرق"

یعنی جمہور فقہا اور علمائے اہلِ حدیث وفتویٰ کا وہی خیال ہے، جو امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا کہ فروعِ فقہیہ میں مناظرہ کیا جائے اور عقائد کو جدل ومرا کی آلودگی سے بالا رکھا جائے۔

حافظ ابن عبدالبر نے ''جامع بیان العلم'' میں جائز اور ناجائز مناظرات پر سیر کن بحث لکھی ہے۔ اربابِ ذوق کو اس میں مبسوط اور مفید معلومات ملیں گی۔

آج کل کے مناظرات:

آج کل کے مناظرے کا صحیح تر نام مجادلہ ہے۔ اس کی اس سے بہتر کوئی تعریف نہیں کی جا سکتی کہ ذہنیتوں کی بربادی، قوموں کی تباہی، جماعتوں کی تخریب کے لیے ایک دل کش اکھاڑہ، جس کو مذہب کے مقدس نام پر بپا کیا جائے۔ یہی وہ چیز ہے، جسے اصلاحی جماعتوں کی رودادِ عمل سے بالکل خارج ہونا چاہیے، جس کے نام سے شرافت جھک جاتی ہے، انسانیت حقہ سر دھن کر رہ جاتی ہے۔ دماغی عیاشی اور اخلاق کی موت کے سوا اس کا کوئی ثمر نہیں۔ اس میں فاتح وہی لوگ سمجھے جا سکتے ہیں، جو فحش گوئی میں یدِطولیٰ رکھتے ہوں۔ متانت اور سنجیدگی کا یہاں شکست کے سوا کوئی دوسرا نام ہی نہیں۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ شاید میرا ماحول ایسا ہو یا مجھے ایسے لوگوں سے سابقہ پڑا ہو، جو اس قماش کے ہوں، یہ صحیح ہے کہ یہ میری رائے ہے، لیکن میں سچ کہتا ہوں کہ میں

نے ایسے مناظرات بھی سنے، جن میں چوٹی کے آدمی شریک تھے، جن کی مناظرانہ جماعت چار دانگِ عالم سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی تھی، لیکن میری رائے نہ بدلی، بلکہ یہ مجالس میری اس رائے کا صحیح ماخذ ہیں، اس کے علاوہ رائے عام ان مجالس سے کافی حد تک بیزار ہو رہی ہے ؎

نہ من تنہا دریں میخانہ مستم جنید و شبلی و عطار شد مست

ائمہ کی رائے:

انہی مناظرات کے لیے تحصیلِ علم پر بھی کوئی ثواب نہیں ملتا۔ سنن دارمی اور مجمع الزوائد اور دیگر کتبِ حدیث میں اس قسم کے آثار بہ کثرت ملتے ہیں۔ امام اوزاعی فرماتے ہیں:

"بلغني أن الله إذا أراد بقوم شراً، ألزمهم الجدل و منعهم العمل"

یعنی جب کسی قوم کو اللہ تعالیٰ شر میں مبتلا کرنا چاہتا ہو تو ان کے دِلوں سے عمل کی محبت نکل جاتی ہے اور جدل و مناظرہ ان میں عام ہو جاتا ہے۔

ابو بکر بن نصر فرماتے ہیں:

"إذا أراد الله بقوم شراً، ألزمهم الجدل ومنعهم العمل"

بالکل یہی الفاظ حضرت ابراہیم نخعی سے مروی ہیں۔ میں خود ایسے مناظروں کو جانتا ہوں، جو مناظرہ سے فرصت کے بعد نماز کا نعم البدل تاش کو سمجھتے ہیں۔ بڑے بڑے مشہور مناظرین کا یہ حال ہے کہ وہ مسجد کے پہلو میں بھی جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنے کی زحمت گوارا نہیں فرماتے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز ان مناظرات کے عجیب نتائج کا پتا دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

"من جعل دينه عرضاً للخصومات أكثر التنقل"[1]

یعنی جو شخص دین کی محبت کا معیار مناظرات ہی کو سمجھے، اس کا مذہب و مسلک اکثر بدلتا رہتا ہے۔

امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"أرأيت إن جاء جاء من هو أجدل منه أيدع دينه؟ كل يوم لدين جديد!"[2]

یعنی کیا ہر جھگڑالو کے لیے روزانہ ایک نئے دین کی تلاش میں پھر جائے؟

حضرت امام مالک رحمہ اللہ کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایسے مناظرات کی پود ہر چڑھتی صبح نئے نقال اور اقوال کی متلاشی رہتی ہے۔

---

[1] جامع بيان العلم (٢/ ١٨٧)

[2] مصدر سابق (٢/ ١٩٤)

فائدہ:

پہلے ذکر ہوا کہ علمائے حق ذات و صفاتِ باری عز اسمہ وغیرہ مسائل میں مناظرات کو پسند نہیں فرماتے تھے۔ اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہ مسائل اَفہام کی دست گاہ سے بالا ہیں۔ ان پر گفتگو علی وجہ البصیرت نہیں کی جا سکتی۔ ﴿وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ یُّجَادِلُ فِی اللّٰهِ بِغَیْرِ عِلْمٍ وَّ لَا هُدًی وَّ لَا کِتٰبٍ مُّنِیْرٍ﴾ [الحج: ۸] آج کل کے مناظرات بھی چوں کہ علم و بصیرت پر مبنی نہیں ہیں، ان سے مقصد بھی صرف جدل و مکابرہ ہے، اس لیے علتِ نہی ایک ہی ہے۔ والحكم كذلك، لأن الأحكام تدور مع العلل.

میں اپنے رفقائے کار سے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اول تو آج کل مناظرات کو کوئی اہمیت نہیں دینی چاہیے اور اگر کبھی اس کی ضرورت محسوس ہو تو اسے حتی المقدور اصلح صورت دینے کی کوشش کی جائے۔

مجھ کو بتوں سے عشق ہے، کافر نہیں ہوں میں:

میں اپنی اس قطعی رائے کے ہوتے ہوئے بھی محسوس کرتا ہوں کہ جب تک دنیا میں مرزائی جماعت موجود ہے اور حکومت انگریزی ان کی پشت پر، ایسے مناظرات کا خاتمہ مشکل نہیں، بلکہ محال ہے اور اس کا دفاع بھی ضروری ہے، اس لیے بحکم ﴿وَجَزٰٓؤُا سَیِّئَةٍ سَیِّئَةٌ مِّثْلُهَا﴾ [الشوریٰ: ۴۰] ایسے مناظرے رہنے چاہییں اور بمقتضائے "إذ ابتلي أحدكم ببليتين فليختر أهونهما"[1] مناسب ہوگا کہ ایسی مجالس کے ضرر کو حسبِ امکان کم کیا جائے۔ تمسخر، غیر مہذب الفاظ سے حسبِ وسعت بچا جائے، خلطِ مبحث سے بچا جائے، تاکہ پبلک کا مذاق درست رہے اور ممکن ہے یہ حقیقت کی طرف راہنمائی کرے اور مناظراتِ سلف کی شان پیدا ہو سکے ع

مجھ کو بتوں سے عشق ہے، کافر نہیں ہوں میں

جدل و مناظرے میں فرق کی آسان راہ:

حافظ ابن عبدالبر نے "جامع" کے (ص: ۱۰۸) میں آدابِ مناظرہ کا تذکرہ فرمایا ہے، جس سے جدل و مناظرے میں فرق آسان ہو جاتا ہے:

"وحق المناظرة أن يراد بها الله عز و جل، وأن يقبل منها ما يتبين، وقالوا: لا تصح المناظرة، و لا يظهر الحق بين المناظرين حتى يكونا متفاريين أو متساويين في مرتبة واحدة من الدين والفهم والعقل والإنصاف و إلا فهو مراء و مكابرة"[2] اھ

[1] جب دو مصیبتوں کا سامنا ہو تو ان میں سے ہلکی کو اختیار کرلو۔

[2] جامع بيان العلم (۲/ ۲۱۸)

یعنی مناظرے کا مقصد یہ ہے کہ وہ صرف خدا تعالیٰ کی رضا کے لیے ہو اور جس قدر اس میں حق ظاہر ہو، اسے تسلیم کرے۔ علما نے فرمایا: جب تک دونوں مناظر عقل، فہم، دیانت اور انصاف میں برابر نہ ہوں، حق ظاہر ہو سکتا ہے اور نہ یہ مناظرہ ہے، بلکہ یہ جھگڑا اور مکابرہ ہے۔''

اس لیے آج کل کے مناظرات میں ان شرائط کا فقدان ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے۔ آج کل جہلا بھی اس میدان کے اس قدر شہسوار ہیں، جس قدر مشاہیر علما نہیں، اس لیے کہ مناظرہ صرف چال چلنے اور چال پہچاننے کا نام رہ گیا ہے ع

این ہمہ شد حلال ولے مے حرام شد

میری سابقہ گزارشات سے بعض بزرگوں کا تاثر:

میں نے ایک مضمون اسی موضوع پر اس سے پہلے لکھا تھا، جسے اکثر حلقوں میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا، لیکن ۱۶؍ دسمبر ۴۳ء کا ''اہلِ حدیث'' دیکھ کر مجھے افسوس ہوا کہ حضرت مولانا ثناء اللہ صاحب کے تاثرات بالکل دگرگوں ہیں۔ انھوں نے اس سے یہ سمجھا ہے کہ میں مناظروں کے بالکل خلاف ہوں اور میری معروضات کی بنیاد حسد اور رقابت ہے۔ أعوذ باللّٰہ من ذلك.

امرِ اول کے متعلق میں کچھ نہ کہوں گا، کیوں کہ مضمون پڑھنے والے جو کچھ ہے، اسے پڑھ چکے ہیں۔ نیز پچھلے ''تنظیم اہلِ حدیث'' میں کسی غائبانہ دوست نے اس پہلو کو مجھ سے بہتر لکھا ہے۔ فجزاہ اللّٰہ. اور یہ کہنا کہ حضرت مولانا نے ان معروضات پر غور نہیں فرمایا، علاوہ سوے ادب کے خلافِ واقع بھی ہے۔

میرا خیال اور معذرت:

مضمون لکھتے وقت مجھے اس چیز کا وہم بھی نہ تھا، جس طرف حضرت مولانا کا ذہن منتقل ہوا اور نہ ہی حضرت مولانا کی شخصیت نفیاً و اثباتاً پیشِ نظر تھی۔ محض اصلاح مقصود تھی، لیکن جس چیز کے متعلق میں نے لکھا تھا۔ حضرت مولانا کے گرامی اوقات کا کافی حصہ اس شغل میں گزرا ہے۔ اس لیے سابق خفگی اور رنجش کی موجودگی میں حضرت مولانا کے یہ احساسات بے جا نہیں ہیں۔ خصوصاً جب کہ ان کے متعلق کوئی کلمہ استثنا بھی موجود نہ ہو۔ اس لیے اس تکلیف اور خفگی کے متعلق میں کھلی معذرت چاہتا ہوں کہ ان کی ذاتِ گرامی اور والا شخصیت سے ان معروضات کا کوئی خاص تعلق نہ تھا۔ رقابت کا خیال تو ہم پیشہ اور اصحابِ حرفت کو ہو سکتا ہے اور یہاں اس کی اہلیت ہی مفقود اور ان انفال و غنائم سے یکسر نفرت، تو پھر رقابت کیوں ہونے لگی؟!

رہا اصل مسئلہ، اس کے متعلق اب بھی وہی رائے ہے کہ آج کل کے مناظرے نہ سنت ہیں نہ عملِ سلف، بلکہ یہ اضطراری فعل تھا، جس کو اختیاری حرفت قرار دے دیا گیا ہے۔

اس کے بعد:

اگر میری یہ معذرت سابق اور موجودہ تکرار کا علاج ہو سکے تو میں حضرت مولانا سے عرض کروں گا کہ میری معروضات پر مکرر غور کیا جائے اور جماعت کی صحیح راہنمائی کی کوشش فرمائی جائے۔ طریقِ کار میں اختلاف اور خیالات میں تفاوت ہو سکتا ہے، لیکن مرض کا نام صحت اور دوا کا نام غذا نہیں رکھا جا سکتا۔ اس کے ساتھ ہی امید کرتا ہوں کہ اختلافِ رائے کی صورت میں جناب اس میں اظہارِ رائے کے حق سے محروم نہیں فرمائیں گے۔ اس پر بے ادبی کی سرزنش امرتسر سے سیالکوٹ تک متعدی نہ ہوگی۔

اُستاذی مولانا محمد ابراہیم صاحب:

مولانا نے فرمایا کہ مناظرہ مولانا ابراہیم صاحب کا دِن رات کا کام ہے۔ میرے خیال میں یہ صحیح نہیں۔ مولانا نے بارہا اس گشت پرنشست کو ترجیح دی۔ کئی دفعہ انھوں نے مسندِ درس کو زینت دینے کی کوشش فرمائی۔ اپنی صحت کو خراب کیا، اپنی ذاتی جائداد کا نقصان کیا، لیکن اس کا کیا علاج کہ ؎

ما كل ما يشتهيه المرء يدركه تجري الرياح بما لا تشتهي السفن

مجبوراً یہ سلسلہ قطع کرنا پڑا۔ میں نہیں کہہ سکتا، اب حضرت الاستاد کے کیا خیالات ہوں، لیکن اتنا جانتا ہوں کہ ان کی افتادِ طبیعت بالکل اس کے منافی ہے۔ انھوں نے اسے کبھی بطورِ پیشہ استعمال نہیں فرمایا۔
اس کے علاوہ وہ کوشش کرتے ہیں کہ مناظرے کو تمسخر اور متعارف بے ہودگیوں سے پاک رکھیں۔ ان کے مناظرات ہمیشہ دلائل اور متانت پر مشتمل ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے مناظرات کے متعلق جناب کی رائے بھی اچھی نہیں، چناں چہ گوجرانوالہ کے ایک مناظرے کے متعلق آپ نے کئی دفعہ اس کا اظہار فرمایا، اسی سے میرا تو یہ خیال ہے کہ ''یہ ان کا دن رات کا کام نہیں ہے۔''[1]

---

[1] ہفت روزہ ''تنظیم اہلِ حدیث'' روپڑ (یکم فروری ۱۹۳۳ء)

شخصیات و وفیات

إخاء أربعين سنة

حضرت مولانا سید محمد داود صاحب غزنوی سے دیرینہ تعلقات

مغفور حضرت مولانا سید محمد داود صاحب غزنوی سے میری پہلی ملاقات کوچہ بلی ماراں دہلی میں ہوئی، جہاں استاذ الاساتذہ، مجاہدِ وقت، سید الاتقیاء حضرت مولانا عبداللہ صاحب غازی پوری رحمہ اللہ قرآنِ عزیز کا درس دیتے تھے۔ حضرت مولانا غزنوی نے اسی دن حضرت حافظ صاحب مغفور سے ہدایہ اخیرین کا پہلا سبق پڑھا تھا۔ اس وقت نہ مولانا مجھے جانتے تھے نہ میں مولانا سے واقف تھا۔ یہ واقعہ ۱۹۱۴ء کا ہے، جب کہ پہلا محاربہ عظمیٰ ملک پر محیط تھا۔ میں ان دنوں مدرسہ دینیہ دہلی میں حضرت مولانا قاسم علی صاحب مرحوم سے کنز الدقائق پڑھتا تھا۔ اس کے بعد دہلی میں مولانا غزنوی سے ملاقات کا موقع نہیں ملا۔

مولانا تعلیم سے فارغ ہو کر امرتسر آ گئے۔ کچھ عرصہ مدرسہ غزنویہ میں پڑھاتے رہے۔ ۱۹۱۹ء کے مارشل لا کے بعد مولانا سیاسیات میں کود پڑے۔ انگریزی حکومت کے استبداد کا مقابلہ بڑی جرأت سے کیا۔ حضرت الامام مولانا عبدالجبار صاحب غزنوی رحمہ اللہ اس وقت انتقال فرما چکے تھے۔ مولانا سے ان دنوں وقتاً فوقتاً ملاقات ہوتی رہی۔ امرتسر میں اس وقت مولانا کی سیاسی اور علمی تقاریر کا بہت چرچا تھا۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو مولانا ہی اس میدان میں لائے تھے، جو بعد میں اپنے وقت کے بہترین مقرر ہوئے۔

میں ۱۹۲۱ء میں فارغ ہو کر گوجرانوالہ آیا۔ حضرت مولانا علاء الدین صاحب مرحوم کے انتقال کے بعد مسجد اہلِ حدیث میں خطابت اور مدرسہ محمدیہ میں تدریس میرے سپرد ہوئی۔ اس وقت تحریکِ خلافت آخری مراحل میں تھی۔ ترکی نے الغائے خلافت کا اعلان کر دیا تھا۔ مغربی طاقتوں نے ترکی حکومت کے حصے بخرے کر لیے تھے۔ مسلمان ان ایام میں انتہائی مضطرب تھے۔ انگریز کے ساتھ اُلجھنے کے لیے مسلمان قیادت مناسب موقعے کی تلاش میں تھی۔ انھیں ایام میں لاہور میں جمعیۃ العلماء ہند کا اجلاس منعقد ہوا، جس کی صدارت حضرت مولانا ابو الکلام آزاد نے فرمائی۔ میاں عبدالعزیز صاحب بیرسٹر ایٹ لاء کی کوٹھی میں مولانا آزاد نے صبح کی نماز پڑھائی۔ اس کے بعد لوگوں نے اسلام کی سربلندی اور استخلاصِ وطن کے لیے بہت بڑی تعداد میں بیعت کی۔ اس بیعت میں حضرت مولانا داود غزنوی بھی شامل تھے۔ میں نے اور میری طرح کے بہت سے لوگوں نے بیعت کی۔ اس اجلاس کے

انتظامات میں حضرت فقید مرحوم نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ حضرت مولانا عبدالواحد غزنوی زندہ تھے۔ مولانا آزاد کی ملاقات کے لیے تشریف لائے۔ مولانا آزاد بڑے تپاک سے ملے۔ مولانا عبدالواحد صاحب نے بہت دعائیں دیں۔ اس وقت مولانا داود غزنوی مجمع میں موجود تھے۔ مولانا آزاد سے گہرے اور خصوصی مراسم کا یہ بھی ایک موقع تھا۔

میرے ذاتی مراسم:

اس اجلاس پر فقید مغفور سے مراسم میں بہت اضافہ ہوا۔ مکتبِ فکر کی وحدت اور سیاسی خیالات میں یکسائی مزید مراسم کا موجب بنی۔ تقریباً انہی ایام میں مولانا نے امرتسر سے اخبار ''توحید'' [یکم اپریل ۱۹۲۷ء] جاری کیا۔ اس اخبار میں مذہب اور سیاست کا بڑا معتدل امتزاج تھا۔ یہ اخبار سیاسی اور جماعتی حلقوں میں بہت مقبول ہوا۔ مرحوم کے قلم میں بہت زور تھا۔ ہم ایسے دینی اور نیم سیاسی ذہن رکھنے والے اسے بڑے شوق سے پڑھتے تھے۔ ان ہی ایام میں ملتان شہر میں آل انڈیا اہلِ حدیث کانفرنس کا اجلاس منعقد ہوا۔ کانفرنس کا سیاسیات سے قطعی تعلق نہ تھا، بلکہ انگریزی حکومت کی وفاداری اس کی پہلی شرط تھی۔ مولانا غزنوی نے اس شرط سے اختلاف فرمایا۔

ہم ایسے کئی سر پھرے اس تجویز میں مولانا کے موید تھے۔ مولانا ثناء اللہ صاحب مرحوم کا خیال تھا کہ مصالح کا تقاضا یہ ہے کہ یہ لفظ رہنے دیا جائے۔ بڑی گرما گرم بحث ہوئی۔ اس کے فقید مرحوم نے اس پر ''توحید'' میں مسلسل مضامین لکھے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کانفرنس کے آئین سے یہ دفعہ حذف کر دی گئی۔

۱۹۲۱ء کے بعد سے مولانا غزنوی مرحوم کے ساتھ سیاسی اور دینی تعلق قائم رہا۔ اس اثنا میں سید محمد شریف مرحوم گھڑیالوی کو امیر منتخب کر کے ایک نئی جماعت کی تشکیل عمل میں آئی۔ اس میں حضرت مولانا عبدالقادر صاحب قصوری، مولانا محمد صاحب سورتی، مولانا اسماعیل صاحب غزنوی، مولانا حافظ عبداللہ صاحب روپڑی سب شامل تھے۔ جماعت کچھ عرصہ بہت کامیاب رہی، لیکن تھوڑے عرصے کے بعد مولانا غزنوی اور ہم سب لوگ اس سے الگ ہونے پر مجبور ہو گئے۔

یہ جماعت کیوں ناکام ہوئی؟ یہ بڑی دلخراش داستان ہے۔ اب اس کے اسباب و دواعی پر بحث کرنا چنداں مفید معلوم نہیں ہوتا، ویسے بھی جماعت کے اکثر دوست ان اسباب کو جانتے ہیں، اس لیے یہ تذکرہ بے سود ہے اور اضاعتِ وقت کا باعث!

اس وقت اخبار ''توحید'' بند ہو چکا تھا اور مولانا غزنوی وطنی سیاسیات کے لیے وقف ہو چکے تھے اور کانگرس اس وقت ملک کی مضبوط ترین سیاسی جماعت تھی۔ احرار بھی معرضِ وجود میں آ چکی تھی۔ مولانا مرحوم نے

ان دونوں محاذوں پر کام کیا۔ بالآخر مولانا غزنوی احرار سے الگ ہو کر کانگرس میں چلے گئے۔ میرے ان تمام مراحل میں مولانا مرحوم سے بدستور مراسم رہے۔

۱۹۴۵ء میں مَیں نے کانگرس سے علیحدگی اختیار کر لی اور درس و تدریس کی راہ مستقل طور پر اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن ۱۹۴۶ء میں جب مولانا غزنوی پنجاب کانگرس کے صدر مقرر ہوئے اور مولانا آزاد انتخابات کی تکمیل کے بعد خود پنجاب تشریف لائے تو مولانا مرحوم نے مجھے بھی پراونشل کانگرس کمیٹی کی مجلسِ عاملہ کا رُکن نامزد کر لیا۔ اس سے بہت پہلے مولانا مرحوم امرتسر چھوڑ کر مستقل طور پر لاہور آ گئے تھے۔ چینیاں والی مسجد لاہور میں اقامت اختیار فرما لی تھی۔ میں بھی اکثر لاہور آتا۔ چینیانوالی مسجد لاہور میں جماعت اہلِ حدیث کا مرکزی مقام تھا۔ ملاقات تبادلہ خیالات کا اکثر موقع ملتا۔ پھر تعلقات بڑھتے گئے۔ احرار کے انتخابات کے سلسلے میں مولانا غزنوی گوجرانوالہ تشریف لائے تو تمام نمازیں عموماً جامع اہلِ حدیث میں ادا فرماتے رہے۔

اگست ۱۹۴۷ء میں پاکستان کی تشکیل عمل میں آئی، اس وقت مولانا دھاریوال کے لیبر حلقے کی طرف سے صوبائی اسمبلی کے ممبر تھے۔ غالباً مولانا واحد آدمی تھے، جو مسلمان امیدواروں سے کانگرس ٹکٹ پر کامیاب ہوئے تھے۔ ۱۹۴۶ء میں مرحوم نے دہلی میں دوسری شادی کی، جس سے اس وقت مرحوم کے چھ بچے ہیں۔

مولانا دہلی سے بذریعہ ہوائی جہاز اس وقت لاہور پہنچے، جب ۱۹۴۷ء کے فسادات جوبن پر تھے، مولانا لیگ میں چلے گئے۔ میں سیاسیات سے دست کش ہو گیا۔ اس وقت بھی اخوت اور برادرانہ مراسم بدستور قائم رہے۔ مولانا نہایت وسیع الظرف اور خوش اخلاق تھے۔ اختلاف کا دوستانہ مراسم پر قطعی کوئی اثر نہیں پڑنے دیتے تھے۔ ۱۹۲۱ء سے ۱۹۴۷ء تک بعض دفعہ سیاسی نظریات میں اختلاف پیدا ہوا، لیکن اس کے باوجود مولانا شفقت فرماتے رہے۔

حضرت مولانا ثناء اللہ صاحب مرحوم:

۱۴/ اگست ۱۹۴۷ء سے پہلے ہی پنجاب میں فسادات شروع ہو چکے تھے۔ عموماً ہندو بھاگ رہے تھے، لیکن مسلمان اس قدر مضطرب نہ تھے۔ مسلمان عموماً ۱۴/ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد ترکِ وطن پر مجبور ہوئے۔ ان ہی ایام میں حضرت مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسر سے لاہور آئے اور اس لٹے ہوئے قافلے نے چینیاں والی مسجد میں قیام کیا۔ اس وقت حضرت مولانا غزنوی رحمہ اللہ نے مولانا ثناء اللہ صاحب مرحوم کی ہر ممکن مدارات فرمائی۔ یہیں سے ہم لوگ مولانا ثناء اللہ صاحب رحمہ اللہ کو گوجرانوالہ لائے۔ گوجرانوالہ سے وہ سرگودھا چلے گئے۔

۱۹۴۸ء میں حضرت مولانا ثناء اللہ کا سرگودھا میں انتقال ہوا۔ ملک میں بڑی پریشانی اور سراسیمگی تھی۔ مشرقی پنجاب سے آنے والے اہلِ حدیث حضرات کے متعلق کوئی علم نہیں تھا کہ کون کہاں ہے۔ بڑی بے ترتیبی

سے لوگ آ رہے تھے اور ٹھہر رہے تھے۔ حکومت بھی کوئی پلان نہیں بنا سکتی تھی کہ مہاجرین کو کیسے آباد کرے۔ اس لیے مولانا کے بعد رہا سہا نظام بھی ٹوٹ گیا اور ہر طرف پریشانی کا دَور دورہ ہو گیا۔

میں ۱۹۴۸ء میں مولانا ثناء اللہ صاحب رحمہ اللہ کے انتقال کے بعد مولانا سید محمد داود غزنوی مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوا اور جماعت کی تنظیم کے متعلق گزارش کی۔ اس وقت مولانا حافظ عبداللہ صاحب روپڑی امرتسری بھی اس طرف تشریف لا چکے تھے، لیکن حافظ صاحب مالی پریشانی میں بھی مبتلا تھے، اس کے علاوہ ان کے خاندان کے بہت سے افراد بھی فسادات کی نذر ہو چکے تھے۔ جمعیت اہلِ حدیث مغربی پاکستان کے نام سے جماعت کا نظم قائم ہوا اور پہلے ناظم پروفیسر عبدالقیوم صاحب ایم۔ اے منتخب ہوئے۔ اس کے بعد یہ ذمے داری مجھ پر ڈالی گئی۔ مولانا اس وقت سے آج ۱۹۶۳ء تک جماعت کے صدر اور امیر رہے۔ ما زال تلك دأبه حتى لقي الله تعالىٰ.

تنظیمِ جماعت کے لیے دَورے:

پہلا جلسۂ عام مولانا کے دولت کدہ پر حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب سیالکوٹی رحمہ اللہ کی صدارت میں ہوا۔ مستقل صدرِ جمعیت مولانا غزنوی رہے۔ مولانا نے تنظیم کے لیے مسلسل دورے کیے۔ پشاور سے کراچی تک شاید کوئی شہر بھی نہ چھوڑا ہو۔ حضرت حافظ عبداللہ صاحب کو دعوت نامے بھیجے گئے، مگر حافظ صاحب شاید پریشانیوں کی وجہ سے ان تنظیمی مجالس میں شامل نہ ہو سکے۔ مولانا کے تجربے اور توجہ سے قریباً پانچ صد جمعیتوں نے مرکز سے الحاق کیا۔

ہزاروں روپیہ تبلیغ و تعلیم و تدریس کی راہ میں صَرف ہوا۔ یہ سب مولانا مرحوم کی مساعی کا نتیجہ تھا۔ اس وقت مرحوم کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ مرحوم کا تدبر، تحمل، دور اندیشی، اخلاق؛ انتہائی قابلِ تعریف تھے۔ بے حد مخلصانہ مراسم تھے۔ بڑے احترام سے پیش آتے۔ مجالس کی صدارت اور مشکل جماعتی مسائل کے حل میں حضرت مرحوم کا تجربہ بہت ہی کار آمد ثابت ہوا اور یہ سب واجبات اس وقت بھی پورے ہوتے رہے، جب کہ آپ کافی علیل تھے۔ دل کی تکلیف مرحوم کو اس وقت ہوئی تھی، جب آپ آئین کے سلسلے میں ۳۳ علما کی دعوت میں کراچی تشریف لے جا رہے تھے۔ یہی مرض بالآخر ۲۲ رجب ۱۳۸۳ھ، (۱۶ دسمبر ۱۹۶۳ء) کو ان کے انتقال کا موجب ہوا۔ اب مرحوم ہم سب کو سوگوار چھوڑ کر اپنے رب سے جا ملے ؎

ما كان قيس هلكه هلك واحد ولكنه بنيان قوم تهدما

مرحوم کا حسنِ اخلاق، طبعی ذوقِ نفاست، علمی گہرائی، تدبر، حسنِ گفتار، تقریر میں تسلسل، زورِ بیان، معاملہ فہمی، شرعی مسائل میں جچی تلی رائے، ہر چیز اپنی نظیر آپ تھی۔ اس کے ساتھ ہی ذوقِ عبادت و تصوف انتہائی قابلِ رشک

تھا۔ سحری میں اکثر روتے روتے ہچکی بندھ جاتی۔ صبح کی نماز اور مغرب کی نماز کے بعد یکسوئی سے ''حسبنا اللہ ونعم الوکیل'' ہزار مرتبہ پڑھتے۔ درود شریف کئی سو بار پڑھتے۔ نماز بے حد طمانیت سے ادا فرماتے۔ مرض کے ایام میں گذشتہ چند ماہ سے چینیانوالی مسجد میں نہیں جا سکتے تھے، اس لیے شیش محل روڈ دار العلوم تقویۃ الاسلام میں ہی جمعہ کا انتظام فرما لیا تھا۔ ضعف و نقاہت کے باوجود جمعہ کی نماز میں شریک ہوتے۔ اساتذہ، طلبہ اور مدرسے کے انتظامات کا بذاتِ خود جائزہ لیتے۔ تقویٰ اور اِنابت الی اللہ کے لحاظ سے اپنے اسلاف کی تمام خصوصیات کے حامل تھے۔ آہ! کتنا پاکیزہ انسان تھا، جو ہم سے جدا ہو گیا۔

اللہ تعالیٰ ان کو جنت میں جگہ دے اور ان کے اعزہ اور لڑکوں کو ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق مرحمت فرمائے۔ ایسے اربابِ فکر و دانش کی پیدائش کے متعلق مالکانِ قضا و قدر کچھ زیادہ فیاض معلوم نہیں ہوتے

دورہا باید کہ صاحبدلے پیدا شود — با یزید اندر خراساں یا اویس اندر قرن

میں قریباً پندرہ سال تک مرحوم کے ساتھ بطورِ ناظم کام کرتا رہا۔ مرحوم کا وجود میرے لیے بے حد موجبِ سکون تھا۔ حضرت مرحوم کی جدائی سے طبیعت میں بے حد گرانی محسوس کرتا ہوں۔ امید ہے اللہ تعالیٰ صبر کی توفیق عطا فرمائیں گے۔[1]

الحزین المکروب
محمد اسماعیل، گوجرانوالہ

[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۲۷ر دسمبر ۱۹۶۳ء)

ایک دیرینہ رفیق کی یاد میں

ملک امام خاں صاحب نوشہروی مرحوم عمر میں مجھ سے چند سال بڑے تھے۔ ان سے ابتدائی تعارف وزیر آباد طلبِ عالم کے زمانے میں حضرت الاستاذ الامام حافظ عبدالمنان صاحب رحمہ اللہ کے مدرسے میں ہوا۔ اس علاقے میں یہ وقت کی بہترین درس گاہ تھی۔ میں نے اس درس گاہ میں ستر اسّی تک طلبا دیکھے۔ قواعد کی ابتدائی کتابیں حضرت مولانا عمر الدین رحمہ اللہ پڑھاتے تھے۔ باقی تمام اَسباق حضرت ہمیشہ خود پڑھاتے تھے۔ بسا اوقات صبح کی نماز کے بعد اَسباق شروع ہوتے۔ نماز اور کھانے کے وقفوں کے علاوہ عشا تک اسباق جاری رہتے۔ میں نے اپنی عمر میں اتنا محنت پسند استاد نہیں دیکھا۔ اللهم اغفرله وارحمه وأدخله الجنة.

حدیث کے علاوہ حضرت کو علومِ عربیت کی کتابیں بھی از بر تھیں۔ نحو سے بے حد شغف تھا۔ الفیہ ابن عقیل اور اس کی شروح بہت ضبط تھیں۔

ملک امام خاں صاحب سے مراسم کی ابتدا یہیں سے ہوئی۔ سوہدرہ وزیر آباد سے چند میل کی مسافت ہے۔ یہاں کی ملک برادری عموماً اہلِ حدیث ہے۔ ملک امام خاں صاحب کے ننھیال قریباً سب اہلِ حدیث تھے اور حضرت حافظ صاحب کے عقیدت مند۔ ملک صاحب اکثر وزیر آباد آتے۔ اُردو کے ادبی رسائل کا انھیں بے حد شوق تھا۔ پھر ان کی فائلیں بڑی احتیاط اور حفاظت سے رکھتے تھے۔ اَشعار بڑی کثرت سے یاد تھے۔ خود بھی کبھی کبھی طبع آزمائی فرماتے۔

غالباً ملک صاحب نے معاشی زندگی کا آغاز کپڑے کے کاروبار سے کیا۔ اپنے عزیزوں کے ہمراہ کپڑا فروخت کرنے کے لیے ہندوستان جاتے۔ ایک موسم میں کپڑا بیچتے، دوسرے موسم میں وصولی فرماتے۔ وزیر آباد کے بعد دلّی میں بھی ملک صاحب سے ملاقات ہوتی رہی۔

وہ عام طلبہ کی طرح مسلسل نہیں پڑھتے تھے۔ ہندوستان سے فارغ ہو کر چند ماہ کے لیے گھر آتے اور فارغ نہ بیٹھتے، بلکہ پڑھنا شروع کر دیتے۔ میں نے انھیں حافظ صاحب سے پڑھتے نہیں دیکھا، لیکن خیال ہے کہ انھوں نے حافظ صاحب سے استفادہ فرمایا ہوگا۔ وہ اکثر مولانا عمر الدین صاحب سے استفادہ فرماتے۔ حافظ عبدالمنان صاحب رحمہ اللہ مرحوم کے بعد ان کی مسندِ درس پر کئی برس مولانا عمر الدین صاحب مرحوم کام کرتے

رہے۔ درس و تدریس، وعظ اور خطابت؛ مولانا عمر الدین صاحب ہی کے سپرد تھے۔

اس کے بعد ملک صاحب نے مسلسل پڑھنا شروع کیا، چنانچہ امرتسر مدرسہ غزنویہ میں ملک صاحب اور مَیں کئی ماہ اکٹھے رہے، ان ایام میں مدرسہ غزنویہ کے مہتمم مولانا احمد علی مرحوم تھے۔ حضرت مولانا محمد داود صاحب غزنوی تحریکِ خلافت میں کام کررہے تھے۔ اپنے مدرسے میں بھی ان کا درس و تدریس کا کوئی مشغلہ نہیں تھا۔

جہاں تک مجھے یاد ہے، بطریقِ تلمذ نہ اُنھوں نے مجھ سے پڑھا نہ حضرت مولانا غزنوی سے۔ معلوم نہیں مدیر ''الاعتصام'' کو یہ اطلاع کہاں سے ملی؟ امرتسر میں مدرسہ غزنویہ کے علاوہ وہ کئی اور مدارس سے بھی استفادہ فرماتے تھے۔ اساتذہ سے ملتے تھے۔ قیامِ امرتسر کے ایام میں بھی ملک صاحب کاروبار کرتے تھے، لیکن کام کچھ نرم ہوگیا تھا۔

۱۹۱۹ء کے بعد امرتسر آ گئے۔ ان دنوں کانگرس کا بہت زور تھا۔ ملک صاحب کے خیالات بھی اسی قسم کے تھے۔ مختلف اساتذہ سے استفادہ بھی فرماتے۔ قومی مجالس میں آتے جاتے تھے۔ ان کا سیاسی ذوق اپنے اکثر رفقا سے بہتر تھا۔ عمر کے لحاظ سے بھی وہ بہت معاملہ فہم تھے۔

ملک صاحب کے مولانا ثناء اللہ صاحب رحمہ اللہ سے گہرے تعلقات تھے۔ ''اہلِ حدیث'' میں ان کے اکثر مضامین نکلتے تھے۔ اس وقت مولانا ثناء اللہ صاحب سے تعارف ان کے توسط سے ہوا۔ غالباً یہ عرصہ ۱۹۔ ۱۹۱۸ء کا ہوگا۔ مولانا ثناء اللہ صاحب سے ملنے کی پاداش میں مولانا احمد علی صاحب نے بعض طلبہ کو مدرسہ غزنویہ سے نکال دیا، جن میں ملک صاحب بھی شامل تھے۔ یہ لوگ اس وقت ڈپٹی محمد شریف صاحب مرحوم کے مکان میں رہتے تھے۔ حضرت مولانا سید محمد داود صاحب غزنوی رحمہ اللہ نے ان طلبا کی بڑی اِعانت فرمائی۔ رہایش اور کھانے کا انتظام ہوگیا اور اَسباق بھی مختلف مدارس میں ہوگئے۔

ان ایام میں ملک صاحب کے پاس مجلّہ ''نقاد'' اور اخبار ''ہمدرد'' آتے تھے۔ عربی طلبا بھی انھیں دلچسپی سے پڑھتے تھے۔ ملک صاحب کا ادبی ذوق لاجواب تھا۔

میں قریباً ۱۹۲۱ء کے وسط میں گوجرانوالہ آ گیا۔ ملک صاحب نے غالباً بعض مجبوریوں کی وجہ سے ہندوستان کا کاروبار چھوڑ دیا اور کچھ عرصہ کے بعد گوجرانوالہ آ گئے۔ کچھ پڑھتے پڑھاتے، مطالعہ کرتے۔ کچھ لکھنے پڑھنے کا کام کرتے۔ رہایش مسجد اہلِ حدیث تھی۔ اخبار ''سیوک'' میں کام کرتے۔ سردار ٹھاکر سنگھ مالک اخبار اُن کی بڑی عزت کرتے۔ روزانہ مسجد میں انھیں ملنے یا بلانے آتے۔ ان دنوں مرحوم کی مالی حالت اچھی نہ تھی۔ مرحوم میں یہ بڑی خوبی تھی، حالات کتنے ہی ناسازگار کیوں نہ ہوں، وہ خود ان کے ساتھ سازگار ہوجاتے تھے۔ ایسے حالات میں صبر کے عادی تھے۔ بڑے خراب حالات میں بھی مَیں نے انھیں شکوہ کرتے نہیں پایا۔

ملک صاحب نے دوسری شادی بھی ایسے ہی حالات میں کی۔ دوسری اہلیہ ڈاکٹر حکیم عبداللہ صاحب نصر کی ہمشیر تھیں۔ اہلیہ بھی صبر و شکر کا مجسمہ تھیں اور ہیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں اور عزیز عبدالباقی صاحب وکیل اور ان کے بھائیوں کو مزید صبر کی توفیق دے۔ خدا کرے وہ اپنے مرحوم والد کے بہتر جانشین بن سکیں۔ دین کی حمایت اور مسلک اہلِ حدیث سے محبت میں ملک صاحب کے سچے جانشین ہوں۔ والدہ کی خدمت کریں اور خدا کی رضا حاصل کریں۔

گذشتہ ایام میں ملک صاحب نے کئی مسودات کو مبیضات کی شکل دی تھی، انھیں شائع کر کے مرحوم کے باقیات صالحات میں اضافہ فرمائیں۔ اگر وہ ایسا نہ کر سکیں تو کسی جماعتی ادارے کے سپرد کر دیں۔ بہر حال یہ مفید مواد دیمک کی نذر نہیں ہونا چاہیے۔

پرانے رفقا اپنی اپنی باری رختِ سفر باندھ کر جا رہے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ منزل قریب سے قریب تر آ رہی ہے اور اپنی بے سروسامانی کا یہ حال ہے کہ زادِ سفر کے لیے صرف معاصی کا سرمایہ موجود ہے، ممکن ہے یہی رحمتِ الٰہی کے لیے جاذب ثابت ہو۔

یارب إن عظمت ذنوبي كثرة فلقد علمت بأن عفوك أعظم
ما لي إليك وسيلة إلا الرجاء وجميل عفوك ثم إني مسلم [1]

[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۱۸ فروری ۱۹۶۶ء)

مولانا نور حسین گرجاکھی مرحوم

مغفور و محترم اواخر اکتوبر میں ذیابیطس سے بیمار ہوئے۔ ممکن علاج کے باوجود تکلیف بڑھتی رہی۔ اوائل دسمبر میں علالت نے ناخوشگوار صورت اختیار کی، مقامی اطبا اور ڈاکٹروں کی طرف رجوع کے باوجود افاقہ نہ ہوا۔

۱۶/ دسمبر [۱۹۵۱ء] کو طبیعت پر غنودگی طاری ہونا شروع ہوئی اور خوراک میں کمی۔ ۱۸/ دسمبر بعد دوپہر غنودگی اور بڑھ گئی۔ ۱۸/ اور ۱۹/ کی درمیانی شب کو ساڑھے دس بجے مرحوم عالمِ بقا کی طرف انتقال فرما گئے۔ إنا للّٰہ وإنا إلیه راجعون.

افسوس ایک خوش بیان واعظ، ایک راسخ العقیدہ موحد ہم سے جدا ہوگیا اور ایک خوشنوا عندلیب رات کی تاریکیوں میں ایک ہی پرواز سے اس خاکدانِ فنا کو عبور کر کے خلد آشیاں ہوگیا۔

مرحوم ۱۸/ کی شب ہی کو موت و حیات کی کش مکش سے آزاد ہو کر اس آخری سفر کے لیے رختِ سفر باندھ کر بالکل تیار ہوگئے تھے، لیکن ہماری مجبوریاں تھیں کہ ہم ۱۹/ دسمبر صبح گیارہ بجے سے پہلے انھیں الوداع کہنے پر قادر نہ ہوسکے۔ جنازے کا وقت صبح دس بجے مقرر کیا گیا تھا۔ گوجرانوالہ اور دوسرے مقامات سے احباب صبح ہی سے گھر جاکھ پہنچنے شروع ہوگئے تھے۔ ٹھیک دس بجے جنازہ اُٹھایا گیا اور قریباً ساڑھے گیارہ بجے ہم لوگ فریضۂ وداع سے فارغ ہوئے، اور یہ تھکا ماندہ مسافر اپنی آخری آرام گاہ میں اطمینان سے محوِ خواب ہوگیا۔ اللھم وسع مدخله واجعل جنة الفردوس مأواه. جنازے میں اتنا ہجوم تھا کہ شاید کسی بڑے دنیا دار کو بھی نصیب نہ ہوگا۔

امام احمد بن حنبل کا ارشاد کس قدر صحیح ہے: ”الفرق بیننا وبینھم یوم الصلاۃ“

جہاں تک اہلِ ایمان کی شہادت کا تعلق ہے، میں نے ایک بھی شخص ایسا نہیں دیکھا، جسے مرحوم کی صلاحیت کے متعلق تذبذب ہو۔

مرحوم کے پانچ لڑکے ہیں اور دو لڑکیاں، لڑکے سب شریف ہیں اور کاروباری۔ اللہ تعالیٰ انھیں اپنے والد کے نعم البدل ہونے کی توفیق دے۔ عزیزی خالد[1] کو مرحوم نے دینی تعلیم دلائی تھی، تھوڑی سی توجہ سے وہ مرحوم کی جگہ لے سکتے ہیں۔[2]

محمد اسماعیل

ناظم جمعیت اہلِ حدیث

مغربی پاکستان، گوجرانوالہ

[1] اس سے مراد مولانا خالد گرجاکھی ہیں، جو بعد ازاں اپنے والد کی مسند کے امین بنے انھوں نے دعوت و تبلیغ کے میدان میں گراں قدر خدمات انجام دیں اور کئی مفید تالیفات رقم کیں۔ ۱۹/ اپریل ۲۰۰۵ء کو وفات پائی۔

[2] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۲۸/ دسمبر ۱۹۵۱ء)

حریفاں بادہ ہا خوردند و رفتند

ملک ہدایت اللہ مرحوم

کل مورخہ ۲۴/ ۷/ ۱۹۶۷ء کو میاں فضل حق نے صبح ساڑھے سات بجے فون پر اطلاع دی کہ ملک ہدایت اللہ کا انتقال ہوگیا، نعش میو ہسپتال لاہور سے سوہدرہ پہنچ چکی ہے۔ میاں صاحب نے فرمایا: میں سوہدرہ کے لیے آرہا ہوں۔ تھوڑی دیر کے بعد میاں صاحب مع چودھری عبدالرشید صاحب حافظ آباد سے آگئے، ہم اسی وقت روانہ ہوگئے۔

ہم غالباً ۹ بجے سوہدرہ پہنچ گئے۔ مولوی محمد سلیمان صاحب انصاری نائب ناظم دفتر، لاہور سے سیدھے سات بجے صبح پہنچ چکے تھے۔ ہم جب پہنچے تو دفن سے فارغ ہو کر سب لوگ آچکے تھے۔ ملک صاحب اپنی آخری آرام گاہ میں آرام فرما ہوچکے تھے۔ نمازِ جنازہ ہوچکی تھی۔ ہم قبرستان پہنچے، قبر پر دعا کی، تعلقات کی قریباً ساٹھ سالہ تاریخ سامنے آگئی۔ سوہدرہ میں ملک امام خاں صاحب، مولوی مراد علی صاحب مولانا عبدالمجید صاحب، ملک ہدایت صاحب قریباً ہم عمر تھے اور ہم مسلک بھی۔ ملک صاحب کی موت نے سوہدرہ کے اس علمی دور کو ختم کر دیا۔

ملک ہدایت اللہ صاحب سے ابتدائی تعارف وزیر آباد میں ہوا۔ میں محدثِ عصر حافظ عبدالمنان صاحب مغفور کی خدمت میں پڑھتا تھا، سوہدرہ وزیر آباد سے قریب ہے۔ یہ حضرت بھی آتے جاتے تھے۔ حافظ صاحب رحمہ اللہ سے استفادہ فرماتے۔ ملک ہدایت اللہ مطالعہ کے شوقین تھے، ذہین اور نکتہ رس، مناظرانہ طبیعت پائی تھی۔ مولانا ثناء اللہ رحمہ اللہ سے عقیدت تھی، ان کی اکثر تصانیف ملک صاحب کی نظر میں تھیں۔ قادیانی، چکڑالوی، بریلوی لٹریچر کا خاصہ ذخیرہ ملک صاحب کے پاس تھا۔ کاروبار کے مشاغل میں مطالعہ سے غافل نہ ہوتے، جب کوئی دقت ذہن میں آتی، دریافت کرنے میں کوئی حجاب نہ فرماتے۔

قوم سے ککے زئی تھے۔ ملک صاحب نے اپنی قوم کی بھی تاریخ لکھی، اور بھی رسائل تصنیف کیے۔ انجیل اور عیسائی لٹریچر پر ملک صاحب کی گہری نظر تھی۔ قلم خوب چلتا۔ گھڑیوں میں مضمون مکمل فرما لیتے۔ ملک صاحب نے اپنی زندگی میں کئی عروج و زوال دیکھے، مال و دولت کی فراوانی بھی ہوئی، غربت کے ایام بھی، ٹھیکیداری چمڑے کا کاروبار بھی کیا، ملازمت بھی کی۔ عرصہ تک جمعیت اہلِ حدیث کے آنریری ناظم رہے۔ "المنبر" لائل پور میں

بھی کام کیا، لیکن قلمی دلچسپیاں ان کی ہمیشہ مسلک اہلِ حدیث کے ساتھ رہیں۔ اب عرصہ سے ''الاعتصام'' کے منیجر تھے، اتنا دیانتدار آدمی کم ہی دیکھنے میں آیا ہے۔ نہایت متقی پرہیزگار اور نہایت خوش مزاج تھے۔ میں نے آپ کو کبھی رنجیدہ نہیں پایا۔

۱۹۴۷ء کے بعد پتھر کا ٹھیکہ لیا، بل کی وصولی سرخ فیتے کی نذر ہوگئی، غالباً اب کیس چل رہا ہے۔ رشوت سے پرہیز کرتے تھے، آج کی ذہنیت کی وجہ سے بل وصول نہ ہوسکے، تنگ دستی نے آن دبوچا، مجبوراً ملازمت اختیار کی اور جمعیت کے دفتر میں بڑی وفاداری سے کام کیا۔ کبھی وقت کی پروا نہیں کرتے تھے۔ اپنی ذمے داری کے علاوہ اخبار میں مضامین لکھتے، اس پر کبھی معاوضے کی خواہش نہیں فرمائی۔

اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔ سوہدرہ میں ان کے متعلق مشہور تھا کہ اس شخص نے عمر بھر کبھی نظر اُٹھا کر اجنبی چہرے کو نہیں دیکھا ؏

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں[1]

① ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۱۴؍ اگست ۱۹۶۷ء)

ایک مخلص ساتھی کی یاد میں

مولانا اسحاق رحمانی

مولانا رحمانی مرحوم کی عمر اس وقت پچپن ساٹھ کے پس و پیش ہوگی۔ مرحوم ایک کھاتے پیتے گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ مرحوم کے والد نیک دل سلفی العقیدہ اور باعمل بزرگ تھے۔ مولانا محمد اسحاق صاحب کی تربیت اور تعلیم ایسے ماحول میں ہوئی۔ پنجاب کے مدارس سے فارغ ہونے کے بعد مرحوم دہلی مدرسہ رحمانیہ میں پہنچے۔ مرحوم مدرسہ رحمانیہ کے ہونہار اور پُر وقار مستعد اور محنتی طالب علم تھے۔ اساتذہ کی نظروں میں سنجیدہ اور قابلِ احترام تھے، ان کے رفقا کی بھی ان کے متعلق یہی رائے تھی۔

تدبر:

رحمانیہ سے فراغت کے بعد وڈالہ سندھواں ضلع گوجرانوالہ میں انھیں کام کرنے کا موقع ملا، یہاں ایک بریلوی پیر تھے، جن سے یہ گاؤں بہت متاثر تھا۔ مرحوم کے تدبر اور حسنِ کار کا نتیجہ تھا کہ خود بدعت سے متاثر ہوئے بغیر پورے گاؤں کو متاثر کیا۔ کافی لوگ خوش عقیدہ ہوگئے۔ گاؤں میں عموماً سکھوں اور مسلمانوں میں اذان اور قربانی کا جھگڑا رہتا تھا، مرحوم کے تدبر کا اثر تھا کہ وہاں کے سکھ مولانا کو دیوتا کہتے تھے۔ کافی حد تک گاؤں میں یہ نزاع ختم ہوگئی۔

بیس سالہ تعارف:

میرے ساتھ مرحوم مولانا کا تعارف ۱۹۴۷ء کے بعد ہوا، جب کہ مولانا وڈالہ سندھواں سے واپس آگئے اور جمعیت اہلِ حدیث میں ایک ساتھی کی طرح کام کرنے لگے۔ مولانا حضرت مولانا غزنوی ؒ کی صدارت کے دور میں مرکزی جمعیت کی مجلسِ عاملہ کے ممبر تھے۔ مرحوم مسلسل بیس سال کے پس و پیش عاملہ میں کام کرتے رہے اور ۳۰ رستمبر کے سوا عاملہ سے کبھی غیر حاضر نہیں ہوئے۔ مرحوم کو اس وقت مسلک سے والہانہ شغف تھا۔ ضلع لاہور خصوصاً تحصیل قصور اور چونیاں میں مولانا جانی پہچانی شخصیت تھے۔ لاہور اور سرگودھا کے ایامِ اقامت میں مرحوم نے پورے پاکستان، بلکہ صوبہ سرحد کے دورے کیے، مسلک کی اشاعت فرمائی۔ آزاد کشمیر کے علاقے میں کئی دفعہ تقاریر کے لیے تشریف لے گئے۔

جماعتی بحران:

حضرت مولانا غزنوی رحمہ اللہ کی علالت کے آخری ایام میں مرکزی جمعیت میں بحران کی کیفیت پیدا ہوچکی تھی۔ بعض غلط کار افراد نے جماعت میں ہنگامہ پیدا کر دیا تھا، مرحوم مولانا رحمانی نے اس وقت بڑی عزیمت سے کام کیا، ناظمِ اعلیٰ کی جگہ دفتر پر کنٹرول کیا، روزانہ کافی وقت دیتے رہے، نزاعی امور میں بڑی پختگی سے گفتگو فرماتے رہے۔

مہمان نوازی:

جماعت کے رفقاء بحمد اللہ سب مہمان نواز اور بامروت ہیں، بلکہ مرحوم اس معاملے میں خاص امتیازی شان رکھتے تھے۔ مہمان کی خدمت اپنی صوابدید سے کرتے اور بے تحاشا خرچ کرتے۔ اکثر زیرِ بار رہتے۔

کتابوں کے معاملے میں بڑے باذوق تھے۔ عمدہ طباعت، اچھے خط، اچھے کاغذ کی مطبوعات خریدتے۔ عمدہ جلد بنواتے۔ کتاب میں ذرا نقص ہوتا، فروخت کر کے نئی خرید لیتے۔

پہلے جامعہ اہلِ حدیث قصور میں خطیب تھے۔ حضرت مولانا ثناء اللہ صاحب مرحوم کے انتقال کے کچھ دیر بعد حضرت مولانا غزنوی رحمہ اللہ کے حکم اور احباب کے مشورے سے سرگودھا چلے گئے۔ سرگودھا میں عرصہ تک قیام کے بعد مولانا غزنوی رحمہ اللہ مرحوم کے انتقال کے بعد لاہور آ گئے۔ چینیانوالی مسجد میں خطابت کا ذمہ لیا۔ مدرسہ جاری کیا۔ کتابیں خاصی ضبط تھیں، طلبہ کو مطمئن کرنا، مطالب ذہن نشین کرنے کا مرحوم کو خاص سلیقہ تھا۔ جو طلبہ مرحوم سے پڑھتے، وہ دوسرے اساتذہ پر چنداں مطمئن نہ ہوتے۔

احبابِ سرگودھا کے مطالبے پر پھر سرگودھا چلے گئے۔ آب و ہوا کچھ سازگار نہ آئی، جلد ہی صحت گرنا شروع ہوگئی، اس کے باوجود خطبہ، دروس اور اسباق وغیرہ فرائض میں فرق نہ آنے دیا۔ انتقال کے دن صبح اپنے اکلوتے لڑکے اقبال کو کالج میں داخلہ دلوایا۔ طلبہ کو حسبِ معمول اسباق پڑھائے، اخبار دیکھا، ظہر کے بعد حدیث کا درس دیتے تھے، اس کے لیے مطالعہ دیکھنا شروع کیا۔ مسجد کی گیلری میں بچوں نے شور کیا، انھیں خاموش کرانے اوپر گئے، قلب کا عارضہ عرصے سے دامن گیر تھا، دل کا دورہ پڑا۔ طلبہ کو خاموشی کا سبق دینے والا وہیں ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگیا۔ طلبہ نے طبیب کو بلایا، طبیب کے پہنچنے سے پہلے روح ملاءِ اعلیٰ میں اپنے مستقر پر پہنچ چکی تھی۔ یہ سارا سانحہ قریباً پانچ منٹ میں ہوگیا۔ إنا لله وإنا إليه راجعون.

جس لختِ جگر کو صبح کالج میں داخل کرایا تھا، جب کالج سے واپس آیا تو ابا جنت میں پہنچ چکے تھے۔ مجھے اس سانحہ کی اطلاع قریباً ڈیڑھ بجے شیخ اشرف صاحب نے دی، اس کے چند منٹ بعد میاں فضل حق صاحب

نے حافظ آباد سے دی۔ دونوں موثق اطلاعات کے باوجود دل یقین نہیں کرتا تھا۔ شام میاں صاحب نے حافظ آباد سے دوسری اطلاع دی کہ جنازہ سرگودھا میں بعد مغرب ہوگا اور نعش رات مرحوم کے آبائی وطن گوہڑ متصل پتوکی بھیج دی جائے گی، وہاں صبح دس بجے جنازہ ہوگا۔ میں صبح براستہ لاہور پتوکی پہنچا۔ راستے میں معلوم ہوا، جنازہ ہو چکا ہے، میں جب پہنچا تو مرحوم گوشۂ تنہائی میں آرام فرما چکے تھے۔

اللهم اغفرله وارحمه وأدخله الجنة، اللهم إنه عبدك وابن عبدك، وكان يشهد أن لا إله إلا الله وأن محمداً عبدك ورسولك، جاءك وهو مفتقر إلى رحمتك، وأنت غني عن عذابه، فاغفرله واعف عنه.

ان چند سالوں میں دوست اور ساتھی تسبیح کے دانوں کی طرح بکھرتے جا رہے ہیں۔ حضرت مولانا غزنوی کے بعد حضرت مولانا محمد یونس صاحب دہلوی، مولانا ہدایت اللہ سوہدروی، مولانا محمد ابراہیم صاحب خادم، مولانا امام خان صاحب نوشہروی وغیرہم رحمہم اللہ داغ مفارقت دے چکے۔ دوستوں کے کندھوں پہ یہ سفر ایک شرف اور مسرت ہے۔ رفقا کے سفر کی اسی افتاد سے تو محسوس ہوتا ہے کہ یہ فقیر تو ان مبارک کندھوں کے شرف سے بھی محروم رہے گا۔ یہ جبری ناکامی ہے، جس کا کسی پر افسوس نہیں کیا جا سکتا۔ دعا ہے کہ سب کا انجام بخیر ہو اور آخر دم تک توحید و سنت سے وابستگی کی توفیق ملے۔[1]

غم زدہ

محمد اسماعیل

---

[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۲۲؍ ستمبر ۱۹۶۷ء)

آہ! مولانا عبدالحمید حمید پوری

۲۸/اگست ۱۹۶۱ء کو بوقتِ صبح صادق مولانا عبدالحمید صاحب اس دارِ فانی سے انتقال فرما گئے۔ إنا لله وإنا إليه راجعون.

ضلع گوجرانوالہ کے مشرقی علاقے کالر میں توحید و سنت کا چرچا دو خاندانوں کی وجہ سے ہوا: مولانا محمد عبداللہ صاحب نہجانوالی (حافظ عبدالغفور صاحب کے والد) اور حمید پور میں: ① مولانا عبدالصمد صاحب ② مولانا محمد ابراہیم صاحب (والد مولوی عبدالحمید صاحب مرحوم) ③ اور مولانا حافظ حبیب اللہ صاحب۔ یہ تینوں بزرگ مولانا عبدالمنان صاحب وزیر آبادی کے شاگرد تھے اور حضرت مولانا عبدالجبار صاحب غزنوی رحمہ اللہ کے عقیدت مند۔ تینوں بھائیوں نے درس و تدریس، وعظ و نصیحت سے اس علاقے میں کتاب و سنت کی پوری پوری اشاعت فرمائی۔ ان کی علمی یادگار صرف مولانا عبدالحمید صاحب تھے، جو اَب مرحوم ہو گئے ع

افسوس کز قبیلہ مجنون کسے نہ ماند[1]

مولوی عبدالحمید صاحب نے سیالکوٹ اور امرتسر مدرسہ تقویۃ الاسلام میں تعلیم حاصل کی۔ فراغت کے بعد اپنے گاؤں میں اقامت اختیار فرمائی اور پورے علاقے کو کتاب و سنت سے سیراب فرمایا۔ مرحوم عالم، متقی اور نہایت دانش مند تھے۔ ہمیشہ جماعت سے متعلق رہے۔ اس وقت بھی جمعیت اہلِ حدیث ضلع گوجرانوالہ کے نائب صدر تھے۔

جامعہ سلفیہ کے ساتھ مرحوم کو والہانہ تعلق تھا۔ مرض کے ایام میں صرف حمید پور سے جامعہ سلفیہ کی چار صد روپے سے زیادہ اعانت فرمائی۔ اللهم اغفرله وارحمه وأدخله الجنة.

مولانا عرصے سے بیمار چلے آرہے تھے۔ کئی ماہ سے بالکل صاحبِ فراش تھے۔ لاہور میو ہسپتال، گوجرانوالہ، سیالکوٹ کے حاذق اطبا سے علاج کرایا، مگر ع

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

مرحوم مولانا نور حسین صاحب کے بعد ساتھی ایک ایک کر کے رخصت ہو رہے ہیں اور محفل ویران ہوتی جارہی ہے ع

① ''افسوس کہ مجنون قبیلے سے کوئی بھی باقی نہ بچا۔''

حریفاں بادہ ہا خوردند و رفتند[1]

﴿فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰی نَحْبَهٗ وَ مِنْهُمْ مَّنْ یَّنْتَظِرُ وَ مَا بَدَّلُوْا تَبْدِیْلًا﴾ [الأحزاب: ٢٣]

کام کرنے والے اپنا کام ختم کر کے رختِ سفر باندھ رہے ہیں۔ ﴿ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ﴾ [الأنعام: ٩٦] نوجوانوں کا فرض ہے، آگے بڑھیں اور خالی جگہوں کو پُر کریں۔

مرحوم کے بعد ایک بیوہ ہے، ایک لڑکی ہے اور بڑا بھائی مولوی عبدالحلیم اور بھتیجے۔ مگر اس خلا کو کوئی نہیں پورا کر سکے گا۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور ان کے پس ماندگان کو صبر کی توفیق مرحمت فرمائے اور مرحوم کی طرح انھیں خدمتِ دین کا جذبہ اور شوق عطا فرمائے۔

مرحوم کی موت سے پورا علاقہ خالی ہوگیا ہے۔ توحید و سنت کے آرزو مند اسے ہمیشہ روئیں گے اور حمید پور کی عظیم الشان مسجد اب ہمیشہ اپنے خطیب کی منتظر

تلك المحاريب تبكي وهي جامدة وهذا المنابر ترثي وهي عيدان[2]

الکئیب المحزون

محمد اسماعیل، گوجرانوالہ

---

[1] ''حریفوں نے قسم قسم کی شراب نوش کی اور چلتے بنے۔''

[2] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۸ ستمبر ۱۹۶۱ء)

حافظ حمید اللہ صاحب کا انتقال پُر ملال

پورے افسوس کے ساتھ اطلاع دی جاتی ہے کہ جماعت کے مخلص اور مخیّر بزرگ محترم حافظ حمید احمد صاحب (نائب ناظم آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس) ۲۷؍دسمبر کو اس دارِ فانی سے انتقال فرما گئے۔ اللہ تعالیٰ مغفور کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور ان کے پسماندگان کو صبر کی توفیق دے۔ عزیز محترم شیخ محمد یحییٰ سے ہمیں اس سانحے میں دلی ہمدردی ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ عزیزِ محترم کو اپنے باپ کا صحیح جانشین ہونے کی توفیق دے۔

محترم اپنے خیالات میں از بس راسخ تھے۔ قومی اور جماعتی کاموں میں روپیہ پانی کی طرح بہاتے تھے۔ فسادات دہلی میں جب کہ بڑے بڑے دلیر دہلی سے بھاگ نکلے، مرحوم بڑی جرأت سے دہلی ہی میں مقیم رہے۔

مرحوم نے تھوڑا عرصہ ہوا، قریباً ایک لاکھ روپے کی ایک عمارت مدینہ منورہ میں دار الحدیث کے لیے وقف فرمائی، جس میں آج کل حضرت مولانا عبدالرحمٰن افریقی درس دے رہے ہیں۔ دار الحدیث مدینہ کی وجہ سے افریقہ میں اہلِ حدیث کا اثر بحمد اللہ اچھا ہو رہا ہے۔

ما كان قيس هلكه هلك واحد   ولكنه بنيان قوم تهدما

ع

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں[1]

محمد اسماعیل

ناظم اعلیٰ جمعیت اہلِ حدیث، مغربی پاکستان

[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۵؍جنوری ۱۹۵۱ء)

ایک معمر اور خوش بیان عالم کا انتقال

مولانا عبدالغنی صاحب لالہ موسیٰ

مولانا عبدالغنی مرحوم چک رجادی ضلع گجرات پنجاب کے ایک زمیندار گھر میں پیدا ہوئے۔ ہوش سنبھالتے ہی دینی تعلیم کا شوق دامن گیر ہوا۔ آواز اچھی تھی، اس لیے وعظ و تذکیر کی طرف طبیعت کا رجحان بڑھا۔ مولانا وعظ و تذکیر کے سلسلے میں مدراس، میسور، گجرات کاٹھیا وار، کوہِ چین تک جاتے رہے۔ اسی اثنا میں حدیث پڑھنے کا شوق ہوا۔

وطن کے قریب وزیر آباد میں استادِ پنجاب استاذ الاساتذہ حافظ عبدالمنان صاحب کی خدمت میں پہنچے۔ مجھے جہاں تک یاد پڑتا ہے، مجھ سے قریباً دو سال پہلے مولانا نے حدیث کا دَورہ ختم کیا۔ غالباً ۱۳۔۱۹۱۲ء میں مرحوم نے حافظ صاحب سے اسنادِ فراغت حاصل کی۔ اس کے بعد انھوں نے ایک دو دفعہ مدراس کا سفر کیا، حالات بدل گئے تھے۔ مولانا کی طبیعت اس قسم کے سفر سے اُکتا گئی۔ مرحوم نے مدرسہ طبیہ دہلی میں داخلہ لیا۔ مرحوم حکیم محمد اجمل خاں صاحب مرحوم سے استفادہ فرمایا اور طبیہ کالج دہلی سے فارغ ہو کر آپ نے مطب کے لیے کاٹھیاوار ہی کا انتخاب فرمایا اور کرنول میں مطب کھولا۔ کئی سال مطب کے پیش آمدہ حالات کے پیشِ نظر واپس پنجاب آ گئے۔ آبائی گاؤں کے قریب لالہ موسیٰ میں مطب شروع کیا۔ ان کے بڑے لڑکے مولوی عبدالخالق جامعی یہیں ان کے پاس آ گئے۔ مولانا مطب بھی کرتے اور اطراف میں وعظ و تبلیغ کے لیے جاتے۔ اس لیے ضعف غالب ہو گیا۔ ضعفِ اعصاب اور رعشے کی تکلیف ہو گئی۔ قریباً نوے سال کی عمر میں مرحوم نے مورخہ ۲۵/ نومبر ۱۹۶۷ء کو ہفتہ روز صبح دس بجے لالہ موسیٰ میں انتقال فرمایا۔

مرحوم بے حد مخلص اور مسلکِ اہلِ حدیث میں بے حد پختہ تھے۔ پوری عمر دین کی خدمت میں صَرف فرمائی۔ مرحوم کی یادگار چار لڑکے ہیں۔ مولوی عبدالخالق جامعی لالہ موسیٰ ہی میں اقامت پذیر ہیں۔ جمعیت اہلِ حدیث ضلع گجرات کے رئیس ہیں۔

اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔

مولانا سید حسین احمد مدنی کی وفات

حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمہ اللہ کے سانحۂ ارتحال نے علمی حلقوں میں ایک ارتعاش کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ یہ حادثہ ہونا تھا، مگر جب بھی ہوتا اسے عام طور پر بے وقت ہی سمجھا جاتا۔ مولانا جید عالم ہونے کے علاوہ مخلص، قابل اور تجربہ کار راہنما تھے۔ ہندوستان میں ان کا وجود اللہ کی نعمت تھا۔ ان کی قیادت ہندوستان کے پیش آمدہ حالات میں مخلص قیادت تھی، جس میں مذہبی دیانت اور سیاسی بصیرت کا صحیح امتزاج فرما دیا گیا تھا۔ ملک کی تقسیم کے بعد مولانا کی علمی اور سیاسی خدمات ہندوستانی مسلمانوں کے لیے بہت بڑا سہارا تھیں۔

ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہندوستان کے مسلم اور غیر مسلم زعما کے سامنے ایک مخلص رفیق کی موت نے ایسا خلا پیدا کر دیا ہے، جسے پاٹنا ممکن نہیں۔ مولانا کے انتقال کا جس قدر رنج ان کے اقربا اور متعلقین کو ہوگا، ٹھیک اسی قدر رنج علمی دنیا کو ہوگا۔

مولانا کے فیوض سب کے لیے برابر تھے۔ اللہ تعالیٰ انھیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور ان کے متعلقین کو صبر کی توفیق مرحمت فرمائے۔[1]

[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۱۳؍ دسمبر ۱۹۵۷ء)

سیٹھ نظام الدین کا سانحہ ارتحال

گذشتہ ہفتے جماعت اہلِ حدیث کے معمر اور مخلص بزرگ محترم سیٹھ نظام الدین صاحب انتقال فرما گئے۔ إنا للہ وإنا إلیه راجعون.

مرحوم کا پوری عمر جماعت اہلِ حدیث کے ساتھ تعلق رہا اور اگلی صفوں میں کام کرتے رہے۔ اسی طرح سیٹھ صاحب نے تمام سیاسی جماعتوں میں کام کیا، جو دینی رجحان رکھتی تھیں۔

مرحوم نہایت مخلص، متدین اور فیاض تھے۔ مولانا عبدالجبار صاحب غزنوی رحمہ اللہ اور مولانا عبدالواحد صاحب رحمہ اللہ کے خاص عقیدت مندوں میں سے تھے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

مرحوم کے دو لڑکے ہیں، سیٹھ نظر محمد اور نیاز محمد۔ دونوں بہترین کاروباری ہیں۔ اللہ تعالیٰ اسلام کی خدمت میں اپنے مقتدر باپ کا انھیں جانشین بنائے۔ تمام قارئین کرام سے استدعا ہے کہ مرحوم کے لیے دعائے مغفرت فرمائیں۔[1]

محمد اسماعیل

ناظم اعلیٰ جمعیت اہلِ حدیث

مغربی پاکستان

---

[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۱۶ر جنوری ۱۹۵۹ء)۔ سیٹھ نظام الدین ڈار کی وفات پر حضرت سلفی رحمہ اللہ کے تعزیتی شذرے کے علاوہ انھی دنوں (۱۲ر جنوری ۱۹۵۱ء) بایں عنوان ''گوجرانوالہ کی ایک بزرگ شخصیت: سیٹھ نظام الدین ڈار کی قابلِ تقلید زندگی'' ایک مختصر مضمون بھی شائع ہوا تھا، جس میں ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر اختصار کے ساتھ روشنی ڈالی گئی تھی۔ لیکن مضمون نگار کے نام کے بجائے آخر میں صرف ''ایک واقف حال'' مرقوم تھا۔ معلوم نہیں یہ مضمون لکھنے والے بھی مولانا سلفی تھے یا یہ کسی دوسرے صاحبِ قلم کی کاوش تھی۔ بہر حال موضوع کی مناسبت سے یہ مضمون بھی ذیل میں درج کیا جا رہا ہے:

''عام لوگوں کا خیال ہے کہ دنیاداری میں دیندار ہونا مشکل ہے۔ محترم سیٹھ نظام الدین صاحب کی زندگی اس کے بالکل برعکس ہے۔ آپ بہترین دنیادار اور کاروباری ہونے کے ساتھ پرانی وضع کے پختہ دیندار ہیں۔ سیٹھ صاحب ۱۸۶۰ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والدین متوسط الحال، سفید پوش اور متدین تھے۔ سیٹھ صاحب نے ابتدا میں درزی کا کام سیکھا۔ آپ کے استاد میاں رحیم بخش صاحب نے دیانت دار اور صالح نوجوان سمجھ کر اپنی دکان سیٹھ صاحب کے سپرد کر دی۔ ۱۸۸۱ء میں درزی کی دکان گوجرانوالہ کے بازار کھنڈ والا میں شروع کی۔ ۱۸۵۰ء میں اللہ تعالیٰ نے کاروبار میں اس ←

← قدر برکت فرمائی کہ سیٹھ صاحب نے ایک بزازی کی دکان بعض غیر مسلم تاجروں کے اشتراک سے شروع کی۔ اس کاروبار میں سیٹھ صاحب نے امرتسر، بمبئی، آگرہ، دہلی کی منڈیوں سے لاکھوں کا مال منگایا۔ ۱۹۲۳ء میں آپ نے تحریکِ ترکِ موالات میں علما کے فتوے سے متاثر ہو کر ولایتی مال استعمال کرنا اور فروخت کرنا بند کر دیا۔ شراکت تقسیم کی، ہزاروں کا نقصان کیا اور آج تک وہ اپنے اس عہد کے پابند ہیں۔

سیٹھ صاحب نے اپنے لڑکوں محمد نذیر اور محمد بشیر، سیٹھ نظر محمد اور نیاز محمد کی تربیت بھی تجارتی نکتہ نظر سے کی۔ بڑے لڑکے نے برتنوں کی دکان کی اور محمد شفیع ڈار مرحوم نے کریانہ اور صرافی وغیرہ کی مختلف دکانیں کیں اور سیٹھ صاحب نے بیسیوں مسلمانوں کو کاروبار کی تعلیم دی، جو آج تک شہر میں بہترین کاروبار کر رہے ہیں، گوجرانوالہ شہر پر سیٹھ صاحب کی اس کاروباری زندگی کا خاص اثر ہے۔

سیٹھ صاحب کا دینی ذہن:

ابتدا میں سیٹھ صاحب محض رسمی مسلمان تھے اور رسوم وغیرہ کی پابندی عام مسلمانوں کی طرح فرماتے تھے۔ غزنوی خاندان اور حضرت مولانا سید نذیر حسین صاحب دہلوی اور دوسرے اہلِ توحید کے اثر سے سیٹھ صاحب پختہ اہلِ حدیث اور موحد ہوگئے۔ دینی سیاسیات میں سیٹھ صاحب کو اتنا شغف تھا کہ آپ اسلامیہ ہائی سکول گوجرانوالہ کے خزانچی رہے اور تحریکِ خلافت میں گوجرانوالہ کی مجلسِ خلافت کے تو وزیرِ خزانہ ہی محترم سیٹھ صاحب تھے۔ تحریکِ خلافت میں سیٹھ صاحب نے ان تھک خدمت کی۔ آپ مدرسہ دیوبند اور مدرسہ غزنویہ کے پرانے معاون ہیں۔

۱۹۱۹ء میں محترم نے اپنے لڑکوں کی شادیاں کیں، یہ شادیاں بالکل سنت کے موافق تھیں۔ باجہ ڈھولک کا نام نہ تھا۔ بہت سے اہلِ توحید کو بلایا اور کئی ہفتوں تک ان کے مواعظ کا سلسلہ شہر میں جاری رہا۔ سیٹھ صاحب کے لڑکے بھی اس سادگی پر خوش نہ تھے۔ مگر سیٹھ صاحب نے پوری جرأت سے پوری برادری کا مقابلہ کیا اور شادی میں کوئی امر خلافِ شریعت نہ ہونے دیا۔ اس شادی میں مسلمان اور ہنود سب شامل ہوئے۔ کھانے میں اہلِ ہنود کی مذہبی پابندیوں کا پورا لحاظ رکھا گیا۔ محمد نذیر نے اپنی براءت کو جنازے سے تشبیہ دی، مگر سیٹھ صاحب نے سختی سے احکامِ شریعت کی پابندی کی۔ محمد نذیر نے شادی سے بیس دن بعد سفرِ آخرت اختیار کیا۔ شاید غیرتِ الٰہی اس کے اس فقرے سے جوش میں آگئی۔

۱۹۲۳ء میں سیٹھ صاحب نے حج کا سفر کیا۔ اس وقت سیٹھ صاحب کی مالی حالت اچھی نہ تھی، تاہم انھوں نے فریضہ حج ادا کیا۔

سیٹھ صاحب ابتدائی دور میں مسلم لیگ کے ممبر رہے، کانگرس میں بھی کام کیا۔ انگریز کی مخالفت میں بے حد سرگرم رہے۔

آپ کا لڑکا محمد شفیع تحریکِ خلافت میں تین سال با مشقت قید ہوا۔ مرحوم کو پرنس آف ویلز کی گاڑی روکنے کے جرم میں گرفتار کیا گیا تھا۔ اس کے بعد مرحوم کی صحت خراب ہوگئی۔ ۱۹۳۳ء میں کشمیر میں بمقام گلبرگ ہمیشہ کے لیے اپنے باپ کو داغِ مفارقت دے گیا۔

آپ کے چھوٹے لڑکے سیٹھ نظر محمد، نیاز محمد شہر میں بہترین کاروباری نوجوان ہیں۔ سیٹھ نظر محمد تحریکِ احرار میں جموں کے محاذ پر گرفتار ہوئے۔ لیگ میں بھی ان کی اچھی پوزیشن رہی۔ مختلف تجارتی اور لین دین میں ان کا رسوخ اور مالی حالت خاصی اچھی ہے، مگر افسوس ہے کہ ایک شریف نوجوان ہونے کے باوجود سیٹھ صاحب کی طرف دینی معاملات میں کافی سست ہیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں توفیق دے کہ وہ اپنے باپ کے سچے جانشین بنیں اور کتاب و سنت اور اہلِ توحید کے عقائد اور اعمال کے عملاً پابند ہوں۔‘‘

مولانا محمد احمد کو صدمہ

گذشتہ ہفتے میرے محترم دوست مولانا محمد احمد صاحب کی اہلیہ محترمہ انتقال کر گئیں۔ إنا لله وإنا إليه راجعون. مرحومہ کئی ماہ سے بیمار تھیں۔ مولانا نے ان کے علاج کے لیے بڑی بھاگ دوڑ کی، مگر وہ جانبر نہ ہوسکیں۔ مرحومہ تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ شعر و شاعری کا بھی خاصہ ذوق رکھتی تھیں۔ مولانا کو ان کی وفات سے جو صدمہ پہنچا ہے، مجھے اس پر ان سے دلی ہمدردی ہے۔ خدا مرحومہ کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور مولانا کو صبر کی توفیق عطا فرمائے۔[1]

شریکِ غم

محمد اسماعیل، گوجرانوالہ

---

[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۱۱/ جنوری ۱۹۵۲ء)

میری صحت

اخبار میں میری علالت کی خبر شائع ہونے کے بعد مجھے عیادت کے متعلق بہت سے خطوط موصول ہوئے۔ کئی احباب دور دراز سے خود تشریف لائے۔ ہر جگہ میری صحت کے لیے دعائیں کی گئیں۔ میں اُن تمام حضرات کی اس کرم فرمائی کا بے حد ممنون ہوں۔

اب نسبتاً کافی افاقہ ہے، لیکن تا حال بیماری کا اثر ہے، اس لیے تمام رفقا دعا جاری رکھیں۔ اصل ہمدردی یہی ہے کہ آپ مجھے دعا میں نہ بھولیں، صحت اور مرض اللہ کے اختیار میں ہے۔[1]

مولانا محمد اسماعیل، کان اللہ لہ

گوجرانوالہ

[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۹ر ستمبر ۱۹۶۶ء)

مقدمات

اور

تبصرہ جات

مقدمہ:

ترجمۃ القرآن

للاستاذ الامام النظار الشیخ ثناء اللہ رحمہ اللہ

(ناشر: مولانا داود راز، انڈیا)

قرآنِ عزیز ایک انقلابی دستاویز ہے، جس نے عقائد، معیشت، سیاست، ادب اور اخلاق میں پُرامن اور معنی خیز انقلاب بپا فرمایا۔ نزولِ قرآنِ مجید کے وقت چار قسم کے عقائد یا پانچ مذہبی طبقات عرب میں موجود تھے: مشرکین، یہود، عیسائی، مجوسی اور صابی۔ عقائد کے لحاظ سے یہ تمام طبقات مختلف تھے۔ خدا تعالیٰ کے متعلق ان کے تصورات بالکل جدا جدا تھے، جن میں بہ ظاہر کوئی تطبیق ممکن نہ تھی۔ مشرکینِ عرب سینکڑوں اللہ کے قائل تھے۔ اللہ میں کاموں کی تقسیم اور ان کے مقامِ الوہیت تک رسائی کے پسِ منظر بھی عجیب عجیب تھے، مثلاً: اِساف اور نائلہ کا مقامِ الوہیت تک رسائی کا ذریعہ اخلاقی برائی اور بدکاری تھا۔[1] کلبی نے لکھا ہے کہ جب قومِ عاد پر عذاب آیا تو یہ دونوں عاشق اور معشوق اپنے وطن سے غائب تھے، اپنے وطن میں ان کی محبت ناکام تھی۔ محبتِ باطلہ کے سیاہ کارانہ عوامل تک ان کو حرمِ کعبہ میں کامیابی ہوئی اور عذابِ خداوندی میں یہ دونوں وہیں مسخ کر کے پتھر بنا دیے گئے۔ پھر عذابِ الٰہی کے بعد یہ انسان نما پتھر حرمِ کعبہ ہی میں رکھ دیے گئے اور ان کی پرستش شروع ہوگئی۔

طائف میں لات کی قبر اس لیے پجتی تھی کہ وہ حجاج کو ستو پلایا کرتے تھے یا وہی ذہنیت ہے، جو آج کل ہمارے ہاں کے قبر پرست حضرات کی ہے۔ اولیاء اللہ رحمہم اللہ کے محاسن اور بزرگوں کے تذکروں کے بعد وسیلہ اور شفاعت کے خانہ ساز معانی گھڑ کر وہ بزرگوں کی پرانی قبروں کو حرکاتی صورت دے دیتے ہیں اور پھر جو ان کے اس مکر وتزویر پر آواز اُٹھائے، اس کو بھلا بُرا اور منکرِ اولیا کہہ کر اپنی دکان کی رونق بڑھانے کی کوشش کرتے ہیں۔

عیسائی:

عیسائیوں کے مختلف گروہ اور طبقات تھے، ان میں اساسی اختلافات پائے جاتے تھے۔ وہ بیسیوں گروہوں میں منقسم تھے۔ حجاز میں ان کی اقامت آنحضرت ﷺ کی بعثت کے انتظار کے لیے تھی، لیکن آنحضرت ﷺ کی

[1] دیکھیں: البدایة والنهایة (۲/ ۱۹۱)

بعثت کے بعد یہ جذبہ دل بدل چکا تھا۔ اب وہ آنے والے پیغمبر علیہ السلام کے سخت مخالف تھے، ان کا سب سے بڑا سہارا رومن امپائر تھی، جس کی سازشوں کا جال مسیحی علما کی معرفت جزیرۃ العرب میں پھیلا ہوا تھا۔ یہ عموماً تین خداؤں کے قائل تھے، ان کی تعیین، ان کے مراتب کی تشخیص کے متعلق ان کے ہاں عجیب عجیب تاویلات مشہور تھیں۔

یہودی:

تمام انبیا علیہم السلام کی تعلیمات میں توحید کی دعوت یکساں تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تعلیم تورات سے پہلے اور تورات کے بعد یکساں تھی، یعنی وحی متلو اور غیر متلو دونوں میں مسئلہ توحید کے متعلق وہی کچھ آپ نے فرمایا تھا، جو ان سے پہلے اور پچھلے نبی فرماتے رہے، لیکن یہود نے جہاں بیسیوں غلطیاں اور نافرمانیاں کیں، وہاں خداوند تعالیٰ کے لیے اولاد کے عقیدے کا بھی اختراع کیا۔ حضرت عزیر کو ابن اللہ کہنے کے ساتھ اپنے متعلق بھی یہ دعویٰ کیا کہ ﴿نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَ اَحِبَّآؤُهٗ﴾ [المائدۃ: ۱۸] یعنی ہم خدا کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں۔ ''ابناء'' پر ''احباء'' کے عطف نے معاملے میں کچھ لچک تو پیدا کر دی تھی، لیکن یہ لچک عقائد میں مقاصدِ شرع کے خلاف تھی۔ خصوصاً جنب عوام کے متعلق خطرہ ہو کہ وہ اس سے غلط متاثر ہوں گے۔ ابن کا لفظ کسی لحاظ سے بھی بولنا درست نہیں۔

مجوسی:

یہ لوگ آگ کو خدا کا مظہر سمجھتے تھے اور بعض فوائد کی بنا پر اس کی پرستش کرتے تھے۔ دنیا میں خیر و شر کے مظاہر کی بنا پر انھیں مغالطہ ہوا کہ خدا دو ہیں۔ ایک سے ہمیشہ خیر کا ظہور ہوتا ہے، جسے وہ ''یزداں'' کہتے تھے، دوسرے سے شر کا ظہور ہوتا ہے، اسے وہ ''اہرمن'' کہتے تھے، حالاں کہ خیر و شر اضافی چیز ہے۔ ان لوگوں نے غلطی سے ان دونوں صفات کو دو مستقل خداؤں کا مقام دے دیا۔ یہ فرقہ فارس کی سرحدوں پر پھیلا ہوا تھا، یہاں اس کی بڑی بادشاہت تھی، جو سیاسی طور پر عربوں کے مذہب، ان کی اخلاقیات پر اثر انداز ہو رہی تھی۔ عرب رسم و رواج پر فارسی کافی حد تک چھائے ہوئے تھے، ان کی تعلیمات اسلام کے ساتھ یہودیت اور عیسائیت سے بھی زیادہ متصادم تھیں۔ قرآن اور اسلام کی تعلیمات نے ان پر بھی اسی طرح اثر ڈالا، جس طرح دوسرے مذاہب اس کی تعلیمات سے متاثر ہوئے۔

صابی:

فارس کی سرحد پر یہ لوگ اقامت پذیر تھے۔ یہ ہوا پرست اور اپنی خواہشات کے غلام تھے۔ حلال اور حرام میں وہ کسی قانون کے پابند نہ تھے۔ جنسی تعلقات میں وہ بہ ظاہر اپنے آپ کو آزاد سمجھتے تھے۔ جہاں تک مشہور ہے نکاح وغیرہ میں وہ کسی شریعت کے پابند نہیں تھے۔ جنسی تعلقات میں ان کے نظریات عام مذہبی دنیا

سے بالکل الگ تھے، ان میں سب سے بڑی دقت یہ تھی کہ ان کے اخلاقیات عام دنیا سے مختلف تھے، ان کے پاس غالباً کوئی آسمانی پیغام تو نہیں تھا، لیکن دوسرے مذاہب سے حسبِ پسند انتخاب کے بعد انھوں نے اپنے لیے ایک مذہب کی صورت بنالی تھی۔ قرآنِ عزیز نے ایک گروہ کو ''صابی'' کے نام سے یاد کیا ہے۔ ائمہ تفسیر نے اس کی تشریح میں اختلاف فرمایا ہے، غالباً یہ وہی اباحی حضرات ہیں، جنھیں قرآنِ عزیز نے صابی فرمایا ہے۔ انھوں نے تمام مروجہ مذاہب سے حسبِ منشا بعض اشیا انتخاب کر کے ایک نئے مذہب کی بنیاد رکھ لی تھی۔ اسلام نے اِباحیت کے پورے نظام کو درہم برہم کر دیا۔ تقویٰ اور اِنابت الی اللہ کا سب سے زیادہ اثر اُن کے خلاف پڑا، کیوں کہ ان کے ہاں سارا انحصار نفس کی خواہشات پر تھا۔ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے ''الفوز الکبیر'' میں مشرکین اور یہود و نصاریٰ کو قرآن کے اولین مخاطب قرار دیا ہے۔ مجوسی اور اباحی مشرکین کے ضمن میں آجاتے ہیں۔[1]

اسلامی معاشرے کی وسعت:

قرآنِ عزیز نے مذہب کے دائرے کو وسیع فرما کر عبادات کے ساتھ معاملات، معاشیات اور اخلاقیات سب کو شامل فرما دیا، اس لیے قرآنی تعلیمات کے اصلاحی اثرات ان فرقوں کی زندگی کے تمام گوشوں تک پہنچے، اس نے عبادات کے ساتھ بیوع، نکاح، طلاق، میراث، وصیت، قتال، صلح، عہد و مواثیق کی پابندی؛ سب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور جہاں جہاں بگاڑ موجود تھا، اس کے متعلق واضح اور مبسوط ہدایات مرحمت فرمائیں۔ اس لیے قرآنِ عزیز اور سنتِ سنیہ کے نظام سے معاشرے کے تمام گوشے متاثر ہوئے اور تمام مذاہب کو ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ اپنے پروگرام پر نظرِ ثانی کریں۔

قرآنِ عزیز کا طریقِ ہدایت:

قرآنِ عزیز عموماً اصولی ہدایات دیتا ہے، وہ فروع پر تفصیلی گفتگو نہیں کرتا، نہ ہی کتبِ فقہ کی سطح پر اُترتا ہے۔ اخلاق میں اسے علم الاخلاق کی اصطلاحی موشگافیوں سے تعلق نہیں ہوتا، وہ ہدایت کے موضوع سے ہٹنے نہیں پاتا۔ تاریخِ امم اور انبیا کی سیرت پر بحث کرتے ہوئے وہ مورخ کا مقام کبھی اختیار نہیں کرتا، وہ دنیا کے واقعات اور تاریخ کی وادیوں میں ہدایت اور راہنمائی کے لیے ضروری بنیادی نکات کو نمایاں فرماتا ہے اور تاریخی حوادث کی وضاحت میں اس کا زور اُن ہی نکات پر ہوتا ہے، جو نوعِ انسان کی راہنمائی میں مفید ہوسکیں۔ غرض قرآنِ عزیز ہدایت کے اصول اور بنیادی نکات کی وضاحت فرماتا ہے، لیکن اگر کسی فرعی معاملے میں بھی لوگ ڈگمگا رہے ہوں

[1] دیکھیں: الفوز الکبیر (ص: ۲۹)

اور زندگی کی صحیح راہوں سے ہٹ رہے ہوں تو وہاں فروع کو بھی نظر انداز نہیں کرتا۔ مثلاً عرب معاشرے میں عورت کے ساتھ اس طرح معاملہ ہو رہا تھا کہ نکاح کے حقیقی فوائد اور ازدواجی زندگی کی برکات تقریباً ناپید ہو رہی تھیں۔ قرآنِ عزیز نے نکاح کے مسائل طلاق، عدت اور نفقات کو فقہی انداز سے ذکر فرمایا اور عورت کے حقوق کی پوری پوری نشان دہی فرمائی۔ میراث میں عرب کا جاہلانہ قانون ظالمانہ تھا۔ نابالغوں کو محروم رکھتے اور عورتوں کو کچھ نہیں دیتے تھے۔ اس لیے میراث کے متعلق فرداً فرداً حصص کی تعیین کر کے اس ظلم کی بندش کے لیے زجر آمیز احکام نافذ فرمائے، جیسا کہ آیتِ ذیل سے واضح ہے:

﴿تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ وَ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ وَ مَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ يَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ﴾ [النساء: ١٣۔ ١٤]

''یہ اللہ کی حدیں ہیں۔ جو اس کی اطاعت کرے گا، اسے دائمی جنت ملے گی، جس میں نہریں بہتی ہوں گی اور یہ بے حد کامیابی کی بات ہے، اور جو شخص اللہ کی نافرمانی کرے اور اس کی حدوں کو توڑ ڈالے، وہ ہمیشہ آگ میں داخل رہے گا اور اسے ذلیل کرنے والا عذاب نصیب ہوگا۔''

اس آیتِ کریمہ میں افراد کے حصص کی تعیین کے بعد انھیں حدود اللہ کے مساوی قرار دیا ہے اور اُن کے توڑنے پر دائمی عذاب کی خبر دی ہے۔ غرض قرآنِ مجید عام طور پر اصول اور کلیات سے بحث کرتا ہے، لیکن اگر ہدایت کا تقاضا یہ ہے کہ کہیں فروع پر بھی بہ قدرِ ضرورت گفتگو کی جائے تو فروع میں بھی ہدایت کے فریضے کی تکمیل فرماتا ہے۔

دوسری مثال:

اس وقت کے مذہبی فرقوں میں عبادت کا رواج کم و بیش موجود تھا، لیکن اس کے لیے طہارت کی کوئی حتمی صورت موجود نہ تھی۔ اس لیے اصول ہوں یا فروع؛ ہر سطح پر وہ اپنا فرض انجام دیتا ہے۔ ہاں جس جگہ قرآنِ عزیز نے اصول بیان فرما کر خاموشی فرمائی ہے، وہاں سنت میں قرآنی ہدایات کی تفصیل فرمائی۔ فریضۂ ہدایت کی تکمیل فرما دی گئی ہے، بیوع اور ربوی معاملات، بین الاقوامی امور اور صلح اور جنگ کے متعلق قرآنِ مقدس نے اساسی ہدایات دی ہیں، لیکن سنت نے ربوی بیوع اور سودی معاملات اور صلح اور جنگ کے متعلق بہ قدرِ ضرورت پوری تفصیل دے دی ہے، جس سے اسلامی تعلیمات کی تکمیل خود شارحِ حکیم کی زبان سے بہ صورتِ حدیث ہو گئی۔

آیتِ شریفہ: ﴿هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ﴾ [الجمعة: ٢] میں اسی طرف اشارہ ہے۔

شرک اُم الأمرض ہے:

شرک تمام دنیا میں اجتماعی مرض تھا اور اب بھی ہے، اس پر قرآنِ حکیم نے سیر حاصل بحث فرمائی اور تمام شبہات اور اُن کے پسِ منظر پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی۔ مشرکین کے شبہات کسی راہ سے بھی آتے ہوں، ان کا پورا پورا ازالہ کر دیا۔ غالبًا توحید اور شرک کے مسئلے پر امت نے آج تک جو کچھ کہا یا لکھا ہے، قرآنِ مجید اس سے بہت آگے ہے۔ یہودی، عیسائی، مجوسی اور دیگر مشرک گروہوں کو جو شکوک پیدا ہوئے اور جو ہو سکتے تھے یا آج کل کے مشرکین جو نت نئے شبہات پیش کرتے رہتے ہیں، قرآنِ حکیم نے ان سب کا ازالہ فرما دیا ہے۔ اسی طرح ثبوتِ قیامت، جزا سزا؛ قرآن کے اساسی مسائل ہیں، ان پر قرآنِ عزیز نے مفصل اور سیر حاصل بحث کی ہے۔ طالب علم کا فرض ہے کہ قرآنِ عزیز پر اسی انداز سے غور و فکر کرے۔

منکرینِ حدیث:

اگر مقدمے کی تنگ دامانی مانع نہ ہوتی تو یہاں موقع تھا کہ مکی سورتوں سے عقائد کی تفصیل، مباحثِ شرک اور اس کے اقسام، توحید اور اس کی انواع کو قرآن کی روشنی میں ذکر کیا جاتا۔ سورت انفال، سورت توبہ، سورت محمد سے جنگ اور صلح کے متعلق اسلامی تعلیمات کا مفصل تذکرہ آ جاتا، لیکن معلوم ہے کہ یہ مختصر سا مقدمہ اس کا متحمل نہیں، اس لیے میں اُمید رکھتا ہوں کہ قرآنِ عزیز کے طالب علم ان مسائل کے متعلق اصول سمجھ لینے کے بعد فرعی اور تفصیلی ہدایات خود مرتب کریں گے، تاکہ مغربی اقوام کی ہوس ملک گیری اور روس کے بے روح فلسفے کے سامنے ایک تیسرا نظریۂ حیات پوری تفصیل کے ساتھ آ جائے اور غلط اور صحیح میں امتیاز آسان ہو جائے، لیکن اس وقت قرآنِ عزیز کے بیان اور تفصیل کا اجمالی تذکرہ مقصود ہے اور اس جامعیت کا اجمالی تصور جو اسلام نے زندگی کے تمام گوشوں کے متعلق پوری دنیا کو دیا ہے، تاکہ قرآنِ عزیز سے اصولی ہدایات تلاش کی جائیں۔

اس حقیقت سے اعراض کا اثر:

امت نے ہمیشہ قرآنِ عزیز کو اسی نظر سے دیکھا اور اسی طرح سمجھنے کی کوشش کی اور تفصیل کے لیے احادیث اور آثار کی طرف توجہ کی یا پھر فقہ المذاہب اور فقہ الحدیث کی مروجہ کتب کی طرف توجہ کی اور محققین ائمہ کی تصانیف سے استفادہ فرمایا، لیکن یہ بھی ایک حادثے سے کم نہیں کہ احادیث کی تفصیلی ہدایات بعض آزادی پسند طبائع کی نظروں میں مدت سے کھٹک رہی تھیں۔ معتزلہ، جہمیہ، روافض، خوارج اور اکثر بدعتی گروہ حدیث کی تفصیلات سے گھبراتے تھے، لیکن وہ اہلِ علم تھے، پس علمی بصیرت کی وجہ سے وہ فنِ حدیث کا کھلا انکار نہ کر سکے۔

خوارج نے ”حسبنا کتاب اللہ“ کہنے کے باوجود حدیث کے دامن کو بالکلیہ چھوڑنے کی جرأت نہیں کی، انھیں اس راہ کی دشواریاں معلوم تھیں اور وہ خوب جانتے تھے کہ انکارِ حدیث کے بعد مذہب ایک چیستان بن کر رہ جائے گا، مگر آج سے قریباً ستر سال قبل لاہور سے ایک شخص نے احادیث کے خلاف کھل کر آواز اُٹھائی اور حدیث کی حجیت سے کھلے طور پر انکار کیا۔ بتدریج اس نظریے نے تحریک کی صورت اختیار کی، جو اَب تک ملک میں کم وبیش چل رہی ہے، لیکن اس عرصے میں تحریک کا انجام یہ ہوا کہ یہ حضرات آج تک نماز تک کا فیصلہ نہیں کر سکے کہ کس طور پر کس تعداد میں کن کن اوقات میں اسے ادا کیا جائے؟!

ابتدا میں تحریک انکارِ حدیث کے یہ گمراہ قائدین نماز کی فرضیت، رکعات، اوقات کی پابندی کا اعتراف کرتے تھے۔ اب منکرینِ حدیث کے فقہا اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ نماز کوئی اساسی مسئلہ نہیں ہے، نہ ہی خداوندِ تعالیٰ کو اس ورزش کی ضرورت ہے، نہ ہی اوقات اور رکعات پر اصرار چنداں ضروری، نہ ہی اس کی وضع میں قیام، رکوع، سجود اور اذکارِ ضروری میں مقصود عبادت ہے، جہاں چاہے، جیسے چاہے، جتنی چاہے، جس وقت جو مناسب سمجھے، اسی میں پڑھ لے۔ فہم حدیث سے تو ایسے بدنصیبوں کا محروم ہونا موجبِ تعجب نہ تھا، اس لیے کہ وہ حدیث کا سرے سے انکار ہی کر بیٹھے، عجیب بات یہ ہے کہ ان سے قرآنِ عزیز کا فہم بھی سلب کر لیا گیا۔ اب وہ جس قدر حدیث سے جاہل ہیں، اسی طرح وہ قرآنِ عزیز سے بھی ناآشنائے محض ہیں۔ صرف نکتہ چینی اور سلبی مباحث ان حضرات کا سرمایۂ افتخار رہ گیا ہے!

قرآنِ عزیز کی حفاظت:

آنحضرت ﷺ جب مبعوث فرمائے گئے، عرب حضریت (شہریت) سے ناآشنا تھے۔ بہ ظاہر مکہ مدینہ طائف وغیرہ چند بستیاں تھیں، جو شہر سمجھی جاتی تھیں۔ ان پر بھی بدویت غالب تھی۔ کھانا پینا، رہنا سہنا؛ سب دیہاتی انداز سے تھا۔ قبائلی سی زندگی تھی۔ علامہ ابن حزم نے ”محلی“ (٥/ ٥٤) میں ذکر کیا ہے کہ مدینہ منورہ میں چند قبائل آباد تھے، جنھوں نے اپنی اپنی زمینوں پر ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ پڑھے لکھے آدمی بہت کم تھے۔ یہود اور عیسائیوں میں تعلیم کا رواج تھا اور وہ بھی معمولی، اس لیے قرآنِ عزیز کی حفاظت کا دارومدار حفظ پر تھا۔ آنحضرت ﷺ تو حفظ فرماتے ہی تھے، صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے بھی اکثر اہلِ علم جس قدر قرآن مجید نازل ہوتا، اسے حفظ کر لیتے۔ احتیاط کے طور پر آنحضرت ﷺ اپنی نگرانی میں قرآنِ مجید کو ترتیب سے لکھواتے جاتے تھے، تاکہ حفظ میں اس سے مدد لی جائے اور حفاظت بھی رہے۔ پرانے کتبات سے، جس طرح کہ معلوم ہوتا ہے، اس وقت خط نے ترقی نہیں کی تھی۔ حروف پر نقطے اور اعراب لگانے کا رواج نہیں تھا۔ آنحضرت ﷺ کا خط مقوقس عظیم قبط کے نام سے اس کا عکس شائع ہو چکا ہے، اس سے عرب رسم الخط کا پتا چل سکتا ہے۔

نزولِ قرآن کے وقت حقیقت یہ تھی کہ لوگ لکھنے کے بجائے حافظے پر زیادہ اعتماد کرتے تھے۔ عرب میں علم اَنساب کا سارا اعتماد حافظے پر تھا۔ قبائل کی تاریخ اور صلح و جنگ کے سارے واقعات حافظے پر مبنی تھے، اس لیے قرآنِ مجید کی حفاظت کا اہم ذریعہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی قوتِ حافظہ تھی۔ جو لوگ لکھتے تھے، ان کا مطلب بھی یہی تھا کہ حفظ کرتے وقت اس نوشتے کی طرف مراجعت کر سکیں، ورنہ وہ رسم الخط آج کل کے ترقی یافتہ خط سے بہت مختلف تھا، اس سے کسی تحریر کا پورا تحفظ سخت مشکل تھا۔

قرآنِ عزیز کا سرکاری نسخہ:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس قرآنِ مقدس کی جو تحریری صورت، صحف و اَجزا، موجود تھی، اسے سرکاری تحریر کہنا چاہیے۔ اس تحریر کی روشنی میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے واقعہ حرہ کے بعد سرکاری نسخہ مرتب فرمایا، اسی نسخے کی بنیاد پر وہ سرکاری نسخے لکھے گئے، جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مختلف گورنروں کو اِرسال فرمائے۔ ہجوں کے اختلاف اور خط کے نامکمل ہونے کی وجہ سے جب شبہہ پیدا ہوا تو حفظ کے ساتھ جزوی نوشتوں سے اس کا مقابلہ کرنے کے لیے تصحیح کی خاطر قریش کی لغت و لہجے کو اساس قرار دیا گیا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافتِ راشدہ میں حفاظ اور قراء کی موت سے قرآنِ عزیز کے ضائع ہونے کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی خلافتِ راشدہ میں عجمی عنصر کی کثرت اور عجمی لہجوں کی یورش کی وجہ سے سرکاری نسخے پر نظرِ ثانی کی گئی اور سب سے بڑی خوبی یہ ہوئی کہ تمام مشکوک دستاویز کو ضائع کر دیا گیا، تاکہ بحث اور تشکیک کے لیے کوئی مواد باقی نہ رہ جائے۔ اب وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس بعینہٖ وہی قرآنِ مقدس تھا، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اور آپ کے اصحابِ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنی زندگیوں میں اسے بار بار پڑھا اور اسے سرکاری دستاویز کے طور پر لکھوایا، اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی بروقت کوشش اس قدر کارگر ہوئی کہ آج تک اس میں ایک حرف بھی کم و بیش نہیں ہو سکا اور اسی میں متواتر قراءات صحیح طور پر آگئیں اور تمام شذوذ کو ایک طرف کر دیا گیا۔

اِتقان میں حافظ سیوطی نے اور زرکشی نے "البرهان في علوم القرآن" میں بعض ایسے واقعات ذکر فرمائے ہیں،[1] جن سے قرآنِ عزیز کی جمع و ترتیب کے متعلق بعض شبہات پیدا ہو سکتے ہیں۔ بعض دوسری روایات سے بھی ان شبہات کی تائید ہوتی ہے، لیکن قرآنِ عزیز حفظ کے بعد جس عظیم الشان تواتر سے منقول ہوا ہے، اس کے سامنے ان آحاد اور آثار کی کوئی اصلیت نہیں رہ جاتی۔

علامہ ابن حزم "الملل و النحل" میں فرماتے ہیں:

[1] دیکھیں: الإتقان (۱/ ۱۶۰) البرهان (۱/ ۲۴۱)

''جب آنحضرت ﷺ کا انتقال ہوا، اس وقت اسلام تمام جزیرۂ عرب میں پھیل چکا تھا۔ بحیرۂ قلزم اور سواحلِ یمن سے گزر کر خلیج فارس اور فرات کے کناروں تک اسلام کی روشنی پہنچ چکی تھی۔ پھر اسلام شام کی آخری سرحدوں سے ہوتا ہوا بحیرۂ قلزم کے کناروں تک شائع ہو چکا تھا، اس وقت جزیرہ نمائے عرب میں اس قدر شہر اور بستیاں وجود میں آ گئی تھیں کہ جن کی تعداد اللہ کے سوا کوئی نہیں جان سکتا۔ یمن، بحرین، عمان، نجد، بنو طے کے پہاڑ، مضر اور ربیعہ و قضاعہ کی آبادیاں، طائف، مکہ، مدینہ؛ یہ سب لوگ مسلمان ہو چکے تھے، ان میں مسجدیں بھرپور تھیں، ہر شہر، ہر گاؤں، ہر محلے، ہر بستی کی مساجد میں قرآن مجید پڑھا جاتا تھا۔ بچے اور عورتیں قرآن جانتے تھے اور اس کے لکھے ہوئے نسخے ان کے پاس موجود تھے۔ آنحضرت ﷺ عالمِ بالا کو تشریف لے گئے، مسلمانوں میں کوئی اختلاف نہ تھا۔ وہ صرف ایک جماعت تھے اور ایک ہی دین سے وابستہ تھے۔

''حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافتِ راشدہ اڑھائی سال رہی، ان کی خلافت میں فارس و روم کے بعض حصص اور یمامہ کا علاقہ اسلامی قلم رو میں شامل ہوا۔ قرآنِ عزیز کی قراءت میں مزید اضافہ ہوا۔ لوگوں نے قرآنِ مقدس کو لکھا۔ حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت زید، حضرت ابو زید اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہم وغیرہم نے قرآنِ عزیز کے نسخے لکھے اور جمع کیے، ہر شہر میں قرآنِ مجید کے نسخے موجود تھے، وہ ان ہی میں پڑھا جا رہا تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا۔ صورتِ حال بدستور تھی، ان کی خلافت میں مسیلمہ اور اسود عنسی کا فتنہ کھڑا ہوا، یہ دونوں نبوت کے مدعی تھے اور آنحضرت ﷺ کی نبوت کا کھلے طور پر اعلان کرتے۔ بعض لوگ زکاۃ کا انکار کرتے، بعض قبائل نے کچھ دن ارتداد اختیار کیا، لیکن ان ہی قبائل کے مسلمانوں نے ان کا مقابلہ کیا اور ایک سال نہیں گزرنے پایا تھا کہ فتنہ فرو ہوگیا اور حالات بدستور اعتدال پر آ گئے۔

''حضرت ابوبکر کے بعد مسندِ خلافت کو حضرت عمر نے زینت بخشی۔ فارس پورا فتح ہوگیا۔ شام، الجزائر، مصر اور افریقہ کے بعض علاقے اسلامی قلم رو میں شامل ہوئے۔ مسجدیں تعمیر ہوئیں، قرآنِ عزیز پڑھا جانے لگا۔ تمام ممالک میں قرآنِ عزیز کے مخطوطے شائع ہوئے۔ مشرق و مغرب تک مکاتب میں علما سے لے کر بچوں تک قرآنِ مجید کی تلاوت ہونے لگی۔ پورے دس سال یہ سلسلہ جاری رہا۔ اسلام میں کبھی اختلاف نہ تھا۔ وہ ایک ہی ملت کے پابند تھے۔ حضرت عمر کے انتقال کے وقت مصر، عراق، شام اور یمن کے علاقوں میں کم از کم قرآنِ عزیز کے ایک لاکھ نسخے شائع ہو چکے ہوں گے، پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت میں اسلامی فتوحات اور بھی وسیع ہوئیں اور قرآنِ عزیز کی اشاعت مفتوحہ ممالک میں وسیع پیمانے پر ہوئی۔ قرآنِ مجید کے شائع شدہ نسخوں کا اس وقت شمار ناممکن ہوگا۔

''حضرت عثمان کی شہادت سے اختلافات کا دور شروع ہوا اور روافض کی تحریک نے زور پکڑا (روافض

ہی کی وجہ سے قرآنِ مجید کی حفاظت کے متعلق اعتراضات اور شبہات شروع ہوئے)۔ صورت یہ تھی کہ نابغہ اور زہیر کے اشعار میں کوئی کمی بیشی کر دے تو یہ ممکن نہیں۔ دنیا میں اسے ذلیل اور خوار ہونا پڑے گا۔ قرآنِ مجید کا معاملہ تو اور بھی مختلف ہے، اس وقت قرآنِ عزیز اندلس، بربر، سوڈان، کابل، خراسان، ترک اور صقلیہ اور ہندوستان تک پھیل چکا تھا۔ اس سے روافض کی حماقت ظاہر ہوئی۔ (وہ قرآن کی جمع و تالیف میں حضرت عثمان کو متہم کہتے ہیں)۔ یہی حال مسیحی اور سماجی مشنریوں کا ہے۔ یہ لوگ روافض سے سیکھ کر قرآنِ مجید کو اپنے نوشتوا کی طرح محرف ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں، حالاں کہ ان حالات میں ایک حرف کی کمی بیشی بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ یا کسی دوسرے شخص کے لیے ناممکن تھی۔

''روافض (اور ان کے تلامذہ) کی یہ غلط بیانی یوں بھی واضح ہوتی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ پانچ سال نو ماہ تک بااختیار خلیفہ رہے اور ان کے بعد حضرت حسن منتخب ہوئے، انھوں نے قرآن کو بدلنے کا کوئی حکم نہیں دیا نہ ہی اپنی حکومت میں قرآنِ عزیز کا کوئی دوسرا صحیح نسخہ شائع فرمایا۔ یہ کیسے باور کرلیا جائے کہ پوری اسلامی قلم رو میں غلط اور محرف قرآن پڑھا جائے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ خاموشی سے اسے گوارا کریں۔ انتھیٰ مختصراً

(الفصل في الملل والنحل ابن حزم: ٢/ ٨٦۔ ٨٠)

حافظ ابن حزم نے قرآنِ عزیز کی حفاظت کے متعلق یہ بیان مسیحی اور روافض کی غلط بیانیوں کے متعلق لکھا ہے، جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد عرصہ تک شائع ہوتی رہیں۔ شیعہ چوں کہ مسلمان کہلاتے تھے اور تقیہ کا رواج ان کے ہاں عام تھا، اس لیے اس قسم کا مسموم لٹریچر رواۃ کی غلطی سے اہلِ سنت کی روایات میں بھی آ گیا۔ محدثین نے ایسی روایات کی حقیقت اور ان کے کذب اور وضع کی حقیقت کو واضح کر دیا ہے۔ فنِ حدیث کے ماہر اِن روایات اور آثار کی حقیقت کو سمجھتے ہیں، لیکن ابن حزم نے اصولی اور واقعاتی جواب دیا ہے کہ اس عظیم الشان تواتر کے سامنے اس مشکوک ذخیرہ روایات کی کوئی اہمیت نہیں، اس لیے جب تعارض ہی نہیں تو تطبیق اور ترجیح کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

سابقہ آسمانی کتابوں کی کیفیت:

قرآنِ عزیز حفظ اور تدوین کے بعد جس طرح تواتر سے منقول ہوا ہے اور جس طرح مسلمانوں نے اسے ہر دور میں حفظ کیا، لکھا اور مشرق سے مغرب تک اس کی اشاعت کی، تمام دنیا مخالفت کے باوجود اس میں کوئی شبہہ نہ پیدا کر سکی۔ قرآنِ مجید کے تحفظ کی یہ بین دلیل ہے۔ تورات اور انجیل واقعی آسمانی کتابیں ہیں، لیکن یہودی اور مسیحی علما ان کو صحیح طور پر محفوظ نہ رکھ سکے۔ تراجم کی کثرت اور مترجمین کی بے اعتدالیوں کی وجہ سے ان کے پاس کوئی مستند نسخہ نہ رہ سکا۔ موجودہ عہدِ جدید اور عہدِ عتیق پادری حضرات کی تبلیغی کوششوں میں ہی یکسر کھو گیا۔

پھر مسیحی فرقوں کے اختلافات نے اسے اور بھی نقصان پہنچایا۔ بائبل کی اصلاح اور حفاظت کے لیے جو کوشش کی گئی، وہ بالآخر بائبل کی ترمیم اور تنسیخ پر منتج ہوئی۔ کبھی حواشی آیات بن گئے، کبھی آیات کو حواشی قرار دے دیا گیا۔

بائبل کا ایک طالب علم جب بائبل کی اس حیثیت پر غور کرتا ہے تو اسے حیرت ہوتی ہے۔ بائبل کی تاریخ، پادریوں کی مساعی، مسیحی حکومتوں کے دینی رجحان، مشنریوں کی صدیوں کی دوڑ دھوپ کے باوجود بائبل محفوظ نہ رہ سکی۔ کروڑوں روپے اس کی خدمت کے لیے صَرف کیے گئے۔ بڑی بڑی بادشاہتیں صف بہ صف اپنے مادی وسائل کے ساتھ اس کی خدمت کے لیے میدان میں اُتریں، لیکن کوئی مفید نتیجہ برآمد نہ ہوسکا، بلکہ شبہات اور زیادہ ہوگئے اور بائبل کی حیثیت آثارِ قدیمہ سے زیادہ نہ ہوسکی۔

مسیحی حضرات نے اس ناکامی کے بعد انتقامی انداز اختیار کیا اور صدیوں کی مادی اور نظریاتی جنگ نے عصبیت کی صورت پیدا کر دی۔ مسیحی مشنوں نے منادی کرنی شروع کر دی کہ قرآن بھی غیر محفوظ ہے، اس جنگ میں شیعہ حضرات سے ان کو مدد ملی۔ شیعی لٹریچر میں اس قسم کا مواد واقعی موجود بھی تھا۔ روافض کا سنجیدہ طبقہ گو اسے ناپسند کرتا ہے، لیکن ان کے ہاں جو مواد موجود ہے، اس کی وجہ سے وہ مجبور ہو جاتے ہیں، اس لیے مسیحی اور شیعہ اہلِ قلم قرآن کے خلاف اس جنگ میں ہم دوش کھڑے رہے۔ ائمہ حدیث کی دور اندیشی اور علم الرجال کی حقیقت پسندی نے ان تمام مساعی کو ناکام بنا دیا، جو شیعہ حضرات اور مسیحی علما نے آج تک کیں، کیوں کہ جن آثار اور روایات پر ان حضرات کو اعتماد تھا، وہ محدثانہ تنقید کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتے نہ ہی اس تواتر کا مقابلہ کر سکتے ہیں، جو قرآنِ عزیز کو ہر دور میں حاصل رہا۔ علامہ ابن حزم ایسے ظاہریت پسند نے پوری جرأت سے اس کا اعتراف فرمایا ہے۔

محدثین میں دو ذہن:

قرآنِ عزیز کی حفاظت کے تذکرے میں فنِ حدیث اور ائمہ حدیث کی مفید اور مضرِ مساعی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مسیحی اور شیعی مواد کو جب تک اس کی اصلی صورت میں نہ دیکھا جائے، قدیم و جدید معترضین کے پیدا کردہ شبہات کا صحیح علاج نہیں ہوسکتا۔ ائمہ حدیث میں قدیم سے دو ذہن آ رہے ہیں:

کچھ وہ لوگ ہیں، جن کی یہ خواہش ہے کہ ہر قسم کا مواد جمع کر دیا جائے۔ حدیث کے مجموعے اس طرح مرتب ہوں کہ ان میں ضعاف، مقطوعات، مراسیل روایات سب آ جائیں۔ محققین تحقیق (ریسرچ) کے بعد غلط اور صحیح، مستند اور غیر مستند میں خود فرق کر لیں گے، متاخرین میں سیوطی، عبدالحق، دہلوی، صنعانی، سخاوی خاص طور پر مشہور ہیں۔ قدما میں بیہقی، خطیب، طحاوی، طبری، طبرانی کا نام لیا جا سکتا ہے۔ یہ حضرات فن میں امامت کا درجہ رکھتے ہیں۔ رجال اور ان کے مراتب کو سمجھتے ہیں، لیکن اپنی تصانیف میں جو مواد ان حضرات نے جمع فرمایا ہے، اس کی اسنادی

اندار کو وہ خوب سمجھتے ہیں کہ انھوں نے وضع وتخلیق کے ذخائر من وعن جمع کر دیے ہیں، تاکہ اگر نقاد کسی چور، یعنی وضاع پر تنقید کریں تو اس کے ساتھ ہی چوری کا مال بھی برآمد ہو جائے۔ وضع وتخلیق کا ذخیرہ بطور شہادت پیش ہو سکے۔

اس سے عوام کو تکلیف یقیناً ہوتی ہے۔ ناواقف پورے ذخیرے کو حدیثِ نبوی سمجھتے ہیں، اس سے استدلال کرتے ہیں، نزاع بڑھتا ہے، ناواقف آدمی لاعلمی کی وجہ سے اڑ جاتا ہے۔ یہ دقت واقعی ہے، لیکن لاعلمی لاقانونی کے لیے عذر نہیں بن سکتی۔ جھوٹ بہرحال جھوٹ ہے۔ کوئی سمجھے یا نہ سمجھے، مصنفین کو اپنی نیت کا اجر ملے گا اور استدلال کرنے والے اپنے کیے کا پھل کھائیں گے۔

ائمہ حدیث کا دوسرا ذہن:

یہ احادیث کے قبول میں پوری چھان پھٹک سے کام لیتے تھے۔ محض نسبتِ نبوی اور ناقل کے نام سے مرعوب نہیں ہوتے تھے، اسی ذہن کے ترجمان متاخرین میں ابن جوزی، ابن تیمیہ، ذہبی، ابن کثیر وغیرہ ہیں۔ یہ حضرات ائمہ اسلام فنِ حدیث کے ماہر، رجال کی گہرائیوں کے شناور ہیں۔ حدیث کے ظاہری اور خفی علل کو سمجھتے ہیں، نڈر تنقید کرتے ہیں۔ متقدمین میں امام محمد بن اسماعیل بخاری، مسلم بن حجاج قشیری، امام ابوعیسیٰ ترمذی، ابوعبدالرحمٰن نسائی، امام ابو داود سجستانی، یحییٰ بن سعید قطان، دارقطنی، یحییٰ بن معین وغیرہم رحمہم اللہ: دراصل فنِ حدیث کی آبرو یہی لوگ ہیں۔ سیوطی کی اتقان، درمنثور، خصائص کبریٰ، شرح الصدور وغیرہ میں ضعاف اور موضوعات کی بڑی تعداد موجود ہے، ان سے بلاتنقید استدلال کرنا اعتقادی اور عملی بدعات میں مبتلا کر دیتا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے حدیث کی کتابوں کے طبقات کا ذکر فرماتے ہوئے طبقہ ثالثہ میں بیہقی، طبرانی، طحاوی، طیالسی وغیرہ کا ذکر فرما کر ارشاد فرمایا:

"وكان قصدهم جمع ما وجدوه، لا تلخيصه وتهذيبه وتقريبه من العمل"
(حجة الله البالغة: ١/ ١٠٧)

"ان بزرگوں کا مقصد ذخیرہ کرنا تھا، یہ مطلب نہ تھا کہ انھیں عمل کے قابل سمجھا جائے۔"

چوتھے طبقے میں ابن عدی، خطیب، ابونعیم، زرقانی، ابن عساکر، ابن نجار، دیلمی، خوارزمی کا ذکر فرما کر لکھا ہے:

"وأصلح هذه الطبقة ما كان ضعيفاً محتملاً و أسوأها ما كان موضوعاً مقلوباً شديد النكارة" اهـ (حجة الله البالغة: ١/ ١٠٧)

"اس طبقے کی بہترین روایات ضعیف ہیں اور جو اُن میں خراب ہیں، وہ موضوع اور مقلوب ہیں اور بہت ہی منکر۔"

پانچواں طبقہ اس سے بھی فروتر ہے۔ سیوطی، سخاوی وغیرہ کی کتابوں کا ان طبقات میں ذکر ہی نہیں، ان کا

مقام تو اور بھی نیچے ہے۔ قرآن کی حفاظت کے خلاف علی العموم جو مواد ملتا ہے، اس کے لیے یہ وثوق سے سمجھ لینا چاہیے کہ ان کتابوں کی روایات محدثانہ تنقید کے بغیر قابلِ قبول نہیں۔ خصوصاً جب صحیح احادیث یا اخبارِ متواترہ کے خلاف ہوں۔ احادیث کا انکار حقائق سے چشم پوشی کے مرادف ہے۔ آج کے انکار سے گذشتہ واقعات نہیں بدل سکتے۔

اللہ تعالیٰ کی حفاظت:

ان گزارشات سے ظاہر ہے کہ قرآنِ عزیز پر مدت سے اندرونی حملے ہوتے رہے ہیں۔ اپنے اور بیگانے اکثر نے اس کی حفاظت مشکوک کرنے کی کوشش کی ہے۔ سادہ دل دوستوں نے سادگی سے وہی کچھ کہا، جو عیار دشمن کہہ رہے تھے، اس کے باوجود قرآنِ عزیز کی حفاظت محض اللہ تعالیٰ کی تائید سے ہوئی: ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾ [بني إسرائيل: ٩] یعنی یہ ذکر ہم نے ہی اتارا اور یقیناً ہم ہی اس کی حفاظت کے ذمے دار ہیں۔

اس حفاظت میں سب سے زیادہ کام قدرت نے قوتِ حفظ سے لیا، پھر بوقتِ ضرورت اس کی تائید قلم سے ہوئی، پھر اُمت کی توجہ اس طرف پھیر دی گئی۔ آج کے لادینی دور میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ ہزاروں کی تعداد میں بچے حفظ کر رہے ہیں۔ مکاتب میں کافی رونق ہے۔ حفاظ پوری تندہی سے یہ خدمت انجام دے رہے ہیں۔ مطبوعہ قرآن کے نسخوں میں جو تحریر و طباعت کی غلطیاں رہ جاتی ہیں، ان کی درستگی کے لیے بھی حفاظ کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں۔

قرآنِ عزیز کے مفہوم کی حفاظت:

امت نے کوشش کی کہ قرآنِ عزیز کے مطالب کی بھی حفاظت اسی طرح کرے، جس طرح اس نے الفاظ کی حفاظت کی، اس کے لیے علما نے مندرجہ ذیل وسائل اختیار کیے:

1. لوگ قرآن کو اصل عربی زبان میں سمجھیں۔ تراجم کی حسبِ امکان ضرورت ہی نہ رہے۔ عربی زبان کی گرائمر کو باقاعدہ مرتب کیا۔
2. اگر تراجم کی ضرورت ہوئی تو اسے الفاظِ وحی سے علیحدہ کرنے کی اجازت نہیں دی۔ سابقہ کتابوں میں اسی وجہ سے تحریف عام ہوگئی۔
3. زبان کی بدلتی ہوئی نفسیات کے پیشِ نظر عرب اول کی زبان، اس کے محاورات کو ضبط کیا۔ جاہلی عربوں کے ہزاروں اشعار صحابہ، تابعین، ائمہ اسلام نے ضبط اور محفوظ کیے، حالاں کہ ان کی روح اسلامی تعلیمات کے منافی تھی، تاکہ زبان کی وقتی تبدیلیاں قرآنِ عزیز کے مفہوم پر اثر انداز نہ ہوں۔
4. آنحضرت ﷺ کی عملی زندگی کے لیے لاکھوں ابواب اور ہزاروں اوراق کو محفوظ کیا، کیوں کہ قرآن کی اصل

تفسیر آنحضرت ﷺ کی زندگی ہے۔ قرآن کا صحیح اور مستند مفسر وہی ہو سکتا ہے، جس پر قرآنِ عزیز نازل ہوا۔

5 آنحضرت کی عملی زندگی اور آپ کے مختلف ارشادات کی حفاظت کے لیے بیسیوں نئے علوم ایجاد فرمائے، تاکہ سنت کے ذخیرے امت کے پاس صحیح طور پر پہنچ جائیں۔

6 عربی زبان کے لیے ضخیم لغت لکھے۔ واقع اور موقع کی تبدیلیوں کا پتا دیا، تاکہ زبان کی تبدیلیاں مفہوم پر اثر انداز نہ ہوں۔

خدا کا شکر ہے کہ اس میں بھی کافی کامیابی ہوئی، لیکن اعتراف کرنا چاہیے کہ ملحدین نے بھی قرآن کے مفہوم کی تخریب میں پورا زور صَرف کیا اور تاویل کے وہ کرشمے ظاہر کیے کہ شیطان بھی حیران ہوگیا۔[1] مولفین نے حقائق کو بدلنے میں انتہا کر دی۔ کبھی لغت کا سہارا لیا، کبھی حدیث کو تاریخ کہہ کر ٹالنے کی کوشش کی، کبھی سنتِ نبوی کو خرافات سے تعبیر کیا، کبھی حدیث کے شرعی حجت ہونے سے انکار کیا۔[2] یہ سب اس لیے

---

[1]

زمن با صوفی و ملا سلامے — کہ او پیغامِ حق دادند مارا
و لے تاویل او حیران ہم ساخت — خدا و جبریل و مصطفیٰ را

[2] ملحدین کی دو راہیں: پرانے اور نئے ملحدین نے قرآنِ عزیز کے الفاظ اور معانی کی حفاظت اور اس کے خلاف جو شبہات وارد ہو سکتے تھے، اس کے متعلق دو راہیں اختیار کیں۔ روافض اور اُن کے شاگردوں نے ان آحاد، ضعاف اور وضعی روایات کی بنا پر قرآنِ عزیز کو مشکوک و مشتبہ قرار دیا اور بزعم خود اپنی غلط کاریوں اور اسلام دشمنی کے لیے راستہ ہموار کیا۔

دوسرے گروہ نے قرآن کے احترام اور حفاظت کی آڑ لے کر سنت کے پورے ذخیرے کو مشکوک اور غیر مستند قرار دینے کی کوشش کی۔ کبھی کتبِ حدیث کو لہو الحدیث اور مزخرف کہہ کر دل کی گرمی کو تسکین دی۔ کسی نے منافقانہ طور پر احادیثِ نبویہ اور سنت کو تاریخ کہہ کر پہلے اس کے مقام کو ہلکا کیا، پھر اس پر مختلف طریقوں سے حملہ آور ہوئے، ائمہ حدیث اور فقہاے سنت کی تضحیک کی۔ ﴿وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ [الجمعة: ۸] یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ احادیث اور قرنِ اول کی زندہ جاوید روایات اگر ان کی راہ سے ہٹ جائیں تو ان کی جہالت آمیز روایات کے لیے میدان صاف ہو جاتا ہے۔ قرآن میں من مانی تاویلات کے لیے راہ کھل جاتی ہے، حرام کو حلال اور حلال کو حرام بنانا آسان ہو جاتا ہے۔ ہمارے زمانے کے منکرینِ حدیث کی تحریک نے قریباً نصف صدی میں اسی نفاق آمیز پالیسی کے لیے مختلف روپ بدلے ہیں۔ آج کل ان ملحدانہ تصورات کی اشاعت کے لیے دو عنوان قائم کیے گئے ہیں: ''قرآنی معاشرہ'' اور ''قرآنی نظام ربوبیت''، اس طرح سے پورے قرآن اور اسلام کی مرمت کا پروگرام مرتب کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ فحش اور عیاشی کے داعی اور مسیحیوں کی مساعی ناکام ہوں گی اور اہلِ سنت اور فقہا محدثین کا مسلک غالب ہوگا۔ ﴿فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً وَ اَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ﴾ [الرعد: ۱۷]

یہ درست ہے کہ اس میدان میں منافقین کو اس طرح شکست اور ناکامی نہیں ہوئی، جس طرح حفظِ قرآن نے انھیں الفاظِ قرآن کی حفاظت کے متعلق ناکام کیا، تاہم ائمہ سنت نے اصولِ تفسیر میں انہی تحفظات کی کوشش کی، جس سے قرآنِ عزیز ﴿

تھا کہ سنت راہ سے ہٹ جائے، زمانۂ نبوت کی تشریحات پر اعتماد نہ رہے اور قرآنِ عزیز کو تاویلات کی سان پر چڑھا کر حسبِ منشا خرافات کے لیے راستہ صاف ہو جائے۔ اس آویزش میں فریقین کہاں تک کامیاب ہوئے؟ ہر فریق کو اپنے دل سے دریافت کرنا چاہیے۔ اہلِ حق کی کوششوں کا اندازہ ان اصولِ تفسیر سے ہوگا، جو قرآن فہمی کے لیے ہمیشہ ان کے پیشِ نظر رہے۔

محدثانہ تفاسیر میں بدعات اور غلو تو نہیں تھا، لیکن قصص کے بیان میں صحتِ اسانید کا خیال نہ رکھا گیا اور آثار میں اسرائیلیات کا کافی ذخیرہ تفاسیر میں آ گیا۔ حافظ ابن کثیر نسبتاً محتاط ہیں، کافی چھان پھٹک کے باوجود وہاں بھی ایسے آثار آ گئے، جو مناسب تھا کہ نہ آتے۔

اہلِ بدعت کی ان تخریبی کوششوں سے بچنے کے لیے ائمہ سنت نے ذیل کے اصول اختیار فرمائے:

اول: قرآنِ عزیز کی تفسیر قرآن سے۔ حافظ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں اکثر مقامات پر التزام فرمایا ہے کہ قرآن کے ایک مقام کو دوسرے مقام سے حل فرماتے ہیں۔ قرآنِ عزیز کے نظم میں کسی واقعہ میں ایک مقام پر اختصار فرمایا گیا تو دوسرے مقام پر اسے تفصیل سے بیان فرما دیا گیا ہے۔ اگر ایک مقام پر اِغلاق ہو تو دوسرے مقام سے واضح ہو سکتا ہے، اس طریق سے اگر قرآنِ حکیم میں غور فرمایا جائے تو بسا اوقات بعض مشکلات کا حل سیاق و سباق سے اس طرح ہوتا ہے کہ صریح لغت سے وہ مقام صاف نہیں ہوتا، اسی سے بعض اہلِ علم نے قرآن کا لغت بھی الگ لکھا ہے، جیسے کہ راغب کی مفردات اور ابن قتیبہ دینوری کی مشکل القرآن اور غریب القرآن؛ ان دونوں کتابوں کو ابن مطرف [۳۸۷۔۴۵۴ھ] نے ''القرطین'' کے نام سے جمع کیا ہے۔ یہ کتاب مصر سے شائع ہو چکی ہے۔

← کے مطالب کی حفاظت ہو سکے۔ تفاسیر کے ذخیرے پر غور کیا جائے تو ظاہر ہوتا ہے کہ اہلِ علم کے ہر طبقے نے اپنے نقطۂ نظر سے اس خدمت کو بجا لانے کی کوشش کی ہے۔ اہلِ سنت کے مختلف مکاتبِ فکر نے قرآنِ عزیز کی خدمت کی ہے۔ فقہی مسائل میں اپنے مسلک کے مطابق قرآنِ عزیز سے استدلال کیا ہے، جس جس فن سے کسی کا طبعی تعلق تھا، اس فن کے لحاظ سے انھوں نے قرآن کی خدمت کی۔ زمخشری نے ادب اور زبان کے مسائل کو زیادہ اہمیت دی ہے۔ ابو حیان نحوی ہیں، انھوں نے قرآنِ عزیز کو تحلیلِ نحوی کے لحاظ سے حل کیا ہے اور اسی نہج سے مسائل کا استخراج فرمایا ہے۔ زمخشری کا رجحان اعتزال کی طرف ہے، اس لیے انھوں نے بقدرِ ضرورت اعتزال کی خدمت بھی کی ہے۔ رازی پر فلسفہ اور کلام غالب ہے، ان کی تفسیر میں یہ رجحانات پائے جاتے ہیں۔ قرطبی حنبلی رحمہ اللہ ہیں، انھوں نے فقہ حنبلی کے مسائل سے تفسیر کو بھر دیا۔ ائمہ حدیث سے حافظ ابن جریر رحمہ اللہ اور حافظ ابو الفداء نے تفسیریں لکھیں، اسی طرح بغوی نے ''معالم التنزیل'' تصنیف فرمائی۔ وغیرہم نے احادیث اور آثار سے تفسیر کی۔ فنی خدمت میں کوئی حرج نہ تھا، لیکن اعتزال وغیرہ بدعی عقائد کی حمایت مناسب نہ تھی، اسی طرح شیعہ اور خوارج نے قرآنِ مجید کو اپنے خیالات کا ترجمان بنانے کی کوشش کی۔ بعض بدعتی صوفیوں نے قرآنِ عزیز سے اپنی بدعات کا استخراج کیا۔ وللناس فیما یعشقون مذاھب! (مختصر أصول تفسیر) [مولف]

بعض مفرد الفاظ کا مفہوم قرآن کے سیاق و سباق سے زیادہ واضح ہوتا ہے، لغت میں وہ وضاحت نہیں ملتی، مثلاً:

نور: عربی زبان میں یہ لفظ ''الضياء المنتشر'' کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ قرآنِ عزیز نے اسے مختلف مقاصد کے لیے استعمال فرمایا ہے:

1 ﴿اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ... الخ﴾۔ قرآن نے اس سے نورِ ہدایت مراد لیا ہے، یعنی آسمان اور زمین میں ہدایت کی روشنی اللہ کی ذات سے ہے۔ اس ہدایت کی مثال ایسے چراغ کی ہے، جس کی روشنی کو شفاف شیشے نے دوبالا کیا ہو اور ایسا ستھرا اور صاف تیل جلایا گیا ہو اور یہ چراغ ستاروں کی طرح آسمان کے مختلف کناروں میں چمک رہا ہو۔

2 ﴿قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ﴾ [المائدة: ١٥] یہاں نور سے مراد کتاب ہے، کیوں کہ اس کے آگے ﴿يَهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ﴾ میں ضمیر مجرور مفرد کا مرجع یا نور ہوگا یا کتاب، دو تو ہو نہیں سکتے، کیوں کہ ضمیر تثنیہ نہیں۔ اگر نور سے مراد آنحضرت ﷺ ہوں تو آنحضرت ﷺ کو کتاب سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ کتاب کو نور اور نور کو کتاب سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، اس لیے ضمیر مجرور مفرد کا مطلب اسی صورت میں درست ہوسکتا ہے کہ نور سے مراد کتاب لی جائے۔ آنحضرت ﷺ کا ذکر مبارک شروع میں بھی آ گیا ہے:

﴿يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتٰبِ﴾ [المائدة: ١٥]

''اے اہلِ کتاب! تمھارے پاس ہمارا رسول آیا، جو ایسی چیزیں ظاہر کرتا ہے، جو تم نے کتاب سے چھپا رکھی ہیں۔''

یہاں کتاب مراد لینے میں ایک گونہ تخصیص ہوگئی۔

3 ﴿اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ﴾ [البقرة: ٢٥٦]

''اللہ اہلِ ایمان کا دوست ہے، وہ انھیں اندھیرے سے روشنی میں لے آتا ہے۔''

یہاں نور سے ایمان مراد ہے۔ ظلمات سے کفر و نفاق کی ظلمت ہے۔

4 ﴿فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَ عَزَّرُوْهُ وَ نَصَرُوْهُ وَ اتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ [الأعراف: ١٥٧]

''جو لوگ آپ پر ایمان لائے، آپ کی مدد کی اور اس نور کی پیروی کی جو آپ پر اتارا گیا، یہی لوگ کامیاب ہیں۔''

اس آیت میں میں جمیع ما انزل اللہ کو نور سے تعبیر فرمایا گیا ہے، اس میں قرآن، سنت سب شامل ہیں۔ الہام، غیبی آواز، فرشتوں کی معرفت نزولِ وحی؛ سب کو نور سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ قرآنِ عزیز نے وحی کی اقسامِ ثلاثہ کو ذکر فرما کر آخر میں آنحضرت ﷺ کو مخاطب فرما کر واضح فرمایا:

﴿وَ كَذٰلِكَ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا﴾ [الشوریٰ: ٥٢]

''ہم نے اسی طرح آپ کی طرف وحی کو نازل فرمایا۔''

5 ﴿اَوَ مَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَ جَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا﴾ [الأنعام: ١٢٢]

''کیا جس شخص کو موت کے بعد ہم نے زندگی دی ہو اور اسے نور بخشا، جسے لے کر وہ لوگوں میں پھر رہا ہو، وہ اس آدمی کی طرح ہے، جسے اندھیروں سے نکلنے کی توفیق ہی نہیں۔''

اس آیت میں ایک مسلمان کی تبلیغی مساعی کو نور سے تعبیر کیا گیا ہے۔

6 ﴿اِنَّاۤ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّ نُوْرٌ﴾ [المائدۃ: ٤٤]

''ہم نے تورات کو اُتارا اس میں ہدایت اور نور ہے۔''

﴿وَ اٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ فِيْهِ هُدًى وَّ نُوْرٌ﴾ [المائدۃ: ٤٤]

''ہم نے مسیح کو انجیل دی اس میں ہدایت اور نور ہے۔''

اس آیت میں تورات اور انجیل کی روشن تعلیمات کو ہدایت اور نور سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔

7 ﴿يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَ بِاَيْمَانِهِمْ﴾ [الحدید: ١٢]

''جب کہ مومن مردوں اور عورتوں کا نورِ ایمان ان کے سامنے اور ان کی دائیں جانب روشنی کر رہا ہوگا۔''

ایمان اور عملِ صالح سے اہلِ ایمان میں جو استعداد پیدا ہوگی، اس کی وجہ سے قیامت کے اہوال و شدائد سے بآسانی عہدہ برآ ہوں گے۔ اس استعداد کو نور سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔

الشهود والشهادة: لغوی معنی ''الإخبار بما شاهده'' (لسان العرب)[1] ''الحضور مع المشاهدة'' (مفرداتِ راغب)[2] جو دیکھنا بتانا۔ قرآنِ عزیز میں فرمایا:

1 ﴿عٰلِمِ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ﴾ [التوبة: ٩٤] ''حاضر اور غائب کا جاننے والا۔''

---

(1) لسان العرب (٣/ ٢٣٨)

(2) المفردات (ص: ٢٦٧)

2 ﴿وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآئِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ [النور: ٢]

''زانی زانیہ کی سزا کے وقت اہلِ ایمان کا ایک گروہ موجود رہے۔''

3 ﴿اَشَهِدُوا خَلْقَهُمْ﴾ [الزخرف: ١٩] ''کیا وہ ان کی پیدائش کے وقت موجود تھے؟''

4 ﴿وَ اَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ﴾ [البقرة: ٨٤] ''اور تم جانتے ہو۔''

5 ﴿وَ لَا يَاْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا﴾ [البقرة: ٢٨٢]

''گواہوں کو جب بلایا جائے تو انکار نہ کریں۔''

6 ﴿شَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا﴾ [یوسف: ٢٦]

''اس کے عزیزوں سے ایک (لڑکے) نے فیصلہ کیا۔''

(حکم یا قضا) یہاں متعارف شہادت بن ہی نہیں سکتا۔

7 ﴿وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ شُهَدَآءُ اِلَّآ اَنْفُسُهُمْ فَشَهَادَةُ اَحَدِهِمْ اَرْبَعُ شَهٰدٰتٍۭ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ﴾ [النور: ٦]

''خاوند کے پاس اپنے ذاتی اقرار کے سوا کوئی ثبوت نہ ہو تو وہ چار قسمیں کھائے کہ وہ سچا ہے۔''

یہاں شہادت اقرار اور قسم کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

8 ﴿وَ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَ ادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾ [البقرة: ٢٣]

''اگر تمھیں شبہہ ہے کہ ہم نے جو کچھ اپنے بندے پر اُتارا ہے، وہ خدا کا کام نہیں تو تم ایسی ایک سورت لے آؤ اور اپنے سب مددگاروں کو بلا لو۔''

اس آیت میں شہادت نصرت اور اعانت کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

9 ﴿فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ لَشَهَادَتُنَآ اَحَقُّ مِنْ شَهَادَتِهِمَا﴾ [المائدة: ١٠٧]

''ہماری قسمیں ان کی قسموں سے زیادہ قابلِ قبول ہیں۔

یہاں شہادت قسم کے معنی میں ہے۔

10 ﴿كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا﴾ [النساء: ٧٩] ''اللہ کا علم کافی ہے۔''

یہاں شہید عالم کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

11 ﴿وَ نَزَعْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا﴾ [القصص: ٧٥]

''ہر امت سے ہم ایسا آدمی لائیں گے، جو اُن کے حالات کو جانتا ہوگا۔''

دونوں مقام پر شہید علیم کے معنی میں مستعمل ہے: ''علیما یعلم أحوالھم''

مقصود استیعاب نہیں، فقط اس چیز کا اظہار ہے کہ الفاظ کے مفہوم کی تعیین میں لغت سے زیادہ خود قرآنِ عزیز کا سیاق وسباق مفید اور کارآمد ہے۔ بسا اوقات لغوی معنی مقصد کو بگاڑ کر رکھ دیتا ہے۔ حضرت مولانا ثناء اللہ صاحب مرحوم (۱۹۴۸ء) مولف تفسیر ثنائی نے ''تفسیر القرآن بکلام الرحمن'' اسی اسلوب پر لکھی اور آیات کی وضاحت اور تفسیر میں دوسری آیات سے استفادہ فرمایا۔ مرحوم اس طریق میں بہت حد تک کامیاب ہوئے۔ چند مقامات پر اہلِ علم نے اپنے مواخذات کیے۔ مولف مرحوم نے اہلِ علم کے متعارف مطلب سے اختلاف فرمایا۔ بحث، جدال کی حد تک پہنچی۔ علمائے آرہ نے فیصلہ دیا کہ بعض مقامات میں واقعی سلف کی راہ سے انحراف ہوا ہے، لیکن مولف اہلِ حدیث سے خارج نہیں۔ اس فیصلے کو قبول کر کے معاملہ ختم کر دیا جاتا تو بہتر تھا، لیکن فریقِ مخالف نے احناف کو اپنے ساتھ رکھنے کے لیے ان مواخذات میں مسئلہ صفات اور ان کی تاویل کو اہمیت نہ دی تاکہ ماتریدی حنفی الگ نہ ہو جائیں اور مخالفین کی صفیں عددی لحاظ سے کمزور نظر نہ آئیں، لیکن اصول اور مسلک اہلِ حدیث کے لحاظ سے یہ پہلی کمزوری تھی، جس سے مولانا مرحوم ایسا دور اندیش نکتہ رس مناظر خوب آگاہ تھا، اس لیے ان کا ذہن اس طرف منتقل ہوگیا کہ خلوص کے بجائے مقارنت اور رقابت کو اس نزاع میں زیادہ دخل ہے۔

بحث ونظر میں تاویل بھی امت میں اہلِ علم کا ایک مسلک رہا ہے۔ وہ کچھ عرصہ اپنی روش میں مطمئن رہے، لیکن آخر عمر میں ان کا ذہن تاویل پر مطمئن نہیں رہا تھا، وہ درس میں اور مجلسی گفتگو میں تفویض ہی کو پسند فرماتے تھے۔ اگر یہ مناقشہ نہ آجاتا تو تفسیر القرآن بالجملہ اچھی چیز تھی۔ اہلِ علم قرآن پر اس انداز سے غور فرماتے تو تفسیر میں یہ ایک نئے باب کا افتتاح ہوتا۔ اب بھی ضرورت ہے کہ قرآن کے طالب علم قرآن میں اس انداز سے غور کریں۔ ذوقِ سلیم اس راہ میں بے حد لطف محسوس کرے گا۔ دین، شکر، حمد، اسلام، کلمہ وغیرہ الفاظ کے استعمال کو قرآنِ عزیز کے مختلف مقامات میں دیکھیے تو تحقیق وتفحص کے ذوق کو اس میں کافی لطف محسوس ہوگا۔

تفسیر کا دوسرا اصل سنت ہے۔ یہ لفظ عموماً تین معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ایسے اعمال جو ابتدائے اسلام سے بتواتر مسلمانوں میں رائج ہیں۔ نماز، اس کے اذکار، رکعات اور اوقاتِ نماز، نفل روزے اور صدقات، اچھے کاموں میں دائیں ہاتھ کا استعمال، گندے کاموں میں بائیں ہاتھ کا استعمال، اہلِ سنت والجماعت کی لغت میں سنت اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔

آنحضرت ﷺ کا قول، فعل، کسی کام پر آنحضرت ﷺ کی خاموشی، آنحضرت ﷺ کے اجتہادات؛ یہ سب سنت ہیں۔ ائمہ حدیث اسے حدیث سے تعبیر فرماتے ہیں۔ فنِ حدیث میں سنتِ نبوی اور حدیث کو اہلِ علم

نے مرادف اور ہم معنی استعمال فرمایا ہے۔

دینی امور جنھیں آنحضرت ﷺ نے ثواب کی نیت سے عموماً کیا ہے یا صحابہ نے اسے دینی معمولات کے طور پر کیا ہو، ایسے اعمال اگر احیاناً ترک ہوجائیں تو اصل سنت میں کوئی شبہہ نہیں ہوتا۔ فرض، واجب، مستحب کے ساتھ جب سنت کا ذکر آتا ہے تو اس کا یہی مطلب ہوتا ہے۔

قرآنِ عزیز کی تفسیر میں سنت سب سے بڑا اصل ہے۔ آنحضرت ﷺ کا قول، فعل، تقریر وغیرہ سب قرآن کی تفسیر ہیں۔ آنحضرت ﷺ قرآنِ حکیم کے پہلے مخاطب تھے۔ آنحضرت ہی کی معرفت قرآنِ عزیز صحابہ تک پہنچا اور صحابہ نے اس کا متن اور مفہوم ہم تک پہنچایا۔ آنحضرت ﷺ قرآن نہ سمجھیں یا پیغمبر ہی اللہ تعالیٰ کے ارشادات کی مخالفت کرے تو قرآنِ عزیز کی تبلیغ و اشاعت کے سارے امکانات بھی ختم ہوجائیں۔

صحابہ رضی اللہ عنہم جب دینی مسائل میں گفتگو فرماتے تو بلا تکلف ایک دوسرے سے دلیل دریافت فرماتے تھے۔ قرآن اور سنت کی طرف رجوع فرماتے، لیکن ایسا واقعہ کبھی نہیں ہوا کہ کسی نے آنحضرت ﷺ سے دلیل دریافت کی ہو یا حضرت کے کسی ارشاد پر کسی سائل کو تردد ہوا ہو:

﴿وَ مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّ لَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ﴾ [الأحزاب: ٣٦]

”کسی مومن مرد اور عورت کو یہ حق نہیں کہ آنحضرت کے فیصلے یا حکم کے بعد اپنی صوابدید کو ترجیح دے۔“

ظاہر ہے یہاں قضا کا قانونی اور عدالتی مفہوم مراد نہیں، بلکہ آنحضرت ﷺ کے رسمی فیصلے ہیں، جو آپ نزاعی امور میں فرماتے تھے۔ صحابہ آنحضرت ﷺ کے ارشادات کو قرآنِ عزیز کی طرح حجتِ شرعی سمجھتے تھے، اس لیے مزید دلیل یا حوالہ طلب کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے تھے۔ قرآنِ عزیز کی تفسیر میں بھی آنحضرت ﷺ کے ارشادات کا یہی حال ہے، اس لیے سنت کے ساتھ تفسیر اسی طرح مستند ہے، جس طرح تفسیر القرآن بالقرآن۔

قرآنِ عزیز میں ایسی صراحت ملتی ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کو قرآنِ عزیز کے بیان کا حق حاصل ہے، بلکہ اسی قسم کی وضاحت اور بیان آنحضرت ﷺ کے ذمے فرض ہے اور تبلیغ کا ایک اہم جزو:

﴿اِنَّاۤ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَاۤ اَرٰىكَ اللّٰهُ وَ لَا تَكُنْ لِّلْخَآىِٕنِيْنَ خَصِيْمًا﴾ [النساء: ١٠٥]

”ہم نے آپ کی طرف قرآن اس لیے اتارا کہ آپ اپنی صوابدید کے مطابق لوگوں میں فیصلے فرما دیں اور خیانت پیشہ لوگوں کی طرف سے آپ خصومت کے وکیل نہیں۔“

قرآنِ حکیم کے آپ پر نزول کی وجہ یہ بتائی ہے کہ آپ کی رائے اور صوابدید قرآنِ عزیز کی تفسیر میں حکم کی حیثیت رکھتی ہے، اس مقامِ رفیع پر فائز ہونے کے بعد اہلِ خیانت کی طرف سے خصومت اور وکالت کا سوال نہیں پیدا ہونا چاہیے۔

﴿وَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ بِالْبَيِّنٰتِ وَ الزُّبُرِ وَ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ﴾ [النحل: ٤٣۔ ٤٤]

''ہم نے تم سے پہلے تمام انبیا کو مرد پیدا کیا اور اُن کی طرف وحی کی، اگر اس کے دلائل معلوم نہ ہوں تو اہلِ ذکر سے دریافت کرو اور ذکر تم پر نازل کرنے کا ایک مقصد یہ ہے کہ اس کی تفصیل اور تشریح کرو، دوسرا مقصد یہ ہے کہ یہ لوگ بھی سوچ بچار کی عادت سیکھیں اور فکر وشعور کو اپنا شعار بنائیں۔''

﴿وَ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي اخْتَلَفُوْا فِيْهِ وَ هُدًى وَّ رَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ﴾ [النحل: ٦٤]

''ہم نے کتاب کو تم پر صرف اس لیے اتارا کہ آپ ان کے سامنے اختلافی مسائل کو بیان کریں اور اہلِ ایمان کے لیے یہ کتاب ہدایت اور رحمت ہے۔''

اس آیت میں حصر کے ساتھ فرمایا ہے کہ رفعِ اختلاف صرف آنحضرت ﷺ کے بیان سے ہو سکتا ہے اور اہلِ ایمان آپ کے ہی بیان سے ہدایت و رحمت کی بارش سے سرشار ہو سکتے ہیں۔ قرآنِ عزیز صرف آنحضرت ﷺ کے بیان (حدیث) ہی کو رفعِ اختلاف کا موجب فرماتا ہے۔ آج منکرینِ سنت کا خیال ہے کہ آنحضرت ﷺ کا بیان ہی اختلاف کا موجب ہے۔ روحِ قرآن کے ساتھ کتنی کھلی جنگ ہے؟!

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ يَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّ نَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَّ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ۝ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا وَ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا﴾ [النساء: ١٥٠۔ ١٥١]

''جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں سے کفر کرتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسولوں میں تفریق کرنا چاہتے ہیں کہ ہم بعض پر ایمان لاتے ہیں اور بعض سے کفر کرتے ہیں اور خدا اور رسولوں کے بین بین کوئی راہ تلاش کرنا چاہتے ہیں (خدا کی بات کو قبول کرنا رسول کی بات کو صحیح نہ سمجھنا) یہ لوگ یقیناً

کفر نواز ہیں اور ایسے اہلِ کفر کے لیے ہم نے ذلت آمیز عذاب تیار کیا ہے۔"

سورت نساء کی اس آیت میں معاملے کو بہت نکھار دیا گیا ہے۔ خدا اور رسول کی اطاعت کو جدا جدا سمجھنا اسے اللہ اور رسول دونوں سے کفر اور انکار کے مرادف قرار دیا گیا ہے۔ راہیں صرف دو ہیں: یا اللہ اور رسول دونوں کی اطاعت قبول کرو یا دونوں سے انکار کر دو، ان دونوں کے بین بین کوئی راستہ نہیں۔ خدا کی اطاعت کرے، رسول ﷺ کے ارشادات کی حجیت سے انکار کرے، یہ قطعی ایمان کی راہ نہیں، بلکہ یہ حتمی کفر ہے۔ ایسے غلط کار اور کفر پرور لوگ خدا کے نزدیک ذلیل کن عذاب کے مستحق ہیں۔

ان آیات سے قرآن کا مقام، آنحضرت ﷺ کا مقام، قرآن اور سنت کا باہمی تعلق، خدا تعالیٰ اور آنحضرت ۔فداہ أبي و أمي۔ کے ارشادات کا باہم ارتباط، ان دونوں میں تفریق کا ایمان پر اثر اور اس تفریق کے خطرناک نتائج بالکل واضح ہیں اور سنت کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔ سنت کے متعلق یہ قرآنِ عزیز کی اپنی شہادت ہے۔

سنت محفوظ ہے یا نہیں؟ سنت کب لکھی گئی؟ سنت کی کوئی کتاب متشخص ہے یا نہیں؟ مباحث اہم ہیں اور اپنی جگہ قابلِ تحقیق ہیں، لیکن ان آیات کا مفاد یہ ہے کہ سنت کو علی التواتر موجود ہونا چاہیے۔ اگر اسے تسلیم نہ کیا جائے تو قرآن کی تبیین اور تفسیر کا مقصد پورا نہیں ہوتا، ان مشکلات کے باوجود جو انکارِ حدیث کی محرکات سے سمجھی جاتی ہیں، یہ اقرار ناگزیر ہے کہ سنت موجود ہے اور جب تک قرآن موجود ہے اور جب تک قرآن دنیا میں رہے گا، سنت کا اقرار بھی ناگزیر ہوگا۔

اس لیے قرآنِ عزیز کی تفسیر میں قرآنِ عزیز کے بعد سنت پر اعتماد واجب اور ضروری ہے اور یہی اہلِ سنت کا اصول ہے۔

صحیح احادیث:

اہلِ سنت کی مسلمہ تفاسیر میں صحیح احادیث کا ذخیرہ کچھ زیادہ نہیں، اس لیے یہ مشکل ہے کہ ہر آیت کی تفسیر میں مستند صحیح حدیث مل جائے۔ علمائے تفسیر نے احادیث کے بعد آثار اور اُن میں پھر اسرائیلیات کا بھی مواد جمع کر دیا ہے، اسے اصولِ ائمہ حدیث کے مطابق تحقیق اور تفتیش کے بعد ہی قبول کیا جا سکتا ہے۔ علمائے متقدمین کا اس معاملے میں یہی معمول رہا ہے۔ اسرائیلیات کی تائید اگر نصوص سے صحیح ہو جائے تو انھیں نصوص کی تائید سمجھنا چاہیے، ورنہ ان سے کوئی چیز ثابت کرنا یا حجت سمجھنا درست نہیں۔

تفسیرِ صحابہ:

صحابہ کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کا اتباع ان لوگوں کا مزاج بن چکا تھا۔ وہ اکثر

معاملات میں نصوصِ نبویہ کی تلاش کرتے تھے اور ان پر عمل کی کوشش کرتے تھے۔ حضرت عمر نقلِ روایات میں متشدد تھے۔ روایت پر کڑی تنقید فرماتے۔ اہلِ علم سے بوقتِ ضرورت حلف لیتے کہ آیا واقعی انھوں نے آنحضرت ﷺ سے، یہ حدیث سنی ہے۔ جو چیز شرعاً حجت ہو، اس کے متعلق یہ تثبت یقیناً ضروری ہے۔ حضرت عمر کبھی شہادت لیتے، کبھی حلف پر اعتماد فرماتے، لیکن جب حوالہ حدیث کی صحت کا یقین ہو جاتا تو اسی طرح واجب الاتباع سمجھتے، جس طرح قرآنِ عزیز پر عمل ضروری سمجھتے۔ بکیر بن اشج فرماتے ہیں:

"إن عمر بن الخطاب قال: سيأتي قوم يجادلونكم بشبهات القرآن فخذوهم بالسنن، فإن أصحاب السنن أعلم بكتاب الله" اهـ

(جامع بيان العلم وفضله لابن عبد البر: ٢/ ١٣٣)

''عن قریب بعض لوگ تم سے قرآنِ عزیز میں بعض شبہات کے متعلق گفتگو کریں گے، ان پر سنت سے گرفت کرو۔ اصحابِ سنت (اہلِ حدیث) قرآنِ مجید کو بہتر جانتے ہیں۔''

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سنت کے بہت زیادہ پابند تھے، ان کے لڑکے بلال نے اصرار کیا کہ عورتوں کو نماز کے لیے مسجد میں نہیں جانا چاہیے۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے اس جسارت کی بنا پر ان سے بولنا ترک کر دیا۔[1] حضرت عباس، عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن مسعود احادیث کے ستون اور سنت میں امام تھے۔ حضرت ابوبکر، حضرت عثمان، حضرت علی؛ ان سب کا یہی حال تھا۔ جب حدیث معلوم ہو جاتی تو پھر کسی کی رائے کو ترجیح نہیں دیتے تھے، اس لیے اگر سننِ صحیحہ مرفوعہ نہ مل سکیں تو پھر صحابہ کی تفاسیر پر اعتماد کرنا چاہیے۔ ابن مسعود فرماتے تھے:

"أولئك أصحاب محمد ﷺ كانوا أفضل هذه الأمة، أبرها قلوباً و أعمقها علماً"[2]

(مشكاة المصابيح)

''آنحضرت ﷺ کے صحابہ نہایت نیک دل تھے اور ان کا علم بہت گہرا تھا۔''

اگر صحابہ کسی تفسیر پر اتفاق فرما دیں تو پھر صحیح تفسیر وہی ہے، اگر اختلاف (گو یہ بہت ہی کم ہے) کریں تو جس کی رائے مصالح شرعیہ اور عامۃ المسلمین کے حق میں زیادہ مفید ہو، اسے قبول کرنا چاہیے۔

اقوالِ صحابہ کی حجیت کا یہی مطلب ہے کہ وہ عام حالات میں حسبِ امکان کتاب و سنت سے الگ نہیں ہوتے۔ وہ آنحضرت ﷺ کی عملی اور اعتقادی زندگی کا اخلاقی مجسمہ تھے، اس لیے تفسیر ہو یا عقائد، اخلاق ہوں یا فقہیات، وہ آنحضرت ﷺ کا نمونہ تھے، اس لیے ان کو اسی نگاہ سے دیکھنا چاہیے، لیکن اگر بالفرض صحابہ کا کوئی

---

[1] دیکھیں: مسند أحمد (٢/ ٣٦)

[2] مشكاة المصابيح (١/ ٤٢)

قول یا تفسیر قرآن وسنت صریحہ کے خلاف ہو تو ترجیح کتاب وسنت ہی کو ہوگی۔

صحابہ کے بعد تابعین کا زمانہ ہے۔ تابعین کا علم صحابہ سے ماخوذ ہے، لیکن اس زمانے میں فتنوں کا شیوع ہو چکا تھا۔ اعتقادی بدعات عام ہو رہی تھیں، علمی حلقے بھی کم وبیش متاثر تھے، علمی ثقاہت زمانہ صحابہ کی طرح نہ تھی، اس لیے اس دور کی منقولات کو وہ مقام حاصل نہیں، جو صحابہ کے آثار کو حاصل ہے۔ مشہور ائمہ تفسیر سے مجاہد بن جبر، سعید بن جبیر، عکرمہ مولیٰ ابن عباس، عطا بن ابی رباح، حسن بصری، سعید بن مسیب، مسروق بن اجدع، ربیع بن انس، ابو العالیہ، قتادہ بن دعامہ اور ابوضحاک بن مزاحم وغیرہ ہیں۔ مجاہد فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت ابن عباس سے تین دفعہ پورا قرآنِ عزیز پڑھا، ہر آیت کے متعلق دریافت کیا،[1] پھر جو سنا بوقتِ ضرورت اسے لکھا، تاکہ علم کا سلسلہ چلتا رہے۔ اس کے باوجود ان بزرگوں کا وہ مقام نہیں، جو صحابہ کو حاصل تھا۔ شعبہ بن حجاج فرماتے ہیں:

"أقوال التابعين في الفروع ليست حجة فكيف تكون حجة في التفسير؟ يعني أنها لا تكون حجة على غيرهم ممن خالفهم، وهذا صحيح، أما إذا أجمعوا على الشيئ فلا يرتاب في كونه حجة، فإن اختلفوا فلا يكون قول بعضهم حجة على بعض، ولا على من بعدهم، ويرجع في ذلك إلى لغة القرآن أو السنة أو عموم لغة العرب أو أقوال الصحابة" اهـ (أصول التفسير لابن تيمية، ص: ٢٩)

"تابعین کے اقوال جب فروعِ فقہیہ میں حجت نہیں تو تفسیر میں کیسے حجت ہوں گے؟ یہ بصورتِ خلاف نہ باہم حجت ہوں گے نہ کسی دوسرے پر۔ شعبہ کا یہ خیال بالکل درست ہے، لیکن اگر وہ کسی بات پر اجماع فرما لیں تو اجماع کی حیثیت شرعاً معلوم ہے، ان میں اختلاف کی صورت ہو تو قرآن کی لغت، عام لغتِ عرب اور اقوالِ صحابہ کی طرف رجوع کیا جائے گا۔"

اختلاف کی نوعیت:

یہ عجیب بات ہے کہ احادیثِ صحیحہ میں اختلاف بالکل نہیں اور جو بظاہر معلوم ہوتا ہے، اس میں ادنیٰ تامل کے ساتھ ترجیح اور تطبیق کی صورت نکل آتی ہے۔ تفسیری اختلاف بھی فقہی اور فرعی اختلاف کی طرح اس میں صرف تنوع ہے۔ اختلاف کی نوعیت راجح اور مرجوح، مباح اور مستحب سے زیادہ نہیں، جیسے ائمہ اربعہ اور فقہاے محدثین رحمہم اللہ میں پایا جاتا ہے۔ اہلِ بدعت کی طرح اس میں انکار وتکفیر کی نوبت نہیں آتی۔

[1] سير أعلام النبلاء (٤/ ٤٥١)

صحابہ کی تفسیر کا بھی یہی حال ہے، عموماً وہاں مختلف اقوال میں تنوع ہوتا ہے۔ عام آدمی اسے اختلاف سمجھتا ہے، دراصل وہاں آیت میں مختلف احتمالات ہوتے ہیں، جن سے استخراجِ مسائل میں وسعت ہوتی ہے اور فکر و نظر کے لیے راہیں کھلتی ہیں۔

خلاصہ کلام:

آخر میں ہم شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے ایک جامع بیان پر اس بحث کو ختم کرتے ہیں۔

شیخ فرماتے ہیں:

''اگر کوئی سوال کرے کہ تفسیر کا بہترین طریقہ کون سا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ سب سے بہتر طریقہ تو یہ ہے کہ قرآن کی تفسیر قرآن ہی سے کی جائے۔ قرآن مجید میں ایک مقام پر جو چیز مجمل ہے، وہ دوسرے مقام پر مفصل موجود ہے۔ ایک جگہ جو مسئلہ مختصر ہے، دوسری جگہ اسے بسط سے بیان کر دیا گیا ہے۔ اگر اس طریق میں دقت محسوس ہو تو پھر سنت سے تفسیر کرو، وہ اس کی شارح ہے۔

امام محمد بن ادریس شافعی فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کے تمام احکام قرآن ہی سے ماخوذ ہیں، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ وَ لَا تَكُنْ لِّلْخَآئِنِيْنَ خَصِيْمًا﴾ [النساء: ۱۰۵]

''ہم نے تم پر کتاب کو اس لیے اتارا، تاکہ آپ لوگوں میں اپنی سمجھ کے مطابق حکم کریں اور خیانت پیشہ لوگوں کی طرف سے بحث نہ کریں۔''

﴿وَ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ﴾ [النحل: ٤٤]

''ہم نے آپ کی طرف قرآن اس لیے اُتارا، تاکہ جو کچھ آپ پر اُتارا گیا ہے، آپ لوگوں سے بیان کریں، تاکہ لوگ سوچیں۔''

﴿وَ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي اخْتَلَفُوْا فِيْهِ وَ هُدًى وَّ رَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ﴾ [النحل: ٦٤]

''ہم نے آپ پر صرف اس لیے کتاب کو اتارا کہ آپ لوگوں کے لیے اختلاف میں وضاحت فرما دیں اور اہلِ ایمان کے لیے اس کتاب میں ہدایت اور رحمت ہے۔''

نیز آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

’’مجھے قرآن بھی دیا گیا ہے اور اس کی مثل اس کے ساتھ دی گئی۔‘‘[1] یعنی سنت، اور سنت آپ پر قرآن کی طرح بذریعہ وحی اُترتی تھی، لیکن قرآن کی تلاوت کی جاتی اور سنت کی تلاوت نہیں کی جاتی۔ امام شافعی اور بعض دوسرے ائمہ نے اس موضوع پر مدلل گفتگو فرمائی ہے، جس کی تفصیل کے لیے یہ موقع نہیں۔

’’غرض یہ ہے کہ آپ کو قرآنِ عزیز کی تفسیر قرآن ہی سے تلاش کرنا چاہیے۔ اگر قرآن میں آپ کو نہ ملے تو اسے سنت سے تلاش فرمائیں، جیسے آنحضرت ﷺ نے جب حضرت معاذ کو یمن بھیجا تو فرمایا کہ تم کس طرح حکم کرو گے؟ معاذ نے فرمایا: اللہ کی کتاب کے ساتھ۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: اگر کتاب اللہ میں وہ حکم نہ ملے؟ تو معاذ نے فرمایا: میں اللہ کے رسول کی سنت سے فیصلہ کروں گا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: اگر وہاں نہ ملے؟ فرمایا: میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا۔ آنحضرت ﷺ نے معاذ کے سینے پر تھپکی دی اور فرمایا: الحمد للہ! اللہ تعالیٰ نے اس کے رسول کے فرستادہ کو رسول کی صوابدید کے مطابق فیصلے کی توفیق مرحمت فرمائی۔[2] یہ سنن اور مسانید میں متعدد اسانید سے مروی ہے۔

’’اس وقت ہم اگر تفسیر کو قرآن اور سنت میں نہ پائیں تو ہم اقوالِ صحابہ کی طرف رجوع کریں گے، کیوں کہ انھوں نے قرآن اور اس ماحول کا مشاہدہ کیا، جن حالات اور جس ماحول میں قرآن نازل ہوا، اور اس لیے کہ ان کا فہم کامل ہے اور علم صحیح، خصوصاً ان میں سے اکابر اہلِ علم اور ائمہ اربعہ، یعنی خلفائے راشدین اور دوسرے ائمہ ہدی رضی اللہ عنہم جیسے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ۔‘‘ (مقدمہ اصولِ تفسیر، ص: ۲۴۔ ۲۵)

لغتِ عرب:

قرآن، سنت، آثارِ صحابہ اور سلف کے علوم عموماً عربی زبان میں ہیں، اس لیے مفسر کے لیے عربی زبان کا جاننا ضروری ہے، لیکن زبان کی وسعت، اس میں حقیقت، مجاز، استعارات، تشبیہات، کنایات کے پائے جانے کی وجہ سے الفاظ کی دلالت میں ظن کی سی کیفیت پائی جاتی ہے، اس لیے یہ قطعی فیصلہ کرنا کہ لفظ سے جو معنی ہم مراد لے رہے ہیں، فی الحقیقت متکلم کا مقصود یہی ہے، استعارات میں تنوع، تشبیہات میں مختلف اسالیب اور کنایات اور اُن کے عقلی اور عادی لوازم کے ساتھ ربط، اس میں اس قدر ابہام ہے کہ کسی لفظ سے اس کی حقیقی مراد کے

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٦٠٤)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٥٩٢) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٣٢٧) امام ترمذی فرماتے ہیں: "وليس إسناده عندي بمتصل" نیز امام بخاری فرماتے ہیں: "لا يصح، ولا يعرف إلا بهذا، مرسل" دیگر ائمہ حدیث نے بھی اس حدیث کو ساقط اور منکر قرار دیا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٨٨١)

متعلق حتمی فیصلہ کرنا کافی مشکل ہے، پھر ائمہ لغت کی یہ عادت ہے کہ وہ تمام مستعمل معانی کو جمع کر دیتے ہیں اور حقیقی معنی میں امتیاز نہیں کرتے، اس لیے لغت کا پورا کارخانہ از اول تا آخر ظنی ہے۔

پھر ائمہ لغت نے جو معانی نقل کیے ہیں، ان کی کوئی سند نہیں۔ اصمعی، ابن الانباری، مبرد، جاحظ، زمخشری؛ یہ ائمہ لغت اپنا اپنا سماع نقل فرما دیتے ہیں، لیکن ان کے پاس کوئی سند نہیں، جس پر ضرورت کے وقت تنقید کی جا سکے اور غلط اور صحیح میں امتیاز کیا جا سکے۔ ائمہ لغت کی اسانید ائمہ حدیث کی اسانید سے کہیں زیادہ کمزور اور ناقابلِ وثوق ہیں۔

پھر لغت کے تغیرات اور محاورات میں صبح اور شام کی تبدیلیوں نے دال اور مدلول کی حیثیت سے شکوک و اوہام کی اور بھی کئی راہیں کھول دی ہیں، اس لیے لغت کو کتاب و سنت کی صف میں کھڑا کرنا مشکل ہے۔ اگر ائمہ لغت کی تصریحات کہیں منقولاتِ شرعیہ سے ٹکرا جائیں تو ترجیح منقولاتِ شرعیہ کو ہوگی۔

یوں بھی آنحضرت ﷺ اور آپ کے صحابہ کبار لغتِ عربی کو آج کے مجتہدین سے بہت بہتر سمجھتے تھے، اس لیے بلحاظِ لغت بھی تقدم ان حضرات کو حاصل ہوگا۔ ائمہ لغت میں تقویٰ اور صلاح کی وہ کیفیت نہیں، جو فقہا اور محدثین میں پائی جاتی تھی۔ زمخشری اور جاحظ ایسے لوگ لغت اور ادب میں امام شمار ہوتے ہیں، لیکن علم دیانت کی محفلوں میں ان کی قیمت دو کوڑی بھی نہیں، اس لیے لغت کے نقل میں وہ احتیاط ملحوظ نہیں رہی، جو نقل روایات میں ملحوظ رہی۔

غرض علومِ لغت کی انتہائی اہمیت کے باوجود انھیں علومِ سنت کا مد مقابل نہیں تصور کیا جا سکتا۔ جن حضرات کو اخبارِ آحاد سے گھبراہٹ اور تکلیف محسوس ہوتی ہے، انھیں سوچنا چاہیے کہ لغت تو شکوک و اوہام کا سمندر ہے، اسے وہ کیسے گوارا کر سکیں گے؟ پھر لغت کا انحصار تمام تر سماع اور تقلید پر ہے۔ جن حضرات کی جھوٹی پیاس اور ہوسِ استسقا دفاترِ سنت سے پوری نہیں ہو پاتی، لغت کے مکدر چشمے انھیں کیوں کر سیراب کر سکیں گے؟ لغت کی ساخت، اس پر ظروف و احوال کا اثر اور اس کی نقل غیر موثق ذرائع کے ہوتے ہوئے وہ کسی طرح سنت اور آثارِ سلف کی حریف اور رقیب بننے کی اہل نہیں۔ یہ دعویٰ آج کل علمی طور پر پسماندہ دور ہی میں کیا گیا ہے، ورنہ زمخشری اور جاحظ، پھر ان کے بعد ائمہ اعتزال و تجہم نے بعض احادیث پر تنقید کی جرأت تو شاید کی ہو، لیکن انکارِ حدیث کا حوصلہ ان حضرات کو کبھی نہیں ہوا۔ یہ حوصلہ ہمارے دور کے جہلاے عظام کو ہوا۔ وذلك لقلة العلم وكثرة الممارسة بينابيع الجهل والاقتداء بجهلاء أوربا.

تجوید:

فنِ تجوید نے قرآن کے الفاظ کی صحت میں بے حد مدد دی ہے۔ معلوم ہے کہ قرآن کو درست پڑھنا

شرعاً ضروری ہے، اس لیے فنِ تجوید سے استغنا کی بھی کوئی صورت نہیں۔ فنِ تجوید کا اصل مقصد الفاظ، ان کے مخارج کی صحت اور صفاتِ حروف اور ان کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے، لیکن مشکل یہ ہے گانا اور مخارج میں بلاوجہ تکلف تجوید کا جز بن گیا۔ قاری کا تلفظ صحیح نہ ہو، لیکن اس کی لَے اچھی، یعنی باندازِ غنا اور موسیقی ہو تو اسے زیادہ پسند کیا جاتا ہے۔ آج کل جس قدر غلطی غیر مجود قاری کرتا ہے، اسی قدر مجود قاری قرآنِ عزیز کو خراب کرتے ہیں۔ عام قاری الفاظ کے مخارج، اظہار، اخفا، وقف اور ابتدا میں غلطی کھاتے ہیں، لیکن مجود قاری الفاظ کے زیر و بم اور اسے موسیقی کی تانوں میں لے جا کر قرآن کی بے ادبی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اس میں اعتدال کی ضرورت ہے۔ قرآن مجید صحیح طور پر پڑھا جائے، اس کے مخارج درست ہوں، لیکن اسے قوالی اور راگ کا انداز نہیں بنانا چاہیے۔ وكان بين ذلك قواماً.

حضرت حذیفہ سے مروی ہے:

«اقرأوا القرآن بلحون العرب وأصواتها، وإياكم ولحون أهل الكتابين وأهل الفسق، فإنه سيجيئ بعدي قوم يرجّعون القرآن ترجيع الغناء والرهبانية والنوح، لا يجاوز حناجرهم، مفتونة قلوبهم وقلوب من يعجبه شأنهم»[1] اهـ

(الجامع الصغير و فيض القدير: ٢/ ٦٥)

''قرآن کو عرب کی آواز اور لہجے میں پڑھو، اہلِ کتاب اور فساق کے لہجے سے بچو، عنقریب ایسے لوگ آئیں گے، جو اسے موسیقی کی تانوں میں پڑھیں گے، نوحہ اور رہبانیت کا لہجہ پسند کریں گے۔ قرآن ان کے حلق سے نہیں اُترے گا۔ ایسے قراء اور انھیں پسند کرنے والوں کے دِل فتنے کی نذر ہو چکے ہیں۔''

یہ حدیث سند کے لحاظ سے ضعیف ہے، لیکن بہت سی صحیح احادیث میں تصنع اور تکلف کی مذمت آئی ہے۔ قرآنِ مجید میں تکلف اور بناوٹ سے منع فرمایا گیا ہے۔

اوقاف:

روزانہ گفتگو میں انسان تسلسل کو کبھی توڑ دیتا ہے، کبھی تھوڑا ٹھہر کر سلسلہ گفتگو جاری کر دیتا ہے۔ آج کل فنِ تحریر نے ترقی کی ہے، یہ مطلب کالموں سے لیا جاتا ہے۔ فقروں کو تقلیع اور تجدید کے لیے مختلف نشان دیے جاتے ہیں۔ قرآنِ مجید نثر ہے، لیکن اس کے نسق اور ترتیب، فقرات کی تقلیع اور تقسیم میں اعجاز کی شان نمایاں

[1] المعجم الأوسط (٧/ ١٨٣) امام نور الدین ہیثمی فرماتے ہیں: ''رواه الطبراني في الأوسط، وفيه راو لم يسم، وبقية أيضاً'' (مجمع الزوائد: ٧/ ٣٥٠) نیز حافظ عبدالرؤف مناوی یہ حدیث ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: ''قال ابن الجوزي في العلل: لا يصح، وأبو محمد مجهول، وبقية يروي عن الضعفاء ويدلسهم... وفي الميزان: تفرد عن أبي حصين بقية وليس بمعتمد، والخبر منكر'' (فيض القدير: ٢/ ٦٥)

ہے، ان مختلف اوقاف کو اگر ملحوظ رکھا جائے تو مطلب کی وضاحت میں بڑی مدد ملتی ہے۔ اوقاف کے نشانات اور علامات گو متاخرین نے مقرر فرمائے ہیں، لیکن طریقِ قراءت تواتر سے ہم تک آ رہا ہے، جیسے حرکات اور تشکل کی صورتیں بعد میں متعین کی گئی ہیں، لیکن حرکات کا وجود ابتدا ہی سے موجود تھا۔ اعجام اور اہمال اسی وقت سے موجود ہے، جب سے عربی زبان دنیا میں ظاہر ہوئی، لیکن جیسے جیسے خط نے ترقی کی، معجم الفاظ کے لیے نقاط کی صورت اور مقام متعین کر دیا گیا۔ اسی طرح اوقاف تو ہمیشہ سے زبان میں رہے، لیکن ان کے احکام، علامات کا تعین بوقتِ ضرورت ہوا۔ جب اس ضرورت نے فن کی صورت اختیار کی تو بعض اصطلاحات اور احکام کا اضافہ اس میں اور ہوا اور بتدریج مباحث اس میں بڑھتے رہے۔ یہ تمام مباحث عقیدے اور دین کی حیثیت تو نہیں رکھتے، لیکن عام گفتگو میں اور خاص طور پر قرآنِ عزیز میں ان کا لحاظ رکھنا بے حد ضروری ہے، ورنہ بسا اوقات معنی غلط ہو جائے گا۔ قرآنِ مجید کے مقاصد کو اس سے نقصان پہنچے گا۔ ممکن ہے بعض مقامات پر نماز پر اس کا اثر پڑے۔
صحابہ اوقاف کا لحاظ رکھتے تھے۔ سنن بیہقی میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے منقول ہے:

”لقد عشنا برهة من دهرنا، وإن أحدنا يؤتى الإيمان قبل القرآن، وتنزل السورة على محمد ﷺ فنتعلم حلالها وحرامها، وما ينبغي أن يوقف عنده منها، كما تتعلمون أنتم القرآن اليوم، ولقد رأينا اليوم رجالا يؤتى أحدهم القرآن قبل الإيمان فيقرأ ما بين فاتحته إلى خاتمته، وما يدري ما أمره وما زجره، ولا ما ينبغي أن يوقف عنده منه“[1] اهـ

”ہم نے کافی وقت گزارا، ہم کو قرآن سے پہلے ایمان دیا گیا، آنحضرت ﷺ پر سورت اترتی، ہم اس کے حلال اور حرام سیکھتے اور اس کے اوقاف معلوم کرتے۔ اب ہم ایسے لوگوں کو جانتے ہیں، جن کو قرآن ایمان سے پہلے دیا گیا، تلاوتِ قرآن کو فاتحہ سے لے کر والناس تک پڑھتے ہیں، لیکن نہ انھیں امر و نہی کا علم ہے نہ وہ اوقاف کے مواقع کو سمجھتے ہیں۔“

قال النحاس: هذا الحديث يدل على أنهم كانوا يتعلمون الأوقاف كما يتعلمون القرآن“ (الإتقان في علوم القرآن: ١/ ٣٤٢، سنن البيهقي: ٣/ ١٢٠ النشر في القراءات العشر: ١/ ٢٢٤)

”نحاس فرماتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اوقاف کا علم قرآن ہی کی طرح سیکھا جاتا تھا۔“

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ترتیل کا مطلب ہی یہ ہے کہ مخارج درست پڑھے جائیں اور اوقاف کو سمجھ کر پڑھا جائے۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے اثر سے سمجھا جاتا ہے، صحابہ کا اس امر پر اتفاق اور اجماع تھا۔ ابن الانباری

[1] المستدرك (١/ ٩١) سنن البيهقي (٣/ ١٢٠)

فرماتے ہیں کہ قرآن کی صحت کے لیے اوقاف کا جاننا ضروری ہے۔

واقعہ بھی یہی ہے کہ اس علم کے بغیر قرآن کے معانی اور اس سے مسائل کا استنباط ہی نہیں ہوسکتا۔
امام سیوطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ائمہ سلف سے یہ علم ہم تک پہنچا ہے۔ متاخرین کا خیال ہے کہ علمِ تجوید کی سند اور اجازت ہی نہیں دینی چاہیے، جب تک علمِ اوقاف کو صحیح طور پر سمجھ نہ لیا جائے۔ بعض قراء کا خیال ہے کہ وقف کسی غرض اور مقصد کے خاتمے پر ہونا چاہیے، لیکن جمہور اہلِ علم کا خیال ہے کہ وقف آیات کے خاتمے پر ہونا چاہیے:

"واتباع السنة أولیٰ، وممن ذكر ذلك الحافظ أبو بكر البيهقي في كتاب شعب الإيمان وغيره، و أرجح الوقف على رؤوس الآي، وإن تعلقت بما بعد"

(البرهان للزركشي: ١/ ٣٥٠)

"اس معاملے میں سنت کا اتباع بہتر ہے۔ حافظ بیہقی نے شعب الایمان وغیرہ کتب میں اس کا ذکر فرمایا ہے، ان کے نزدیک راجح یہی ہے کہ آیات پر ہی وقف کیا جائے، گو آیت کا تعلق مابعد کے ساتھ بھی ہو۔"

مسنون یہی ہے کہ آیات کے شروع میں وقف کیا جائے، گو نحوی تحلیل کے لحاظ سے اس کا تعلق دوسری آیت میں موجود ہو۔ حافظ ابوبکر بیہقی وغیرہ ائمہ حدیث اور ائمہ قراءت کا یہی حال ہے۔

علامہ محمد بن محمد جزری (م ۸۳۳ھ) فرماتے ہیں:

"وكان أئمتنا يوقفوننا عند كل حرف، ويشيرون إلينا فيه بالأصابع. سنة أخذوها كذلك عن شيوخهم الأولين رحمة الله عليهم أجمعين، وصح عندنا عن الشعبي وهو من أئمة التابعين علماً و فقهاً و مقتدىً أنه قال: إذا قرأت: ﴿كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ﴾ فَلَا تسكت حتى تقرأ: ﴿وَيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُوالْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ﴾ اھ

(النشر في القراء ات العشر: ١/ ٢٢٥)

"ہمارے ائمہ ہمیں ٹھہرا کر اشاروں سے اوقاف سمجھایا کرتے تھے اور یہ طریق انھوں نے اپنے سابق شیوخ رحمہم اللہ سے سیکھا تھا۔ امام شعبی جو تابعین میں علم و فقہ کے لحاظ سے امام تھے، فرماتے تھے: جب تم ﴿كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ﴾ پڑھو تو اس کے ساتھ ﴿وَيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ﴾ ملائے بغیر سکوت مت کرو (کیوں کہ معنی غلط ہوجائے گا)۔"

شیخ محمد بن محمد جزری فرماتے ہیں:

"إنما يريدون بذلك الجواز الأدائي، وهو الذي يحسن في القراءة، ويروق في

التلاوة، ولا يريدون بذلك أنه حرام، ولا مكروه، ولا ما يؤثم به، بل أرادوا بذلك الوقف الاختياري الذي يبتدأ بما بعده" (النشر: ۱/ ۲۳۰)

''قراء کی اصطلاح میں جہاں ''یجوز'' اور ''لا یجوز'' کا ذکر آتا ہے، اس سے ان کی مراد حسنِ ادا ہے، جس سے قراءت میں خوبصورتی اور رونق نمایاں ہو، اس سے ان کی مراد حرام یا مکروہ یا گناہ نہیں، ان کا مقصد صرف اختیاری وقف ہے۔''

اسی بحث میں فرماتے ہیں:

"وهذا هو الذي اصطلح عليه السجاوندي "لازم"، وعبر عنه بعضهم بالواجب، وليس معناه الواجب عند الفقهاء، يعاقب على تركه، كما توهمه بعض الناس" اهـ (أيضاً: ۱/ ۲۳۱)

''سجاوندی کی اصطلاح میں لازم اور بعض دوسرے قراء کے نزدیک واجب کا لفظ کہتے ہیں، اس سے مراد وجوبِ فقہی نہیں، جس کے ترک پر عند اللہ مواخذہ کیا جا سکے۔''

مفصل احکام کے لیے علمِ قراءت کی کتابوں کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ ابو عمر دانی، سجاوندی، ابن الانباری نے اس موضوع پر مستقل کتابیں لکھی ہیں۔ ابن الجزری (۸۳۳ھ) نے ''النشر'' میں کافی تفصیل فرما دی ہے۔

نسخ کے معانی:

"قال أبو عبد الله محمد ابن حزم رحمہ اللہ: أما أصله فالنسخ في اللغة عبارة عن إبطال شيئ وإقامة آخر مقامه. قال أبو حاتم: الأصل في النسخ هو أن يحول العسل في خلية والنحل في أخرىٰ"

(كشف الأسرار: ۳/ ۸۷٤، شرح أصول البزدوي، معرفة الناسخ والمنسوخ بهامش جلالين: ۲/ ۱٤۲)

"والنسخ إبطال الشيئ وإقامة آخر مقامه"[1] (لسان العرب، ج: ۳)

لغت میں نسخ کا مطلب یہ ہے کہ ایک چیز کو ہٹا کر دوسری اس کی جگہ رکھ دی جائے۔ شہد کی مکھی اور شہد کے خزانوں کو نسخ کہتے ہیں۔ اصطلاح میں اس کی تعریف یہ ہے:

"رفع تعلق حكم شرعي بدليل شرعي متأخر عنه"

(نخبة الفكر، ص: ۸۵، إرشاد الفحول، ص: ۱۷۲، حصول المأمول، ص: ۷۹)

''ایک شرعی حکم کا تعلق دوسرے شرعی حکم سے ختم ہو جائے، پہلا منسوخ ہوگا، دوسرا ناسخ۔''

[1] لسان العرب (۳/ ٦۱)

شرائع میں نسخ مسلم ہے۔ ہر آنے والا پیغمبر عموماً پہلے نبی کے بعض احکام کو منسوخ کرتا ہے۔

﴿وَلِأُحِلَّ لَكُم بَعْضَ الَّذِي حُرِّمَ عَلَيْكُمْ﴾ [آل عمران: ۵۰]

''میں تم پر بعض چیزیں حلال کرتا ہوں، جو پہلے حرام تھیں۔''

متقدمین ائمہ اسلام کا نسخ پر اتفاق ہے۔ علمائے اسلام سے اس میں بظاہر کوئی اختلاف منقول نہیں۔ سابقہ کتابیں: تورات، انجیل، زبور جس حالت میں اس وقت موجود ہیں، وہاں نسخ کی بحث بے سود ہے، وہاں معاملہ مسخ کی حد تک پہنچا ہوا ہے۔ کبھی حواشی متن بن جاتے ہیں، کبھی متن حواشی کی جگہ لے لیتا ہے۔ بعض نسخوں میں بعض آیات ہی ناپید ہیں، اس لیے ان میں نسخ کی بجائے مسخ زیرِ بحث آنا چاہیے، اس لیے علمائے یہود اور نصاریٰ ان صحائف کے متعلق نسخ کی بحث کم کرتے ہیں۔ یہ بات کسی قدر درست بھی ہے، جب پوری کتاب یا اس کا کثیر حصہ مشکوک ہو، وہاں بعض آیات یا احکام کے نسخ کی بحث قطعی غیر مفید ہے۔

قرآنِ مجید میں نسخ:

مسیحی اور یہودی مناظرین قرآنِ مجید میں بعض آیات کے نسخ کو زیرِ بحث لائے اور اس پر انتقامی انداز کی تنقید کی ہے، اسی طرح جو مسلمان مسیحی مبلغین اور یورپ کے مستشرقین سے متاثر ہیں، وہ بھی اس مسئلے کی وجہ سے کئی ایک باطل شبہات میں مبتلا ہوگئے ہیں اور ان حضرات نے بعض دوسرے مخلص، لیکن یورپ زدہ عوام کو شبہات اور شکوک میں مبتلا کر دیا ہے۔

سید احمد خاں، مولوی چراغ علی، محمد علی لاہوری، قادیانی، پرویزی حضرات؛ یہ سب اس مرض میں گرفتار ہیں، اس لیے آج کل یہ مسئلہ واقعی ایک اختلافی مسئلہ بن گیا ہے۔ الحاد پسند حضرات اسے عموماً بحث ونظر کی مجالس میں اُچھالتے رہتے ہیں۔

نسخ پر اعتراض:

جہاں تک اصول کا تعلق ہے، جب آسمانی شرائع میں نسخ کو قبول کر لیا گیا ہے، کسی خاص کتاب یا کسی خاص مقام پر نسخ کو محلِ اعتراض سمجھنا چنداں معقول معلوم نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ اگر پوری شریعت کو بدل سکتا ہے تو شریعت کے بعض احکام بھی بدل سکتا ہے۔ تشریع کے لیے مناسب وقت اور اسے بدلنے کے لیے مناسب وقت دونوں اللہ ہی کے حکم میں ہیں اور وہی اس میں کلیتاً مختار ہے، اس میں اس کے علم کا کمال ہے کہ اس نے بوقتِ ضرورت حکم دے دیا، جب اس کی ضرورت نہ رہی، حکم اُٹھا لیا۔ غرض اصول کے طور پر نسخ کے جواز پر کوئی معقول اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔

قرآنِ عزیز میں نسخ کا اندازہ:

عام لوگوں کو یہ دقت محسوس ہوتی ہے کہ منسوخ آیات کی تعداد میں بہت زیادہ اختلاف ہے۔ بعض علما نے اس کی تعداد پانچ صد تک پہنچا دی اور بعض نے پانچ آیات کو مشتبہ سمجھا۔ پہلے ذکر ہوا ہے کہ ائمہ متقدمین نسخ کو لغوی معنی میں ہی استعمال فرماتے تھے، یعنی ایک حکم دوسرے حکم کی وجہ سے ٹل جائے۔ اگر کسی عام حکم کو خاص کر دیا جائے تو یہ بھی اپنے مقام سے ہٹ گیا۔ اگر کسی حکم میں کوئی قید یا شرط لگا دی گئی تو اسے بھی منسوخ کہنا درست ہوگا یا کسی حکم کی مدت ختم ہوگئی یا عام اور متبادر معنی کو نظر انداز کر کے غیر متبادر مفہوم لیا جائے یا کسی منصوص حکم کو مقیس علیہ میں امرِ فارق بیان کیا گیا ہو یا کسی جاہلی اسم یا پہلی شریعت کے حکم کو ختم کرنا؛ ائمہ سلف ان تمام مواقع پر نسخ کا لفظ بلا تکلف استعمال فرماتے تھے۔ لغت میں نسخ کا یہی مطلب ہے کہ ایک چیز کو دوسری چیز سے زائل کر دیا جائے۔ اس استعمال کے لحاظ سے منسوخ آیات کی تعداد پانچ سو سے بھی بڑھ سکتی ہے۔

اصطلاحی معنی سے منسوخ کی تعداد بہت ہی کم رہ جاتی ہے۔ اگر متعارض آیات میں تطبیق کی کوشش کی جائے تو یہ تعداد اور بھی کم ہو جائے گی۔ حافظ سیوطی نے اصطلاح کے مطابق منسوخ آیات کی تعداد بیس (۲۰) لکھی ہے۔ امام ابن العربی کی بھی قریباً یہی رائے ہے۔ شاہ صاحب نے ان بیس میں تطبیق کے بعد فرمایا:

"وعلى ما حررنا لا يتعين النسخ إلا في خمس آيات"

(الفوز الكبير مع جامع البيان، ص: ۱۰ مطبوعه فاروقی پریس دهلی)

''ہماری تحریر کے مطابق منسوخ آیات کی تعداد صرف پانچ رہ جائے گی۔''

نواب صدیق حسن خاں رحمہ اللہ نے شاہ صاحب کے ان اصول کے پیشِ نظر پانچ میں بھی تطبیق کی کوشش فرمائی ہے اور آخر میں فرماتے ہیں:

''و از ینجا دریافتہ باشی کہ در نسخ در ایں پنج آیہ نیز اختلاف است و بر ایں تقدیر منسوخ متعین از خمس آیات ہم کم تر باشد واللہ اعلم۔''[1] (دليل الطالب إلى أرجح المطالب، ص: ۸۰۲)

مسئلہ نسخ میں جہاں تک اصل اور نظریے کا تعلق ہے، ائمہ سنت کے نزدیک صحیح اور درست ہے، اس پر جن حضرات نے اعتراضات کیے ہیں، وہ صرف شکوک اور شبہات ہیں۔ یہ شبہات بھی کسی شرعی اساس پر مبنی نہیں۔ منسوخ آیات کی مقدار میں ہمیشہ اختلاف رہا ہے، بعض نے کسی آیت کو منسوخ کہا، دوسرے نے ترجیح اور تطبیق کی صورت پیدا کر دی۔ متقدمین اور متاخرین میں اصطلاحی اختلاف کی وجہ سے بھی تعداد میں کمی بیشی ہوئی۔ یہ علمی

---

[1] یعنی اس سے معلوم ہوا کہ ان پانچ آیات کے منسوخ ہونے میں بھی اختلاف ہے، بنا بریں منسوخ کی تعداد پانچ آیات سے بھی کم ہے۔

مسئلہ ہے، اس میں نظر وفکر کے لیے راہ کھلی رہنی چاہیے۔ حضرت شاہ ولی اللہ اور نواب صدیق حسن خاں صاحب ﷬ نے جس طرح تطبیق کی کوشش فرمائی ہے، ممکن ہے بعض ذہن بعض مقامات کے قبول کرنے میں تامل کریں یا ترجیح اور تطبیق کی کوئی دوسری راہ پیدا کریں تو علمی اور نظری طور پر اس میں کوئی حرج نہیں ہوگا، بلکہ اگر اس اصل کے مطابق تمام آیات میں جہاں نسخ کا خیال ہے، اگر تطبیق سمجھ میں آ جائے تو یہ کہنا درست ہوگا کہ قرآنِ عزیز میں کوئی آیت منسوخ نہیں۔

احادیث کے متعلق نواب صدیق حسن خاں صاحب ﷫ نے یہی روش اختیار فرمائی ہے۔ حافظ ابن جوزی اکیس احادیث کو منسوخ سمجھتے ہیں۔ بعض اہلِ علم نے ان کی تعداد انیس بتائی ہے۔ ابن تیمیہ نو، دس فرماتے ہیں۔ ابن قیم ﷫ کا خیال ہے کہ اس سے کم ہیں۔ حازمی سے ستانوے احادیث کے متعلق نسخ کا دعویٰ کیا گیا ہے۔ غرض مقدار کا مسئلہ علما کے نزدیک اعتقادی نہیں، اس میں نظر وفکر کے لیے راہیں کھلی ہیں۔ آخر میں فرماتے ہیں:

''مقصود دریں موضع ذکرِ احادیث است اکثر از اہلِ علم منسوخیتش رفتہ اند ورنہ در نسخ ایں حدیثہا ہم مارا مقال است۔''[1]

پھر زرقانی کے حوالے سے فرماتے ہیں:

''مذهب المحدثين والأصوليين والفقهاء أنه متى أمكن الجمع بين الحديثين وجب الجمع'' (دليل الطالب، ص: ۸۰۳)

''ائمہ اور فقہائے محدثین کا خیال ہے کہ جب جمع ممکن ہو تو جمع کی کوشش کرنی چاہیے۔''

اس پر اصرار نظر وفکر سے جی چرانے کے مرادف ہے۔ جب تک کسی نص پر عمل ممکن ہو، اسے مہمل بنانے کی کوشش کرنا، یہ علم و دانش کے ساتھ خصومت ہے۔ ائمہ اصول نے نسخ کی کئی اقسام ذکر فرمائی ہیں، یہ بھی کوئی بنیادی چیز نہیں، یہ محض علما کے علمی تجربے ہیں، یہ اعتقاد اور اصولِ دیانت کا مسئلہ نہیں۔

حضرت مولانا ثناء اللہ صاحب مرحوم:

مرحوم انیسویں صدی کے اواخر میں پیدا ہوئے۔ مسلک اہلِ حدیث کے لیے یہ خاص ابتلا کا وقت تھا۔ سید احمد شہید اور مولانا اسماعیل نے جس تحریکِ جہاد کا آغاز شروع صدی میں کیا تھا، وہ ۱۸۳۱ء مطابق ۱۲۴۶ھ میں بظاہر ختم ہوگئی، اس تحریک کو دبانے کے لیے سکھ اور انگریز دونوں کا سمجھوتہ تھا۔ مجاہدین کے مقابلے میں انگریز جرنیل اور سکھ فوجی دونوں دوش بدوش کام کر رہے تھے۔ تحریک جب ظاہراً ختم ہوئی تو سکھ سیاست نزع کی حالت

[1] اس مقام پر ان احادیث کو ذکر کرنا مقصود ہے، جن کے منسوخ ہونے کی طرف اہلِ علم گئے ہیں، ورنہ ان حدیثوں کے منسوخ ہونے میں بھی اختلاف ہے۔

میں تھی۔ پروانوں کی موت نے شمع کو بھی پیغامِ سحر دے دیا تھا۔ تحریکِ جہاد انڈر گراؤنڈ ہوگئی تو سکھ سیاست آخری ہچکی لے کر ہمیشہ کی نیند سوگئی ؎

دیدی کہ خون ناحق پروانہ شمع را   چنداں اماں نداد کہ شب را سحر کند[1]

لیکن انگریز اپنی عیاریوں کی وجہ سے سیاست کی بساط پر اُبھر آیا۔ آگے وہ رنجیت سنگھ کے جھنڈے کے نیچے لڑ رہا تھا، اب وہ اپنے اقتدار کے لیے میدان میں اُتر آیا۔ مجاہدین کی نقل و حرکت اور ان کے زیرِ زمین ٹھکانوں سے وہ بہت حد تک واقف تھا، اسے ان فقرا کے مخلصانہ طریقِ کار کا بھی کافی علم تھا، اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اہلِ توحید کے دلوں میں اور مسلم سیاست دانوں کے قلوب میں ان کے لیے کس قدر احترام ہے، اسے اہلِ بدعت کے رِستے ہوئے ناسور کا علم تھا۔ بریلی، بدایوں اور خیرآباد کی ذہنی سازشوں کا بھی علم تھا، اس لیے اس نے ٹھنڈی سیاست کے سہارے ان تمام طاقتوں کا جائزہ لیا اور ہر طاقت کو اپنے اپنے مقام پر استعمال کیا اور مسلمانوں کی سادہ دلی سے پورا فائدہ اُٹھایا۔ یہ سرد اور گرم جنگ اپنی طبعی اور غیر طبعی رفتار کے ساتھ اٹھارویں صدی کے آخری نصف میں داخل ہوگئی۔ صادق پوری خاندان اس وقت تحریکِ جہاد کے پورے ماحول پر محیط تھا۔ مسلم مجاہدین کے وفود مغربی بنگال سے بہار، مشرقی بنگال راجپوتانہ سے ہوتے ہوئے سندھ کے ریگستانوں کو عبور کرتے ہوئے بلوچستان کی برفانی پہاڑیوں میں غائب ہوجاتے تھے۔ سندھ کے مقامِ اتصال سے کبھی پورے پنجاب کو روندتے ہوئے ضلع ہزارہ سے نکلتے، مانسہرہ کالا باغ میں چھپتے چھپاتے بالاکوٹ کے اطراف میں پہنچ جاتے تھے۔ انگریز کے لیے یہ نقل و حرکت نزع کا منظر بنتی جا رہی تھی۔ انگریزی ملازم اور سرکاری دفاتر اس مقدس تحریک کے رضا کار تھے۔

انگریز کی بدحواسی:

اس ضیق میں انگریز بدحواس ہوگیا، اس نے ۱۸۵۷ء میں ایسی احمقانہ حرکتیں کیں کہ اس نے پورے ملک کو اپنے خلاف صف آرا کرلیا۔ ہندو، مسلم، مرہٹے، بہادر شاہ ایسے بوڑھے کمزور بھی انگریز کی موت کے خواب دیکھنے لگے، اس غیر منظم ہنگامے کی قیادت تو شرعاً مجاہدین اپنے سر نہیں لے سکتے نہ ہی اس نوعیت کے ہنگامے کی قیادت ان کے نزدیک درست تھی، لیکن انگریز کو بدنام کرنے اور اس کی سیاست کو دنیا میں رسوا کرنے میں جس قدر فائدہ اٹھایا جاسکتا تھا، وہ پورا پورا اٹھایا گیا۔

انگریز نے ظلم و تعدی سے اس غیر منظم ہنگامے کو ختم تو کرلیا، لیکن وہ اتنا روسیاہ تھا کہ خود سمجھ دار انگریزوں نے اسے ملامت کی۔ سرسید احمد خاں بالقابہ جیسا انگریز دوست بھی انگریز پر تنقید کرنے کے لیے مجبور ہوگیا۔

---

[1] تو نے دیکھا ہے کہ پروانے کے خونِ ناحق نے شمع کو اتنی امان نہ دی کہ رات کو دن میں بدل دیا۔

سر سید کا اندازِ تنقید کتنا ہی نرم اور لجاجت آمیز ہو، بہرکیف وہ تنقید تھی، اس نے پورے ہنگامے کی ذمے داری انگریز پر ڈال دی، اس سے ایک شرارت آمیز تبدیلی ہوئی، یعنی کمپنی کے بجائے سارا نظم ونسق ملکہ وکٹوریہ کے سپرد کر دیا گیا۔

مجاہدین پر اس انقلاب کا اثر:

اس تبدیلی سے غالباً کچھ لوگ متاثر ہوئے، لیکن مجاہدین کے نظریات پر اس کا اثر نہ ہوا، وہ سمجھتے تھے کہ سکھ ہو یا کمپنی، ملکہ وکٹوریہ ہو یا کوئی اور غیر مسلم طاقت، بہرحال اقتدار غیر مسلم کے ہاتھ میں ہے، اس لیے اسلامی نظام کا مسئلہ ہنوز لاینحل ہے۔ وہ زیرِ زمین جنگ بدستور جاری رہی اور ملک میں روز بروز مقبول ہونے لگی۔

ایک اور میدانِ کارزار:

۱۸۵۷ء کے بعد مسیحی مشنری اس ملک کے طول و عرض میں پھیل گئے اور اسلام کی دینی حیثیت کو چیلنج کیا جانے لگا، انھیں دیکھ کر آریہ سماج نے بھی اسلام کو ہدف بنایا۔ سوامی دیانند نے اسلام پر چھانے کے لیے یہ وقت مناسب سمجھا، اسی اثنا میں مرزا غلام احمد قادیانی نے جہاد کی تنسیخ کا فتویٰ دے کر انگریز کی بروقت خدمت کی اور تحریکِ جہاد کے پیٹ میں چھرا گھونپ دیا، اور اسلامی صفوں میں انتشار پھیلا کر انگریز کی بہت بڑی خدمت انجام دی اور اسلام کو نقصان پہنچایا۔ اس وقت مسلمان مجاہدین زیرِ زمین میدانِ کارزار سے واپس آنے کے لیے تیار نہ تھے، لیکن انتشار پسند عناصر کے لیے قادیانیوں اور سماجیوں کے لیے میدان کو خالی چھوڑنا، اس میں بھی نقصان کے بہت بڑے مواقع موجود تھے۔

حضرت مولانا ثناء اللہ کی آمد:

اس وقت مرحوم مولانا ثناء اللہ کا وجود قدرت کا ایک کرشمہ تھا۔ ملاے اعلیٰ کی طرف سے اہلِ حق کے لیے ایک عطیہ تھا۔ مرحوم نے بیسویں صدی کے آغاز سے اس علمی جنگ کی تمام ذمے داریاں اپنے کندھوں پر اٹھا لیں اور مجاہدینِ حق کو مطمئن کر دیا کہ وہ اپنی راہ پر چلتے رہیں، اس جنگ کے لیے انھیں بے قرار نہیں ہونا چاہیے۔

مرحوم نے اس کام کو اس طرح سنبھالا، گویا قدرت نے انھیں اسی کے لیے پیدا فرمایا تھا۔ مسیحیت، قادیانیت، بہائیت، روافض، سماجیت سے بیسیوں مناظرات کیے، مسلمانوں کے اندرونی اختلافات کے متعلق بھی پوری اعتدال کے ساتھ گفتگوئیں کیں۔ کبھی مرحوم کا قدم اعتدال کی راہ سے نہیں ڈگمگایا۔ مناظرات میں آپ جذبات سے کبھی مغلوب نہیں ہوئے، متانت کو کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا اور اُن مجالس میں بھی یہی ان کی کامیابی کا اصول تھا۔

مرحوم میں جامعیت:

مرحوم کو تمام فنون پر کافی عبور تھا اور بوقتِ ضرورت ان سے بلا تکلف استفادہ فرماتے تھے۔ مناظرے کے ساتھ مرحوم خوش بیان مقرر تھے۔ آخر عمر میں سورۂ واقعہ کے آخری رکوع کا بیان بڑے عارفانہ انداز سے فرماتے۔ تقریر میں عربی، اُردو، فارسی اشعار بکثرت استعمال فرماتے۔

مرحوم بہت بڑے مصنف تھے۔ مرحوم کی اکثر تصانیف مناظرانہ ہیں، ان میں مخالفین کے شبہات کا دفاع کیا گیا ہے۔ مرحوم نے اس دفاعی جنگ میں قرآنِ عزیز کی خدمت کو نظر انداز نہیں فرمایا۔ تفسیر ثنائی اُردو زبان میں لکھی۔ ترجمہ اس انداز سے فرمایا کہ آیات میں ربط قائم رہے، پھر تفسیری نوٹ لکھے، جس میں قرآن مجید کی تعلیمات کی وضاحت فرمائی گئی۔ اگر اعتراض سامنے آیا تو حواشی میں اس کی وضاحت فرما کر اعتراض رفع فرما دیا۔ یہ تفسیر پہلے شائع ہوئی، اس پر چنداں اعتراضات نہیں ہوئے، اس کے بعد ''تفسیر القرآن بکلام الرحمان'' لکھی، اس میں مرحوم نے بڑی محنت کی۔ آیات کی تفسیر میں قرآن ہی سے مدد حاصل کی۔ قرآن کی مشکلات کو قرآن ہی سے حل فرمایا۔ مرحوم کا یہ طرز گو اچھوتا نہ تھا، لیکن پورے قرآن میں اس کا التزام بالکل نئی بات تھی، جسے علمی حلقوں میں بہت پسند کیا گیا۔

مرحوم کی ذہانت:

ذہین آدمی نظریات میں بھی پہلی رایوں کا پابند نہیں رہتا۔ تحقیق پسند طبائع کبھی پرانی راہوں سے الگ راہ تلاش کرتی ہیں۔ مناظر مزاج آدمی کے ذہن پر کچھ اور بھی ذمے داریاں ہوتی ہیں، وہ دشمن کی گرفت سے بچنا چاہتا ہے، اس راہ میں جہاں بیسیوں کو متاثر کرتا ہے، کہیں خود بھی متاثر ہوتا ہے۔ وہ کوشش کرتا ہے کہ دیکھی بھالی راہوں سے کوئی الگ راہ تلاش کر لے۔ ابو الحسن اشعری، بیہقی، ابن خزیمہ، ابن حزم ایسے ائمہ سنت ہمارے سامنے ہیں، ان حضرات نے جہاں متکلمین پر بھرپور وار کیے ہیں، کہیں کہیں ان سے متاثر بھی نظر آتے ہیں۔ خود متکلمین جنھوں نے فلاسفہ سے ان کی زبان اور اصول میں گفتگو کی، ان کے کئی اصولوں کو پاش پاش کیا، وہاں اہلِ سنت کے حلقوں میں ان کی آبلہ پائی کے تذکرے بھی ملتے ہیں، ان حضرات پر حافظ ابن تیمیہ کا ارشاد ''لا للإسلام نصروا ولا للفلاسفة كسروا'' کتنا جارحانہ حملہ ہے۔ مناظرات میں اس قسم کا تاثر اور تاثیر قدرتی چیز ہے۔

مرحوم مولانا ثناء اللہ صاحب نے تفسیر القرآن میں بعض مقامات پر ایسی راہیں اختیار کیں، جو پہلے لوگوں کی نظر میں اجنبی تھیں اور بعض مغلق مقامات کے حل میں ایسے گوشے اختیار فرمائے، جو پہلے بزرگوں کے ہاں

متعارف نہ تھے، اس سے اختلاف قدرتی امر تھا۔ مولانا نوجوان تھے، طبیعت میں جلال تھا، فنون پر نظر تھی، تھوڑے عرصے میں اختلاف نے مخالفت کی صورت اختیار کی اور مخالفت نے ہنگامہ بپا کر دیا، اس ہنگامے میں بعض بنیادی مسائل پیدا ہوگئے۔ اتباعِ سلف، تفسیرِ سلف کی حجیت، اجماع کا امکان اور اس کی حجیت۔ ابتدا میں مولانا محمد ابراہیم صاحب سیالکوٹی، حضرت مولانا حافظ عبدالمنان صاحب محدث وزیر آبادی، ہندوستان کے بہت سے اکابر مولانا کے خلاف اگلی صفوں میں تھے، لیکن بتدریج اس ہنگامے کا اثر ذہنوں سے اترتا گیا۔ بہت سے لوگ تفسیری تسامحات کو مانتے تھے، لیکن ہنگامے سے بالکل الگ ہوگئے۔ مولانا ثناء اللہ صاحب کے مخالفین میں غزنوی اکابر حضرت مولانا عبدالجبار صاحب غزنوی، مولانا عبدالواحد صاحب غزنوی، مولانا عبدالرحیم صاحب اور مولانا عبدالاول صاحب غزنوی رحمہ اللہ اس اختلاف کے اہم عناصر تھے، لیکن ان کی مخالفت معقول اور مسائل کی حد تک تھی اور بوقت ضرورت تھی، وظیفہ نہیں تھا۔ جہاں تک خیال ہے ان حضرات نے اپنی ذاتیات کی آلائشوں سے اسے ہمیشہ پاک رکھا۔ یہ حضرات عمر میں مولانا سے بڑے تھے، ان کا علمی اقتدار، زہد وتقویٰ علمی حلقوں میں مسلم تھا۔ مولانا کی ذہانت، ان کا مناظرانہ انداز بہت کم موثر ہو سکا۔ مولانا بھی ان کا ہمیشہ احترام فرماتے، کوئی تیز لفظ ان کے خلاف نہیں کہتے تھے۔

مولانا سے کچھ معمر مولانا فقیر اللہ مدراسی اور قاضی عبدالاحد صاحب رحمہ اللہ تھے، ان دونوں بزرگوں نے مرحوم کے خلاف بہت کچھ لکھا، لیکن ان کا انداز چنداں جاذب نہ ہو سکا اور اس اثنا میں مولانا اپنی ہمہ گیر خدمات کی وجہ سے علمی حلقوں پر چھا چکے تھے۔ مولانا کی تالیفات اور مناظرات نے ایک ایسا ماحول پیدا کر لیا تھا کہ یہ مخالفت اپنے لیے کوئی حلقہ بھی پیدا نہ کر سکی، صرف آواز تھی، تھوڑے سے تموج کے بعد فضا میں گم ہو کر رہ گئی، اس کے بعد اس مخالفت کی نقل روپڑی حلقوں کی طرف سے ہوتی رہی۔ ابتدا میں چند افراد متاثر بھی ہوئے، لیکن ان حضرات میں اس قدر کمزوریاں اور عملی فروگذاشتیں تھیں کہ اس آواز کو صدا بہ صحرا ہی سمجھنا چاہیے۔ اس کے علاوہ مولانا کا علمی وقار اور تقویٰ اور معاملات میں ذہانت کا اثر اتنا ہی وقیع تھا، جس طرح مولانا عبدالجبار صاحب غزنوی واخوانہ کا اثر اپنے وقت میں، اس لیے اس اختلاف کو نہ جماعت کے عوام نے کوئی وقعت دی نہ مرحوم نے اسے کبھی اہمیت دی۔ حضرت جنیدِ وقت قاضی محمد سلیمان صاحب منصور پوری، حضرت لقمانِ زماں مولانا عبدالقادر صاحب قصوری نے کئی دفعہ اس نزاع کو ختم کرانے کی کوشش فرمائی، لیکن روپڑی حضرات کی روش کبھی بھی معقول نہیں سمجھی گئی، اس لیے یہ نزاع اور بھی بے اثر ہوگئی۔

۱۹۴۷ء میں ملک تقسیم ہوگیا۔ مرحوم پہلے گوجرانوالہ تشریف لائے، پھر سرگودھا میں مستقل سکونت اختیار

فرمائی۔ ۱۹۴۸ء میں یہ علم وفضل کا بادشاہ اور مسلک اہلِ حدیث کا یکتا خادم آخری نیند سو گیا، اس نوزائیدہ ملک میں جب کہ اس کی خدمات کی بے حد ضرورت تھی، جماعت کو نو آموز ہاتھوں میں چھوڑ کر رختِ سفر باندھ لیا اور اپنی آخری آرامگاہ میں سامانِ سفر ڈال دیا۔ آج مولانا ہم میں نہیں، لیکن ان کے آثار ابھی نمایاں ہیں ؎

ابھی اس راہ سے گزرا ہے کوئی   کہے دیتی ہے شوخی نقشِ پا کی

مولانا کے باقیاتِ صالحہ:

مرحوم کی پوری عمر پنجاب میں گزری، انتقال پنجاب میں ہوا۔ فرض تھا کہ جماعت اہلِ حدیث پنجاب ان کے علمی آثار کو زندہ رکھتی، لیکن ہمیں اپنے قصور کا اعتراف ہے کہ ہم اس فرض کی ادائیگی میں قاصر رہے۔ برادرِ محترم مولانا محمد داود راز صد ہزار مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے مولانا کی قیمتی یادگاروں کے احیا کا شرف حاصل کیا۔ فتاویٰ ثنائیہ اور حواشی ثنائیہ ایسے علمی ذخیروں کو شائع فرما کر استفادے کا موقع دیا ؎

نگاہِ ناز جسے آشنائے راز کرے   وہ اپنی خوبی قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے

ولو قبل مبكاها بكيت صبابة   بسعدى شفيت النفس قبل التندم

ولكن بكت قبلي فهيج لي البكاء   بكاها فقلت الفضل للمتقدم

پیشِ نظر حواشی تفسیر ثنائی اُردو سے بھی لیے گئے ہیں۔ پہلے اِڈیشن میں بعض مقامات کا اندراج مرحوم کی تحقیق کے مطابق ہو گیا، ان میں بعض مقامات سلف کی متعارف راہوں سے مختلف تھے، اس اِڈیشن میں ان مقامات کی اصلاح کر دی گئی اور ائمہ سلف کے متعارف اور مشہور مسلک کو ترجیح دی گئی ہے۔ مرحوم کے ساتھ انتہائی عقیدت کے باوجود بحمد اللہ ہماری راہ تقلید و جمود کی نہیں۔ جماعت اہلِ حدیث ہند اور اُن کے کارکن خدامِ مولانا راز وغیرہ سب سلفی العقیدہ ہیں اور اسی عقیدے کی اشاعت جماعت کا مطمحِ نظر ہے۔ خود مرحوم نے بھی تفسیر القرآن کے دوسرے اِڈیشن میں بعض مقامات کی اصلاح فرمائی تھی، مولانا راز نے اسی کا تتبع فرمایا ہے۔

مسئلہ صفات:

مسئلہ صفات کے متعلق اب وہ تیسری صدی کی ہنگامہ آرائیاں تو نہیں تھیں، تاہم متکلمین کے اعتقادی اثرات اب تک قائم ہیں۔ ہمارے زمانے میں اربابِ تقلید کا عجیب حال ہے، وہ بیک وقت تین اماموں کی تقلید کرتے ہیں، عقائد میں ابو الحسن اشعری یا ماتریدی کی، تصوف میں ان کی نظریں شیخ عبدالقادر جیلانی اور باقی متعارف سلاسل کی اقتدا کے لیے بے قرار ہوتی ہیں اور فروع فقہیہ میں وہ ائمہ اربعہ کی تقلید کو واجب فرماتے ہیں،

اس کے باوجود انھیں شبہہ بھی نہیں ہوتا کہ وہ غیر مقلد ہیں۔ اہلِ حدیث اصول اور فروع، عقائد اور فقہی احکام میں آنحضرت ﷺ اور ان کے رفقا کی اقتدا اور صحابہ کی رایوں کا تتبع ضروری سمجھتے ہیں، اس سے علیحدگی کو وہ کسی قیمت پر گوارا نہیں کرتے۔

مرحوم مولانا ثناء اللہ صاحب مسئلہ صفات میں متکلمین سے متاثر تھے، اس لیے اکابر جماعت کو ان سے شکر رنجی رہی۔ آخر عمر میں مرحوم نے بھی تاویل کے بجائے تفویض کی راہ اختیار فرمائی تھی، جس کا تذکرہ انھوں نے تفسیر القرآن کے دوسرے اِڈیشن (ص: ۱۲۵) میں مسئلہ استوا میں تفصیلاً فرمایا ہے، لیکن اس تفویض میں بھی مرحوم کا رجحان اس تفویض کی طرف رہا، جسے غزالی نے آخر عمر میں پسند فرمایا تھا۔ معلوم ہے کہ یہ تفویض ائمہ سنت امام مالک، امام احمد، امام شافعی، امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی تفویض سے مختلف ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہوں: مصنفات شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ و ابن قیم رحمہ اللہ والمنار ۱۹۲۵ء۔

یہ چند سطور اظہارِ حقیقت کے طور پر عرض کی گئی ہیں، ورنہ میری کیا بساط کہ ایسے جامع الفنون عالم کے نظریات کے متعلق کچھ عرض کر سکوں۔ مرحوم نے اسلام کی جو خدمات کی ہیں، میرے سامنے ہیں اور مسلک اہلِ حدیث کے لیے انھوں نے جو قربانیاں فرمائی ہیں، میری نظر میں ہیں۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو فردوس میں جگہ دے اور ہماری لغزشوں کو معاف فرمائے اور توفیق دے کہ ہم ائمہ سلف کی اقتدا کر سکیں۔

مرحوم جید عالم تھے اور پاک و ہند کے مشہور اہلِ علم اور اہلِ قلم، لیکن مرحوم کی زندگی نہایت سادہ تھی۔ زہد و ورع کی نمایش اور اس کے لیے تصنع مرحوم کے قریب تک نہیں آیا تھا۔ مجھے مرحوم کا مقام، ان کی متکلمانہ اور مناظرانہ مجبوریاں معلوم ہیں اور مرحوم کے مخالفین کے اندازِ زندگی بھی معلوم ہیں۔ ۱۹۴۷ء کے بعد مجھے مرحوم کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ مرحوم بے حد محتاط تھے۔ اکلِ حلال کے متعلق مرحوم کے جذبات بے حد نازک تھے۔ مرحوم الاٹ منٹ کے جھمیلے سے بہت پرہیز کرتے تھے۔ مصنوعی جائداد اور کلیموں کی مبالغہ آمیزیوں سے سخت نفرت تھی، اس کے بالمقابل اربابِ تقویٰ کی ہوشمندیاں اور صنعت کاریاں بھی دنیا کی نظروں میں ہیں۔ مسائل میں اختلاف ہو سکتا ہے، اعتدال کے ساتھ اس کے متعلق اظہار میں بھی کوئی حرج نہیں، اس میں لغزشیں بھی ہو سکتی ہیں۔

من ذا الذي ما ساء قط ومن له الحسنىٰ فقط

اصل کسوٹی عمل ہے۔ معاملات میں اللہ تعالیٰ لطیف و خبیر ہے، اس کی نظر ہمارے ظاہر و باطن پر ہے، جہاں تک ظاہر حالات کا تعلق ہے، میں نے مرحوم کے حالات کو اکابر اہل اللہ کے برابر پایا۔ اس کی رحمت

ہمارے فتوے کی محتاج نہیں، نہ اس کی رحمت ہمارے نمایشی زہد وتقوے کی مرہون ہے۔ استحقاق اور عدمِ استحقاق کا فیصلہ وہی فرمائے گا ؎

إذا اشتبكت دموع في خدود تبين من بكىٰ ممن تباكىٰ

ربنا اغفر لنا ولإخواننا الذين سبقونا بالإيمان ولا تجعل في قلوبنا غلا للذين آمنوا ربنا إنك رؤف رحيم. وصلىّٰ الله علىٰ محمد وعلىٰ آله وأصحابه أجمعين.

محمد اسماعیل

جامع اہل الحدیث گوجرانوالہ، چاہ شاہان

(ناظم اعلیٰ جمعیت اہلِ حدیث مغربی پاکستان)

۹ رصفر المظفر ۱۳۸۰ھ مطابق ۳۰ راگست ۱۹۶۰ء

مقدمہ:

شرف أصحاب الحديث

(تالیف: حافظ ابوبکر خطیب بغدادی۔ ناشر: مرکزی جمعیت اہلِ حدیث مغربی پاکستان ۱۹۶۴ء)

الحمد لله الذي شيد علوم النبوة بالأسانيد السداد، وأعانها برجال العلم، إذ ظهر في الأرض الفساد، والصلاة والسلام الأتمان على من أسس الفقه والحكمة بأسند الأوتاد، وعلىٰ أتباعه آخذي ألوية العلم حتى يقوم الأشهاد، وعلىٰ حاملي علوم السنة، و رافعي أخبار النبوة إلى يوم المعاد.

ظهر الإسلام، ودياجير الجهل أحاطت بلاد العروبة، وما حولها من الهند والسند وأقطارهما القاصية والدانية، وعمت الظلمة الشرق والغرب، ظلمات بعضها فوق بعض، إذا أخرج يده لم يكد يراها، ومن لم يجعل الله له نوراً فما له من نور. وكل ذلك في قيادة أئمة الكفر، قد أحاط بهم الجمود، وحرية الفكر هاجرت من هذه الأوطان، وخمود الذكاء عمت ينابيع الفطنة القاصية منها والدانية، ولا بد من القضاء عليه ليقضي الله أمراً كان مفعولا، فإن كل من عليها فان، ويبقىٰ وجه ربك ذوالجلال والإكرام.

فلله أبوك! طلع الذكاء من شعاب فاران، وأضاءت به قلل سلع وبلاد غطفان، وشاع الضياء، وأشرقت الأرض بنور ربها، ووضع الكتاب فكان ما كان.

وانتشر هذا النور، وأعانه نور القرآن والسنة، واستضاء به الشرق والغرب، وكاد الجهل تضمحل وتذوب، والجمود و عوائد الكفر ترحل حيثما تحل عساكر النبوة، وانهزمت جنود التقليد والخمود، وتفرقوا أيدي سبا، جند ما هنالك مهزوم من الأحزاب.

حرية الفكر:

وكان الحال على هذا النمط إلىٰ آخر القرون المشهود لها بالخير، يسأل العالم، ويقبل قوله من غير تعيين وتقييد برأي شخص معين، و فيهم الفقهاء الكبار والعلماء

العظام، ومن هدىٰ بهديهم، وفوق كل ذي علم عليم. والاجتهاد بالمعنى المصطلح المعهود لم يكن إذ ذاك موجوداً، ولا علوم الاجتهاد الشائعة المصطلحة عند المتأخرين من الفقهاء والأصوليين، بل الاعتماد علىٰ التقوىٰ وسلامة الفطرة، والأصل عندهم قوله ﷺ: «إنما شفاء العي السؤال»[1] رواه أصحاب السنن.

والعلماء حينئذ متوافرون، كلما حللت بلدة أو قرية، وجدت عالما من الصحابة أو فقيهاً من التابعين و أتباعهم، يدرسون في الفقه والحديث، يفتون أحيانا، وأحيانا يفوضون الأمر إلى غيرهم، تارة يجيبون، وتارة يعترفون بعدم العلم. وإذا وجدوا في المسألة نصاً من الكتاب والسنة فرحوا، وأجابوا مما فيها من غير شك وريبة، وإذا اضطروا إلى رأي وحكم بغير نص، فكروا وشاوروا، فأحياناً قالوا به، وما أحسن قولهم: إن كان صحيحاً فمن الله، وإن كان غير صحيح فمني ومن الشيطان. ويصرحون بأن هذا رأينا، إن وجدتم رأيا أحسن منه فاقبلوه، وإن وجدتم نصا يخالف قولنا فاضربوا بقولنا الحائط من غير إلزام وإجبار على التقليد.

والأئمة الأربعة وأكثر أصحابهم نسجوا علىٰ تلك المنوال، ونصوصهم في ذلك متوافرة متظاهرة. عليك بسنن الدارمي، و جامع بيان العلم وفضله لابن عبد البر، و حجة الله البالغة لمجدد الهند الإمام ولي الله الدهلوي، والميزان للشعراني، وإعلام الموقعين للإمام ابن القيم، وغير ذلك من أسفار أئمة السنة، رضوان الله عليهم أجمعين.

هكذا أو قريباً من ذلك الأحوال إلىٰ آخر المائة الرابعة لم يجتمعوا علىٰ جواز تقليد شخص معين فضلًا عن الوجوب أو حصر أهل السنة في تقليد الأربعة وغيرهم، بل أكثر أهل العلم صرحوا بالنهي عن التقليد المعين كما قال ابن مسعود رضی اللہ عنہ: لا يقلدن أحدكم دينه رجلا، إن آمن آمن، وإن كفر كفر، فإنه لا أسوة في الشر. و أيضاً قال عبيد الله بن المعتز: لا فرق بين بهيمة تنقاد وإنسان يقلد. (جامع بيان العلم لابن عبد البر: ٢/ ١١٤)

وأيضاً قال ابن مسعود: أغد عالما أو متعلما، ولا تغد أمعة فيما بين ذلك" (ابن عبدالبر: ٢/ ١١٢)

وقال سلمان: أما زلة العالم فإن اهتدى فلا تقلدوه دينكم. (٢/ ١١١)

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٣٦) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٥٧٢)

وقال في حجة الله البالغة عن اليواقيت والجواهر عن أبي حنيفة أنه كان يقول: "لا ينبغي لمن لم يعرف دليلي أن يفتي بكلامي"، وقال الإمام مالك: "ما من أحد إلا و مأخوذ من كلامه و مردود عليه إلا رسول اللهﷺ"، وقال الشافعي: "إذا صح الحديث فهو مذهبي"، وقال أحمد: "لا تقلدني ولا تقلد مالكا ولا الأوزاعي ولا النخعي وخذ الأحكام من حيث أخذوا من الكتاب والسنة" وعن أبي يوسف وزفر وغيرهما أنهم قالوا: "ليس لأحد أن يفتي بقولنا ما لم يعلم من أين قلناه" (حجة الله: ١/ ١٢٦)

هذا مذهب الأئمة وطريقهم في المسألة، ولا نعلم من أين جاء المتأخرون بوجوب التقليد المعين من العلماء؟!

ما نعني بذلك:

الحقيقة ما قلناه، والحرب لم تزل دائراً بين أهل الحديث وبين دعاة التقليد. ينال كل من الآخر، يقلون ويكثرون بحسب ما تيسر لهم من الأسباب المادية من القضاء والتوسل بالسلاطين والحكام، كما ذكره المقريزي في الخطط بأن جمع الحديث، وتدوينه كان عاما في البلاد الإسلامية، والعمل به كان أصلًا أصيلًا عندهم، كما كان في عهد الصحابة والتابعين، والناس يرحلون لطلب الحديث الواحد الأيام الكثيرة، والمنازل البعيدة. يعرف ذلك من نظر في كتب الحديث، وعرف سير الصحابة والتابعين، حتى قام هارون الرشيد بالخلافة، و ولىٰ القضاء أبا يوسف القاضي بعد سنة سبعين ومائة، فلم يقلد أمر القضاء في المصر والشام والعراق أحد إلا بأمره وإشارته، فكان بسبب شيوع الحنفية في تلك البلاد.

وقام الخليفة المنتصر المرتضىٰ بن هشام بالأندلس، و ولّى القضاء يحيىٰ بن يحيىٰ بن كثير، وهو من تلامذة مالك وأصحابه، وابن وهب و ابن القاسم، فكانت قيادة الفتوىٰ بيده، ولا يتولى القضاء أحد إلا بأمره وإشارته؛ فغلب هنالك مذهب مالك بعد الأوزاعي، وكان أفريقية الغالب عليه السنن والآثار إلىٰ أن جاء عبد الله بن فروخ بالحنفية، وجاء سحنون بالمالكية، وصار القضاء في أصحابه، يتصاولون على الدنيا تصاول الفحول على الشول. انتهى مختصراً (الخطط: ٤/ ١٤٤)

وأهل الحديث لم يطوفوا أبواب السلاطين، ولا طلبوا القضاء، كما طلبه أصحاب الأئمة وتلاميذهم، فاضمحل أمرهم، ولم يتوسلوا إلا بفضل الله ورحمته، كما قال رسول الله ﷺ: «لا تزال طائفة من أمتي ظاهرين على الحق لا يضرهم من خذلهم»[1] (الحديث)

ولفظة: أهل الحديث، والسلفي، والأثري، وأصحاب الحديث، وأهل السنة مرادفة، لا تدل إلا على هذه الحقيقة التي ذكرناه، وهي مرادفة للإسلام نفسه.

واعلم رحمك الله أن لفظة أهل الحديث لا نعني به ترك التقليد والجمود فقط، بل لا بد بعد ذلك من الالتزام بالكتاب والسنة وفهم النصوص علىٰ دأب الصحابة والتابعين، أصحاب القرون المشهود لها بالخير. فإن الفوضوية واتباع الهوىٰ وإعجاب كل ذي رأي برأيه ممنوع عندهم عن أصله بالمرة، فلتكن من ذلك علىٰ حذر.

وإنهم ـأدام الله بقاءهمـ ما زالوا يذبون عن السنة، يتبعونها، وينفون عنها تحريف الغالين وانتحال المبطلين، قد وفقهم الله ومنّ عليهم بخدمة السنة حفظاً وضبطاً، جمعاً وتدويناً، و درساً و تعليماً، و فقها و درايةً، فإنهم هم الموفقون لذلك، وإن شاركهم في ذلك بعض أتباع الأئمة فضلًا من الله ونعمة.

ومن التسامح قول بعض القاصرين بأنهم "أصحاب الفن وحفاظ الحديث فقط، من غير فقه و دراية، لا يعدون إلى أمر سوى الحفظ والضبط والتحاور في الأسانيد والرجال من غير اجتهاد في الفهم ودقة نظر في الفقه والدراية في المعاني والمقاصد" إن ذلك إلا وهم منهم، بل القوم هم العالمون بالمصالح العامة، والعارفون بمقاصد الإسلام الذين جاهدوا فيه وأفتوا بحسب ما تقتضيه المصالح.

وهذا الوهم نشأ إما من الانغماس في بحار العصبية أو قلة النظر في أسفار القوم وتواريخ الفرق والمذاهب، فإن أصحاب الحديث فيهم الفقهاء والمؤرخون والقراء والمحدثون، هم هذبوا أصول الفقه، ودونوا قواعده، وأسسوا الرواية على الدراية والدراية على الرواية، ودونوا الحديث، وبوبوا، وغاصوا في بحار الفقه والكلام، أكثرهم أئمة في كل فن. وحرية فكرهم تظهر في مسارح الأسفار ودقة نظرهم تسبر إذا تقاولت الأنظار.

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩٢٠)

هم فلاسفة السنة ومتكلموها، هم أدباء الإسلام الماهرون في الفنون بألوانها. وقد اعترف بذلك أئمة الإسلام في غير موضع.

قال إمام الأشعرية الفقيه النظار أبوبكر محمد بن حسن بن فورك (٤٠٦هـ): إن أصحاب الحديث على قسمين: فرقة منها هي أهل النقل والرواية الذين تشتد عنايتهم بنقل السنن، وتتوفر دواعيهم على تحصيل طرقها، وحصر أسانيدها، والتمييز بين صحيحها وسقيمها، فيغلب عليهم ذلك، فيعرفون به، وينسبون إليه، وفرقة منهم يغلب عليهم تحقيق طرق النظر والمقاييس والإبانة عن ترتيب الفروع على الأصول، ونفي شبه الملبسين عنها، وإيضاح وجوه الحجج والبراهين على حقائقها. (مشكل الحديث وبيانه، ص: ٣٣)

فقد ظهر مما ذكرنا أن أصحاب الحديث صنفان: صنف أصحاب حفظ و ضبط، وقسم أصحاب فكر و نظر، يرتبون الفروع على الأصول، ويربطون الأحكام مع العلل، وهم أصحاب الفقه والنظر.

قال الإمام عبد الكريم الشهرستاني في الملل والنحل: المجتهدون من أئمة الأمة محصورون في صنفين، لا يعدون إلىٰ ثالث: أصحاب الحديث وأصحاب الرأي" (الملل: ٢/ ٤٥)

معلوم أن الشهرستاني من المتكلمين، وهو يعترف بأن أهل الحديث صنف من المجتهدين، ومعلوم أن المجتهد في زمن الشهرستاني لا يصير مجتهداً بفن واحد فقط، بل لا بد له من العبور علىٰ فنون شتى، بل المهارة التامة واجبة في بعضها، وأي معنى للاجتهاد إذا لم يتفكر بفكرة حرة فيما يحول حولهم من المسائل، ويتفكر بحكم وراء فكرة العامة.

وقد ذكر الشعراني عن أبي بكر بن عياش (١٩٣هـ) يقول: أهل الحديث في أهل الإسلام كالإسلام في سائر الأديان. (الميزان الصغرى، ص: ١٥٦)

ولنختم هذا البحث بما قاله الإمام العلامة شيخ الإسلام ابن تيمية الحراني في منهاج السنة النبوية: ومذهب أهل السنة والجماعة مذهب قديم معروف قبل أن يخلق الله أبا حنيفة ومالكاً والشافعي وأحمد، فإنه مذهب الصحابة الذين تلقوه عن نبيهم، ومن خالف ذلك كان مبتدعا عند أهل السنة والجماعة. (١/ ٢٥٦)

فقد ظهر مما ذكرنا من نصوص الأئمة أن أهل الحديث، وإن خصهم الله لخدمة

السنة وضبط ألفاظها ومعانيها، فإنهم اختصوا بأفكار حرة عتيقة عن التقليد وراء آراء الرجال وأفكارهم. وأفكارهم تساوي بل تزيد وتضعف رتبتهم من أفكار أئمة التقليد، وهذه الحقيقة نعبر حين ننسب أنفسنا بأهل الحديث والأثر أو سمينا بالسلفي، وليس في ذلك إلا حذار أو احتظار عن التقليد الشخصي الذي هو داء عضال للأذهان الصافية، واتباع السنة النبوية والاقتداء بأئمة السلف.

نهضة السنة واتباع السلف:

قد ثبت بما ذكرنا فيما مضىٰ أن المسلمين كلهم ـأولهم عن آخرهم أو أكثرهم- كانوا أهل الحديث بالمعنىٰ المذكور في قرون الخير ومئات من السنين بعدهم حتى أن الجنود الإسلامية التي ألقت رحالها علىٰ ساحل الهند في قيادة البطل الجرئ محمد بن القاسم (٩٢هـ) والتي تسورت جبال الفرس، ومصت مياه الثلوج على قلل جبال كابل وما حولها في زمن الخليفة الثاني الإمام العادل عمر بن الخطاب، والأمويون الذين عبروا بحار الغرب حين تسلط عساكر السفاح على المدينة وباقي بلاد الإسلام، كلهم كانوا علىٰ طريقة السلف أحراراً عن هذه التقاليد المصطلحة، لأن كل ذلك الحوادث حدثت في المائة الأولىٰ و أوائل المائة الثانية، والأئمة الأربعة رحمهم الله لم يخلقهم الله إلىٰ الآن، ومن كان حينئذ في حيز الوجود لم يصل إلى شعاب الإمامة والقيادة، فأين التقليد والتقييد بمذاهبهم التي قد أحاطت بالأذهان بعد المائة الرابعة؟!

وإن شئت أن تعلم دبيب هذه الطامة وتدرج هبوطها على أذهان الأذكياء من المسلمين، فانظر المجلد الأول من تذكرة الحفاظ للذهبي (١/ ١٥٨، ٢/ ٦٢٨جديد) وإن شئت أن تعلم أن أذكياء الأمة الذين لم ينقادوا لهذا، فانظر التاج المكلل للإمام العلامة النواب صديق حسن خان، وسواه من أسفار أئمة الحديث والرجال.

ثلة من الآخرين:

وقد ظهرت آثار النهضة السلفية الحديثية في الهند بعد مدة في أوائل المائة الحادية عشر، و أول من أظهرها وكسر أغلال تقاليد البدعة هو مجدد هذه المائة وإمام هذه النهضة القدوة الشيخ أحمد بن عبد الأحد الفاروقي الحنفي السرهندي (١٠٣٤هـ) هو

بحسب الحال وإن كان ينتسب إلى الحنفية، لكنه من أعداء الجمود وأعظم هدفه القضاء على البدعات الرائجة، ومن أصحابه الذين استفادوا من علومه الحبر العلامة بيهقي زمانه القاضي ثناء الله الفاني فتى (١٢٤٥هـ) والفاضل العلامة مرزا مظهر جان جانان، والإمام الثقة المقدام، الشاه ولي الله الفاروقي وأبناءه الكرام، كلهم مع صعوبة الأحوال خالفوا البدع والتقاليد العامة الرائجة في الالتزام بالمذهب المعين، وقد ذكر في التفهيمات أنه يختار مذهب فقهاء المحدثين، ويستعيذ بالله من رسوم الصوفية، وكذلك أبناءه نقدوا الفقه وأصوله، ولا تغتر بعزوهم وميلهم إلى الحنفية، فإن ذلك لاقتضاء الأحوال وبجمود العوام على التقاليد الرائجة.

وفور رحمة الله:

والمائة الحادي عشر والثاني عشر توفرت وعمت فيه رحمة الله على خلقه، وانبعثت دواعي عطفه على العرب والعجم بأن نبعت نهضات دينية، أحدها في نجد، وهي الدعوة النجدية، والداعي إليها هو عبقرية الدهر الإمام القدوة محمد بن عبد الوهاب، وأعانه على ذلك أسرة كريمة سعودية، وهذه الدعوة فيما نعلم كانت في الأول دينية خالصة فاستحالت سياسية دينية، وقد يسر الله لها بنعمته العامة الفوز والقبول في هذه البلاد، وتأثرت منها الحجاز واليمن والمصر والعراق، ففي كل هذه البلاد لها أعوان وأنصار، وهم إلى الآن أقرب البلاد إلى الدعوة المحمدية أصلح الله حالهم، وعافاهم عن الضلالات التي عمت لهم البلوىٰ في بلاد الغرب من الفحش والتعري والبغاء وقلة الحياء والخروج عن الدين وترجيح الوطنية على الدعوة الإسلامية وترجيح الفراعنة على الإسلام ودعايته.

والثانية: النهضة الإسلامية التي قام بها زعيم الإسلام جمال الدين الأفغاني وأصحابه ورفقته، أعني بذلك سيد محمد عبده، والسيد رشيد رضا، و تلاميذهم الكرام.

والثالثة: النهضة السلفية في الهند. هذه النهضات الثلاثة وإن اختلفت مساعيهم، وافترقت أعمالهم وأحوالهم فإنهم متفقون في أمرين: الدعوة إلى التوحيد الخالص المتنقى من أدناس الشرك والبدعة، والدعوة إلى الكتاب والسنة والاجتناب عن الجمود والتقليد مع التمسك بطريقة السلف الصالح من الصحابة والتابعين والأئمة المجتهدين.

النهضة السلفية في الهند:

وقد أتم الله هذه النهضة في البلاد الهندية بعد وقعة بالا كوت ١٢٤٦هـ بالإمام الصدر الحميد محمد إسحاق ابن بنت الشاه عبد العزيز دهلوي (١٢٦٣هـ) ثم تلميذه الشيخ الإمام السيد محمد نذير حسين الدهلوي (١٣٢٠هـ) ثم تلاميذه الكرام الشيخ أستاذ الأساتذة محمد بشير السهسواني (١٣٢٦هـ) وشيخ الأستاذ الإمام عبد الله الغازيفوري (١٣٣٧هـ) و المجاهد الكبير الشيخ التقي إبراهيم الآروي، والثقة المجاهد الإمام عبد العزيز الرحيم آبادي.

الشيخ المحدث شريف حسين الدهلوي (١٣٠٤هـ) والإمام الحجة الشيخ شمس الحق الديانوي، والإمام عبد الرحمان المباركفوري (١٣٥٣هـ) وإمام الأتقياء الشيخ عبد الله الغزنوي وأبناءه الكرام، والأستاذ الكبير الإمام المحدث الحافظ عبد المنان الوزير آبادي (١٣٣٥هـ) والأستاذ الكبير الشيخ غلام حسن السيالكوتي، والشيخ المحامي الكبير الأستاذ عبد القادر القصوري، والشيخ إسماعيل الدلاوري، والأستاذ فضل الحق الدلاوري، والأستاذ عبد القادر الفشاوري، وكثير سواهم، لا يحصيهم إلا الله، قد أحاطوا أقطار الهند شرقا و غرباً، وجنوباً وشمالا، درساً وتعليماً، و تصنيفاً و تأليفاً رحمهم الله.

وقد اعتضد هذه النهضة حركة سلفية يمنية من تلامذة الإمام محمد بن علي الشوكاني (١٢٥٠هـ) قرأ عليه، ومكث عنده دهرا طويلا الشيخ الإمام القدوة عبد الحق البنارسي (١٢٨٦هـ) والمجاهد العظيم العلامة ولايت علي البهاري (١٢٦٩هـ) والعلامة الشاعر الشهير فاخر زائر إله آبادي، له ديوان في الدعوة إلى طريقة السلف وذم التقليد لخصه العلامة النواب صديق الحسن البوفالي، و حضرة النواب صديق الحسن أيضاً ممن استفاد من فيوض العلامة الشوكاني و الصنعاني، وأفاض علومه، وجاء بكتبه القيمة حين سافر إلى الحجاز.

المخالفون لهذه النهضة::

وقد خالف هذه الحركة فرق ثلاث:

الأول: الروافض، لأنهم خالفوا أئمة السنة قديماً و حديثاً في العقائد وميلهم العام إلى الاعتزال في الصفات وغيرها، وأئمتهم عندهم في الحقيقة أنبياء، وأعمالهم أيضاً

تخالف أهل السنة والحديث.

والثاني: هم دعاة البدعة في الهند، والمشركون عباد القبور، فإن دينهم العوام، كل ما تفعل العوام من القبائح والمعاصي فهؤلاء يطلبون لهم المآخذ والأدلة من الكتاب و السنة.

والثالث: الأحناف المنتسبون إلى فقهاء العراق، وهم شركاءنا في التوحيد، ومع هذا يدعون إلى التقليد والجمود خوفاً من التوهب، لأن لفظة الوهابية اشتركت بحسب العرف بين إخواننا النجديين الذين استفادوا العلم والخير من الإمام محمد بن عبد الوهاب الحنبلي وبين أصحاب الحديث الهند الذين فازوا بهذه النعمة عن إمام هذه النهضة وداعيها الإمام الشهيد إسماعيل بن عبد الغني بن شاه ولي الله السلفي.

وهؤلاء الفقهاء الأمجاد من أبناء ديوبند يخافون من الوهابية، ويرتعشون عنها، ويسبون الإمام محمد بن عبد الوهاب، عليه شآبيب رحمة الله.

يقول شيخ الجامعة الديوبندية السيد أنور شاه في كتابه فيض الباري (١/ ١٧١):

"أما محمد بن عبد الوهاب النجدي فإنه كان رجلا بليداً قليل العلم فكان يتسارع إلى الحكم بالكفر، ولا ينبغي أن يقتحم في هذا الوادي إلا من يكون متيقظاً متقنا عارفاً بوجوه الكفر وأسبابه" انتهى

و قالؒ: في حق تقوية الإيمان:

"في محق الرسومات كتاب للشاه إسماعيلؒ سماه: إيضاح الحق الصريح، وهو أجود من كتاب تقوية الإيمان، فإنه تحتوي على مضامين علمية، وكتابه تقوية الإيمان فيه شدة، فقل نفعه حتى أن بعض الجهلة رموه بالكفر من أجل هذا الكتاب" (فيض الباري على صحيح البخاري: ١/ ١٧٠)

هذا ما نصه الشيخ السيد أنور شاه الكاشميري في حاشيته على البخاري. نحن نعلم أن الاستاذ أنور من رجال العلم، له نظر بسيط في المتون و الأسانيد، وهو من فحول الحنفية تيقظاً و بصراً في الحديث، مع أنه شيخ الحديث في جامعة ديوبند، لم يفرق ولم يعثر على الفرق بين مقام العلم عامة، وبين مقام التجديد. فالعالم قد يفرح بعلمه المصطلح، ولا يتجاوز نظره إلى إصلاح ما أفسد الدهر من طبائع الناس فيتكلم بالعلم

المصطلح عنده غير ملتفت إلى ما تقتضيه الأحوال، فيقول بألفاظ درسية كلامية، ويفرح بما عنده من العلم متفوها بفوائد القيود متعرضاً إلى ما يتعارف الطلبة والمدرسون غير مبال بشدة المرض وأحوال المريض من الضعف والذبول فعلمه مع فرحه البالغ لا يفيد شيئاً، ولا يغني من جوع، والمجدد ينظر بدقة وغموض إلى ما ابتلي به العامة والخاصة من أمراض القلب وشيوع الضلال والجمود فيهم، وإلى علل و أسباب أنتجت فيهم هذه الكوارث المهلكة فيتكلم العامة بلسانهم والخاصة بلسانهم.

انظر إلى مجدد وقته إسماعيل الشهيد الدهلوي، تكلم رجالًا في "عبقاته"، وتكلم رجالًا في "تقوية الإيمان" فلسانه في كلا المقامين فيه تغاير بين، لو تكلم العامة بلسان "عبقات" ما أفاد شيئاً، ولم يرجع إلا بخفي حنين، ولو تكلم في عبقاته بما تكلم في تقوية الإيمان ما أفاد بفائدة، ولم يعد بعائدة، فإسماعيل مجدد الوقت عرف المقامين، وسبر الرجال، وأفاد كلا بما يجب له، والمسكين أنور شاه رحمه الله لم يرتفع مقامه من مقام التدريس، فهو صادق في مقامه غير ملام فيما قال، لأنه لم يمارس من مقاصد التجديد والإصلاح ما مارسه إسماعيل الشهيد.

وكذلك الإمام القدوة محمد بن عبد الوهاب هو إمام الحضر والبدو، لم يتكلم في لهجة المتكلمين والمناطقة، وهو ـ رحمه الله وأعلى الله مقامه ـ لم يكن مدرساً في الجوامع والمدارس، بل هو خالط الناس، وعرف أمراضهم الظاهرة والباطنة فكلمهم بلسان يفهمونه، وعالجهم بمعالجات قد تمرن وتدرب هو وأمثاله بها، والأستاذ الثقة أنور مدرس محقق في جزئيات الفقه، حافظ للكنز والهداية، فعرف دقائقها الفقهية، ومقام الإصلاح والتجديد أرفع منه بمرات، فإن المبتلى بالرخص المجرب للحيل لا يعرف مقام أرباب العزائم، ولا يعرج معارج أهل التجديد.

والعجب من جرأة الشيخ أنور أنه يزعم الإمام المجدد محمد بن عبد الوهاب "بليداً قليل العلم" والتجربة تشهد أن ذكاء الشيخ أنور و علمه لم يفد شيئاً سوى الجمود و التقليد، و محمد بن عبد الوهاب صار إمام النهضة، وأصلح الله به بلاد النجد واليمن

والحجاز، وتأثر من علومه السامية العراق والشام والمصر، وعم فيوضه إلى أقطار البلاد الشاسعة، فقلة علمه وبلادة طبعه أسمىٰ وأحسن من ذكاء الشيخ أنور، و علمه لم يتجاوز من الجزئيات الفقهية والمسائل الخلافية الفرعية.

واختلاف الروافض وتكفير أهل البدعة لا ينقص من مقام هذين الإمامين شيئاً. فمن الذي لم يكفروه؟ ومن الذي سلم من لسانهم؟ وظني أن من حرم من إيذاءهم فقد حرم رحمة الله الواسعة. فلينظر الأستاذ محمد أنور أنه مع ميله إلى البدعة وغموسه في بحار التصوف المصطلح المستحدث، هل سلم من فتاواهم؟ هل لم يكفروه وشيوخه؟

وقال الشيخ حسين أحمد ـرئيس التدريس في دار العلوم ديوبند، في رسالته "الشهاب الثاقب" (ص: ٤٦) حيث يذكر الإمام محمد بن عبد الوهاب النجدي فيقول: "اعلموا أن محمد بن عبد الوهاب ظهر أمره في أوائل القرن الثالث عشر في نجد، وكانت له عقائد فاسدة، ونظريات باطلة، فلذلك قتل، و قاتل أهل السنة، وأجبرهم أن يذعنوا لعقائده ونظرياته، وكان يستحل نهب أموالهم، ويظن أن في قتلهم أجرا وثواباً، سيما أهل الحجاز، فإنه آذاهم أشد الإيذاء، وكان يسب السلف الصالح، ويأتي في شأنهم بغاية سوء الأدب، وقد استشهد كثير منهم على يديه، والحاصل أنه ظالم باغ سفاك فاسق، ولذلك أبغضته العرب أشد من اليهود والنصارىٰ. (إلى آخر ما قاله مترجما وملخصاً)

والحق أن الاستاذ حسين أحمد سكن في المدينة المنورة سنين عديدة في زمن الشريف والأتراك، وهو قد عرف عقيدة الإمام محمد بن عبد الوهاب، وكتاب التوحيد للإمام محمد بن عبد الوهاب، وبعض شروحه قد طبعت مراراً في الهند، و وزعت مجاناً في مكاتب الهند ومدارسها، وقد عمت دراسة عقائد علماء النجد وتصانيفهم وتاريخ ملوكهم قبل ذلك بسنين، وكتاب ملوك العرب لأمين الدين الريحاني، وكتاب حاضر العالم الإسلامي ـ الترجمة العربية ـمن الأمير شكيب أرسلان مع حواشيه المفيدة العلمية طبعت وعمت حتى لم يخل عنه مكتبة في الهند ولا باكستان، فاعتذار بعض الناس أن الاستاذ حسين أحمد لم يعرف عقائد أهل نجد، ولم يطلع على نظرياتهم عذر لا يعبأ به ولا يعتمد عليه، بل الأستاذ خاف من أهل البدعة والشرك البريلويين، وارتعش أن ينسبه الناس إلى الوهابية، فسب الإمام وعلماء نجد، ونسب إليهم ما ليس فيهم.

أعاذنا الله من الجبن وسوء المنقلب.

ومن العجائب أن الاستاذ حسين أحمد قلما يذكر في كتابه "الشهاب الثاقب" أهل التوحيد والسنة إلا و يطعن فيهم بالوهابية، وقلما يذكرهم إلا ويصفهم بالوهابية الخبيثة. انظر: الشهاب (ص: ٥٩ سطر ٢٠ و ص: ٦٠ سطر ١٤ و ص: ٦١ سطر ٣) و قلما ذكرهم في هذا الكتاب إلا ونسبهم إلى الخبث، وذكر في الفرق بين الديوبندية والوهابية أنا نتوسل بالأنبياء بل برجال شجرة أهل التصوف كالچشتية والنقشبندية وما سواهما من مشائخ السلاسل، ويقول: والوهابية لا يتوسلون، وذكر أن الأنبياء أحياء عندنا حياة حقيقة غير برزخية، بل سعيه أنه يمد باعه إلى البريلوية، ويلقي عليهم إلقاء يقين أن الديوبندية والبريلوية سواء في تلك المسائل، والوهابية الخبيثية مخالفون لنا في ذلك!!

أنا ممن يعلم الأستاذ حسين أحمد، وأعرف أعماله السياسية القيمة، وأعلم ابتلاءه وامتحانه وأيامه في سلطة إنجليز لكن تعتريني حيرة واستعجاب من عصبيته وضيق صدره في المسائل الفرعية الفقهية ومجادلاته مع أهل التوحيد. أنا من محبيه بالغيبة، وإن لم أره، ولم أقرأ له كتابا إلا كتابه هذا: الشهاب الثاقب. أظنني شاكا في علمه و ذكائه وحدة نظره وغفلته عن عواقب هذه التعصبات، فإنه يقول قولًا سخيفاً أشبه بالكذب لا يبالي بما قال. يقول في كتابه هذا أن الوهابية يسيئون الأدب بحضرة النبيﷺ، ويقولون: ليس له علينا إلا فضيلة قليلة، وليس له علينا حق ولا إحسان، ولا يفيدنا شيئا بعد مونهﷺ. تقول أكابر الوهابية: إن عصاي هذه أنفع لنا من النبيﷺ أذود به الكلاب وأدفعهم به، والنبيﷺ لا ينفع شيئاً. (شهاب، ص: ٥٣)

قد رأينا كتب الشيخ محمد بن عبد الوهاب وأتباعه من علماء نجد، ما رأينا ذلك في كتبهم، ولم يحول لها حسين أحمد، ولا أحد من رفقاءه وتلاميذه، لعله رحمه الله تلمذ على إمام أهل البدعة الداعي إليها أحمد رضا البريلوي، وكذلك هو يتنفر من أهل الحديث السلفيين أشد النفار. ما أشبه كتابه هذا بكتب أحمد رضا وأتباعه، والله يهدي من يشاء إلى صراط مستقيم.

وخليل أحمد، و حسين أحمد، و حسين علي من كبراء ديوبند، فإنهم خوفاً من التوهب يسبون أهل التوحيد، ويعاندونهم كل العناد، فما بالهم وهداهم فروا من المطر

وقاموا تحت الميزاب!

يقول الشيخ أنور في مسألة زيادة الإيمان ونقصانه: أما الحافظ ابن تيمية فإنه وإن نسب الزيادة والنقصان إلى إمامنا ﷫ لكن في طبعه سورة وحدة، فإذا عطف إلى جانب عطف، ولا يبالي، وإذا تصدى إلى أحد تصدى ولا يحاشي، ولا يؤمن مثله من الإفراط والتفريط، فالتردد في نقله لهذا، وكان حافظاً متبحراً" (فيض الباري: ١/ ٥٩)

فلينظر العاقل العارف بأحوال الرجال: هل لرأيه هذا قيمة علمية؟ لعل الشيخ الأستاذ المغفور محمد أنور لم يعلم أن نقده هذا على ابن تيمية قد أسقط رتبته العلمية في أعين أهل المعرفة، ولعل أكثرهم يضحكون على رأيه السخيف الملوث بالعصبية. يطعن على ابن تيمية بالسورة، والحق أنه السائر والثائر عليه۔ رحمه الله۔ والعصمة لله، كيف اجترأ على تنقيص ابن تيمية، وهو الإمام الحجة الثقة المتقن الخواض في بحار العلوم، العارف بأقوال الرجال، واختلاف المذاهب. إن لم تؤمن على نقله فالعالم كله يؤمن بنقله، ويعتمدون على علومه الجمة الزاخرة، وهل هذا إلا سورة منك رحمك الله! نشأت بين العصبية المنتنة والبغض الشديد بأهل التوحيد والسنة المتمسكين بأذيال الدعوة السلفية، كأنك رحمك الله كوثري أوانك، وتركماني زمانك، لا تخاف في مؤمن إلا ولا ذمة؟

أيش تقول: إن محمد بن عبد الوهاب بليد قليل العلم، وتقوية الإيمان لشدته لم تفد شيئاً وابن تيمية لسورته لا تعتمد على نقله، أهذا علمك وذكاءك رحمك الله؟ ألا ترى أن التوحيد الخالص القرآني قد عم أقطار البلاد بمساعي هؤلاء الأئمة﷭؟ صدق المجربون: إن الخفاش لا تفيدها ضوء الشمس وإن كان نصف النهار.

والإمام الخطيب:

ولد رحمه الله ٣٩٢ھ والتحق إلى جوار رحمة الله ٤٦٣ھ وهذا أوان شيوع التقليد بعد ظهوره. ارتحل حفاظ الحديث وفقهاؤه والمحبون له واحدا بعد آخر، والجهل عم وطم، وحيث لا يجد الرجل السكون والطمانينة إلا بعلم غيره، وهو في ذاته لا يعرف الحق من الباطل، والنور من الظلمة، ينظر بعين غيره، ويسمع بسمع الغير، والقلب نائم غير يتفطن. إذا فقد الحديث فأين الفقه والدراية؟ إذا تهدم الجدار فالنقوش تابعة له.

والإمام الخطيب ينظر إلى هذه الطامة وهو حي يرزق، فلعله كتب هذا الكتاب "شرف أصحاب الحديث" يعظ الناس ويذكرهم أيام الحمى ونزول الحسان الأبرار فيها، ويهديهم إلى رجال العلم الذين تتجافى جنوبهم عن المضاجع، يذكرون الله قياما وقعودا وعلىٰ جنوبهم. يحفظون متون السنة وأسانيدها، يقودون الكرائم بأزمتها، ويحيطون النوارد برمتها، يذودون الأوابد عن حياض النبوة أن تردها، وينخلون الضعاف والأكاذيب أن تختلط بالصحاح والحسان، ليميز الله الخبيث من الطيب، ويحيىٰ من حي عن بينة ويهلك من هلك عن بينة، والله يختص برحمته من يشاء.

وبعين هذه النية تعرض الجمعية السلفية هذه الكراثة العظيمة الشريفة، ونرجوا من أرباب الخير القبول والإقبال، من قبل أن يأتي يوم لا بيع فيه ولا خلال، والحمد لله أولا وآخراً، والصلاة والسلام علىٰ رسوله محمد وآله وأصحابه واتباعه أجمعين.

إسماعيل بن إبراهيم السلفي، عفا الله عنهما وغفرلهما

ربيع الأول ١٣٨٤ھ جولائی ١٩٦٤ء

[جب اسلام کا ظہور ہوا، اس وقت مشرق ومغرب اور عرب وعجم کے آفاق و اکناف پر ظلمت و جہالت کے گہرے بادل چھائے ہوئے تھے، انسانیت کی قیادت کفر کے اماموں کے ہاتھوں میں تھی؛ جو ہر طرف سے جمود کا شکار تھے۔ آزادیِ فکر یہاں سے رخصت ہو چکی تھی، عقل وفکر کے چشمے خشک ہو چکے تھے اور اس (جامد ذہنیت) کا خاتمہ گوشۂ دیوار بن چکا تھا، تاکہ اللہ تعالیٰ کے اس فیصلے کی راہ ہموار ہو، جو اس نے روزِ اول سے کر رکھا تھا۔

پھر فاران کی چوٹیوں سے عقل و ذہانت کا سورج طلوع ہوا، جس کی کرنوں نے مکہ و مدینہ کی وادیوں، چوٹیوں اور اطراف و اکناف کو منور کر دیا اور زمین اپنے رب کے نورِ ہدایت سے چمک اٹھی، یہ نورِ ہدایت اور قرآن وسنت کی روشنی ہر طرف پھیل گئی، جس سے مشرق ومغرب نے روشنی اور راہنمائی حاصل کی۔ اس کے سامنے جہالت مدقوق اور کمزور ہوگئی، جہاں جہاں لشکرِ نبوت نے ڈیرے ڈالے، وہاں وہاں سے کفر و جمود نے اپنا بستر سمیٹ لیا اور تقلید و تنگ نظری شکست خوردہ ہو کر اِدھر اُدھر بکھر گئی۔

آزادیِ فکر:

قرونِ اولیٰ تک یہی روش رہی کہ علما سے پوچھا جاتا، لیکن کسی مخصوص شخص کی رائے کی پابندی نہیں کی جاتی تھی، اس وقت ایک سے بڑھ کر ایک عالم اور فقیہ موجود تھا، لیکن متاخرین فقہا اور اصولیوں کے ہاں جس

اصطلاحی اجتہاد کا ذکر کیا جاتا ہے، اس وقت اس کا وجود نہیں تھا۔ تقوے اور سلیم الفطرتی پر اعتماد ہوتا اور رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان ان کے نزدیک قاعدے کی حیثیت رکھتا تھا: «إنما شفاء العي السؤال» (رواہ أصحاب السنن) ''ناواقفیت کا علاج پوچھنا ہے۔''

اس وقت علما کثیر تعداد میں موجود تھے، ہر بستی اور ہر شہر میں صحابہ، تابعین اور تبع تابعین میں سے کوئی نہ کوئی عالم اور فقیہ مل جاتا، جو فقہ کی تعلیم دیتا، بسا اوقات وہ فتویٰ دے دیتے اور کبھی کسی دوسرے کی طرف بھیج دیتے۔ کبھی جواب دیتے اور کبھی عدمِ علم کا اعتراف کرتے ہوئے خاموشی اختیار کر لیتے۔ جب پوچھے گئے مسئلے میں انھیں قرآن و حدیث سے کوئی نص اور دلیل مل جاتی تو اس پر خوش ہوتے اور کسی شک اور تردد کے بغیر اس کے مطابق جواب دیتے۔ جب انھیں کسی نص کے بغیر کوئی فیصلہ دینا پڑتا اور اپنی رائے ظاہر کرنی پڑتی تو پھر وہ سوچتے اور مشورہ کرتے، اس کے بعد کوئی رائے ظاہر کرتے تو ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیتے: اگر یہ صحیح ہے تو اللہ کی طرف سے ہے، اگر غلط ہے تو میرے اور شیطان کی طرف سے ہے۔ بلکہ بعض صاف صاف کہتے: یہ ہماری رائے ہے، اگر تمھیں کوئی اس سے اچھی رائے مل جائے تو اس کو قبول کر لو، اگر تمھیں کوئی نص مل جائے، جو ہمارے قول کے مخالف ہو تو ہمارے قول کو دیوار پر دے مارو، تقلید ضروری نہیں ہے۔

ائمہ اربعہ اور اُن کے اکثر ساتھیوں کا یہی طرزِ عمل تھا، اس بارے میں ان کے واضح اقوال موجود ہیں، جنھیں سنن دارمی، ابن عبدالبر کی جامع بیان العلم وفضلہ، مجددِ ہند امام ولی اللہ دہلوی کی ''حجة اللّٰه البالغة''، شعرانی کی ''المیزان''، ابن قیم کی ''إعلام الموقعین'' اور اہلِ سنت کی دیگر بڑی بڑی کتابوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ تقریباً چوتھی صدی کے اواخر تک یہی حالات رہے۔ علما کسی مخصوص فرد کی تقلید کے جواز پر بھی اکٹھے نہیں تھے، وجوب یا اہلِ سنت کو ائمہ اربعہ یا دیگر کی تقلید میں محصور و مقید کرنا تو ایک طرف رہا، بلکہ اکثر اہلِ علم نے واضح الفاظ میں مخصوص و متعین شخص کی تقلید سے منع کیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول ہے:

''لا يقلدن أحدكم دينه رجلا، إن آمن آمن، وإن كفر كفر، فإنه لا أسوة في الشر''

''تم میں سے کوئی بھی اپنے دین میں کسی بھی آدمی کی تقلید نہ کرے کہ اگر وہ ایمان لائے تو وہ بھی ایمان لائے اور اگر وہ کفر کرے تو وہ بھی کفر کرے۔ برائی میں کوئی نمونہ نہیں۔''

عبداللہ بن معتز کا قول ہے:

''لا فرق بين بهيمة تنقاد وإنسان يقلد''

''ایک مطیع جانور اور مقلد انسان میں کوئی فرق نہیں۔''

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''عالم بن کر چل یا متعلم (سیکھنے والا) بن کر چل، ابن الوقت نہ بن۔''

سلمان رضی اللہ عنہ کا قول ہے:

''جہاں تک عالم کی لغزش کی بات ہے، اگر وہ صحیح بھی ہو تو اپنے دین میں اس کی تقلید نہ کرو۔''

"حجة الله البالغة" میں یواقیت و جواہر کے حوالے سے امام ابو حنیفہ کا قول منقول ہے، وہ کہا کرتے تھے:

''جو میری دلیل نہیں پہچانتا، اس کے لیے میرے کلام کے مطابق فتویٰ دینا جائز نہیں۔''

امام مالک رحمہ اللہ کا قول ہے:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا ہر ایک کے کلام سے لیا بھی جا سکتا ہے اور رد بھی کیا جا سکتا ہے۔''

امام شافعی رحمہ اللہ کا قول ہے: ''صحیح حدیث میرا مذہب ہے۔''

امام احمد فرماتے ہیں:

''میری تقلید کر نہ مالک کی نہ اوزاعی کی اور نہ نخعی کی، احکام کو وہیں سے لے جہاں سے اُنھوں نے لیا، یعنی کتاب و سنت سے۔''

ابو یوسف اور زفر وغیرہ سے منقول ہے کہ انھوں نے کہا:

''کسی کے لیے اس وقت تک ہمارے قول کے مطابق فتویٰ دینا جائز نہیں، جب تک وہ یہ نہ جان لے کہ ہم نے کہاں سے کہا ہے۔''

یہ اس مسئلے میں ائمہ کا مذہب اور طریق تھا۔ اب نا معلوم متاخرین کسی مخصوص عالم کی تقلید کے وجوب کو کہاں سے لے آئے ہیں؟!

ہماری مراد:

حقیقت وہی ہے، جو ہم عرض کر آئے ہیں، اہلِ حدیث اور تقلید کے علمبرداروں کے درمیان جنگ مسلسل جاری ہے، دونوں ایک دوسرے کو نقصان پہنچاتے رہتے ہیں۔ بادشاہوں، سلاطین اور احکام کے ساتھ تعلقات، قضا اور دیگر مناصب پر تقرری جیسے حاصل ہونے والے مادی اسباب کے حسبِ حال ان کی تعداد کم اور زیادہ ہوتی رہتی ہے۔

مقریزی نے اپنی کتاب ''خطط'' میں ذکر کیا ہے کہ اسلامی بلاد و ممالک میں حدیث کی جمع و تدوین عام تھی، اس پر عمل ہی ان کے ہاں اصل چیز تھی، جس طرح صحابہ کرام کے زمانے میں ہوتا تھا۔ لوگ ایک

حدیث کے حصول کے لیے کئی دنوں اور دور دراز کے علاقوں کا سفر کرتے، جو شخص کتبِ حدیث میں غور کرتا ہے، اور صحابہ و تابعین کی سیرت و سوانح سے کچھ واقفیت رکھتا ہے، وہ اس سے اچھی طرح آ گاہ ہے۔

پھر ہارون الرشید خلیفہ بنا تو اس نے ۱۷۰ھ کے بعد قاضی ابو یوسف کو قاضی القضاۃ مقرر کیا، اس وقت مصر، شام اور عراق میں اس کے حکم اور مشورے کے بغیر کوئی بھی قاضی نہیں بن سکتا تھا۔ یہ ان ممالک میں فقہ حنفی کے عام ہونے کا سبب بنا۔ اُندلس میں خلیفہ منتصر مرتضیٰ بن ہشام خلیفہ بنا اور اس نے یحییٰ بن یحییٰ بن کثیر کو قاضی مقرر کیا۔ یہ امام مالک کے شاگردوں اور ساتھیوں میں سے تھا، فتوے کی قیادت اس کے ہاتھ میں تھی، اس کے حکم اور مشورے کے بغیر کوئی قاضی مقرر نہیں ہوتا تھا، اس لیے وہاں اوزاعی کے بعد مالک کا مذہب غالب ہوگیا۔ افریقہ میں سنن اور آثار غالب تھے، یہاں تک کہ عبداللہ بن فروج وہاں حنفیت لے کر آیا۔ سحنون مالکیت لے کر آیا تو وہاں قضا اس کے اصحاب میں محصور ہوگئی، وہ دنیا پر اس طرح ٹوٹ پڑتے، جس طرح اونٹ برتن میں بچے ہوئے تھوڑے سے پانی پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔

محدثین بادشاہوں کے دروازوں کے چکر لگاتے نہ قضا کی تمنا رکھتے تھے، لیکن ائمہ کے اصحاب اور شاگرد ان کے پیچھے پیچھے دوڑتے تھے، اس لیے ان کو وہ رواج نصیب نہ ہوا، جو اَتباعِ مذاہب کو حاصل ہوا، وہ صرف اللہ کے فضل اور رحمت پر توکل رکھتے تھے، جیسے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«لا تزال طائفة من أمتي ظاهرين على الحق لا يضرهم من خذلهم»

''میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ حق پر ظاہر اور قائم رہے گا، ان کو چھوڑنے اور رسوا کرنے والے ان کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔''

اہلِ حدیث، سلفی، اثری، اصحابِ حدیث اور اہلِ سنت کے الفاظ مترادف ہیں، جو اسی حقیقت پر روشنی ڈالتے ہیں، جو ہم نے بیان کی ہے اور وہ خود اسلام کے مترادف اور ہم معنی ہے۔

یاد رہے! ہم لفظ اہلِ حدیث سے صرف ترکِ تقلید مراد نہیں لیتے، بلکہ اس کے بعد کتاب و سنت کی پیروی اور صحابہ کرام و تابعینِ عظام کے طریقے اور سمجھ کے مطابق کتاب و سنت کی نصوص کو سمجھنے کا التزام بھی ضروری قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک بے اصولی، خواہش پرستی اور رائے پسندی اصلاً ممنوع ہے۔ اس لیے اس سے احتیاط برتنی چاہیے۔

وہ ہمیشہ سے سنت کا دفاع، اس سے غلو پسندوں کی تحریف اور باطل پرستوں کی فرقہ بندی کی تردید کرتے آئے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو حفظ و ضبط، جمع و تدوین، درس و تدریس اور فقہ و درایت کے متعدد پہلوؤں

سے سنت کی خدمت کی توفیق عنایت فرمائی، گو اس کام میں اللہ کے فضل و احسان سے ائمہ کے بعض پیروکار بھی ان کے شریک رہے ہیں۔

کچھ کوتاہ فہموں کی یہ بات انتہائی زیادہ تسامح اور بھول پن پر مبنی ہے کہ وہ لوگ صرف اصحابِ فن اور حدیث کے حافظ تھے، فقہ و درایت سے اُنھیں کوئی سروکار نہیں تھا، ان کا کام حفظ و ضبط اور اسانید و رجال میں گفتگو سے آگے نہیں تھا۔ فہمِ حدیث اور معانی و مقاصد اور فقہ و درایت میں غور و فکر ان کے پیشِ نظر نہیں تھا۔ یہ ان کا محض وہم ہے، محدثین مصالح عامہ سے واقفیت رکھتے تھے اور اسلام کے مقاصد سے بھی اچھی طرح آگاہ تھے، اس میں انھوں نے بھرپور اجتہاد سے کام لیا اور مصالح شریعت کو مدِنظر رکھ کر فتوے دیے۔

یہ وہم یا تعصب کا نتیجہ ہے یا محدثین کے مجموعوں اور فرق و مذاہب کی تاریخ میں کوتاہ بینی کا شاخسانہ، کیوں کہ محدثین میں فقہا بھی گزرے ہیں، مورخین بھی اور قراء بھی، انھوں نے ہی فقہ کے اصول و قواعد کی تدوین و تہذیب کی، روایت کی درایت اور درایت کی روایت پر بنیاد رکھی، حدیث کی تدوین اور ابواب بندی کی اور فقہ و کلام کے سمندروں کی غوطہ زنی کی۔ ان میں سے اکثر ہر فن میں امامت کے درجے پر فائز تھے۔ علمی مباحث میں ان کی آزادیِ فکر اور دقتِ نظری کھل کر سامنے آتی ہے، وہی اہلِ سنت کے فلاسفہ اور متکلمین، اسلام کے ادبا اور مختلف فنون کے شاہسوار تھے۔ ائمہ اسلام نے کئی مواقع پر اس کا اعتراف کیا ہے۔

فقیہ، متکلم اور اشاعرہ کے امام ابوبکر محمد بن حسن بن فورک (۴۰۶ھ) کا قول ہے:

''اصحابِ حدیث کی دو اقسام ہیں: ایک گروہ نقل اور روایت کے ساتھ شغف رکھتا ہے، ان کی زیادہ توجہ نقلِ احادیث، طرق کے حصول، اسانید کے حصر اور صحیح اور ضعیف احادیث کے درمیان فرق کرنے پر مرکوز ہے، وہ اس کام میں طاق ہیں اور اس کی طرف نسبت رکھتے ہیں۔ دوسرے گروہ پر غور و فکر کرنے کے طریقوں، استدلالات، اصول کی بنیاد پر فروع کی ترتیب، تلبیس کاری کرنے والوں کے شبہات کے ازالے اور دلائل و براہین کی دلالتوں کو واضح کرنے کا رجحان غالب ہے۔''

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ اصحابِ حدیث کی دو اصناف ہیں: ایک صنف کا تعلق حفظ و ضبط سے ہے اور دوسری کا تعلق فکر و نظر سے، وہ اصول پر فروع کی ترتیب دیتے ہیں اور احکام کو علتوں کے ساتھ مربوط کرتے ہیں، یہ اصحابِ فقہ و نظر ہیں۔

امام عبدالکریم شہرستانی ''الملل والنحل'' میں لکھتے ہیں:

''ائمہ مجتہدین کی صرف دو اقسام ہیں، کوئی تیسری قسم نہیں، ایک اصحابِ حدیث، دوسرے اصحابِ رائے۔''

شہرستانی ایک نامور متکلم تھے، وہ اعتراف کرتے ہیں کہ اہلِ حدیث مجتہدین کی صنف سے تعلق رکھتے ہیں اور یہ معلوم ہے کہ شہرستانی کے زمانے میں مجتہد ایک ہی فن کے ساتھ مجتہد نہیں بن جاتا تھا، بلکہ اس کے لیے کئی فنون سے گزرنا ضروری تھا، بلکہ بعض میں مکمل مہارت ضروری ہوتی ہے، اگر مجتہد درپیش مسائل میں آزادی کے ساتھ سوچ نہ سکے اور عام لوگوں کی سوچ کو مدنظر رکھ کر غور نہ کر سکے تو اجتہاد کا کیا معنی رہ جاتا ہے؟!

شعرانی نے ابو بکر بن عیاش (۱۹۳ھ) کا یہ قول ذکر کیا ہے:

''اہلِ حدیث اہلِ اسلام میں تمام ادیان میں اسلام کی طرح ہیں۔''

ہم اس بحث کا خاتمہ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ حرانی کے اس قول کے ساتھ کرتے ہیں، جو انھوں نے ''منهاج السنة النبوية'' میں ذکر کیا ہے:

''اہلِ سنت والجماعت کا مذہب ایک قدیم مذہب ہے، جو اللہ تعالیٰ کے ابو حنیفہ، مالک، شافعی اور احمد کو پیدا کرنے سے پہلے سے معروف ہے، یہی صحابہ کرام کا مذہب ہے، جنھوں نے اسے اپنے نبی ﷺ سے لیا، جو اس کی مخالفت کرتا ہے، وہ اہلِ سنت والجماعت کے نزدیک بدعتی ہے۔''

ہم نے ائمہ کے جو اقوال نقل کیے ہیں، ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے اہلِ حدیث کو سنت کی خدمت اور اس کے الفاظ و معانی کے ضبط کے لیے مخصوص کیا ہے، لیکن وہ آزادانہ افکار کے مالک بھی تھے، جو لوگوں کے افکار و آرا کی تقلید سے یکسر آزاد تھے، ان کے افکار ائمہ تقلید کے افکار کے برابر، بلکہ رتبے میں ان سے بہت بلند ہیں، جب ہم اپنے آپ کو اہلِ حدیث، اہلِ اثر کی طرف منسوب کرتے ہیں یا اپنے آپ کو سلفی کہتے ہیں تو اس وقت ہم اسی حقیقت کا اظہار کرتے ہیں، اس میں تقلیدِ شخصی سے خبردار اور منع کیا جاتا ہے، جو صاف ذہنوں کے لیے سنت کی پیروی میں اور اسلاف کی اقتدا میں لا علاج مرض کی حیثیت رکھتی ہے۔

تحریک اتباعِ سنت و اقتدائے سلف:

ہماری گذشتہ معروضات سے ثابت ہوتا ہے کہ قرونِ اولیٰ اور اس کے بعد کئی صدیوں تک تمام مسلمان یا ان کی اکثریت مذکورہ معنی میں اہلِ حدیث ہی تھی۔ وہ اسلامی لشکر جنھوں نے ۹۲ھ میں نامور شاہسوار محمد بن قاسم کی زیرِ قیادت ہندوستان کے ساحلوں پر ڈیرے ڈالے، وہ افواجِ اسلام جنھوں نے امامِ عادل خلیفہ ثانی عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے عہدِ سعید میں ایران و افغانستان پر چڑھائی کی، وہ اموی سپاہ جس نے مغرب کے سمندروں کو عبور کیا، وہ سب اسلاف کے طریقے پر کاربند تھے اور اِن خود ساختہ تقلیدی مذاہب سے آزاد تھے، کیوں کہ یہ تمام واقعات پہلی صدی اور دوسری صدی کے آغاز میں رونما ہوئے اور اس وقت تک اللہ تعالیٰ نے ائمہ اربعہ کو پیدا

نہیں کیا تھا اور جو اس وقت پیدا ہو چکا تھا، وہ ابھی امامت اور قیادت کے درجے کو نہیں پہنچا تھا تو وہ تقلید اور ان کے مذاہب کی پابندی کہاں تھی، جس نے چوتھی صدی کے بعد ذہنوں کو جکڑا؟

اگر آپ سمجھدار مسلمانوں کے ذہنوں میں اس مصیبت اور آفت کی دراندازی اور سرایت کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں تو ذہبی کی "تذكرة الحفاظ" (١/ ١٥٨، ٢/ ٦٢٨ جديد) کا مطالعہ کریں، اگر آپ اُمت کے ان ذہین لوگوں کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں، جو اس مصیبت کے سامنے سپر انداز نہیں ہوئے تھے تو نواب صدیق حسن خان قنوجی کی "التاج المكلل" اور ائمہ حدیث و رجال کی دیگر کتب کا مطالعہ کریں۔

عہدِ متاخر کی ایک جماعت:

گیارھویں صدی کے آغاز میں ایک مدتِ مدید کے بعد ہندوستان میں جدید سلفی تحریک کے آثار ظاہر ہوئے، سب سے پہلے جس نے بدعتِ تقلید کی بندشوں کو توڑا اور آزادیِ فکر کی نوا بلند کی، وہ اس صدی کے مجدد اور اس تحریک کے سرخیل، مجدد الفِ ثانی سید احمد بن عبدالاحد فاروقی حنفی سرہندی (١٠٣٤ھ) تھے، وہ گو مسلکاً حنفی تھے، لیکن جمود کے سب سے بڑے دشمن تھے، ان کا سب سے بڑا ہدف مروجہ بدعات کا خاتمہ تھا۔ آگے چل کر بیہقیِ زمانہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی (١٢٢٥ھ) مرزا مظہر جانِ جاناں، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور اُن کے فاضل بیٹوں نے اس سوچ اور منہج کو آگے بڑھایا۔ ان سب نے حالات کی ناہمواری اور مساعدت کے باوجود رائج بدعات کی مخالفت کی اور ایک مخصوص مذہب کی تقلید اور پابندی کے خلاف آواز بلند کی۔

شاہ صاحب رحمہ اللہ نے "تفہیمات" میں ذکر کیا ہے کہ وہ فقہاے محدثین کے مذہب کو اختیار کرتے ہیں اور صوفیوں کی رسوم سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔ اس طرح ان کے فرزندوں نے فقہ اور اصولِ فقہ پر تنقید کی۔ ان کے حنفیت کی طرف رجحان سے دھوکا نہ کھائیں، یہ اس وقت کے حالات اور عوام کے رائج الوقت تقلیدی مزاج پر جمود کی وجہ سے تھا۔

رحمتِ الٰہی جوش میں آتی ہے:

گیارھویں اور بارھویں صدی میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر بڑی فیاضی کے ساتھ اپنی رحمت کی اور عرب و عجم پر اس کی شفقت کے سائے اُمنڈ آئے، اس وقت کئی دینی تحریکوں نے جنم لیا۔ نجد میں نجدی دعوت کی بہار آئی، اس دعوت کے امام نابغہ روزگار امام محمد بن عبدالوہاب نجدی تھے۔ سعودی عرب کے شاہی خاندان نے ان کی بھرپور مدد کی۔ ہمارے علم کے مطابق یہ دعوت پہلے خالص دینی دعوت تھی، اس کے بعد دینی سیاسی دعوت بن گئی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے خصوصی فضل و کرم سے ان علاقوں میں اس دعوت کو قبولیت بخشی، ان تمام ممالک میں

اس دعوت کے حامی اور ہمنوا موجود تھے اور یہ علاقے اب تک دعوتِ محمدی کے سب سے زیادہ قریب ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے حالات کی اصلاح فرمائے۔ ان کو فحاشی، عریانی، بدکاری، حیا باختگی، دین بے زاری اور اسلامی دعوت پر وطن پرستی کی ترجیح اور فرعونیت پسندی جیسی گمراہیوں سے محفوظ رکھے، جو ایک وبا کے طور پر پھیل رہی ہیں۔

دوسری دعوت: اسلامی بیداری اور وحدتِ امت کی تحریک جس کا آغاز زعیم اسلام جمال الدین افغانی نے سید محمد عبدہ، سید رشید رضا مصری اور اپنے شاگردوں اور ساتھیوں کے ساتھ مل کر کیا۔

تیسری دعوت: ہندوستان میں سلفی تحریک، ان تینوں تحریکوں کی کوششیں، اعمال اور حالات اگرچہ ایک دوسرے سے علاحدہ اور مختلف تھے، لیکن یہ سب تحریکیں دو مقاصد میں متفق تھیں: ایک شرک و بدعات کی گندگی سے پاک، خالص توحید کی دعوت اور دوسرے کتاب و سنت کی دعوت، تقلید و جمود سے اجتناب اور صحابہ کرام، تابعینِ عظام اور ائمہ مجتہدین کے منہج و مسلک کی پیروی۔

ہندوستان میں سلفی تحریک:

ہندوستان میں اللہ تعالیٰ نے اس تحریک کو واقعہ بالاکوٹ (۱۲۴۶ھ) کے بعد شاہ عبدالعزیز دہلوی (۱۲۶۳ھ) کے نواسے شاہ محمد اسحاق، پھر ان کے شاگرد سید نذیر حسین محدث دہلوی (۱۳۲۰ھ) اور ان کے شاگرد مولانا بشیر احمد سہسوانی (۱۳۲۶ھ)، حافظ عبداللہ غازی پوری (۱۳۳۷ھ) مجاہدِ اعظم مولانا ابراہیم آروی، مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی، مولانا شریف حسین محدث دہلوی (۱۳۰۴ھ)، مولانا شمس الحق ڈیانوی، مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری (۱۳۵۳ھ)، مولانا عبداللہ غزنوی اور ان کے قابل و فاضل بیٹوں، حافظ عبدالمنان وزیر آبادی، مولانا غلام حسن سیالکوٹی، مولانا عبدالقادر قصوری، مولانا اسماعیل دلاوری، مولانا فضل حق دلاوری، مولانا عبدالقادر پشاوری اور ان کے سوا بے شمار علمائے اہلِ حدیث کے ہاتھوں پورا کیا، جن کی تعداد اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ انھوں نے ہندوستان کے کونے کونے میں درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کے ذریعے علومِ سنت کا احیا اور قال اللہ و قال الرسول کی آوازیں بلند کر دیں۔

اس تحریک نے علامہ محمد بن علی شوکانی (۱۲۵۰ھ) کے شاگردوں پر مشتمل یمنی سلفی تحریک سے بھی بھرپور قوت حاصل کی۔ علامہ عبدالحق بنارسی (۱۲۸۶ھ) مجاہدِ عظیم مولانا ولایت علی بہاری (۱۲۶۹ھ) مشہور شاعر علامہ فاخر زائر الٰہی آبادی ایک مدت تک علامہ شوکانی کی صحبت سے مستفید ہوتے رہے۔ تقلید کی مذمت اور اسلاف کے منہج کی دعوت کے موضوع پر ان کا ایک دیوان ہے، نواب صدیق حسن خاں نے اس کی تلخیص کی ہے۔ علامہ نواب صدیق حسن خاں قنوجی بھی علامہ شوکانی کے فیوض و برکات سے مستفید ہونے والوں میں شامل ہیں، وہ جب حجاز گئے تو ان کی قیمتی کتابیں لے کر آئے۔

سلفی تحریک کے مخالفین:

تین گروہوں نے اس تحریک کی مخالفت کی، جو حسبِ ذیل ہیں:

① روافض: یہ زمانہ قدیم ہی سے ائمہ اہلِ سنت کے مخالف رہے ہیں اور صفات وغیرہ میں مسلکِ اعتزال کی طرف عمومی رجحان رکھتے ہیں، ان کے ائمہ ان کے نزدیک حقیقت میں انبیا ہیں۔ نیز ان کے تمام اعمال اہلِ سنت اور اہلِ حدیث کے خلاف ہیں۔

② ہندوستان میں بدعت کے علمبردار اور قبر پرست مشرک، ان کا دین عوام ہے، عوام جو گناہ اور برے اعمال کرتے ہیں، ان کا کام ان کے لیے کتاب وسنت سے دلائل تراشنا ہے۔

③ فقہاے عراق کی طرف نسبت رکھنے والے احناف، یہ توحید میں ہمارے شریک ہیں، اس کے باوجود وہابیت سے خوف کھاتے ہیں اور تقلید و جمود کی دعوت دیتے ہیں، کیوں کہ لفظِ وہابی عرفِ عام میں امام محمد بن عبدالوہاب نجدی سے علم و خیر کا استفادہ کرنے والے ہمارے نجدی بھائیوں اور ہندوستان کے اہلِ حدیث کے درمیان مشترک ہے، جو اس تحریک کے امام اور داعی شاہ اسماعیل شہید بن شاہ عبدالغنی بن شاہ ولی اللہ محدث سلفی کے توسط سے اس نعمت سے بہرہ مند ہوئے۔

یہ عظیم فقہا، فرزندانِ دیوبند وہابیت سے خوف کھاتے ہیں، یہ لفظ سن کر ان پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے اور امام محمد بن عبدالوہاب کو گالیاں دینا شروع کر دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان پر کروڑوں رحمتیں برسائے۔

دیوبند کے شیخ الحدیث علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ اپنی کتاب ''فیض الباری'' (۱/ ۱۷۱) میں لکھتے ہیں:

''محمد بن عبدالوہاب نجدی ایک کند ذہن اور کم علم آدمی تھا، وہ کفر کا حکم لگانے میں بہت جلد بازی سے کام لیتا، اس وادی میں اسی کو کودنا چاہیے، جو بیدار مغز، ماہر اور کفر کے وجوہ و اسباب کو اچھی طرح جانتا ہو۔''

''وہ ''تقویۃ الایمان'' کے بارے میں لکھتے ہیں:

''رسومات مٹانے میں شاہ اسماعیل کی ایک کتاب ہے، جس کا نام "إیضاح الحق الصریح" ہے، یہ تقویۃ الایمان سے زیادہ عمدہ ہے، کیوں کہ یہ علمی مضامین پر مشتمل ہے، لیکن ان کی کتاب تقویۃ الایمان میں ایک طرح کی شدت ہے، اس لیے اس کا فائدہ کم ہو گیا، بلکہ بعض جاہلوں نے ان کو اس کتاب کی وجہ سے کافر تک کہہ دیا۔''

یہ علامہ انور شاہ صاحب کے الفاظ ہیں، جو انھوں نے بخاری پر اپنے حاشیے میں درج کیے ہیں۔

ہم جانتے ہیں کہ علامہ انور شاہ صاحب نامور عالمِ دین ہیں، متون و اسانید پر گہری نظر رکھتے ہیں اور حدیث میں بصیرت رکھنے والے بلند پایہ اور ماہر حنفی علما میں شمار ہوتے ہیں۔ مزید برآں مدرسہ دیوبند کے شیخ الحدیث بھی ہیں، اس کے باوجود مقامِ تجدید اور عمومی طور پر مقامِ علم میں فرق بھانپ نہیں سکے۔ عالم بسا اوقات اپنے اصطلاحی علم پر خوش ہوتا ہے، لیکن اس کی نظر ان خرابیوں کی اصلاح تک نہیں پہنچ پاتی، جو لوگوں کی فطرتِ ثانیہ بن چکی ہوتی ہیں، وہ اپنے اصطلاحی علم کے مطابق گفتگو کرتا ہے، لیکن حالات کا کیا تقاضا ہے؟ اس سے اس کو کوئی سروکار نہیں ہوتا، وہ درس میں کلامی الفاظ استعمال کرتا ہے، اپنے علم پر نازاں ہوتا ہے، اساتذہ اور طلبہ کے ہاں متعارف علوم کے بارے میں بڑے نکتے بیان کرتا ہے، لیکن مرض کی کیا شدت ہے؟ مریض کس قدر کمزور ہو چکا اور مرجھا چکا ہے؟ اس کو اس کی کوئی پروا نہیں ہوتی تو اس کا علم اپنی فراواں خوشی کے باوجود کچھ سود مند ثابت نہیں ہوتا، لیکن مجدد بڑی گہرائی اور باریک بینی سے عام و خاص کے امراضِ قلب اور ان میں پھیلتی ہوئی گمراہی و جمود کا جائزہ لیتا ہے، وہ ان اسباب و نتائج پر غور کرتا ہے، جو ان میں ان ہلاکت خیز حوادث کا باعث بنتے ہیں۔ پھر وہ عوام کو عوام کی زبان میں اور خواص کو خواص کی زبان میں مخاطب کرتا ہے۔

اپنے وقت کے مجدد شاہ اسماعیل شہید دہلوی کو دیکھیں، جنھوں نے اپنی کتاب ''عبقات'' میں بھی ایک طبقے کو مخاطب کیا ہے اور ''تقویۃ الایمان'' میں بھی ایک طبقے کو، لیکن دونوں جگہوں پر ان کی زبان مختلف ہے اور اس میں واضح فرق نظر آتا ہے، اگر وہ عام لوگوں کو ''عبقات'' کی زبان میں مخاطب کرتے تو ان کو کچھ سمجھ نہ آتی، اسی طرح اگر ''عبقات'' میں وہ زبان استعمال کرتے، جو انھوں نے ''تقویۃ الایمان'' میں کی ہے تو اس کا کوئی فائدہ حاصل نہ ہوتا تو سید اسماعیل شہید، جو اپنے وقت کے مجدد تھے، دونوں مقامات اور اُن کے تقاضوں کو جانتے تھے، انھوں نے لوگوں کو اچھی طرح پرکھا اور ہر ایک کی ضرورت کے مطابق اس کو فائدہ پہنچایا، لیکن بے چارے انور شاہ صاحب مقامِ تدریس سے بلند نہیں ہو سکے، اس لیے وہ اپنے مقام پر سچے ہیں تو ان کی بات کا کیا برا منانا! تجدید و اصلاح کا جو کام سید اسماعیل شہید نے کیا، انھوں نے وہ شعبہ اختیار ہی نہیں کیا۔

اسی طرح امام اور قائد محمد بن عبدالوہاب جو شہریوں کے بھی امام ہیں اور دیہاتیوں کے بھی، انھوں نے بھی متکلمین اور منطقیوں کی زبان استعمال نہیں کی، آپ رحمہ اللہ کسی مسجد یا مدرسے میں مدرس نہیں تھے۔ آپ نے عوام کے ساتھ ملاپ رکھا، ان میں اُٹھے بیٹھے، ان کی ظاہری اور باطنی بیماریوں کی تشخیص کی، پھر ان کے ساتھ ان کی زبان ہی میں گفتگو کی اور ان کا وہی علاج کیا، جو مناسب تھا۔ دوسری طرف استاذ با اعتماد انور شاہ صاحب فقہی جزئیات کے محقق، کنز و ہدایہ کے حافظ اور فقہی دقائق کے رموز آشنا ہیں، لیکن مقامِ اصلاح و تجدید اس سے کہیں بلند ہے، رخصتوں اور حیلوں کے امراض میں مبتلا شخص اربابِ عزائم کے مقام کو پہچان سکتا ہے نہ اہلِ تجدید

کی بلندیوں کو چھو سکتا ہے!!

علامہ انور شاہ صاحب کی جرأت رندانہ پر تعجب ہوتا ہے، جو امام اور مجدد محمد بن عبدالوہاب کو کند ذہن اور کم علم خیال کرتے ہیں، جب کہ تجربہ گواہی دیتا ہے کہ علامہ صاحب کی ذہانت اور علم نے تقلید و جمود کے سوا کوئی فائدہ نہیں دیا، لیکن دوسری طرف محمد بن عبدالوہاب تحریکِ تجدید کے امام بن گئے، اللہ نے ان کے ہاتھوں یمن و حجاز کی قسمت پھیر دی۔ عراق و شام و مصر ان کے بلند و مبارک علوم سے مستفید ہوئے اور ان کے فیوض و برکات دور دور تک پھیل گئے۔ ان کی کم علمی اور کند ذہنی علامہ انور صاحب کی ذہانت اور علم سے کہیں بہتر اور اعلیٰ ہے، جو فقہی جزئیات اور فروعی اختلافی مسائل سے آگے نہیں بڑھ سکا!

روافض کا اختلاف اور اہلِ بدعت کی تکفیر ان دونوں اماموں کی شان میں کوئی کمی نہیں کرتی، کس کو انھوں نے کافر نہیں کہا؟ کون ان کی زبان سے محفوظ رہا ہے؟ میرے خیال میں جو ان کی ایذا رسانی سے محروم ہے، وہ اللہ کی رحمت سے محروم ہے۔ خود علامہ انور شاہ صاحب ہی دیکھ لیں، جو بدعت کی طرف رجحان رکھنے اور خود ساختہ تصوف کے سمندر میں غوطہ زن ہونے کے باوجود کیا ان کے فتوؤں سے محفوظ رہ سکے ہیں؟ کیا انھوں نے ان کو اور اُن کے شیوخ کو کافر نہیں کہا؟

علامہ حسین احمد مدنی (صدر مدرس دارالعلوم دیوبند) اپنے رسالے ''شہابِ ثاقب'' کے صفحہ (۴۶) پر امام محمد بن عبدالوہاب کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''تیرھویں صدی کے اوائل میں محمد بن عبدالوہاب کی تحریک کا آغاز ہوا، اس کے عقائد و نظریات فاسد اور باطل تھے، اس لیے اس نے لڑائیاں لڑی، اہلِ سنت کو قتل کیا، ان کو اپنے عقائد و نظریات قبول کرنے پر مجبور کیا، وہ ان کا مال لوٹنا حلال سمجھتا تھا، ان کو قتل کرنا بالخصوص اہلِ حجاز کو مارنا کارِ ثواب سمجھتا تھا، اس نے ان کو سخت اذیتیں پہنچائیں، وہ سلف صالحین کو گالیاں دیتا تھا، ان کی گستاخیاں کیا کرتا تھا اور ان میں سے بہت سے لوگ اس کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ مختصراً وہ ظالم، باغی، سفاک اور فاسق تھا، اس لیے عرب اس سے یہود و نصاریٰ سے بھی زیادہ نفرت کرتے تھے....''

حالاں کہ سچ یہ ہے کہ مولانا حسین احمد مدنی کئی سالوں تک شریفِ مکہ اور ترکیوں کے زمانے میں مدینہ منورہ سکونت پذیر رہے ہیں۔ وہ امام محمد بن عبدالوہاب کے عقیدے سے آگاہ تھے۔ امام محمد بن عبدالوہاب کی ''کتاب التوحید'' بعض شروح سمیت ہندوستان میں کئی مرتبہ چھپی اور مفت تقسیم ہوئی ہے۔ نیز علمائے نجد کے عقائد، تصانیف اور اُن کے بادشاہوں کی تاریخ کا مطالعہ عام تھا۔ امین الدین ریحانی کی کتاب ''ملوك العرب''

اور امیر شکیب ارسلان کی کتاب "حاضر العالم الإسلامي" اپنے مفید اور علمی حواشی سمیت مطبوعہ اور عام تھیں اور ہندوستان کا کوئی مکتبہ ان سے خالی نہیں تھا، اس لیے کسی کا یہ عذر پیش کرنا کہ مولانا حسین احمد مدنی اہلِ نجد کے عقائد سے آگاہ نہیں تھے اور اُن کے نظریات سے واقفیت نہیں رکھتے تھے، ایک ناقابلِ اعتماد عذر ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ مولانا بدعتیوں، مشرکوں اور بریلویوں سے ڈرتے تھے کہ کہیں وہ ان کو وہابیت کی طرف منسوب نہ کر دیں، اس لیے انھوں نے امام محمد بن عبدالوہاب اور علماے نجد کو گالیاں دیں اور اُن کی طرف ایسی خصلتیں منسوب کر دیں، جو ان میں موجود نہیں تھیں۔ اللہ تعالیٰ بد انجامی اور بزدلی سے بچائے!

کتنی عجیب بات ہے کہ مولانا حسین احمد مدنی جیسے ہی اپنی کتاب شہابِ ثاقب میں اہلِ توحید وسنت کا ذکر کرتے ہیں تو ان پر وہابیت کی تہمت لگا دیتے ہیں، انھیں جہاں ذکر کرتے ہیں خبیث وہابی کہہ کر پکارتے ہیں۔ دیکھیں (ص: ۵۹ سطر ۲۰، ص: ۶۰ سطر ۱۴، ص: ۶۱، سطر ۳)۔ پھر دیوبندیت اور وہابیت کے درمیان فرق کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ہم انبیا کے وسیلے کے قائل ہیں، بلکہ اہلِ تصوف کے تمام سلسلوں جیسے چشتی، نقشبندی اور دیگر سلسلے ہیں، ان سب کے وسیلے کے قائل ہیں، لیکن وہابی وسیلے کے قائل نہیں، پھر وہ ذکر کرتے ہیں کہ ہمارے نزدیک انبیاے کرام حقیقی زندگی کے ساتھ زندہ ہیں، برزخی زندگی کے ساتھ نہیں۔

وہ بریلویوں کو یہ باور کروانے کی پوری کوشش کرتے ہیں کہ ان مسائل میں بریلویت اور دیوبندیت دونوں برابر ہیں، صرف خبیث وہابی ان مسائل میں ہمارے مخالف ہیں!

میں مولانا حسین احمد مدنی کو اچھی طرح جانتا ہوں، ان کے عظیم الشان سیاسی کارناموں سے آگاہ ہوں، انگریزی دور میں ان کی ابتلا و آزمایش سے بھی واقف ہوں، لیکن مجھے ان کے تعصب، تنگ نظری، ان فروعی فقہی مسائل میں شدت پسندی اور اہلِ توحید کے ساتھ مخاصمانہ رویے پر انتہائی حیرت ہوتی ہے۔ میں نے اُنھیں نہیں دیکھا، لیکن میں ان کی غیر موجودگی میں ان کا قدر دان ہوں، میں نے ان کی ایک کتاب "شہابِ ثاقب" ہی پڑھی ہے تو مجھے ان کے علم، ذکاوت اور عاقبت اندیشی میں شک محسوس ہونے لگا ہے اور یوں لگتا ہے جیسے وہ ان تعصبات کے انجام بارے آگاہ نہیں تھے! وہ انتہائی سخیف باتیں کر جاتے ہیں، جو جھوٹ سے ملتی جلتی ہیں، لیکن اُنھیں کوئی پروا بھی نہیں ہوتی، مثلاً: وہ اپنی اس کتاب میں لکھتے ہیں:

> "وہابی رسول اللہ ﷺ کی گستاخی کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ نبی کو ہم پر کچھ ہی برتری حاصل ہے، آپ ﷺ کا ہم پر کوئی حق ہے نہ احسان، آپ اپنی موت کے بعد ہمیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکیں گے، وہابیوں کے اکابرین کا کہنا ہے کہ میری یہ لاٹھی نبی اکرم ﷺ سے زیادہ مفید ہے، اس سے میں

کتوں کو ڈراتا اور دور کر سکتا ہوں، لیکن نبی کوئی فائدہ نہیں دیتے۔''

ہم نے علامہ محمد بن عبدالوہاب کی کتابیں بھی پڑھی ہیں اور ان کے پیروکار نجدی علما کی بھی، ہمیں تو ایسی کوئی بات ان کی کتابوں میں نہیں مل سکی! پھر حیرت ہے مولانا مدنی نے کوئی حوالہ دیا ہے نہ ان کے کسی ساتھی اور شاگرد ہی نے۔ لگتا ہے انھوں نے امامِ بدعت احمد رضا بریلوی کی شاگردی اختیار کی ہوئی ہے۔ اسی طرح ان کو اہلِ حدیث اور سلفیوں سے بھی شدید نفرت ہے، ان کی یہ کتاب احمد رضا اور اس کے پیروکاروں کی کتابوں کا رنگ لیے ہوئے ہے۔

مولانا خلیل احمد، حسین احمد اور حسین علی اکابرینِ دیوبند میں شمار ہوتے ہیں اور یہ سب وہابیت کے الزام کے خوف سے اہلِ توحید کو دشنام طرازی کرتے ہیں اور ان کے خلاف شدید عداوت رکھتے ہیں، ان کا حال تو یہ ہے، کہ بارش سے بھاگے تو پرنالے کے نیچے آ کھڑے ہوئے!

علامہ انور شاہ صاحب ایمان میں کمی بیشی کے مسئلے پر بات کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''حافظ ابن تیمیہ نے اگرچہ ایمان میں کمی بیشی کی نسبت ہمارے امام کی طرف کی ہے، لیکن وہ تیز مزاج تھے اور گھڑی میں ماشہ گھڑی میں تولہ ہو جاتے، جس کی طرف جھکتے تو جھکتے ہی جاتے، جس کے خلاف ہو جاتے تو اس کو قطعاً نہ بخشتے۔ جو اس مزاج کا حامل ہو، وہ افراط وتفریط سے محفوظ نہیں ہوتا، اس لیے ان کی نقل کی صحت میں تردد ہے، اگرچہ وہ حافظ اور عالم متبحر تھے۔''

صاحبِ عقل اور رجال کے حالات سے واقف انسان غور کر کے بتائے کہ کیا ان کی اس رائے کی کوئی علمی قدر و قیمت ہے؟ شاید علامہ مرحوم کو علم نہیں کہ ان کی اس تنقید نے اہلِ معرفت کی نگاہوں میں ان ہی کے علمی رتبے کو گرا دیا ہے۔ شاید اکثر ان کی اس سخیف اور تعصب آلودہ رائے پر ہنستے ہوں، وہ ابن تیمیہ کو تلون مزاجی کا الزام دے رہے ہیں، لیکن حقیقت میں وہ خود ان کے خلاف اپنی بھڑاس نکال رہے ہیں۔ عصمت تو اللہ ہی کے لیے ہے، لیکن ان کو ابن تیمیہ پر تنقید کی جرأت کیسے ہوئی، جو امام، حجت، علوم کے پختہ اور جامع، عالم، اقوالِ رجال اور اختلافِ مذاہب سے پوری واقفیت رکھتے تھے؟ اگر آپ کو ان کے نقل اور حوالے پر اعتماد نہیں تو کیا ہوا، ساری دنیا ان کی نقل پر اعتماد اور ان کے وسیع علوم پر اعتبار کرتی ہے۔

یہ مولانا صرف آپ کی تیز مزاجی اور چشم آلودی ہے اور اللہ آپ پر رحم کرے، مسئلہ یہ ہے کہ آپ نے سلفی دعوت کے حاملین اور توحید وسنت کے متوالوں کے خلاف نفرت بھرے ماحول میں تربیت پائی ہے۔ یوں لگتا ہے، جیسے آپ اپنے زمانے کے کوثری اور اپنے وقت کے ترکمانی ہیں، آپ کو کسی اسلامی رشتے ناتے کا کوئی خیال نہیں!

یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں کہ محمد بن عبدالوہاب کند ذہن، کم علم ہیں، تقویۃ الایمان نے اپنی شدت پسندی کی وجہ سے کوئی فائدہ نہیں پہنچایا۔ امام ابن تیمیہ کی تنگ مزاجی کی وجہ سے ان کی نقل پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا؟! کیا یہ آپ کی ذہانت اور علم ہے! اللہ آپ پر رحم کرے! کیا آپ دیکھتے نہیں کہ خالص قرآنی توحید ان ائمہ کی کوششوں کے نتیجے میں اطرافِ عالم میں پھیل چکی ہے؟! تجربہ کاروں نے کیا خوب کہا ہے کہ سورج نصف النہار پر بھی ہو تو چمگادڑ کو اس کی روشنی کوئی فائدہ نہیں دے پاتی!

امام خطیب بغدادی:

۳۹۲ھ کو ان کی ولادت ہوئی اور یہ ۴۶۳ھ ہجری میں اپنے خالق کو پیارے ہوگئے۔ یہ تقلید کے عہد کے بعد اس کے عام ہونے کا وقت تھا۔ حفاظِ حدیث اور فقہا ایک ایک کر کے اس دنیا سے کوچ کر گئے تھے، جہالت کا راج قائم ہو چکا تھا، آدمی دوسرے کے علم پر اعتماد کرتا تھا، لیکن خود اس کو حق و باطل اور نور و ظلمت کی کوئی پہچان نہیں تھی، وہ دوسرے کی آنکھ سے دیکھتا اور اس کے کان سے سنتا۔ دل سویا اور خوابِ غفلت میں کھویا ہوا تھا، جب حدیث ہی نہ رہے تو فقہ و درایت کس کام کی اور کہاں ملے گی؟! اگر دیوار گر جائے تو نقوش اس کے تابع ہوتے ہیں!

امام خطیب اپنی زندگی میں اس مصیبت کو دیکھتے، شاید انھوں نے یہ کتاب یعنی "شرف أصحاب الحدیث" لوگوں کو وہ سنہرے دور کے بارے بتانے کے لیے تحریر کی تھی، جن کے پہلو رات کے وقت بستر پر نہیں لگتے تھے، وہ کھڑے بیٹھے اور پہلو کے بَل اللہ کو یاد کرتے تھے، انھوں نے سنت کے متون اور اسانید کی حفاظت میں دن رات ایک کر دیے، بکھرے ہوئے معارف کو یکجا کیا، نبوت کے مقدس حرم کا دفاع کیا اور کسی بدکے ہوئے کو اس کی طرف رخ کرنے کی اجازت نہ دی۔ صحیح اور حسن احادیث کو کمزور اور موضوع روایات سے چھان پھٹک کر علاحدہ کیا، تاکہ خبیث اور طیب علاحدہ علاحدہ ہو جائیں، جو زندہ رہے تو دلیل کے ساتھ اور جو مرے تو دلیل کے ساتھ، اللہ جس کو چاہتا ہے، اپنی رحمت کے لیے خاص کر لیتا ہے۔

اسی نیت و ارادے کے ساتھ جمعیت اہلِ حدیث یہ عظیم الشان رسالہ پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہی ہے اور اربابِ خیر سے اُمید ہے کہ وہ اس پر توجہ دیں گے۔

والحمد للّٰہ أولًا و أخیراً، و الصلاۃ والسلام علیٰ رسولہ محمد وآلہ وأصحابہ وأتباعہ أجمعین] ۔

پیش لفظ:

معیار الحق

(تالیف: میاں نذیر حسین محدث دہلوی۔ ناشر: مکتبہ نذیریہ لاہور ۱۹۶۵ء)

الحمد لله رب العالمين، والصلاة والسلام على رسوله خاتم النبيين، وعلىٰ أتباعه الهادين المهديين، من الصحابة والتابعين، ومن بعدهم من الغارة الغر المحجلين، سيما الأئمة المجتهدين ومن معهم من الفقهاء المحدثين، وأتباعهم من أئمة السنة ورواة الملة المجاهدين في سبيل الدين، اللهم صل عليه وعلىٰ آله وأتباعه وأزواجه وذرياته أجمعين الىٰ يوم الدين.

ائمہ سنت کے نزدیک بنیادی اصول چار ہیں۔ تمام دینی مسائل میں ان کی طرف رجوع کیا جاتا ہے: قرآن وسنت، اجماع امت اور قیاس۔ ان میں بھی اصل قرآن وسنت ہے۔ اجماع اور قیاس کا ماخذ بھی قرآن وسنت ہے۔ کتاب وسنت کے خلاف نہ اجماع ہوسکتا ہے نہ قیاس۔ قرآن وسنت دونوں کی حفاظت کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے لے لیا ہے۔ حفاظِ قرآن نے قرآن کے الفاظ کو حفظ کیا ہے اور الفاظ کے مختلف لہجوں کو ضبط کیا، حرکات وسکنات کو پوری احتیاط سے امت تک پہنچایا۔ فصحاے عرب اور جن قبائل اور علاقوں کی زبان مستند تھی، قرآنِ عزیز کی قراءت میں اس کا پورا پورا خیال رکھا۔ آج پوری ذمے داری سے کہا جا سکتا ہے کہ قرآنِ عزیز ہمارے پاس پوری طرح محفوظ ہے، اس میں کمی ہوئی ہے نہ زیادتی۔

حفاظِ حدیث نے سنت کے متون اور اسانید کو پوری ذمے داری اور محنت سے ضبط کیا، جیسے قرآنِ عزیز میں بعض لوگوں نے خبط پیدا کرنے کی کوشش کی، اسی طرح سنت میں بھی بعض غلط کار، اہوا پرست اور تعصب پسند حضرات نے وضع وتخلیق کا سلسلہ شروع کر دیا اور سیکڑوں احادیث بنا ڈالیں۔ آنحضرت ﷺ اپنے مقام کو سمجھتے تھے، قرآنِ عزیز کی صریح نصوص اس کی موید تھیں کہ آنحضرت ﷺ کا قول، فعل، سکوت، اجتہاد؛ سب حجتِ شرعی ہیں، یقیناً لوگ اس مقامِ رفیع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں گے اور غلط چیزیں آں حضرت ﷺ کی طرف منسوب کر کے اپنی بدعات اور خرافات کی ترویج کے لیے بہانہ تلاش کریں گے۔ حضرت ﷺ نے پوری

صاف گوئی سے اس کے عواقب کو واضح فرمایا:

عن جابر قال: قال رسول اللهﷺ: «من كذب علي متعمدا فليتبوأ مقعده من النار» [1]

''جس نے جان کر میری طرف کوئی جھوٹی اور غلط بات منسوب کی، اسے اپنا مقام جہنم میں بنانا چاہیے۔''

یہ حدیث حضرت جابر، ابن عباس، حضرت زبیر، حضرت سمرہ، حضرت انس بن مالک، ابو قتادہ وغیرہم رضی اللہ عنہم سے دارمی اور سنت کے باقی دفاتر میں بتواتر منقول ہے۔ اس کے بعد اس آبروباختہ گروہ نے آنحضرت ﷺ کی طرف غلط چیزیں منسوب کیں، خود عذابِ الیم میں مبتلا ہوئے اور عوام کے لیے گمراہی کا سامان بہم پہنچایا۔ اللہ تعالیٰ نے ائمہ حدیث اور حفاظِ سنت کو توفیق مرحمت فرمائی، انھوں نے چھان پھٹک کر سچ اور جھوٹ کو الگ الگ کر دیا۔

اس وقت تین قسم کا ذخیرہ امت کے پاس موجود ہے:

1. بالکل صحیح، جہاں انسانی کوشش اور امکان کی حد تک صحیح احادیث کو ضعاف اور اکاذیب سے الگ کر دیا گیا ہے۔
2. موضوع اور مختلق، جسے چھانٹ کر الگ موضوعات کے نام سے شائع کر دیا گیا ہے۔ اس میں ان لوگوں کی نشان دہی بھی کر دی گئی ہے، جنھوں نے اس معصیت کا ارتکاب کیا ہے، تاکہ چور کے ساتھ وہ مال بھی برآمد ہو جائے، جسے چرا لیا گیا ہے۔ اللھم برد مضاجعھم، وارفع درجاتھم.
3. مخلوط مواد، ایسا ذخیرہ جس میں صحیح، ضعیف، مختلق؛ ہر قسم کی احادیث موجود ہیں، جو اہلِ علم کو محنت اور بصیرت کی دعوت دے رہی ہیں۔ طالبِ حق ان اسباب اور ذرائع کو استعمال کریں، جو حق و باطل کی پہچان کے لیے بنائے گئے ہیں اور کھرا اور کھوٹا الگ الگ کر لیں۔

یہ دین کی بہت بڑی خدمت تھی، جو صدیوں کی محنت اور دیدہ ریزی سے کی گئی، گویا علمائے امت کے ان کارناموں کی بدولت ہمیشہ کے لیے امت کو آنحضرت ﷺ کی زیارت نصیب ہوئی۔

اس حفاظت کا تعلق صرف قوتِ حافظہ سے ہی نہیں، بلکہ اُمت نے اس کے لیے کئی جدید علوم ایجاد کیے، علمِ رجال، علمِ موالید، علمِ وفیات، معرفت البلدان، علم الآباء والابناء، کتابت میں مخصوص اصطلاحات، علمِ اصولِ حدیث؛ یہ تمام علوم اور ان کے علاوہ کئی فنون کی ایجاد صرف اسی فن کی حفاظت کے لیے کی گئی۔ شروحِ حدیث، لغۃ الحدیث، سنن اور جوامع، احکام، معاجم، اطراف؛ غرض کئی قسم کے تحفظات تھے، جو اُمت نے اس فن کی افادیت و قدردانی کے لیے ایجاد فرمائے۔ یہ سب اسی لیے تھا کہ مقامِ نبوت کی معرفت اور حفاظت اسی صورت میں ہو سکتی تھی کہ یہ فن محفوظ رہے۔ اگر حدیث شرعی حجت نہ ہوتی، اس کی حیثیت عام تاریخی ذخیرے کی ہوتی تو

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۱۱۰) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۵۸٤٤)

ان خطیر مساعی اور عظیم الشان تحفظات کی قطعاً ضرورت نہ تھی۔ انسانیت کا تقاضا ہے کہ اپنے اکابر کی اس میراث کی حفاظت کی جائے، کیوں کہ مقامِ نبوت اور دین کی حفاظت کا اصل طریق یہی ہے۔

تفقہ فی الدین:

قرآن اور سنت کی حفاظت کے باوجود دنیا کے حوادث لا متناہی ہیں اور کتاب وسنت کی راہنمائی کے سوا ان حوادث سے عہدہ برآ ہونا ممکن نہیں، اس لیے لازماً اہلِ علم اور اصحابِ بصیرت کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ قرآنِ عزیز کا ارشاد ہے:

﴿فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ بِالْبَيِّنٰتِ وَ الزُّبُرِ﴾ [النمل: ٤٣۔ ٤٤]

’’جب کسی چیز کا علم نہ ہو تو اہلِ علم کی طرف رجوع کرو۔‘‘

آنحضرت ﷺ نے فرمایا: «إنما شفاء العي السؤال» [1]

’’انجان آدمی کے لیے صحت مند طریقہ یہی ہے کہ وہ اہلِ علم کی طرف رجوع کرے۔‘‘

یہ ایک فطری جذبہ تھا۔ ہر زمانے میں اہلِ علم نے اس ذمے داری کا احساس فرمایا۔ وقت کی ضرورت اور ماحول کے مطابق کتاب وسنت کے تقاضوں کو پورا فرمایا۔ آوارگی سے بچتے ہوئے غیر منصوص حوادث کے فیصلے نصوص، یعنی کتاب وسنت کی روشنی میں کیے اور اس کے ساتھ وقت کے مصالح اور ضرورتوں کو پوری طرح ملحوظ رکھا۔

صحابہ، تابعین، تبع تابعین کی زندگیاں اسی میں صَرف ہوئیں۔ ہر شہر میں، ہر علاقے میں حاجت مند اپنی مشکلات میں علما کی طرف رجوع کرتے رہے، بلکہ خود اہلِ علم دوسرے اہلِ علم سے مستفید ہوتے رہے اور تمام لوگ بلا تعصب اور بلا تخصیص اپنے اپنے علاقے اور ماحول کے علما سے مسائل پوچھتے رہے اور ان کے مطابق عمل کرتے رہے۔ اگر کسی مسئلے میں اختلاف ہوا تو اسے فرقہ بازی کا رنگ نہیں دیا گیا، بلکہ اساتذہ اور تلامذہ ایک دوسرے کے خلاف فتوے دیتے رہے اور اسے گوارا کیا گیا۔ صحابہ اور تابعین کے بعد ائمہ اربعہ اور ان کے شاگردوں میں بھی یہی صورت جاری رہی۔ مذاہبِ اربعہ کی مروجہ کتبِ فقہ اس کی شاہد ہیں۔ ہر ایک کے فتوے ایک دوسرے کے خلاف ان میں مرقوم ہیں۔ آزادیِ فکر اور اصلاح وتجدید کا یہ واجبی تقاضا تھا کہ آنحضرت ﷺ کے بعد کلی طور پر کسی کی اطاعت نہ کسی پر فرض ہو نہ واجب۔ یہ عقیدت کی وابستگی اِباحت سے آگے نہیں بڑھنی چاہیے۔ اطاعت کے وجوب وفرضیت کا مقام آنحضرت ﷺ کے لیے مخصوص رہنا چاہیے۔ مقامِ نبوت کا یہ تقاضا قطعاً قابلِ تقسیم نہیں۔ جو اطاعت کا مقام آنحضرت ﷺ کو حاصل ہے، وہ کسی کو امت سے حاصل نہیں ہوسکتا۔

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٣٦) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٥٧٢)

یہ صورتِ حال پہلی صدی سے چوتھی صدی تک بدستور جاری رہی۔ علما کے ساتھ عقیدت، مشکلات میں ان کی طرف رجوع، ان کا احترام؛ یہ دین کا مزاج ہے۔ اس لیے علما کے ساتھ عقیدت تو قدرتی چیز تھی، بتدریج اس میں غلو آنے لگا، جن ائمہ سے تعلق تھا، ان کے مقابل دوسرے ائمہ سے عقیدت کم ہونے لگی، بلکہ تنقید اور تیزی کے اثرات بھی زبان اور قلم سے ظاہر ہوتے رہے۔

فقہائے حنفیہ نے اصولِ فقہ میں ایسے جذبات کا کافی اظہار فرمایا اور شیخ ابوبکر محمد بن عبداللہ بن محمد بن العربی (متوفی ۵۴۳ھ) کی تصنیفات میں امام شافعی، ابن حزم وغیرہ ائمہ کے خلاف لہجہ خاصا تلخ ہے، اس قسم کی تلخی چوتھی صدی سے پہلے کم ہے۔ جونہی دنیا میں تقلید کا رواج ہوا، علما کے لہجے تلخ ہونے لگے اور سوے ادب کا انداز بڑھتا گیا۔

ائمہ کے صحیح احترام کا طریق تو یہ ہونا چاہیے تھا کہ ان سے محبت کرنے والے بحث ونظر کی راہوں میں ان کے نقشِ قدم پر چلتے، ان کی طرح علوم میں دقتِ نظر پیدا کر کے مسائل کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرتے اور اجتہاد کی راہوں کو کھلا رہنے دیتے، ہر وقت اسباب وعلل پر غور فرماتے اور قرآن وسنت کی روشنی میں پیش آمدہ مسائل حل فرماتے۔

لیکن ہوا یہ کہ ائمہ کی محبت کے ساتھ کچھ بے عمل، بے محنت، غبی ہونے کے ساتھ احساسِ کمتری کے مریض علم و دانش کی بستیوں میں آباد ہونے لگے اور یہ ذہن پیدا کرنا شروع کر دیا کہ تم دین اور شریعت کو کہاں سمجھ سکتے ہو، اجتہاد ونظر کے دروازے کھلے ہونے کے بجائے اس طرح بند کر دیے، جیسے نبوت کی راہیں مسدود ہوچکی ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابتدا میں تو ائمہ کے اصولوں کو سامنے رکھ کر بعض فروع کی تخریج کی گئی، لیکن بتدریج وہ مستخرج جزئیات ہی مستقل شریعت قرار پا گئیں۔ ان کے سہارے پر متون اور کچھ شروح محافلِ درس کی زینت بن گئے، ان جزئیات کا حفظ و ضبط اور اُن حروف و الفاظ کی پابندی منتہائے علم تصور ہونے لگی۔ کتاب وسنت سے استخراج مسائل کو شجرِ ممنوع تصور کیا جانے لگا۔

ہمارے جمود کا یہ حال ہے کہ بارہ بارہ سال مدارس میں صَرف کرنے کے بعد ایک عالم متونِ فقہ کو مقدس ماننے لگا، قدوری اور کنز الدقائق اصل دین شمار ہونے لگے۔ گویا احساسِ کمتری اور جمود نے مزمن مرض کی صورت اختیار کر لی۔ ائمہ کے احترام کے نام سے یہ جو کچھ کیا گیا، حضرات ائمہ اور اُن کے پاکیزہ مقاصد کو ذبح کرنے کے مترادف تھا۔ گویا علم کی ترقی اور اجتہاد کی سربلندیوں کے لیے ان بزرگوں نے جو مساعی کی تھیں، انھیں غارت کر کے رکھ دیا گیا۔ الفاظ کی پرستش اور حشویت کا نام فقہ رکھ دیا گیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک امام یا

عالم کی محبت نے دوسرے کے ساتھ بغض کی صورت اختیار کر لی اور احادیثِ نبویہ کی تقسیم اس طرح ہوگئی کہ گویا میراث بٹ رہی ہے۔ ہر امام اور اس کے مقتدی اپنے اپنے حصے پر قابض ہو رہے ہیں۔ دوسرا اس کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا۔ اگر کوئی شافعی کسی حدیث پر بحث کرنا چاہے تو استاد یہ کہہ کر مطمئن کر دے گا کہ یہ احناف یا اہلِ کوفہ کی حدیث ہے اور یہ اہلِ حجاز کی، اور طالب علم اس سے مطمئن ہو جائے گا کہ میرا اس حدیث سے کوئی تعلق نہیں، یہ دوسرے امام کی ہے!

چوتھی صدی کے بعد تقلید کا رواج عام ہوگیا۔ ائمہ کی علمی اور اجتہادی کوششیں اپنے اپنے حلقوں میں محدود ہو کر رہ گئیں۔ پانچویں چھٹی صدی کی فقہیات بالکل کتاب وسنت کے برابر سمجھی گئیں۔ سائل جب علمائے دین سے شریعت کے متعلق سوال کرتا ہے تو ہمارے ملک کے علما بلا تامل ہدایہ، درمختار اور شامی، عالمگیری وغیرہ کی عبارات لکھ کر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ ہم نے شریعت کی بات بتا دی اور حق ادا ہوگیا، وہ قرآن یا حدیث کا نقل کرنا ضروری نہیں سمجھتے، حالاں کہ یہ ایک خاص مکتبِ فکر کی ترجمانی ہے، جو بالکل ممکن ہے کہ قطعی طور پر غلط ہو۔ یہی حال شافعی، مالکی اور حنبلی فقہوں کا ہے، کسی کو عین شریعت یا شریعت کا مرادف نہیں سمجھا جا سکتا۔

اجتہاد کی بندش:

اسی عقیدت اور احساسِ کمتری کی بنا پر چوتھی صدی کے بعد اجتہاد کی بندش کا فیصلہ کر دیا گیا۔ "رسالة حميدية في حقيقة الديانة الإسلامية و حقيقة الشريعة المحمدية" (ص: ٣٢٨) میں پوری وضاحت سے اجتہاد کی بندش کا ذکر فرمایا:

"ولكن من عصر أربع مائة من الهجرية النبوية ـعلى صاحبها أزكى الصلاة والسلام۔ قال بعض العلماء الأعلام كما ينقل عن علماء الحنفية: إن باب الاجتهاد قد انسد من ذلك التاريخ"

بعض علما خصوصاً علمائے حنفیہ سے منقول ہے کہ اس تاریخ سے اجتہاد کا دروازہ بند ہوگیا۔

یہ ایک رسالہ ایک ترک عالم شیخ حسین آفندی جسر نے سلطان عبد الحمید کی حکومت میں سلطان کے لیے لکھا، اس کے بعد بڑی تفصیل سے بتایا ہے کہ ہمتیں قاصر ہیں، عزائم ختم ہو چکے ہیں، اس لیے ان لوگوں کی رائے درست ہے کہ اجتہاد بند ہے:

"لكن إذا دقق النظر يظهر أن ما قاله أولئك الأعلام هو الموافق للصواب وعين الحكمة" (رساله حميدية، ص: ٣٢٨)

"دقتِ نظر کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات کی رائے اجتہاد کی بندش کے متعلق صحیح ہے۔"

وقتِ معین پر اجتہاد کا بند کرنا ایسا معلوم ہوتا ہے، گویا یہ کوئی خدائی حکم ہے، حالاں کہ قرآن و سنت میں کوئی حکم نہیں کہ اجتہاد فلاں صدی میں بند ہو جائے گا اور اللہ تعالیٰ اس وقت یہ قوت مخلوق سے سلب فرما لیں گے۔ یہ ساری جمود کی کارستانی ہے۔ ائمہ مجتہدین نے کب یہ دعویٰ فرمایا تھا کہ ہم مجتہد ہیں یا ہمیں مجتہد سمجھا جائے، بلکہ ان کے علمی کارناموں اور دینی خدمات اور کتاب و سنت کی اشاعت کی وجہ سے آنے والے لوگوں نے انھیں مجتہد سمجھا۔

چوتھی صدی کے بعد:

چوتھی صدی کے بعد واقعی یہ تصور عام ہو گیا کہ اب کوئی مجتہد نہیں ہو سکتا۔ جن لوگوں کے قلمی کارنامے ائمہ اجتہاد کی طرح روشن اور نمایاں تھے، ان کے متعلق بھی یہ لفظ بولنے کی بظاہر جرأت نہ ہو سکی۔ ارشادِ نبوی ہے:

«لا تزال طائفة من أمتي ظاهرين على الحق لا يضرهم من خذلهم»[1]

''دنیا میں ایسے لوگ ہمیشہ رہیں گے، جو حق کی حمایت کرتے رہیں گے اور انھیں ناکام اور ذلیل نہیں کیا جا سکے گا۔''

طبقات کی کتابیں پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسے لوگ ہمیشہ رہے، جو لوگوں کی نفرت کے باوجود ان پابندیوں سے آزاد رہے اور براہِ راست کتاب و سنت سے استدلال فرماتے رہے۔ ''تذكرة الحفاظ'' للذهبي، ''الديباج المذهب''، ''البدر الطالع''، ''التاج المكلل''، ''شذرات الذهب''، ''طبقات السبكي''، ''طبقات الحنابلة''، وغیرہا سے واضح ہوتا ہے کہ ایسے لوگ ہر زمانے میں ملتے رہے ہیں۔

ہندوستان میں اسلام:

تیسری صدی ہجری کے آخر تک خراسان، ایران میں ائمہ حدیث کی کثرت تھی۔ محدثین عموماً وطنیت کے لحاظ سے فارسی تھے، اس کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ان اطراف میں شوافع کا کافی اثر رہا، چناں چہ شیخ ابو اسحاق ابراہیم بن علی بن یوسف الشیرازی مصنف مہذب فیروز آباد کے رہنے والے تھے۔ فیروز آباد فارس کا شہر ہے۔ اور بھی بہت سے مشاہیر ائمہ شوافع ان اطراف میں شمار کیے جا سکتے ہیں، اس کے بعد ماوراء النہر میں احناف اور شوافع کی باہمی آویزشوں اور حکومت کے سیاسی مصالح نے یہاں اہلِ حدیث شوافع کو ختم کر دیا، جس طرح ایران میں جب تشیع کو غلبہ حاصل ہوا، اسی طرح بعض علاقوں میں احناف کو غلبہ حاصل ہوا، اسی طرح جب مغل فاتحین ہندوستان میں داخل ہوئے، ان کے اثر سے ہندوستان میں احناف کی کثرت ہو گئی۔

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (۱۹۲۰)

عرب فاتحین جو سمندر کی راہ سے ۹۲ھ کے پس و پیش سندھ میں وارد ہوئے، یہ سب اہلِ حدیث تھے، اس وقت تقلیدِ ائمہ رحمہم اللہ کا دور شروع ہی نہیں ہوا تھا۔ چند سال بعد مرکز میں خلفشار کی وجہ سے واپس چلے گئے، ان کے اخلاقی اور دینی آثار زیادہ دیر نہ رہ سکے۔ سلطان محمود شافعی تھے، وہ باطنی فرقے کی سازشوں اور مسلم آزاریوں کو روکنے اور ان کی قوت ختم کرنے لیے آئے اور واپس چلے گئے۔ عمومی طور مغل بادشاہ حنفی المذہب تھے اور علما بھی غالباً اسی خیال کے تھے، اس لیے ہندوستان کے علاقوں میں حنفی مسلک کو بہت زیادہ فروغ حاصل ہوا اور اب تک ہے۔ حکومت اور علما جب ایک خیال کے ہوں تو عوام کا ان سے تاثر قدرتی بات ہے۔

تقلید اور جمود:

حضرت امام ابو حنیفہ اور ان کے تلامذہ کا ایک اندازِ فکر ہے۔ حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اس مکتبِ فکر کے بانی ہیں۔ اگر عوام اس سے متاثر ہوں تو اس میں کوئی عیب نہ تھا، بشرطیکہ اس میں جمود نہ ہو اور دوسرے مکاتبِ فکر سے نفرت نہ پیدا کی جائے، ان مکاتبِ فکر پر عمل کے لیے بھی راہیں کھلی ہوں۔ افسوس ہے کہ ہندوستان کیا، کہیں بھی اس معاملے میں وسعتِ ظرف کا ثبوت نہ دیا گیا۔ سوڈان، مصر، حجاز، عراق، ایران، ہندوستان؛ جہاں ایک مکتبِ فکر کو تمکن حاصل ہوا، اس نے دوسروں کے لیے زمین کو تنگ کرنا شروع کر دیا۔ اگر کبھی وسعتِ ظرف کا تھوڑا بہت اثر پایا گیا تو یہ انھیں لوگوں میں تھا، جن کو فنِ حدیث کے ساتھ تعلق تھا، جیسے علامہ شیخ علی المتقی صاحب کنز العمال (م ۸۷۵ء) اور شیخ محمد طاہر پٹنوی مولف "مجمع البحار" (م ۹۸۶ھ)، حضرت شیخ الامام احمد الفاروقی سرہندی (۱۰۳۴ھ) وغیرہم رحمہم اللہ۔ یہ حضرات فروع میں عملاً حنفیت سے متاثر تھے، لیکن ان حضرات میں جمود تھا نہ تعصب۔

لیکن عام اہلِ علم، جو حدیث سے متاثر نہ تھے، ان میں جمود بھی تھا اور تعصب بھی۔ اس لیے ان حضرات کی اصلاحی مساعی کے باوجود جمود اور عصبیت کو فروغ ہوتا رہا۔ حضرت شیخ احمد مجدد الفِ ثانی کے دور سے معلوم ہوتا ہے کہ تقلید اور جمود کی مضرتوں کا احساس زیادہ ہوا اور اس کی اصلاح کی طرف زیادہ سے زیادہ توجہ فرمائی گئی، چناں چہ حضرت مجدد صاحب کے محترم رفقا سے شیخ شمس الدین، مرزا مظہر جانِ جاناں، جن کا سلسلہ نسب محمد بن حنفیہ سے ملتا ہے، فروعی مسائل میں احناف کی روش سے انحراف فرماتے اور مجدد الفِ ثانی رحمہ اللہ کے چھوٹے لختِ جگر شاہ محمد یحییٰ وقتی جمود سے کھلا تصادم فرماتے تھے۔ مجدد صاحب کی روش کے متعلق نواب صاحب مرحوم نے فرمایا:

"ثم إنه باحث الملاحدة في زمانه، و جادلهم بقلمه ولسانه، ورد على الروافض، وحقق الفرق بين البدعة والسنة، و أقيسة المجتهدين واستحسانات المتأخرين، والتعارف عن القرون المشهود لها بالخير، وما أحدثه الناس في القرون المتأخرة،

وتعارفوه فيما بينهم، فرد بذلك مسائل مما استحسنها المتأخرون من فقهاء مذهبه، وكان فقيها ماتريديا حريصا على السنة مجتهداً فيه"[1] اھ

''حضرت مجدد رحمہ اللہ نے ملحدین سے مباحثات کیے اور ان کے ساتھ قلم اور زبان سے جہاد کیا، روافض کا رد کیا، سنت اور بدعت میں فرق فرمایا، ائمہ اجتہاد کے قیاس اور متاخرین کے استحسان میں فرق واضح فرمایا اور قرونِ خیر کے معروفات اور متاخرین کی بدعات مالوفہ میں امتیاز فرمایا اور اپنے مسلک کے علما کی بدعات پر رد کیا، وہ عقیدتاً ماتریدی تھے اور اتباعِ سنت کے عاشق۔''

مجدد الفِ ثانی اور شاہ ولی اللہ:

مجدد الفِ ثانی کی مساعی جو مصالح وحکم کے پردوں میں مستور تھیں، حضرت شاہ ولی اللہ کے دور میں اور زیادہ نکھر گئیں۔ احناف اور شوافع میں متاخرین کے جمود کی وجہ سے جو بعد واضح ہو چکا تھا، اسے حتی المقدور کم کرنے کی کوشش فرمائی اور علما اور عوام کو کتاب وسنت سے زیادہ مانوس فرمایا اور اس امر پر زور دیا کہ یہ مکاتبِ فکر کوئی مستقل حقیقت نہیں، اصل چیز قرآن وسنت ہے۔ حجۃ اللہ البالغہ، تفہیمات، انصاف اور عقد الجید میں تقلید کے وجود کے معمے کو پوری طرح حل فرمایا۔ یہ اوراق اس کی تفصیل کے متحمل نہیں۔ شاہ صاحب کا یہ اثر ہوا کہ احناف سے بدعت پسند حضرات نے تو شاہ صاحب کو بالکل نظر انداز کر دیا اور احناف کا توحید پسند گروہ چوں کہ حدیث کے ساتھ تعلق اور تعارف کی وجہ سے شاہ صاحب رحمہ اللہ کا ممنون ہے، اس لیے ان سے عقیدت کا اظہار تو کرتے ہیں، لیکن حضرت کے اس پروگرام سے وہ متفق نہیں، نہ وہ اس پر مطمئن ہیں، ان کی کوشش ہے کہ قرونِ وسطیٰ کے جمود کو ہی دعوت دیں اور کتاب وسنت سے تعلق مشروط رکھیں کہ اگر وہ عراق اور کوفے کی راہ سے آئے تو اسے منظور کر لیا جائے اور اگر حجاز یا مصر کی راہ سے آئے یا وہ ائمہ سلف اور قرونِ خیر کے اندازِ فکر کا ترجمان ہو تو حتی الامکان اسے قبول نہ کیا جائے اور اس راہ میں ہر رکاوٹ ڈالی جائے، چناں چہ ان کے مرکز اب بھی اسی کوشش میں مصروف ہیں۔

شیخ الکل حضرت مولانا سید نذیر حسین صاحب (م ۱۳۲۰ھ):

اس دور کے دو بزرگ ہیں، جنھیں خدمتِ سنت اور طریقۂ سلف کے اِحیا میں بلند ترین مقام حاصل ہے، حضرت نواب صدیق حسن خاں صاحب مرحوم بھوپال اور شیخ الکل نذیر حسین صاحب دہلی۔ نواب صاحب ریاست میں با اختیار مقام کے باوجود تصنیف وتالیف اور دینی مشاغل کی طرف راغب تھے اور تقلید و جمود کے

[1] أبجد العلوم (۳/ ۲۲۶)

خلاف ان کے قلم نے اتنا کام کیا، جو شاید کوئی جماعت بھی مشکل سے کر سکے۔ مرحوم کی تصانیف مختلف فنون میں سیکڑوں تک پہنچی ہیں۔ حضرت میاں صاحب کے پاس اللہ پر توکل اور مسجد کی چٹائیوں کے سوا کچھ نہ تھا۔

میاں صاحب مولانا اسحاق کے شاگرد تھے اور شاہ ولی اللہ کے سلسلے کے ساتھ والہانہ عقیدت تھی۔ علومِ آلیہ اور عالیہ میں پوری مہارت تھی۔ جامع العلوم تھے، مزاج میں تواضع اور انکسار تھا۔ تملق اور لجاجت نام کے لیے طبیعت میں موجود نہ تھا۔ لالچ اور طمع ایسے امراض سے ذہن بالکل صاف تھا۔ فنِ حدیث کی اشاعت اور مسلکِ سلف کی خدمت کو زندگی کا مقصد سمجھتے تھے۔ مشاہرات کا نہ یہ دور تھا نہ طبیعت میں اس کے لیے کوئی مقام۔ زمانے کے اتفاقات سمجھیے کہ حضرت شاہ اسحاق کی ہجرت کے بعد اسی مسند پر دین کی خدمت کا موقع میسر آیا۔ شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ نے تقلیدِ مروج اور جمود کے خلاف جرأت مندانہ قدم اُٹھایا تھا، لیکن جہاد کی مشغولیت اور اس کے مصالحوں کے تقاضوں کی بنا پر اس کی تکمیل نہیں فرما سکے تھے۔ میاں صاحب نے اسے مقصدِ حیات قرار دیا اور تمام مشاغل سے فی الجملہ الگ ہو کر اس میں مشغول ہو گئے اور پوری عمر اس میں صَرف فرما دی۔ پوری عمر نہ نقل مکانی کی ضرورت محسوس کی اور نہ کسی خوف و ہراس نے پروگرام کی تبدیلی پر مجبور کیا۔

۱۸۵۷ء کے انقلاب ایسی ہیبت ناک صورت نے بھی میاں صاحب پر کوئی اثر نہ کیا۔ شہر پر توپیں آتش باری کر رہی تھیں، ادھر مسندِ درس گرم تھی۔ اسباق شروع تھے، طلبہ خائف تھے، لیکن حضرت میاں صاحب پر اس کا کوئی اثر نہ تھا، وہ بدستور تدریس کے سلسلے میں تشریف لاتے۔

۱۸۵۷ء کا انقلاب بالکل بے قاعدہ تھا۔ انگریزوں کی بدکرداریوں کے سبب تقریباً پورے ملک میں پھیلا، لیکن بدنظمی کی وجہ سے ناکامی پر منتج ہوا۔ میاں صاحب نے اس میں انگریز عورت کو باغیوں سے بچایا اور اسے پناہ دی۔ یہ بالکل اسلامی تعلیمات کے مطابق تھا۔ عورت پر ہاتھ اٹھانا شرعاً درست نہ تھا۔ باغی اور آوارہ مزاج لوگوں نے اسی بہانے سے میاں صاحب کے مکان پر حملہ کیا اور ایذا پہنچائی، اس کی اطلاع رضی الدولہ بہادر میرزا قدرت اللہ بیگ نے بہادر شاہ ظفر شاہ دہلی کو دی۔ بادشاہ نے شہزادوں کو حکم دیا کہ وہ اس ہنگامے کو فرو کروائیں اور میاں صاحب سے دعا کے لیے عرض کریں، کیوں کہ ہمارے بزرگ مشکلات میں اہل اللہ سے دعا کرایا کرتے تھے۔ (روز نامچہ ۱۸۵۷ء مولفہ عبداللطیف)

اسی روزنامے میں میاں صاحب کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا:

''ہمانا مولانا از سادات حسنی و حسینی است۔ در حدیث پایۂ اجتہاد گرفت، در فقہ برتری مایہ در اصول آگاہی کمال دارد، و در علمِ تفسیر بے مثال است، امروز در علم و عمل بے نظیر است، شب باز و سفید کار است ہر آئینہ در پرستش ایزدی بزرگی گرفت بہ پژوہش ایزدگی متردگی یافت'' (روز نامچہ ۱۸۵۷ء۔ ص: ۱۰۴)

افکار اور مذہبی خیالات میں اختلاف کے باوجود میاں صاحب کے علم و عمل اور اخلاق کی پاکیزگی مسلم تھی۔ واقعاتِ دار الحکومت دہلی (۳/ ۲۵۹) میں میاں صاحب کا ذکر بڑے اچھے الفاظ میں کیا گیا ہے اور انھیں شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین اور شاہ اسحاق کے شاگرد ظاہر کیا گیا ہے اور آپ کی تصنیفات ''معیار الحق''، ''واقعة الفتوی دافعة البلوی''، ''ثبوت الحق'' اور ''فلاح الولي'' کا ذکر کیا گیا ہے۔[1]

وفورِ علم کے ساتھ میاں صاحب اخلاقِ فاضلہ میں اکابرِ ملت سے پوری پوری مماثلت رکھتے تھے۔ صحتِ فکر، تدبر اور دور اندیشی میں میاں صاحب آپ اپنی نظیر تھے۔ مخالفین کی کثرت کے باوجود ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ دہلی سے نہ بھاگنا، متحارب طاقتوں سے نہ اُلجھنا، نہ مرعوب ہونا انتہائی تدبر تھا۔ حلم و دیانت میں میاں صاحب کا مقام بہت اونچا تھا۔ علما کی جماعت میں میاں صاحب نظریاتی اختلاف کے باوجود بڑی عزت سے دیکھے جاتے تھے۔ سر سید احمد خاں علی گڑھی، ڈپٹی نذیر احمد دہلوی، ڈپٹی احمد حسن، نواب ضمیر مرزا ایسے اعاظمِ رجال کو میاں صاحب سے استفادے کا شرف حاصل تھا۔

میاں صاحب کے تلامذہ کا تاثر:

میاں صاحب کے تلامذہ کے مزاج اور طریقِ کار میں عجیب تنوع معلوم ہوتا ہے، ہر ایک نے اپنی استعداد کے مطابق مرحوم سے اثر لیا۔ مولانا حافظ عبداللہ صاحب غازی پوری، مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی، مولانا محمد ابراہیم صاحب آروی، حاجی علی جان کا خاندان، انگریز کے سخت مخالف تحریکِ مجاہدین کے حامی بنے اور تحریکِ مجاہدین جب ۱۸۳۱ء کے بعد زیرِ زمین چلی گئی تو ان حضرات کی مخلصانہ مساعی سے تحریک زندہ رہی اور ۱۹۴۷ء تک انگریز کے لیے وبالِ جان بنی رہی۔

پنجاب میں مولانا عبدالقادر قصوری وکیل، مولانا عبدالادل غزنوی، مولانا فضل الٰہی وزیر آبادی، مولانا دلی محمد فتوحی والے، مولانا اکبر شاہ سخانہ اس تحریک کے سرگرم رکن اور موید تھے۔ وللتفصیل موضع آخر.

ایک جماعت کا رجحان تدریس کی طرف تھا، جن میں مولانا محمد بشیر سہسوانی، مولانا حافظ عبداللہ صاحب غازی پوری، مولانا عبدالجبار صاحب غزنوی، مولانا عبدالمنان صاحب وزیر آبادی، مولانا حافظ محمد صاحب لکھوی، مولانا عبدالقادر صاحب لکھوی۔ وسواهم خلق لا يحصون.

بعض کا رجحان تصنیف و تالیف کی طرف تھا، مولانا شمس الحق صاحب ڈیانوی، مولانا عبدالرحمن صاحب مبارک پوری، مولانا محمد حسین بٹالوی، مولانا حافظ محمد صاحب لکھوی، مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری، مولانا احمد غزنوی رحمة الله عليهم أجمعين۔

---

[1] ان تصنیفات کے لیے دیکھیں: تاریخ اہلِ حدیث از ڈاکٹر محمد بہاء الدین (۴/ ۲۹-۷۴۳)

بعض کا رجحان مناظرانہ تھا، مولانا عبدالعزیز صاحب رحیم آبادی، مولانا ابو الوفاء ثناء اللہ صاحب امرتسری، مولانا عبدالحکیم صاحب نصیر آبادی وغیرہم رحمہم اللہ۔

بعض وعظ وتقریر میں نابغہ دوراں تھے، مولانا محمد علی بوپڑہ، مولانا محمد صاحب لکھوی، مولانا عبدالوہاب ملتانی دہلوی وغیرہم رحمہم اللہ۔

شیخ کی جامعیت کے یہ تاثرات تھے، جو تلامذہ میں مختلف طور پر پائے گئے۔ ہر ایک نے شیخ سے حسبِ استعداد اخذ کیا اور اسی تاثر کے ماتحت اپنے اپنے ماحول میں خدمت فرمائی۔ بنگال، سندھ، آسام وغیرہ ممالک کے تلامذہ کا مجھے علم نہیں نہ ان کے اسمائے گرامی معلوم ہیں نہ ان کے اعمال سے واقفیت۔ عرب میں شیخ سید محمد نصیف جدہ، شیخ عبداللطیف آل شیخ نجد، شیخ ابو بکر خوقیر مکہ مکرمہ، یہ حضرات مسلم دوست اور توحید وسنت کے خادم ہیں اور حضرت میاں صاحب کے علمی فیوض کے شاہد ہیں اور ان کے تلمذ پر نازاں۔

میاں صاحب کا اخلاص:

زیرِ طبع کتاب ''معیار الحق'' میاں صاحب نے ''تنویر الحق'' کے جواب میں لکھی تھی۔ یہ کتاب حضرت میاں صاحب کے ایک شاگرد محمد شاہ نے لکھی تھی، لیکن نواب قطب الدین صاحب مرحوم کے اسمِ گرامی سے شائع کی گئی تھی۔ محمد شاہ صاحب پاک پٹن ضلع منٹگمری کے رہنے والے ایک معمولی طالب علم تھے اور نواب قطب الدین صاحب مغفور مشہور عالم تھے اور میاں صاحب کے ہم سبق۔ بعض مصالح کی بنا پر یہ کتاب ان کے نام سے شائع کی گئی تھی، لیکن میاں صاحب نے اپنی رفعتوں سے بے نیاز ہو کر اپنے شاگرد کو مخاطب کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں فرمائی۔ آج کل ہمارے علما کا یہ حال ہے کہ وہ کسی اپنے ہمسر سے بھی خطاب پسند نہیں فرماتے اور یہاں ایک معمولی شاگرد سے تخاطب میں بھی توہین کا احساس نہیں فرمایا گیا۔

حضرت کی متانت:

معیار الحق کا لب ولہجہ مصنف کی متانت اور سنجیدگی کا شاہد ہے، اس وقت کے تصنیفی انداز کو دیکھا جائے تو معیار الحق ٹھنڈی سنجیدہ کتاب ہے، حالاں کہ بحث ومناظرہ کی کتاب ہے، لیکن اس کا انداز محققانہ ہے۔ طعن وتشنیع کے بغیر نفسِ مسئلہ پر بحث فرمائی گئی ہے۔ اصل مسئلے میں کوئی خلا نہیں چھوڑا گیا۔ ہر تشنگی کو علمی حوالوں سے پورا کر دیا گیا ہے۔

معیار الحق کے لہجے کی پسندیدگی، دلائل کی فراوانی اور استدلال کی پختگی نے حضرت امام الہند خطیب الملک یگانہ روزگار اپنے وقت کے بلند پایہ عالم مولانا ابو الکلام آزاد کو اتنا متاثر کیا کہ وہ اپنے آبائی خیالات کو خیر باد کہہ کر میاں صاحب کے ہمنوا ہو گئے، حالاں کہ مولانا کے والد بزرگوار حضرت مولانا خیر الدین صاحب سخت قسم کے بریلوی

تھے۔ وہ اپنی حنفیت کے سامنے مولوی احمد رضا خاں صاحب کی بریلویت کو بھی مشکوک سمجھتے تھے۔ شاہ ولی اللہ صاحب کے خاندان سے علمی استفادے کے باوجود ان کے اصلاحی پروگرام پر تنقید فرماتے تھے، لیکن معیار الحق نے اس خاندانی مقلد اور غالی حنفی کو اپنی آغوشِ عاطفت میں تسکین بخشی۔ (ملاحظہ ہو: آزاد کی کہانی، ص: ۳۶۶)

میاں صاحب نے تقلید کی متعدد اقسام لکھیں، ہر ایک کے حکم کو واضح فرمایا۔ کسی کے مدح و ذم میں مبالغہ آمیزی سے کام نہیں لیا۔ مولانا آزاد نے معیار الحق کے متعلق فرمایا کہ معیار الحق سنجیدگی اور دلائل کے لحاظ سے بہت وزنی تھی۔ فریقِ مخالف نے اس کے خلاف جو کچھ لکھا، اس میں وہ وزن نہ تھا۔ مولانا کے الفاظ کسی دوسری جگہ مذکور ہیں۔

حضرت کی امن پسندی:

میاں صاحب کا ذہن قطعاً تفریق پسند نہ تھا۔ دہلی شہر میں رہتے ہوئے اور تلامذہ کے حلقے میں بے حد وسعت کے باوجود میاں صاحب نے الگ جمعہ قائم نہیں فرمایا، بلکہ مدت العمر شاہی مسجد کے حنفی امام کے پیچھے نمازِ جمعہ ادا فرماتے رہے۔ مغل دربار تک تعارف اور شناسائی کے باوجود جمعہ علیحدہ کرنا پسند نہ فرمایا۔ حضرت میاں صاحب کے انتقال کے بعد احناف کے تشدد اور عصبیت کی وجہ سے دہلی میں اہلِ حدیث اور احناف کے متعدد جمعے قائم ہوگئے۔

دہلی میں علما کی کثرت تھی۔ مختلف مکاتبِ فکر کے جید علما دہلی میں موجود تھے، لیکن کبھی کسی سے کسی اہم اور قابلِ ذکر آویزش کی اطلاع نہیں ملی۔ نہ مناظرہ بازی اور چیلنج پسندی کے آپ عادی معلوم ہوتے ہیں۔ میاں صاحب کے اسی مزاج کو بھانپ کر مرزا غلام احمد نے اپنی شہرت کے لیے دہلی میں یہ میدانِ مناظرہ گرم کیا۔ مرزا غلام احمد ایسے عوامی اور نمایش پسند آدمی کے لیے یہ بہترین راہ تھی۔ میاں صاحب نے اپنے وقار اور مقام کے لحاظ سے توجہ نہ فرمائی۔ اس اشتہار بازی اور مناظرہ پروری کی اطلاع پا کر مولانا محمد بشیر صاحب سہسوانی پہنچ گئے۔ حیاتِ مسیح پر مناظرہ شروع ہوا، مرزا صاحب مناظرہ درمیان میں چھوڑ کر واپس قادیان پہنچ گئے۔

ابتذال اور عوامیت:

معیار الحق، فتاویٰ نذیریہ اور بعض دوسری تصانیف سے معلوم ہوتا ہے کہ میاں صاحب کے ذوق میں ابتذال اور عوامیت نہ تھی۔ پوری کتاب علمی مباحث پر مشتمل اور اندازِ بیان علمی ہے، اسے عوامی بنانے کی کوشش نہیں فرمائی۔ علمی حلقے بھی اس سے متاثر ہو سکتے تھے اور ہوئے، حالاں کہ اس دور میں "جامع الشواھد في إخراج الوھابیین عن المساجد" اور "انتظام المساجد" ایسی مبتذل اور عامیانہ کتابیں شائع کی گئیں، مگر میاں صاحب کے ذوق پر ان کا کوئی اثر ظاہر نہیں ہوتا۔ میاں صاحب کے تلامذہ اور متوسلین نے ان کے

جواب نرم گرم ہر طرح دیے۔ جامع الشواہد ایسی گھٹیا کتاب کا بڑا متین جواب مولانا حافظ عبداللہ صاحب غازی پوری رحمہ اللہ نے لکھا ہے، جو اسی نام سے شائع ہوا۔[1] افسوس ہے کہ یہ متانت دیر تک قائم نہ رہ سکی۔ بریلی، بدایوں، لدھیانہ اور دہلی کے علمی مراکز اس قسم کا ردی لٹریچر شائع کرنے لگے، علمی مسائل کو بازاری انداز سے شائع کیا جانے لگا۔ حضرت میاں صاحب کے انتقال کے بعد بلکہ ان کی حیات کے آخری ایام میں یہ وبا عام ہوگئی، نہ اہلِ حدیث حضرات اس سے بچے نہ بریلی اور دیوبند اس سے محفوظ رہے۔ علمی تدریسی مسائل بازار کا سودا بن کر عوام کے لیے بدگمانی اور سنجیدہ حضرات کے لیے مضحکہ کا موجب بنے۔

میاں صاحب کا تحمل:

۱۳۰۰ھ مطابق اکتوبر ۱۸۸۳ء میاں صاحب حج کے لیے تشریف لے گئے۔ اتفاقاً مولوی رحمت اللہ کیرانوی مرحوم اور حاجی امداد اللہ صاحب مرحوم اور مولانا خیر الدین صاحب مرحوم پہلے وہاں موجود تھے۔ کچھ اور علمائے کرام ہندوستان سے صرف اس لیے حجاز پہنچے کہ میاں صاحب کو وہاں گرفتار کروا دیں، اور رسالہ ''جامع الشواہد'' کا عربی ترجمہ کر کے ترکی کے گورنر کے سامنے پیش کیا، حالاں کہ وہ ان حضرات نے ہی یہاں شائع کروایا تھا۔ تعجب ہوتا ہے مذہبی تعصب کتنے بڑے بڑے اعاظمِ رجال کو ایسے کبائر پر آمادہ کر لیتا ہے، وہ ان غلط بیانیوں میں نہ اپنے مقام کو سوچتے ہیں اور نہ مستقبل کی بدنامی سے گھبراتے ہیں، اس کی تفصیل مولانا محمد حسین بٹالوی مرحوم نے ''اشاعۃ السنۃ'' (جلد نمبر ۶، ص: ۱۰، ۱۱) میں دی ہے اور ''الحیاۃ بعد المماۃ'' (ص: ۸۴۰) میں بھی موجود ہے۔ گورنر ترکی کو جب حقیقتِ حال کا علم ہوا تو میاں صاحب کو باعزت بری کر کے اپنی نگرانی میں مدینہ منورہ بھیجا، ان حضرات کو سخت تنبیہ کی، لیکن میاں صاحب مرحوم نے اس کے متعلق کوئی انتقامی کارروائی نہ وہاں کی اور نہ واپس دہلی آ کر کسی رنج کا اظہار فرمایا، بلکہ صفح جمیل پر عمل فرمایا، حالاں کہ یہاں پہنچ کر انتقامی طور پر بہت کچھ کیا جا سکتا تھا، لیکن اس خیرِ مجسم نے کسی انتقامی کارروائی کے لیے آمادگی کا اظہار نہ فرمایا۔

أولئك آبائي فجئني بمثلهم إذا جمعتنا يا جرير المجامع

''معیار الحق'' کی اشاعت:

میاں صاحب کا عام مشغلہ درس و تدریس تھا۔ تنویر الحق کی اشاعت کے بعد ضرورتاً اس موضوع پر قلم

---

[1] اس کے پہلے حصے کا نام ''الكلام النباه في رد هفوات من منع مساجد الله'' ہے اور دوسرے حصے کا نام ''إبراء أهل الحديث والقرآن مما في جامع الشواهد من التهمة والبهتان'' ہے۔ یہ کتاب حضرت حافظ صاحب غازی پوری کے دیگر گیارہ رسائل سمیت دار ابی الطیب گوجرانوالہ کی طرف سے ''مجموعہ رسائل'' کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔

اُٹھایا اور مسئلے کے ہر پہلو کو واضح فرمایا، اس کا اثر علمی حلقوں پر شدید ہوا۔ مخالف بہت سٹ پٹائے۔ انصاف پسند لوگوں نے سنجیدگی سے اس بات پر غور کیا کہ جب قرآنِ عزیز اُتر رہا تھا اور آنحضرت ﷺ اس کی تبلیغ اور تشریح میں مشغول تھے، اس وقت ائمہ مجتہدین، جن کے مذاہب مروج ہیں، موجود ہی نہ تھے، بلکہ پیدا نہ ہوئے تھے، ان کی تقلید واجب ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور جب ائمہ پیدا ہوئے، ان کے علوم اور فیوض سے دنیا متعارف اور متاثر ہوئی، اس وقت فرضیت اور وجوب کا زمانہ گزر چکا تھا۔ پیغمبر کے سوا کسی کو استحباب کا بھی حق حاصل نہیں، فرض، واجب تو بڑی چیز ہے۔ آنحضرت ﷺ کے بعد صحابہ اور تابعین کے وقت ایسے مجتہد، صلحا اور اتقیا کی جماعت موجود تھی، نہ انھوں نے اپنی تقلید کے لیے دعوت دی نہ آنحضرت ﷺ نے ان کی تقلید کے لیے اشارہ فرمایا اور فرضاً کوئی اشارہ ہے تو انھیں چھوڑ کر مفضول کو بلا وجہ کیوں ترجیح دی جائے؟!

مسئلہ بڑا صاف تھا، اس لیے خواص کیا، عوام نے بھی اس سے اثر لیا۔ اس اثر کی تلافی کے لیے معیار الحق کے جواب میں اس وقت جہاں تک میرا خیال ہے، دو کتابیں شائع کی گئیں، ارشاد الحق مولفہ مولانا ارشاد الحق صاحب رام پوری اور انتصار الحق مولفہ مولانا ارشاد حسین رام پوری۔[1] پہلی کتاب میری نظر سے نہیں گزری، اس کے متعلق مولانا آزاد فرماتے ہیں:

''اسی زمانے میں معیار الحق دیکھی اور اس کا جواب ارشاد الحق مولفہ مولانا ارشاد الحق صاحب رام پوری کا، اور مجھ پر معیار الحق کی سنجیدہ اور وزنی بحث کا بہت اثر پڑا اور صاحب ارشاد الحق کا علمی ضعف صاف صاف نظر آ گیا۔'' (مولانا آزاد کی کہانی خود ان کی زبانی، ص: ۳۶۶ مولفہ عبدالرزاق صاحب)

انتصار الحق اس وقت میرے سامنے ہے، مولانا محمد حسین صاحب نے لکھی، لیکن مولانا اس پتھر کو نہیں اٹھا سکے، جو معیار الحق نے ان کی راہ میں ڈال دیا تھا۔ مولانا مرحوم نے تشقیق فرما کر مسئلے کو اُلجھانے کی کوشش فرمائی ہے، لیکن وہ مسئلے کے منہ پر تشکیک کا غبار بھی نہیں ڈال سکے۔ ویسے یہ کتاب معیار الحق سے بڑی تقطیع پر شائع ہوئی ہے، اس سے ضخیم بھی زیادہ ہے۔

بتدریج یہ مسئلہ مجلسی اور عوامی ہو گیا ہے۔ ہر طرف سے عامیانہ انداز میں اس پر گفتگو ہونے لگی، ہر فریق نے جذباتی طور پر عوام کو اپنی طرف متوجہ کرنا شروع کر دیا۔ متون اور شروحِ فقہ کی بعض جزئیات کو اشتہاری صورت

[1] یہاں کتابوں کے نام میں مولف رحمہ اللہ کو کچھ تسامح ہوا ہے۔ معیار الحق کے جواب میں دو کتابیں شائع ہوئی تھیں: ① انتصار الحق از مولانا ارشاد حسین رامپوری۔ ② مدار الحق از محمد شاہ پنجابی۔ جن کے جواب میں حضرت میاں صاحب کے تلامذہ نے چار کتب لکھیں: ① براہین اثنا عشر از مولانا امیر حسین سہسوانی ② تلخیص الانظار از مولانا احمد حسن دہلوی ③ البحر الزخار از مولانا شہود الحق عظیم آبادی ④ اختیار الحق از مولانا احتشام الدین مراد آبادی رحمہم اللہ۔

میں عوام کے سامنے رکھا گیا۔ ہر فریق نے عوامیت اور ابتذال کی راہ اختیار کی، جس کی بدولت یہ نزاع انگریزی عدالتوں تک پہنچ گئی۔ مساجد سے اخراج تک کی نوبت آئی۔ دونوں طرف کے اہلِ علم خالص دینی مسئلے کے لیے خالص کفر کی عدالتوں میں پہنچ گئے، اس ہنگامے کی صدائے بازگشت پریوی کونسل تک اثر انداز ہوئی، اس صورت پر کسی فریق کو بھی فخر مناسب نہیں۔ "البادي أظلم" درست ہے، لیکن "فاصفح الصفح الجميل" بھی آخر قابلِ فخر مقام ہے۔

معیار الحق مدت ہوئی بازار سے غائب تھی۔ برادرِ عزیز مولانا محمد حنیف صاحب یزدانی قصوری کی توجہ قابلِ صد ستایش ہے۔ انھوں نے اس قیمتی کتاب کی اشاعت کے لیے کمرِ ہمت باندھی۔ ضرورت تھی کہ کتاب ایڈٹ کی جاتی۔ اس پر تھوڑی سی محنت کی جاتی۔ کتابوں کے حوالے بقیدِ صفحات دیے جاتے۔ عربی عبارات کے تراجم سلیس زبان میں ہوتے۔ میاں صاحب نے جو نسخہ طبع فرمایا تھا، میں نے سنا ہے اس میں تراجم بالکل نہ تھے۔ میں نے جو نسخہ دیکھا ہے، اس میں کچھ تراجم ہیں، لیکن ان کی زبان صاف نہیں۔ خدا کرے مولانا یزدانی نے ان تمام ضرورتوں کا احساس فرما لیا ہو اور کتاب عمدہ کاغذ، عمدہ طباعت اور سلجھے انداز سے بازار میں آئے، جو بھی صورت ہو، کتاب کی طباعت مغتنم ہے، یہ علمی میراث ہے، اسے ضائع نہیں ہونا چاہیے۔

میں اُمید رکھتا ہوں کہ اگر کچھ مدت ان مباحث اور مناظرات کو رہنا ہے تو یہ ابتذال، تمسخر، استہزا اور استحقار کا انداز ختم ہو جائے۔ علمی مباحث منجھے ہوئے انداز میں علما کے سامنے آئیں۔ علما اور اربابِ علم ان پر غور کریں۔ عوام جھگڑوں کے بجائے عملی زندگی کو درست کرنے کی کوشش کریں۔

اب ضرورت ہے کہ "الحیات بعد الممات" کی اشاعت اچھے انداز پر کی جائے۔ اس میں کچھ مباحث کا اضافہ ہو۔ پڑھنے والا محسوس کرے کہ یہ ایک محدث کی سوانح ہے۔ اُمید ہے کہ آل پاکستان اہلِ حدیث کانفرنس اس کی طرف توجہ دے گی۔ کراچی میں اس کا جو نسخہ شائع ہوا ہے، اسے دیکھ کر شرم بھی محسوس ہوتی ہے اور دُکھ بھی ہوتا ہے۔ ان جواہر پاروں کو صرف مالی منفعت سے شائع نہیں کرنا چاہیے۔ پاکباز بزرگ ہمارے اسلاف ہیں، وہ ہماری دکان کا سامان نہیں۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين، إن أريد إلا الإصلاح ما استطعت، وما توفيقي إلا بالله.

محمد اسماعیل، گوجرانوالہ

شعبان المعظم ۱۳۸۴ھ

مقدمہ:

اکمل البیان

(تالیف: حافظ عزیز الدین مراد آبادی۔ ناشر: مکتبہ سلفیہ لاہور۔ ۱۹۶۵ء)

قدرتِ الٰہیہ کی نیرنگیوں پر تعجب ہوتا ہے۔ انسان کچھ سوچتا ہے، اس کی بصیرت مستقبل کے متعلق اپنی صوابدید سے فیصلے کرتی ہے، لیکن قدرت کا بے نیاز ہاتھ انھیں بدل کر رکھ دیتا ہے۔

آج سے قریباً ڈیڑھ سو سال پہلے (متحدہ) ہندوستان سے ایک تحریک اُٹھی، جس کی قیادت حضرت سید احمد شہید رحمہ اللہ (۱۲۴۶ھ۔ ۱۸۳۱ء) اور مولانا محمد اسماعیل شہید رحمہ اللہ (۱۲۴۶ھ۔ ۱۸۳۱ء) نے فرمائی۔ ان کے سامنے دو مقصد تھے، ہندوستان میں ایسے نظام کا قیام و نفاذ، جس کی اساس قرآن و حدیث پر ہو اور قرآن و سنت کے فہم میں جمود اور توحیدِ خالص کے راستے میں حائل بدعات و رسوم کو ہٹا کر اس کی تعلیمات کو شائع کرنا۔ پہلا مسئلہ دین کے ساتھ سیاسی بھی تھا، اس لیے اس کے پورے ماحول پر سیاست محیط ہو گئی۔ انگریز، سکھ، افغان اور ہندوستان کے اہلِ بدعت سب ہی اس سے خائف تھے اور اس کے عواقب کے منتظر۔ یہ اربعہ عناصر باہم دیگر بعض شدید اختلافات کے باوجود اس تحریک کو ناکام کرنے کے لیے متفق تھے۔ انگریز اور سکھ تو کھلے میدانِ جنگ میں نبرد آزما تھے۔ افغان غداریوں میں مشغول اور شرک پسند اور خوگرانِ بدعت ہندوستانی حضرات کفر کے فتوؤں کی بھرمار کرنے میں مصروف تھے۔

معرکہ بالاکوٹ (۱۲۴۶ھ۔ ۱۸۳۱ء) کے سانحہ جان گداز کے بعد یہ تحریک مختلف صورتوں اور قیادتوں کے تحت ایک صدی سے زائد عرصہ تک چلتی رہی اور پاکستان بننے تک شمال مشرقی سرحد پر انگریز کو ہمیشہ پریشان رکھا، مگر افسوس کہ اندرونی پریشانیوں اور بیرونی سازشوں کی وجہ سے اس مقدس تحریک کا یہ پہلو عملی طور پر کافی کمزور رہا۔

دوسرے مقصد کے لیے مولانا محمد اسماعیل شہید۔قدس اللہ روحہ۔ نے کتاب "تقویة الإیمان" اور "تذکیر الإخوان" لکھیں اور شائع فرمائیں۔ "تذکیر الإخوان" گو دوسرے کے نام سے شائع ہوئی، مگر تحریک کی معنویت کو سمجھنے والے جانتے ہیں کہ تذکیر، تقویۃ الایمان کا ہی دوسرا حصہ ہے۔ دونوں کتابیں کلمۂ توحید کی وضاحت ہیں۔ پہلا حصہ لا الٰہ الا اللہ کی تشریح اور دوسرا محمد رسول اللہ کی توضیح۔ دونوں کتابوں کی بڑی کثرت،

سے اشاعت ہوئی۔ ان کی روشنی نے لاکھوں دلوں کو منور کیا اور کروڑوں مردہ روحوں کو ان سے اللہ تعالیٰ نے زندگی بخشی۔ تحریک کا یہ پہلو کافی کامیاب رہا۔ سمجھنا چاہیے کہ توحید وسنت کی اشاعت اور جمود کے خلاف ہزاروں زبانیں جو نغمہ سرا ہیں، انھیں کی بدولت ہیں۔ تقویۃ الایمان کی زبان، اندازِ بیان، پھر نصوصِ قرآن وحدیث کے مضامین کی دلنواز چاشنی نے فضا کو ایسا مسحور اور اذہان کو اتنا متاثر کیا کہ ہزارہا دلوں نے اس کی تعلیمات کو قبول کیا۔ چناں چہ لاکھوں کی تعداد میں یہ کتاب ہر سال شائع ہوتی اور گھروں میں پڑھی جاتی ہے۔

اس دنیا کا مزاج ایسا ہے کہ بعض عناصر اچھی سے اچھی چیز کی مخالفت پر بھی آمادہ ہو جاتے ہیں۔ تقویۃ الایمان کی مخالفت میں بدایوں اور بریلی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اسی کیمپ کے ایک مراد آبادی بزرگ مولوی نعیم الدین نے (جن کا انتقال ۱۳۶۷ھ۔ ۱۹۴۸ء میں ہوا) تقویۃ الایمان کی تردید میں پھر ایک کتاب لکھی، جس کو مخالف کیمپ نے بہت اُچھالا۔ شاید اس لیے کہ یہ تالیف لطیف سب وشتم کے مسالے سے چٹ پٹی اور مغالطوں سے بھرپور تھی۔ مولوی نعیم الدین نے اپنے زعم میں "مدلل" کرنے کا اپنا حق خوب استعمال فرمایا ہے، جس سے تقویۃ الایمان اور عقیدہ توحید کی قرآنی اور نبوی تشریح میں شکوک اور شبہات خام علموں اور ناواقفوں کے لیے اُبھر سکتے تھے۔

اندریں حالات حضرت مولانا ثناء اللہ صاحب مرحوم (متوفی ۱۳۶۷ھ۔ ۱۹۴۸ء) نے ضرورت محسوس فرمائی کہ اس کے اغلاط کو رفع اور مغالطات کا پردہ چاک کیا جانا چاہیے۔ چناں چہ مرحوم کی مردم شناس نگاہ نے مراد آباد ہی کے ایک صاحبِ علم بزرگ جناب مولانا عزیز الدین صاحب (مرحوم) کا جواب کے لیے انتخاب فرمایا۔ مولانا جواب لکھ کر اخبار "اہلِ حدیث" میں طبع کراتے رہے، جس کا سلسلہ کئی سال جاری رہا۔ بعدہ کافی عرصہ تک اخبار میں سلسلہ طباعت بند رہا، لیکن معلوم ہوتا ہے مولانا عزیز الدین رحمہ اللہ نے جواب کی تکمیل کر دی تھی، مگر خدا جانے کیا موانع پیش آئے کہ کتاب طبع نہ ہو سکی، تا آنکہ پاکستان بن گیا۔ مولانا مرحوم امرتسر سے سرگودھا پہنچ گئے اور پریشانیوں میں ۱۹۴۸ء میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ رحمہ اللہ تعالیٰ.

ممکن ہے ان کو پتا نہ ہو کہ جو کام انھوں نے شروع کرایا تھا، وہ کہاں تک پہنچا۔ قیامِ پاکستان کے بعد دونوں منطقوں کے اربابِ اقتدار میں کشیدگیاں پیدا ہو گئیں۔ دونوں کے سیاسیات الگ ہو گئے۔ آنا جانا بند ہو گیا۔ انھی ۱۹۴۸ء کے ایام میں مولف مرحوم بھی انتقال فرما گئے۔ تغمدہ اللہ برحمتہ۔ یہ ہیں جو میں نے شروع میں کہا ہے، قدرتِ الٰہیہ کی نیرنگیاں کہ دونوں بزرگ رخصت ہو گئے اور کتاب طبع نہ ہو سکی ؎

ما کل ما یشتھیه المرء یدرکه   تجري الریاح بما لا تشتھي السفن

برادرم مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کا ذوقِ تلاش و جستجو قابلِ داد ہے۔ معلوم نہیں، کس طرح وہ مولانا عزیز الدین مرحوم کے اعزہ سے کتاب کا مسودہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ انھوں نے چند سال ہوئے مسودہ مجھے دکھایا اور اس کی طباعت و اشاعت کی ضرورت و اہمیت کی وضاحت کی۔ مجھے ان کی تجویز پسند آئی، مگر ہوشربا گرانی کے اس دَور میں ایسی ضخیم کتاب کی طباعت کے لیے ہزاروں روپے درکار ہوتے ہیں۔ بہر حال میں نے اپنے احباب سے ذکر کیا تو انھوں نے بہترین تعاون پیش فرمایا۔ چناں چہ اس سلسلے میں عزیز محترم میاں مہر محمد افضل صاحب آڑھتی (گوجرانوالہ) نے مصارف میں سب سے زیادہ حصہ لیا۔ میاں محمد افضل صاحب کاردباری ہونے کے باوجود علم دوست، توحید و سنت کے شیدائی اور اُن کی تبلیغ و اشاعت سے شغف رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں اخلاص کی دولت اور توحید و سنت کی محبت سے مزید بہرہ ور فرمائے۔ دوسرے معاون اس میں میاں عبدالعزیز صاحب انصاری (چاہ چوہاناں گوجرانوالہ) ہیں۔ میاں عبدالعزیز بھی جماعتی اشاعت کے کاموں سے خاصی دلچسپی رکھتے ہیں۔ جزاہ اللہ تعالیٰ.

''اکمل البیان'' سب مراحل طے کر کے بتوفیقہ تعالیٰ شائقین کے ہاتھوں پہنچ رہی ہے۔ مولف مرحوم نے محنت فرمائی۔ مولانا امرتسری مرحوم نے ان کو توجہ دلائی۔ اللہ تعالیٰ دونوں کو کروٹ کروٹ اپنی رحمت سے نوازے۔ محبی مہر محمد افضل اور میاں عبدالعزیز نے اس کی طبع و اشاعت میں ہاتھ بٹایا۔ اللہ تعالیٰ ان کے مال و کاروبار میں مزید برکت اور اخلاص کے ساتھ خدمتِ دین کی توفیق مرحمت فرمائے۔ میں دونوں دوستوں کا شکر گزار ہوں۔

آخر میں مجھے برادرِ محترم مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی (مدیر المکتبہ السلفیہ، لاہور) کا شکریہ ادا کرنا ہے، جنھوں نے نہایت تگ و دو سے اپنے موضوع پر ایک بہترین کتاب مہیا کی۔ پھر باریک خط کے آٹھ سو صفحات پر دیدہ ریزی سے نظر غائر ڈالی، اس کی ممکن اور مناسب تصحیح وتصویب فرمائی، ضروری حوالجات کی طرف مراجعت پر وقت صَرف کیا، مواضعِ مہمہ پر مختصر علمی و تحقیقی حواشی لکھے اور امکانی حد تک اس کو مُعنونَ و مرتب بھی کر دیا، کیوں کہ ساری کتاب میں غالباً عنوان نہیں تھے، جس سے استفادے میں دقت ہوتی، جو بحمد اللہ اب نہیں رہے گی۔ یہ سب عرق ریزی محترم رفیق موصوف کی توحید و سنت سے محبت اور مسلکِ اہلِ حدیث سے والہانہ شغف کا نتیجہ ہے کہ کتاب بہتر طباعت اور ممکن تصحیح کے ساتھ حاملینِ توحید کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔ درحقیقت مولانا محمد عطاء اللہ حنیف کا بھی جماعت اہلِ حدیث، بلکہ جملہ اہلِ توحید پر یک گونہ احسان ہے۔ جزاہ اللہ تعالیٰ أحسن الجزاء.

ناسپاسی ہوگی اگر مولوی حافظ عبدالرحمٰن گوہڑوی (منتظم المکتبہ السلفیہ) کا شکریہ ادا نہ کیا جائے کہ طباعتی معاملات میں ان کی مساعی مولانا کے ہم رکاب رہیں اور ان کی دلچسپی سے بعض مشکلات کے حل میں مدد ملی۔ ان کی ترقیِ درجات دینی و دنیاوی کے لیے میری دعا ہے!

اللہ تعالیٰ قابل مولف اور باقی تمام معاونین کو ان کے اعمالِ خیر کا بہتر بدلہ دے اور ہم سب کو توحید و سنت کی اشاعت کے لیے مزید توفیق عنایت فرماتا رہے۔

والسلام

محمد اسماعیل، کان اللہ لہ

خطیب جامع مسجد اہلِ حدیث گوجرانوالہ

شعبان ۱۳۸۴ھ = دسمبر ۱۹۶۴ء

تذ کارِ فاخر:

مجموعہ نور السنۃ وقرۃ العین در اثبات سنتِ رفع الیدین

(تالیف: مولانا محمد فاخر زائر الہ آبادی۔ ناشر: جمعیت اہلِ حدیث، گوجرانوالہ۔ ۱۹۵۹ء)

نام: محمد فاخر۔ والد: محمد یحییٰ۔ تخلص: زائر۔ مسکن: الہ آباد۔ پیدایش: ۱۱۲۰ھ۔ انتقال: ۱۱۶۴ھ۔

شیخ کے خاندان میں بیعت و ارشاد کا سلسلہ قدیم سے جاری تھا، لیکن مشیخت کی بدعات سے نفرت تھی۔ ضروری علوم میں اپنے والد اور اپنے بڑے بھائی شیخ محمد طاہر سے استفادہ فرمایا اور مسندِ تدریس و تعلیم کو زینت بخشی۔ ۱۱۴۹ھ میں سفرِ حج اختیار فرمایا اور حرمِ محترم میں شیخ محمد حیات سندھی سے حدیث اور علومِ حدیث حاصل فرمائے، اور مدینہ طیبہ ہی وہ سرچشمہ ہے، جس سے حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے علومِ حدیث کا استفادہ فرمایا اور حجاز ہی کی بابرکت تربیت کا اثر ہے کہ حضرت شاہ صاحب جمود و تقلید کے قائل ہیں اور نہ ہی علامہ شیخ محمد فاخر۔

حج کے لیے دوسرا سفر ۱۱۵۴ھ میں اختیار فرمایا اور سورت کے قریب مرہٹوں کے ہاتھ گرفتار ہوئے۔ کتابوں کے سوا تمام سامان غارت کر دیا گیا۔ شیخ کا اس قدر احترام ضرور کیا کہ اپنی سواری دے کر انھیں شہر سورت میں پہنچا دیا۔ شیخ ۱۱۵۶ھ میں یہیں سے حجاز کے لیے روانہ ہوئے۔ یہ جہاز بھی تباہ ہوگیا، لیکن شیخ بندر مخا میں چند روز قیام فرما کر اسی سال حجاز بخیریت پہنچ گئے۔ ۱۱۵۹ھ میں وطن واپس آ گئے، پھر ۱۱۶۰ھ میں سفرِ حرمین کا ارادہ فرمایا، لیکن کامیابی نہ ہوئی اور واپس آ گئے، پھر ۱۱۶۴ھ میں زیارتِ حرمین کے لیے تیار ہوئے اور بعارضہ سرسام بیمار ہوگئے اور اسی سال بعمر ۴۴ سال انتقال فرمایا۔ تاریخِ پیدایش ''خورشید'' تاریخِ انتقال ''زوالِ خورشید'' ہے۔

شیخ نے بچپن میں اپنے جد امجد شیخ محمد فضل سے بیعتِ طریقت فرمائی، انھوں نے تربیت کے لیے ان کے والد بزرگوار شیخ محمد یحییٰ کے سپرد فرمایا۔

مسلک اہلِ حدیث:

شیخ مسلکاً اہلِ حدیث تھے۔ ائمہ دین سے انتہائی محبت کے باوجود مروجہ تقلید کو سخت ناپسند فرماتے، اسی ناپسندیدگی کا تذکرہ ان کے اکثر اشعار میں ملتا ہے ؎

بقول مصطفیٰ زائر ز رائے دیگراں ماندم شہود یار مانع گردد از اغیار عاشق را

کنند گور پرستاں زیارت زاہد | کہ زیرِ گنبد دستار زندہ درگورست
زائر ز رائے قوم نیست بہرہ مرا | علمِ حدیث کرد ز خود بے خبر مرا
زائر از کشکول اہل رائے نتواں لقمہ خورد | برسرِ خوان رسول اللہ مہمانیم ما
زائر کہ مایہ اش از سنت نبی است | محتاج اعتقاد ز علم الکلام نیست
از احادیث رسول آوردہ ام اسرار دیں | نیست غیر از گوہر شہوار در دکان ما
جز نقش نماندہ رہ و رسم قیل و قال | زائر تمام دفتر بدعت دریدہ است
زائر چہ غم از کش مکش زمرہ تقلید | سلطان رسل گر سرما داشتہ باشد
نمے دہند اطبا دوائے درد گناہ | بخاک سنت اگر میردی شفا باشد
زائر بہار باغ جمال پری رخاں | با شاہد حدیث برابر نمے کند
زرای قوم نہ شد نور ظلمت زائر | بیا بیا کہ بعلم حدیث چارہ کنیم!

اس دور کے اکثر علما تقلید کے جمود سے متنفر تھے۔ یہ داعیہ دسویں صدی ہجری کے بعد اہلِ علم میں عام معلوم ہوتا ہے۔ حضرت شیخ سرہندی کے مکتوبات میں بھی ارشادات پائے جاتے ہیں۔ حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں، قاضی ثناء اللہ پانی پتی، حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ اور اُن کے ابنا و احفاد کے ارشادات اور تصانیف سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ائمہ دین سے وابستگی کا یہ جامد انداز، جس کی دعوت آج کل دیوبندی مکتبِ فکر اور بریلوی حضرات کی طرف سے دی جا رہی ہے، درست نہیں۔ علما کے لیے تو ویسے ہی شرعاً ضروری ہے کہ وہ کتاب و سنت کی طرف رجوع کریں اور عوام بے چارے تو حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی نزاع سے ویسے ہی بے خبر ہیں۔ "العامي لا مذهب له" عوام کا کوئی مذہب نہیں، وہ بیچارے ان تفصیلی تنازعات سے بے خبر ہیں، جو فروعی مسائل میں پائے جاتے ہیں۔ ان کو حنفی، شافعی کہنا بالکل بے معنی ہے۔ ان کو اسی غیر معلوم تقلید میں تقلیداً جکڑنا دینِ اسلام کی وسعتوں کو بلاوجہ سکیڑنے کے مترادف ہے۔ عوام کو اجازت ہونی چاہیے کہ وہ علما کی طرف رجوع کریں اور جو مسلک مصالحِ وقت کے مطابق ہو اور قرآن و حدیث و تعاملِ سلف سے مدلل ہو، اس پر عمل کرنے کی ان کو اجازت دی جائے، بلکہ پاکستان ایسے ملک میں اس وسعت کو آئینی حیثیت دی جانی چاہیے، مختلف مسالک میں اس سے اتفاق ہو سکے گا۔

مصنف کا مقام:

مصنف کے دیوان سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف توحید و سنت کے بے خوف داعی ہیں، وہ مروجہ جمود و تقلید پر بے لاگ تنقید فرماتے ہیں، جس میں بسا اوقات تلخی بھی نمایاں ہوتی ہے۔ مآثر الکرام میں آزاد بلگرامی

(۱۲۰۰ھ) نے اس کا تذکرہ فرمایا ہے۔ مرزا مظہر جانِ جاناں فرماتے ہیں:

''بسیارے از کبراء دین را مشاہدہ نمودم بعد از یازدہ صد سال یک شخص کہ عبارت از شیخ محمد فاخر است موافق کتاب وسنت دریافتم'' (مآثر الکرام: ۲/ ۲۱۸)

''میں نے بڑے بڑے آدمیوں کو دیکھا، گیارہ سو سال کے بعد شیخ محمد فاخر کو دیکھا، میں نے ان کو کتاب وسنت کے موافق پایا۔''

''بسا اربابِ کمال را برخوردم آں قدر کہ نزدیک شیخ محمد فاخر ارزاں شدم ہیچ جا اتفاق نیفتاد''

(مآثر الکرام: ۲/ ۲۱۸)

''بڑے بڑے باکمال احترام سے میرے سامنے جھکتے تھے، لیکن شیخ محمد فاخر کے پاس میں بہت ہی ارزاں رہا۔''

آزاد بلگرامی فرماتے ہیں:

''یعنی میرزا برخلاف وضع خود بہ ملاقات شیخ محمد اکثر می رسیدہ''

''مرزا مظہر جانِ جاناں اپنی عادت کے خلاف مولانا فاخر الہ آبادی کی ملاقات کے لیے خود جایا کرتے تھے۔''

شیخ محمد فاخر زائرؔ عربی اور فارسی شعر وسخن میں بہت زیادہ دسترس رکھتے تھے، ان کا دیوان بھی ہے، جس کا خلاصہ نواب صدیق حسن خان رحمہ اللہ نے ''نفح الطیب'' اور ''الروض الخضیب'' وغیرہ میں دیا ہے۔

حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی رحمہ اللہ حضرت علامہ فاخر کا تذکرہ ان الفاظ میں فرماتے ہیں:

''وقد كان الشيخ الأستاذ محمد فاخر المحدث رحمہ اللہ يكره ذلك (المسجد عند القبر) مستدلاً بما عند مسلم عن أبي الهياج'' (تفسير مظهري، سورة الكهف: ٦/ ٢٢)

''علامہ استاد محمد فاخر محدث قبر کے پاس مسجد بنانا ابو الہیاج کی حدیث کی بنا پر ناپسند فرماتے تھے۔''

قاضی صاحب مسلک کے لحاظ سے انصاف پسند اور غیر جامد حنفی ہیں، لیکن شیخ محمد فاخر ایسے اہلِ حدیث کا کس احترام سے ذکر فرمایا، پھر ان کی رائے سے اختلاف بھی پورے احترام سے فرمایا۔ اس سے ظاہر ہے کہ آج کل حضراتِ دیوبند اپنے اکابر کی روش چھوڑ چکے ہیں، وہ اہلِ حدیث کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔

نور السنۃ:

یہ کتاب ''سفر السعادۃ'' مصنفہ مجد الدین فیروز آبادی کا مختصر اور منظوم ترجمہ ہے، جس میں سنت کے مطابق نماز کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ کتاب اس قابل ہے کہ اہلِ حدیث کے ابتدائی مدارس میں اسے بچوں کو پڑھایا

جائے۔ یہ کتاب ۱۲۹۶ھ میں شائع ہوئی تھی، پھر ناپید ہوگئی اور اب نایاب ہو رہی تھی۔ میں نے مناسب سمجھا کہ اسے شائع کیا جائے، اس سے مآثرِ سلف کا احیا بھی ہوگا اور بچوں کو مسنون الفاظ کا بھی علم ہوگا۔

قرۃ العین:

یہ بھی حضرت مولانا فاخر الہ آبادی کی منظوم تصنیف ہے، جس میں مسئلہ رفع الیدین کے متعلق تحقیق فرمائی گئی ہے، اس کے خلاف جو کچھ کہا جاتا ہے، اس کی حقیقت بھی واضح فرمائی گئی ہے۔ یہ مسئلہ دلائل کے لحاظ سے اس قدر مضبوط ہے کہ اس کے خلاف جو قدم بھی اُٹھایا گیا ہے، آج تک نہ اس میں کامیابی ہوئی ہے اور نہ ہی مخالفینِ رفع کو اس پر اطمینان ہوا۔ غالباً جمود کے سوا اس کے خلاف کوئی چیز نہیں پائی گئی۔

مرزا مظہر جانِ جاناں مسلکاً حنفی ہونے کے باوجود سینے پر ہاتھ باندھتے تھے، امام کے پیچھے سورت فاتحہ پڑھنے کو قوی سمجھتے تھے اور تشہد میں انگشتِ سبحہ سے اشارہ فرماتے تھے۔ (أبجد العلوم: ۳/ ۹۰) حالاں کہ یہ مسائل ثبوت کے لحاظ سے رفع الیدین کی احادیث کے ہم پایہ نہیں۔

"قرۃ العین" اسی موضوع پر مختصر اور جامع کتاب ہے۔ ہم اسے "نور السنۃ" کے ساتھ شائع کر رہے ہیں، اس لیے کہ یہ بھی اس کا ایک جز ہے اور اُن مسنون اعمال سے ہے، جن پر عوام کو عمل کرنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ (مآخذ ترجمہ: مآثر الکرام، ص: ۲۱۸، ۲۱۹، اتحاف النبلاء، ص: ۴۰۴، تقصار جیود الاحرار، ص: ۱۱۵)

محمد اسماعیل، گوجرانوالہ

۲۰ جمادی الثانی ۱۳۷۸ھ = یکم جنوری ۱۹۵۹ء

تقریظ:

المرآة لطرق حديث من كان له إمام فقراءة الإمام له قراءة

(تالیف: علامہ بدیع الدین شاہ راشدی سندھی رحمہ اللہ۔ غیر مطبوع)

بسم الله الرحمن الرحيم

حمداً لكَ يا من أسندت حديثك إلى الأنبياء، وأوحيت أنواع الذكر من عبادك على من تشاء، و وفقت الخلف العدول ليحفظوا علوم السلف فتصعد إلى عنان السماء. اللهم فسلم عليهم ما دام انتحال الأغبياء وتحريف السفهاء، وما دام والذب عن حظيرة السنة ديدن العلماء وحلية الفقهاء.

وبعد: فقد رأيت الكراسة الوجيزة المسماة بالمرآة التي ألفها أخونا الثقة الشيخ الأستاذ السيد بديع الدين السندي الذي فرع شجرة العلم، وثمر الدوحة الرشدية، لا زالت شموس علمهم ضاحية داهرة. ذكر فيها طرق حديث جابر المتفق على ضعفها؛ فتكلم الشاب الفاضل على طرقه الشاردة، وأتى على نظر رجاله التي تدور رحى الإسناد عليها، كما هو دأب أئمة الحديث. وهو ـأطال الله عمرهـ من الذين خلقوا له؛ وإن هذا العلم يحمله من كل خلف عدوله، ورب حامل فقه إلى من هو أفقه منه فتكلم على طريق رواية الإمام المقدام أبي حنيفة النعمان رحمه الله، وأتى بما قيل فيه جرحا وتعديلا، وما ذكره قليل من كثير، وقد ذكر كل ذلك الخطيب في تاريخ بغداد، و أبو عمر ابن عبد البر في جامع بيان العلم وفضله و غير ذلك من كتب الرجال، وليس هو ـعافاه اللهـ أبو عذرة، وهل على الناقل إلا تصحيح النقل.

وأنا مثل إخواني من طلبة الحديث و خدامه، سجيتي الأدب مع الأئمة،

خمرت على ذلك كما خمروا، لا أحب التوسع في المقال عليهم في ذلك؛ لأن اتفاق أئمة الحديث على ضعف جميع طرقه يكفي في ذلك، ومع هذا أظن أن ذكر بعض ما تكلموا فيه لا يخلو عن الفائدة.

فإن إخواننا المقلدين قد زكت أذهانهم ورق إحساسهم في أئمتهم، إذا ذكر كلام الأئمة فيهم اتهمونا بسوء الأدب وإساءة الظن بالأئمة، بل صاروا غوغاء لا يسمعون لنا معذرة؛ كأنهم لا يخافون في مؤمن إلا ولا ذمة. و إذا سبوا الأئمة، وأخذوا من عز الشافعي، وشتموا أبا جعفر محمد بن عمرو العقيلي و ابن عدي و الخطيب و ابن حجر، و عابوا على البخاري، وجهلوا الشوكاني، و وهنوا أعمال خدام الحديث صار ذلك عندهم وعند أتباعهم تحقيقا جديداً وحقيقة واثقة وحصل لهم بذلك أريحية، وصاح مرتجزهم بأن الشيخ أتى بما لم يأت الأوائل، وإن شئت أن ترى نماذج ذلك فانظر إلى مقدمة الزيلعي للشيخ محمد زاهد الكوثري، و فيض الباري للشيخ المغفور محمد أنور الكاشميري مؤسس دار العلوم في داهبيل، وحواشي المولوي بدر عالم عليه، و مقدمة انتقاد المفتي لحسام الدين المقدسي، وحواشي الكوثري على ذيول التذكرة للذهبي، تراهم لا يرحمون أئمة الجرح والتعديل، ولا يقبلون لمسامحتهم معذرة، وإن كانت عن بادرة؛ فهذا من ذكاوة حسهم فلعل مثل صنيع المؤلف يرد طبائعهم إلى الاعتدال، ويشفيهم من الداء العضال والله يهدي من يشاء إلى صراط مستقيم.

انظر إلى الحافظ أبي بكر الخطيب الذي المحدثون له عيال، كما قاله الحافظ أبو بكر ابن نقطة، قد ذكر محل الإمام أبي حنيفة بابا بابا، عد عبادته وجوده و امتحانه وقيامه بالليل، وذكر فقهه وعلمه، وأطال في ذلك، وبسط ذلك في أجزاء من كتابه، لكن ما أفاده هذا الصنيع لأنه ذكر بعض ما تكلموا فيه بعد الثناء عليه، وجل ما ذكره الخطيب موجود في الجامع لابن عبد البر،

ولعلهم عافوا عنه لأنه عكس الترتيب، وذكر محاسن بعد المثالب.

وكذلك إذا تكلم البخاري والنسائي والدارقطني والذهبي مقالا يفيد الحنفية فهم نوابغ الدهر وأئمة الجرح والتعديل لا يرام جنابهم، وإذا قالوا في أئمة الكوفة، وتكلموا في رجال الحنفية فهم حشوية متعصبون، و انتسابهم كتبهم إليهم مشكوكة لا يعتمد عليها.

صم إذا مدح ذكرت به   وإن ذكرت بذم إذا هم أذن

إن شئت تصديق ذلك فانظر إلى مقدمة الزيلعي للكوثري (ص: ٥٧ـ٦٠) وكلامه في ذيول التذكرة على ابن تيمية، كيف تسور على هؤلاء الأئمة، والحال أنهم ما قالوا إلا ما كان حقا عندهم، وهم مجتهدون في ذلك، ومن ذا الذي ما ساء قط، ومن له الحسنىٰ فقط!

فإذا قال الذهبي في العقيلي شيئا فهو الثقة المعتمد عليه، وإذا تكلم على أبي حنيفة فهو حنبلي متعصب، وتصير الترجمة عن أصلها إلحاقية، فما لهؤلاء القوم لا يكادون يفقهون حديثا.

وجل ما تكلموا على الإمام القدوة أبي حنيفة أمور ثلاثة: الرأي والإرجاء وضعف الحفظ. أما الرأي فكما لا محيص عنه إلا أن يرد به السنة الصحيحة عمدا، وهذا من كوائف القلب وأوصافهم التي لا يعلمها إلا الله. وظني أن الإمام بريئ منه، وإن كان هناك زلة فمن الاجتهاد.

والإرجاء فليس هو ـرحمه اللهـ أول من اتهم، وإرجاءه إرجاء السنة[1] كما قاله الشهرستاني في الملل والنحل. ولم يبق إلا ضعف الحديث. ولذلك قلت روايته بالنسبة إلى أقرانه الكرام كمالك والشافعي وأحمد وغيرهم وأقرب

[1] قال الشيخ العلامة بديع الدين الراشدي معلقا على هذا القول:

قال ابن عبد البر في الانتقاء: وكان مع ذلك أيضاً لا يرى الطاعات وأعمال البر من الإيمان. فعا به بذلك أهل الحديث. وقال أيضاً: وكان مع ذلك أيضًا يقول: الطاعات من الصلاة وغيرها لا تسمى إيمانا. وكل من قال من أهل السنة: الإيمان قول و عمل ينكرون قوله ويبدعونه بذلك. انتهى

تلاميذه الكرام، وهو من الحقائق التاريخية لا محيص عنه إلا الانقياد لها، لكن لا ملام فيه عليه، لأن الأمراض لا اختيار فيها لأحد. هذا ما قاله المحققون من علماء الرجال، وأما نسبة الوضع والكذب إليه فأظنه غلطا حاشاه عن ذلك. رحمة الله عليه. بل هو من الأئمة الذين يقتدى بهم والأتقياء الذين يهتدى بهم.

وأجله في كل عين علمه فيرى له الإجلال كل جليل

ذكر ابن عبد البر عن يحيى بن معين: أكان أبو حنيفة يكذب؟ فقال: كان أنبل من ذلك. اهـ جامع. وأيضا قال: أما أبو حنيفة فلم يكن من أهل الكذب، وكان صدوقا ولكن لست أرى حديثه يجزئ (٢/ ١٢٩) فحاله كمحمد بن إسحاق[1] صاحب المغازي، إذا تفرد أو تعارض وإذا جاء بما يوافق الثقات فهو من الثقات الأتقياء وسادة النقباء.

نمقه بيده الحقير: أبو الخير الشهير بإسماعيل بن إبراهيم المدرس بالمدرسة المحمدية بجوجرانواله الهند الفنجاب.

---

[1] قال العلامة بديع الدين السندي في التعليق عليه:

التسوية بيهما في حيز المنع. فإن ابن إسحاق قد صرح بكونه ثقة جماعة من أهل العلم بخلاف أبي حنيفة فما ثبت توثيقه عن أحد من أئمة الشأن.

تقریظ:

نتائج التقلید

(تالیف: مولانا حکیم محمد اشرف سندھو۔ ناشر: دار الاشاعت اشرفیہ، بلوکی۔ ۱۹۵۸ء)

مکرم مولوی صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

''نتائج التقلید'' مجھے اس وقت ملی، جب میں دہلی کے لیے پا بہ رکاب تھا۔ دہلی سے واپسی پر فرید کوٹ جلسے پر حاضر ہونا تھا۔ رات ریل میں وقت ملا۔ میں نے رسالہ سرسری طور پر بالاستیعاب پڑھا۔ جناب نے کافی محنت کی ہے۔ حضرت میاں صاحب رحمہ اللہ کا تذکرہ اس اختصار اور استیعاب کے ساتھ آپ نے فرمایا ہے کہ جس سے ''الحیات بعد الممات'' اور دوسری کتب کی بھی ضرورت نہیں رہتی، میاں صاحب مرحوم کی جامع زندگی کے بہت سے پہلو آ گئے ہیں۔ فجزاهم الله أحسن الجزاء.

علماے دیوبند:

علماے دیوبند کو ان کی علمی خدمات نے اتنا ہی اونچا کیا ہے، جتنا مناظرات نے ہم کو نیچا دکھایا اور ذہنی طور پر جماعت کو قلاش کر دیا۔ اس علمی مرکز دار العلوم دیوبند کی پیداوار خیالات کے لحاظ سے تین قسم پر ہے:

1. مولوی انور شاہ صاحب رحمہ اللہ کے تلامذہ کا رجحان بدعت کی طرف ہے اور اہلِ حدیث سے انتہائی بغض۔
2. مولوی اشرف علی صاحب رحمہ اللہ کے معتقدین میں بدعت کم ہے، مگر اہلِ حدیث سے بے حد بغض۔
3. مولوی حسین علی صاحب رحمہ اللہ[1] کے مریدوں میں توحید کی حمایت اور اہلِ توحید سے محبت تو ہے، لیکن بعض کو سنت سے بہت زیادہ بغض ہے۔

مدرسہ دیوبند:

مدرسہ دیوبند میں اختلاف کے ساتھ جو چیز مشترک طور پر پائی جاتی ہے، وہ اہلِ حدیث سے بغض ہے۔ دیوبندی احناف نرم ہو کر سنت سے بہکاتے ہیں اور مولوی احمد علی صاحب لاہوری وغیرہ اور بعض دوسرے لوگ اس راہ میں غلط بیانی سے بھی پرہیز نہیں کرتے۔ مولوی خیر محمد صاحب جالندھری سے، چوں کہ توحید میں ایک حد

[1] مولوی حسین علی واں بھچراں ضلع میانوالی (سندھو)

تک اشتراک ہے، اس لیے اہلِ حدیث ان حضرات پر بہت زیادہ اعتماد کرتے ہیں، لیکن ان حضرات میں سنت اور اہلِ حدیث سے بغض طبیعتِ ثانیہ ہو چکی ہے۔ ان حضرات پر قطعاً اعتماد نہیں کرنا چاہیے۔ اس پہلو کو ''نتائج التقلید'' میں ذرا وضاحت سے کہنا چاہیے، تاکہ یہ باہمی اعتماد ختم ہو جائے۔ آپس میں اختلاط سوچ سمجھ کر ہو۔ نرمی اور گرمی حقائق کو نہ بدل سکے۔[1]

حضرت مولانا اشرف علی صاحب رحمہ اللہ فنِ تصوف و زہد کے بہترین ماہر مشہور تھے، لیکن حقیقتِ زہد کو خدا ہی جانتا ہے کہ کہاں تک ان میں موجود تھا۔ ہاں اتنا تو ضرور معلوم ہوتا ہے کہ سچے صوفی سنت کے شیدا ہوتے ہیں، مگر حضرت مولانا اشرف علی صاحب کی تصانیف میں سنت اور اصحابِ حدیث سے انتہائی بغض پایا جاتا ہے۔ عفا اللہ عنہ

اسی غلط تصوف کی وجہ سے ان کی طبیعت پر وہم غالب تھا اور یہ چھاچھ والا خواب اور اس کی تعبیر اسی وہم کا کرشمہ ہے۔[2] ورنہ چھاچھ پینے کے بغیر انھیں کیسے معلوم ہوا کہ اس میں روغن نہیں؟ ہر چھاچھ تو ایسی نہیں، جس میں روغن نہ ہو، (کیوں کہ دہی کی چھاچھ بھی تو آخر چھاچھ ہی کہلاتی ہے۔ کیا اس میں روغن نہیں ہوتا؟) خدا تعالیٰ مرحوم کو معاف فرمائے۔ خواب کی تعبیر میں انھوں نے حضرت میاں صاحب پر بہت بڑا ظلم کیا ہے۔ وسيعلم الذين ظلموا أي منقلب ينقلبون.

باب ثانی جس میں علمائے دیوبند کی تصحیح و طباعت کی اغلاط کی طرف توجہ دلائی گئی ہے، وہ باب نہایت اہم ہے۔ جہاں اس باب سے علمائے دیوبند کی دیانت و امانت کی حقیقت بے نقاب ہوگئی ہے، وہیں یہ بات جماعت اہلِ حدیث کی سرد مہری، یعنی کتبِ حدیث کی طباعت اور ضرورت کے مطابق جدید شروح و حواشی وغیرہ سے غفلت اور سستی پر تازیانہ عبرت ہے۔

محمد اسماعیل

نتائج التقلید کے متعلق ایک ضروری گزارش

مولانا محمد اشرف صاحب سندھو جو میرے پرانے رفیق اور دوست ہیں، آپ نے مدت ہوئی ایک رسالہ ''نتائج التقلید'' کے نام سے لکھا تھا۔ مولانا کے حسبِ خواہش ان ایام میں میں نے اس پر تقریظ لکھی تھی۔ اب سنا ہے کہ مولانا نے اسے دوبارہ شائع کیا ہے۔ مضامین میں کافی اضافہ فرمایا ہے اور کافی دنوں سے کتاب بازار میں فروخت ہو رہی ہے۔ دوبارہ طباعت اور اس کے مضامین کے متعلق مولانا نے نہ مجھے کوئی اطلاع دی نہ اس کے مضامین کے متعلق کوئی مشورہ لیا نہ ہی طباعت کے بعد مجھے کوئی کاپی ارسال فرمائی، لیکن سابقہ تقریظ اس ایڈیشن کے ساتھ

---

[1] اہلِ حدیث بھائیوں کو فاضل محترم کی نصیحت سے عبرت حاصل کرنی چاہیے۔ [اشرف سندھو]

[2] اس خواب اور اس کی تعبیر کے متعلق تفصیل کے لیے اسی مجموعے کا صفحہ (۵۷۹) ملاحظہ کریں۔

بھی شائع کر دی، حالاں کہ یہ ایڈیشن سابقہ ایڈیشن سے بہت ہی مختلف ہے۔ یہ معاملہ اصول کے خلاف ہے۔

تازہ ایڈیشن میں اگر میری تقریظ کی اشاعت مولانا اشرف کے نزدیک ضروری تھی تو مجھے قبل از اشاعت، ترمیم و اضافہ والا مسودہ دکھا لینا چاہیے تھے، افسوس ہے مولانا نے ایسا نہیں کیا اور مجھے اس سے اتفاق نہیں ہے۔

مولانا سے مخلصانہ مراسم کے باوجود یہ گزارش ضروری سمجھتا ہوں، تاکہ محترم مصنف اور میرے غائبانہ دوست مطلع رہیں اور اس تقریظ سے انھیں کوئی غلط فہمی نہ ہو۔ میں اس سلبی اندازِ تحریر کو پسند نہیں کرتا۔ امید ہے، مولانا اشرف مجھے معاف فرمائیں گے۔[1]

محمد اسماعیل، گوجرانوالہ

---

[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۱۸/ نومبر ۱۹۶۰ء)

تقدمہ:

امام شوکانی

(تالیف: مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی۔ ناشر: مکتبہ عتیقیہ جھوک دادو، تاندلیانوالہ۔ ۱۹۴۶ء)

الحمد لله وكفىٰ، وسلام على عباده الذين اصطفىٰ.

یہ ایک فطری جذبہ معلوم ہوتا ہے کہ جب قومیں اور جماعتیں رجال العلم سے خالی ہوتی ہیں، خلف سلف کی جگہ پُر کرنے سے قاصر ہوتے ہیں تو سلف کے تذکرے اور ماضی کے اعمال سے دلوں کو تسکین دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ بے شک اس میں تاسف کا اثر کارفرما ہوتا ہے، لیکن یہی تذکرے کبھی حال کی اصلاح اور مستقبل کی تعمیر میں بے حد مفید اور کارآمد ثابت ہوتے ہیں۔ مصنف علام نے اسی قسم کی حساس طبیعت پائی ہے، غالبًا ان کے قلم میں یہ مختصر سی جنبش اسی لیے ہوئی ہے، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مصنف کو اپنے مقصد میں کامیاب فرمائے اور جماعتِ اہلِ حدیث کے لیے یہ کوشش نشو وارتقا کا پیش خیمہ ثابت ہو۔ جدل و مناظرات کی عادت نے جو غیر متوازن ذہنی کیفیت پیدا کی ہے، اس کے لیے یہ تذکرے داروئے شفا ثابت ہوں۔

یہ تذکرہ امام شوکانی رحمہ اللہ کے مقامِ اجتہاد و عزیمت سے بہت کم ہے، لیکن جہاں تک محسوس ہوتا ہے، یہ نقشِ اول ہے، آیندہ اس میں بہت کچھ زیادت و اضافے کی توقع کی جا سکتی ہے۔ دنیا کے طے کردہ راہوں سے الگ راہ بنانا مشکل، پھر اس پر چلنا مشکل، پھر اس راہ کی مشکلات کو صبر و عزیمت سے برداشت کرنا اور بھی مشکل ہے۔

امام شوکانی اس راہ کے شاہسوار ہیں۔ امام ابن حزم رحمہ اللہ کے بعد امام شوکانی رحمہ اللہ ان خوش نصیب لوگوں میں سے ہیں، جن کی مساعیِ اصلاح کو ظاہری اور مادی اعانت بھی نصیب ہوئی۔ عہدۂ قضا کی وجہ سے اَشرار کو فتنہ انگیزی کا کم موقع ملا، تاہم وہ فتنوں کی دستبرد سے محفوظ نہیں رہ سکے، ان کی زندگی کا یہ حصہ ہم ایسے کم سواد اور بے صبر لوگوں کے لیے ایک اسوہ ہے۔ مسلکِ اہلحدیث حکومتِ وقت کی نگاہوں میں تو ۱۸۵۷ء سے پہلے ہی معتوب تھا، ۵۷ء نے اسے اور بھی اُجاگر کر دیا۔ سرسید کی مصلحت اندیشیوں اور مولانا محمد حسین صاحب بٹالوی مرحوم کی سوئے تدبیر سے کسی قدر ظاہری آرام تو ملا، مگر ردح حریت موت کی آغوش میں جا بسی، اس پر جدل و مناظرات

کی عادت نے قبر مشید کی صورت پیدا کر دی۔ اب وقت ہے کہ نیا خون اپنی منزل کی طرف بڑھے، ہندوستان کی لادینی تحریکات میں اپنے مقام کو پہچانے، ان بزرگانِ ملت کے اسوہ کا تتبع کرتے ہوئے راہ کی مشکلات سے بے نیاز ہو کر کتاب و سنت کے علم کو بلند کرے، اشاعتِ سنت کے لیے اپنی تمام کوششوں کو وقف کر دے، آنے والے ہندوستان میں ایک ایسے انقلاب کی تیاری کی جائے کہ سلف کی مٹی ہوئی یادگاریں پھر اُبھرنے لگیں، آزادی ہو، کتاب و سنت کی محفلیں ہوں اور کلمۃ اللہ کی سربلندی کا موقع ملے، مگر ؎

سر مدِ غمِ عشق بو الہوس راندہند — سوزِ دل پروانہ مگس راندہند

عمرے باید کہ یار آید بکنار — ایں دولت سرمد ہمہ کس راندہند

بزدل، طماع اور ہوس پرستوں کے لیے مناسب ہے کہ کوئی دوسری راہ تلاش کریں۔ وسيعلم الذين ظلموا أي منقلب ينقلبون.

والسلام

محمد اسماعیل

مدرس مدرسہ محمدیہ، گوجرانوالہ

۱۳ر شوال ۱۳۶۵ھ

مقدمہ:

کالا پانی[1]

(تالیف: مولانا محمد جعفر تھانیسری۔ ناشر: طارق اکیڈمی، فیصل آباد۔ ۱۳۹۶ھ)

الحمد لله رب العالمين، والصلاة على أنبيائه سيما الخاتم لهم، والسلام على الأتقياء البررة المكرمين إلى يوم الدين.

پیشِ نظر کتاب مولانا محمد جعفر تھانیسری مغفور کی خودنوشت سرگزشت ہے۔ اس کتاب میں متعدد مقامات پر وہابی یا اہلِ حدیث کا تذکرہ ملے گا۔ ''وہابی'' کا لفظ تو سرکارِ انگریزی کا خودساختہ ہے۔ اہلِ توحید نے ان شخصی

[1] ۱۹۴۱ء۔۱۳۶۰ھ کی بات ہے، جب خاکسار فیروز پور (مشرقی پنجاب) کی جامع اہلِ حدیث گنبداں والی میں مقیم تھا کہ مولانا محمد جعفر تھانیسری رحمہ اللہ کی مشہور کتاب ''تواریخ عجیبہ (کالا پانی)'' کو عمدہ طریقے سے شائع کرنے کا ارادہ ہوا تھا، جس پر مقدمہ لکھوانے کی درخواست حضرت مولانا محمد اسماعیل رحمہ اللہ (گوجرانوالہ) کی خدمت میں کی گئی۔ مرحوم و مغفور نے حسبِ عادت قلم برداشتہ نہایت فاضلانہ مقدمہ تحریر کر کے بذریعہ ڈاک فیروز پور ارسال فرما دیا تھا، لیکن افسوس! بوجوہ کتابِ مذکور کی اشاعت کی نوبت نہ آسکی۔

۱۹۴۷ء میں پاکستان آنے پر جو مختصر سے چند کاغذات راقم کے ساتھ آئے (ہزاروں کی قیمتی اور نادر ذاتی کتب اور بعض ضروری کاغذات تو وہیں فسادات کی نذر ہوگئے) ان میں خوش قسمتی سے حضرت کا یہ ''مقدمہ کالا پانی'' بھی تھا۔

گذشتہ دنوں اتفاقاً معلوم ہوا کہ طارق اکیڈمی کے زیرِ اہتمام کتاب ''کالا پانی'' کا تازہ ایڈیشن نہایت احسن انداز میں زیورِ طباعت سے آراستہ کیا جا رہا ہے، لہٰذا اب یہ مبارک مقدمہ اس کے ساتھ شامل ہے۔ إن الله بالغ أمره، قد جعل الله لكل شيئ قدراً.

واضح رہے کہ یہ نگارش ۳۵ سال پہلے کی ہے، اگرچہ انگریزی راج کے آخری سال تھے، تاہم برطانوی استبداد موجود تھا، جس کی طرف مقدمہ میں قدرے اشارات ہیں۔ نیز ان ہی دنوں ایک دیوبندی سیاست دان مولانا نے ''علمائے ہند کا شاندار ماضی'' نامی کتاب تالیف فرمائی تھی، جس میں نہ صرف کہ ''علما'' کہلانے کا حق اپنے حلقے کے فقہائے احناف کو دیا گیا، بلکہ ''شانداری'' کا کریڈٹ بھی، چوں کہ اس کتاب کی تالیف کے زمانے میں بھی جماعت اہلِ حدیث تحریک آزادیِ وطن کے سلسلے میں حضرت مقدمہ نویس اور مولانا ابو القاسم بناری رحمہ اللہ کی قیادت میں علمائے دیوبند کے دوش بدوش سرگرمِ عمل تھی، اس لیے مولانا محمد اسماعیل مرحوم و مغفور کو دیوبندی مولانا کی خلافِ واقع تاریخ نویسی سے دکھ پہنچنا قدرتی تھا، جس کا خفیف سا ذکر ←

نسبتوں کو اپنے لیے کبھی پسند نہیں کیا، البتہ ''اہلِ حدیث'' کے لفظ کو اپنے مسلک کے لحاظ سے ضرور پسند کیا گیا۔ اس وقت میں نہیں کہہ سکتا کہ جماعت کی اس لفظ کے متعلق کیا پوزیشن ہے، لیکن اصل وضع کے وقت یقیناً کہا جا سکتا ہے کہ اس لقب کے ساتھ نظر وفکر کے ان سکولوں سے اجتناب مقصود تھا، جو جمودِ تقلیدی کے ترجمان تھے اور اس فرقہ پروری کے سبب اسلام پر کئی حد بندیاں لگا دی گئی تھیں، جن کو عبور کرنا ترکِ اسلام کے مرادف یا کم از کم فسق ومعصیت سمجھا جاتا تھا، حالاں کہ اسلام نے سب سے بڑی نعمت جو اپنے متبعین کو عطا فرمائی تھی، وہ یہی حریتِ فکر تھی اور آبا واجداد کی رسوم اور پابندیوں سے نجات۔

پہلی صدی کے اواخر اور دوسری صدی کے اوائل میں گو بہت سے مفاسد اور خرابیاں پیدا ہو چکی تھیں، تاہم عقل و دانش اور فہم وفراست کے کھلے اور وسیع دروازوں پر یہ قفل نہیں پڑے تھے، جو چوتھی صدی ہجری کی پیداوار ہیں۔ پہلی صدی ہجری میں محمد بن قاسم رحمہ اللہ کے رفقا کا وہ ریلا، جس نے سب سے پہلے کراچی کے راستے ساحلِ (متحدہ) ہند کو عبور کیا، ایسے مقدسین پر مشتمل تھا، جو اسلام کے آبِ زلال کو اس کے اصل سرچشموں سے حاصل کرنے کے عادی تھے۔

اس کے بعد علم کی کمی اور زمانۂ نبوت کے بُعد نے فرقہ پرستی کا یہ مخمصہ پیدا کر دیا، جس میں آج کل ہم مبتلا ہیں، اور بے حسی کا یہ عالم ہے کہ خود اس جمود وتقلید پر فخر کرتے ہیں۔ علمائے امت اور ائمہ اصلاح وتجدید کے متعلق یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ بھی ہماری طرح قاصر النظر تھے اور کتاب وسنت سے استدلال کی جرأت نہیں فرماتے تھے، پھر اس کے لیے ایسے حیل اور تاویلات پیدا فرماتے ہیں کہ جس سے ان حضرات کو بھی حیل کے فن کا مجتہد اعظم کہنے کو جی چاہتا ہے۔[1] عیب اور اس کا عدمِ احساس بلکہ عیب پہ فخر ایسے امراض ہیں، جن پر امت کو ناز نہیں ہو سکتا، بلکہ ندامت سے سر جھک جاتا ہے اور اصلاحِ حال کا ولولہ، یاس اور نااُمیدی کا پیکر بن کر رہ جاتا ہے۔

← مقدمہ میں ہے، جس میں ان کو حق بہ جانب سمجھنا چاہیے۔

افسوس! مقدمہ میں مذکور تقریباً سبھی حضرات جناب مقدمہ نویس کی طرح آج ہم میں موجود نہیں۔ رہے نام اللہ کا۔ رحمہم اللہ تعالیٰ۔

خاکسار محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی (ناظم: المکتبۃ السلفیہ، لاہور)

غرہ محرم ۱۳۹۶ھ

[1] ملاحظہ ہو ''الفرقان'' بریلی کا ''شاہ ولی اللہ نمبر''، مولوی خیر محمد جالندھری کا مضمون ''شاہ ولی اللہ حنفی تھے''۔ واضح رہے کہ مولانا مرحوم کی یہ تحریر اس زمانے کی ہے، جن دنوں یہ محولہ نمبر شائع ہوا تھا۔ [ع، ح]

مصلحین کی مساعی:

ہر صدی میں ایسے لوگ موجود رہے، جو وقتی خرابیوں کو دیکھتے اور ان کے بے قرار دل، ان کی اصلاح کے لیے بے تاب ہو جاتے۔ حدیث: « لا يزال طائفة من أمتي » کا مقتضیٰ بھی یہی تھا۔ ان تمام بزرگوں کا تذکرہ بقیدِ سنین اس مختصر سی تحریر کا موضوع نہیں، لیکن تاریخ کا ادنیٰ طالب عالم آسانی سے یہ جان سکتا ہے کہ مصلحین حسبِ حال ان تباہیوں کی روک تھام کرتے رہے اور اس راہ میں ہجرت، قید بلکہ دار و رسن تک کی صعوبتیں برداشت فرماتے رہے۔ حضرت امام مالک، حضرت امام ابو حنیفہ، امام شافعی، امام احمد اور امام سفیان ثوری رحمہم اللہ وغیرہ ائمہ اسلام ایک ایک اس کی نظیر میں پیش کیے جا سکتے ہیں۔

سنتِ الٰہی:

گیارھویں صدی ہجری کے اواخر میں حق و باطل کی آویزش نے ایک ایسے معرکے کی صورت اختیار کر لی تھی کہ کفر و فسق کے شیوع اور تعلیماتِ اسلامی کے انحطاط نے دنیائے ہست و بود کو ظلمت کدہ بنا دیا تھا۔ فجور اور بدعت کے بادل اس قدر محیط تھے کہ حق و صداقت کی کسی ہلکی سی کرن کے ظہور کی بھی امید نہیں کی جا سکتی تھی، لیکن سنتِ الٰہی کے مطابق مختلف مقامات میں مصلحینِ امت کا ظہور ہوا۔ عرب میں یہ شرف خطہ نجد کو ملا اور حضرت شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب رحمہ اللہ کا انتخاب عمل میں آیا۔ گو یہ تحریک سیاسی نہ تھی، اصلاحی تھی، لیکن بتدریج سیاسی ہو گئی، کیوں کہ اسلام کا نظام ہی ایسا تھا کہ وہاں سیاسیات سے الگ رہ کر کسی کامیاب اصلاح کی توقع ہی نہ تھی۔ یہ تحریک ''وہابی تحریک'' کے نام سے عرب میں کافی کامیاب ہے۔ اہلِ نجد اسی نام سے پکارے جاتے ہیں اور اسے شاید اپنے لیے پسند بھی کرتے ہیں۔ اس وقت اس تحریک کو عرب میں علمی اور سیاسی اقتدار حاصل ہے۔ فالحمد لله على ذلك.

دوسری تحریک:

دوسری تحریک الجزائر اور ٹیونس میں شروع ہوئی، جو ''سنوسی تحریک'' کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔ یہ تحریک فرانس کے مظالم اور استبداد کی بدولت شروع ہوئی۔ سنوسی خاندان نے اس کی راہنمائی کی۔ گو یہ تحریک کھلے طور پر کامیاب نہ ہو سکی، لیکن اس کے بیج اس قدر گہرے ہوتے گئے کہ بالآخر فرانس کو لے ڈوبے۔ ملک کی اسی اندرونی ناراضگی نے ہٹلر کے مقابل فرانس کو چت گرایا اور ملک سے اسے کوئی امداد نہ مل سکی، اس کی تفصیلات ہمیں نہیں مل سکیں اور نہ ہی اس وقت وہ مطلوب ہیں۔

تیسری تحریک:

تیسری تحریک کے بانی حضرت شیخ جمال الدین افغانی ہیں۔ اس کی ابتدا ایران سے ہوئی، ہندوستان بھی اس سے متاثر ہوا، بلکہ مصر، قسطنطنیہ اور یورپ تک اس کے اثرات پھیلے۔ آج بھی مصر میں زندگی کے آثار اسی کے سبب پائے جاتے ہیں۔ شیخ محمد عبدہ، سید رشید رضا اور شیخ مراغی اسی تحریک کے متعلقین سے ہیں، جنھوں نے اپنی عمریں یورپ کے سیاسی اقتدار کے خلاف اور عامۃ المسلمین کی اصلاح میں صَرف فرما دیں۔ غرض مصر کی ساری بیداری شیخ جمال الدین رحمہ اللہ اور ان کے تلامذہ کی مساعی سے ہے۔ شکر اللہ مساعیھم.

چوتھی تحریکِ اصلاح:

مغل حکومت پہلے بھی کوئی خالص اسلامی حکومت نہ تھی، اس کے نظام میں غیر اسلامی اثرات بہت زیادہ تھے۔ اپنے عروج کے زمانے میں بھی یہ حکومت مہدویت[1] اور شیعیت کے اثرات سے مرکب تھی۔ باستثناء ایک، دو کے عموماً بادشاہ جاہل تھے، ان کی ہوا پرستیوں کے ساتھ علمائے سو کے تعاون نے حالات کو بد سے بدتر کر دیا تھا۔ علمائے حق کو اس نظام سے صرف اسی قدر دلچسپی تھی کہ بادشاہوں کے نام مسلمانوں سے ملتے جلتے تھے۔ کبھی کبھار عید اور جمعہ کی نماز میں شریک ہو جاتے تھے، اس کے سوا وہاں اسلام کے لیے کوئی گنجایش نہ تھی۔

اسلام کے اس ظاہری اقتدار کے سبب علمائے حق ان سلاطین کے خلاف کوئی کھلا قدم اٹھانا پسند نہ فرماتے تھے اور چاہتے تھے کہ یہ معاملہ وعظ و موعظت اور افہام و تفہیم سے طے ہو جائے اور یہ سلاطین صحیح طور پر اسلامی نظام کی ذمے داریاں اپنے اوپر لے لیں۔[2] لیکن سلاطین کے لیے ناممکن تھا کہ وہ کسی اصلاح کو آسانی سے قبول کر لیں یا فجور و معصیت کو صرف علمائے حق کی ناراضی یا نصیحت سے چھوڑنے پر آمادہ ہو جائیں۔

جلال الدین اکبر اور اس کے رفقا کی مفسدانہ مساعی اور اہلِ حق کی اذیت، تخریب دین کے لیے منصوبے اور عیاشیوں کی طرف کھلا ہوا رجحان، یہ ہندوستان کی اسلامی تاریخ کا تاریک ترین اور کھلا ہوا باب ہے۔ جہاں شیخ محمد طاہر پٹنوی رحمہ اللہ ایسے اہل اللہ کی پیش نہ جا سکی، نہ دوسرے اہلِ حق کی، وہاں اگر جادو چلا تو خانوادہ ملاّ مبارک کا اور بس۔ فسحقاً لھم.

حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ:

ان ناگزیر حالات کی بدولت قانونِ الٰہی کے موافق ملاءِ اعلیٰ کی رحمت بھری نگاہیں اس ظلمت کدہ کی

[1] سید محمد جونپوری کی طرف منسوب۔ [ح، ع]

[2] حضرت مجدد الفِ ثانی رحمہ اللہ نے اپنی ساری عمر ایسی ہی کوششوں میں صَرف فرما دی۔ رحمہ اللہ تعالیٰ [مولف]

طرف متوجہ ہوئیں اور خانوادہ ملا مبارک کی نجاستوں کو دور کرنے کے لیے ان کی جگہ حضرت شاہ عبدالرحیم رحمہ اللہ کے خاندان نے لے لی۔ فرق صرف اس قدر تھا کہ ملا مبارک کا خاندان جلال الدین اکبر کے زیرِ سایہ تھا اور شاہ عبدالرحیم رحمہ اللہ کے لختِ جگر پر صرف خدا کا سایہ۔ ابو الفضل اور فیضی کی بھوک پیاس کا علاج شاہی محلوں اور اکبر کے قلعوں میں تھا اور اس خاندان کی ضروریات اور روحانی پیاس کی سیرابی کا سامان حجاز وطیبہ میں۔ فشتّان ما بينهما.

یہ لوگ ایوانِ خسروی سے اتنے ہی بے نیاز تھے، جس قدر خانوادہ ملا مبارک ایوانِ ''خداوندی'' سے، اسی لیے حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے تحصیلِ علوم کے بعد درسِ حدیث کے لیے حجاز کا رخ کیا اور فنونِ حدیثیہ کا ایک بیش بہا ذخیرہ حجاز سے ہندوستان کے لیے جمع فرمایا اور سابقہ درسیات کے ساتھ درسِ حدیث کو خاص اہمیت دی اور عمر کا باقی حصہ اسی راہ میں ختم فرما دیا ؎

طاق و رواق مدرسہ و قیل و قال درس — اینہا بخاک کوئے تو مادر نہادہ ایم

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کی عمر حسبِ بیان حضرت نواب صدیق حسن خاں مرحوم (ابجد العلوم، ص: ۹۱۳) قریباً ۶۲ سال (پیدائش ۱۱۱۰ھ اور وفات ۱۱۷۶ھ) ہوتی ہے۔ یہ زمانہ ہندوستان میں طوفانی انقلابات کا ہے۔ بیسیوں قوتیں دہلی کے تخت کی آرزو میں بساطِ سیاست پر آئیں اور کامیابی یا ناکامی کے ساتھ ختم ہوئیں۔ بیٹوں نے اپنی سیاسی مصالح کی بنا پر باپ سے بغاوت کی، بھائی بھائی سے لڑا۔ غرض اس عرصے میں قریباً دس بادشاہ دلی کے تخت پر قابض ہوئے اور اسے چھوڑ کر رخصت ہوگئے۔ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کی وفات کے ایام میں برطانوی عتاب تختِ دہلی پر قابض ہونے کے لیے مغل بادشاہوں سے گھوریاں لے رہا تھا، بلکہ ایک حد تک اس کا چنگل اس شکار پر پڑ بھی چکا تھا۔ یہ تو ناممکن ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ ایسا بابصیرت آدمی ان حوادث سے متاثر نہ ہو یا وہ ان نتائج سے بے خبر ہو، جو ان انقلابات کے بعد اُن کے پروگرام پر پڑ سکتے تھے، جس کی تکمیل کی ذمے داری حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ڈالی گئی تھی، جس کا تذکرہ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے ''تفہیمات'' میں جا بجا اشارتاً وصراحتاً کیا ہے۔

شاہ صاحب رحمہ اللہ کا اندازِ اصلاح:

شاہ صاحب رحمہ اللہ کی مثال ان حوادث میں اس پہاڑ کی طرح ہے، جو سمندر کے کناروں پر واقع ہو۔ جس کی موجیں اسے بار باری تھپیڑتی ہیں، لیکن اس کے سکون میں کوئی جنبش نہیں پیدا کر سکتیں، اس کے اندر کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ اضطراب بھی پیدا نہیں ہوسکتا۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ کی تصانیف میں ان حوادث سے کوئی بے قراری یا قلق محسوس نہیں ہوتا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک کوہ وقار جرنیل اپنی اور دشمن فوج کی ساری حرکتوں کو دیکھتا ہے،

ناگزیر حالات کو سہارتا ہے اور اپنے پروگرام کی تکمیل کے لیے بڑھا جاتا ہے۔ "حجة الله البالغة" کے ابواب میں خلافتِ الٰہی کی تاسیس اور تکمیل کے لیے جو خاکہ بنایا گیا ہے، اس میں بتدریج رنگ بھرا جائے گا اور اس ارادے کی تکمیل ٹھیک اسلامی تعلیمات کے زیرِ سایہ ہوگی۔ اس کے لیے نہ نعرۂ تکبیر کا ارتعاش مطلوب ہے، نہ "زندہ باد" کی ہنگامہ آرائی۔

مقابل کی صفوں میں سے جہاندار شاہ ہو یا فرخ سیر، کوئی بھی اگر مقاصد سے ٹکرانے کے لیے آمادہ ہوتو ایک تبسم آمیز بے نیازی کے ساتھ اس کی دعوتِ مبارزت قبول فرما لی گئی ہے، لیکن اس سیاسی انہماک نے مسلمانوں کی اندرونی بیماریوں سے ایک منٹ کے لیے بے پروانہیں کیا۔ "فتح الرحمٰن" کی اشاعت، درسِ حدیث اور ردِ بدعات کا ہر ہر مسئلہ ساتھ ساتھ جا رہا ہے۔ "حجة الله البالغة"، "تفہیمات" اور "البلاغ المبین" آپ کی تصنیفات پڑھنے والے ان محاذوں کو خوب پہچانتے ہیں، جن پر مجددِ وقت لڑ رہا تھا۔

حضرت شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ:

۱۱۷۶ھ میں حضرت مجددِ وقت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کی وفات کے بعد یہ ساری ذمے داریاں شاہ عبدالعزیز صاحب رحمہ اللہ کے حصے میں آئیں۔ آپ کے دور میں ان مقاصد کے تین شعبے ہوگئے: سیاسیاتِ وطن، درس و تدریس اور پند و موعظت، اور ہر شعبہ حسبِ رجحانِ طبیعت شاہ صاحب کے تلامذہ کے حصے میں آیا اور ہر ایک نے ذمے داریاں اپنی افتادِ طبیعت کے مطابق اٹھالیں، تاہم معلوم ایسا ہوتا ہے کہ سب کارگزاریوں کی نگرانی خود فرماتے ہیں اور حسبِ ضرورت ہدایات دیتے تھے۔

خاندانِ دہلی اور حنفیت:

فروعِ فقہیہ میں حنفی مسلک کا التزام خاندان میں حضرت شاہ عبدالرحیم رحمہ اللہ کے زمانے سے ہی اُٹھ چکا تھا۔ بعض مشہور مسائل میں وہ حنفی مسلک کے پابند نہ تھے، جیسے قراءتِ فاتحہ خلف الامام، چناں چہ حضرت شاہ عبدالرحیم رحمہ اللہ نمازِ جنازہ اور دوسری نمازوں میں اس کا التزام فرماتے تھے۔ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے یہ قصہ اور بھی عریاں کر دیا، چناں چہ مولانا شاہ محمد فاخر زائر الہ آبادی کا ورودِ دہلی، آمین بالجہر کی نزاع اور شاہ صاحب رحمہ اللہ کا فیصلہ مشہور واقعہ ہے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمہ اللہ کے فتوؤں میں بھی فاتحہ کے متعلق مسلکِ شافعی کی کھلی حمایت پائی جاتی ہے۔ (ملاحظہ ہو: فتویٰ مطبوعہ کلکتہ)

حضرت شاہ محمد اسماعیل شہید رحمہ اللہ نے تقلیدِ جامد کے اس پہلو کو بالکل ہی بے نقاب کر دیا۔ "تنوير العينين في إثبات رفع اليدين" لکھ کر حنفی مسلک کی حمایت سے بالکل دستکش ہوگئے اور رفع عندالرکوع و بعدالرکوع

کو ترکِ رفع پر ترجیح دی، جیسے حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ بھی ''حجۃ اللہ البالغۃ'' میں ظاہر فرما چکے تھے۔
(حجۃ اللہ البالغۃ: ۲/ ۸)

اظہارِ حقیقت:

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کے تلامذہ میں حنفی مسلک کے پورے پابند بھی تھے۔ سید احمد شہید رحمہ اللہ کے لشکر میں دونوں فریق یا دونوں مسلک کے آدمی دوش بدوش سکھوں سے لڑتے تھے اور آپس میں ان مسائل پر کوئی ادنیٰ سی مخاصمت یا آویزش بھی نہ ہوتی تھی اور حق بھی یہی ہے۔ معاملہ ایک سنت پر عمل یا اس کے ترک سے زیادہ نہیں اور نہ ہی حنفی اور اہلِ حدیث میں کفر و اسلام کا فرق ہے (تقلید شخصی پر جمود سے قطع نظر)۔ ایسے اختلافات سلف سے خلف تک موجود رہے ہیں۔ ان اختلافات کی بنا پر نہ کسی کی تکفیر عمل میں آئی نہ تفسیق۔ شخصی اجتہاد یا ترجیح سے اسے زیادہ اہمیت نہیں دی گئی۔ ہر ایک اپنی تحقیق اور صواب دید پر عمل کرنے میں آزاد تھا۔

ایک عجیب حقیقت ہے کہ اس تحریک میں اکثریت علما کی تھی۔ سکھوں سے جنگ کے بعد انگریز سیاسیین سے بھی مجاہدین کو اُلجھنا پڑا۔ انگریز شاطر بھی ان مخلصین میں ایسے اختلافات پیدا کرنے سے قاصر رہا۔ یہ سب علم و دانش کی برکت تھی کہ اختلاف کے باوجود حدودِ اختلاف کو سمجھ لیا گیا تھا۔ یہی ایک نقص ہے، جسے آج ہم اپنے اختلافات میں نہیں سمجھ رہے، ورنہ وہ کون سا زمانہ ہے، جس میں اختلافِ خیال موجود نہ تھا اور یہ کیسے ممکن ہے کہ انسان کی دماغی قوتیں ایسی مستوی سطح پر آجائیں، جہاں یہ فروعی اختلافات سرے سے ناپید ہی ہو جائیں۔

تحریکِ اصلاح و جہاد کا مقصد:

(متحدہ) ہندوستان میں اس تحریک کے مویدین کے سامنے تین مقصد تھے:

① آزادیِ فکر، تقلید و جمود سے بچ کر کتاب و سنت سے براہِ راست اصول و فروعِ دینیہ کے سمجھنے کی کوشش کرنا اور ان تالوں کو توڑ دینا جو اس موہبۂ الٰہی کے دروازوں پر لگائے گئے تھے، جسے عقل و دانش سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

② بدعات و محدثات کی مخالفت کرنا اور اسلام کی اس سادہ صورت کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی کوشش کرنا، جو قرونِ اولیٰ میں موجود تھی اور جس پر سلفِ اول نے عمل کر کے کامیابی حاصل کی تھی۔

③ دنیا میں حکومتِ الٰہیہ قائم کرنا اور سیاست کے رُخ کو اس طرح بدل دینا کہ اسلامی نظام قائم ہو، کیوں کہ یہی ایک طریقہ ہے، جس سے دنیا کے مختلف مذاہب صحیح امن و چین اور مذہبی آزادی سے ہمکنار ہو سکتے ہیں۔

شاہ محمد اسماعیل شہید رحمہ اللہ:

حضرت شاہ اسماعیل رحمہ اللہ کے وعظ اور دہلی کے بازاروں کی مجلسوں سے لے کر بالاکوٹ کے اس خونی معرکہ تک جو حق و باطل کی آویزش میں اس نہج کا آخری میدان کارزار تھا، یہ حقیقت نمایاں ہے کہ توحید کی اشاعت، سنت کی ترویج، بدعت کی مخالفت، شرک اور اس کی اسلام سے جنگ اور ہر غیر شرعی نظام کے بدلنے کے لیے کتنے مضبوط ارادوں اور اس راہ میں مصمم عمل سے کام کیا گیا ہے اور اس بے جگری سے کہ دنیائے اسباب اسے دیکھ کر عقل و دانش کی راہ سے ان جانبازوں کا محاسبہ کرنے میں ناکام ہو جاتی ہے۔ رضي الله عنهم وأرضاهم.

ایمانِ صحیح اور خلوص فی العمل ہی ایسے ذرائع ہیں، جن سے اس تحریک اور اس کے محرکین کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے ؎

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

ایک غلطی کا ازالہ:

مجھے ان جنگوں کی تفصیلات میں نہیں جانا ہے کہ سکھوں کو کہاں شکست ہوئی اور مجاہدین کہاں کہاں کامیاب ہوئے، بلکہ مجھے اس غلطی کو اٹھانا ہے جو ’’حیاتِ طیبہ‘‘ کے مصنف اور اس قسم کے ڈرپوک لوگوں نے، اس تحریک کے متعلق پیدا کر دی ہے کہ بانیانِ تحریک کا مقصد صرف سکھوں کے مظالم کو ختم کرنا تھا، انگریزی حکومت سے ان کی صلح تھی یا انگریزی مظالم ان کی نگاہ میں قابلِ مواخذہ نہ تھے۔ تحریک کے متعلق ایسے خیالات کا اظہار تحریک پر سب سے بڑا ظلم ہے۔

۱۸۶۳ء کا معرکہ جس میں مولانا مقصود علی، مولانا عبداللہ بن مولانا ولایت علی صادقپوری رحمہ اللہ کی قیادت میں شریک تھے، جس میں انگریزوں کی طرف سے جنرل نیوی چیمرس انگریزی عساکر کی قیادت کر رہے تھے۔ یہ معرکہ قریباً چھ ماہ تک جاری رہا۔ ہنٹر نے اس کے متعلق لکھا ہے کہ اس معرکے میں انگریزوں کے قریباً پانچ ہزار آدمی کام آئے اور اسی لڑائی کے نقصان سے جو انگریزوں کو ان خانہ بدوش لوگوں کو خواہ مخواہ چھیڑ کر ہوا، لارڈ ایلجن وائسرائے ہند چنیے کی پہاڑیوں میں حرکتِ قلب بند ہونے سے مر گئے۔ اس کا تذکرہ مولانا تھانیسری نے ’’کالا پانی‘‘ کے شروع ہی میں کیا ہے اور (عربی) مجلہ ”الضیاء“ لکھنو (ہند) شعبان ۱۳۵۴ھ میں اس کی پوری تفصیل موجود ہے۔ اس کے بعد متواتر واقعات ہوتے رہے، جن میں اس لشکر کے بقیۃ السیف انگریزی مظالم سے اس طرح لڑے، جس طرح وہ سکھ مظالم سے نبرد آزما ہوئے تھے۔

پیشِ نظر کتاب میں بھی ان کوششوں کے پسِ منظر کا تذکرہ ہے، جو ان مسلم مجاہدین نے اس راہ میں کیں۔ پٹنہ کے وہابی کیس کی یہ سرگزشت ہے، جو پھانسیوں یا عبور دریائے شور کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ مولانا جعفر تھانیسری رحمہ اللہ

نے جس سلاست سے ان واقعات کو بیان کیا اور جس سادگی سے اس داستان کو دہرایا ہے، وہ اپنی صداقت کی آپ گواہ ہے، اس میں جماعت اہلِ حدیث کی ان مساعی کو واضح کر دیا گیا ہے، جو انھوں نے تخلیصِ وطن کے باب میں کیں۔ فجزاهم الله عنا وعن المسلمين أحسن الجزاء.

درس و تدریس اور تحریکِ جہاد:

تحریک کا شعبہ جہاد جس کی ذمے داریاں مولانا شہید رحمہ اللہ کے سپرد تھیں، بے حد خطرناک تھا۔ اسے نہ سکھ برداشت کر سکتے تھے اور نہ انگریز۔ اس لیے ۵۷ء کے بعد ولی اللہ دبستان کا ایک معتد بہ حصہ صرف درس و تدریس، وعظ و خطابت اور شرک و بدعت کی تردید کی طرف راغب ہوگیا اور استخلاصِ وطن کے لیے کسی دوسرے وقت کا انتظار کرنے لگا اور اپنے مسلک کے موافق دیوبند، سہارنپور اور دہلی میں فقہ و حدیث کے مدارس کھول کر کتاب و سنت کی اشاعت میں اپنے اپنے طریق پر مشغول ہوگئے، دونوں جماعتوں میں فروعی اختلاف ضرور تھا، لیکن عناد اور شقاق بالکل نہ تھا۔

شیخ الکل مولانا سید محمد نذیر حسین رحمہ اللہ کی درسگاہِ حدیث:

اس زمانے میں دہلی کی درسگاہ وہابیت کے نام سے زیادہ بدنام ہوئی، جس کا سبب غالباً یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ اصلاحِ رسوم میں زیادہ عریاں اور بے حجاب تھے۔ نیز اس شغل کے باوجود ان لوگوں نے شرعی نظام کے قائم کرنے اور ظالمانہ نظام کو توڑنے میں اپنی کوششوں کو کسی نہ کسی صورت میں جاری رکھا اور اصحابِ دیوبند وغیرہ اس فرض کی ادائیگی میں محتاط بلکہ خاموش ہوگئے۔

غالباً یہی وجہ ہے کہ اس زمانے میں آپ کو اس دور کی اس تحریک کے تذکرہ نگار غالباً تمام کے تمام اہلِ حدیث ملیں گے۔ بعض لوگ، مثلاً: مولانا محمد میاں مراد آبادی، مولف "علمائے ہند کا شاندار ماضی" اسے اتفاقی چیز سمجھتے ہیں، لیکن یہ صرف اتفاق نہیں، بلکہ واقعات کا صحیح نتیجہ ہے، یعنی ۵۷ء کے بعد ایک گروہ ضرورت سے زیادہ محتاط ہوگیا اور دوسرا گروہ خدمتِ علم کے ساتھ استبداد کی مخالفت بھی کرتا رہا۔ اس لیے کچھ حنفی حضرات نے (بریلوی اور لدھیانوی قسم کے) اور کچھ برطانوی حکومت کے اربابِ بسط و کشاد نے اس جماعت (اہلِ حدیث) کو بدنام کیا، چناں چہ یہی لوگ "وہابی مقدمات" میں گھسیٹے گئے، چناں چہ اسی کتاب کے صفحہ پر مرقوم ہے کہ "مولوی نذیر حسین صاحب جن پر واسطے اظہار نام کل ممبران اہلِ حدیث باشندگان ہند کے جبر کیا جاتا تھا، رہا ہو کر واپس آ گئے" اور حالاں کہ مولانا سید نذیر حسین صاحب رحمہ اللہ کا زیادہ تر مشغلہ درسِ حدیث کا تھا۔ سیاسیات میں ان کو چنداں دلچسپی نہ تھی، مگر ہماری سرکار (انگریزی) کا تو یہ حال ہے کہ غصہ آتا ہی کمزوروں پر ہے۔ حالاں کہ حضرت شیخ الکل

مولانا الشیخ السید محمد نذیر حسین رحمہ اللہ نے بعض انگریز بچوں اور عورتوں کی ہنگامہ ۱۸۵۷ء میں مناسب اعانت بھی فرمائی تھی، کیوں کہ ایسے معرکوں میں جہاں تک ممکن ہو، عورتوں اور بچوں کو نقصان پہنچانے سے شرعاً منع فرمایا گیا ہے۔

حضرت شیخ الکل رحمہ اللہ کے تلامذہ:

حضرت شیخ مولانا سید محمد نذیر حسین رحمہ اللہ (جو شاہ محمد اسحاق رحمہ اللہ کی ہجرتِ حجاز کے بعد ان کی علمی جانشینی کے سبب ''میاں صاحب'' کے لقب سے مشہور تھے) کی سیاسیات سے کنارہ کشی اور مشاغلِ درس کے باوجود میاں صاحب رحمہ اللہ کے تلامذہ سے ایک جماعت استخلاصِ وطن اور حکومتِ الٰہیہ کے قیام اور استحکام کے لیے بدستور سرگرمِ عمل رہی، جن میں حضرت شیخنا الاکرم مولانا حافظ عبداللہ صاحب غازی پوری، حضرت شاہ عین الحق صاحب وخلق سواہم، رحمهم الله أجمعين، خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، جن کا تمام عمر یہی مشغلہ رہا۔ اپنے ذاتی اموال نیز احباب کے بھی زکات وصدقات وغیرہ سے مجاہدین تھانہ (چمرکنڈ و اسمس) کی اعانت فرماتے رہے۔ یہی وہ جرمِ عشق تھا، جس کی پاداش میں مولانا محمد بشیر عرف عبدالرحیم بن (مصنف سلسلہ کتبِ اسلام) مولانا رحیم بخش (آف مسجد چینیانوالی، لاہور) ہزاروں روپے کی تجارت پر لات مار کر برسوں سوات بنیر کی پہاڑیوں میں سرگرداں رہ کر وہیں ہمیشہ کی نیند سو گئے۔

یہی حال مولانا فضل الٰہی وزیر آبادی کا ہے، جن کے سیاہ بال یاغستان کی برف میں سفید ہو گئے اور مضبوط صحت کا ایک نوجوان آج مرتعش جسم اور گری ہوئی صحت کے باوجود اسی لیلائے مراد کے وصل کی انتظار میں چمرقند کی سربفلک پہاڑیوں میں اپنی موت کے دن کاٹ رہا ہے ؎

بجرمِ عشق توام مے کشند غوغائیست　　　　تو نیز برسرِ بام آ کہ خوش تماشائیست

ان بزرگانِ ملت میں بعض وہ لوگ تھے، جنھوں نے اس فریضے کو اس وقت ادا فرمایا، جب کہ بہت سے ''علمائے ہند'' جن کے ''شاندار ماضی'' پر آج بعض لوگوں کو ناز ہے، ابھی یا تو مستقبل کی آغوش میں محوِ خواب تھے اور یا مدارس اور مساجد کی چٹائیوں کی زینت بن رہے تھے۔ ''شاندار ماضی'' کے مصنف کی تنگ نظری اگر انھیں علما میں جگہ نہیں دے سکی، نہ سہی، مگر جریدۂ عالم کا زیبِ عنوان ان کے سوا کون ہو سکتا ہے؟ واقعات کے خار اشگاف قلم نے جس مقامِ رفیع پر ان کا نام کنندہ کیا ہے، کسی متعصب اور تنگ نظر حاسد کی کم نگاہی اسے کبھی مٹا نہیں سکتی۔ سچ ہے ؎

ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

عرضِ حال:

آج جب کہ ''کالا پانی'' کا یہ ایڈیشن آپ کی خدمت میں پیش ہو رہا ہے اور یہ چند سطور بطور مقدمہ لکھی جا

رہی ہیں، حالات یہ ہیں کہ ''شاندار ماضی'' کے بعد ''تاریک مستقبل'' کے لیے زمین تیار ہو رہی ہیں اور علمائے حال صرف "فاتحة خلف الإمام" "كشف الستر عن مسئلة الوتر" اور "نيل الفرقدين"[1] ایسی تصانیف میں مشغول ہو کر اپنے علم کی داد لے رہے ہیں اور "فصل الخطاب" کے لیے صرف یہی چند مسائل رہ گئے ہیں، جن پر امتِ مسلمہ کے شاندار یا تاریک مستقبل کا انحصار سمجھا جا رہا ہے۔ ہمارے مدارس کے طلبا دیوبند سے آئیں یا دہلی سے، حنفی ہوں یا اہلِ حدیث، ان کی نگاہ میں سب سے بڑا جہاد جدل و مناظرات کی وہ محفلیں ہیں، جن میں امام ابوحنیفہ، شافعی، مالک اور احمد بن حنبل رحمہم اللہ کے فروعی اجتہادات پر طبع آزمائی کی جا رہی ہے اور ان خلد مکان بزرگانِ ملت کی فتح و شکست کا جائزہ لینے کی کوشش کی جا رہی ہے، غالباً یہ ''جہاد'' اس لیے فرض قرار دیا گیا ہے کہ انگریز بہادر کی ''شریعت'' اسے جرم قرار نہیں دیتی، ورنہ اس سے بھی کوئی زیادہ شنیع مشغلہ تلاش کرنا پڑتا۔

خاتمہ:

کتاب آپ کے سامنے ہے اور اپنے بزرگوں کے کارنامے ان کے مقاصد کی تفسیر کر رہے ہیں، اس راہ کے مصائب، حکومت کی گرفت، اِتلافِ مال، اِتلافِ جان، غرض منزلِ عشق کے سارے آثار آپ کے سامنے ہیں۔ آپ ہیں اور اپنے مستقبل کی تعمیر آپ کا فرض، حکومتِ الٰہیہ کی تشکیل آپ کا ذمہ، ماضی کو دیکھیے اور مستقبل کو بنائیے۔ جو راہ آپ کی سربلندی پر منتج ہو سکے، اس کی طرف قدم اٹھائیے۔ خدا تعالیٰ کی رحمت ان نیک بندوں کا ساتھ دیتی ہے، جو اس کے قانون کا احترام کریں۔ إن الذين جاهدوا فينا لنهدينهم سبلنا.

آج کی مشکلات:

اس وقت کی مشکلات کی نوعیت گو اس وقت کی مشکلات سے مختلف ہے، لیکن عزم و ارادے کی پختگی، تمام مشکلات کا صحیح حل ہے۔ اپنی سربلندی کے لیے کوشش انسانی فطرت کا نہ ٹلنے والا فرض، اس کی مشکلات سے گھبرانا، اپنی فطرت سے غداری کے مترادف ہے۔ جماعت اہلِ حدیث کے نوجوانوں کا فرض ہے کہ وہ توحید و سنت کی اشاعت اور اسلام کی سربلندی کے لیے بڑھیں۔ إنها لإحدى الكبر، من شاء منكم أن يتقدم أو يتأخر.

محمد اسماعیل، کان اللہ لہ

خطیب مسجد اہلِ حدیث، گوجرانوالہ

بتاریخ: ۹/۳/۴۱ء

[1] یہ تینوں کتابیں حضرت مولانا سید محمد انور شاہ مرحوم کی تالیف کردہ ہیں، جن میں حنفی اہلِ حدیث میں متنازع ان تین مسائل پر لب کشائی کی گئی ہے۔ [ع۔ ح]

پیش لفظ:

تعلیماتِ مجددیہ

(تالیف: ملک حسن علی جامعی۔ ناشر: ادارۃ إشاعۃ التوحید والسنۃ۔ شرقپور۔ ۱۹۶۵ء)

الحمد لله العلي العظيم، والصلاة والسلام على رسوله الخاتم الحاشر، والعاقب الكريم، وعلىٰ أصحابه وأتباعه الحماة لدينه حماية الكفيل والزعيم.

سلسلۂ نبوت کے کلی طور پر بہر نہج ختم ہونے کے بعد حق تعالیٰ نے راہنمائی اور ہدایت کی ذمے داری علمائے حق پر عائد کر دی اور اعلان فرمایا:

«إِنَّ هٰذَا الْعِلْمَ يَحْمِلُهُ مِنْ كُلِّ خَلَفٍ عُدُولُهُ يَنْفُوْنَ عَنْهُ تَحْرِيْفَ الْغَالِّيْنَ وَانْتِحَالَ الْمُبْطِلِيْنَ»[1]

''اس علم کی حفاظت کے لیے یکے بعد دیگرے اہلِ علم پیدا ہوتے رہیں گے، جو اہلِ بدعت کے غلو اور غلط کار لوگوں کی باطل نوازیوں کی مدافعت اور نفی کرتے رہیں گے۔''

یعنی امت کی اصلاح اور بدعات کی تردید کا سلسلہ چلتا رہے گا اور امت دین میں رخنہ ڈالنے والوں کی حیلہ سازیوں سے محفوظ رہے گی۔

اس ضمن میں ائمہ تجدید کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ وہ ایک طرف مزاجِ نبوت اور مقاصدِ نبوت کو سمجھتے ہیں اور دوسری طرف ان کا ہاتھ اُمت کی نبض پر ہوتا ہے۔ وہ امت کے امراض اور اس کے علاج کو اپنے مخصوص مقام کے لحاظ سے سمجھتے ہیں۔ علاج میں مرض کی شدت، مریض کے حالات، ہر چیز کو علمِ الٰہی کی روشنی میں سمجھتے ہیں۔ امر بالمعروف میں سب سے بڑی چیز بدعات کی رفتار اور اس کی اصلاح میں مناسب زبان کا استعمال ہے۔ مجدد کی راہ اس معاملے میں عام علما سے مختلف ہوتی ہے۔

عام علما علمی اصطلاحات کی پابندی، مروّجہ علوم کی روشنی اور اصولِ مناظرہ کے زیرِ سایہ گفتگو فرماتے ہیں۔ کبھی کبھی ﴿فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ﴾ [المؤمن: ٨٣] (انھیں مروجہ علوم اور اپنی مصطلحات پر فخر ہوتا ہے)

[1] سنن البيهقي (١٠/ ٢٠٩)

کی شان ان کے اندازِ بیان میں نمایاں ہو جاتی ہے، لیکن مجدد مقاصدِ دین کے تحفظ کے بعد مروّجہ علوم اور علما کے رسوم و عوائد سے بے نیاز ہوتا ہے۔ وہ اپنی زبان میں بولتا ہے، اس کی زبان کی تلخی مروجہ رسوم کے تابع نہیں ہوتی، بلکہ اس کا لہجہ وقت اور ضرورت کے مطابق بدلتا رہتا ہے۔

شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ نے بھی شرک و بدعات کے متعلق ایک زبان استعمال فرمائی اور اپنے وقت کی بدعات کے خلاف شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے بھی ایک اندازِ بیان اختیار فرمایا۔ آج کل اور اس وقت کے علما، علم کی مسندوں پر بیٹھ کر تدریس، شروح، حواشی اور مناظرات کا کام کرتے ہیں اور اصلاح کی کوشش فرماتے ہیں، لیکن ہوتا کیا ہے کہ مجدد اپنے ماحول میں ایک ہنگامہ بپا کر دیتا ہے۔ حکومت کے ایوان سے لے کر محراب و منبر کی فضائیں اس کی آواز سے لرزتی ہیں، پوری فضا میں ارتعاش ہوتا ہے۔ محکمہ قضا اور محکمہ افتا دونوں اس کے تعاقب میں نکلتے ہیں، مگر وہ مسکراتا ہوا اپنے سفر کو جاری رکھتا ہے، اس کی آسمانی اور خداوندی آواز میں ایک اثر ہوتا ہے۔ اس اضطراب و ارتعاش کے بعد جب کچھ سکون ہوتا ہے تو اہلِ دنیا کی زبانیں تلاشِ حقیقت کے طور پر دریافت کرتی ہیں: ﴿مَاذَا قَالَ اٰنِفًا﴾ [محمد: ١٦] ؟ جواب ملتا ہے: ﴿قَالُوا الْحَقَّ﴾، اس لیے کہ اس کا علم، علومِ نبوت کے توسط سے الٰہی علوم کی صدائے بازگشت ہوتا ہے۔ اس لیے اسے بتدریج «يُوضَعُ لَهُ الْقُبُوْلُ فِي الْأَرْضِ» [1] کا مقام حاصل ہوتا ہے، لیکن عام علما کی اصلاحی خدمات کے صلے میں حکومتیں انعامات دیتی ہیں۔ عوام میں عقیدتیں غلو کی حد تک پہنچتی ہیں۔ دنیوی اعزاز، درباری حاضریاں، خطابات و وظائف اور دنیا میں امن و خوشحالی کی زندگی میسر آتی ہے۔

حضرت شیخ احمد بن عبدالاحد بن زین العابدین الفاروقی (متوفی ۱۰۳۴ھ) دسویں صدی کے اواخر ۹۷۱ھ میں پیدا ہوئے۔ اس وقت کئی قسم کے جمود پائے جاتے تھے، جن کی اصلاح کے لیے حضرت مجدد صاحب رحمہ اللہ نے جرأت مندانہ قدم اُٹھایا۔ سیاسی جمود، رسوم و عادات میں مشرکانہ جمود، تصوف میں جمود اور فقہی جمود۔ اکبرِ اعظم کا انداز ابتدا میں اسلامی تھا۔ اس نے شیخ محمد طاہر پٹنوی مولف ''مجمع البحار'' کے سر پر پگڑی اس شرط پر رکھی کہ ان کے بجائے بادشاہ خود بدعات کی بیخ کنی کرے گا، (أبجد العلوم، ص: ٨٩٦) لیکن عیاش رفقا اور ملا مبارک کے خانوادے نے اسے برباد کر دیا۔ بدعات کیا مٹیں، وہ کفر کو از سرِ نو واپس لانے میں مشغول ہوگیا۔ ہندومت اور رفض کی ملی جلی رسوم، شاہی خاندان میں پائی جانے لگیں اور اس کا اثر رعایا پر بھی ہوا۔ علما سے ملا مبارک کا خاندان ایوانِ شاہی پر قابض تھا۔ اکبر کی لگام علمی طور پر انہی حضرات کے ہاتھ میں تھی اور جب دربار پر قبضہ ملا دو پیازہ ایسے مسخروں اور بیربل ایسے بے دین لوگوں کا ہو تو دینی بصیرت، تفقہ، تقویٰ، تدین

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٠٣٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٣٧)

کہاں سے آئے گا؟ برہمنوں کی نقالی، تیجے، دسویں، چہلم اور گیارھویں اصل دین قرار پا سکتا تھا، جو ہندو رسوم کی ایک صورت ہے۔

شرک کی اصل بنیاد عموماً خالق اور مخلوق کی صفات میں عینیت یا تشابہ رہا ہے، جس کا اوتار، حلول، تجسم اور وحدت الوجود نام رکھا گیا۔ مسیحی حضرات نے جب مسیح کی ابنیت کا دعویٰ کیا تو تجسم کی آڑ لی۔ یہاں بھی اسی حلول اور وحدت الوجود کے باطل عقیدے کو رواج دیا گیا۔ آج ہمارے عوام میں عرب بلاعین اور احمد بلامیم کی شہرت اسی عقیدے کے برگ و بار ہیں۔

حضرت مجدد رحمہ اللہ مسلک کے لحاظ سے حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے پختہ تعلق رکھتے تھے، لیکن ان کی روش میں اس قدر وسعت ہے کہ آج کل حضراتِ احناف کے دونوں شعبوں، حضراتِ ''دیوبند'' اور حضراتِ ''بریلی'' کو اس سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ حضراتِ صوفیہ سے محبت کے ضمن میں حضراتِ بریلی مجدد صاحب سے بے حد عقیدت رکھتے ہیں، لیکن بدعات کی ترویج کے سلسلے میں وہ حضرت مجدد کی پروا بھی نہیں کرتے، بلکہ ان کے ہاں مذہب کا بالکل ایک نیا تصور ہے، جس کے لیے نہ وہ حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی صحیح تقلید کرتے ہیں، نہ حضرت مجدد کی اقتدا۔

حضرت مجدد کی وسعتِ نظر اور وسعتِ ظرف کا پتا مولف ''الیانع الجنی'' کے اس بیان سے ملتا ہے:

''وَقَلَّ مَا تُعُقِّبَ بِهِ عَلَيْهِ وَرُدَّ مِنْ قَوْلِهِ وَالْمَسَائِلُ الْمَعْدُوْدَاتُ الَّتِي شَدَّدَ بِهَا النَّكِيرَ عَلَيْهِ بَعْضُ أَهْلِ الْعِلْمِ فَالْحَقُّ أَنَّهُ مُصِيبٌ فِي بَعْضِهَا، وَلَهُ تَاوِيلٌ سَائِغٌ فِي الْبَعْضِ الْآخِرِ، وَشَارَكَهُ فِيهَا غَيْرُهُ مِنْ هٰذِهِ الطَّائِفَةِ مِمَّنْ لَا يُحْصٰى كَثْرَةً'' (الیانع الجنی، ص: ٦٦)

''بہت کم مسائل ایسے ہیں، جن پر حضرت مجدد رحمہ اللہ کا تعاقب اور رد کیا گیا ہے، اور جن میں بعض اہلِ علم نے ان کی سخت مخالفت کی ہے، صحیح یہ ہے کہ بعض میں مجدد صاحب رحمہ اللہ حق پر ہیں، بعض میں ان کی تاویل درست ہے اور اُن میں علما کی ایک بڑی اکثریت ان کی ہمنوا اور ان سے متفق ہے۔''

پھر فرماتے ہیں:

''وَاَجَابَ عَنْ شُبُهَاتِ الْمُتَقَشِّفَةِ، وَذَبَّ عَنْهُ أَبُو عَبْدِ الْعَزِيزِ رَحِمَهُ اللهُ وَأَنْعَمَ الثَّنَاءَ عَلَيْهِ فَلَمْ يَتْرُكْ فِيهِ مَجَالًا لِعَائِبٍ، وَلَا مَقَالًا لِرَائِبٍ، وَكَفَاكَ بِهِ إِمَاماً يَشْهَدُ لِإِمَامٍ''

(الیانع الجنی، ص: ٦٥)

''اور ایسے نقاد حضرات کے شبہات کا جواب حضرت شاہ ولی اللہ نے پوری طرح دیا ہے، جس کے

بعد کسی شک اور عیب جوئی کی گنجائش نہیں رہتی اور یہ کافی ہے کہ ایک امام دوسرے امام کے حق میں شہادت دے رہا ہے۔''

ایک مقام پر فرمایا:

''وَمِنْهَا أَنَّهٗ حَقَّقَ الْفَرْقَ بَيْنَ الْبِدْعَةِ وَالسُّنَّةِ وَأَقْيِسَةِ الْمُجْتَهِدِيْنَ وَاسْتِحْسَانَاتِ الْمُتَأَخِّرِيْنَ وَالتَّعَارُفِ عَنِ الْمَشْهُوْدِ لَهَا بِالْخَيْرِ وَمَا أَحْدَثَهُ النَّاسُ فِي الْقُرُوْنِ الْمُتَأَخِّرَةِ وَتَعَارَفُوْهُ فِيْمَا بَيْنَهُمْ. فَرَدَّ بِذٰلِكَ مَسَائِلَ مِمَّا اسْتَحْسَنَها الْمُتَأَخِّرُوْنَ مِنْ فُقَهَاءِ مَذْهَبِهٖ'' (اليانع الجنی، ص: ٦٥)

''انھوں نے بدعت، سنت اور مجتہدین کے قیاس اور متاخرین کے استحسان میں فرق فرمایا اور قرونِ خیر اور متاخرین کی بدعات میں جن کو انھوں نے مستحسن سمجھ رکھا تھا، امتیاز فرمایا اور ان مسائل کا رد کیا، جنھیں متاخرین فقہا بدعتِ حسنہ سمجھتے تھے۔''

حضرت مجدد الفِ ثانی رحمہ اللہ کی تحقیق پسندی اور وسعتِ نظر کا یہ اثر تھا کہ ان کے لختِ جگر بھی بعض فرعی مسائل میں اختلاف کرتے اور اس کا اظہار کسی تصادم اور مناظرے کے بغیر فرماتے۔ یہی حال حضرت مجدد رحمہ اللہ کے تلامذہ اور مستفیدین کا ہے۔ وہ فرعی مسائل میں بڑی آزادی سے امام شافعی رحمہ اللہ کے ساتھ بعض اہم مسائل مختلف فیہ پر اتفاق فرماتے اور اس کے باوجود وہ حنفی کہلانے میں مسرّت محسوس فرماتے۔ یہ اس علمی جہاد کا اثر تھا، جو حضرت مجدد رحمہ اللہ نے فقہی جمود کے خلاف فرمایا۔ یہ تذکرہ ''أبجد العلوم'' میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ مرقوم ہے۔[1]

حضرت مجدد رحمہ اللہ کی تصنیفات مفید ہونے کے علاوہ علمی طور پر بلند پایہ ہیں۔ مکتوبات علم و حکمت کا اتنا مقدس ذخیرہ ہے، جس کی نظیر متاخرین کی تصنیفات میں نہیں مل سکتی۔

نواب صدیق حسن خاں مرحوم فرماتے ہیں:

''وبالجملہ مکاتیب عالی جناب حضرت مجدد قدس سرہ، مالا مال است در رد بدعت و انکار تقسیم آں بسوئے حسنہ و سیئہ و طریقہ علیہ وے مبنی است بر اتباع کتاب و سنت در ظاہر و باطن و نہ پذیرفتن چیزے کہ مخالف ایں ہر دو اصل محکم باشد و ایں مکتوبات اصول عظیم است از برائے وصول منازل معرفت و قبول۔ طالبِ صادق و سالک راغب را در ہیچ وقتے از اوقات از مطالعہ آں بے نیازی

---

[1] أبجد العلوم (ص: ٨٩٦)

حاصل نیست۔"

''حضرت مجدد کے مکتوبات، رد بدعات سے بھرپور ہیں۔ انھوں نے بدعتِ حسنہ اور سیئہ کی تقسیم کا انکار کیا ہے۔ ان کا طریقہ ظاہر و باطن میں کتاب و سنت پر مبنی ہے۔ کتاب و سنت کے خلاف وہ کسی چیز کو قبول کرنے کے حق میں نہیں، معرفت و قبول کی منازل تک پہنچنے کے لیے یہ مکتوبات اصولِ عظیم کا حکم رکھتے ہیں۔ طالبِ صادق اور سالکِ راغب اس کے مطالعے سے کبھی بے نیاز نہیں ہوسکتا۔''

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ نے حضرت مجدد رحمہ اللہ کے بعض افکار پر تنقید فرمائی، لیکن محققین کی نظر میں اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ خود حضرت شیخ رحمہ اللہ نے بھی اس سے رجوع فرما لیا تھا۔

حضرت مجدد رحمہ اللہ اپنی ان خصوصیات کی وجہ سے اپنے وقت کے بہت سے علما اور اربابِ تصوف سے ممتاز رہے۔ قید و بند کی صعوبتوں کے باوجود اس وقت اور آنے والی نسلوں میں حضرت مجدد رحمہ اللہ اس عزت و احترام سے دیکھے گئے، جس کا عُشرِ عشیر ان کے اقران کو حاصل نہ ہو سکا۔

محترم ملک حسن علی صاحب شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے حضرت مجدد رحمہ اللہ کی تصانیف کے ہزار دو ہزار صفحات کو کھنگالا اور بڑی دیدہ ریزی اور محنت سے حضرت کی تعلیمات کو جمع فرمایا۔ یہ ان حضرات کے لیے، مقامِ عبرت ہوگا، جو حضرت مجدد رحمہ اللہ کے اسمِ گرامی کے ساتھ کئی گز لمبے القاب پیوست کرتے ہیں، قبر کی زیارت اور عرس کی تقریب میں شمولیت کے لیے سرہند جاتے ہیں، مگر حضرت مجدد رحمہ اللہ کی تعلیمات سے اس قدر بے خبر ہیں کہ وہ ان سچائیوں کا نام ''وہابیت'' رکھ کر، حضرت مجدد کو بدنام کرتے اور اپنی سادگی و کم فہمی کا ثبوت بہم پہنچاتے ہیں۔

ملک صاحب کے مضامین چٹان، الاعتصام اور دیگر اخبارات میں چھپتے اور نظر سے گزرتے رہے، جو توحیدِ خالص، سنت سے محبت، عقیدہ سلف اور اُن کے اعمال کا مرقع ہیں۔ اب یہ کتابی صورت میں ''تعلیماتِ مجددیہ'' کے نام سے شائع ہو رہے ہیں۔ ضرورت ہے کہ یہ مجموعہ ہر گھر میں پہنچے اور ہر مکتب اور ہر لائبریری میں پڑھا جائے۔

شرک خدا پر بدگمانی کا نتیجہ ہے اور بدعت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ۔فداہ أبي و أمي۔ سے بدظنی کا اثر۔ یہ دونوں چیزیں ایمان کے لیے مقراض کا حکم رکھتی ہیں۔

تعجب ہے کہ اہلِ توحید سے ایک طبقہ مداہنت کا شکار ہو رہا ہے۔ وہ عوام کے خوف اور اہلِ بدعت کی بدزبانی سے بچنے کے حیلے تلاش کر رہا ہے۔ ملک صاحب کی یہ محنت ان بزرگوں کے لیے عبرت کا مقام ہے کہ

ایک زمیندار مگر جدید تعلیم کا بہترین واقف اس فرض کو سرانجام دے رہا ہے، جو درحقیقت اصحابِ منبر و محراب اور اربابِ عمائم کا فرض تھا۔

اللہ تعالیٰ ملک صاحب کی اس محنت کو قبول فرمائے اور بھولے ہوئے بھائیوں کو سمجھنے کی توفیق مرحمت کرے۔

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

محمد اسماعیل

خطیب جامع مسجد اہلِ حدیث، گوجرانوالہ

۲۰/مئی ۱۹۶۵ء، لاہور

پیش لفظ:

قبر پرستی اور سماعِ موتی

(تالیف: خواجہ محمد قاسم۔ ناشر: ادارہ احیاء السنۃ، گوجرانوالہ، ۱۹۶۷ء)

الحمد لله الذي أنزل علىٰ عبده الكتاب ولم يجعل له عوجا، يسبح لله ما في السماوات وما في الأرض الملك القدوس العزيز الحكيم، هو الذي بعث في الأميين رسولًا منهم يتلو عليهم آياته ويزكيهم ويعلمهم الكتاب والحكمة وإن كانوا من قبل لفي ضلال مبين. محمد رسول الله والذين معه أشداء على الكفار رحماء بينهم، تراهم ركعاً سجداً يبتغون فضلًا من الله و رضوانا، سيماهم في وجوههم من أثر السجود ذلك مثلهم في التوراة ومثلهم في الإنجيل.

انبیا کی تعلیمات میں تنوع:

قرآنِ عزیز کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زندگی کے تمام شعبوں میں راہنمائی فرما کر انسان پر نوازش کی ہے۔ بادشاہوں کے پُرشکوہ ایوانوں سے شروع ہو کر فقرا کے جھونپڑوں تک اس کا فیضان پہنچا ہے۔ قرآنِ عزیز کے تاریخی حصوں میں جہاں انبیا علیہم السلام اور اُن کی اُمتوں کی سرگزشت کا تذکرہ ملتا ہے، وہاں انبیا علیہم السلام کے مختلف فرائض پر بھی روشنی پڑتی ہے، جن کو انھوں نے انسانی معاشرے کے عروج و زواج اور ترقی و انحطاط کے متعلق بہ خوبی نباہا۔ بدکاری سے روکا، بدکرداری سے منع فرمایا، ماپ تول میں بے اعتدالی پر سرزنش فرمائی۔ راستوں میں بیٹھ کر مسافروں سے چھیڑ چھاڑ کرنے پر وعید فرمائی، شاہراہوں پر بیٹھنے سے جو ذمے داریاں انسان پر عائد ہوتی ہیں، ان کا حکیمانہ تذکرہ فرمایا۔

«إن كنتم لا بد فاعلين فاعطوا الطريق حقه»[1] (الحديث)

''اگر تم کو شاہراہوں پر بیٹھنے کے سوا چارہ نہ ہو تو راستے کا حق ادا کرو۔''

کتنا بلیغ فقرہ ہے، جس میں شاہراہوں اور سقیفوں کی صورت میں ڈیرے ڈالنے کی کراہت ظاہر فرما کر

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٨٧٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢١٢١) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٧٢٦)

اجازت دیتے ہوئے انسانی معاشرے کی بہترین خدمت کے لیے حتمی احکام ارشاد فرما دیے۔ حضرت یوسف علیہ السلام اور امراۃ العزیز کی محبت کا تذکرہ اس خوبصورتی سے بیان فرمایا کہ اس اخلاقی انداز بیان پر ہزاروں ابن مسکویہ اور دوانی قربان کیے جا سکتے ہیں۔ محبت کی بے عنوانی اور جذبات کی بے اعتدالی کا پورا تذکرہ اپنی پہنائیوں کے ساتھ آ گیا، لیکن ایک لفظ بھی ایسا نہیں آیا، جس پر اخلاق کی محفلیں کوئی نکتہ چینی کر سکیں۔ اتنا مبسوط تذکرہ، جس میں پُر امید محبت کی فراوانی، بے اعتدالیوں اور مایوسیوں کے سیلاب ابتلا اور استقامت کی پاداش میں سالہا سال تک جیل کی زندگی؛ قرآنِ عزیز نے ان تمام حوادث اور سوانح کا ذکر فرمایا، لیکن ایک بھی گندا اور مستہجن لفظ واقعات کے اظہار میں نہیں فرمایا۔ ان مصنوعی اور مجازی محبتوں میں ایرانی ادبیات نے عشق کا لفظ بڑی بے تکلفی سے استعمال کیا ہے، لیکن قرآن نے اس داستان میں اسے بھی پسند نہیں فرمایا:

﴿قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا﴾ [یوسف: ٣٠] ''یوسف کی محبت اس کے دل کی گہرائیوں میں اُتر چکی تھی۔''

کہہ کر دریا کو کوزے میں بند کر دیا۔ قصہ کوتاہ گشت ورنہ درد سر بسیار بود۔

قدرِ مشترک:

انبیا علیہم السلام کی مساعی کے اس تنوع اور تطور کے باوجود ان سب میں قدرِ مشترک مسئلہ توحید تھا۔ آدم علیہ السلام کی نبوت اس وقت زندگی کی ضروریات تک محدود معلوم ہوتی ہے۔ قابیل کی اخلاقی بے اعتدالی کے علاوہ کسی گناہ کا سراغ نہیں ملتا، جس کی اصلاح حضرت آدم علیہ السلام نے فرمائی ہو اور زندگی کی اس قریبی ابتدا میں شاید انسان شرک کے تصور کو قبول بھی نہ کر سکتا۔ اس لیے کہ ابھی بے عمل اور بدعمل زندگی ہی شروع نہ ہوئی تھی، جس کے لیے بزرگوں اور ولیوں کی چوکھٹوں پر سربسجود ہونے کی ضرورت محسوس ہو۔ اللہ کی توفیق شاملِ حال ہو، انسان اپنی بساط کے مطابق خود دین کی پابندی کرے، اللہ تعالیٰ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کے ساتھ حسنِ عمل اور حسنِ کردار کا پابند ہو تو اس پر اس قدر مایوسی طاری ہی نہیں ہوتی کہ وہ ان دنیا کے درباروں اور پرانی خانقاہوں پر جبہ سائی کرے۔

وہ یقیناً اپنے رب کی رحمت پر مطمئن ہوتا ہے اور اُمید رکھتا ہے کہ وہ اس کی دستگیری فرمائے گا اور ان مساعی کو قبول فرما کر اپنی رحمت کے دروازے اس پر کھول دے گا۔ یہ شخص بفضلِ خدا بزرگوں سے توسل کے بجائے ان کی معیت سے سرفراز ہوگا۔

﴿مَنْ يُطِعِ اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَ الصِّدِّيْقِيْنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَ الصّٰلِحِيْنَ وَ حَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا﴾ [النساء: ٧٠]

''جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا، اسے قیامت کے دن انبیا، اہلِ صدق، اربابِ شہادت اور صلحا کی معیت نصیب ہوگی اور یہ رفاقت بہترین رفاقت ہے۔''

جس کو اللہ تعالیٰ بزرگوں کی معیت سے نوازے، وہ توسل اور شفاعت کے لیے کیوں سرگرداں اور بے قرار ہو؟!

طریقِ کار:

انبیا علیہم السلام نے توحید کی اشاعت کو موثر، ذہن نشین اور کامیاب بنانے کے لیے اساسِ کار کے طور پر اپنی اطاعت پر پورا زور دیا۔ اس لیے کہ یہ تصور پیغمبر کے ساتھ پوری عقیدت کے بغیر ذہن میں پیوست نہیں ہوسکتا۔ دوسری چیز جس پر بار بار زور دیا، وہ اپنی عبدیت کا اقرار اور اس کی تشہیر ہے، تاکہ خود پیغمبر کے متعلق بھی غیر متوازن تصورات قائم نہ ہو جائیں اور غلو پسند طبائع پیغمبر کو بھی خدا کا شریک نہ بنا لیں۔ اس لیے خود اسے عبدیت کی سند عطا فرمائی اور نبوت کی زبان سے بھی اس کا اعلان کرایا گیا۔

انبیا علیہم السلام کا محبوب ترین لقب جس سے رفعتوں اور بلندیوں کی راہیں کھلتی ہیں، اسی عبدیت کو قرار دیا گیا:

- ﴿لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَ لَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ﴾ [النساء: ١٧٢]
"حضرت مسیح اور اللہ تعالیٰ کے مقرب فرشتے اللہ کا بندہ بننے سے قطعی گریز نہیں کرتے۔"
- ﴿يُلْقِي الرُّوْحَ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ﴾ [المؤمن: ١٥]
"اپنے بندوں سے جس پر چاہے وحی نازل فرمائے۔"
- ﴿يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ﴾ [النحل: ٢]
"اپنے بندوں سے جس کے پاس چاہے وحی بھیج دے۔"
- ﴿سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا﴾ [بني إسرائيل: ١]
"اس نے اپنے بندے کو رات سیر کرائی۔"
- ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلٰى عَبْدِهِ الْكِتٰبَ﴾ [الكهف: ١]
"اس نے اپنے بندے پر کتاب اُتاری۔"
- ﴿نِعْمَ الْعَبْدُ اِنَّهٗٓ اَوَّابٌ﴾ [ص: ٣٠] "ایوب بہترین بندے تھے۔"
- ﴿ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ اِنَّهٗ كَانَ عَبْدًا شَكُوْرًا﴾ [بني إسرائيل: ٣]
"نوح بہتر بندے تھے۔"

آنحضرت ﷺ (فداہ ابی و امی) اور باقی انبیا علیہم السلام کے وصفِ عبدیت سے قرآن بھرا پڑا ہے۔ نماز میں آنحضرت ﷺ کی عبدیت کا بار بار اقرار کرایا گیا ہے۔

سورۃ الشعراء میں حضرت نوح، حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت شعیب کا تذکرہ یکے بعد دیگرے فرمایا، سب نے اسی چیز پر زور دیا: ﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوْنِ﴾ [آل عمران: ۵۰] ''اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔'' نبوت کے اقرارِ عبدیت کے اعتراف کے ساتھ خدا تعالیٰ کی وحدانیت پر زور دیا ہے۔

قوم نوح اولیا پرستی کی موجد:

قرآنِ عزیز کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اولیا پرستی کا دورہ سب سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کو پڑا اور انھوں نے اجتماعی طور پر قرار داد پاس کی کہ ودّ، سواع، یغوث، یعوق، نسر؛ ان پانچ بزرگوں کی پرستش کو مت چھوڑنا۔ ان کا یہ فیصلہ ان بزرگوں کے بتوں کی پرستش کے متعلق تھا۔ ہمیں آج تک ان قبوری اور خرافی حضرات کا فلسفہ سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ قبر پرستی کی اجازت دیتے ہیں، بُت پرستی کو ناپسند کرتے ہیں۔ آخر ان دونوں پرستشوں میں فرق کیا ہے؟

بُت پرستی کے متعلق اُس وقت کے صوفی حضرات نے یہی فلسفہ بیان کیا تھا:

- ﴿هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ﴾ [یونس: ۱۸]
- ﴿لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى﴾ [الزمر: ۳]

یہ بزرگ ہمارے لیے اللہ کے ہاں سفارش اور قرب کا موجب ہیں۔ یہی دلیل خرافی حضراتِ اولیا اور قبورِ اولیا کے متعلق فرماتے ہیں۔ اگر قرآنِ عزیز نے اَصنام اور اَوثان کے تزلف اور شفاعت کو ناجائز قرار دیا ہے تو قبور کے لیے جواز کہاں سے ثابت ہوا۔ اوضاع و اطوار اور اسما و القاب کے بدل جانے سے عبادت میں کیا فرق پڑ گیا ہے۔ وہ حرام یہ ثواب۔ ﴿مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ﴾ [الصافات: ۱۵٤]

قرآنِ عزیز نے جو شرک کی مذمت فرمائی ہے تو اس کے ظہور کی ایک نہیں کئی صورتیں ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم نے ستاروں کی پرستش کی۔ بعض نے حضرت مسیح اور حضرت عزیز کو ابن اللہ کہہ کر پرستش کے لیے حیلہ بنایا۔ روسائے عرب لات کی قبر اور بُت دونوں کو خدا کا مظہر سمجھتے تھے۔ پختہ قبریں بنانے کا رواج بھی موجود تھا۔ اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ان کے برابر کرنے کا حکم دیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ابو الہیاج کو مامور فرمایا۔[1] صحابہ میں سے ایک بھی آواز اس کے خلاف نہیں اُٹھی۔ آج بزرگوں کے بتوں اور بزرگوں کی قبروں میں کیوں فرق کیا جائے؟ جب ہیاکل اور ملائکہ کی پرستش کے لیے جواز کی کوئی وجہ نہ بن سکی تو اہل اللہ اور ان کی قبور کے لیے جواز کا فتویٰ کہاں سے آیا؟

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۹٦۹)

﴿أَكُفَّارُكُمْ خَيْرٌ مِّنْ أُولَٰئِكُمْ أَمْ لَكُم بَرَاءَةٌ فِي الزُّبُرِ﴾ [القمر: ٤٣]

کام جب یکساں ہے تو حکم میں فرق کیسے ہو؟

زیرِ تقریظ کتاب:

حافظ قاسم سلمہ اللہ ان نوجوانوں میں سے ہیں، جن کے خمیر میں توحید سمو دی گئی ہے۔ وہ ان معنی میں نجیب الطرفین ہیں کہ ان کے ننھیال اور ددھیال دونوں پختہ قسم کے موحد تھے۔ ان کے مرحوم والد کی دلی آرزو تھی کہ یہ کسی معاوضے کے بغیر دین کی خدمت کریں۔ حافظ صاحب کے والد کی یہ دعا اللہ تعالیٰ نے منظور فرمائی۔ انبیا اور اکابرِامت کی طرح ان کے معاشی ذرائع دینی خدمت سے بالکل الگ ہیں۔ (کاش یہ روز افزوں مہنگائی خاکسار کے ارادوں کو متزلزل نہ کر دیتی۔ محمد قاسم)

بڑی خوش قسمتی ہے کہ انھیں لکھنے کی عادت ہے۔ پہلے بھی وہ مختلف موضوعات پر رسائل لکھ چکے ہیں۔ زیرِ تقریظ رسالہ میں نے اکثر مقامات سے پڑھا ہے۔ ایسے تلخ موضوع پر جہاں ایک موحد ان خرافی حضرات کے خرافات سن کر جوش میں آ جاتا ہے، حافظ صاحب کا قلم اعتدال سے نہیں ہٹا۔ معلوم ہے یہ خرافی ذہن مریض ہے۔ مریض سے ناراض ہونا کوئی خوبی نہیں۔ حافظ صاحب نے یہ رسالہ اسی انداز سے لکھا ہے کہ ان بیماریوں کا علاج ہو سکے۔ انھوں نے ان مریض حضرات کے قریب ہو کر ان کے مرض کی نشان دہی فرمائی ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمارے ان خرافات پسند دوستوں کو توفیق دے کہ وہ اس حکیمانہ علاج سے استفادہ فرمائیں۔ وہ اپنی عبادات کو بزرگوں کی قبور اور بزرگوں کی بے حس و حرکت لاشوں کے بجائے خدائے لا یزال کے لیے بجا لائیں۔ اللہ تعالیٰ سے محبت کریں اور اللہ تعالیٰ کے سامنے عجز کا اعتراف کریں، تاکہ ان کی عبادت قبولیت کی مستحق ہو سکے۔

وعبادة الرحمان غاية حبه   مع ذل عابده هما قطبان

وعليهما فلك العبادة دائر   مادار حتى دامت القطبان [1]

اللہ تعالیٰ حافظ صاحب کے قلم میں برکت فرمائے اور مزید خدمتِ دین کی توفیق بخشے۔

محمد اسماعیل

۷ر جمادی الاخریٰ ۱۳۸۷ھ = ۱۴ر ستمبر ۱۹۶۷ء

[1] القصيدة النونية لابن القيم (ص: ٣٥)

پیش لفظ:

تین طلاقیں

(تالیف: خواجہ محمد قاسم۔ ناشر: ادارہ احیاء السنۃ، گوجرانوالہ،۱۹۶۴ء)

جب سے ملک میں عائلی قوانین کا تنقیدی جائزہ لینے کے لیے راہ کھلی ہے، ملک کے مختلف حلقوں سے اس کے متعلق لکھا گیا ہے۔ بعض حضرات کا خیال تھا کہ عائلی قوانین کو از اول تا آخر مسترد کر دیا جائے۔ دراصل یہ خیال پاکستانی حکام کے لا دینی ذہن اور غیر محتاط روش، دین کے معاملے میں اکابر حکومت کی بے اعتدالی اور ذہنی آوارگی کی پیداوار ہے۔ ورنہ اصلاح سے کون انکار کر سکتا ہے۔

بعض حضرات کا خیال ہے کہ ان قوانین کی چھان پھٹک کی جائے۔ جو غلط اور خلافِ شریعت ہیں، انھیں یکسر اُڑا دیا جائے اور اگر کوئی مفید مواد مل جائے تو اسے رکھ لیا جائے۔ راقم الحروف کا تعلق دوسرے گروہ سے ہے۔ ہمارے معاشرے میں عورت مظلوم ہے۔ سوسائٹی میں اس بے چاری کی سادگی سے فائدہ اُٹھا کر آزادی کے نام سے اسے آوارگی کی دعوت دی جاتی ہے اور اسے جنسی خواہشات کے لیے تختۂ مشق بنایا جاتا ہے، بلکہ اس کے جائز حقوق سے گریز کی راہ اختیار کی جاتی ہے۔

عائلی قوانین:

عائلی قوانین کا مسودہ جب پہلے پہل شائع ہوا تو عائلی کمیشن کے ایک ممبر مولانا احتشام الحق صاحب تھانوی نے اس پر ایک اختلافی نوٹ لکھا، جو نہایت مفصل اور کئی صفحات پر مشتمل تھا۔ عائلی قوانین میں حکومت نے مروجہ طلاقِ ثلاثہ کو، جو بیک وقت دی جاتی ہے، ایک شمار کرنے کا اشارہ کیا تھا۔ مولانا احتشام الحق نے جو نوٹ لکھا، وہ انتہائی عصبیت سے بھرا ہوا تھا۔ مولانا احتشام الحق ایسے معقول اور معاملہ فہم آدمی سے ہمیں اس کی اُمید نہ تھی۔

عائلی قوانین موت و حیات کی کش مکش سے گزرتے ہوئے صدرِ مملکت کی عنایت سے کچھ دن زندہ رہ گئے ہیں۔ حکومت نے وعدہ کیا ہے کہ وہ ان میں مناسب اصلاحات کر دے گی۔ حافظ محمد قاسم صاحب کا یہ مضمون ایک اصلاحی کوشش ہے۔ مزید بھی بعض ایسی چیز موجود ہیں، عائلی قوانین میں جن سے صحیح طور پر فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے۔

حافظ صاحب موصوف کا زیادہ تر ماخذ ”إغاثة اللهفان“، ”زاد المعاد“، ”فتاویٰ ابن تيمية“ وغیرہ کتب اہلِ سنت ہیں۔ مناسب ہوگا، عائلی کمیشن کے ممبرانِ کرام ان کتابوں کے علاوہ ”نیل الأوطار“ اور ”إعلام الموقعين“ کے بعض صفحات ”مسك الختام“، ”دليل الطالب“، ”فتح الباري“ وغیرہ ائمہ سنت کے ملفوظات پر بھی توجہ مبذول فرمائیں۔

اللہ تعالیٰ حافظ صاحب کی مساعی کو شرفِ قبولیت بخشے کہ دین کی خدمت کرسکیں۔ سیمنٹ اور بجری تو اور لوگ بھی فروخت کر سکتے ہیں۔

والسلام

محمد اسماعیل، گوجرانوالہ

۱۸/۳/۶۴

پیش لفظ:

تاریخ تدوینِ حدیث

(تالیف: مولانا ہدایت اللہ ندوی۔ ناشر: مکتبہ جامعہ محمدیہ اوکاڑہ۔ ۱۹۵۷ء)

الحمد للّٰه وكفىٰ، وسلام علىٰ عباده الذين اصطفىٰ. وبعد!

فقد قال الله تعالىٰ: ﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ إِنَّا لَهُ لَحٰفِظُوْنَ﴾ [بني إسرائيل: ٩]

عن حسان رحمه الله قال: كان جبريل ينزل على النبي ﷺ بالسنة كما ينزل عليه بالقرآن.

(دارمي، ص: ٧٧، مجموعة الرد الوافر، ص: ٣ الصواعق المرسلة: ٢/ ٣٤٠، موافقات شاطبي: ٤/ ٢٦)

قرآن اور سنت دونوں ذکر میں شامل ہیں اور اللہ تعالیٰ نے دونوں کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے۔ دونوں کا ظہور آنحضرت ﷺ کی زبان سے ہوا، دونوں کا ماخذ وحیِ الٰہی ہے، دونوں کی حفاظت حفظ اور کتابت سے ہوئی۔ قرآن کی حفاظت قرا اور لکھنے والوں نے کی، حدیث کی حفاظت حفاظِ حدیث اور کاتبوں نے فرمائی۔ حفاظت کے طریقوں میں فرق ہے، اس لیے سنت کا مرتبہ قرآنِ عزیز کے بعد رکھا گیا ہے۔

قرآنِ عزیز کے معانی میں جب احتمال ہو تو سنت کا فیصلہ قاضی اور ناطق ہوگا، کیوں کہ سنت کا نزول بھی آنحضرت ﷺ پر خدا تعالیٰ کی طرف سے ہوا۔ جب دونوں علوم کا ماخذ ومنبع ایک ہی ہے تو ایک کی تصدیق دوسرے کی تکذیب، ایک کا اقرار دوسرے کا انکار موجبِ استعجاب ہے۔

قرآنِ مجید بھی ہم تک تواتر سے پہنچا اور انسانوں کی اس مجموعی کوشش نے عصمت عن الخطا کی صورت اختیار کر لی۔ روایت میں تلقی بالقبول اور اجتہادیات میں یہی مقام ''اجماع'' کو حاصل ہے۔ انفراداً انسانی کوششیں خطا اور نسیان کی متحمل ہیں، لیکن اجتماعیت اور تواتر سے یہ کوششیں معصوم ہو جاتی ہیں، اس لیے قرآنِ عزیز کا ہر ہر نقطہ اور حرف محفوظ ہے اور یہ نقلِ متواتر اس حفاظت کی ضامن ہے۔

آنحضرت ﷺ کی احادیث کی حفاظت کا سامان بھی حق تعالیٰ نے اسباب کی دنیا میں اس طرح فرمایا کہ حفاظِ حدیث نے اپنے اوقات حفظِ حدیث کے لیے ٹھیک اسی طرح وقف فرما دیے، جس طرح حفاظِ قرآن نے قرآن کو حفظ فرمایا۔ حافظوں میں بشری نقائص کی اصلاح کے لیے حفاظِ حدیث کی کتابیں اور اُن کے قلم وقف

ہو گئے اور یہ سلسلہ صحابہ سے شروع ہو کر آج تک جاری ہے، چناں چہ حدیث کے ذخائر مختلف اقسام و انواع میں موجود ہیں۔

صحیح جن کے مولفین نے نقلِ حدیث میں صحت ہی نہیں بلکہ مراتبِ صحت کے لحاظ سے خاص شرائط رکھیں اور ان شروط کی پابندی کی پوری کوشش فرمائی، جیسے صحیح بخاری، صحیح مسلم، مستدرک حاکم (۴۰۵ھ) صحیح ابن خزیمہ (۳۱۱ھ) صحیح ابن حبان (۳۵۴ھ) وغیرہ، ان مصنفین نے اپنی جوامع اور مسانید میں صحت کی شرط فرمائی۔ جہاں تک ممکن تھا، انسانی حدود کے اندر اپنی بساط کے مطابق اس شرط کو پورا کیا۔ وکان سعیھم مشکوراً.

ملا جلا ذخیرہ:

ابو داود، نسائی، ترمذی، ابن ماجہ، موطا مالک، دارمی، دارقطنی وغیرہ ان کے مصنفین نے اپنی کتابوں میں صحت کی شرط نہیں فرمائی۔ بعض دوسری شرائط ان کے پیشِ نظر رہی ہیں، اس کے باوجود ان میں اکثر احادیث صحیح ہیں اور قابلِ استناد، اسی لیے ان میں سے بعض کو صحاح کہا گیا ہے، لیکن ضعیف، حسن، شاذ، منکر سے یہ کتابیں خالی نہیں۔ تعارض اور ترجیح کے وقت ان اقسام کا تفاوت پیشِ نظر رہنا چاہیے۔

بالکل غیر مستند، موضوع اور مختلق احادیث یا ضعیف اور کمزور روایات ''اللآلئ المصنوعة في الأحاديث الموضوعة''، موضوعات کبیر و صغیر لعلی القاری (۱۰۱۴ھ)، ''تمیز الطیب من الخبیث فیما یدور علی ألسنة الناس من الحدیث''، بعض رسائل شیخ الاسلام ابن تیمیہ (۷۲۸ھ)، موضوعات ابن جوزی ۵۹۵ھ وغیر ذلک، معاجم طبرانی، الضعفاء للعقیلی (۳۲۲ھ) و کامل لابن عدی (۳۶۷ھ) وغیرہ یہ ذخیرہ عموماً موضوع اور مختلق ہے یا بے حد ضعیف، جس سے عام حالات میں استدلال درست نہیں۔

اس تنوع کے باوجود احادیث میں متواتر کی بڑی تعداد موجود ہے، ان میں لفظاً متواتر بھی ہیں اور معنیً بھی۔ موجودہ دفاترِ سنت کی نسبت ان کے مصنفین تک متواتر ہے اور ائمہ مصنفین سے اکثر احادیث آنحضرت ﷺ تک دس دس اور بیس بیس اسانید سے پہنچتی ہیں، پھر ان رواۃ میں بعض ائمہ ایسے ہیں، جن کے اسمائے گرامی جرح و تعدیل کے باب میں پوری اہمیت سے لیے جاتے ہیں، اور معلوم ہے کہ متواتر میں صرف ''عدد'' کی کثرت ہی مطلوب نہیں، بلکہ صفاتِ رجال کو بھی دخل ہے۔ تجربہ شاہد ہے کہ بعض وقت ثقہ اور مستند آدمی بازاری قسم کے آدمیوں کے ایک ہجوم سے زیادہ قابلِ اعتبار ہوتا ہے۔ اس لیے ایسی احادیث جو مستند رواۃ اور متعدد اسانید سے آنحضرت تک پہنچیں، ان کے لفظاً متواتر ہونے میں کوئی شبہہ نہیں۔ تواتر معنوی اس کے علاوہ ہے، اس لیے بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ احادیث کے ان دفاتر میں متواتر احادیث کا بہت بڑا سرمایہ موجود ہے۔

بعض اہلِ علم نے متواتر کی قلت کی تصریح فرمائی ہے۔ وہ متواتر کے مفہوم میں غلطی یا صفاتِ رجال سے بے اعتنائی اور ائمہ فن کی تصریحات سے بے خبری پر مبنی ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: "الصواعق المرسلة" لابن قیم (۷۵۱ھ) اور دیگر کتبِ اصول۔ فإن لصفات الرجال قدراً عظیماً في تحقیق مفهوم المتواتر لفظیاً کان أو معنویا.

باقی احادیث:

متواتر کے علاوہ باقی ذخیرہ جو سنت کے دفاتر میں موجود ہے، اس میں صحیح، حسن اور بعض اقسامِ ضعاف پائی جاتی ہیں، جن سے استناد کیا جا سکتا ہے اور ایسے قرائن پائے جا سکتے ہیں، جو ضعف کا جبر بن سکیں اور حدیث فی الجملہ اس قابل ہو سکے، جس پر اعتماد کیا جا سکے۔

بلاشبہہ ایسے ادلہ اور اصول ظن سے خالی نہیں ہوں گے، لیکن اس ظن کی تائید جب قرائن سے ہو جائے تو یہ ظن شرعاً عرفاً قابلِ استناد ہے اور دین میں ایسے ظنون پر اعتماد کیا گیا ہے۔ قانونِ شہادت، قانونِ عدالت، ضمانت، اقرار، بعض احکام اسی قسم کے ظن پر مبنی ہیں۔ یہ وہم کہ دین میں ظن کا کوئی مقام نہیں، کسی دلیل سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔

اخبارِ آحاد اور منکرینِ حدیث کا ظن:

ان ظنی احادیث پر اتنا وثوق تو کیا جا سکتا ہے، جس قدر ہمارے منکرینِ حدیث کو اپنے اجتہادات پر ہے۔ مولوی عبد اللہ صاحب چکڑالوی، مولوی حشمت علی دہلوی ثم لاہوری، مستری محمد رمضان صاحب گوجرانوالہ، سید رفیع الدین صاحب ملتانی؛ چاروں حضرات نے قرآنِ مجید سے نماز کشید کرنے کی کوشش کی ہے۔ نماز کے لیے اذکار قرآنِ عزیز سے برآمد کرنے کا شغل فرمایا ہے۔ پہلے دونوں بزرگ پانچ نمازیں مانتے ہیں، اذکار میں اختلاف فرماتے ہیں۔ مستری محمد رمضان صاحب اذکار میں اختلاف کے ساتھ نماز کے لیے صرف تین وقت مانتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ عصر اور مغرب مولویوں نے از خود بنا لی ہے، قرآن میں صرف فجر، ظہر، عشاء تین نمازیں ہیں، یعنی صلواتِ مسیلمہ کذاب؟!

سید رفیع الدین ملتانی فرماتے ہیں: نمازیں چار ہیں، دو دن میں، دو رات کے وقت، دن کی نمازوں میں مشرق کی طرف منہ کرے، رات کے اوقات میں مغرب کی طرف: قل للّٰه المشرق والمغرب.

نماز جیسی عبادت میں ان حضرات کا اختلاف ان کی موت تک ختم نہیں ہوسکا اور ہر ایک کو اصرار تھا کہ

صرف میری نماز قرآنی ہے، باقی غلط اور غیر مقبول ہے۔

یہ حضرات پوری عمر لڑتے رہے اور قرآن بچارا خاموش مظلوموں کی طرح یہ نظارہ دیکھتا رہا۔ جب تک قرآنِ عزیز اپنی زبانی ان حضرات سے کسی کی تائید نہ کرے، یہ سارے مفہوم ظنی ہو سکتے ہیں۔ اگر یہ ظنی اجتہادات کچھ دینی اہمیت رکھ سکتے ہیں تو احادیثِ نبویہ کی ظنیت اس قدر کمزور تو نہ ہونی چاہیے کہ ان مزخرفات کے سامنے بھی نہ ٹھہر سکے، اس لیے احادیث کا یہ ذخیرہ اپنی ظنیت کے باوجود قابلِ اعتماد ہوگا اور اعمال میں اسے حجت سمجھا جائے گا۔

اس باہمی مخاصمت کی بنا پر مولوی احمد دین صاحب امرتسری نے نماز کی اساسی حیثیت کو ہی نظر انداز کر دیا۔ وہ خود عام مسلمانوں کی طرح نماز پڑھتے تھے، پانچ چار اور دو تین پڑھنے کا انکار نہیں کرتے تھے۔ عام عادات میں مسلمانوں کی رسوم کا تتبع کرتے تھے، اور پرویز صاحب نے ایسے معاملات مرکزِ ملت کے سپرد کر دیے ہیں۔ یہ معلوم نہیں مرکزِ ملت کے یہ فیصلے ظنی ہوں گے یا قطعی؟ دینی ہوں گے یا لا دینی؟ ہر دانش مند آدمی کا ضمیر فیصلہ کرے گا کہ ان پریشان خیالات سے تو بہرحال خبرِ واحد زیادہ قابلِ اعتماد ہوگی، اور ایسے کم سواد اور کند ذہن حضرات کو اخبارِ آحاد پر اعتراض اور تشکیک پیدا کرنے سے شرم محسوس ہونی چاہیے۔ فما لهؤلاء القوم لا يكادون يفقهون حديثا.

انکارِ حدیث کا مرض:

احادیث پر تنقید اہلِ علم کا دل پسند مشغلہ رہا ہے۔ قواعدِ فن کی روشنی میں بعض احادیث کا رد، بعض میں توقف، ہر دور کے اہلِ علم کرتے رہے۔ صحابہ، تابعین، ائمہ اسلام اپنے مسالک کی ترجیح میں انھیں قواعد سے استفادہ فرماتے تھے۔

ائمہ رجال اور ان کے اوصاف، موالید و وفیات کی بنا پر احادیث کے متعلق ایجاباً یا سلباً حکم لگاتے رہے، بلکہ صحیح یہ ہے کہ فنِ تنقید کی ایجاد کا سہرا انھی بزرگوں کے سر ہے۔ اگر ان حضرات کی راہنمائی نہ ہوتی تو ہم اس راہ میں ایک قدم نہ چل سکتے۔ جو مواد آج غلطی یا جہالت سے سنت کے خلاف استعمال ہو رہا ہے، یہ بھی ان کی عنایت یا دقتِ فکر کا نتیجہ ہے، ان مباحث کو انکارِ حدیث سے کبھی تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔

اہلِ ہوا:

ان کی دیکھا دیکھی کچھ ایسے حضرات بھی تنقید کے میدان میں آ گئے، جن کے پیشِ نظر کوئی بنیادی چیز نہ تھی، بلکہ کچھ خواہشات تھیں، کچھ طے کردہ نظریات تھے، وہ ہر قیمت پر ان کی حمایت کرنا چاہتے تھے۔ ان کی تنقید

کا محور وہی خواہش یا آرزو تھی۔ شیعہ نے فیصلہ کر لیا کہ وہ کچھ بھی ہو، اہلِ بیت کی حمایت کریں گے۔ خوارج نے طے کر لیا کہ وہ ہر برائی کا مورد خانوادۂ نبوت کو قرار دیں گے۔ دونوں گروہ کی تصانیف ملاحظہ فرمایئے، آپ کو یہ بات نمایاں نظر آئے گی۔

معطلہ، مجسمہ، معتزلہ، جہمیہ کے سامنے بھی اسی قسم کے مقاصد تھے۔ ان کی زد سے نہ قرآن بچ سکا نہ حدیث، تاویل کی بے ہنگام اور بے اصول گردش نے تمام قواعد کو کچل کر رکھ دیا۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور حافظ العصر ابن قیم کی تصانیف سے یہ کیفیت واضح ہو جاتی ہے۔

آج ہمارے سامنے مشرکینِ ہند موجود ہیں، تاویل وتحریف میں ان کے ہاں کوئی جوہری فرق نہیں۔ خدا تعالیٰ کی صفاتِ حسنیٰ کو وہ اس عاجز مخلوق اور مطیع بندوں کی طرف اس طرح منتقل کرتے ہیں، گویا خدا تعالیٰ کے لیے اس دنیا میں کوئی کام باقی نہیں، نہ ہی اس کی کوئی صفت باقی ہے، جس کی موہبت اور عطا کا دعویٰ نہ کر دیا گیا ہو۔

ان اہوا کی حمایت میں احادیث کے رد وقبول میں جو روش اختیار کی گئی ہے، یہ ائمہ حدیث کی راہ سے بالکل مختلف ہے۔ محدثین کی تنقید اور جرح وتعدیل کے اصول موافق مخالف سب کے لیے یکساں مفید اور مضر ہو سکتے ہیں، لیکن اہلِ بدعت کی تنقید اسی محور پر گھومتی ہے، جہاں وہ اسے گھمانا چاہتے ہیں۔ ائمہ حدیث کے اصول صدیوں سے اہلِ علم کے لیے زیادتِ علم اور افادہ کے موجب ہو رہے ہیں، لیکن اہلِ بدعت کے اصول وقواعد روزانہ بنتے اور بدلتے رہتے ہیں۔ كشجرة خبيثة اجتثت من فوق الأرض ما لها من قرار.

ان اہوا اور خواہشات کی حمایت میں احادیث پر جس طرح ہاتھ صاف کیا جاتا ہے، اس کا انکار سے بہتر کوئی نام نہیں۔

اہلِ قرآن یا منکرینِ حدیث:

ان حضرات کی حالت بھی پہلے اہلِ ہوا کی طرح ہے۔ سنت پر بدگمانی، قلتِ مطالعہ، لاعلمی، انگریز مستشرقین سے تاثر، مناظرانہ جذبات اور اس کے ساتھ احساسِ کہتری اور کبر؛ اس تحریک کے اساسی ارکان ہیں، ان کے قائد بالواسطہ یا بلا واسطہ جدید تعلیم سے متاثر ہیں، اس کے ساتھ ہی اس تہذیب کا بھی ان حضرات پر اثر ہے، جو جدید تعلیم کے ساتھ آئی۔ وہ رسوم وعادات بھی ان پر اثر انداز ہیں، جو ہر تہذیب کے ساتھ لوازم کی طرح لپٹی رہتی ہیں۔ دینی علوم کے لیے ان حضرات کے پاس نہ وقت ہے نہ فرصت۔ اہلِ علم کی طرف رجوع سے ان کی پوزیشن مانع ہے۔ یہ بچارے جہلِ مرکب کی سی تکلیف میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ اسلام سے بظاہر تعلق موجود ہے، اس کی حمایت کے لیے طبیعت میں کچھ بے قراری سی محسوس کرتے ہیں، جی چاہتا ہے کہ اس سے مدافعت کریں۔

صحیح جواب کے لیے وسعتِ مطالعہ اور معلومات کی ضرورت ہے اور پھر ایمان راسخ کی، اور یہاں ایک ایک چیز ناپید ہے، اس لیے ان حضرات کو آسان یہی معلوم ہوا کہ حقائق کا انکار کر دیا جائے۔

کبھی ان مقدس علوم کو عجمی سازش کہہ دیا۔ کبھی صحابہ کے تثبت اور تشدد فی الروایہ کو انکار کا عنوان دے دیا، کبھی حضرات امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ (۱۵۰ھ) شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ (۱۱۷۶ھ) کو منکرِ حدیث کہہ کر دل کے لیے سکون کا سامان پیدا کر لیا اور میز پر بیٹھے حقے یا سگریٹ کا کش لگایا اور اپنے ذہن میں ایک فیصلہ کر لیا، جس کی حیثیت تنگ بندی سے زیادہ نہیں، اس تنگ بندی اور آوارگی کی راہ میں حدیث کی تفصیلات عموماً حائل ہوتی ہیں، اس لیے، یہی مناسب سمجھا گیا کہ حدیث کے خلاف ایک ہنگامہ بپا کر دیا جائے۔ لاہور کے اربابِ ''ثقافت'' اور کراچی کے اربابِ ''طلوع'' ایک ''ماڈرن اسلام'' کو درآمد کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ولا يمكن ذلك أبداً حتى يلج الجمل في سم الخياط.

ہمارے رفیقِ محترم مولانا عطاء اللہ صاحب حنیف مدیر رحیق نے آج سے چند سال پہلے کی ''تنقید'' کا جائزہ لینے کے بعد مروجہ تنقید کا بہت ہی صحیح تجزیہ فرمایا ہے:

> ''اور نئے دور میں معاملہ اور بھی دگرگوں ہے۔ مصر اور ہند و پاک کے یہ نقاد مغرب کے ملحد مستشرقین کی ''تحقیقاتِ نادرہ'' پر لٹو ہو گئے۔ سر سید علی گڑھی نے ''نیچر'' درآمد کی اور اس کے مخالف ہر حدیث کے انکار کی ٹھانی۔ پرویز صاحب نے ''قوانینِ فطرت'' کا پیمانہ گھڑ لیا اور ہر حدیث کو اس سے ناپنا شروع کر دیا۔ مرزائیوں نے ''مخالفِ قرآنی'' کے بہانے بہت سی احادیث سے گلو خلاصی کرا لی۔ حالاں کہ یہ صرف مفروضہ ہے۔ کوئی صحیحین کی حدیث قرآنِ حکیم کے خلاف ہو ہی نہیں سکتی۔ لاہور کی ''ثقافت پارٹی'' نے خلیفہ عبدالحکیم کی قیادت میں ''ارتقا'' کی آڑ لے کر انکارِ حدیث کے علاوہ نصوصِ قرآنی کی بھی مرمت اور تحریف شروع کر دی۔ جماعتِ اسلامی نے مودودی صاحب کی تقلید میں ''درایت اور مزاج شناس رسول'' کی درانتی صحیح بخاری کی احادیث پر چلا دی۔ بعض لوگ ''مشاہداتِ سائنس، تجرباتِ طب'' پر ایمان لا کر بخاری مسلم کی تحقیقات کو مجروح کرتے ہیں۔ غرض ''ہر کہ آمد عمارت نو ساخت''، جس شخص کی طبع نازک پر کوئی حدیث گراں گزری، اپنے مزعومہ ریسرچ کے خلاف پا کر اسے مردود قرار دے دیتا ہے۔'' (رحیق، اکتوبر ۵۷ھ)

دراصل ذہنی تاریکیوں اور نارسائیوں کے یہ سب نام ہیں اور اپنے جہل کے متعلق لاعلمی نے یہ مصیبت بپا کر دی۔ یہ ریسرچ کاری اگر بدستور جاری رہی تو حدیث سے گزر کر قرآن پر بھی ہاتھ صاف ہوگا۔ قرآن کی مرمت کے لیے دراصل یہ سب حیلے تمہید ہیں۔ وما تخفي صدورهم أكبر.

اہلِ حق کی بیداری:

خدا کا شکر ہے، جب سے یہ ناپاک منصوبے زبانِ قلم پر آئے ہیں، اہلِ حق بھی خاموش نہیں رہے۔ پورے پاک و ہند میں اس دجل و فریب اور ان ''چور دروازوں'' کے خلاف زبان و قلم حرکت میں آ گئے ہیں۔ ارشادِ خداوندی: ﴿إِذَا مَسَّهُمْ طَٰٓئِفٌ مِّنَ ٱلشَّيْطَٰنِ تَذَكَّرُوا۟ فَإِذَا هُم مُّبْصِرُونَ﴾ [الأعراف: ۲۰۱] کے مطابق حق پسند طاقتیں اپنے فرض کو پہچان رہی ہیں اور نفاق میدان خالی کر کے پیچھے ہٹ رہا ہے۔ مولوی عبداللہ چکڑالوی جن ''دفاترِ سنت'' کو ''اسفار لہو الحدیث''، ''بکواس'' کہتے تھے، آج انھیں ''تاریخی سرمایہ'' کہا جا رہا ہے:

''الغرض حدیث کا صحیح مقام دینی تاریخ کا ہے، اس سے تاریخی فائدے حاصل کیے جا سکتے ہیں۔''

(مقامِ حدیث: ۱/ ۱۶۷)

جن ائمہ کو سازشی کہا جا رہا تھا، اب وہ مورخ قرار پا رہے ہیں، جس نماز کے ارکان اور اذکار ثابت کرنے کے لیے قرآنِ عزیز کی آیات کا آپریشن کیا جا رہا تھا، آج یا تو اسے متواتر سمجھ کر قبول کیا جا رہا ہے یا پھر وہ مرمت ترک کر کے اسے بحال رکھنے کی سفارش کی جا رہی ہے۔

نمبرداروں کی حکومت:

پرویزی حضرات کی حالت یہاں اور بھی قابلِ رحم ہے۔ وہ نماز سے تو بہرکیف مخلصی چاہتے ہیں، لیکن اس کے لیے منکرینِ حدیث نے آج تک جو راہ اختیار کی ہے، اس کے غیر معقول ہونے میں ان کو کوئی شبہہ نہیں، اس لیے وہ نمبرداروں کی حکومت کا نظریہ وضع فرماتے ہیں۔ ان کا ارشاد ہے کہ پہلے قرآنی معاشرہ بنانے کا آرڈر دیا جائے، پھر قرآنی معاشرہ قرآنی نقطہ نظر سے کچھ نمبردار ''مرکزِ ملت'' منتخب کرے، پھر یہ نمبردار حسبِ تقاضا، وقتِ عبادات اور معاملات اور احکام میں ترمیم یا مرمت کریں۔ جب تک نمبردار حضرات اپنی کرسیوں پر بیٹھ کر اپنی ذمے داریاں نہیں سنبھالتے، اس وقت تک یہ چیزیں جوں کی توں رہنے دی جائیں۔

ہمیں یقیناً معلوم ہے یہ ناپاک گٹھ جوڑ ۔إن شاء اللہ۔ ہوگا ہی نہیں، اس لیے نماز وغیرہ اعمال اپنی حالت پہ قائم رہیں گے۔

اب یہ حضرات انکارِ حدیث کے نام سے گھبرا رہے ہیں۔ قرآن اور عقل کی آڑ لے کر تنقید کے نئے ہتھیاروں سے مسلح ہونے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن یہ بھی محض دفع الوقتی ہے، جس کارخانہ میں یہ ہتھیار تیار ہوں گے، وہ کارخانہ ہی ۔إن شاء اللہ۔ پوری طرح مسمار ہو کر رہے گا!

حقیقت یہ ہے کہ اہلِ سنت کے حملوں سے تنگ آ کر یہ تحریک پسپا ہو رہی ہے۔ معلوم نہیں یہ پسپائی

با قاعدہ ہے یا بے قاعدہ، مگر جب کوئی تحریک اساسی معاملات میں حیلے اور بہانے تلاش کرنا شروع کر دے تو اس کی پسپائی یقینی ہے اور اہلِ حق کی بیداری یقین ہے کہ اس دجل وفریب کے جال کو تار تار کر کے رکھ دے گی۔

تاریخ تدوین حدیث:

رفیقِ محترم مولانا ہدایت اللہ صاحب ندوی (جامعہ محمدیہ اوکاڑہ) مبارک کے مستحق ہیں، انھوں نے یہ عمدہ کتاب محنت سے لکھی، صحیح مستندات کی طرف رجوع فرمایا، مروجہ مناظرانہ انداز سے ہٹ کر صحیح معلومات جمع فرمائے، تدوینِ حدیث کے ارتقائی ادوار کا پورا جائزہ لیا اور اس کے تدریجی ارتقا کی ایک تاریخ مرتب فرما دی، اور یہ ارتقا بالکل طبعی رفتار سے ہوا، آنحضرت ﷺ کے سامنے اسے وقتی حوادث کی طرح یاد رکھا گیا، سماع اور مذاکرہ کی مجالس منعقد ہوتی رہیں اور جب ضرورت ہوئی، اسے لکھ لیا گیا یا لکھوا دیا گیا۔

آنحضرت ﷺ کے بعد صحابہ نے تحریر کی طرف زیادہ توجہ فرمائی۔ اکثر صحابہ کے پاس یہ یادداشتیں کتابی صورت میں موجود تھیں۔ کسی کے پاس اس قسم کی متعدد یادداشتیں تھیں، حضرت ابوہریرہ ایسے اصحاب التدریس صحابہ کے پاس تذکرے انباروں کی حد تک پہنچے ہوئے تھے۔ تاریخ تدوینِ حدیث کا یہ حصہ بے حد تابناک ہے۔ مولانا نے عہدِ نبوت سے تیسری صدی تک صحابہ اور تابعین کے محفوظات اور تذکروں کا مسلسل ذکر فرمایا ہے اور اس وقت کے حالات کے مطابق یہی ہونا چاہیے۔ دوسری صدی کے اواخر اور تیسری کے آغاز میں تدوین کا عروج تھا۔ ان واقعات اور ان کے تسلسل سے واضح ہو جاتا ہے کہ تیسری صدی فن کا ارتقائی دور ہے اور یہ تسلسل درمیان میں کہیں ٹوٹا بھی نہیں۔ یادداشتیں اور تذکرے لکھے گئے۔ تذکروں نے مدوّن کتابوں کی صورت اختیار کی، ان میں سنن اور اجزا تھے، ان میں عبادات اور معاملات تھے۔ ان میں سیر اور مغازی تھے، ان میں ایسے حضرات تھے، جنھوں نے حدیث کے ساتھ فتاویٰ صحابہ کو جمع کیا۔ ان میں وہ تھے، جنھوں نے صرف صحاح جمع فرمائیں، ضعاف بالکلیہ نظر انداز کر دیں۔ بعض نے صحاح، حسان، ضعاف سب جمع فرمائیں، بعض نے غیر مستند ضعاف اور موضوعات جمع کیں۔

زمانہ صحابہ سے زمانہ ارتقا تک اور ارتقا سے آج تک یہ سلسلہ جاری ہے، اس سے یہ مغالطہ بالکل دور ہو جاتا ہے کہ حدیث کی تدوین تیسری صدی میں ہوئی، درمیان کا زمانہ خاموشی سے گزر گیا۔ تیسری صدی میں حدیث کہیں سے برس پڑی یا کھیتی کی طرح اُگ آئی۔

میں نے کتاب کو بالاستیعاب پڑھا ہے اور غور سے پڑھا ہے۔ کتاب حقائق پر مبنی ہے اور مناظرانہ ہمز ولمز سے کافی پرہیز کی گئی ہے۔ انصاف پسند طبائع کے لیے امید ہے یہ مختصر تحریر بے حد مفید ہوگی۔ دوسرے

اصحابِ قلم سے بھی امید ہے کہ وہ لکھتے وقت عوام کو ''علمی مواد'' دینے کی کوشش کریں گے، طعن و تشنیع سے ذہن صاف نہیں ہوتا، بلکہ بعض اوقات اس سے تنفر بڑھتا ہے۔

تاریخ انکارِ حدیث:

زیرِ نظر کتاب میں مولانا نے اس کا اجمالاً ذکر فرمایا ہے۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ دنیا کے مشہور مذاہب اور مسالک میں سے کسی نے اہلِ قرآن کی طرح کلیتاً حجیتِ حدیث کا انکار نہیں کیا۔ بدعی فرقوں نے اپنے نقطہ نظر سے بعض احادیث کا انکار کیا، جو اُن کے منشا اور مخترع اصولوں کے خلاف تھیں، لیکن اصولی طور پر آنحضرت ﷺ کے ارشادات کو حجت مانتے رہے۔ جزوی انکار کا مرض پرانا ہے، لیکن کلی طور پر انکار تیرھویں صدی کے آغاز میں کیا گیا اور اب تک ایسے لوگ موجود ہیں، جو سنت کی حجیت کا انکار کرتے ہیں۔

ادارہ ''طلوع'' کراچی کی تحریرات میں عجیب قسم کا اضطراب ہے۔ ان کا اصل مقصد تو یہی ہے کہ وہ حجیتِ حدیث کا بالکل انکار کریں، مگر اس کے اظہار میں صاف گوئی سے کام نہیں لیتے۔ کبھی وہ تنقید کا مقام اختیار کرتے ہیں اور قرآن کی حمایت کا ٹھیکہ لے کر احادیث کا انکار کرتے ہیں۔ کبھی اسے محض تاریخ سمجھتے ہیں۔ معلوم نہیں یہ تذبذب قلتِ مطالعہ اور فن سے بے خبری کا نتیجہ ہے یا عوام کو دھوکا دینے کا منصوبہ؟!

مولانا ہدایت اللہ صاحب ندوی کے ہم ممنون ہیں، انھوں نے تدوینِ حدیث کی تاریخ کی حد تک قریباً اکثر شبہات کو رفع فرما دیا ہے۔ فجزاہ اللہ عنا وعن المسلمین أحسن الجزاء.

اور منکرینِ حدیث سے باادب گزارش ہے کہ

اَلْجَهْلُ دَاءٌ قَاتِلٌ وَشِفَاؤُهٗ
أَمْرَانِ فِي التَّرْكِيبِ مُتَّفِقَانِ
نَصٌّ مِنْ قُرْآنٍ أَوْ مِنْ سُنَّةٍ
وَطَبِيبُ ذَاكَ الْعَالِمُ الرَّبَّانِيُ

محمد اسماعیل سلفی، گوجرانوالہ

۱۴ ربیع الثانی ۱۳۷۷ھ = ۷ نومبر ۱۹۵۷ء

پیش لفظ:

تحریک جماعتِ اسلامی اور مسلکِ اہلِ حدیث

(تالیف: مولانا داود راز۔ ناشر: مکتبۃ السنہ، کراچی۔ ۱۴۱۳ھ)

بعد الحمد والصلاۃ.

مجھے مولانا مودودی اور ترجمان القرآن سے اس وقت تعارف ہوا، جب مولانا حیدر آباد میں تھے۔ بقول مولانا اصلاحی، مولانا مودودی ملائے مکتبی نہیں ہیں، اس لیے مولانا جو کچھ لکھتے ہیں، مروجہ مکاتب سے آزاد ہو کر اجتہاد سے لکھتے ہیں اور ان کو اپنے نظریات پر اتنا ہی وثوق ہوتا ہے، جتنا ایک مجتہد کو اپنے اجتہادات پر ہونا چاہیے۔ مکتبی علما کو اس طرح کے بعض نظریات بلا محنت رفقا کے مذاکرات اور اساتذہ کے اشارات سے مل جاتے ہیں، اس لیے یہ حضرات نہ ان اجتہادات کو اہمیت دیتے ہیں نہ اُن کا احترام کرتے ہیں، بلکہ بسا اوقات انھیں اپنی تنقید کی سان پر چڑھا دیتے ہیں۔ ویسے بھی ہمارے مکاتب میں طلبہ کے مزاج کا انحصار زیادہ تر اساتذہ کے فیوض پر ہوتا ہے، کچھ مکاتب کے ماحول پر۔ پس عام علما اور مولانا کے طریقِ فکر میں یہ ایسی خلیج ہے، جسے پاٹنا کافی مشکل ہے۔

مولانا مودودی میں ایک اور بھی خوبی ہے، مولانا اپنے اجتہادات میں قوتِ استدلال سے اتنا نہیں گھبراتے، جس قدر وہ عوام کے ہیجان اور فضا کی تمازت سے دبکتے ہیں۔ کئی اہم ملکی مسائل اور متعۃ النکاح[1] کے،

---

[1] ناظرینِ کرام میں سے شاید اکثر کو معلوم ہوگا کہ حضرت مولانا مودودی صاحب کے عجیب وغریب علمی تفردات میں سے ایک مسئلہ ''متعہ کا جواز'' بھی ہے۔ متعہ اہلِ سنت کے ہاں احادیثِ صحیحہ کی بنا پر قطعاً حرام ہے اور کسی صورت میں بھی جائز نہیں ہے۔ ائمہ اربعہ اور جملہ امامانِ احادیث کا اس پر اتفاق ہے، مگر ان سب سے ہٹ کر مولانا مودودی صاحب نے متعہ کو جائز قرار دیا اور جب اخبارات اور اسلامی دنیا میں اس پر لے دے ہوئی، علما نے اس پر مولانا کو چیلنج کیا تو آپ نے نہ صرف اس کے جواز پر ڈرامائی استدلال پیش کرنے شروع کیے، بلکہ احتجاج کرنے والے علما کی پگڑیاں اُچھالنے لگے اور آپ کے مریدوں نے علمائے کرام کی وہ وہ تردید، تجہیل، تفسیق فرمائی کہ توبہ ہی بھلی۔ اس منظم محاذِ جنگ کا اندازہ آپ ذیل کے اقتباس سے لگا سکیں گے، جو جماعت اہلِ حدیث کے مستند ثقہ اور مقبول ترین اخبار ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (مجریہ ۱۸/ نومبر ۱۹۵۵ء) سے درج ذیل کیا جا رہا ہے:

←

متعلق مولانا نے تفرد سا اختیار فرمایا۔ علما کے کہنے پر مولانا نے توجہ نہ فرمائی، جب اخبارات نے سرخیاں جمانی شروع کیں اور ایک ہیجان سا بپا ہو گیا تو مولانا نے فوراً ہتھیار ڈال دیے۔

مولانا اپنے علمی تفردات کی اگر اشاعت نہ فرماتے یا اپنے اجتہادات اور جماعتی لٹریچر میں خطِ فاصل کھینچ سکتے تو اس قدر بگاڑ نہ ہوتا، لیکن ہوا یہ کہ مولانا نے اپنے گرد و پیش اس قسم کے مزید اربابِ اجتہاد کو جمع فرما لیا، جو عموماً کوئی نہ کوئی اعجوبہ ظاہر فرماتے رہتے ہیں اور یہ سارا لٹریچر جماعت ہی کا تصور ہوتا ہے۔

> ”تعجب ہے کہ مودودی صاحب اگر ① صحیح احادیث کا مضحکہ اڑائیں ② دجّال کے متعلق پایۂ تحقیق کو پہنچی ہوئی روایات کو افسانہ قرار دیں ③ صحیح بخاری شریف کی صحت و استناد کے ماننے کو شرافت و علمیت کے منافی بتائیں ④ تمام علمائے دین کی تجہیل کریں ⑤ شامی اور ہدایہ کی دل کھول کر تضحیک کریں ⑥ متعہ ایسے قبیح فعل کا جواز ثابت کریں تو جماعت اسلامی کے مجتہدوں کے نزدیک یہ بلا استثنا سب کچھ صحیح اور بجا، لیکن اگر کوئی اللہ کا بندہ مودودی صاحب کی گرفت کرے اور ان کی تحقیق کو غلط قرار دے تو یہ جماعتِ اسلامی کی نازک مزاجیوں کے منافی ٹھہرے اور اس کی بارگاہِ عدل و انصاف میں ایسا شخص گردن زدنی و کشتنی قرار پائے۔ یہ آخر کیوں ہے؟ جماعتِ اسلامی کے یہ لینے اور دینے کے پیمانے اتنے مختلف کیوں ہیں؟“

شاید ناظرین کرام میں سے کوئی صاحب ہمارے یا اخبار ”الاعتصام“ کے بیانِ بالا کو مبالغہ آمیزی تصور کریں، ایسے حضرات کے سامنے ہم اس جماعت کے صرف ایک اخبار ”ایشیا“ نامی کے وہ نازیبا اور مکروہ الفاظ بطورِ نمونہ نقل کرتے ہیں، جو صرف ایک مخالف مولانا احمد علی صاحب خدام الدین لاہور والوں کی شان میں اس اخبار نے استعمال کیے ہیں، اس سے اندازہ ہو جائے گا کہ جماعتِ اسلامی کے صالحین کی سنجیدگی و متانت و شرافت کی دنیا کس قدر ”سنسان“ ہے۔

اخبار ایشیا کے مدیر شہیر مولانا نصر اللہ خاں صاحب مولانا احمد علی صاحب کے حق میں ذیل کے خطابات بڑی ہی فراخ دلی کے ساتھ غالباً لکھنؤ کی روایتی بھٹیاریوں کی لغت کو سامنے رکھ کر پیش فرماتے ہیں:

”جاہل، بہتان طراز، مفتری، اخلاقی تعلیمات سے بے بہرہ، تقویٰ، تقدس، للّٰہیت اور تقرب الی اللہ کا ڈھونگ رچانے والے، غیر معقول، مسمی صورت والے، فریبی، جھوٹے، تقدس و تقویٰ کی دھونس رچانے والے، مذبوحی حرکتیں کرنے والے، علم و اخلاق سے بے تعلق، فاسد ذہنیت کے مالک، پیشہ ور دیندار، عقل کے اندھے، غیر ذمہ دار، قرآن کے فہم سے عاری، ناخدا ترس، بے حس، خدا اور مخلوق کی شرم سے بے بہرہ، بے حیا، بے وقوف، گھناؤنے اور مکروہ اخلاق کے مالک، دیوبند کی چراگاہ سے نکلے ہوئے فریبی، دجل و کذب کے مالک، شور مچانے والے کفن چور، افیونی، شوریدہ سر۔“ (”الاعتصام“ لاہور، ۱۸ رنومبر ۱۹۵۵ء بحوالہ ”ایشیا“ لاہور)

ایک رکن جماعتِ اسلامی کی طرف سے یہ خطابات مولانا احمد علی صاحب کو صرف اس جرم کی پاداش میں ملے کہ انھوں نے مودودی صاحب کے غلط اجتہادات کے خلاف کیوں لب کشائی کی؟ اب اس روشنی میں اس جماعت کے دستور کی اس دفعہ کا مطالعہ کیجیے، جس میں لکھا ہے کہ ”پیغمبرِ اسلام علیہ السلام کے سوا کسی کو تنقید سے بالاتر نہ سمجھا جائے، کسی کی ذہنی غلامی میں مبتلا نہ ہو۔“ قول اور فعل کے اس تضاد کے لیے یہی کہنا موزوں ہوگا کہ ہاتھی کے دانت کھانے کے اور ہیں اور دکھانے کے اور۔ (داود راز)

اپنی کیفیت:

میں خود ابتداءً جماعت اور اس کے لٹریچر سے کسی قدر متاثر رہا اور شاید دیر تک متاثر رہتا، لیکن فنِ حدیث کے متعلق اساتذہ کی توجہات اور فیوض اور ائمہ حدیث کے گرامی قدر ارشادات سے جو مزاج بن چکا تھا، اس کی وجہ سے مولانا اور اُن کے رفقا کے اجتہادات طبیعت پر گراں گزرنے لگے۔ میں نے ہر چند کوشش کی کہ اس اساسی تعارض میں تطبیق یا ترجیح کی کوئی صورت پیدا ہو سکے، لیکن میری قدامت پسند طبیعت نے سازگاری کی ان مسائل سے بالکل انکار کر دیا۔ میں نے محسوس کیا کہ مداہنت کرنا مشکل ہوگا۔ ملک میں سیاسی کشمکش تھی، میں نے سوچا کہ "أهون البليتين" کے اصول پر کچھ وقت صبر اور خاموشی سے گزر جائے، پھر دیکھا جائے گا، لیکن اس نفاق آمیز مداہنت پر بھی طبیعت مطمئن نہ ہو سکی، کیوں کہ میری ناقص رائے میں یہ چور دروازے برداشت کے قابل نہ تھے۔ ایسے نظریات جنھیں اپنا لینے کے بعد احادیثِ نبویہ ہر مداری کی درایت اور ہر رائے پرست کے چشم و ابرو کی محتاج ہو کر رہ جائے، دیانت اسے قبول کرنے کے لیے آمادہ نہ ہو سکی۔ وحیِ الٰہی اذواق اور وجدانی عوامل کی تختۂ مشق بن جائے، میری دانست میں یہ جرم "تحاكم إلى الطاغوت" سے کسی طرح کم نہیں۔ ائمہ حدیث ائمہ کوفہ کی بعض علمی موشگافیوں کو سنت کی موجودگی میں پسند نہیں فرماتے تو وہ ان نیچر آمیز عقلیات کو کیوں کر گوارا کر سکتے ہیں؟ پھر یہ اندھے کی لاٹھی ایسے کم سواد ہاتھوں میں دے دی جائے، جن کے علم و بصیرت، فہم و فراست پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا، اس کا تو یہ مطلب ہوگا کہ حدیث کو ایک غیر مستند دستاویز تسلیم کر لیا جائے، جو منکرینِ حدیث کا اصل مقصد ہے۔

اعلانِ بیزاری:

میرے لیے یہ مشکل تھا کہ اس بدعت کو گوارا کروں، جس سے حدیث اور ائمہ حدیث کا احترام خطرے میں ہو اور جانتے ہوئے ایسی جدید اور بدعتی تحریکات کا ضمیمہ بننا گوارا کر لیا جائے۔ میرے بعض دوست اس وقت بھی جماعتِ اسلامی کے ساتھ تعاون کر رہے ہیں۔ میں تو اسے ضعفِ ایمان، مداہنت سمجھتا ہوں، اس لیے میں نے جماعتِ اسلامی اور اس کی قیادت سے ساری ہمدردیاں ختم کر دیں۔ والحمد لله رب العالمين.

جدت پسند حضرات سے:

ہمیں جب کوئی تکلیف ہو یا کوئی عمارت بنانی ہو تو ہم اچھے ڈاکٹر اور قابل انجینئر کی تلاش کرتے ہیں۔ پھر علاج کے معاملے میں انجینئر سے مشورے کی ضرورت نہیں سمجھتے اور نہ ہی عمارت کے متعلق ڈاکٹر سے دریافت کرنے کی ضرورت سمجھتے ہیں۔ ہر فن اور حرفت کے متعلق ماہرین کی طرف رجوع دانش مندی کا تقاضا تصور

کرتے ہیں، لیکن علومِ دینی اور دفاترِ سنت کا تذکرہ آجائے تو ہر اور اتیج پنشنر اور ناتراشیدہ جاہل قلم و دوات سنبھال کر تنقید کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ کبھی انھیں ''عجمی سازش'' کی خود ساختہ فکر دامن گیر ہوتی ہے، کبھی تدوین کا وقت ان کے فرضی توہمات کی بنیادوں پر انھیں ستانے لگتا ہے۔ کبھی اہلِ علم کے اوطان کی تلاش میں بچارے سرگرداں پھرنے لگتے ہیں۔ اگر یہ حضرات دماغوں میں ان علمی مشاغل کی اہلیت نہ رکھتے تو اور چند سال ملازمت کر لی ہوتی یا اچھا ہوتا کہ یہ حضراتِ کرام آرام فرماتے، اسلام کے بجائے اپنے عزیز و اقارب کو اپنے مفید مشوروں سے مستفید فرماتے۔

ہمارا صرف ایک مطالبہ ہے:

وہ یہ کہ فنِ حدیث کے خدام موجود ہیں، انھیں اپنے نہجِ مستقیم پر خدمت کا موقع دیجیے، جو اس کے اہل ہوں گے، وہ خود اس کی ذمے داری سنبھال لیں گے، جو اس کے اہل نہیں، وہ یہ دردسری خواہ مخواہ کیوں خرید تے ہیں ؎

پیش آنکس برد کہ خریدار تست

نہ آپ فن کو جانتے ہیں نہ فن آپ سے آشنا ہے، پھر سر پھوڑنے سے کیا فائدہ؟ ناقدین کی موجودہ کھیپ میں ایک شخص بھی ایسا نہیں ہے، جس نے باقاعدہ فنِ حدیث پڑھا ہو۔

ائمہ حدیث:

شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''وكذلك الذي عليه الجمهور أن العلم يختلف باختلاف حال المخبرين به، فرب عدد قليل أفاد خبرهم العلم بما يوجب صدقهم، وأضعافهم لا يفيد خبرهم العلم، ولهذا كان الصحيح أن خبر الواحد قد يفيد العلم إذا احتفت به قرائن تفيد العلم، وعلىٰ ذلك فكثير من متون الصحيحين متواتر اللفظ عند أهل العلم بالحديث، وإن لم يعرف غيرهم أنه متواتر، ولهذا كان أكثر متون الصحيحين مما يعلم علماء الحديث علماً قطعياً أن النبي ﷺ قاله، تارة لتواتره عندهم، وتارة لتلقي الأمة له بالقبول ... الخ'' (فتاویٰ ابن تیمیة: ۱/ ۴۰۹)

''جمہور علما کا خیال ہے کہ علم کے حالات مخبر کے لحاظ سے مختلف ہوتے ہیں۔ کبھی تھوڑے سے افراد کے صدق کی وجہ سے خبر میں علم و یقین نمایاں ہوتا ہے، کبھی کئی گنا افراد کی خبر سے علم اور یقین حاصل نہیں ہوتا، اس لیے جب خبرِ واحد قرائن سے بھرپور ہو، اس سے علم و یقین حاصل ہو جاتا ہے، اس

اصل کے مطابق صحیحین میں اکثر روایات لفظاً متواتر ہیں، لیکن اس کا فیصلہ صرف علماے حدیث کر سکتے ہیں، جو اس فن کے ماہر اور اکسپرٹ ہیں۔ غیروں کو اس کی کیا خبر؟ اسی طرح صحیحین کے بعض متون کے متعلق یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے۔ یہی یقین کبھی تواتر سے ہوتا ہے، کبھی امت کے قبولِ عام سے۔"

حاصل یہ ہے کہ ① خبر پر اعتماد مخبر کی صفات کی وجہ سے ہوتا ہے، اس لیے تعداد کے ساتھ صفات کا لحاظ ضروری ہے۔ ② صحیحین میں اکثر روایات لفظاً متواتر ہیں۔ ③ خبرِ واحد اگر قرائن موجود ہوں تو اس سے بھی یقینی علم حاصل ہوتا ہے۔ ④ صحیحین کے اکثر متون کے متعلق یہ کہنا بجا ہے کہ یہ آنحضرت ﷺ کے ارشادات ہیں۔ ⑤ لیکن یہ فیصلہ علمائے حدیث کا کام ہے، ہر بوالہوس کا یہ حق نہیں۔ ⑥ یہ اعتماد اور فیصلہ کبھی تواتر عددی سے ہوتا ہے، کبھی امت کی قبولیتِ عامہ سے، یہ ماہر اور اکسپرٹ علمائے فن کی رائے ہے۔ مسٹر پرویز، خلیفہ عبدالحکیم، مولانا اصلاحی، مولانا مودودی اگر اس پر مطمئن نہ ہوں تو وہ معذور ہیں، وہ فن سے آشنا نہیں ہیں۔

اس کے بعد شیخ الاسلام خبرِ واحد اور اس کی مختلف صورتوں کا ذکر اور قرائن کے تفصیلی تذکرے کے بعد فرماتے ہیں:

"وتارة يكون علم أحدهم لقرائن تحتف بالأخبار توجب لهم العلم، ومن علم ما علموه حصل له من العلم ما حصل لهم" اھ (فتاویٰ: ۱/ ۴۰۱)

"ان کا یہ علم قرائن کی وجہ سے ہوتا ہے، جو خبر میں پائے جاتے ہیں، جو اس علم کو جان لے گا، اُسے یقیناً وہ علم حاصل ہوگا، جو علماے حدیث کو ملا۔"

عقل وخرد کی دنیا میں فنون اور علوم میں فیصلے کا حق گنواروں کو نہیں دیا جا سکتا۔

حضرات علمائے ہند:

تقسیمِ ہند کے بعد ظاہراً تعلقات آپ حضرات سے ٹوٹ چکے ہیں، حجاز پہنچنا شاید آسان ہو، آپ کی زیارت مشکل ہے۔ مجھے مالیر کوٹلہ کی مسجد اہلِ حدیث کے سلسلے میں معلوم ہوا کہ ہمارے بعض رفقا جماعتِ اسلامی کی گرفت میں آ چکے ہیں اور مولانا محمد امین اثری کے توسط سے مسجد اور ملحقہ جائداد کا شکار کھیلا جا رہا ہے۔[1] وہاں کے احباب کی شکایت کے بعد میں نے مولانا عبدالوہاب صاحب آروی اور بعض دوسرے احباب کو لکھا اور ممکن کوشش کی کہ مالیر کوٹلہ کی جماعت اہلِ حدیث سے انصاف ہو اور اکابرِ ہند اس معاملے میں جرأت سے کام لیں، لیکن مجھے محسوس ہوا کہ "لا حياة لمن تنادي"۔ حضرت امام الہند مولانا ابو الکلام آزاد (ادام الله فيوضهٗ)

[1] مالیر کوٹلہ سے حال ہی میں اطلاع ملی ہے کہ جائداد پر جماعتِ اسلامی والے قابض ہیں۔ فوا أسفاً. [مولف]

کے سوا ہمارے اکابر سے کسی کو کلمہ حق کہنے کی توفیق میسر نہ ہوئی اور جماعتِ اسلامی نے بادعاے صلاحیت مولانا کے خلاف جتنا کیچڑ اُچھالا، ندامت سے میرا سرنگوں ہے۔"[1]

---

[1] فاضل محترم نے نزاع مالیر کوٹلہ کی بابت حضرت امام الہند مولانا ابو الکلام آزاد مدظلہ العالی کے ایک اہم ترین تاریخی فیصلے کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ ناظرین کرام کے استفادہ کے لیے ہم وہ فیصلہ اخبار "اہلِ حدیث" دہلی (مجریہ ۱۵؍ اکتوبر ۱۹۵۴ء) سے یہاں حرف بہ حرف نقل کر دیتے ہیں۔ امام الہند کا یہ فیصلہ جماعت اہلِ حدیث ہند کے لیے ایک اہم ترین درسِ حیات ہے، جس میں ہمارے لیے بہت سے اسباق پوشیدہ ہیں۔ یہی وہ تاریخی فیصلہ ہے، جس کی وجہ سے جماعتِ اسلامی کے نامہ نگاروں نے حضرت امام الہند کے خلاف بہت کچھ زہر اُگلا۔ اخبار "اہلِ حدیث" دہلی کے اداریے سمیت وہ تاریخی فیصلہ حسبِ ذیل ہے:

مالیر کوٹلہ کے ایک نزاعی معاملے میں

حضرت مولانا ابو الکلام صاحب آزاد کا اصولی فیصلہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جماعت اہلِ حدیث مالیر کوٹلہ میں کچھ عرصے سے ایک سخت نزاع پیدا ہوگیا ہے۔ نزاع نے اس قدر طول کھینچا کہ پولیس کو حفظِ امن کے لیے مداخلت کرنی پڑی اور بالآخر اصلاحِ حال اور رفعِ نزاع کے لیے معاملہ تین ثالثوں کے سپرد کیا گیا۔ جو حضرات ثالث مقرر ہوئے ہیں، انھوں نے معاملے کی تفصیلات سے مجھے مطلع کیا اور لکھا کہ جماعت کے دونوں فریق چاہتے ہیں کہ معاملہ آپ کے سامنے پیش کر دیا جائے۔ آپ جو فیصلہ کر دیں گے، اس کی بلا چوں و چرا تعمیل کی جائے گی۔ میں نے انھیں لکھا کہ دونوں فریق اپنا ایک ایک معتمد نمایندہ دہلی بھیج دیں، تاکہ دونوں فریقوں کا نقطۂ خیال مجھے معلوم ہو جائے، اس کے بعد جس نتیجے پر پہنچوں گا، لکھ کر بھیج دوں گا۔

چند دنوں کے بعد ثالثوں نے مجھے اطلاع دی کہ دونوں فریقوں نے اپنی اپنی انجمنوں کا باقاعدہ جلسہ کر کے دو نمایندے چن لیے ہیں۔ ایک فریق نے بابو محمد شفیع صاحب کو چنا ہے، دوسرے فریق نے ماسٹر کفایت اللہ کو۔

۲۲؍ اگست ۱۹۵۴ء کو دونوں صاحب دہلی آئے اور مجھ سے ملے۔ دونوں صاحب اپنا تحریری بیان لائے تھے، جو میں نے لے لیا، انھوں نے تفصیل کے ساتھ زبانی تقریریں کی، جو میں نے سن لیں۔ معاملے کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد میں جس نتیجے پر پہنچا ہوں، قلم بند کر کے بھیجے دیتا ہوں۔

بنائے نزاع:

نزاع جس معاملہ میں ہوا، وہ یہ ہے کہ مسجد اہلِ حدیث کا امام اور خطیب کیسا ہونا چاہیے اور موجودہ امام مولوی محمد امین صاحب مبارک پوری اس منصب پر قائم رہیں یا انھیں سبک دوش کر دیا جائے؟

مالیر کوٹلہ میں جماعت اہلِ حدیث کی ایک مسجد ہے، جس کا انتظام انجمن اہلِ حدیث کی نگرانی میں ہے۔ مسجد کی امامت و خطابت کے لیے انجمن نے یہ طے کیا تھا کہ اس منصب پر ایک ایسے اہلِ حدیث عالم کو مقرر کیا جائے، جو قرآن و حدیث کا درس دے سکے اور توحید و سنت کا مبلغ ہو۔ دو سال ہوئے مولوی محمد امین صاحب مالیر کوٹلہ آئے اور اس منصب پر مقرر کیے گئے۔ مولوی صاحب ←

ممدوح جماعتِ اسلامی سے تعلق رکھتے ہیں۔ انھوں نے اس منصب کو جماعتِ اسلامی کے افکار وعقائد کی تبلیغ واشاعت کا ذریعہ بنا لیا اور یہ صورتِ حال بتدریج یہاں تک بڑھی کہ ان کے وعظ و ہدایت اور عملی جدوجہد کا تمام تر مرکز جماعتِ اسلامی کی دعوت وتبلیغ ہوگئی۔ جماعتِ اسلامی کا مرکز قائم کیا گیا اور بیت المال بھی کھول دیا گیا۔

اس صورتِ حال کی وجہ سے جماعت اہلِ حدیث میں اختلاف رونما ہوا۔ ایک گروہ نے اُسے پسند نہیں کیا کہ مسجد کی امامت، جماعتِ اسلامی کی دعوت وتبلیغ کا آلۂ کار بنا دی جائے، اس کی رائے یہ ہوئی کہ امام مسجد کو صرف مسلک اہلِ حدیث کے افکار و مقاصد کا مبلغ ہونا چاہیے۔ وہ چاہتا ہے کہ مولوی محمد امین صاحب اس خدمت سے سبک دوش کر دیے جائیں۔ دوسرا گروہ مولوی صاحب کا حامی ہے، اُسے اس پر اصرار ہے کہ مولوی صاحب ممدوح امام رہیں۔

بالآخر یہ تفرقہ یہاں تک بڑھا کہ مسجد میں دو جماعتیں ہوگئیں۔ ایک جماعت مولوی محمد امین صاحب کے پیچھے نماز پڑھتی ہے۔ دوسری ایک دوسرے صاحب (مولوی عبداللہ صاحب) کے پیچھے۔ گذشتہ رمضان میں ایک نیا جھگڑا پیدا ہوگیا، یعنی یہ کہ مسجد میں پہلی جماعت کس فریق کی ہو؟ اس پر جذبات اس قدر تیز ہوگئے کہ تصادم اور نقضِ امن کا اندیشہ پیدا ہوگیا اور پولیس کو مداخلت کرنا پڑی۔ پولیس نے فریقین سے پینتیس افراد کو زیرِ دفعہ (۱۰۷/ ۱۵۱) گرفتار کر کے عدالت میں پیش کیا۔ عدالت نے ابتدائی پیشی کے بعد کارروائی ملتوی کر دی اور ثالث مقرر ہوئے، تاکہ اصلاحِ حال کی کوشش کی جائے۔

جو فریق موجودہ امام صاحب کا مخالف ہے، اس کی جانب سے محمد شفیع صاحب آئے تھے، جو فریق اُن کا حامی ہے، اس کی جانب سے ماسٹر کفایت اللہ صاحب آئے تھے۔

فیصلہ:

اس نزاع نے ایک اصولی سوال پیدا کر دیا ہے، جس کا ہمیں فیصلہ کرنا چاہیے۔ سوال یہ ہے کہ مسجد اہلِ حدیث کی امامت وخطابت کے منصب کو کسی دوسری مذہبی یا سیاسی تحریک کی دعوت وتبلیغ کا ذریعہ بنانا مناسب ہے یا نہیں اور جماعت اہلِ حدیث کے مقاصد کے پیشِ نظر ایسا کرنا درست ہوگا یا نہیں؟

معاملے کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد میں جس نتیجے پر پہنچا ہوں، وہ یہ ہے کہ ایسا کرنا درست نہیں ہوگا۔ اتنا ہی نہیں، بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ اگر اس بات کا دروازہ فوراً بند نہیں کر دیا گیا تو یہ بات جماعت اہلِ حدیث کے لیے آیندہ طرح طرح کی مشکلات و مفاسد کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ آج جماعتِ اسلامی کا سوال پیدا ہوا ہے، کل کوئی دوسرے امام صاحب آئیں گے اور مسجد کے منبر پر کسی دوسری سیاسی یا مذہبی تحریک کی دعوت وتبلیغ کا پلیٹ فارم بنا دیں گے۔ نتیجہ یہ نکلے گا کہ مسجد کی امامت وقت کی سیاسی یا مذہبی تحریکوں کا ایک بازیچہ بن کر رہ جائے گی اور جماعتِ اہلِ حدیث اپنے مسلک اور اصول کو محفوظ نہیں رکھ سکے گی۔

ملک میں جو سیاسی اور مذہبی تحریکیں چل رہی ہیں، لوگوں کو اختیار ہے کہ اگر چاہیں تو اس میں دلچسپی لیں، لیکن مسجد کی امامت وخطابت کو اس کا آلۂ کار بنانا کسی طرح بھی درست نہیں ہوسکتا۔ مسجد کا منبر صرف کتاب وسنت کی تبلیغ وتلقین کے لیے ہے، اسے دوسری تحریکوں کے دعایۃ (پروپیگنڈا) کا پلیٹ فارم نہیں بنانا چاہیے۔ اگر ایسا کیا گیا تو یہ جماعت کے لیے ایک خطرناک اقدام ہوگا۔

بابو محمد شفیع صاحب نے اپنے بیان میں یہ بات بھی لکھی ہے کہ جماعتِ اسلامی کے بعض افکار و آرا قابلِ اعتراض ہیں اور علما نے ان کا رَد کیا ہے۔ میں اس معاملے میں جانا ضروری نہیں سمجھتا۔ میرے سامنے معاملہ صرف اس شکل میں آیا ہے کہ

اہلِ کانفرنس کے آرگن ''ترجمان'' میں بعض اکابر نے ایک براءت نامہ شائع فرمایا، ممکن ہے حضرات علماے ہند اس سے مطمئن ہو گئے ہوں، مجھے تو تسکین نہیں ہوئی۔

حضرت مولانا عبیداللہ صاحب رحمانی کا گرامی نامہ اسی ضمن میں آیا، جس میں بڑی متانت آمیز تلخی تھی۔ میرے لیے خاموشی کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔

مخلصانہ گزارش:

میں مسلک کے معاملے میں دوستوں سے لڑنا چاہتا ہوں۔ اگر یہ حضرات پاکستان میں ہوتے یا مجھے وہاں اُن کے قدموں میں بیٹھنے کی سعادت حاصل ہوتی تو میں اُن کو بتاتا کہ آپ حضرات کی مصلحت اندیشی یا کنبہ پروری جماعت کو کس مصیبت میں مبتلا کر دے گی اور عنداللہ ان ملحدانہ نظریات کو گوارا کرنے کی آپ کون سی معذرت فرمائیں گے، مگر صورت یہ ہے کہ آپ وہاں ہیں، جہاں حاضری مشکل ہے۔ فعادت عواد بيننا وخطوب.

بقول حضرت مولانا عبیداللہ رحمانی ''اتنی دور سے کسی کے متعلق فیصلہ کرنا کہاں کی دیانتداری ہے؟''

یہ میری خاموشی کے لیے کافی تھا، لیکن علماے ہند کا فرض تو ختم نہیں ہو جاتا۔ ان کی ذمہ داری ہے کہ جماعت کو ان ملحدانہ نظریات سے بچائیں۔ مالیر کوٹلہ کی طرح مدرسہ جھنڈے نگر[1] سے اطلاع آئی۔ افسوس سے

← کیا اصولاً یہ بات مناسب ہوگی کہ مسجد کی امامت کے منصب کو کسی سیاسی یا مذہبی تحریک کی تبلیغ کا ذریعہ بنایا جائے؟ اگر ایسا کرنا اصولاً درست نہیں ہے تو پھر اس بحث میں پڑنے کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ جس تحریک کا سردست سوال پیدا ہوا ہے، وہ کیسی ہے اور اس کے افکار و آرا کیا ہیں؟ خواہ کچھ بھی ہوں، لیکن امامت کے منصب کو ان کا ذریعہ تبلیغ نہیں بنانا چاہیے۔

ماسٹر کفایت اللہ صاحب نے اپنے بیان میں اس بات پر زور دیا ہے کہ بابو محمد شفیع صاحب کی مخالفت محض جماعتِ اسلامی کی وجہ سے نہیں ہے، بلکہ بعض شخصی وجوہ کی بنا پر ہے اور اس سلسلے میں انھوں نے بعض واقعات بیان کیے ہیں۔

میں نے ان واقعات کی تحقیقات ضروری نہیں سمجھی، کیوں کہ سوال افراد کی مخالفت اور عدمِ مخالفت کا نہیں ہے، بلکہ اصل مسئلے کا ہے۔ فرض کر لیا جائے کہ محمد شفیع صاحب کسی ذاتی مخالفت کی بنا پر موجودہ امام صاحب کی مخالفت کر رہے ہیں، لیکن پھر بھی اصل سوال بدستور باقی رہتا ہے کہ مسجد کی امامت کو وقت کی تحریکات کا ذریعہ تبلیغ بنانا چاہیے یا نہیں؟

میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مولوی محمد امین صاحب کو اس خدمت سے سبکدوش کرنا چاہیے اور ان کی جگہ ایک ایسے اہلِ حدیث عالمِ دین کو مقرر کرنا چاہیے، جو اہلِ حدیث کے مسلک کے مطابق قرآن و حدیث کی تعلیم دے، توحید و سنت کی تبلیغ کرے اور وقت کی سیاسی اور مذہبی تحریکوں سے کوئی تعلق نہ رکھتا ہو۔ اگر فوراً کسی ایسے صاحب کا تقرر نہیں ہو سکتا تو سردست مولوی عبداللہ صاحب امامت کی خدمات انجام دیں، جب تک کہ کسی زیادہ اہل شخص کی خدمات حاصل ہو جائیں۔

آخر میں میں دونوں فریقوں سے درخواست کروں گا کہ جو کچھ ہو چکا ہے، اب اسے یک قلم فراموش کر دیں اور بحکم ﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ﴾ باہم دگر بغل گیر ہو کر از سر نو رشتۂ اخوت کو تازہ و استوار کریں۔

[1] مدرسہ جھنڈے نگر اب جماعت اہل حدیث ہی کے زیرِ انتظام ہے۔ فالحمد للہ (راز)

خاموش ہوگیا، لیکن اتنے اکابر کے ہوتے ہوئے یہ حوادث ہوجائیں، تعجب ہے۔

جماعت اسلامی کے صلحا سے گزارش ہے کہ اس قسم کے ہوشمندانہ یا عیارانہ ڈاکوؤں سے جماعت کے وقار میں اضافہ نہیں ہوگا، آپ بدنام ہوں گے، جیسے کہ آپ نے پاکستان میں ملاحظہ فرمایا، آپ کی قیمت روز بروز کم ہورہی ہے۔

تحریک جماعتِ اسلامی اور مسلک اہلِ حدیث:

پیشِ نظر مقالہ دیکھ کر طبیعت پھر متاثر ہوئی اور جنون میں بہت کچھ کہہ دیا، معلوم نہیں یہ گزارشات کہاں کہاں ناخوشگوار اثرات پیدا کریں گی۔ لیکن ﴿اِنۡ اُرِیۡدُ اِلَّا الۡاِصۡلَاحَ مَا اسۡتَطَعۡتُ وَ مَا تَوۡفِیۡقِیۡۤ اِلَّا بِاللّٰهِ﴾۔ آپ نوجوان ہیں، آپ کا قلم بحمد اللہ سیال ہے۔ زبان میں قوتِ گویائی موجود ہے، دونوں نعمتوں سے فائدہ اٹھائیے، سوتوں کو جگائیے، اللہ تعالیٰ آپ کی مساعی کو کامیاب فرمائے ؎

کنونت کہ چشم است اشکے ببار زباں دردہاں است عذر بے بیار

کنوں بایدت عذر تقصیر گفت نہ چو نفس ناطق ز گفتن بخفت

میں گزارش کروں گا کہ اصولِ حدیث اور ائمہ حدیث کے ارشادات کی روشنی میں آپ حضرات اسی نہج پر مزید مسلک اہلِ حدیث کو تفصیلاً شائع فرمائیں، مسلک اہلِ حدیث کی تائید اور جدید نظریات کے اغلاط کی نشاندہی فرمائیں۔ اس سے جماعت کے لٹریچر میں مزید اضافہ ہوگا۔ واللّٰه يعينكم علىٰ نوائبه.

کام شروع کرنے کے لیے۔ إن شاء اللّٰه۔ امید ہے اس مقالے سے حرکت پیدا ہوگی، اس کے بعد چند اور مخلص نوجوان بھی لکھنا شروع کریں، اصولِ حدیث اور شیخین کی تصنیفات میں اس طرح کا کافی مواد موجود ہے۔ یہ کام کے لیے ایک نیا میدان ہوگا۔ والسلام علی النبي وآله.

خویدمکم الذلیل

ابو الخیر الشہیر باسماعیل السلفی، گوجرانوالہ

۱۵/ذی الحجہ ۱۳۷۶ھ

پیش لفظ:

إضاحة الحق

[تالیف: مولانا عبدالحق قریشی ہاشمی، میانوالی]

الحمد لله رب العالمین، والصلاة والسلام علی رسوله خاتم النبیین.

مولانا مودودی نے اپنے مشن کا آغاز دستوری تحریک اور کانگرس کی مخالفت سے کیا۔ مولانا نے ملک میں اسلامی دستور کے نفاذ کے متعلق کافی لٹریچر شائع کیا، عوام چوں کہ موجودہ قیادت کی بے اصولی اور لادینیت سے متنفر تھے، اس لیے اس نوعیت کا لٹریچر ملک میں کافی مقبول ہوا اور بکا، اور اس قسم کے کاروبار میں کوئی حرج بھی معلوم نہیں ہوتا، جس سے دینی اور دنیاوی دونوں قسم کے فوائد ہوں۔ ان کی جماعت کے کئی اخبارات اور رسائل ملک میں اچھی تعداد میں شائع ہوئے اور ملک کی نفسیات سے کاروباری مفاد بھی حاصل کیا گیا۔ ہم خرما وہم ثواب کا یہی مطلب تھا۔

لیکن مولانا مودودی صاحب اور ان کے رفقائے کرام کو اس کاروباری کامیابی سے غلط فہمی ہوئی۔ ان حضرات نے محسوس فرمایا کہ شاید اسلام اور فنونِ اسلامیہ کی تعمیر میں بھی ان کے تصورات اسی طرح مقبول ہوں گے، جس طرح اِن کے سیاسی نظریات، حالاں کہ سیاسی نظریات کی مقبولیت کی بنیاد اِن کے نظریات اور ان کے متعلق مولانا کے دلائل کی صحت پر نہیں تھی، بلکہ اربابِ اقتدار کی پے بہ پے غلطیاں اور روز مرہ کی بے عنوانیاں تھیں، ورنہ مولانا کے سیاسی افکار بھی بہت حد تک قابلِ بحث ہیں، بلکہ کافی حد تک غلط۔ یہ ایک انسانی کمزوری ہے کہ وہ اس قسم کی جزوی اور وقتی کامیابیوں کو اپنی ہمہ دانی کی دلیل سمجھنے لگتا ہے۔ یہی حال اسلامی جماعت کا ہے۔ وہ اس وقتی اور جزوی قبولیت کو مولانا کی ہمہ دانی کی دلیل سمجھتی اور اُن کی غلط صحیح بات کو نص کا مرتبہ دے کر اس کی تائید میں میدان کارزار بپا کر دیتی ہے، تنقید کرنے والوں کو بدنام کرتے ہیں، اپنی مجالس میں ان پر پھبتیاں کستے ہیں اور پوری قادیانی تکنیک سے اپنے مخالف کو کم علم، ذلیل اور پامال ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اصل مسئلے پر قطعاً سوچنے کی کوشش نہیں کرتے۔

فرقہ:

آج سے چند سال پہلے یہ خیال پیدا ہوتا تھا کہ یہ جماعت جس راہ پر جا رہی ہے، فرقہ بن کر رہ جائے

گی، چناں چہ آج جماعتِ اسلامی کی قیادت اور عوام کے طریقِ عمل نے اس کو فرقہ بنا دیا ہے۔ وہ (جماعت اسلامی کے کارندے) رسائل بغلوں میں دبائے ہوئے ایسی محفلوں کی تلاش میں پھرتے ہیں، جہاں وہ اگر مولانا مودودی کی مدح سرائی نہ کر سکیں تو کم از کم ان کے مخالفین کو گالیاں دے کر دل کی بھڑاس نکال سکیں۔ اس مقصد کے لیے جھوٹ، کھلی بددیانتی سے بھی پرہیز نہیں کرتے۔ آج کل ان حضرات کا حال بالکل ملک کی دوسری باطل پرست جماعتوں کا سا ہے۔ وہ مولانا کی حمایت اور اِن کے مخالفین کی تنقیص میں ہر شنیع سے شنیع حرکت کر سکتے ہیں، جھوٹ بولتے ہیں اور ذرہ ندامت محسوس نہیں فرماتے۔

حدیث اور اصولِ حدیث کے متعلق مولانا کے نظریات کا یہ حال ہے کہ وہ ائمہ سنت کے نقطۂ نظر سے قطعاً غلط ہیں۔ اہلِ سنت کا کوئی مکتبِ فکر ان نظریات کی تائید نہیں کرتا۔ ان کے اکثر نظریات خود ساختہ ہیں، مگر جماعت اندھا دھند اُن کی تقلید کر رہی ہے اور بدحواسی سے ان کی تائید کر رہی ہے۔ علما نے ہر طرح ان کو توجہ دلائی، مگر بظاہر اصلاح کی کوئی امید معلوم نہیں ہوتی۔

علما کے مکاتیب:

آپ حضرات علما کے مکاتیب شائع فرما رہے ہیں۔ ان حضرات نے اپنے اپنے نقطۂ نگاہ سے بہتر خدمات انجام دی ہیں۔ وہ خود اپنی افادیت کے شاہد ہیں۔ عامۃ المسلمین کا فرض ہے کہ اس پمفلٹ کو پڑھیں۔ اپنے احباب کو پڑھائیں اور حدیث کے متعلق عوام کو غلط عقیدے سے بچائیں۔

حضرت مولانا مودودی اگر اپنے فیوض سیاسیات اور دستوری مسائل تک محدود فرما لیتے تو اُن کا احسان ہوتا۔ یہ خلفشار پیدا نہ ہوتا جو جابجا نمایاں ہو رہا ہے اور نیز ان کی جماعت اس کبر و غرور سے محفوظ ہو جاتی، جس میں ان کی اکثریت مبتلا ہو رہی ہے۔

محمد اسماعیل، گوجرانوالہ

جامع مسجد اہلِ حدیث

۱۸ رمئی ۱۹۵۷ء

تقریظ:

ناقابل مصنف مرزا

(تالیف: شیخ الاسلام مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمہ اللہ)

پیشِ نظر رسالے میں مرزا صاحب کی سخاوتِ استدلال کا تذکرہ ہے۔ اس تالیف میں حضرت مولانا ثناء اللہ صاحب کی نگاہِ تنقید مرزا صاحب کی مایہ ناز کتب براہین احمدیہ، سرمہ چشم آریہ اور چشمہ معرفت پر ہے۔ کتاب میں موضوع کی سنجیدگی اور رسوخِ استدلال اس حد تک ہے کہ احمدی تصانیف اور مصنفین قطعاً اس شرف کے مستحق نہیں اور احمدیت کا مزاج اس شرفِ تخاطب اور تکلم سے بالکل نا آشنا ہے۔

دعا ہے کہ حضرت مولانا کو عمرِ نوح عطا ہو، تاکہ ملت ان سے دیر تک مستفید ہو سکے۔ کتاب کا انداز علمی ہے۔ اہلِ علم اس سے حظ اٹھائیں گے۔[1]

محمد اسماعیل

مدرس: مدرسہ محمدیہ وخطیب مسجد اہلِ حدیث، گوجرانوالہ

---

[1] ہفت روزہ ''اہلِ حدیث'' امرتسر (۲۴ر ستمبر ۱۹۴۳ء)

تقدمہ:

فسانۂ قادیان

(تالیف: حافظ محمد ابراہیم کمیر پوری۔ ۱۹۵۰ء)

الحمد للّٰہ وکفیٰ، وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ.

تیرھویں صدی کے اواخر میں اہلِ توحید اس فکر میں تھے کہ انگریز کے تسلط کی گرفت کو جس قدر جلد ممکن ہو، ڈھیلا کر دیا جائے، علمائے حق کی پوری توجہ اسی طرف لگ رہی تھی۔ اس وقت ظاہری بغاوت اور مسلح انقلاب کی کوششیں بظاہر ناکام ہو چکی تھیں۔ انگریز ۱۸۵۷ء میں جو انتقامی مظاہرہ کر چکا تھا، اس کی خواہش تھی اسے برداشت کر لیا جائے یا کم از کم ملک اسے بھول جائے۔

تحریک اہلِ حدیث کا یہ مقصد تھا کہ اگر انگریز بدل نہ سکے تو اسے ہمیشہ کے لیے بے چین ضرور کیا جائے۔ اس مقصد کے لیے تقسیم کار کے طور پر ایک گروہ نے بنگال پنجاب اور یو پی، سی پی کے بعض اطراف سے ہجرت کر کے سوات بنیر کے اطراف میں علاقہ آزاد کو اپنے قیام گاہ کے لیے انتخاب فرمایا اور یہی ان کی کوششوں کا مرکز قرار پایا۔ ان لوگوں کو پورے متحدہ ہندوستان سے امداد پہنچتی تھی۔ ہزاروں روپیا اس کشت زار کی آبیاری میں صرف ہوتا اور یہ سرحدی چوکیوں پر مسلح یورشیں کرتے، تاکہ انگریز پریشان رہے۔ چناں چہ انھوں نے حسبِ طاقت اسے پریشان رکھا۔

کچھ لوگ یہی کام انڈر گراؤنڈ کرتے تھے۔ ان لوگوں کی مدد کرتے، روپیا جمع کرتے اور بیرونی مراکز کو بھیجتے۔ ڈاکٹر ہنٹر نے ان جماعتوں کو افسانوی صورت دینے کے لیے بڑی مبالغہ آمیزی سے کام لیا ہے، تاکہ پٹنہ اور انبالہ کے وہابی مقدمات کے لیے زمین تیار کرے اور دنیا کی نظروں میں خاک جھونک سکے۔ انڈمان، پھانسی اور عمر قید کی سزاؤں کو حق بجانب ثابت کر سکے۔ ان واقعات کو مبالغہ آمیز سمجھنے کے باوجود اس تحریک، اس کے طریقِ عمل، ان کے پروگرام میں ایک جان تھی۔ وہ اشتہارات اور صرف پروپیگنڈا کا پروگرام نہ تھا، اور حسرت ہے کہ آج جماعت ہر عمل سے محروم ہے غیر الجدل والحسد.

چناں چہ ان اعمال کی پاداش کے لیے انگریز نے پر تولنے شروع کیے اور معمولی وقفوں کے بعد انبالہ کیس،

پٹنہ کیس، قاضی کوٹ بم کیس شروع کرائے۔ بے گناہوں کو عبور دریائے شور، پھانسی اور عمر قید کی سزائیں دے کر اپنی قوم کی تاریخ کو سیاہ کیا اور شاید اپنی معصیتوں کی پاداش میں اپنے وقار کی لاش پر اب مرثیہ خوان ہیں۔ مظلوم شہید کے خون سے سرخ رخسار سے اپنی نو آبادیوں کو چھوڑ کر آبدیدہ آنکھوں کے ساتھ انگلستان کی بے آب و گیا سرزمین میں سمٹ رہے ہیں۔ توقع ہے کہ قدرت کے منتقم ہاتھ اسرائیل کو فلسطین میں اور آل ٹام کو اپنے مختصر جزیرے میں سمیٹنے کے بعد عبرت کی موت دے کر ظالموں کے لیے ایک نشان قائم فرمائیں گے۔

قادیانی تحریک اور قدرت کی ستم ظریفی:

یہ ناخوشگوار حالات تھے کہ انگریز کی خوش قسمتی نے ایک نئی تحریک کو جنم دیا، جو اہلِ توحید کی مشکلات میں مزید اضافے کا موجب بنا، ان حالات میں مرزا غلام احمد اور اُن کی قادیانی تحریک ظاہر ہوئی۔ مرزا صاحب اور ان کے رفقا، حق گوئی کی جو سزا حکومت کی طرف سے مجاہدین اور موحدینِ ہند کو دی گئی تھی، اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے۔ انھوں نے پوری احتیاط سے اس راہ کو چھوڑ دیا، انھوں نے انگریزی حکومت کی وفاداری کو جزِ ایمان قرار دیا، فریضہ جہاد کا انکار کیا، ضرورتِ ہجرت کو ختم کر دیا۔ انگریز کی مملکت ان کی نظر میں قریباً ایک اسلامی حکومت تھی، جس کے خلاف بغاوت گناہ اور اس سے قتال عند اللہ معصیت۔ ایک تھرڈ کلاس فوجی خاندان اور گھٹیا قسم کا زمین دار گھرانہ جسے کل سات سو روپے سالانہ وظیفہ ملتا تھا اور اس میں بھی کئی کنبے حصے دار تھے، اپنی ساکھ کو قائم رکھنے کے لیے اس سے زیادہ کر ہی کیا سکتا تھا۔

قلتِ علم اور اس کے ساتھ غربت اور زندگی کی مشکلات کا غیرت مندی سے کیا حل ہو سکتا تھا؟ حالات کی ناسازگاری اس سے بھی واضح تھی کہ منشی غلام احمد صاحب کے والد بزرگ وار مرزا غلام مرتضیٰ کا بٹالہ میں معمولی سا مطب تھا، خود مرزا صاحب نہ ذہین تھے نہ محنتی، اس کی شہادت ان کی تصانیف اور اُن کی زندگی کے تعلیمی زمانے سے ملتی ہے۔ بیچارے محنت سے جی چراتے رہے اور مختاری جیسا معمولی امتحان دیا۔ اُن کے دوست لالہ بھیم سین کامیاب ہوئے اور مرزا جی ناکام ہو گئے۔

ایسا جامع صفات انسان اس سے زیادہ کر ہی کیا سکتا تھا کہ حکومت کی خوشامد کرے، مسلمانوں میں خلفشار پیدا کرے، حکومت کی مخالفت سے روکے اور مسلمانوں کی قوتِ جہاد کو ختم کرے اور اپنی لیڈری کی دکان چمکائے؟!

مرزا صاحب کا لہجہ:

ایک پیغمبر کا لہجہ ملاحظہ فرمائیے:

”میری عمر کا اکثر حصہ سلطنت انگریزی کی وفاداری میں گزرا ہے اور میں نے مخالفتِ جہاد اور انگریزی

اطاعت کے بارے میں اس قدر کتابیں لکھی ہیں اور اشتہارات شائع کیے ہیں، اگر وہ رسائل اور کتابیں اکٹھی کی جائیں تو پچاس الماریاں ان سے بھر سکتی ہیں۔'' (تریاق القلوب: ص: ۱۵۔ ۲۷)

اس انداز سے واضح ہوتا ہے کہ یہاں نبوت کا سوال نہیں، سوال تھا اس اقتدار کے حصول کا جو مرزا صاحب کے بزرگ غلط روی اور کم علمی سے کھو چکے تھے، جس کے لیے ان کے بزرگ مسلمانوں کے خلاف سکھوں کی امداد کرتے رہے۔ انگریزوں کی اطاعت کا وعظ کہتے ہوں۔ مبالغہ آمیزی ملاحظہ ہو کہ اگر مرزا صاحب کا تمام چھوٹا موٹا لٹریچر جمع کر لیا جائے تو یہ اساطیر الکذب ایک الماری بھی نہیں بن سکتی، جن کو پچاس الماریاں کہا جا رہا ہے۔ (الحذر)

مرزا صاحب اور ان کی جماعت کا طریقِ کار:

اس مقصد (ثروۃ زائلہ) کی تحصیل کے لیے مرزا صاحب نے مختلف طریق اختیار فرمائے:

1. حکومت کی خدمت جس طرح ممکن ہو۔ آزادی پسند افراد اور جماعتوں کی مقدور بھر مخالفت، فریضہ جہاد کی مخالفت، تاکہ ملی زندگی کا خاتمہ ہو۔ بیرونی ممالک میں تبلیغی مشن بھیجنا، تاکہ انگریز کی جاسوسی کی خدمت سر انجام دیں اور اپنے عزیز و اقارب پبلک کے خرچ پر ہائی تعلیم حاصل کر سکیں۔
2. عامۃ المسلمین کے عقائد کی تخریب، نبوت کی اہمیت اور اس کے وقار کا استخفاف، تاکہ وہ قادیانی مزخرفات کو قبول کر سکیں، چناں چہ انگریز نے ان کی ہند اور بیرونِ ہند میں پوری مدد کی۔ پشاور کی سرحد کو عبور کرنے پر جو سہولت ایک احمدی کو حاصل تھی، وہ کسی غیر مسلم کو بھی حاصل نہ تھی، اور جو مشکلات ایک اہلِ حدیث کو تھیں، وہ شاید کسی انگریز کے مخالف کو نہ ہوں۔ (ملاحظہ ہو: بیان مولوی ولی محمد صاحب مشمولہ قاضی کوٹ بم کیس)
3. مسلمان کو آپس میں لڑاتے رہنا، تاکہ قوت باہم صرف ہوتی رہے اور انگریز آرام سے حکومت کرے۔ اسی طرح دوسرے فرقوں سے الجھتے رہنا، تاکہ ملک میں سکون قائم نہ ہو۔ اس معاملے میں پنڈت دیانند جی اور ساجی تحریک نے بھی انگریز کی کافی خدمت کی۔ آپ ساجی تحریک اور قادیانی حرکت کو اس معاملے میں ہمنوا پائیں گے۔ گرجے کہیں اور برسے کہیں۔ شست کسی جگہ باندی اور نشانہ کہیں ہو گیا۔ ساجی ہمیشہ مسلمانوں کے مقابلے اور تردید کا اعلان کرتے اور شکار، سناتنیوں کا ہوتا۔ قادیانی مقابلہ ساجیوں عیسائیوں سے ٹھانتے اور شکار بیچارے مسلمان ہوتے۔

مدت ہوئی ایک دفعہ کسی صاحب لارڈ ہیڈلے کو یہاں کو بکو پھرایا گیا۔ واپسی کے بعد وہ بچارے ایسے چپ ہوئے کہ اُن کی کسی سرگرمی کا ذکر نہ مرزائی اخبارات نے کیا اور نہ ہی ولایت میں اس کا چرچا ہوا، وہ بچارے سمجھ گئے ہوں گے کہ مجھے استعمال کیا گیا ہے۔ اس کے بعد بھی ایک دو بچارے بھوکے اور قلاش احمدی لارڈوں کا

ذکر آیا، مگر پھر وہ سو گئے۔ اُن کی مثال مداری کے ڈورو کی تھی، مجمع اس کی آواز سے جمع ہوا، پیسے مداری کی تھیلی نے سمیٹ لیے۔

علما کا طریقِ کار:

اس وقت اصل مشکل یہ رہی کہ ہمارا یورپ زدہ طبقہ مصیبت بنا رہا ہے اور ہے، وہ ان حقائق سے ناآشنا رہا۔ کبھی اپنی سادگی کی وجہ سے لڑھکتا رہا اور کبھی نوکری کے طمع سے اپنی وسعتِ ظرف کا اظہار کرتا رہا اور کبھی کسی رنڈوے نے مشکل ڈال دی، اسے اس وسعتِ ظرف کے سوا بیوی میسر نہیں آتی۔ علما بیچارے ختمِ نبوت، امکانِ نبوت، اجرائے نبوت وغیرہ مسائل پر بحث کرتے رہے اور یہاں اصل مشکل ہی دوسری تھی۔

۱۹۴۷ء سے پہلے علما نے اپنی ذمے داریوں کا اپنی توفیق کے مطابق احساس فرمایا۔ قرآن و حدیث سے عقائد اور مسائل کی وضاحت میں جو کچھ کہہ سکتے تھے، کہتے رہے۔ اس معاملے میں علمائے اہلِ حدیث سب سے پیش پیش تھے۔ مرزا صاحب خود فرماتے ہیں کہ موحدین اول المکفرین ہیں اور مقلدین ان کے اُتباع سے ہیں۔
(نشان آسمانی، ص: ۱۹۰)

ہزاروں آدمی ان کی کوششوں سے اس فتنے کی گرفت سے محفوظ رہے، لیکن انگریز کی مصالح اور ہماری تعلیم یافتہ طبقے کی دماغی بے اعتدالی کا ان کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ ان کے ہاں ہر دلیل کا پہلا مقدمہ یہ ہے کہ مستدل کوٹ پینٹ پہنے کھڑے ہو کر پیشاب کرے، تاکہ اس کی وسعتِ ظرف ثابت ہو یا کم از کم اس کی ڈاڑھی منڈھی ہو یا فاحش طور پر کٹی ہوئی ہو۔ دلیل کا یہ مقدمہ علما میں واقعی ناپید تھا۔

۱۹۴۷ء کے بعد:

خیال تھا کہ انگریزی مصالح کی مشکل ختم ہو جائے گی۔ اب احمدی جماعت کی حیثیت دوسری ملکی جماعتوں کی طرح ہوگی اور دستِ غیب کی غائبانہ برکتیں اب نہیں ہوں گی۔ مگر بدقسمتی ملاحظہ فرمائیے، پوری وزارت خارجہ اہلِ قادیان کی غلام ہوگئی۔ سر ظفر اللہ صاحب کا یہ حال ہے کہ وہ ہمارے وکیل ہیں، جہاں انھیں اس لیے وکیل کیا کہ تقسیم نہ ہو، وہاں ہوگئی اور جہاں انھیں تقسیم کے لیے وکیل کیا، وہاں وہ یوں ناکام رہے۔ تاہم وہ ہمارے مستقل وکیل ہیں!!

ان کی وجہ سے قادیانیوں کو بے حد فائدہ ہوا۔ ربوہ کے سودے میں وہی دلال رہے۔ کشمیر کی فوجوں میں قادیانیت ان کی وجہ سے غالب رہی اور ہو رہی ہے۔ سروس میں قادیانیت انھیں کے دم سے زندہ ہے اور ہمارا یورپ زدہ طبقہ روز بروز نوکریوں کے لیے ان سے متاثر ہو رہا ہے۔ (انا للہ) بہر حال انقلاب ۴۷ء کے بعد اس

حصے کی ذمے داری حکومت پر ہے۔

تخریبِ عقائد اور قادیانی لٹریچر کی تخریبی اثرات کے اظہار کا جہاں تک تعلق ہے، علما نہ اس سے پہلے بے خبر تھے نہ اب بے خبر ہیں۔ وہ اپنا فرض ادا کر رہے ہیں۔

پیشِ نظر کتاب عزیزی مولوی ابراہیم صاحب کمیر پوری نے لکھی ہے۔ حضرت مولانا ثناء اللہ رحمہ اللہ کے انتقال سے جو خلا پیدا ہوا ہے، وہ تو شاید ہی پُر ہو سکے، لیکن امید ہے مولوی ابراہیم صاحب اور بعض دوسرے نوجوان قادیانی شر انگیزیوں کا مداوا کر سکیں اور عامۃ المسلمین ان کے شر سے محفوظ ہو جائیں۔

قادیانی حضرات:

پاکستان کے موجودہ حالات میں اُمید تھی کہ قادیانی حضرات پرانی فتنہ انگیزیوں سے بچنے کی کوشش کریں گے اور ملک کے حالات پر رحم فرمائیں گے۔ ان کا مربی جا چکا، انگریز کی نا صرف رحمتیں ختم ہو چکیں، بلکہ اس کی اہلیتیں بھی ختم ہو چکیں۔ مگر قادیانی حضرات سے یہ امید بارآور ہوتی معلوم نہیں ہوتی۔ مرزا محمود اب کسی مختصر حکومت یا کم از کم ایک سٹیٹ کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ ولا يحيق المكر السيئ إلا بأهله.

پیشِ نظر کتاب ”فسانۂ قادیان“ امید ہے کہ اپنے موضوع میں کامیاب ہوگی۔ عزیزی مولوی ابراہیم صاحب کا نام اس کامیابی کا ضامن ہے۔

الراقم

محمد اسماعیل، گوجرانوالہ

(ناظم: جمعیت اہلِ حدیث پاکستان)

مکتوب:

خلافتِ رشید ابن رشید

(تالیف: ابو یزید محمد دین بٹ)

محترم ومکرم بٹ صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مکتوب گرامی ملا۔ یزید کی تکفیر اور اس پر لعنت کو ہر متین آدمی ناپسند کرتا ہے، لیکن زندگی کے تاریخی حوادث جن کی تاریخ میں صراحت موجود ہے، ان کا انکار یا اقرار دلیل کا محتاج ہے۔ واقعات ثابت ہوجانے کے باوجود اللہ تعالیٰ کی رحمت کو کون روک سکتا ہے؟

امام سیوطی نے ابو محمد عبداللہ بن زید مالکی [۲۸۹ھ] کا قول نقل فرمایا ہے:

"رحم الله بني أمية لم يكن فيهم قط خليفة ابتدع في الإسلام بدعة، وكان أكثر عمالهم وأصحاب ولا يتهم العرب" اهـ. (صون المنطق والكلام)

"اللہ تعالیٰ بنی امیہ پر رحم فرمائے، ان کے کسی خلیفہ نے اسلام میں کوئی بدعت نہیں کی، ان کے اکثر عمال عرب تھے۔"

والسلام

محمد اسماعیل، گوجرانوالہ

پیش لفظ:

إثبات التوحید بإبطال التثلیث

(تالیف: حضرت العلام حافظ محمد محدث گوندلوی رحمہ اللہ)

الحمد لله رب العالمين، والصلاة والسلام علىٰ رسوله محمد وآله وأصحابه أجمعين.

پادری عبدالحق کی کتاب کو شائع ہوئے بہت دن ہوئے۔ بعض اہلِ علم نے اس کا جواب مختصر اور عام فہم لکھا۔ پادری صاحب کی وہ کتاب اگر ان اصطلاحات سے خالی ہو جائے، جو پادری صاحب نے برمحل اور بے محل استعمال کی ہیں تو اس کی حقیقت اور قوتِ استدلال کی انتہا سب آشکارا ہو جاتی ہے اور اس کی وہ عزت جو سادہ لوح یورپین مبلغین یا عوام مشنری اعضا کی نظر میں ہے، واضح ہو جاتی ہے۔

''اثبات التثلیث'' نام رکھنے کے بعد اس کی حقیقت صرف اسی قدر ہے کہ مسلمانوں کے لیے از خود ایک عقیدہ تجویز کر کے اس پر اپنے فہم کے موافق چند اعتراضات کر دیے ہیں، اور پادری صاحب کرتے بھی کیا؟ تثلیث کوئی ایسی چیز نہیں کہ جس پر ایک صحیح الفطرت علی وجہ البصیرت غور کر سکے، چہ جائے کہ اسے دلائل سے ثابت کیا جائے، بہر حال اس قسم کی کتابوں کی اشاعت ایک گونہ مفید ضرور ہے۔ ان کے زاویہ نگاہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ حقیقت اور صحیح چیز وہی ہے، جسے ریگستان کے ایک امی بادیہ نشین نے پیش کیا ہے، جسے صحفِ سابقہ میں ''فارقلیط'' کے لقب سے پکارا گیا۔ اللهم صل وسلم عليه وعلىٰ آله وصحبه أجمعين.

بلاشبہہ دنیا کے لیے وہی دعوت مشعلِ ہدایت ہے، جس نے اپنی برقی قوت سے نہ صرف دنیا کو غیر اللہ کی غلامی سے آزاد کر دیا اور نہ ہی صرف اوہامِ باطلہ کے خس و خاشاک کو نذر صرصر کیا، بلکہ ایک قلیل مدت میں اس نے ایک اتنی بڑی آسمانی حکومت قائم فرمائی، جس نے قیصر و کسریٰ کی آنکھوں کو چندھا دیا۔ بڑی بڑی عالمگیر حکومتوں کو اس طرح نذرِ خاک کیا کہ وہ آج تک صفحہ ہستی سے ناپید ہیں۔

اسی لیے آج کل ایسی توحید کے خاکے اڑا کر صرف قوتِ الفاظ کے بل بوتے پر عوام کے سامنے پیش کیا جاتا ہے کہ شاید توحید کے ظرف میں تثلیث جیسا مظروف گنجایش پا جائے، لیکن دوربین نگاہیں اسے تاڑتی ہیں،

یہ کس کی نقل کی جا رہی ہے اور عوام کو ذات اور صفات کی اُلجھنوں میں پھنسا کر کس پتھر کو کلیسا میں رکھنے کی سعی ناتمام کے لیے اس قدر مال اور وقت خرچ کیا جا رہا ہے۔ سچ ہے ع

منکرِ مے بودن و ہم رنگ مستان زیستن

کتاب حقیقت میں چاہے کیسی ہی ہو، مگر عوام پر (جو وقتی نظامِ تعلیم میں گرفتار ہو کر اپنی مذہبی زبان سے نابلد ہیں) اس کا کچھ غلط صحیح اثر تھا، بلکہ بعض مشنری دوستوں کو میں نے کہتے سنا کہ مسلمان اسے سمجھ بھی نہیں سکتے ؎

بت کریں آرزو خدائی کی ہے یہ شان تیری کبریائی کی

ان حالات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے میں نے بمعیت بعض احباب محترم حضرت شیخ صاحب العلم والفراسۃ، ذوالذکاء والدراسہ، زعیم العلم والہدیٰ، قرین الزہد والتقیٰ جناب حافظ محمد صاحب (مدرس مدرسہ محمدیہ، گوجرانوالہ) سے عرض کی کہ وہ اس کے متعلق کچھ لکھیں، جس سے مقصد صرف چند امور تھے۔ ایک تو ان دوستوں کی اصلاح، جو اپنی کم علمی کو دوسرے کے علم کی دلیل سمجھتے ہیں۔ دوسرا اس قرض کی مع الزیادۃ واپسی کی امید، جو کئی دنوں سے عیسائی مشنریوں کے ہاتھوں بصد استحقار عبدالحق کی صورت میں استعمال ہو رہا ہے۔ تیسرا رحمتِ خداوندی کی امید کہ شاید ہم ایسے عصیان پیشہ اسی کی بدولت آسمانی حکومت سے مستحقِ عفو ہو جائیں۔

ما لي إليك وسيلة إلا الرجاء وجميل عفوك ثم إني مسلم

بالآخر موصوف محترم نے ہماری اس التجا کو منظور فرما کر عیدِ اضحیٰ کی رخصتوں میں کل تین دن میں اس قصے کو ختم فرما دیا۔ اب طباعت کی فکر دامنگیر ہوئی۔ کامل دو ماہ اپنی مفلسی کے نوحے میں گزرے۔ راتوں ع ''کریماں را بدست اندر درم نیست'' کا وظیفہ وردِ زبان رہا۔ بالآخر فیصلہ ہوا کہ مسودہ کاتب کے سپرد کیا جائے۔ اگر اُجرت میسر نہ ہوئی تو غنیمت بے بضاعتی جو آج کل مسلمانوں کا متاعِ حیات ہے، مع ہدیہ جزاک اللہ ان کی خدمت مبارک میں ہی پیش کر دیا جائے گا۔ آخر اس جنسِ عام سے وہ کیوں پرہیز کریں گے؟

عیسائی مشنریوں کا مقابلہ اور یہ بے بضاعتی اور اس پر یہ حوصلہ، سچ ہے ع

لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

مسودہ سپرد کرنے کے بعد کاتب صاحب نے اپنے ابن آدم ہونے کا ثبوت چند گھڑیوں میں یوں دیا کہ اسی وقت مسودہ گم کر کے فوراً اطلاع دی ؎

قسمت کی بات دیکھیے کہ ہے ٹوٹی کہاں کمند دو چار ہاتھ جب کہ لبِ بام رہ گیا

میں تو اس واقعہ کے بعد بالکل مایوس ہو گیا۔ اتنے بہترین آدمی کی تحریر اور اس قدر ضروری اور مفید، اور

پھر اتنے توقف کے بعد بایں بے بضاعتی اس کا یہ حشر ہے

رَضِينَا قِسْمَةَ الْجَبَّارِ فِينَا لَنَا عِلْمٌ وَلِلْجُهَّالِ مَالُ
فَإِنَّ الْمَالَ يَفْنٰى عَنْ قَرِيْبٍ وَإِنَّ الْعِلْمَ يَبْقٰى لَا يَزَالُ

مگر محترمی حافظ صاحب کے حافظے اور حوصلے پر مجھے تعجب ہوا کہ انھوں نے ایک دو دن کے متاسفانہ توقف کے بعد مسودہ پھر مکمل کر ڈالا، جو اس وقت پیشِ نظر ہے۔ علی الله أجره وعنده ذخره.

اگر رب العزت کی توفیق شاملِ حال رہی تو اس مسودے کی اشاعت کے بعد خیال ہے کہ پادری عبدالحق اور مسٹر پال کی مکمل تحریروں کا جواب شائع کر دیا جائے، چناں چہ مسٹر پال کی ''انسان کامل'' کا جواب اس وقت پیشِ نظر ہے۔ اللهم أخلص نياتنا، وزيننا بنور الإيمان، ووفقنا لما تحب وترضىٰ، فكلنا راجع إليك.

نوٹ: بعض جگہ رسالہ عمداً مغلق رکھا گیا ہے۔ غالباً ابتدائی حصہ عوام اور خواص سب کے لیے مفید ہوگا اور آخری حصہ کسی قدر مغلق ہوگا۔ کسی آیندہ اڈیشن میں اُمید ہے کہ آسان ہو جائے گا۔

اسماعیل محمدی، کان اللہ لہ [1]

---

[1] شیخ الحدیث مولانا سلفی رحمہ اللہ ابتدائی دور میں ''سلفی'' کے بجائے اپنے نام کے ساتھ ''محمدی'' کا لاحقہ لکھا کرتے تھے، جیسا کہ ان کی بعض ملکیتی کتب اور مکاتیب پر ان کے ہاتھ سے لکھے ہوئے اپنے نام کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے۔ ان کا یہ کتب خانہ جامع مسجد مکرم اہلِ حدیث ماڈل ٹاؤن گوجرانوالہ کی لائبریری میں محفوظ ہے۔

تقریظ:

برہان الحق

(تالیف: مولانا احمد دین گکھڑوی)

الحمد للّٰه الّذي بنعمته تتم الصالحات، والصلاة والسّلام الأتمان علیٰ رسوله الخاتم الذي جاء بالحجج والبیّنات، و علیٰ آله و أصحابه الکرام، البررۃ القادۃ الھدات.

مولانا احمد دین صاحب کی زیرِ تقریظ کتاب کو میں نے متعدد مقامات سے بغور دیکھا۔ مولانا نے تحریفِ انجیل کے متعلق مستقل دستاویز مرتب فرما دی ہے۔ مسیحی متکلمین تثلیث اور کفارہ ایسے مسائل پر جس زبان میں گفتگو کرتے ہیں، وہ انبیا علیہم السلام کی زبان نہیں۔ وہ ارسطو اور افلاطون کے نظریات ہیں، جنھیں مسیحی متکلمین نے انجیل اور تورات کی تعلیمات میں ترمیم، بلکہ تنسیخ کے لیے اس نہج پر مرتب کیا ہے جس سے عوام کو مغالطہ دیا جا سکے۔

تعجب ہے کہ مسیحی متکلمین کی نظر اس طرف کیوں نہیں گئی کہ مذہب کو آپ ارسطو کی زبان سے کہیں یا افلاطون کے لب و لہجے سے، اس کی بنیاد آخر آسمانی کتاب پر ہوگی یا پیغمبر کے ارشادات پر۔ تورات اور انجیل کے موجودہ متون اگر غیر مستند اور محرف قرار پائیں تو ارسطو کا فلسفہ اس بگڑی کو کیسے بنا سکتا ہے؟ متکلمین کی سینہ زوری اس بیماری کا علاج نہیں ہو سکتی۔

مولانا احمد دین صاحب نے بائبل کی سرگزشت کا تفصیلی جائزہ لیا ہے اور تحریف کے مختلف ادوار کا تفصیلی تذکرہ فرمایا، اور ثابت فرمایا ہے کہ موجودہ بائبل میں لفظی اور معنوی تحریف دونوں موجود ہیں۔ مسیحی مناظر اس موضوع سے عموماً پہلو بچا کر گزرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کبھی وہ تحریفِ قرآن کے لیے موضوع اور تخلیقی ذخیرے کی آڑ لیتے ہیں۔ کبھی صحیح روایات کا مفہوم توڑ موڑ کر مسلمانوں کو الزام دے کر بچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ معلوم ہے کہ الزام سے نہ کوئی جرم ثابت ہو سکتا ہے نہ کوئی مجرم بری ہو سکتا ہے۔

مولانا نے ان الزامات کا بھی تحقیقی جواب دے کر مسیحی مصنفین کا تمام بقایا چکا دیا ہے۔ اب مسیحی مناظر جب تک بائبل کا کوئی صحیح اور مستند نسخہ پیدا نہ کریں، جس پر تثلیث اور کفارہ ایسی غیر معقول اور خارج از فہم مسائل

کی بنیاد رکھی جائے، اس وقت تک یہ سمعی اور نقلی طور پر ثابت نہیں کیا جا سکتا۔

مولانا احمد دین صاحب نے تحریفِ بائبل کے تمام پہلوؤں کا بہترین جائزہ لیا ہے۔ پہلے یہ ذخیرہ مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی رحمہ اللہ کی "إظهار الحق" اور حافظ ابن القیم رحمہ اللہ کی "هداية الحيارىٰ في أجوبة اليهود و النصارىٰ" وغیرہ میں تھا۔ اب یہ مواد ایک خاص انداز سے زیرِ تقریظ کتاب میں آ گیا ہے۔ یہ دونوں مصنف اس باب میں قابلِ اعتماد ہیں۔ خدا تعالیٰ مصنف کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

ناظرین سے استدعا ہے کہ کتاب کو غور سے پڑھیں، اسے خرید کر مسیحی حضرات تک پہنچائیں اور مصنف کی صحت اور طولِ حیات کے لیے دعا کریں۔

محمد اسماعیل

مدرس وخطیب جامع اہلِ حدیث گوجرانوالہ

تقریظ:

فضائل سید العالمین

(تالیف: مولانا احمد دین گکھڑوی۔ ناشر: سکول بک ڈپو، گوجرانوالہ۔ ۱۹۵۷ء)

''فضائل سید العالمین'' کا کافی حصہ میں نے غور سے پڑھا۔ محترم مصنف میرے دیرینہ دوست، مخلص اور نیک دل ہونے کے ساتھ تجربہ کار مناظر ہیں۔ رسمی مناظرات میں ان کا ایک مخصوص مقام ہے۔ ہمیں باوجود رسمی مناظرات سے کوئی دلچسپی نہیں، نہ ہی اس کے لیے طبیعت میں صلاحیت، تاہم ''فضائل سید العالمین'' کو ہم نے دلچسپ پایا۔ بعض مقامات میں تو مصنف علاّم نے بڑی دقتِ نظری سے کام لیا ہے اور تحقیق مسئلے کی عام مناظرانہ روش پر غالب آ گئی ہے۔ بعض مقامات پر مناظرانہ انداز بھی نمایاں ہو گیا ہے، لیکن اس کے باوجود سنجیدگی کا پہلو جھکنے نہیں پاتا۔

مصنف محترم مبارکباد کے مستحق ہیں کہ ایک ایسا موضوع جس پر آج تک یا میلاد خوانوں کا قبضہ تھا یا فلسفی سیرت نگاروں کا۔ اول الذکر گروہ نے اس چشمۂ صافی کو اس قدر مکدر کر دیا کہ ایک سلجھا ہوا دماغ ان مزخرفات کو سن بھی نہیں سکتا، جو ان لوگوں کے وعظوں اور نعتوں میں بیان کیے جاتے ہیں۔ دوسرے فریق نے اسے اس قدر خشک اور خاص فلسفی موضوع بنا دیا کہ اس کے پڑھنے سے نہ عقیدت پیدا ہوتی ہے نہ ہی وہ سرور باقی رہتا ہے جو سیدِ عالم ﷺ کی سیرت کا لازمی جزو ہے۔

مصنف علام نے اس رسالے میں علمی تحقیق کے ساتھ ساتھ عقیدت مندی کے ذوق کو جمع کر دیا ہے۔

فجزاه الله عنا وعن المسلمين أحسن الجزاء!

نمقه بيده: عبده الأثيم إسماعيل بن إبراهيم السلفي۔ تجاوز الله عن ذنوبه.

مورخہ ۸/ ۹/ ۵۰ء

تقریظ:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نجاۃ الاسلام

(تالیف: مولانا احمد دین گکھڑوی۔ ناشر: سکول بک ڈپو۔ گوجرانوالہ۔ ۱۳۸۱ھ)

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَكَفٰى، وَسَلَامٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى.

عیسائیت اور اسلام میں آویزش بہت پرانی ہے، اس کے وجوہ مختلف رہے ہیں: معاشی، سیاسی، دینی، اخلاقی۔ اسلام نے ہر میدان میں مسیحیت سے مقابلہ کیا، دفاع بھی کیا، جارحانہ حملہ بھی۔ خود مسیحیت نے بھی اسلام کے ساتھ زور آزمائی میں پورا زور صرف کیا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ جب عیسائیت کو موقع ملا، اس نے اسلام کو کبھی نہیں بخشا۔ عرصہ تک یہ لڑائی اپنے اپنے حلقوں میں ہوتی رہی۔ علما عقائد اور اعمال میں مناظرات کرتے رہے، حکومتیں میدانِ کارزار میں اپنے جوہر دکھاتی رہیں۔ سیاسی، علمی، معاشی حلقے اپنے اپنے انداز سے اپنے اپنے مذہب کی خدمت کرتے رہے۔

عرصے سے مغربی حکومتوں نے سیاسی مقاصد کے لیے مذہب کو استعمال کرنا شروع کیا۔ معاشی رعایتوں سے مسیحیت کی اشاعت کے لیے راہیں ہموار کیں۔ چھوٹے اور غیر مستطیع ملکوں کو اس انداز سے امداد دی گئی کہ وہاں اگر سیاسی حربوں سے کام نہ چلے تو مشنریوں اور ان کے متعلقہ حلقوں کو سیاسی دسیسہ کاریوں کے لیے استعمال کیا جائے۔ بعض کم فہم سیاست دانوں نے اپنی وسیع نظری کی ترنگ میں ملک میں ایسے عناصر پیدا کر لیے، جن کی وفاداری ملک کے ساتھ قطعی طور پر مشکوک ہے۔ وہ اس ملک میں رہتے ہوئے بھی دوسرے ملک کے وظیفہ خوار ہیں۔ یہ ہم وطن اجنبی اپنے ملک کے بجائے دوسرے ملکوں کی خدمت کرتے ہیں، اس لیے کہ انھیں کہیں سے وظیفہ درآمد ہوتا ہے۔

مغربی طاقتیں اس عیسائیت کی اشاعت پر کروڑوں روپیا خرچ کرتی ہیں، جس پر انھیں ذاتی طور پر کچھ یقین نہیں۔ ان کے محققین عہدِ جدید اور عہدِ عتیق دونوں کے صحیفوں کو وضعی اور غیر مستند سمجھتے ہیں، مگر ان کی اشاعت صرف اس لیے ہو رہی ہے کہ اس سے دوسرے ملک کے حالات معلوم ہوتے رہتے ہیں اور اس ملک کی

سیاسیات میں دخل دینے کا موقع ملتا رہتا ہے۔

تعلیمی مشنریاں سیاسی مقاصد کی تکمیل کے لیے پھرتی ہیں۔ تعلیمی ادارے تعلیم کے ساتھ عیسائیت اور عیسائیت کے ساتھ اپنی سیاست کو کامیاب بنانے کا بہترین ذریعہ ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان میں انگریزی حکومت کے صد سالہ دور نے تعلیم کی راہ سے ایسی تباہی مچائی ہے کہ ہر پڑھا لکھا آدمی نیم بابو یا عیسائی معلوم ہوتا ہے۔ اسلام کے ہمدرد اور خیر اندیش حضرات کو ان تمام چور دروازوں پر نظر رکھنی چاہیے اور انھیں بند کرنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ عیسائیت کی روک تھام کے لیے محض مناظرات اور لٹریچر ہی کافی نہیں، بعض دوسری راہیں آج کل اس سے کہیں زیادہ موثر ہیں۔

پادری سلطان محمد پال نے آج سے کئی سال پہلے ایک رسالہ لکھا تھا، جس میں ظاہر کیا تھا کہ انھیں اسلام میں چونکہ نجات نظر نہ آئی، اس لیے وہ عیسائی ہو گئے۔ معمولی قسم کا طالب علم سمجھتا ہے کہ وہ محض مغالطے تھے، جو نو آموز عیسائیوں کو خوش کرنے کے لیے لکھ دیے، ورنہ وہ کچھ حقیقت نہ تھے۔ پادری صاحب زندہ ہوتے تو ہم ان سے عرض کرتے کہ ان کی اصل مصیبت آخرت نہیں دنیوی نجات ہی تھی، مگر اب پادری صاحب کا انتقال ہو چکا ہے، اس لیے بحث بے وقت ہے۔

ہمارے مولوی احمد الدین صاحب مخلص اور اہلِ علم ہیں۔ وہ ایسے معاملات میں اپنا فرض ادا کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ انھوں نے پادری صاحب کے ان مغالطوں کا پورا تعاقب کیا ہے کہ اگر کوئی شخص ان وجوہ سے ارتداد کی طرف مائل ہوا ہو تو اس کی تسکین کا سامان ہو جائے۔ سیاسی، معاشی، علمی راہوں سے آنے والی عیسائیت کا علاج ان لوگوں کا فرض ہے جو ان راہوں کے در و بست پر قابض ہیں۔

اللہ تعالیٰ مولوی صاحب کو اجر اور توفیق عطا فرمائے، تا کہ وہ مزید دین کی خدمت کر سکیں۔ کتاب آپ حضرات کے سامنے ہے، اس کے متعلق مجھے کسی تعریف کی ضرورت نہیں۔ وہ خود اپنے متعلق سچا شاہد ہے۔ وَاللّٰهُ وَلِيُّ التَّوْفِيْقِ.

محمد اسماعیل، مدرس گوجرانوالہ

یکم محرم الحرام ۱۳۸۱ھ مطابق ۱۵/ جون ۱۹۶۱ء

تقریظ:

سیرت سید العالمین

(تالیف: مولانا احمد دین گکھڑوی۔ ناشر: سکول بک ڈپو گوجرانوالہ۔ ۱۹۶۶ء)

الحمد لله رب العالمين، والصلاة والسلام على رسوله، و أصحابه أجمعين.

میں نے رسالہ ''سیرت سید العالمین'' کا بالاستیعاب مطالعہ کیا۔ مولوی احمد دین نے پادری ٹھاکرداس کے زہریلے حملے اور اعتراضات کا معقول جواب دے کر اہلِ اسلام کو تسلی دے دی، بلکہ ان کے دل میں فرحت و سرور پیدا کیا اور نبی ﷺ کی نبوت و رسالت کو براہینِ قاطعہ و دلائلِ واضحہ سے ثابت کر کے اہلِ اسلام پر احسان کیا۔ دعا ہے کہ خدا تعالیٰ مصنف مذکور کو حضرت نوح علیہ السلام کی عمر اور صحت عطا کرے۔ آمین ثم آمین.

مقدمہ:

تحریمُ الْخَمر والزِّنا واللَّواط والمَعَازِف والعشق

(تالیف: نواب صدیق حسن خاں رحمہ اللہ۔ ناشر: جمعیت اہلِ حدیث ضلع گوجرانوالہ)

الحمد للہ وکفیٰ، وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ.

اسلام نے اپنے نظام میں جہاں عبادات، معاملات کا ایک نظام مقرر فرمایا ہے، وہاں اخلاق کے متعلق بھی مکمل پروگرام دیا ہے۔ ان میں سے بعض چیزوں کے متعلق ترغیب دی ہے، بعض سے سختی کے ساتھ روکا ہے۔ اس کی مثال دوائی اور پرہیز کی ہے۔ مریض بڑی پابندی سے دوائی کا استعمال کرے، مگر پرہیز نہ کرے تو شفایاب نہیں ہوگا۔

نواب صدیق حسن خاں صاحب والی ریاست بھوپال رحمہ اللہ ریاست کے نواب ہونے کے ساتھ بہت بڑے فاضل اور متقی بھی تھے۔ مرحوم کی تصنیفات سینکڑوں تک پہنچتی ہیں، جن میں فتح البیان اور ابجد العلوم، ترجمان القرآن، التاج المکلل ایسی ضخیم کتابیں بھی ہیں۔ اخلاق، تاریخ، شروح، رجال، ادب، تفسیر، حدیث، فقہ؛ ہر موضوع پر طبع ہوئی ہیں، جن سے علمی حلقوں نے بے حد استفادہ فرمایا۔

زیرِ نظر رسالہ حضرت مرحوم و مغفور نے اصلاحِ اخلاق کے لیے لکھا ہے، تاکہ عوام الناس اور خواص ان مہلک امراض سے بچیں، جو انسانی معاشرے کو گھن کی طرح کھا رہی ہیں۔ اکثر مسلمان ان میں مبتلا ہیں۔

حافظ محمد یوسف صاحب مبارک باد کے مستحق ہیں، انھوں نے یہ کتاب شائع کر کے ملک میں معاشرے کی بہت بڑی خدمت فرمائی ہے۔ جزاہ اللہ أحسن الجزاء۔

اللہ تعالیٰ مصنف مرحوم، طابع اور ناشر سب کو اپنی جوارِ رحمت میں جگہ دے اور مسلمانوں کو توفیق دے کہ وہ ان قباحتوں سے بچیں۔

محمد اسماعیل، گوجرانوالہ

۲۸ر جولائی ۱۹۶۴ء

تقریظ:

احترامِ مسلم

(تالیف: مولانا عبدالرؤف رحمانی جھنڈانگری)

''احترامِ مسلم'' کی بعض اقساط پہلے اخبارات میں پڑھ چکا ہوں، مجھے یہ اندازِ فکر بے حد پسند ہے۔ مباحث و مناظرات نے ہمارے اندازِ فکر کو اس قدر بگاڑ دیا ہے کہ انسانیت سرنگوں ہوجاتی ہے۔ ﴿وَيَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا﴾ [الكهف: ١٠٤]

اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق مرحمت فرمائے کہ دین کی اس اصلی و اخلاقی روح کو قائم کرسکیں۔ مولانا ثناء اللہ مغفور آخر عمر میں ہر جلسے میں ایک مضمون اخلاق کے متعلق ضرور بیان فرماتے، عموماً سورت واقعہ کی آیات پڑھتے، حشر ونشر کے احوال کا تذکرہ بڑے دلگداز انداز میں بیان فرماتے۔ ہمیں تعجب ہوتا، مگر محسوس ہوتا ہے کہ یہ موضوع کس قدر ضروری ہے۔ آپ نے کافی محنت فرما کر دشوار مواد کو جمع کر دیا ہے۔ على الله أجرك.[1]

محمد اسماعیل، گوجرانوالہ

---

[1] ماہنامہ ''السراج'' جھنڈانگر، نیپال، خطیب الاسلام نمبر (ص: ٣٦٠)

تبصرہ وتعارف:

تحفة الأشراف بمعرفة الأطراف

(تالیف: حافظ جمال الدین یوسف بن عبدالرحمٰن بن یوسف المزی، التوفی ۷۴۲ھ)

ائمہ سنت، فنِ حدیث اور دواوینِ سنت کی اہمیت کو سمجھتے تھے، وہ جانتے تھے کہ طریقِ ثبوت اور اسناد کی بحث کی وجہ سے گو سنت کا مقام قرآنِ عزیز کے بعد ہے، لیکن نفسِ حجیت اور احکام کے اِثبات کے متعلق یہ بھی منزل من اللہ ہے (دارمی، ص: ۷۸) اور ذکر کی ایک قسم (احکام الاحکام: ۱/۱۲۲) جس کی حفاظت کا قرآنِ عزیز میں وعدہ فرمایا گیا ہے۔ چناں چہ یہ ذمے داری ائمہ سنت اور حفاظِ حدیث نے سنبھال لی اور مختلف زمانوں میں مختلف مناہج سے یہ خدمت سرانجام دیتے رہے۔ آنحضرت کی زندگی میں یہ خدمت حدیث کے حفظ اور کتابت کی صورت میں کی گئی۔ دروس کی صورت میں صحابہ رضی اللہ عنہم احادیث میں مذاکرات فرماتے اور اساتذہ ان حلقہ ہائے درس کا احتساب فرماتے۔ (دارمی، ص: ۷۸) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، عبدالرحمان بن ابی لیلی اور حسن بصری، علقمہ اس خدمت میں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ حافظ دارمی فرماتے ہیں:

"إذا صلوا العشاء الآخرة جلسوا في الفقه فلم يفرق بينهم إلا أذان الصبح"

(دارمي: ۷۸)

جابر بن عبداللہ اور امام ابن شہاب زہری سے اسی طرح منقول ہے اور ان حضرت کے حلقہ ہائے درس کو خاصی شہرت حاصل تھی، اس کے بعد ان مختلف تذکروں اور یادداشتوں کے محفوظ رکھنے کا وقت آیا تو علمائے صحابہ اور تابعین نے ان یادداشتوں کے دفاتر جمع کر ڈالے، درس و تدریس، حفظ و مذاکرے ہوتے اور ضرورت کے وقت ان نوشتوں کی طرف رجوع کیا جاتا۔ اگر حدیث شرعاً قابلِ احتجاج ہی نہ ہوتی تو یہ محنت بے سود تھی اور یہ دردسر بے فائدہ۔

دوسری صدی کے اوائل ہی میں ان تذکروں اور یادداشتوں کو محفوظ کرنے کے لیے ان کی باقاعدہ تدوین کا مرحلہ پیش آیا۔ پوری دو صدیاں جمع و تدوین میں صَرف ہوئیں۔ جوامع، سنن، مسانید، اجزا، اموال، خراج ایسے مسائل پر اس دور کی مختلف تالیفات آج بھی مکاتب کی زینت ہیں اور اہلِ علم کے لیے سرمایۂ افتخار۔

پھر یہ سلسلہ اقطارِ عالم میں بڑھتا چلا گیا۔ ایران، خراسان، بربر، اندلس، ہند، سندھ وغیرہ ممالک میں یہ سلسلہ دور تک پھیل گیا، جہاں اسلامی پھریرا لہرایا۔ اسلامی علوم اس کے سائے میں پھیلتے گئے۔ حکومت اور علما اپنے اپنے طور پر ان علوم کی خدمت کرتے رہے۔

جمع و تدوین کے ساتھ ساتھ رجال، اصولِ حدیث، موالید، وفیات کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس کے لیے، فن اسماء الرجال، علم طبقات الرجال اور اصولِ حدیث کے دفاتر مرتب ہوگئے۔ چھٹی اور ساتویں صدی تک یہ سلسلہ کمال تک پہنچ گیا اور ضرورت محسوس ہوئی کہ اربابِ تحقیق اور مصنفین کے لیے اس مواد کو ایک دوسرے رنگ سے مرتب کیا جائے، تاکہ شارحینِ حدیث اور محققین اس سے استفادہ فرما سکیں۔ جمع بین الصحیحین للحمیدی، جمع بین الصحاح لابن الحسن رزین العبدری اور جامع الاصول لابن الاثیر الجزری وغیرہ اس نوع کی کتابوں میں اس مستند ذخیرے اور مدونہ دفاتر کے مواد کی جمع وتقسیم، تبویب اور توزیع بالکل نئے انداز سے کی گئی، جس سے آنے والی نسلیں شروح اور تخریجات میں تحقیق اور توضیح کا کام لے سکیں۔ امت کی یہ مساعی دلیل ہے کہ اُمت کی نظر میں یہ ذخائر انتہائی قابلِ احترام تھے اور اسلامی زندگی میں اسے اہمیت اور حجت کا مقام حاصل تھا، اور ان مساعی کی راہنمائی علم الفہارس، جو آج حضری دنیا میں ایک فن کی حیثیت اختیار کیا ہے، اس علم کی بنیاد، ان اکابر محدثین نے اس کے مبادی طے فرمائے اور آنے والوں کے لیے اس علم کی بنیاد رکھی۔

تحفة الأشراف بمعرفة الأطراف:

یہ کتاب آج تک طبع نہیں ہوئی تھی۔ اس کے قلمی نسخے بعض اہم مکاتب کی زینت تھے۔ حافظ جمال الدین مزی رحمہ اللہ (۷۴۲ھ) نے اس میں صحاحِ ستہ کے اطراف مع اسانید جمع فرمائے ہیں۔ وہ پہلے رجالِ اسانید، ترتیبِ حروف سے ذکر فرماتے ہیں، پھر متون کو مع اختلافِ الفاظ ذکر فرماتے ہیں۔ اس ضمن میں صحابہ، تابعین، اَتباعِ تابعین بلکہ بعد کے بعض رواۃ اور علما کا بھی ذکر آگیا ہے۔ گویا اس میں حدیث اور سند کے متعلق ضروری معلومات یکجا آجائیں گی اور طالب علم مزید ورق گردانی کی تکلیف سے بچ جائے گا۔

ان دنوں کتاب کی پہلی جلد طبع ہوکر آچکی ہے، اگر محترم ناشر کو اللہ تعالیٰ نے صحت اور زندگی مرحمت فرمائی اور پوری کتاب اسی انداز سے شائع ہوئی، تقریباً بیس ہزار حدیث کا ایسا مستند ذخیرہ اہلِ علم کے ہاتھ آجائے گا، جو کافی حد تک دفاترِ احادیث کی مراجعت سے مستغنی کر دے گا۔ حافظ شیرازی کی زبان سے عشاقِ حدیث کے لیے یہ کہنا بالکل بجا ہوگا: "هذا الصبوح حيوا يا أيها السكاری"

جس چیز کی زیارت کے لیے صدیوں سے آنکھیں ترس رہی تھیں، وہ آج آپ کے سامنے ہے۔ ضرورت ہے کہ کوئی مکتبہ اور کوئی میز اس کتاب سے خالی نہ رہے اور ہر طالب علم اس سے فائدہ حاصل کرے۔

مولف کتاب:

حافظ ابو الحجاج جمال الدین یوسف بن عبدالرحمٰن بن یوسف المزی (۷۴۲ھ) اپنے وقت کے اکابر ائمہ حدیث سے اور شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے رفقا سے اور شریکِ درس رہے اور ائمہ سلف اور ان کے افکار کی اشاعت میں شیخ الاسلام کے دوش بدوش کام کرتے رہے اور ان کی پاداش میں جیل گئے۔

امام شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''انھوں نے تقریباً ایک ہزار اساتذہ سے استفادہ فرمایا۔ امام محی الدین نووی شارح مسلم ان کے اساتذہ سے ہیں، جب دار الحدیث اشرفیہ میں انھیں مسندِ درس تفویض کی گئی تو شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے فرمایا:

"لم يلها من حين بنيت إلى الآن أحق بشرط الواقف منه" (البدر الطالع: ۲/ ۳۵۳)

''جس دن سے یہ مدرسہ بنا ہے، بانی کی شرائط کے مطابق آج تک حافظ مزی سے بہتر کوئی عالم اس مسند کی زینت نہیں بن سکا۔''

صفی الدین ہندی سے شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے مناظرے کے بعد علمائے شوافع اشعریت نوازی کی آڑ میں شیخ کے مخالف ہو گئے۔ حافظ مزی شیخ الاسلام کے حامی تھے۔

امام ذہبی فرماتے ہیں:

"كان خاتم الحفاظ وناقل الأسانيد والألفاظ، وهو صاحب معضلاتنا ومرجع مشكلاتنا، وفيه حياء وكرم وسكينة واحتمال وقناعة وترك للتجمل وانجماع عن الناس" (البدر الطالع: ۲/ ۳۵٤)

''الفاظ اور اسانید کی تنقید اور حفظِ حدیث کے خاتم تھے۔ ہمارے لیے علمی مشکلات میں آخری امید گاہ تھے۔ حیا، کرم، حسنِ اخلاق، بردباری، قناعت، سادگی اور عوام سے پرہیز ان کی پاکیزہ عادات تھیں۔''

حافظ ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"ترافق هو وابن تيمية كثيراً في سماع الحديث، وفي النظر في العلم، وكان يقرر طريقة السلف في السنة، ويعضد ذلك بمباحث نظرية" اهـ (تذكرة الحفاظ: ۲/ ۱٤۹۹)

''وہ سماعِ حدیث اور تحصیلِ علوم میں حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے شریک رہے اور سنت کے معاملے میں طریقۂ سلف کے پابند تھے اور مباحثات میں سلف کی روش کے موید تھے۔'' اللهم اغفر له وارحمه

واجعل جنة الفردوس مأواه.

ناشر محترم نے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی کتاب "النکت الظراف" کو بھی اس کے ساتھ شائع فرما کر اس کی افادیت کو المضاعف کر دیا ہے۔ جزاه الله عنا وعن المسلمين أحسن الجزاء.

حضرت الناشر الاستاذ الفاضل مولانا عبدالصمد شرف الدین۔ زاده شرفاً و کرماً۔ ۱۹۲۶ء میں ان کے والد حضرت مولانا شرف الدین رحمہ اللہ سے بمبئی میں ملاقات ہوئی۔ پھر یہ تعلق تاحیات قائم رہا۔ میرے پاس اس وقت کتابوں کا جو مختصر سا ذخیرہ موجود ہے، وہ حضرت مولانا عبدالتواب صاحب رحمہ اللہ اور حضرت مولانا شرف الدین صاحب رحمہ اللہ کے مشوروں کا نتیجہ ہے۔ محترم ناشر مولانا عبدالصمد صاحب سے پہلا تعارف حج کے موقع پر حاصل ہوا، جو لواء العلم الشیخ السید محمد نصیف صاحب آفندی رحمہ اللہ کے مکان پر ۱۹۴۹ء میں جدہ میں ہوا۔ پھر حرم میں بھی روزانہ ملاقات ہوتی رہی۔ مولانا حج سے فراغت کے بعد نایاب مخطوطات کی تلاش میں مصر چلے گئے اور آج تک علومِ دین اور کتاب وسنت کی خدمت میں مشغول ہیں۔ زاده الله حرصاً و فوزاً، اور اپنا یہ حال ہے کہ بے کار مشاغل پورے ماحول پر اس طرح محیط ہیں کہ اپنی سیاہ کاریوں پر ندامت کے لیے بھی چند لمحات میسر نہیں آ سکے۔

ما و مجنون ہم سبق بودیم در دیوان عشق
او بصحرا رفت ما در کوچہا رسوا شدیم

اسماعیل، کان اللہ لہ
چاہ شاہاں، خطیب جامع اہلِ حدیث، گوجرانوالہ[1]

[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۴ر جون ۱۹۶۵ء)

تبصرہ و تعارف:

خیرِ کثیر

(تالیف: شاہ ولی اللہ محدث دہلوی۔ ترجمہ: مولانا عبدالرحیم پروفیسر عربی اسلامیہ کالج پشاور)

آج سے کئی سال پہلے خیرِ کثیر کا عربی اِڈیشن... میں شائع ہوا۔ حضرت شاہ صاحب تفسیر، حدیث، کلام، تصوف، علم الاسرار میں امامت کے مقام پر فائز ہیں اور ان مسائل میں مجتہدانہ گفتگو فرماتے ہیں۔ تقلید و جمود ان کے قریب نہیں پھٹکتا، بلکہ بعض مواقع پر ان کی حیثیت ایک مجدد کی ہوتی ہے اور وہ پرانی راہوں کو یکسر بدل دیتے ہیں۔

مصفی اور مسوی کے نام سے حضرت شاہ صاحب نے موطا پر دو شرحیں لکھی ہیں، ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب کی نظر مذاہبِ ائمہ پر کس قدر وسیع ہے۔ اس کے باوجود ان کو کسی مذہب کے ساتھ تقلیدی وابستگی نہیں، ان کی تمام تر وابستگی دلائل و براہین سے ہے، ان کی تحقیق کا انحصار تفقہ اور مصالح پر ہے، اس لیے بسا اوقات بلا تامل شافعی کو مالک کے مسلک پر ترجیح دیتے ہیں، حنبلیہ کو حنفیہ پر ترجیح دینے میں انھیں کوئی حجاب نہیں ہوتا، حالاں کہ ظروف و احوال کے لحاظ سے وہ ہندوستان کے لیے حنفی مسلک کو پسند فرماتے ہیں۔

اصولِ فقہ احناف کے لیے ایک محفوظ علم تھا، جس کے سہارے پر طلبہ کو شوافع، مالک اور حنابلہ کے خلاف مناظرات کی مشق کا بہترین موقع ملتا تھا، اس کا اثر مبتدی طلبا پر یہ ہوتا تھا کہ بسا اوقات وہ ائمہ ثلاثہ کی علمی بصیرت ہی میں شک کرنے لگتے تھے، بلکہ اصولِ فقہ کی متعارف درسیات میں بسا اوقات سوے ادب تک نوبت پہنچ جاتی۔

شاہ صاحب نے ''حجۃ اللہ'' میں اتنی کڑی تنقید فرمائی ہے کہ جس سے ایک تو اصولِ فقہ کی حقیقت واضح ہوگئی ہے، دوسرے ائمہ مجتہدین کا علمی احترام بحال ہوگیا، جسے تقلید و جمود نے بے حد نقصان پہنچایا تھا۔ جزاہ اللہ عنا وعن المسلمین أحسن الجزاء.

حضرت شاہ صاحب نے اسرارِ شریعت پر مستقل کتاب لکھی اور سچ یہ ہے کہ ''حجة الله البالغة'' اس فن میں ایک ہی کتاب ہے۔ فقہ اور حدیث پر لکھنے والوں کی تعداد میں جتنی کثرت ہے، اسرارِ شریعت پر لکھنے والوں کی اسی قدر قلت ہے۔ اسرار و غوامض پر جن لوگوں نے کسی قدر تفصیل سے لکھا ہے، وہ بزرگ انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں: امام رازی، امام غزالی، ابن رجب، عز بن عبدالسلام، شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ اور حکیم ملت

ابن القیم، متاخرین میں امام ولی اللہ، یہ گنتی کے آدمی ہیں، جن کی تصانیف میں اسرارِ شریعت کے مباحث بسہولت سے آتے ہیں، لیکن شاہ صاحب کو یہ ممتاز حیثیت حاصل ہے کہ ان کی تصانیف نے اسے فن کی حیثیت دے دی۔

زیرِ نظر کتاب خیرِ کثیر میں اسرارِ شریعت کے علاوہ حضرت الامام نے اسرارِ تکوین پر بحث فرمائی ہے، یہ ایک اچھوتا فن ہے۔ متقدمین نے اس پر بالاستقلال بہت کم لکھا ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے فلاسفہ اور متکلمین پر جہاں رد فرمایا ہے، اس قسم کے مباحث وہاں ضمناً آ گئے ہیں، اسی طرح فتوحاتِ مکیہ اور فصوص الحکم وغیرہ میں بھی کہیں کہیں بحث نے یہ انداز اختیار کر لیا ہے، لیکن وہاں شہد کو زہر میں آمیز کرنے کا واہمہ ہوسکتا ہے۔ شیخ الاسلام کے بعد حضرت شاہ صاحب نے ان مباحث کو نکھار کر بدعی تصورات سے علیحدہ فرما دیا۔ جزاہ اللہ کما یجزي عبادہ الحنفاء.

شاہ صاحب نے تصوف میں بھی بہت حد تک نکھار پیدا کیا۔ علم کلام پر بھی ان کی نظر مجتہدانہ ہے، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب کے سامنے متکلمین اہلِ سنت سے عموماً امام اشعری اور ماتریدی اور ان کے احباب کی تصانیف ہیں اور اسی گرد و پیش کے تاثرات حضرت امام کے ماحول پر محیط رہے، حالاں کہ کلام و عقائد میں اہلِ سنت کی راہ حضرت امام احمد بن حنبل الشیبانی کی ہے اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ علم کلام کے مباحث میں مقلدین ائمہ نے اپنے ائمہ فقہ کو چھوڑ کر اشعری اور ماتریدی کی راہیں اختیار کی ہیں اور اصولِ دین میں انہی القاب کو اپنے لیے پسند فرمایا ہے، حالاں کہ ائمہ اربعہ اصولاً حضرت امام احمد بن حنبل کے ہمنوا تھے، تاخرِ زمانہ کے سبب حضرت امام احمد ان فتنوں سے بذاتِ خود دوچار ہوئے، جو کلام اور فلسفے کی وجہ سے پیدا ہوئے۔ ایک صاحبِ حال کی طرح ان جدید مباحث کو حضرت امام نے کھنگالا، سنت کی راہ کو متعین کیا، مصائب سہے اور کوئی فرعون انھیں حق کی راہ سے بھٹکا نہ سکا۔ ائمہ ثلاثہ کے وقت یہ فتنے اس قدر پھل پھول نہیں سکے تھے، اس لیے اساسی طور پر ائمہ ثلاثہ سنت کے ساتھ تھے، اور وہ وہی راہ تھی، جسے امام احمد نے اختیار فرمایا۔

حضرت شاہ ولی اللہ کے سامنے متکلمینِ حنابلہ کے علمی ذخائر زیادہ مقدار میں نہ آ سکے، اس لیے ان کے کلام پر اشعریت کا رنگ غالب ہے، اس کے باوجود ان کی فطری بصیرت نے اکثر مقامات پر حق کا تتبع فرما لیا ہے۔

حضرت شاہ صاحب نے خیرِ کثیر میں متکلمین اور فلاسفہ کی اصطلاحات کو بے تکلف استعمال کیا ہے اور بوقتِ ضرورت ان سے کہیں بہتر اور جامع اصطلاحات وضع فرمائی ہیں۔ اس لیے قدرتی طور پر خیرِ کثیر، بدورِ بازغہ، حجۃ اللہ البالغہ کے بعض ابتدائی مباحث مشکل معلوم ہوتے ہیں، طالب علم کو گھبرانا نہیں چاہیے، بلکہ بار بار غور کرنے سے طبیعت مانوس ہوگی اور حافظہ آپ کی امداد کرے گا۔

جناب مترجم شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے ایک قیمتی ذخیرہ طلبۃ العلم کے سامنے پیش فرما دیا ہے۔

فاضل مترجم نے پوری کوشش کی ہے کہ اصطلاحات عام فہم ہو جائیں، قوسین میں جا بجا اس ضرورت کو پورا کیا گیا ہے، لیکن اس کے باوجود اِغلاق موجود ہے۔ جو ترجمہ بھی بقید الفاظ کیا جائے گا، شاہ صاحب کی تصانیف میں یہ دقت موجود رہے گی اور عوام اس سے پوری طرح مستفید نہیں ہو سکیں گے۔ اس لیے ضرورت ہے کہ یا تو ان کتابوں کے آزاد تراجم شائع کیے جائیں یا ان پر مفصل نوٹ لکھا جائے، امید ہے آیندہ اشاعت میں اس کا خیال رکھا جائے گا۔

شاہ صاحب نے اصطلاحات میں عموماً علمائے یونان کا تتبع فرمایا ہے، اس لیے ان پر ائمہ حنابلہ یا ائمہ سنت کا اصطباغ ضروری ہے۔ اگر شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور ابن القیم کی تصانیف آج کی طرح شاہ صاحب کے سامنے آجائیں تو یقیناً ان اصطلاحات کا استعمال موجودہ صورت سے مختلف ہوتا، اس لیے بھی ضرورت ہے کہ کتاب پر مفصل نوٹ لکھے جائیں۔

منطق الکون:

عقلی علوم کو سمجھنے کے لیے علما نے جو علم ایجاد فرمایا، اسے منطق المعقول کہا جاتا ہے، فنِ حدیث کے لیے ائمہ حدیث نے جو تنقیدی اصول وضع فرمائے ہیں، اسے منطق المنقول سمجھنا چاہیے۔ حجۃ اللہ البالغہ ایسی کتابیں، جن میں اسرارِ شرائع کا ذکر فرمایا، اسے منطق الاحکام کہنا مناسب ہوگا۔ خیرِ کثیر اور بدورِ بازغہ ایسی کتب کو منطق التکوین تصور کرنا چاہیے۔

ہم حضرت مترجم اور محترم ناشر کے ممنون ہیں کہ انھوں نے پبلک کو ان قیمتی خزائن سے متعارف فرمایا، ایسے علمی موتیوں کو بکھیرنے والے حضرات کے سامنے تجارت سے زیادہ اشاعتِ علم کا مقصد ہونا چاہیے اور قیمتیں جہاں تک ہو سکے کم رکھی جائیں۔[1]

---

[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۲۹؍ جون ۱۹۵۱ء)

تبصرہ و تعارف:

آپ حج کیسے کریں؟

(تالیف: مولانا محمد منظور نعمانی)

یہ رسالہ حج کے متعلق چند مضامین کا مجموعہ ہے، ان میں بعض ''الفرقان'' لکھنؤ میں شائع ہو چکے ہیں۔ مولانا ابو الحسن علی ندوی صاحب کا مختصر مضمون محض تعارف ہے، اس میں حج سے بھی زیادہ اپنی تبلیغی جماعتوں کا تعارف کرایا گیا ہے۔

مولانا کو شاید معلوم نہ ہو، ان تبلیغی وفود میں جو لوگ شامل ہوتے ہیں، ان کی دیانت، ان کا اخلاق معیاری نہیں ہوتا۔ اس سفر میں آپ ایسے بزرگوں کی راہنمائی کے سبب عوام ان وفود سے استفادے کی کوشش کرتے ہیں، حسنِ ظن کی بنا پر ان کے اعمال کا تتبع ان کے افعال سے کرتے ہیں۔ بعض اوقات ان کی خامکاری کی وجہ سے بری طرح متاثر ہوتے ہیں اور پوری جماعت سے بدظن ہو جاتے ہیں۔ اس لیے اگر سفرِ حج کو اس پراپیگنڈے سے محفوظ رکھا جائے تو میری ناقص رائے میں مناسب ہوگا۔ جماعتی نشر و اشاعت کے لیے اور مواقع میسر آ سکتے ہیں، حج کا معاملہ حج ہی تک محدود رہے تو مناسب ہوگا۔

باقی مضامین اپنی نوعیت کے لحاظ سے بہت ہی مفید ہیں۔ مولانا محمد منظور صاحب نعمانی کا مضمون تعلیم حج کے لحاظ سے بہت مفید ہے اور تعلیمی نقطۂ نظر سے دل نشین۔ اختلافی مقامات میں سید القوم حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے مسلک کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ یہ مختصر رسالہ اس سفر میں ضرورت کے لحاظ سے بہت ہی مفید ہے۔

آخر میں کچھ نظمیں ہیں، جن میں عشق و محبت کا اظہار کیا گیا ہے۔ یقیناً آنحضرت ۔فداه أبي و أمي۔ سے محبت ایک مسلمان کے لیے سرمایہ حیات اور اساسِ ایمان ہے، لیکن اس کے اظہار میں شعریت غالب آ گئی ہے اور مصنوعی عشق مقامِ نبوت پر چھا گیا ہے۔ ہر چند کہ حضرات اہلِ توحید کے ارادوں پر شبہ نہیں کیا جا سکتا، نہ ہی اس سے ترویجِ شرک کا قصد مفہوم ہو سکتا ہے، لیکن عوام کے لیے یہ طریقِ گفتار فتنے کا موجب ہو سکتا ہے۔ اکثر اشعار میں ایسی گنجایش موجود ہے، اگرچہ توجیہ و تاویل سے ان کا مفہوم صاف ہو سکتا ہے، لیکن اعتقاد کے معاملے میں پیچ دار راہ کیوں اختیار کی جائے، جو عوام کے لیے فتنے کا موجب ہو؟

مولانا محمد منظور صاحب سے مجھے غائبانہ تعارف ہے۔ میں نے انھیں مدینہ منورہ باب الرحمۃ میں دیکھا، لیکن ازدحام کی وجہ سے مل نہ سکا۔ میری طبیعت پر ان کی وجاہت کا ایک اثر ہے، ان کے چہرے سے توحید کا نور نمایاں ہے، اس لیے ان کے توسط سے ایسی مشتبہ اور ذوالوجوہ نظمیں شائع ہوں تو کچھ بھلا معلوم نہیں دیتا۔

عشق و محبت کی راہ میں یہ بے اعتدالیاں مستبعد نہیں، خصوصاً جب کہ اس کے اظہار کے لیے شعر یا نظم، ترصیع و قافیہ کا سہارا لیا جائے، لیکن ایک مومن کے لیے دربارِ نبوت سے پہلے ایک اور بھی بارگاہِ عشق موجود ہے۔ وہاں کے آداب کا لحاظ عتبہ نبوت سے بھی کہیں زیادہ ہے، اس لیے ہماری ناقص رائے میں یہاں وہابیت کی خشکی بریلوی انداز کے عشق سے کہیں بہتر ہے ؎

فاحفظ وقيت فتحت قدمك هوة   كم قد هوى فيها من الإنسان

آخر میں ہم پھر حجاج کو توجہ دلاتے ہیں کہ یہ مختصر رسالہ ان کے لیے بہترین راہنما اور رفیقِ سفر ثابت ہوگا۔[1]

---

[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۲۹ر شوال ۱۳۷۰ھ)

تبصرہ و تعارف:

اہلِ بیت

(تالیف: مولانا فضل الرحمٰن مبارکپوری[1])

اس موضوع پر احادیث اور شروح میں اہلِ سنت کی طرف سے سیر حاصل مباحث ملتے ہیں، مگر ایسا مجموعہ جس میں یہ مواد یکجا مل سکے، مولانا المحترم کی پہلی کوشش ہے۔ مشکل یہاں یہ ہے کہ ہمارے ہاں اسلام کا مدار صرف شکل پر ہے، حالاں کہ شکل سے کہیں پہلے ذہن کا اسلامی ہونا شرط ہے۔ طریقِ فکر کا مسلمان ہونا ضروری ہے۔ کسی خاندان کی بلحاظ خاندان حمایت یہ نہ اسلامی ذہن ہے اور نہ اس کا طریقِ فکر، جس مذہب نے شعوب و قبائل کو صرف تعارف کا ذریعہ سمجھا ہو، کرامت کا تمام تر انحصار تقوے پر رکھا، اس سے کیوں کر یہ اُمید رکھی جائے کہ وہ اہلِ بیت کی عزت اور عصمت کو اس لیے منوانا چاہتے ہیں کہ وہ آنحضرت کے رشتے دار ہیں؟

جب وہ نوح کے بیٹے کو معاف نہیں فرماتا۔ لوط اور نوح کی بیوی کو نہیں بخشتا۔ حضرت ابراہیم کے آبا و اقارب کی لغزشوں کو شمار کرنے میں کوئی لحاظ نہیں فرماتا، وہ علی اور حسین اور فاطمہ رضی اللہ عنہم کو اس لیے معزز نہیں سمجھتا کہ وہ رسول کے رشتے دار ہیں، بلکہ اس کے نزدیک ان بزرگوں کی برتری کے لیے کچھ اور وجوہ ہیں اور ان کی کرامت کے کچھ اور اسباب، ان کی عصمت وہبی نہیں، بلکہ کسبی ہے۔ (احزاب)

اگر قبائلی تعلق موجبِ کرامت ہوتا تو ابوجہل اور ابولہب کم از کم لعنت سے محفوظ ہو جاتے۔ ابوسفیان رضی اللہ عنہ کو فتح مکہ سے پہلے کوئی اعزاز عطا ہو جاتا۔

ہمارے شیعہ حضرات کے نزدیک کرامت کا معیار قبائل، نسبت و قرابت کا تعلق ہے۔ ہمارے ہاں یہ راہ قطعاً غلط ہے، اس لیے جب تک طریقِ فکر میں جزوی وحدت ہی موجود نہ ہو، یہ مناظرانہ حوالجات ہمیں ان سے قریب نہیں کر سکتے، نہ وہ ہمیں اپنا سمجھ سکتے ہیں۔ جس شخص کے ذہن میں نکاح کا یہ تصور موجود ہو، جس میں

---

[1] یہ کتاب اصلاً مولانا حکیم عبدالسمیع مبارکپوری کی تصنیف تھی، جو ان کے صاحبزادے مولانا فضل الرحمٰن مبارکپوری کے نام سے اشاعت پذیر ہوئی تھی۔ حکیم عبدالسمیع صاحب محدث الہند علامہ عبدالرحمٰن مبارک پوری کے بھتیجے تھے۔ دیکھیں: مکاتیبِ رحمانی (ص: ۳۶)

حسنِ معاشرہ کے ساتھ تمام عمر کے لیے یہ عہد کیا گیا ہو، وہ شعارِ متعہ اور خدن اور حلالہ وغیرہ کو کیوں کر نکاح تصور کر سکتا ہے؟

ضرورت ہے کہ ہمارے شیعہ دوست اپنے طریقِ فکر پر غور فرمائیں۔ مولانا فضل الرحمٰن صاحب کی کوشش قابلِ شکریہ ہے کہ انھوں نے شیعہ فکر کی تصحیح کے لیے مختصر اور مفید مواد جمع فرما دیا ہے۔ اس ضمن میں آیتِ تطہیر، مسئلہ عصمت، حدیث: "علي مني"، حدیثِ سفینہ پر مفید مباحث مختصراً زیرِ قلم آئے ہیں۔ اُمید ہے کہ اس نہج پر سوچنے والے حضرات رسالے سے مستفید ہوں گے اور آیندہ صحت اور حسنِ طباعت کا خیال رہے گا۔

رسالے میں تیزی اور رسمی مناظرات کے انداز سے چھیڑ چھاڑ کی کوشش نہیں فرمائی گئی۔ سلجھے ہوئے انداز سے نفسِ مسئلہ پر جو مناسب تھا، اپنے معلومات کے مطابق لکھا گیا ہے۔ رسالہ "جادلهم بالتي هي أحسن" کی اچھی مثال ہے۔ بہتر ہوگا مذہبی مسائل پر لکھنے والے نوجوان اس انداز سے لکھنے کی کوشش کریں۔[1]

محمد اسماعیل، کان اللہ لہ

---

[1] ہفت روزہ "الاعتصام" لاہور (۱۲ر جنوری ۱۹۵۱ء)

تقریظ:

ضرورتِ تجوید

(مضمون: قاری محمد اسلم صاحب، مدرس مدرسہ محمدیہ گوجرانوالہ)

میں نے مذکورہ مضمون تحریر فرمودہ قاری محمد اسلم صاحب پڑھا ہے۔ قرآن مجید کی غلطی کی صحت حسبِ امکان ضروری ہے۔ قرآن مجید ہمارے پاس اللہ تعالیٰ کی امانت ہے، اسے پوری طرح محفوظ رکھنا چاہیے۔ الفاظ کی صحت کے لیے فنِ تجوید بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے، اس لیے بچوں کو یہ فن سیکھنا چاہیے۔ حافظ محمد اسلم صاحب اس فن کے ماہر ہیں۔ آج کل مدرسہ محمدیہ گوجرانوالہ میں کام کر رہے ہیں۔ احباب سے گزارش ہے کہ ان سے استفادہ فرمائیں۔[1]

محمد اسماعیل، گوجرانوالہ

[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۱۸/ مارچ ۱۹۶۶ء) یہ مضمون بھی اسی پرچے میں شائع ہوا تھا۔

نقد وتبصرہ:

ضعیف حدیث پر ایک تحقیقی نظر

(مضمون: مولانا عبدالجبار کھنڈیلوی ﷫)

حدیث کی حجیت ائمہ سنت کے نزدیک حتمی اور قطعی ہے۔ قرآن، احادیث اور تمام شرائع سابقہ اور انبیاء ﷩ اسی اصول کے قائل ہیں کہ انبیاء ﷩ کے ارشاداتِ غیر متلو بھی حجت ہیں۔ حضرت ابراہیم ﷤ نے غیر متلو وحی کی بنا پر حضرت اسماعیل کو ذبح کرنے کا فیصلہ فرمایا۔ حضرت اسماعیل نے اسی وحی پر یقین فرما کر اپنی گردن ذبح کے لیے پیش کر دی۔

حضرت موسیٰ ﷤ نے فرعون اور اس کے رفقا کو دعوت دی، قرآنِ حکیم سے معلوم ہوتا ہے، یہ دعوت نزولِ تورات سے پہلے تھی، سورت قصص میں ہے:

﴿وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ الْاُوْلٰى بَصَآىِٕرَ لِلنَّاسِ وَ هُدًى وَّ رَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ﴾ [القصص: ٤٣]

موسیٰ ﷤ کو ہم نے پہلوں کی تباہی کے بعد کتاب عطا فرمائی۔ غرض فرعون اور اس کی قوم کی بربادی حدیثِ موسیٰ کی مخالفت کے سبب سے عمل میں آئی، اس لیے انکارِ حدیث کل انبیاء ﷩ کے انکار کے ہم معنی ہے، یہاں تک بحث حدیث کے متعلق اس بنا پر ہے کہ حدیث آنحضرت ﷺ کے اعمال اور ارشادات اور مسلمہ اجتہادات سے تعبیر ہے۔

سند کا اثر:

احادیث کے ہم تک پہنچنے میں اسناد اور رجالِ اسناد کو دخل ہے۔ احادیث میں جہاں سیکڑوں احادیث متواتر ہیں، وہاں ہزاروں کی تعداد میں ایسی احادیث بھی ہیں، جو آحاد ہیں اور تواتر کی حد تک نہیں پہنچ سکیں۔ یقیناً ائمہ اسلام اور قائدینِ سنت کے نزدیک یہ احادیث درجہ تواتر سے قاصر ہیں۔ ان پر قرآنِ عزیز کی طرح وثوق نہیں کیا جا سکتا۔ الفاظِ قرآن کو جو تواتر نصیب ہوا، احادیث کے ذخیرے کا کافی حصہ اس تواتر سے محروم ہے، اسی لیے احادیث کے اس ذخیرے کو ائمہ نے ثانوی حیثیت سے قبول فرمایا ہے۔

رجالِ اسناد پر کلام:

رواتِ حدیث اور ان کے ذاتی اوصاف پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ رواۃ کے عیوب پر دو طریق سے گفتگو کی گئی ہے۔ بعض عیوب ایسے ہیں کہ جن کا روایت پر تو اثر پڑتا ہے، لیکن راوی کے تقدس پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا، مثلاً: ضعفِ حفظ، یہ قدرتی نقص ہے۔ یہ راوی کے اختیار کی چیز نہیں، کتنا بڑا امام کیوں نہ ہو، اس کا حافظہ کمزور ہوسکتا ہے، اس سے روایت ضعیف ہوجائے گی، لیکن راوی کے زہد وتقویٰ، امامت اور عفت پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ امراض خدا تعالیٰ کی طرف سے ہیں، ان کا آنا اور جانا دونوں خدا تعالیٰ کے اختیار میں ہیں۔

بعض ایسے نقائص ہیں، جن کا اثر راوی اور روایت دونوں پر پڑتا ہے، جیسے بدعت، بعض اقسامِ تدلیس اور وضع وتخلیقِ احادیث کی عادت۔ یہ ایسے عیوب ہیں، جن سے راوی اور روایت دونوں بے کار ہوجاتے ہیں، تاوقتیکہ وجوہِ ضعف پر غور نہ کر لیا جائے۔ ضعف کا لفظ متذکرہ صدر دونوں قسموں کو شامل ہے، اور بعض قرائن اور کثرتِ طرق سے ضعف کی بعض اقسام کا ازالہ بھی ہوسکتا ہے۔ ضعف کے باوجود حدیث قابلِ عمل رہتی ہے، تاوقتیکہ کسی صحیح تر حدیث سے متعارض نہ ہو، تعارض کے وقت صحیح تر حدیث کو ترجیح دی جائے گی۔

یہ اصلِ عظیم گو ائمہ حدیث اور اصولِ حدیث کے نوشتوں میں موجود ہے، لیکن اس کی بنیاد عقل پر ہے۔ دنیا کا کوئی حادثہ یا کوئی خبر آپ پرکھنا چاہیں تو آپ کو اس نوع کے اصول کے سوا چارہ ہی نہیں۔

ائمہ حدیث نے وجوہِ جرح پر بحث فرماتے ہوئے کسی چھوٹی موٹی غلطی کو بھی نظر انداز نہیں فرمایا اور کسی بڑے سے بڑے آدمی کو بھی نہیں بخشا۔ بیٹے نے باپ کا لحاظ نہیں فرمایا اور شاگرد نے استاد پر رحم نہیں کیا۔ جو عیب معلوم ہوا، واشگاف کہہ دیا۔ حق بھی یہی ہے کہ جب معاملہ چھان پھٹک کا ہو تو کم اور زیادہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، جو حقیقت ہو، اسے کہنا ضروری ہے۔

اسی علم رجال اور اوصافِ رواۃ سے تنگ آ کر ایک گروہ نے حدیث کی حجیت ہی سے انکار کر دیا، دوسرے گروہ نے صحیح اور ضعیف کو علی الاطلاق قبول کیا، بلکہ موضوعات کی بھی مرمت شروع کر دی۔ حضرت مولانا عبدالجبار صاحب کھنڈیلوی شکر گزاری کے مستحق ہیں کہ انھوں نے مراتبِ ضعف پر رد وقبول کے لحاظ سے بحث فرما کر اعتدال کی راہ کو واضح فرمایا ہے۔

کاش! مولانا اس پر مزید وضاحت سے خامہ فرسائی فرماتے۔ ابھی بحث تشنہ ہے۔ زدني أيضاً زاده الله صلاحا.[1]

محمد اسماعیل، گوجرانوالہ

---

[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۲۸؍ ستمبر ۱۹۵۱ء)

نقد و تبصرہ:

تکبیراتِ عید

(مضمون: مولانا عبدالجبار کھنڈیلوی رحمہ اللہ)

تکبیراتِ عید کے متعلق اہلِ علم کے دو مسلک ہیں، ایک گروہ بارہ تکبیرات قبل القراءۃ کا قائل ہے۔ امام مالک، امام احمد، امام شافعی رحمہم اللہ کا بھی یہی معمول ہے، اس مسلک کی تائید عمرو بن عوف، حضرت عائشہ، ابن عمر، عبدالرحمان بن عوف اور سعد موذن کی روایات سے ہوتی ہے۔ عمرو بن عوف کی روایت کو "أحسن شيئ روي في هذا الباب" فرماتے ہیں، حالاں کہ اس میں بشر بن عبداللہ راوی متہم بالکذب ہے۔ (شافعی، ابو داود، ابن حبان)

میزان الاعتدال میں حضرت عائشہ کی روایت بحوالہ ابو داود ہے اور اس کے راوی ابن لہیعہ ہیں، ان کا ضعف مشہور ہے۔ ابن عمر کی روایت دارقطنی وغیرہ میں ہے۔ اس میں فرج بن فضالہ منکر الحدیث ہے۔ (بخاری) سعد موذن کی روایت میں بقیہ ضعیف ہے اور عبدالرحمٰن بن عوف کی روایت میں حسن بجلی ضعیف ہیں۔ عبداللہ بن عمر کی روایت کے متعلق امام بخاری فرماتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے۔ عراقی اس کی سند کو صالح کہتے ہیں اور اصل یہی حدیث ہے، جسے "أحسن شيئ روي في الباب" کہنا چاہیے۔ ترمذی کی ترجیح و تحسین کا مدار بھی طرق کے تعدد پر ہی معلوم ہوتا ہے، ورنہ ان کی مصطلح تحسین تو غرابت کے منافی ہوسکتی ہے، اس کا مفاد لغوی تحسین بھی نہیں ہوسکتا۔ عبداللہ بن عمرو کا طریق وہی ہے، جو عن ابیہ عن جدہ سے روایت فرماتے ہیں۔ اسی سند پر محدثین کی گفتگو مشہور ہے۔ سند بلاشک قابلِ اعتماد ہے، علی الاطلاق ضعیف نہیں، لیکن صحیح کی ان اعلیٰ اقسام سے بھی نہیں، جس کی مخالفت کو انشراح کے ساتھ ناجائز اور نادرست کہا جا سکے۔

دوسرے مسلک کی تائید صرف بعض آثار سے ہوتی ہے۔ مرفوعاً صرف حضرت ابو موسیٰ اشعری سے ایک حدیث مروی ہے، جس کی سند میں عبدالرحمٰن بن ثابت بن ثوبان عنسی ہیں، ان میں ائمہ حدیث کو کلام ہے اور صحیح یہ ہے کہ یہ بھی حضرت ابن مسعود کا اثر ہے، مرفوع نہیں، اس لیے اس میں تو کلام نہیں کہ توازنِ احادیث کے لحاظ سے پہلا مسلک راجح ہے۔ احناف رحمہم اللہ کا مسلک ائمہ حدیث کے نقطۂ نظر سے ضعیف ہے۔

لیکن دونوں مسلک کی موید روایات فی الجملہ کلام سے خالی نہیں۔ اسانید کے اسی توازن کی موجودگی میں

محترم المقام مفتی صاحب کے ارشاد پر کہ اہلِ حدیث نمازِ عیدین میں حنفی کی اقتدا نہ کرے، انصاف پر مبنی نہیں۔ میں یقین رکھتا ہوں کہ محترم مفتی صاحب اپنے اس فتوے پر نظر ثانی فرمائیں گے۔ مسلک اہلِ حدیث کی اساس تو صرف اس اصل پر ہے کہ اجتہادی مسائل میں فرقہ وارانہ عصبیت سے احتراز کیا جائے۔ ترجیح کی بنیاد دلائل پر ہو، مگر افسوس ہے کہ ہم لوگ خود ایک فرقہ بن رہے ہیں۔ أعاذنا الله من الافتراق الشنیع.

ایسے فرعی اجتہادی مسائل میں اپنے مسلک کی حمایت اور عملاً اس کی پابندی تو از بس ضروری ہے، لیکن دوسرے کی اقتدا کے عدمِ جواز کا فتویٰ جسارت ہے اور اہلِ تحقیق کے لیے قطعی نامناسب۔ اہلِ تحقیق کو امام بخاری اور شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی طرح وسیع الصدر ہونا چاہیے، اقتدا کے معاملے میں اہلِ بدعت کو بھی بالکل نظر انداز کرنا نہیں چاہیے۔ (ملاحظہ ہو: فتاویٰ ابن تیمیہ رحمہ اللہ مطبوعہ اہلِ نجد جدید)

حضرت المحترم شیخ مولانا انور شاہ صاحب اور ان کے تلامذہ کی یہ عادت تھی اور ہے کہ اگر شوافع یا موالک وغیرہ احناف کے شرائط اور قیود کی پابندی کریں تو اقتدا درست ہے۔ یہ اسی طرح بے معنی اور مبنی بر تعصب ہے۔ امام اگر دیانتاً ایک مسلک کو صحیح سمجھ کر اس کا پابند ہے، مقتدی کو اس کی تحقیق سے اتفاق ہو یا نہ ہو، اقتدا میں کوئی حرج نہیں۔ تشبیک کی موجودگی میں اگر عبداللہ بن مسعود کی اقتدا درست ہے تو احناف کی تکبیرات سنتِ منسوخہ سے زیادہ کڑوی نہیں، اس لیے اہلِ حدیث کو احناف کی اقتدا بلا نکیر درست ہے۔[1]

والسلام

محمد اسماعیل، گوجرانوالہ

---

[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۱۰ نومبر ۱۹۵۰ء)

تبصرہ و تعارف:

صلاۃ الرحمٰن

(تالیف: حافظ محمد شریف، ناشر: جمعیت تبلیغ اہلِ حدیث، ڈپٹی باغ سیالکوٹ)

حافظ صاحب نے وقت کی ضرورت کو پورا فرمایا، اس میں اذکار اور طریقۂ نماز سنت کے مطابق ذکر فرمائے گئے ہیں۔ نماز اختصار کے باوجود جامع ہے، نمازِ جنازہ، نمازِ تراویح وغیرہ کا ذکر بھی کر دیا گیا ہے، کاغذ سفید عمدہ اور دیدہ زیب ہے۔

یہ نماز ہر گھر میں موجود ہونی چاہیے، اہلِ توحید اپنے بچوں کو بچپن ہی میں یہ تمام دعائیں یاد کرانے کی سعی کریں۔[1]

[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۲۹/ جون ۱۹۵۱ء)

تبصرہ وتعارف:

مفردات القرآن

(تالیف: امام راغب اصفہانی۔ ترجمہ وحواشی: مولانا عبدہ الفلاح۔ ناشر: اہلِ حدیث اکادمی لاہور)

قرآنِ عزیز کا طالب علم قرآن کے فہم میں چار مقامات سے استفادہ کرسکتا ہے:

① قرآنِ عزیز۔ ② سنتِ نبویہ علیہ التحیۃ والسلام۔ ③ لغتِ عرب ④ اور عقلِ سلیم سے۔

سنت کی حفاظت، جمع و تدوین کی ذمے داری ائمہ حدیث نے لی اور اس کا حق ادا کر دیا۔ شکر اللہ مساعیھم۔ لغت کے دفاتر موجود ہیں۔ علماے لسان شکریے کے مستحق ہیں، جن کی محنت نے عربی زبان کو حیاتِ دوام بخشی۔ عقلِ سلیم اللہ تعالیٰ کی عطا ہے۔ یہ نہ بکتی ہے اور نہ اس کی جمع و تدوین ممکن ہے، بلکہ عقلا میں تفاوتِ مراتب نے حجتِ عقل کو اور بھی معما بنا دیا ہے۔

ان تمام اسباب و ذرائع کی موجودگی کے باوجود قرآن خود اپنا محتاج ہے۔ قرآن ایک لفظ کو متعدد مقامات میں استعمال فرماتا ہے۔ بسا اوقات اس کا استعمال الگ الگ معنی میں فرمایا گیا ہے۔ اس لیے اُمت نے ہر آیت اور ہر مقام کے پیشِ نظر خود قرآن کے الگ لغت مرتب فرمائے۔ اس موضوع پر کافی کتابیں لکھی گئیں، جن میں حافظ ابن قتیبہ دینوری کی "القرطین" اور امام راغب کی "مفردات القرآن" مشہور اور متداول ہیں، ان میں مفردات القرآن زیادہ جامع اور مفید ہے۔ کتاب چوں کہ عربی تھی، اس لیے اُردو دان حضرات اس کے فیوض سے محروم تھے۔

برادرم مولانا محمد عبدہ شیخ الحدیث والادب جامعہ محمدیہ اوکاڑہ انتہائی شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اسے سلیس اردو کا دلکش جامہ پہنا کر اُردو دان اصحابِ ذوق کے سامنے پیش فرمایا اور شروع میں ایک مختصر لیکن جاندار مقدمہ لکھا۔ اللہ تعالیٰ انھیں مزید توفیق مرحمت فرمائے کہ وہ قرآن وسنت کی خدمت کرسکیں۔ مجھے یقین ہے کہ دیانت دار اور دانش مند منکرینِ سنت اپنی دیرینہ لغزش کو محسوس فرمائیں گے۔ وہ قرآن فہمی کی ساری ذمے داری لغتِ عرب پر سمجھتے ہیں۔ اس سے بسا اوقات ان کی قرآنی تشریحات مضحکہ خیز ہو جاتی ہیں۔

میں نے جستہ جستہ مقامات سے ترجمہ دیکھا۔ میں قارئین کرام اور قرآنِ عزیز کے طلبہ کو اس کتاب کے مطالعے کی دعوت دیتا ہوں کہ وہ اُسے بہ غور پڑھیں اور قرآنِ عزیز کو سمجھیں۔ خصوصاً منکرینِ سنت حضرات۔ عَسَى اللّٰهُ أَنْ يَّجْعَلَ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ عَادَيْتُمْ مِّنْهُمْ مَّوَدَّةً[1] مولانا کا مکرر شکریہ۔ والسلام

---

[1] ہفت روزہ "الاعتصام" لاہور (۱۰/ اپریل ۱۹۶۴ء)

روز نامہ ''الجمعیۃ'' دہلی

''جمعیت علمائے ہند'' ہندوستان کے مسلمانوں کی واحد نمایندہ جماعت ہے۔ تقسیمِ ہند کے بعد سے لے کر اب تک اس نے جو وہاں سیاسی، مذہبی، اصلاحی اور اسلامی خدمات انجام دی ہیں، ان کا اعتراف نہ کرنا حقیقتِ حال پر پردہ ڈالنا ہے۔ وہاں کے سیاسی حالات سے بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے کہ جمعیۃ العلماء ہند کا وجود وہاں نہایت ضروری ہے، اس کے اکابر نے جس تن دہی اور ہمت و استقلال سے مسلمانوں کی مدد کی ہے، وہ ان کا سب سے بڑا سیاسی اور اسلامی کارنامہ ہے، جو ہمیشہ تاریخ کے سینے میں محفوظ رہے گا۔

جمعیت علماے ہند کا واحد آرگن روزنامہ ''الجمعیۃ'' دہلی ہے، جو گذشتہ کئی سال سے برعظیم کے مشہور صحافی مولانا محمد عثمان فارقلیط کی زیرِ ادارت نکل رہا ہے، اس کی توسیعِ اشاعت کے لیے مولانا منظور حسین صاحب قاسمی (نمایندہ خاص جمعیت علماے ہند) آج کل پاکستان کا دورہ فرمارہے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ جمعیت علما اور اس کے اخبار ''الجمعیۃ'' کے ساتھ تعاون کرنا، وہاں کے مسلمانوں کی براہِ راست مدد کرنا ہے۔

مولانا پاکستان کے چند بڑے بڑے شہروں میں تشریف لے جائیں گے اور ''الجمعیۃ'' کے لیے خریدار مہیا کریں گے۔ ظاہر ہے کہ اتنا بڑا کام وہ تنہا نہیں کرسکیں گے۔ اس لیے آپ احباب اُن کے ساتھ اس کارِ خیر میں پورا پورا تعاون کریں۔ میں توقع رکھتا ہوں کہ آپ ان کو اپنے مقصد میں کامیاب کرانے کے لیے ہر ممکن سعی کریں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ پاکستان سے ہندوستان کو مراجعت کے وقت ان کے دل پر آپ سے متعلق خلوص و محبت کے نقوش اُجاگر ہوں۔[1]

محمد اسماعیل

ناظمِ اعلیٰ جمعیت اہلِ حدیث، مغربی پاکستان، گوجرانوالہ

---

(1) ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۲۸ر دسمبر ۱۹۵۱ء)

مکاتیب

مکتوب نمبر 1

(حضرت سلفی رحمہ اللہ کا ایک سوانحی مکتوب)[1]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جناب علما کا تعارف کرانا چاہتے ہیں اور میں شاید ان میں سے نہیں ہوں۔ یہاں تو ''چار پائے وکتابے چند'' کی صورت پر عبداللہ بن سہل کا ارشاد ہے: "من لم يعمل فليس بعالم".

البتہ ان لوگوں سے محبت ہے، جن حضرات کو اللہ تعالیٰ نے عمل کی توفیق مرحمت فرمائی۔

أحب الصالحين ولست منهم　　　لعل الله يرزقني صلاحاً

تعمیلِ ارشاد میں چند حروف لکھ رہا ہوں۔

مسقطِ راس ڈھونیکی از مضافات وزیر آباد ضلع گوجرانوالہ ہے۔ ابتدائی تعلیم وزیر آباد میں پائی۔ وزیر آباد میں حضرت الامام حافظ عبدالمنان صاحب محدث نے ''نصرة العلوم'' کے نام سے مدرسہ جاری فرمایا۔ صرف ونحو کی ابتدائی کتابیں مولوی عمر الدین صاحب مرحوم سے پڑھیں، جو اسی مدرسے میں پڑھاتے تھے۔ نحو کی اوپر کی کتابیں: ابن عقیل، شرح جامی، الفیہ، آجرومیہ؛ حضرت حافظ صاحب سے پڑھیں۔ حدیث اول تا صحیحین حضرت، حافظ صاحب سے پڑھی۔ حضرت حافظ صاحب مرحوم، سید نذیر حسین دہلوی رحمہ اللہ کے اکابر تلامذہ میں سے تھے۔ شیخ حسین بن محسن انصاری رحمہ اللہ سے بھی آپ کو اجازتِ حدیث تھی۔ مولانا عبدالحق بنارسی رحمہ اللہ، شاگرد امام شوکانی رحمہ اللہ، سے بھی شرفِ تلمذ تھا۔

تفسیر بیضاوی حضرت مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی سے پڑھی۔ ادب اور معقولات کی کتابیں مولانا محمد حسن (امرتسری) کے مدرسے میں مختلف اساتذہ سے پڑھیں۔ شرح وقایہ حضرت مفتی محمد حسن صاحب سے پڑھی۔ مطول، مختصر المعانی، ہدایہ اولین و آخرین علامہ محمد حسین ہزاروی سے پڑھی، جو مدرسہ غزنویہ امرتسر میں پڑھاتے تھے۔

۱۹۲۱ء سے ۱۹۳۰ء تک حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمہ اللہ کے حسبِ حکم مناظرات کی طرف توجہ رہی۔ قادیانی، عیسائی اور چکڑالوی حضرات سے کئی جگہ گفتگو ہوئی، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس مرض سے نجات دے۔

---

[1] مرکز اسلامی لائبریری نور پور (متصل بہاولپور) حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ سے تعلق رکھنے والے پانچ سو مستند اکابر علما کے سوانح حیات بنام ''تذکرہ علمائے ربانیین'' مرتب کر رہی تھی، اس سلسلے میں مولانا محمد رشید احمد صاحب نے، جو اس لائبریری کے ناظم تھے، حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمہ اللہ سے بھی رابطہ کیا، چنانچہ حضرت سلفی رحمہ اللہ نے ''۰۸۔ ۹۔ ۶۷ء'' کو رشید احمد صاحب کے نام ایک مکتوب لکھا، جس میں اپنے سوانح ذکر کیے۔ مندرجہ بالا سطور میں وہ مکتوب گرامی درج کیا جا رہا ہے۔

دی۔ رسمی مناظرات بالکل ترک کر دیے۔ اب طبیعت کی ان مناظرات کے ساتھ قطعاً موزونیت نہیں اور اس راہ کو باعثِ تسکین سمجھتا ہوں۔

۱۹۲۱ء سے گوجرانوالہ جامع مسجد میں مقیم ہوں۔ درس و تدریس کا مشغلہ مسلسل چل رہا ہے۔ مدرسہ محمدیہ کے نام سے جاری ہے، اس کے ساتھ شعبہ حفظ و تجوید بھی ہے، اس وقت مدرسین کی تعداد تقریباً ۹ ہے۔ حجیتِ حدیث کے متعلق چند رسائل لکھے ہیں:

1. حدیث کی تشریعی اہمیت۔
2. جماعتِ اسلامی کا نظریہ حدیث۔
3. مقامِ حدیث قرآن کی روشنی میں۔
4. نیز تحریک آزادیِ فکر اور شاہ ولی اللہ کی تجدیدی مساعی وغیرہ،

ایڈیٹری بالکل نہیں کی۔ خطابت کا سلسلہ گوجرانوالہ جامع اہلِ حدیث میں مسلسل جاری ہے۔ جمعیت کی تاسیس ۱۹۴۸ء میں ہوئی، اس وقت سے اس کے ساتھ تعلق ہے۔ اب بھی "كَبَّرَنِيْ مَوْتُ الْكبراء" کے مصداق تعلق قائم ہے۔ دعا ہے کہ اسی راہ سے اللہ دین کی خدمت اور کتاب و سنت کی اشاعت کا موقع بہم پہنچا دے اور انجام بخیر ہو۔ والسلام

فقط

محمد اسماعیل، کان اللہ لہ

............❀❀❀............

مکتوب نمبر 2

(ایک نصیحت آموز خط)[1]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

گجرانوالہ

۱۱۔۸۔۶۶ء

محترم مولانا صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

کئی دن ہوئے خط ملا تھا۔ مصروفیت اور علالت کی وجہ سے جواب نہ دے سکا۔ تبلیغ میں الفاظ کی شدت اور

---

[1] یہ خط مولانا سلفی رحمہ اللہ نے اپنے ایک تلمیذِ رشید مولانا محمد یوسف صاحب (خطیب جامع اہلِ حدیث چکوال ضلع جہلم) کے نام لکھا تھا۔ دیکھیں: ہفت روزہ "الاعتصام" لاہور (۲۳/ اگست ۱۹۶۸ء)

فتویٰ بازی سے پرہیز کریں، اس سے نفرت بڑھتی ہے۔ ﴿وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ﴾ پر عمل کریں۔لوگوں سے ذاتی تعلقات بڑھائیں۔غم وخوشی میں ان سے مناسب ربط قائم رکھیں، یہ بے حد موثر چیز ہے۔

اخراجات محدود رکھیں اور قناعت سے کام لیں۔قرض اور سوال دونوں میں آبرو کو خطرہ ہے، اکثر علما اسی وجہ سے بدنام ہوتے ہیں۔اپنے اخراجات کا کنٹرول کرنے سے ان دونوں چیزوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔

منتظمین سے تعاون فرمائیں۔ جماعت میں پارٹی بازی نہ ہونے پائے، اس کا پورا پورا خیال رکھیں۔ بعض لوگ اختلاف برائے اختلاف کے عادی ہیں، ان سے اِغماض کرنا چاہیے۔

نماز باجماعت اور رات کو بیداری کی عادت ڈالیں، اس میں بڑی برکت ہوتی ہے۔

والسلام

محمد اسماعیل گوجرانولہ

مکتوب نمبر 3

(منصبِ اَمارت پر فائز ہونے کے بعد احبابِ جماعت کے نام ایک مکتوب)

برادرانِ کرام!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

جماعت کا انتخاب ۱۹؍جنوری ۱۹۶۴ء کو ہوا۔ اسی دن سے مبارک بادی کے خطوط مسلسل آ رہے ہیں۔ جماعت کا اعتماد یقیناً برکت ہے اور اللہ تعالیٰ کا احسان۔

لیکن آپ یقین فرمائیں کہ یہ ایک بوجھ ہے۔خصوصاً ایسی امارت جس کی بنیاد صرف اَخلاق پر ہو۔اس کے پیچھے کوئی مادی قوت نہ ہو۔اس میں مشکلات زیادہ ہوتی ہیں اور ان کے حل کے اسباب کم بلکہ کالعدم۔

اس کے ساتھ ہی بعض ایسے حضرات بھی یقیناً موجود ہوں گے، جنھیں یہ انتخاب ناپسند ہوگا اور وہ شاید کوشش فرمائیں کہ نظم کی یہ کوششیں ناکام ہو جائیں۔ان حالات میں مبارک باد پر وقت صَرف کرنے کے بجائے اللہ تعالیٰ سے قبولیت کے اوقات میں دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ کام کرنے کی توفیق مرحمت فرمائے، حالات کو سازگار کرے، احباب اور رفقا کے دلوں میں اُلفت پیدا فرما کر ہم سب کو جمع کلمہ کی توفیق دے۔ اللهم ألف بين قلوبنا وأصلح ذات بيننا.

دوم: مجھے صحیح مشوروں سے نوازیں۔ مفید اور مختصر خطوط لکھیں، جن سے مجھے مدد ملے اور کام کی راہیں کھلیں۔ اور سب سے بہتر یہ ہوگا کہ مجھے میری کمزوریوں کے متعلق آگاہ فرمائیں، تاکہ میں بھی اپنی اصلاح کروں۔

اپنی مقامی ضروریات اور مشکلات سے اختصار کے ساتھ آگاہ فرمائیں، تاکہ اس کی اصلاح کے متعلق سوچا جائے۔ اگر ضرورت ہو تو اسے عاملہ یا شوریٰ میں پیش کیا جائے۔

غیر ممکن اور خارج از استطاعت امور کے متعلق طویل خطوط لکھنے سے کوئی فائدہ حاصل نہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہمارا یہ نظام طوعی ہے، حاکمانہ اور مادی نہیں۔

نیز خطوط میں لفظِ امیر کا وظیفہ نہ کیا جائے۔ ہر لفظ کا استعمال وقت پر ہی مناسب ہوتا ہے، جس طرح طریقِ تخاطب ہوتا تھا، وہی مناسب ہوگا۔

اپنی جگہ پر جماعت کے نظام کو مضبوط سے مضبوط تر بنائیں، تاکہ لوگ اَخلاقی اقدار کے سامنے جھکنا سیکھیں۔ اصل اطاعت یہی ہے کہ انسان اخلاقی اقدار کو قبول کرنے کا عادی ہو۔ اصل خدمت یہی ہے کہ ہر جگہ نظام کو پختہ اور مضبوط کیا جائے۔ اگر کہیں کوئی بزرگ اعتراض کریں تو ان سے بحث نہ کی جائے۔ ایسے حضرات کو نظر انداز کر کے اصل کام کی طرف توجہ دی جائے۔ تمام شبہات و اعتراضات کا یہی صحیح جواب ہے۔

عاملہ کا اعلان ہو چکا ہے۔ سارے صوبے[1] سے اکیس آدمیوں کا چناؤ بڑا مشکل ہے، جسے اپنی سوچ کے مطابق کر دیا گیا۔ اب اسے بدلنا مشکل ہے۔ آپ کی اطلاع پر تلافی کسی دوسری طرح ہی ہو سکے گی۔

والسلام

محمد اسماعیل

(امیر مرکزی جمعیت اہلِ حدیث، مغربی پاکستان)

............❀❀❀............

[1] اس سے مراد مغربی پاکستان کے چاروں صوبے پنجاب، سندھ، خیبر پختون خواہ اور بلوچستان ہیں۔

مکتوب نمبر 4

(مولانا داود غزنوی رحمہ اللہ کے نام)

مرکزی جمعیۃ اہلِ حدیث مغربی پاکستان

شیش محل روڈ۔ لاہور

مکرم و محترم سیدی حضرت صدرِ محترم مرکزی جمعیت اہلِ حدیث! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

مزاجِ گرامی! جناب ناظم محکمہ اوقاف کے ناظم محترم کو مل چکے ہوں گے۔ یہاں کے اربابِ اختیار کا ذہن کچھ اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ وہ مساجد کو مزاروں کی صف میں سمجھتے ہیں۔ بعض مساجد کے متعلق ان کی رائے درست بھی ہے، لیکن اپنی مرکزی جمعیت اور اس کے متعلق مساجد اور اداروں کی پوزیشن یہ نہیں۔ حسابات درست ہیں اور خیانت کا کوئی احتمال نہیں۔ تفصیلات سے مطلع فرما دیں۔

مولانا اسحاق مدیر ''الاعتصام'' آئے تھے۔ جناب کا نصیحت آمیز پیغام ملا۔ حضرت الاستاذ مفتی محمد حسن صاحب کی ناراضگی سے بے حد رنج ہوا۔[1] آج کے دیوبند میں میرے علم کے مطابق حضرت ہی کی شخصیت ہے، جن کے علم، خلوص، زہد اور تقویٰ پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ میرے تو وہ بے حد محسن ہیں۔ وہ ناراض بھی ہوں، میرے دل میں ان کے لیے بحمد اللہ وہی احترام ہے اور یقین ہے کہ آیندہ بھی ۔إن شاء اللہ۔ رہے گا۔ میں حضرت مفتی صاحب کو براہِ راست خط لکھنا چاہتا تھا، لیکن اس تقریظ کی موجودگی میں یہ کوشش بے سود تھی۔

یہ تقریظ آج سے قریباً پندرہ سولہ سال پہلے کی ہے اور اس میں بھی مولوی اشرف نے کافی مرمت کر دی ہے۔ میں نے اس وقت بھی اس سے کہا تھا، مگر وہ روپڑی حضرات کی گود میں چلا گیا۔ میں خاموش ہو گیا، تا کہ جھگڑا بڑھنے نہ پائے۔

مولانا تھانوی رحمہ اللہ کا خواب[2] میاں صاحب کے متعلق بعض رسائل میں شائع ہوا تھا۔ واقعی اس وقت

---

[1] مفتی محمد حسن امرتسری مراد ہیں، جو جامعہ اشرفیہ کے بانی اور مولانا تھانوی کے خلیفہ مجاز تھے۔ یہ مولانا عبدالجبار غزنوی کے شاگرد اور مولانا سلفی رحمہ اللہ کے استاد بھی تھے۔ ''نتائج التقلید'' (تالیف: مولانا محمد اشرف سندھو) پر مولانا سلفی رحمہ اللہ کی تقریظ پر رنجیدہ تھے، کیوں کہ اس میں مولانا سلفی رحمہ اللہ نے سید نذیر حسین دہلوی کے متعلق مولانا تھانوی کے ایک خواب اور اس کی تعبیر پر نقد کیا تھا، جس کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔

[2] خواجہ عزیز الحسن (خلیفہ تھانوی) ذکر کرتے ہیں کہ مولانا اشرف علی تھانوی اپنے طالب علمی کے زمانے کا ایک خواب بیان کرتے ہیں کہ میں نے دیکھا، مولوی نذیر حسین صاحب کی دہلیز میں کچھ طلبا جمع ہیں اور چھاچھ تقسیم ہو رہی ہے۔ ←

طبیعت [کو] بہت کوفت ہوئی تھی۔ میاں صاحب مرحوم کے متعلق ہمارے جذبات اس سے کہیں نازک ہیں، جس قدر حضرت مفتی صاحب کے مولانا تھانوی رحمہ اللہ کے متعلق۔ تقریظ کی روح یہی تھی۔ اب میں اگر مفتی صاحب کو کوئی معذرتی عریضہ لکھوں تو اس کا معنی میاں صاحب کے ساتھ تعلقات کا سودا ہوگا، اس کے لیے طبیعت اب بھی تیار نہیں۔ اس لیے حضرت مفتی صاحب کو براہِ راست لکھنے سے کوئی فائدہ معلوم نہیں ہوتا۔

الفاظ کے متعلق معذرت بے سود ہے۔ جب ... قائم ہو۔ میرے خیال [میں] حضرت مولانا [نے] اس خواب اور تعبیر میں حضرت میاں صاحب مرحوم اور جماعت اہلِ حدیث سے انصاف نہیں فرمایا۔ عفا اللّٰہ عنه.

مسلک کے متعلق بحمداللہ آج تک کبھی سودا نہیں کیا۔ اکابر دیوبند کے ساتھ عقیدت اور اُن کے علمی احترام کے باوجود مسلک میں لچک کا کبھی خیال نہیں [آیا]۔ اگر مفتی صاحب قبلہ کبھی اچھے موڈ میں ہوں؟ (تو میری طرف سے معذرت فرمادیں)۔

یہاں کے دیوبندی حضرات چونکہ مفتی صاحب کے پاس آتے جاتے ہیں اور معلوم ہوتا ہے وہ گلہ گزاری کرتے رہتے ہیں، ان کے ذاتی خیالات امانت داری کے نام سے جو بلیک میلنگ کرتے ہیں، مجھے

← گو حضرت والا (تھانوی) کو چھاچھ سے طبعاً بے حد رغبت ہے، لیکن خواب میں اس چھاچھ کے لینے سے انکار کر دیا، جو وہاں تقسیم ہو رہی تھی۔ حضرت والا (تھانوی) کے ذہن میں اس خواب کی تعبیر فوراً یہ آئی کہ اس جماعت کا طریق دین کی محض صورت ہے، جس میں معنی نہیں۔ جیسے چھاچھ گو صورتاً دودھ کے مشابہ ہوتی ہے، لیکن اس میں روغن نہیں ہوتا۔ دین کی اور علم دین کی صورت مثالی دودھ ہے، جس کی تائید حدیث سے بھی ہوتی ہے اور یہاں دودھ کے بجائے چھاچھ تقسیم ہوتی ہوئی دیکھی گئی، جو دودھ کے مشابہ تو ہوتی ہے، لیکن دودھ میں جو اصل چیز ہے، یعنی روغن، وہ اس میں نہیں ہوتا۔ (اشرف السوانح: ۱/ ۱۲۷)

اس خواب اور اس کی تعبیر پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا سلفی رحمہ اللہ نے نتائج التقلید پر اپنی تقریظ میں لکھا تھا:

''حضرت مولانا اشرف علی صاحب رحمہ اللہ فنِ تصوف و زہد کے بہترین ماہر مشہور تھے، لیکن حقیقتِ زہد کو خدا ہی جانتا ہے کہ کہاں تک ان میں موجود تھا۔ ہاں اتنا تو ضرور معلوم ہوتا ہے کہ سچے صوفی سنت کے شیدا ہوتے ہیں، مگر حضرت مولانا اشرف علی صاحب کی تصانیف میں سنت اور اصحابِ حدیث سے انتہائی بغض پایا جاتا ہے۔ عفا اللّٰہ عنه.

''اسی غلط تصوف کی وجہ سے ان کی طبیعت پر وہم غالب تھا اور یہ چھاچھ والا خواب اور اس کی تعبیر اسی وہم کا کرشمہ ہے۔ ورنہ چھاچھ پینے کے بغیر انھیں کیسے معلوم ہوا کہ اس میں روغن نہیں؟ ہر چھاچھ تو ایسی نہیں، جس میں روغن نہ ہو، (کیوں کہ دہی کی چھاچھ بھی تو آخر چھاچھ ہی کہلاتی ہے۔ کیا اس میں روغن نہیں ہوتا؟) خدا تعالیٰ مرحوم کو معاف فرمائے۔ خواب کی تعبیر میں انھوں نے حضرت میاں صاحب پر بہت بڑا ظلم کیا ہے۔ وسیعلم الذي ظلموا أي منقلب ینقلبون''

یہ مکمل تقریظ دیکھنے کے لیے زیرِ نظر مجموعے کا صفحہ (۴۸۷) ملاحظہ کریں۔

اس کا پورا علم ہے، لیکن نہ ہی میں اسے مفتی صاحب تک پہنچانا چاہتا ہوں نہ سرِ دست اس کا کوئی امکان ہے۔ میری زندگی [میں] نمایشی تکلفات نہیں، نہ ہی دوستوں میں تکلف کے ساتھ رہنے کی عادت ہے۔ آپ حضرات بھی جانتے [ہیں] میری زندگی کھلی ہے، اس کے باوجود مقامی طور پر احباب پر اس کا جو اثر ہے، وہ جناب سے مخفی نہیں۔

میں نے مولانا اسحاق صاحب سے بھی اس سلسلے میں کچھ باتیں کی تھیں، مجھے یقین ہے انھوں نے بالکل صحیح طریقے سے جناب کی خدمت میں پیش کر دی ہوں گی۔

والسلام

محمد اسماعیل، کان اللہ لہ

مکتوب نمبر 5

(مولانا عبدالغفار حسن رحمہ اللہ[1] کے نام سات خطوط)

(۱)

محترمی مولانا المکرّم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج گرامی! اخبار ''اہلِ حدیث'' ۸/ محرم کی اشاعت میں جناب نے مجھ کو بھی یاد فرمایا ہے،[2] اس کا میں، ممنون ہوں۔ ایسی تقریب سے خاکسار کو چند معروضات پیش کرنے کا موقع مل گیا۔ پھلواری صاحب کا مضمون میرے پیشِ نظر ہے۔[3] درس و تدریس اور خانگی و مقامی مشاغل نے بروقت اس پر توجہ دینے کی مہلت نہ دی۔ میرا

---

[1] مولانا عبدالغفار حسن ۱۹۱۳ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ دار الحدیث رحمانیہ دہلی میں تعلیم مکمل کی۔ جماعتِ اسلامی سے سولہ سال منسلک رہے، بعد ازاں جماعتِ اسلامی کی پالیسیوں سے دل برداشتہ ہو کر قطع تعلقی اختیار کر لی۔ سولہ سال جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں مدرس رہے۔ مارچ ۲۰۰۷ء کو اسلام آباد میں دفات پائی۔

[2] مولانا سلفی رحمہ اللہ نے ہفت روزہ ''اہلِ حدیث'' امرتسر میں ایک سلسلہ مضمون ''مسلکِ اہلِ حدیث اور فریضہ اقامتِ دین، جدید تحریکات اور ہمارا موقف'' لکھا تھا، جس کی ایک قسط (۱۴/ دسمبر ۱۹۴۵ء کی اشاعت) میں مولانا عبدالغفار حسن کو بھی مخاطب کیا کہ وہ بھی جماعتِ اسلامی کے غلط افکار پر تنبیہ کے سلسلے میں حق گوئی کا فریضہ ادا کریں اور لکھا کہ مجھے یقین ہے کہ جماعتِ اسلامی کی ہمدردیاں انھیں اظہارِ حق سے نہیں روکیں گی۔ اس مضمون کی اشاعت کے بعد مولانا عبدالغفار حسن رحمہ اللہ نے حضرت سلفی رحمہ اللہ کو مذکورہ بالا خط لکھا تھا۔

[3] مولانا جعفر پھلواری نے جماعتِ اسلامی کے آرگن ''کوثر'' (جلد:۵، شمارہ: ۴۴۔ ۴۵) میں حدیثِ نبوی کے متعلق ایک مضمون لکھا تھا، جس پر مولانا سلفی نے اپنے مضمون مندرجہ ''اہلِ حدیث'' امرتسر (۱۴/ دسمبر ۱۹۴۵ء) میں نقد کیا تھا۔

خیال ہے کہ الگ الگ اس قسم کے مقالات پر تنقید کرنے کے بجائے اگر مسلکِ حدیث پر ایک مستقل جامع کتاب شائع کر دی جائے تو زیادہ مناسب ہوگا، اس میں حدیث کے متعلق ضروری معلومات، ''مسلکِ اعتدال'' پر اصولی بحث، "النظر في الحديث" پر ایک نظر اور مقالہ پھلواری پر تنقید سب یکجا طور پر لوگوں کے سامنے آ سکتی ہیں۔ اس سلسلے میں خاکسار قلمی اور مطبوعہ مواد فراہم کر رہا ہے، اگر آنجناب بھی اس معاملے میں راہنمائی فرمائیں تو حد درجہ ممنون ہوں گا۔

جماعتِ اسلامی میں میری شرکت اس بنا پر ہے کہ موجودہ اجتماعی اور تنظیمی اداروں سے اس کا نصب العین اور طریقِ کار کتاب وسنت کے زیادہ موافق ہے۔

کانگریس، احرار، خاکسار، مسلم لیگ: ان میں سے کسی کے سامنے خالص اسلامی پروگرام نہیں ہے۔ "أصحاب الجحيم" کی رفاقت وتعاون سے ''اصحاب برزخ'' سے تعاون علی البر بہر حال بہتر ہی ہے۔ مشترک مقصد آزادیِ وطن کی خاطر اگر ہندوؤں سے اشتراک، اتحاد اور تعاون ہوسکتا ہے تو اقامتِ دین کے لیے حنفیت واہلِ حدیثیت کے مابین ''برزخ'' والوں سے اشتراک واتحاد کیوں ناگوار ہے؟

جماعتِ اسلامی سے اشتراکِ عمل کی صورت سے تو ایک برزخی صورت ہی پیدا ہوگی، لیکن کانگریس کی ''متحدہ قومیت'' کی ہم نوائی سے تو اصل اسلام ہی خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ آپ تو خود ہی اعتراف کر چکے ہیں کہ ''جماعتِ اسلامی'' نے لیگ، کانگریس اور اشتراکیت کے متعلق مفید لٹریچر تیار کر دیا ہے۔ میں تو اس تحریر سے سمجھا تھا کہ آنجناب بھی ''متحدہ قومیت'' کے خطرات سے آگاہ ہو کر آزادیِ وطن کی نام نہاد تحریک سے دستبردار ہوگئے ہیں۔ لیکن اخبارات سے معلوم ہوا کہ آپ پوری طرح اس سلسلے میں سرگرم عمل ہیں۔ اگر آپ کے نزدیک کانگریسی تحریک درست ہے تو پھر سیاسی کشمکش حصہ دوم کے خلاف تنقیدی قلم اُٹھایئے، تاکہ دوسرے نوجوان بھی اس سعادت سے محروم نہ رہیں۔

محترم مولانا! اگر مسلکِ حدیث کی حمایت کے ساتھ ساتھ اقامتِ دین کا کام کرنا ہے تو موجود ہنگامہ آرائیوں سے الگ ہو کر یکسوئی سے کوئی مفید اور کتاب وسنت کے مطابق عملی پروگرام مرتب فرمایئے۔إن شاء الله۔ بہت سے کام کرنے والے آپ کو مل سکتے ہیں۔ ورنہ کانگریس میں داخل رہتے ہوئے حمایت مسلک اہلِ حدیث جگ ہنسائی کا موقع فراہم کر رہی ہے۔ وردھا اسکیم، ودیا مندر اسکیم اور کانگریس وزارتوں کے تلخ اثرات وثمرات دیکھنے کے باوجود آپ یہ کیسے فرما رہے ہیں کہ لادینی کانگریس کی ذاتیات میں داخل نہیں ہے؟

کیا وطنیت، غیر اسلامی قیادت، مذہب وسیاست کی تفریق، مخلوق کے لیے قانون سازی کا حق تسلیم کرنا،

ان بنیادوں پر کانگریس کی عمارت قائم نہیں ہے؟ وطنیت کا جو تصور کانگریس پیش کرتی ہے، کیا اسلامی ہے؟ تحریک آزادیِ وطن کا قدم قدم پر کتاب وسنت سے تصادم ہے اور ہوگا۔ لیکن پھر بھی آنکھ کا یہ شہتیر نہیں کھٹکتا۔ امید ہے کہ میری یہ تلخ گوئی ناگوار نہ ہوگی۔

جماعتِ اسلامی کی برزخی حالت جس رفتار سے جا رہی ہے، اس کا مجھے احساس ہے، اس کے ذمے دار، کارکنوں میں خامیاں اور کمزوریاں ہیں، کچھ تحریریں مسلکِ سلف سے ہٹی ہوئی ہیں، لیکن جب تک نعم البدل نہیں ملتا، "أصحاب الجحیم" کو "اصحابِ برزخ" پر ترجیح نہیں دی جاسکتی۔ اس جماعت کی اصلاح اور اقامتِ دین کا ہمہ گیر کام کرنے کے لیے دو ہی صورتیں ہیں، یا تو اکابر علمائے حدیث اس میں داخل ہو کر اس کو برزخیت سے نکال لیں یا پھر اسی نہج پر کتاب وسنت کے مطابق ایک دوسرا ادارہ قائم کر لیا جائے جو اقامتِ دین اور حمایتِ کتاب وسنت (بطریقِ سلف) کی خدمت انجام دے اور جماعتِ اسلامی سے تعاون علی البر کی حد تک یگانگت برتی جائے۔ مودودی صاحب کا تو خود یہ اعلان ہے کہ ہماری دعوت جماعت یا شخصیت کی طرف نہیں ہے، بلکہ اسلامی نصب العین کی طرف ہے۔

دستور جماعتِ اسلامی کی اصل روح سے آپ کو اتفاق ہے یا اختلاف؟ اندازِ تعبیر میں اختلاف ہوسکتا ہے، اس کو برداشت بھی کیا جاسکتا ہے، لیکن اگر اس میں کوئی ایسی چیز ہے، جو کتاب وسنت سے صراحتاً متصادم ہے تو پھر قلم کو حرکت دے کر تغییرِ منکر کا فرض ادا کیجیے۔ ورنہ پھر ایک ساتھ یا الگ ہو کر ایسے پروگرام کو ہر دلعزیز بنانے کی کوشش ہی کیجیے۔

مجھے معلوم ہے کہ اہلِ حدیث کانفرنس کے ماتحت تنظیمی کام شروع ہے، لیکن میں اصولاً اس سے متفق نہیں ہوں۔ ٹھیک جس طرح مسلم لیگ چار آنے کے ممبر بھرتی کر کے نسلی مسلمان رنگروٹ بھرتی کر رہی ہے، اسی طرح کانفرنس نے بھی نسلی خاندانی اہلِ حدیث کو منظم کرنے کا بیڑا اُٹھایا ہے۔ کیا انبیاے کرام کا طریقِ کار بھی یہی تھا؟ مسلم لیگی وزارتوں کا جو حشر ہوا، وہی نوعیت یہاں دینی اداروں میں نظر آنے کا خطرہ ہے۔

صحیح صورت یہی ہے، جن لوگوں کے دل میں تڑپ ہے، جو کتاب وسنت کے اتباع پر ہر مفاد کو قربان کر سکتے ہیں، وہ یکجا جمع ہو کر ایک ادارۂ تالیف وتصنیف اور تربیت گاہ کی بنیاد ڈال دیں، اس کام کی ابتدا مختصر حالت سے شروع کی جائے، جب اس کے فوائد ظاہر ہوں گے تو مخلصین خود بخود کھنچنے شروع ہو جائیں گے۔

میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ "مسلکِ اعتدال" مسلکِ محدثین سلف سے ہٹا ہوا ہے، لیکن کیا اسی اصول کو مولانا ثناء اللہ صاحب نے اہلِ حدیث کہلاتے ہوئے تفسیر القرآن اور دوسری اردو تصانیف میں عملاً اختیار نہیں کیا ہے؟ کیا آپ نے اس کے خلاف تقریراً یا تحریراً کوئی احتجاج فرمایا ہے؟ کیا اس غیر مساویانہ سلوک پر گروہی

عصبیت کا الزام عائد نہ ہوگا؟ آخر ﴿وَ لَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰۤی اَلَّا تَعْدِلُوْا﴾ [المائدة: ٨] ﴿کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَ لَوْ عَلٰۤی اَنْفُسِکُمْ﴾ [النساء: ١٣٥] پر عمل کب ہوگا؟

خیال تو یہی تھا کہ یہ خط بصورتِ مضمون ''اہلِ حدیث'' کو بھیج دیتا، تاکہ ناظرین تصویر کے دونوں رخ دیکھ کر صحیح رائے قائم کر سکتے، لیکن گذشتہ تجربے اس کی اجازت نہیں دیتے۔ ''اہلِ حدیث'' کے مدیر محترم حسبِ عادتِ قدیمہ ترمیم و تنسیخ کے بغیر شائع نہ فرمائیں گے۔

''کانگریسی'' اہلِ حدیث علما میں جناب کو میں معتدل المسلک اور متحمل المزاج، وسیع النظر اور صاحبِ درد پاتا ہوں، اس لیے چند گزارشات پیش کرنے کی جرأت کر رہا ہوں۔ شاید کوئی مفید نتیجہ نکل آئے۔ ورنہ نہ میرے پاس وقت ہے اور نہ دوسروں سے اُمید ہے کہ ایسی لمبی تحریر کے لیے دماغ سوزی گوارا فرمائیں گے۔ ممکن ہے کہ قلم سے کوئی ناگوار خاطر کلمہ نکل گیا ہو، اس کے لیے معافی کا خواستگار ہوں۔

والسلام

عبدالغفار حسن

................(جواب)................

واذکر فی الکتاب ''إسماعیل''	Mohammad Ismail
چاہ شاہاں۔ گوجرانوالہ	Chah Shahan
(پنجاب)	Gujranwala
	(Punjab)
تاریخ: ۱۸ محرم الحرام ۱۳۶۵ھ	Dated 23-12-45

حبیبي الأعز! السلام علیکم ورحمة اللّٰه وبرکاته

اگر مولوی ثناء اللہ صاحب کرم نہ فرماتے تو جناب کی توجہ سے محرومی ہوتی۔ تنقید کے متعلق جو خدمت میرے سپرد فرمائیں، میں حسبِ استطاعت حاضر ہوں۔ نامہ گرامی کا انداز مناظرانہ اور الزامی ہے، اس لیے اس کا مطلب تو یہی ہوگا کہ ایک کی بجائے دو گناہگار ہوگئے۔ میری طلب یہ تھی کہ واقعی سچائی سے شناسائی کا موقع ملے، الزامی صداقت فی الواقع صداقت نہیں۔

گرامی نامہ ان غلط نوازیوں کی سمیت سے پوری طرح مسموم ہے، جو ایک تحریک اپنے ماحول کو مخالفین سے محفوظ کرنے یا اپنی گرفت کو مضبوط کرنے کے لیے فضا میں پھیلا سکتی ہے، اس لیے چند گزارشات کرنا چاہتا ہوں، اگر سمع قبول میں آجائیں:

1 "أصحاب الجحيم" سے مخالفت بے شک ضروری ہے، لیکن صرف ان امور میں جو موصل "إلی الجحیم" ہوں۔ اگر یہ لوگ بھی کوئی اچھا کام کریں تو ان سے اشتراک یا ان کی اعانت ممنوع نہیں، بلکہ مستحسن ہے۔

"قال عثمان حين سئل عن اقتداء المبتدع: الصلاة أحسن ما يعمل الناس، فإذا أحسن الناس فأحسن معهم" [صحيح البخاري: ٦٦٣]

2 اگر "اہلِ برزخ" سے اشتراک ایک جنتی کو برزخ میں لا کھڑا کرے تو ایسا اشتراک بے سود ہی نہیں، بلکہ نادرست ہے۔ ﴿اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِیْ هُوَ اَدْنٰی بِالَّذِیْ هُوَ خَیْرٌ﴾ [البقرة: ٦١]

دوزخی برزخ میں آ جائے تو خیر، جنتی برزخ پر فخر کرنے لگے تو گزارش ہے کہ ﴿فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَ مَا كَانُوْا مُهْتَدِیْنَ﴾ [البقرة: ١٦]

3 آیتِ کریمہ: ﴿تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَ التَّقْوٰی﴾ [المائدة: ٢] میں محطِ فائدہ نہ فعلِ تعاون ہے اور نہ اس کے ذہنی مفاعیل۔ محطِ فائدہ فیہ زاید ہے، جسے ظرف "علی البر" اور "علی الاثم" سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ اس لیے اہلِ جحیم اور اہلِ برزخ دونوں کو نظر انداز کر کے "بر" اور "اثم" سے بحث ہونی چاہیے۔ میں جناب کو پورے وثوق سے یقین دلانا چاہتا ہوں کہ اس وقت ہم لوگ اپنی کمزوریوں کے اعتراف کے باوجود إعانت علی الاثم والعدوان کے مرتکب نہیں ہیں۔

﴿وَ مَاۤ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ﴾ [یوسف: ٥٣]

4 اہلِ برزخ اگر اثم وعدوان کا ارتکاب کریں تو ان کے ساتھ تعاون واشتراک بھی ایسے ہی ممنوع ہے، جیسے اصحابِ جحیم کے ساتھ۔ "إذا عملوا أعمالَ أهل الجحيم"، اس لیے ادبا گزارش ہے کہ "أصحاب الجحيم" اور "اہلِ برزخ" کے الفاظ کے ساتھ جذبات سے اپیل نہ کی جائے، بلکہ حقائق پہ نظر رکھی جائے۔

5 کوئی ادارہ اجتماعی ہو یا تنظیمی، اسے محض اس کے دعاوی سے ہی نہ پرکھنا چاہیے، بلکہ اصل پہچان اعمال سے ہونی چاہیے اور اس رفتار سے جو اس نے مقاصد کی طرف بڑھنے کے لیے اختیار کی ہو اور دشمن اس سے کہاں تک متاثر ہوا ہے۔ اس لحاظ سے جماعتِ اسلامی صفر سے بھی کچھ نیچے ہوگی۔ یہاں ابھی ① اچھی روحوں کی تلاش ہے اور کچھ ② اسلامی زندگی کے تجزیے اور کچھ ③ غلطیوں کی نشان دہی اور ④ اس کے بعد ہر شیطان سے جنگ، بشرطیکہ وہ خبیث کہیں نظر آ جائے!!

میں "کوثر" کو التزاماً پڑھتا ہوں۔ عزیز صاحب کی چھیڑ چھاڑ، مولانا رام نگری کے فسانے اور مولانا

پھلواری وغیرہ کے فتاوے اور مباحث سے تعجب ہوتا ہے کہ پہلی جماعتوں کا اندازِ تخاطب کیا یہی تھا؟ زمانہ نبوت اور اس وقت کا ابتدائی پروگرام وفاترِ سنت اور اسفارِ سیرت میں ہمارے سامنے ہے۔ وہاں مفید اور قابلِ فخر لٹریچر کا کوئی مقام ہی نہیں۔ قرآن ایسی مفید کتاب کی اشاعت بھی صرف سینوں ہی میں ہوئی۔ زمانہ صدیق تک قرانیسی بھی اس کی برکات سے محروم رہے۔ لٹریچر کی اِفادی حیثیت سے اب بھی انکار نہیں، لیکن اسے آپ ایک مکتبے کے اعمالِ صالحہ میں شمار فرما سکتے ہیں نہ کہ ایک اجتماعی اور انقلابی تحریک کے محاسن میں!!

6 ایک دنیا پرست لیڈر کے لیے واقعی یہ ایک خوبی ہے کہ وہ اپنے اَتباع کو اتنا بدحواس کر دے کہ وہ حق اور باطل میں امتیاز نہ کر سکیں، لیکن عند اللہ وہ اس کی مسئولیت سے نہیں بچ سکتا۔ اس لیے جس جمود کی دعوت مولانا ابو الاعلیٰ اس وقت جماعتِ اسلامی کے توسط سے دے رہے ہیں، وہ بہت بڑی مسئولیت اپنے سر پر لے رہے ہیں۔

میری ناقص رائے میں جماعتِ اسلامی نے اپنے سر پر دو ذمے داریاں لی ہیں:

1 موجودہ تحریکات پر تنقید، یہ بحیثیت ایک دیانت دار اشاعتی ادارے کے ان کا حق ہے اور مفید کام۔

2 دوم: دوسری تحریکات کی تنقیص اور آپ ایسے مخلص حضرات کے اَذہان کو حقائق کی غلط تعبیر سے مسموم کرنا۔ یہ انگریز اور نظامِ باطل کی درازیِ عمر کے لیے ایک بہترین خدمت ہے۔ میں نے جہاں اس حرکت کے خلاف کچھ کہا، وہاں پیشِ نظر یہی دوسرا پہلو رہا۔ میں اس حرکت کو عملی پہلو سے بے کار محض اور مضر حرکت سمجھتا ہوں۔ بہت سے کام کرنے والے ان اوہام کی وجہ سے بیکار ہوگئے اور یہ انگریز کی بہترین خدمت ہے، جو مولانا اور آپ سب حضرات نادانستہ طور پر پورے خلوص کے ساتھ کر رہے ہیں۔ عفا اللہ عنکم.

اگر آپ حضرات اس تنقیدی لٹریچر کی اشاعت کے ساتھ ملک کی موجودہ تحریکات سے جو بھی اصلح تھی، اس کے ساتھ تعاون کر کے نظامِ باطل کی تھوڑی بہت تخریب فرماتے تو شاید ہم ایسے گناہگار تحریک کے متعلق کچھ سوچتے، مگر اس سکوتِ تام اور جمودِ محض میں مَیں نہیں سمجھ سکا کہ اس کی تگ و دو کی دنیا میں کیا قیمت ہوگی؟ یہ لاساس کا فلسفہ دینِ محمدی میں کوئی دقیع فلسفہ نہیں ہے اور نہ ہی اس سے کچھ فائدہ۔

7 ① حضرت ابوبکر ہجرت کے لیے پہلی دفعہ نکلے اور ابن دغنہ کے ساتھ واپس تشریف لائے۔ اس سے اتنا تو معلوم ہوا کہ نظامِ باطل کی برتری کو ضرورتاً قبول کیا گیا، ان کی دی ہوئی امان سے وقتی استفادہ کیا گیا۔

② حضرت یوسف کے قیامِ مصر میں مولانا پھلواری کے تفسیری نکات کے باوجود میری رائے تو یہی ہے کہ نظامِ باطل کی تخریب کے لیے نظامِ باطل میں شمولیت، ان کی اعانت، غیر مسلم کی قیادت وغیرہ محظورات وقتی طور برداشت کیے جا سکتے ہیں۔

④ غزوہ خندق کے ابتدائی مراحل میں آنحضرت ﷺ اس معاہدے کے لیے آمادہ ہو گئے تھے کہ مدینے کے محاصل سے اپنے مخالفین کو سالانہ کچھ دے دیا کریں۔ غالباً حضرت ابوبکر نے اس تجویز سے اختلاف فرمایا تھا۔[1] نظامِ باطل کی برتری اور حالات کا اقتضا دونوں غور طلب ہیں۔

جماعت کے لٹریچر میں میری ناقص رائے میں جو بین غلطی ہوئی ہے، وہ یہ ہے کہ یہاں دین کے سیاسی پہلو کو تعبدی پہلو کا رنگ دیا جا رہا ہے اور یہاں جزئیات تک کے لیے نصوص کی تلاش کی جا رہی ہے۔ تعبدیات میں تو یہ صورت ایک حد تک قابلِ برداشت ہے، لیکن معاملات میں چند اصولی تحفظات کے بعد معاملات کی تشخیص اور فیصلہ «أنتم أعلم بأمور دنیاکم»[2] کی روشنی میں ہونا چاہیے۔ اگر جماعت میں قوت ہو تو وہ جزوی تحفظات خود پیدا کر لے گی اور قوت ناپید ہو تو اصولِ تحفظات کاغذی معاہدات کی قوت سے نہیں بچ سکتے اور جماعتِ اسلامی کے پروگرام میں تو کاغذی معاہدات بھی شاید نہ ہوں۔ وہاں شاید اصلاحِ نفس ہی سے سارے کام ہو جائیں۔

اصلاحِ اعمال کا پروگرام صحیح ہے، لیکن اس اصلاح کے انتظار میں تعطل خلافِ سنت معلوم ہوتا ہے۔ زمانۂ خیر میں اچھی روحوں کی تلاش کے لیے کوئی ایسی اکتشافی مہم شروع نہیں کی گئی، جیسے کہ جناب کے پروگرام میں اسے اہمیت دی گئی ہے۔ وہاں حضرت صدیق کے ساتھ ماعز اسلمی ایسے لوگ بھی کام کرتے رہے۔ "هذه قسمة لم يُرَدْ به وَجْهُ الله"[3] جیسے ریمارک سن کر بھی کام بند نہیں کیا گیا۔

8 اہلِ حدیث کے تنظیمی کام سے مجھے اس لیے دلچسپی ہے کہ ان گناہگاروں سے ہی کام کے آدمی مل سکتے ہیں۔ بے امید نہیں ہونا چاہیے۔ جن اداروں میں جناب تشریف لے گئے ہیں، وہاں کی کمزوریوں پر اگر صبر کیا جا سکتا ہے تو یہاں کے گناہ گاروں کو وہ مراعات دے دی جائے تو کیا حرج ہے؟

9 ادارہ تالیف و تصنیف کے متعلق جناب کی تجویز معقول ہے، کہیں مل کر مشورہ کر لیا جائے۔ میں چوں کہ اس راہ سے ناواقف ہوں، اس لیے بحیثیت مقتدی جو حکم ہو، کرنے کو تیار ہوں اور جہاں طلب فرمائیں، حاضر ہو سکوں گا۔ إن شاء الله.

میری کانگریسیت پر جناب ناراض نہ ہوں، وہ بھی ایسی ہے جیسے جناب کا جماعتِ اسلامی میں اشتراک۔ بعض مکارہ وہاں موجود ہیں، لیکن میں انگریز کو ان تمام مکارہ کی علت سمجھتا ہوں اور اس موثر مخالفت کے لیے

---

[1] دیکھیں: سیرۃ ابن ہشام (۲/۲۲۳) اس میں سیدنا سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے اختلاف کا ذکر ہے۔ والله أعلم.

[2] دیکھیں: صحيح مسلم، رقم الحديث (۲۳٦۳)

[3] دیکھیں صحيح البخاري، رقم الحديث (۲۹۸۱) صحيح مسلم، رقم الحديث (۱۰٦۲) غزوہ حنین میں تقسیمِ غنائم کے موقع پر ایک شخص نے نبی اقدس ﷺ کے متعلق یہ توہین آمیز کلمات کہے تھے۔

کانگریس سے بہتر کوئی جماعت نہیں۔ ۱۸۵۷ء اور اس کے بعد پٹنہ انبالہ میں جو مصائب جماعت پر آئے، اسی بغض کی وجہ سے میں جلد سے جلد اس نظام کی تباہی چاہتا ہوں۔ میری کم علمی سمجھیے یا نا تجربہ کاری، میں اس کے لیے کسی لمبے پروگرام پر یقین نہیں رکھتا۔

عریضہ بلا ارادہ لمبا ہوگیا، ایسی بہت سی چیزیں کہنے کی تھیں، مگر انھیں کسی دوسری فرصت پر ملتوی رکھتا ہوں۔ جناب کی توجہ کا مکرر شکریہ۔ گرامی نامہ میں کچھ تلخی نہ تھی اور اگر ہو بھی تو جس تلخی کی تہہ میں خلوص ہو، اُسے برداشت کرنا چاہیے۔

ہوسِ قیادت کا الزام میں نے مولانا مودودی پر خصوصیت کے ساتھ نہیں رکھا، تمام نئی تحریکات میں اس چیز کو ایک حد تک دخل ہے۔ ''بزمِ توحید'' ہو یا ''جماعتِ صالحین''۔ مگر اسے کس سے کہیں اور کہاں؟

مدیر اہلِ حدیث کی نوازش ہے کہ انھوں نے قریباً پانچ ماہ کے بعد بعض تصرفات کے ساتھ مضمون شائع کرایا۔

والسلام

محمد اسماعیل، گوجرانوالہ

.............❀❀❀.............

مکتوب نمبر 6

(۲)

أخي وحبي في الله! زيد إخلاصه. السلام علیکم ورحمة الله وبرکاته

مکتوب ملا۔ شکریہ۔ مکتوبِ گرامی کو بغور دیکھنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں، ہر تحریک کے ساتھ معتقدین کو ایک شغف ہوتا ہے، جس کی بنیاد ایک اتفاقی حسنِ ظن پر ہوتی [ہے]۔ اس کے معائب کی توجیہ بھی اس نکتہ نگاہ سے ہوتی ہے اور اس کے محاسن کی تشہیر بھی اسی محور پر گھومتی ہے۔ اس حسن یا عیب میں ہم سب شریک [ہیں]۔ اس لیے ایک مخلص آدمی اپنے انتخاب پر ہمیشہ مطمئن رہتا ہے، تاوقتیکہ اس کا اپنا نکتہ نظر نہ بدل جائے۔ گرامی نامہ میں بھی مباحث کو اسی طریق سے سوچا گیا ہے۔

مفاسد بہت ہیں۔ حکومت کا نظام، کانگریس کا نظام، لیگ کا نظام اور احرار اور جمعیۃ العلماء کی نوعیت کے نظام، بلکہ خود جماعتِ اسلامی کا نظام بھی معائب سے پاک نہیں۔ ہر خرابی کے نتائج سے خطرات ہوں گے اور ان سے بے فکری بالآخر نقصان دہ ہوگی، لیکن سوال یہ ہے کہ ان کی کلیدی حیثیت کس میں ہے؟ اس کی موجودگی میں جزوی مساعی کہاں تک کامیاب ہوسکتی ہے؟ میرے خیال میں مفاسد میں کلیدی حیثیت حکومتِ انگریزی کو حاصل ہے، اس کی اصلاح یا تبدیلی کی جو کوشش ہوگی، وہی صحیح راستے پر ہوگی، اس لیے ان تحریکات میں جس میں

بھی شمولیت ہو، یہ نکتہ اساسی حیثیت رکھے گا اور اگر ان میں خرابیاں ہوں گی تو ان کو بھی اسی اچھے نتیجے کی توقع میں برداشت کیا جائے گا۔ ہم خود انگریزی عمل داری سے ہجرت نہیں کر رہے، اصلاح کی اُمید پر اس کی برائیاں اور مظالم برداشت کر رہے ہیں، اسی طرح ان تحریکات کے نقائص کو بامید اصلاح برداشت کیا جائے گا۔ والعاقبة للتقویٰ. وإنما لکل امرئ ما نویٰ.

مسلمان ان تینوں فتنوں سے کافی متاثر ہو چکے ہیں، لیکن ان تحریکات سے اجتناب اسی وقت مفید ہو سکتا ہے، جب ان تحریکات کے ذمے دار حضرات سے عہد کر لیا جائے کہ جب تک ہم اپنی زندگی کو پوری اسلامی نہ بنالیں، آپ اپنا کام بند کر دیں۔ اگر ایسا ہو سکے تو میں جناب کے مشورۂ اجتناب کو قبول کروں گا، ورنہ اجتناب کا نتیجہ صرف یہی ہوگا کہ وہاں پر اشتراک سے جو اصلاح ہو سکتی ہے، وہ بھی ختم ہو جائے گی اور ہم صرف تاثر ہے، اکیلے رہ جائیں گے۔ ایسے مواقع میں اصل چیز اجتناب نہیں، بلکہ تقسیمِ کار ہے اور تعیینِ مقاصد۔ جماعتِ اسلامی کا طریقۂ دعایت (پروپیگنڈا) غیر اسلامی ہے اور غیر مفید بھی، اس میں وہی عوامل اور جراثیم کام کر رہے ہیں، جو اس سے پہلے احرار، خاکسار وغیرہ میں تھے: دوسروں پر طعن اور اپنا تزکیہ۔ لَا تُزَکُّوْٓا اَنْفُسَکُمْ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰی.

صدیقی صاحب اور مولانا رام نگری کے مضامین میں اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ خود عزیز صاحب کے تیر و نشتر اور سفر سفیر، ہمز ولمز کا بہترین نمونہ ہیں۔

یہ پروگرام صحیح ہے کہ دینی درس گاہوں کا ملک میں جال بچھا دیا جائے اور تعلیمی تیزاب کی سمیت کو کم کیا جائے، لیکن اس کے لیے جن ہمدردیوں کی ضرورت ہے، وہ جماعت کی موجودہ صورت نہیں پیدا کر سکے گی، بلکہ میرا خیال ہے کہ لوگ بتدریج مایوس ہو کر الگ ہوتے جائیں گے۔

لیگ کی قیادت کا سہرا لیگ کے پروگرام اور اس کی خوبیوں کے سر پر نہیں، بلکہ ان اصحابِ غرض کے سر پر ہے، جن پر آج کل لیگ کی نوازشیں یا اس طریقِ دعایت کی خوبی ہے، جو اس نیم چڑھے کریلے اشتراکیت کی شمولیت نے پیدا کی۔ جماعتِ اسلامی اگر ایک بااصول جماعت ہے تو پچاس سال میں بھی یہ ہمہ گیری پیدا نہیں کر سکے گی، اس چھا جانے کے لیے بے دینی اور بے اصولی ضروری ہے۔

میں نے جماعتِ اسلامی کو دائمی جمود ان مقاصد کے لحاظ سے کہا ہے، جو اس کے پیشِ نظر ہیں، اس سفر کے لحاظ سے اس کی رفتار صفر کے برابر ہے۔ ورنہ اشاعتِ کتب اور ایک دینی مکتبہ ہونے کے لحاظ سے اس کی رفتار تسلی بخش ہے۔

جہاں ترکِ رفع الیدین پر تنبیہ کی وجہ سے جماعت سے اخراج تک کی دھمکی دی جا سکتی ہے، اس ادارے میں تحفظِ مسلک کے لیے میں ایک ضمیمہ قائم کروں، میرا دماغ اس خوش فہمی کا عادی نہیں۔ مسلک اہلِ حدیث کی

تخریب میں انگریز اور کانگریس اس قدر موثر نہ ہوں گے، جس قدر یہ برزخی تحریکات۔ وہ دشمن بصورتِ دشمن ہے اور یہاں جال ہمرنگِ زمین، جس میں آپ ایسے مخلصین پھنس کر مطمئن ہوجاتے ہیں۔ لولا الاعتبارات لبطلت الحکمۃ۔

ارشادات کا اگلا حصہ جس میں مودودی صاحب کی صفائی اور "سَمَّاکُمُ الْمُسْلِمِیْنَ" کی سی تعریضات فرمائی گئی ہیں، میرے لیے قطعی دلخراش ہیں اور میرے اسی خیال کی تائید ہیں کہ آپ حضرات میں احساسِ کمتری پیدا ہوچکا ہے۔ وَاللّٰہُ یُنَجِّیْکُمْ مِنْھَا، وَمِنْ کُلِّ کَرْبٍ.

کانفرنس کے جمہوری نظام کے متعلق جناب نے مکرر تذکرہ فرمایا۔ میرے خیال میں اسلام نے کوئی ہیئت نظام کے لیے لازم نہیں قرار دی۔ امارت کی صورت دین میں موجود ہے، اسے شوریٰ کے ساتھ مقید فرما دیا گیا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس میں کوئی تبدیلی نہیں کی جاسکتی۔ اصل مقصد "الدین النصیحۃ للّٰہ ورسولہ ولأئمۃ المسلمین وعامتھم"۔ یہ مقصد کسی جمہوری تشکیل یا اس کا نام فیسیرزم ہٹلرزم میں آجائے تو نام میں کوئی حرج نہیں۔ انتخابِ خلافت میں تنوع سے یہ بات ظاہر ہے۔ خلفائے اربعہ کا انتخاب بالکل الگ صورتوں میں ہوا۔ اگر سیاسیات میں جزئیات تک کا احتوا فرمایا گیا ہوتا تو انتخابِ امیر میں یہ تنوع ناممکن تھا۔ معلوم نہیں وہ کون سی تنظیمیں ہیں، جن کے انھیں بننے کا خطرہ ہے؟

تعاون تو ہر "بِرّ" سے ہوسکتا ہے، البتہ اشتراک مشکل ہے۔ جناب کے خیال میں "تقلید کے بادل چھٹتے جارہے ہیں۔" لیکن میرا خیال ہے کہ نئے ائمہ مبعوث ہورہے اور پرانے غیر مقلدوں کو نئی زنجیروں سے جکڑا جارہا ہے اور رنج اس پر ہے کہ اسیری کا احساس بھی ختم ہورہا ہے۔ إنا للّٰہ!! جمعیت اور کانگریس کے تعلق کا مجھے علم نہیں، تخیلات کی دنیا میں "إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ" سے بچنا چاہتا ہوں۔

مسلک اہلِ حدیث کی حمایت اور اعانت کے لیے جناب کوئی ادارہ بنائیں، مجھے اس میں اشتراک سے بالکل گریز نہیں، بلکہ ہر ممکن اعانت کے لیے حاضر ہوں۔ البتہ اگر یہ ادارہ جماعتِ اسلامی کی سرپرستی یا نگرانی میں ہو، مجھے اس میں تامل ہے۔ یہ بالکل درست ہے، اس نظام سے اسے تصادم بالکل نہ ہوگا، مولوی محمد علی صاحب[1] اس کی سرپرستی قبول فرمالیں تو اچھا ہوگا، مولوی عطاء اللہ صاحب فیروزپوری[2] سے بھی مشورہ فرمالیں۔

جناب نے وردھا سکیم اور سیاست اور مذہب کی علیحدگی کا تذکرہ [کیا]۔ تحریکِ اسلامی میں شامل ہونے سے کیا یہ خیالات دلوں سے نکل جائیں گے؟ صرف اتنا ہوگا اور ہوا ہے کہ جو لوگ تحریک کی نذر ہوگئے، انھوں

---

[1] غالباً مولانا محمد علی قصوری (م ۱۹۵۶ء) مراد ہیں۔

[2] مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی (م ۱۹۸۷ء)

نے آنکھیں بند کر لی ہیں اور کبوتر کی طرح خوش ہیں، بلی چلی گئی، ورنہ چند افراد کی صحت سے وبا کا انکار نہیں کیا جا سکتا، وہ بدستور موجود ہے اور ممکن ہے اس کا حملہ دارالاسلام پر بھی ہو جائے، اس لیے طبیب کو بیماروں کے مرکز پر پہنچنا چاہیے، تاکہ وہ وبا کی رفتار کا صحیح اندازہ کر سکے۔

میں جماعت اہلِ حدیث کی صحیح تنظیم کے ایجابی پہلو ہی کے لیے حامی تھا، لیکن آپ حضرات رفاقت سے دست کش ہو کر دوسرے گھونسلوں پر مطمئن ہو گئے۔ اب آپ مجھ سے دریافت فرماتے ہیں کہ ایجابی پہلو کا کیا بنے گا؟ مجھے بھی آپ ایسے حضرات سے یہی دریافت کرنا ہے۔ یقیناً یہ لمحات بے حد قیمتی ہیں اور میں قبول کرتا ہوں کہ ہم سب ان کی اِضاعت کے ذمے دار ہیں، اس لیے جناب بے شک کوئی صورت اختیار فرمائیں، تاکہ اَسلاف کے آثار کا اِحیا اَسلاف ہی کے طریق پر کر سکیں۔

ابن دغنہ اور ماعز اسلمی کے واقعات، جناب کی جوابی توجہ عرفی مناظرات سے کسی قدر نیچے ہے اور حبِ شے سے اس قدر مسامحت ہوئی ہے۔ سوال یہ نہیں کہ وہ پناہ ٹوٹ گئی، سوال یہ ہے کہ آیا کچھ وقت کے لیے نظامِ باطل اور اس کی سہولتیں قبول کی گئی یا نہیں؟ اگر یہ صحیح ہے تو دوسروں پر طعن کیوں ہے؟ ہم سب عملاً اس پر عامل ہیں، لیکن تحریک اور اس کی ذمے داریاں دوسروں کو ملزم قرار دے رہے ہیں۔ یہ وہم کہ کانگریس ہندو تہذیب کا احیا چاہتی ہے، اگر یہ صحیح ہے تو اس کا علاج بھی یہی ہے کہ اس کا راستہ روک کر کھڑے ہو جائیں۔ تیاری کے لیے سالہا سال مہلت آپ کو کون دے گا؟

یہ صحیح ہے کہ پورا ماحول بدلنا پڑے گا، آپ نظامِ باطل کی ممکن اور جائز اعانت کریں اور تعمیری کام کا پروگرام الگ جاری رکھیں، اس میں وہ نظام مانع نہیں ہوگا، بلکہ انگریز کی دور بین نگاہیں بالکل ممکن ہے کہ آپ کو اس حالت میں چلنے نہ دیں۔ انگریز ہمیشہ نعرے دیتا ہے، وہ اب اشتراکیت سے اس لیے دب رہا ہے کہ وہ اب مضبوط ہے۔

میرے خیال میں "يُعَلِّمُكُمْ كُلَّ شَيْئٍ حَتّٰى الْخِرَاءَةَ"[1] میں اصولی ہدایات ہی ہیں، کتاب وسنت میں "کل" عموماً لغوی معنی ہی میں مستعمل ہوا ہے، منطقی معنی میں بہت کم استعمال ہوتا ہے۔

عرصہ ہوا میں نے "سیاسی کشمکش"[2] تینوں حصے پڑھے تھے۔ جن خطرات کا تذکرہ وہاں کیا گیا ہے، وہ موجودہ صورت میں کم نہیں ہوں گے، بلکہ زیادہ مضبوط اور مستحکم ہوں گے، اس راہ میں مولانا آزاد کو حریف سمجھنے کے بجائے، اگر مشیر سمجھ لیا جائے تو بہت مفید ہوگا۔ شدھی کی مدافعت میں مولانا عبدالقادر مرحوم نے ان کے

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٦٢)

[2] یہ مولانا مودودی کی تالیف ہے۔

مشوروں سے استفادہ کیا تھا۔

میں نے جو دلائل عرض کیے تھے، ان پر جناب احادیث اور قرآنِ مجید میں اسی نہج پر غور کریں گے تو بہت زیادہ مواد ملے گا۔ میرے خیال میں تو انبیا کا ابتدائی طریقِ کار یہی رہا ہے، ہم لوگ چوں کہ ایک دوسرے پر بدگمان ہیں، اس لیے صحیح صورتِ حال سامنے نہیں آ سکتی، جیسے آپ نے مولوی ابراہیم صاحب اور مولوی داود صاحب کا ذکر کیا ہے۔ یہ صرف بدگمانی ہے، ورنہ شاید بدنیت کوئی بھی نہ ہو۔

میرا خیال اب بھی یہی ہے کہ کوئی جماعت بھی اس وقت اسوۂ نبوی پر کام نہیں کر سکتی اور نہ ہی کر رہی ہے اور نہ ہی جزئیات تک اس کی پابندی ضروری ہے۔ مقاصد کو مطمح نظر بنانے کے بعد طریقِ کار میں تھوڑا بہت اختلاف قابلِ عفو ہے۔

میں سفر میں تھا، اس لیے جواب میں دیر ہوئی۔ ادارے کے متعلق اپنی رائے گرامی سے جلدی مطلع فرمائیں۔

والسلام

اسماعیل

مدرس گجرانوالہ۔ پنجاب

............❁❁❁............

مکتوب نمبر 7

(۳)

واذکر فی الکتاب "إسماعیل"　Mohammad Ismail

چاہ شاہاں۔ گوجرانوالہ　Chah Shahan

(پنجاب)　Gujranwala

(Punjab)

تاریخ: ۷؍ ربیع الاول ۱۳۶۵ھ　Dated 10-2-46

أخي الأعز زاد عزة! السلام علیکم ورحمة اللّٰه وبرکاته

میں نے اظہارِ حقیقت اور اختصارِ بحث کے لیے عرض کیا تھا کہ نقائص سے کوئی جماعت خالی نہیں۔ مقصد یہ تھا کہ الزامی گفتگو سے بچ کر آپ حضرات کے موقف کو سمجھ سکوں، مگر مجھے اس میں ناکامی ہوئی۔ میں سمجھتا ہوں کہ جب ایک [شے] کا بحرانی اثر دماغ پر محیط ہوتا ہے، اس وقت اچھے اچھے نقاد بھی تنقید کی استعداد سے محروم ہو سکتے ہیں۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اس مراسلہ میں ہم اسی مقام پر ہیں۔

ارکانِ تحریک پر تو حسنِ ظن ہو سکتا ہے، بلکہ ہے بھی۔ نیک نیتی اور غلط فہمی سے کوئی محفوظ نہیں۔ مقامِ تکلم

یہی ہے ''حبك الشيئ'' کو تعریض کیوں سمجھا ہے؟ پُرخلوصی کی انتہا ہے اور حسنِ ظن۔ مودودی صاحب کی مسامحات کے لیے جو اندازِ معذرت اختیار فرمایا جا رہا ہے، اسے احساسِ کمتری ہی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، ورنہ اس سے براءت ہونی چاہیے۔ یہ سکوت، معذرت کی پوزیشن میری سمجھ میں نہیں آتی۔

ابن دغنہ کا واقعہ تو میں نے بطورِ مثال عرض کیا تھا۔ انبیا کی زندگیوں کی ابتدائی منازل استفادہ بالباطل بامیدِ احقاق ہی کے اصول پر قائم ہیں۔ مجھے تو تعجب ہے کہ آپ بدیہیات پر بھی بحث شروع فرما دیتے ہیں۔ آپ اس نہج پر اگر کتاب و سنت پر غور فرمائیں گے تو اس کے بیسیوں نظائر ملیں گے۔

رہا قانون سازی کا حق، محترم بھائی! ہم نے کب دیا؟ اسی ظالم نے آپ سے اور ہم دونوں سے یہ حق جبراً لے لیا ہے۔ آپ ایک نہج سے اس حق کی واپسی کے لیے کوشش کرتے ہیں اور ہم دوسرے نہج سے۔ رہی اس کی حد، یہ سوال تمام اسلامی جماعتوں سے ہونا چاہیے کہ وہ کب تک مجبور رہیں گی؟ کانگریس بے شک نکال نہیں سکی، لیکن اس نے کچھ نہ کچھ لیا ضرور۔ آج میں اور آپ جو تنقید نظامِ باطل پر کر رہے ہیں، اس میں کانگریس کا بہت زیادہ حصہ ہے۔ احساسِ مسئولیت کی بنا پر ہی پُرامن راہوں سے الگ خاردار راستوں میں سے گزرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ واللہ علیم.

میں نے عرض کیا تھا کہ اگر موجودہ جمہوری نظام نصحِ اُمت پر منتج ہو تو میں اسے دینی سمجھتا ہوں اور اگر امارت اُن مقاصد کی حامل نہ ہو تو وہ چنگیزی اور نادر شاہی۔ اسلامی طور پر کوئی ہیئت ہم پر لازم نہیں۔ خلوص اور تقویٰ کے ساتھ صلاحیتِ کار کا خیال بھی ضروری ہے۔ حربی ضرورت میں خالد کی شجاعت کو ابوذر کے تقوے پر ہمیشہ ترجیح رہے گی۔

جناب نے غور فرمایا ہے کہ ''استنجا بالیمین'' وغیرہ کا مقام شرعاً کیا ہے؟ یہ چیزیں اگر اصولی حیثیت رکھتیں تو ان کی مخالفت پر کوئی وعید آتی۔ میرا مقصد یہی تھا کہ اصل زور مقاصد پر ہے۔ آداب کا مقام ادب ہی تک ہے۔

میں نے آگے بھی عرض کیا تھا کہ ٹھنڈے دل سے غور کے بعد میں اسی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ہمیں مسلک اہلِ حدیث ہی سے وابستہ رہنا چاہیے اور اسے ایک تحریک کی حیثیت سے پھیلانا چاہیے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس بحث کو ختم کر دینا چاہیے۔ غالباً ایک دوسرے کا عندیہ سمجھ لیا گیا ہے، طولِ بحث سے کوئی فائدہ نہیں۔

ادارے کی تشکیل پر غور فرمائیں۔ مولانا قصوری پر اگر اعتماد نہیں کیا جا سکتا، نہ سہی، کوئی اور آدمی تلاش فرمائیں، میں بھی تبدیلِ مقام کے حق میں نہیں ہوں، تاوقتیکہ مستقبل کے متعلق کوئی واضح چیز پیشِ نظر نہ ہو۔ نسلی اہلِ حدیثوں سے گھبرانا نہیں چاہیے۔ نسلی مسلمانوں کی طرح ان کی بھی اصلاح فرمائیں۔ میں گوجراں والا میں کوشش

کر رہا ہوں کہ کوئی اجتماع کی صورت پیدا ہو سکے۔ آپ اس مسئلے پر مزید غور کریں۔ قیادت کے انتخاب پر اصل غور کی ضرورت ہے۔ باقی امور سہل ہیں۔ ضعفِ قیادت ام الامراض ہے۔ اس پر جس قدر غور ہو سکے، فرمائیں۔

ادارہ کی ابتدائی منازل طے ہونے کے بعد کام، تشکیل اور شرائط پر غور ہونا چاہیے۔ ثَبِّتِ الْجِدَار ثُمَّ انْقُشْ.

والسلام

محمد اسماعیل

مدرس: چاہ شاہاں والا

گوجراں والا۔ پنجاب

............❀❀❀............

مکتوب نمبر 8

(۴)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مرکزی جمعیت اہلِ حدیث مغربی پاکستان

شیش محل روڈ۔ لاہور

حضرت مولانا زادمجدکم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آج بمشورہ احباب فیصلہ کیا گیا ہے کہ جناب جامعہ سلفیہ میں ۱۵ رشوال ۱۳۷۸ھ سے تشریف لانا شروع فرما دیں۔

امید ہے جناب کی تشریف آوری سے جامعہ میں نئی روح پیدا ہوگی۔

والسلام

محمد اسماعیل

ناظم تعلیمات جامعہ سلفیہ

۵۔۴۔۵۹ء

............❀❀❀............

مکتوب نمبر 9

(۵)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مرکزی جمعیت اہلِ حدیث مغربی پاکستان

شیش محل روڈ۔ لاہور

مکرم ومحترم مولانا عبدالغفار حسن صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

جامعہ سلفیہ کے نصابِ تعلیم پر غور کرنے کے لیے ایک ضروری اجلاس بلایا جا رہا ہے۔ جناب کی شرکت اس میں ضروری ہے۔ امید ہے کہ جناب وقتِ مقررہ پر تشریف لا کر اپنے مفید مشوروں سے مستفید فرمائیں گے۔

تاریخ: ۱۵؍ مارچ ۵۹ء دن: اتوار وقت: ۸:۳۰ صبح

مقام: دفتر مرکزی جمعیت اہلِ حدیث لاہور، بلڈنگ تقویۃ الاسلام، شیش محل روڈ۔

والسلام

محمد اسماعیل

ناظمِ اعلیٰ

از راہِ کرم طلبا جامعہ سلفیہ کے امتحانی پرچے نمبر لگا کر ضرور ساتھ لے کے آئیں۔ نوازش ہوگی۔ والسلام

مکتوب نمبر 10

(٦)

مرکزی جمعیت اہلِ حدیث مغربی پاکستان

شیش محل روڈ۔ لاہور

گجرانوالہ

۳۔۴۔۶۳ء

مولانا المحترم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج گرامی! پہلی ملاقات دوسرے دن حاضری کے لیے نکلے۔ حاجی صاحب کی گاڑی فارغ نہ تھی۔

رکشا لیا، مولوی یحییٰ صاحب نے راستہ بھلا دیا۔ قاری عبدالخالق صاحب واپسی آتے راستے میں ملے۔ آپ حضرات کو انتظار کی زحمت ہوئی۔ معذرت خواہ ہوں۔ اگلے دن پھر حاضر ہوا۔ غالباً جمعرات تھی۔ کافی دیر بیٹھے رہے، نہ قاری عبدالخالق آئے نہ جناب۔ ہم بیٹھ کر واپس آ گئے۔ ﴿اَلسِّنَّ بِالسِّنِّ وَ الْجُرُوْحَ قِصَاصٌ﴾۔ ایک رقعہ دے آیا، غالباً ملا ہوگا۔

جناب نے نصاب دیکھ لیا ہوگا۔ اپنی ترمیمات سمیت واپس فرما دیجیے۔ اجتماعی مشورے کے لیے ممکن ہے کوئی وقت نکل سکے۔

کراچی میں موحدین میں کافی کشیدگی ہے۔ طاش کبریٰ زادہ نے حضرت ابن عباس [رضی اللہ عنہما] سے نقل فرمایا ہے: ”إياكم والتعارض بين العلماء فإنهم أشد من التيوبس“۔ یہ علما کا شکوہ ہے۔ کراچی [کے] تاجر حضرات بھی کسی سے کم نہیں۔ کوشش فرمائیں مختلف احزاب ایک دوسرے کے قریب ہو جائیں۔

مولوی یوسف صاحب نے پندرہ طلبا کو تیار کیا ہے، غالباً اسی انداز سے جس کا خطرہ تھا۔ جہاں علم اور عقل [کی] جگہ کبر اور شر نے لے لی ہو، انجام کا خدا حافظ۔ امید ہے جناب سوچ سمجھ کر قدم اُٹھائیں گے۔

والسلام

محمد اسماعیل، کان اللہ لہ

............❀❀❀............

مکتوب نمبر 11

(۷)

و اذکر فی الکتاب ”إسماعيل“	Mohammad Ismail
چاہ شاہاں۔ گوجرانوالہ	Chah Shahan
Dated 2-5-60	Gujranwala

محترم مکرم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج بخیر! مکتوب سامی ملا۔ جامعہ کے متعلق مفید مشوروں کے لیے شکریہ۔ گزارش ہے کہ دنیا ناسازگاریوں کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ شاید ہی دنیا میں کوئی ایسا آدمی ہو، جسے ناسازگاریوں سے سابقہ نہ پڑا ہو۔ اس راہ میں اصل چیز صبر اور استقامت ہے، اور اصول سے وابستگی۔

جناب جب جامعہ میں بطورِ رفیق شریک ہوئے تھے، میں یقین رکھتا تھا کہ اب یہ سلسلہ منقطع نہیں ہوگا اور

ہم برسوں تعاون اور تناصر کے ساتھ اس سفر کو جاری رکھ سکیں گے۔ مجھے بے حد تعجب ہوا کہ جناب نے آشیانہ بدلنے میں واقعی عجلت فرمائی۔ جناب کا معاملہ مولوی شریف اللہ صاحب[1] سے کسی قدر مختلف ہے۔ کیوں کہ جناب نے تھوڑی سی وضع داری ضرور رکھی ہے، مولانا سے یہ بھی نہ ہوسکا۔

میں سمجھتا ہوں کہ استعفیٰ کی اصل وجہ رفقا کی ناہمواری ہے۔ یہ درست ہے کہ ان حالات میں کام کرنا مشکل ہوتا ہے، لیکن اگر آشیانہ بدلنے سے پہلے اس کا علم ہوجاتا تو شاید معاملہ حل ہوسکتا اور جناب کو تکلیف نہ ہوتی۔ مگر معلوم ہوتا ہے، جناب آشیانے کی تلاش میں رہے، جب وقت آگیا، ہمیں مطلع فرما دیا۔ میں سمجھتا ہوں دنیا میں دانش مندی یہی ہے، گو یہ میری توقعات کے خلاف ہوا ہے۔ تجري الرياح بما لا تشتهي السفن.

مولانا! شاید جناب نہ جانتے ہوں، میں برسوں سے ایسے حالات سے گزر رہا ہوں۔ رفقاء سے حسبِ منشا توافق نہیں، لیکن چوں کہ سازگار آشیانے کی تلاش میرے پروگرام میں نہیں، اس لیے میرا سفر ناسازگار حالات میں بھی جاری رہا اور ۔إن شاء اللّٰہ۔ رہے گا۔ جناب نے جو کچھ کیا درست ہے۔ دانش مندی ہے، لیکن جناب کے مقام سے کسی قدر نیچے ہے!!

مولانا! ہمیں اس وقت جامعہ سے ایسا ربط رکھنا چاہیے کہ ہم جامعہ کے ہیں اور جامعہ ہمارا ہے۔ یہ درست نہیں کہ جامعہ رفقا کا ہے اور جناب صرف ان کے ساتھ معلق ہیں۔ یہ تعلیق، جہاں ٹوٹے معاملہ وہیں ختم ہوگیا۔ مسلکِ سلف کے ساتھ اپنے اَسلاف کی وابستگی اور ان کی خدمات پر نظر فرمائیں اور پھر اپنی معذوریوں اور معذرتوں پر غور فرمائیں۔ والخير فيما وقع. اب یہ بحث بے سود ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کے موجود انتخاب کو سازگار فرمائے اور آپ وہاں پر کوئی صحیح خدمت فرماسکیں۔

یہ جناب نے درست فرمایا کہ ''جتنی چادر ہو، اتنے ہی پاؤں پھیلانے چاہئیں'' لیکن یہ دانش مند اور دولت مند حضرات کا اصول ہے، ہمارے ہاں تو ہر سال ممکن سعی کے بعد توکل سے شروع ہوتا ہے، توکل پہ ختم ہوجاتا ہے۔ مجھے تو پوری زندگی ایسا موقع نہیں ملا کہ پاؤں ماپ کر چادر بنائی ہو۔ شکر ہے کہ جب پاؤں پھیلے، چادر مل گئی اور اپنے بزرگوں سے بھی قریباً ایسی ہی روایات سنی گئی ہیں۔

ہماری دنیا میں مشاہرات کا تعین اور رواتب کی بروقت ادائیگی کا رواج کب تھا؟ متوکلین کی ایک جماعت تھی، جو سنت کی خدمت کے جذبے سے سرشار تھی اور مسلکِ سلف کی ترویج ان کا اپنا فرض تھا، وہ کسی کے لیے ایسا نہیں کرتے تھے۔

مولانا شریف اللہ صاحب کی بات چھیڑنا بے سود ہے۔ میرے دل میں ان کے لیے احترام تھا اور ہے،

---

[1] جامعہ سلفیہ فیصل آباد میں مدرس تھے۔

لیکن جو کچھ انھوں نے کیا، اس کے لیے توجیہات بے سود ہیں۔

امید ہے جناب کی نوازشات جامعہ[1] پر بدستور رہیں گی اور آپ اپنے تعاون سے ہمیں محروم نہیں رکھیں گے۔ جناب اگر مولوی شریف اللہ صاحب کی روش بھی اختیار فرماتے تو بھی ذاتی مراسم۔إن شاء اللّٰہ۔ بدستور قائم رہتے۔

مولوی اسحاق کی بعض مسامحات کا پہلے بھی علم تھا، جناب کے مکتوبِ گرامی سے بعض دوسرے گوشوں سے بھی پردہ کشائی ہوئی، اس کے لیے ہم لوگ آپ کے ممنون ہیں۔

جناب نے یہ نصائح حکیم عبدالرحیم صاحب اشرف کی طرح لبِ جو بیٹھ کر دی ہیں۔ کاش آپ قعرِ دریا میں کچھ دیر شناوری کی تکلیف بھی فرماتے۔ مقصد دین کی خدمت ہے۔ اللہ تعالیٰ جس قدر توفیق مرحمت فرمائے، خوش بختی ہے۔

نصاب کی تکمیل کے لیے چند ماہ تک مجلس بلانے کا خیال ہے، اُمید ہے جناب تشریف لائیں گے۔

والسلام

محمد اسماعیل، گوجرانوالہ

مکتوب نمبر 12

(مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمہ اللہ کے نام)[2]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

''العدل'' (مورخہ ۳۱؍ مئی ۳۳ء) میں مولوی عبدالعزیز صاحب خطیب جامع مقلدین گوجرانوالہ نے مجھ

① مولانا سلفی رحمہ اللہ نے جامعہ سلفیہ فیصل آباد سے مولانا حسن رحمہ اللہ کے استعفے کے سلسلے میں یہ خط لکھا تھا۔

② گوجرانوالہ سے احناف کا ایک اخبار ''العدل'' نکلتا تھا، اس کے یکم مارچ ۱۹۳۳ء کے پرچے میں مولانا عبدالعزیز صاحب آف گوجرانوالہ نے قراءت خلف الامام کے موضوع پر ایک مضمون لکھا، جس میں یہ دعویٰ کیا کہ صحیح مسلم میں قراءتِ فاتحہ خلف الامام کی ممانعت میں ایک حدیث ((وإذا قرأ فأنصتوا)) مروی ہے۔ مولانا امرتسری رحمہ اللہ نے اپنے ہفت روزہ اخبار ''اہلِ حدیث'' میں اس مضمون پر تعاقب کیا، جو پانچ قسطوں (۱۷؍ مارچ تا ۲۱؍ اپریل ۱۹۳۳ء) میں شائع ہوا۔ اس مضمون میں مولانا امرتسری رحمہ اللہ نے لکھا کہ حدیثِ ابی موسیٰ ((وإذا قرأ فأنصتوا)) صحیح مسلم میں نہیں۔ البتہ صحیح مسلم میں امام مسلم کا قول درج ہے کہ میں اس روایت کو صحیح جانتا ہوں، مگر میں نے اسے صحیح مسلم میں درج نہیں کیا، کیوں کہ یہ صحیح مسلم میں درج ہونے کے قابل نہیں۔ پھر مولانا امرتسری رحمہ اللہ نے اس روایت کے ضعیف ہونے کے دلائل درج کیے۔ اس پر مولانا عبدالعزیز نے اخبار ''العدل'' (۳؍ مئی ۱۹۳۳ء) میں ایک ''کھلی چٹھی'' شائع کی، جس میں مطالبہ کیا کہ اس حدیث کے صحیح مسلم میں ←

سے زیادت حدیثِ ابی موسیٰ « إذا قرأ فأنصتوا » کی بابت شہادت طلب کی ہے۔ میرے خیال میں مولوی صاحب موصوف نے اس میں کچھ معاملہ فہمی کا ثبوت نہیں دیا۔ اللہ تعالیٰ حضرات مقلدین پر رحم کرے، یہ بیچارے ہمیشہ اشتہاروں پر زور دیتے ہیں، عمل کے تجربہ کار نہیں۔

مجھے شہادت دینے سے انکار نہیں اور نہ ہی یہ شہادت ایسی ہے، جس کے ادا سے کوئی فہمیدہ آدمی گریز کر سکے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں، میری اس طرح کی شہادت معاملے کو بہت زیادہ پیچیدہ کر دے گی۔ آپ کو معلوم ہے کہ مناظرہ مدن چک[1] پر آپ لوگوں نے یہی فیصلہ چار منصفوں کے سپرد کیا تھا، جن کا فیصلہ آج تک ہمارے سامنے نہیں آیا۔

میرے خیال میں اس کی وجہ یہ ہے کہ اس مناظرے کے بعد معاً ہی آپ کا مضمون متعلقہ فاتحہ جو مدت سے آپ کے منہ میں آیا ہوا تھا، ''العدل'' میں چھپنا شروع ہوگیا۔ جس کا جواب لازماً ''اہلِ حدیث'' کو لکھنا تھا۔ اس سے معاملہ بڑھا تو آپ نے شرط بازی شروع کر دی، حالانکہ مناسب یہ تھا کہ تا فیصلہ منصفوں پر کوئی خارجی اثر ڈالنے کی کوشش نہ کی جاتی۔ معلوم نہیں کہ آپ لوگ معاملہ فہم کیوں نہیں؟ آپ کو یقیناً معلوم ہے کہ جب مقدمہ عدالت میں چلا جائے تو کوئی اخبار اس پر رائے زنی نہیں کر سکتا، تاکہ جج کے خیالات بیرونی مقالات سے متاثر نہ ہوں۔

میں خیال کرتا ہوں کہ اب کوئی معاملہ فہم انسان اس پر کچھ لکھنے کی کوشش نہیں کرے گا اور نہ ہی وہ لکھنا آئینی ہوگا۔ اس لیے کہ اخبارات اور بعض کم فہم لوگوں نے یہاں ایسی صورت حال پیدا کر دی ہے، جس کے ہوتے ہوئے ثالث جانبداری اور فرقہ نوازی کے اتہام سے بچ نہیں سکتے۔

اس لیے میں آپ کو دوستانہ مشورہ دیتا ہوں کہ آپ میری شہادت اس وقت طلب نہ کریں۔ ورنہ یہ معاملہ بھی مدن چک کے فیصلے کی طرح نازک تر اور غیر آئینی ہو جائے گا۔ ممکن ہے حضرت مولانا ثناء اللہ صاحب

← موجود ہونے یا نہ ہونے کے متعلق پانچ دیوبندی علما سے فیصلہ کروا لیا جائے اور جیتنے کی صورت میں میں چار صد روپے آپ کو انعام دوں گا۔ ابھی اس امر کا تصفیہ نہیں ہوا تھا کہ مولانا عبدالعزیز نے اسی دوران میں ایک کھلی چٹھی بنام مولانا اسماعیل صاحب سلفی رحمہ اللہ لکھ دی کہ وہ بتائیں کہ مذکورۃ الصدر روایت صحیح مسلم میں موجود ہے یا نہیں؟ تو اس شہادت طلبی کے جواب میں مولانا سلفی رحمہ اللہ نے مذکورہ بالا مکتوب لکھا، جو ہفت روزہ ''اہلِ حدیث'' امرتسر (۱۶ر جون ۱۹۳۳ء) میں ''میری شہادت'' کے عنوان سے اشاعت پذیر ہوا۔ اس واقعہ کا تذکرہ سید سلیمان ندوی نے بھی مولانا امرتسری رحمہ اللہ کے ترجمے میں کیا ہے۔ دیکھیں: یادِ رفتگان (ص: ۳۷۲)

[1] یہ تحصیل وزیر آباد کا ایک گاؤں ہے، جو نو کھر کے قریب ہے۔ یہاں غالباً ۱۹۳۲ء کے پس و پیش علامہ محمد یوسف کلکتوی (اگست ۱۹۷۰ء) اور قاضی نور محمد حنفی کے درمیان فاتحہ خلف الامام کے موضوع پر ایک مناظرہ ہوا تھا۔

بھی ایسی مویدات کی کوشش کریں اور معاملہ یہیں رہ جائے۔ اس لیے میرا خیال ہے کہ جناب حسبِ اعلانِ خویش یہ کفر توٹنے دیں اور مبلغ چار صد روپیہ معینہ اشخاص کے پاس رکھ دیں اور معاملہ ثالثوں کے ہاتھ دے دیں۔ آپ کے بیانات ہو جانے کے بعد اگر ثالثوں نے ضرورت محسوس کی تو مناسب شہادتیں طلب کر لیجیے گا۔ اس مرحلے پر تو شہادت کی ضرورت ہی نہیں۔ چناں چہ مدن چک کے معاملے میں اس کی اب تک ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔

میرے خیال میں مولوی ثناء اللہ صاحب کی تجویز اور ترمیم نہایت معقول ہے، اس لیے آپ یا روپیا جمع فرما دیں یا روپے کی شرط واپس ہی لے لیں، کیوں کہ وہ تو اس قمار بازی کی صورت کو پسند نہیں کریں گے کہ متقابلتاً روپیا رکھیں۔ اس لیے آپ اربابِ تقلید کی طرح شرائط اور اشتہار بازی میں وقت ضائع نہ فرمائیں اور روپیا رکھیں اور مولوی ثناء اللہ کو میدان میں اُترنے دیں۔ پہلی دفعہ ہے، ہار گئے تو تجربہ ہی سمجھیے ؎

گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

اگر آپ شرط ہار گئے تو حقِ ہمسائیگی کی بدولت۔ إن شاء اللہ۔ کوشش کروں گا کہ آپ کی ساری رقم آپ کے لیے حسرت کا سبب نہ بنے۔ یارِ شاطر باشم نہ بارِ خاطر۔[1]

مولوی ثناء اللہ صاحب کی منظوری کے بعد میں نے جناب کے دو مضمون ''العدل'' میں پڑھے۔ جس میں، مَیں محسوس کرتا ہوں کہ مولوی صاحب کی متانت آمیز تحریر نے آپ کو سیخ پا کر دیا ہے۔ وہ مضمون آپ خود بھی اگر بحالتِ سلامتی طبیعت پڑھیں گے تو میں یقین کرتا ہوں کہ آپ کا ضمیر ضرور آپ کو ملامت کرے گا۔ اتنی معقول تحریر کے بعد مقامی جماعت کو مخاطب کرتے ہوئے، یہ تیزی نہ آپ کے ادعاے علم کے لیے مناسب ہے اور نہ ہی عرفی شرافت اس کی متحمل۔

میں محسوس کرتا ہوں کہ علم و عقل کی بستیوں پر قوتِ غضب کا پورا تسلط اور قبضہ ہو چکا ہے۔ اس لیے میں عرض کروں گا کہ یہ طرزِ نگارش سخت ضرر انگیز ہوگا اور ہلاکت آفرین ؎

أوردها سعد وسعد مشتعل   ما هكذا يا سعد تورد الإبل

آپ کا

اسماعیل، گوجرانوالہ

---

[1] آپ کی فرمائش سے کچھ حصہ واپس دے دوں گا۔ إن شاء اللہ. [ابو الوفاء]

مکتوب نمبر 13

(مولانا غلام رسول مہر کے نام)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

گجرانوالہ

۱۹۔۲۔۴۸ء

محترم زاد لطفکم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

جناب کا مجمل سا پیغام ملا تھا کہ قاضی خاندان کے حالات سے اطلاع ہونی چاہیے۔ معلوم نہیں جناب، کس قسم کی اطلاع چاہتے تھے؟ یہ مختصر سی تحریر قاضی عبدالرحیم صاحب کے قلم سے ہے، جو اس وقت اپنے خاندان میں علمی حیثیت سے ممتاز ہیں اور گوجرانوالہ میں مطب کرتے ہیں۔

مزید تفصیل کی ضرورت ہو تو تعمیل ہو سکے گی۔

والسلام

محمد اسماعیل، کان اللہ لہ

ضروری: مولانا ثناء اللہ صاحب سرگودھا چلے گئے۔ اخبار ''اہلِ حدیث'' شاید دوبارہ جاری نہ ہو سکے۔ مولانا کی صحت اس قابل نہیں۔ آپ حضرات تو شاید ان قیود سے بلند ہو چکے ہوں گے، ہم لوگ وہیں ہیں۔ خیال ہے کہ آثارِ قدیمہ زندہ رہیں اور اس کی تاریخی خصوصیات نظر انداز نہ ہونے پائیں۔ اکابرِ جماعت نے اسلام کی اندرونی اصلاح یا بیرونی خطرات سے جو مدافعت فرمائی، وہ ایسی نہیں کہ اسے نظر انداز کر دیا جائے۔ مولانا داود صاحب غزنوی ...فرمارہے ہیں۔ خیال ہے کہ آپ حضرات ہم ایسے سوختہ پروں کو بھی اپنے مفید مشوروں سے محروم نہ فرمائیں گے۔ اب تو شاید مقتضائے حال کے مطابق اس تحریک کو پھر زندہ کرنے کی ضرورت ہے۔ رفض والحاد کی طغیانی پھر سر اُٹھا رہی ہے۔

والسلام

محمد اسماعیل

مدرس گجرانوالہ

مکتوب نمبر 14

(مولانا عبدالرؤف جھنڈانگری[1] کے نام پانچ خطوط)

(۱)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

گجرانوالہ

۱۰۔۱۰۔۶۰ء

مولانا المحترم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مولانا عبدالرحمٰن صاحب نے تصوف کے متعلق جو خط لکھا ہے، یہ مجھے بھی انھوں نے لکھا تھا۔ میں نے اپنے فہم کے مطابق جواب عرض کر دیا تھا۔ اب میرا جواب تو تکرار ہوگا۔ میں نے پہلے بھی یہ جواب عرض کیا تھا، معلوم نہیں وہ مکتوب کیوں نہیں ملا؟

مدارج السالکین جناب کے پاس ہوگی۔ مولوی عبدالرحمٰن صاحب نے وہ کتاب پڑھی ہے۔ ایسے آدمی [کو] میں اور آپ کیا جواب دے سکتے ہیں؟ ان کے سامنے خانقاہی نظام بانداز تھانہ بھون ہے۔ یہ نظام ہمارے ہاں تو نہیں ہے۔

البتہ ذکر کے لیے ادعیہ مذکور ہیں۔ جب فقہی فرقوں کو نظر انداز کیا گیا ہے تو ان فرقوں کے لیے وجہ جواز کہاں سے لائی جائے؟ آپ ان سے دہلی میں بالمشافہہ گفتگو کریں۔

والسلام

محمد اسماعیل، کان اللہ لہ

گجرانوالہ

---

[1] مولانا جھنڈانگری نیپال کے رہنے والے تھے۔ دار الحدیث رحمانیہ دہلی سے فارغ ہوئے اور اپنے آبائی مدرسے سراج العلوم جھنڈانگر کے ناظم رہے۔ جمعیت اہلِ حدیث نیپال کے امیر اور رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کے رکن بھی رہے۔ ۱۹۹۹ء کو فوت ہوئے۔ مولانا جھنڈانگری نے مولانا سلفی رحمہ اللہ کی وفات کے بعد ''الاعتصام'' میں ایک مضمون لکھا تھا، جس میں انھوں نے ذکر کیا ہے کہ ''میرے پاس مولانا سلفی رحمہ اللہ کے تقریباً ایک سو خطوط ہیں۔'' تلاشِ بسیار کے بعد ہمیں ان کے نام مولانا سلفی رحمہ اللہ کے چند ایک مکاتیب ہی مل سکے ہیں۔ اس سلسلے میں ہم نے ان کے ادارے سراج العلوم جھنڈانگر میں بھی رابطہ کیا تھا، لیکن وہاں سے بھی کوئی مثبت جواب نہیں مل سکا۔

مکتوب نمبر 15

(۲)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجامعة السلفية. لائل پور

پاکستان میں اسلامی علوم کی مرکزی درس گاہ

گجرانوالہ

۲۸۔۱۔۶۲ء

محترم مولانا! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج گرامی۔ مبلغ ۲۷ روپے میں نے حکیم محمد صادق [کو] بھیج دیے۔ اس کی [اطلاع] میں نے اور حکیم صاحب موصوف نے مولانا راز[1] کو دے دی ہے۔ مولانا حکیم محمد صادق صاحب کی چٹ لف کر رہا ہوں۔ امید ہے جناب بمبئی سے واپس وطن پہنچ گئے ہوں گے۔

کتاب "تنبيه الباحث السني على ما في التأنيب و رسائل الكوثري"[2] کی غالباً بمبئی کے مکاتب میں تلاش فرمائی ہوگی۔ یہاں یہ کتاب کراچی میں مرحوم نور محمد کے لڑکے کے ذاتی کتب خانہ میں ہے، فروختنی نہیں۔ ابناء شرف الدین یا ابناء غلام رسول صاحب جہاں بھی ملیں تلاش فرمائیں۔ میں نے یہاں کے کتب فروشوں سے بھی کہا ہے۔

آپ نے اس [دفعہ] بڑا طوفانی دورہ فرمایا۔ ایک ماہ سے زائد عرصہ آپ غائب رہے۔ مولانا راز مطلع نہ فرماتے تو میں تو پاک و ہند کے اخبارات میں ایک مفقود الخبر کا اشتہار دینے والا [تھا]۔ مجھے اطلاع ملی تھی، نیپال اور ہند کے اختلافات کی وجہ سے آپ پر پابندی لگا دی گئی [ہے]۔ اس لیے اہلِ حدیث کانفرنس نے بھی آپ کو اپنی رکنیت سے علیحدہ کر دیا۔ معلوم نہیں ان واقعات میں کہاں تک صداقت ہے؟ فرمایئے کانفرنس اہلِ حدیث... کس مرحلہ تک پہنچا؟

والسلام

محمد اسماعیل

............❀❀❀............

---

[1] مولانا محمد داود راز (شارح صحیح بخاری) مراد ہیں۔

[2] یہ علامہ محمد عربی تبانی جزائری (۱۹۷۰ء) کی تالیف ہے۔ بعض مصادر میں اس کتاب کا نام "تنبيه الباحث السري إلى ما في رسائل و تعاليق الكوثري" مذکور ہے۔

مکتوب نمبر 16

(۳)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

گجرانوالہ

۲۹-۲-۶۲ء

محترم مولانا! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج گرامی۔ عرصہ ہوا جناب کی خیریت سے اطلاع نہیں۔ امید ہے جناب مع العیال بخیر ہوں گے۔ اکمل البیان[1] کی پہلی جلد طباعت کے مراحل میں ہے۔ دوسری جلد کاتب کا تختۂ مشق۔ دونوں جلد یکجا شائع کرنے کا ارادہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے تکمیل تک پہنچائے۔ جناب کی رقم مبلغ ۲۵۰ امانت پڑی ہے۔ عید اضحیٰ سے پیشتر سبزی کے تاجر دہلی سے یہاں آئیں گے۔ اگر جناب پسند فرمائیں تو یہ رقم مولانا محمد داود صاحب راز کے پاس دہلی اجمیری گیٹ پہنچا دوں؟

مجھے جناب کے جواب کا انتظار ہے۔ کاش آپ کا جواب عید سے پہلے مل جائے۔

والسلام

محمد اسماعیل، گوجرانوالہ

حاجی عبدالکریم صاحب تاجر ہڈی کے کیس کا کیا حال ہے؟ ان کی اعانت کے لیے رقوم کس پتے پر بھیجی جائیں؟ میری مراد پاکستانی رقوم سے ہے۔ میں نے اس کے متعلق خواجہ سلیم صاحب کو دہلی لکھا۔ انھوں نے توجہ نہیں فرمائی۔ غالباً بڑے آدمی ہیں، انھیں ایسے معمولی امور کے لیے فرصت کہاں؟

محمد اسماعیل، گوجرانوالہ

---

[1] أكمل البيان في تائيد تقوية الإيمان، تالیف حافظ عزیز الدین مراد آبادی، جو مولانا سلفی رحمہ اللہ کی ترغیب و تحریض اور جماعت اہلِ حدیث گوجرانوالہ کے تعاون سے مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی رحمہ اللہ کی زیرِ نگرانی مکتبہ سلفیہ لاہور کی طرف سے شائع ہوئی تھی۔

مکتوب نمبر 17

گجرانوالہ

۳۰۔۹۔۶۲ء

محترم مولانا! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ملتان کی ایک کانفرنس میں جناب کا نام مرقوم ہے۔ کیا جناب کو دعوت ملی ہے اور آپ آ رہے ہیں؟ اگر جناب آ رہے ہوں تو اجازت کچھ زیادہ وقت کے لیے لائیں۔ شروع نومبر میں مرکزی جمعیت کی کانفرنس بھی ہو رہی ہے۔ اگر جناب [کو] کوئی دعوت نہ پہنچی ہو یا جناب نے نفی میں جواب دیا ہو تو بھی مفصل اطلاع [فرمائیں] تاکہ جھوٹی دعایت کی راہ روکی جا سکے۔ جناب قریباً ستر روپے مدت سے آئے ہیں، فرمائیں کیسے بھیجوں؟

والسلام

محمد اسماعیل، کان اللہ لہ

گجرانوالہ

مکتوب نمبر 18

(۵)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مرکزی جمعیت اہلِ حدیث مغربی پاکستان

شیش محل روڈ۔ لاہور

۱۳۔۹۔۶۰ء

مکرم مولانا! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج گرامی۔ پہلا عریضہ مل چکا ہوگا۔ مولانا راز کا اب تک کوئی خط نہیں [آیا]۔ میں نے ان کے حسب الحکم خطوط دہلی کے پتے پر لکھے، لیکن اب تک اس پتے سے کوئی جواب نہیں آیا۔ قرآنِ عزیز کے متعلق ایک مسودہ ان

کو اسی پتے سے بھیجا، اس کی اکنالجمنٹ آئی، لیکن اس پر کسی کے دستخط نہیں، آج ہی ان کو پھر خط لکھا ہے۔

میں نے حتی المقدور کوشش کی کہ نصرۃ الباری[1] کا حساب ختم ہو جائے، مگر ایسے عوائق آرہے ہیں۔ یہ حقوق العباد کا معاملہ ہے، جس کے لیے رب العزت نے بھی عفو کا وعدہ نہیں فرمایا۔ اگر معاملہ درست ہونے سے پہلے کوئی ایسا حادثہ ہو جائے کہ یہ قرض ادا نہ ہو سکے تو امید ہے کہ آپ معاف فرما دیں گے۔ میں پوری کوشش کر رہا ہوں کہ آپ کا قرض ادا ہو جائے۔

مدیر ''الاعتصام'' کو میں نے آپ کے اخبار کے متعلق لکھا تھا، ان کا جواب آیا ہے کہ مولانا کا اخبار اعزازی ہے اور جا رہا ہے، البتہ مدرسہ کا اخبار بند کیا گیا ہے، میں ان کا خط بجنسہٖ بھیج رہا ہوں۔

ابن حزم کی کتاب ''جوامع السیر'' آئی ہے۔ آپ بھی اسے ملاحظہ فرما دیں، بمبئی سے مل سکے گی۔ میری دانست میں اسے بطورِ نصاب مدارس میں رکھنا چاہیے۔

والسلام

محمد اسماعیل، گوجرانوالہ

............❀❀❀............

مکتوب نمبر 19

(حضرت مولانا عطاء اللہ صاحب حنیف بھوجیانی کے نام دو خط)

(۱)

گجرانوالہ

۶۔۳۔۶۷ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محترم مولانا! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

کل جناب سے ملاقات نہ ہو سکی۔ میں بھی [اس] دن لاہور نہیں آ سکا۔ صلح کے سلسلے میں خیال تھا، عواقب پر غور ہو جاتا۔ تاہم میرا خیال ہے، ہمیں صاف دلی سے اسے آگے بڑھانا چاہیے۔ میرا خیال ہے مشیر کے سلسلے میں میری شمولیت اصولاً غلط ہے۔ حافظ صاحب کے لیے مناسب نہ تھا، لیکن ان کو فریقین نے قبول کیا ہے، ورنہ بظاہر میں اور حافظ صاحب فریق ہیں۔ جناب حاجی صاحب اور مولانا محمد حنیف صاحب کو اپنے ساتھ شامل رکھیں، دونوں سنجیدہ اور معاملہ فہم ہیں۔

---

[1] نصرة الباري في بيان صحة البخاري، یہ مولانا جھنڈانگری کی تالیف ہے۔

"المنار" کی جلد ۱۱۔۱۲ جناب دے گئے ہیں یا کوئی اور۔ غالباً جلد نئی (؟) ہوئی، گیارھویں کی خیر (؟) بارھویں کے آخر میں لگ گئی ہے اور غالباً جز بندی سابقہ ہی رکھی گئی ہے، نیز اس کی مزدوری بھی نہیں بتائی۔ باقی جلدیں آنے پر کتابوں کی قیمت بھی۔إن شاء اللّٰہ ....

والسلام

مکتوب نمبر 20

(۲)

مرکزی جمعیت اہلِ حدیث مغربی پاکستان

۷۔ ایبک روڈ۔ حدیث منزل۔ لا ہور

محترم مولانا! السلام علیکم ورحمۃ اللّٰہ وبرکاتہ

پرسوں دفتر میں حاضر ہوا، آپ دفتر سے جا چکے تھے، ملاقات نہ ہوسکی۔ اکمل البیان کا حساب مکمل فرما کر عزیزی محمد صاحب کی معرفت بھیج دیں۔ باقی کتب کا حساب بھی اگر کوئی ہو تو اسے بھی ایک دفعہ ختم کر لینا چاہیے۔ تاریخ کبیر للبخاری کی قیمت سے مطلع فرمائیں، اگر قیمت کے متعلق آپ قریباً ایک ماہ صبر فرما سکیں تو اسے جلد کے لیے دے دیں۔ اس عرصے میں۔إن شاء اللّٰہ۔ قیمت پیش کر دی جائے گی۔

اکمل البیان کے متعلق جناب نے جو صورت فرمائی تھی، میری ناتجربہ کاری کی بنا پر وہ اندازہ گراں معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے کسی بحث کے بغیر میری گزارش ہے کہ آپ ساڑھے سات سو کتاب اکیڈمی کو دے دیں، اڑھائی سو آپ رکھ لیں۔ جو کتابیں بلا قیمت دی گئی ہیں، وہ بھی اسی تناسب سے وضع فرما لیں۔ یہ معاملہ چونکہ ابتدا میں طرفین نے طے نہیں کیا، اس لیے یہ موجبِ بحث نہیں ہونا چاہیے۔ اُمید ہے آپ یہ نقصان گوارا فرمائیں گے۔

مولانا نذیر احمد صاحب[1] کے متعلق اس پرچے میں نوٹ آ جائے گا۔ شوریٰ کی خیریت کے ساتھ نامزدگیاں اب ختم اور مزید تاخیر گوارا نہ ہوگی، اس کے متعلق سوچ کر لاہور یا یہاں اکٹھے ہو کر نامزدگیاں کر دی جائیں۔

والسلام

محمد اسماعیل، گوجرانوالہ

[1] مولانا نذیر احمد رحمانی املوی (م ۱۹۶۵ء)

مکتوب نمبر 21

(مولانا عبدالعلیم ماہرؒ[1] کے نام چھے خطوط)

(۱)

مرکزی جمعیت اہلِ حدیث مغربی پاکستان

۷۔ ایبک روڈ، حدیث منزل لاہور

مورخہ: ۵۔۱۲۔ ۱۹۶۶ء

حبي الأعز! زيد شرفكم. السلام عليكم و رحمة الله و بركاته

منطقوں کی تقسیم کے [بعد] آپ حضرات کی زیارت کافی مشکل ہے۔ ممنون ہوں کہ آپ حضرات کسی نہ کسی عنوان سے یاد فرما لیتے ہیں۔ زادكم الله مجدا و شرفاً.

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ نے تبوک کے اہلِ توحید و سنت کو لکھا تھا:

إذا طلعت شمس النهار فإن ذا أمارة تسليمي عليكم فسلموا

احباب کو اسی نوعیت کا سلام ہر آن کیجیے۔

جماعت میں اہلِ علم اور اہلِ قلم کا فقدان روز بروز بڑھ رہا ہے۔ اللہ ہی اس کمی [کو] پورا فرمائے۔ وما ذلك على الله بعزيز.

مرحومؒ[2] کے مکاتیب آخر ہماری بھی آس اور اُمید ہے۔ إن شاء اللہ مل جائیں گے، تلاش کی ضرورت ہے۔

استرخائے اعصاب کی وجہ [سے] تقریباً تین ماہ صاحبِ فراش رہا۔ اب کچھ ہمت ہوئی ہے۔ قریبی مقامات کا سفر کر لیتا ہوں، مگر اس وقت بھی نقاہت کافی ہے۔

خطوط کو اہتمام سے سنبھالنے کی عادت نہیں۔ اُمیدِ قوی ہے کہ مرحوم کے چند خطوط مل جائیں گے۔ میں اتنی دور بیٹھے کیا مشورہ دے سکتا ہوں؟ دعائیں بہرکیف آپ کے ساتھ ہوں گی۔ حضرت مولانا عبیداللہ صاحبؒ[3]، مولانا عبدالرؤف صاحب جھنڈانگری، مولانا داؤد صاحب راز اور مولانا عبدالصمد عبدالحکیم صاحب،

---

[1] مولانا عبدالعلیم ماہر دہلی، انڈیا کے رہنے والے ہیں۔ آپ جامعہ ریاض العلوم دہلی کے مدرس اور ادیب و شاعر بھی ہیں۔ ایک شعری مجموعہ بھی مطبوع ہے۔

[2] مولانا ماہر نے حضرت سلفی رحمہ اللہ سے مولانا نذیر احمد رحمانی املوی (م ۱۹۶۵ء) کے مکاتیب کی بابت پوچھا تھا۔

[3] مولانا عبیداللہ رحمانی مبارکپوری (م ۱۹۹۴ء)

یہی بہترین مشورے دے سکتے ہیں۔ طبیعت تھوڑی بہتر ہوتے [ہی] ۔إن شاء اللّٰہ۔ تلاش شروع کر دوں گا۔

میرا خیال ہے پاکستان میں مولانا عطاء اللہ صاحب حنیف مکتبہ سلفیہ شیش محل روڈ سے مرحوم کا یہ سلسلہ موجود تھا۔ ممکن ہے سید بدیع الدین صاحب نیو سعید آباد، گوٹھ پیر جھنڈا ضلع حیدر آباد سندھ سے بھی ہو۔ میں اس سلسلے میں مزید معلومات حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔ یاد فرمائی کے لیے مکرر شکریہ۔

حضرت میاں صاحب مرحوم[1] کے متعلق مولانا[2] نے جو لکھا تھا غالباً مسودہ ہوگا، اُسے صاف کر کے شائع کرنا چاہیے۔

والسلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

محمد اسماعیل، کان اللہ لہ

گجرانوالہ

⁂

مکتوب نمبر 22

(۲)

مرکزی جمعیت اہلِ حدیث مغربی پاکستان

۷، ایبک روڈ، حدیث منزل، لاہور

مورخہ: ۲۰۔ا۔۶۷ء

حضرت المحترم! السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

مکتوب گرامی ملا۔ یاد فرمائی کے لیے شکریہ۔ مکتوب رمضان میں ملا۔ کچھ رمضان کے مشاغل، اس کے ساتھ اعصاب میں درد، کمر میں تکلیف، اس لیے جواب میں دیر ہوئی۔ بصمیم قلب معذرت خواہ ہوں۔

میرا خیال ہے میرے پاس حضرت مرحوم[3] کے تین خطوط ہوں گے۔ آج مولانا عبدالسلام صاحب مدرس[4] اور طلبا کی تھوڑی سی محنت سے مرحوم کا آخری مکتوب ملا۔ اس کے بعد مولانا عبدالوحید صاحب کا مکتوب ان کی شدتِ علالت کے متعلق آیا، اور احباب کے خطوط بھی اسی سلسلے میں آئے، لیکن ان کا کوئی مکتوب نہ ملا۔ رحمہ اللّٰہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً.

---

[1] میاں نذیر حسین محدث دہلوی (۱۳۲۰ھ)

[2] مولانا نذیر احمد رحمانی املوی

[3] مولانا نذیر احمد رحمانی املوی

[4] محترم المقام حافظ عبدالسلام صاحب بھٹوی، جو اس وقت جامعہ محمدیہ چوک نیائیں میں مدرس تھے۔

اب ذرا طبیعت درست ہونے پر مزید کوشش کروں گا۔ اُمید ہے باقی خطوط بھی مل جائیں گے۔ إن شاء الله.

مولانا! صحیح قیادت ہر جگہ مفقود ہے۔ "کَبَّرَنِيْ مَوْتُ الْکُبراء" کا معاملہ سب جگہ کارفرما ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ حضرات کو نعمتِ اخلاص سے نوازے۔ مستقبل کے معمار آپ حضرات ہیں۔ وفقکم اللّٰه لما یحب و یرضیٰ.

① مولانا بھوجیانی رحمہ اللہ کا پتا: مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی، مکتبہ سلفیہ شیش محل روڈ لاہور۔

② گوٹھ پیر جھنڈا، نیو سعید آباد، ضلع حیدر آباد سندھ، سید شیخ بدیع الدین صاحب۔

مولانا رحمانی کی اس آخری تحریر متعلقہ میاں صاحب کو جلد از جلد شائع کرنا چاہیے۔ اگر وہاں چھپنے کا امکان نہ ہو تو اِدھر بھیج دیں، یہاں سے شائع ہو جائے [گی]۔ پیش لفظ مولانا عبید اللہ صاحب[1] لکھیں۔

والسلام

محمد اسماعیل

گجرانوالہ، چاہ شاہاں

مکتوب نمبر 23

(۳)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

گجرانوالہ

۲۳۔۱۔۶۷ء

محترم مولانا! السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

مکتوب شروع جنوری میں ملا۔ اس اثنا میں طبیعت پھر خراب ہوگئی۔ جواب میں غیر معمولی دیر ہوئی۔

حضرت مولانا نذیر احمد صاحب مغفور کا ۱۴ر مئی ۶۵ء کا آخری مکتوب سرِ دست ملا ہے، جو بجنسہٖ مرسل ہے۔

کل یا پرسوں ایک جدید مطبوعہ نسخہ "تحریک آزادیٔ فکر اور شاہ ولی اللہ کے تجدیدی کارنامے" بذریعہ رجسٹرڈ پارسل بھیج رہا ہوں۔ خدا کرے آپ تک پہنچ جائے۔ احتیاطاً میں نے چٹھی کی نقل رکھ لی ہے۔ مکتوب ملنے کی

① مولانا عبید اللہ رحمانی (شارح مشکاۃ)

اطلاع بھی دیں اور کتاب ملاحظہ فرمانے کے بعد اس کے محتویات کے متعلق رائے گرامی سے مطلع فرما دیں۔

''حسن البیان''[1] اور ''الارشاد''[2] اہلِ حدیث اکیڈمی نے شائع کی ہے۔ حسن البیان کے شروع میں مَیں نے یہاں کے دیوبند حضرات سے تنگ آ کر مبسوط پیشِ لفظ لکھا ہے، جس میں کسی قدر تلخی آ گئی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ حضرات اسے ملاحظہ فرمائیں۔ یہاں کی بے اعتدالی دیوبند ہی سے آئی ہے۔ مولانا انور شاہ صاحب کے نام سے ایک ان کا لختِ جگر، جو شائع کر رہا ہے، وہ خطرناک ہی نہیں، شرمناک بھی ہے۔ اپنے مسلک کی حمایت تو بجا ہے، مگر محدثین کی تنقیص کے لیے کوئی وجہ جواز نہیں۔ والسلام

اُمید ہے دعاؤں میں یاد رکھیں گے، عمر کے آخری لمحات قرآن و سنت کی خدمت میں گزر جائیں۔ مولانا عبد الرؤف صاحب[3] آپ سے کتنی دور ہیں؟

والسلام

محمد اسماعیل، کان اللہ لہ

..........❀❀❀..........

مکتوب نمبر 24

(۴)

مرکزی جمعیۃ اہلِ حدیث مغربی پاکستان

۷۔ ایبک روڈ، حدیث منزل، لاہور

مورخہ: ۹۔۳۔۶۷ء

محترم مولانا! السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

''أنوار الباري''[4] میری نظر سے نہیں گزری۔ دیوبندی حلقوں [میں] اس کی خاصی شہرت ہے۔ تحریر کا

---

[1] یہ مولانا عبد العزیز رحیم آبادی (م مارچ ۱۹۱۸ء) کی تالیف ہے، جو مولانا شبلی نعمانی (م نومبر ۱۹۱۴ء) کی کتاب ''سیرۃ النعمان'' پر نقد ہے۔

[2] مولانا ابو یحییٰ شاہجہانپوری (م ۱۹۲۰ء) کی تالیف: ''الإرشاد إلی سبیل الرشاد في أمر الاجتهاد والتقلید''، جو مولانا رشید احمد گنگوہی (..........) کی تصنیف ''سبیل الرشاد'' کے جواب میں ہے اور ۱۳۱۹ھ کو مطبع انصاری دہلی سے شائع ہوئی تھی۔

[3] مولانا عبد الرؤف جھنڈا نگری۔

[4] یہ مولانا انور شاہ کشمیری (م مئی ۱۹۳۳ء) کے داماد احمد رضا بجنوری کی تالیف ہے، جو صحیح بخاری کی شرح و تقریر ہے۔ یہ کتاب ہندو پاک سے شائع ہو چکی ہے۔ اس کے مقدمے (دو جلدیں) اور شرح میں ائمہ سلف اور مسلکِ محدثین کے متعلق ←

یہ انداز محمد زاہد کوثری کا پیدا کردہ [ہے]۔ مرحوم مولانا انور شاہ بھی اسی سے متاثر تھے۔ موجودہ دیوبندی پود اسی سے متاثر ہو رہی ہے۔ یہاں کے دیوبندی مصنف بھی یہی لب ولہجہ اختیار کر رہے ہیں۔ انیسویں صدی کے پہلے عشرہ [میں] ڈاکٹر عمر کریم پٹنوی نے یہ انداز اختیار کیا تھا۔ مرحوم مولانا ابو القاسم صاحب بناری نے اس کا منہ توڑ جواب دیا۔[1] وہ بریلوی تھا، مگر یہ حضرات ائمہ حدیث پر طعن میں کہیں زیادہ بے باک ہیں۔ پاکستان میں اس قسم کی قانونی دشواریاں ہیں، جن کی تفصیل مشکل ہے۔ مولانا عطاء اللہ صاحب محشی سنن نسائی نے اس موضوع پر کچھ لکھا ہے۔ معلوم نہیں پریس میں کب آئے؟

آپ حضرات مطالعہ کریں اور قلم اُٹھائیں۔ مولانا نذیر احمد تو اب نہیں آئیں گے۔ عزم ہو تو اسباب خود بخود پیدا ہو سکتے ہیں۔ میں کوشش کر رہا ہوں "حُسن البيان" آپ کو بھجوا دوں۔ معلوم نہیں کہ پہلے پارسل میں خطیب بغدادی کی کتاب "شرف أصحاب الحديث" آپ کو بھیجی یا نہیں؟[2]

ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ شخصیتیں اسی طرح اُبھرتی ہیں۔ مطالعہ کے لیے چند رفقار حجانِ طبیعت کے مطابق مختلف راہیں اختیار فرمائیں اور اس نہج پر متعدد کتابیں دیکھ ڈالیں۔ اس پر نوٹ لکھیں،اس سے مواد بھی فراہم ہوگا اور طبیعت بھی کھل جائے گی۔ متعدد ساتھی کسی مقام پر ہر ماہ جمع ہو کر اپنے موضوع پر تبادلہ خیال فرمائیں اور ایک دوسرے کے مطالعے سے استفادہ فرمائیں۔

اللہ تعالیٰ آپ حضرات سے اپنے دین کی خدمت لے اور آپ کو کام کے لیے عزم کرنے کی توفیق مرحمت فرمائے۔

والسلام

محمد اسماعیل، کان اللہ لہ

............❀❀❀............

➜ مولف نے انتہائی دریدہ دہنی اور طعن وتشنیع سے کام لیا ہے۔ اس کا جواب برصغیر کے معروف سلفی عالم مولانا رئیس الاحرار ندوی نے "اللمحات إلى ما في أنوار الباري من الظلمات" کے نام سے دیا ہے، جو پہلے جامعہ سلفیہ بنارس سے چار جلدوں میں اور پھر پانچ جلدوں میں پاکستان میں شائع ہو چکا ہے۔

[1] مولانا بناری مرحوم نے اس سلسلے میں سات کتب و رسائل لکھے تھے، جو مکتبہ ام القریٰ گوجرانوالہ کی طرف سے "دفاع صحیح بخاری" کے نام سے یکجا شائع ہو چکے ہیں۔

[2] یہ کتاب جمعیت اہلِ حدیث پاکستان نے شائع کی تھی، جس کے آغاز میں حضرت سلفی رحمہ اللہ کا عربی میں ایک مبسوط مقدمہ درج ہے۔ یہ مقدمہ زیرِ نظر مجموعے (ص: ۴۳۵) میں بھی شامل ہے۔

مکتوب نمبر 25

(۵)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

گوجرانوالہ

۹۔۶۔۶۷ء

محترم مولانا! السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

مزاج گرامی! خیال نہیں کوئی مکتوبِ گرامی ملا اور جواب رہ گیا ہو۔ ہوسکتا ہے کہ کسی وجہ سے ملا ہی نہ ہو۔ مولانا عطاء اللہ سے عرض کر دوں گا۔ غالباً انھوں نے ایک دو مکتوب تلاش کیے ہیں۔ میں جب ملے، عرض کروں گا۔ مرحوم امام خاں[1] کا لڑکا لاہور میں وکیل ہے۔ ہم لوگوں سے کوئی تعلق نہیں۔ مولانا عطاء اللہ صاحب سے مراسم ہیں۔ انھیں یاددہانی کرائیں، ممکن ہے کوئی مکتوب مل جائے۔

شیخ بدیع الدین حجاز گئے تھے، اب واپس آئے ہیں۔ ممکن ہے پہلے مکاتیب نہ ملے ہوں۔ انھیں پھر لکھیے۔ پیر صاحب ڈاک کے جواب میں بہت متساہل ہیں۔

جناب کے تاثرات مجھے نہیں ملے۔ ترجمان میں پڑھے۔ جناب کے تاثرات مجھے کتاب کے ناشر نے بھیجے۔ شکریہ۔ ملک امام خاں کے ورثا بے حد حریص ہیں، ان کے مسودات کی بڑی گراں قیمت طلب کرتے ہیں۔ سنا ہے تراجم اہلِ حدیث ایک دو جلدیں بصورتِ مسودہ موجود ہے۔[2] وہ سودے بازی کر رہے ہیں۔ ویسے بھی بے دین ہیں۔ آخر عمر میں ملک صاحب کے حالات بھی کچھ خراب ہوگئے تھے۔ وہ خود بھی فروخت کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ اللہ تعالیٰ انھیں معاف فرمائے۔

والسلام

محمد اسماعیل، کان اللہ لہ

---

[1] مولانا ابو یحییٰ امام خاں نوشہروی (م ۱۹۶۶ء)

[2] تراجم علمائے حدیث ہند کی جلد اول ۱۹۳۸ء میں دہلی سے شائع ہوئی۔ باقی جلدیں زیرِ ترتیب تھیں، لیکن مولانا دیگر تصنیفی مشاغل میں ایسے اُلجھے کہ انھیں مکمل نہ کر سکے۔ جناب ضیاء اللہ کھوکھر (گوجرانوالہ) نے دوسری جلد کا مسودہ مولانا نوشہروی کے فرزند عبدالباقی ایڈووکیٹ سے حاصل کیا، جو بالکل ابتدائی حالت میں ہے اور اشاعت کے لیے موزوں نہیں۔

اس پتے پر خط لکھیں: سوہدرہ، ضلع گوجرانوالہ براستہ وزیر آباد، بجانب ملک امام خاں صاحب ان کی اہلیہ کو ملے۔ والسلام

مکتوب نمبر 26

(۲)

واذکر فی الکتاب "إسماعیل"	Mohammad Ismail
چاہ شاہاں گوجرانوالہ	Chah Shahan
Dated ۵۔۱۔۶۷ء	Gujranwala

حبی العزیز! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مکتوب ملا۔ تقسیم کے اثرات کے [متعلق] آپ کے احساسات بالکل درست ہیں۔ دونوں منطقے یکساں متاثر ہیں۔ یہاں بھی "کَبَرَنِيُ مَوْتُ الْکُبراء" ہی کا معاملہ ہے۔ لیکن ماضی کا ماتم مرض کا علاج نہیں، بلکہ ماضی کے کھنڈروں پر مستقبل کی تعمیر اربابِ ہمت کا شیوہ ہے۔ تقسیم سے پہلے جو خلا نمودار ہوئے، انھیں پاٹنے کی ہمیں توفیق کب ہوئی؟ نذیر احمد رحمہ اللہ اگر واپس نہیں آ سکے تو نذیر حسین کی جگہ کب پُر ہوئی؟ ہمت کو سہارا دیجیے اور اپنے کندھوں کو اس بوجھ کے لیے تیار فرمایئے۔

عرصہ ہوا مولانا مرحوم کا ایک مکتوب اور چند مطبوعہ پریشان خیالات بنام "تحریکِ آزادیِ فکر" ارسال کیے گئے۔ پارسل رجسٹرڈ تھا، مگر تاحال اس کی رسید نہیں ملی۔ مل جائے تو مطلع فرما دیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ کتاب مولانا عبدالرؤف صاحب جھنڈانگری کو بھیجی تھی، اُن کی رسید آئی۔ اس کے ساتھ شیخ یحییٰ صاحب اُن کی رسید بھی نہیں۔ ہر کتاب کے متعلق اپنی رائے گرامی سے مطلع فرمائیں۔

مولوی عطاء اللہ حنیف صاحب کو غالباً آپ نے نہیں لکھا۔ ان کے پاس مرحوم کے کئی ایک مکتوب موجود ہیں، انھوں نے مجھ سے اس کا ذکر فرمایا۔

ہمارے ہاں ایک جدید فتنہ سر اُٹھا رہا ہے حافظ عنایت اللہ گجراتی۔ آپ نے سنے ہوں گے۔ انھوں نے تین کتابیں شائع کی ہیں: "عیون زم زم" "بحر قلزم" اور "نظر جزَیم"۔ ان کا خیال ہے کہ حضرت مسیح کی پیدائش بلا باپ نہیں ہوئی، بلکہ حضرت مریم کا نکاح یوسف نجار سے [ہوا] تھا۔ وہ حضرت مسیح کے باپ

تھے۔ تا حال تو اس کا جواب نہیں دیا گیا۔ خیال ہے یہ خاموشی توڑنی پڑے [گی]۔ والسلام

مولانا نذیر احمد صاحب کا جولڑکا مدینہ یونیورسٹی تعلیم حاصل کر رہا ہے، اس کا کیا نام ہے اور تعلیم اس کی کتنی مدت باقی ہے؟

والسلام

محمد اسماعیل، کان اللہ لہ

گجرانوالہ

....

مکتوب نمبر 27

(مولانا نذیر احمد رحمانی کے نام دس خطوط)

(۱)

مرکزی جمعیت اہلِ حدیث مغربی پاکستان

شیش محل روڈ۔ لاہور

مکرم ومحترم حضرت مولانا زادمجدکم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مرکزی جمعیت اہلِ حدیث مغربی پاکستان کی سالانہ کانفرنس امسال یکم تا چار اپریل لائل پور میں ہو رہی ہے۔ یکم، دو اپریل کو مرکزی کونسل کے اجلاس ہوں گے اور تین، چار کو پبلک اجلاس۔

ارکانِ جمعیت کی دلی آرزو ہے کہ جناب اس کانفرنس میں شرکت فرمائیں۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ جمعیت اہلِ حدیث مغربی پاکستان کی اس مخلصانہ دعوت کو شرفِ قبولیت بخشیں گے۔

آپ کی تشریف آوری ہمارے لیے انتہائی مسرت کا موجب ہوگی۔ جناب کے مصارف جمعیت کے ذمے ہوں گے۔

آپ کا مخلص

محمد اسماعیل، گوجرانوالہ

ناظم اعلیٰ مرکزی جمعیت اہلِ حدیث، مغربی پاکستان

....

مکتوب نمبر 28

(۲)

راذكر فى الكتاب "إسماعيل" Mh. Ismail, Chah Shahan

چاہ شاہاں گوجرانوالہ Gujranwala

حضرت الاعز المحترم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاجِ گرامی! تقسیم کے بعد دونوں منطقوں میں بدعی عقائد کی اشاعت میں منظم سرگرمی نظر آ رہی ہے۔ ہمارے ہاں یہ حضرات قادیانیت اور تشیع کے متعلق بے حد متساہل ہیں۔ ہمارے ہاں یہ ہنگامہ تحریک ختم نبوت ۵۳ء کے بعد تیز ہوا ہے۔ باستثناء دو تین حضرات کے تمام بریلوی حضرات نے معافی مانگی۔

تحریک ختم نبوت کے ایام میں مولوی سردار محمد صاحب بریلوی نے سر ظفر اللہ سے ان کے سیلون میں ملاقات کی۔ ہمارے ایک دوست مولانا عبیداللہ احرار فیروز پوری نے اس واقعہ کو عدالتی چیلنج کی صورت دی، لیکن نہ مولوی سردار محمد نے عدالت میں حاضری کی جرأت کی اور نہ عدالت ہی اس کے لیے آمادہ ہوئی کہ اس واقعے کی چھان بین کرے۔

میں نے رسالہ "تردید عقائدِ بدعیہ" بالاستیعاب پڑھا۔ بعض دوسرے دوستوں کو بھی پڑھنے کے لیے دیا، سب نے پسند فرمایا۔ ایک خوبی اس میں یہ ہے کہ مباحث کی پہنائی صرف مسائل تک محدود رہی ہے۔ مناظرانہ ہمز ولمز اور طعن وتشنیع کا طریق اختیار نہیں فرمایا گیا، حالاں کہ بریلوی لٹریچر پڑھنے کے بعد اس عادت سے بچنا مشکل ہے۔ مولوی احمد رضا اس کبر وتبختر کے باوجود انھیں معلومات کے متعلق وہ بدزبانی سے نہیں رکتے۔ مسائل سے زیادہ رذائل کا استعمال ان کی طبیعتِ ثانیہ ہے۔ ان کی کتاب پڑھنے کے بعد طبیعت قصاص پر مجبور ہو جاتی ہے۔ جہالت اور جھوٹ کے ساتھ یہ سینہ زوری؛ بریلوی مجدد کی خصوصیات سے ہے۔ لیکن آپ نے جذبات پر پورا ضبط کیا ہے۔ لِلّٰه درك و عنده أجرك!

اس حصے میں بنیادی مسئلہ علم غیب کی تخصیص ذاتِ حق کے ساتھ ہے۔ قرآنِ عزیز میں غیب دو معنی سے استعمال ہوا ہے: "ما غاب عن البصر" اور "ما غاب عن الحواس بحيث لا يمكن العثور عليه". جناب نے یہ دونوں معنی ذکر فرمائے ہیں، لیکن ان پر سیر حاصل گفتگو نہیں کی۔ غیب کے دونوں معانی کے متعلق غالباً حوالہ بھی نہیں دیا۔ راغب نے مفردات میں لکھا ہے: "يؤمنون بالغيب: ما لا يقع تحت

[1] المفردات (ص: ٣٦٧)

الحواس ولا تقتضيه بداية العقول"[1]

پہلے معنی میں تو عطا اور توہب کی گنجایش ہے۔ دوسرے معنی میں اس کا امکان ہی نہیں۔ اس لیے تفسیر فتح العزیز، کبیر اور مفردات راغب کی طرف توجہ فرما کر ذرا زیادہ واضح فرما دیجیے۔ خالص الاعتقاد وغیرہ میں احمد رضا بھی اپنی زبان سے اسے مانتے ہیں، لیکن حضرات بُرلاء اس کا بدستور انکار کر رہے ہیں۔

غالباً دوسرا حصہ لکھنا شروع ہو گیا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو مزید ضبط کی توفیق مرحمت فرمائے۔ دوسرا حصہ بھی صرف مسائل کی حد تک پورا ہو جائے۔ حاضر ناظر، مختارِ کل وغیرہ مسائل آ جائیں۔ بدنصیبی ہے کہ اہلِ علم کو ان مبتذل مباحث پر لکھنا پڑا ہے۔

میرا اپنا یہ حال ہے کہ جب ان حضرات کے متعلق کچھ لکھنا چاہتا ہوں تو قلم مشتعل ہو جاتا ہے، لیکن بحمد اللہ آپ کے قلم سے یہ لغزش نہیں ہوئی۔

ہمارے بعض دیوبندی حضرات نے بھی اس موضوع پر لکھا ہے۔ ایک کتاب بھیج رہا ہوں، ملاحظہ فرمائیں۔ اخوانِ یوسف کا کیا انداز ہے؟ وما تخفي صدورهم أكبر!!

محمد اسماعیل

مدرس چاہ شاہاں گوجرانوالہ

❁❁❁

مکتوب نمبر 29

(۳)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

گجرانوالہ

۱۷ راگست ۵۹ء

اخی الاعز المحترم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاجِ گرامی! انوارِ مصابیح پہنچ کر موجب مسرت ہوئی۔ ان شاء اللہ کتاب پڑھنا شروع کروں گا۔ دیوبندی حضرات کی عادت ہو گئی ہے، وہ آج کل اہلِ حدیث کے خلاف اسی انداز سے لکھتے ہیں اور غالباً اُن کے اکابر کا بھی یہی انداز ہے۔ سنت سے بغض غالباً تقلید کے لوازم سے ہے۔ یہاں بھی دیوبندی حضرات اسی یہودی ذہن سے کام کرتے ہیں۔ یہ حضرات توحید کی آڑ میں سنت کا شکار کھیلتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو نیکی

کی توفیق دے۔ جماعت کی ...... کبر کی کے مریض ہے۔

ہندوستان میں ایک جامعہ کی تاسیس کا انتظام فرمائیں، جس میں مختلف علوم پر ریسرچ ہو، رجال، اصولِ حدیث اور حدیث پر کچھ تحقیقی انداز سے لکھا جائے۔

مولانا ابو القاسم صاحب کے خاندان اور لڑکوں کا کیا حال ہے؟ عاصم اب کیا کرتا ہے؟

والسلام

محمد اسماعیل، کان اللہ لہ

گوجرانوالہ

مکتوب نمبر 30

(۴)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پاکستان میں اسلامی علوم کی مرکزی اور معیاری درسگاہ

الجامعة السلفية. لائل پور

زیر اہتمام: مرکزی جمعیت اہلِ حدیث، مغربی پاکستان

صدر دفتر

مرکزی جمعیت اہلِ حدیث، مغربی پاکستان

شیش محل روڈ۔ لاہور

فون نمبر: ۴۹۱۴

پتا: جامعہ سلفیہ

نزد نشاط ٹیکسٹائیل ملز۔ لائل پور

تاریخ: ۴/اگست ۱۹۶۳ء

مولانا المحترم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج گرامی! میری دانست میں یہ خاصی مشکل ہے۔ اس لیے کہ اس وقت تحریک پر دو پابندیاں انگریز کی طرف سے اور اہلِ بدعت کی طرف سے۔ افغانستان پہنچنے کے بعد سید احمد صاحب رحمہ اللہ نہیں چاہتے تھے کہ سرحد میں اس قسم کی تفریق ظاہر ہو۔ تصویر التنویر بجواب تنویر العینین کے قلمی نسخے میں ہے کہ سید صاحب نے شاہ صاحب کو حکم کیا کہ آپ اس علاقے میں رفع الیدین وغیرہ نہ کریں۔ یہ مخطوطہ غالباً قلعہ میہاں سنگھ میں موجود ہے۔

آپ زیادہ زور تحریک کے مزاج پر دیں۔ اس میں شاہ عبد العزیز صاحب میں ذرا لچک ہے۔ شاہ ولی

اللہ صاحب میں یہ لچک نہیں یا بہت کم ہے۔تحریک کے مزاج کے لیے اتحاف النبلاء، تاریخ علماءِ اہلِ حدیث، امام خان نوشہروی، اکمل البیان مولانا عزیز الدین مراد آبادی میں اس کے لیے کافی مواد ہے۔

ملا سید میر کے متعلق معلوم ہوا ہے، وہ رفع سبابہ اور جمعہ فی القریٰ کو ضروری سمجھتے تھے۔ اسی وجہ سے وہابی مشہور تھے۔ مولوی غلام رسول صاحب قلعہ میہاں سنگھ ان سے بیعت تھے اور ملا صاحب توحید میں بڑے متشدد تھے۔ مولوی غلام رسول صاحب، حضرت میاں صاحب کے شاگرد ہیں۔ شاہ شہید رحمہ اللہ سے بہت بعد کے ہیں۔ گوجرانوالہ میں اس وقت بھی ان کے دیکھنے والے موجود ہیں۔ قلعہ میہاں سنگھ، گوجرانوالہ سے قریباً پانچ میل ہوگا۔ مولانا غلام رسول صاحب یقیناً اس جہاد میں شریک نہیں تھے۔ مولانا غلام رسول سنت کے اتباع کی تلقین کرتے تھے۔ خود کھلے طور پر رفع الیدین نہیں کرتے تھے، لوگوں کو اس کی تلقین کرتے۔ عاملین بالسنّت کو دیکھ کر خوش ہوتے۔ ان کے لڑکے مولوی عبدالعزیز، مولوی عبدالقادر کھلے اہلِ حدیث تھے۔

مولانا غلام رسول صاحب کی سوانح اگر مل سکی تو ان شاء اللہ بھیجوں گا۔

ایک صاحب مولانا عبدالرب اس جہاد کے بقیۃ السیف تھے، جو ۱۸۳۷ء کے بالاکوٹ سے نکل کر کالا باغ ضلع ہزارہ میں آگئے۔ یہ علاقہ نتھیا گلی سے جانب جنوب دور تک چلا گیا ہے۔ یہاں کی آبادی قریباً پچاس ہزار ہے۔ مولوی عبدالرب صاحب سے متاثر اور سب اہلِ حدیث۔ کالا باغ کی مسجد اہلِ حدیث میں اس وقت مولوی محمود صاحب امام ہیں۔ ایک مختصر سا مدرسہ ہے۔ یہ علاقہ بے حد ٹھنڈا ہے۔ مری سے اونچا علاقہ ہے۔ یہاں قریباً ۹ ہزار فٹ کی بلندی ہوگی۔ مولوی عبدالرب کے یہ تفصیلی حالات نہیں۔ اگر میں اب کے کالا باغ گیا تو مزید حالات دریافت کروں گا۔ مولوی عبدالرب یہاں چھپ کر وقت گزارتے رہے۔

میرا خیال ہے تحریک میں ابتداءً دو ذہن تھے، موحد حنفی اور اہلِ حدیث۔ تقلیدی جمود، ان سے کسی کو بھی پسند نہ تھا۔ شاہ شہید تقلید کے خلاف کھل کر کہتے۔ کچھ اسے ناپسند کرتے۔ اس گروہ کی قیادت مولانا عبدالحی فرماتے تھے۔ بتدریج شاہ شہید کا اثر غالب ہوتا گیا اور کارشہادت کے بعد زمامِ اقتدا پوری اہلِ حدیث کے ہاتھ آگئی۔ ۱۹۴۷ء تک قریباً انھیں کے ہاتھ میں رہی۔

گزارش بے ضرورت لمبی ہوگئی۔ معذرت چاہتا ہوں۔

والسلام

محمد اسماعیل

گوجرانوالہ

مکتوب نمبر 31

(۵)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

گوجرانوالہ

۸۔۶۔۶۳ء

اخی الاعز المحترم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

نصرۃ الابرار کا پہلا اِڈیشن ضرور تلاش فرمائیں۔ اس لدھیانوی خاندان کو بے نقاب کرنا چاہیے۔ یہ خاندان برزخی رہا ہے۔ دیوبند اور بریلوی دونوں سے ملتا اور فائدہ اُٹھاتا رہا ہے۔ نصرۃ الابرار کا مقدمہ خیر شاہ نے لکھا ہے، جو امرتسر کا سخت بدعتی تھا۔

"تنبیہ الباحث السري" میں اس موضوع کے متعلق کچھ نہیں۔ البتہ محمد زاہد کوثری کی تعلیقات اور رسائل پر کڑی تنقید ہے۔

مولانا عبیداللہ صاحب سے سلام عرض فرما دیں اور دعا کی درخواست۔

والسلام

محمد اسماعیل

گوجرانوالہ

مکتوب نمبر 32

(۶)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

گوجرانوالہ

۲۳۔۱۲۔۶۳ء

مولانا المحترم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

کل میں لاہور گیا تھا۔ عبداللہ ملک کو فون پر تاکید کی تھی، وہ عنقریب تمام پرچے بھیج دیں گے۔ ویسے وہ

مضامین مہر صاحب کی کتابوں کے اقتباسات ہیں۔ چند دن انتظار کے بعد اگر نہ پہنچیں تو مکرر مطلع فرما دیں۔ میں نے حاجی اسحاق صاحب حنیف کو بھی کہا ہے۔ ان شاء اللہ وہ بھجوا دیں گے۔ پہلے ''امروز'' حاجی صاحب ہی نے خریدار تھا، اب انھوں نے بیچ دیا ہے۔ پرچے ان شاء اللہ مل جائیں گے۔

والسلام

محمد اسماعیل

گوجرانوالہ

............✿❀✿............

مکتوب نمبر 33

(۷)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

گجرانوالہ

۱۹۔۵۔۶۳ء

مولانا المحترم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج گرامی! مسرت ہوئی، جناب کو رسالہ پہنچ گیا۔ یاد نہیں میں نے جناب کو ''نصرۃ الابرار'' بھیجی تھی یا نہیں؟ یہ کتاب بھی لدھیانوی حضرات نے شائع کی تھی۔ اس کے تین ایڈیشن شائع [ہوئے] پہلا اِڈیشن اس وقت شائع ہوا، جب سرسید نے کالج کی بنیاد رکھی۔ یہ ضخیم ہے، اس میں دیوبندی اور بریلوی حضرات کے فتوے ہیں۔ میری نظر سے نہیں گزرا۔ دوسرا اِڈیشن مختصر ہے، جس میں میاں صاحب کو نذیر حسین بنگالی ظاہر کیا گیا ہے۔ اس وقت کانگریس وفادار جماعت تھی۔ اس کا مطمحِ نظر یوم اول تھا، اس میں تفصیل نہیں دی گئی۔

تیسرا اِڈیشن تقسیم کے بعد شائع ہوا ہے۔ اس میں اہلِ حدیث اور میاں صاحب کا تذکرہ ہے۔ ناپید ہے۔ یہ دونوں اِڈیشن میں نے دیکھے ہیں۔ نصرۃ الابرا کا ایک ہی نسخہ ملا ہے، اگر ضرورت ہو تو بھیج دوں؟

عبدالرحمان صاحب کاشمیری کا عرصہ کے بعد کل خط آیا ہے۔ میں نے سروست ان سے استخراج کیا ہے۔ جواب کے معاملے میں اُن سے دریافت کروں گا۔ ان شاء اللہ

والسلام

محمد اسماعیل

گوجرانوالہ

ایک کتاب حجاز سے آئی ہے:"تنبيه الباحث السري إلى ما في رسائل وتعاليق الكوثري"، غالباً نظر سے گزری ہوگی۔ والسلام

............❁❁❁............

مکتوب نمبر 34

(۸)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

گجرانوالہ

۲۷۔۴۔۶۳ء

اخی المحترم زادمجدکم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ایک رسالہ بذریعہ بک پوسٹ مرسل ہے۔ یہ رسالہ مولوی عطاء اللہ صاحب کے پاس آیا تھا۔ اس میں کچھ مواد آپ کے موضوع سے متعلق ہے۔ اگر پسند ہو تو رکھ لیں، اگر ضرورت نہ ہو تو واپس فرما دیں۔ والسلام

امید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔ قاری احمد سعید صاحب ملیں تو ان سے سلام عرض فرما دیں۔

والسلام

محمد اسماعیل، گوجرانوالہ

چاہ شاہاں

............❁❁❁............

مکتوب نمبر 35

(۹)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

واذکر فی الکتاب "إسماعیل" Mohammad Ismail

چاہ شاہاں۔ گوجرانوالہ Chah Shahan

Dated 25-3-64 Gujranwala

محترم مکرم مولانا! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج گرامی! اس ہفتے کے ترجمان میں جناب کی علالت اور صحت کی اطلاع معاً پڑھی۔ افسوس ہوا،

عیادت کے اجر سے محروم رہا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو کامل اور عاجل صحت عطا فرمائے۔ تحریک اہلِ حدیث کے متعلق معلوم نہیں، شہسوارِ قلم کہاں تک پہنچا؟ تحریک کے بعض رجال کے متعلق جناب نے دریافت فرمایا تھا، ان اتقیا کا پتا کہاں سے چلے؟ تحریک سو سال تک معتوب رہی، لوگوں نے قیمتی اور محفوظ ذخائر کئی دفعہ جلائے۔

مولانا جعفر تھانیسری مرحوم کے پوتے لاہور صدر میں مقیم ہیں۔ خیال تھا ان سے کوئی پتا ملے گا، لیکن وہ بچارے ۱۹۴۷ء کے فسادات میں تہی دست لاہور پہنچے۔ اسمست میں آج کل مولوی برکت اللہ ہیں، شاید ان کے ہاں پرانے رجال کا کوئی ریکارڈ ہو، مجھے تو ان کے ساتھ مراسم نہیں۔ مولانا عبدالخبیر صاحب کی معرفت معلوم فرمائیں، اگر کچھ ہو تو کوئی آدمی بھیج دیا جائے۔

حال ہی میں ایک رسالہ ''حدیث کی تشریعی اہمیت'' طبع ہوا ہے، اس کے ساتھ ''شرف اصحاب الحدیث'' بھیج رہا ہوں۔ مل جائے تو مطلع فرما دیں۔ والسلام

❁❁❁

مکتوب نمبر 36

(۱۰)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مرکزی جمعیت اہلِ حدیث مغربی پاکستان

شیش محل روڈ۔ لاہور

۲۴۔ ۷۔ ۶۸ء

مولانا المحترم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج گرامی! تمام مرسلات اور مراسلات مل گئے۔ جزاکم اللہ احسن الجزاء۔ لدھیانوی خاندان نے جماعت کی ایذا رسانی میں انتہائی عیاری سے کام کیا ہے۔ ان کی خوبی یہ ہے کہ یہ نہ دیوبندی ہیں نہ بریلوی۔ اہلِ حدیث کے خلاف اس کنبے نے برزخ کے طور پر کام کیا ہے، ان کے مراسم بریلوی اور دیوبندی دونوں حلقوں میں ہیں، ان حضرات نے اپنی ساری صلاحیتیں جماعت کے خلاف ہیزم کشی میں صَرف کی ہیں۔

مولوی عبد القادر صاحب کی بعض تصانیف اور بھی ملی ہیں۔ مگر وہ قادیانی اور سرسید کے متعلق ہیں۔ انتقاد صحیح بہت اچھی ہے۔ میں نے نصف سے زیادہ پڑھ لی ہے۔ انتظام المساجد اور ملحقہ رسالہ کل آئے ہیں۔ پڑھ لیا ہے۔ انتظام المساجد نقل کرانے کا خیال ہے۔ نقل ہوتے ہی واپس کر دی جائیں گے۔

میں نے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی کتاب انتقاض الاعتراض نقل کرائی ہے۔ یہ نسخہ کثیر الغلط ہے۔ جناب کی نظر میں اس کا کوئی صحیح نسخہ ہو، جس سے مقابلہ ہو سکے؟ نسخہ میں خود حافظ صاحب رحمہ اللہ نے بیاض رکھے ہیں۔ مرحوم تکمیل نہیں فرما سکے، اس کے باوجود اغلاط ہیں۔ غالباً میرا نسخہ مسودہ نسخہ کا نقل ہے۔

محمد اسماعیل

مدرس گوجرانوالہ

جناب کو یہ سن کر رنج ہوگا کہ مولانا ثناء اللہ صاحب مرحوم کے دو پوتوں مسٹر بہاء اللہ اور ذکاء اللہ کو، ایک بدقماش آدمی نے شہید کر دیا۔ بے چارے دونوں پریس میں تھے، وہیں جان بحق ہوگئے۔ بظاہر اس کی کوئی معقول وجہ معلوم نہیں ہوسکی۔ بہاء اللہ مقامی سیاسیات میں بڑے مخلص ورکر تھے اور ذکاء اللہ جماعتی کاموں میں بھی بڑے مستعد تھے اور پریس کا کام بھی سارا اُنھیں کے ذمے تھا۔

والسلام

محمد اسماعیل

گوجرانوالہ

مکتوب نمبر 37

(مولانا اسحاق بھٹی کے نام تیرہ خطوط)

(۱)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مرکزی جمعیت اہلِ حدیث مغربی پاکستان

شیش محل روڈ لاہور

۱۹ر جولائی ۱۹۶۰ء

مکرمی مولوی محمد اسحاق صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

عرصہ ہوا آپ نے خیال ظاہر کیا تھا کہ سر ڈھانپ کر نماز ادا کرنے کے متعلق مولوی عبداللہ مظفر گڑھی کا مضمون شائع ہو سکے گا۔ میں نے آپ کے وعدے کی بنا پر مضمون بھیج دیا۔ اب اس کے خطوط آ رہے ہیں، میرے خیال میں مناسب ترمیم کے بعد مضمون شائع ہو جانا چاہیے۔

اگر شائع نہ کرنے کا فیصلہ ہو تو اسے اطلاع کر دیں، تاکہ وہ بے چارہ منتظر نہ رہے۔ میں نے جو ابتدائی سطور دیکھی ہیں، وہ غیر ضروری ہیں، انھیں شائع کرنا ضروری نہیں۔ اگر ناپسند ہوں تو چھوڑ دیں۔

والسلام

محمد اسماعیل، کان اللہ لہ

گجرانوالہ

مکتوب نمبر 38

(۲)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

گجرانوالہ

۱۶/نومبر ۱۹۶۰ء

مکرم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

تاج کمپنی کا اشتہار سودی ہے۔ اس کا پراسپکٹس منگا کر صفحہ ۸ دیکھیں۔ اخبار کا خسارہ ان چیزوں سے پورا نہیں ہوگا۔

والسلام

محمد اسماعیل

گجرانوالہ

مکتوب نمبر 39

(۳)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

واذکر فی الکتاب "إسماعیل" — Mohammad Ismail

چاہ شاہاں۔ گوجرانوالہ — Chah Shahan

Dated ۱۷/نومبر ۱۹۶۰ء — Gujranwala

مکرم مولانا اسحاق صاحب مدیر الاعتصام!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ مزاج گرامی؟

کراچی سے واپسی کے بعد حضرت صدر محترم اور باقی رفقا کا بھی خیال تھا کہ کراچی میں بعض احباب کو

''الاعتصام'' اعزازی طور پر بھیجا جائے اور اس کی قیمت دفتر ادا کرے۔ معلوم نہیں اس کے مطابق عمل ہوا ہے یا نہیں؟ اگر جناب کو معلوم ہو تو مطلع فرمائیں۔ ورنہ صدرِ محترم[1] اور ناظمِ نشر و اشاعت[2] سے اس کا تذکرہ فرمائیں۔ اگر وہ اس تجویز کو پسند فرمائیں تو کراچی میں آیندہ کام کے لیے یہ مناسب قدم ہوگا۔ اگر مدرسہ سعودیہ میں الاعتصام نہ جاتا ہو تو چھے ماہ کے لیے پرچہ اعزازی طور پر مدرسہ سعودیہ میں بھی بھیج دیا جائے۔

اخبار میں اشتہارات کے متعلق محمود صاحب[3] کا کام قابلِ تعریف ہے۔ معلوم نہیں یہ اشتہارات محض اعزازی ہیں یا ان سے اخبار کو کچھ فائدہ بھی ہے۔ آپ کو اس کے متعلق اگر علم ہو تو مجھے مطلع فرمائیں۔ ناظمِ تعلیمات[4] سے میں نے دریافت کیا تھا، ان کو اس کے متعلق صحیح علم نہ تھا، لیکن اس کے متعلق محکمہ ٹیکس بھی دریافت کر سکتا ہے۔ اس کے حسابات درست ہونے چاہئیں۔ محمود صاحب کو کمیشن بھی ملنی چاہیے۔

والسلام

محمد اسماعیل، کان اللہ لہ

مولوی عبداللہ صاحب مظفر گڑھی کے مضمون ''ننگے سر نماز'' کے متعلق آپ نے اشاعت کا وعدہ کیا تھا، اسے شائع کر دیا جائے۔ وہ بار بار مجھے لکھ رہے ہیں، اگر اشاعت کا خیال نہ ہو تو انھیں مضمون واپس بھیج دیجیے۔ ممکن ہے وہ ذاتی طور پر اسے شائع کرانا چاہتے ہوں۔ ان کے کئی خطوط آ چکے ہیں۔

والسلام

محمد اسماعیل

گجرانوالہ

............❀❀❀............

---

① مولانا داود غزنوی (م ۱۹۶۳ء)

② حاجی محمد اسحاق حنیف۔

③ مکتوبِ گرامی میں حضرت مولانا نے محمود صاحب کا ذکر فرمایا ہے۔ یہ معروف اہلِ حدیث عالم و مصنف مولانا محمد جونا گڑھی دہلوی کے بیٹے تھے۔ کچھ عرصہ ''الاعتصام'' میں بطورِ مینجر کام کرتے رہے۔ بڑے مستعد اور محنتی شخص تھے۔ تقریباً تین سال قبل [۱۹۹۳ء] انھوں نے کراچی میں حرکتِ قلب بند ہو جانے سے وفات پائی۔ إنا للّٰه وإنا إليه راجعون. [مولانا محمد اسحاق بھٹی]

④ ناظمِ تعلیمات سے مولانا محی الدین احمد قصوری مراد ہیں۔ [مولانا محمد اسحاق بھٹی]

مکتوب نمبر 40

(۴)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

گجرانوالہ

۸ر مارچ ۱۹۶۱ء

مکرم ومحترم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

پہلے بھی کئی دفعہ لکھا ہے۔ مولو عبداللہ صاحب ڈیرہ غازی خاں کا مضمون میں نے آپ کو بھیجا تھا، اسے شائع نہیں کرنا تو فوراً واپس بھیج دیں۔ وہ کئی خط لکھ چکے ہیں۔ ایسے مضمون واپس بھیجنا اخلاقاً ضروری ہے۔ مضمون بھیج کر مجھے اطلاع دیں کہ ان کو مضمون بھیج دیا ہے۔

میں تا حال ''الاعتصام'' کے لیے کچھ نہیں لکھ سکا، فرصت ہی نہیں تھی۔ کل لائل پور رجسٹری کے سلسلے میں جا رہا ہوں۔ مولوی فضل حق[1] اپنے کیس کے سلسلے میں مشغول ہیں۔ پرسوں اگر وقت ملا تو لکھنے کی کوشش کروں گا۔ ڈیکلریشن ملا یا نہیں؟

۲۴ر فروری کے ''الاعتصام'' میں تعویذاتِ حب کا ایک اشتہار شائع ہوا ہے، جو قابلِ اعتراض ہے۔ دوسرا حجاز میں قرآن مجید کے متعلق جو کچھ لکھا گیا، درست نہیں، اور وہاں قرآن مجید کی ضرورت..[2] یہ مولانا عبدالرؤف صاحب جھنڈانگری نے توجہ دلائی ہے۔ میری بھی یہی رائے ہے۔ اشتہار میں احتیاط کی ضرورت ہے۔

محمد اسماعیل

مدرس گجرانوالہ

---

1. مولوی فضل حق سے میاں فضل حق مراد ہیں۔ [مولانا محمد اسحاق بھٹی]
2. جہاں نقطے لگائے گئے ہیں، وہاں لفظ پڑھا نہیں گیا۔ [مولانا محمد اسحاق بھٹی]

مکتوب نمبر 41

(۵)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

گجرانوالہ

یکم مئی ۱۹۶۱ء

مکرم ومحترم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

کل ایک مضمون یوسف[1] کو دے آیا تھا۔ مل گیا ہوگا۔ ''الاعتصام'' مدرسہ محمدیہ[2] کے طلبا کے نام ارسال کر دیں، اس کی قیمت میں۔ إن شاء اللہ۔ لیتا آؤں گا۔ اگر منیجر آجائے تو وہ لے جائے۔

اخبار کچھ دنوں سے بہت خراب چھپتا ہے، کیا پہلا کاتب بدل دیا گیا ہے؟

والسلام

محمد اسماعیل

گجرانوالہ

مکتوب نمبر 42

(۶)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجامعۃ السلفیۃ. لائل پور

پاکستان میں اسلامی علوم کی مرکزی درسگاہ

۱۶۔ ۹۔ ۶۱ء

مکرم مولانا اسحاق صاحب مدیر الاعتصام! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

۱۵ر ستمبر ۶۱ء کے ''الاعتصام'' میں نوکھر[3] کے مدرسے کے متعلق آپ نے ایک مضمون شائع فرمایا ہے۔

---

① یہ دفتر ''الاعتصام'' میں ملازم تھے۔

② مدرسہ محمدیہ سے مراد خود مولانا کا مدرسہ ہے۔ یعنی مدرسہ محمدیہ گوجرانوالہ۔ [مولانا محمد اسحاق بھٹی]

③ ضلع گوجرانوالہ میں ایک مقام کا نام ''نوکھر'' ہے۔ وہاں کچھ جھگڑا سا تھا۔ مولانا کا اشارہ اسی طرف ہے۔ [مولانا محمد اسحاق بھٹی]

اس سے پہلے اسی مدرسے کے متعلق ناظم صاحب کی طرف سے ایک مضمون شائع ہوا ہے۔ دونوں کا لب و لہجہ نامناسب ہے۔ ایسے مضامین کی من و عن اشاعت سے قبل سوچنا چاہیے کہ اس کا عوام پر کیا [اثر] ہوگا؟ یا ایسے تلخ مضامین کی اشاعت نہ ہو یا اسے مناسب طور پر نرم کر دیا جائے۔ آیندہ اگر نوکھر یا اس مدرسے کے متعلق یا ان دو مضامین کے متعلق کوئی تحریر آئے تو اسے میری اطلاع کے بغیر شائع نہ فرمائیں۔

یہ مضمون مولوی فضل حق صاحب کے نام پر کسی دوسرے شخص نے دے دیا ہے۔ اب یہ نزاع ضلعی جماعت نے اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ اس لیے اس کے متعلق مزید کچھ چیز شائع نہ کی جائے۔ رپورٹ[1] کی تکمیل جلدی ہونی چاہیے۔ کل جمعرات کو میں حاضر ہوا تو آپ نہ مل سکے۔

والسلام

محمد اسماعیل، کان اللہ لہ

گوجرانوالہ

............✿✿✿............

مکتوب نمبر 43

(۷)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

گوجرانوالہ

۱۲؍ دسمبر ۱۹۶۱ء

برادرِ عزیز! السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

سنا ہے جناب کے کسی دوست عبدالرشید نامی کے پاس شاہ شہید رحمہ اللہ کے قلمی خطوط ہیں اور وہ فروخت کرنا چاہتے ہیں۔ غالباً یہ وہی خطوط ہیں، جو حیاتِ طیبہ وغیرہ میں چھپ چکے ہیں۔ شاہ صاحب کے نام کی وجہ

[1] رپورٹ سے حضرت مولانا کی مراد ہے جمعیت اہلِ حدیث کی خدمات، تنظیمی دورے، جلسے، تقریریں، جامعہ سلفیہ کی تعلیمی کیفیت، الاعتصام کے سلسلے کے ضروری کوائف اور دفتری معاملات کی تفصیلات۔ اس قسم کی رپورٹیں تیار کرنے کے بارے میں بالعموم مجھے ارشاد فرمایا جاتا تھا اور میں لکھ کر مولانا کی خدمت میں پیش کر دیتا تھا۔ وہ رپورٹیں انھی کی طرف سے لکھی جاتی تھیں اور وہ مجلسِ شوریٰ کے اجلاس میں بحیثیت ناظم اعلیٰ پڑھ کر سناتے تھے۔ [مولانا محمد اسحاق بھٹی]

سے میرا خریدنے کا خیال ہے۔ آپ ان سے مل کر دریافت فرمائیں، وہ کہاں تک دینا چاہتے ہیں؟ یہ بھی دیکھ لیں کہ کاتب کون ہے؟ کس سن کے لکھے ہوئے ہیں؟ اگر ممکن ہو تو دیکھ لیں کوئی غیر مطبوعہ خط بھی ہے؟ اس سلسلے میں مولوی عطاء اللہ صاحب سے بھی مشورہ کر لیں۔

والسلام

محمد اسماعیل

گجرانوالہ

............❀❀❀............

مکتوب نمبر 44

(۸)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

واذکر فی الکتاب "إسماعیل" | Mohammad Ismail

چاہ شاہاں۔ گوجرانوالہ | Chah Shahan

Dated ۲۶۔۱۲۔۶۱ء | Gujranwala

محترم مکرم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج بخیر۔ مکتوب ملا۔ شاہ صاحب کے مکاتیب عموماً سوانح احمدیہ میں چھپ چکے ہیں۔ یہ مکاتیب بھی شاہ صاحب کے قلم سے تو نہیں ہوں گے، بہرحال نقل ہوگی۔ یہ بھی معلوم نہیں کس کے قلم سے لکھے گئے ہیں، اس لیے میں اتنے گراں خریدنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ میرا خیال ایک صد کے پس و پیش تھا۔ اگر وہ اس کے لیے آمادہ نہ ہوں تو انھیں فروخت کی اجازت ہے۔ جواب میں دیر ہوئی۔ میں خود مخطوطہ دیکھنا چاہتا تھا، مگر وقت نہیں مل سکا۔ معذرت خواہ ہوں۔

"الاعتصام" کا معیار روز بروز گر رہا ہے۔ جماعت کے اہم حوادث پر بروقت کچھ نہیں لکھا جاتا۔ ہندوستان میں اہلِ حدیث کانفرنس ہوئی، اس کے متعلق آپ ایک حرف نہیں لکھ سکے، حالانکہ کانفرنس سے پہلے اور بعد اس پر مناسب نوٹ لکھنا ضروری تھا۔ سعود کی علالت وصحت دونوں پر آپ کے قلم میں جنبش نہیں ہوئی۔ "المنبر" حالانکہ جماعت کا اخبار نہیں، قابلِ رشک نوٹ لکھتا ہے اور بروقت لکھتا ہے۔

اخبار کو اشاعت کے لحاظ سے خسارے میں نہیں جانا چاہیے، لیکن مینیج منٹ کی خرابی کی وجہ سے اخبار

خسارے میں جا رہا [ہے]۔ ایک کاروباری ادارہ جماعت کے نام پر ہاتھ جوڑ کر چلایا جا رہا ہے۔

یہی حال ادارہ ''اشاعۃ السنۃ'' کا ہے۔ شعبہ اشاعت کے لحاظ سے آپ دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہونا چاہیے، لیکن آپ ایک مکان میں رہتے ہوئے [بھی] ایک دوسرے سے اتنے اجنبی ہیں، جیسے ادارہ ''تحفظ حقوقِ شیعہ''۔ یہ صورتِ حال قطعی ناپسندیدہ ہے۔

افسوس ہے کہ حضرت الامیر اور ناظم نشر و اشاعت میں اندازِ فکر میں فرق ہے، اس سے دفتری حضرات پورا فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔ دفتر کی حالت دیکھ کر ''اَلْجَمْعُ بَیْنَ الضَّبِّ وَالنُّون'' کی ضرب المثل یاد آتی ہے۔[1]

میں جانتا ہوں کہ اس کا براہِ راست تعلق حضرت نگران اور ناظم نشر و اشاعت سے ہے، لیکن ایک عام ممبر کی حیثیت سے ان تلخ گذارشات پر بھی غور فرمائیں۔ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ.

والسلام

محمد اسماعیل

گجرانوالہ

.... ❀❀❀ ....

مکتوب نمبر 45

(۹)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

گجرانوالہ

۸؍ مئی ۱۹۶۲ء

مکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

''تحریکِ اہلِ حدیث کا مد و جزر''[2] کا مسودہ اگر موجود ہو تو بھیج دیں۔ اس مضمون پر نظرِ ثانی کی ضرورت ہے۔

① یہ مثال دو غیر ممکن الاجتماع چیزوں کے اکٹھا ہونے کے متعلق بولی جاتی ہے۔ ''ضب'' (گوہ یا سانہ) ایک صحرائی جانور ہے، جو پانی کے اندر نہیں آتا اور ''نون'' (مچھلی) ایک آبی جانور ہے، جو خشکی میں زندہ نہیں رہ سکتا۔ یعنی دونوں کا اکٹھا رہنا ناممکن ہوتا ہے۔ دیکھیں: مجمع الأمثال للمیداني (۱/ ۲۱۳)

② حضرت سلفی رحمہ اللہ کا ایک طویل مضمون، جو ہفت روزہ ''الاعتصام'' (۲۴؍ نومبر۔ ۹؍ فروری ۱۹۶۲ء) میں بارہ قسطوں میں شائع ہوا۔ یہ مکمل مضمون مولانا سلفی رحمہ اللہ کے مضامین کے مجموعہ ''نگارشات'' (ص: ۲۱۸) میں طبع ہو چکا ہے۔

آپ ہندوستان کی جماعتی خبروں کو التزام سے شائع کریں۔ کانفرنس اہلِ حدیث ہوگئی، آپ نے اس پر ایک حرف نہیں لکھا۔ ہر کام کے لیے مطالعہ ضروری ہے۔

والسلام

محمد اسماعیل

مکتوب نمبر 46

(۱۰)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

گجرانوالہ

۱۲/ جولائی ۱۹۶۲ء

مکرم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

کل برقی پنکھوں کی تفصیل میں متفرق چار پنکھے لکھوائے تھے۔ یہ تین کر دیں اور ایک پنکھا میاں عبدالستار[1] کے نام لکھ دیں۔ مکرر اطلاع کی ضرورت نہ ہو۔

مولانا فضل احمد صاحب غزنوی[2] کی مصنفات قیمتی ایک ہزار روپیہ انھوں نے فروخت کے لیے دی ہیں۔ وہ جب پہنچ جائیں، ان کے متعلق اشتہار دے دیں۔

والسلام

محمد اسماعیل

گجرانوالہ

[1] میاں عبدالستار آف گوجرانوالہ ستارہ فیکٹری والے، جو مولانا سلفی رحمہ اللہ کے قریبی ساتھیوں میں سے تھے۔

[2] شیخ الحدیث مولانا فضل احمد غزنوی حیدر آباد سندھ کے رہنے والے تھے۔ مختلف جماعتی اخبار و جرائد میں ان کے مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان کی تاریخِ وفات معلوم نہیں ہو سکی۔

مکتوب نمبر 47

(۱۱)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

گجرانوالہ

۷/اکتوبر ۱۹۶۲ء

مکرم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

کل آپ سے ملاقات نہ ہو سکی۔ مولوی اسحاق برق نے حویلیاں سے آپ کے پاس کتاب ''فلاحِ عالم'' بھیجی ہے۔ ان کا تقاضا ہے کہ اس پر اپنی رائے کا اظہار فرمائیں۔ اگر اس میں کوئی مفید بات ہو تو انھیں حویلیاں کے پتے پر لکھ دیں۔ میری یاد دہانی کا بھی تذکرہ کر دیں۔

دو اعلان پہلے آپ کو مل چکے ہوں گے۔ ایک اعلان یہ بھی فرما دیں کہ گجرانوالہ کی جماعت اہلِ حدیث کی طرف سے بنگال سیلاب فنڈ کے لیے قریباً چھے سو سے زائد رقم جمع ہو چکی ہے، جو عنقریب دفتر کو ارسال کر دی جائے گی۔

آپ نے نیپال کے لیے ایک دفعہ لکھ کر قصہ ختم کر دیا۔ ایسے اعلانات متعدد دفعہ ہونے چاہئیں۔ گجرانوالہ سے ممکن ہے سات سو ہو جائے۔ اتنی رقم اتنی دور بھیجتے ہوئے بھی شرم محسوس ہوگی، اس کے لیے متعدد دفعہ لوگوں کو توجہ دلانا چاہیے۔

والسلام

محمد اسماعیل

گجرانوالہ

مکتوب نمبر 48

(۱۲)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

Mohammad Ismail وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ "إِسْمَاعِيلَ"

Chah Shahan چاہ شاہاں۔ گوجرانوالہ

Gujranwala Dated ۱۹/ستمبر ۱۹۶۴ء

مکرم ومحترم مولانا اسحاق صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج گرامی! آپ دو دفعہ یہاں تشریف [لائے]۔ جاتی دفعہ آپ نے وعدہ فرمایا کہ خود یا بذریعہ مولانا عطاء اللہ صاحب[1] حاجی اسحاق[2] سے معاملہ طے کرلوں گا۔ واقعہ یہ ہے کہ مسئلہ طے نہ ہوا۔ اس کے بعد میں ۵/ستمبر ۶۴ء کو لاہور گیا۔ آپ نہ مل سکے۔ پروفیسر ابوبکر صاحب[3] سے فون پر ملاقات ہوئی، میں نے ان سے عرض کیا کہ آپ مولوی اسحاق صاحب کو دفتر بھیج دیں۔ انھوں نے فرمایا: میں پیغام دے دوں گا۔ میں نے عرض کیا: اگر وہ دفتر نہ جائیں تو انھیں میرے پاس گوجرانوالہ بھیج دیں۔ میں ۶۔۷/ستمبر کو دو دن جناب کا منتظر رہا۔ آپ نہ آئے۔ معلوم نہیں آپ کو پیغام ملا یا نہیں؟

اب یہ عریضہ جناب کے نام رجسٹری کر رہا ہوں۔ یا تو جناب عریضہ دیکھتے ہی مصری شاہ مجیدیہ فلور ملز میں دفتر تشریف لے جائیں اور کام شروع کر دیں۔ آپ کی شرائط، مطالبات حسبِ امکان پورے ہو جائیں گے۔

اگر مزید تامل ہو تو ۲۲/ستمبر منگل کو گوجرانوالہ تشریف لے آئیں۔ میں اتوار کو احمد پور شرقیہ جارہا ہوں۔ سوموار کو اُمید ہے واپسی ہوگی۔ میں منگل کو آپ کا منتظر رہوں گا۔

والسلام

محمد اسماعیل، کان اللہ لہ

گجرانوالہ

---

① مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی (۱۹۸۷ء)

② حاجی محمد اسحاق حنیف (ناظمِ نشر واشاعت جمعیت اہلِ حدیث)

③ مولانا داود غزنوی کے صاحبزادے پروفیسر ابوبکر غزنوی۔

مکتوب نمبر 49

(۱۳)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مرکزی جمعیت اہلِ حدیث مغربی پاکستان

مجیدیہ فلور ملز، رحیم روڈ، مصری شاہ۔ لاہور

فون ۲۲۶۶

عزیز مولوی محمد اسحاق صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ

مزاجِ گرامی! آپ کو کئی پیغام بھیجے، خطوط لکھے، نہ آپ ملے نہ ہی گجرانوالہ تشریف لائے۔

۲۔۹۔۶۴ء کو آپ کے نام رجسٹرڈ خط لکھا، معلوم نہیں آپ کو ملا یا نہیں؟ منگل کا دن آپ کے انتظار میں گزرا۔ یہ تعویق اور انتظار آپ کی خدمات کی وجہ سے ہے۔ آپ نے اخبار اور جماعت کی جس تندہی سے خدمت کی ہے، اس سے متاثر ہوں، ورنہ آپ کی اس بے اعتنائی کے بعد مجھے کوئی فیصلہ کر لینا چاہیے تھا۔

یہ عریضہ مکتبہ سلفیہ کی معرفت لکھ رہا ہوں۔ میں صبح جمعرات کو لاہور آ رہا ہوں۔ جناب مجھے دس گیارہ بجے کے درمیان میاں عبدالمجید صاحب[1] کی کوٹھی پر ملیں یا میاں صاحب کے فون پر اطلاع دیں کہ میں جناب کو کہاں ملوں؟[2]

والسلام

محمد اسماعیل کان اللہ لہ

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

① مجیدیہ فلور ملز کے مالک، جہاں اس وقت جمعیت اہلِ حدیث کا دفتر تھا۔

② اس مکتوب گرامی پر تاریخ مرقوم نہیں ہے، تاہم یہ اکتوبر ۱۹۶۴ء کی ابتدائی تاریخوں کا تحریر فرمودہ ہے۔

حضرت مولانا کے دونوں آخری مکتوبات میری غیر حاضری میں آئے۔ ان دنوں میں لاہور سے باہر تھا۔ لاہور واپس آ کر حضرت مولانا کے خط پڑھے تو ان کے حکم سے ''الاعتصام'' کے نئے دفتر مجیدیہ فلور ملز (مصری شاہ) میں حاضر ہوگیا اور کام شروع کر دیا۔ [مولانا محمد اسحاق بھٹی]

مکتوب نمبر 50

(مولانا فضل حق قریشی[1] کے نام اکیس خطوط)

(۱)

گجرانوالہ

۲/اپریل ۵۶ء بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محترم قاضی صاحب زید مجدکم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج بخیر۔ مکتوب ملا۔ جناب کے جملہ مکاتیب لاہور بھیج دیے ہیں، امید ہے۔ إن شاء اللہ۔ منظوری ہو جائے گی۔

جناب کے حسب الحکم کانفرنس کے بعد۔ إن شاء اللہ۔ حاضری کی کوشش کروں گا، بشرطیکہ جناب یاد دلا دیں، بلکہ گوجرانوالہ کانفرنس[2] پر جناب تشریف لائیں گے تو پروگرام بنا لیا جائے گا۔ إن شاء اللہ.

اب احباب سے عرض کریں گے کہ بے اُمیدی گناہ ہے۔ میری یا میرے دوسرے رفقا کی غلطی سے مسلک کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

مولوی عبداللہ چکڑالوی اہلِ قرآن کی اہلیہ میانوالی میں مقیم ہے۔ اس سے یا دوسرے آدمی سے مولوی عبداللہ کے سنِ وفات کا پتا چل سکے گا؟ مولوی عبداللہ کی کوئی ایسی کتاب، جس میں حدیث پر اپنے شبہات کا ذکر کیا گیا ہو؟[3]

والسلام

محمد اسماعیل، کان اللہ لہ

گوجرانوالہ

---

① مولانا فضل حق قریشی رحمہ اللہ میانوالی جماعت کے سرگرم رکن اور وہاں محکمہ بہبودِ حیوانات میں ملازم تھے۔

② جمعیت اہلِ حدیث پاکستان کی یہ چوتھی کانفرنس ۱۲۔۱۳۔۱۴/ اکتوبر ۱۹۵۶ء کو گوجرانوالہ میں علامہ خلیل عرب کی زیرِ صدارت منعقد ہوئی تھی، جس کا خطبہ استقبالیہ مولانا سلفی رحمہ اللہ نے ارشاد فرمایا تھا۔

③ مولانا فضل حق ہاشمی نے اس مکتوب کے اوپر یہ نوٹ لکھا ہے:

۲۷/۴/ ۵۶ء کو جواب دیا گیا کہ مولوی عبداللہ چکڑالوی کو فوت ہوئے اکتالیس سال اور دو ماہ ہو گئے ہیں اور اب تیسرا ماہ ←

مکتوب نمبر 51

(۲)

گجرانوالہ

۳رمئی ۵۶ء بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محترم قاضی صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

کل لاہور دفتر گیا۔ وہاں بھی جناب کا مکتوب موجود تھا۔ ہم تو تیس روپے کی منظوری دے دیں گے، لیکن مقصد یہ ہے کہ آپ کے ضلع میں کچھ کام ہو۔ آپ کی تجویز کے مطابق تو وہ صرف آپ کے ماحول میں تھوڑا بہت کام کر سکیں گے۔ اس صورت کی اعانت مقامی جماعت کی اعانت کے مرادف ہوگی۔ آپ کچھ وسعت پیدا کریں اور میانوالی کو ضلع کی مرکزی حیثیت دیں، اعانت اس سے زیادہ بھی ہو سکتی ہے۔ دفتر سے آپ مکاتبت فرمائیں، غالباً آپ کو دفتر سے خط ملے گا۔

مولوی عبداللہ[1] کی موت ۱۹۱۴، ۱۹۱۵ء کے قریب معلوم ہوتی ہے۔ ان کی اہلیہ غالباً ملتان کی رہنے والی تھی۔ لاہور سے نکلنے کے بعد یہ نکاح ہوا تھا اور شاید کچھ اغوا کی صورت ہوئی۔ میں اس وقت بہت چھوٹا تھا، جب مولوی عبدالرحیم مرحوم نے ان کو لاہور سے نکالا تھا۔ اس کے متعلق کچھ تفصیل مل سکے تو مطلع کریں۔ میں تاریخ انکارِ حدیث کے مد و جزر پر کچھ لکھنا چاہتا ہوں۔ مولوی عبداللہ کی ''صلاۃ القرآن'' میرے پاس ہے، ان کا ترجمہ قرآن بھی کچھ پارے میرے پاس ہیں، جو میاں چٹو[2] نے شائع کیا تھا۔[3]

والسلام

محمد اسماعیل

چاہ شاہاں، گوجرانوالہ

← شروع ہے۔ ان کی صرف ایک کتاب ''صلاۃ القرآن'' کا ہی پتا چل سکا۔ باقی معلوم نہیں، اور یہ کتاب بھی نہیں ملی۔

[1] معروف منکرِ حدیث مولوی عبداللہ چکڑالوی۔

[2] مولوی عبداللہ چکڑالوی کا قریبی دوست اور نظریہ انکارِ حدیث کو پروان چڑھانے میں اس کا مددگار تھا۔ یہ جامع مسجد چینیانوالی کے قریب ہی رہتا تھا اور ریشمی کپڑے کی تجارت کرتا تھا۔

[3] حضرت سلفی رحمہ اللہ کے اس خط کے جواب میں مولانا فضل حق ہاشمی نے جو خط ۲۶ رمئی ۱۹۵۶ء کو لکھا، اس میں مولوی عبداللہ چکڑالوی کے متعلق بعض تفصیلات ذکر کیں۔ افادیت کے پیشِ نظر ذیل میں مولانا ہاشمی کا وہ مکتوب مکمل درج کیا جا رہا ہے: ←

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قائدِ محترم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

جناب کی خدمت میں ایک عریضہ مورخہ ۱/۵/ ۵۶ء کو گزارش کیا اور وعدہ کیا تھا کہ بعد میں بھی مولوی عبداللہ صاحب چکڑالوی کے حالات سے آپ کو مطلع کروں گا۔ اس سلسلے میں عرض ہے کہ سول سرجن صاحب کے دفتر میں مولوی صاحب کی پیدائش وموت کا کوئی ریکارڈ نہیں ہے۔ دو سرٹیفکیٹ اس امر کے سول سرجن صاحب کے دفتر سے حاصل کر کے لف کر رہا ہوں:

مولوی صاحب　　　　　　　فوتیدگی: ۱۹۱۵ء

والد صاحب: مولانا میر عالم صاحب ولد نور عالم

لڑکے: ① مولوی محمد عیسیٰ۔　　　　مولوی محمد ابراہیم

↓　　　　　　↓

محمد یحییٰ　　　　　　مولوی اسماعیل

دوسری شادی: ۱۹۱۰ء۔ ایک لڑکی پیدا ہوئی۔

بمقام بھکوا میں پیر صاحب کے پاس بیٹھنے پر سزا ملی تھی اور باندھ کر باہر جنگل میں ڈال دیا۔ کسی عورت نے آ کر چھڑایا۔ یار وخیل والوں نے دعویٰ کرنے کے لیے کہا، مگر وہ نہ مانے۔ مسجد چینیانوالی میں میاں چٹو اور دیگر حضرات کے ساتھ اہلِ قرآن ہوئے۔

یکم مئی والے خط میں مَیں نے مولوی عبداللہ صاحب کی وفات ۱۵/ دسمبر ۱۹۱۵ء لکھی تھی، مگر بعد میں جب ان کے پوتے قاضی محمد یحییٰ صاحب[1] نے ریکارڈ دیکھا تو مجھے مطلع کیا کہ مولوی صاحب مذکور ۲۹/ دسمبر ۱۹۱۵ء کو فوت ہوئے تھے۔ باقی ان کے تاریخی حالات کے متعلق فرمایا کہ میں (قاضی یحییٰ صاحب) مولوی صاحب کے حالات لکھ کر آپ کو ارسال کروں گا، مگر اب تک ارسال نہیں کیے۔ جوں ہی مجھے اس سے تاریخی حالات ملتے ہیں، جناب کی خدمت میں گزارش کر دوں گا۔

دراصل مولوی عبداللہ صاحب کی پہلی بیوی سے ان کے دو لڑکے پیدا ہوئے۔ بڑے کا نام محمد عیسیٰ اور چھوٹے کا نام مولوی محمد ابراہیم صاحب تھا۔ بڑا لڑکا اپنا کوئی مستقل مسلک نہ رکھتا تھا، بلکہ جہاں جاتا اور جس قسم کے لوگ دیکھتا، اسی قسم کا مسلک ظاہر کرتا۔

لیکن ان کا چھوٹا لڑکا مولوی محمد ابراہیم صاحب پکا اہلِ حدیث تھا اور بہترین مقرر ومبلغ بھی۔

پھر ان دونوں صاحبان کے ایک ایک لڑکا ہوا۔[2] بڑے، یعنی مولوی محمد عیسیٰ کے بیٹے کا نام محمد یحییٰ ہے اور انھوں نے ہی مجھے مولوی صاحب کے حالات لکھ کر دینے کا وعدہ کیا ہے۔ یہ اپنے والد صاحب سے بھی بازی لے گئے ہیں، پکے 420 ہیں۔[3] اگر انھیں یہ علم ہو جائے کہ میں مولوی صاحب کے حالات آپ کو بھیجنے کے لیے ان سے حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہوں، تو وہ مجھے کبھی بھی حالات نہ بتائیں گے۔ اب بھی میرا خیال ہے کہ وہ اس سراغ میں ہیں کہ میں کیوں ان سے مولوی صاحب کے حالاتِ زندگی لینے کی کوشش کر رہا ہوں۔ مولوی محمد ابراہیم کے لڑکے کا نام مولوی محمد اسماعیل تھا۔ یہ بھی اپنے باپ کی طرح نہایت متقی ←

① یحییٰ کے دونوں چھوٹے بھائیوں کا نام محمد یعقوب اور محمد یونس ہے۔ (فضل حق)

② اب معلوم ہوا ہے کہ قاضی یحییٰ کے دو اور بھائی بھی ہوئے۔ ایک فوت ہوگیا اور ایک قاضی محمد یعقوب اب تک زندہ ہے۔ اس کا بھی ایک لڑکا ہے، جس کا نام عبدالجبار ہے۔ (فضل حق)

③ قاضی یحییٰ کی عمر قریباً ۵۵ سال ہوگی۔ اس نے اب تک شادی نہیں کی ہے۔ (فضل حق)

اور مسلکِ اہلِ حدیث کے مبلغ تھے، مگر عین جوانی کی عمر میں اپنی تین چھوٹی لڑکیاں چھوڑ کر آج سے قریباً ۱۲ سال قبل فوت ہو گئے۔

مولوی عبداللہ صاحب کی دوسری شادی سے ان کے ہاں ایک لڑکی ہوئی، جس کا نام عائشہ ہے، اس نے بھی اپنے بھائیوں کی رضا کے بغیر شاید اپنا نکاح پڑھایا تھا۔ سنا ہے کہ اس کو اس کے خاوند نے کسی ذاتی جھگڑے کی بنا پر گھر سے نکال دیا ہے، اور وہ اب اپنی والدہ مریم بی بی کے ہمراہ راولپنڈی میں رہتی ہیں اور اب قاضی یحییٰ ان ہی کے پاس گیا ہوا ہے۔

قاضی یحییٰ کی زبانی مجھے جو حالات مولوی عبداللہ صاحب کے متعلق معلوم ہوئے ہیں، وہ حسبِ ذیل ہیں:

مولوی صاحب نے شروع میں علمِ دین حاصل کرنے کی طرف کوئی غور نہ کیا، بلکہ عام لوگوں کی طرح زمینداری و کاشتکاری کر کے وقت گزار رہے تھے۔ نیز وہ ''پڑکوڈی'' کے بھی شوقین تھے۔ چناں چہ پڑکوڈی کھیلتے عین جوانی کی عمر میں ان کو سینے پر ایک سخت چپت لگی اور فوت ہونے تک ہاتھ کا نشان سینے پر باقی تھا۔

ایک دن مولوی صاحب کے والد صاحب ان پر گھاس وقت پر نہ لانے کی وجہ سے ناراض ہوئے تو یہ گھر سے نکل پڑے، اور ''دندہ دابٹہ'' ایک گاؤں جو چکڑالہ سے تین چار میل ہے، وہاں جا کر کسی اور آدمی کو بھی ساتھ لیا اور وزیر آباد چلے گئے۔ وہاں ایک ویران سی مسجد میں پانی بھی بھرتے اور کسی عالم (غالباً مولانا الحافظ عبدالمنان صاحب) سے مذہبی تعلیم بھی حاصل کرتے تھے۔ (یہ معلوم نہ ہو سکا کہ کتنا عرصہ وہاں رہے)

پھر وہاں سے دہلی پہنچ کر حضرت میاں سید نذیر حسین شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ پہلے تو انھوں نے مولوی صاحب کو پڑھانے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ میرے پاس تین یا چار صد کے قریب طالب علم ہیں، جو تعلیمی لحاظ سے آپ سے بہت آگے ہیں، لہٰذا ان کی طرف توجہ دینا ضروری ہے اور میرے پاس ایسا وقت نہیں ہے کہ تجھے پڑھا سکوں۔ آخر کار بڑی منت سماجت کی تو میاں صاحب نے فرمایا کہ میرے پاس صرف ایک ہی وقت ہے کہ جب میں مسواک کرنے بیٹھوں تو میرے پاس آ کر سبق حاصل کر لیا کرو۔ چناں چہ اس طرح سبق کا آغاز کرا دیا۔ حضرت میاں صاحب کا یہ خاص مقولہ قاضی یحییٰ صاحب نے فخریہ لہجے میں مجھے سنایا کہ مولوی عبداللہ صاحب فرماتے تھے کہ جب لڑکوں کو کوئی سبق نہ آتا اور میاں صاحب جب بہت زیادہ غصہ اور ناراض ہوتے تو ان لڑکوں کو میری طرف اشارہ کر کے کہتے: ''ایک پنجابی گدھے نے تم سب کو گدھا بنا دیا ہے۔''

میرے اس سوال پر کہ مولوی صاحب مفلوج کیوں اور کس سن میں ہوئے تھے؟ قاضی یحییٰ نے بتایا کہ مولوی صاحب جب دہلی سے واپس چکڑالہ آئے اور اس علاقے میں مذہب اہلِ حدیث کا پرچار کیا تو پہلے پہل لوگوں نے طرح طرح کی تکلیفیں دیں، مارا پیٹا، لیکن دین کا بائیکاٹ کیا، مگر وہ نہ رکے تو ان کو زہر دیا گیا، جس کا ان کو بروقت پتا چل گیا۔ علاج وغیرہ کرانے پر ہلاکت سے بچ گئے، مگر مفلوج ہو گئے۔

قاضی یحییٰ نے کہا کہ اس زہر کے واقعہ کی کوئی صحیح اور معین تاریخ یا سن مجھے علم نہیں ہے۔ اس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ مولوی صاحب نے بطورِ محدث قرآن مجید کے ایک پارے کی تفسیر بھی لکھی تھی، جو اَب تک ان کے پاس ہے اور پھر اہلِ قرآن مسلک کی بنیاد ڈالی تو بھی چند پاروں کا ترجمہ کیا، جن کو میاں چٹو نے شائع کیا تھا۔

باقی حالات انھوں نے مجھے لکھ کر بھیجنے کا وعدہ کیا ہے، مگر ایک ماہ ہو گیا ہے، ابھی تک تو نہیں بھیجے اور اب راولپنڈی اپنی سوتیلی دادی اور پھوپھی کے پاس چلا گیا ہے، لیکن ان سے جلد ملنے کی کوشش کروں گا اور جونہی مجھے ان کی طرف سے کچھ چیز ملی،

مکتوب نمبر 52

(۳)

گجرانوالہ

۱۶؍نومبر ۵۶ء بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مکرم مولانا! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

کل بیمہ بھیجا تھا، مل چکا ہوگا۔ ڈراف کا خیال [تھا کہ] اس پر خرچ کم آتا ہے، مگر تعجب ہوا کہ میانوالی میں کوئی بنک نہیں، اس لیے بیمہ بھیج دیا گیا۔

چٹائیاں خود ملاحظہ فرما دیں، دوہری ہوں اور پختہ۔ مجھے آپ کی مسجد کی چٹائیوں سے خیال آیا تھا۔ ایسا نہ ہو کہ ہم دونوں کو ندامت ہو۔ مال عمدہ ہونا چاہیے۔

کل لاہور گیا، جناب کا گرامی نامہ صدرِ محترم کو دے دیا تھا۔ سرِدست دونوں نام التوا کی نذر ہو گئے۔ آپ سرکاری ملازم ہیں اور مولانا ابراہیم صاحب نیم سرکاری۔ ورکنگ کمیٹی میں دونوں قسم کے ملازم نہیں لیے جاتے۔[1]

اب آپ حضرات کوئی تیسرا نام تجویز فرما دیں، ورنہ کوئی دوسرے صاحب آپ کی نمایندگی کریں گے، ویسے بھی ورکنگ کمیٹی میں ضلع وار نمائندگی نہیں۔

تسبیح[2] کے متعلق جناب نے فرمایا تھا۔ تسبیح درست ہے، سنت یا واجب نہیں۔ آنحضرت ﷺ نے ہاتھوں کی انگلیوں پر تسبیحات کا حکم فرمایا۔ منتقیٰ میں ہے:

جناب کو ارسال کر دوں گا۔

باقی یہاں کی جمعیت کو حرکت دینے کی کوشش تو کی جا رہی ہے۔ جناب بھی ہماری کامیابی کے لیے دعا کریں۔

والسلام: تابعدار: فضل حق قریشی (کلرک محکمہ بہبودی حیوانات میانوالی)

[1] مولانا سلفی رحمہ اللہ نے مولانا فضل حق ہاشمی کا نام جمعیت اہلِ حدیث کی ورکنگ کمیٹی کے لیے تجویز کیا تھا، لیکن انھوں نے اپنی سرکاری ملازمت کی مجبوری کے پیشِ نظر معذرت کی اور اپنے بجائے مولانا محمد ابراہیم صاحب کا نام تجویز کیا، جو ڈسٹرکٹ بورڈ میانوالی کے ملازم تھے۔ اس سلسلے میں حضرت سلفی رحمہ اللہ نے اُن کو صدرِ محترم مولانا محمد داود غزنوی رحمہ اللہ کے فیصلے سے آگاہ کیا۔

[2] مولانا فضل حق ہاشمی رحمہ اللہ نے اپنے مکتوب (۱۲/۱۱/۵۶ء) میں حضرت سلفی رحمہ اللہ سے مندرجہ ذیل چار سوالات بھی دریافت کیے تھے:

① کیا تسبیح (مالا) پر پڑھنا سنت ہے؟

② اگر سنت نہیں تو کیا بدعت ہے؟

③ اگر بدعت (بدعتِ حسنہ بھی) ہو تو کیا تمام بدعتیں بالفاظِ ہادیِ اعظم ﷺ گمراہی نہیں ہیں؟

④ تسبیح (منکوں والی) پڑھنے کا شرعی جواز؟

"باب جواز عقد التسبيح باليد وعده بالنوى"

اس میں دو حدیثیں مرقوم ہیں:

سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: آنحضرت اپنی ایک حرم کے پاس تشریف لے گئے: "وَبين يديها نوى أو حصى تسبح به"[1]

دوسری روایت حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، فرماتی ہیں:

"دخل علي رسول الله ﷺ وبين يدي أربعة آلاف نواة أسبح بها... الخ"[2]

(منتقیٰ لمجد بن تيمية، ص: ٦٩)

"حضرت صفیہ کے پاس آنحضرت تشریف لے گئے، ان کے پاس چار ہزار گٹھلیاں تھیں، جن پر وہ تسبیح کہتیں۔"

نیل الاوطار میں ایک حدیث بھی مروی ہے:

« نعم المذكر السبحة... الخ »[3] "تسبیح [سے] ذکر یاد رہتا ہے...۔"

والسلام

محمد اسماعیل، کان اللہ لہ

..........❀❀❀..........

مکتوب نمبر 53

(۴)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۷۔۱۱۔۵۶ء

مرکزی جمعیت اہل حدیث مغربی پاکستان

شیش محل روڈ، لاہور

مقتدر قاضی صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج بخیر۔ پرسوں بیمہ بھیجا تھا، کل صفیں پہنچ گئیں۔ ٹرک والا غلہ منڈی میں ڈال گیا۔ دو جگہ ٹرک والے

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٥٠٠) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٥٦٨) نيل الأوطار (٢/ ٣٥٨) اس کی سند میں خزیمہ مجہول اور "سعید بن ابی ہلال" مختلط ہے۔

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٥٥٤) اس کی سند میں "ہاشم بن سعید" ضعیف ہے اور کنانہ مولیٰ صفیہ لین الحدیث ہے۔

[3] مسند الفردوس (٦٧٦٥) علامہ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ نے اس روایت کو موضوع قرار دیا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٨٣)

کی بے احتیاطی کی وجہ سے مرمت کی ضرورت ہوگی۔ جناب کو اس سلسلے میں بہت تکلیف ہوئی۔ علی اللہ أجرك.

ٹرک والا کرایہ نہیں لے گیا۔ معلوم نہیں جناب نے دے دیا ہوگا؟ بیمہ میں نے پوری رقم کیا ہے۔ جو خرچ ہوا ہے، مطلع فرما دیں، بذریعہ منی آرڈر بھیج دیا جائے گا۔ صفیں لمبائی میں قریباً ایک فٹ کم ہیں۔ میں نے جناب کو ۵۹ فٹ لکھا، یہ قریباً ۵۸ فٹ ہیں۔ یہ خلا بدنما سا معلوم ہوتا ہے، مگر یہ کسی کے اختیار کی بات نہیں ہے۔ تخمینی کاموں میں یہ کمی قدرتی ہے۔

ورکنگ کمیٹی[1] میں غالباً ایک دو آدمی کم ہوں گے، اگر کوئی مناسب آدمی ہو تو مطلع فرما دیں، لیکن ذرہ جلدی کریں۔ احباب سے مشورہ کر لیں۔ ممکن ہے کوئی مفید آدمی مل سکے۔

مولانا عبدالرحمٰن صاحب اور مولانا محمد شریف صاحب سے سلام عرض کریں۔[2] مولانا عبدالرحمٰن صاحب سے عرض فرما دیں، جناب نے ایک وعدہ فرمایا تھا، مجھے اس کا انتظار ہے۔

والسلام

محمد اسماعیل، گجرانوالہ

مکتوب نمبر 54

(۵)

گجرانوالہ

۱۲۔۴۔۵۷ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مکرم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج بخیر۔ عرصہ کے بعد گرامی نامہ ملا۔ شکر ہے آپ حضرات بخیریت ہیں۔ جانوروں کے متعلق یہاں

---

① مرکزی جمعیت اہل حدیث پاکستان کی ورکنگ کمیٹی مقصود ہے۔

② یہ دونوں بزرگ ہماری قوم کے اکابر اور مولانا حافظ عبدالمنان وزیر آبادی کے تلامذہ میں سے تھے۔ مولانا محمد شریف صاحب فرمایا کرتے تھے کہ جب میں حافظ صاحب کے درس میں شریک تھا تو اس وقت وہ بخاری شریف کا 56 واں درس دے رہے تھے۔ [احسان الحق ہاشمی بن مولانا فضل حق ہاشمی]

پر افواہ ہے، لوگ جانوروں کو انجیکشن کرا رہے ہیں۔ ہمارے [یہاں] تا حال خیریت ہے، کوئی جانور بیمار نہیں۔[1]

آپ کے ضلع [کا] کوئی نمایندہ جمعیت میں نہیں آسکا نہ آپ حضرات نے کوئی اطلاع دی۔ انتہائی انتظار کے بعد اب ورکنگ کمیٹی کی تکمیل ہوئی ہے۔

والسلام

محمد اسماعیل، کان اللہ لہ

گجرانوالہ

مکتوب نمبر 55

(۶)

گجرانوالہ

یکم اگست ۵۷ء بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مکرم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

محترم ناظم جمعیت میانوالی نے ایک ڈراف بھیجا تھا، اس کی رقم اب تک نہیں مل سکی۔ آپ کے بنک نے اب تک یہاں کے بنک کو اطلاع نہیں دی۔ اب تک دفتر مبالغ نہیں بھیجے جا سکے۔

بینک میں جا کر اطلاع بھجوائیں۔ پاکستان میں حکومت کے کام اسی انداز سے چل رہے ہیں۔

میں ناظم صاحب کا پتا بھول گیا، ورنہ جناب کو تکلیف نہ دیتا۔ براہِ عنایت ان سے سلام عرض فرما دیجیے اور معذرت۔

والسلام

محمد اسماعیل، کان اللہ لہ

گجرانوالہ

مولانا عبدالرحمٰن صاحب ملیں تو ان سے عرض فرما دیں کہ چکڑالہ کا کام غالباً وہ بھول گئے ہیں۔[2]

---

[1] اس وقت پنجاب کے مختلف علاقوں میں سیلاب آیا تھا، جس سے چاروں طرف بہت نقصان ہوا۔ یہ اسی سیلاب کے اثرات و نتائج کی طرف اشارہ ہے۔

جماعتی نقل وحرکت آپ کے ضلع میں کہاں تک ہے؟ اگر ضرورت ہو تو مبلغ بھیجا جائے؟

والسلام

محمد اسماعیل، کان اللہ لہ

گجرانوالہ

مکتوب نمبر 56

(۷)

واذکر فی الکتاب ''إسماعیل'' Mh. Ismail, Chah Shahan

چاہ شاہاں گوجرانوالہ Gujranwala

۷؍جنوری ۵۸ء

مکرم محترم[1] ! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج بخیر۔ محدثین یا ائمہ اسلام نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ حفظِ قرآن یا تفسیرِ قرآن، حفظِ حدیث، روایتِ حدیث، شرحِ حدیث میں ان کی مساعی انسانی حدود سے بالا ہیں۔ یقیناً وہ انسانی مساعی اور انسانی تجربات [کی] آخری حد ہیں، اس لیے میں نہیں کہہ سکتا کہ آپ کے ان ارشادات کو شبہات کہوں یا بلا وجہ اوہام؟ اور بعض اس قدر بے جوڑ ہیں، جو فنی لحاظ سے مضحکہ خیز۔ معلوم ہوتا ہے کہ جناب نے کسی ایسے آدمی سے گفتگو فرمائی ہے، جسے فن میں رسوخ حاصل نہیں، لیکن آپ کو مغالطہ میں مبتلا کرنا چاہتا ہے۔ اس کے مقاصد میں خیر سے شر غالب

[1] حضرت مولانا سلفی رحمہ اللہ نے یہ خط مولانا فضل حق ہاشمی کے مکتوب میں ذکر کردہ درج ذیل سوالات کے جواب میں لکھا تھا:

① صحیحین کی حدیث، جس میں حدیث کی تشریح بھی صحابی یا تابعی سے ہو، افضل ہے یا دوسری کتبِ صحاح (مثلاً ابو داود شریف) کی صحابی سے روایت بالمعنی؟ ثبوت؟

② ایک ضعیف حدیث (ضعیف بالروایۃ) کس حد تک قابلِ قبول ہوتی ہے؟ نیز ایک صحیح حدیث کی تشریح ایسی ہی ضعیف حدیث سے کرنی چاہیے یا روایت بالمعنی سے؟ کیا ایک صحابی روایت بالمعنی میں غلطی نہیں کھا سکتا؟ ایک امام یا خلیفہ بعض وجوہ کی بنا پر بھی احادیث کی روایت بالمعنی اور مفہوم میں ہمیشہ حق کہتا ہے اور ہمیشہ ان کا مفہوم درست ہی ہوتا ہے؟ اور کیا اس طرح سوچنا بھی جرم ہے؟

③ کیا ہمارا رواجی نکاحِ تبادلہ، جس میں طرفین نکاح سے قبل ایک دوسرے سے رشتہ کرنے پر اکتفا کرتے ہیں اور بر موقع نکاح با قاعدہ مہر بھی مقرر کیا جاتا ہے اور نکاح میں ''شرطِ تبادلہ'' بھی نہیں ہوتی، جائز ہے یا ناجائز؟

امید ہے جناب مدلل اور مفصل جواب سے مشکور فرمائیں گے۔ والسلام: فضل حق، میانوالی

۱/۱/۵۸ء

ہے۔ پوری تسکین اصولِ حدیث میں فنی مہارت کے سوانہیں ہوسکے گی نہ مجھے اتنی فرصت ہے کہ اصول اور تفصیلی مباحث سے آپ کی سمع خراشی کروں۔

1 جس حدیث میں راوی (صحابی ہو یا تابعی) کی تشریح درج ہو، اسے ''مُدْرَج'' کہتے ہیں۔ اس تشریح کا اگر علم ہوجائے تو باقی حدیث صحیحین میں یا کسی دوسری کتاب میں اپنے مقام پر ہوگی صحیح یا ضعیف۔ اگر اِدراج کا علم نہ ہو سکے تو اشتباہ ہوگا، جس کے علم کی مختلف صورتیں ہیں، جن کی تفصیل کتبِ اصول میں مندرج ہے۔

2 اسبابِ ضعف سے ضعفِ حفظ اگر معمولی ہوتو روایت قبول کی جاسکتی ہے، اس کمی کو کثرتِ طرق سے پورا بھی کیا جا سکتا ہے۔ بعض اور قرائن بھی اس کمی کا عوض ہوسکتے ہیں۔ تشریح ضعیف حدیث سے ہوسکتی ہے، لیکن وہ ضعیف ہی ہوگی۔

روایت بالمعنی کا آپ یہاں عجیب جوڑ لگاتے ہیں۔ روایت بالمعنی کسی تشریح کے لیے نہیں کی جاتی، یہ بالکل دوسری چیز ہے۔ صحابہ کبھی آنحضرت کے لفظ ذکر فرماتے تھے، کبھی اس کا مفہوم اپنے لفظوں میں ذکر فرماتے۔ اس کا مطلب تشریح نہیں ہوتا۔

یہ ''کرسکتا''، ''ہوسکتا'' یہ امکانی الفاظ قرآن کے متعلق بھی کہے گئے ہیں: ''کیا حافظ غلطی نہیں کر سکتے؟''، ''کیا قرآن کا معنی غلط نہیں ہوسکتا؟''، ''کیا کاتب غلطی نہیں کرسکتا؟''۔ یہ سب کچھ سب جگہ ہوسکتا ہے۔ غلطی سے محفوظ صرف اللہ ہے۔

بحث یہ ہے کہ اس امکان کے بعد کہاں غلطی ہوئی؟ پھر اس کا علم ہوا یا نہیں؟ ادراج ہوا، اس کا پتا لگا یا نہیں؟ ہمارا یہ خیال ہے کہ جہاں غلطی ہوئی، ائمہ حدیث نے اس کا پتا لگا لیا۔ مرزا جی[1] پوچھا کرتے تھے: کیا اللہ نبی پیدا نہیں کرسکتا؟

مجھے سمجھ میں آیا، آپ کس کیچڑ میں پھنس رہے [ہیں]۔ یہ دراصل کوئی سوال نہیں۔ فنِ اصول پر صحیح عبور نہ ہونے کی وجہ [سے] ایک مغالطہ ہے۔

3 اگر نکاح میں تبادلہ شرط نہ ہوتو شغار نہیں ہوگا۔

والسلام
محمد اسماعیل
مدرس گجرانوالہ

............✿✿✿............

[1] مرزا غلام احمد قادیانی (م ۱۹۰۷ء)

مکتوب نمبر 57

(۸)

گوجرانوالہ

۱۴راگست ۵۸ء بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محترم قریشی صاحب![1] السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج گرامی۔ سعیدی صاحب[2] مخلص لیکن کسی قدر جذباتی اور تیز طبیعت ہیں۔ غالباً ان کا خیال ہے، شاید تمام خرابیوں کا علاج صرف تنقید ہے۔ یہی حال مولوی عبدالمجید صاحب[3] کا ہے، حالاں کہ اصل حل دوستانہ اور برادرانہ گفتگو ہے۔ سعیدی صاحب ملیں تو ان سے زبانی گفتگو فرمائیں۔ یہ مسئلہ خطوط کا نہیں۔

انکارِ حدیث میری ناقص رائے میں انکارِ نبوت کے مرادف [ہے]۔ نبی کے جسم کا اقرار تو ان کے اشد ترین دشمن بھی کرتے تھے اور کرتے ہیں، جہاں تک ان کے فرامین کا تعلق ہے، ایمان بالنبوۃ اسی سے تعبیر ہے۔ جس انداز سے اہلِ قرآن بحث کرتے ہیں، اس میں ایمان بالنبوۃ کی تو کوئی حقیقت باقی نہیں رہتی اور نہ ہی

---

[1] یہ خط حضرت سلفی رحمہ اللہ نے مولانا فضل حق ہاشمی کے مندرجہ ذیل چھے سوالات کے جواب میں لکھا تھا:

① حضرت عائشہ صدیقہ سے نبی ﷺ کے غسل کے متعلق استفسار کیا گیا تو انھوں نے برتن منگوا کر اوپر پردہ لٹکا کر اپنے بھائی اور ایک غیر شخص کی موجودگی میں غسل فرمایا۔ (بخاری: ۱/ ۳۹، فتح الباری: ۱/ ۱۸٤)

② حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت کہ ہم نبی ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد میں مٹھی بھر آٹا دے کر عورتوں کو استعمال کر لیتے تھے اور اس حرکت سے ہمیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے روکا۔ (مسلم: ۳/ ۴۴)

③ حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ کو نبی ﷺ نے آفتاب کے متعلق بتایا کہ ڈوبنے کے بعد آفتاب عرش کے نیچے سجدے میں گر جاتا ہے اور صبح تک دوبارہ طلوع ہونے کی اجازت مانگتا رہتا ہے۔ (بخاری: ۲/ ۳۷)

④ ایک روایت کے مطابق عورت، گدھا، کتا سامنے سے گزر جائے تو نماز ٹوٹ جاتی ہے۔ (مسلم: ۲/ ۱۱۱)

⑤ مجامعت کے وقت اگر مرد کا انزال عورت سے پہلے ہو تو بچہ باپ پر جاتا ہے، ورنہ ماں پر۔ (بخاری شریف: ۲/ ۱۴۹)

⑥ جو شخص گناہ ہمیشہ کرتا ہے اور شرک و کفر نہ کرتا ہو، تصدیقِ قلبی اس کی موجود ہے اور خیر ایک بھی نہیں کی، سوائے تصدیق قلبی کے۔ کیا ایسا شخص ناجی ہوگا اور کیا قرآن و حدیث میں اس کو مومن کہا گیا ہے یا نہیں؟

[2] مولانا عبدالعزیز سعیدی، انھوں نے مدرسہ غزنویہ امرتسر اور مدرسہ سعیدیہ دہلی سے تعلیم حاصل کی۔ مختلف مقامات ملتان، خانیوال وغیرہ پر درس و تدریس اور خطابت کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔ بعد ازاں منکیرہ ضلع بھکر میں مسجد تعمیر کی اور وہاں درس و خطابت میں مشغول رہے۔ مئی ۱۹۸۱ء کو وہیں دفات پائی۔

[3] مولانا عبدالمجید سوہدروی۔

آنحضرت ﷺ کی اطاعت کا کوئی مطلب سمجھ میں آتا ہے۔

اس تحریک کی بنیاد یا بے عملی پر ہے یا بد عملی پر۔ حدیث کی تفصیلات میں اس کی گنجایش نہیں ملتی۔ قرآن میں تاویل سے بدعملی پر پردہ ڈالا جا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ عبداللہ سے پرویز تک اس جماعت میں یہ عیب موجود ہے۔ اس لیے اس جماعت میں نظم نہیں ہوسکا اور نہ ہی خیالات میں یکسانیت پیدا ہوسکی، بلکہ ہر ایک اپنی جگہ پر مجتہد مطلق ہے۔

اگر بالفرض چند احادیث کا مفہوم کسی کے ذہن میں نہیں آسکا تو پورے فن کا انکار، تمام احادیث پر بے اعتمادی قطعاً غیر معقول ہے۔ قرآن کی بعض آیات کے مفہوم میں رازی جیسا امام اقرار کرتا ہے کہ اس کے سمجھنے میں میرا ذہن صاف نہیں ہوسکا، اس کا یہ معنی نہیں کہ پورے قرآن کا انکار کر دیا جائے، زیادہ سے زیادہ فہم کا قصور ہے۔ ہمارے اہلِ قرآن دوستوں کا عجیب وطیرہ ہے، اپنی کم فہمی کی سزا پورے فن اور علم کو دینا چاہتے ہیں!!

اب سوالات کے متعلق گزارش سنیے:

1. حضرت عائشہ کی حدیثِ غسل کے [متعلق] غور طلب مسئلہ یہ [ہے] کہ ابو سلمہ بن عبدالرحمن بن عوف اور ان کا ساتھی کیا دریافت کرنا چاہتے تھے؟ کیا وہ اتنے انجان تھے کہ غسل کا بھی علم نہ تھا کہ کیسے کیا جاتا ہے؟

بخاری نے باب کا عنوان "باب الغسل بالصاع ونحوه" مقرر فرمایا ہے۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں: "فدعت بإناء نحواً من صاع فاغتسلت وأفاضت... الخ"[1]

ظاہر ہے کہ ان دونوں حضرات کو شبہہ تھا کہ ایک صاع سے غسل نہیں ہوسکتا۔ یہ مقدار کم ہے۔ دوسرا یہ خیال تھا کہ صرف پانی بہا دینا کافی نہیں، مَلنا بھی ضروری ہے۔ حضرت عائشہ نے پردہ کیا اور ایک صاع پانی لے کر بدن پر بہا دیا۔ ان دونوں چیزوں کو اندورن پردہ دیکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں۔ پانی کی مقدار ان دونوں کے سامنے اندر رکھی اور سر پر پانی بہا دیا۔ دونوں کی تسکین ہوگئی، اتنے پانی سے اس طرح غسل ہوسکتا ہے۔ حافظ ابن حجر نے فرمایا:

"ولما كان السؤال محتملًا للكيفية والكمية، ثبت لهما ما يدل على الأمرين معا" (فتح الباري: ١/ ١٨٤)

"سوال غسل کی کیفیت اور پانی کی مقدار کے متعلق تھا، جس کا ثبوت ان کو مل گیا۔"

پھر یہ دونوں سائل، ایک حضرت عائشہ کا (رضاعی) بھائی ہے دوسرا رضاعی بہن کا لڑکا ہے۔ حضرت عائشہ اس کی رضاعی خالہ ہیں۔ یعنی حضرت عائشہ کی ہمشیرہ ام کلثوم کا دودھ اس نے پیا تھا۔ دونوں محرم ہیں۔ جسم کے

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٤٨)

اوپر کے حصوں کو وہ دیکھ سکتے ہیں، اس لیے بالکل ممکن ہے کہ جسم کا بالائی حصہ نظر آتا ہو۔ اس لیے دونوں سائلوں کو مزید سوال کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔ یہ تکلیف تیرہ سو سال کے بعد حضرات اہلِ قرآن کو محسوس ہوئی۔ ''مدعی ست گواہ چست'' اسی کو کہتے ہیں۔ بخاری نے روایت جوں کی توں بیان فرما دی۔ سائل اور مسئول دونوں مطمئن ہو گئے۔ معلوم نہیں حضرات اہلِ قرآن سائل کی وکالت فرماتے ہیں یا حضرت مسئولہ کی؟ علیهم الصلاة والسلام.

ذہن صاف اور دیانت موجود ہو تو حدیث میں کوئی الجھن نہیں۔ حضرت عائشہ اگر بند غسل خانے میں غسل فرماتیں تو بھی مسئلہ حل ہو جاتا، بشرطیکہ پانی سائل کے سامنے رکھا جاتا۔ کیفیت کا اندازہ غسل کے وقت سے بھی ہو سکتا تھا۔ اسی لیے دونوں سائل مطمئن ہو گئے۔ بخاری کا صرف یہ جرم ہے کہ اس حدیث کو پوری احتیاط سے جمع کر دیا۔ رحمة الله عليه.

❷ حضرت جابر اور بعض دوسرے صحابہ سے متعہ کے جواز اور حلت کے متعلق بعض روایات آئی ہیں، اس لیے متعہ کی حرمت کے متعلق متقدمین علما میں اختلاف [ہے]۔ بعض اس کی حرمت کو مکرر سمجھتے ہیں، بعض اس کی حرمت کو اضطرار سمجھتے ہیں۔ صحیح یہ ہے کہ متعہ ایک جاہلی نکاح تھا، جس طرح ① استبضاع ② خدن ③ سفاح ④ شغار نکاح تھے۔ اسلام نے مناسب اوقات میں انھیں حرام فرمایا۔ اسی طرح متعہ جاہلی نکاح کے طور پر ایامِ فتح مکہ تک، فتح مکہ او غزوہ اوطاس ایک ہی سفر میں قریباً آٹھ ہجری میں ہوئے، اس وقت متعہ کی قطعی حرمت نازل ہوئی، لیکن اس وقت نشر و اشاعت کے اسباب و ذرائع عام نہ تھے۔ بعض صحابہ کو اس کا صحیح طور پر علم نہ ہو سکا۔ فتح مکہ سے حضرت عمر کی خلافت تک قریباً چار سال یا ساڑھے چار سال ہوتے ہیں، اس عرصے میں بعض صحابہ پر اس کا مخفی رہنا چنداں غیر ممکن نہیں۔ آج کے نشریات میں بعض معاملات انتہائی پبلسٹی کے باوجود مخفی رہتے ہیں۔

حضرت عمر نے اسے قانونی طور پر روکا۔ تمام لوگ رک گئے۔ سوال یہ ہے کہ آیا آنحضرت سے اس کی اَبدی حرمت ثابت ہے یا نہیں؟ فتح مکہ میں اس کی حرمت قطعی ہے۔ اب صحابہ کے عدمِ علم سے استدلال کرنا معلوم نہیں یہ دلیل کی کونسی قسم ہے؟ حضرت عمر کے اس حکم کی آیا صحابہ سے کسی نے کھل کر اس کی مخالفت کی ہے؟ اس کا معنی ظاہر ہے۔ جب علما صحابہ کو اس کی حرمت کا یقین [ہے] حکومت [نے] اس کی حمایت فرمائی۔ تمام نے اس نہی پر یقین اور امت نے اس پر اجماع فرمایا۔

محدثین کی دیانت ہے کہ علمی ذخیرے کے طور پر جو کچھ ان سے منقول تھا، انھوں نے اسے نقل کر دیا۔ علمی امانت دوسری چیز ہے اور تحقیق اور مسلک دوسری چیز۔ اس میں محدثین پر بڑی بے انصافی ہے۔ آج منکرینِ حدیث

مولوی عبداللہ اور مولوی حشمت علی کا مذہب قریباً متروک ہے۔ مولوی رمضان اور پرویز وغیرہ کے مسالک زیادہ مقبول ہو رہے ہیں، لیکن پہلے مسالک کا علمی طور پر تذکرہ کوئی جرم نہیں۔ حدیث کی مخالفت میں علمی امانت اور دیانت پر ہاتھ صاف نہیں ہونا چاہیے۔ حضرت جابر کی روایت اگر مسلم میں نہ ہوتی تو علم حدیث مستند ہو جاتا؟ اس قسم کے شبہات میرے لیے کم از کم قابلِ تعجب نہیں۔

③ یہ اعتراض میں نہیں سمجھ سکا۔ اعتراض آفتاب کے غروب پر ہے یا اس کے سجود اور اجازت پر؟

غروب کا تذکر قرآنِ مجید میں [ہے]: ﴿وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِيْ عَيْنٍ حَمِئَةٍ﴾ [الكهف: ٨٦]

غروب کا وجدان قرآن مجید اس کا اعتراف فرماتا ہے۔ علمِ ہیئت میں غروب کی تعبیر موجود ہے۔ ہم لوگ ہی نہیں، بلکہ علماے ہیئت رات کے وقت جانتے ہیں کہ سورج غروب ہو گیا۔ جس ملک سے وہ غائب ہو گیا، اسے غروب ہی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ عرف جس طرح پاکستان میں ہے، اسی طرح امریکہ میں ہے۔ یہ عرف اور زبان کا مسئلہ ہے۔ علمائے ہیئت بھی جب گفتگو کریں گے تو یہی کہیں گے۔

اگر شبہہ آفتاب کے سجود پر ہے تو یہ سجود اجازتِ ربانی کا دوسرا نام ہے، جب وہ اُس ملک میں طلوع ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی اجازت سے، اگر اس سے غائب ہو کر کسی دوسرے ملک میں ظاہر ہوتا ہے تو اللہ کی اجازت سے۔ ہر لحہ جو اس دنیا میں گزر رہا ہے، وہ اللہ کی اجازت سے ہے۔ جہاں یہ اجازت ختم ہوئی، نظام درہم برہم ہو گیا۔ اس سجود سے مراد انسانی نماز کا سجود نہیں۔ ﴿وَ اِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَ لٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ﴾ [الإسراء: ٤٤]

ہر چیز تسبیح کہتی ہے، لیکن یہ ضروری نہیں کہ انسان اس کی حقیقت کو سمجھ لے۔

④ معلوم نہیں اس حدیث میں اہلِ قرآن کے لیے کونسی چیز ناگوار ہے اور ان کے ہاں نماز کے آگے گزرنے کا مثبت طریق پر کیا حکم ہے؟ کھلی اجازت ہے؟ بالکل ممنوع؟ اور جو بھی صورت ہو، اس کی قرآنی دلیل؟

اگر ناگواری اس میں ہے کہ عورت کا تذکرہ گدھے اور کتے کے ساتھ کیوں آیا ہے؟ یہ تو کوئی چیز نہیں۔ قرآنِ عزیز [میں] گدھے اور خچر گھوڑے کا ذکر معاً آیا ہے، حالاں کہ وہ نہ اِفادی لحاظ سے مساوی ہیں نہ مرتبے کے لحاظ سے، لیکن وہ اللہ تعالیٰ کی نعمت اور قدرت کا مظہر ہونے میں برابر ہیں۔ عورت، گدھا، کتا: نماز میں جاذبِ توجہ اور مانع خشوع ہونے میں برابر ہیں، بلکہ مرد بھی اس میں ان کے برابر ہیں، گو جذب کی وجہ الگ الگ ہے۔ عورت میں جذب کی وجہ جنسی کشش اور رجحان ہے۔ کتے اور گدھے میں نقصان اور ضرر کا خطرہ ہے۔

اگر ناگواری کا سبب نماز کا ٹوٹنا ہے تو گزارش ہے کہ گو بعض روایات [میں] ''قطع'' کا لفظ آیا ہے، لیکن اس سے مراد توجہ اور خشوع کا انقطاع ہے۔ اصل نماز کا انقطاع مقصود نہیں۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

قال رسول اللهﷺ: «لا يقطع الصلاة شيئ، وادرأوا ما استطعتم، فإنما هو شيطان»[1] (أبو داود، مشكاة المصابيح، ص: ٧٤ أصح المطابع)

''نماز کو کوئی چیز نہیں توڑتی، لیکن اس حرکت سے روکنا چاہیے، کیوں کہ ایسا کرنا شیطانی فعل ہے۔''

حضرت عائشہ رات بوقتِ تہجد آپ کے سامنے لیٹی ہوتی تھیں۔[2] (مشكاة، ص: ٧٤)

ابن عباس فرماتے ہیں: میں نے اپنے گدھے کو نماز کے آگے چھوڑ دیا، وہ چرنے لگا۔ مجھے اس فعل سے کسی نے نہیں روکا۔[3]

ویسے نماز نہ ٹوٹنے کی صورت میں بھی عورت کا تذکرہ تو قبیح حیوانات کے ساتھ ہو جائے گا، مثلاً: آپ فرمائیں گے: عورت، گدھے، کتے اور خنزیر کے گزرنے سے نماز نہیں ٹوٹتی۔ اس صورت میں بھی عورت کی مزعومہ بے ادبی تو ہوگئی۔ ہماری روز مرہ کی گفتگو میں اس قسم کا تذکرہ آ ہی جائے گا اور ہر زبان میں یہ طریقہ گفتگو مروج ہے۔

﴿۵﴾ اس قسم کی احادیث کا تعلق یا عرف سے ہے یا تجربے سے۔ اسے دین اور شریعت کی حیثیت سے ذکر نہیں فرمایا۔ آنحضرت ﷺ نے طب اور علاج کے متعلق بعض روایات فرمائیں، وہ شریعت یا دین نہیں، بلکہ اس وقت متعارف چیزیں یا آنحضرت کا ذاتی تجربہ [تھا]، لیکن اگر اسے دین اور شریعت سمجھ لیا جائے تو ان حضرات کے پاس اس کے خلاف کون سی آیت ہے؟ تعجب ہے کہ یہ حضرات اپنی ذہنی ہفوات کو آنحضرت کے ارشادات سے مقدم سمجھتے ہیں، بلکہ اپنی لاعلمی کو بھی علم پر مقدم سمجھتے ہیں!!

﴿۶﴾ قرآنِ حکیم میں اصولِ مجازات کا ذکر فرماتے ہوئے فرمایا:

① ﴿جَزَآءً بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ﴾ [التوبة: ٨٢]

② ﴿وَ وُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَ هُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ﴾ [آل عمران: ٢٥]

یعنی جزا کا انحصار اعمال پر ہے، اور اب اگر تصدیق قلب کا فعل ہے تو اس کی جزا اس کو ملنی چاہیے اور اس مفروضے کے مطابق وہ نجات کا حق دار ہونا چاہیے۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّ نَذَرُ الظّٰلِمِيْنَ فِيْهَا جِثِيًّا﴾ [مريم: ٧٢]

''اہلِ تقویٰ کو نجات ملے گی اور ظالم آگ میں گھٹنوں کے بَل گریں گے۔''

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٧١٩)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٩٢)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٠٤)

اس سے ظاہر ہے کہ اچھے اعمال کی جزا تراخی اور دیر سے ملے گی، اس لیے قرآن کی رُو سے توحید اور اچھے اعمال کی جزا آخر میں ہی ملنی چاہیے۔ سید شہید کا رجحان ''تقویۃ الایمان'' میں اسی طرف ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ صرف یہ مفروضہ ہے، ورنہ تصدیقِ قلبی کے بعد اعمال سے خالی ہونا یا بدعمل ہونا، عرفاً ناممکن ہے۔ کھلی بدعملی کے بعد ایمان کی صحت اور خشیتِ الٰہی کا دعویٰ صرف طفل تسلی ہے، عملاً ایسا نہیں ہو سکتا، اس لیے عام اہلِ حدیث نے اس مسئلے میں شاہ صاحب سے اختلاف کیا ہے اور اعمال [کو] جزوِ ایمان قرار دے کر اسے مدارِ نجات سمجھا ہے۔

والسلام

محمد اسماعیل، کان اللہ لہ

گوجرانوالہ

گذشتہ ہفتے انتخابات کے سلسلے میں زیادہ وقت سفر میں گزرا، اس لیے نہ تو جواب میں تفصیل ہو سکی اور نہ عجلت، بلکہ جواب دیر سے دیا جا رہا ہے، اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ اگر مزید تفصیل کی ضرورت ہو تو ۔إن شاء اللہ۔ فقیر حاضر ہے۔

والسلام

محمد اسماعیل، کان اللہ لہ

گوجرانوالہ

············

مکتوب نمبر 58

(۹)

واذکر فی الکتاب ''إسماعیل'' Mh. Ismail, Chah Shahan

چاہ شاہاں گوجرانوالہ Gujranwala

تاریخ: ۱۰ر دسمبر ۵۸ء

محترم مولانا زاد مجدکم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج گرامی۔ ''سبیل الرشاد''[1] مل گئی۔ جناب نے مسئلہ واضح کر دیا۔ اس معاملے میں تشدد کی بدعت تو حافظ عبداللہ روپڑی نے پیدا کی۔ بہاول پور میں ایک مقدمہ چلا اور دو سال تک چلتا رہا۔ حافظ عبداللہ صاحب کا

[1] ''سبیل الرشاد في تفریق التبادلة والشغار'' کے نام سے مولانا فضل حق ہاشمی نے نکاحِ شغار کی حرمت اور نکاحِ بٹہ کی حلت کے متعلق ایک کتاب تالیف کی تھی۔

رجحان بھی پہلے جواز مع الکراہۃ کی طرف تھا، اس کیس میں اُن کا رویہ سخت ہوگیا، وہ اسے حرام بتانے لگے۔

مشکل دونوں صورتوں میں ہے۔ حرام کہنے کے لیے شرعی صراحت کی ضرورت ہے اور کھلا چھوڑنے میں معاشرے کی خرابی کی وجہ سے تلخیاں پیدا ہوتی ہیں۔ استدلال کی چستی ان خرابیوں کا علاج نہیں کرسکتی۔ جواز کے باوجود کوشش ہونی چاہیے کہ مشروط تعلقات نہ ہونے پائیں یا اصلاحِ معاشرہ کے لیے حکومت کوئی جامع قانون بنا دے۔

حدیثِ غسل [1] کے ''خلاف ادب اور توہین'' کا بہانہ مضحکہ خیز ہے۔ شبہہ اس میں ہے کہ اتنے تھوڑے پانی میں غسل نہیں ہوسکتا۔ ام المومنین رضی اللہ عنہا نے غسل فرمایا اور پانی کی اسی مقدار میں فرمایا۔ سائل کو یقین ہوگیا کہ ایسا ہوسکتا ہے۔ گھروں میں غسل خانے موجود ہیں، گھر کی عورتیں بچوں اور بوڑھوں کے ہوتے گھر میں غسل کرتی ہیں، نہ ہم بے ادبی کے خطرے سے گھر چھوڑتے ہیں نہ وہ غسل کے لیے کوئی دوسرا مقام اختیار کرتی ہیں۔ فرق صرف اس قدر ہے، یہاں غسل خانہ کپڑے کا بنایا گیا، ہمارے ہاں غسل خانے اینٹوں کے ہوتے ہیں۔ گویا کپڑے کے غسل خانے میں نہانا توہین اور بے ادبی ہے اور اینٹوں کے غسل خانے میں ادب اور اعزاز ہے۔

ما لهؤلاء القوم لا يكادون يفقهون حديثا؟

اسلامی فرقوں میں مَیں نے اہلِ قرآن سے زیادہ کم فہم کوئی فرقہ نہیں دیکھا۔

مولانا محمد شریف صاحب اور مولانا عبدالرحمٰن صاحب سے مؤدبانہ سلام عرض فرمادیں۔

والسلام

محمد اسماعیل، کان اللہ لہ

گجرانوالہ

............❁❁❁............

مکتوب نمبر 59

(۱۰)

واذكر في الكتاب "إسماعيل" — Mh. Ismail, Chah Shahan

چاہ شاہاں گوجرانوالہ — Gujranwala

تاریخ: ۲۵؍اپریل ۵۹ء

محترم مولانا زادمجدکم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج گرامی۔ عید کارڈ اور تیل مل گئے۔ تیل کی دونوں کمپنیوں سے کچھ نقصان ہوا ہے۔ ٹین کے

[1] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث کی طرف اشارہ ہے۔

کاک کے اندر کوئی کاک ہوتا تو یہ نقصان نہ ہوتا، تاہم کافی بچ گیا ہے۔ کرم فرمائی کے لیے شکریہ، لیکن اگر جناب تھوڑی سی بے تکلفی فرما کر قیمت وصول فرما لیا کریں تو مجھے ندامت نہ ہو۔ اس میں یہ فائدہ ہوتا ہے بلا تکلف طلب کی جا سکتی ہے۔

جناب نے مولوی عبدالقادر صاحب[1] سے ثالثی کے لیے چند آدمیوں کو انتخاب فرمایا ہے۔ ثالث کو آپ حضرات حکم فرماتے ہیں کہ وہ آپ حضرات کے حکم کی تعمیل کرے۔ کسی ثالث کو معذرت یا مجبوری کے اظہار کی اجازت بھی ہے یا نہیں؟

میں نے مولوی عبدالقادر صاحب کو پہلی دفعہ لاہور کی مجلسِ مفاہمت میں دیکھا اور انکی نجی تحریر جناب کے توسط سے پڑھی۔ سچ ہے قلم کی آنکھیں نہیں ہوتیں۔ میں ایسے حضرات کے معاملے میں دخل دینے سے گھبراتا ہوں۔

یہ بھی فرمائیں! باقی ثالث حضرات بھی ثالثی کے لیے تیار ہیں یا نہیں؟ کسی کی منظوری آئی ہو تو مطلع فرمائیں، میں تو بہر کیف معذور ہوں۔

اچھا یہ ہے کہ معاملہ جہاں ہے، وہیں ختم کر دیں۔ اس طعن و تشنیع میں باہم بے اعتمادی اور بدگمانی بڑھے گی۔ بظاہر فیصلے کی کوئی امید نہیں۔

میں تو آج تک مجلسِ مفاہمت میں شریک نہیں ہوا۔ صدرِ محترم ہی ہماری نیابت فرماتے ہیں۔ حافظ عبداللہ صاحب روپڑی اپنی افتادِ طبع سے مجبور ہیں۔ انھوں نے ساری عمر مل کر کام نہیں کیا۔ ان کی پوری زندگی تفریق پسندی میں گزری ہے۔ اب وہ کیسے جماعت کے ساتھ چل سکتے ہیں؟!

والسلام

محمد اسماعیل، کان اللہ لہ

گجرانوالہ

❀❀❀

[1] مولانا عبدالقادر عارف حصاری (م ۱۹۸۱ء) مولانا ہاشمی اور مولانا حصاری کے درمیان نکاحِ بنہ کے مسئلے کی بابت علمی نزاع تھا، جس کے لیے ثالثی کا قضیہ پیدا ہوا تھا۔

مکتوب نمبر 60

(۱۱)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مرکزی جمعیت اہلِ حدیث مغربی پاکستان

شیش محل روڈ۔ لاہور

گجرانوالہ

۲۴ر جون ۵۹ء

مکرم قریشی صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج گرامی۔ جناب سے ملاقات ہوئی۔ میں اس وقت تشویش میں تھا۔ اس لیے جناب کے پاس ٹھہر نہیں سکا۔ اس وقت اتنی جلدی واپسی کا خیال بھی نہ تھا۔

میانوالی حاضری مشکل نہیں۔ میرا خیال یہ ہے ہماری تقاریر وہاں چنداں مفید نہیں ہوں گی۔ اپنی گزارشات کے متعلق تو مجھے پختہ خیال ہے، ممکن ہے صاحبِ صدر اس سے مستثنیٰ ہوں۔ وہاں کے قریبی اہلِ علم اس ماحول میں زیادہ مفید ثابت ہوں گے۔ اواخر اکتوبر یا نومبر میں یاد فرمائیں، ۔إن شاء اللہ۔ کوئی صورت تجویز کر لی جائے گی۔ لیکن سعیدی صاحب کی شکایت کے متعلق مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ مجھے ان کے خلوص پر شبہ نہیں، ان کا مزاج اور اندازِ گفتگو میرے ایسے کند ذہن کے فہم سے بالا ہے۔ مجھے ان کے ارشادات پڑھنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ وہ دوسرے لوگوں کو بد دیانت سمجھتے ہیں اور اپنی دیانت داری پر کبر وغرور کی حد تک پہنچے ہوئے ہیں:

- ''انتخاب ایک مجوزہ اور سوچی سمجھی سکیم اور خاص طریق سے عمل میں لایا جائے گا۔''
- ''بڑوں کے سیاسی جوڑ توڑ اور من مانی تجاویز کو جماعتی رنگ میں رنگنا وغیرہ وغیرہ سب میرے سامنے ہے۔''
- ''یہ بڑے دوسروں کو دیکھنا گوارا نہیں کرتے۔''

إنا للہ وإنا إلیہ راجعون!

آپ شوریٰ کے اجلاس میں موجود تھے۔ فرمایئے! کیا جوڑ توڑ ہوئی؟ کونسی مجوزہ سکیم سامنے آئی؟ کس کی آنکھوں میں دھول ڈالی گئی؟ قلم کی آنکھیں نہیں، ورنہ اسے لکھتے حیا محسوس ہوتی!!

سعیدی صاحب میں قوتِ گویائی نہیں، دلیل سے وہ کوئی چیز منوا نہیں سکتے، لیکن اپنی بڑائی کے متعلق انھیں پورا وثوق ہے۔ قلم کی زبان سے جلی کٹی کہہ کر اپنی مزعومہ دیانت کے متعلق مطمئن ہو جاتے ہیں۔

یہ لوگ مایوسی کی پیداوار ہیں۔ ان کا ماضی اور مستقبل صرف مایوسی ہے۔ وہ منتظر ہیں کہ ان [کے] مزعوم بڑے مرجائیں اور آیندہ ان کے لیے جگہ خالی کردیں۔ خدا کرے ان کی یہ آرزو پوری ہو!

ہمارے [ہاں] ایک معمار ہے، وہ شاہی مسجد کی امارت پر اعتراض کرتا ہے کہ اس کے بنانے والے ماہر نہ تھے، لیکن یہ حال ہے کہ اُسے کام پر کوئی نہیں لگاتا تو وہ اپنے ساتھیوں کو گالیاں دے کر دل ٹھنڈا کر لیتا ہے۔

سعیدی صاحب کا مزاج شورائی نہیں، لیکن ان کی آرزو یہ ہوتی ہے کہ ان کی ہر بات قبول کر لی جائے۔ اب یہ کیسے ہو؟ وہ اسے جوڑ توڑ کہہ کر خوش ہو جاتے ہیں۔

گذشتہ سال شوریٰ نے ابتدائی تعلیم کے ترک کا فیصلہ فرمایا، ہمارے خلاف اکثریت نے فیصلہ دے دیا۔ قبول کے سوا چارہ؟ امسال تجربے نے شوریٰ کی رائے بدل دی۔ یہ حضرات اس قابل ہیں کہ انھیں سیم و زر کے گنبد میں بٹھا کر ان کی زیارت کی جائے اور بس!

امید ہے آیندہ ان کے گرامی ارشادات اپنی ذات تک محدود رکھیں گے۔ ملیں، ان کا مزاج گوارا کرے تو سلام عرض کر دیں۔ اہلِ بدعت کی تکفیر میں کچھ غلو ہوا ہے، مگر ہم ان کی حمایت میں فریق نہیں بننا چاہتے، اس حمایت میں شرک اور بدعت کی فی الجملہ اعانت بھی ہوگی، حالاں کہ ان سے تنفر ضروری ہے اور مفید بھی۔

یہاں تو کوئی پریس میری نظر میں نہیں، لاہور مولوی عطاء اللہ صاحب سے مشورہ کریں۔ سعیدی صاحب کا حافظہ غلطی کرتا ہے۔ حافظ ابراہیم کے متعلق کیس کا فیصلہ نہیں ہوا تھا، بلکہ یہ فیصلہ ہوا تھا انکوائری کمیٹی کی رپورٹ عاملہ میں پیش ہو کر شوریٰ میں آئے۔ سعیدی صاحب مع مولوی عبدالمجید صاحب حافظ ابراہیم کی حمایت میں تھے۔

مولانا محمد شریف صاحب اور مولانا عبدالرحمٰن صاحبؒ سے سلام عرض کر دیں۔

والسلام

محمد اسماعیل، کان اللہ لہ

مکتوب نمبر 61

(۱۲)

گجرانوالہ

۱۸۔۷۔۵۹ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محترم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

یاد فرمائی کا شکریہ۔ گجرانوالہ ... ایسی جگہ واقع ہے کہ یہاں سیول کا اثر بہت کم ہوتا ہے۔ امسال بھی خیریت رہی۔ امید ہے آپ حضرات کی ادعیہ سے خیریت ہی رہے گی۔

غلہ اور مویشی کا نقصان ضلع سیالکوٹ میں ہوا ہے۔ گوجرانوالہ کے دہات سیلاب تو آیا ہے، لیکن انسانوں اور مواشی کا نقصان نہیں ہوا۔

والسلام

محمد اسماعیل

مدرس گجرانوالہ

مکتوب نمبر 62

(۱۳)

گجرانوالہ

۲۷۔۵۔۶۰ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محترم قرنی صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

کانفرنس کی بندش سے نقصان بھی ہوا اور تکلیف بھی، مگر حکومت کی مصالح کا لحاظ ناگزیر تھا۔[1]

شکر ہے اللہ تعالیٰ نے آپ کے عائلہ کو ٹائیفائڈ ایسے موذی مرض سے صحت بخشی۔

[1] مرکزی جمعیت اہلِ حدیث پاکستان کی چھٹی سالانہ کانفرنس ۲۔۳۔۱۹۶۰ء کو چوکی میں منعقد ہو رہی تھی کہ مارشل لا حکومت نے کانفرنس کے انعقاد سے چند گھنٹے پیشتر اس پر پابندی لگا دی، جس کی بنا پر مجبوراً اربابِ جماعت کو یہ کانفرنس منسوخ کرنا پڑی۔ دیکھیں: ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۱۸ر اپریل ۱۹۶۰ء)

سرگودھا کانفرنس کا خطبہ صدرِ محترم نے ہی ابھی پورا نہیں لکھا، طبع کیسے ہوتا!

مارشل لا کا دور ہے، تا حال تگ و دو کامیاب نہیں ہوئی۔ جامعہ سلفیہ کی آمد و خرچ کے پیشِ نظر اُمید نہیں حکومت اس پر قبضہ کرے۔ اگر حکومت اسے چلانا چاہے تو ہمیں اور کیا چاہیے؟ حکومت کل قبضہ کرتی، آج ہی کرے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ جماعت کے کام کے لیے مجھے کوئی نیا جنجال گلے میں نہیں ڈالنا چاہیے۔ شاید میں کسی سے اشتراک کرلوں۔ مولوی علی محمد صاحب صمصام اس کے لیے مع رفقا تیار ہوئے ہیں۔ آج چار الگ الگ درخواستیں اسی مضمون کی ڈپٹی کمشنر صاحب بہادر کو بھیج دی گئی ہیں۔ بذریعہ رجسٹری ایک نقل چاروں کی طرف جناب کو یاد دہانی کے لیے بھیج رہا ہوں۔ تفصیلات سے مطلع فرما دیں۔ دونوں سکیم کی تفصیلات بھیج دیں۔

والسلام

محمد اسماعیل

چاہ شاہاں، گجرانوالہ

مکتوب نمبر 63

(۱۴)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مرکزی جمعیت اہلِ حدیث مغربی پاکستان

شیش محل روڈ، لاہور

۲۴۔۸۔۶۰ء

محترم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج گرامی۔ توجہ سامی کا شکریہ۔ درخواست پہنچ گئی، اس کے لیے مکرر شکریہ۔ میں سوچتا ہوں، آج کل کے دفتری نظام میں میرے جیسا آدمی کیسے رُخ کرسکتا ہے؟ وہاں کا طواف، وہاں کے مطالبات میرے جیسا آدمی کیسے پورے کرسکتا ہے؟

مولوی صمصام صاحب اس کے لیے شوقین ہیں، ان سے عرض کروں گا۔

مولوی عبدالقادر حصاری معذور ہیں۔ مجھے ان کی زیارت لاہور کنونشن پر ہوئی، میری ان کے متعلق اسی دن سے یہ رائے ہے۔ ان کا جواب یہ ہے کہ انھیں ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔

اینست جوابش کہ جوابش نہ دہی

آپ جب شغار پر لکھ رہے تھے، مجھے اس وقت بھی آپ پر ترس آتا تھا کہ آپ کس مصیبت میں گرفتار ہیں؟ ''ضرب الفأس''[1] میں نے دیکھی ہے اور ردّی کی ٹوکری میں ڈال دی ہے۔ آپ مسئلہ شغار یا کسی دوسرے مسئلے پر ضرور لکھیں، اس کے شبہات کو بھی نظر میں رکھیں، لیکن اسے مخاطب کرنا چھوڑ دیں۔ مولوی عبدالستار دہلوی نے اُسے اِسی لیے رکھا ہے کہ وہ لوگوں کی بے آبروئی کرے اور شرفا سے اُلجھتا رہے۔

اپنے خطیب صاحب مولانا عبدالرحمٰن صاحب سے میرا نیاز مندانہ سلام عرض کریں۔ مولانا عبدالرحمٰن سے کہہ دیں کہ مَیں نے ''لسان العرب'' ساڑھے آٹھ صد (۸۵۰) روپے میں خرید لی ہے۔ اب چکڑالہ میں کوشش کی ضرورت نہیں۔

والسلام

محمد اسماعیل، کان اللہ لہ

گجرانوالہ

مکتوب نمبر 64

(۱۵)

گجرانوالہ

۲۱۔۱۲۔۶۰ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محترم ومکرم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مدت ہوئی جناب نے اپنی صحت و عافیت کے متعلق کوئی اطلاع نہیں دی۔ اُمید ہے جناب مع العیال بخیریت ہوں گے۔

مولانا حصاری[2] نے آپ کا پیچھا چھوڑا ہے یا نہیں؟

سعدی کا ارشاد ہے:

[1] یہ ''ضرب الفأس علیٰ کاشف الرأس'' مولانا عبدالقادر عارف حصاری کی تالیف ہے۔

[2] مولانا عبدالقادر عارف حصاری (م ۱۹۸۱ء)، ان دنوں ہفت روزہ ''الاعتصام'' میں مولانا حصاری اور مولانا فضل حق ہاشمی کے درمیان ایک مسئلے (نکاحِ شغار) کی بابت نزاع چل رہی تھی۔ اسی کی طرف اشارہ ہے۔

آنکس کہ بقرآن و خبر زد ... انیست جوابش کہ جوابش نہ دہی

یہ حضرات مسائل سے زیادہ ذاتیات کی جنگ لڑتے ہیں۔ ان کا مقابلہ ہم ایسے لوگوں سے مشکل ہے۔

والسلام

محمد اسماعیل

....

مکتوب نمبر 65

(۱۶)

گجرانوالہ

۱۴-۳-۶۱ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مکرم قریشی صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

جناب تشریف لائے۔ ملاقات نہ ہوسکی، افسوس ہوا۔ جناب نے سنا ہوگا، جامعہ سلفیہ کے ملحق ایک ایکڑ زمین کا سودا کیا تھا، رجسٹری [کی] آخری تاریخ ۱۹ رفروری تھی، قریباً تیس ہزار روپیہ وہاں پہنچانا تھا، اس لیے میں نے خود ہی جانا مناسب سمجھا۔ آپ کی تکلیف اور ملاقات نہ ہوسکنے کا بے حد افسوس ہے۔

مجھے جناب کی تشریف آوری کا علم ہوتا تو میں ایک جانماز یعنی مصلیٰ کی تکلیف دیتا۔ آپ کے ہاں باریک پٹھے کی صفیں اچھی ہوتیں ہیں۔ بہرکیف کسی آنے والے کے ہاتھ -إن شاء اللہ- منگالی جائیں گی۔

والسلام

محمد اسماعیل

چاہ شاہاں، گوجرانوالہ

آپ اتنی دور سے تشریف لائے، کم از کم رات قیام فرمایا ہوتا۔ مولانا محمد شریف اور مولانا عبدالرحمٰن صاحب سے سلام عرض فرمادیں۔

والسلام

محمد اسماعیل، کان اللہ لہ

....

مکتوب نمبر 66

(۱۷)

گجرانوالہ

۲۲۔۴۔۶۱ء بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محترم مکرم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ

عرصہ سے جناب کے متعلق کوئی اطلاع نہیں ملی۔ امید ہے جناب بخیریت ہوں گے۔ مولانا عبدالرحمٰن صاحب اور مولانا محمد شریف صاحب دونوں حضرات بخیریت ہوں گے۔ ان سے سلام عرض فرما دیں۔

والسلام

محمد اسماعیل، کان اللہ لہ

گجرانوالہ

..........❀❀❀..........
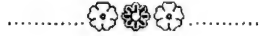
مکتوب نمبر 67

(۱۸)

واذکر فی الکتاب "إسماعیل" Mohd Ismail, Chah Shahan

چاہ شاہاں گوجرانوالہ Gujranwala

۴۔۵۔۶۱ء

محترم قریشی صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ

اس سے پہلے کوئی خط مشتمل بر سوالات نہیں ملا۔ حافظ محمد صاحب کا فتویٰ بھی نہیں دیکھا۔ "الاعتصام" عموماً پورا دیکھتا ہوں۔ معلوم نہیں نظر سے کیوں نہیں گزرا۔[1]

---

[1] مولانا ہاشمی نے اپنے مکتوب میں ذکر کیا تھا کہ حافظ محمد صاحب گوندلوی (۱۹۸۵ء) کا ایک فتویٰ " ہفت روزہ "الاعتصام" لاہور (۱۴/اپریل ۱۹۶۱ء) میں ادائے رکعاتِ فجر بعد نمازِ فجر کے متعلق شائع ہوا تھا۔

پھر ہاشمی صاحب نے اپنے مکتوب میں مولانا سلفی رحمہ اللہ سے تین سوال دریافت کیے تھے:

① کیا وتر کے بعد کوئی نفل نماز نہیں؟

② نمازِ تراویح کے بعد وتر پڑھ کر نفل ادا کیے جا سکتے ہیں یا سحری کے نوافل کے بعد وتر پڑھے جائیں؟

③ کیا وتر پڑھنے کے بعد نفلی عبادت کی کوئی پابندی بھی ہے؟

مولانا سلفی رحمہ اللہ نے اوپر انھیں تین سوالات کے جوابات رقم فرمائے ہیں۔

[۱] «اجعلوا آخر صلاتکم باللیل وترا»[1] (مسلم) یہ آنحضرت کا حکم ہے، جس کا مفاد یہ ہے کہ اس حکم کی تعمیل کی جائے۔ وتروں کے بعد دو رکعت یہ حضرت کا فعل ہے، اس میں خصوصیت کا احتمال ہے، اس لیے اس میں تعارض نہیں۔ امت کو قول پر عمل کرنا چاہیے، فعل ہوسکتا ہے آنحضرت کی خصوصیت ہو۔

[۲] حضرت عائشہ سے آنحضرت ﷺ کے دو عمل مروی ہیں: نو رکعت اور گیارہ رکعت۔[2] آخر عمر میں سات رکعت مع وتر ادا فرما کر دو نفل پڑھتے۔ اس سے پہلے ۹ رکعت مع وتر ادا فرماتے، اس کے بعد دو نفل ادا فرماتے۔ بعض نے توجیہ فرمائی ہے کہ اگر پہلی رات وتر پڑھے جائیں تو دو نفل پڑھ لے، لیکن آخر رات میں نوافل نہیں پڑھنے چاہئیں۔ لیکن اس کی صراحتاً تائید نہیں ہوتی۔

[۳] صحیح صورت یہ ہے کہ نوافل [میں] وسعت ہے۔ وتر کے بعد دو نفل کا التزام نہیں کرنا چاہیے، اگر کبھی کوئی پڑھ لے تو درست ہے۔ حدیث میں التزام کا ذکر نہیں، اس لیے بہتر ہے کہ التزام نہ کیا جائے۔

والسلام

محمد اسماعیل، گوجرانوالہ

میانوالی کالج میں ایک نوجوان پروفیسر محمد اسحاق ہے۔ حافظ بھی ہے۔ بڑے دیندار گھر کا لڑکا ہے۔ چنیوٹ گیا تھا، وہاں اسے دماغی خرابی ہوگئی تھی۔ اس کے بعد کچھ درست ہوگیا، لیکن دینداری کی طرف توجہ بالکل ہٹ گئی۔ اگر ملے تو اندازہ فرمائیں دماغی حالت کیسی ہے؟ ممکن ہے آپ کی ملاقات سے دینی رجحان عود کر آئے۔ غالباً اکیلا رہتا ہے، لیکن متاہل ہے۔ اہلیہ کو اپنے پاس نہیں رکھتا۔ اگر ہو سکے تو اس کے حالات سے مطلع فرمائیں۔ مجھے اچھی طرح جانتا ہے۔ ممکن ہے اب اس کا حافظہ جواب دے چکا ہو۔

محمد اسماعیل

❀❀❀

مکتوب نمبر (۶۸)

(۱۹)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مرکزی جمعیت اہلِ حدیث مغربی پاکستان

مکرم قریشی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج گرامی۔ مکتوب ملا۔ تعجب ہے مجھے سرگودھا میں جناب کی ملاقات قطعاً ذہن میں نہیں۔ جن بزرگوں

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۷۵۱)

[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۱۰۸۹، ۱۰۹۶) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۷۳۰)

کو جناب نے شوریٰ کی ممبری کے لیے انتخاب فرمایا تھا، وہ متعدد دفعہ ملے۔

مولوی عبدالمجید صاحب[1] اور سعیدی[2] صاحب کے معاملے میں مجھے تو چنداں تشویش نہیں اور نہ ہی بحمد اللہ اب تک کوئی نقصان ہوا ہے۔ میں نے جہاں تک اپنے ضمیر کو ٹٹولا ہے، نہ کوئی ذاتی منفعت مطلوب ہے اور نہ کوئی طمع نہ کسی سے عداوت۔

مولوی عبدالمجید اور سعیدی صاحب کو آمریت اور نظم میں تمیز نہیں۔ نظم قائم رکھنے کے لیے صدر کو بعض وقت رولنگ دینا ہوتا ہے اور بحث کو غلط رخ سے پھیرنے کے لیے بظاہر سختی کی ضرورت ہوتی ہے۔

حضرات اسے آمریت سمجھنے لگتے ہیں، ورنہ جہاں تک میرا خیال ہے اس دفعہ شوریٰ کافی حد تک آزاد تھی، اگر آمریت ہوتی تو صدر کو ناظمِ تعلیمات کے سلسلے میں شکست نہ ہوتی۔ مولوی عبدالمجید صاحب ہمارے ضلع کے صدر ہیں، لیکن انھوں نے کچھ نہیں کیا، بلکہ کام میں رکاوٹ پیدا کرتے رہے۔ جماعت کو مالی نقصان پہنچانے کی کوشش کی۔ ''الاعتصام'' کا کئی سو روپیہ ان کے ذمے ہے، وہ دینا نہیں چاہتے۔ ایسے لوگوں کو کوئی خوش کر سکتا ہے؟

سعیدی صاحب نیک نیت آدمی ہیں، لیکن انتہائی جذباتی۔ یہ ان کے اختیار کی چیز نہیں۔ افتادِ طبیعت اُن کے بس میں نہیں، وہ بیچارے اس قدر دور ہیں، وہ صحیح حالات کا اندازہ لگا ہی نہیں سکتے۔ پچاس فیصدی بھی جذباتی فیصلہ ہے، غلطیاں ضرور ہیں، اس سے بریت کا دعویٰ نہ صدر کر سکتا ہے نہ ناظم۔ یہ لوگ تنقید یا اعتراض کے بجائے اگر مشورہ دیں تو وہ بہت زیادہ مفید ہو۔

مگر ان حضرات نے سیاسی جماعتوں میں اپوزیشن کا لفظ سن رکھا ہے، اس لیے وہ اس لفظ کی آڑ میں غلط صحیح کہنے کے لیے وجہ جواز پیدا کرتے ہیں۔ حالاں کہ سیاسی جماعتوں میں طریقِ کار یا پروگرام کی بنا پر اپوزیشن بنتا ہے، یہاں کتاب و سنت کے اتباع اور اشاعت کے سوا کوئی پروگرام نہیں، اس لیے اپوزیشن کے لیے کوئی موزونیت نہیں۔

مولانا سعیدی صاحب نے اگر جماعت میاں والی سے قطع تعلق کیا ہے تو افسوس ہے، لیکن مجھے معلوم نہیں گذشتہ سالوں میں انھوں نے میاں والی کی جمعیت کے لیے کیا قربانی فرمائی؟ آپ ان سے اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی کی درخواست کریں۔ اگر وہ ایسا نہ کر سکیں تو اللہ تعالیٰ کوئی صورت پیدا فرما دے گا، گھبرانے کا کوئی مقام نہیں۔

مجھے تعجب ہے کہ مولوی عبدالمجید صاحب نے اعتراضات کیا کیے ہیں، جن کے جوابات نمبر وار شائع کیے جائیں؟ ان کی شکایات کا جواب تو اراکینِ شوریٰ نے نمبر وار ہی شائع کیا ہے۔

---

[1] مولانا عبدالمجید خادم سوہدری۔

[2] مولانا عبدالعزیز سعیدی (م مئی ۱۹۸۱ء)

جہاں تک میں نے مختلف سیاسی اور غیر سیاسی جماعتوں میں کام کیا ہے، نقائص سے خالی تو کوئی بھی نہیں، یہاں بھی نقائص ہیں، مگر یہاں اس قدر نقائص نہیں، جس قدر دوسری جماعتوں میں دیکھے گئے ہیں۔ پھر اصل میں اپنے وقار اور جماعتی مفاد میں جب تصادم ہو تو بہت کم لوگ اس میں تطبیق دے سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی توفیق شاملِ حال ہو تو اعمالِ خیر کی توفیق مل جاتی ہے، ورنہ حِیَل تو بہر حال سوجتے ہی رہتے ہیں۔

تیل کے متعلق جناب نے شاید ابہام سے کام لیا۔ حال ہی میں ختم ہوا تھا، میں نے تکلیف دینا مناسب نہ سمجھا اور یہاں انتظام کر لیا۔ جناب اگر اس کی قیمت وصول فرمالیں تو مجھے طبیعت پر بوجھ نہ رہے، میں بے تکلف رہوں بلکہ پُرسکون۔

احباب سے سلام عرض فرمادیں۔

والسلام

محمد اسماعیل، گوجرانوالہ

مکتوب نمبر 69

(۲۰)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مرکزی جمعیت اہلِ حدیث مغربی پاکستان

شیش محل روڈ۔ لاہور

مکرم محترم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج گرامی۔ مدت کے بعد مکتوب ملا۔ پروگرام بعض ناگزیر وجوہ کی بنا پر منسوخ کرنا پڑا۔ ان میں ایک وجہ آپ حضرات کی خاموشی بھی تھی۔ آپ نے ایک گرامی نامہ میں لکھا تھا کہ اب میری اطلاع کے بغیر میانوالی نہ آئیں۔ پروگرام کی اشاعت کے بعد مجھے آپ کے گرامی نامہ کا انتظار رہا، مگر آپ نے مکمل سکوت فرمایا۔ میں خوشاب تک گیا اور مولوی صدیق اور حافظ اسماعیل صاحب[1] کے ذمے لگایا کہ وہ آپ کی خدمت میں

[1] حافظ اسماعیل صاحب ذبیح آف راولپنڈی۔

پہنچے۔ اب رمضان المبارک سے پہلے پہنچنا تو مشکل ہے۔ میں ۵/اپریل کو راولپنڈی سے ہوتا ہوا آزاد کشمیر جا رہا ہوں۔ غالباً ۱۲ اپریل سے پہلے نہیں آسکوں گا۔ ۱۳/اپریل کو رمضان المبارک شروع ہو رہا ہے۔

عید کے [بعد] کانفرنس کی تاریخ ہوگی۔ اس دس بارہ دن میں مشغولیت بہت زیادہ ہوگی۔ کانفرنس کے بعد آپ مختار ہوں گے، میں۔ إن شاء اللہ۔ ضرور پہنچوں [گا]۔

اپنے ہمراہ بھی کسی کو۔ إن شاء اللہ۔ لے آؤں گا۔

والسلام

محمد اسماعیل، کان اللہ لہ

گوجرانوالہ

............❁❁❁............

مکتوب نمبر 70

(۲۱)

پاکستان میں اسلامی علوم کی مرکزی اور معیاری درس گاہ

الجامعة السلفية۔ لائل پور

زیرِ اہتمام: مرکزی جمعیت اہلِ حدیث، مغربی پاکستان

محترم ڈاکٹر صاحب زید مجدکم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج گرامی۔ حاملِ رقعہ کا ایک مریض کئی دنوں سے ہسپتال میں داخل ہے۔ مریض قابلِ آپریشن ہے۔ لوگ پریشان ہیں کہ آپریشن میں دیر کیوں ہو رہی ہے؟

والسلام

محمد اسماعیل، گوجرانوالہ

۹۔۴۔۶۴ء

............❁❁❁............

مکتوب نمبر 71

(مولانا محمد حیات آف پنڈی گھیپ کے نام دو خط)

(۱)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

واذکر فی الکتاب "إسماعیل" — Mohammad Ismail

چاہ شاہاں۔ گوجرانوالہ — Chah Shahan

Dated 67-8-24 — Gujranwala

عزیزم مولوی محمد حیات صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ کی پریشانی سن کر دُکھ ہوا۔ اللہ تعالیٰ اس پریشانی کو دور فرمائے۔ یہاں کے حالات اس وقت کچھ زیادہ سازگار نہیں ہیں۔ فسادات پر پولیس کی انکوائری شروع ہے۔ اڈیالہ کے کیس پر بھی مصارف ہو رہے ہیں۔ کاروباری حالات بھی اچھے نہیں۔ کاروباری لوگ اسی وقت اپنے ہیں جب آمدن ہو۔ والسلام

محمد اسماعیل، کان اللہ لہ
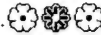
مکتوب نمبر 72

(۲)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

واذکر فی الکتاب "إسماعیل" — Mohammad Ismail

چاہ شاہاں۔ گوجرانوالہ — Chah Shahan

Dated 67-2-2 — Gujranwala

عزیزم سلمہ اللہ! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

کام اخلاص اور محنت سے کریں۔ کسی کو ناراض کرنے کی کوشش نہ کریں۔ اگر کوئی خوامخواہ ہو جائے تو منت کی ضرورت نہیں۔ اپنی طرف سے اصلاح کریں۔ طبیعت میں تیزی نہیں آنا چاہیے اور اپنے رفقا سے صحیح صحیح بات کریں۔ بے ضرورت معاملے کو چھپانے کی کوشش نہ کی جائے۔ رات اُٹھنے کی عادت ڈالیں۔ تہجد میں بڑی برکتیں ہیں۔ ادعیہ کی قبولیت کا بہترین وقت ہے۔ والسلام

محمد اسماعیل، کان اللہ لہ

مکتوب نمبر 73

(..)[1]

مرکزی جمعیت اہلِ حدیث مغربی پاکستان
شیش محل روڈ۔ لاہور

مکرم ومحترم حضرت المحترم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مکتوب ملا۔ جماعت کے فیصلوں کا علم جناب کو بذریعہ ''الاعتصام'' ہو جائے گا۔إن شاء اللہ۔ مختصر یہ ہے کہ لائل پور میں ایک لاکھ پچیس ہزار کی زمین خرید لی ہے۔ عمارت کے اخراجات کراچی کے احباب خیر دیں گے۔

جناب نے علمائے کراچی کا ذکر فرمایا ہے۔ مولانا ... کا معاملہ ہے۔ ایسے حضرات میں ہمیں کام کرنا ہے، اس لیے ہمت نہیں ہارنا چاہیے۔

جس شخص کا میں نے ذکر کیا تھا، وہ طبیب نہیں۔ اس کے پاس عطائی نسخہ ہے، جو مفید ہے۔ اس نے کافی تجربہ کیا ہے، اس کی رائے ہے کہ مفید ثابت ہوا ہے۔ دمہ اور ذیابیطس دونوں کے لیے کافی مفید ہے۔ اگر فرمائیں تو دوائی بھیج دوں؟

ان کا پتا یہ ہے: محترم فضل پہلوان صاحب، محلّہ اسلام آباد گوجرانولہ، یا اڈہ جی ٹی بس سروس۔ ان کو جو کچھ لکھیں، میرا ذکر کر دیں، میں ۔إن شاء اللہ۔ ان کو مل لوں گا۔ ویسے وہ طبیب نہیں، بالکل بے علم آدمی ہے۔ نسخہ بتاتا بھی کسی کو نہیں۔

مودودی صاحب کا مسئلہ ہمارے ہاں اس حد تک پہنچ گیا ہے، اب مزید کوئی آدمی ان میں شامل نہیں ہوتا۔ جو ہو چکے، وہ ہو چکے۔

مجھے مولوی عبدالغفار حسن کے متعلق افسوس ہے۔ وہ بالکل مودودیت کا ضمیمہ ہو کر رہ گئے ہیں۔ اگر جناب یا مولانا عبدالحنان کے ان سے مراسم ہوں تو ان کو لکھیے، ہم ۔إن شاء اللہ۔ ان کی ضروریات کی پوری کفالت کے لیے تیار ہیں۔ اپنے آدمیوں کو اپنے حلقوں میں کام کرنا چاہیے۔

والسلام

محمد اسماعیل، کان اللہ لہ

............❀❀❀............

---

[1] مکتوب الیہ کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔

مکتوب نمبر 74

(سعودی سفیر کے نام کانفرنس[1] میں شرکت کا مکتوب)

بسم الله الرحمن الرحيم

حضرة السمو صاحب الفضيلة، السفير المفوّض للدولة السعودية العربية! دامت، بركاتهم. السلام عليكم ورحمة الله.

يا صاحب المعالي! إن الجامعة السلفية معهد علمي كبير للسلفيين في باكستان. وستكون لها في شهر أكتوبر ١٩٦١ء حفلة كبيرة سنوية في لائل فور.

نرجوا أن تشرفونا بقدومكم الميمون، وأن تشاركونا في هذا التقريب المبارك. وسيحضر عندكم وفدٌ للجمعية السلفية برياسة حضرة الأستاذ سيد محمد داود الغزنوي، رئيس الجمعية المركزية في باكستان الغربي.

ثم نكرر استدعاء الإجابة من فضيلتكم لهذه الحفلة الكبيرة.

والسلام

محمد إسماعيل

الناظم العمومي للجمعية المركزية لأهل الحديث في باكستان الغربي،

مکتوب نمبر 75

(حضرت حافظ عبدالمنان وزیر آبادی رحمہ اللہ کی اولاد کے متعلق ایک وضاحتی مکتوب[2])

مکرم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

حضرت حافظ عبدالمنان صاحب کی اولاد کے متعلق آپ کی اطلاع اب بھی غلط ہے۔ حضرت مرحوم کی دو

---

① یہ کانفرنس ۲۰۔ ۲۱۔ ۲۲/ اکتوبر ۱۹۶۱ء کو لائل پور (فیصل آباد) میں منعقد ہو رہی تھی۔

② ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (یکم جولائی ۱۹۶۰ء) کے ادارتی کالم میں لکھا گیا کہ حافظ عبدالمنان وزیر آبادی رحمہ اللہ کی کوئی نرینہ اولاد نہ تھی۔ اس پر ملک ہدایت اللہ سوہدروی کی طرف سے ''الاعتصام'' (۸/ جولائی ۱۹۶۰ء) کے شمارے میں یہ تصحیح درج کی گئی کہ حضرت حافظ صاحب مرحوم کے چار لڑکے ① عبدالستار ② محمد حسین ③ عبدالرشید ④ عبدالباسط تھے۔ عبدالستار مولانا عبدالمجید سوہدری کے پھوپھا تھے اور حافظ صاحب کی زندگی ہی میں فوت ہو گئے تھے۔ سات آٹھ سال ہوئے کہ محمد حسین ←

بیویاں تھیں۔ پہلی بیوی مولوی عبداللہ چکڑالوی کی بہوتھی۔ ان سے حضرت کے پانچ لڑکے تھے: ① عبدالجبار ② عبدالستار ③ محمد حسین ④ عبدالرشید ⑤ عبدالباسط۔ لڑکیاں: عائشہ، زینب، مریم۔ یہ سب صاحبِ اولاد تھے۔ عبدالجبار اور عبدالستار، حضرت مرحوم کی زندگی میں انتقال کر گئے۔ عبدالجبار کی شادی مولانا عبدالقادر صاحب قصوری مرحوم کے خاندان میں مولانا اسماعیل صاحب دلاوری کے ہاں ہوئی۔ ان کے لڑکے عبداللطیف وکیل ہیں۔ کراچی میں پریکٹس کرتے ہیں۔ عبدالستار مرحوم کا لڑکا راولپنڈی میں دکان کرتا ہے۔

دوسری بیوی بمبانوالہ ضلع سیالکوٹ کے چوہدری محکم دین مرحوم کی ہمشیرہ تھیں۔ ان کے پہلے خاوند سے ایک لڑکا تھا، جن کا نام عبدالقادر، ایک لڑکی جن کا نام فاطمہ تھا۔ یہ دونوں حافظ صاحب کے ربیب تھے۔ مرحومہ فاطمہ مولوی عبدالمجید مرحوم کی والدہ تھیں۔ مولوی عبدالقادر، مولوی عبدالمجید صاحب کے سگے ماموں تھے۔ جموں میں ملازم تھے۔ ان کا وہیں انتقال ہوا۔

ملک ہدایت اللہ کی یہ اطلاع صحیح نہیں ہے کہ مولوی عبدالستار مولوی فاضل تھے۔ میں نے ان سے نسائی کا کچھ حصہ پڑھا تھا۔ یہ مرحوم کی پہلی اہلیہ سے۔ عبدالجبار، عبدالرشید وغیرہ کے بھائی تھے۔

محمد اسماعیل، گوجرانوالہ

............✿❀✿............
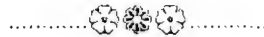
مکتوب نمبر 76

(شیخ الحدیث مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمہ اللہ کے نام علامہ سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ کا ایک مکتوب گرامی)

حضرت مولانا سید سلیمان صاحب ندوی رحمہ اللہ سے دیرینہ مراسم تھے اور دیر تک رہے۔ مرحوم گجرانوالہ، بدوملہی وغیرہ اہلِ حدیث جلسوں میں شامل ہوتے رہے۔

حضرت مغفور سے مکاتبت بھی رہی۔ افسوس کہ تمام خطوط تلاش کے باوجود نہیں مل سکے۔ ایک خط آج پرانے کاغذات سے دستیاب ہوا۔ اُسے دیرینہ مقدس یادگار کے طور پر ''الاعتصام'' میں اشاعت کے لیے بھیج رہا ہوں۔ ممکن ہے اگر حضرت کے مکاتیب کا کچھ مجموعہ شائع ہو تو یہ مکتوب بھی شاملِ اشاعت ہو جائے۔ تقسیم کے

← فوت ہوئے ہیں اور چار پانچ سال ہوئے کہ عبدالرشید اللہ کو پیارے ہوگئے ہیں۔ ان دونوں کی اولاد ہے۔ عبدالباسط زندہ ہیں اور پشاور میں مقیم اور صاحب اولاد ہیں۔

ملک ہدایت اللہ صاحب کے اس اطلاعی خط کے بعد مولانا سلفی رحمہ اللہ نے مدیر ''الاعتصام'' کو مذکورہ بالا مکتوب لکھا، جس میں حضرت حافظ صاحب وزیر آبادی کی اولاد کے متعلق درست تفصیل ذکر کی۔ یہ مکتوب ہفت روزہ ''الاعتصام'' (۱۵؍ جولائی ۱۹۶۰ء) میں شائع ہوا تھا۔

بعد ندوہ سے مراسم نہیں رہے۔

یہ مکتوب گرامی غالباً حضرت مولانا تھانوی رحمہ اللہ سے تعلق و ارادت سے پہلے کا ہے۔ فرعی مسائل میں تو حضرت کے ساتھ ارادت کے بعد مرحوم نے اپنی تحقیقات سے اجمالاً رجوع فرما لیا تھا۔ عقائد کے متعلق معلوم نہیں کیا صورت رہی؟ میرے تعلقات مرحوم سے نیاز مندانہ تھے، اس لیے دریافت کی ہمت نہ ہو سکی۔

یہ مختصر مکتوب علمی انداز کا ہے۔ ہمارے محترم رفیق اور دوست مولانا حافظ محمد صاحب گوندلوی نے عقائد کے متعلق ایک متن لکھا۔[1] میں نے یہ متن استصواب کے طور پر حضرت مرحوم کو بھیجا۔ مرحوم نے سرسری ملاحظہ کے بعد یہ مکتوب لکھا۔ حضرت مولانا تھانوی مرحوم کے تعلق کے بعد حضرت مولانا کا اندازِ فکر بدل گیا تھا۔ إن القلوب بين أصبعين من أصابع الرحمان يقلبها كيف يشاء.

علمی اور مرحوم کے ارادتمند حلقوں میں یہ مکتوب عریضۂ عزت کی نظر سے دیکھا جائے گا۔

محمد اسماعیل

خطیب جامع اہلِ حدیث، گجرانوالہ

دار المصنفین اعظم گڑھ

مکرمی! السلام علیکم

عنایت نامہ اور مسودہ دونوں پہنچے۔ مسودہ تو بڑے شوق سے پڑھا۔ رسالہ محنت سے لکھا گیا ہے اور شیخین ابن تیمیہ اور ابن قیم کی تحقیقات کو خوب سمجھ کر لکھا گیا ہے۔ کم از کم ایک مسئلہ میں تو مولانا شبلی کی اور دوسرے میں میری تکفیر کا جواب ہو گیا ہے۔ تسلسلِ آثار کے قائل مولانا شبلی ہیں اور انتہائے نار کے جرم کا ارتکاب مجھ سے ہوا۔

مجھے ۱۰ر نومبر تک فرصت نہیں، اس کے بعد اس کو غور سے پڑھ کر واپس کر دوں گا۔ ایک چیز اس رسالے میں کی کی ہے، یعنی یہ کہ اس میں متونِ مختصرہ کی تقلید کی گئی ہے، جیسے تہذیب، نسفی وغیرہ سے اس میں گنجلک پن پیدا ہو جاتا ہے۔

طالب کی درخواست ناظم صاحب کے پاس بھیجئے۔ پنجاب ندوہ ہو تو کیا۔

والسلام

سلیمان

۴ر رجب ۱۳۵۵ھ[2]

---
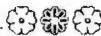
[1] اس سے مراد حضرت حافظ صاحب گوندلوی رحمہ اللہ (م ۱۹۸۵ء) کا رسالہ ''تحفۃ الاخوان'' ہے، جو عربی میں ہے اور گوجرانوالہ سے ان کے فرزند محترم مسعود اعظم کے اہتمام میں جنوری ۱۹۶۷ء کو شائع ہوا تھا۔

[2] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۱۴ر نومبر ۱۹۶۶ء)

مکتوب نمبر 77

[اہلِ حدیث اور مودودی]

ہم نے ایک بار مولانا محمد اسماعیل صاحب ناظم جمعیت اہلِ حدیث سے مودودی جماعت کے متعلق استفسار کیا تھا تو آپ نے حسبِ ذیل جواب دیا۔ (محمد خاں سیف مونگ)

میری ذاتی رائے یہ ہے کہ اہلِ حدیث ہو کر ہمیں مولانا ابو الاعلیٰ کی جماعت میں شامل ہونے کی ضرورت نہیں ہے، وہاں بھی کوئی نئی چیز نہیں، بلکہ دیوبندی اور اہلِ حدیث کے درمیان ایک برزخی حنفیت کی دعوت ہے، جس سے ہم لوگ بحمد اللہ بہت آگے ہیں۔ مولانا ابو الاعلیٰ کی تحریک ایک علمی اور لٹریری تحریک ہے، کوئی عملی تحریک نہیں۔ اس میں تعمیر کی بجائے تخریب زیادہ ہے۔ پروگرام اتنا لمبا ہے کہ شاید ایک صدی میں اس کا سواں حصہ پورا ہو سکے۔ طریقِ کار بے حد غلط ہے۔

والسلام

محمد اسماعیل، کان اللہ لہ

۱۸۔ ۱۱۔ ۵۱ء

مکتوب نمبر 78

(حکیم عبدالرحیم اشرف کے نام)[1]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

گجرانوالہ

۲۸؍ اکتوبر ۵۸ء

مکرم مولانا زاد فضلکم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاجِ گرامی۔ تعمیلِ ارشاد میں چند سطور لکھ رہا ہوں۔ بعض پریشانیوں کی وجہ سے کوئی مبسوط مضمون نہیں لکھ سکا۔ ''المنبر'' کی کامیابی کے لیے دعا ہے۔

مغلوں کی کئی سو سال حکومت اور انگریزوں کے دو سو سال کے تسلط سے ہندوستانی مسلمانوں کا مزاج عجیب سا ہوگیا ہے۔ مغل مسلمان تھے، لیکن بعض بادشاہ شیعیت سے متاثر تھے۔ ہندو رعایا کے ساتھ مدارات تو

[1] مولانا سلفی رحمہ اللہ نے یہ مضمون نما مکتوب حکیم عبدالرحیم اشرف کے زیرِ ادارت نکلنے والے جریدے ''المنبر'' کے لیے لکھا تھا، جس میں تحریکِ آزادی میں جماعت مجاہدین کی خدمات پر مختصراً روشنی ڈالی گئی۔ یہ خط ''المنبر'' (۹؍ فروری ۱۹۵۹ء) میں شائع ہوا تھا۔

بحیثیتِ مسلمان ان کا فرض تھا، جس سے ہندو ذہن کو ان سے متاثر ہونا چاہیے تھا، لیکن واقع یہ ہے کہ مغل بادشاہوں کی گھریلو اور خانگی زندگی پر بھی ہندو رسم و رواج غالب ہوگیا۔ عام رعایا کا ذہن بھی شیعہ اور ہندو رسوم و عادات کا خوگر ہو چکا تھا، بلکہ عوام میں صحیح اسلام کا احساس اور اس کی جستجو کے محرکات بھی ختم ہو چکے تھے۔ انگریز کی حکومت کے دو سو سال میں ان عیوب کی اصلاح تو کیا ہونا تھی، دینی تعلیم کو نظر انداز کر کے وہ دروازے بھی بند کر دیے گئے، جن سے اصلاح کی امید کی جا سکتی اور ملت اپنے تاریخی محاسن کو قائم رکھ سکتی تھی۔

شیخ محمد طاہر پٹنوی اور حضرت شیخ احمد مجدد سرہندی اور ان کے خلفا مرزا مظہر جان جاناں، قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے خاندان نے صحیح اسلام کی اشاعت اور غلط رسوم و عادات اور بدعات کو روکنے کی کوشش کی، جو اس وقت مذہب اور اسلامی زندگی کا جزو بن چکی تھیں۔ اس اصلاحی پروگرام نے بارھویں صدی کے اواخر میں ایک تحریک کی صورت اختیار کر لی۔ یہ تحریک برسوں سکھ حکومت سے برسرِ پیکار رہی اور سکھوں کے بعد انگریزوں سے اس کا مقابلہ رہا۔

سیاسی طور پر وہ نتائج برآمد نہ ہو سکے، جو بانیانِ تحریک کے پیشِ نظر تھے۔ غلط عقائد، فاسد رسوم و عادات اور بدعات کے خلاف اس تحریک نے خوب کام کیا۔ ایک مادی حکومت جس کے ہر قسم کے مادی سامان کے علاوہ ڈپلومیسی اور پروپیگنڈا کے تمام وسائل موجود تھے۔ اس تحریک کے بانیوں اور ان کے رفقا نے پوری ایک صدی تک انگریز کو پریشان رکھا۔ بالآخر انگریز کو یہ ملک خالی کرنا پڑا۔ ممکن ہے کہ انگریز کے اس تخلیہ کے کچھ اسباب یہ بھی ہوں، لیکن اس تحریک کے اثرات سے انکار ممکن نہیں، بلکہ اس کی اس جزدی کامیابی میں سب کے لیے سامانِ عبرت بھی ہے۔

تحریک کا مزاج:

اس تحریک کے بانی مخلص تھے۔ کتاب و سنت کے پورے پابند تھے۔ سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ لوگ شخصی طور پر نہایت نیک، اعمالِ صالحہ کے پورے پابند تھے اور معاملات میں نہایت دیانت دار تھے۔ یہی وجہ ہے کہ سکھوں ایسی اندھی اور لاقانونی اور انگریزوں ایسی متبد لیکن قانونی حکومت سے ان فقرا اور بے سروسامان لوگوں نے ڈیڑھ سو سال تک کے مقابلے میں بعض وجوہ میں جزدی اور بعض وجوہ سے پوری کامیابی حاصل کی۔ اس کا سبب اَفراد کی صلاحیت، اعمالِ صالحہ کا التزام اور خدمتِ دین کا مخلصانہ جذبہ تھا۔

کاروباری تحریکات:

اس عظیم دینی جدوجہد کے بعد قریباً پچاس سال سے یہ ملک مختلف تحریکات کا گہوارہ بھی رہا ہے اور مدفن

بھی۔ اکثر تحریکات کے مقاصد کی صحت میں بھی شبہہ نہیں اور ان کی دعوت اور دعایت (پروپیگنڈہ) وقتی تقاضوں کو پورا کرنے والا تھا اور ان میں قوتِ عمل بھی بڑی حد تک موجود تھی۔ لیکن اس سب کچھ کے باوجود یہ تحریکات کامیاب نہ ہوسکیں نہ چنداں مفید۔ اس کا سبب میری ناقص رائے میں یہ ہے کہ ان تحریکات کا عام انداز کاروباری رہا۔ ان کے علمبردار اپنے مقاصد کا بزنس کرتے رہے، جس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ عوام کے رجحانات کے ساتھ ہی بانیانِ تحریک کا فکر بدلتا جاتا رہا ہے، زبان بدلتی جاتی رہی، اندازِ تخاطب بدلتا رہا، حتی کہ معروف ومنکر کی حقیقت بھی تبدیل ہوتی رہی ہے۔

ان تحریکات کا اگر بے لاگ تجزیہ کیا جائے تو یہ بات مشاہدے میں آئے گی کہ اخلاص کے ساتھ انفرادی طور پر حسنِ عمل کا ان کے ہاں کوئی پروگرام ہی نہیں۔ اِنابت الی اللہ، عبادات کو ان کے ہاں کوئی خاص اہمیت نہیں دی جاتی رہی۔ افراد کی اصلاح، عامۃ الناس کی دینی تربیت، خانگی زندگی میں تدین، معاملات میں للّٰہیت؛ اگر یکسر ناپید نہیں رہی تو کم از کم یہ کہ اسے وہ درجہ حاصل نہیں رہا، جو دین میں ان باتوں کو حاصل رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ تحریکات اپنے شباب کے ساتھ بوڑھی ہونا شروع ہوجاتی رہی ہیں اور ہمارا مشاہدہ یہ ہے کہ دنیا کے عوام جب ان سے اپنی امیدیں وابستہ کرتے ہیں، یہ اپنے گوروکفن کی تیاری میں مصروف ہوجاتی ہیں۔

یہ تو تھی گذشتہ نصف صدی میں اُبھرنے والی تحریکات کی ناکامی اور اس کے سبب کا اجمالی تذکرہ، لیکن مقصود اس وقت یہ تھا کہ ''المنبر'' کے اِجرا کی تقریب میں وہ بات کہی جائے، جو ہماری آیندہ دینی کوششوں کی بنیاد ہونی چاہیے۔

میری رائے اس بارے میں یہ ہے کہ جو دینی جدوجہد یا رائج الفاظ میں ''اسلامی تحریک'' کی بنیاد واساس، افراد کی تیاری اور اصلاح پر ہے۔ اگر اس بنیاد پر کسی تحریک کا قصرِ تعمیر ہوتا ہے تو اسے کامیابی بھی نصیب ہوگی اور اس میں دین اور ملت کے لیے خیر وبرکت بھی ہوگی، اور اگر اسے نظر انداز کر کے حرکت اور جوش کا مظاہرہ ہوگا تو اس کا انجام وہی ہوگا، جو پچھلے پچاس برس میں پیدا ہونے والی تحریکات کا ہوا ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ اس بات کا لحاظ رکھنا بھی اسلامی جدوجہد کی اساس ہے کہ وہ کاروباری ذہن اس میں کارفرما نہ ہو، جس کا ذکر اوپر ہوا۔ اسلامی دعوت، اسلامی جدوجہد اور اسلامی تحریک کے داعی اگر اپنا ذہن عوامی رجحانات کے ساتھ ساتھ بدلتے رہیں، ان کا اندازِ تخاطب بھی گردوپیش کے حالات کے مطابق تبدیل ہوتا رہے اور اَفراد میں اِنابت الی اللہ اور عبادات کا شوق پیدا کرنے کے بجائے اجتماعیت پر سارا زور صَرف کیا جائے تو یہ خالص کاروبار ہوگا اور اس کا انجام بھی وہی سامنے آئے گا، جو گذشتہ نصف صدی میں اُبھرنے اور دفن ہونے والی تحریکات کا ہوا ہے۔

اسلام فرد کو اجتماع کی بنیاد قرار دیتا ہے اور اصلاحِ معاشرہ اجتماعی انقلاب کا واحد ذریعہ ہے۔ اس موضوع پر مختصر گزارشات پیشِ خدمت ہیں۔

قرآنِ عزیز نے معاشرے کی اصلاح کے لیے ایک اصل تو یہ قائم فرمایا ہے:

﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا﴾ [التحريم: ٦]

''اپنی اور اپنے اقربا کی تربیت اس طرح کرو کہ وہ جہنم کی آگ سے بچ جائے۔''

دوسرا اصل یہ طے فرمایا:

﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ [آل عمران: ١١٠]

''امتِ مسلمہ کی خیریت اور بقا اسی میں ہے کہ معروف کی دعوت دیں اور بحدِ امکان منکر سے روکنے کی کوشش کریں۔''

تیسرا اصل یہ بتایا:

﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾ [المائدة: ١٠٥]

''تم پہلے اپنی اصلاح کرو، دوسروں کی بے راہ روی تمھارا، کچھ نہیں بگاڑ سکے گی۔''

سید شہید کی بے سروساماں دینی جدوجہد کا برسوں مستبد اور مادی تحریکات سے کامیاب مقابلہ اور اصلاحی پروگرام کا علمائے سو اور غلط کار صوفیوں کی تیز و تند مخالفت کے باوجود حیرت انگیز کامیابی انھیں محاسن اور قرآنی اصولوں کی پابندی کی وجہ سے تھی۔ آج بھی جو مشکلات اہلِ حق کی راہ میں حائل ہیں، اس کا بھی حل یہی ہے کہ ان قرآنی اصولوں کی پابندی کی جائے۔

اللہ تعالیٰ کتاب وسنت اور عملِ صالح کی طرف راہنمائی فرمادے۔ وما ذلك على الله بعزيز.

مکتوب نمبر 79

(مولانا عبدالجلیل رحمانی صاحب کے نام)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ا۔۱۲۔۶۸ء

مولانا محترم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج گرامی! مکتوب گرامی مدت مدید کے بعد ملا۔ خیال تھا کہ جواب ذرا سوچ کر دوں گا۔ زیرِ غور ڈاک میں رکھا اور بھول گیا۔ رمضان میں ایسے بھی مشاغل کا اژدحام ہوتا ہے۔ جامعہ سلفیہ کے لیے مالی اعانت کا موسم ہوتا ہے۔ کئی دن کے بعد خیال آیا تو مکتوب ناپید تھا اور جناب کا عنوان نا معلوم۔ کئی دن کی تلاش کے بعد مکتوب گرامی ملا۔

کانفرنس کے نظام کی اصلاح کے متعلق آپ حضرات نے جو محنت فرمائی ہے، اس کا علم اسبوعی اخبارات سے بھی کچھ ہوتا رہا۔ کچھ رفقا کی نجی ڈاک سے بھی پتا چلتا رہا۔ اللہ تعالیٰ آپ حضرات کو اس محنت کا اجر عطا فرمائے۔ آپ نے جماعت کو ایک راہ پر لا کھڑا کیا ہے۔ اب مقاصد تک پہنچنا اربابِ ہمت کا کام ہے۔ آپ جناب کے ہاں امارت یا امامت کا جھنجٹ تو نہیں ہوگا۔

اگر ممکن ہو تو دار العلوم کا نصاب اور اپنے دستور کی ایک کاپی ارسال فرما دیں۔ ہم اپنے دستور پر مکرر غور کر رہے ہیں۔ ہو سکے تو جلدی ارسال فرمائیں۔

معلوم نہیں جناب کے ہاں الاعتصام جاتا ہے یا نہیں؟ اگر مناسب مواقع ہوں جہاں اخبار مفید ہو سکے تو مطلع فرمائیں۔ کوشش کر کے بھجوا دیا جائے۔

آپ حضرات کی زیارت کے لیے طبیعت بے تاب ہے۔ آرزو ہے کہ یہ طویل غیوبہ جزوی شہود سے ہم کنار ہو، مگر فنی رکاوٹیں اور کچھ پرانے معاصی اس راہ میں حائل ہیں۔ متعدد دفعہ پاسپورٹ کے لیے کوشش کی، کامیابی نہیں ہو سکی۔ اب پھر تعمیلِ ارشاد کرنے کا ارادہ کر لیا ہے، مگر کامیابی کی اُمید موہوم ہے۔ دونوں منطقوں میں کچھ اس قسم کی مشکلات ہیں کہ مہینوں دفتروں کا چکر کاٹنا پڑتا ہے، جس کے لیے فرصت ہے نہ ہمت۔

جاننے والے اہلِ توحید وسنت سے سلام عرض کریں۔ پرسوں مولانا عبدالسلام بستوی لاہور تشریف لائے۔ ایک دن قیام کے بعد واپس تشریف لے گئے۔ ملاقات بھی نہ ہو سکی۔ مولوی عطاء اللہ عجیب مست آدمی ہیں، کسی کو اطلاع تک نہ دی۔ مولانا ذبیح پر گذشتہ سال فالج کا حملہ ہوا تھا، مگر اب آرام ہے، مگر سفر کے قابل نہیں۔

والسلام

محمد اسماعیل

چاہ شاہاں، گوجرانوالہ

مکتوب نمبر 80

[مولانا عبدالستار دہلوی کی وفات (۲۳/ مارچ ۱۹۹۷ء) پر ان کے فرزند مولانا عبدالغفار کے نام
تعزیتی مکتوب]

محترم مولانا! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کے والد بزرگ وار مولانا عبدالستار مرحوم کے انتقال کی اطلاع اخبارات سے ملی۔ ان کے انتقال سے آپ پر جو علمی ذمے داریاں عائد ہوگئی ہیں، اللہ تعالیٰ آپ کو ان سے عہدہ برآ ہونے کی توفیق مرحمت فرمائے۔ مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور ان کی بشری لغزشوں کو معاف فرمائے۔ حالات روز بروز نئے سے نیا رنگ اختیار کر رہے ہیں، آپ جیسے نوجوانوں کا فرض ہے کہ انھیں سازگار بنانے کی کوشش کریں۔ میں خود تقریباً ڈیڑھ ماہ سے صاحبِ فراش ہوں۔ اب کچھ افاقہ ہے، لیکن طبیعت پوری طرح سے صاف نہیں۔

[محمد اسماعیل، گوجرانوالہ]

نظمِ جماعت کے متعلق

ہدایات واخبارات

جمعیت اہلِ حدیث مغربی پاکستان اور اس کے معاونین

جمعیت اہلِ حدیث مغربی پاکستان کی تاسیس ۱۹۴۸ء میں ہوئی اور اواخر مئی ۴۹ء میں مجھے اس کی نظامت سپرد کی گئی۔ جہاں تک جماعت کے پھیلاؤ کا تعلق ہے، اس کی تعداد بحمد اللہ لاکھوں سے متجاوز ہے، بلکہ پنجاب اور آزاد کشمیر کی حدود میں باڈر کے قریب اکثر اہلِ حدیث آباد ہیں۔ اتنی بڑی تعداد کسی تنظیم کے بغیر اب بھی بڑھ رہی ہے۔ مبلغین اور لٹریچر کی کمی کے باوجود اعتقاد اور عمل کی جاذبیت اس کی ترقی کا موجب ہو رہی ہے۔ نظامت کے سلسلے میں مجھے ایسے علاقوں سے گزرنے کا موقع ہوا، جہاں مجھے وہم بھی نہ تھا کہ کوئی توحید وسنت کا شیدا ہوگا، لیکن معمولی تلاش سے سیکڑوں آدمی ملے، جو نہ صرف خود سنت سے شغف رکھتے ہیں، بلکہ مشکلات میں گھرے ہونے کے باوجود اللہ کے بھروسے پر تنہا جماعت بنے ہوئے ہیں اور اپنی بساط کے مطابق اپنے گرد وپیش پر چھائے ہوئے ہیں۔

ہندوستان میں آغاز:

آغازِ تحریک میں اجتماعیت اور مرکزیت کا شعور بے حد پختہ اور مکمل تھا۔ سکھوں اور اس کے بعد انگریزوں کے لیے یہی مرکزیت پریشانی کا موجب رہی۔ بنگال اور بہار کی گرم اور تمازت انگیز میدانوں سے لے کر افغانستان کی برفانی پہاڑیوں تک اس مرکزیت کا غلغلہ تھا۔ بے نوا فقیر اسی مرکزیت کے سہارے پر ایک شہنشاہیت کے لیے لرزہ اور ارتعاش کا سبب بنے ہوئے تھے۔ ڈبلیو ہنٹر کی رپورٹ ان مساعی کے لیے ایک دشمن کی سچی اور ناگزیر شہادت ہے۔

انفرادی رجحانات:

انیسویں صدی کے آخری نصف میں تحریک کی سیاسی دوڑ دھوپ میں فتور پیدا ہوا اور ناگزیر وقتی تقاضوں کے سبب تحریک کا رُخ سیاسیات سے بالکل ہٹ گیا یا کم از کم اس کے ظاہری اعمال میں جہاد فی سبیل اللہ کی دعوت ختم ہوگئی اور اس کا رخ رسمی مناظرات اور حسبِ اصطلاحِ مناظرین جہاد بالقلم اور جہاد باللسان کی طرف بدل گیا، اور کچھ باہمی تنازعات نے اس بے توجہی میں مزید اضافہ کیا۔ یہیں سے جماعت میں انفرادی رجحانات بڑھنے شروع ہوئے اور مرکزیت کمزور ہونا شروع ہوئی، اور جماعت کے اچھے اچھے ہمدرد اور اہلِ علم

مرکزیت کے ساتھ اِلحاق سے گھبراتے ہیں اور عجیب عجیب قسم کے سوالات کرتے ہیں۔ بالمشافہہ گفتگو سے ایسے سوالات کا جواب اور شبہات کا ازالہ آسان تھا۔ مگر اس کے لیے فنڈ کہاں سے آتا؟ اس لیے میں نے قریباً ۵ ماہ سے اس طرف تحریری طور پر توجہ دلانا شروع کیا۔ اس وقت پاکستان کے منطقے میں مقامی جماعتوں کی تعداد سیکڑوں سے زائد ہے، مگر وہ مرکز کے ساتھ اِلحاق اور تعاون سے گھبراتے ہیں۔ کأنما یساقون إلی الموت!

کوئی صاحب دریافت فرماتے ہیں: مرکز ہمیں کیا دے گا؟ کوئی پوچھتا ہے: مرکز کیا لے گا؟ کوئی دریافت کرتا ہے: ہمارے اختیارات تو سلب نہیں کر لیے جائیں گے؟ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ذہن مرکزیت کی برکات سے بالکل خالی ہیں اور انفرادیت اور مقامی اختیارات بھوت کی طرح ذہنوں پر چھائے ہوئے ہیں۔

بعض حضرات ساری سچائیوں کا معیار روپیا سمجھتے ہیں۔ دریافت فرماتے ہیں کہ جمعیت مرکزیہ کے پاس فنڈ کتنا ہے؟ اور تعجب اس پر ہے ایسی اُلجھنیں علما پیدا کر رہے ہیں، جن کا ذہن اجتماعیت کے لیے کبھی بھی مکدر نہیں ہونا چاہیے۔

اس کے باوجود شکر ہے کہ جماعت کی اکثریت کا ذہن اس معاملے میں بالکل صاف ہے۔ وہ نظم اور اجتماعیت کی برکات سے پوری طرح آشنا ہیں۔ اس وقت خط و کتابت سے قریباً چالیس اہم اور کارکن جماعتیں الحاق کر چکی ہیں۔ تعداد بحمد اللہ روز بروز بڑھ رہی ہے۔

امسال دفتر کی مالی اعانت کے لیے اپیل کی گئی، جن احباب نے دفتر سے تعاون فرمایا ہے، ان کے اسمائے گرامی شکریے سے درج کیے جاتے ہیں اور جن احباب نے وعدے فرمائے ہیں، ان سے گزارش ہے کہ اپنی رقوم جلد از جلد ارسال فرما کر شکریہ کا موقع دیں، اور جو ابھی سوچ رہے ہیں، جلد از جلد فیصلہ کر کے جماعت کی اجتماعی قوت کو مضبوط کریں، تاکہ آیندہ تعمیری کام علی وجہ البصیرت شروع کیے جائیں:

① محترم شیخ عبدالمجید صاحب تاجر چرم، وزیر آباد — ۵۰۰/-
② محترم شیخ خدا بخش صاحب، گوجرانوالہ — ۱۰۰/-
③ محترم شیخ احمد دین صاحب تاجر ظروف، گوجرانوالہ — ۵۰/-
④ جمعیت اہلِ حدیث منڈی بورے والا — ۲۰/-
⑤ مولانا علی محمد صاحب صمصام — ۱۰/-
⑥ جمعیت اہلِ حدیث خانیوال — ۱۰۰/-
⑦ محترم حکیم عبداللطیف صاحب، ایبٹ آباد — ۲۰/-

⑧ محترم صوفی نذیر حسین صاحب (نائب صدر جمیعت اہلِ حدیث
مغربی پاکستان، گوجرانوالہ) ۱۰۰/-

⑨ جمیعت اہلِ حدیث، جہلم شہر ۵۰/-

یہ رقوم اکثر جمیعتوں کی طرف سے ہیں اور بعض شخصی طور پر عطا کی گئی ہیں۔ محترم شیخ عبدالمجید صاحب وزیر آبادی ان مخلصین سے ہیں، جو جماعت کے لیے بڑی سے بڑی قربانی فرما سکتے ہیں۔ ان کا وعدہ ہے، اگر جمیعت کوئی تعمیری کام شروع کرے تو وہ سفید چیک دینے کے لیے تیار ہیں۔ جزاه الله أحسن الجزاء، وبارك له في أهله وماله.

عزیزی مولوی محمد افضل صاحب منڈی بورے والا ہمیشہ سابقین سے رہے ہیں۔ ایسے مخلص نوجوان جماعت کے مستقبل کے لیے نیک فال ہیں۔ كثر الله أمثاله.

مولوی عطاء اللہ صاحب حنیف بھوجیانی، عزیزی مولانا معین الدین صاحب، جبی مولوی محی الدین صاحب لکھوی (ایم۔ ایل۔ اے)، مولوی داود صاحب ارشد، مولوی شمس الحق صاحب ملتانی، حافظ اسماعیل صاحب روپڑی، مولوی عبدالغنی صاحب سرگودھا، حافظ اسماعیل صاحب راولپنڈی، حافظ نصیر الدین صاحب راولپنڈی؛ وہ حضرات ہیں، جنھیں جماعت کے نظم اور ترقی سے ایک گونہ عشق ہے، لیکن جماعت کی مالی اصلاح کے لیے ان حضرات نے بہت کم توجہ فرمائی۔ اگر یہ حضرات اپنے اثر و رسوخ کو صحیح طور پر استعمال فرماتے تو آج دفتر کے پاس ہزاروں روپے کا فنڈ موجود ہوتا۔

حضرت صدر محترم مولانا غزنوی ۔زیدت برکاتھم۔ کا علم و تدبر ہمارے لیے بہترین تعاون ہے اور ان کی راہنمائی موجبِ فخر۔ اگر ان کے مشاغل کی فراوانی مجھے پیشِ نظر نہ ہوتو اس معاملے میں ان کی بے توجہی سب سے زیادہ قابلِ شکایت ہے۔ ان کی ہمہ گیر شخصیت کی ادنیٰ توجہ سے جمیعت کی مالی حالت جلد از جلد درست ہوسکتی ہے۔ یہ برادرانہ اور صحیح شکوہ ہے، ورنہ ان کا خلوص اور تدبر بہترین معاون رہا ہے۔[1]

---

① ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۴؍ جون ۱۹۵۱ء)

جمعیت اہلِ حدیث مغربی پاکستان کی خدمات
اور اس کے مالی استحکام کے سلسلے میں ضروری گزارشات

انقلاب ۱۹۴۷ء کے بعد ملک کی جو حالت تھی، وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ ۱۹۴۸ء کے آخر تک ملک میں خلفشار اور حالات کی ناہمواری کے باعث نہ کسی کو اطمینان حاصل تھا اور نہ طبیعتوں میں یکسوئی تھی۔ مہاجرین کے لیے آبادکاری کی کوئی معقول سکیم نہ تھی، اس لیے ملک میں عام انتشار، پراگندگی اور سراسیمگی پھیلی ہوئی تھی۔ غرض یکسر نامساعد حالات میں احباب کو جمع کیا گیا اور ۱۹۴۸ء ہی میں جمعیت اہلِ حدیث مغربی پاکستان کی بنیاد رکھ دی گئی۔

جمعیتوں کا قیام:

اگرچہ جمعیت کے پاس کوئی فنڈ نہ تھا، لیکن اللہ تعالیٰ کے بے پایاں فضل و کرم اور اس کی عنایات بے غایات کی برکت سے صوبے میں قریباً چالیس جمعیتیں قائم ہوچکی ہیں۔ صوبے کے اکثر مقامات پر جلسوں کے ذریعے تبلیغ و ارشاد کا سلسلہ قائم رکھا اور جمعیت کی شاخوں کے قیام کے لیے ترغیب دیتے رہے۔ آج بحمد اللہ مرکزی جمعیت اہلِ حدیث اس قابل ہے کہ یہ دعویٰ کر سکے کہ وہ ایک نمایندہ جماعت ہے۔ شاید اس سے قبل صوبے میں کبھی اتنی تعداد میں جماعتیں منظم طریق پر قائم نہ ہوئی ہوں۔ اس کے لیے میں ان تمام رفقائے کار کا، جنھوں نے اس بارے میں ہماری امداد فرمائی، شکر گزار ہوں۔ جزاهم الله أحسن الجزاء.

جمعیت کا اخبار:

جمعیتوں کے قیام کے ساتھ ہم نے ایک ایسے اخبار کے اِجرا کو ضروری خیال کیا، جو جماعت کے تبلیغی مقاصد کو پورا کر سکے۔ باوجود سرمائے کی قلت اور حالات کی نامساعدت کے ہم نے توکلاً علی اللہ ہفتہ وار اخبار ''الاعتصام'' کے نام سے جاری کر دیا، جو بحمد اللہ اپنی عمر کی تین منزلیں (۳ سال) طے کر چکا ہے اور اس کی قبولیت کے پیشِ نظر اکثر احباب کی خواہش ہے کہ ہم اسے سہ روزہ اخبار کر دیں۔

عربی مدارس کی تنظیم:

جمعیت نے اپنی سرگرمیوں کے باعث صوبے میں ایک ایسی جماعتی فضا پیدا کر دی ہے، جس میں جمعیت کی کوششیں عربی مدارس کی تنظیم کے سلسلے میں یہاں تک کامیاب ہوگئی ہیں کہ جماعت کے قائم قابلِ ذکر عربی دینی مدارس نے ایک نصابِ تعلیم قبول کرلیا ہے اور کوشش کر رہے ہیں کہ ہمارے تمام عربی دینی مدارس کا معیارِ تعلیم بلند ہو اور ایک نصابِ تعلیم ہو۔ ابھی اس بارے میں ہمیں اور بہت کچھ کرنا ہے۔

جمعیت اہلِ حدیث کی مالی حالت:

جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ جمعیت کی مالی حالت کبھی بھی اچھی نہیں ہوتی۔ جب جمعیت کی نظامت کا بار اس عاجز کے کندھوں پر ڈالا گیا، اس وقت جمعیت کا خزانہ بالکل خالی تھا، بلکہ مقروض تھی۔ مجھے اپنی اس کمزوری کا اعتراف ہے کہ میں چندہ فراہم کرنے کے فن سے ناآشنا ہوں۔ اس لیے کچھ اپنے اور کچھ اپنے دوستوں کی جیبوں کے سہارے دفتر کا ضروری خرچ پورا کرتا رہا۔ مالی حالت کی اصلاح کے لیے اگر کبھی دورے کا پروگرام بنا بھی تو کبھی بارشوں اور سیلاب کی وجہ سے رُک گیا اور کبھی کارکنوں کی ذاتی پریشانیوں اور مصروفیوں کی وجہ سے دورہ ملتوی کرنا پڑا۔

چوں کہ اب کام بہت بڑھ گیا ہے اور ہمارے پیشِ نظر مقاصد کی تکمیل کے لیے ضروری ہے کہ اس اپیل کے ذریعے تمام مخلص احباب، ہمدردانِ جماعت اور مخیّر اصحاب سے عرض کروں کہ یہ رمضان مبارک کا مہینا ہے، جس میں نفل صدقے کا ثواب فرض کے برابر اور فرض صدقے زکات کا ثواب ستر فرضوں کے برابر ہے۔[1] یہ وہ مبارک مہینا ہے، جس میں رسول اللہ ﷺ بہت زیادہ جود وسخا فرمایا کرتے۔[2]

غرض اس مبارک مہینے میں زکات، صدقات اور تبرعات کا ثواب بہت زیادہ ہے۔ اس لیے اپنے اس تبلیغی جماعتی ادارے کو بھولیں نہیں، بلکہ پیش پیش رکھیں۔

ملحقہ جماعتیں اپنے مقامی فنڈ سے مرکزی جمعیت کے لیے حسبِ استطاعت رقوم ارسال فرمائیں۔

جہاں جماعتیں بن گئی ہیں اور ابھی تک وہ ملحق نہیں ہوئی ہیں، وہ جلد سے جلد الحاق کا فیصلہ کریں، تاکہ رمضان مبارک کے بعد ہونے والی مجلس میں ان کو نمایندگی مل سکے۔

رقوم چندہ ذیل کے دونوں مقامات میں سے کسی ایک جگہ بھیجی جا سکتی ہیں:

---

① صحیح ابن خزیمۃ (۳/ ۱۹۱) اس کی سند میں علی بن زید بن جدعان ضعیف ہے۔

② صحیح البخاري، رقم الحدیث (٦)

(1) ناظم اعلیٰ جمعیت اہلِ حدیث مغربی پاکستان، گوجرانوالہ۔

(2) میاں عبدالمجید صاحب (خازن جمعیت اہلِ حدیث) بیرون یکی دروازہ، کوٹھی میاں عبدالعزیز صاحب بیرسٹر ایٹ لا، لاہور

نوٹ:

جمعیت کے حسابات میاں عبدالمجید صاحب خازن کے پاس موجود ہیں، جو صاحب چاہیں دیکھ سکتے ہیں۔

محمد اسماعیل

ناظم اعلیٰ جمعیت اہلِ حدیث، مغربی پاکستان، گوجرانوالہ[1]

---

(1) ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۲۰؍ جون ۱۹۵۲ء)

مرکزی جمعیت اہلِ حدیث کے ادارۂ مبلغین کا قیام

حضرات مبلغین اور ضلعی اور شہری جمعیتوں سے گزارش

۱۹۴۸ء میں جب مرکزی جمعیت اہلِ حدیث نے مغربی پاکستان میں کام شروع کیا تو تبلیغ کا شعبہ بھی اس کے ساتھ ہی شامل رہا اور اکثر جلسے جمعیت ہی کے زیرِ اہتمام منعقد ہوتے رہے۔ تواریخ دفتر کی طرف سے دی جاتی رہیں، تاہم بعض کوتاہیاں ہوتی رہیں اور ضرورت محسوس ہوتی رہی کہ شعبۂ تبلیغ کو زیادہ سے زیادہ منظم اور باقاعدہ بنایا جائے۔ عوام اور حضرات مبلغین دونوں کی خواہش تھی کہ کام زیادہ باقاعدگی سے ہو۔ اس کے متعلق ایک دو دفعہ مبلغ حضرات جمع ہوئے اور غیر رسمی گفتگو بھی ہوئی، لیکن اس راہ میں بعض مشکلات حائل تھیں، جن کا حل تلاش کرنا ضروری تھا، ورنہ خطرہ تھا کہ اس شعبے میں انتشار پیدا ہو جائے گا۔ بالآخر یہ ذمے داری مولانا عبدالمجید سوہدروی مرحوم نے اپنے ذمے لی، لیکن وہ بھی کثرتِ کار اور مسلسل علالت کی وجہ سے کوئی قطعی اور آخری فیصلہ نہ فرما سکے۔

پچھلے دنوں اسی مقصد کے لیے ایک اجتماع لائل پور میں ہوا، جس کی صدارت کے فرائض مولانا محی الدین صاحب لکھوی نے انجام دیے۔ اس میں مشہور مبلغین کے ساتھ مولانا محمد صدیق لائل پوری، حافظ محمد شریف سیالکوٹی، مولوی عبداللہ دال بازار گوجرانوالہ، مولوی محمد حسین شیخوپورہ، مولانا فضل حق دغیرہ اساطینِ تبلیغ موجود تھے۔ ان سب نے مرکزی جمعیت اہلِ حدیث کے امیر حضرت مولانا سید محمد داود غزنوی سے درخواست فرمائی کہ وہ دو ماہ کے اندر اندر شعبۂ تبلیغ کے نظام کی تشکیل فرمائیں۔ اس درخواست پر مولانا فضل الحق اور مولانا محی الدین لکھوی کے دستخط مرقوم تھے۔

اس درخواست کے بعد بھی بعض انتشار پسند حضرات نے انتشار پھیلانے کی کوشش کی اور بعض مقامات پر معمولی قسم کے اجتماع ہوئے، جن کی تفصیل معلوم نہیں ہو سکی، حالاں کہ دو ماہ کے اندر ان اجتماعات کے لیے کوئی وجہِ جواز نہ تھی۔

امیر مرکزی جمعیت حضرت مولانا سید محمد داود غزنوی نے علالت کے باوجود اس معاملے میں اصالتاً دل چسپی

لی اور اس شعبے کی تشکیل اور اس کے مبادی طے کرنے کا کام مولانا محی الدین لکھوی کے سپرد فرمایا۔ مولانا محی الدین صاحب نے ۳؍اگست ۱۹۶۳ء کو بروز ہفتہ منڈی پتوکی میں ایک نمایندہ اجتماع بلایا، جس میں مغربی پاکستان کے اہلِ علم کی خاصی حاضری تھی۔ ہر نقطہ نظر کے اہلِ علم نے دل کھول کر گفتگو کی۔

مولانا حافظ عبدالقادر روپڑی، مولانا صدیق صاحب سرگودھا اور مولانا حافظ اسماعیل ذبیح نے حصہ لیا۔ بالآخر اس اجتماع کے سربراہ اور امیر مولانا محی الدین صاحب قرار پائے۔ مبلغین کے لیے تربیتی کورس طے کرنے کا فیصلہ کیا گیا اور یہ اجتماع دعا کے ساتھ بخیر وخوبی ختم ہوا اور آیندہ کے لیے حافظ محمد ابراہیم کمیر پوری اس شعبے کے سیکرٹری مقرر ہوئے۔

اب شہری اور ضلعی جمعیتوں کا فرض ہے کہ جلسوں اور تقریروں کے لیے اس نظام سے رابطہ پیدا کریں۔ ضلعی اور شہری ورکروں کے اجتماعات بلا کر یا کانفرنسیں منعقد کر کے اس نظام کو مضبوط بنائی۔ شعبۂ تبلیغ کو زیادہ فعال بنائیں اور مرکزی نظام کو زیادہ سے زیادہ مضبوط اور اس کے ساتھ وابستگی کا اظہار کریں۔[1]

محمد اسماعیل

ناظم اعلیٰ مرکزی جمعیت اہلِ حدیث، مغربی پاکستان

شیش محل روڈ، لاہور

[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۲۳؍اگست ۱۹۶۳ء)

پس چہ باید کرد اے اربابِ فکر؟

مرکزی جمعیت اہلِ حدیث کا انحصار یومِ تاسیس سے جماعت کے مخلصین کی اعانت پر ہے۔ دو سال گزر رہے ہیں، جمعیت کا اجلاس نہیں ہوسکا۔ گذشتہ سال بڑی مشکل سے گزرا۔ اس سال اُمید تھی کہ کانفرنس کے موقع پر اس قدر اعانت ہو سکے گی، جس سے اخراجات کے متعلق اطمینان ہو جائے گا، مگر آپ کو معلوم ہے کہ کانفرنس روک دی گئی۔ اس سے جماعت کی مالی حالت کو جو صدمہ پہنچا، وہ ظاہر ہے۔

راولپنڈی، سیالکوٹ، گوجرانوالہ، شیخوپورہ وغیرہ اضلاع کی مخلصانہ مساعی سے چند ہزار روپیہ دفتر میں پہنچا ہے۔ یہ رقم تعلیمی مصارف کے لیے بھی کافی نہیں۔ تعمیر، تبلیغ، خرید کتب وغیرہ کے مصارف اس کے علاوہ ہیں۔ جامعہ کی شہرت اور نظم کی وجہ سے طلبہ کا اتنا ہجوم ہو رہا ہے کہ داخلہ قبل از وقت بند کرنا پڑا اور طلبہ کی تعداد گذشتہ سال سے بھی زیادہ ہوگئی۔

کانفرنس روک دی گئی، لیکن مصارف کی ذمے داری بدستور آپ حضرات پر ہے۔ آپ ہی کے کندھوں نے یہ بوجھ برداشت کرنا ہے۔ اساتذہ اور طلبہ کے مصارف کی ذمے داری آپ ہی کی دوشِ ہمت پر ہے۔ آپ حضرات نے اس سال اپنے مصارف کے لیے ایک لاکھ پچیس ہزار روپے کا فیصلہ کیا تھا۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ شہری اور ضلعی جماعتوں کے اراکین اپنی ذمے داریوں کو محسوس فرمائیں اور ہر مقام کے اصحابِ خیر اس رقم کی فراہمی کے لیے کوشش کریں اور دفتر کو اطلاع دیں، وہ باقی ستر پچھتر ہزار روپے کی فراہمی میں کتنا حصہ لے سکیں گے؟

احبابِ سیالکوٹ نے اپنے حصے سے زائد رقم ادا کر دی تھی۔ اس کے باوجود محترم شیخ عمر دین صاحب سوداگر چرم سفرِ حج کے لیے جاتے ہوئے مزید ایک ہزار روپیہ عنایت فرما گئے۔ اسی طرح ۱۵/ ۵/ ۱۹۶۰ء ہفتہ کے دن ایک ذاتی کام سے خانیوال گیا، وہاں کی جماعت نے مبلغ پانچ صد روپیہ مرحمت فرمایا۔ جزاهم الله أحسن الجزاء۔

ضلع گجرات، ہری پور، لاہور، میانوالی، منٹگمری، مظفر گڑھ، ملتان وغیرہ اضلاع کے احباب اگر کوشش کریں اور جماعتی ذمے داری کو محسوس کریں تو یہ رقم ہفتہ عشرہ میں جمع ہوسکتی ہے۔

''الاعتصام'' ملک کے مقتدر پرچوں میں ہے، لیکن ابھی تک اس کی مالی حالت قابلِ اطمینان نہیں۔ آپ کا فرض ہے کہ ''الاعتصام'' کی اشاعت میں زیادہ سے زیادہ کوشش کریں، تاکہ اخبار اپنا بوجھ برداشت کر سکے۔ جماعتی نقل و حرکت سے باخبر رہنے کے لیے ''الاعتصام'' صحیح ترین ذریعہ ہے۔ تبلیغی اور علمی مواد بھی اس میں بہتر طریق پر مل سکتا ہے۔[1]

محمد اسماعیل

ناظمِ اعلیٰ مرکزی جمعیت اہلِ حدیث، مغربی پاکستان

---

[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۲۷ مئی ۱۹۶۰ء)

جمعیت اہلِ حدیث مغربی پاکستان کی طرف سے

ضروری اعلان

برادرانِ کرام! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

جمعیت اہلِ حدیث مغربی پاکستان کی بنیاد ۱۹۴۸ء میں رکھی گئی۔ جمعیت کے اعمالِ خیر سے اخبار ''الاعتصام'' ہے، جو جماعت کی صحیح آواز ہے۔ احباب کی توجہ زیادہ تر اخبار ''الاعتصام'' کی طرف رہی اور اس کی بہت ضرورت بھی ہے، باوجود اس کے کہ جمعیت کی اپنی مالی حالت ابتدا ہی سے تسلی بخش نہیں رہی، مگر ہم نے آپ کو اس ضمن میں کبھی تکلیف نہیں دی۔

اس وقت قریباً ضلعی اور ابتدائی جماعتیں جو مرکز کے ساتھ ملحق ہیں، ان کی تعداد چالیس ہے اور بتدریج یہ سلسلہ بحمداللہ وسیع ہو رہا ہے۔ اگر آپ حضرات کما حقہ تعاون کریں تو کام بہت زیادہ ہو سکتا ہے۔ لیکن جمعیت کی مالی کمزوری بہت بڑا مانع ہے، جس کو دور کرنے کی آپ سے پُرزور درخواست ہے۔ حال ہی میں ایک دوست نے اس کے لیے سو روپیا عنایت فرمایا ہے۔ ایک صاحب نے تین صد روپے دینے کا وعدہ کیا ہے۔ آپ تمام حضرات اپنے صدقات سے یا مقامی جمعیت کے خزانے سے مرکزی جمعیت کی اعانت فرمائیں۔ رمضان المبارک اس کے لیے بہترین موقع ہے۔

اس کے علاوہ جمعیت کی شاخوں کو دیہات تک پھیلائیں، تاکہ پورے ملک میں جماعتی نظام قائم ہو جائے اور پروگرام کے تحت کوئی بہتر کام کیا جا سکے۔ اگر مرکزی فنڈ کمزور رہا تو آپ یقین فرمائیں، آپ کی جماعتی آبرو اور اجتماعی زندگی ناتمام ہوگی، گو آپ مقامی طور پر بہت کچھ کر رہے ہوں۔ مگر «يدالله على الجماعة»[1]

مَیں اُمید رکھتا ہوں کہ میری یہ آواز رائیگاں نہیں جائے گی۔

والسلام: محمد اسماعیل (ناظم اعلیٰ جمعیت اہلِ حدیث، مغربی پاکستان، گوجرانوالہ)[2]

---

[1] سنن النسائي، رقم الحديث (٤٠٢٠)

[2] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۶؍ جون ۱۹۵۲ء)

بنیادی حقوق کی کمیٹی کے متعلق

جمعیت اہلِ حدیث پاکستان کی قرار داد

جمعیت اہلِ حدیث پاکستان، بنیادی حقوق کی کمیٹی اور بنیادی اصول کی کمیٹی کی ان رپورٹوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے، جو اخبارات میں شائع ہوچکی ہیں، اپنی اس رائے کا اظہار کرتی ہے کہ ان کمیٹیوں نے پاکستان کے دستور کی ترتیب کے لیے جو سفارشات کی ہیں، وہ ان وعدوں، اعلانوں اور فیصلوں پر پوری نہیں اُترتیں، جو اس وقت تک قومی راہنماؤں اور حکومتِ پاکستان کے وزرا اور ترجمانوں کی طرف سے وقتاً فوقتاً ملک وملت کے ساتھ کیے گئے ہیں۔ علی الخصوص ان میں اس قرار داد مقاصد کو بڑی حد تک بالائے طاق رکھا گیا ہے، جو دستور ساز اسمبلی نے ۱۲/ مارچ ۱۹۴۹ء کو منظور کی تھی، مثلاً:

1. بنیادی اصولوں کی کمیٹی نے اس امر کی کوئی صراحت نہیں کی کہ ریاستِ پاکستان ایک اسلامی ریاست ہوگی۔
2. قرار دادِ مقاصد کو پاکستان کے آیندہ دستور میں اساسی حیثیت دینے کی سفارش نہیں کی گئی ہے، بلکہ صرف یہ کہا گیا ہے کہ ریاست کی بنیادی پالیسی کے لیے قرار دادِ مقاصد مرکزی اور صوبائی حکومتوں کی راہنمائی کرے گی، بشرطیکہ وہ دستور کے متعین کردہ بنیادی حقوق کے لیے مضرت رساں نہ ہو۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ کمیٹی کے نزدیک اسلام کے اصول اور پاکستان کے بنیادی حقوق دو جداگانہ چیزیں ہیں اور دونوں میں تصادم کی صورت میں قرار دادِ مقاصد کو نظر انداز کیا جائے گا اور قرار دادِ مقاصد کے تقاضے مضر بھی ہوسکتے ہیں۔
3. کمیٹی کی سفارشوں میں اس امر کا کوئی نشان نہیں ملتا کہ پاکستان کی ریاست کے دستور اور قانون کے لیے کتاب وسنت معیارِ رد وقبول ہوں گے۔
4. کمیٹی نے صدر ریاست، مرکزی وزرا، صوبائی گورنروں اور صوبائی وزرا اور مرکزی اور صوبائی مجالس کے ارکان کو وہ حقوق اور اختیارات دیے ہیں، جو مساوات، حریت، عدل، جمہوریت کے خلاف اور اسلامی روح کے منافی ہے اور مرکزی حکومت کو جو غیر معمولی اختیارات دیے گئے ہیں، ان سے ریاست پاکستان کے فسطائی بن جانے اور صوبائی خود مختاری کے ختم ہوجانے کا قطعی امکان ہے۔
5. ایک طرف اربابِ اختیار وحکومت کو اتنے وسیع اختیارات اور حقوق دیے ہیں، جس کی مثال اسلامی حکومت

تو درکنار کسی غیر اسلامی جمہوری حکومت میں بھی نہیں ملتی اور دوسری طرف عام شہریوں کے حقوق کو نہایت بُری طرح سلب کرنے کی کوشش کی گئی ہے، جسے اسلامی آئین میں کسی وقت میں بھی گوارا نہیں کیا جا سکتا، لہٰذا جمعیت اہلِ حدیث پاکستان حکومتِ پاکستان کو آگاہ کرتی ہے کہ پاکستانی عوام کسی ایسے دستور کو قبول نہیں کریں گے، جسے علمائے اسلام اور ماہرینِ قانونِ اسلامی کی مکمل تائید وتصدیق حاصل نہ ہو۔

6 اسلامی تعلیمات میں شوریٰ کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اراکینِ حکومت کو یہ اجازت نہیں دی گئی کہ وہ شوریٰ کی روح کو نظر انداز کریں، لیکن موجود سفارشات میں شوریٰ کی اہمیت کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

7 نیز دستور میں اس امر کی وضاحت ہونا چاہیے کہ ملاحدہ ومرتدین کے شہری حقوق کی نوعیت کیا ہوگی؟ کیا انھیں تبلیغ واشاعت کی اجازت ہوگی اور انھیں موقع دیا جائے گا کہ اسلامی معاشرے میں بے دینی پھیلاتے رہیں یا ان کی تبلیغی سرگرمیوں پر پابندیاں عائد کی جائیں گی؟

محمد اسماعیل
ناظمِ اعلیٰ جمعیت اہلِ حدیث، پاکستان[1]

[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (جلد: ۲، شمارہ: ۵)

پنجاب کے انتخابات کے متعلق

مرکزی جمعیت اہلِ حدیث کی اہم قرارِ داد

جمعیت اہلِ حدیث مغربی پاکستان کا ایک اہم اجلاس مورخہ ۲۸ رجنوری ۵۱ء کو گوجرانوالہ میں منعقد ہوا اور پیش آیند انتخابات کے سلسلے میں مندرجہ ذیل تصریحات پر مشتمل قرارداد پاس ہوئی۔ اُمید ہے کہ تمام اہلِ حدیث عموماً اور ملحقہ جمعیتیں خصوصاً اس کی روشنی میں اپنے اقدام کا فیصلہ کریں گی اور اپنے حلقہ ہائے اثر میں ان کی تبلیغ و اشاعت کے سلسلے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھیں گی:

1. جمعیت اہلِ حدیث کسی خاص سیاسی دھڑے کی موافقت یا مخالف کی حامی نہیں ہے، اس کے سامنے صرف یہ اصول ہے کہ ہمارا نمایندہ ایسا شخص ہونا چاہیے، جو دستوری و آئینی سوجھ بوجھ کے ساتھ ساتھ نیک اور صالح بھی ہو۔
2. جمعیت موجودہ سیاسی قیادت کو قطعی نااہل سمجھتی ہے اور یہ رائے رکھتی ہے کہ اس کے سوچنے کا جو انداز ہے، اس سے ملک میں دینی نظام کے قیام اور قرار دادِ مقاصد کی تکمیل کی کوئی توقع نہیں کی جا سکتی۔
3. جمعیت دستوری سفارشات کو اسلامی مقاصد کے قطعی منافی سمجھتی ہے اور ان کے مرتبین کی صلاحیتوں سے قطعی اُمید نہیں رکھتی کہ وہ کسی بہتر دینی دستور کی ترتیب میں کامیاب ہوسکیں گے، إلا أن یشاء اللہ، اس لیے جمعیت کی یہ قدرتی خواہش ہے کہ اس قیادت کو آئینی و دستوری طریقوں سے بدلنا چاہیے۔
4. جمعیت کی نظر میں دیانت داری و سیرت و عمل کی پاکیزگی بے حد ضروری ہے۔ اس لیے اس کی قطعی رائے ہے کہ برائے نام اہلِ حدیث نمایندے کے مقابلے میں، جس کی عملی زندگی تسلی بخش نہ ہو، اس غیر اہلِ حدیث نمایندے کو ترجیح دی جائے گی، جو صالح اور متدین ہو۔
5. جو لوگ بلیک مارکیٹ اور لوٹ مار وغیرہ ایسی بے اعتدالیوں کے مرتکب ہو چکے ہیں، ان کا تعلق چاہے کسی پارٹی سے ہو، جمعیت انھیں اپنے تعاون کا بہر حال مستحق نہیں سمجھتی۔

محمد اسماعیل

ناظمِ اعلیٰ جمعیت اہلِ حدیث، مغربی پاکستان[1]

[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۱۲ رفروری ۱۹۵۱ء)

دفتر کی باتیں

مارچ کے وسط میں ہم چند رفقا ضلع ملتان اور منٹگمری کے مقامات میں حاضر ہوئے، وہاڑی، بورہ منڈی، پاکپتن، خانے وال، میاں چنوں، اوکاڑہ، منڈی پتوکی، ملتان، لائل پور، جڑانوالہ، منصور پور وغیرہ مقامات میں احباب سے ملنے کا موقع ملا۔

تقریباً تمام حضرات کو نظم اور باہمی ربط کے لیے بے قرار پایا۔ اکثر مقامات کی جماعتیں مرکز سے ملحق ہوگئیں اور اکثر مقامات پر احباب نے کام کرنے کا ذمہ لیا اور دفتر کے ساتھ مکمل تعاون کا وعدہ کیا۔

بعض مقامات سے اطلاع پہنچی ہے کہ احباب کام کر رہے ہیں، مگر بعض مقامات پر اس قدر غیر ذمے داری سے کام لیا جا رہا ہے کہ ڈاک کا جواب تک نہیں مل رہا اور یہ وہی لوگ ہیں، جو بہت باتیں کرتے اور تنظیم کے لیے بہت زیادہ بے قرار معلوم ہوتے تھے۔

یہ غیر ذمے داری نہایت افسوس ناک ہے۔ خانے وال میں خاں عبدالعظیم صاحب پرانے تجربہ کار ہیں، ان کے رفقا مولوی عبدالقادر صاحب اور حکیم محمد جمال صاحب مخلص کام کرنے والے ہیں، مگر افسوس ہے کہ اب تک دفتر چشم براہ ہے، ان حضرات کے کام کے متعلق کوئی اطلاع نہیں دی۔ دوسرے مقامات میں بھی بعض احباب کی روش قابلِ شکایت ہے۔ تمام احباب اپنے اپنے حلقے میں اجتماعات کریں، جماعتوں کو منظم کریں، دفتر ہر قسم کی اعانت کے لیے تیار ہے۔

والسلام

ناظمِ اعلیٰ جمعیت اہلِ حدیث آل پاکستان

اعلان متعلقہ اجتماعات

من جانب دفتر جمعیت اہلِ حدیث مغربی پاکستان، گوجرانوالہ

① جلسوں پر بلا ضرورت مصارف نہ کیے جائیں، بلکہ ایک علاقے کے احباب مل کر کسی مناسب موقع پر جلسہ رکھ دیں۔ اگر قریبی مقامات پر متعدد جگہ جلسہ کرنا ضروری ہو تو ایک ایک دن کے لیے مختلف مقامات میں جلسہ رکھ لیا جائے۔

② جلسوں کے حسابات پوری دیانت داری سے مرتب ہونے چاہییں۔ تبلیغی جلسوں کو کاروبار کی صورت قطعاً نہ دی جائے۔

③ اپنے علاقے کی ضروریات کے لحاظ سے بعض مضامین کی طرف خاص توجہ رکھنا ضروری ہے۔ مقامی منتظم اس کی اطلاع دفتر کو دیں، تاکہ یہ مضامین مناسب مقررین کے سپرد کیے جائیں۔

④ جلسوں کی تواریخ میں تصادم کی وجہ سے علما، منتظمین اور سامعین کو دقت ہوتی ہے۔ طبائع پر اس کا اثر اچھا نہیں ہوتا۔ اس لیے مندرجہ اجتماعات کا اعلان دفتر کی طرف سے کیا جاتا ہے:

- جمعیت اہلِ حدیث میاں چنوں: ۷، ۸، ۹ر مارچ ۱۹۵۲ء
- جمعیت اہلِ حدیث خانیوال: ۲۱، ۲۲، ۲۳ر مارچ ۱۹۵۲ء

مشتہرہ تواریخ کا فیصلہ، ناظم اعلیٰ جمعیت نے متعلقہ جمعیتوں کے منتظمین کے مشورے کے بعد کیا۔ آیندہ جو صاحب کوئی اجتماع مقرر کرنا چاہیں، دفتر کی طرف رجوع کریں، ورنہ بدنظمی کی ذمے داری ان پر ہوگی۔

⑤ بہتر ہوگا کہ اپنے علاقے کے قریبی علما کو دعوت دی جائے اور انھیں بولنے کا زیادہ سے زیادہ موقع دیا جائے اور آمد و رفت کے مصارف سے بچنے کی کوشش کی جائے۔

⑥ کھانے اور دوسرے اہتمامات میں زیادہ تکلف سے پرہیز کی جائے۔

محمد اسماعیل

ناظم اعلیٰ جمعیت اہلِ حدیث مغربی پاکستان[1]

---

① ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۲۲ر فروری ۱۹۵۲ء)

اہلِ حدیث پریس کے متعلق اہم تجویز!

''الاعتصام'' مورخہ ۲۲ر جمادی الاولی ۷۰ھ میں برادرم محترم مولانا صدیق حسن صاحب نے ایک اہم تجویز جماعت کے سامنے رکھی ہے، جس کا ملخص یہ ہے کہ جماعت کا اپنا ایک پریس ہونا چاہیے، جس کا انتظام ایک کمیٹی کرے۔ تجویز کے مفید ہونے میں کوئی شبہہ نہیں نہ ہی اس کے لیے کسی استدلال اور بحث کی ضرورت ہے۔

جماعت کی مطبوعات روز بروز ناپید ہو رہی ہیں۔ تراجم احادیث، متونِ احادیث، شروح اور دوسرے علومِ متعلقہ، اسی طرح قرآنِ عزیز اور اس کے متعلقات کی اشاعت جماعت کے اہم فرائض ہیں۔

مولانا نے اس کے لیے تین ہزار روپے کا اندازہ فرمایا ہے۔ میں ذاتی طور پر طباعت کے کام سے واقف نہیں ہوں، خیال ہے کہ تین ہزار روپے بہت کم ہوگا۔

مولانا اگر پریس اور اس کی ضروریات سے واقف ہوں تو اپنی تجویز تفصیلاً لکھ کر بھیج دیں، تاکہ دوسرے اصحابِ فکر بھی اس پر اظہارِ رائے کر سکیں۔

نیز محترم شیخ محمد اشرف صاحب، میاں عبدالمجید صاحب، مولانا محمد اسحاق صاحب حنیف اس مسئلے پر غور فرما کر اپنی متفقہ رائے سے مطلع فرمائیں۔

جمعیت اہلِ حدیث ملتان کا اجلاس ۲۹، ۳۰ر مارچ اور یکم اپریل کو منعقد ہو رہا ہے۔ شیخ عبدالرشید صاحب صدیقی سے گزارش ہے کہ مجلسِ شوریٰ کے لیے مناسب اور کھلا وقت رکھا جائے، تاکہ اس مسئلے اور دوسرے جماعتی مسائل پر گفتگو ہو سکے۔

میرا تجربہ:

اخبار کے لیے ہم مدتوں سوچتے رہے، مگر کوئی تجویز کارگر نہ ہو سکی۔ جماعت اہلِ حدیث گوجرانوالہ مبارک باد کی مستحق ہے کہ اس کے ایثار نے ''الاعتصام'' کی صورت اختیار کر لی، جو اس وقت اربابِ ثروت کی بے توجہی کے باوجود چل رہا ہے اور بحمد اللہ بڑھ رہا ہے۔

اس معاملے میں بھی اندازِ جرأت کی ضرورت ہے۔ حاتمِ ہند مرحوم حافظ حمید اللہ صاحب دہلوی نے مبلغ

پچیس ہزار روپے عنایت فرما کر ہندوستان میں اہلِ حدیث برقی پریس کی بنیاد رکھ دی۔ اللهم برد مضجعه واجعل جنة الفردوس مأواه.

مجھے امید ہے کہ احبابِ ملتان اور اصحابِ لاہور اس تجویز پر ہمدردانہ غور فرمائیں گے۔ حضرت محترم حضرت علامہ غزنوی ۔دامت برکاتھم۔ اگر کسی مختصر سی فرصت میں اس طرف توجہ فرمائیں تو بہتر ہوگا۔

مولانا عبیداللہ صاحب بی اے فیروز پوری کی تجویز بھی اگر مرتب شکل میں آجائے تو شیخ عبدالرشید صاحب صدیقی یا مجھ سے گوجرانوالہ کے پتے پر بھیجیں، تاکہ شوریٰ میں پیش ہو سکے۔

محمد اسماعیل

ناظمِ اعلیٰ جمعیت اہلِ حدیث، مغربی پاکستان [1]

---

[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۲۹ر جمادی الاولیٰ ۱۳۷۰ھ)

مولانا محمد یحییٰ حافظ آبادی کی زبان بندی

اخبارات سے یہ معلوم کر کے مجھے تعجب ہوا کہ حکومت نے مرکزی جمعیت اہلِ حدیث کے رکن مولانا محمد یحییٰ حافظ آبادی کی تین ماہ کے لیے زبان بندی کر دی ہے۔ مجھے بعض ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ یہ زبان بندی ساہو والہ ضلع سیالکوٹ کی ایک تقریر کی بنا پر عمل میں لائی گئی ہے، جو انھوں نے حوادثِ محرم اور شیعانِ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے متعلق کی۔

مولانا محمد یحییٰ اور ان کے اندازِ بیان سے اکثر لوگ واقف ہیں۔ وہ ان تیز بولنے والوں سے نہیں ہیں، جن کو اپنی زبان پر قابو نہ ہو۔ میری قطعی رائے ہے کہ یا تو رپورٹر متعصب شیعہ ہے یا کم علم جو تقریر کو صحیح طور پر سمجھ نہیں سکا۔

اگر میری یہ اطلاع صحیح ہے کہ مولانا کی زبان بندی ساہو والہ کی تقریر کی بنا پر ہوئی ہے تو اس کے مقابلے میں شیعہ حضرات کی ان بے اعتدالیوں پر غور فرمایا جائے جو تعزیہ اور گھوڑے کے متعلق ہر ہر جگہ ہو رہی ہیں۔ ضلع گوجرانوالہ کے ڈپٹی کمشنر صاحب غالباً شیعہ ہیں، جس کا اثر یہ ہے کہ اس سال چالیسویں پر بھی تعزیہ نکالا گیا اور جلوس میں اہلِ سنت کے جذبات کو مجروح کیا گیا۔ اربابِ انتظام کو اس طرف بھی توجہ مبذول کرنا چاہیے اور حقائق کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرنا چاہیے۔[1]

[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۱۲/ نومبر ۱۹۵۴ء)

مرکزی جمعیت اہلِ حدیث کے قواعد میں ترمیم و اضافہ

عہدہ داروں کے فرائض کی تقسیم

مرکزی جمعیت اہلِ حدیث کے کام کی وسعت اور نظامِ جماعت کو بہتر طریق پر چلانے کے پیشِ نظر صدر مرکزی جمعیت اہلِ حدیث نے مجلس کے گذشتہ اجلاس ۱۵ر جنوری میں یہ فرمایا:

① اخبار ''الاعتصام'' اور ادارہ ''اشاعۃ السنۃ'' کے کام کی نگرانی اور اس کے جملہ انتظامات کو بہتر طریق پر سر انجام دینے کے لیے ایک اور سیکرٹری کی ضرورت شدت سے محسوس کر رہا ہوں، اس لیے مرکزی جمعیت کے عہدہ داروں میں ایک اور عہدہ ''ناظمِ نشر و اشاعت'' کا اضافہ ہونا چاہیے۔

② مرکزی جمعیت اہلِ حدیث کے کام کے پھیلاؤ اور نظامِ جماعت کے مزید استحکام کے لیے معین ناظم کی شدید ضرورت محسوس کر رہا ہوں۔ اس کے لیے میں نے مولانا معین الدین لکھوی اور مولانا عبدالخالق جامعی کی خدمات حاصل کرنے کی کوشش کی، مگر ان ہر دو حضرات نے اپنی مقامی مصروفیتوں کی بنا پر لاہور کی اقامت سے معذوری ظاہر کی۔ مولانا ابو حفص عثمانی سے بھی میں نے عرض کیا تھا، مگر انھوں نے بھی معذوری ظاہر کی تھی۔ اب میں پھر ان سے استدعا کرتا ہوں کہ وہ جماعت کی خدمت کو ذاتی آرام پر ترجیح دیتے ہوئے اس عہدے کو قبول فرمائیں۔

③ موجودہ قواعد کے رو سے مجلسِ عاملہ ہی کے اختیار میں ہے کہ وہ ملازمین کا تقرر، تعطل، تنزل، برطرفی کرے۔ اس دفعہ کو مشکلات کے تجربے کی بنا پر مجلسِ عاملہ کے اختیارات میں سے حذف کرنا اور سیکرٹریز کے اختیارات میں شامل کرنا ضروری ہے۔

اراکین مجلسِ عاملہ نے صدرِ محترم کے ارشادات کی روشنی میں فیصلہ کیا:

1. سیکرٹریز کی تعداد میں ایک سیکرٹری کا اضافہ کیا جائے۔ اس کا نام ''ناظمِ نشر و اشاعت'' ہوگا۔ اخبار ''الاعتصام'' اور ادارہ ''اشاعۃ السنۃ'' و دیگر نشریاتِ جماعت ''ناظمِ نشر و اشاعت'' سے متعلق ہوں گی۔ اس عہدہ کے لیے حاجی محمد اسحاق صاحب حنیف کا اسم گرامی پیش کیا گیا۔ حاجی صاحب موصوف نے جماعت

کے فیصلے کو بخوشی قبول فرمایا۔ جزاه الله أحسن الجزاء.

2 تمام ناظم حضرات اپنے اپنے شعبوں کے ذمے دار افسر اعلیٰ ہوں گے اور اپنے اپنے شعبوں کے ملازمین کے تقرر، تعطل اور معزول کے مجاز ہوں گے۔

3 مالی معاملات میں مجلسِ عاملہ کے منظور کردہ بجٹ اور عام معاملات میں مجلسِ عاملہ کی طے کردہ پالیسی کے پابند ہوں گے اور اپنے شعبوں سے متعلقہ معاملات میں صدر مرکزی جمعیت اہلِ حدیث کے سامنے جواب دہ ہوں گے، اس کے علاوہ انتظامی نقطہ نگاہ سے صدرِ محترم نے یہ فیصلہ کیا کہ تینوں ناظم (ناظمِ اعلیٰ، ناظمِ مالیات، ناظمِ نشر واشاعت) اور خود صدر جمعیت مرکزیہ کی ایک مجلس ہوگی، جس میں مجلسِ عاملہ کے دو اجلاسوں کے درمیانی عرصے میں پیش آنے والے اہم معاملات کے متعلق یہ مجلس فیصلہ کیا کرے گی۔

معزز اراکین سے استدعا:

تمام معزز اراکین واعوان وانصارِ جماعت سے استدعا ہے کہ مرکزی دفتر کے انتظامات کو احسن طریق پر چلانے کے سلسلے میں آپ اس قدر تو ضرور امداد فرمائیں کہ خط وکتابت اور استفسار کے وقت مختلف شعبہ جات کے نگرانِ اعلیٰ اور افسرِ مجاز کو مخاطب فرمایا کریں، مثلاً:

1 تمام مالی معاملات، حساب وکتاب، رسیدوں کی وصولی یا عدمِ وصولی کے متعلق ناظم مالیات میاں عبدالمجید صاحب کے نام سے خط وکتابت کریں۔

2 اخبار ''الاعتصام'' اور ادارۂ ''اشاعۃ السنۃ'' سے متعلق کوئی شکایت یا مشورہ یا استفسار ہو تو حاجی محمد اسحاق صاحب حنیف کے نام سے خط وکتابت کریں۔

3 مرکزی دفتر کے متعلق کوئی شکایت یا مشورہ یا استفسار ہو یا ضلعی، شہری اور ابتدائی جمعیتوں کے نظم ونسق کے متعلق کوئی مسئلہ ہو تو اس کے لیے ناظمِ اعلیٰ کے نام سے خط وکتابت کریں۔

اس وقت صدرِ محترم سے ہر قسم کے معاملات کے متعلق معزز اراکین خط وکتابت کر کے اپنی محبت وعقیدت کا اظہار کرتے ہیں، لیکن ان کی علالت اور ضعف واضحلال کی وجہ سے معزز اراکین اور تمام اعوان وانصارِ جماعت سے استدعا کروں گا کہ ازراہِ عنایت مندرجہ بالا گزارشات کو پیشِ نظر رکھیں اور ہر شعبے کے انچارج افسر، یعنی ناظم شعبہ سے خط وکتابت فرمائیں۔

محمد اسماعیل، کان اللہ لہ

ناظمِ اعلیٰ جمعیت اہلِ حدیث مغربی پاکستان[1]

---

[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۲۷/ جنوری ۱۹۵۶ء)

پاکستان پر ہندوستانی حملہ اور ہمارا شرعی وقومی فرض

کشمیر کا مسئلہ اتنا صاف اور منصفانہ تھا، ممکن نہ تھا کہ اس میں دو رائیں ہوسکیں۔ کشمیر میں مسلمانوں کی اکثریت کے باوجود پاکستان نے یہ مطالبہ کبھی نہیں کیا کہ اسے پاکستان سے ملا دیا جائے، بلکہ مطالبہ یہ تھا کہ کشمیریوں کو موقع دیا جائے، وہ اپنا فیصلہ خود کریں، یعنی اسی اصول کے مطابق جو معاہدہ تقسیم میں طے ہوا تھا کہ ریاستیں اپنا خود فیصلہ کریں گی۔ مگر ہندوستانی قیادت کی کم فہمی نے اسے خراب سے خراب تر کر دیا۔ ابتدا میں شاید امید ہو کہ کشمیر سے چار فی صد ووٹ ان کے حق میں ہوں، لیکن موجودہ حالات میں یقین ہے ایک فیصد بھی ان کو میسر نہ آسکیں گے۔

سیالکوٹ، واہگہ، قصور کے اطراف میں ہندوستانی فوجوں نے بلا اعلانِ جنگ حملہ کر کے جس کمینگی کا ثبوت دیا ہے، وہ اتنا شرمناک ہے، جس کی نظیر شاید تاریخ میں نہ ملے۔ ان حالات میں اب جبکہ جنگ کا نقارہ بج چکا اور پاکستان کو صرف کشمیریوں کی حمایت اور بین الاقوامی معاہدات کی پابندی کی پاداش میں جنگ میں گھسیٹ لیا گیا تو ہر پاکستانی کا فرض ہے کہ کسی قسم کی مالی اور جانی قربانی سے دریغ نہ کرے، جب تک مقصد حاصل نہ ہو، مصالحت کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوسکتا۔

اندریں حالات جماعت اہلِ حدیث اور اس کی برانچوں کو حکومتِ پاکستان کے ساتھ پورا تعاون کرنا نہایت ضروری ہے، جو لوگ جنگ میں شریک ہوسکتے ہیں، وہ کسی سوچ بچار کے بغیر جنگ میں شریک ہوں۔ اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا.

جو لوگ مالی اعانت کر سکتے ہیں، وہ زیادہ سے زیادہ ہر طرح کی مالی اعانت کریں۔ مجاہدین کی ضروریاتِ زندگی مہیا کریں۔ خصوصاً گرم جرسیاں بے حد کارآمد ہوں گی، اگر جنگ لمبی ہوئی جیسے کے حالات کے تیور بتا رہے ہیں تو گرم لباس کی بھی ضرورت ہوگی۔

صدرِ محترم کا قومی دفاعی فنڈ:

❁ ہمارے صدرِ محترم نے جو قومی دفاعی فنڈ کھول دیا ہے، اس فنڈ میں نقد روپیا زیادہ سے زیادہ پیش کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ نیز ملک میں بددلی، قتل اور غلط افواہوں کو پوری قوت سے روکیے۔

- شہری اور دیہاتی نوجوان سول ڈیفنس میں بھرتی ہو کر ملک کی خدمت کریں۔
- شہری اور ابتدائی جماعتوں کو ہر مقام پر فوج، حکام اور عمال کے ساتھ پورا پورا تعاون کرنا چاہیے۔

علاوہ ازیں موجودہ جنگ کی ہولناکی سے جو لوگ سخت متاثر ہوئے ہیں اور ہندوستانی فوج کے مظالم کا شکار ہو کر گھروں سے بے گھر ہوگئے ہیں (خصوصاً سرحد کے قریب رہنے والے لوگ) ان کی خبر گیری اور ان سے پوری پوری ہمدردی کی طرف رفاہی اداروں اور عام مسلمانوں کی توجہ ہونا بہت ضروری ہے۔ ان کے لیے عارضی مکانات اور ان کے فوری ضروری اخراجات کی کفالت، نہایت شدید ضرورت ہے۔ اولین فرصت میں اس طرف توجہ کی جانی چاہیے۔

حکومت کی توجہ اس وقت تمام تر ملک کے دفاع کی طرف ہے، جس کی اہمیت ظاہر ہے۔

لہٰذا یہ کام بھی ہمیں کرنا ہے۔

محمد اسماعیل

امیر مرکزی جمعیت اہلِ حدیث، مغربی پاکستان[1]

---

[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۱۷ر ستمبر ۱۹۶۵ء)

شہدا کی یادگار

شہدا کے مقام کی رفعت ارشادِ خداوندی سے ظاہر ہے۔ ظاہری موت کے باوجود انھیں مردہ کہنے کی اجازت نہیں دی گئی، اس لیے کہ ان کی برزخی زندگی عام اموات سے ارفع و اعلیٰ ہے۔ جنت میں ان کی روحیں درجات کی پابندی سے آزاد ہیں۔ "تطیر من الجنة حیث تشاء" وہ جنت میں جہاں چاہیں آ جا سکتی ہیں۔

ہندوستان کے ساتھ حالیہ معرکے میں جو لوگ شہید ہوئے ہیں، ان کا مقام اس لیے بھی بلند ہے کہ ان لوگوں کو جہاد فی سبیل اللہ کی ایسے وقت میں توفیق ملی، جبکہ معاشرہ فسق و فجور کی طرف جا رہا تھا۔ اعتقادی بدعملی، برائیاں پورے ماحول پر چھا رہی تھیں۔ توحید و سنت کے چرچے اس انداز سے نہیں ہو رہے تھے، جو اسلامی معاشرے کے شایانِ شان ہوں۔

ہندوستانی حملے نے ملک میں یکا یک صورتِ حال بدل دی۔ ملک میں جہاد کا جذبہ اُبھر آیا۔ ریڈیو میں عریاں گانے قریباً ختم ہو گئے۔ مساجد کی رونق کئی گنا بڑھ گئی۔ مساجد سے محاذ اور مورچوں تک اللہ تعالیٰ کا نام بلند ہونے لگا۔ اِنابت الی اللہ کی راہیں کھل گئیں۔ اعلاے کلمۃ اللہ کے لیے اللہ کے بندوں نے جانیں دے دیں۔ شہادت کئی لحاظ سے قابلِ رشک ہے اور ان کی یادگار آنے والی نسلوں کے لیے اُسوہ حسنہ کا کام دے گی۔

شہدا کی یادگار کے بارے میں محترم گورنر مغربی پاکستان ملک محمد امیر خاں صاحب کی تجویز نہایت معقول ہے کہ ان کی یاد میں مساجد تعمیر کی جائیں۔ آنحضرت کا ارشاد ہے کہ مساجد تمام مقامات سے بہتر مقام ہے[1] اور مسلمانوں کی قوتِ عمل کا مرکز بھی مساجد ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں سب سے پہلے مسجد کی تعمیر فرمائی۔ مسلمانوں کے عزم اور اُن کی عملی زندگی کا مظہر مساجد ہی ہیں۔

قبروں کی یادگار سے شاید غلط یا صحیح عقیدت مندی میں تو کچھ اضافہ ہو سکتا ہے، ملکی عزائم اور اعمال ختم ہو جاتے ہیں۔ عملی زندگی مفلوج ہو کر رہ جاتی ہے۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ مساجد، دار المطالعہ اور مکاتب کا سلسلہ لازماً رکھا جائے، تاکہ باقیات الصالحات کا یہ سلسلہ آیندہ نسلوں کے لیے ہدایت کا سرچشمہ ثابت ہو۔

شہدا تو جہاں شہید ہوئے دفن ہوئے اور جنت میں پہنچ گئے۔ بے میت قبر، بے مقصد یادگار ہو گی۔ مساجد، مکاتب اور دار المطالعہ صدقہ جاریہ ہوں گے، جس کا اجر اُن کو ملتا رہے گا۔[2]

---

[1] دیکھیں: صحیح مسلم، رقم الحدیث (٦٧١)

[2] ہفت روزہ "الاعتصام" لاہور (۱۵؍ نومبر ۱۹۶۵ء)

آل پاکستان مؤتمر اہلِ حدیث کانفرنس کراچی کے متعلق جمعیت اہلحدیث مغربی پاکستان کا فیصلہ

نہایت افسوس کے ساتھ اس امر کا اعلان کیا جاتا ہے کہ کراچی کے بعض تاجروں نے ایک آدھ مولوی کی سرکردگی میں جو ''آل پاکستان اہلِ حدیث موتمر'' کراچی میں قائم کی ہے اور اس کے جلسے کا اعلان بھی کر دیا ہے اور اب وہ چندہ فراہم کرنے کے لیے اپنے ایجنٹوں کو بھیج رہے ہیں، نہایت افسوس ناک افتراق انگیز اور جماعت کی وحدت و سالمیت کو تباہ کرنے کے لیے یہ قدم اُٹھایا گیا ہے۔ اس لیے یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ کراچی کی اس مؤتمر کو جمعیت مرکزیہ اہلِ حدیث مغربی پاکستان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ جمعیت مرکزیہ اہلِ حدیث قیامِ پاکستان کے بعد ۴۸ء سے خدا کے فضل سے قائم ہے اور اپنا ایک وسیع اور مضبوط نظام رکھتی ہے۔ تمام جماعت کے لیے یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ وہ ''موتمر اہلِ حدیث'' کے لفظ سے دھوکا نہ کھائیں اور ایسے تفرقہ پرداز شخص کی حرکات سے قطعی طور پر کنارہ کش رہیں اور کسی طرح ان کی حوصلہ افزائی نہ کریں۔

محمد اسماعیل

ناظمِ اعلیٰ جمعیت اہلِ حدیث، مغربی پاکستان[1]

---

[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۱۰/ اکتوبر ۱۹۵۲ء)

جمعیت اہلِ حدیث مغربی پاکستان کے خلاف افتراق انگیز مساعی مسٹر آٹیہ کی چٹھی اور اظہارِ حقیقت

مولوی یوسف اور مسٹر آٹیہ کی افتراق انگیز مساعی کا تذکرہ ناظرین ''الاعتصام'' کم و بیش سن چکے ہیں۔ جمعیت کراچی کا ایک وفد پنجاب میں پھر رہا ہے اور افتراق اور چندہ دونوں شغل ان کے پیشِ نظر ہیں۔ ذیل کی چٹھی مسٹر آٹیہ کی طرف سے آئی ہے، جس کا جواب ناظرین کے سامنے ہے۔ ناظرین خود فیصلہ فرمائیں کہ اصلاح و تعمیر کی راہیں کس قدر دشوار ہیں اور تخریب کس قدر آسان؟!

اظہارِ حقیقت بضمنِ مؤتمر اہلِ حدیث:

''مولانا محمد اسماعیل صاحب (ناظمِ اعلیٰ جمعیت اہلِ حدیث، مغربی پاکستان) کے اعلان مندرجہ ''الاعتصام'' (مورخہ: ۱۰/ اکتوبر) کو جمعیت اہلِ حدیث کراچی کے اجلاس منعقدہ ۱۲/ اکتوبر میں پیش کیا گیا، جس پر جملہ اراکین مجلسِ منتظمہ نے اظہارِ افسوس کرتے ہوئے اس امر پر اظہارِ تعجب کیا کہ مولانا موصوف نے نہ معلوم کس طرح تنقید و تبصرے کے معیار کو اس قدر گرا دیا۔ حالاں کہ ان کو انعقادِ کنونشن (مجلسِ شوریٰ) بضمن سہ روزہ کانفرنس سالانہ جمعیت اہلِ حدیث کراچی کے حقائق سے بہ خوبی آگاہ کیا جا چکا تھا۔

''ناظرین کی اطلاع کے لیے یہ واضح کرنا از بس ضروری ہے کہ جمعیت اہلِ حدیث کراچی نے اپنے اجلاس منعقدہ ۶/ جولائی ۵۲ء میں موجودہ الحاد و انکارِ حدیث و ختمِ نبوت کے پیشِ نظر اغراض و مقاصدِ جمعیت کی روشنی میں تبلیغِ دین کو وسیع تر پیمانے پر سرانجام دینے کے لیے کافی غور و خوض کیا اور بالآخر یہ طے پایا کہ اس غرض کی تحصیل کے لیے ایک کل پاکستان اہلِ حدیث کانفرنس بلائی جائے، جس میں مختلف صوبہ جات پاکستان کے جلیل القدر علما و دیگر مفکرینِ جماعت کو مدعو کیا جائے، تاکہ وہ باہمی مذاکرے اور بحث و تمحیص کے بعد ایسی تدابیر سوچ سکیں، جن سے مذکورہ بالا فریضہ تبلیغ و اشاعتِ دین بہ طریقِ احسن ادا ہو سکے اور آج کل جو کفر و الحاد کی رَو ساری دنیا میں بالعموم اور پاکستان میں بالخصوص نہایت تیز رفتاری سے جاری ہے، اس کا انسداد ہو سکے۔ واللہ المستعان وعلیہ التکلان۔

''اس کے علاوہ جمعیت اہلِ حدیث کراچی نے یہ بھی مناسب جانا کہ اپنے مندرجہ ذیل اغراض و مقاصد کو (جس سے ہر وہ شخص جس کے دل میں دینی تڑپ ہے، متفق ہوگا) مجوزہ آل پاکستان اہلِ حدیث کانفرنس کے سامنے پیش کرے، تاکہ باہمی مشورے سے ایسے اسباب و ذرائع اختیار کیے جاسکیں، جن سے ان کی تحصیل و تکمیل ہو سکے۔

مندرجہ بالا بیان سے یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ ''اب تک آل پاکستان اہلِ حدیث موتمر کا قیام وجود میں نہیں آیا۔'' جس کے متعلق مولانا محمد اسماعیل صاحب کو نامعلوم کس طرح غلط فہمی ہوگئی ہے کہ انھوں نے اپنے اعلانِ مذکور الصدر میں کہہ دیا کہ ''آل پاکستان اہلِ حدیث موتمر کراچی میں قائم کی ہے۔'' بے شک اس قسم کی ایک کل پاکستان جمعیت کی ضرورت ہر فردِ جماعت ابتدا سے محسوس کر رہا ہے۔ بس اسی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے پہلا قدم ہے، جو جمعیت اہلِ حدیث کراچی نے اُٹھا کر محض داعی الی الخیر کی حیثیت اختیار کی ہے۔ اس سے زیادہ اس کا ہرگز کوئی مقصد نہیں۔ اسی لیے وہ ہر فردِ جماعت سے مخلصانہ اپیل کرتی ہے کہ اس کے ان نیک عزائم میں بموجب فرمانِ خداوندی: ﴿تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى﴾ اس کی ہر ممکن اعانت کرے۔

''واضح رہے کہ اس سلسلے میں بتاریخ ۲۱ر ستمبر ۵۲ء مولانا موصوف سے بضمن عصرانہ مشورہ کیا گیا، جس پر انھوں نے فرمایا کہ ''جماعت کے اصحابِ فکر کو مختلف مقامات سے بلا کر تجویز پیش کی جائے اور ان کے فیصلے پر عمل ہو۔''

''اس سے واضح ہوتا ہے کہ جمعیت اہلِ حدیث کراچی نے مذکورہ بالا مقاصد کے لیے جو مجلسِ مشاورت بلائی ہے، وہ عین مولانا محمد اسماعیل صاحب (ناظم اعلیٰ جمعیت اہلِ حدیث، مغربی پاکستان) کے مشورے اور راہنمائی کے مطابق ہے۔ اس لیے اس میں کم از کم ان کو کسی قسم کا اعتراض نہ ہونا چاہیے تھا۔ مگر حیرت ہے کہ انھوں نے خود اپنے ہی مشورے کے خلاف مجوزہ موتمر کی مخالفت کی ہے، جس سے جماعت میں ''سوئے فہمی'' اور افتراق پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ اس اندیشے کا سدِ باب کرنے کے لیے جمعیت اہلِ حدیث کراچی کی اس پیش قدمی اور تحریک سے لوگوں کو مزید باخبر کرنے کے لیے جمعیت کے وفود ناظرین کی خدمت میں پہنچ رہے ہیں۔

(از طرف: محمد صالح آٹیہ برائے جنرل سیکرٹری جمعیت اہلِ حدیث کراچی)

جوابی گزارش

جمعیت اہلِ حدیث کراچی کی تاسیس تھوڑا عرصہ ہوا عمل میں آئی۔ ابتدائے آفرینش ہی سے جمعیت ایسے ہاتھوں میں چلی گئی، جن سے نہ تو جماعت کی سالمیت محفوظ رہ سکتی تھی اور نہ ہی جماعت کا علمی وقار خطرات سے بچ سکتا تھا۔ مولانا یوسف خاں صاحب، مسٹر صالح آٹیہ کی کلکتہ اور مدراس کی زندگی کے واقعات ہمارے سامنے تھے۔ جمعیت تنظیم اہلِ حدیث کی نیابت کے بعد جو کچھ کلکتہ میں ہوا، اس سے ہمارے حافظے ناآشنا نہ تھے۔

مولانا فضل الٰہی وزیر آبادی سے تعلق اور فقیر اوپی سے بیعت اور اُن کے پیغامات کے افسانے، پورے پسِ منظر کے ساتھ ہمارے سامنے تھے۔ مولانا یوسف صاحب قبلہ کی عجلت پسندی اور قوتِ فیصلہ کا فقدان معلوم اور مسٹر آٹیہ کی ہشیاریاں اور سودے بازیاں بھی ہمارے لیے حدیثِ محفل سے کم نہ تھیں۔

جمعیت اہلِ حدیث مغربی پاکستان کی تاسیس ۴۸ء کے اوائل سے ہو چکی تھی۔ مناسب بلکہ ضروری تھا کہ جمعیت اہلِ حدیث کراچی تعاون اور مشورے سے کام کرتی۔ اس کی تاسیس اس انداز سے عمل میں آتی، جس سے جماعت کی وحدت اور سالمیت کو خطرہ نہ ہوتا، مگر جمعیت اہلِ حدیث کراچی پیدا ہوتے ہی ایسے حضرات کی گود میں چلی گئی، جن سے جماعتی زندگی کی توقع، اتفاق و وحدت کی اُمیدوں کا بر آنا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

پنجاب تو خیر کچھ دور تھا، خود کراچی میں شیخ عبدالوہاب صاحب بانی مدرسہ رحمانیہ دہلی، محترم حافظ محمد اسماعیل صاحب بانی لائبریری "رابطة العلوم الإسلامية" ایسے مخلص اصحابِ خیر اور جماعت کے خیر اندیش بھی اس کے قریب نہ پھٹک سکے۔ مولانا یونس صاحب اور محترم شیخ خلیل عرب ایسے فضلائے روزگار بھی اس کے نظام سے مطمئن نہ ہو سکے۔

ابتدائے امر:

"سرچشمہ شاید گرفتن بمیل"[1] کے مطابق ضروری تھا کہ ہم اس افتراق انگیز تحریک کے متعلق جماعت کو ابتدا ہی میں آگاہ کر دیتے اور کراچی کے اصحابِ فکر اور مخلص احباب کی ایک نمایندہ جماعت کی تشکیل کر دی جاتی، مگر جماعت کی سالمیت کے پیشِ نظر ہم اس فریضے کو ادا کرنے سے قاصر رہے۔ ہم نے جمعیت کراچی کے ساتھ ممکن تعاون کیا اور جمعیت کے بعض غیر موزوں اعمال و افکار کی پردہ پوشی کرتے رہے۔ صدر محترم حضرت مولانا سید محمد داود صاحب، مولانا یوسف خاں اور مسٹر آٹیہ کو سمجھاتے رہے کہ وہ مشورے اور تعاون سے کام کریں، جس کا ذکر "الاعتصام" (مورخہ: ۱۷/ اکتوبر ۵۲ء) میں حضرت مولانا کے گرامی نامہ میں آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں، مگر مسٹر آٹیہ اور خاں صاحب دینا گری تفریق اور مخاصمت کی راہ پر کمر بستہ رہے۔

میں نے دو ہفتے قبل کراچی کا سفر کسی دوسری ضرورت کے ماتحت کیا تھا، مگر مولانا یوسف کے ارشاد کے مطابق جمعیت اہلِ حدیث کراچی کے زیرِ اہتمام تقریر کرنا منظور کر لیا۔ اپنے کام سے فرصت اور فراغت کے باوجود میں بھائی یوسف اور ان کی دعوت و ارشاد کے مطابق مزید ایک دن ٹھہر گیا اور جمعیت کراچی کے اہتمام اور حضرت فاضل علامہ شیخ خلیل عرب آلِ حسین کے زیرِ صدارت تقریر کی اور ایک عصرانہ میں مولانا یوسف خان کے دولت کدے پر شریک ہوا۔ وہیں آٹیہ صاحب کی زیارت کا شرف حاصل ہوا۔

---

[1] چشمے کا دھانہ ایک سلاخ سے بند کیا جا سکتا ہے۔

بدگمانی کا آغاز:

صدرِ محترم جمعیت کراچی اور اس کے اراکین کے متعلق پورے بدگمان تھے، مگر میں حضرت محترم کے سامنے ادباً خاموش تھا۔ میری بدگمانی کا آغاز اسی عصرانے سے ہوا، جس کا تذکرہ محترم آٹیہ نے اپنی چٹھی میں کیا۔ مجھے اس عصرانے میں اشتراک پر بے حد افسوس ہوا۔ اس مجلس میں تدبر، سنجیدگی بالکل ناپید تھی۔ علما پر بعض نوجوان سوقیانہ حملے کرتے تھے۔ مولانا خلیل عرب ایسے مخلص اور یگانہ روزگار فاضل کا مذاق خود مولانا یوسف خاں نے متعدد دفعہ اُڑایا۔ مولانا محمد یوسف صاحب نے اس مجلس میں مولانا یونس صاحب اور دوسرے اہلِ علم کو کئی دفعہ مناظرے کا چیلنج دیا۔ میں حیرت میں تھا کہ

اینچہ مے بینم سدا است[1]

اس مجلس کے اربابِ بست وکشاد میں مولانا عبدالحنان صاحب اور مولانا عبدالوکیل صاحب کے علاوہ ایک شخص بھی ایسا نہیں تھا، جس پر کوئی جماعتی ذمے داری ڈالی جا سکے۔ اگر مولانا یوسف خاں صاحب مسٹر آٹیہ کا تعارف نہ کراتے تو میں ان کی وضع سے انھیں قادیانی اور نقل وحرکت سے انھیں سی۔ آئی۔ ڈی کا آدمی سمجھتا، جو ایک پرائیویٹ مجلس کی رپورٹ لینے آیا ہے۔ مولانا یوسف کا میں ممنون ہوں کہ ان کے تعارف نے یہ بدگمانی دور کر دی اور میں مسٹر آٹیہ کو جمعیت کراچی کا ناظم سمجھنے لگا۔

ایک دستی اشتہار:

مسٹر آٹیہ جمعیت اہلِ حدیث کراچی کا تعارف کرا رہے تھے کہ ایک دستی اشتہار میرے ہاتھ میں دیا گیا، جس کا عنوان تھا: ''کل پاکستان مؤتمر اہلِ حدیث'' (وضاحت) ''کل پاکستان'' یعنی موجودہ حدودِ پاکستان ''مؤتمر'' یعنی کانفرنس اور ''اہلِ حدیث'' سے مراد ہر وہ مسلمان جو حدیث کے اہل ہو، یعنی منکرِ حدیث نہ ہو۔

یہ فقرات اس دستی اشتہار کے عنوان کے طور پر مرقوم تھے۔ اشتہار آنے کے بعد میں تو ابھی خاموش ہی تھا، اہلِ حدیث کی اس تعریف پر بحث کا آغاز مولانا عبدالوکیل نے فرمایا۔ وہ اس تعریف کو ناپسند فرماتے تھے۔ حضرت مولانا یونس صاحب نے بھی ان کی تائید فرمائی۔ مولانا عبدالحنان صاحب کا لہجہ اس معاملے میں زیادہ تیز تھا، وہ دریافت فرما رہے تھے کہ اس اشتہار کا مسودہ کس نے لکھا؟ اتنے میں مولانا یوسف خاں صاحب باہر سے تشریف لائے اور بحیثیت صدر بیٹھ گئے اور اچھے تلخ لہجے میں فرمایا: ''بڑے افسوس کی بات ہے کہ اشتہار سب کے مشورے سے لکھا گیا اور ا ب آپ ہی اس پر اعتراض کر رہے ہیں۔'' مولوی عبدالحنان صاحب نے اس کے

---

[1] میں جو دیکھ رہا ہوں، یہی ان کا وتیرہ ہے۔

متعلق لاعلمی کا اظہار فرمایا۔ مولوی یوسف صاحب نے بڑے جلال سے فرمایا کہ آپ کے پاس کئی دفعہ مسودہ بھیجا گیا، آپ ملتے ہی نہیں۔ اس وقت مجلس خاصی تیز ہوگئی اور مولوی عبدالوکیل اور مولوی محمد یوسف کی تلخ کلامی کافی بڑھ گئی۔ مولانا عبدالوکیل واک آؤٹ کے لیے تیار ہو رہے تھے کہ مولوی یوسف صاحب نے بحیثیتِ صدر گفتگو بند کر دی اور فرمایا کہ اس صورت میں بحث کی اجازت نہیں دیتا۔

میں نے عرض کیا کہ اس تعریف کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے اسلاف نے آج سے کئی سو سال ساری دنیائے اسلام میں اور ایک سو سال ہندوستان میں مسلک اہلِ حدیث کی اشاعت میں جو کچھ کہا، سب غلط تھا۔ ﴿نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنۢ بَعْدِ قُوَّةٍ أَنكَٰثًا﴾ کی ہم لوگ زندہ مثال ہیں۔

مولوی عبدالوکیل صاحب یا کسی دوسرے بزرگ نے حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کی کتاب "حجة الله البالغة" کے "باب الفرق بين أهل حديث وأهل الرأي" کا ذکر فرمایا۔ مولوی یوسف نے فرمایا: ہم شاہ صاحب کے مقلد نہیں۔ مولانا محمد یونس صاحب نے بھی اس تعریف کے خلاف اپنی رائے کا اظہار فرمایا۔ مولوی محمد یوسف صاحب نے فرمایا: اس پر مناظرہ کر لو اور قریباً ہر تنقید کا جواب مولوی یوسف کے پاس یہی تھا۔ مسٹر آتیہ میدانِ کارزار کا جائزہ پورے اطمینان سے لے رہے تھے۔ ایک حیدر آبادی نوجوان اور مسٹر آتیہ بوقتِ ضرورت مولوی یوسف صاحب کی حوصلہ افزائی فرماتے تھے۔ باقی سارا ہاؤس یا تو مولوی یوسف صاحب کے مخالف تھا یا خاموش تماشائی۔

مولوی یوسف صاحب نے مجھ سے دریافت فرمایا کہ آپ کی کیا رائے ہے؟ میں نے عرض کیا کہ وضاحت کے بعد جو کچھ لکھا گیا ہے، سب اُڑا دیجیے۔ اہلِ حدیث علم ہے، اعلام کے لیے مزید فصول اور تشخصات کی ضرورت نہیں ہوتی۔ مولانا یوسف صاحب مجھے اس کج بحثی میں اُلجھانے کی کوشش فرماتے رہے، مگر میں اس سے دامن بچاتا رہا۔ بحمد اللہ میرا ذہن رسمی مناظرات کے جنون سے خالی ہے۔ میں اس کو کوئی فیصلے کی صورت نہیں سمجھتا۔

"کل موتمر":

مولانا عبدالحنان صاحب کے جواب میں مَیں نے عرض کیا کہ جس جمعیت کے صدر حضرت مولانا سید محمد داود صاحب غزنوی ہیں، وہ "جمعیت اہلِ حدیث مغربی پاکستان" ہے۔ اس پر آتیہ صاحب نے فرمایا: ہماری خواہش ہے کہ "آل پاکستان موتمر" بنائی جائے۔ میں نے عرض کیا کہ اگر آپ کو اس مسئلے پر سوچنا ہے تو پورے پاکستان سے چند مفکر حضرات کو بلا کر مشورہ کر لیجیے۔ اس کے لیے کسی کانفرنس یا بڑے جلسے کی ضرورت نہیں، اگر اصحابِ فکر نے اس کی ضرورت محسوس کی تو اس کی تشکیل کے اسباب و دواعی پر غور کر لیا جائے گا۔ یہ تجویز تقریباً

پورے ہاؤس نے پسند کی۔ اسی کا ذکر مسٹر آتیہ نے اپنے مضمون میں کیا ہے اور یہ صحیح ہے، اس کے متعلق ایک حیدر آبادی نوجوان کچھ کہتے رہے، میں ان کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔ اس پر مولانا عبدالحنان صاحب نے فرمایا کہ اگر یہ تجویز منظور ہے تو وفود کو روک دینا چاہیے۔ مسٹر آتیہ نے قریب سے ان کا پاؤں دبا دیا اور وہ خاموش ہوگئے۔

میری حیرت:

اختتامِ مجلس کے بعد میں مسٹر آتیہ سے کچھ دریافت کرنے کے لیے ان کے پاس گیا تو میری حیرت کی کوئی حد نہ رہی کہ مسٹر آتیہ چار سو بیس میں مشغول تھے۔ وہ مجلسِ استقبالیہ کی کاپیاں تقسیم فرما رہے تھے۔ میں مسٹر آتیہ کی اس جرأت پر واقعی حیران ہوں کہ جس مجلس میں یہ فیصلہ ہوا تھا کہ اب جلسے کی ضرورت نہیں، اسی مجلس میں وہ اس کی خلاف ورزی فرما رہے تھے اور وفود کا پروگرام بنا رہے تھے۔ إنا للہ وإنا إلیه راجعون.

مسٹر آتیہ فرماتے ہیں کہ "اب تک آل پاکستان موتمر اہلِ حدیث کا قیام وجود میں نہیں آیا" ادباً گزارش ہے کہ حضور یہ آپ کی مجلسِ استقبالیہ کیا یہ کسی معدوم چیز کا استقبال کرے گی؟ کراچی، بہاول پور اور مغربی پنجاب میں آپ کے وفود بھیک مانگ رہے ہیں۔ سب اقتصادی کوششیں کسی ناپید چیز کے لیے فرمائی جا رہی ہیں؟ آپ کے خطوط کسی غیر موجود جمعیت کی اعانت کے لیے بھیجے جا رہے ہیں؟ میرا مشورہ یا ادباً گزارش تو یہ تھی، چند اصحابِ فکر کو بلا لیجیے۔ اے چندہ مجسم! کیا چند آدمی جماعتی مفاد کے لیے اپنا کرایہ بھی نہیں خرچ کر سکتے؟ مغربی پنجاب کی جمعیت اہلِ حدیث ورکنگ کمیٹی کے ممبران کو ایک پائی بھی نہیں دے رہے۔ اپنے اخراجات پر اجلاس میں شریک ہوتے ہیں۔ اگر آپ ان حضرات کو کرایہ دینا بھی چاہتے ہیں تو سارا پاکستان مانگنے کی کیا ضرورت ہے؟ آپ نے کراچی ہی میں کئی حضرات سے سو سو روپیا وصول فرمایا ہوتا، اب پورے پنجاب میں کاسۂ گدائی لے کر کیوں پھرا جا رہا ہے؟ موتمر کو وجود میں آنے دیجیے، وہ اپنے بقا کے لیے خود راہ پیدا کر لے گی۔

محترم مسٹر آتیہ! ۱۲ر اکتوبر ۵۲ء کے روزنامہ "زمیندار" میں صدر کل پاکستان موتمر اہلِ حدیث کی طرف سے ایک اعلان چھپا ہے، جس میں لیگ کونسل سے مکمل وفاداری کا عہد کیا گیا ہے اور درخواست کی گئی ہے کہ پاکستان کو جمہوریہ قرار دیا جائے۔

میں دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ یہ کونسی مؤتمر کا صدر پاکستان کو جمہوریہ بنانے کا مطالبہ فرما رہے ہیں اور لیگ کونسل کے ساتھ بلا شرط وفاداری کا عہد کر رہے ہیں؟

محترم مسٹر آتیہ! اگر سچ بولنا جرم نہیں تو سچ بولنے کی کوشش فرمایئے۔ اس سے بہت سی مشکلیں آسان ہوسکتی ہیں۔

حضرت مولانا یوسف صاحب (علامہ) سے گزارش ہے کہ آیا کوئی دینی جماعت لیگ ایسی آزاد منش

جماعت کے ساتھ بلاشرط وابستہ ہوسکتی ہے؟ لیگ اور موجودہ حکومت کا تعلق آپ حضرات سے مخفی نہیں ہے۔ مسٹر برد ہی کے ساتھ مخاصمت محض ایک نمایش ہوگی اور دینی دستور کا مطالبہ محض سخن سازی۔ اس لیے میری گزارش ہے کہ آپ ایسے حضرات پر نہ جمعیت اہلِ حدیث کراچی کو اعتماد ہونا چاہیے اور نہ کسی آل پاکستان جماعت کو۔ اگر آپ ناراض نہ ہوں تو عرض کردوں ع

مرا بنفع تو امید نیست برساں [1]

میں نے آپ کی چٹھی کو بار بار پڑھا اور ان واقعات پر غور کیا، جو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے، مجھے آپ کے ارشادات میں تصنع اور بناوٹ کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔

آپ دنیا میں ترقی کیجیے۔ خدا آپ کو برکت دے، مگر جماعت کو اس کے لیے سیڑھی نہ بنائیے اور چندہ مانگنے کا پیشہ چھوڑ دیجیے۔ اس میں آپ کی بہتری ہوگی۔

میں اب بھی وثوق سے کہہ سکتا ہوں آپ درحقیقت ذہنی طور پر موتمر بنا چکے ہیں۔ اس کے لیے چندے مانگ رہے ہیں۔ انکار محض ظاہر داری ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو سچائی کی توفیق عطا فرمائے۔ آخر میں آپ دونوں حضرات سے ادباً گزارش ہے کہ جماعت پر رحم کیجیے اور اپنی ضروریات کے لیے کوئی اور راہ تلاش فرمائیے۔

مجھے بحمداللہ آپ حضرات کے متعلق کوئی غلط فہمی نہیں، میں نے جو نتائج اخذ کیے ہیں، وہ دیکھنے کے بعد کیے ہیں۔ واللہ علی ما أقول شھید. آپ نے کس قدر خلافِ واقع فرمایا ہے کہ وفود اس لیے بھیجے گئے ہیں کہ میرے اعلان سے پیدا شدہ غلط فہمی کو رفع کریں، حالاں کہ آپ وفود کا فیصلہ آج سے قریباً ایک ماہ پہلے فرما چکے تھے، جبکہ میں کراچی میں تھا۔ اللہ تعالیٰ جھوٹ کبھی بار آور نہیں فرماتا۔ وسیعلم الذین ظلموا أي منقلب ینقلبون.

آپ کا خیر اندیش

محمد اسماعیل

ناظم اعلیٰ جمعیت اہلِ حدیث، مغربی پاکستان [2]

---

[1] مجھے تم سے کوئی فائدہ ملنے کی اُمید نہیں۔

[2] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۲۴/ اکتوبر ۱۹۵۲ء)

محمد صالح آٹیہ، مولوی عبدالحنان، چودھری عبدالرشید جہلمی، حکیم عبدالعزیز رنگونی

جماعت اہلِ حدیث کے مرکزی نظام سے خروج اور انتشار پیدا کرنے کی وجہ سے جماعت کے باغی قرار دیے گئے

محمد صالح صاحب آٹیہ کی ایک چٹھی اس مضمون کی دفتر میں موصول ہوئی ہے:

''موتمر اہلِ حدیث کراچی نے اپنے اجلاس منعقدہ ۶ / دسمبر ۵۵ء میں متفقہ طور پر طے کیا ہے کہ آپ کے حالیہ دستور کی عملی دشواریوں اور صدر جمعیت کے آمرانہ اور حاکمانہ رجحانات کے پیشِ نظر اپنے اس الحاق کو، جس کی آپ کو پہلے اطلاع دی گئی تھی، توڑ دیا گیا ہے۔''

مجھے انتہائی افسوس سے یہ کہنا پڑا کہ محمد صالح صاحب آٹیہ اور اُن کے ساتھیوں کا یہ عذر لنگ ہے۔ واقعہ صرف اتنا ہے کہ صدرِ محترم نے موتمر اہلِ حدیث کراچی (شاخ مرکزی جمعیت اہلِ حدیث، مغربی پاکستان) کے حالیہ انتخاب کو ناجائز قرار دیا ہے۔ اس لیے کہ

1. مرکزی جمعیت کے قواعد کے مطابق نئے قرطاسِ رکنیت پر رکن سازی ضروری ہے، لیکن انھوں نے اس کی پروا نہ کی۔
2. قواعد کے مطابق تمام مغربی پاکستان کی ابتدائی شہری اور ضلعی جماعتوں کا انتخاب ایک مقررہ وقت میں کیا جاتا ہے، لیکن انھوں نے کراچی کی جمعیت (موتمر) کا سالانہ انتخاب قواعد کے خلاف مقررہ وقت سے پہلے کر دیا۔
3. قواعد کے مطابق تمام عہدے داروں کا انتخاب اراکین کے اجتماعِ عام میں ہوتا ہے، لیکن انھوں نے، اجتماعِ عام میں عہدے داروں کا انتخاب نہیں کیا، بلکہ چھے سات افراد نے ایک پرائیویٹ مکان میں جمع ہو کر عہدے داروں کا انتخاب کر لیا۔

اور یہ تمام قواعد مرکزی جمعیت کے جدید دستور میں اضافہ نہیں کیے گئے، بلکہ پرانے دستور میں بھی یہی دفعات تھیں اور اسی قدیم دستور کی موجودگی میں موتمر والوں نے مرکزی جمعیت سے الحاق کیا تھا اور جدید دستور کے مطابق قرطاسِ رکنیت میں بھی کسی ایسی بات کا اضافہ نہیں کیا گیا، جس کی پابندی کسی اہلِ حدیث کے لیے دشوار ہو۔ البتہ قدیم اور جدید قرطاسِ رکنیت کی شرائط میں ہر رکن کی عملی زندگی کو بہتر بنانے کے لیے یہ پابندی لگا دی گئی ہے کہ جمعیت کا ہر رکن فرائضِ شرعیہ کا پابند اور کبائر سے پرہیز کرتا ہو۔ اگر یہ پابندی آٹیہ صاحب اور ان

کے ساتھیوں کے لیے دشوار تھی اور اس لیے وہ مرکزی جمعیت کے نظام کی اطاعت قبول کرنے کے بعد اس سے خروج کی راہ اختیار کر رہے ہیں تو انتہائی صدمے کی بات ہے۔ اور اگر یہ نہیں ہے تو ان کو واضح کرنا چاہیے کہ نئے دستور میں وہ کون سی پابندیاں ایسی ہیں، جو ان کے لیے ناقابلِ عمل ہیں اور ان کی وجہ سے انھیں بغاوت کی راہ اختیار کرنا پڑی؟!

نیز اُن کا یہ کہنا کہ صدرِ مرکزیہ کا رویہ آمرانہ ہے ''خوئے بدرا بہانہ بسیار'' کے مصداق ہے۔ صدرِ محترم کی طرف سے انھیں یہ ہدایت کی گئی تھی کہ موتمر اہلِ حدیث کا انتخاب قواعد کے خلاف ہوا ہے۔ اس لیے مجلسِ مرکزیہ کے قواعد کے مطابق انتخاب ہونا چاہیے۔ کون صاحبِ عقل وخرد اس کو آمریت کہہ سکتا ہے؟ ملحقہ جماعتوں کو بدنظمی سے بچانا، ڈسپلن کا پابند بنانا اور قواعد کا احترام کرنا آمریت نہیں، بلکہ اسلامی تعلیمات اور ان کے مقتضیات کو پورا کرنا اور جماعت کو انتشار سے بچانا اور لا مرکزیت کو ختم کرنا اور جماعتی نظام کو جمہوری طریقوں پر چلانا ہے۔

آثیہ صاحب اور اُن کے ساتھیوں نے مرکزی نظام سے بغاوت کیوں کی؟ یہ کسی قدر تفصیل کا محتاج ہے۔ ہم سردست آثیہ صاحب کے ایک خط کا اقتباس پیش کرتے ہیں۔ اس سے ان کی ذہنیت آشکارا ہو جاتی ہے۔

محمد صالح صاحب آثیہ محترم صدر مرکزی جمعیت اہلِ حدیث کو اپنے ایک خط مورخہ ۱۴ر نومبر ۱۹۵۵ء میں ایک کنونشن کے انعقاد کے لیے مشورہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''صرف ۱۷/ ۱۵ افراد ہی کو مدعو کریں، لیکن صرف علما تک محدود نہ رکھیں، بلکہ گریجویٹ حضرات کو زیادہ اہمیت دیں، کیوں کہ میرا تجربہ ہے کہ دو مولوی کبھی ایک ساتھ مل کر کام نہیں کر سکتے اور نہ موجودہ گندی ریاست اور چالبازیوں کو سمجھنے کی صلاحیت ہی ان میں پائی جاتی ہے۔ ضرورت ہے کہ نئی پود کو لیڈر شپ دی جائے... اور اسی سپرٹ کے ماتحت ہم نے (موتمر اہلِ حدیث کراچی) کی صدارت پر اس دفعہ ایک غیر مولوی کو مامور کیا ہے۔''

آخری فقرہ خاص طور پر قابلِ غور ہے۔ صدرِ محترم کو آمریت کا طعن دینے والوں کا یہ حال ہے کہ ایک غیر مولوی کو صدارت کے لیے منتخب نہیں، بلکہ مامور کرتے ہیں!!

اسی ذہنیت کی بنا پر آثیہ صاحب اور ان کے ساتھی جمعیت اہلِ حدیث کراچی سے الگ ہوئے اور اسی انتشار پسند طبیعت اور جماعتی نظام کی پابندیوں سے گریز پائی نے اب ان کو مرکزی جمعیت اہلِ حدیث سے خروج اور بغاوت پر آمادہ کیا۔ اس لیے مرکزی جمعیت اہلِ حدیث، مغربی پاکستان تمام ملحقہ شاخوں اور ان تمام افراد کو جو مرکزی جمعیت اہلِ حدیث سے وابستہ ہیں اور چاہتے ہیں کہ جماعت اہلِ حدیث کا ایک مرکزی نظام ہو اور تمام افرادِ جماعت اس سے وابستہ، پیوستہ اور منسلک ہوں اور جماعت کا مرکزی نظام ایک مضبوط اور مستحکم نظام

ہو، مطلع کیا جاتا ہے کہ محمد صالح صاحب آثیہ، مولوی عبدالحنان ایڈیٹر رسالہ ''المؤتمر'' کراچی، چودھری عبدالرشید جہلمی اور حکیم عبدالعزیز رنگونی جماعتی نظام کی اطاعت قبول کرنے کے بعد خروج اور بغاوت کی راہ اختیار کر چکے ہیں۔

ان سے کسی قسم کا رابطہ یا تعلق نہ رکھیں اور ہر جگہ ان کی اس سرکشی اور تمرد کی روش کی مذمت کی جائے۔ تاکہ مرکزی نظام سے سرکشی اور تمرد کی راہ اختیار کرنے پر وہ ندامت محسوس کریں اور آیندہ اس قسم کے انتشار پسند عناصر کی حوصلہ افزائی نہ ہو۔

محمد اسماعیل

ناظم اعلیٰ جمعیت اہلِ حدیث، مغربی پاکستان[1]

---

[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۲۳ر دسمبر ۱۹۵۵ء)

المؤتمر کی ناشائستہ حرکت

ہم نے مولوی عبدالحنان علوی کا وہ پمفلٹ، جو انھوں نے ''المؤتمر'' کے حوالے سے مرکزی جمعیت اہلِ حدیث مغربی پاکستان کے صدرِ محترم مولانا سید داود غزنوی کے خلاف معاندانہ رنگ میں لکھا ہے، دیکھا۔ افسوس کے ساتھ یہ عرض کرنا پڑتا ہے کہ آج تک ہم نے کسی عالم کی ایسی تبذل اور سوقیانہ تحریر کسی عالم کے خلاف نہیں دیکھی۔ مولوی عبدالحنان صاحب اگر یہ سمجھتے ہیں کہ اس سے انھوں نے صدرِ محترم کے وقار اور عظمت کو نقصان پہنچایا ہے تو وہ مغالطے میں ہیں۔ جہاں کہیں انھوں نے اپنا کتابچہ بھیجا، احباب نے یا تو اسے نذرِ آتش کیا، یا حقارت سے ٹھکرا دیا۔ البتہ مولوی عبدالحنان صاحب کے متعلق لوگوں کو رائے قائم کرنے کا موقع مل گیا کہ وہ کیسی زبان استعمال کر سکتے ہیں اور کس اخلاق کے مالک ہیں۔

تاریخ شاہد ہے کہ جب کسی مصلح نے اپنی قوم یا اپنی جماعت کی اصلاح و تنظیم کی کوشش کی تو جاہ پسند، خود غرض اور ذاتی مفاد کو جماعتی مفاد پر ترجیح دینے والوں نے مصلح کی مخالفت کی۔ اس کے خلاف معاندانہ رویہ اختیار کیا اور اس کی مساعیِ اتحاد کے مقابلے میں تفریق و تشتت کے کانٹے بچھائے اور مصلح کو ناکام اور ذلیل کرنے کی کوشش کی۔

صدرِ محترم کا اس کے سوا کوئی قصور نہیں کہ انھوں نے باوجود علالتِ طبع کے بارہا کوشش کی کہ کراچی کی جماعت اہلِ حدیث جو کئی گروہوں میں بٹی ہوئی ہے، وہ ایک ہو جائے اور مغربی پاکستان میں جماعت کا مرکزی نظام جو قائم ہے، اس کے ساتھ منسلک ہو جائے۔ اس سے نہ صرف یہ کہ جماعت متحدہ قوت کے ساتھ کام کر سکے گی، بلکہ اس کے وقار میں اضافہ ہوگا۔ دوسری جماعتوں کی نظروں میں اس کی وقعت ہوگی اور اربابِ اقتدار کے ہاں بھی اس کا ایک مقام ہوگا۔

مولوی عبدالحنان اور ان کے ساتھیوں نے مرکزی جمعیت اہلِ حدیث کے نظام میں شریک ہو کر خروج کی جو وجہ بیان کی، اس کے متعلق ''الاعتصام'' کی گذشتہ اشاعتوں میں تفصیل شائع کر چکے ہیں، ہمیں اس کے دہرانے کی ضرورت نہیں، کیوں کہ خود مولوی عبدالحنان نے تسلیم کیا کہ ان کا انتخاب واقعی قواعد کے خلاف تھا۔ صدرِ محترم کا فرض ہے کہ وہ ماتحت جماعتوں سے قواعد کی پابندی کرائیں اور نظام جماعت کو بے قاعدگیوں او

بے ضابطگیوں سے پاک رکھیں۔ اگر صدرِ محترم نے مولوی عبدالحنان صاحب سے یہ کہا کہ آپ قواعد کے مطابق نیا انتخاب کرائیں، جماعت جن حضرات کو عہدہ دار منتخب کرے، ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں اور میری موجودگی میں صدرِ محترم نے مولوی عبدالحنان صاحب سے فرمایا کہ ہمارے نزدیک آپ ہی باقاعدہ صدر ہیں، اس لیے ہم آپ ہی کو مخاطب کریں گے۔

خدارا کوئی بتائے، اس میں کون سی آمریت تھی، جسے مولوی عبدالحنان اور ان کے ساتھیوں نے مرکزی نظامِ جماعت سے خروج کے لیے بہانہ بنایا؟ جو شخص مولوی عبدالحنان صاحب کو اس عزت سے مخاطب کرتا ہے کہ ہمارے نزدیک آپ ہی صدر ہیں، اسی کے خلاف مولوی عبدالحنان وہ متبذل تحریر شائع کرتے ہیں، جو کسی عالم کے شایانِ شان نہیں۔

آخر میں صرف اتنا عرض کروں گا کہ صدرِ محترم پر جس قدر ذاتی حملے کیے گئے ہیں اور جس طرح کی زبان استعمال کی گئی ہے، ہم نے اس قسم کی تحریروں کا نہ پہلے جواب دیا ہے نہ اب دیں گے اور نہ صدرِ محترم اسے پسند ہی فرماتے ہیں۔ ان کا فرمانا یہ ہے کہ

> ''سفرِ آخرت قریب ہے۔ ہم نے اللہ کے سامنے حاضر ہونا ہے۔ مولوی عبدالحنان نے جو مجھ پر زیادتی کی ہے، اس کا فیصلہ اللہ تعالیٰ کے دربار میں ہی ہوگا، یہاں مَیں صبر کروں گا۔''

صحیح فرمایا... اور یہی ہمارے لیے اسوۂ حسنہ ہے۔ ﴿فاصبر إن وعدالله حق ولا يستخفنك الذين لا يوقنون﴾ اور ﴿ودع أذاهم وتوكل على وكفىٰ بالله وكيلا﴾[1]

[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۳ر فروری ۱۹۵۶ء)

جامعہ سلفیہ کی تعمیر و تعلیم کے سلسلے میں ہماری مساعی

قیامِ پاکستان سے جو علمی نقصان جماعت اہلِ حدیث کو ہوا، وہ تاریخ کا ایک اَلم ناک باب ہے۔ جماعت کے متعدد مشاہیر اہلِ علم شہید ہوئے۔ بیسیوں مدارس تباہ و برباد اور لاکھوں روپے کے بہترین اور نایاب کتب خانے نذرِ آتش ہوگئے۔

انھیں حوادث کا اثر تھا کہ پاکستان میں جماعت کے اکابر علما نے جب تنظیمِ جماعت کا کام شروع کیا تو قحط الرجال محسوس کرتے ہوئے ایک اعلیٰ اور معیاری درس گاہ کا قیام ضروری خیال کیا اور اسے اپنے مقاصد میں سرفہرست جگہ دی اور مرکزی جمعیت اہلِ حدیث مغربی پاکستان کی مجلسِ شوریٰ نے اپنی دوسری سالانہ کانفرنس منعقدہ ملتان میں مرکزی دار العلوم کے قیام کو اپنا بہترین مقصد قرار دیا۔

ملتان کانفرنس کے فوراً بعد مجلسِ عاملہ منعقدہ ۳۔۵۔۵۴ء کے اجلاس میں یہ مسئلہ پیش ہوا اور صدرِ محترم مولانا سید داود غزنوی نے اپنے مدرسے تقویۃ الاسلام کی بلڈنگ، عظیم اور نایاب کتب خانہ اور خود اپنی تمام تر خدمات مرکزی دار العلوم کے لیے پیش کیں اور لائل پوری احباب نے اس امر کی پیشکش کی کہ اگر دار العلوم لائل پور میں قائم کیا جائے تو ہم اس کے لیے ہر ممکن قربانی کریں گے۔

کچھ عرصہ بعد صدرِ محترم نے بعض وجوہ کی بنا پر اپنی تجویز واپس لے لی اور مجلسِ عاملہ نے دار العلوم کے لیے لائل پور کو حتمی طور پر منتخب کر لیا اور تیسری سالانہ کانفرنس منعقدہ لائل پور کے موقع پر اُس زمین پر ''جامعہ سلفیہ'' کا سنگِ بنیاد نصب کر دیا گیا، جو اس مقصد کے لیے کوٹ امین متصل لائل پور کے ایک مرحوم اہلِ حدیث بزرگ نے وقف فرمائی تھی۔

چوں کہ یہ زمین دو متفرق ٹکڑوں میں تھی اور جمعیت کے نام اس کا باقاعدہ انتقال بھی نہ ہوا تھا، اس لیے کوشش کی گئی کہ زمین ایک جگہ ہوسکے اور باقاعدہ انتقال بھی کرا لیا جائے، لیکن اس راہ میں کئی قسم کی قانونی اُلجھنیں تھیں، جن پر قابو نہ پایا جا سکا اور کام کو آگے نہ بڑھایا جا سکا۔ علاوہ ازیں جامعہ سلفیہ کے وسیع منصوبے کے پیشِ نظر مذکورہ زمین ناکافی تھی اور نزدیک و جوار کی زمین فیکٹری ایریا ہونے کی وجہ سے انتہائی گراں تھی، اس لیے لائل پور میں ہی کسی دوسرے مقام پر مزید زمین خریدنے کا فیصلہ ہوا اور زمین کی تلاش اور انتخاب کا سلسلہ

لائل پوری احباب بالخصوص محمد اسحاق صاحب اور مولانا عبیداللہ احرار کے سپرد کیا گیا، لیکن احباب جانتے ہیں کہ لائل پور کے قرب و جوار میں زمین کا حصول کتنا مشکل ہے، یہی وجہ ہے کہ اس کام میں بھی کافی وقت لگا۔ بالآخر یہ احباب لائل پور سمندری روڈ پر زمین تلاش کرنے میں کامیاب ہوئے۔

زمین کی اطلاع ملتے ہی مورخہ ۱۱۔ ۹۔ ۵۵ء کو صدرِ محترم مولانا سید داود غزنوی اپنے متعدد رفقا کی معیت میں لائل پور تشریف لے گئے اور زمین کو ملاحظہ فرمایا اور اس زمین کو ہر لحاظ سے جامعہ سلفیہ کے لیے موزوں پایا۔

یہ زمین ملک خضر حیات خاں کی ہے۔ لائل پور سے واپسی پر صدرِ محترم نے براہِ راست ملک صاحب سے ملنا پسند کیا۔ ملک صاحب پاکستان سے باہر گئے ہوئے تھے، اس لیے ان کی انتظار ناگزیر تھی۔ دلال کی معرفت اگرچہ قیمت کا اندازہ ہو ہی چکا تھا، تاہم ملک صاحب سے ملاقات ضروری خیال کی گئی۔ ان کی آمد پر صدرِ محترم چند احباب کی معیت میں ان سے ملے، لیکن افسوس کہ ہم جس قدر جامعہ سلفیہ کے قیام اور اس کے لیے زمین خریدنے میں بے تاب تھے، ملک صاحب اپنے مفاد کے پیشِ نظر زمین فروخت کرنے میں اتنا ہی التوا چاہتے تھے۔

مذکورہ زمین کی قیمت جس کا تخمینہ سوا لاکھ روپے کے قریب تھا، اگرچہ ہمارے وسائل سے بہت زیادہ تھی، تاہم صدرِ محترم کے ارشاد پر لائل پور کی جماعت نے چالیس ہزار اور لاہور شہر کی جماعت نے پچیس ہزار روپیہ جمع کرنے کا وعدہ اور اعلان کر دیا اور باقی رقم کی فراہمی کے لیے صدرِ محترم نے مورخہ ۱۸۔ ۹۔ ۵۵ء کو مجلسِ عاملہ کا اجلاس بلا لیا۔ مجلسِ عاملہ نے اس تمام کارروائی کی توثیق کرتے ہوئے باقی رقم تمام اَضلاع پر تقسیم کرتے ہوئے جلد از جلد اس کی ادائیگی کے عزم کا اعلان کیا۔

لیکن کسے معلوم تھا کہ پنجاب میں ہولناک اور قیامت خیز سیلاب آنے والا ہے۔ مجلسِ عاملہ کے اراکین پورے عزم سے اپنے اپنے اَضلاع میں رقوم جمع کرنے کے لیے کانفرنس کا پروگرام ہی بنا رہے تھے کہ سیلاب نے صورتِ حال ہی بدل دی اور پنجاب کا $\frac{2}{3}$ حصہ اس کی تباہ کاری کا شکار ہو گیا اور مرکزی جمعیت نے مصیبت زدگانِ سیلاب کی اِعانت کو سب سے اہم اور ضروری خیال کرتے ہوئے اپنی تمام تر توجہات اس محاذ پر مرکوز کر دیں اور اپنی پوری قوت سے سیلاب زدگان کی امداد کی اور پورے تین ماہ ہم کسی دوسری طرف دھیان نہ دے سکے۔

سیلاب زدگان کی اِعانت کا کام ختم کرتے ہی ہم نے جامعہ سلفیہ کے مسئلے پر از سرِ نو سوچ بچار کیا تو ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ اگرچہ ہم اب اس پوزیشن میں نہیں کہ مجلسِ عاملہ منعقدہ ۱۸۔ ۹۔ ۵۵ء کے فیصلے کے مطابق دو مربع زمین خرید سکیں، لیکن جامعہ سلفیہ کے قیام میں مزید تاخیر کسی صورت بھی مستحسن نہیں۔ ان حالات میں یہ

معاملہ پھر مجلسِ عاملہ منعقدہ ۱۵۔ ۱۔ ۵۶ء میں پیش کیا گیا۔

مجلسِ عاملہ نے حالات کا گہرا جائزہ لینے کے بعد فیصلہ کیا کہ دو مربع زمین خریدنے کا منصوبہ اور اسے عملی جامہ پہنانے کی پوری کوشش کی جائے، لیکن سرِدست اسی زمین پر جہاں سنگِ بنیاد نصب کیا گیا تھا، ایک مختصر اور سادہ عمارت تعمیر کر کے رمضان المبارک کے بعد تعلیمی کام شروع کر دیا جائے۔

مجلسِ عاملہ نے اسی اجلاس میں مولانا عطاء اللہ صاحب حنیف اور مولانا معین الدین صاحب لکھوی اور مجھ پر مشتمل سب کمیٹی کی تشکیل کی کہ ہم سب اولین فرصت میں لائل پور جائیں اور زمین کے مالکان کو مل کر زمین کے دونوں ٹکڑوں کو ایک ساتھ کرنے اور انتقال کرانے کے مسائل پر گفت و شنید کریں۔ ہم تینوں لائل پوری اراکین جمعیت سمیت ۲۱ر جنوری کو لائل پور سے مالکانِ زمین سے گفتگو کر کے واپس آئے ہیں اور آخری گفت و شنید مولانا محمد اسحاق، مولانا محمد صدیق صاحب اور مولانا عبدالواحد صاحب کر رہے ہیں۔

اُمید ہے کہ چند دنوں تک یہ سب مراحل طے ہو جائیں گے اور اس کے بعد فوراً ہی تعمیر کا کام شروع کر دیا جائے گا۔ مرکزی راہنما اور مجلسِ عاملہ کے اراکین کی زبردست خواہش ہے کہ یہ سب کام رمضان شریف تک سرانجام ہوسکیں اور رمضان شریف کے بعد نئے تعلیمی سال سے جامعہ سلفیہ میں تعلیمی کام کا آغاز کر دیا جائے۔

وأفوض أمري إلى الله.[1]

---

[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۲۷ر جنوری ۱۹۵۶ء)

جامعہ سلفیہ کا تعلیمی پروگرام

''الاعتصام'' ۲۷؍ جنوری میں جامعہ سلفیہ کے سلسلے میں اعلان کیا گیا تھا کہ مجلسِ عاملہ نے تین ارکان پر مشتمل سب کمیٹی کو جامعہ سلفیہ کے لیے وقف شدہ زمین کے دو الگ الگ ٹکڑوں کو ایک ساتھ کرانے اور مرکزی جمعیت کے نام انتقال کرانے کے لیے زمین کے مالکان سے آخری گفت وشنید کے لیے منتخب کیا ہے۔ امید ہے، کہ چند دنوں تک یہ سب مراحل طے ہو جائیں گے اور اس کے بعد فوراً ہی تعمیر کا کام شروع کر دیا جائے گا۔ مرکزی راہنما اور مجلسِ عاملہ کے اراکین کی زبردست خواہش ہے کہ یہ سب کام رمضان شریف تک سرانجام پا سکیں تو رمضان شریف کے بعد نئے تعلیمی سال سے جامعہ سلفیہ میں تعلیمی کام کا آغاز کر دیا جائے۔

اگرچہ ہم بعض اہم مجبوریوں کی وجہ سے تاحال جامعہ سلفیہ والی زمین پر کوئی عمارت شروع نہیں کر سکے، تاہم ہمارا قطعی پروگرام ہے کہ رمضان المبارک کے بعد تعلیم کا آغاز کر دیا جائے اور تعلیمی کام کو جامعہ کی تعمیر تک معرضِ التوا میں نہ رکھا جائے، کیوں کہ جماعت میں علما کا قحط روز بروز بڑھ رہا ہے اور جماعت کو اپنی ضروریات کے مطابق علما دستیاب نہیں ہو رہے۔ مشرقی پنجاب میں بیسیوں علما کی شہادت کے بعد گذشتہ آٹھ سال میں متعدد جید علما اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں اور جو بقیدِ حیات ہیں، وہ بھی چراغِ سحری ہیں اور اگر فوری طور پر اس طرف توجہ نہ کی گئی تو ہم اتنے شدید علمی بحران میں دوچار ہوں گے، جس سے عہدہ برآ ہونا ہمارے بس میں نہ ہوگا۔

درجہ تکمیل:

ان حالات میں ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ تعلیمی کام کا فوراً آغاز کیا جائے اور سردست ایک تو درجۂ تکمیل کا اجرا کیا جائے، تاکہ مختلف مدارس کے فارغ التحصیل، ذہین اور ہونہار طلبا کو داخل کر کے قابل اساتذہ سے ان کی تعلیمی کمی کو پورا کیا جائے۔ ہم نے یہ راستہ اس لیے اختیار کیا ہے کہ قلیل مدت میں جید علما کی ایک معقول جماعت تیار کی جا سکے اور تیار شدہ علما کا یہ گروہ جماعت کی تعلیمی اور تبلیغی ضروریات کے لیے کفیل ہو سکے۔ ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ ایسے ذہین طلبا کو باقاعدہ وظیفہ دیا جائے، تاکہ یہ طلبا اپنی ضرریات سے بے نیاز ہو کر پوری محنت سے اپنی تعلیم مکمل کر سکیں۔ ہم نے یہ بھی فیصلہ کیا ہے کہ درجہ تکمیل کے علاوہ ایک جماعت درجہ تخصص بھی جاری کر دی جائے، تاکہ دینیات، ادب وتاریخ اور علومِ آلیہ کے ماہر اور خصوصی عالم تیار کیے جا سکیں۔

درجۂ تخصص:

درجۂ تخصص میں سرِدست یہ درجات پیشِ نظر ہیں:

اول: درجۂ تخصص دینیات جس میں ذیل کے مضامین پڑھائے جائیں گے:

1. علومِ قرآن: تفسیر، اصولِ تفسیر، تاریخ جمع قرآن، تاریخ رجالِ قرآن، جغرافیہ ارض القرآن اور اعجاز القرآن۔
2. علومِ حدیث: حدیث، اصولِ حدیث، تاریخ جمع و تدوینِ حدیث اور تاریخِ حدیث۔ اس کے ساتھ ساتھ فتویٰ نویسی کی مشق۔
3. علوم فقہیہ: فقہ، اصولِ فقہ، تاریخ فقہ اسلامی، فقہ ائمہ اربعہ کا مطالعہ، اسلامی قانون اور رائج الوقت قوانین کی اہم دفعات کا مقابلہ، اجنبی ممالک کے دساتیر سے دستورِ اسلامی کا مقابلہ، اسلام کے اقتصادی قوانین کا دنیا میں رائج نظام ہائے اقتصادی سے مقابلہ۔
4. علمِ تصوف: اسلامی تصوف کو عجمی تصوف یا رہبانیت سے ممتاز کرنا اور صلحاے سلف کے مختلف طرق ہائے تزکیہ نفس اور اصلاحِ قلب سے واقفیت۔
5. علمِ کلام: مباحثِ توحید، مباحثِ نبوت و رسالت، علوم نبویہ اور عقلِ سلیم میں تطابق، تاریخِ علم کلام اور متکلمین کے مختلف مکاتیبِ فکر سے واقفیت اور غیر مسلم اقوام کے اختلاط سے اسلام میں جو بدعات داخل ہوگئی ہیں، ان کی نشان دہی۔

دوم: درجہ تخصص ادب۔ اس میں عربی ادب کی بلند پایہ نظم و نثر، تاریخ لغتِ عرب، تاریخ الخطابت (جاہلیت اور اسلام میں) اس میں تاریخ مشاہیر خطباے عرب بھی شامل ہوگی۔

علوم معانی و بلاغت، اس انداز میں پڑھانا جس سے کلام اللہ (قرآن مجید) اور کلام الرسول (احادیثِ نبویہ) میں علومِ معانی و بلاغت کے قوانین کا اجرا ہو سکے۔ اس کے علاوہ اس درجے میں تاریخِ اسلامی کی تعلیم دی جائے گی، جس میں تاریخِ دولِ اسلامیہ اور تاریخِ اشاعتِ مذہبِ اسلام بھی شامل ہوں گی۔

سوم: درجہ تخصص علومِ آلیہ۔ اس میں منطق و فلسفہ اور علمِ ہیئت کی اس طرح تعلیم دی جائے گی کہ جدید علمِ ہیئت اور منطق و فلسفے کے جدید نظریات سے طلبا کو واقفیت حاصل ہو۔

استدعا:

آخر میں جماعت اہلِ حدیث کے دینی مدارس کے اساتذہ کرام اور مہتمم حضرات اور جماعت کے معزز حضرات سے درخواست کی جاتی ہے کہ ان کے مدارس کے جو طلبا فارغ ہو چکے ہیں یا اس سال فارغ ہونے والے ہوں، انھیں جامعہ سلفیہ میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے ترغیب دیں، تاکہ جس قدر جلد ممکن ہو، جید علما کی ایک معقول تعداد تیار ہو اور جماعت کی تعلیمی اور تبلیغی ضروریات باحسن وجوہ پوری ہوسکیں۔[1]

[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور

جامعہ سلفیہ کے تعلیمی پروگرام کا آغاز

خدا کا شکر ہے کہ مرکزی جمعیت اہلِ حدیث ایک سال کی جدوجہد کے بعد اس لائق ہو پائی ہے کہ جامعہ سلفیہ کی عظیم الشان سکیم کے پروان چڑھنے کا مژدۂ جانفزا سنا سکے۔ جمعیت نے لائل پور میں پہلے پہل ''جامعہ سلفیہ'' کے منصوبے کا اعلان کیا اور وہیں اس کا سنگِ بنیاد رکھ دیا۔ مگر اس منصوبے کی تکمیل کے سلسلے میں ایک بڑی رُکاوٹ یہ سدِ راہ تھی کہ جن حضرات نے جامعہ سلفیہ کے لیے زمین وقف کی، ان کی وقف شدہ زمین کے دو ٹکڑے باہم متصل نہ تھے، بلکہ کچھ فاصلے پر تھے۔ کئی ماہ کی دوڑ دھوپ کے بعد درمیانی ٹکڑے کے مالک سے تبادلہ کر کے جامعہ سلفیہ کی زمین کو باہم ملانے میں بحمد اللہ کامیابی حاصل ہوئی۔ اس کے بعد کاغذاتِ مال میں جمعیت کے نام زمین داخل خارج کرانے میں بھی کئی ماہ صَرف ہوگئے۔

آج ہم اپنے قارئین کو یہ خوش خبری سنانے کے قابل ہوئے ہیں کہ کاغذاتِ مال میں زمین انجمن اہلِ حدیث لائل پور کے نام داخل خارج ہوگئی ہے، لیکن تحصیل دار کے سامنے ابھی تک وقف زمین کے مالکوں اور متبادل زمین کے مالکوں اور دیگر وارثوں کے بیان نہیں ہوئے۔ جونہی تحصیل دار صاحب کی تصدیق ہوگئی، موقوفہ زمین میں ان شاء اللہ تعمیر کا کام شروع کر دیا جائے گا۔ اس کے ساتھ ہی مرکزی جمعیت کے اکابر نے جامعہ سلفیہ کی زمین کے قریب کے بھٹہ کے مالک جناب میاں مولا بخش صاحب مالک نشاط ٹیکسٹائل ملز سے درخواست کی ہے کہ جس قدر جلد ممکن ہو، ہمیں جامعہ سلفیہ کی تعمیر کے لیے بیس لاکھ اینٹ تیار کر دی جائے اور اس کام کے لیے مولانا عبیداللہ احرار ناظمِ اعلیٰ جمعیت اہلِ حدیث شہر لائل پور اور مولانا عبدالواحد صاحب امام جامع اہلِ حدیث لائل پور کو متعین کیا گیا ہے کہ وہ جلد سے جلد اینٹیں حاصل کرنے کی کوشش کریں۔

تعلیمی پروگرام:

جامعہ سلفیہ کی تعمیر کا مسئلہ ظاہر ہے کہ ابھی وقت چاہتا ہے۔ وہ دو سال میں تیار ہو یا تین سال میں، اس کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا، لیکن مرکزی جمعیت اہلِ حدیث کی مجلسِ عاملہ کے اجلاس منعقدہ ۱۷ مئی میں صدرِ محترم نے اپنے اس عزم کا نہایت بلیغ اور موثر انداز میں اظہار کیا کہ جامعہ سلفیہ کی تعمیر کی تکمیل تک ہم تعلیمی پروگرام کو ملتوی نہیں کر سکتے، اس لیے تعلیم و تربیت کے منصوبے کا جلد از جلد آغاز کر دیا جائے اور کسی نوع کی تاخیر و التوا

نہ کی جائے۔ تعلیم و تربیت کے سلسلے میں صدرِ محترم نے جید اساتذہ کے حصول کی راہ میں مشکلات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

''اس عصرِ انحطاط اور قحط الرجال کے عالم میں بھی ہمارے ہاں ایسی شخصیتیں موجود ہیں کہ جن پر خود علم و فضل ناز کر سکتا ہے، مگر یہ سب حضرات اپنے اپنے حلقوں اور دائروں میں اس طرح برسوں سے درس و تدریس کا کام انجام دے رہے ہیں کہ ان کو مجبور کر کے لائل پور بھیج دینے میں مجھے کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ ان مشکلات کے باوجود میں یہ عزم کر چکا ہوں کہ جس طرح بھی ہو، جامعہ سلفیہ کا تعلیمی پروگرام شروع کر دیا جائے۔''

ان حالات کی روشنی میں مجلسِ عاملہ نے یہ فیصلہ کیا کہ سر دست اعلیٰ درجے کے مدرسین کی ایک کھیپ تیار کی جائے، جو ہماری تمام تعلیمی اور تدریسی ضروریات کی باحسن وجہ کفیل اور ضامن ہو۔ اگر سر دست ہم لائل پور کے لیے جید اساتذہ کی خدمات حاصل نہیں کر سکے تو لاہور جو خود اہلِ علم کا مرکز ہے اور یہاں کچھ مقتدر ہستیاں ایسی ہیں، جو اپنی گونا گوں مصروفیات کے باوجود اگر چاہیں تو جامعہ کے تعلیمی پروگرام کی تکمیل کے لیے وقت نکال سکتی ہیں۔ یہاں پر دار العلوم تقویۃ الاسلام کا بہت بڑا کتب خانہ اور دوسری لائبریریاں بھی ہیں، یہاں علمی فضا بھی ہے اور ایسا ماحول بھی، جس سے ذہنوں کو جلا اور روشنی حاصل ہو سکتی ہے۔ چناں چہ طے پایا کہ سر دست دو تین سال تک جامعہ سلفیہ کی تعلیمی اور تدریسی ضروریات کو پورا کرنے کی غرض سے یہاں علما کی ایک ایسی جماعت تیار کی جائے جو اپنا تعلیمی و تربیتی نصاب پورا کرنے کے بعد لائل پور میں تعلیم و تدریس کا کام باقاعدہ سنبھال سکے۔

جامعہ سلفیہ کی اس جماعت (درجہ تکمیل) میں تعلیم و تدریس کا معیار کیا ہوگا، اس کی تفصیلات تو آپ کو ''الاعتصام'' کی آیندہ اشاعت سے معلوم ہوں گی، مگر اس کا اندازہ آپ اس سے کر سکتے ہیں کہ علوم قرآنی کی تعلیم کی ذمے داری مولانا سید داود غزنوی نے بنفسِ نفیس قبول فرما لی ہے۔ علومِ حدیث کے لیے مولانا عطاء اللہ حنیف کی خدمات حاصل کی گئی ہیں اور مجھ راقم الحروف نے بھی اس باب میں اپنی خدمات پیش کی ہیں۔ ادبیاتِ عربی کی تکمیل کے لیے مولانا محمد حنیف ندوی نے اپنی خدمات سے جامعہ کو نوازا ہے۔ دوسرے علوم منطق و فلسفہ اور علمِ کلام وغیرہ کے لیے مولانا شریف اللہ (سابق صدر مدرس دارالعلوم فتح پور، دہلی) کے وسیع تعلیمی تجربے سے استفادے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ جامعہ سلفیہ میں چوں کہ ہمیں منتہی طلبا کو لینا ہے اور ان فنون کی تکمیل کرانا ہے، جو وہ پوری طرح حاصل نہیں کر سکے، اس لیے ایسے پارٹ ٹائم لیکچراروں کا بھی انتظام کیا جا رہا ہے، جو طلبا کے جنرل نالج (معلوماتِ عامہ) میں اضافہ کریں اور ان کو اس قابل بنائیں کہ یہ تعلیم و تدریس ایسے اہم فریضے سے پوری ذمے داری سے عہدہ برآ ہو سکیں۔ ایک ایسے عرب مدرس کا انتظام بھی کیا جا رہا ہے، جو عربی زبان میں

تقریر اور تحریر کی اعلیٰ پیمانے پر مشق کرائیں، تاکہ جامعہ سلفیہ کے فارغ طلبا آج کی مروجہ زبان عربی میں لکھنے اور بولنے کے قابل ہوں۔

طلبا کا داخلہ:

ایسے محنتی اور ذہین طلبا، جو جامعہ سلفیہ کے درجہ تکمیل میں داخل ہونا چاہیں، انھیں بہت جلد اپنی درخواستیں مرکزی جمعیت کے دفتر میں بھیج دینی چاہییں، تاکہ انھیں امتحان کے بعد جامعہ سلفیہ کی اس کلاس میں داخل کیا جائے۔ طلبا کو تین سال کے لیے یکسو ہو کر اپنی صلاحیتوں کو صَرف کرنا ہوگا۔ جماعت کی طرف سے ان طلبا کو حسبِ استعداد اور ان کی ضرورت کے پیشِ نظر وظائف دیے جائیں گے اور کوشش کی جائے گی کہ ان کے ذہن وفکر کی تربیت کے لیے ایسی سازگار آب و ہوا پیدا کی جائے، جو ہر لحاظ سے ضروری اور موزوں ہو۔

اس سلسلے میں علمائے کرام سے درخواست ہے کہ وہ فارغ طلبا یا اس سال فارغ ہونے والوں کو جامعہ سلفیہ کے درجۂ تکمیل میں تعلیم حاصل کرنے کی ترغیب دیں، تاکہ ہم منتخب طلبا میں سے جید علما کی ایک معقول تعداد تیار کر سکیں۔

اہلِ خیر سے اپیل:

ہم ان تمام مخیّر حضرات سے جو دینی علوم کی ترویج کا جذبہ صادق اپنے دل میں رکھتے ہیں، اپیل کرتے ہیں کہ وہ فراخ دلی کے ساتھ جمعیت کا ہاتھ بٹائیں اور کم از کم مالی پریشانیوں سے جمعیت کو دوچار نہ ہونے دیں۔ اللہ تعالیٰ ہماری مساعی کو قبول فرمائے اور ان کاموں کی انجام دہی کی توفیق بخشے![1]

---

[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۲۵؍ مئی ۱۹۵۶ء)

جامعہ سلفیہ میں کچھ لمحے

اپنی ذمے داری کے لحاظ سے تقریباً ۱۵؍شوال کو مجھے جامعہ سلفیہ پہنچ جانا چاہیے تھا، مگر آغاز شوال ہی میں طبیعت کچھ اس طرح خراب ہوئی کہ سارے پروگرام ملتوی ہو گئے۔ ۲۰؍شوال کے بعد کچھ افاقہ ہوا۔ خیال تھا کہ وزیر آباد سے ہو کر ۲۵؍شوال تک جامعہ پہنچوں گا۔ مہتمم جامعہ کئی دفعہ بلا چکے تھے۔ ۲۳؍شوال رات کو مولانا محمد اسحاق صاحب مہتمم جامعہ کا تار آیا۔ مَیں باقی پروگرام منسوخ کر کے صبح ۵ بجے کی بس سے ۱۰ بجے کے قریب جامعہ میں پہنچ گیا۔

بحمد اللہ جامعہ کی رونق قابلِ رشک ہے۔ طلبا کی تعداد سو سے اوپر ہو رہی ہے اور ابھی تانتا بندھا ہوا ہے۔ سارے مغربی پاکستان کے علاوہ مشرقی پاکستان اور بلتستان سے بھی طلبا کی خاصی تعداد پہنچ چکی ہے۔ اساتذہ اپنے اپنے کمروں میں مشغول تھے۔

جامعہ کی فضا امسال بہت اچھی ہے۔ سبزی کی حالت بحمد اللہ اچھی ہے۔ امسال امید ہے کہ سبزی کے لیے جامعہ کی اپنی فصل کفایت کرے گی۔ جامعہ کا باغ سرسبز ہے۔ جامعہ کے کنویں کا پانی غسل اور کھیتی وغیرہ کے لیے کافی ہے اور اس گرم موسم میں لائل پور ایسے شہر میں بسا غنیمت ہے۔

اساتذہ:

امسال قابل اساتذہ کا اجتماع جامعہ کے مستقبل کے لیے نیک فال ہے۔ شیخ الجامعہ کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ مولانا شریف اللہ صاحب اپنی اخلاقی رفعت، محنت، طلبا کے ساتھ محبت کے لحاظ سے بے نظیر شخصیت ہیں۔ مولانا عبدالغفار حسن صاحب اسی سال جامعہ میں تشریف لائے ہیں۔ مولانا کی متانت، خلوص اور تعلیمی تجربہ اور انہماک؛ امید ہے طلبا کی زندگیوں میں انقلاب پیدا کر دے گا۔ مولانا عبداللطیف صاحب سمندری میں اقامت کی وجہ سے علاقے میں متعارف اور ہر دلعزیز ہیں۔ آپ کا وجود جامعہ کے لیے ان شاء اللہ خیر و برکت کا موجب ہوگا۔

احباب لائل پور

تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ مولانا محمد اسحاق (مہتمم جامعہ) مولانا عبیداللہ احرار (ناظم تعمیرات) مولانا

محمد یعقوب صاحب بن مولانا خیر محمد صاحب مرحوم بھانبڑی جامعہ میں تشریف لائے، یہ تینوں حضرات لائل پور کے اچھے کاروباری ہیں۔ جامعہ کے کام میں جستہ اور وقت اور روپیہ صَرف فرماتے ہیں۔ کثر اللّٰه أمثالهم. ان کے علاوہ بہت سے رفقا لائل پور میں جامعہ کی خدمات کو سرمایۂ افتخار سمجھتے ہیں۔ اس وقت دوپہر ہو چکی تھی، بعض ضروری امور کے متعلق مشورے کے بعد خیال تھا، تھوڑی دیر آرام کریں، لیکن ظہر کی اذان ہوگئی۔

جامعہ اور مسجد:

ہمارے ذہن میں جامعہ کا نقشہ چار اہم حصوں پر مشتمل ہے، دفاتر، ہال و رہایش گاہ، مسجد، اساتذہ کے مکانات۔ معلوم ہے کہ اس منصوبے پر لاکھوں روپیہ صَرف ہوگا اور معلوم نہیں کتنی دیر میں تکمیل تک پہنچے، لیکن اس وقت مسجد نہ ہونے کی وجہ سے بے حد تکلیف ہے۔ گرمی میں ظہر، عصر اور سردی میں عشا اور صبح کی نمازوں کے لیے بے حد وقت ہوتی ہے۔ نماز کے لیے کوئی موزوں جگہ نہیں۔ موجود کمرے طلبا کی رہایش کے لیے بھی کم ہیں۔ اس وقت اساتذہ وطلبا اس مختصر سی عمارت میں گزر کر رہے ہیں۔ رہایش، نماز اور اسباق؛ سب ان پندروں کمروں میں ہو رہے ہیں۔ یقیناً ان حضرات کا یہ ایثار آنے والے دَور کے لیے ایک مثالی دَور ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ان سب حضرات کو جزائے خیر دے۔

مسجد کی تعمیر اور اس کے اسباب پر غور کرنے میں احباب پر زور دیا کہ آپ اس میں پہلے قدم اُٹھائیں، چناں چہ فیصلہ ہوا کہ مسجد کی تعمیر میں جس قدر ریت اور بجری صَرف ہو، وہ مولانا عبیداللہ صاحب عنایت فرمائیں گے۔ جس قدر سیمنٹ خرچ ہو، وہ مولانا محمد یعقوب صاحب مرحمت فرمائیں گے۔ لکڑی کی پوری ذمے داری مولانا محمد اسحاق صاحب نے اُٹھائی۔ مجھے یقین ہے کہ اینٹوں کی کفالت صاحب الجود مولانا فضل الحق صاحب کا بھٹہ کرے گا۔ لیبر اور لوہے کے مصارف گوجرانوالہ، سیالکوٹ اور سرگودھا کے غربا اور مساکین اٹھائیں گے۔ اس کے لیے کوشش میرا ذمہ ہوگا۔ ان شاء اللہ

جامعہ کا نقشہ:

جامعہ کے نقشے کی تکمیل کے لیے کچھ مزید زمین کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے رفیقِ محترم حاجی محمد اسحاق صاحب (گلوب فیکٹری والے) سے بہتر کوئی آدمی نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ حاجی ظہور الٰہی صاحب اور شیخ عمر الدین صاحب تاجر چرم سیالکوٹ ان کے لیے تعاون فرمائیں گے۔

امید ہے کہ یہ مخلص رفقا میری گزارش کو قبول فرما کر جماعت کو ممنون فرمائیں گے اور مسجد کے اس منصوبے کو عملی جامہ پہنا کر اپنے لیے باقیاتِ صالحات کا ذریعہ بنائیں گے۔[1]

---

[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۱۹۵۹ء)

جامعہ سلفیہ لائل پور

جامعہ سلفیہ کا منصوبہ شروع کرتے وقت اس راہ کی بہت سی مشکلات کا علم تھا۔ تجربے سے مزید مشکلات کا بھی علم ہوا ہے۔ دنیا میں کون سا کام ہے، جس میں مشکلات نہیں؟ جو لوگ جامعہ کے نظام کو چلا رہے ہیں، وہ اِجمالاً ان دقتوں سے آگاہ ہیں۔ اس لیے کسی مایوسی کے بغیر بحمد اللہ کام چل رہا ہے۔ گرانی کی وجہ سے اخراجات میں خلافِ اُمید اضافہ ہوا ہے۔ مشاہرات پر گرانی کا اثر ہے۔ احباب کی توجہ اور تعاون سے پھر بھی بحمد اللہ کام بڑھ رہا ہے۔ امسال ان مشکلات کے باوجود چالیس ہزار سے ایک ایکڑ زمین کا مزید سودا کر لیا گیا ہے۔ اربابِ خیر کی توجہ سے اُمید ہے کہ یہ رقم بھی فراہم ہو جائے گی۔

گذشتہ سال جب حکومت نے پتوکی کانفرنس روک دی، آپ کے خادم بے حد متفکر تھے کہ وقت کیسے گزرے گا؟ ساٹھ ستر ہزار کے مصارف کہاں سے آئیں گے؟ سارے ذمے دار حضرات اس وقت بیم و رجا میں وقت گزار رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے دوستوں نے یہ مرحلہ بھی خاموشی سے طے کر لیا۔ آج سال گزر رہا ہے اور شکر ہے نہ جامعہ مقروض ہے نہ زیرِ بار۔ یقیناً ہم جمع نہیں کر سکے، لیکن اس کا احسان ہے، سال اِتمام تک پہنچ گیا اور ہمیں کوئی خاص تکلیف نہیں ہوئی۔

اس وقت جامعہ کا سب سے اہم مرحلہ جامعہ کی عمارت ہے۔ گرانی کے اس دَور میں اس کے لیے لاکھوں روپے کی ضرورت ہے اور یہ اَحباب کی پوری اور صحیح توجہ ہی سے اِتمام تک پہنچ سکتی ہے۔ جامعہ کی تاسیس کے وقت محترم حاجی مولا بخش صاحب چنیوٹی نے جامعہ کے متعلق بہت ہی سہارا دیا اور سچ یہ ہے کہ لائل پور میں جامعہ کی تعمیر اور تاسیس کا ایک اہم سبب مرحوم حاجی مولا بخش صاحب کی حوصلہ افزائی اور ان کے پُر امید مواعید تھے۔ مرحوم کا وعدہ تھا، جامعہ پر جتنی اینٹ خرچ ہو، وہ اصلی لاگت پر (جو اس وقت ۱۸ روپیا ہزار تھی) جامعہ کو عنایت فرمائیں گے۔ جامعہ کی چار دیواری اپنے مصارف سے بنائیں گے۔ سالانہ دو ہزار روپے عنایت فرمائیں گے۔ چناں چہ پہلی قسط دو ہزار لائل پور کانفرنس میں انھوں نے عنایت فرما دی۔ اس کے بعد وقتاً فوقتاً مرحوم کی طرف سے جامعہ کی اعانت ہوتی رہی۔

اب مرحوم حاجی صاحب اللہ کو پیارے ہو چکے۔ ان کے لڑکے دولت مند ہیں۔ ان کے وسیع کاروبار

ہیں۔نشاط مل حاجی صاحب کی زندہ یادگار ہے۔اگر وہ ان فقرا کی جھونپڑیوں کو عظیم الشان عمارت کی صورت دینا چاہیں، ان کے لیے کوئی مشکل نہیں۔اگر ایسا نہ ہو سکے تو تمام اہلِ توحید وسنت کا فرض ہے کہ وہ جامعہ کی تعمیر کو تکمیل تک پہنچائیں۔

محترم حاجی محمد اسحاق صاحب حنیف اور میاں عبدالمجید صاحب کی تجویز تھی کہ پندرہ بیس دوست چار چار ہزار روپیہ سالانہ عنایت فرما کر تعلیمی اخراجات کی بہت سی ضرورت کو پورا کر دیں۔گذشتہ سال اسی قسم کی جراَت مندانہ اعانت سے ساٹھ ستر ہزار روپے کے اخراجات پورے ہوئے۔

رجب اور رمضان:

اب صدقات کے مہینے آرہے ہیں۔احباب تھوڑی سی توجہ فرما دیں تو تعلیم کے علاوہ ایک لاکھ روپیا سالانہ بھی ہم عمارت پر خرچ کر دیں تو چند سالوں میں بقدرِ ضرورت عمارت بن سکتی ہے۔یہ گزارشات اسی مقصد کے لیے کی جارہی ہیں کہ اواخر رمضان تک تعلیم کے علاوہ تعمیر فنڈ کے لیے کم سے کم ایک لاکھ روپیا جمع ہوجانا چاہیے۔

سب سے بہتر تجویز یہ ہے کہ شہری اور اَضلاع کی جماعتیں عمارت کے مختلف حصے اپنے ذمے لے لیں اور بتدریج ان کی تکمیل کرا دیں۔اس سے منتظمینِ جامعہ کا بہت سا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔محترم الحاج شیخ عبدالوہاب نے مسجد کا ذمہ لے لیا ہے۔اسی طرح اور اصحابِ ثروت دار الحدیث ہال، دار المطالعہ، اساتذہ کے مکانات، دار الصنعہ کے حصص، اپنے ذمے لے کر جامعہ کو مستغنی فرمائیں تو ان کا احسان ہوگا اور اللہ تعالیٰ کی رضا مندی کا موجب، اور ہم حساب وکتاب کی جواب دہی سے بچ جائیں گے۔

تربیت:

جامعہ کے متعلق اَحباب کے خطوط اور زبانی اطلاعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ طلبا کے اخلاقی احتساب کی بے حد ضرورت ہے۔طلبا کی باہم آویزش، گفتگو میں بے اعتدالی، آدابِ تلمذ سے بے اعتنائی، اسے کتنا ہی معمولی سمجھا جائے، یہ اخلاقی نقص ہے، جس کی اصلاح ہمارا فرض ہے۔ پرانے دینی مدارس میں یہ ضرورت، اساتذہ کے حسنِ اخلاق اور تقوے سے خود بہ خود پوری ہوجاتی تھی۔ اساتذہ کا تقدس، ہمدردی اور حسنِ اخلاق ایک ایسا موثر ذریعہ ہوتا تھا کہ ہوسٹل سپرنٹنڈنٹ کی ہمارے مدارس میں کبھی ضرورت ہی محسوس نہیں کی گئی۔

مگر اب طلبا کی کثرت، اساتذہ کی تعلیمی مشغولیت، کچھ ماحول کی گندگی اور انگریزی مدارس کی تقلید کی وجہ سے طلبا کی اخلاقی اَقدار اور اساتذہ کی مشفقانہ توجہات کم ہوگئی ہیں۔ اس لیے معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے مدارس کی طرح جامعہ میں بھی اخلاقی احتساب کی آسامی خالی ہے اور اُسے پر کرنا ضروری ہے۔

ادارہ اہتمام:

جامعہ میں اہتمام کی ذمے داری ایک آدمی پر نہیں، بلکہ یہ کام مولانا محمد صدیق، مولانا اسحاق، مولانا عبیداللہ صاحب احرار اور مولانا محمد یعقوب کے سپرد ہے۔ عمومی انتظام میں مولانا محمد اسحاق صاحب نے کافی وقت دیا اور ان کی مساعی قابلِ شکریہ ہیں، انھوں نے اَن تھک محنت کی۔

تقسیمِ کار کے اصول پر خیال تھا کہ اخلاقی احتساب کی ذمے داری مولانا محمد صدیق صاحب اپنے ذمے لے لیں گے، وہ لائل پور اہلِ حدیث جامع مسجد کے خطیب ہیں۔ مستند عالم ہیں، بہترین خطیب اور مناظر ہیں۔ ان کی موجودگی سے اخلاق کے علاوہ طلبا اور بھی کئی قسم کے فوائد حاصل کر سکتے ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ مولانا جامعہ کے لیے کوئی وقت نہیں نکال سکے۔ اب تو غالباً انتخابات کے جھمیلوں سے بھی ان کو چند دن سے دلچسپی نہیں۔ اگر فارغ وقت جامعہ کو دیں تو یہ دین کی ایک بہت بڑی خدمت ہوگی۔ اگر وہ ہماری گزارش کو شرفِ قبولیت نہ بخش سکیں تو بہر حال جامعہ سلفیہ کمیٹی کو اس اسامی کے لیے سوچنا پڑے گا۔ مالی حالات اچھے ہوں تو الاؤنس وغیرہ بھی دیا جا سکتا ہے۔ اگر کوئی بزرگ اس کے لیے اپنی خدمات پیش فرمائیں تو بہت ہی مبارک ہوگا۔ میری نظر میں دو تین بزرگ ہیں، وہ یہ کام بہتر طور پر کر سکتے ہیں۔ غرض یہ ضرورت پیشِ نظر ہے، جسے ان شاء اللہ پورا کیا جائے گا۔

ہمارے زکی الحس دوست:

جامعہ میں طلبا کی تعداد عموماً سو سے اوپر ہوتی ہے۔ بچے مختلف مقامات سے آئے ہوتے ہیں، بلکہ مختلف ممالک سے، مشرقی بنگال اور بلتستان تک کے طلبا موجود ہیں۔ پھر ان کا تعلق مختلف النوع کنبوں اور خاندانوں سے ہے، اس لیے ان کے عادات اور اَخلاق کا اختلاف لازمی ہے۔ ہمارے بیرونی دوست جامعہ جاتے ہیں تو وہ پہلے ہی سوچ لیتے ہیں کہ جامعہ شاید فرشتوں کی بستی ہوگی، وہاں ملائکہ آباد ہیں، وہاں اَتقیا کی جماعت اوراد و وظائف میں مشغول ہوگی۔ ان کا یہ حسن ظن قابلِ تعریف ہے. لیکن جامعہ نو آموز طلبا اور نا تجربہ کار بچوں کا ایک مکتب ہے۔ وہاں لڑائی جھگڑا، شور ہنگامہ، اس کے علاوہ بیسیوں غلطیاں ممکن ہیں۔ اس لیے ہمارے زکی الحس حضرات کو اس سے گھبرانا نہیں چاہیے، بلکہ منتظمینِ جامعہ کو اپنے مفید مشوروں سے ممنون کرنا چاہیے۔ طعن و تشنیع کے بغیر اپنی رائے کا اظہار کرنا چاہیے۔ یہی نصیحت کا مفید طریقہ ہے۔

میں بعض اوقات اپنی ڈاک پڑھتا ہوں تو مجھے احباب کے ارشادات پر ہنسی آتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں: ”میں جامعہ گیا، دو طالب علم لڑ رہے تھے، میں نے خود دیکھا، وہ عصر کے بعد کھیل رہے تھے۔ ایک اُستاد لیٹا ہوا تھا۔ طلبا ہنس رہے تھے۔ یہ خاک اسلام کی خدمت کریں گے، بڑی مدت سے جامعہ کے متعلق سن رہے تھے، دیکھنے کا شوق

تھا، لیکن دیکھ کر افسوس ہوا۔ خدا کے لیے رقوم کا روپیہ برباد نہ کیجیے۔"

یہی حضرات سیدھی زبان سے مشورہ دیں تو ہم ان کے ممنون ہیں۔ ہماری خواہش ہے احباب اپنے مشوروں سے ہم پر نوازش فرمائیں، تاکہ ہم ان کی روشنی میں جامعہ کو بہتر بنا سکیں۔

ان کے اس لب و لہجے سے نقصان ہوتا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ لائل پور اور بعض دوسرے مقامات میں جامعہ اور جمعیت کی نفاق انگیز مخالفت ہوتی ہے۔ ان خطوط کو اسی نوع سے شمار کر کے انھیں ردی کی ٹوکری میں پھینک دیتا ہوں۔ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے: «المسلم مرآة المسلم»[1] اگر احباب اپنے مشورے ناصحانہ انداز سے ارشاد فرمائیں تو ہم ان کے شکر گزار ہوں گے۔

غور طلب مسئلہ یہ ہے کہ جب سے جمعیت اور جامعہ کی تاسیس عمل میں آئی، بحمد اللہ ہم آگے بڑھے ہیں، جماعت میں حرکت بھی ہے۔ جماعت کے وقار میں اضافہ ہوا ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ اخلاص سے مخالفت بھی مفید ہو سکتی ہے اور نفاق آمیز نصیحت سے بھی کچھ حاصل نہیں ہوتا ہے۔[2]

---

[1] ان الفاظ کے ساتھ یہ حدیث "یحییٰ بن عبید اللہ" کی وجہ سے سخت ضعیف ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (١٨٨٩) ضعيف الجامع، رقم الحديث (١٢٧٠٢) البتہ ان الفاظ «المؤمن مرآة المؤمن» کے ساتھ یہ روایت سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٩١٨) میں حسن سند کے ساتھ مروی ہے۔

[2] ہفت روزہ "الاعتصام" لاہور (١٦/ دسمبر ١٩٦٠ء)

جامعہ سلفیہ کا وفد سیالکوٹ میں

جامعہ سلفیہ کا وفد مشتمل بر صدر جمعیت ضلع گوجرانوالہ مولانا فضل الحق صاحب مالک چناب رائس ملز حافظ آباد، مولانا عبدالستار صاحب مالک ستارہ فیکٹری اور راقم الحروف صبح ۷ بجے مولانا فضل الحق صاحب کی کار سے سیالکوٹ پہنچے۔

احبابِ سیالکوٹ نے نہایت خلوص اور فراخ دلی سے وفد کے ساتھ تعاون فرمایا۔ سب سے پہلے حافظ محمد شریف صاحب مالک ونڈر کلاتھ ہاؤس ملے۔ اس کے بعد حاجی ظہور الٰہی صاحب، محمد شفیع صاحب سیٹھی، شیخ محمد نذیر صاحب اور مولانا محمد اسماعیل صاحب سے ملاقات ہوئی۔

ان حضرات کی قیادت میں ہم سیالکوٹ کے احباب سے ملے۔ قریباً دو گھنٹے تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ مبلغ ۳۵۸ روپے کی رقم احباب سیالکوٹ نے مرحمت فرمائی، جس کی فہرست نیچے شائع ہو رہی ہے۔ جزاھم اللّٰه أحسن الجزاء. اللھم بارك لھم في أھلھم ومالھم وأعمالھم.

سیٹھی صاحب اور میاں نذیر صاحب کے ہم ممنون ہیں کہ وہ پورا وقت وفد کے ساتھ رہے۔ ان کے وسیع رسوخ اور تعارف سے اللہ تعالیٰ نے کامیابی مرحمت فرمائی۔

حاجی ظہور الٰہی صاحب نے اپنی جیب خاص سے مبلغ ایک ہزار روپیہ مرحمت فرمایا۔ اس کے علاوہ جس قدر احباب نے وعدے فرمائے، حاجی صاحب نے وہ رقوم اپنی جیب سے اسی وقت نقد ادا فرما دیں۔ اس لیے حاجی صاحب کی بھرپور جیب بے حد مفید ثابت ہوئی۔ حاجی صاحب کی اخلاص بھری گفتگو بھی وفد کی کامیابی میں برابر کی حصے دار ہے۔

جامعہ کے مقاصد کی تقدیس کا یہ اثر تھا کہ کئی بریلوی دوستوں نے بھی کھلے دل سے اعانت فرمائی، حالاں کہ مسلک اہلِ حدیث سے انھیں چنداں اتفاق نہ تھا۔ جزاھم اللّٰه أحسن الجزاء.

یہ سوچ رہا ہوں کہ مولانا فضل الحق اور مولانا عبدالستار صاحب کا شکریہ میں ادا کروں یا وہ میرا شکریہ ادا کریں۔ بالآخر طبیعت نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ مجھے ہی ان کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ ان کی کار جماعت کی کار کی طرح استعمال ہو رہی ہے۔ وہ حافظ آباد سے کراچی تک پھیلے ہوئے کاروبار کو چھوڑ کر ایک درویش صفت ساتھی

کی طرح کام کر رہے ہیں۔

سیالکوٹ سے واپس ہوتے وقت وزیر آباد اپنے محترم دوست شیخ عبدالحمید صاحب کے پاس پہنچے، انھوں نے پانچ صد روپیہ اپنی جیب خاص سے مرحمت فرمایا اور وعدہ فرمایا کہ وہ جمعۃ المبارک تک مبلغ ایک ہزار روپیہ اور جماعت کو بھیجنے کی کوشش فرمائیں گے۔

اس ضمن میں ہم اپنے محترم بزرگ عمر الدین صاحب تاجر چرم کے پرخلوص برتاؤ سے بے حد متاثر ہوئے ہیں، جنھوں نے گذشتہ سال بھی ایک ہزار روپیہ مرحمت فرمایا۔ اس دفعہ بھی پانچ صد روپیہ مرحمت فرمایا اور پانچ صد روپیہ عن قریب بھیجنے کا وعدہ فرمایا۔

عن قریب ارکانِ وفد کاموںکی منڈی اور حافظ آباد بھی پہنچیں گے۔ دونوں مقام کے احباب کو پہلے سے تیار رہنا چاہیے۔

آخر میں تمام احباب کو عموماً اور ارکانِ عاملہ اور شوریٰ کو خاص طور پر توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ کام کرنے سے ہوگا، آپ اپنی ذمے داریوں کو محسوس کریں۔

محمد اسماعیل کان اللہ لہ یکے از ارکانِ وفد

فہرست رقوم:

آمدہ از جماعت اہلِ حدیث سیالکوٹ برائے جامعہ سلفیہ:

حاجی ظہور الٰہی صاحب	۱۰۰۰ روپیہ
الحاج شیخ عمر دین صاحب	۵۰۰ روپیہ
شیخ محمد نذیر صاحب	۵۰ روپیہ
شیخ عنایت اللہ صاحب سوداگر چرم	۱۰۰ روپیہ
شیخ فضل کریم صاحب سوداگر چرم	۱۰۰ روپیہ
حاجی شیخ جلال الدین صاحب اگر چرم	۲۰۰ روپیہ
شیخ عبدالمجید صاحب کپور اینڈ کمپنی	۱۰۰ روپیہ
شیخ غفوری حاجی اللہ دتہ صاحب رئیس	۲۰۰ روپیہ
شیخ محمد صدیق محمد انور صاحب	۲۰۰ روپیہ
چودھری فضل حسین صاحب سپرٹ ہاؤس	۲۰۰ روپیہ

حاجی محمد اسماعیل احمد کمپنی ۱۰۰ روپیہ

حاجی محمد حسین محمد سلیم سوت والے ۲۰۰ روپیہ

شیخ امام الدین صاحب ۵۰ روپیہ

شیخ محمد شفیع صاحب سیٹھی ۲۰۰ روپیہ

حاجی شیخ خدا بخش صاحب ۲۰۰ روپیہ

مولوی محمد اسماعیل صاحب حکیم خطیب جامع احمد پورہ ۱۰۰ روپیہ[1]

[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۲۵/ مارچ ۱۹۶۰ء)

جلسہ انجمن اہلِ حدیث سرگودھا

سرگودھا کسی وقت دور افتادہ شہر سمجھا جاتا تھا۔ صرف شیخ فضل کریم صاحب مرحوم کا گھر توحید و سنت سے مانوس تھا۔ ۱۹۴۷ء کے انقلاب میں امرتسر وغیرہ مقامات سے بہت سے اہلِ توحید وہاں آباد ہوئے۔ حضرت مولانا ثناء اللہ صاحب مغفور نے بھی وہیں سکونت اختیار فرمائی، بلکہ حضرت مرحوم کی دائمی اِقامت کے لیے بھی قدرت نے یہی شہر انتخاب فرمایا۔ جہاں مرحوم نے زندگی کے آخری ایام گزار کر جنت کی راہ لی اور سرگودھا کے قبرستان کو اپنے قیام سے برکت بخشی۔ مرحوم نے آخری ایامِ حیات میں مسجد اہلِ حدیث کی تعمیر کے لیے کوشش فرمائی۔ جماعت کے تعاون سے ایک وسیع قطعہ اراضی اسی غرض کے لیے حاصل کیا، جس پر ایک سادہ مگر وسیع مسجد تعمیر ہو چکی ہے۔

جماعت کے صدر برادرِ محترم مولانا رضاء اللہ صاحب نبیرہ حضرت مولانا ثناء اللہ صاحب ہیں، جو ایک نوجوان عالم ہیں۔ سرگودھا میں کاروبار کر رہے ہیں۔ جماعت کے ناظم میاں عبدالعزیز صاحب ہیں۔ وہ بھی غالباً امرتسر ہی سے آئے ہوئے ہیں۔

جماعت اس وقت اچھا کام کر رہی ہے۔ مخلصینِ جماعت میں بعض حضرات توحید و سنت کی اشاعت میں ازبس سرگرم ہیں۔ خدا تعالیٰ انھیں مزید کام کی توفیق عطا فرمائے اور اعمال میں خلوص نصیب کرے۔

۱۵۔ ۱۶/ مئی ۱۹۵۲ء انجمن اہلِ حدیث سرگودھا کا جلسہ تھا۔ صدر جمعیت اہلِ حدیث پاکستان حضرت مولانا محمد داود صاحب غزنوی ۱۵/ مئی کی صبح کو سرگودھا پہنچ گئے تھے۔ جمعہ وہیں پڑھایا۔ مولانا عبداللہ ثانی، مولانا احمد دین گکھڑوی، حافظ محمد یوسف، مولوی یحییٰ حافظ آبادی، اور بھی بہت سے علما پہنچ گئے تھے۔ جلسہ باہر باغ میں تھا۔ علما نے مختلف مضامین پر بڑی سنجیدہ تقاریر کیں۔ مولوی احمد دین صاحب کی آخری تقریر کا عنوان ''دو مسیح'' تھا۔ تقریر بڑی دلچسپ تھی۔ مولانا نے مسیحِ قادیان اور حضرت مسیح علیہ السلام میں فرق بتایا۔ آنحضرت کے بتائے ہوئے نشانات کی روشنی میں واضح فرمایا کہ مسیح قادیانی میں وہ نشانات نہیں پائے جاتے۔ ۱۶/ مئی کی رات کو گیارہ بجے جلسہ بڑی خیر و خوبی سے ختم ہوا۔

جماعتوں کو چاہیے کہ سالانہ جلسے کے علاوہ بھی علاقے میں کام کریں۔ توحید و سنت کی اشاعت، اعمالِ صالحہ کی عوام کو ترغیب دلائیں۔ جلسہ تعارف کا ذریعہ ہے، کام اس کے بعد شروع ہوتا ہے۔

انجمن اہلِ حدیث سرگودھا نے اپنی مجلسِ شوریٰ میں جمعیت اہلِ حدیث پاکستان کے ساتھ الحاق کا فیصلہ کیا۔[1]

---

[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۲۳/ مئی ۱۹۵۲ء)

سرگودھا اور جہلم میں جماعت اہلِ حدیث کے اجلاس

اور علاقہ آزاد کشمیر میں حضرت مولانا حافظ محمد اسماعیل صاحب روپڑی کی تبلیغی کوششیں

تقسیم کے بعد کشمیر میں جو دھاندلی مچی، اس کی وجہ سے جماعت اہلِ حدیث پر بے حد مصیبت آئی۔ ہزاروں بے چارے کیمپوں میں زندگی کے دن کاٹ رہے ہیں اور سیکڑوں موت کی آغوش میں سو چکے ہیں۔ اس کے باوجود بہت بڑی جمعیت صبر و استقلال سے باڈر کے متصل حفاظتی دستوں کا کام دے رہی ہے۔ اس علاقے کے بیدار مغز ورکروں کی کوششوں سے نومبر میں کوٹلی تحصیل میر پور میں ایک تبلیغی جلسہ ہوا۔

محترم مولانا حافظ محمد اسماعیل صاحب روپڑی وہاں تشریف لے گئے۔ مختلف مضامین پر محترم حافظ صاحب کی تقریریں ہوئیں۔ عمائدِ حکومت اور دوسرے افسروں نے ہمدردی اور دلچسپی سے یہ تقریریں سنیں، بلکہ جلسے کے انتظامات میں کافی حد تک تعاون فرمایا، جس کے لیے جمعیت اہلِ حدیث مغربی پاکستان ان کی ممنون ہے۔

اسی قسم کی تبلیغی کوششیں پچھلے دنوں سرگودھا اور جہلم میں کی گئیں۔ سرگودھا میں محرم کے دنوں میں شیعہ حضرات نے بڑی دلخراش صورت پیدا کی۔ اس کے کچھ دن بعد سیرت کے جلسوں کا ڈھونگ رچا کر عامۃ المسلمین کو گمراہ کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس پر سرگودھا کے تمام مسلمانوں نے مل کر شیعہ دسیسہ کاریوں کا تار پود بکھیرا اور بہترین اور کامیاب جلسے کیے۔ اُمید ہے دوسری جماعتیں بھی اپنی ذمے داریوں کو محسوس کرتے ہوئے اپنے فرائض کو انجام دیں گی، مرکزی جمعیت ہر ممکن تعاون کے لیے تیار ہے۔

ان جلسوں میں اس چیز پر اِظہارِ افسوس کیا گیا کہ پاکستان کے آئین کی تشکیل میں بلاوجہ التوا ہو رہا ہے۔ حکومت کو جلد از جلد شرعی قوانین نافذ کر کے اس حکومت کو خالص دینی حکومت قرار دے دینا چاہیے اور خود حکامِ بالا اور اربابِ حل و عقد کو اسلام کے احکام کا پابند ہونا چاہیے۔

جہلم میں مولانا عبدالمجید صاحب دینانگری اور دوسرے مقامی دوستوں اور بزرگوں کی مساعی سے کافی کام ہو رہا ہے۔ مولانا ایسے حضرات کا وجود جماعت کے لیے بہت غنیمت ہے۔[1]

[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۱۵ر دسمبر ۱۹۵۱ء)

چوتھی سالانہ اہلِ حدیث کانفرنس گوجرانوالہ

تاریخوں کی تبدیلی

مجلسِ استقبالیہ اہلِ حدیث کانفرنس گوجرانوالہ کی خواہش کے مطابق کانفرنس کی مشتہرہ تاریخیں تبدیل کر دی گئی ہیں۔ مجلسِ استقبالیہ کی رائے میں گرمی کی شدت کانفرنس کی کامیابی کی راہ میں مشکلات کا باعث ہوگی۔ نہ باہر سے نمایندگان کافی تعداد میں آسکیں گے نہ شرکاے کانفرنس سکون و اطمینان کے ساتھ علماے کرام کے ارشادات سن سکیں گے۔

اس کے علاوہ مجلسِ عاملہ کی رائے میں رُکن سازی کی مہم نے اس دفعہ اس قدر وسعت حاصل کر لی ہے کہ دو ماہ کے اندر ابتدائی جماعتوں کے انتخابات مکمل نہیں ہو سکے۔ ایک لاکھ کے قریب فارم رکنیت تقسیم ہو چکے ہیں اور ابھی مانگ جاری ہے۔ اس کے علاوہ بڑی وجہ رمضان المبارک کے روزے بھی ہیں۔ گرمی اور روزے کی وجہ سے تقریباً تمام کام رکا رہا۔ اس طرح پورا ایک مہینہ کام نہیں ہو سکا۔

اس لیے مجلسِ عاملہ نے فیصلہ کیا ہے کہ مئی اور جون میں ابتدائی شہری اور ضلعی جمعیتوں کے انتخابات مکمل کیے جائیں اور جولائی میں کانفرنس کا اجلاس طلب کیا جائے۔[1]

---

[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۲۵/ مئی ۱۹۵۶ء)

حضرت العلامہ خلیل حفید شیخ حسین بن محسن الانصاری
چوتھی سالانہ اہلِ حدیث کانفرنس گوجرانوالہ کے صدر منتخب کیے گئے

مجلسِ عاملہ کی ہمیشہ یہ خواہش رہی ہے کہ جماعت کے مقتدر اہلِ علم کی خداداد قابلیتوں سے استفادہ کیا جائے اور اپنے قومی اجتماعات ان کی صدارت میں منعقد کر کے ان کی راہنمائی حاصل کی جائے۔ چناں چہ اس دفعہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ حضرت العلامہ خلیل بن محمد بن شیخ حسین بن محسن الانصاری (متعنا اللّٰہ بطول بقائہ) گوجرانوالہ کانفرنس کی صدارت فرمائیں۔

اہلِ علم سے مخفی نہیں کہ خاتمۃ المحدثین شیخ حسین بن محسن الانصاری رحمہ اللہ، حضرت نواب صدیق حسن رحمہ اللہ کی استدعا پر یمن سے ہند تشریف لائے۔ ان کے فیوض علمیہ سے خود نواب صاحب بھی مستفید ہوئے اور استاذ الاساتذہ حضرت مولانا سید نذیر حسین صاحب رحمہ اللہ کے اکثر تلامذہ ان سے بھی مستفیض ہوئے۔ حضرت علامہ خلیل الانصاری اس خانوادہ علم وفضل کے روشن چراغ ہیں۔ ان کی علمی اور ادبی فضیلتوں سے برصغیر پاک و ہند کے علما خوب واقف ہیں۔ حضرت العلامہ نے شروع میں اپنی علالت اور ضعف کا عذر کیا، لیکن بالآخر ہماری گزارشات کو انھوں نے شرفِ قبولیت بخشا اور آج ہم نہایت مسرت سے اعلان کرتے ہیں کہ سالانہ اہلِ حدیث کانفرنس گوجرانوالہ کی کرسیِ صدارت کو حضرت علامہ زینت بخشیں گے۔[1]

---

[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۲۵ رمئی ۱۹۵۶ء)

مسجد باغ ڈپٹی سیالکوٹ میں نزاع
اور
اخبار ''ترجمانِ اسلام''

مکرم مدیر ''ترجمانِ اسلام''! السلام علیکم ورحمۃ وبرکاتہ

۲۲؍ اگست ۱۹۵۸ء کے ''ترجمانِ اسلام'' میں مسجد ڈپٹی باغ سیالکوٹ کے متعلق اطلاع پڑھ کر افسوس ہوا۔ مَیں ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ اس مسجد میں قریباً دس گیارہ سال سے جماعت اہلِ حدیث قابض ہے۔ تعمیر، امامت اور خطابت کی تمام ذمے داری جماعت اہلِ حدیث کے سپرد ہے۔ جماعت اس پر اب تک قریباً تیس ہزار روپیہ صَرف کر چکی ہے۔ اس عرصے میں کبھی اکثریت یا اقلیت کا یہاں سوال پیدا نہیں ہوا۔

مولوی محمد علی اور علامہ خالد محمود صاحب نے ذاتی مناقشات اور مقامی باہمی رنجشوں کی بنا پر اہلِ حدیث کے خلاف یہ محاذ قائم کیا ہے۔ وہی اس کی سرپرستی فرما رہے ہیں۔ ہمیں سیالکوٹ کے پولیس افسران پر تعجب ہے کہ وہ فریق اور نزاع کے بانیوں سے منصف اور ثالث کا کام لے رہے ہیں۔

اقلیت اور اکثریت کا جو سوال اس وقت اہلِ حدیث کے خلاف اُٹھایا گیا ہے، اگر اسے درست تسلیم کر لیا جائے تو آیا محلہ احمد پورہ میں جامع شہابیہ پر مولوی محمد علی صاحب قابض رہ سکتے ہیں؟ مولوی محمد علی دیانتاً یہ فرما سکتے ہیں کہ اگر وہاں آپ کو اہلِ حدیث کا تعاون حاصل نہ ہوتا تو آج شہابیہ اکثریت کے قبضے میں ہوتا اور وہاں کے خطیب علامہ یعقوب ہوتے۔

علامہ خالد محمود کے لیے اگر خطابت کا کوئی موقع نہیں تو اس کے لیے برادرانہ کوشش کی جا سکتی ہے۔ اس شرانگیزی سے یہ مقصد حاصل نہیں ہوگا۔ جہاں تک واقعات کا تعلق ہے، یہ ساری شورش ان دونوں موحد بزرگوں کی پیدا کردہ ہے اور ترجمان کا نوٹ بھی شاید انھی حضرات کے قلم کا مرہونِ منت ہے۔

صدق رسول اللهﷺ: «منهم تبدأ الفتنة وفيهم تعود» (الحديث)[1]

بظاہر مسجد کے کیس میں کوئی کمزوری نہیں، نہ ہمیں اس ہنگامے سے چنداں خطرہ ہے۔ البتہ ذاتی رنجشوں کو

[1] شعب الإيمان (۱/ ۵۹) اسے ذکر کرنے کے بعد امام بیہقی نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔

اگر مسائل میں لپیٹ کر اس طرح مناقشات کی صورت دی گئی تو اسلام کے ان متحدہ مقاصد کو ضرور نقصان پہنچے گا، جن کے ترجمانِ اسلام اور جمعیت علما اس وقت علمبردار ہیں اور یہ مقاصد ان دونوں بزرگوں کی خوشنودی سے کہیں زیادہ ضروری ہیں۔

میری نظر میں ''ترجمانِ اسلام'' کا مقام اس سے بہت بلند ہے کہ وہ ان مناقشات میں دخیل ہو اور اربابِ غرض کا آلہ کار بنے۔

حضرت مولانا احمد علی، مولانا غلام غوث اور مولانا عبدالواحد سے مَیں گزارش کروں گا کہ وہ جمعیت علمائے اسلام کے ان اراکین کو اس غلط روش سے روکیں اور ہوائی اطلاعات کے بجائے خود جا کر تحقیق فرمائیں کہ اس ہنگامے کی تہہ میں کیا ہے اور ترجمان کے کالموں کو اس گندگی میں آلودہ ہونے سے بچائیں۔

ہمارے لیے یہ صورتِ حال بے حد ناپسندیدہ ہے کہ جس جماعت کے صدر مولانا احمد علی صاحب ہوں، اس جماعت کے نامور کارکن جماعت اہلِ حدیث کی مساجد پر بریلوی مفسدوں کا قبضہ دلانے کے لیے اہلِ حدیث سے برسرِ پیکار ہوں۔ یہ نامور کارکن اندازہ نہیں کر سکتے کہ اس عاقبت نااندیشانہ طرزِ عمل کے نتائج کس قدر دور رس ہو سکتے ہیں ...!

مجھے امید ہے کہ جمعیت علمائے اسلام مغربی پاکستان کے اکابر اس مسئلے پر سنجیدگی سے غور کریں گے اور عدل و انصاف کے تقاضوں کو پورا کریں گے۔[1]

[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۵ر ستمبر ۱۹۵۸ء)

منڈی جڑانوالہ میں اہلِ بدعت کی دھاندلی

منڈی جڑانوالہ اور اس کے اطراف میں انقلاب ۴۷ء کے بعد اہلِ توحید کی کافی تعداد آباد ہو چکی ہے۔ اپنی سہولت اور ضرورت کے لحاظ سے ان لوگوں نے منڈی میں ایک مسجد کی بنیاد رکھی، وہاں کے بعض شرارت پسند اہلِ بدعت نے اسی مسجد میں الگ نماز اور اذان کا انتظام کر لیا۔ ایک ہی مسجد میں بیک وقت دو اذانیں اور نمازیں ہونے لگیں، پولیس کی بروقت مداخلت سے رفت گذشت ہوتی رہی۔

پچھلے ہفتے اطلاع ملی ہے کہ شرارت پسند عنصر نے چند غنڈوں کے ساتھ مل کر مسجد کی دیوار گرا دی ہے، کام کرنے والے مزدوروں کو بھی زدوکوب کیا ہے اور تعمیر کا کام بند کرا دیا ہے۔

پولیس کی روش اور بھی قابلِ تعجب ہے کہ اس شرارت پسند عنصر سے دو آدمی گرفتار کیے اور امن پسند بانیانِ مسجد سے چھ آدمی۔ قانون کی عدل گستری کا یہ پہلو نہایت ہی تعجب انگیز ہے کہ وہاں شر پسند اور امن پسند عنصر کو ایک ہی نگاہ سے دیکھا گیا ہے اور دونوں سے ایک ہی طرح کا معاملہ کیا گیا ہے۔ ہم ڈپٹی کمشنر لائل پور سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ معاملے کو مناسب اور ذی فہم ہاتھوں کے سپرد کریں، تاکہ انصاف کا خون نہ ہو اور حق دار محروم نہ ہوں۔

جماعت اہلِ حدیث لائل پور کا فرض ہے کہ وہ اس معاملے کو اپنے ہاتھ میں لے۔ مسٹر عبدالقیوم صاحب اور جناب حکیم نورالدین صاحب سے خصوصیت سے توقع ہے، کہ وہ اسے سلجھانے کی کوشش فرمائیں گے۔ اہلِ حدیث مہاجرین کے حقوق کسی طرح بھی ضائع نہ ہونے چاہییں، ایسا نہ ہو کہ یہ مفلوک الحال مسافر شریروں کا تختۂ مشق بنیں اور دفتر کو بھی صحیح اطلاعات سے باخبر رکھیں۔

جڑانوالہ کے اطراف میں اہلِ توحید کی بہت بڑی تعداد آباد ہے۔ اگر حکومت نے اس طرح لاقانونی کی اجازت دے دی تو مشکلات بڑھ جائیں گی، عوام کا بھی نقصان ہوگا اور حکومت کا وقار بھی محفوظ نہیں رہ سکے گا۔[1]

محمد اسماعیل

ناظم اعلی جمعیت اہلحدیث آل پاکستان، گوجرانوالہ

---

[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۲۸ر اپریل ۱۹۵۰ء)

مسجد اہلِ حدیث جڑاں والا

گذشتہ سے پیوستہ اِشاعت میں ہم بتا چکے ہیں کہ جماعت اہلِ حدیث نے جڑانوالہ میں اپنی ضروریات دینی کی تکمیل کے لیے ایک مسجد تعمیر کی، جس پر ہزاروں روپے جماعت کے صرف ہوئے۔

پھر جب توحید وسنت کا یہ مرکز معرضِ وجود میں آ گیا تو اہلِ بدعت کو ناگوار ہوا، لہٰذا اہلِ حدیث کی مخالفت میں ایک طوفان احتجاج کا بپا کیا گیا اور لطف یہ کہ مقامی حکام نے اس بے آئینی اور بدتمیزی کو دیکھا اور برداشت کیا، ہمیں معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ ٹریڈ ایسوسی ایشن کے مرزائی صدر اس فتنے میں خاص دلچسپی لے رہے ہیں اور یہ کوشش کر رہے ہیں کہ اہلِ حق کو مسجد کے جائز استعمال سے روک دیا جائے، جو حد درجہ افسوس ناک ہے۔

اس ضمن میں قانون کی مشینری کو جس ڈھب سے حرکت میں لانے کی سعی ہو رہی ہے، وہ اصولاً غلط ہے، یعنی یہ کہا جا رہا ہے کہ بغیر باقاعدہ اجازت کے منڈی کی زمین پر مسجد کی تعمیر صحیح نہیں۔ ہم ان لوگوں میں سے یقیناً نہیں ہیں، جو خواہ مخواہ معقول بات کی مخالفت کریں، اس موشگافی پر ہمیں جو اعتراض ہے، وہ یہ ہے کہ قانون اور ضابطے کی ایسی توجیہ ہونا چاہیے، جو سب کے لیے یکساں قابلِ قبول اور مفید ہو۔ ہم جانتے ہیں کہ پاکستان کے ہر شہر میں اس ڈھب کی مساجد تعمیر کی گئی ہیں، جو بلا کسی قانونی مزاحمت کے اس وقت تک موجود ہیں، اس لیے اسی مسجد کے لیے قانونی توجیہ کا حرکت میں آنا سمجھ میں نہیں آتا۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ حکومت اس انداز کی مساجد کے لیے کوئی مشترکہ پالیسی وضع کرے، جس کا ہم خیر مقدم کریں گے، لیکن بریلوی وقادیانی حضرات کو ہم قطعی موقع نہیں دیں گے کہ وہ ان مکروہ سازشوں میں کامیاب ہو سکیں۔

لائل پور کے ڈپٹی کمشنر صاحب سے بھی ہمیں خصوصیت سے کہنا ہے کہ وہ موجودہ صورت پر ہمدردانہ غور فرمائیں، انھیں یہ معلوم ہے کہ چودھری محمد شفیع آڑھتی اور ملک محمد انور (سابق ایم، ایل، اے) مسجد کی تعمیر ان کے نوٹس میں لا چکے ہیں اور انھیں تعمیر سے قبل یقین دلا چکے ہیں کہ اگر حکومت نے زمین کا کوئی معاوضہ طلب کیا تو وہ ادا کر دیا جائے گا۔

بریلوی اور قادیانی عناصر سے بھی ہماری درخواست ہے کہ وقت کی نزاکت کو پہچانیے، یہ دور ان مسائل کا نہیں ہے۔ یہ پاکستان ہے۔ وہ انگریز یقیناً جا چکا ہے، جو اس طرح کے فتنوں کی پشت پناہی کرتا تھا، اب تو اہلِ حدیث کی مساجد اور ان کے تبلیغی مرکزوں کو برداشت کرنا ہی پڑے گا۔[1]

ناظم جمعیت اہلِ حدیث، پاکستان، گوجرانوالہ

---

[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۱۲ر مئی ۱۹۵۰ء)

مسجد اہلِ حدیث میاں چنوں

میں پچھلے ہفتے سندھ سے واپسی پر منڈی میاں چنوں میں اترا۔ میاں چنوں میں انقلاب ۴۷ء کے بعد مسجد اہلِ حدیث کی بنیاد رکھی گئی، مسجد کی ظاہری صورت پتا دے رہی ہے کہ مقامی جماعت کی مالی حالت اچھی نہیں۔ مسجد نہایت سادہ، چھت نہایت نیچے، گرم علاقوں میں ایسی چھت صحت کے لیے بالکل غیر مفید ہے، مگر جماعت کے مساکین اس پر مطمئن ہیں کہ سنت کے مطابق نماز ادا کرنے کے لیے اطمینان بخش موقع حاصل ہے۔

مقامی احناف:

پسماندہ علاقوں میں ہمارے احناف کا یہ حال ہے کہ وہ اپنی مساجد میں اہلِ حدیث کو نماز کی اس لیے اجازت نہیں دیتے کہ بعض مسنون اعمال انھیں ناگوار ہیں، وہ اپنی مساجد کو ان اعمال کی ترویج کے لیے پسند نہیں کرتے۔

اگر اہلِ حدیث اپنی مساجد بنالیں تو یہ انھیں اور بھی ناگوار ہوتا ہے۔ اہلِ توحید کے لیے آرام و آسائش بہر حال انھیں ناگوار ہے۔ بے نمازوں، بے روزوں، شراب خوروں کے ساتھ مدارات بلکہ مساوات کر سکتے ہیں، لیکن ایک سنی المسلک اہلِ حدیث نمازی کے ساتھ وہ کوئی رعایت نہیں فرما سکتے۔ ان کی دوستی کی روش پر تعجب ہوتا ہے۔ آخر یہ کیا چاہتے ہیں؟ اسلام نے اپنے مخالف غیر مسلموں کو عبادت کے لیے مسجدِ نبوی میں جگہ دی۔ ہمارے ان دوستوں کی شرافت کا یہ حال ہے کہ اہلِ حدیث اپنی مساجد میں نماز ادا فرمائیں تو یہ بے چارے دکانوں پر بے قرار ہو جاتے ہیں، اپنے مکان اور مسجدوں پر ان کے لیے نیند حرام ہو جاتی ہے۔

میاں چنوں کی جامع مسجد منڈی کے خطیب صاحب بھی اس قسم کے مضطرب اور بے قرار دل لے کر آئے دن منڈی میں کوئی نہ کوئی شورش بپا فرماتے رہتے ہیں، تاکہ وہ اہلِ توحید کے ساتھ الجھنے کی راہ پیدا فرما سکیں۔

مسجد اہلِ حدیث کو تعمیر اور آباد ہوئے عرصہ گزر چکا ہے۔ وہاں امام اہلِ حدیث ہے اور اہلِ حدیث انجمن بھی موجود ہے، جس کا اپنے حلقے میں گہرا اثر ہے۔ مرکزی جمعیت اہلِ حدیث کے ساتھ اس کا الحاق بھی ہے۔ تعجب ہے کہ یہ حضرت ملا صاحب اس امید میں ہیں کہ وہ منڈی میاں چنوں میں اہلِ حدیث کی آواز کو ختم کر سکیں گے۔

جہلا کی روز مرہ شر انگیزیوں سے متاثر ہو کر جماعت نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ مسجد کے دروازے پر پتھر لگا دیں

اور اس پر اہلِ حدیث کی صراحت کر دیں، تا کہ عوام اور خود امام صاحب منڈی سمجھ لیں کہ بہر حال مسجد ان مساکین کے سر چھپانے کی جگہ ہے، جہاں نماز اور عبادت کا تعلق ہے۔ اہلِ حدیث مساجد میں کہیں کسی کو یرد کا نہیں جاتا۔

ناجائز حرکت:

پتھر لگانے کے بعد ہمارے بریلوی دوست بے حد مشتعل ہوئے، سنا ہے ان کے سرخیل وہی امام صاحب ہیں، یہ بزرگ ایک مجمع کی صورت میں فساد پر آمادہ ہو کر آئے کہ پتھر کو اُکھاڑ دیں۔ تعجب ہے کہ ہمارے بریلوی دوست پتھروں سے کیوں گھبراتے ہیں، مسجد کی تعمیر اہلِ حدیث نے کی، امام اہلِ حدیث، مدرسہ اہلِ حدیث، جمعیت اہلِ حدیث موجود، مگر پتھر سے بے قراری پیدا ہو رہی ہے!!

معلوم ہوا ہے کہ مقامی پولیس کا رویہ شریفانہ ہے۔ انھوں نے ہر چند اس معاملے میں مفاہمت کی کوشش کی اور یہی ان کا فرض تھا، جس کے لیے ہم مقامی پولیس افسران کے ممنون ہیں کہ انھوں نے فرض شناسی کا ثبوت دیا۔

ثالثی:

آخر صورت یہ طے قرار دی گئی کہ چار ثالث اس امر کا فیصلہ کریں۔ یہ صورتِ فیصلہ ہماری سمجھ سے بالا ہے۔ ایک جماعت نے اپنے حقوق حاصل کیے، اپنے روپے سے اپنا آشیانہ بنایا، آشیانے کی پیشانی پر اپنا نام لکھا، کسی کو کیا حق ہے کہ یہ پتھر اُکھاڑنے کا فیصلہ کرے؟ یہ ثالثی اگر حق دار کو حق دلانے کے لیے ہو تو ہمیں اعتراض نہیں، لیکن کوئی ایسا فیصلہ جس میں جماعت کی حق تلفی ہو، جذبات مجروح کیے جائیں، شر پسند افراد و شرارت انگیز ملاؤں کی حوصلہ افزائی کی جائے، یہ ہمیں منظور نہیں ہوگا۔

منڈی میاں چنوں کے مقامی حکام اور ضلع ملتان کے افسرانِ بالا سے ہم درخواست کرتے ہیں کہ پاکستانی سرزمین میں ان شرارت پسند عناصر کو سنگین سزائیں دی جائیں، تا کہ انھیں شرارت کی دوبارہ جرأت نہ ہو۔

اگر مسجد کی تعمیر میں کوئی قانونی سقم ہو تو فریقین کے لیے نہیں، بلکہ حکومت کے لیے قانونی عدالتوں کے دروازے کھلے ہیں، وہ قانونی چارہ جوئی کریں۔

میاں چنوں اور ملحقہ جماعتوں اور جماعت اہلِ حدیث ملتان کو میں دفتر کی طرف سے توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ وہ اس معاملے پر کنٹرول کریں اور اپنے امن پسند اور مظلوم بھائیوں کی پوری پوری مدد کریں۔ دفتر ہر ممکن اعانت کے لیے ہر وقت تیار ہے۔[1]

---

[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۲۵ رشعبان ۱۳۷۰ھ)

دار الحدیث مدینہ منورہ

دار الحدیث مدینہ منورہ کا ذکر آپ نے اخبار ''اہلِ حدیث'' امرتسر میں اکثر پڑھا ہوگا۔ اس وقت ہم لوگ اس کے انتظامات پر مطمئن نہ تھے، لیکن سیدی حضرت مولانا ثناء اللہ صاحب مغفور کی دور اندیش نگاہیں اس نام کو زندہ رکھنا چاہتی تھیں، وہ احباب کی کراہت کے باوجود دار الحدیث مدینہ منورہ کے لیے مالی اعانت کی اپیل فرماتے رہے اور جو کچھ جمع ہوتا، پوری احتیاط سے مدینہ پہنچاتے۔ اللهم اغفرله واجعل جنة الفردوس مأواه.

اس وقت مدرسے کی عمارت اپنی نہ تھی۔ آج سے چند سال پہلے صاحب الجواد الخیر محترم حافظ حمید اللہ صاحب دہلوی مغفور نے اپنی جیب خاص سے مبلغ -/۹۰۰۰۰ (نوے ہزار) روپے میں ایک وسیع بلڈنگ خرید کر دار الحدیث کے لیے مخصوص فرمائی۔ اللهم برد مضجعه، وارفع درجته في أعلیٰ عليين.

بلڈنگ مدینہ منورہ کی آبادی کے لحاظ سے کافی وسیع ہے اور اگر اس میں مناسب اصلاح ہوجائے تو وہ کافی حد تک اپنے مصارف کو برداشت کرسکتی ہے، لیکن آمدن کے ذرائع کی کمی کی وجہ سے دار الحدیث کا نظم ہمیشہ تشنہ نہ رہا۔ دار الحدیث کا حساب وکتاب عرصے سے حکومت کی تحویل میں ہے۔ اس کمی اور تنگ دستی کے باوجود اخی المحترم الشیخ الاستاذ عبدالرحمٰن الافریقی السّلفی ہزار تحسین کے مستحق ہیں، جن کی مساعی سے یہ نام چلتا رہا۔ المغفور حافظ حمید اللہ صاحب دہلوی اس کی مزید اصلاح اور توسیع کے خواہش مند تھے، مگر موت نے انھیں اتنی مہلت نہ دی ع

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

شیخ ابن مزاحم السّلفی قاضی القضاۃ مدینہ منورہ دار الحدیث کے انتظامات کی نگرانی فرماتے ہیں۔ اس وقت ہماری اطلاع کے مطابق دار الحدیث میں آٹھ مدرس ہیں اور قریباً دوصد طالب علم۔ بڑی خوشنما عمارت میں تعلیم کا سلسلہ جاری ہے۔ بئر بضاعہ[1] کے بالکل پہلو میں ہے۔

شیخ عبدالرحمٰن افریقی کچھ عرصے کے لیے ریاض گئے تھے۔ مگر معلوم ہوا ہے کہ وہ بہت جلد واپس تشریف لا رہے ہیں اور بدستور سابق دار الحدیث میں صدر مدرس کے فرائض انجام دیں گے۔

---

[1] مدینے کا ایک کنواں، جس کا تذکرہ احادیث میں موجود ہے۔

اس وقت دار الحدیث قریباً پندرہ ہزار (۱۵۰۰۰) روپے کا مقروض ہے۔ پاکستان اور ہندوستان جب تک اس دارالحدیث کی سرپرستی نہ فرمائیں، دار الحدیث اطمینان سے کام نہیں کر سکے گا۔ مجھے ذاتی طور پر معلوم ہے کہ برادرم محترم شیخ محمد یحییٰ صاحب بن حافظ حمید اللہ دار الحدیث کے نظام سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ میری دلی خواہش ہے کہ ہندوستان کی جماعت اہلِ حدیث دار الحدیث کی مالی طور پر سرپرستی کرے اور دار الحدیث کو مستغنی کر دے۔ پاکستان و ہندوستان کے حجاج دار الحدیث کی عمارت میں بلا کرایہ قیام فرمائیں اور اپنے صدقات سے دار الحدیث کو مستغنی کریں۔[1]

---

[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۱۸؍جولائی ۱۹۵۲ء)

دار الحدیث مدینہ منورہ

آپ حضرات کو معلوم ہے کہ دار الحدیث مدینہ منورہ کے لیے ایک وسیع عمارت مرحوم صاحبِ خیر حافظ حمید اللہ نے قریباً ایک لاکھ روپے میں خرید کر وقف فرمائی تھی۔ آج تک مدرسے کا نظم ونسق مولانا احمد دہلوی فرماتے رہے۔ مولانا احمد صاحب کے انتقال کے بعد حکومتِ سعودیہ نے دار الحدیث کا نظام مولانا عبدالرحمٰن صاحب افریقی کے سپرد فرمایا۔ اب تمام انتظامات حکومتِ سعودیہ کی سرپرستی میں مولانا عبدالرحمٰن افریقی فرمائیں گے۔

مولانا عبدالرحمٰن بہت بڑے عالم اور راسخ اہلِ حدیث ہیں۔ اس لیے جماعت اہلِ حدیث پاکستان کو اس درس گاہ کی سرپرستی کرنا چاہیے اور اسے مالی طور پر مستغنی کر دینا چاہیے۔

قیام مدینہ:

جو حجاج مدینہ منورہ جائیں، بہتر ہے کہ وہ دار الحدیث میں قیام فرمائیں۔ وہاں سامان کے لیے کمرے موجود اور سونے کے لیے سامنے کھلا میدان ہے۔ اس طرح آپ بدعات سے محفوظ رہیں گے اور سنت کے مطابق روضۂ اطہر کی زیارت کر سکیں گے۔ باقی ضروری انتظامات مولانا افریقی فرمائیں گے۔

اہلِ حدیث علما کے لیے:

اہلِ حدیث علما سے جو حضرات حج کے لیے تشریف لے جائیں، وہ مکہ مکرمہ میں مولانا محمد شریف صاحب اشرف سے ضرور ملیں۔ مولانا کا قیام رباط ٹونک میں ہے۔ وہ حرم میں روزانہ درس دیتے ہیں۔ ان سے مل کر مسلک اہلِ حدیث کی تبلیغ و اشاعت کے متعلق جس قدر کوشش ممکن ہو سکے، فرمائیں۔ مولانا سے آپ کو اور بھی معلومات اور فوائد حاصل ہو سکیں گے۔ مولانا محمد شریف اشرف لاہور کے رہنے والے ہیں۔ وہ پنجابی اور اُردو اچھی طرح جانتے ہیں۔ ان سے ملاقات ہر لحاظ سے مفید رہے گی۔[1]

---

[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۲۵ر مئی ۱۹۵۶ء)

جماعت اہلِ حدیث کی
زیرِ تعمیر اور زیرِ تجویز مساجد

اللہ کا شکر ہے کہ جماعت میں تاحال نماز کی عادت اکثر پائی جاتی ہے، لیکن مشکل یہ ہے، ہمارے عام بھائیوں میں اتنی وسعتِ خیال نہیں۔ وہ گوارا نہیں فرماتے کہ ایک اہلِ حدیث ان کی مساجد میں اپنے طریق پر نماز گزار سکے۔ جھگڑے سے بچنے کے لیے عموماً علاحدہ مساجد کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے۔ اس لیے جماعت کی غربت کے باوجود بوجھ جماعت کو اُٹھانا پڑتا ہے۔ قدرتی طور پر احباب اس کے لیے مرکز ہی کی طرف توجہ فرماتے ہیں۔ مرکزی دفتر کے پاس اس قسم کا کوئی فنڈ نہیں۔ مرکزی فنڈ بہ مشکل سابقہ ذمے داریوں سے عہدہ برآ ہوسکتا ہے۔ لہٰذا احباب کو مندرجہ ذیل گزارشات پر غور فرمانا چاہیے:

۱۔ مسجد اپنی ضرورت کے مطابق شروع کریں۔ وسیع کام عموماً انجام تک مشکل پہنچتا ہے۔

۲۔ کوشش فرمائیں کہ آپ کے قرب و جوار کے لوگ اس میں حصہ لیں، جو آپ کے حالات کو اصالتاً جانتے ہوں۔ دور دور تک سفراء کا جانا بہت سی بدگمانیوں کے دروازے کھولتا ہے۔

۳۔ مساجد سادہ بنائی جائیں۔ عمارت اخراجات کے تکلفات زیرِ باری کا موجب ہوتے ہیں۔

۴۔ اگر ضرورتاً کہیں دور جانا پڑے تو اپنی ضلعی جماعت کی طرف سے شناختی دستاویز ضرور ہمراہ رکھیں، تاکہ آپ کے متعلق شبہہ نہ رہے اور ''الاعتصام'' میں بھی اعلان کرا دیں۔

۵۔ اس وقت مندرجہ ذیل مساجد زیرِ تعمیر ہیں، جن کی طرف اصحابِ خیر کی توجہ ضروری ہے:

۱۔ پنڈی گھیپ، ضلع کیمبل پور

۲۔ بھکر، ضلع میاں والی

۳۔ لیہ، ضلع مظفر گڑھ

۴۔ حویلی لکھا، ضلع منٹگمری

۵۔ قصبہ کنجاہ، ضلع گجرات

۶۔ بالاکوٹ، ضلع ہزارہ

۷۔ جوہر آباد، ضلع سرگودھا

یہ سب مساجد خصوصی توجہ کی مستحق ہیں۔ ان میں لیہ مسجد کے لیے زمین خرید لی گئی اور بیعانہ دے دیا گیا ہے۔ باقی رقم واجب الادا ہے، جس کے لیے مولوی عبداللہ مظفر گڑھی کی معیت میں ایک وفد احباب کی خدمت میں آرہا ہے۔ امید ہے احباب ان سے تعاون کریں گے۔ یہ حضرات قابلِ اعتماد ہیں۔

بھکر کی مسجد کے لیے بقدرِ ضرورت زمین خرید لی گئی ہے، بلکہ مدرسے کے لیے بھی زمین حاصل ہو چکی ہے۔ بھکر کی مرکزی اہمیت کے پیشِ نظر یہاں مدرسہ اور مسجد عالی شان ہونی چاہیے، لیکن شہر میں جماعت بہت کم ہے اور کام کرنے والوں میں مولانا عبدالعزیز صاحب سعیدی کی حیثیت امتِ وحدہ کی ہے۔ مولانا اس کام میں شب و روز ایک کر رہے ہیں۔ اصحابِ خیر اس دور افتادہ علاقے کی ان دونوں مساجد کی طرف خصوصی توجہ دیں۔

جوہر آباد اور کنجاہ کی مسجدوں کی چھت ابھی تک باقی ہے۔ چھت کے سوا ان مساجد میں نماز ادا کرنا مشکل ہوگا۔

بالاکوٹ کے مسئلے کو جماعتی سطح پر سوچنا چاہیے۔ دو کنال اراضی میاں فضل حق صاحب کی مساعی سے مبلغ چھے ہزار میں خرید لی گئی ہے۔ نقشہ وغیرہ بن جانے کے بعد اس کے مصارف کا تخمینہ بذریعہ ''الاعتصام'' احباب کے سامنے عرض کر دیا جائے گا۔

اس کے علاوہ جامعہ سلفیہ کی مسجد کا کافی حصہ بن چکا ہے اور کافی کام باقی ہے۔ احباب اس مرکزی مسجد کی طرف توجہ فرمائیں تو بہتر ہے، ورنہ محترم شیخ محمد انور صاحب لائل پور اور میاں فضل حق صاحب کے اموال اور اولاد میں اللہ تعالیٰ برکت فرمائیں، ان کی جیبیں اس کی کفالت کر رہی ہیں۔ یہ فرضِ کفایہ ان شاء اللہ ادا ہو کر رہے گا۔

ایک تیسرے بزرگ مولوی عبیداللہ صاحب فیروز پوری نے بھی جامعہ کی تعمیر میں بہت کام کیا، مگر اب بے چارے بوڑھے ہو چکے ہیں اور تھک چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں خیر کی مزید توفیق مرحمت فرمائے۔[1]

محمد اسماعیل، مدرس گوجرانوالہ

امیر مرکزی جمعیت اہلِ حدیث، مغربی پاکستان

[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۲۷؍ نومبر ۱۹۶۴ء)

کنجاہ (گجرات، پنجاب) میں مسجد اہلِ حدیث

آج سے قریباً اسّی سال قبل قصبہ کنجاہ میں سردار کھڑک سنگھ ریٹائرڈ تھانے دار رہتے تھے۔ ان کے تین لڑکے تھے۔ بڑے لڑکے کا نام مول سنگھ تھا۔ والد نے مول سنگھ کو مسجد میں مولوی امام علی صاحب کے پاس تعلیم کے لیے بھیجا۔ مول سنگھ یہاں مسلمان ہوگئے۔ والدین کو علم ہوا تو انھوں نے سختی کی۔ مول سنگھ بھاگ نکلے۔ یہ مول سنگھ حضرت مولانا ابوالقاسم بنارسی کے والد حضرت مولانا محمد سعید تھے۔ مولانا گھر سے اتنی دیر باہر رہے کہ وہ واقعی مولانا محمد سعید بن کر کنجاہ تشریف لائے۔ شہر کی جامع مسجد میں اسلام کی صداقت کے متعلق تقریر کی۔ چھوٹا بھائی ہیرا سنگھ مولانا سے متاثر ہوا، لیکن کھل کر اسلام کا اظہار نہ کر سکا۔ باقی خاندان اس نعمت سے محروم رہا۔ مولانا بالالتزام اپنے عزیزوں کی مدد فرماتے رہے اور مستقل اقامت بنارس میں اختیار کر لی۔

عجیب بات ہے کہ یہ قصبہ پڑھے لکھے اور کاروباری لوگوں کی اقامت گاہ ہے، جو متحدہ ہندوستان کے دور دراز علاقوں تک کاروباری ضرورت کے ماتحت جاتے رہے۔ لیکن توحید و سنت کی چاشنی سے بدستور محروم رہا۔ پڑھے لکھے لوگوں کی اعتقادی حالت عوام سے مختلف نہیں۔

خدا کا شکر ہے کہ مرکزی جمعیت اہلِ حدیث، مغربی پاکستان کی تبلیغی اور تنظیمی مساعی سے اس قصبے میں بھی اب توحید و سنت کا کافی اثر ہوا ہے۔ خدا کرے مولانا محمد سعید بنارسی اور حضرت مولانا ابوالقاسم کی رُوحیں اس تبدیلی سے جنت الفردوس میں مسرور ہوں۔ یہاں مسجد اہلِ حدیث کے لیے زمین خرید لی گئی ہے۔ عنقریب تعمیر شروع ہونے والی ہے۔ مقامی جماعت ان شاء اللہ مسجد کی تعمیر کرے گی۔ ناظرین ''الاعتصام'' سے استدعا ہے، اگر آپ حضرات اس معاملے میں اعانت فرمائیں تو جماعت آپ کی ممنون ہوگی۔

امدادی رقوم: مولوی محمد شریف صاحب چغتائی رنگ والے بازار کلاں، کنجاہ۔ ضلع گجرات کے پتے پر ارسال کی جائیں۔

محمد اسماعیل

ناظم اعلیٰ جمعیت اہلِ حدیث، مغربی پاکستان[1]

[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۲۲ر مارچ ۱۹۶۳ء)

قصبہ بھائی پھیرو میں مسجد اہلِ حدیث کی تعمیر

قصبہ بھائی پھیرو اپنے محلِ وقوع کے لحاظ سے ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔ یہاں مختصر جماعت اہلِ حدیث موجود ہے۔ چوں کہ تمام قصبے میں جماعت اہلِ حدیث کی کوئی مسجد نہیں تھی، اس لیے ارکانِ جماعت بڑی دقت محسوس کر رہے تھے۔ بالآخر جماعت کے چند مخلص احباب نے کمال ہمت سے ایک مکان قیمتاً خرید کر مسجد کی بنیاد رکھ دی ہے اور توکل علی اللہ تعمیر شروع کر دی ہے۔

چوں کہ مقامی جماعت انتہائی کمزور اور قلیل ہے، اس لیے تمام مخیّر اصحاب اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والے مخلص احباب سے مَیں استدعا کرتا ہوں کہ اس مسجد کی تعمیر کے لیے فیاضی کے ساتھ حصہ لیں اور عند اللہ ماجور ہوں۔[1]

جامع مسجد اہلِ حدیث جوہر آباد

جوہر آباد تھل میں جامع مسجد اہلِ حدیث کی شدید ضرورت تھی۔ اب اس کی تعمیر شروع ہو چکی ہے، لیکن روپے کی قلت ہے۔ وہاں کی جماعتی آبادی اتنی نہیں ہے کہ اتنا بڑا کام تنہا کر سکے۔ ہر مقام کی جماعت کو اس سلسلے میں جوہر آباد کی جماعت سے تعاون کرنا چاہیے اور مخیّر حضرات کو دل کھول کر روپے سے امداد کرنا چاہیے۔

آپ اپنا چندہ ''مولانا فتح محمد پٹیالوی، آئرن مرچنٹ، متصل ہسپتال ریل بازار، خوشاب، ضلع سرگودھا'' کے پتے پر ارسال فرمائیں یا ''دفتر مرکزی جمعیت اہلِ حدیث مغربی پاکستان، شیش محل روڈ، لاہور'' میں پہنچا دیں اور مسجد جوہر آباد کی تصریح کر دیں۔

نیز مولانا عبداللہ صاحب ارشد خطیب جامع مسجد جوہر آباد آپ کے پاس مسجد کے لیے فراہمی چندہ کی غرض سے آرہے ہیں، آپ ان سے پورا پورا تعاون کریں۔[2]

---

[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور

[2] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور

[گجرات میں مسجد کی تعمیر]

سید محمد شاہ صاحب گجرات پنجاب میں اسٹیشن کے قریب ایک مسجد بنا رہے ہیں۔ اسٹیشن کے قریب کوئی مسجد نہیں۔ نمازیوں کے علاوہ رات کے وقت بعض مسلمان مسافروں کو بھی تکلیف ہوتی ہے۔ اس لیے اصحابِ خیر سے امید ہے کہ اس مسجد کی امداد کر کے اجر حاصل کریں۔ شاہ صاحب موصوف کوئی پیشہ ور سائل نہیں، بلکہ تجارت سے اپنی روزی کماتے ہیں۔

انھوں نے اپنی جیب سے بھی روپے اس مسجد پر صَرف کیے ہیں۔ اب مجبوراً یہ اعلان شائع کرا رہے ہیں۔

محمد اسماعیل[1]

۲۲/ ۱۱/ ۴۴ء

تعمیر مسجد کے لیے فراہمیِ زر کی ضرورت

مولانا [عبدالعزیز] سعیدی کی اس اپیل سے پورا پورا اتفاق ہے۔ میں اور میاں فضل حق بھکر گئے۔ مسجد کا مذکورہ قطعہ دیکھا۔ وہاں کی مقامی جماعت کی معاشی حالت کا اندازہ کیا، یہ مسجد واقعی ہر لحاظ سے اس قابل ہے کہ اصحابِ خیر اس کی طرف توجہ دیں۔

مولانا سعیدی اس کام میں اپنا وقت دے رہے ہیں۔ میری دانست میں وہ واقعی قابلِ اعتماد ہیں۔ اس کے علاوہ پنڈی گھیپ، ضلع کیمبل پور اور بالاکوٹ ضلع ہزارہ کی مساجد بھی مستحق ہیں۔ اصحابِ خیر ان کی طرف توجہ فرمائیں۔ ایسے علاقوں میں مسجد اور توحید و سنت کی اشاعت اضعافاً مضاعفہ اجر کا موجب ہوگا۔[2]

والسلام

محمد اسماعیل

امیر مرکزی جمعیت اہلِ حدیث، مغربی پاکستان

---

① ہفت روزہ ''اہلِ حدیث'' امرتسر (۱۲؍ فروری ۱۹۴۵ء)

② ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۲۲؍ مئی ۱۹۶۴ء)

رسالہ رحیق کے لیے اپیل

میں نے ''رحیق'' کی متعدد اشاعتوں کو بغور پڑھا۔ ادارہ رحیق نے آثارِ سلف کے احیا اور جدید بدعات کے خلاف جس جرأت سے قدم اُٹھایا ہے، یہ وقت کی آواز تھی۔ رحیق کو زندہ رکھنا اور اسے اہلِ حضرات تک پہنچانا، بلکہ ان مریضوں تک پہنچانا، جن کی بیماری کا یہ صحیح علاج ہے، تمام اہلِ توحید کا فرض ہے۔

اللہ تعالیٰ ادارہ رحیق کو توفیق مرحمت فرمائے کہ وہ اپنی آواز ہر کان تک پہنچا سکے۔[1]

والسلام

محمد اسماعیل، کان اللہ لہ

گوجرانوالہ

[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۳ رمئی ۱۹۵۷ء)

حادثہ فاجعہ اور مخیّر حضرات

قحط الرجال کے اس دور میں ہماری جماعت کو تازہ نقصان یہ پہنچا ہے، ایسا نقصان جس کی جلد تلافی بظاہر مشکل ہے کہ جماعت کے مشہور پُر جوش اور سراپا اخلاص مبلغ مولوی محمد ابراہیم صاحب خادم تاندلیانوالہ کشتی کے حادثے کی نذر ہو گئے۔ إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ.

مجھے میرے رفقا سمیت اس سے سخت صدمہ ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس عاشقِ توحید و سنت اور دل دادۂ حریت کو جنتِ بریں میں اعلیٰ مقام عنایت فرمائے۔

مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ مرحوم نہ صرف کثیر العیال، بلکہ مقروض بھی تھے۔ گو اپنا کاروبار بھی کرتے تھے، مگر تبلیغی کاموں میں انہماک کے باعث معاش کے لیے وہ زیادہ وقت نہیں دے سکتے تھے، اس وجہ سے آمدنی نہایت محدود رہی۔ نیز خود دار ہونے کی بنا پر کسی سے اپنی مشکلات بیان نہ کرتے۔ اب صورتِ حال یہ ہو گئی ہے کہ ان کی اولاد سے کوئی بھی بوجھ اُٹھانے کے قابل نہیں۔

میں تمام جماعت خصوصاً متمول و مخیّر احباب کو اس طرف توجہ دلانا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ مرحوم مولانا ابراہیم خادم کے بچوں کی کفالت اور اُن کے قرض کی ادائیگی میں ہاتھ بٹائیں۔ مرحوم نے اپنی زندگی تبلیغ کے لیے وقف کر رکھی تھی۔ ہمارا اسلامی اور اخلاقی فرض ہے کہ مرحوم کا بوجھ ہلکا کرنے میں پوری کوشش کریں۔

یہ اعانت میاں عبد المجید صاحب (ناظم مالیات مرکزی جمعیت اہلِ حدیث، مجیدیہ فلور ملز، مصری شاہ لاہور) کے نام روانہ کی جائے، تاکہ باقاعدہ نظم کے تحت پس ماندگان تک پہنچ سکے۔[1]

(مولانا) محمد اسماعیل

(امیر مرکزی جمعیت اہلِ حدیث مغربی پاکستان)

[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۲۱ر جولائی ۱۹۶۷ء)

دروس و تقاریر

حضرت محمد اسماعیل رحمہ اللہ کے تفسیری افادات

ترتیب: فیض لدھیانوی

آج سے تقریباً بارہ سال پہلے قیامِ گوجرانوالہ کے دوران وقتاً فوقتاً مجھے مولانا محمد اسماعیل ذبیح رحمہ اللہ (خطیب جامع اہلِ حدیث چوک نیائیں) کے مواعظِ حسنہ سننے کی سعادت نصیب ہوئی تھی۔ میری یہ پرانی عادت ہے کہ مجھے کسی صاحبِ علم و دانش کی کوئی بات پسند آئے تو میں گھر آ کر اپنی یادداشت کے مطابق اسے اپنی ڈائری میں درج کر لیتا ہوں۔

نمازِ فجر کے بعد درسِ قرآن مجید کے سلسلے میں یوں تو مولانائے مرحوم کی تفسیری تقریر روزانہ خاصی طویل ہوتی تھی، لیکن میں نے وہی باتیں نوٹ کی ہیں، جن کو یاد رکھنا میں اپنے نزدیک ضروری خیال کرتا تھا۔ ناظرینِ ''الاعتصام'' کو ان شذرات میں بظاہر کوئی خاص تسلسل نظر نہیں آئے گا، لیکن مطالعہ کے بعد وہ بلاشبہہ یہ محسوس فرمائیں گے کہ ہر ٹکڑا اپنی جگہ مکمل اور معنی خیز ہے۔ (فیض لودھیانوی)

① جن کی خصوصیات:

قرآن پاک کی سورۃ الرحمٰن سے اتنا ثابت ہوتا ہے کہ انسانوں کی طرح جنوں کو بھی عقل دی گئی ہے، ورنہ اس طرح دونوں کو یکساں طور پر غور و فکر کرنے کی دعوت نہ دی جاتی۔ قرآن کریم ہی سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ جنوں کو آگ سے پیدا کیا گیا ہے اور وہ بھی خدا کی عبادت کرتے ہیں۔ ان باتوں کے علاوہ ہمیں ان کی نسبت اور کوئی بات معلوم نہیں۔

② شیطان کی سرکشی:

فرشتوں نے انسان کے متعلق خون ریزی کا خدشہ ظاہر کر کے کچھ اچھی رائے کا اظہار نہ کیا تھا۔ اس لیے ضروری تھا کہ ان کے دل میں انسان کا احترام پیدا کیا جائے۔ چناں چہ باری تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کریں۔ سب فرشتوں نے اس حکم کی تعمیل کی، لیکن شیطان نے انکار کر دیا۔

امام رازی رحمہ اللہ ذرا منطقی اور فلسفی قسم کے بزرگ گزرے ہیں، ان کے نزدیک شیطان کا یہ استدلال وزن دار

تھا کہ میں آگ سے پیدا ہوا ہوں، جس کا خاصا بلندی کی طرف جانا ہے اور آدم علیہ السلام کو خاک سے پیدا کیا گیا ہے، جس کا خاصا پستی کی طرف مائل ہونا ہے، لیکن شیطان کا فرض یہ تھا کہ وہ اختلافِ رائے کے باوجود سب سے بلند ہستی (خدا) کا حکم مانتا اور نافرمانی کر کے راندۂ درگاہ نہ بنتا۔

امام رازی رحمہ اللہ کی اس نکتہ آفرینی سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ کوئی گھر ہو یا کوئی انجمن، اس کے افراد و ارکان کو کسی معاملے میں اختلافِ رائے ظاہر کرنے کا حق حاصل ہے۔ لیکن جب کافی رد و کد اور بحث و تمحیص کے بعد گھر کا سربراہ یا انجمن کی اکثریت کسی بات کا آخری فیصلہ کر دے تو پھر کسی فرد یا کسی رکن کو اس فیصلے کی مخالفت کا حق نہیں پہنچتا، بلکہ گھر کے تمام افراد اور انجمن کے تمام ارکان کا یہ فرض ہو جاتا ہے کہ وہ اس فیصلے کی پوری پوری پابندی کریں۔ مطلب یہ ہے کہ شیطان نے اگر اپنی برتری کا خیال ظاہر بھی کر دیا تھا تو وہ برتری انسان کے مقابلے میں تھی، لیکن اس اختلاف کے بعد اس کو چاہیے تھا کہ وہ سب سے اعلیٰ اور سب سے برتر ہستی (پروردگار) کا حکم مانتا اور سرکشی کر کے ذلیل نہ ہوتا۔

③ ایمان اور تکبر:

حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے شیطان کا انکار بربنائے توحید پرستی نہیں، بلکہ بربنائے تکبر تھا۔ تکبر خدا تعالیٰ کو پسند نہیں ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ تکبر اور ایمان کسی دل میں اکٹھے نہیں رہ سکتے۔ جس دل میں تکبر ہے وہ سراسر ایمان سے خالی ہے اور جس دل میں ایمان ہے، وہاں تکبر کا گزر بھی نہیں ہوگا۔

④ تکبر کسے کہتے ہیں؟

تکبر کی تعریف یہ ہے کہ انسان حق بات کو جھٹلائے اور دوسروں کو اپنے مقابلے میں ذلیل وحقیر خیال کرے۔ جس شخص میں یہ دو بُری عادتیں ہوں گی، وہ متکبر سمجھا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کو عاجزی اور انکسار پسند ہے۔ فرشتوں کا یہ اندازہ صحیح نہیں تھا کہ آدم علیہ السلام کی تمام اولاد خونریزی کرے گی۔ آج ہم دیکھتے ہیں کہ آدم علیہ السلام کی اولاد میں ایسے ایسے برگزیدہ لوگ بھی گزرے ہیں، جن کے دم قدم سے دنیا کا امن قائم رہا۔ ہر مسلمان کو عاجزی اور انکساری اختیار کرتے ہوئے امن پسند ہونا چاہیے۔

⑤ سجدۂ تعظیمی جائز نہیں:

تعظیم عبادت ہی کا ایک جزو ہے۔ معبود کی عظمت دل میں نہ ہوگی تو عابد کی سجدہ ریزی بے کار ہے۔ بعض لوگوں کا یہ کہنا کہ سجدۂ تعظیمی کسی بزرگ کے سامنے جائز ہے، درست نہیں۔ یہ خواہ مخواہ کا جواز پیدا کیا گیا ہے۔

سجدہ تعبدی صرف اللہ تعالیٰ کا حق ہے۔ اس کے سوا باقی ہر قسم کا سجدہ شریعتِ محمدیہ میں ناجائز ہے۔ آدمی گناہ کو گناہ سمجھے تو اسے توبہ کی توفیق حاصل ہوگی۔ اگر اس نے اس کے جواز کی راہ تلاش کی تو سمجھو شیطان کامیاب ہے۔

⑥ تین سجدے:

قرآنِ کریم کی رو سے تین سجدے غیر خدا کو ثابت ہوتے ہیں۔ فرشتوں نے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کیا۔ جادوگروں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو سجدہ کیا اور حضرت یعقوب علیہ السلام نے مع افرادِ خاندان حضرت یوسف علیہ السلام کو عزیزِ مصر بننے کے بعد سجدہ کیا، لیکن نبیِ کریم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت میں غیر خدا کو سجدہ کرنا شرک قرار دیا گیا۔ اب یہ ایک ایسا گناہ قرار دیا گیا ہے جو ناقابلِ معافی ہے۔ مشرک بہ ہر حال جہنم رسید ہوگا۔

⑦ مسیلمہ کی سرکوبی:

مسیلمہ (جس نے بعد میں تاریخ میں مسیلمہ کذاب سے شہرت پائی) یمن کا رہنے والا تھا۔ اس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی میں نبوت کا دعویٰ کر دیا تھا، بلکہ ایک جھوٹا موٹا قرآن بھی مقابلے میں تیار کرلیا تھا۔ حالت یہ تھی کہ لوگ ہزاروں کی تعداد میں اس کے گرد جمع ہوگئے تھے اور فتنۂ ارتداد بہت تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس فتنے کی سرکوبی کے لیے اسامہ رضی اللہ عنہ کو لشکر دے کر روانہ کیا، اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ٹائیفائڈ بخار (تپِ محرقہ) میں مبتلا تھے۔ لشکر ابھی روانہ ہی ہوا تھا کہ فوراً بعد آپ کا انتقال ہوگیا۔

اسامہ رضی اللہ عنہ کو یہ خبر ملی تو وہ راستے ہی سے واپس آگئے۔ بعد ازاں مسیلمہ پر حملہ کرنے کے سلسلے میں بڑی بحث ہوئی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے سوا باقی تمام صحابہ رضی اللہ عنہم حملہ نہ کرنے کا مشورہ دیتے تھے۔ شاید اس کی بڑی وجہ یہ بھی ہو کہ خزانے میں گنجایش نہ ہو اور زکات وصول نہ ہونے کے باعث آمدنی کم ہوگئی تھی، لیکن خلیفۂ وقت نے فرمایا کہ جو جھنڈا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اسامہ رضی اللہ عنہ کو عنایت فرمایا ہے، اب وہ واپس نہیں ہوسکتا۔ میں اکیلا ہی مسیلمہ کے ساتھ جنگ کروں گا۔ کوئی میرا ساتھ دے چاہے نہ دے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے جب صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کی عزیمت کا حال دیکھا تو اختلافِ رائے کے باوجود اپنے سربراہ کے فیصلے کو تسلیم کرلیا اور باقاعدہ لشکر کی صورت میں مسیلمہ کذاب کی سرکوبی کے لیے روانہ ہوگئے۔ خدا تعالیٰ کی نصرت سے اس لڑائی میں مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی۔

⑧ خیر و شر لازم و ملزوم ہیں:

خدا نے جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو پیدا کیا، وہاں نمرود بھی سرکشی کے ترک پر آمادہ نہ ہوا، جہاں موسیٰ علیہ السلام کو پیدا کیا، وہاں فرعون کو بھی تخت و تاج کا مالک بنایا۔ قومِ عاد کی طرف جہاں ہود علیہ السلام کو ہادی بنا کر بھیجا، وہاں روایتی شداد کو بھی ضلالت کے راستے پر ڈال دیا۔ جہاں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت سے سرفراز فرمایا،

وہاں ابوجہل بھی کفر میں پختہ ہی ہوتا چلا گیا۔ الغرض اللہ تعالیٰ کی مشیت کا تقاضا یہ ہے کہ دنیا میں خیر کے ساتھ ساتھ شر کا وجود بھی باقی رہے، بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ خیر کے مقابلے میں آج شر زیادہ ہے۔

⑨ دعا کی قبولیت کا مسئلہ:

اپنی خواہش ظاہر کرنے اور دعا مانگنے کا حق ہر انسان کو حاصل ہے۔ چاہے وہ نیک ہو یا بد۔ لیکن خدا تعالیٰ اس بات کا پابند نہیں ہے کہ وہ نیک کی ہر دعا ضرور قبول کرے اور بد کی کوئی دعا بھی قبول نہ کرے۔ یہ درست ہے کہ وہ اپنے نیک بندوں کی اکثر دعائیں قبول فرماتا ہے، لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ اپنے بدکار بندے کی کوئی دعا بھی قبول نہ کرے۔ بعض اوقات وہ پیغمبر کی التجا کو رد کر دیتا ہے، چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس نے حضرت نوح علیہ السلام کی دعا اپنے بیٹے کے حق میں، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا اپنے باپ کے حق میں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا اپنے چچا ابوجہل کے حق میں منظور نہیں کی، حالاں کہ یہ دعائیں نیک جذبات پر مشتمل تھیں۔ اس کے برعکس اس قادرِ مطلق نے جو کسی کے سامنے بھی جواب دہ نہیں ہے، شیطان کی دعا کو منظور فرمایا اور اس کی خواہش کے مطابق اسے قیامت تک اس بات کی چھٹی دے دی کہ وہ عام انسانوں کو گمراہ کرے۔ واضح رہے کہ ''عباد اللہ المخلصین'' اس ملعون کی زد سے باہر ہیں۔

⑩ جنت اور دوزخ:

جنت نہایت امن اور ابدی راحت کا مقام ہے، لیکن اس تک پہنچنے کا راستہ بے حد دشواریوں سے معمور ہے۔ دوزخ نہایت تکلیف اور انتہائی ذلت کا مقام ہے، لیکن اس تک پہنچنے کا راستہ بڑی آسایشوں اور عیاشیوں سے پُر ہے۔

⑪ اجتماعی گناہ:

جس طرح ''مرگِ انبوہ جشنے دارد'' ایک حقیقت ہے، اسی طرح جب کوئی گناہ اجتماعی صورت اختیار کر جائے تو عام لوگوں کے دلوں سے اس کے گناہ ہونے کا احساس کم ہو جاتا ہے، بلکہ مٹ جاتا ہے۔ وہ زبانی طور پر برائی کو برائی تو کہہ دیتے ہیں، لیکن اس کو اختیار کرتے ہوئے ذرا نہیں شرماتے، مثلاً: تمبا کو پینے والے اور نہ پینے والے تمام لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ یہ بالکل بے کار چیز ہے، لیکن آج یہ برائی اس قدر عام ہوگئی ہے کہ ہر ناصح کی نصیحت بے کار ہو کر رہ گئی ہے یا، مثلاً: آج کل ڈاڑھی منڈانے کا رواج اس قدر عام ہو گیا ہے کہ نمازیوں کی صفوں کی صفیں بے ریش دکھائی دیتی ہیں۔ حالاں کہ ڈاڑھی منڈانا بڑے گناہوں میں سے ایک گناہ ہے، لیکن فی زمانہ اجتماعی گناہ ہونے کی وجہ سے اس معصیت کا احساس لوگوں کے دلوں سے ختم ہو گیا ہے۔

ایک مرتبہ شاہ صاحب (غالباً سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ مرحوم مراد ہیں) بمبئی گئے۔ انھوں نے وہاں دیکھا کہ ہر سیٹھ نے سونے کے بٹن اور سونے کی انگوٹھی پہن رکھی ہے۔ (ان دو چیزوں کا وہاں بہت رواج ہے، بلکہ یہ سیٹھ ہونے کی نشانیاں سمجھی جاتی ہیں) آپ نے جب ان لوگوں کو منع کیا تو وہ سب ہنسنے لگ گئے۔ حالاں کہ مرد کے لیے سونا پہننا شرعاً حرام ہے۔ مطلب یہ کہ جب بہت سے نادانوں میں ایک دانا گھر جائے، تو وہ اسے نادان سمجھ کر ہنسی اڑاتے ہیں۔ یہ سب اثر اجتماعی گناہ کا ہے۔

شیطان نے انکارِ سجدہ کی بحث کے وقت یہی کہا تھا کہ میں اول گناہ کو مزین کر کے لوگوں کے سامنے پیش کروں گے، دوسرے اسے اجتماعی رنگ دوں گا، تاکہ لوگ اس کے ارتکاب سے گھبرائیں نہیں۔

⑫ غصہ، حسد اور کینہ:

کسی ناپسندیدہ بات پر دل میں ناراض ہونے کی ایک لہر اُٹھی اور تھوڑی دیر کے بعد ختم ہوگئی، اسے غصہ کہتے ہیں۔ یہ انسان کی فطرت ہے، جوش اور غضب ہر بشر میں پایا جاتا ہے، لیکن اُسے دوام نہیں ہونا چاہیے۔

کسی سے ناراض ہونے کے بعد دل میں یہ آرزو پیدا کرنا کہ اس کی فلاں نعمت زائل ہوجائے تو اچھا ہے، اسے حسد کہتے ہیں۔ یہ بہت معیوب ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس جذبے سے محفوظ رکھے۔

کسی کے خلاف اپنے دل میں انتقامی جذبات کا پرورش کرنا، بدلہ لینے کے لیے موقع کی تلاش میں رہنا، کینہ کہلاتا ہے۔ یہ بھی ایک بدترین خصلت ہے۔

⑬ نعمت کی قسمیں:

نعمت کی دو قسمیں ہیں: مادی نعمت اور روحانی نعمت۔ اللہ تعالیٰ جسمانی آسایش کا سامان عطا فرمائے تو یہ مادی نعمت ہے اور اگر روح کی سلامتی کا سامان عطا فرمائے تو یہ روحانی نعمت ہے۔ اگر کوئی شخص جسمانی آسایش کا سامان حاصل کرنے کے لیے کسی کو فریب دے اور اس کے بعد قانون کی گرفت میں آنے کے اندیشے سے ہر وقت بے چین رہے تو وہ خسارے میں ہے، کیوں کہ اس نے جسم کی خاطر ایک ناجائز حرکت سے اپنی روح کو ذبح کرلیا ہے۔ اب وہ بظاہر ایک کھوکھلا سا بدن ہے، جو لوگوں کو حرکت کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

⑭ اہلِ جنت کی زندگی:

جنت میں جانے والے لوگوں پر انعاماتِ الٰہی کی بارش ہوگی۔ ان کے دل ہر قسم کے مخالفانہ جذبات سے پاک ہوں گے۔ وہ کسی قسم کی اُکتاہٹ اور تھکاوٹ محسوس نہیں کریں گے۔ اُنھیں موت کا کوئی کھٹکا نہ ہوگا۔ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ اہلِ جنت اور اہلِ دوزخ کا فیصلہ ہوچکنے کے بعد موت کو ایک جانور کی صورت میں

لایا جائے گا اور اسے جنت و دوزخ کے درمیان ایک مقام پر ذبح کر دیا جائے گا۔[1] جس کا مطلب یہ ہوگا کہ اب کسی کے لیے کوئی موت نہیں ہے۔ اہلِ جنت اس خبر سے خوش ہوں گے اور اہلِ دوزخ رنجیدہ۔

(15) نیکی کی زینت:

ایک نیکی دوسری نیکی کی زینت ہے۔ روزہ رکھ کر اسے شراب سے افطار کرنا پہلی نیکی کو بھی برباد کرنا ہے۔

(16) اسلامی تاریخ کا ایک پہلو:

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا شمار بہادروں میں ہوتا تھا۔ چناں چہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں انھوں نے متعدد لڑائیوں میں شریک ہو کر اپنی خداداد شجاعت کے جوہر دکھائے۔ لیکن حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے زمانے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کوئی لڑائی نہیں لڑی، بلکہ صرف وزیر اور حکومت کے مشیر کی حیثیت سے کام کیا۔ حضرت عثمان کے عہد میں جو اختلافات رونما ہوئے، ان کی وجہ چاہے کچھ بھی ہو، لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ کو چار و ناچار ان میں حصہ لینا پڑا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد جب خلافت کا منصب حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حاصل ہوا تو وہ بڑھاپے کے باوجود پھر جنگوں میں شرکت فرمانے لگے۔ حضرت زبیر اور حضرت طلحہ رضی اللہ عنہما ان کے مخالفین سے مل گئے تھے، کیوں کہ ان کا مطالبہ یہ تھا کہ حضرت عثمان کے قاتلوں کو سزا دی جائے، لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مصلحتاً ایسا کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

(17) غفور رحیم کا مطلب:

غفر کے معنی ہیں ڈھانپنا۔ خدا تعالیٰ بندوں کے بعض گناہوں پر پردہ ڈال دے گا اور انھیں ظاہر نہ ہونے دے گا۔ ان معنوں میں وہ غفور ہے۔ کسی کے حق میں مغفرت کی دعا کا یہی مطلب ہے کہ پروردگار اس کی خطاؤں کو پوشیدہ رکھے اور اسے رسوا نہ ہونے دے۔

رحم کے معنی ہیں ترس کھانا۔ خدا تعالیٰ بندوں کے اچھے اعمال کی واجبی جزا سے بڑھ کر انھیں نوازے گا اور ان کے جائز حق سے زیادہ انعامات مرحمت فرمائے گا۔ ان معنوں میں وہ رحیم ہے۔ کسی کے لیے رحمت کی دعا کا یہی مطلب ہے کہ پروردگار اس پر زیادہ سے زیادہ مہربانی فرمائے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کی ان دو صفتوں کا بہت زیادہ ذکر آیا ہے۔

(18) آپس میں سلام کرنا:

قرآن مجید سے ثابت ہوتا ہے کہ آپس میں سلام کرنا فرشتوں کا بھی شیوہ ہے، چناں چہ جب کچھ فرشتے

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٥٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٤٩)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس غلام علیم یعنی دانش مند بیٹے (حضرت اسحاق علیہ السلام) کی ولادت کا مژدہ لے کر آئے تو انھوں نے سب سے پہلے سلام عرض کیا۔

(19) نیک نامی کا اثر:

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی والدہ کا نام ہاجرہ تھا اور حضرت اسحاق کی والدہ کا نام سائرہ۔ حضرت ابراہیم کے اور بھی کئی بیٹے تھے، لیکن ان دو کا نام زیادہ مشہور ہے۔ بلکہ ان کی نیک اور پیغمبرانہ زندگی کے سبب اُن کی مائیں بھی تمام عالمِ اسلام میں ممتاز ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ نیک اولاد کی نیک نامی کا اثر لازماً والدین پر بھی پڑتا ہے۔

(20) مشیتِ الٰہی کا ظہور کبھی بلا اسبابِ عادیہ بھی ہو جاتا ہے:

عام حالات میں پیغمبر بھی عوام الناس کی طرح اسباب کا محتاج ہوتا ہے، لیکن جب پروردگار کوئی خاص بات اسباب کی کڑیاں ملائے بغیر ظہور میں لانا چاہے تو خود بہ خود ایسا ہو جاتا ہے اور کوئی رکاوٹ راہ میں حائل نہیں ہوتی، مثلاً: حضرت زکریا علیہ السلام کے ہاں بڑھاپے میں لڑکا پیدا ہوا۔ اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاں بھی پیری کے عالم میں حضرت اسحاق علیہ السلام کی ولادت ہوئی۔ یہ دونوں بزرگ خود بھی حیران تھے کہ اس عمر میں ایسا کیوں کر ہو سکتا ہے، لیکن خدا کی مشیت چوں کہ اسی طرح تھی، اس لیے ایسا ہو کر رہا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ حضرت مریم نے بھی حیران ہو کر فرشتوں کو یہی کہا تھا کہ مجھے کسی مرد نے ہاتھ نہیں لگایا۔ پھر میرے ہاں لڑکا کیوں کر پیدا ہوگا؟ لیکن خدا نے اسباب کی قید کو دور کرتے ہوئے حضرت عیسیٰ کو باپ کے بغیر پیدا کیا اور اپنی مشیت کا تقاضا پورا فرمایا۔

(21) دل کی موت:

غلط کار انسان دو قسم کے ہیں: ایک وہ جو بتقاضائے بشریت اگر کوئی غلطی کر بیٹھیں تو جلد یا بدیر اس کا احساس کر کے استغفار کرتے ہیں اور اس غلطی کی نہ صرف تلافی کرتے ہیں، بلکہ آیندہ بھی محتاط رہتے ہیں کہ اس قسم کی غلطی کا ان سے اعادہ نہ ہو۔ دوسرے وہ جنھیں اپنی غلط کاری کا قطعاً احساس نہیں ہوتا اور غلطی کرنے کے بعد خوشی محسوس ہوتی ہے اور نہ برائی کے بعد افسوس ہوتا ہے۔ دل کی موت اسی کیفیت کا نام ہے۔

(22) مایوسی کفر ہے:

اللہ کی رحمت سے انسان کو کسی حالت میں بھی مایوس نہ ہونا چاہیے۔ یہ گناہ بلکہ کفر ہے۔ ہمارا مشاہدہ ہے کہ سخت مایوسی کے عالم میں بھی وہ اچانک ایسے اسباب پیدا کر دیتا ہے کہ پانسا پلٹ جاتا ہے اور کامیابی کی صورت

جلوہ گر ہوجاتی ہے۔ مومن کا دل حق تعالیٰ کی رحمت سے کبھی مایوس نہیں ہوتا۔ البتہ جن لوگوں کا دل مردہ ہو چکا ہو اور جو ضلالت کی گہرائی میں گر چکے ہوں، وہ مایوس ہوجاتے ہیں۔ شرک کے سوا پروردگار ہر قسم کے گناہ معاف کر دے گا۔ قرآن پاک میں کئی جگہ تلقین کی گئی ہے کہ خدا کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔

(23) لفظ آل کے معنی:

آل کا لفظ کئی بار آیا ہے۔ اس کے معنی کو صرف گھر کے افراد تک محدود کرنا درست نہیں، بلکہ آل سے مراد وہ تمام لوگ ہیں، جو رشتے داری کا تعلق رکھنے کے علاوہ ہم خیال اور ہم عقیدہ بھی ہوں، اس اعتبار سے کسی پیغمبر کے تمام متبعین اس کی آل ہیں، مثلاً: آلِ موسیٰ اور آلِ لوط وغیرہ۔ فرعون کے پیروکاروں کو بھی قرآن نے آلِ فرعون کہا ہے۔

(24) مردود بیوی:

حضرت نوح [کی بیوی] کی طرح حضرت لوط کی بیوی بھی مردود ہے، کیوں کہ وہ مخبری کا کام کرتی تھی اور اپنے پیغمبر شوہر کی تمام تبلیغی سکیموں کا راز قبل از وقت فاش کر دیتی تھی۔ یہاں یہ نکتہ ملحوظِ خاطر رہنا چاہیے کہ پیغمبر کی بیوی کافرہ تو ہوسکتی ہے، لیکن وہ زانیہ ہرگز نہیں ہوتی۔

(25) نجات کے لیے اچھے اعمال کی شرط:

حضرت نوح اور حضرت لوط کی بیویاں پیغمبرانہ زوجیت کا درجہ رکھنے کے باوجود قابلِ تعزیر ہیں۔ اس سے یہ حقیقت اُبھر کر سامنے آجاتی ہے کہ محض کسی نیک آدمی کے قرب میں رہنے یا اُس کی خدمت انجام دینے سے نجات لازم نہیں ہوجاتی، بلکہ نجات کے لیے اچھے اعمال کی شرط لازمی ہے، جو لوگ کسی پیر یا بزرگ کے پاس اُٹھنے بیٹھنے اور اس کی خدمت کرنے کو نجات کا ذریعہ خیال کرتے ہیں، انھیں آنکھیں کھولنی چاہییں۔

(26) یہود و نصاریٰ کا حضرت لوط علیہ السلام پر شرمناک الزام:

یہودی اور عیسائی حضرت لوط علیہ السلام کو پیغمبر تسلیم نہیں کرتے، بلکہ ازراہِ شرارت اُن پر اپنی بیٹیوں سے زنا کا الزام لگاتے ہیں۔ أستغفر اللّٰه۔ واضح رہے کہ حضرت لوط، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے تھے۔

(27) سنگین گناہ کا سنگین عذاب:

حضرت لوط علیہ السلام ہجرت کے بعد سدوم کی بستی میں اقامت گزیں ہوگئے تھے۔ اُن کی قوم خلافِ وضع فطری فعل میں بُری طرح مبتلا تھی اور معاشرہ بے حد بگڑا ہوا تھا۔ آپ کی کوشش کے باوجود راہِ راست پر نہ آئے۔

اِعلام کی شناعت و برائی کے علاوہ وہ عام مسافروں کو راہ بتانے کے بجائے گمراہ کر دیتے تھے اور پھر خوب مذاق اُڑاتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے قومِ عاد و ثمود کی طرح آخر کار قومِ لوط کو بھی ہلاک کر دیا اور آج ان کا نام و نشان بھی کہیں باقی نہیں ہے۔ چوں کہ ان کا گناہ سنگین قسم کا تھا، اس لیے ان پر عذاب بھی سنگین قسم کا نازل ہوا، یعنی زمین کا تختہ اُلٹ دیا گیا اور حضرت لوط علیہ السلام کی تمام قوم مَنوں خاک کے نیچے زندہ دفن ہو کر ختم ہوگئی۔ مغلوں کی سلطنت کو زوال آیا، لیکن ان کی نسل آج تک باقی ہے۔ کسی قوم کی پوری نسل کا نابود ہو جانا حقیقتاً بہت بڑا عذاب ہے۔

28 حد اور تعزیر میں فرق:

جن گناہوں کی سزا اسلام نے خود مقرر کر دی ہے، اس سزا کو حد کہتے ہیں، مثلاً: ثبوت مہیا ہو جانے پر زانی اور زانیہ کی سزا بہر حال انھیں سنگسار کرنا ہے یا شرعی شہادتوں کی بنا پر چور کا ہاتھ بہر حال کاٹنا چاہیے۔ اس میں کوئی رعایت نہیں کی جا سکتی۔

تعزیر اس سزا کو کہتے ہیں (جو شریعت میں متعین نہیں کی گئی) جس میں کمی بیشی ہو سکتی ہے اور حاکم وقت جرم کی نوعیت کے پیشِ نظر اپنی صوابدید سے جیسی سزا مناسب سمجھے، دے سکتا ہے۔

29 زنا اور یورپ:

اسلام نسب کی حفاظت کا بہت زیادہ حامی ہے، اس لیے اس نے زانی اور زانیہ کے لیے سخت ترین سزا مقرر کی ہے، تاکہ لوگوں کے اَنساب میں گڑ بڑ نہ ہو، لیکن یورپ اس سنگین سزا کا نام سن کر چیخ اٹھتا ہے۔ وہ آج تک شور مچا رہا ہے کہ اسلام نے زنا کی سزا بہت زیادہ رکھی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام میں نہ حرام زادوں کی گنجایش ہے نہ حرام خوروں کی۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے معاشرے کی فلاح و بہبود کے لیے زانیوں اور چوروں کو سخت سزا دینے کا حکم صادر فرمایا ہے۔ شرک اور کفر بھی سنگین گناہ ہیں، لیکن ان سے مشرک اور کافر خود ہی متاثر ہوتا ہے۔ معاشرے کو نقصان نہیں پہنچتا۔ مشرکوں اور کافروں کو اللہ تعالیٰ آخرت میں پوری سزا دے گا۔

30 برائیوں کا حل:

اسلام نے جہاں زنا کی اتنی سخت سزا مقرر کی ہے، وہاں بیک وقت چار نکاحوں کی اجازت دے کر اس کا حل بھی پیش کر دیا ہے۔ جہاں چور کا ہاتھ کاٹنے کا حکم نافذ فرمایا ہے، وہاں غریبی کو دور کرنے کے لیے زکات اور صدقات ادا کرنے کا فرض بھی مالداروں پر عائد کر دیا ہے۔ پالیسی ہمیشہ یک طرفہ ناکام ہوتی ہے۔ ان احکامات کے ہوتے ہوئے بھی اگر کوئی شخص ضابطہ شکنی کا ثبوت دے اور زنا یا چوری کا ارتکاب کر کے خواہ مخواہ معاشرے میں فتور پیدا کرنے کی کوشش کرے تو وہ واقعی سخت سے سخت سزا کا مستوجب ہے۔

31 مخالفینِ حق کے چار درجے:

پہلا درجہ ''اِعراض'' کا ہے، جس کے لفظی معنی ہیں: روگردانی، اپنی دیگر مصروفیات کے باعث حق سے کوئی واسطہ نہ رکھنا اور نہ حق کی مخالفت میں کوئی خاص سرگرمی دکھانا۔ یہ محرومی اور بدنصیبی کی دلیل ہے۔

دوسرے درجے کا نام ''کفر'' ہے، جس کے معنی ہیں: چھپانا یا کسی نعمت کا انکار کرنا۔ کسی خاص ہنگامہ آرائی کے سبب بے تعلق لوگوں کے سامنے اگر حق خود ہی پہنچ جائے تو اس کو تسلیم کرنے سے کترانا۔ یہ مقام اِعراض سے بدتر ہے۔

تیسرے درجے کا نام ''نفاق'' ہے، جس کے معنی ہیں: دورُخی چال چلنا۔ مصلحتاً کبھی حق کو قبول کر لینا اور کبھی اُس سے پھر جانا۔ ہوا کا رخ دیکھ کر بھاری پلے کی طرف ہوجانا۔ یہ مقام کفر سے بدتر ہے۔

چوتھے درجے کا نام ''استہزا'' ہے، جس کے معنی ہیں: مضحکہ اُڑانا۔ حق کے دلائل کو بے وقار کرنے کے لیے مسخرہ پن دکھانا۔ سچی بات کو بے وزن کرنے کے لیے مذاقیہ انداز اختیار کرنا۔ یہ مقام بھی کفر سے بدتر ہے۔

32 گوشت خوری کا مسئلہ:

ہندو دھرم کے قائلین کو گوشت خوری کے سلسلے میں ''رحم'' کی بدہضمی ہے اور نام نہاد مسلمانوں کو طیب مال کی آڑ میں ''حلال خوری'' کی بدہضمی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں ہی اعتدال کی راہ سے ہٹے ہوئے ہیں۔ ضرورت کے وقت حلال جانور کا ذبح کر لینا اور اس سے فائدہ اُٹھانا بالکل جائز اور فطرتِ انسانی کے عین مطابق ہے۔ البتہ بلا ضرورت بارہ مہینے گوشت خوری کا عادی ہونا قابلِ اعتراض ہے۔ اس عادت کو پورا کرنے کے لیے بعض اوقات نہایت کام کے جانور ضائع ہوجاتے ہیں۔

اسلام نے گوشت خوری کو مباح قرار دیا ہے، روزانہ کھانے کا حکم نہیں دیا۔

33 چوپایوں کی اہمیت:

قرآن کی اصطلاح میں چوپایوں کو جمال کہا گیا ہے۔ چوپائے واقعی انسان کے لیے زینت کا سبب ہیں۔ خصوصاً دیہاتی لوگوں کے بینک اُن کے یہی ریوڑ ہیں۔ اُن کو جب روپے کی ضرورت ہوتی ہے، وہ اپنا ایک آدھ جانور بیچ کر رقم فراہم کر لیتے ہیں اور جب کبھی کہیں سے دولت اُن کے ہاتھ لگتی ہے تو وہ چوپائے خرید کر اُسے محفوظ کر لیتے ہیں۔

انسان کے لیے دودھ کی حفاظت بہت مشکل تھی، جانور تازہ دودھ کا ذخیرہ لیے پھرتے رہتے ہیں۔ اُن

کے تھنوں کو گویا تالے لگے ہوئے ہیں۔ مجال ہے جو ذرا سا دودھ بھی ضائع ہو جائے۔ انسان کو جب بھی ضرورت پڑتی ہے، ان سے دودھ حاصل کر لیتا ہے۔

34 عمل میں اِفراط وتفریط:

کسی عمل میں نہ افراط اچھی ہے نہ تفریط، بلکہ اعتدال بہتر ہے، جسے قرآن کی زبان میں ﴿قَصْدُ السَّبِيْلِ﴾ کہتے ہیں۔

عبادت میں بھی افراط وتفریط مناسب نہیں۔ بعض لوگوں نے فاقہ کشی اور چلہ کشی کو عبادت قرار دے رکھا ہے، یہ افراط ہے اور بعض لوگ فرائض وسنن کی پروا نہ کرتے ہوئے صرف جمعہ کی نماز پڑھ لینے کو عبادت خیال کرتے ہیں، یہ تفریط ہے۔

35 تصوف اور افراط وتفریط:

آج کل بعض صوفیوں کے عجیب وغریب مشاغل دیکھنے میں آ رہے ہیں، جن کا اسلام سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ یاد رکھو کہ صحیح تصوف صحابہ کرام کا تصوف ہے۔ کوئی بڑے سے بڑا ولی اور کوئی بڑے سے بڑا صوفی بھی رسولِ پاک ﷺ کے کسی صحابی کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ چوتھی، پانچویں اور چھٹی صدی میں جس نام نہاد تصوف نے زور پکڑا، اس میں کچھ تو ہندو دھرم کے تصوف کا اثر غالب تھا اور کچھ یہودیت کا۔ جس عمل میں افراط ہوگی، لازماً اس کا ردِ عمل بھی ہوگا اور یہ ردِ عمل تفریط پذیر ہوگا۔

36 احمد (ﷺ) اور محمد (ﷺ) کے معانی:

تحمید کے معنی ہیں: سراہنا، تعریف کرنا، پے بہ پے کسی کو اچھا کہنا۔ حامد اس سے فاعل ہوگا، یعنی تعریف کرنے والا۔ احمد اسم تفضیل ہے، یعنی بہت زیادہ تعریف کرنے والا۔ نبیِ کریم، ختم المرسلین ﷺ سے بڑھ کر دنیا میں کسی پیغمبر نے بھی اللہ تعالیٰ کی حمد بیان نہیں کی، حتی کہ خود خدا نے انھیں فرمایا کہ آپ ﷺ راتوں کو زیادہ دیر تک عبادت نہ کیا کریں۔ گویا آپ ﷺ بہت زیادہ خدا کی تعریف کرنے والے ہیں۔

محمد اسم مفعول ہے، یعنی تعریف کیا گیا۔ دنیا میں کسی پیغمبر کی تعریف رسولِ ہاشمی ﷺ سے بڑھ کر نہیں کی گئی، حتی کہ آپ کے بدترین دشمنوں نے بھی آپ ﷺ کو صادق اور امین تسلیم کیا ہے۔ قیامت تک آپ ﷺ کی خوبیوں کا ذکر یوں ہی جاری رہے گا۔ گویا آپ ﷺ سے بڑھ کر مخلوقِ خدا میں کسی کی تعریف نہیں کی گئی۔

37 رازِ حکیمانہ:

بعض شر پسند مخالفین نے نبی اکرم ﷺ کا نام "مذمم" رکھ چھوڑا تھا۔ جس کے معنی ہیں: مذمت کیا گیا۔

(یہ لفظ محمد ﷺ کی ضد ہے) جب آپ ﷺ کے علم میں یہ بات آئی تو فرمایا کہ اس میں ایک حکیمانہ راز ہے۔ میرا خدا مجھے مخالفین کی گالیوں سے بچانا چاہتا ہے۔ یہ لوگ بزعم خود مذمم کو برا بھلا کہتے ہیں، میرا نام تو محمد ﷺ ہے۔[1]

38 قدرتِ الٰہی کے مظاہر:

قرآن کا منشا یہ ہے کہ انسان زراعت اور ہیئت کا علم باقاعدہ سیکھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے ایسی قوم کے لیے جو نباتات اور نجوم میں غور و فکر کرتی ہو، ان چیزوں کو خدا کی نشانیاں بتایا ہے۔ اگر انسان میں غور و فکر کا مادہ نہ ہو اور وہ مظاہرِ قدرت کو دیکھ کر سوچ بچار نہ کر سکے تو اس کے لیے قرآن کا پڑھنا بے کار ہے۔ مفکرین کے لیے تو کتاب خانۂ عالم کا ورق ورق معرفت کا درس دیتا ہے۔

39 تذکر و تشکر سے محروم لوگ، دہریہ اور مشرک:

دہریہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا انکار کرتا ہے۔ اس کا یہ فعل تذکّر سے محرومی کا نتیجہ ہے اور مشرک خدا کی نعمتوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کسی دوسرے کو اس کا شریک ٹھہراتا ہے۔ اس کا یہ فعل تشکر سے خالی ہے۔

40 موحد اور مشرک:

بخلاف اس کے موحد کا ذہن ہمیشہ مائل بہ تذکر و تشکر رہتا ہے۔ وہ کبھی اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہیں ہوتا۔ اُسے خواہ کتنی ہی ناکامیوں کا سامنا ہو۔ وہ اپنے خالقِ حقیقی کا دَر چھوڑ کر کسی اور کے دروازے پر نہیں جاتا۔ اس کے برعکس مشرک جب کسی ناامیدی کا شکار ہوتا ہے تو فوراً کسی پیر یا فقیر یا کسی قبر یا کسی بت اور مورتی کی طرف رجوع کرتا ہے اور اس کی منت مان کر حصولِ مدعا کی کوشش کرتا ہے۔ حالانکہ پیر ہو یا فقیر؛ وہ بھی اُسی طرح خدا کا محتاج ہے، جس طرح یہ مشرک۔ یاد رکھو کہ دریا کا سفر کرتے ہوئے ''یا خضر المدد'' کہنا صریحاً شرک ہے۔

41 عقائد کی کمزوری:

دنیا میں فائدے اور نقصان ہوتے ہی رہتے ہیں، لیکن جاہل لوگ انھیں اپنے پیروں کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔ کسی کے ہاں بیٹا ہوا تو کہتے ہیں کہ پیر کی دعا سے ہوا اور کسی کی بھینس مرگئی تو کہتے ہیں کہ پیر کی بد دعا سے مری۔ ایسے نادانوں کو کون سمجھائے کہ نفع و نقصان خدا کے ہاتھ میں ہے۔ پیروں فقیروں کا اس میں ذرا بھی دخل نہیں ہے۔

42 جہالت کی باتیں:

پیر پرستوں کی زبان سے اکثر اس قسم کے جملے سننے میں آتے ہیں کہ فلاں پیر بڑی کرنی والا ہے۔ یعنی جو

---

[1] دیکھیں: صحیح البخاري، رقم الحدیث (۳۳٤۰)

کچھ چاہے کر گزرتا ہے، یا اللہ تعالیٰ سے کرالیتا ہے یا فلاں فقیر کا کہا خدا نہیں موڑتا۔ یعنی اس کے کہنے پر عمل کرنے سے انکار نہیں کرتا۔ گویا ان جاہلوں کے نزدیک عاجزی اور مجبوری بہرحال خدا ہی کے حصے میں آتی ہے۔ (معاذ اللہ) واقعہ یہ ہے کہ یہ سب بے سروپا باتیں ہیں۔ توحید کے پرستاروں کو ایسے نادانوں کی اصلاح کرنی چاہیے۔

43 پانی کی قدر:

دنیا کی ہر چیز پانی سے زندہ ہے۔ ہمارے ہاں پانی کی کثرت ہے۔ اس لیے ہم اس کی قدر نہیں کرتے اور ذرا تنکا بھی گلاس میں نظر آئے تو اُسے پھینک دیتے ہیں۔ حالاں کہ جہاں پانی قطرہ قطرہ دستیاب ہوتا ہے اور مقطر کر کے پیا جاتا ہے، وہاں ایک گلاس پانی کی بہت زیادہ قدر ہوتی ہے۔

اگرچہ زمین کے پانی کا مزہ ایک ہے، لیکن وہ ہر درخت کے پھل میں جا کر قدرتِ خداوندی سے الگ الگ مزہ پیدا کرتا ہے۔

44 نعمتوں کی انتہا:

فرمانِ الٰہی: ﴿وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا﴾ کے درس میں فرمایا:

حساب والوں نے ہزار دہ ہزار، لاکھ دہ لاکھ، کروڑ دہ کروڑ، ارب دہ ارب، کھرب دہ کھرب، نیل دہ نیل، سنکھ دہ سنکھ اور پدم دہ پدم جیسے بڑے بڑے عدد وضع کیے، لیکن خدا کی نعمتوں کا شمار پھر بھی نہ ہو سکا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس سلسلے میں بڑے سے بڑا عدد بھی بے کار ہو کر رہ گیا ہے۔ جہاں عدد بے کار ہو جائے، وہاں اِحصاء کیا ہوگا؟ جس کے معنی ہیں: گھیرنا یا احاطہ کرنا۔

45 سکونِ قلبی:

سب سے بڑی دولت سکونِ قلبی ہے۔ جو لوگ زر و مال کی خاطر سرگرداں پھر رہے ہیں، وہ سکونِ قلبی کی نعمت سے محروم ہیں۔ چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ آج یورپ میں کم از کم پچیس فی صد لوگ دماغی عوارض میں مبتلا ہیں اور وہاں آئے دن اچانک حرکتِ قلب بند ہو جانے سے موتیں ہو رہی ہیں۔ بینک بیلنس، کار، کوٹھی اور اس قسم کی دوسری آسایشیں روحانی کیف سے دور کا واسطہ بھی نہیں رکھتیں۔

46 اَساطیر الاولین (زبان کے کرشمے):

اُسطورہ عربی زبان میں جھوٹی کہانی کو کہتے ہیں۔ اساطیر اس کی جمع ہے۔ کفار قرآن کے بارے میں کہا کرتے تھے کہ اس میں صرف اساطیر الاولین درج ہیں۔ یہ صرف اُن کی دریدہ دہنی تھی۔ انسان اگر ناپسندیدگی کا اظہار کرنا چاہے تو وہ اچھی سے اچھی چیز کے متعلق بھی بُرے سے بُرے الفاظ استعمال کر سکتا ہے۔ اسی طرح اگر

وہ بُری سے بُری چیز کو پسند کر کے اُسے اہمیت دینا چاہے تو وہ اس کی شان میں اچھے سے اچھے الفاظ تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ صرف زبان کے کرشمے ہیں۔ زبان کا یہ ٹکڑا اپنی مٹھاس سے جہاں کسی معاملے کو سنوار سکتا ہے، وہاں اپنی کڑواہٹ سے کسی معاملے میں بگاڑ بھی پیدا کر سکتا ہے۔

کوئی شک نہیں کہ قرآن مجید کے درمیانی دس پاروں میں عموماً پہلی قوموں کے مختلف قصے بیان کیے گئے ہیں، لیکن ان میں مبالغہ آرائی نام کو نہیں ہے، بلکہ اس کے بیان کرنے کا مقصد محض عبرت دلانا ہے، تاکہ آنے والی نسلوں کو معلوم ہو کہ بد اعمالی کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ عاد و ثمود کو نام کی زندگی بھی قرآن ہی نے عطا فرمائی ہے۔ ورنہ آج ان بد اعمال قوموں کا نشان تک کہیں باقی نہیں۔

47 اِخفا اور سر میں فرق:

''اِخفا'' کے معنی ہیں بات کو دھیما کرنا، تاکہ وہ دوسروں کے کان تک نہ پہنچ سکے اور ''سرّ'' کے معنی ہیں، بات کو بالکل اپنے دل میں چھپا رکھنا، تاکہ کسی کو اس کا علم نہ ہو سکے۔ بہت سے معاملات باپ بیٹے سے نہاں رکھتا ہے اور بیٹا باپ سے، لیکن اللہ تعالیٰ ہر ظاہر و پوشیدہ بات سے یکساں خبردار ہے۔

48 مُردوں سے مرادیں مانگنا:

سورت نحل میں ﴿اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَاءٍ﴾ کے الفاظ موجود ہیں۔ جن سے صاف ظاہر ہے کہ مردہ لوگ کسی حاجت مند کی مراد پوری کرنے سے قاصر ہیں، بلکہ وہ کچھ نہیں جانتے۔ انھیں تو خود اپنی نسبت اتنا بھی معلوم نہیں کہ وہ دوبارہ کب اُٹھائے جائیں گے۔ ﴿وَمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ﴾ [النحل: ۲۱]

49 بُری رسم کے اِجرا کا گناہ:

جو شخص اپنے مفاد کی خاطر کسی بُری رسم کو جاری کرے گا، دنیا میں جب تک وہ بُری رسم باقی رہے گی، اس کا بانی یا موجد بھی سزا میں برابر کا حصہ دار بنتا رہے گا۔ گویا مرنے کے بعد بھی اُس کے نامۂ اعمال کی سیاہی بڑھتی رہے گی۔

50 پیغمبر اور معجزہ:

ہر پیغمبر کو اللہ تعالیٰ نے کوئی نہ کوئی معجزہ ضرور عطا فرمایا ہے۔ پیغمبر اپنی طاقت سے کچھ نہیں کر سکتا۔ البتہ خدائے قادر وقدیر کے لیے ہر بات آسان ہے۔ اس نے جس وقت بھی کوئی معجزہ مخلوقات کو دکھانا چاہا، پیغمبر کے ذریعے اس کو ظاہر فرما دیا۔ یاد رہے کہ مداریوں کی طرح ہر وقت اور ہر جگہ معجزوں کا اظہار کرتے پھرنا پیغمبر کا شیوہ نہیں ہے۔ ایسا کرنا ویسے بھی اُس کی شان کے منافی ہے۔

51 جائز و ناجائز:

ایک ماں بچہ پیدا ہونے پر خوشی کا اظہار کرتی ہے، نہ صرف وہ بلکہ اس کا سارا خاندان مسرور ہوتا ہے۔ مبارک بادیں دی جاتی ہیں۔ دعوتیں اُڑتی ہیں۔ قریب و دور کے رشتے دار زچہ و بچہ کے لیے حسبِ توفیق تحائف لے کر آتے ہیں۔ اس کے برعکس ایک ماں وہ ہے، جو بچہ پیدا ہوتے ہی رسوائی کے خوف سے اُس کا گلہ گھونٹ دیتی ہے اور پھر اُس کی نعش کو چھپانے کے لیے سو حیلے کرتی پھرتی ہے۔ یہ سارا فرق صرف جائز و ناجائز کی وجہ سے ہے۔ پہلا بچہ حلال زادہ ہے، جو باقاعدہ نکاح کے بعد عالمِ وجود میں آیا اور دوسرا بچہ حرام زادہ ہے، جس کے ماں باپ نے اسلام کے قانون سے بغاوت کر کے غلط راہ اختیار کی اور اُن میں اتنی جرأت باقی نہ رہی کہ وہ بدنامی کا سامنا کر سکیں۔ انسانی دنیا میں جائز و ناجائز کا یہ فرق بہت عالمگیر ہے اور حیا کا کوئی شعبہ اس اصول سے خالی نہیں۔ اسلام نے ہر فعل کو ایک ضابطے میں ڈھال دیا۔ اس پر عمل کرتے ہوئے انسان نہایت پاکیزہ اور بے خوف زندگی بسر کر سکتا ہے۔

52 بدنصیبی کی انتہا:

ائمہ کفر ابوجہل اور ابولہب وغیرہ خانہ کعبہ کا بڑا احترام کرتے تھے، لیکن اُن کا ذہن چوں کہ شروع ہی سے نبی اکرم ﷺ کے خلاف تھا، اس لیے وہ آخر وقت تک اپنے کفر پر ڈٹے رہے۔ جب بدنصیبی مقدر ہو چکی ہو تو صاف اور درست بات بھی انسان کی سمجھ میں نہیں آتی۔ قرآن کا فیصلہ یہ ہے کہ ایسے لوگوں کے حصے میں "خِزْيٌ" (رسوائی) کے سوا اور کچھ نہیں آتا۔ وہ دنیا میں بھی ذلیل ہوتے ہیں اور آخرت میں بھی ان کی ذلت برقرار رہے گی۔ جن لوگوں کی ابتدائی زندگی فسق و فجور میں گزری ہو، لیکن وہ اپنی عمر کے آخری دَور میں صالح و متقی بن گئے ہوں، خدا تعالیٰ کی رحمت سے اُن کی مغفرت ہو جائے گی۔ یاد رہے کہ زبانی طور پر موحد ہونا کافی نہیں۔ انسان کا عمل بھی موحدانہ ہونا چاہیے۔

53 حق گوئی کی پاداش:

جو شخص جتنا حق گو ہوگا، اتنا ہی اُسے تکلیفوں کا سامان کرنا پڑے گا۔ دنیا میں سب سے زیادہ تکلیفیں پیغمبروں کو آتی ہیں، کیوں کہ وہ سب سے زیادہ حق گو ہوتے ہیں۔ جوں جوں وہ حق گوئی سے کام لیتے ہیں، لوگ ان کے خلاف ہوتے جاتے ہیں۔ ہمارے پیغمبر کی شان چوں کہ تمام پیغمبروں سے اونچی ہے، اس لیے ان تمام کے مقابلے میں اُنہیں تکلیفیں بھی بڑے پیمانے پر برداشت کرنی پڑیں۔

54 مخالفت کا اصول:

نبی اکرم ﷺ نے اصولاً بت پرستی کی مخالفت کی ہے۔ قرآن نے بھی دلائل و براہین سے بت پرستی کو بُرا کہا ہے، لیکن بتوں کو گالیاں نہیں دی ہیں۔ قرآن نے مسلمانوں کو بھی ہدایت کی ہے کہ تم کافروں کے بتوں کو بُرا نہ کہو، ورنہ وہ تمھارے خدا کو بُرا کہیں گے۔ البتہ اصولی طور پر بت پرستی اور خدا پرستی کا فرق بیان کرتے ہوئے بت پرستی کے فعل کی مذمت کی جا سکتی ہے۔

آج سے تقریباً پچاس سال پیشتر ہندوستان کے دو گروہوں نے انگریزوں کا ہم خیال ہو کر اسلام کو نقصان پہنچانا شروع کیا تھا۔ اول آریہ سماجی۔ دوسرے مرزائی۔ پہلا گروہ جا و بے جا قرآن پر اعتراضات کرتا تھا اور دوسرا گروہ جواباً ایسا رویہ اختیار کرتا تھا کہ حمایت کی آڑ میں الٹا قرآن کی مخالفت ہو جاتی تھی۔

55 "عَيْنُ السَّخَطِ تُبْدِي الْمَسَاوِيَا":

نبی اکرم ﷺ کا بیس پچیس سال کی عمر میں چالیس سال کی ایک عورت (حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا) سے نکاح کرنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ حضور کو اپنے جذباتِ شباب پر کس قدر قابو تھا اور وہ کس درجہ متقی، پرہیز گار اور کسی بیوہ کی دلجوئی کرنے والے تھے۔ اُن کے مخالفین اعتراض کرتے وقت حقیقت سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں اور تعریف کے پہلو کو بھی اعتراض بنا لیتے ہیں۔ اگر اس کے برعکس معاملہ ہوتا تو نفسانیت کے اعتبار سے واقعی قابلِ اعتراض تھا۔

56 ناپاک ذہنیت کا مظاہرہ:

﴿لَهُمْ فِيهَا مَا يَشَاءُونَ﴾ یعنی جنت میں پرہیزگاروں کے لیے وہ سب کچھ ہوگا، جو وہ چاہیں گے۔ اس پر آریہ لوگوں نے اعتراض کیا تھا کہ کیا اہلِ جنت وہاں چرس بھنگ بھی پی سکیں گے اور کیا وہاں شرمناک جنسی برائیوں کا ارتکاب جائز ہوگا؟ حقیقتاً یہ بیہودہ اعتراض ان کی ناپاک ذہنیت کا آئینہ دار ہے۔ ورنہ اس آیت سے پہلے صاف طور پر مذکور ہے کہ ﴿وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِينَ﴾ یعنی جنت بہت اچھا گھر ہے پرہیزگاروں کا۔ ظاہر ہے کہ اس جگہ وہی لوگ جائیں گے جن کا ذوق سلیم ہوگا اور جو پرہیزگاری کے معیار پر پورے اُتر چکے ہوں گے اور جو اس قسم کی بیان کردہ برائیوں کا خیال تک بھی دل میں نہیں لا سکتے۔ جن لوگوں نے مادی دنیا میں رہتے ہوئے ایسے غلط امور کا ارتکاب نہیں کیا، وہ جنت جیسے پاکیزہ ماحول میں کیوں ایسی حماقت کرنے لگے؟

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ انسان کی تربیت میں اس کے ماحول کو بہت زیادہ دخل ہوتا ہے۔

57 جنت کی توقع:

نماز، روزہ اور دوسرے نیک اعمال کو بہ روئے کار لانے کے بعد جنت کی توقع رکھنا کوئی گناہ نہیں ہے۔

ایماندار آدمی مرتے وقت اس خیال سے بہت خوش ہوتا ہے کہ محنت ومشقت کا دور ختم ہوگیا ہے اور اب صِلہ پانے کا وقت آرہا ہے۔ بالکل اس مزدور کی طرح جو سارا دن کام کرنے کے بعد شام کو اُجرت پانے کے خیال سے خوش وخرم ہو۔

58 غلاظت کی قسمیں:

غلاظت دو قسم کی ہے: ایک جرمی اور دوسری حکمی۔ پہلی قسم کی غلاظت کا تعلق جسم سے ہے، جو پانی سے دور ہو جاتی ہے اور دوسری قسم کی غلاظت کا تعلق انسان کے اخلاق وعقائد سے ہے، جسے ہم روحانی گندگی بھی کہہ سکتے ہیں، یہ توبہ کے بغیر زائل نہیں ہوتی۔

59 صحیح تصوف:

چوتھی اور پانچویں صدی میں ہمارے مشائخ نے یہودیوں، ہندوؤں اور دوسرے لوگوں کے میل جول سے کچھ ایسی رسوم کو تصوف میں شامل کر لیا، جو قطعاً غیر اسلامی ہیں، مثلاً: چلّہ کشی، دم کشی اور فاقہ کشی وغیرہ۔ اسلام نے ان باتوں کو روا رکھا ہوتا تو خود نبی اکرم ﷺ ان پر عمل پیرا ہوتے۔ متواتر بھوکا رہنے سے انسان کسی مشقت طلب کام، مثلاً: ہجرت یا جہاد کے قابل نہیں رہتا۔ چلّہ کش لوگ عموماً اصل عبادت سے غافل رہتے ہیں اور ان کا انجام چرس یا بھنگ پر ہوتا ہے۔ قرآن نے تزکیۂ نفس کے لیے زہد پر زور دیا ہے۔ زہد مالِ دنیا سے بے رغبتی کا نام ہے۔ خدا کی نعمتوں سے جائز طور پر مستفید ہونا منع نہیں ہے۔ صحیح تصوف وہی ہے جو نبی اکرم ﷺ کی زندگی میں پایا جاتا ہے۔

60 فرشتوں کی خصوصیت:

فرشتے خدا کی ایسی مخلوق ہیں، جن پر جنت اور دوزخ کا کوئی اثر نہیں۔ وہ جنت میں بھی احکامِ خدا پر عمل کرانے کے لیے آتے جاتے ہیں اور دوزخ میں بھی۔ اُن کے لیے نہ جنت کی بہاروں میں کوئی کشش ہے نہ دوزخ کے شراروں میں کوئی خوف۔

61 مناظرہ اور الزامی جواب:

الزامی جواب مناظرے کا ایک حصہ ضرور ہے، جس سے مقابل تھوڑی دیر کے لیے چپ ہو جاتا ہے، لیکن حقیقت واصلیت سے اس کا کچھ واسطہ نہیں ہوتا، مثلاً: ایک شخص دوسرے سے کہتا ہے کہ کم تولنا بُرا ہے۔ وہ اس کو تسلیم کرنے کے بجائے جواب میں یہ الزام لگاتا ہے کہ مجھے بھی تمھاری فلاں کمزوری کا علم ہے۔ تم کہاں کے پارسا ہو؟ ظاہر ہے کہ اس سے نصیحت کرنے والا تھوڑی دیر کے لیے سوچ میں تو ضرور پڑ جائے گا، لیکن اس

الزامی جواب کے بعد بھی اصل حقیقت برقرار رہے گی کہ کم تولنا بُری بات ہے۔

مشرک لوگوں نے بھی شرک کی برائیاں سننے کے بعد رسولِ اکرم ﷺ کو یہ نامعقول جواب دیا تھا کہ اگر بُت پرستی بُرا فعل ہے تو خدا ہمیں خود آ کر کیوں نہیں روکتا؟ اس نے ہمیں اتنی کھلی چھٹی کیوں دے رکھی ہے؟ بحث کا یہ طریق منفی ہے۔ مثبت طریق یہ تھا کہ وہ لوگ بت پرستی کو دلائل و براہین سے درست ثابت کرتے۔ انھوں نے الٹا اسے مشیتِ الٰہی قرار دے دیا کہ خدا کی رضا یوں ہی ہے، ورنہ وہ ہمیں ایسا کرنے سے ضرور روک دیتا۔

(62) درجۂ اعتدال کی اہمیت:

خداوند تعالیٰ کا نظام ابتدا سے یہی ہے کہ اس نے اپنے پیغمبروں کی وساطت سے نیک باتوں کی تبلیغ کرائی اور پھر انسانوں کو نیک و بد میں تمیز کرنے کا اختیار عطا فرمایا۔ یہ بات تو بھلی معلوم نہیں ہوتی کہ اس کے فرشتے ہر گھر میں الگ الگ جاتے اور خدائی پیغام سناتے پھرتے۔ ہدایت حاصل کرنے کے لیے صرف پیغمبرِ خدا کا وسیلہ کافی ہے، لیکن افسوس ہے کہ نادان لوگوں نے آج کل وسیلوں کی تہیں لگا دی ہیں۔ جس طرح مشرکینِ مکہ کا پیغمبر کے جائز وسیلے سے انکار قابلِ اعتراض تھا، اُسی طرح موجودہ زمانے کے وسیلہ پرست لوگوں کا رویہ بھی قابلِ اعتراض ہے۔ گویا وہ افراط تھی اور یہ تفریط ہے۔ درجہ اعتدال (یا قصد السبیل) یہ ہے کہ ہدایت یابی کے لیے صرف پیغمبر ﷺ کا وسیلہ کافی ہے۔

وہ مسلمان جو وسیلہ در وسیلہ کی روش پر گامزن ہیں، انھیں درجۂ اعتدال کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔

(63) نیکی و بدی کا اختیار:

اختیار دیے بغیر نیکی اور بدی کا جائزہ لینا ناانصافی ہے، مثلاً: ایک شخص اندھا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ کسی عورت کو نہیں دیکھ سکتا۔ اب اس کی تعریف میں یہ کہنا کہ حافظ جی بڑے پاک نظر ہیں، غلط ہے۔ دیکھنے کا اختیار حاصل ہو اور پھر کوئی نظر کی حفاظت کرے تو واقعی قابلِ تعریف ہے۔ اسی طرح مشرکینِ مکہ کو جب اللہ تعالیٰ نے نیکی و بدی کی شناخت کا اختیار دے دیا تھا تو پھر ان کا یہ کہنا غلط تھا کہ خدا خود آ کر ہمیں بت پرستی سے روکے۔

(64) ضمیر کا فتویٰ:

پیغمبرانہ وسیلے سے قطع نظر خدا کی آواز انفرادی طور پر بھی ہر شخص کے اندر موجود ہے۔ جو اسے نیک کام پر خوشی عطا فرماتی ہے اور بُرے کام پر ملامت کرتی ہے۔ یہ اُس کے ضمیر کا فتویٰ ہے۔ اگر خدا کی اس آواز سے کسی کو انکار ہے تو وہ بتائے کہ چوری کرنے کے بعد کونسی چیز چور کو ڈراتی ہے؟ یہاں پر یہ نکتہ ملحوظِ خاطر رہے کہ حرام وحلال کی صحیح تمیز اور اچھے برے اعمال کی درست شناخت کے لیے پیغمبر کی شریعت ہی ہماری راہنمائی کر سکتی

ہے۔ ورنہ ہر شخص کی نیکی بدی کا معیار جداگانہ ہوگا، جس سے معاشرے میں فتور کا اندیشہ ہے۔ ہمارا اولین فرض ہے کہ ہم اپنے دل کی آواز کو کمزور نہ پڑھنے دیں اور پیغمبر ﷺ کی بتائی ہوئی راہ پر عمل کرتے ہوئے صحیح زندگی بسر کرنے کی کوشش کریں۔

65 تجلّیات کی برداشت:

نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ جب مجھ پر وحی کا نزول ہوتا ہے تو یوں معلوم ہوتا ہے، جیسے کانوں میں گھنٹی کے بجنے کی آوازیں آرہی ہیں، پھر بدن پر ایک لرزہ سا طاری ہوجاتا ہے۔[1] حضور ﷺ کے اس فرمان کی موجودگی میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر عامی شخص کا یہ حوصلہ نہیں کہ وہ تجلیاتِ الٰہی کو برداشت کر سکے، بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ برگزیدہ پیغمبر (حضرت موسیٰ علیہ السلام) کوہِ طور پر بے ہوش ہو کر گر پڑے اور پہاڑ کا ایک حصہ بھی جل کر سرمہ بن گیا۔ ان حالات میں مشرکینِ مکہ کا یہ خیال کس قدر لغو ہے کہ خدا کا پیغام براہِ راست ہم تک کیوں نہیں آتا؟

66 پیغمبروں کا اصل مقصدِ بعثت:

اللہ تعالیٰ نے ہر امت میں ایک ہادی روانہ کر کے حجت تمام کر دی۔ ''اُمت'' لوگوں کے گروہ کو کہتے ہیں، چاہے وہ چھوٹا ہو یا بڑا۔ ان ہادیوں کا کام لوگوں کو نیک و بد کی راہ بتانا رہا ہے۔ پھر چاہے کوئی عمل کرے یا نہ کرے۔ ''البلاغ المبین'' کے بعد لوگوں سے عمل کرانا پیغمبروں کے فرائض میں شامل نہیں ہے۔ قرآنِ مجید میں صرف اُن چالیس نبیوں کا ذکر آیا ہے، جن کے ناموں سے اہلِ عرب پہلے واقف تھے۔[2] باقی نبیوں کا ذکر اس لیے ضروری نہ سمجھا گیا کہ پیغمبرِ آخر الزمان ﷺ پہلے اُن کا تعارف کراتا اور پھر ان کے تاریخی حالات سناتا تو اس طرح بلاضرورت تبلیغی کام بڑھ جاتا۔

اندازہ ہے کہ کل تین سو کے قریب انبیا کو شرع کے مختلف صحیفے دے کر مبعوث کیا گیا ہے۔ ویسے ایک ضعیف سی روایت یہ بھی ہے کہ کُل ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر دنیا میں آئے ہیں۔[3] پیغمبر کی زندگی پیغمبری کا منصب ملنے سے پہلے بھی بے داغ اور صالح ہوتی ہے، تاکہ مخالفین کو حرف گیری کا موقع نہ ملے اور وہ اس کی سابقہ زندگی کے پیشِ نظر یہ نہ کہہ سکیں کہ حضرت اس سے پہلے آپ بھی تو یہ کام کیا کرتے تھے، جس سے اب ہمیں منع فرمارہے ہیں۔ ہر پیغمبر نے صرف خدائے واحد کی عبادت کا حکم دیا ہے اور طاغوت کی عبادت سے روکا

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۲) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۳۳۳)

[2] قرآنِ مجید میں صراحتاً پچیس نبیوں کا نام مذکور ہے، جن میں سے اٹھارہ نبیوں کا تذکرہ ایک ہی مقام (سورت انعام، آیت: ۸۲۔۸۶) پر ہے اور دیگر سات انبیا کے نام مختلف مقامات پر مذکور ہیں۔

[3] مسند أحمد (۵/ ۲٦۵) اس کی سند میں ''معان بن رفاعہ'' اور ''علی بن یزید'' ضعیف ہیں۔

ہے۔ یعنی سب کا مقصدِ اولین توحید کی تبلیغ تھا:

﴿اُعْبُدُوا اللّٰهَ وَ اجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ﴾ [النحل: ٣٦]

لا الٰہ الا اللہ میں بھی ہر قسم کے طاغوت کی نفی ہے۔ کفارِ مکہ میں سے ابولہب وغیرہ خدا کے قائل تھے اور کعبہ کا طواف کرتے ہوئے لبیک بھی کہتے تھے، لیکن اللہ تعالیٰ کے ساتھ بتوں کو سجدہ کرنے کے بھی روادار تھے۔ اسلام اس بات کے سخت مخالف تھا۔ اس لیے ان کی رسولِ خدا ﷺ سے ٹھن گئی اور کفر واسلام کا معرکہ گرم ہوگیا۔ واضح رہے کہ زید بن عمرو زمانہ جہالت میں بھی توحید پرست تھے۔

(67) مختلف بانیانِ مذاہب کی حیثیت:

اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر وادی کے لیے ایک ہادی یا ایک پیغمبر مبعوث کیا ہے، لیکن مرزا غلام احمد اور سرسید احمد خاں کا کرشن، گوتم اور گرو نانک کو نبی کہنا سراسر غلط ہے۔ وہ بانیانِ مذاہب ضرور ہیں اور ان کی زندگی ہم جیسے معمولی لوگوں کے مقابلے میں ممکن ہے، قابلِ تعریف ہو، ہم اُن کی عظمت وشہرت سے بھی انکار نہیں کرتے، لیکن نبوت کا جو بلند مقام اور اعلیٰ معیار ہے، اُس پر یہ لوگ پورے نہیں اُترتے۔ ہم نبی اُسی کو تسلیم کریں گے، جس کی طرف قرآنِ پاک نے اشارہ کر دیا ہو۔ خود نشاندہی کر کے کسی قوم کے بڑے سے بڑے مذہبی پیشوا کو بھی نبی نہیں کہا جا سکتا۔

(68) علمائے اسلام کا بلند مرتبہ:

نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ میری امت کے علما بنی اسرائیل کے نبیوں کی طرح ہوں گے۔[1] یعنی ان کا مشن انبیا کی طرح خدا پرستی کی تعلیم اور توحید کی تبلیغ ہوگا۔ چناں چہ آج ہم دیکھتے ہیں کہ بعض علمائے اسلام نے حق کی حمایت کرتے ہوئے واقعی بنی اسرائیل کے نبیوں کی طرح مشکلات کا سامنا کیا ہے، بلکہ بعض تو اس سلسلے میں پھانسی کے تختے پر بھی لٹک گئے ہیں۔ اللہ کی رحمت ہو ان سب پر۔

(69) قرآنی سجدے کا مسئلہ:

قرآن پاک میں جہاں کہیں سجدہ آیا ہے، تلاوت کرتے وقت اگر اس موقع پر سجدہ کر لیا جائے تو بہتر ہے اور اگر ایسا نہ کیا جائے تو کوئی حرج نہیں، کیوں کہ یہ سجدہ کوئی فرض نہیں ہے۔ سجدہ بہ معنی عاجزی بھی آیا ہے، مثلاً: چودھویں پارہ سورت نحل میں ہے: زمین وآسمان کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرتی ہے۔ یعنی اظہارِ عجز کرتی ہے۔

---

[1] یہ روایت بے سند اور بے اصل ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: کشف الخفاء للعجلوني (١٧٤٤) الفوائد المجموعة (ص: ٢٨٦) السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٤٦٦)

70 کفار کا شرک اور ہمارے دَور کے مسلمانوں کا شرک:

کفارِ عرب اس بات کے قائل تھے کہ خدا ہمیں پیدا کرنے والا ہے اور وہی ہمیں روزی دیتا ہے، لیکن ان کا باطل عقیدہ یہ تھا کہ خدا اس قدر زبردست ہے کہ وہ ہماری بات بتوں کی سفارش کے بغیر نہیں مانتا۔ یہ بت چوں کہ خدا کے مقرب ہیں، اس لیے ان کا وسیلہ اختیار کرنا ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ توحید پرستی سے ہٹ کر بت پرستی میں مبتلا ہوگئے تھے۔ بہ الفاظِ دیگر یوں کہا جا سکتا ہے کہ عقائد کی رو سے خلاقیت اور رزاقی کے دو چشمے ان کے بالکل صاف و شفاف تھے، صرف اُلوہیت کے چشمے کو انھوں نے گدلا کر لیا تھا۔

آج خدا کے نیک بندوں کو چھوڑ کر عام مسلمانوں کی مذہبی بدحالی کا یہ عالم ہے کہ وہ اولاد اور نوکریاں بھی پیروں فقیروں ہی سے مانگتے ہیں اور خدا کی عبادت سے منہ پھیر کر قبر پرستی میں مبتلا ہوگئے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ان وسیلوں کے بغیر براہِ راست ہماری کوئی مراد پوری نہیں ہوسکتی۔ گویا ہمارے مقابلے میں کفارِ عرب کے دو چشمے صاف و شفاف تھے، لیکن ہم نے تینوں چشموں کو گدلا کر لیا ہے۔

71 فنِ تاریخ کی اہمیت:

عبرت حاصل کرنے کے لیے تاریخِ عالم کا جاننا نہایت ضروری اور بے حد مفید ہے۔ قرآن نے بار بار ﴿فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ﴾ کہہ کر ہمیں اس بات کی تاکید فرمائی ہے کہ تم دنیا میں گھوم پھر کر ان مقامات کو دیکھو، جو تاریخ کا ماخذ ہیں۔ اگرچہ پرانے لوگوں کے عبرتناک واقعات کہانیوں کی صورت میں پہلے بھی موجود تھے، لیکن اس فن کی باقاعدہ بنیاد اُندلس کے ایک امام ابن خلدون نے رکھی اور اس کے اصول وضع کر کے گذشتہ تاریخی واقعات کی خوب چھان بین کی۔

72 جبر و اختیار کی وضاحت:

اللہ تعالیٰ نے تھوڑا بہت اختیار ہر انسان کو دیا ہے، لیکن مختارِ کل کا درجہ کسی کو حاصل نہیں۔ اگر یہ اختیار نہ دیا جاتا تو نیک و بد کا امتحان لینا ناانصافی تھی۔ ہمیں اپنے تمام افعال پر اختیار حاصل ہے، البتہ اس اختیار پر ایک اور بڑا اختیار حق تعالیٰ کا غالب ہے۔

جب کوئی بات اس مختارِ کل کو منظور ہو تو پھر ہمارا اختیار ختم ہو جاتا ہے اور وہی ہو کر رہتا ہے، جو اُس مختارِ کل کا منشا ہو، مثلاً: ہم رات کو پروگرام بناتے ہیں کہ صبح لاہور جا کر فلاں فلاں کام انجام دیں گے، لیکن صبح ہونے سے پہلے ہی ہم کسی ایسی بیماری میں مبتلا ہوجاتے ہیں کہ بستر سے اُٹھنا دوبھر ہو جاتا ہے۔ ہمارا سارا پروگرام دھرا رہ جاتا ہے۔

الغرض اس مختارِ کل کے سامنے ہمارا اختیار بے بس ہے۔ جب تک اللہ تعالیٰ چاہے ہم اپنے اختیار سے کام لے سکتے ہیں اور جب وہ مختارِ کل کی حیثیت سے چاہے تو ہمارے اختیار کو مجبوری سے تبدیل کر دیتا ہے اور ہم قطعاً بے بس ہو کر رہ جاتے ہیں۔

(73) نعت گوئی میں غلو سے اجتناب ضروری ہے:

نبی اکرم ﷺ کو نعتوں میں بڑے بڑے توصیفی الفاظ سے یاد کر لینا اور بات ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی صحیح مدح سرائی بے حد مشکل کام ہے۔ ہمارے شاعروں کو اس سلسلے میں بڑی احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ پھر ذیل کا شعر پڑھ کر فرمایا کہ اس قسم کی شاعری سخت قابلِ اعتراض ہے ؎

اللہ کے پلّے میں وحدت کے سوا کیا ہے
جو کچھ ہمیں لینا ہے لے لیں گے محمد ﷺ سے

نعت گو حضرات کو اس قدر مبالغہ آرائی سے کام نہ لینا چاہیے کہ رسول ﷺ کی مدح سرائی کرتے کرتے خدا کی اِہانت کا پہلو نمایاں ہو جائے۔

(74) واعظوں کی غلط بیانی:

سورت نحل (آیت: ۳۷) میں ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے:

﴿اِنْ تَحْرِصْ عَلٰی هُدٰىهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِیْ مَنْ یُّضِلُّ وَ مَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِیْنَ﴾ [النحل: ۳۷]

یعنی اے نبی ﷺ! اگر آپ خواہش کریں ان کو راہ پر لانے کی تو بلاشبہہ اللہ راہ پر نہیں لاتا، ان کو جنھیں وہ گمراہ کر دیتا ہے اور نہ ان کا کوئی مددگار رہی ہے۔

اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اختیار کے سامنے رسولِ کریم ﷺ کی خواہش بھی کوئی معنی نہیں رکھتی۔ وہی مختارِ کل ہے۔ کسی کی مجال نہیں کہ اُس کی مشیت کو بدل سکے۔ اس لیے رسول اللہ ﷺ کو مختارِ کل کہنا اور یہ سمجھنا کہ ہر بات ان کے اختیار میں ہے، ناجائز ہے، بلکہ شرک ہے۔ خدا معلوم لوگ قرآن کو سمجھ کر کیوں نہیں پڑھتے؟ منبروں پر بیٹھ کر واعظوں کا دیدہ و دانستہ غلط بیانی کرنا نہایت افسوس ناک ہے۔ اللہ تعالیٰ اس گمراہ قوم پر رحم فرمائے۔

(75) رسولِ کریم ﷺ کی عملی زندگی سے ایک مثال:

یہ تو ایک نظری بات تھی کہ اللہ تعالیٰ ہی مختارِ کل ہے اور اس کے بالمقابل کسی پیغمبر کو مختارِ کل نہیں کہا

جا سکتا۔ اب ہم ایک نگاہ آنحضرت ﷺ کی عملی زندگی پر ڈالتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ آپ نے بڑی کوشش کی کہ کسی طرح آپ ﷺ کا چچا ابو طالب ایمان لے آئے۔ لیکن اس میں آپ ﷺ کو کامیابی نہیں ہوئی اور آپ ﷺ کا یہ ارمان شرمندہ تکمیل ہی رہا۔ پھر آپ ﷺ نے چاہا کہ اپنے وطن مکہ میں امن و امان سے زندگی بسر کریں، لیکن یہ خواہش بھی پوری نہیں ہوئی، بلکہ مخالفین کی مخالفت نے اس قدر زور پکڑا کہ آپ ﷺ گھر بار چھوڑنے پر مجبور ہو گئے اور غارِ ثور کے اندر چھپ کر جان بچانی پڑی۔ سوال یہ ہے کہ کیا کوئی مختارِ کل بھی گھر بار چھوڑ کر غار میں چھپنے کی ضرورت محسوس کر سکتا ہے؟ مدینے میں بھی پہنچ کر دس سال کے بعد آپ کو کامیابی حاصل ہوئی، گویا کافی عرصہ انتظار کرنا پڑا۔

76 مختارِ کل کی شان:

صرف اللہ تعالیٰ مختارِ کل ہے۔ اُس کے اختیار کی شان کا اندازہ اس سے بہ آسانی ہو سکتا ہے کہ جب وہ کسی بات کا ارادہ کرتا ہے تو حکم دیتا ہے کہ ہو جا، پس وہ فوراً ہو جاتی ہے۔ اس کے مقابلے میں کسی اور کو مختارِ کل کہنا محض لفظ ہی لفظ ہیں۔ ورنہ اختیار کی دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ ہفت اقلیم کا شہنشاہ بھی اگر کوئی کام کرتا رہتا ہے تو اسے کئی برس کئی ماہ اور کئی دن گزر جاتے ہیں۔ طاقتور سے طاقتور حاکم بھی کسی چور یا ڈاکو کو فوراً گرفتار نہیں کر سکتا اور اس کا سارا اختیار بے کار ہو کر رہ جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی وہ مختارِ کل ہے، جس کے ہاں برسوں، مہینوں اور دنوں کی کوئی قید نہیں، بلکہ اس کا ارادہ ہوتے ہی بات فوراً ہو جاتی ہے۔ وہ جس وقت چاہے، جہاں چاہے اور جس طرح چاہے ہر کام کو فی الفور انجام دے سکتا ہے۔ دیکھو آدمی کیا کیا پروگرام بنا کر گھر سے باہر نکلتا ہے، لیکن آناً فاناً کسی چیز سے ٹکرا کر اُس کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ کیا حیات و موت پر اتنا اختیار اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی کو ہے؟

77 ہجرت کی قسمیں:

ترکِ وطن کا نام ہجرت ہے۔ یہ کام انسان جس نیت سے کرے گا، اس کی ہجرت بھی ویسی ہی ہو گی۔ اگر کوئی شخص ملازمت کے سلسلے میں ترکِ وطن کرتا ہے تو یہ ملازمت کی ہجرت ہے۔ اگر کوئی شخص تجارت کی غرض سے ترکِ وطن کرتا ہے تو یہ تجارت کی ہجرت ہے۔ اگر کوئی شخص دوسری جگہ جا کر لوٹ مار کرنے کے ارادے سے اپنا شہر چھوڑتا ہے تو یہ لوٹ مار کی ہجرت ہے۔ اگر کوئی شخص جان بچانے کے لیے گھر سے بھاگتا ہے تو یہ جان کی حفاظت کے لیے ہجرت ہے اور اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے دین کی کھلم کھلا اشاعت کے لیے ترکِ وطن کرتا ہے، یہ ہجرت کارِ ثواب ہے اور اس ہجرت کا درجہ باقی تمام ہجرتوں سے اعلیٰ ہے۔ قرآن پاک نے ایسی ہجرت کرنے والوں کو ﴿هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ﴾ کہا ہے۔

(78) دین کے لیے ہجرت کرنے والوں کا مقام:

اللہ تعالیٰ کے دین کی اشاعت کے لیے ہجرت کرنا ضروری ہے۔ نبیِ اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ دین مہاجروں سے شروع ہوا اور مہاجروں ہی میں آخر کار رہ جائے گا۔ یعنی وہ لوگ ہی اسے زندہ و تابندہ رکھ سکیں گے، جنھیں گھریلو آسایش مطلوب نہ ہوگی اور جو بہ خوشی ترکِ وطن کی تکلیفیں برداشت کر سکیں گے۔[1] پردیس میں جانے والے کو عربی زبان میں غریب کہتے ہیں۔ اس لفظ سے وہ غریب مراد نہیں ہے، جو اُردو میں بہ معنی نادار مشہور ہے، بلکہ غریب الوطن مراد ہے۔ بہر حال دین کی غرض سے ہجرت کرنے والوں کا مفاد عام سیاسی کاروباری مہاجروں کی طرح کسی وقت بھی آپس میں نہیں ٹکراتا، بلکہ وہ لوگ عالمِ غربت میں نہایت محبت اور رواداری سے گزارا کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ پاک میں ایسے مہاجروں سے وعدہ فرمایا ہے کہ انھیں دنیا میں بھی اچھا اجر ملے گا اور آخرت میں بھی۔ چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ نبیِ اکرم ﷺ کے ساتھی مہاجروں کو بعد میں اِس قدر عروج حاصل ہوا کہ ان کی سلطنت اندلس اور دمشق تک وسیع ہوگئی۔ خود فتح مکہ بھی اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا بیّن ثبوت ہے۔

(79) دینی ہجرت توکل اور صبر کا مرحلہ ہے:

گھر بار، اعزا و اقربا اور وطن کی سہولتوں کو خیر باد کہہ کر راہِ خدا میں ہجرت کرنا بہت بڑے حوصلے کا کام ہے۔ خصوصاً اس لیے کہ اس سفر میں آیندہ اسبابِ معیشت کا انسان کو کچھ علم نہیں ہوتا، بلکہ محض توکل ہوتا ہے اور پیش آمدہ مصائب کے مقابلے میں ہر قدم پر انتہائی صبر سے کام لینا پڑتا ہے۔ دوسری اَغراض کے لیے ترکِ وطن میں کم از کم ظاہری اَسباب کا انسان کو ضرور علم ہوتا ہے کہ فلاں جگہ قیام ہوگا اور فلاں جگہ سے آمدنی ہوگی، لیکن دینی ہجرت میں ایسا نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہجرت فی اللہ کرنے والے مہاجرین کو دنیا اور آخرت میں انعامات کی نوید دی ہے۔

(80) حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی پہلی ہجرت:

سب سے بڑی تاریخی ہجرت سے پہلے بھی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ایک بار ہجرت کا ارادہ کر کے اپنا گھر بار چھوڑ دیا تھا۔ راستے میں انھیں ابن دغنہ ملا اور یہ کہہ کر انھیں واپس لے آیا کہ آپ جیسے انسان کے بغیر یہ بستی کس طرح آباد رہ سکتی ہے۔ ابن دغنہ نے اُن کو امان دینے کا وعدہ کیا تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ میں یہ تین صفتیں بدرجہ اتم موجود تھیں، جن کی وجہ سے اُن کا درجہ بہت بلند تھا:

[1] حدیث «بدأ الإسلام غریباً» کی تشریح میں حضرت مولانا نے جو الفاظ کہے ہوں گے، مرتب نے اس کا مفہوم بیان کیا ہے۔
[مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی رحمہ اللہ]

1 دوسروں کی مصیبت کو اپنی مصیبت سمجھ کر اس کا حل سوچنا۔

2 پوری تندہی سے عام مہمانوں کی خدمت میں مصروف رہنا۔

3 کسی سے مرعوب ہوئے بغیر حق بات کا برملا اظہار کرنا۔

ابن دغنہ نے مخالفین سے کہا کہ تم ایسے مرنجاں مرنج اور نیک دل انسان کو کیوں تنگ کرتے ہو۔ انھوں نے کہا کہ ہم اس شرط پر انھیں تمھاری امان میں رہنے دیں گے کہ وہ قرآن اپنے گھر میں پڑھیں۔ یہ شرط مان لی گئی، لیکن ایسا کرنے سے لوگوں کو قرآن سننے کا اور زیادہ شوق ہوگیا۔[1]

آج بھی ہم دیکھتے ہیں کہ حکومت جس کتاب کو ضبط کرنے کا اعلان کر دے، وہ اور زیادہ بکنے لگ جاتی ہے اور لوگ خواہ مخواہ اُسے پڑھتے ہیں۔

81 مہاجرین، انصار اور طلقا:

جن لوگوں نے نبی اکرم ﷺ کے ساتھ مکہ چھوڑ کر مدینے کی طرف ہجرت کی، انھیں ''مہاجرین'' کہتے ہیں، جن لوگوں نے مدینے میں مہاجرین کی امداد کی، انھیں ''انصار'' کہتے ہیں اور جن لوگوں کو فتح مکہ کے بعد نبی اکرم ﷺ نے آزاد کیا، انھیں ''طلقا'' کہتے ہیں۔ مہاجرین مہاجر کی جمع ہے، انصار ناصر کی اور طلقا طلیق کی۔

82 مسئلہ بشریت کا الجھاؤ:

حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد ﷺ تک (اور ان کے بعد آج تک) یہ مسئلہ لوگوں کے حلق میں ایسا اڑا ہے کہ صاف ہونے میں نہیں آتا۔ خدا معلوم ان کی خواہش یہ کیوں ہے کہ وہ نبی کو الگ جنس قرار دیں، حالاں کہ سورت نحل میں اللہ تعالیٰ کا صریح ارشاد ہے:

﴿وَ مَاۤ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوۡحِيۡۤ اِلَيۡهِمۡ﴾ [النحل: ٤٣]

یعنی اے نبی (ﷺ)! ہم آپ سے پہلے جو بھی رسول بھیجے، وہ مرد ہی تھے، جن کی طرف ہم وحی کرتے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ نبی شکل وصورت میں عام انسانوں کی طرح ہوتا ہے، لیکن روحانی اعتبار سے کوئی عام انسان اُس کا مثل نہیں ہوتا۔ ﴿قُلۡ اِنَّمَاۤ اَنَا بَشَرٌ مِّثۡلُكُمۡ﴾ [الکھف: ١١٠] میں بھی ﴿مِثۡلُكُمۡ﴾ ہے۔ مراد جسمانی اعتبار سے تمھاری مثل ہے، ورنہ رسولِ اکرم ﷺ کی روحانیت کے لحاظ سے کوئی بشر بھی آپ ﷺ کی مثل نہیں ہے۔ کیا خدا کی طرف سے وحی آنے اور نہ آنے کا فرق کوئی معمولی فرق ہے؟

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢١٧٥)

(83) غیر جنس سے بے معنی مقابلہ:

جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ نبی کو فرشتہ ہونا چاہیے، وہ غلطی پر ہیں۔ بشر ہوتے ہوئے اگر کوئی نبی معجزہ دکھائے گا تو وہ معجزہ ہوگا، ورنہ معجزہ نہیں ہے۔ ہمارا غیر جنس سے مقابلہ بے معنی ہے۔ ہاتھی چالیس من بوجھ اُٹھا سکتا ہے، لیکن انسان ایک دو من بھی بہ مشکل اٹھاتا ہے۔ پس ہاتھی کا زیادہ بوجھ اُٹھانا غیر جنس ہونے کی وجہ سے ہمارے لیے تعجب خیز نہیں ہے۔ اسی طرح اگر فرشتہ غیر جنس ہوتے ہوئے ہمیں کوئی معجزہ دکھائے گا تو وہ ہمارے نزدیک معجزہ نہیں ہوگا۔

(84) احادیثِ نبویہ ﷺ کی اہمیت:

اللہ تعالیٰ نے اپنا پیغام سنانے کے لیے حضرت محمد ﷺ کو منتخب فرمایا۔ ﴿لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ﴾ میں اسی طرف اشارہ ہے۔ یہ آیت ظاہر کرتی ہے کہ آنحضرت ﷺ کا ہر فرمان اللہ تعالیٰ کے منشا کی پوری ترجمانی ہے۔ اُن کے ارشاد کے بالمقابل اور کسی کا قول معتبر نہیں ہے۔ کوئی شک نہیں کہ آج بعض حدیثیں ضعیف، بلکہ موضوع بھی ہیں، لیکن اس صورتِ حال سے گھبرا کر راہِ فرار اختیار کرنا اور حدیث کی ضرورت ہی سے انکار کرنا غلطی ہے۔ فی زمانہ عدالتوں میں سچ جھوٹ سب کچھ چل رہا ہے، حاکم اچھے بھی ہیں اور رشوت خور بھی۔ گواہ سچے بھی ہوتے ہیں اور جھوٹے بھی۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ہم عدالت اور ضرورتِ شہادت سے انکار نہیں کر سکتے۔

باقی سوال رہ جاتا ہے تحقیقِ حق کا۔ سو قرآنِ پاک نے تحقیقِ حق کی عام دعوت دی ہے۔ ﴿بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ﴾ [النحل: ٦٦] میں اِسی طرف اشارہ ہے کہ تم ہر بات کو خوب کرید کرید کر معلوم کرو، تاکہ حقیقت کا کوئی پہلو تمھاری نظروں سے اوجھل نہ رہے۔ علم یہ نہیں کہ تحقیقِ حق کے بجائے راہِ فرار اختیار کی جائے، جو حدیث کچھ ضعیف یا موضوع نظر آئے۔ اس کی تحقیق کرنا ہمارا فرض ہے۔ اس کے برعکس حدیث کی ضرورت ہی سے منکر ہو جانا کسی عالمِ دین کی شان کے شایاں نہیں ہے۔ ﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى﴾ [النجم: ٣] کی رو سے نبی اکرم ﷺ کا عام بولنا بھی وحی کے ذیل میں آتا ہے، جس مسئلے میں اُنھوں نے خاموشی اختیار کی، وہاں خاموشی ہی سنت قرار پائی۔

(85) تحقیقِ حق سے گریز:

آج ہمارے علما منبروں پر کھڑے ہو کر جو کچھ کہہ دیتے ہیں، عوام بغیر تحقیق کے اُسے تسلیم کر لیتے ہیں۔ یہ مانا کہ بہت سے علما نہایت ذمے داری سے سوچ سمجھ کر ہی وعظ فرماتے ہیں اور لوگوں کی اصلاح کرتے ہیں، لیکن بیچ میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں، جنھوں نے خواہ مخواہ چند من گھڑت مسائل پیدا کر رکھے ہیں۔ کسی واعظ

نے جوشِ عقیدت میں کہہ دیا، نبی اکرم ﷺ کا سایہ نہیں تھا۔ سننے والوں نے تحقیق کے بغیر اُسے تسلیم کر لیا، جس نے اس بات سے انکار کیا، اُسے وہابی کہہ کر دو چار گالیاں دے دیں اور گھر کو چلے گئے۔ ظاہر ہے کہ اس طرزِ عمل سے ﴿بِالْبَيِّنٰتِ وَ الزُّبُرِ﴾ کا تقاضا پورا نہیں ہوتا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کسی چیز کا سایہ نہ ہونے سے اُس کے ادب و احترام میں کیا اضافہ ہوتا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے ﴿لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ﴾ کہہ کر پیغمبر کے ذمے بیان کرنے کی ڈیوٹی لگائی اور ہمیں ﴿لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ﴾ کہہ کر دعوتِ فکر دی۔

86 ارشادِ نبوی ﷺ کی دریافت کا جذبہ:

ایک مرتبہ شام میں طاعون پھیل گیا، وہاں جانے کی بابت حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مہاجرین، انصار اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم سب سے باری باری نبی اکرم ﷺ کا کوئی ارشاد دریافت کیا، لیکن تسلی نہ ہوئی۔ آخر کار عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے کہا کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ جہاں کوئی بیماری پھیل جائے، وہاں سے بھاگو نہیں اور جہاں کوئی بیماری پھیلی ہو، وہاں جاؤ نہیں۔ اس پر عمل کرتے ہوئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے شام میں جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ ایک صاحب نے اعتراض کیا کہ آپ رضی اللہ عنہ تقدیرِ الٰہی سے بھاگ رہے ہیں۔ جواباً فرمایا کہ میں تقدیرِ الٰہی سے تقدیرِ الٰہی ہی کی طرف بھاگ رہا ہوں۔

87 تقدیرِ الٰہی کی ایک مثال:

دو چراگاہیں تمھارے سامنے ہیں؛ ایک میں خوب سبزہ اُگا ہوا ہے۔ دوسری بالکل خشک پڑی ہے، اب بتاؤ کہ تم اپنے اونٹوں کو کس چراگاہ کی طرف لے جاؤ گے؟ ظاہر ہے کہ جدھر سبزہ اُگا ہوا ہے۔ خشک چراگاہ میں یہ کہتے ہوئے اونٹوں کو لے جانا کہ تقدیرِ الٰہی سے بھاگنا نہیں چاہیے، غلط ہے۔ اسباب پر نظر رکھتے ہوئے کامیابی حاصل کرنا عین اسلام ہے، کوئی کام اپنے آپ نہیں ہوتا۔ خشک چراگاہ کو محض اس لیے ترجیح دینا کہ خدا کو منظور ہوگا تو یہیں اونٹوں کا پیٹ بھر جائے گا، حماقت ہے۔

88 عذابِ الٰہی کے چار طریقے:

نڈر لوگوں کو اُن کی بد اعمالی کے سبب خدا کا عذاب حسبِ ذیل چار طریقوں سے گھیر سکتا ہے:

1. اُن کو زمین دھنسا دے۔
2. کسی غیر معلوم جگہ سے اُن پر مصیبت نازل کر دے۔
3. وہ چلتے پھرتے (حالتِ تقلب میں) عاجز ہو کر رہ جائیں۔
4. کسی معلوم شدہ اندیشے کی جگہ سے اُن کو گرفت میں لے لے۔

سورت نحل میں نزولِ عذاب کی ان چار صورتوں کا بیان کرنے کے بعد برمحل ارشاد ہوتا ہے: ﴿فَإِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوفٌ رَّحِيمٌ﴾ [النحل: ٤٧]

89 رؤف اور رحیم کے معنی:

رؤف کے معنی ہیں رافت، رحیم کے معنی ہیں رحم کرنے والا۔ قرآن پاک میں یہ دو صفاتی نام نبی اکرم ﷺ کے بھی آئے ہیں، لیکن فرق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا رؤف و رحیم ہونا کسی تاثر کے تحت نہیں ہے۔ (کیوں کہ کسی بات سے متاثر ہونا شانِ خداوندی کے منافی ہے) وہ تو ازراہِ احسان اپنے بندوں کے لیے رؤف و رحیم ہے، لیکن نبی اکرم ﷺ کا کسی کے لیے رؤف و رحیم ہونا ازراہِ تاثر ہے۔ وہ کسی کی حالت بھی دیکھ کر اُس کے لیے بلاشبہہ رؤف و رحیم ہیں۔ مہربانی اور رحم کا مادہ کم و بیش ہر انسان میں ہے، لیکن درجہ بدرجہ یہ صفت بڑھتی جائے گی۔ کوئی بزرگ یا ولی، خواہ کتنا ہی اعلیٰ پائے کا ہو، وہ مہربانی اور رحم میں نبی کے مقابلے میں نچلے درجے پر ہوگا۔ اسی طرح نبی کی شان میں کسی کو کوئی شک نہیں۔ ان کی ذاتِ گرامی کو لا ریب بے حد بلند مقام حاصل ہے، لیکن اُن کی عظمت و بزرگی اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں نہیں لائی جا سکتی۔ اللہ اکبر کہنے کا مطلب ہی یہ ہے کہ ہم سب صاغرین میں سے ہیں۔

90 اہلِ شرک کی نادانی:

جَین مت (ہندوؤں کا ایک فرقہ ہے) کے حامی لوگ ہزاروں دیوتاؤں کے قائل ہیں۔ عرب کے کفار نے خانہ کعبہ میں تین سو ساٹھ بت رکھے ہوئے تھے۔ وہمی طور پر جس کو جس بت سے فائدہ پہنچتا، وہ اُسی کا پُجاری بن جاتا۔ آتش پرست دو خداؤں کے قائل تھے۔ اہرمن کو شرارتوں کا خدا اور یزداں کو خیر و برکت کا خدا مانتے تھے۔ اصولاً یہ سب کے سب مشرک ہیں۔

یاد رکھو! شرک کم سے کم بھی گوارا نہیں کیا جا سکتا۔ بعض لوگ ہاتھی، بندر اور سانپ وغیرہ کو پوجتے ہیں اور اس قسم کی اشیا کو اللہ تعالیٰ کی صفات کا مظہر بتاتے ہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ صفت کہیں ہو اور موصوف کہیں! پچھلے دنوں امریکہ نے بھارت سے کچھ بندر طلب کیے تو بندر کے پُجاریوں نے شور برپا کر دیا کہ یہ ہمارا دیوتا ہے، اسے وہاں مت بھیجو۔ ذرا حماقت ملاحظہ فرمایئے کہ خود دیوتا تو جانے سے انکار نہیں کرتا، لیکن پُجاری اُسے رکوا رہے ہیں!!

91 مسلمانوں میں رواج یافتہ موجودہ دَور کا شرک:

فی زمانہ لوگوں نے بتوں کی جگہ بعض قبروں (جو عرفِ عام میں خانقاہیں اور مزار کہلاتی ہیں) کو بڑی

اہمیت دی ہے۔ ہر علاقے کی الگ الگ خانقاہیں مشہور ہیں۔ جہاں ان قبروں والوں سے مرادیں طلب کی جاتی ہیں، جو اس دنیا سے رخصت ہوگئے ہیں۔عقیدت مندوں کا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کچھ اختیار ان بزرگوں کی طرف (معاذ اللہ) منتقل کر دیے ہیں۔ بھلا اختیاراتِ خدائی کس طرح منتقل ہوسکتے ہیں؟ کوئی باپ اپنے بیٹے کو اپنا باپ پن یا کوئی ماں اپنی بیٹی کو اپنا ماں پن کیسے دے سکتی ہے؟ بیٹا اپنے بیٹے کا باپ اور بیٹی اپنی بیٹی کی ماں تو بن سکتی ہے، لیکن دوسرے کا تشخص تبدیل ہونا محال ہے۔ بعض لوگوں کو یہ کہتے ہوئے بھی سنا گیا ہے کہ فلاں پیر بڑی گرنی والا ہے۔ خدا اس کی بات کو رد نہیں کرتا۔ گویا ہر لحاظ سے عجز خدا ہی کے حصے میں آتا ہے (یہ صریحاً شرک ہے اور) شرک نا قابلِ معافی ہے۔

(92) حلول کا لغو مسئلہ:

جین مت والوں کا ایک لغو خیال یہ ہے کہ مچھر سے لے کر ہاتھی تک تمام چھوٹی بڑی چیزوں میں خدا سمایا ہوا ہے۔ ایک روح ان تمام جانوروں سے ہوتی ہوئی ترقی کر کے آخر خدا سے جا ملتی ہے۔ یہ حلول کا مسئلہ بالکل بے معنی ہے۔ ہمیں دنیا میں ایک روح بھی ایسی نہیں ملے گی، جو اپنے گذشتہ جنم کا کچھ حال بتا سکے۔ پھر ایسی ترقی سے کیا فائدہ، جس میں صاحبِ روح کو اپنی پہلی پست منزل کا پتا ہی نہ ہو؟ اس قسم کے تمام غیر اسلامی عقائد شرک کی ذیل میں آتے ہیں، انسان کا فرض ہے کہ وہ اس خدائے واحد کے سوا، جو اس کا حقیقی خالق و رازق ہے، کسی کو اپنا دیوتا یا معبود نہ مانے۔

(93) ملکیت کا تصور:

جو کچھ آسمان اور زمین میں ہے، ہر چیز کا مالکِ حقیقی خدا ہے۔ مجازی مالکوں کا تصورِ ملکیت ناپائیدار ہے۔ یہ عارضی الاٹ منٹ ہے۔ دنیا میں کوئی چیز ایسی نہیں، جس کا مالک آئے دن تبدیل نہ ہوتا رہتا ہو۔ دکاندار اپنی دکان میں مال ڈال کر کہہ سکتا ہے: ہمارا مال آ گیا ہے، لیکن تھوڑی دیر کے بعد ہی ہم دیکھتے ہیں کہ اس مال کا مالک کوئی اور خریدار بن جاتا ہے۔ آئے دن دکانوں کی خرید وفروخت سے بھی مالکوں میں تبدیلی رونما ہوتی رہتی ہے۔ یوں سمجھ لینا چاہیے کہ ہم صرف سیل مَین کا پارٹ ادا کرتے ہیں۔ ورنہ درحقیقت یہ مال کسی اور کا ہے اور اُسے اللہ کہتے ہیں۔ اسی لیے یہ حکم ہے کہ مال تو ہمارا (اللہ تعالیٰ کا) ہے، تم لین دین کے وقت کسی قسم کا دھوکا فریب کر کے مفت میں گناہگار نہ بنو اور نہایت نیک نیتی کے ساتھ معاملات کو انجام دو، یہ سودا بازی چند روزہ ہے۔

(94) غیرِ خدا کا خوف:

آنحضرت ﷺ کے پاس ایک نو مسلم قبیلہ آیا اور بتایا کہ ہم نے اور سب بت تو توڑ دیے ہیں، لیکن ایک

بُتنی سے ڈر لگتا ہے، کیوں کہ وہ جابر (زبردست) ہے۔ آپ نے اپنے ایک صحابی کو اس غرض کے لیے ان کے ہمراہ روانہ کیا۔ وہ توڑنے لگے تو پہلی مرتبہ گر پڑے۔ وہم پرستوں نے کہا: دیکھا! بتنی نے اپنا کرشمہ دکھا دیا۔ لیکن یہ اتفاق کی بات تھی۔ دنیا میں اچھے بُرے واقعات ہوتے ہی رہتے ہیں۔ نفع وضرر کو غیر خدا سے منسوب کرنا گناہ ہے۔ ہمارے معاشرے کا یہ حال ہے کہ بھینس مرگئی تو (کہا جاتا ہے) پیر کی بد دعا سے مری۔ بیٹا پیدا ہوا تو پیر کی دعا سے پیدا ہوا (معاذ اللہ) یہ تمام باتیں شرک ہیں۔ ان سے بچنا چاہیے۔

ایک مرتبہ عربوں کا ایک قافلہ جنگل میں ٹھہرا۔ سردار نے بلند آواز سے کہا: جنگل کے جنوں! ہمیں رات بسر کرنے کی اجازت دے دو۔[1] اس کا یہ فعل سخت حماقت پر مبنی تھا۔ مردِ مومن کو غیر خدا سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

95 بیٹی کی پیدایش:

عرب میں لات، منات اور عزیٰ وغیرہ عورتوں کے نام تھے۔ ان ناموں کے مشہور بت بھی مونث تھے (پنجابی میں بتنیاں کہہ لیجیے) یہ کتنی عجیب بات ہے کہ مشرکین ان مونث بتوں کو تو خدا کی بیٹیاں بتاتے تھے، لیکن خود بیٹیوں کی پیدایش سے گھبراتے تھے۔ یہاں ایک بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ عرب میں عام لوگ دُختر کشی کے حامی نہ تھے۔ ورنہ عربوں کی نسل بالکل ختم ہو جاتی۔ خصوصاً یہود ہرگز ایسا نہ کرتے تھے۔ البتہ بنو تمیم وغیرہ چند قبیلے ایسے تھے، جو بیٹی کی پیدایش کو بُرا سمجھتے تھے (واقعہ یہ ہے کہ) کسی کے ہاں بیٹا پیدا ہو یا بیٹی؛ سب اللہ تعالیٰ کے حکم سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس میں کسی کا کچھ دخل نہیں۔ اس معاملے میں ہر انسان بالکل مجبور ہے۔ اولاد کا ایک فائدہ یہ ہے کہ وہ انسان کو نرم اور متواضع ہونا سکھاتی ہے۔

96 عورت کا صحیح مقام:

عرب کے بعض قبیلوں نے اپنی جہالت کی بنا پر عورت کا مقام اس قدر گرا دیا تھا کہ وہ بیٹی کی ولادت سے ہراساں ہو کر اُسے زندہ درگور کر دیتے تھے۔ اُن کے خیال میں کسی کو اپنا داماد بنانا بے عزتی کی بات تھی۔ آج یورپ نے ترقی کے نام پر عورت کا مقام اس قدر پست کر دیا ہے کہ سوسائٹی میں اس کے وجود سے ہر طرف خرابی رونما ہوگئی ہے اور حکومت کو جا بجا حرامی بچوں کی تربیت گاہیں کھولنی پڑ گئی ہیں۔ یہ دونوں گروہ غلط کار ہیں۔ عورت کا صحیح مقام وہی ہے، جو اسلام نے اُسے عطا فرمایا ہے اور وہ گھر کی چار دیواری ہے۔

97 کسی خرابی کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب نہیں کرنا چاہیے:

اللہ تعالیٰ کا ایک صفاتی نام ''حکیم'' ہے۔ یعنی ایسی ذات جس کی ہر تدبیر مبنی بر حکمت اور نہایت محکم ومضبوط

[1] دیکھیں: تفسیر الطبري (۱۲/ ۲٦۳)

ہے۔ انسان کو ازراہِ ادب اللہ تعالیٰ کی طرف اچھی باتوں ہی کو منسوب کرنا چاہیے، مثلاً: عدل، احسان اور رحم وغیرہ۔ ﴿وَلِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰی﴾ کا یہی مطلب ہے۔ نبیِ کریم کی شریعت نے بیماری کو اپنی کوتاہی کی طرف منسوب کرنے کی تعلیم دی ہے اور ہر بہتری کو من جانب اللہ فرمایا گیا۔ یہ درست ہے کہ سنکھیا میں موت کا سبب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، لیکن اُس کے سبب کو کرنا انسان کی اپنی حرکت ہے۔ اس مثال کی روشنی میں شر اور موت کے فساد کی اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت درست نہیں، بلکہ اس میں انسان کی اپنی کوتاہی اور عاقبت نا اندیشی ہے۔ اگر کوئی شخص موت کی راہ خود اختیار کرے تو اللہ تعالیٰ اس پر یقیناً موت مسلط کر دیتا ہے۔ بے شک قادرِ حقیقی وہی ذات ہے، لیکن ہر خرابی کے اختیار کرنے میں انسان کی اپنی صوابدید کا دخل ہے۔ کسی خرابی کا الزام اللہ تعالیٰ پر دھرنے سے حدیث شریف میں ممانعت آئی ہے: «وَالشَّرُّ لَيْسَ إِلَيْكَ»[1]

بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کے اسباب انسانی دنیا خود اختیار کرتی ہے۔ یہی حال کفر و ایمان کا ہے، جو دل جس راہ پر گامزن ہونا چاہے، اللہ تعالیٰ اُس کے لیے ویسی ہی توفیق ارزانی فرما دیتا ہے۔ ہمیں ہمیشہ خیر کی توفیق مانگنی چاہیے اور اپنی فراست کو بروئے کار لا کر نیک وسائل اختیار کرنے چاہییں۔

98 دابہ کے معنی:

چیونٹی سے لے کر انسان تک ہر وہ چھوٹی بڑی چیز جو روئے زمین پر چلتی پھرتی ہے، قرآن کی زبان میں دابہ ہے۔ بعد میں فارسی والوں نے اِسے چوپائے کے معنی میں استعمال کرنا شروع کر دیا۔ (جمع اس کی دواب ہے) آج کل ایران اور مصر وغیرہ کی طرف دابہ کا لفظ صرف گھوڑے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ روز مرہ اردو میں یہ لفظ رائج نہیں ہے۔

99 ضبط ونظم کی خوبی:

ڈسپلن کا انگریزی لفظ آج کل عام بولا جاتا ہے۔ ضبط ونظم کہو یا ڈسپلن، اس کی اچھی اور صحیح تعریف یہ ہے کہ کوئی کام وقتِ مقرر سے ایک سیکنڈ پہلے ہو نہ بعد میں۔ قولِ رازی کے مطابق تقدیم میں ضعف کا پہلو نہیں ہے، بلکہ مستعدی اور کام پر آمادگی پائی جاتی ہے، البتہ تاخیر میں ضعف کا پہلو نمایاں ہے، مثلاً: اگر کوئی گاڑی لیٹ ہو تو یقیناً کسی خرابی اور کمزوری کے سبب سے ہوگی، لیکن مقررہ وقت سے پہلے آ جانے میں خرابی اور کمزوری کا پہلو نہیں ہے۔ تاہم یہ تقدیم بھی صحیح ضبط ونظم کے منافی ہے۔ کارخانۂ الٰہی کا سارا نظام پورے ڈسپلن کے تحت چل رہا ہے، حتیٰ کہ کسی جاندار کی موت میں بھی مقررہ وقت سے ایک لمحہ آگے پیچھے نہیں ہو سکتا۔

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۷۷۱)

بڑے سے بڑا سائنس دان بھی اس معاملے میں بے بس ہے ؎

جو برق و باد پہ قادر وہ اس قدر مجبور — کہ ایک سانس بڑھانے کا اختیار نہیں

(100) گناہوں پر گرفت میں تاخیر:

انسانی طبائع دو طرح کی ہیں: ایک وہ جو گناہ کرنے کے بعد فوراً تائب ہو جاتی ہیں۔ دوسرے وہ جو گناہ پر گناہ کرنے کی عادی ہو جاتی ہیں۔ ایسے لوگوں کا ذہن کچھ اس طرح کا بن جاتا ہے کہ ہم تو گناہگار ہیں، ہمیں نیکی کی توفیق کس طرح مل سکتی ہے؟ ان میں بدترین لوگ وہ ہیں، جو گناہ کا ارتکاب کرنے کے بعد اینٹھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر خدا ہے تو وہ ہمیں گناہوں سے کیوں نہیں روکتا؟ اس کا عذاب ہم پر کیوں نازل نہیں ہوتا؟ قرآن کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ اگر ایسے لوگوں کی فوری گرفت کرنے لگے تو روئے زمین پر ایک بھی چلنے والا نظر نہ آئے۔

(101) عذابِ الٰہی کا فلسفہ:

اللہ تعالیٰ کا عذاب جب بھی نازل ہوتا ہے، عمومی رنگ کا ہوتا ہے۔ یہ کبھی نہ دیکھا ہوگا کہ کہیں قحط پڑے یا کوئی بیماری پھیلے تو اس سے صرف بدکار لوگ متاثر ہوں اور نیکو کار محفوظ رہیں یا بارش ہو یا سیلاب آ جائے تو خاص خاص لوگوں کو چھوڑ کر باقی مخلوق کو تکلیف ہو۔ اس سنتِ الٰہی کی رُو سے اگر ہر گناہگار کے گناہ پر فوراً گرفت ہونے لگے اور اللہ تعالیٰ کا عذاب بار بار عمومی رنگ میں نازل ہو تو ظاہر ہے کہ دنیا میں کوئی جاندار بھی محفوظ نہیں رہ سکتا، کیوں کہ ہر بار گناہگاروں کے ساتھ لازماً بے گناہ لوگ بھی مارے جائیں گے۔ اس لیے ڈھیل دینا حکمت پر مبنی ہے۔

(102) بے وقت توبہ بے کار ہے:

حق تعالیٰ کی گرفت ہوتی ہے اور ضرور ہوتی ہے۔ وہاں دیر ہے، اندھیر نہیں، لیکن اس کے لیے ایک وقت مقرر ہے۔ جسے قرآن کی زبان میں ﴿أَجَلٍ مُّسَمًّى﴾ کہتے ہیں۔ جب وہ مقررہ وقت آ جاتا ہے تو پھر ایک منٹ بھی اِدھر اُدھر نہیں ہوتا۔ دیکھو فرعون کو اللہ تعالیٰ نے کس قدر ڈھیل دی۔ اس دوران میں اُس نے توبہ نہیں کی، لیکن جب اُس کی غرقابی کا وقت آیا تو دریائے نیل کے کنارے پر کھڑے ہوئے انسانوں نے بچشم خود دیکھا کہ اُس کی کیا گت بنی۔ ایسے وقت میں اس کی توبہ کے قبول کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ توبہ وہی ہے، جو عذابِ الٰہی نازل ہونے سے پہلے کی جائے۔ لیکن سرکش قسم کے گناہگار مختلف قسم کی مکروہ باتوں کو خدا تعالیٰ سے منسوب کرتے ہیں اور ان کی زبانیں جھوٹ کہتے ہوئے نہیں تھکتیں۔ وہ اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان کے لیے بہتری ہے۔ قرآن کا فیصلہ یہ ہے کہ ایسے لوگوں کے لیے آگ کی تکلیف ہی نہیں، بلکہ وہ دوزخ میں اپنے پیچھے آنے والوں کے میزبان بھی ہوں گے۔

103 بیاہ شادی کی فضول رسمیں:

ہر انسان اپنی عادات کا غلام ہوتا ہے اور عادات کی پختگی میں اس کے ماحول کو بہت زیادہ دخل ہوتا ہے۔ ہندوؤں کی ہمسائیگی کے سبب بیاہ شادی کے موقعوں پر مسلمانوں کے ہاں بھی ایسی ایسی فضول رسمیں دیکھنے میں آتی ہیں، جن کا بظاہر کچھ فائدہ نظر نہیں آتا۔ چہرے پر سہرا یا ہاتھوں میں بدھنا باندھنا، چہ معنی دارد؟ آخر ان چیزوں کے نہ باندھنے سے کیا فرق پڑتا ہے، لیکن ہم میں سے اکثر معقول آدمی بھی عورتوں کو ایسا کرنے سے نہیں روک سکتے۔ (اس موقع پر آپ نے ازراہِ تفنن بیاہ شادی کی تقریب کو روٹھنے کا سیزن قرار دیا، کیوں کہ دعوت دینے والے کو رشتے داروں کے منانے میں کافی وقت صَرف کرنا پڑتا ہے)

104 بداعمالی کے مختلف بہانے:

﴿فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ﴾ کے مصداق شیطان نے لوگوں کو بُری باتوں کا گرویدہ بنا رکھا ہے۔ تزئینِ گناہ کا مطلب یہ نہیں ہے کہ شیطان نے ان بُری باتوں کو سونے چاندی کے ورق لگا کر سجا دیا ہے، بلکہ مراد یہ ہے کہ بداعمال لوگوں نے شیطان کے دام میں آکر بداعمالی پر قائم رہنے کے لیے مختلف قسم کے بہانے تراش رکھے ہیں اور اپنے دل کو خوش کرنے والی دلیلیں گھڑ رکھی ہیں، جن کی موجودگی میں اُنھیں اپنا ہر بُرا فعل مزین معلوم ہوتا ہے۔ دفتروں میں رشوت کھانے والوں کا یہ کہنا کہ کام بہت ہے یا ہمارے گھر کا خرچ صرف تنخواہ میں پورا نہیں ہوتا، اس لیے ہم مجبوراً رشوت لیتے ہیں، تزئینِ گناہ ہے۔ یا بازاروں میں کم تولنے والوں کا یہ کہنا کہ ہم کیا کریں، پورا تولنے سے اتنی بچت نہیں ہوتی کہ بال بچوں کا گزارہ ہو سکے، تزئینِ گناہ ہے۔

105 کم تولنے کا کوئی جواز نہیں:

کم تولنے کا عیب حضرت شعیب علیہ السلام کی امت میں بہت زیادہ تھا، لیکن آج ہمارے معاشرے میں بھی کم تولنے والوں کی کمی نہیں ہے۔ یاد رکھو! کم تولنا کسی حالت میں بھی جائز نہیں ہے، بلکہ یہ فعل سور کو کھانے سے بھی سنگین ہے، کیوں کہ بہ امرِ مجبوری اضطرار کے عالم میں جان بچانے کے لیے یہ ممکن ہے کہ کسی شخص کو سور کھانے کی نوبت آجائے اور اس کے لیے اس وقت ایسا کرنا جائز ہے، لیکن کم تولنے والے کو قرآن و حدیث سے کسی حالت میں بھی کوئی جواز نہیں مل سکتا۔ اس لیے بلا مبالغہ ازروئے منطق یہ کہنا درست ہوگا کہ کم تولنا سور کھانے سے بھی بدتر فعل ہے۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اس عیب سے محفوظ رکھے۔

106 بے معنی دشنام طرازی:

گالی دینے کا فعل بھی بے حد مذموم ہے، لیکن بعض لوگ گالیاں دینے کے اس قدر عادی ہوتے ہیں کہ

بے جان چیزوں کو بھی معاف نہیں کرتے۔ ان کی زبان ہر وقت گالی کے استعمال کی عادی ہوتی ہے۔ کوئی برتن ٹوٹ گیا تو بولے: اس برتن کی ماں کو یوں، ان سے کوئی پوچھے کہ کیا برتن کی بھی کوئی ماں ہوتی ہے؟

107 حیات کا وسیع تر تصور:

روح اور بدن لازم وملزوم ہیں۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے بغیر بے کار ہیں۔ بلاشبہہ عبادت سے (جو ہماری خلقت کا مقصود ہے) رُوح لطف اندوز ہوتی ہے، لیکن عبادت کا ذریعہ ہمارے جسمانی اعضا ہیں، جو رکوع و سجود وغیرہ ارکان ادا کرتے ہیں۔ حیات کا تصور بہت وسیع ہے۔ ایک زندگی علم کی زندگی ہے، جو جاہل کو نصیب نہیں ہوتی۔ اسی طرح دل کی زندگی ہے، جو شقی لوگوں کو نصیب نہیں ہوتی۔ اِن معنوں مین یہ کہنا درست ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے لوگوں کو حیاتِ تازہ بخشی۔ یہاں حیاتِ تازہ سے مراد دل کی زندگی ہے، جو دنیا کی تمام دولتوں سے افضل و اعلیٰ ہے۔ بہ قولِ اقبال ؎

من کی دولت ہاتھ آتی ہے تو پھر جاتی نہیں
تن کی دولت چھاؤں ہے آتا ہے دھن جاتا ہے دھن

دل کی زندگی کے بغیر انسان چلتی پھرتی لاش ہے۔ کئی بدبخت انسان ایسے بھی گزرے ہیں، جو زندہ ہونے کے باوجود مردہ ہی رہے اور پیغمبرِ اسلام کی حیات بخشی سے کچھ فائدہ نہ اُٹھا سکے۔

108 قرآنی فصاحت و بلاغت کا اثر:

لبید عرب کا ایک نامی شاعر تھا۔ اس نے ساٹھ سال کی عمر زمانہ جاہلیت میں اور ساٹھ سال کی عمر زمانہ اسلام میں پائی۔ خانہ کعبہ میں جو سات زوردار قصائد آویزاں تھے، ان میں سے ایک قصیدہ اس شاعر کا بھی تھا۔ لیکن صرف سورت فاتحہ پڑھنے کے بعد وہ قرآن کی فصاحت و بلاغت کا ایسا قائل ہوا کہ اس نے اس کے بعد شعر گوئی ترک کر دی۔

109 رضا کا مفہوم:

جب تک فریقین راضی نہ ہوں، رضا کا مفہوم کچھ نہیں ہوسکتا۔ یاد رہے کہ رضا یک طرفہ نہیں ہوسکتی۔ بے شک اللہ تعالیٰ رسول اللہ ﷺ کی رضا چاہتا ہے، لیکن اس سے یہ سمجھ لینا کہ پیغمبر روٹھا ہوا ہے اور خدا اس کی منتیں کر کے اسے منا رہا ہے بالکل غلط ہے، بلکہ اس طرح اللہ تعالیٰ کی توہین ہوتی ہے۔ خدا تو ہر مسلمان کی رضا چاہتا ہے اور چاہتا ہے کہ ہر مسلمان کو اس کی عبادت کا پورا پورا صلہ دے کر اُسے جنت میں بھیج دے۔ کوئی مزدور اور اس کا آقا ہرگز اُس وقت تک راضی نہیں ہوسکتے، جب تک ان کا باہمی معاملہ خوش اسلوبی سے طے نہ ہوجائے۔ ﴿لَعَلَّكَ تَرْضٰى﴾ سے خدا کا یہی منشا ہے۔

(110) حیات وموت:

اگر کسی چیز کا مقصد فوت ہو جائے تو وہ اس کی موت ہے۔ جب تک وہ مقصد بطریقِ احسن پورا ہوتا رہے، اس چیز کی حیات قائم ہے، مثلاً: درخت جب تک سایہ دیتا ہے، اس کے پتے قائم ہیں یا وہ میوہ پیدا کرتا ہے، ہم اسے زندہ کہیں گے، لیکن جب اس کے برگ و بار جھڑ جائیں تو ہم سمجھ لیں گے کہ اس کی موت واقع ہوگئی۔ اسی طرح زمین ہر سال کم از کم دو مرتبہ مرتی اور دو مرتبہ زندہ ہوتی ہے۔ جب تک اس کی حیات برقرار ہو، وہ فصل کو پکاتی ہے، لیکن جب وہ کسی فصل کی نشو ونما چھوڑ دے تو اس کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ قرآن نے اسی لیے ﴿بَعْدَ مَوْتِهَا﴾ کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔

(111) شریعت کی پابندی:

ہر بالغ مرد اور عورت پر شریعت کی پابندی لازم ہے، لیکن نابالغ بچے، مخبوط الحواس شخص اور سوئے ہوئے انسان اس سے مستثنیٰ ہیں۔ اصطلاحِ شرعی میں ان کو ''مرفوع القلم'' کہا جاتا ہے۔

(112) یزدان و اہرمن کا تصور:

ایک ہی وقت میں دو متضاد باتوں کے ظہور پذیر ہونے سے انسان کو دو خداؤں کی خدائی کا خیال پیدا ہوا۔ خصوصاً آتش پرست لوگ بہت زیادہ اس بات کے معتقد تھے کہ خیر کا خدا یزدان اور شر کا اہرمن، مثلاً: ایک ہی پل میں ایک شخص کو بیٹے کی ولادت کا مژدہ ملتا ہے اور اس کے فوراً بعد اس کے دوسرے بیٹے کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ جس کے باعث اس کی پہلی ساری خوشی متبدل بہ غم ہو جاتی ہے۔ ان دو مختلف کیفیتوں کے محرکات کو یہ لوگ دو خداؤں کی خدائی سے تعبیر کرتے تھے۔ قرآن نے ﴿لَا تَتَّخِذُوٓا اِلٰهَيْنِ اثْنَيْنِ﴾ فرما کر اس غلط عقیدے کی نفی کی اور نہایت وضاحت سے کہا کہ ﴿اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنَ﴾ یاد رہے کہ خوشی اور غم سب کچھ من جانب اللہ ہے۔

(113) ایک حدیثِ نبوی کا خلاصہ:

خوش اعمالی پر نازاں نہ ہونا چاہیے۔ اگر انجام اچھا ہو تو سب کچھ اچھا ہے۔ ایک حدیثِ نبویﷺ کا خلاصہ یہ ہے کہ ① بعض لوگ کافر پیدا ہوتے ہیں، کافرانہ زندگی بسر کرتے ہیں اور آخر کار کافر ہی فوت ہوتے ہیں۔ ② بعض لوگ مومن پیدا ہوتے ہیں، مومنانہ زندگی بسر کرتے ہیں اور آخر کار مومن ہی فوت ہوتے ہیں۔ ③ بعض لوگ کافر پیدا ہوتے ہیں، کافرانہ زندگی بسر کرتے ہیں، لیکن مرتے وقت مومن بن جاتے ہیں۔ سبحان اللہ، ان کا خاتمہ بالخیر ہوا اور ان پر خدا کی رحمت ہوئی۔ ④ بعض لوگ مومن پیدا ہوتے ہیں، مومنانہ زندگی بسر

کرتے ہیں، لیکن آخر کار ایسی لغزش کھاتے ہیں کہ انھیں کافرانہ موت نصیب ہوتی ہے۔[1] بہر حال انسان کو اپنے اچھے انجام کے لیے دعا کرتے رہنا چاہیے۔

(114) اطاعتِ رسول کی اہمیت:

نبی اکرم ﷺ کی فرماں برداری اور مکمل اطاعت کے بغیر اگر کوئی شخص اپنے دفترِ اعمال میں اس قدر نیکیاں بھی رکھتا ہو کہ ان سے زمین و آسماں کا درمیانی خلا پُر ہو جائے تو بھی وہ نجات پا کر جنت میں نہیں جا سکتا ؎

محال است سعدی کہ راہِ صفا   تواں یافت جز در پے مصطفیٰ[2]

کافروں کی نیکیوں کا بدلہ انھیں اسی جہاں میں مل جاتا ہے۔ آخرت میں ان کا کچھ حصہ نہیں ہے۔ فرعون زانی نہیں تھا، علاوہ ازیں بڑا سخی تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ پانچ دروازوں سے سائلوں کو سخاوت کرتا تھا، لیکن ان نیکیوں کے باوجود دوزخی ہے، کیوں کہ اس نے اپنے عہد کے نبی موسیٰ کی اطاعت نہیں کی۔ نبی اکرم ﷺ کے بعض قریبی رشتے دار بھی آپ کی عدمِ اطاعت کے باعث اُخروی نجات سے محروم رہے۔

(115) اچھائی برائی کا معیار:

نبیِ اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ تم میں سے اچھا آدمی وہ ہے، جس کی عمر لمبی ہو اور اعمال صالح ہوں۔ اسی طرح تم میں سے بُرا آدمی وہ ہے، جس کی عمر لمبی اور اعمال خراب ہوں۔[3]

جب ہمیں کوئی بزرگ آدمی نظر آئے تو ہمیں اس خیال سے اس کا احترام کرنا چاہیے کہ اس کی عمر ہم سے زیادہ ہے، یقیناً اس کی نیکیاں بھی ہم سے زیادہ ہوں گی اور جب کوئی اپنے سے چھوٹا نظر آئے تو ہمیں اس خیال سے اُس کی قدر کرنی چاہیے کہ اُس کی عمر ہم سے کم ہے، یقیناً اس کے گناہ بھی ہم سے کم ہوں گے۔

(116) ایمان اور تکبر:

ایمان اور تکبر بہ یک وقت ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے۔ جس دل میں ایمان ہو، وہاں تکبر کا گزر نہیں اور جس دل میں تکبر ہو، وہاں ایمان کا گزر نہیں۔ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ جس شخص کے دل میں رائی کے دانے جتنا بھی ایمان ہوگا، وہ دوزخ میں نہیں جائے گا اور جس شخص کے دل میں رائی کے دانے جتنا بھی تکبر ہوگا، وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا۔[4]

---

(1) صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٢٣٣) مسند أحمد (٣/ ١٢٠)

(2) اے سعدی! (محمد) مصطفیٰ ﷺ کا اتباع کیے بغیر صحیح راہ پانا محال و ناممکن ہے۔

(3) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٣٣٠)

(4) صحيح مسلم، رقم الحديث (٩١) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٠٩١)

(117) تکبر کی تعریف:

اپنے کو بڑا خیال کرتے ہوئے دوسروں کو اپنی نسبت کمزور حقیر خیال کرنا ہی تکبر نہیں، بلکہ حق کو پامال کرتے ہوئے دیدہ و دانستہ باطل کی حمایت پر اُڑنا بھی تکبر ہے۔ تکبر خدا کو سخت ناپسند ہے۔ (واضح رہے کہ اچھا لباس پہننا اور حلال کی کمائی سے اچھا کھانا، تکبر میں شامل نہیں ہے)

(118) دانائی کی بات:

ہمیں جہاں سے بھی دانائی کی بات ملے، حاصل کر لینی چاہیے، خواہ کسی غیر مسلم ہی کے پاس کیوں نہ ہو۔ حکمت مومن کا گم شدہ مال ہے۔ یہ جہاں بھی نظر آئے، اُسے فوراً اَخذ کر لو ؎

گفت حکمت را خدا خیر کثیر   ہر کجا ایں خیر را بینی بگیر [1]

(119) جائز غصہ:

انسان میں غضب کی صفت اللہ تعالیٰ نے بے کار پیدا نہیں کی۔ رسول اللہ ﷺ کو غصہ بھی آتا تھا، لیکن جائز طور پر۔ ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو تورات کے اوراق پڑھتے ہوئے آپ ﷺ نے دیکھا تو آپ ﷺ کا چہرہ ایک دم متغیر ہو گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس کیفیت کو بھانپ گئے اور ان اوراق کو پڑھنا بند کر دیا۔[2]

(120) حق کا رُعب:

باطل میں اتنی تاب نہیں کہ حق کا مقابلہ کر سکے۔ حق کا رعب مسلّم ہے۔ نبی اکرم ﷺ کی ایک خصوصیت مبارکہ یہ تھی کہ ایک مہینے کی مسافت کی دوری سے بھی دشمن آپ سے مرعوب ہو جاتا تھا۔ اس سے یہ اَخذ کیا جا سکتا ہے کہ صداقت کی بڑی طاقت ہے۔

(121) چند فرق:

خدا اور رسول کی سچی محبت اور فسق و فجور کے رجحان میں فرق ہے۔ عوام کی بدحالی کے خلاف منصفانہ صدائے احتجاج اور کمیونزم کے پرچار میں فرق ہے۔ اسلام کے زرّیں اصولوں کی مومنانہ پیروی اور خشک ملائیت میں فرق ہے۔

(122) معیارِ فضیلت:

قرآن کے نزدیک فضیلت کا معیار صرف تقویٰ ہے، حسب و نسب کوئی چیز نہیں۔ ابولہب اور ابوجہل

---

[1] اللہ تعالیٰ نے حکمت کو خیرِ کثیر کہا ہے، لہٰذا یہ خیر جہاں بھی دیکھو اسے لے لو۔

[2] مسند أحمد (۳/ ۳۸۷)

خاندانی اعتبار سے کچھ کم معزز نہیں تھے، لیکن اسلام کی نظروں میں ان کی کچھ عزت نہیں ہے۔ خدا کا خوف محسوس کرتے ہوئے گناہوں سے بچنے کا نام تقویٰ ہے ؎

طبیعت اس تصور سے بہت مایوس ہوتی ہے
کہ بے خوفِ خدا بھی زندگی محسوس ہوتی ہے

(123) ارشادِ حکیمانہ:

کسی چیز کو ہرگز للچائی ہوئی نظروں سے نہ دیکھو، لیکن جب کوئی چیز تمھاری طلب کے بغیر ازراہِ محبت تمھیں تحفے کے طور پر پیش کی جائے تو اسے رد نہ کرو، بلکہ شکریے کے ساتھ قبول کر لو۔ تحائف کے لینے دینے سے محبت بڑھتی ہے۔

(124) تین جھوٹ اور ان کی حقیقت:

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تین باتوں پر ''کذبات'' کا اطلاق ظاہر کے اعتبار سے کیا گیا ہے۔ ذرا غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ جھوٹ نہیں:

1. ستاروں کو خدا کہنا۔ یہ محض استفہامی طرز ہے کہ کیا یہ ڈوبنے والے خدا ہو سکتے ہیں؟ پھر آپ نے خود ہی فرمایا کہ یہ ڈوبنے والے خدا نہیں ہو سکتے۔ یہ محض تلاشِ حق ہے۔ اسے حقیقی جھوٹ نہیں کہا جا سکتا۔
2. بتوں کو خود توڑا اور پھر کہا کہ ان بتوں کے سردار سے دریافت کرو کہ کس نے ان کو توڑا ہے؟ آپ نے بتوں کو توڑنے کے بعد ہتھوڑا ایک بڑے بت کے کندھے پر رکھ دیا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ جھوٹ نہیں، بلکہ ایک زبردست طنز تھی۔
3. اپنی بیوی حضرت سارہ رضی اللہ عنہا (حضرت اسحاق علیہ السلام کی والدہ) کو حاکمِ مصر کے روبرو اپنی بہن کہا، کیوں کہ وہ ظالم ہر شخص کی بہن کو چھوڑ دیتا تھا اور بیوی کو قید کر لیتا تھا۔ یہ بھی دراصل جھوٹ نہیں، بلکہ واقعتا حضرت سارہ رضی اللہ عنہا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پھوپھی زاد بہن تھی۔

(125) معاشرے کی بدحالی کا سبب:

قانون کی طاقت بجائے خود مسلّم ہے، لیکن کسی قوم کے دل سے اگر قانون کا احترام اُٹھ جائے تو بڑے سے بڑا قانون بھی بے کار رہ جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ کوئی قانون ہر گھر میں جھانک کر لوگوں کے اعمال کی جانچ پڑتال نہیں کر سکتا، اسی لیے اسلام نے اعمال کی بنیاد خشیتِ الٰہی پر رکھی ہے۔ جب تک دلوں میں خوفِ خدا پیدا نہ ہو، معاشرے کی اصلاح مشکل ہے۔

(126) بے ہودہ خواہش:

اگر کوئی شخص بڑھاپے کی عمر میں یہ چاہے کہ اس کا شباب لوٹ آئے اور وہ پھر نوجوانی کی سی قوت محسوس کرنے لگے تو اُسے ایسی خواہش سے کوئی نہیں روک سکتا۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم اس کی اس خواہش کو ایک احمقانہ خواہش کہیں گے، لیکن بہرحال اُسے خواہش تو ہوتی ہے کہ کاش ایسا ہو جائے۔

اسی طرح کفار کا یہ کہنا کہ رسولِ اکرم ﷺ اپنی تبلیغ سے دست بردار ہو کر ہمارے آبائی دین کو اختیار کر لیں تو ہم ان کی مخالفت کرنا چھوڑ دیں گے، یہ بھی ایک احمقانہ خواہش تھی، جسے کوئی روک نہیں سکتا تھا۔ تاہم تھی یہ بات بھی اُسی طرح ناممکن، جس طرح کسی پیرِ صد سالہ کا از سرِ نو شباب کی طاقت سے بہرہ مند ہونا۔ دراصل یہ فضول مطالبہ کفار کی حماقت پر مبنی تھا۔

(127) عبادتِ الٰہی کا انقلابی پروگرام اور تائیدِ الٰہی:

نبی اکرم ﷺ نے تن تنہا اپنے دور کے معاشرے کے خلاف آواز اُٹھائی اور معاشرہ بھی ایسا زبردست، جس میں ابولہب اور ابوجہل جیسے جلیل القدر سردار برسرِ اقتدار ہوں۔ اُن کا یہ جرأت مندانہ فعل لوگوں کی نظروں میں واقعی بہت عجیب تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئی اپنی طاقت کا اندازہ لگائے بغیر یہ دعویٰ کر دے کہ میں پہاڑ سے ٹکڑ لوں گا اور آخر کار اسے پاش پاش کر دوں گا۔ ایک یتیم بچے کا جوان ہوتے ہی بڑی شد و مد کے ساتھ انقلابی پروگرام پیش کر دینا، نظر بہ ظاہر جنون اور دیوانگی ہی معلوم ہوتا ہے۔ یہی باعث ہے کہ کفار اپنے نقطہ نگاہ سے نبی اکرم ﷺ کو مجنون اور دیوانہ کہتے تھے، لیکن تائیدِ الٰہی چوں کہ آنحضرت ﷺ کے ساتھ تھی، اس لیے بالآخر وہ اپنے نیک مشن میں نہایت شان کے ساتھ کامیاب ہوئے اور انھوں نے حق کی عطا کردہ بے پناہ طاقت سے معاشرے کی تمام برائیوں کا خاتمہ کر کے اللہ تعالیٰ کی حکومت قائم کی۔ ﴿جَآءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا﴾ [الإسراء: ۸۱]

(128) قرآن اور عربی زبان:

لوگوں کا یہ اعتراض بے معنی ہے کہ خدا نے قرآن کو عربی زبان میں نازل کر کے جانب داری کا ثبوت دیا ہے۔ قرآن کا دعویٰ ہے کہ دنیا کی ہر وادی میں کوئی نہ کوئی ہادی ضرور آیا ہے۔ کسی ہادی کو تبلیغ کرنے میں آسانی اُسی وقت ہو سکتی ہے، جب لوگ اس کی زبان کو سمجھیں اور وہ لوگوں کی زبان کو سمجھتا ہو۔ اگر ایسا نہ ہو تو ہادی کی دشواریوں میں اضافہ ہو جائے گا۔ یعنی پہلے وہ لوگوں کو اپنے الہام کی زبان سکھائے اور پھر اپنا پیغام

سنائے، لہٰذا یہ کہنا کہ عربی میں قرآن نازل کرنا خدا کی جانب داری ہے، غلط ہے۔ اہلِ عرب اس زبان کے سوا اور کسی زبان کو آسانی سے کس طرح سمجھ سکتے تھے؟

(129) یہودیوں کے مکر:

رسولِ اکرم ﷺ کو اپنے مشن میں ناکام بنانے کے لیے یہودی آئے دن نئی نئی تدبیریں سوچتے رہتے تھے۔ اُن میں سے ایک تدبیر یہ تھی کہ بڑے بڑے سردار اور فہمیدہ قسم کے افراد اجتماعی طور پر اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کر دیتے تھے اور کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد یہ کہہ کر دینِ اسلام ترک کر دیتے تھے کہ اس میں کچھ نہیں ہے، ہم نے خوب قریب سے مشاہدہ کرلیا ہے۔ ان کے اس شر انگیز عمل سے بھولے بھالے لوگوں پر بظاہر بُرا اثر پڑنے کا اندیشہ تھا، لیکن خدا نے جو ﴿خَيْرُ الْمَاكِرِيْنَ﴾ ہے، یہودیوں کی ایسی تمام تدبیروں کو خاک میں ملا دیا اور بالآخر اسلام کا بول بالا ہو کر رہا۔

(واضح رہے کہ اُردو زبان میں مکر کا لفظ کچھ اچھے معنی میں استعمال نہیں ہوتا، لیکن عربی میں اس کا مطلب ہے تدبیر کرنا۔ "ماکر" اس کا فاعل ہے۔ "ماکرین" جمع سالم ہے۔ ﴿وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمَاكِرِيْنَ﴾ سے مراد یہ ہے کہ خدا بہترین تدبیر فرماتا ہے)

(130) عذابِ الٰہی میں تاخیر:

قرآن کریم اس بات کا شاہد ہے کہ جب کوئی قوم حد سے زیادہ گمراہیوں میں گھر جائے تو وہ عذابِ الٰہی سے تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔ آج ہماری قوم بھی اپنی بد اعمالیوں کے اعتبار سے دیگر برباد شدہ قوموں کی طرح مستحقِ عذاب ہو چکی ہے۔ اب اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب نازل کرنے میں کوئی ڈھیل ہے تو یہ اُس کی مصلحت ہے، ورنہ ہماری طرف سے کوئی کمی نہیں۔ عذابِ الٰہی کو عذاب نہ سمجھنا بھی ایک عذاب ہے۔ جب کوئی قوم عذابِ الٰہی کے قریب ہوتی ہے تو سب سے پہلے اس کی دماغی صلاحیت سلب کی جاتی ہے اور اس کے افراد کو صحیح فکر و شعور سے محروم کر دیا جاتا ہے۔

(131) فقیر پرستی کی لعنت:

فقیر پرستوں کی زبان سے عموماً یہ دو باتیں سننے میں آتی ہیں کہ فلاں فقیر بڑی کرنی والا ہے یا فلاں فقیر کا کہنا خدا نہیں موڑتا (واپس نہیں کرتا)۔ گویا دونوں لحاظ سے عجز خدا ہی کے حصے میں آتا ہے۔ یاد رکھو کہ خدا سے بڑھ کر کوئی کرنی والا نہیں ہے۔ اُس کے رد برو کسی بڑے سے بڑے بزرگ کی مجال نہیں کہ دم مارے۔ باقی رہا معاملہ کہا نہ موڑنے کا، سو ہم دیکھتے ہیں کہ جو کچھ خدا چاہتا ہے، وہی ہوتا ہے، حتی کہ بعض اوقات وہ پیغمبروں کی

التجا بھی قبول نہیں فرماتا۔ چناں چہ آنحضرت ﷺ نے اپنے چچا ابو طالب کے حق میں، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے والد کے حق میں اور حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی بیوی اور بیٹے کے حق میں دعا کی تھی، لیکن وہ رد کر دی گئی۔ ان حالات میں غور کا مقام ہے کہ ہمارے معاشرے کے بےعمل اور شرع اسلامی کی مخالفت کرنے والے فقیروں کی کیا حقیقت ہے؟

مرتب کی معروضات:

میں نے حضرت مولانا محمد اسماعیل مرحوم کے جو ارشادات قلم بند کیے ہیں، وہ کسی ترتیب سے نہیں ہیں۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ میں ان کی مجلسِ وعظ و نصیحت میں باقاعدگی سے حاضر نہ ہوتا تھا، بلکہ جب کبھی وہاں جاتا تو گھر واپس آ کر ضروری باتیں اختصار کے ساتھ اپنی ڈائری میں نوٹ کر لیتا۔ میرا ایسا کرنا مولانا کے نوٹس میں نہیں تھا، ان سے ایک دو بار حضرت راسخ عرفانی کے مکان پر ملاقات ہوئی۔ لیکن میں نے ذکر کرنا مناسب نہ سمجھا، تاکہ ان کی بےتکلفی اور جملوں کی برجستگی میں کچھ احتیاط نہ پیدا ہو جائے۔

مولانا کا طریقِ کار یہ تھا کہ وہ سب سے پہلے قرآنِ پاک کی آیات تلاوت فرماتے۔ پھر ان کا ترجمہ اُردو میں بیان کرتے اور پھر ان آیات کی تفسیر نہایت دلکش انداز میں اپنے مخصوص لب و لہجے کے ساتھ بزبانِ پنجابی اس طرح سمجھاتے کہ سننے والوں کو لطف آ جاتا۔ اب صرف یادیں باقی ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مدارج عطا فرمائے۔ آمین

درسِ قرآن:

اسلام میں بہتان طرازی اور فحش گوئی کی حیثیت

﴿وَلَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ قُلْتُمْ مَّا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّتَكَلَّمَ بِهٰذَا سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ ۝ يَعِظُكُمُ اللّٰهُ اَنْ تَعُوْدُوْا لِمِثْلِهٖٓ اَبَدًا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ وَيُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ وَاَنَّ اللّٰهَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ﴾ [النور: ١٦۔ ٢٠]

’’اور کیوں نہ جب تم نے اس کو سنا تھا، کہا ہوتا ہم کو نہیں لائق کہ منہ پر لائیں یہ بات، اللہ تو پاک ہے۔ یہ تو بڑا بہتان ہے، اللہ تم کو سمجھاتا ہے کہ پھر نہ کرو ایسا کام کبھی، اگر تم ایمان رکھتے ہو اور کھولتا ہے اللہ تمھارے واسطے پتے کی باتیں اور اللہ سب جانتا ہے، حکمت والا ہے۔ جو لوگ چاہتے ہیں کہ چرچا ہو بدکاری کا ایمان والوں میں، ان کے لیے عذاب ہے دردناک دنیا اور آخرت میں اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے اور اگر نہ ہوتا اللہ کا فضل تم پر اور اس کی رحمت اور یہ کہ اللہ نرمی کرنے والا ہے مہربان تو کیا کچھ نہ ہوتا۔‘‘

جب کسی شخص میں کوئی عیب ہو اور اس عیب کا تذکرہ اس کی غیر موجودگی میں کیا جائے تو یہ غیبت ہے اور اگر یہ عیب اس میں نہیں تو یہ بہتان ہے۔ بہتان کے عام تذکرے سے اللہ تعالیٰ نے سختی سے روکا ہے۔ اگر چار گواہ موجود ہوں تو اس کا ذکر شرعی عدالت کے سامنے کرنا چاہیے، تاکہ مجرم کو سزا دی جا سکے۔ اگر ایسا نظام ہو کہ اس میں شرعی عدالت نہ ہو تو اس صورت میں برادری کے معتبر بزرگوں کے سامنے اصلاح کی غرض سے اس کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ زنا کے الزام پر عام گفتگو اور بہتان کا چرچا کرنا بے حد غلط ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے اس واقعے کے متعلق اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

’’کیوں نہ اس بہتان کے سنتے ہی تم نے کہہ دیا کہ یہ زیب ہی نہیں کہ ایسی بات زبان سے نکالیں۔ سبحان اللہ یہ تو ایک بڑا بہتان ہے۔‘‘

معاشرے کے اندر زنا کا تذکرہ اور بہتان طرازی کی کثرت، اخلاق کے لیے سخت تباہ کن ہے۔ اس سے زنا کو فروغ حاصل ہوتا ہے اور فحاشی کو عروج۔ چناں چہ کہا ہے: ﴿أَنْ نَّتَكَلَّمَ بِهٰذَا﴾ قیاس، قیافہ اور قرائن کی بنیاد پر فحاشی کا ذکر غلط ہے۔ جن صحابہ کرام سے یہ غلطی ہوئی تھی، ان کو سزا دی گئی تھی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر بہتان قائم کرنے والوں پر اَسّی کوڑے فی کس مارے گئے تھے اور منافقین کے ساتھ ان میں دو تین مسلمان بھی تھے۔

﴿يَعِظُكُمُ اللّٰهُ اَنْ تَعُوْدُوْا لِمِثْلِهٖٓ اَبَدًا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ [النور: ١٧]

تنقیصِ عائشہ رضی اللہ عنہا ایمان کی ضد ہے۔ ﴿اَنْ تَعُوْدُوْا لِمِثْلِهٖٓ اَبَدًا﴾ اس کا اعادہ پھر نہیں ہونا چاہیے۔ علمائے اسلام اس بات پر متفق ہیں کہ جو شخص، فرقہ یا جماعت اس براءت کے نزول کے بعد بھی بہتان طرازی کرے، اس کے کفر میں کوئی شبہہ نہیں ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر عیب لگانا اور صحابہ کرام کے ایمان کا ثبوت مانگنا رسول اکرم ﷺ کو ایذا دینا ہے اور نبی کریم ﷺ کی ایذا رسانی سے سختی سے روکا گیا ہے: ﴿الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ النَّبِيَّ...﴾ [التوبة: ٦١]

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ...﴾ [النور: ١٩] ایمان والوں میں فواحش کی اشاعت کرنے والے مجرم ہیں۔ ان لوگوں کو سخت سزا ملنی چاہیے۔ زبان، قلم سے بے حیائی پھیلانا، بد اخلاقی اور بے حیائی کے جذبات کو اُبھارنے والے شعر اور کہانیاں، گانے اور فحش تصاویر اس ضمن میں آتے ہیں۔ بد اخلاقی کے اڈے، جنسی لٹریچر اور قحبہ خانے وغیرہ سب ﴿تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ﴾ کے ضمن میں آتے ہیں۔ ایسے کام کرنے والوں کو آخرت میں تو سزا اللہ تعالیٰ دے گا ہی، لیکن اس دنیا میں بھی ان کو اس جرم سے روکنا ضروری ہے اور اس کے ارتکاب پر سزا دینی چاہیے۔

﴿فِي الدُّنْيَا...﴾ حکومت اور خاص طور پر ایک اسلامی حکومت کا فرض ہے کہ اشاعتِ فواحش کو روکے اور اس کے لیے سزا مقرر کرے اور ان جرائم کو قابلِ دست اندازی پولیس قرار دے۔ فحاشی کی دعوت دینا اور عمل کرنا، اس معاملے میں معاونت کرنا اور فحاشی کے معاملے میں مداہنت اور خاموشی اختیار کرنا گناہ ہے، جس کے لیے عذابِ اَلیم کی بشارت دی گئی ہے....

رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ زنا پھیلے تو وبائی امراض پھوٹتے ہیں اور اگر ناپ تول میں کمی کی جائے تو اس کی سزا قحط کی صورت میں دی جاتی ہے۔[1]

﴿وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ...﴾ یہ جرم اس قدر بڑا تھا کہ اگر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو مسلمان بھی نہ بچتے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر بہتان طرازی کس قدر سنگین ہے، اس آیت سے بھی صاف معلوم ہوتا ہے۔ جو لوگ اب بھی اس جرم کا ارتکاب کرتے ہیں، ان کی سزا عذابِ اَلیم کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے؟[2]

---

① سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٠١٩)

② ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۸/ اکتوبر ۱۹۷۱ء)

صلح و جنگ[1]

﴿سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ﴾ [الصف:١۔٤]

برادرانِ کرام! آج ہم جس مقصد کے لیے جمع ہوئے ہیں، ہر زندہ قوم ایسے مقاصد کے لیے اپنے اجتماعات منعقد کیا کرتی ہے۔ اس کائنات کی آبادی کا دارو مدار صلح و آشتی پر ہے۔ انبیا علیہم السلام یہی پیغام لے کر دنیا میں مبعوث ہوئے۔ امتِ مسلمہ کا مشن بھی یہی ہے کہ وہ تمام کام صلح و آشتی سے انجام دے۔ لیکن غلط کار لوگوں کی روش نے صلح پسندوں کی راہ ہمیشہ ان پر تنگ کر دی۔ جو قومیں معاملات کو اس انداز سے نہیں سوچتیں، وہ ناکام رہتی ہیں۔ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے تیرہ سال تک صلح و آشتی سے دعوتِ دین لوگوں تک پہنچائی، لیکن اہلِ مکہ کی شرارتوں نے آپ کی راہ میں ہر طرح کے روڑے اٹکائے۔ آپ نے مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ کو اپنی دعوت کا مرکز بنایا۔ لیکن اہلِ مکہ نے یہود سے ساز باز کر کے اتنی دور بھی آپ کی زندگی کا سکون مکدر کرنے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی اور مدینے میں بھی اطمینان سے دعوت و اصلاح کا فریضہ انجام نہ دینے دیا۔ تب اللہ تعالیٰ نے آپ کو لڑائی کی اجازت دی۔ آپ نے اپنا پروگرام بدل دیا اور جنگ کو بھی اسلام کی دعوت پہنچانے کا ایک ذریعہ بنایا۔ آپ نے دس سال کے عرصے میں کئی جنگیں لڑیں۔

ابن سعد کی روایت کے مطابق آپ کے غزوات کی تعداد ۸۲ ہے۔ تاریخ کی ورق گردانی سے یہ بات الم نشرح ہو جاتی ہے کہ جس نے صرف صلح و آشتی کو اپنایا، دشمنوں نے اُسے چین نہ لینے دیا۔ مسیحیوں کو دیکھیے کہ اُن کی تعلیم کتنی مرنجاں مرنج ہے، لیکن کیا دنیا نے اُنھیں اس اصول پر کار بند رہنے دیا؟ صلح کتنی ہی عزیز چیز کیوں نہ ہو، قومی زندگی میں بعض ایسے مواقع بھی آ جاتے ہیں کہ جنگ کے سوا کوئی چارہ کار نہیں رہتا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ «جُعِلَ رِزْقِي تَحْتَ ظِلِّ رُمْحِي» کہ میرا رزق میرے نیزے کا مرہونِ منت ہے۔[2]

---

[1] مذکورہ بالا خطاب مسجد مبارک اہلِ حدیث لاہور میں ۲۰ رنومبر ۱۹۶۵ء کو ہوا تھا۔ دیکھیں: ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۳ر دسمبر ۱۹۶۵ء)

[2] مسند أحمد (۲/ ۵۰)

یہ بات تمام دنیا جانتی ہے کہ پیغمبرِ خدا ﷺ نے کن حالات میں جنگیں لڑیں۔ آپ کے پاس ساز و سامان کی مقدار کیا تھی اور دشمنوں کے پاس کیا۔ جنگِ بدر کو دیکھیے کہ مسلمانوں اور کفار کے درمیان فوج اور ساز و سامان کے نقطہ نگاہ سے کون سی نسبت قائم کی جا سکتی ہے۔ جنگوں کے محرک کفار ہی ہوئے۔ جنگِ حنین کے موقع پر نبی اکرم ﷺ کی زبانِ مبارک پر یہ الفاظ تھے:

إن البغاة قد بغوا علينا فثبت الأقدام إن لاقينا

''بارِ الٰہ! سرکش ہم پر چڑھ دوڑے ہیں، اگر ہماری مڈبھیڑ ہو تو ہمیں ثابت قدمی عطا کر۔''

ایک مومن کا مقام یہ ہے کہ وہ اپنی استطاعت کے مطابق سامان پوری طرح فراہم کر لے اور اُسباب کے ساتھ آگے بڑھے، آسمانی طاقتیں اس کے ہمرکاب ہوں گی۔ اُحد اور حنین میں جن میں سے ایک کے نتائج آخر میں اور دوسرے کے شروع میں خوشگوار نہ تھے، مومنین نے وہاں بھی ثبات و استقامت کو نہ چھوڑا۔ کسی لڑائی میں بھی ایسا نہیں ہوا کہ اس کے آخر میں صفِ ماتم بچھ گئی ہو۔ جنگِ اُحد میں ۷۰ فدا کاروں نے جامِ شہادت نوش کیا۔ پھر بھی ماتم کی کوئی اپیل نہیں کی گئی، بلکہ انھی قدموں پر مستقبل کا پروگرام سوچنا شروع کر دیا گیا۔

عرب کے حالات آپ کے سامنے ہیں۔ مسیحی، مشرک، یہود؛ سبھی مسلمانوں کے خلاف تھے اور اسلام کی دعوت کو پنپتا ہوا دیکھ نہ سکتے تھے۔ اہلِ حق کا ہمیشہ یہی حال ہوا ہے۔ اگر آپ بھی اصول پرستی کی زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں تو جنگ کو اپنے دائرہ کار میں داخل کیے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے۔ جو قومیں زیادہ دولت مند ہوتی ہیں، وہ اپنے ملک کی حفاظت کے لیے انسانوں کو خرید کر اپنا فوجی نظام مستحکم کر لیتی ہیں۔ انگریز کا نظام آپ کے سامنے ہے، لیکن جو قومیں زیادہ مالدار نہ ہوں اور اُن کے ملک کے حدود وسیع و عریض ہوں، اُن کے لیے ناگزیر ہے کہ وہ بحیثیت مجموعی عسکری پوزیشن اختیار کریں۔

اسلام غالب بن کر رہنے کے لیے آیا ہے، مغلوب بن کر رہنے کے لیے نہیں۔ اسلام کا مزاج ہے کہ مسلمان ایک صحیح امارت کے تحت ہوں اور پوری قلمرو میں ایک قیادت کے تحت سارا نظام چلے۔ ایمان اور اسلام کے حدود پوری طرح رائج ہوں۔ جان، مال، عزت، آبرو ہر چیز کی ضمانت ہو۔ ذلت صرف کفر کے لیے مقدر ہے۔ آنحضرت ﷺ کی زندگی اس بات کی شاہد ہے۔ آپ کے انتقال کے بعد اموی نظامِ حکومت کو دیکھیے۔ اس کی بعض چیزوں سے آپ کو اختلاف ہو سکتا ہے، لیکن جہاں تک سرحدوں کی حفاظت، اسلام و عرب کی آبرو کا تعلق ہے، وہ پوری دنیا کے سامنے سرخرو ہیں۔ تبلیغ کے فرائض انھوں نے کما حقہ انجام دیے۔ فتوحات کے سلسلے میں اُن کی سلطنت روم تک پہنچی۔ اسلام اپنی روح کے لحاظ سے صلح پسند ہے، لیکن وہ دشمن کے سامنے جھکنے کے لیے نہیں آیا۔

ہندوستان پر ۹۲ھ میں محمد بن قاسم نے پہلا حملہ کیا۔ یہ اموی حکومت کے عروج کا زمانہ تھا۔ محمد بن قاسم کو

حملے کا حکم کیوں ہوا؟ جن عرب تاجروں کے اہل وعیال سیلون سے واپس جا رہے تھے، اُن کے ساتھ ہندوؤں کا سلوک ایسا تھا، جو شرافت کے سراسر خلاف تھا۔ ۱۹۴۷ء کے حوادثات آج تک تازہ ہیں۔ وہ مظالم بھلائے نہیں جا سکتے، جو ہندو حکومت نے اُس وقت نہتے مسلمانوں پر ڈھائے۔ ہماری آبرو کا کیا حشر ہوا۔ نقل مکانی اور دوسرے مصائب جو مسلمانوں پر ڈھائے گئے، ان کا تقاضا تھا کہ اُسی وقت اس کا نوٹس لیا جاتا۔ لیکن پاکستان نے اسے گوارا کیا اور معاملہ رفع دفع ہوگیا۔

اٹھارہ سال میں دشمن نے کیا کچھ کیا، وہ محتاجِ بیان نہیں۔ بالآخر پاکستان پر حملہ آور ہو کر رہا اور اپنے اُن ناپاک عزائم کو پورا کرنے کی کوشش کی، جو ۱۹۴۷ء ہی میں اُس نے تیار کر لیے تھے۔ اُس کا خیال تھا کہ پاکستان کی مختصر سی حکومت ختم ہو جائے گی۔ یہ حملہ حقیقت میں ہندوستان کی ہمت سے بعید تھا۔ یہاں کچھ دوسرے ہاتھ ہیں جو در پردہ پاکستان کے خلاف کارروائیاں کر رہے ہیں۔ ہندوستان کی حکومت نے جہاں ہمارے لیے مشکلات پیدا کر دی ہیں، وہاں اس نے اپنے ملک کو بھی جہنم میں جھونک دیا ہے۔

اس آزمایش کے موقع پر ہمارے عوام نے جس وفاداری کا ثبوت دیا ہے، وہ محض خدا کا فضل ہے۔ ہماری افواج نے جو کردار پیش کیا ہے، وہ مسلمان فوج کے شایانِ شان ہے اور بلاشبہہ آج ہمارے سر اپنے انھی بھائیوں کی وجہ سے اونچے ہیں۔ اہلِ یورپ کی قیادت دیانت کو کھو چکی ہے۔ ان کے سامنے نہ خدا ہے نہ اصول اور نہ کوئی بین الاقوامی قانون ہے۔

تعجب کا مقام ہے کہ روس اور امریکہ جو مختلف نظریات کے حامل ہیں، آج ہمیں جمع ہوتے نظر آ رہے ہیں۔ ہندوستانی حکومت نے اہلِ کشمیر کے ساتھ جو مواعید کیے تھے، ان کو کس طرح پسِ پشت ڈال رکھا ہے۔ ان کی اس عیاری کو بددیانتی نہ کہا جائے تو اور کون سا نام دیا جائے۔ ہم جن حالات سے دوچار ہیں، ان کا صرف ایک ہی حل ہے کہ ہماری پوری قوم عسکری حیثیت اختیار کر لے۔

حکومت کو چاہیے وہ بھارتی درندوں کے مظالم کو پیشِ نظر رکھ کر کوئی لائحہ عمل تجویز کرے، جو اُنھوں نے سیالکوٹ، لاہور اور مقبوضہ کشمیر کے دیہات پر ڈھائے ہیں۔ یہ بات اَشد ضروری ہے کہ قوم کو دفاع کے لیے پوری طرح لیس کیا جائے۔ خصوصاً سرحدی علاقوں کو اس قابل بنا دیا جائے کہ وہ اپنا دفاع خود کر سکیں۔

ہم اللہ تعالیٰ کے شکر گزار ہیں کہ اس نے پوری قوم کو متحد و یک جان کر دیا ہے۔ یہ اتفاق محض فضلِ خداوندی ہے۔ کسی انسان کے بس میں نہیں۔ خود نبی کریم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

﴿لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ﴾ [الأنفال: ٦٣]

اے پیغمبر! اگر آپ دنیا کا سب کچھ خرچ کر ڈالتے تو بھی ان کے دلوں میں محبت نہ ڈال سکتے۔ ہم نے اس نعمت کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ مساجد میں مسلمانوں کی فتح و نصرت کے لیے دعائیں کی گئیں۔ چندے کی اگر اپیل ہوئی تو بڑوں کو چھوڑ بچوں تک نے دفاعی فنڈ میں حصہ لیا۔ اس آزمایش سے قبل ملک مختلف جماعتوں میں بٹا ہوا تھا، لیکن دفاع کے سلسلے میں اب کوئی اپوزیشن نہیں۔ پوری قوم ملک کی وفادار تھی، ہے اور رہے گی۔ اس کا سب سے بڑا داعیہ اسلام ہے۔

اس موقع پر دولتِ سعودیہ، شام، مشرقِ وسطیٰ اور دوسرے ممالک نے جو ہماری ہم نوائی کی ہے، وہ صرف اسلام کی بدولت ہے۔ پاکستان اسلامی ملک ہے اور یہ محض خدا کا احسان ہے۔ ہمارا فرض اوّلین ہے کہ یہ احساس بیدار رکھیں۔ اس فرض کی بجا آوری میں حکومت اور عوام دونوں یکساں ذمے دار ہیں۔ ہمیں جلد از جلد اس ملک کو پوری طرح اسلامی رنگ میں رنگنا چاہیے۔

یہ بات افسوس سے کہنی پڑتی ہے کہ اس موقع پر بھی بعض پروگرام ایسے مرتب کیے جا رہے ہیں، جو اسلام اور اس کی روح کے سراسر منافی ہیں اور اُن سے کسی قسم کا میل نہیں کھاتے۔ مسلم قوم جو "لا إلٰه إلا اللّٰه محمد رسول اللّٰه" کا ورد کرتی ہوئی میدانِ جنگ میں کودی ہے، اُسے غلط اور ناجائز محرکات سے آشنا نہ کیا جائے۔ جہاد جیسے مقدس فریضے کے ساتھ ثقافتی شو کے پیوند ہرگز نہیں لگنے چاہییں۔ حکومت کو وہی انداز اور شان قائم رکھنی چاہیے، جو مسلمان حکومت کے لائق ہوتی ہے۔ اگر ہم نے اسلامی حدود کی پابندی اور اللہ پر توکل کرتے ہوئے اپنے عمل کو درست کیا تو ان شاء اللہ قلت و کثرت کا سوال ہم پر اثر انداز نہیں ہوگا۔ یہ عقیدہ حکومت، عوام، امیر، غریب سبھی کا ہونا چاہیے۔ یہ وطن ہمارا ہے۔ اسلام کے لیے ہے۔ اس لیے اس کی حفاظت فرضِ عین ہے۔

أقول قولي هذا و أستغفر اللّٰه لي ولكم أجمعين.

خطبہ جمعہ مسجد اہلِ حدیث لائل پور

از قلم: محمد یحییٰ عزیز۔ ایم۔ اے

یکم صفر ۱۲ مئی [۱۹۶۷ء] بروز جمعۃ المبارک حضرت الامیر صاحب بڑی دیر کے بعد لائل پور میں تشریف لائے۔ حضرت امیر صاحب کی آمد اور آپ کا ورودِ مسعود باعثِ صد مسرت ثابت ہوا۔

اہلِ لائل پور نے والہانہ انداز سے آپ کا استقبال کیا۔ لاکھوں آنکھیں آپ کے دیدار کی متمنی تھیں۔ دراصل یہ اہلِ لائل پور کی بے پناہ عقیدت ہی تھی، جو حضرت الامیر کو اس شہر میں کھینچ لائی۔ آپ کی آمد سے قبل نہ صرف لائل پور کو بلکہ پورے پاکستان کو مطلع کر دیا گیا تھا اور باقاعدہ اشتہارات کی شکل میں پروگرام کو مرتب کر کے ملک کے کونے کونے میں بھیج دیا تھا۔ یہ فریضہ حضرت مولانا عبیداللہ صاحب احرار نے بہ خوبی انجام دیا۔

حضرت الامیر کی آمد پر آپ کے اِعزاز میں شیخ محمد ابراہیم صاحب (نیشنل کلاتھ ہاؤس) نے ایک پر تکلف دعوت کا اہتمام کیا، جس میں دیگر معززین شہر کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ ان لوگوں نے آپ کی آمد پر بڑی مسرت کا اظہار کیا۔ اس کے بعد یہ سب حضرات جامع مسجد اہلِ حدیث میں تشریف لائے، کیوں کہ جمعہ کا وقت ہو رہا تھا۔ جامع مسجد اپنی وسعتِ فراخی کے باوجود عقیدت مندوں کے بے پناہ ہجوم سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ ہر ایک کے چہرے سے مسرت اور شادمانی ٹپک رہی تھی۔

ٹھیک ساڑھے بارہ بجے حضرت الامیر منبرِ رسول پر جلوہ افروز ہوئے۔ موذن نے حجازی لے میں اذان دی، جس سے مسجد تو مسجد فضا میں بھی ایک سوز اور ترنم پیدا ہو گیا۔ سامعین پر ہو کا عالم طاری تھا۔ یکا یک حضرت الامیر اُٹھ کھڑے ہوئے اور آپ نے اس سکوت کو خطبہ مسنونہ سے توڑا۔ آپ نے سورت لقمان کی آیت: ﴿وَاقْصِدْ فِیْ مَشْیِكَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِیْرِ﴾ [لقمان: ۱۹] تلاوت فرمائی۔

مختصر حمد و ثنائے باری تعالیٰ بیان کرنے کے بعد آپ نے ابتدا و ارتقائے اسلام کا ایک مختصر، جامع مگر عمیق جائزہ لیا، آپ نے جزیرہ نمائے عرب کا تاریخی، معاشی، سیاسی، جغرافیائی تجزیہ کرتے ہوئے اس کے محلِ وقوع کی موزنیت و مناسبت پر ایک مدلل اور جامع بحث کی۔ آپ نے فرمایا کہ یہ خطۂ ارضی کئی ایک تہذیبوں

کے درمیان واقع ہے۔

بعثتِ رسول ﷺ کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد اس جزیرہ نما عرب میں دین نے تحریف کا لبادہ اوڑھ لیا اور اخلاقی اقدار دنیا سے ناپید ہوگئیں۔ شرم وحیا کا دیوالہ نکل گیا اور وہ لوگ گمراہی کی اس گہری اور وسیع خلیج میں اس قدر نیچے چلے گئے تھے کہ ان کا باہر نکلنا دشوار نظر آ رہا تھا تو اس وقت غیرتِ ربانی جوش میں آئی اور اس نے ہادیِ انام حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو دنیا میں اہلِ دل کی فلاح و بہبود کے لیے مبعوث فرمایا۔ چوں کہ اسلام کی ابتدا تھی، اس لیے اس کے ماننے والے بہت کم تھے اور جو تھے وہ قوت اور طاقت کے اعتبار سے کمزور تھے۔ اس لیے تبلیغِ دین ایک خفیہ تحریک بنی رہی اور اس کی مثال بالکل اس چنگاری کی طرح ہے، جو اندر ہی اندر سلگتی رہے اور پھر یکایک خرمن کو بھک سے آگ لگا دے۔

حضور۔علیہ التحیۃ والسلام۔ نے یقینِ کامل کے ساتھ لوگوں کو درسِ توحید دیا اور ذاتِ واجب الوجود کے حقیقی اوصاف سے روشناس کرایا۔ پھر جب اسلام کے پیرو بڑنے شروع ہوگئے تو اس نے ایک علانیہ تحریک کا رنگ دھار لیا۔ اس کے ظہور کے ساتھ ہی عرب تین گروہوں میں منقسم ہوگئے؛ ایک گروہ تو وہ تھا جو اپنی ہٹ دھرمی کے باعث صاف انکار کر رہا تھا۔ دوسرا وہ تھا جو دل و جان سے حضور پر شیدا تھا اور آپ کے فرامین پر اپنے آپ کو قربان تک کرنے کے لیے بھی تیار تھا۔ تاریخ ان حقائق سے نقاب کشائی کرتی ہے۔

ان کے علاوہ ایک گروہ ایسا بھی تھا جو دنیاوی اغراض و مصالح کے پیشِ نظر بہ ظاہر مسلمان بنا ہوا تھا، مگر وہ اندرونِ خانہ اسلام کے خلاف ریشہ دوانیوں میں مصروف تھا، جس کی کوشش ہی یہ تھی کہ اسلام کا یہ سرسبز و شاداب پودا جڑ سے اُکھاڑ دیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس گروہ سے اسلام کو بہت نقصان پہنچا۔ ان منافقوں نے اسلام کے لبادے میں اسلام کو اس قدر نقصان پہنچایا کہ خود قرآن کو اُن کی نشان وہی کرنا پڑی۔ آیندہ چل کر یہ ایک تناور درخت بن گیا، جس نے پورے عالمِ اسلام کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

نفسیاتی طور پر بعض طبائع کمزور واقع ہوتی ہیں، جو لالچ اور حرص سے مغلوب ہو کر ذاتی اغراض کے حصول میں کوشاں رہتی ہیں، ان کا مقصدِ وحید ہی یہ ہوتا ہے کہ برسرِ اقتدار پارٹی کا ساتھ دے کر ہر ممکن حد تک اپنا کام نکال لیا جائے، خواہ اس میں ناجائز ذرائع ہی کا کیوں نہ استعمال کرنا پڑے۔

جب اسلام کو اپنے ایک نہایت ہی خطرناک دشمن روم سے سابقہ تھا، اس وقت منافقوں کے ایک گروہ کا حیل و حجت کر کے لشکرِ اسلام سے علاحدہ ہو جانا اسلام سے کھلی غداری تھا۔ ان کی اس شرمناک علاحدگی نے ان کی بد باطنی کی نقاب کشائی کر دی اور یہ گروہ کھل کر سامنے آ گیا، چوں کہ اسلام کا عنفوان شباب تھا، اس لیے حضور علیہ السلام نے ان کی گوشمالی مناسب نہ سمجھی، تا کہ کفار یہ نہ کہیں کہ یہ کیسا انسان ہے، جو اپنے ہی حواریوں کو قتل

کرنے کے درپے ہے، بلکہ آپ حالات کا پوری طرح جائزہ لیتے ہوئے پوری دل جمعی کے ساتھ اپنے مشن کی تبلیغ میں منہمک رہے۔ قرآنِ مجید نے ان کی اس غداری کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے۔ فرمایا:

﴿وَ سَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَوِ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ يُهْلِكُوْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ﴾ [التوبة: ٤٢]

''اور خدا کی قسمیں کھائیں گے کہ اگر ہم طاقت رکھتے تو آپ کے ساتھ نکل کھڑے ہوتے (ایسے عذروں سے) اپنے تئیں ہلاک کر رہے ہیں اور خدا جانتا ہے کہ یہ جھوٹے ہیں۔''

آگے فرمایا:

﴿اِنَّمَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ ارْتَابَتْ قُلُوْبُهُمْ فَهُمْ فِيْ رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُوْنَ﴾ [التوبة: ٤٥]

''اجازت وہی لوگ مانگتے ہیں، جو خدا پر اور پچھلے دن پر ایمان نہیں رکھتے اور ان کے دل شک میں پڑے ہوئے ہیں۔ سو وہ اپنے شک میں ڈانواں ڈول ہو رہے ہیں۔''

ان آیات میں جہاں اللہ تعالیٰ نے منافقین کی حقیقت سے پردہ کشائی کی ہے، وہاں ہمارے سامنے ایک میزان اور کسوٹی بھی رکھ دی ہے، جس سے ہم کھوٹے اور کھرے میں فرق کر سکتے ہیں۔ چنانچہ جو شخص اس کشمکش میں دل وجان سے حمایت کرتا ہے اور اپنی ساری طاقت اور ذرائع اس کی سربلندی میں صرف کرتا ہے اور کسی قسم کی قربانی سے دریغ نہیں کرتا، وہی دراصل سچا مومن ہے بخلاف اس کے جو اس کشمکش میں اسلام کا ساتھ دینے سے جی چرائے اور کفر کی سربلندی کا خطرہ سامنے دیکھتے ہوئے بھی اسلام کے لیے جان ومال کی بازی لگانے سے پہلو تہی کرے، اس کی یہ روش اس حقیقت کو واضح کر دیتی ہے کہ اس کے دل میں ایمان نہیں۔

قرآن پاک نے ان کی بد باطنی اور اسلام دشمنی کو بھی آشکار کیا ہے۔ چونکہ ان کے دلوں میں شرکتِ جہاد کا جذبہ ہی نہ تھا، بلکہ وہ صرف مسلمانوں کی شرما شری، بد دلی یا کسی شرارت کی نیت سے جہاد میں شریک ہوتے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو اجازت ہی نہ دی اور پیغمبر کو صورتِ حال سے آگاہ فرماتے ہوئے کہا کہ اے حبیب! کوئی بات نہیں، یہ لوگ تو حیلے اور بے جا بہانے کر رہے ہیں۔ یہ لوگ اس قدر مخالف تھے کہ اگر انہیں وحی الٰہی کا خوف نہ ہوتا تو وہ بھی کفارِ مکہ کی طرح اعلان بغاوت کر دیتے۔ ان کی اس خصلت کو قرآن نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

﴿يَحْذَرُ الْمُنٰفِقُوْنَ اَنْ تُنَزَّلَ عَلَيْهِمْ سُوْرَةٌ تُنَبِّئُهُمْ بِمَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ﴾ [التوبة: ٦٤]

''منافق ڈرتے رہتے ہیں کہ ان کے پیغمبر پر کہیں کوئی ایسی سورت نہ اتر آئے کہ ان کی دل کی باتوں کو ان مسلمانوں پر ظاہر کر دے۔''

دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿وَ مِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ وَ مِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ لَا تَعْلَمُهُمْ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ﴾ [التوبۃ:۱۰۱]

''اور تمھارے گردو نواح کے بعض دیہاتی منافق ہیں اور بعض مدینے والے بھی نفاق پر اَڑے ہوئے ہیں، تم انھیں نہیں جانتے، ہم انھیں جانتے ہیں۔''

یعنی اپنے نفاق کو چھپانے میں وہ اتنے مشاق ہوگئے ہیں کہ خود نبی اکرم ﷺ بھی اپنی کمال درجے کی فراست کے باوجود ان کو نہیں پہچان سکتے تھے۔

غرض کہ حضور ۔علیه التحیة والسلام۔ کے عہدِ مبارک میں یہ لوگ اندرونِ خانہ اسلام کے سخت مخالف رہے اور انھوں نے اسلام کو مٹانے کی پیہم کوششیں کیں، جب حضورِ اقدس اس دارِ فانی سے اپنا مقدس مشن ختم کر کے دارِ آخرت کی طرف رحلت فرما گئے تو اس شجرۂ خبیثہ کو مزید پھلنے پھولنے کا موقع مل گیا، چناں چہ دورِ صدیقی کے شروع ہوتے ہی طرح طرح کے فتنے جنم لینے لگے اور اسلام کے خلاف علانیہ بغاوتیں شروع ہوگئیں۔ بعض قبیلے تو بالکل اسلام سے مرتد ہوگئے۔ بعض نے فرضیتِ صلاۃ سے انکار کر دیا اور بعض زکات کو رکنِ اسلام ماننے سے روگردانی کرنے لگے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کمال فراست سے کام لے کر اس فتنے کو دبایا۔

عہدِ فاروقی میں بھی یہ فتنہ دبا رہا، مگر اس نے دور دراز علاقوں میں سر اُٹھانا شروع کر دیا۔ پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں یہ فتنہ اور چمکا اور شہادتِ عثمان رضی اللہ عنہ اسی کا نتیجہ ہے۔ آپ کا شہید ہونا ہی تھا کہ مسلمان مختلف گروہوں میں بٹ گئے۔ کچھ تو وہ تھے، جو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے پیرو تھے اور کچھ وہ تھے، جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ہاں میں ہاں ملا رہے تھے۔ وہ وقت اسلام کا بڑا نازک وقت تھا، ہر طرف سے فتنے امڈے چلے آتے تھے۔ مسلمان خانہ جنگی میں مشغول ہوگئے، جس کے نتیجے میں جنگِ جمل اور جنگِ صفین دو مشہور لڑائیاں معرضِ وجود میں آئیں، جس سے مسلمانوں کا بہت زیادہ نقصان ہوا۔

اس کے ساتھ ساتھ حضرت الامیر نے تبلیغِ دین اور اشاعتِ حدیث پر بصیرت افروز دلائل دیتے ہوئے فرمایا کہ عہدِ رسالت ہی میں صحابہ رضی اللہ عنہم نے تبلیغ و تدوینِ حدیث شروع کر دی تھی، جیسے کتبِ احادیث سے واضح ہے۔ صحابہ کے بعد تابعین کے دور میں تو یہ فن بہت اچھی طرح چمکا، جب اصحابِ صحاح ستہ کا دور آیا تو انھوں نے اس فن میں مزید چار چاند لگا دیے اور اس کو باقاعدہ طور پر مرتب و مدون کر دیا۔ آیندہ چل کر ان کی یہی

مساعی جمیلہ لوگوں کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوئیں۔

حقیقت یہ ہے کہ پیغمبرِ خدا کی مکمل تصویر پیش کرنے کی جو سعی محدثین نے پیش کی ہے، اس کی مثال تاریخِ عالم میں مفقود ہے۔ دراصل وہ لوگ حقیقی جذبۂ عشقِ رسول سے آشنا تھے، یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنا سب کچھ اس فن کی نذر کر دیا۔

تاریخ شاہد ہے کہ مختلف ادوار میں بہت سارے لوگوں نے اس فن پر خامہ فرسائی کی، جن کی رشحاتِ قلم آج دنیا میں موجود ہیں۔ آیندہ چل کر اس سلسلے میں جن لوگوں نے محنت کی، ان میں سرفہرست شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور ان کے شاگردِ رشید حافظ ابن القیم رحمہ اللہ ہیں۔ یہ دونوں بزرگ اپنے وقت کے بہت بڑے امام تھے۔ خالقِ کائنات نے ان کے قلم میں زور اور ان کی زبان میں تاثیر مبالغہ کی حد تک رکھی تھی۔ یہ لوگ باوجود شدید مخالفت کے اپنے کام میں منہمک رہے اور اُن کے قلم سے وہ کارہائے نمایاں معرضِ وجود میں آئے، جو آج نوادرِ روزگار شمار کیے جاتے ہیں۔

ان حضرات نے اس وقت کے تقلیدی اور جمودی دور کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرتے ہوئے ایک اصلاحی تحریک چلائی تھی، جو بڑی حد تک کامیاب رہی۔ یہ تحریک ان کے بعد بھی جاری رہی، کیوں کہ ان کی تصانیف ان کے اصلاحی خیالات کا خزینہ تھیں اور پھر انھوں نے شاگردوں کی ایک ایسی پرجوش جماعت پیدا کر دی تھی، جس نے ان کی تحریک کو نہ صرف زندہ اور برقرار رکھا، بلکہ ان کی تمام تصانیف کو، جو اسلامی جوش اور ولولے سے لبریز تھیں، ہر جگہ پھیلانا شروع کر دیا، اس جماعت کے سرگروہ شیخ شمس الدین ابن القیم تھے۔ اُنھوں نے اپنے استاد کے انقلاب انگیز خیالات کو نئی ترتیب وتہذیب کے ساتھ مدون کیا اور سنجیدگی کے ساتھ ان کی اشاعت کی۔

چناں چہ اس مقدس تحریک سے ہندوستان بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ کتبِ تاریخ شاہد ہیں کہ وقتاً فوقتاً اس کے داعی ہندوستان آتے رہے اور اس مقدس فن کی اشاعت میں منہمک ہوتے رہے۔ ہندوستان میں زیادہ تر ان لوگوں نے حدیث کی اشاعت کی، جو امامین سابقین کی تحریک سے عقیدت کی حد تک متاثر تھے، ان کا تبلیغی انداز بالکل وہی تھا، جو حضور علیہ السلام کا تھا۔ صحابہ، تابعین اور سلف صالحین کا تھا۔

ہندوستان میں اشاعتِ حدیث میں سب سے زیادہ شاہ ولی اللہ کے خاندان نے حصہ لیا، اس خاندان نے قرآن اور حدیث کی بڑی خدمت کی۔ اگر ایک طرف قرآنِ مجید کا ترجمہ اور تفسیر کر کے امت کی ضرورتوں کو پورا کیا تو دوسری طرف احادیث کے اسرار و رموز اور حکم بیان کر کے تشنگانِ علمِ حدیث کی پیاس بجھائی۔ حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ بھی اسی خاندان کے چشم و چراغ تھے، جنھوں نے اعلاے کلمۃ اللہ کے لیے اپنے آپ کی

بازی لگا دی اور باطل طاقتوں کے خلاف برسرِ پیکار رہے، انھوں نے اس کے ساتھ ساتھ حدیث پر بھی بہت کام کیا۔

اس خاندان کے دوسرے بزرگ حضرت اسحاق رحمہ اللہ ہیں، وہ اپنے وقت کے ایک جید عالم تھے۔ لوگ ان کے چشمۂ فیض سے سیراب ہو رہے تھے۔ آپ وقت کے بہت بڑے محدث بھی تھے۔ آپ کی خدمت میں ایک طالب علم آیا اور بہت ہی قلیل مدت میں اپنے استاد کو اس قدر متاثر کر دیا کہ وہ جب ارضِ حجاز کی طرف ہجرت کے ارادے سے دہلی چھوڑنے لگے تو انھوں نے تدریسِ حدیث کی مسند پر اس طالب علم کو بٹھا دیا، جو بعد میں چل کر شیخ الکل فی الکل کے نام سے مشہور ہوا۔ آپ نے نہایت دیانت داری سے اور صبر وتحمل سے اس صبر آزما عہدے کو نبھانے کی کوشش کی۔ چند ہی دِنوں میں آپ کی شہرت دور دراز ملکوں میں پھیل گئی اور عقیدت مندوں کا ہجوم ہونے لگا، آپ کی مجلس میں بیک وقت ہزاروں لوگ درسِ حدیث سے استفادہ کرتے تھے۔ آپ کے تلامذہ کا حلقہ اس قدر وسیع ہوا کہ ہندوستان تو درکنار بیرونی ممالک میں بھی آپ کے بہت سے شاگرد ہوگئے۔ آپ کے فیضان سے متمتع ہونے والوں میں ایسے لوگ بھی پیدا ہوئے، جنھوں نے اسلاف کی یاد تازہ کر دی۔

آپ کے فیض یافتگان میں سب سے مشہور غزنوی خاندان ہے اور اس کے ساتھ ساتھ لکھوی خاندان بھی۔ تاریخ شاہد ہے کہ ان دونوں خاندانوں نے ہندوستان میں علمِ حدیث کی وہ خدمت کی، جس کی نظیر سے کتب قاصر ہیں۔ آپ کے ارشد تلامذہ میں مولانا محمد عبداللہ صاحب غزنوی، حافظ عبدالمنان صاحب وزیر آبادی اور مولانا حافظ محمد صاحب لکھوی بہت مشہور عالم گزرے ہیں۔

غزنوی خاندان کے چشم و چراغ حضرت مولانا محمد داود صاحب غزنوی بھی وقت کے بہت بڑے جید عالم تھے، جہاں آپ نے سیاست میں سرگرم حصہ لیا، وہاں آپ نے علمِ حدیث کی بھی بہت خدمت کی۔ آپ کے درسِ حدیث سے لاکھوں لوگ متاثر ہیں۔ آپ ہی کی مساعیِ جمیلہ سے ایک عظیم الشان مرکزی درس گاہ کا قیام معرضِ وجود میں آیا، جس کا مقصد صرف اسلاف صالحین کی سنت کا اِحیا تھا، اس درس گاہ کے پیشِ نظر جہاں طلبا میں علومِ اسلامیہ کی رُوح پھونکنا ہے، وہاں ہی ان کو دورِ حاضر کے جدید تقاضوں سے روشناس کراتے ہوئے علومِ دنیاوی سے بھی بہرہ افروز کرنا بھی ہے، چناں چہ یہی وجہ تھی کہ اس مرکزی درس گاہ میں انگریزی تعلیم کو وسیع پیمانے پر لازمی قرار دے دیا گیا، چناں چہ اس کے فیض یافتہ آج ملک کے گوشے گوشے میں تعلیم و تدریس اور تبلیغِ دین میں مصروف ہیں۔

آخر میں حضرت الامیر صاحب نے لائل پور میں اپنی آمد کا مقصد بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ کچھ عرصے سے جماعت میں اختلاف پیدا ہوگیا تھا، جو بحمد اللہ میاں فضل حق صاحب ناظمِ اعلیٰ کی مسلسل کوششوں سے دور

ہوتا جا رہا ہے اور کافی حد تک جماعت کی اصلاح ہوگئی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ یہ میاں صاحب ہی کی ذات ہے، جنھوں نے اس قدر کٹھن معاملے کو نہایت دانش مندی سے سلجھا دیا ہے۔ یہ آپ ہی کی مسلسل جدوجہد کا نتیجہ ہے کہ کراچی سے پشاور تک بلکہ آزاد کشمیر تک جماعت میں اتحاد و اتفاق کی ایک لہر دوڑ گئی ہے اور ہر طرف سے تعاون کی صدائیں بلند ہو رہی ہے، جا بہ جا جلسے ہو رہے ہیں، تاکہ جماعت کے بکھرے ہوئے شیرازے کو یک جا کر دیا جائے۔[1]

[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۱۶، ۲۳، ۳۰؍ جون ۱۹۶۷ء)

خطبہ جمعہ:

ہدایت کا اختیار اور توفیقِ ایزدی

مرتب: جناب ابوعزیز عبدالواحد صاحب

حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب نے ایک عرصہ ہوا خطبہ جمعہ میں قرآنِ مجید کو سورت فاتحہ سے شروع کیا تھا اور ہر جمعہ کو آپ اسی ترتیب سے قرآنِ مجید کی کچھ آیات کی تشریح فرماتے ہیں۔ یہ سلسلہ اللہ کے فضل سے آج تک جاری ہے۔ اسی تسلسل کے تحت گذشتہ جمعہ خطبہ مسنونہ کے بعد آپ نے سورت بنی اسرائیل کے دسویں رکوع کی ان آیات کی تلاوت کی:

﴿قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۢ بَيْنِيْ وَ بَيْنَكُمْ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًا ۢ بَصِيْرًا ۝ وَ مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ وَ مَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِهٖ وَ نَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ عُمْيًا وَّ بُكْمًا وَّ صُمًّا مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ كُلَّمَا خَبَتْ زِدْنٰهُمْ سَعِيْرًا ۝ ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمْ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا وَ قَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّ رُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا ۝ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ قَادِرٌ عَلٰۤى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ وَ جَعَلَ لَهُمْ اَجَلًا لَّا رَيْبَ فِيْهِ فَاَبَى الظّٰلِمُوْنَ اِلَّا كُفُوْرًا﴾ [بني إسرائيل: ٩٦۔ ٩٩]

ان آیات کی تلاوت کے بعد آپ نے فرمایا کہ اس دنیا میں انبیاے کرام اعلیٰ صفات اور خوبیوں کے بہترین اور مکمل نمونہ ہیں اور انھیں کی اِتباع میں خیر و رُشد ہوسکتی ہے۔ اب ظاہر بات ہے کہ تمام انسانوں کو ہر معاملے میں انبیا کی پیروی کرنی چاہیے اور جس دعوت کی طرف وہ بلاتے ہیں، اس کو قبول کرنا چاہیے، جو ہدایات اُن کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملی ہیں، ان کو اپنے لیے مشعلِ راہ بنانا چاہیے، لیکن تمام انبیاے کرام کو جھٹلایا گیا اور اُن کی پیش کردہ ہدایت و رشد کو مختلف حیلوں اور بہانوں سے لوگوں نے ٹھکرایا۔

یہاں مولانا نے ان آیات کا ربط اس سے پہلے کی آیات سے قائم کرتے ہوئے فرمایا کہ کفار اپنے انکار کی جو وجوہ پیش کرتے رہے ہیں، اُن میں سے ایک سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ نبی ایک فوق البشر مخلوق ہونا

چاہیے اور نبوت کا مدعی، چوں کہ ہماری ہی طرح کا ایک انسان ہے، اس لیے ہم ایک انسان کو رسول و نبی تسلیم کرنے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں ایک اصول بیان کر دیا ہے کہ انسانوں کے لیے ایک انسان ہی رسول ہونا چاہیے، کیوں کہ انسان کے لیے ایک انسان ہی کی زندگی نمونہ اور قابلِ اتباع ہوسکتی ہے۔ ایک فرشتے کی زندگی اور عادات انسانوں کے لیے ہرگز قابلِ اتباع نہیں ہوسکتیں، کیوں کہ فرشتے کی قوتیں اور فطرت انسان سے مختلف ہے اور جو کام ایک فرشتہ بڑی آسانی سے کرسکتا ہے، انسان وہی کام بڑی تکلیف اور مشقت کے باوجود نہیں کرسکتا۔ فرمایا:

﴿لَوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا﴾ [بني إسرائيل: ٩٥]

''اس دنیا میں اگر فرشتے آباد ہوتے تو ہم آسمان سے فرشتے ہی رسول بنا کر اتارتے۔''

لیکن چوں کہ فرشتے یہاں آباد نہیں ہیں، بلکہ انسان آباد ہیں تو ظاہر بات ہے کہ انسانوں کی راہنمائی و ہدایت کے لیے فرشتہ نہیں، بلکہ انسان ہی موزوں ہوسکتا ہے۔ انسانوں میں ہر طرح کے افراد ہیں؛ ناکارہ اور گھٹیا قسم کے انسان بھی ہیں اور پسندیدہ اخلاق و اعمال کے مالک بھی۔ جب رسولِ اکرم ﷺ کو بشر کہا جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ نعوذ باللہ وہ بھی ہماری طرح گناہگار تھے، بلکہ وہ تو ان تمام عیوب اور نقائص سے پاک تھے۔ بشر ہونا کسی بھی رسول کی کسرِ شان نہیں ہے، بلکہ انسان ہو کر تمام عیوب سے پاک ہونا بہت بڑی شان اور اللہ کی عنایت ہے۔

اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ محنت اور کام کرنا انسان کا کام ہے اور نتائج و ثمرات اس کے بس کی بات نہیں، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہیں۔ آپ نے رسول اللہ ﷺ کی مثال دیتے ہوئے فرمایا کہ آپ کی تبلیغ سے زیادہ پُراثر اور جامع تبلیغ اور کسی کی نہیں ہوسکتی، لیکن کس کو علم نہیں ہے کہ آخر وقت تک منکرین موجود رہے۔ ہر روز تلقین سننے والے منافقین باقی رہے۔ مشرکین کی ایک بہت بڑی تعداد نے ہدایت کو قبول نہ کیا۔ اس موقع پر آپ نے اللہ تعالیٰ کو گواہ بنایا ہے: ﴿كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًاۢ بَيْنِيْ وَ بَيْنَكُمْ﴾

رسول اللہ ﷺ نے تمام قبائل کو دعوتِ اسلام دی اور عذابِ الٰہی سے ڈرایا۔ تمام عرب اکابرین اور عجمی بادشاہوں کو بھی اسلام کی طرف بلایا اور اس معاملے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ وفات سے اسی روز پہلے عرفات کے میدان میں ایک جامع اعلان فرمایا، جس میں جاہلیت کی رسوم کو کچلنے، اونچ نیچ کو ختم کرنے، انسانی مساوات کو

قائم کرنے، غلاموں کے حقوق اور عورتوں کے حقوق کے علاوہ دیگر مختلف امور کی تلقین کی۔ اس کے بعد آپ نے مخاطبین سے پوچھا کہ کیا میں نے حقِ تبلیغ ادا کر دیا ہے؟ انھوں نے اس کا جواب اثبات میں دیا۔ اس موقع پر بھی آپ نے اللہ تعالیٰ ہی کو گواہ بنایا اور کہا: اے اللہ! گواہ رہنا۔

رسولِ اکرم ﷺ نے اپنی پوری زندگی اس کام میں صَرف کی اور اس پر اللہ تعالیٰ کو گواہ ٹھہرا دیا، کیوں کہ انسان کا علم اور خبر ناقص ہے اور اللہ تعالیٰ پوری طرح خبیر و بصیر ہیں۔ انسانی علم اور خدائی علم کا فرق ایک مثال سے واضح کرتے ہوئے فرمایا: انسان سورج کو دیکھ کر اس کی چوڑائی کا ایک اندازہ کرتا ہے، لیکن یہ حقیقت ہے کہ سورج اندازے سے کروڑوں گنا بڑا ہے۔

انبیا، آسمانی کتب، نیک ہستیاں؛ یہ سب ہدایت کے اسباب و ذرائع ہیں، لیکن اگر اللہ تعالیٰ کی توفیق کسی کے شاملِ حال نہ ہو تو وہ ہدایت نہیں پا سکتا، جس طرح رات کے وقت آنکھوں کے بصارت سے کام لینے کے لیے روشنی کی ضرورت ہوتی ہے، اسی طرح تمام وسائل کے ساتھ ساتھ توفیقِ الٰہی کی ضرورت ہے، اگر یہ میسر نہ ہو تو یہ تمام ذرائع بے کارِ محض ہوتے ہیں، جیسا کہ کہا گیا ہے: ﴿مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ﴾

تبلیغ کرنے والے رسول اللہ ﷺ تھے، لیکن جن کو یہ روشنی نصیب نہ ہوئی، وہ ایمان نہ لائے۔ حق کو قبول کرنے میں ہر آدمی کی بصیرت اور اُس کا فہم مددگار ہوتا ہے، لیکن ہر آدمی کے معاملے میں یہ یکساں نہیں ہوتا۔ ابوجہل اور ابولہب کو تو اُن کے فہم و بصیرت نے انکار و کفر کی راہ دکھائی، لیکن حکیم ضماد کے معاملے میں اس کا اثر الٹا ہوا۔ یہ صاحب کرنے تو جنون کا علاج جاتے ہیں، لیکن خطبہ مسنونہ کو تین مرتبہ سننے کے بعد مسلمان ہو جاتے ہیں۔ اندھیرے میں آنکھوں سے کام لینے کے لیے جس روشنی کی ضرورت تھی، وہ اُن کو میسر آ گئی، لیکن یہی خطبہ دوسرے کفار کئی مرتبہ سُن چکے تھے، لیکن ان پر اس سے اثر الٹا ہوا۔ ہدایت و اصلاح کے اس معاملے میں کسی طرح کا کوئی دوست کام نہیں آ سکتا۔

﴿فَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِهٖ﴾ کارسازی کو اس معاملے میں بالکل ختم کر دیا گیا ہے۔ ان لوگوں نے برائی کو دیکھا، لیکن زبان نہ کھولی۔ دنیا کے تجربات سے فائدہ نہ اُٹھایا اور کانوں سے ہدایت نہ سنی۔ حق پر غور کرتے، تبھی ایمان نصیب ہوتا۔ ایسا نہ کرنے کا انجام ظاہر ہے کہ اُن کے لیے سقر مقرر ہے۔ مجھے اور آپ سب حضرات کو چاہیے کہ حق کو حق جانیں اور اس پر عمل پیرا ہوں، باطل کو سمجھیں اور اس سے بچیں۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين.[1]

---

[1] سہ روزہ ''منہاج'' لاہور (۲۱؍ مارچ ۱۹۵۸ء)

ایمان بالآخرۃ کے فوائد وثمرات

ترتیب: مولانا عبدالواحد صاحب

﴿ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمْ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا وَ قَالُوْٓا ءَ اِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّ رُفَاتًا ءَ اِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا ۝ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ وَ جَعَلَ لَهُمْ اَجَلًا لَّا رَيْبَ فِيْهِ فَاَبَى الظّٰلِمُوْنَ اِلَّا كُفُوْرًا ۝ قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَآئِنَ رَحْمَةِ رَبِّيْٓ اِذًا لَّاَمْسَكْتُمْ خَشْيَةَ الْاِنْفَاقِ وَ كَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا﴾ [بني إسرائيل: ۹۸۔ ۱۰۰]

اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں ہدایت دیتے ہیں اور جسے وہ گمراہ کر دیں تو کوئی نہیں، جو اس کو ہدایت دے۔ گمراہوں کو قیامت کے دن اندھا گونگا اور بہرہ کر کے سر کے بل چلایا جائے گا۔ ایسا کیوں کیا جائے گا؟ اس لیے کہ یہ لوگ سیدھا راستہ اختیار کر کے ہدایت قبول کرنے کے بجائے الٹا چلے اور اپنے لیے خلافت کو پسند کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو آنکھیں دی تھی، لیکن انھوں نے حقائق سے آنکھیں بند کر لیں، ان کو زبان دی گئی تھی کہ اس سے اپنے خالق کی حمد و ثنا کریں، لیکن انھوں نے اس کا غلط استعمال کیا، ان کو کان دیے گئے تھے کہ کلامِ الٰہی کو سنیں، لیکن انھوں نے انکار و گمراہی کی باتیں ہی سنیں، گویا تمام قوتوں کا الٹا استعمال کیا، اس لیے قیامت کے روز ان کو بھی سر کے بل یعنی الٹا ہی چلایا جائے گا، اور دوزخ میں داخل کیا جائے گا۔

اس سزا کی وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے اللہ کی آیات کا انکار کیا، حق کو ماننے کے بجائے آخرت کا انکار کیا، بلکہ الٹا سوال کیا:

﴿ءَ اِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّ رُفَاتًا ءَ اِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا﴾ [بني إسرائيل: ٤٩]

''ہمیں کیوں کر زندہ کیا جائے گا، جبکہ ہم مٹی اور ہڈیاں ہو چکے ہوں گے۔ بوسیدہ ہڈیوں میں زندگی کیسے پیدا ہو سکتی ہے؟ ہمارے دوبارہ زندہ ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے۔''

انسانی زندگی پر دوبارہ زندہ ہونے اور آخرت کے اس تصور کا بڑا اثر ہے، جس آدمی کو اس پر یقین نہیں ہے وہ جو چاہے کر سکتا ہے، دین سے جس قدر چاہے لڑائی کرے، بے ایمانی اور باطل کو جتنا چاہے اپنا لے،

لوگوں کا مال کھانے میں ذرا برابر شرم اور تکلیف محسوس نہ کرے۔ آخرت پر یقین کا نہ ہونا تمام برائیوں کا سرچشمہ ہے۔ حکومتیں قتل کرتی ہیں، امرا فساد کرتے اور کراتے ہیں، علما جھوٹ بولتے ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟

یہ سب اسی وجہ سے ہوتا ہے کہ آخرت کی باز پرس کا خیال نہیں ہوتا اور زندگی بعد از موت کا تصور یا تو ذہن سے ختم ہوجاتا ہے یا مدہم پڑ جاتا ہے۔ یہ کفار نے بھی اسی وجہ سے معاد کا انکار کیا اور کہا کہ بوسیدہ ہڈیوں اور مٹی کو ہرگز زندہ نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ قَادِرٌ عَلٰى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ وَ جَعَلَ لَهُمْ اَجَلًا لَّا رَيْبَ فِيْهِ فَاَبَى الظّٰلِمُوْنَ اِلَّا كُفُوْرًا ﴾ [بني إسرائيل: ۹۹]

''اللہ تعالیٰ نے آسمان و زمین کو بنایا اور وہ پوری قدرت رکھتا ہے کہ ایسے ہی آسمان اور زمین بنا دے، جب وہ اس قدر طاقتور ہے تو کیا وہ انسانوں ہی کو دوبارہ زندہ نہیں کرسکتا؟''

خوفِ آخرت کے متعلق آپ نے ایک واقعہ بیان کیا، جو احادیث میں آیا ہے:

ایک شخص قریب المرگ تھا، جب اس نے اپنے اعمال پر نظر کی تو اس نے سمجھا کہ زندگی بالکل اکارت گنوا دی۔ کوئی اچھا کام نہ کیا، اب عذاب سے چھٹکارا ناممکن ہے۔ آخرت اور دربارِ الٰہی کی باز پرس کا خوف اس کے دل پر محیط ہوگیا۔ اس نے اپنے لڑکوں کو بلایا اور وصیت کی کہ میری لاش کو جلا دینا اور راکھ کے ایک حصے کو ہوا میں اُڑا دینا اور دوسرے کو دریا میں بہا دینا۔ انھوں نے ایسا ہی کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ہوا اور پانی کو اس کی راکھ جمع کرنے کا حکم دیا اور اس کو زندہ کیا۔ سوال کیا گیا کہ ایسا کیوں کیا ہے؟ اس شخص نے جواب دیا کہ تمام زندگی تو کوئی نیک عمل نہ کیا، اس لیے اپنے تباہ ہونے کا پورا یقین تھا اور یہ کام اسی خوف کی وجہ سے کیا ہے کہ عذاب سے بچ جاؤں۔ اللہ تعالیٰ نے معاف کر دیا اور کہا کہ تمھارا یہ خوف اور ڈر تمھاری بخشش کی وجہ بنا ہے۔[1]

برائی کرتے وقت ہمارے ذہن میں خدا تعالیٰ کا ڈر اور آخرت کا تصور نہیں ہوتا۔ اگر یہ یقین ہو کہ اس دنیا کا کوئی خدا ہے اور مر کر دوبارہ زندہ ہونا ہے اور ہر چیز کا حساب بھی دینا ہے تو پھر برا کام کس طرح ہوسکتا ہے؟

زندگی بعد از موت کے بے شمار شواہد موجود ہیں۔ آخرت کے بے شمار نشانات ہیں، لیکن اس کے باوجود کفار نے اس کو ماننے سے انکار کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس جگہ آسمان و زمین کی پیدایش کی طرف اشارہ کر کے ان کو ذہن نشین کرایا ہے کہ جو ہستی ایسی چیزیں بنا سکتی ہے، وہ انسان کو موت کے بعد دوبارہ زندہ بھی کرسکتی ہے۔

مال و دولت کی کثرت انسان میں سرکشی پیدا کر دیتی ہے۔ ﴿اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰى ۝ اَنْ رَّاٰهُ

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤٧٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٧١٥٧)

اسْتَغْنٰی﴾ [العلق: ٦۔ ٧] اس کی بہتات فواحش کا باعث بنتی ہے اور گناہ میں دلیر بنا دیتی ہے۔ انسان کو اگر مال و دولت کے خزانے مل جائیں تو انسان ان کو روک لیتا ہے۔ اس لیے کہا گیا ہے:

﴿لَوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ﴾ [الإسراء: ١٠٠] اگر تم کو تمام خزانوں کا مالک بنا دیا جائے تو تم ان کو محفوظ کرنے کے لیے روک لو۔ اس طرح دوسروں کے لیے زندگی دوبھر کر دو۔

آپ نے فرمایا: پیغمبر دنیا کے لیے نمونہ ہوتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ کے متعلق احادیث میں آتا ہے کہ آپ کی سخاوت کی مثال ہوا کی سی ہے، جو ہر وقت چلتی ہے۔

آپ کے پاس متعدد مرتبہ بے حساب مال و دولت آیا، لیکن آپ نے فوراً تقسیم کر دیا۔ ایک مرتبہ آپ بیمار ہوئے۔ سرِ مبارک عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے زانو پر تھا۔ آپ نے پوچھا کہ فلاں سونا تقسیم کیا جا چکا ہے یا نہیں؟ حضرت عائشہ نے جواب دیا کہ نہیں تو اسی وقت آپ نے کہا کہ میرا سر تکیے پر رکھ دو اور جا کر سونا تقسیم کر دو۔ انسان کو پورا علم ہوتا ہے کہ یہ خرچ کرنے کا موقع ہے، لیکن خرچ نہیں کرتا۔ محتاج اور مستحق موجود ہوتا ہے اور مال داروں کو اس کا بھی علم ہوتا ہے، لیکن مال و دولت کو روکنے والے ان کی پروا نہیں کرتے۔

خدا سے دعا ہے کہ ہمیں ایسے مال سے بچائے، جو ہمارے لیے آخرت میں رسوا کن ثابت ہو اور آرزو ہے کہ ہم سب کو عملِ صالح کی توفیق عطا کرے۔[1]

[1] سہ روزہ ''منہاج'' لاہور (٢٥ / مارچ ١٩٥٨ء)

ماہِ محرم کی شرعی حیثیت اور ذوالحجہ سے مناسبت

ذوالحج اور محرم الحرام اپنے مابین ایک لطیف مماثلت و مشاکلت رکھتے ہیں۔ جب ان مہینوں میں رونما ہونے والے واقعات پر نظر ڈالی جائے تو یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ یہ مہینے دو عظیم المرتبت پیغمبروں کی فتح مبین اور کامیابی کو ظاہر کرتے ہیں۔ یہ مہینے غم و ناکامی کے نہیں، بلکہ خوشی و فائز المرامی کے ہیں۔ ماہِ ذوالحج حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اسوہ حسنہ کی یاد تازہ کرتا ہے۔ آپ نے کس طرح اپنے والد کو دل نشیں انداز میں تبلیغ فرمائی۔ بتوں کی پرستش اور شیطان کی عبادت سے روکا، لیکن باپ نے نصیحت قبول کرنے کے بجائے سنگسار کرنے کی دھمکی دی۔ پھر آپ نے دعوت کو عام کیا اور پوری قوم کو مخاطب بنا کر یہی تبلیغ انھیں بھی کی، اللہ کے دین کے لیے وطن کو خیر آباد کہا۔ حضرت اسماعیل، حضرت اسحاق اور حضرت لوط علیہم السلام کو مختلف مراکز پر مامور کیا کہ وہ دین کی اشاعت اور توحید کی تبلیغ کو عام کرسکیں۔ بادشاہِ وقت نمرود سے مکالمہ کیا، جو مبہوت و لاجواب ہوگیا۔ بڑھاپے کے عالم میں امنگوں، آرزوؤں اور دعاؤں کے بعد عطا ہونے والے بیٹے کو اللہ کی راہ میں قربان کرنے کے لیے تیار ہوگئے۔ اللہ تعالیٰ نے باپ بیٹے دونوں کی فرماں برداری کا اعلان فرمایا، نیز مناسکِ حج بھی اسی ماہ سے متعلق ہیں۔

محرم الحرام کا مہینا اس لحاظ سے اہمیت کا حامل ہے کہ اس ماہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اسوہ حسنہ کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ فرعون سے مکالمہ، مختلف آزمایشوں کو برداشت کرنا، آپ کا بنی اسرائیل کو مصر سے نکالنا اور معجزانہ طور پر دس محرم کو سمندر پار کرنا اور فرعون کا غرق ہونا، یہ تمام واقعات اسی سے متعلق ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت فرما کر مدینہ طیبہ تشریف لائے تو آپ کو معلوم ہوا کہ یہودی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی یادگار کے طور پر دس محرم کا روزہ رکھتے ہیں تو آپ نے فرمایا: «نَحْنُ أَحَقُّ بِمُوسیٰ مِنکُمْ»[1] نیز آپ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ آیندہ سال بشرطِ زندگی مَیں ۹، ۱۰ر محرم کے روزے رکھوں گا۔ چناں چہ آپ کے زمانہ مبارک تک ۹، ۱۰ر ذوالحج (عرفہ و عید الاضحیٰ) اور ۹، ۱۰ر محرم کی حیثیت دو اولوالعزم پیغمبروں کی یادگار اور خوشی کے دن کے طور پر رہی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا قرآنِ مجید میں یہ ارشاد ہے:

﴿اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا﴾ [المائدۃ: ۳]

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۱۹۰۰) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۱۳۰)

یعنی میں نے تمھارے لیے دین کو مکمل کر دیا اور اپنی نعمت پوری کر دی اور تمھارے لیے اسلام کو بطورِ دین پسند کر لیا۔

نبی کریم ﷺ پر دین کی تکمیل تو ہو چکی، اب کسی کو بھی حک و اضافہ، ترمیم و تنسیخ کا اختیار حاصل نہیں ہے۔ اس لیے جو نیا کام دین میں داخل ہوگا، وہ بدعت کی فہرست میں شمار ہوگا۔ دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ مختلف واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ حادثات پیش آتے ہیں، عہدِ ماضی میں بھی ہوئے اور آیندہ بھی ہوں گے، ان میں صحیح غلط سبھی قسم کے شامل ہیں۔ اللہ کے بندے شہید بھی ہوئے ہیں اور ہوں گے، لیکن ماضی و حال و مستقبل کسی کی بنا پر ہم دین میں کسی نئے مسئلے کو داخل نہیں کر سکتے، ایسا کرنا غلط ہے۔

ذرا غور فرمایئے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کن حالات میں ہوئی، لیکن ان حوادث کو دین کا حصہ قرار نہیں دیا گیا۔

کربلا کے واقعات اور پھر اس تنازع کو آگے تک طول دینا مناسب نہیں، بلکہ ان حوادث سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ ذرا غور فرمایئے کہ یہاں نہ تو مدعی ہے اور نہ مدعا علیہ، نہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا ہیں اور نہ حضرت ابوبکر، نہ حضرت حسن اور نہ حضرت معاویہ، نہ حضرت حسین رضی اللہ عنہم ہیں اور نہ یزید، عقل و دانش کا بھی تقاضا یہی ہے کہ ان کے جھگڑے کو وجہ نزاع نہ بنایا جائے، بلکہ ان واقعات سے کچھ سبق حاصل کیا جائے۔

اسلام حوادث کے بارے میں صبر کی تلقین کرتا ہے، وہ جزع و فزع، سینہ کوبی، بال نوچنا اور بَین کرنے سے منع کرتا ہے۔ چناں چہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے ایک ارشاد مبارک میں ایسا کرنے والے کے بارے میں فرمایا ہے کہ وہ ہم میں سے نہیں۔[1] تعزیہ نکالنا ناجائز ہے۔ اس میں شریک ہو کر اس کی رونق کا باعث بننا گناہ ہے۔ ایسے افراد کی حوصلہ افزائی بھی گناہ سے کم نہیں، سبیل لگانا بھی درست نہیں۔ تعزیے پر چڑھاوے چڑھانا حرام ہے، اس لیے کہ غیر اللہ کے نام صدقہ دینا حرام ہے۔

اللہ کے بندے کو گالیاں دینا غلط ہے۔ حضرت زین العابدین کے سامنے ایک آدمی نے یزید کو گالی دی تو امام صاحب نے فرمایا کہ یزید سے واقعی بڑی غلطی ہوئی ہے، لیکن بہتان طرازی درست نہیں ہے۔ ﴿تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ﴾ [البقرة: ١٣٤]

ہمارے ہاں یہ رسمِ بد چل پڑی ہے کہ محرم میں شادیوں کو بند کر دیا جاتا ہے، جو لوگ اپنے آپ کو اہلِ سنت کہلاتے ہیں، ان کا فرض ہے کہ وہ اس خیالِ فاسد کو ذہنوں سے کھرچنے کی کوشش کریں، نیز یہ خیال کہ اس ماہ میں کی ہوئی شادیاں کامیاب نہیں ہوتیں، اس کی تردید کی جائے۔

---

(1) صحيح البخاري، رقم الحديث (١٢٣٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٣)

اہلِ توحید کو چاہیے کہ وہ عملاً اس غلط رسم کو حرفِ غلط کی طرح مٹانے کی کوشش کریں اور محرم میں شادیاں رچانے کا عزم کریں۔ اسلام نے ماتم کا ایک سلجھا ہوا انداز مقرر فرمایا ہے، جو تمام مومنین کے بارے میں امت نے اختیار کیا ہے، لیکن حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بارے میں ماتم کا جو طرز اختیار کیا جا رہا ہے، وہ غلط ہے اور اسے ختم ہونا چاہیے۔

جس طرح ہم دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم کی شہادتوں کے بارے میں صبر و ضبط سے کام لیتے ہیں، اسی طرزِ عمل کا مظاہرہ آپ رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھی ہونا چاہیے۔

میلاد کی شرعی حیثیت

﴿وَاِذْ قَالَ عِیْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًاۢ بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُوَ يُدْعٰٓى اِلَى الْاِسْلَامِ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ۝ هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ﴾ [الصف: ٦ تا ٩]

ان آیات میں عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو آنے والے رسول کی بشارت دی اور ان کا اسم گرامی بھی بتا دیا۔ اسی وجہ سے بنی اسرائیل اس وقت سے لے کر برابر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے انتظار میں تھے، چنانچہ انھوں نے یحییٰ علیہ السلام سے بھی دریافت کیا: آیا تو وہ نبی ہے؟ تو انھوں نے انکار کر دیا۔ دوسری طرف قبائلِ عرب اپنی باہمی آویزش کی بنا پر شدید منتظر تھے کہ آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت میں ہم اپنے حریفوں پر غالب آ کر سیاسی اور ملکی اقتدار حاصل کر لیں۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی یہ بھی ہے کہ وہ اپنے نومولود بچوں کا نام اس امید پر رکھتے کہ شاید یہی وہ موعود پیغمبر ہو جائے، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت اور ولادت کے درمیانی زمانے میں سات اشخاص محمد نامی ہو چکے ہیں۔ احمد اور محمد دونوں ناموں سے کتبِ سابقہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ ملتا ہے۔

بشارتِ عیسیٰ کی تصدیق:

جب سیدِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں تشریف لائے اور دعوائے نبوت و رسالت کیا تو ایک موقع پر خطبہ دیتے ہوئے فرمایا:

«أنا محمد، وأنا أحمد، وأنا العاقب، و أنا دعاء أبي إبراهيم، و بشارة عيسى»[1]

''میں ہی محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہوں، میں ہی احمد رحمہ اللہ ہوں اور میں ہی سب سے آخر میں آنے والا نبی ہوں۔ میں ہی اپنے باپ ابراہیم علیہ السلام کی دعا کا مظہر ہوں اور عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت ہوں۔''

[1] دیکھیں: صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٣٣٩) صحيح مسلم (٢٣٥٤) مسند أحمد (٤/ ١٢٧)

اس شہرہ و انتظار کے باوجود تاریخِ ولادت میں اختلاف پتا دیتا ہے کہ اس قسم کے موالید اور ایام اسلام کے مزاج سے چنداں مناسبت نہیں رکھتے۔

تاریخِ ولادت میں اختلاف:

آپ ﷺ کی تاریخِ ولادت میں کئی اقوال ملتے ہیں۔ ایک جگہ ربیع الاول کی دو تاریخ مذکور ہے، آٹھ کی بھی صراحت ہے، دس، بارہ، تیرہ اور ستائیس کا بھی ذکر آیا ہے۔ ان سب تاریخوں میں آٹھ ربیع الاول زیادہ راجح ہے۔

روایات متعلقہ ولادت کا غلط ہونا:

آج کل ہمارے واعظین رسولِ کریم ﷺ کی افضلیت و نجابت کے ثبوت کی خاطر جہاں اور بہت سی بے سروپا کہانیاں بیان کرتے ہیں، یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ حضور ﷺ کی والدہ محترمہ حضرت آمنہ نے اپنے بطنِ اطہر سے ولادت کے موقع پر غیر معتاد مناظر دیکھے، اور ایسی بہت سی غیر معمولی باتیں واقعہ ولادت کے ساتھ چسپاں کرتے ہیں۔ ایسی باتوں کی سند پر بحث کرنا فنِ حدیث کا وظیفہ ہے۔ عقلی طور پر اگر سوچا جائے تو مطلع صاف ہوجاتا ہے اور کوئی شک باقی نہیں رہتا، کیونکہ اگر واقعی ایسے غیر معمولی مناظر رونما ہوئے تھے، جیسا کہ یہ وعظ پیشہ حضرات بیان کرتے ہیں، تو تاریخِ ولادت میں اتنا اختلاف کیوں رونما ہوتا؟ آپ ﷺ کی سیرت و تاریخ لکھنے والوں نے جہاں آپ ﷺ کی پوری زندگی قلم بند کر دی، اگر ولادت کے موقع پر کوئی غیر معمولی حادثہ ظہور پذیر ہوتا تو جہاں دوسرے واقعات، مثلاً: ہجرت، غزوات، فتوحات کی تاریخیں بلا اختلاف منضبط ہیں، یہ تاریخ بھی بلا کسی اختلاف کے مذکور ہوتی!!

آنحضرت ﷺ کن معنوں میں نور ہیں؟

جس معنی میں قرآن کو اللہ تعالیٰ نے نور کہا ہے:

﴿وَالنُّوْرِ الَّذِیْٓ اَنْزَلْنَا﴾ [التغابن:٨] ''اس نور پر ایمان لاؤ جس کو ہم نے اُتارا ہے۔''

اس معنی میں ہم پیغمبر علیہ السلام کے نور کے قائل ہیں۔ اگر قرآنِ کریم کے نور سے زمین و آسمان روشن نہیں ہوتے اور نہ ہی قرآن کا نور شمس و قمر کے نور سے مشابہ ہے کہ اس قرآن کی موجودگی میں سورج اور چاند کی کوئی ضرورت نہ رہے تو اسی طرح رسول کریم ﷺ کا نور غیر جسمانی اور معنوی ہے، جس پر کبھی ظلمات غلبہ نہیں کر سکتیں۔ نورِ نبوت کا تعلق زمین و آسمان سے نہیں، جسم اور بدن سے نہیں، اس کا تعلق قلب سے ہے، دماغ اور عقل سے ہے، اخلاقِ فاضلہ اور صفاتِ حسنہ سے ہے۔ ایسا نور جو دنیا اور عقبی دونوں جگہ روشنی کرے، ایسا نور جو کفر و شرک، بدعت و جہالت، تقلید و رسوم پرستی کے اندھیروں سے نکال کر شریعتِ بیضاء، ملتِ غراء، صراطِ مستقیم اور

توحید و سنت کی شاہراہوں تک پہنچا دے۔ یہ سورج کا نور، یہ چاند کی روشنی تو بڑھتی اور گھٹتی ہے، پیدا ہوتی اور فنا ہوتی ہے، موجود بھی ہو تو اس سے دنیا کا صرف ایک ہی حصہ روشن ہوتا ہے اور دوسرا ظلمت کدہ ہی رہتا ہے، لیکن آنحضرت ﷺ کی روشنی سے ایک عالم روشن ہے اور وہ بھی اس طرح کہ وہاں رات بھی دن کی طرح تابندہ ہے، اس لیے آپ ﷺ کے نور کو سورج اور چاند کے نور سے کوئی نسبت ہی نہیں۔

مخالفینِ سنت سے ایک سوال:

جب روز مرہ کے معاملات میں کہیں احادیثِ نبویہ میں اختلاف نظر آئے تو ہمارے اہلِ قرآن بجائے اس کے کہ اس میں کوئی درمیانی صورت نکال کر احادیث میں تطبیق و توفیق کی راہ اختیار کریں، سرے سے حدیث ہی کا انکار کر دیتے ہیں کہ حدیث کوئی شے نہیں، کیونکہ اس میں اختلاف ہے۔ اب اگر یہی اصول تاریخِ ولادت کی مختلف روایات پر چسپاں کیا جائے تو کیا ہمارے دوست فرمائیں گے کہ واقعہ ولادت غلط ہے؟ نعوذ باللہ من ذلك!

اگر کوئی صاحبِ بصیرت مجسٹریٹ کسی واقعہ کی مختلف شہادتوں کو سن کر اصل واقعہ کے انکار کا فیصلہ نہیں دے سکتا، اگر کسی شہر کی آبادی میں مردم شماری کی رپورٹیں مختلف ہوں تو نفسِ آبادی کے انکار کی کوئی گنجایش نہیں نکلتی تو یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک مسئلے میں مختلف روایات دیکھ کر ہم نفسِ حدیث کا حقیقتاً ہی انکار کر بیٹھیں؟ بہر حال روایاتِ ولادت کا اختلاف مخالف دوستوں اور ہمارے نعت خواں اصحاب کے لیے غور طلب حقیقت ہے۔

میلاد کا شرعی مقام:

شریعت کو کسی بڑے سے بڑے انسان کی موت و حیات سے اس طرح کی کوئی دلچسپی نہیں ہے کہ عبادت اور ثواب سمجھ کر اس کی سالگرہ منائی جائے اور عید میلاد منعقد کی جائے، یا نوحہ و ماتم کر کے اظہارِ غم کیا جائے۔ آخر اتنے انبیا و اصفیا عالمِ شہود میں آئے اور بے شمار نہایت بے دردی سے شہید کر دیے گئے، اب اگر ہم ایک ایک کی عید میلاد منائیں یا ایک ایک کا ماتم کریں تو دن میں کئی بار تو میلاد کی محفلیں سجانا پڑیں اور کئی بار غم و اندوہ کا اہتمام کرنا پڑے۔

یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ کی رسالت کا تئیس سال کا زمانہ اور خلافت کا تیس سال کا عرصہ ایک نگاہ سے دیکھ جائیں، کہیں بھی آپ کو ایسی کوئی تقریب نظر نہیں آئے گی، نہ خود شارع علیہ السلام نے اپنی سالگرہ منائی اور نہ اپنے اکابر و اجداد کی کوئی عید میلاد منعقد کی اور نہ ہی صحابہ کرام نے ایسا کوئی ڈھونگ رچایا، سوائے دو عیدوں کے وہاں کوئی تیسری عید نظر نہیں آتی۔ عید میلاد کا اہتمام تو کجا ان میں سے کسی کو یہ خیال بھی نہیں آیا کہ یہ بھی کوئی ثواب کا کام ہے، حالانکہ ہم محبتِ نبوی ﷺ میں صحابہ کرام کی گردِ راہ تک بھی نہیں پہنچ سکتے۔

عید میلاد کو سب سے پہلے سلطان ابوسعید علی بن سبکتگین نے چھٹی صدی ہجری میں شروع کیا۔ بعد میں جب مصر پر سنیوں کا غلبہ ہوا تو یہ لعنت ختم ہوئی، پھر سلطان مظفر نے چھٹی صدی ہجری کے آخر میں اس کو شروع کیا۔ سلطان مذکور بہت سادہ لوح اور جذباتی آدمی تھا۔ میلاد کی تقریب منانے کے لیے ماہِ صفر میں تیاری شروع کر دیتا۔ ہر قسم کے قوال، گانے بجانے اور غزل خواں واعظ اکٹھے ہوجاتے اور بے شمار قسم کے کھانے پکائے جاتے، پھر رفتہ رفتہ یہی فتنہ طول پکڑتا ہوا عید بن گیا، بعد ازاں جب زنا کاری اور بدمعاشی جیسے نتائجِ بد سامنے آئے تو سلطان کو یہ تقریب بند کر دینی پڑی۔

ہندوستان میں جہاں اور بہت سی بدعتیں فتوحاتِ اسلامیہ کے بعد آئیں، محفلِ میلاد بھی اپنے تمام لوازم کے ساتھ سارے ملک میں چھا گئی۔ جاہل ملاؤں اور خود غرض سیدوں نے اس کی نزاکتِ شان سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس بدعت کو خوب ہوا دی۔ قرآنی آیات کی تحریف اور ترمیم کر کے احادیث کے عمومات کو غلط موقع پر محمول کرتے ہوئے اس کے جواز کی کوشش کی گئی۔ محبتِ رسول ﷺ کا نام لے کر جذبات کو اس قدر اچھالا گیا کہ یہ رسم ایک میلہ اور ہنگامہ وتماشا بن کر رہ گئی۔

محبت کا معیار:

محبت کا معیار نعرہ بازی نہیں اور نہ عشق کا تقاضا ریا کاری اور دکھلاوا ہے۔ محبت زمانی اور مکانی نہیں ہوتی۔ الفت دائمی تعلق کا نام ہے، جو عاشق کے دل پر اور اس کی زندگی پر ہمیشہ کے لیے غالب رہے۔ محبتِ رسول ﷺ کا نعرہ لگانا آسان ہے، لیکن محبّ بننا مشکل۔ اگر محبّ بننا ہو تو صحابہ کرام، مہاجرینِ عظام، انصارِ مدینہ، شہدائے احد، مجاہدینِ بدر اور خصوصاً مکی زندگی میں اسلام قبول کرنے والے فرشتہ سیرت لوگوں کی شیفتگی اور والہانہ عقیدت اور سراپا جاں نثاری سے سبق لینا ہوگا۔ محبت موسمی چیز نہیں کہ ربیع الاول میں تو سیلاب بن کر آئے اور باقی سارا سال آپ کو احساس تک نہ ہو کہ آپ کا کوئی رسول بھی ہے!!

محبتِ رسول ﷺ کی آڑ میں لیڈروں کی سیاسی چالیں:

جن لوگوں کو نماز روزے سے کوئی واسطہ نہیں، اور یہی نہیں بلکہ سارے اسلام سے بھی دور کا تعلق نہیں، مگر اس کے باوجود جاہل عوام سے ووٹ کے خواہشمند ہیں، تاکہ سیاسی اقتدار حاصل کریں، ایسے حضرات اپنے اسلام کی نمایش کے لیے کبھی عید میلاد کا ڈھونگ رچا دیتے ہیں، کبھی معراج کا نام لے کر کوئی ہنگامہ اور شور برپا کیا جاتا ہے، حالانکہ ان مراسم کی حیثیت اسلام میں ریا کاری اور تماشے سے زیادہ نہیں۔ اسی حقیقت کو قرآنِ کریم نے دین کو کھیل اور تماشا بنانے سے تعبیر کیا ہے۔ ایسے اقدامات سے ان کا مطلب تو پورا ہو جاتا ہے، مگر اسلام کو ان جلوسوں سے کوئی

فائدہ نہیں پہنچتا۔ کاش یہی مال اور روپیا جو ان فضول اور غیر ضروری کاموں پر خرچ ہو رہا ہے، غربا و مساکین پر خرچ ہوتا یا اس روپے سے سیرت کی کتابیں خرید کر مفت تقسیم کی جاتیں، تاکہ عوام کا ذہن درست ہو اور ان میں اسوۂ رسول ﷺ کی اشاعت ہو یا اشاعتِ کتاب و سنت کے دوسرے کاموں پر اس کو خرچ کیا جاتا تو بلاشبہہ یہ ایک کام ہوتا۔

رہ گئی وہ قوم جو اپنے مقصدِ حیات کو فراموش کر بیٹھی ہے، جو ساٹھ ہزار مساجد کو ویران چھوڑ کر یہاں اس لیے آئی ہے، تاکہ میلاد کا جلوس نکال کر سیاسی اقتدار حاصل کرے تو ایسی قوم کا خدا ہی حافظ ہے، اور پھر جس قوم کے لیڈر رسول اللہ ﷺ کا نام لے کر اپنی لیڈری چمکائیں اور جو زبان پر رسول اللہ ﷺ کا نام بار بار لائیں، مگر جب ووٹ کا وقت آئے تو قوم اور اس کے لیڈروں کی ہمدردیاں حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ نہ ہوں، بلکہ یزید کے ساتھ ہوں تو ایسے لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ سے ہدایت کی دعا ہی کی جا سکتی ہے!![1]

[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۶ر جنوری ۱۹۵۰ء)

میلاد النبی ﷺ
(پریس کانفرنس)

۲۸؍ جولائی کو گوجرانوالہ میں مولانا محمد اسماعیل صاحب امیر مرکزی جمعیت اہلِ حدیث مغربی پاکستان نے ایک پریس کانفرنس منعقد کی۔ اس کانفرنس میں مولانا نے میلاد النبی ﷺ کی تقریب کے انعقاد کے بارے میں پانچ تجاویز پیش کیں۔ مولانا نے کہا:

رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ اقدس اس دنیا کی عظیم ترین ہستی تھی، آپ ﷺ کی ولادت کی تقریب کو غلط اور خلافِ شرع طریقے سے منایا جا رہا ہے۔ آپ ﷺ کی شانِ بلند کا اس میں خیال نہیں رکھا جاتا۔

انھوں نے فرمایا: راستوں کو اس انداز سے روکا نہ جائے کہ آمد و رفت میں تعطل پیدا ہو جائے اور ٹریفک کے ذرائع ختم ہو کر رہ جائیں۔

مولانا نے تجویز پیش کی کہ میلاد النبی ﷺ کے موقع پر بازاروں اور راستوں کی زیبایش پر جو کچھ خرچ کیا جاتا ہے، اس میں متوازن اور معتدل رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ یہ روپے اگر رفاہی کاموں پر خرچ کیے جائیں تو اس کی افادی حیثیت زیادہ ہوگی اور منافع کے پہلو پائیدار ہوں گے۔

مولانا نے فرمایا: میلاد النبی ﷺ کے نام پر ایک خاص فرقے کے لوگ میدان میں اتر آتے ہیں، وہ اپنی تقریروں میں دوسرے مکاتبِ فکر کے حاملین کے جذبات کو مجروح کرتے اور ان کے خلاف نفرت پھیلاتے ہیں، اس طرح یہ ملک کی سالمیت پر ضرب لگاتے اور لوگوں میں اشتعال پیدا کرتے ہیں، انھیں روکنا چاہیے۔

مولانا نے فرمایا: جلوس کے بعض نوجوان افراد خواتین پر آوازے کستے اور ان کو تنگ کرتے ہیں، جس سے اخلاقی انارکی کے لیے فضا ہموار ہوتی ہے، اس موقع پر عورتوں کا بازار میں آنا ممنوع قرار دیا جائے۔

مولانا نے کہا: بعض لوگ اس تقریب پر فلمی گانوں کے ریکارڈ لگا دیتے ہیں، جو آنحضرت ﷺ (فداہ ابی وامی) کی سراسر توہین ہے۔

یہ پریس کانفرنس ستارہ فیکٹری گوجرانوالہ میں منعقد ہوئی، جس میں لاہور اور گوجرانوالہ کے مدیران و نمائندگانِ جرائد کے علاوہ جماعتِ اہلِ حدیث اور شہر کے معززین خاصی تعداد میں شامل تھے جن میں مولانا عبداللہ صاحب، مولانا محمد چراغ صاحب، میاں عبدالستار صاحب (امیر جمعیت اہلِ حدیث گوجرانوالہ) جناب اسماعیل صاحب

ضیا (رکن مجلسِ عاملہ جمعیت اہلِ حدیث گوجرانوالہ) منشی محمد یوسف صاحب (نائب ناظم جمعیت اہلِ حدیث گوجرانوالہ) شیخ محمد یوسف صاحب (خازن مقامی جمعیت) حاجی عبدالکریم صاحب (امیر جمعیت اہلِ حدیث گوجرانوالہ) عبدالعزیز، ذوالفقار، رفیق انور صاحب (ایشیا فین) نذیر احمد صاحب، جناب بشیر احمد صاحب ایڈووکیٹ، عبدالوہاب صاحب اور حکیم عبدالرحمٰن صاحب قابلِ ذکر ہیں۔

پریس کانفرنس میں مولانا محمد اسماعیل (امیر جمعیت اہلِ حدیث مغربی پاکستان) کے بیان کا مکمل متن مندرجہ ذیل ہے:

پاکستان ایک اہم جمہوری ملک ہے اور اس کی بنیاد اسلام پر رکھی گئی ہے، اس لیے ضروری ہے کہ اس کی تمام تقریبات اور نظام میں جمہور کی خیر خواہی اور اسلام کی سربلندی کا خیال رکھا جائے۔ پاکستان میں میلاد النبی (ﷺ) کی تقریب ہر سال منائی جاتی ہے، اس تقریب کو عوام اور اربابِ حل وعقد جس دینی اور سیاسی ذہن سے مناتے ہیں، ضروری ہے کہ اس کے تمام پہلوؤں پر ابتدا ہی سے نظر رکھی جائے، تاکہ کسی کو کوئی دقت پیش نہ آئے۔ نظم ونسق کو قائم رکھنے کے سلسلے میں مندرجہ ذیل امور قابلِ غور ہیں:

1. بازاروں کی زیبائش اور محرابوں کی ساخت میں اس چیز کو پیشِ نگاہ رکھا جائے کہ ٹریفک اور آمد ورفت کے ذرائع پر کوئی اثر نہ پڑے، یا کم سے کم اثر پڑے۔ لاہور کی ایک اطلاع میں بتایا گیا ہے کہ ایک بار عورت کو ہسپتال پہنچانا تھا، مگر اسے ہسپتال پہنچانے کے لیے کوئی قریبی راستہ نہ مل سکا اور وہ جان بحق ہوگئی۔ منت سماجت کے باوجود منتظمین اسے راستہ دینے پر آمادہ نہ ہوئے۔ (پاکستان ٹائمز، ۲۵ جولائی ۱۹۶۴ء)
2. مصارف میں اعتدال ملحوظ رکھا جائے۔ ایک ایسا ملک جو اپنے تعمیری امور کو سرانجام دینے کے لیے دولت مند ممالک کا منت پذیر ہو، اور جس میں غربت و افلاس کی کمی نہ ہو، اس کے دانشوروں کو اس مسئلے پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے کہ اس کی تقریبات سادہ ہوں اور روپیا تعلیمی یا رفاہی اداروں پر صَرف کیا جائے، جس سے مستقل فائدہ حاصل ہو۔
3. میلاد النبی ﷺ کے جلوس کی آرائش وزیبائش کو دیکھنے کے لیے خواتین بھی گھروں سے باہر نکل آتی ہیں، لیکن اس سال بعض مقامات پر ان کے ساتھ سلوک کی جو اطلاعات موصول ہوئی ہیں، اس سے گردن جھک جاتی ہے۔ مسلمان نوجوانوں کا اس مقدس تقریب میں خواتین سے چھیڑ چھاڑ کا یہ رجحان انتہائی قابلِ مذمت ہے۔ عورتیں زیادہ تر روشنی کے لیے آتی ہیں، اس لیے یا تو روشنی کا حصہ حذف ہونا چاہیے یا پھر رات کو عورتوں کا آنا بند ہونا چاہیے۔ اگر اس طرف توجہ نہ دی گئی تو نتیجتاً اخلاقی انارکی پھیلنے کا اندیشہ ہے۔
4. پاکستان میں مختلف مکاتبِ فکر کے حامل لوگ پائے جاتے ہیں، اس لیے میلاد النبی ﷺ کے جلوسوں اور

تقریب کا نظام صرف انھیں ہاتھوں میں نہیں ہونا چاہیے، جو اسے اپنے نقطہ فکر کی تبلیغ کا ذریعہ بنا لیتے ہیں اور دوسروں کے خلاف نفرت پیدا کرتے ہیں، چنانچہ اس سال بعض مقامات پر حضرت مولانا اسماعیل شہید دہلوی رحمہ اللہ اور شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن کے خلاف بہت غلط جذبات کا اظہار کیا گیا۔ (کوہستان: ۷/۶۴۔۶۶)

یہ حرکت انتہائی مذموم ہے۔ ایک خاص مکتبِ فکر کے حامل گروہ نے بعض مساجد کے سامنے جلوس دیر تک ٹھہرائے رکھا اور ان کے مقرر چیلنج بازی کرتے رہے اور ایسے جذبات کا اظہار کرتے رہے، جن سے ذہنوں میں اشتعال پیدا ہوتا ہے۔ یہ چیز امنِ عامہ کے لیے خطرناک ہے، اس کی اصلاح نہایت ضروری ہے، اس کی ایک صورت یہ ہے کہ جلوس کا نظم و نسق معتدل، امن پسند اور معاملہ فہم حضرات کے ہاتھوں میں ہونا چاہیے۔ فرقہ پرور عنصر کو اس سے بالکل الگ رکھنا چاہیے۔ تقاریر صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ پر ہوں، ان میں مناظرات اور چیلنج بازی کا انداز قطعاً نہ ہو۔

5 جلوس میں بعض جگہ فلمی گانے ریکارڈ کیے گئے، یہ بات اس تقریب کی تقدیس کے بالکل منافی ہے۔

حاجی محمد دین (نیشنل فین) کی تجویز کے مطابق جلوس کے لوگ باوضو اور درود شریف پڑھتے جائیں اور جلوس اسی پر اختتام پذیر ہو۔

جب مولانا محمد اسماعیل صاحب (امیر مرکزی جمعیت اہل حدیث مغربی پاکستان) پریس کانفرنس میں یہ بیان، جو تحریری صورت میں تھا، پڑھ چکے تو ان سے نمائندگانِ جرائد نے متعدد سوالات کیے، جو مع جواب کے درج ذیل کیے جاتے ہیں:

سوال میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

جواب میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے، نہ صحابہ کرام کے زمانے میں یہ تقریب منائی گئی، نہ تابعین اور نہ تبع تابعین کے دَور میں اس کا وجود ملتا ہے، نہ ائمہ کرام نے اس کی ضرورت محسوس کی، نہ فقہا میں سے کسی نے اس کی اہمیت بیان کی۔ یہ چیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے چھے سو سال بعد عالمِ وجود میں آئی۔ ایک بادشاہ مظفر الدین کوکبوری بن اربل نے ۶۳۰ھ میں موصل میں اس کی ابتدا کی، مگر اس میں قوالی وغیرہ بالکل نہ تھی اور نہ کوئی اور برائی پائی جاتی تھی، لیکن اس دور کے علمائے کرام کے لیے یہ بات بھی ناقابلِ برداشت تھی، اس کی بھی مخالفت کی گئی اور اس کے خلاف سب سے پہلے ابن الحاج نے آواز بلند کی۔

سوال میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے موقع پر جو تقریریں کی جاتی ہیں، کیا ان میں کسی مسلکِ فکر کی مخالفت کی جاتی ہے؟

جواب ایک خاص گروہ کے حاملین نے اس کو دوسروں کی مخالفت کا ذریعہ بنا لیا ہے۔ یہ کتنی مذموم حرکت ہے کہ

باٹاپور میں ایک خاص مکتبِ فکر کے حامل مقرر نے حضرت مولانا اسماعیل شہید دہلوی رحمہ اللہ اور شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمہ اللہ کو ہدفِ تنقید ٹھہرایا، حالانکہ یہ دونوں بزرگ بہت بڑے عالم، بہت بڑے مجاہد اور بہت متقی و پرہیزگار تھے، اور ان کے معتقدین بھی بہت بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں اور اس سے ان کے دل مجروح ہوتے ہیں، لیکن مخالفین کو اس بات کا کوئی احساس نہیں ہے۔ ان کی اس قسم کی تقریریں ملک کی سالمیت اور وحدت کے لیے خطرہ ہیں۔ ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس وقت ملک کو اتحاد و اتفاق کی سخت ضرورت ہے اور اسی سے ملک ترقی کی منزلیں طے کر سکتا ہے۔ ہماری ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ ملک میں اتحاد کی فضا پیدا کی جائے اور اختلاف و افتراق کا کلیتًا خاتمہ کر دیا جائے۔ یہ لوگ میلاد النبی ﷺ کی تقریب کو دوسروں کی مخالفت کے لیے استعمال کرتے ہیں اور حالات کی رفتار کا بالکل خیال نہیں رکھتے۔

سوال کیا آپ نے بحیثیتِ جماعت کے کبھی تمام مسالکِ فکر کے حاملین کو متحد کرنے کی کوشش کی؟

جواب ہم نے جماعتی طور سے تمام جماعتوں میں اتحاد پیدا کرنے کی بارہا کوششیں کیں۔ اس ضمن میں ہم نے سب سے پہلا قدم اپریل ۱۹۵۵ء میں اٹھایا۔ اپریل ۱۹۵۵ء میں مرکزی جمعیت اہلِ حدیث مغربی پاکستان کی تیسری سالانہ کانفرنس لائل پور میں منعقد ہوئی تھی۔ اس میں اتحاد کے متعلق ایک طویل قرارداد منظور کی گئی، جس میں تمام جماعتوں اور اسلام پسند عناصر کو متحد رہنے کی اپیل کی گئی تھی اور کہا گیا تھا کہ اپنے اپنے مسالک پر قائم رہتے ہوئے ملک سے برائی اور فحاشی و عریانی کو ختم کرنے کے لیے تمام جماعتیں اکٹھی ہو جائیں۔ اس ضمن میں ہم نے جمعیت کے مرکزی دفتر لاہور میں تمام جماعتوں کے علما و زعما کا ایک اجتماع بھی بلایا تھا۔ حضرت مولانا سید محمد داود غزنوی رحمہ اللہ نے اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اپنی تمام کوششیں صَرف فرما دی تھیں، اس کے بعد اپنے تمام سالانہ اجتماعات اور مجالسِ شوریٰ میں ہم اس مسئلے کو موضوعِ فکر ٹھہراتے اور سب کو متفق ہونے کی اپیل کرتے رہے۔ نومبر ۱۹۶۲ء میں لاہور میں مرکزی جمعیت کی سالانہ کانفرنس کا انعقاد عمل میں آیا تو اس وقت بھی اس تجویز کا اعادہ کیا گیا۔

بہر حال جہاں تک جماعتِ اہلِ حدیث کا تعلق ہے، ہم نے حالات کی رفتار پر ہمیشہ نگاہ رکھی ہے اور ملک جس دَور سے گزر رہا ہے، وہ دَور ہمارے پیشِ نظر رہا ہے، اس کے تقاضوں کو ہم خوب سمجھتے ہیں، اس لیے ہماری یہ نپی تلی رائے ہے کہ پاکستان کی ترقی کے لیے سب جماعتوں کا اتحاد نہایت ضروری ہے اور علما کا فرض ہے کہ کسی کے خلاف کچھ نہ کہیں۔ مثبت انداز میں اپنا نقطہ بیان کریں۔ یہ دَور کسی کے دل مجروح کرنے اور فروعی اختلافات کو ہوا دینے کا نہیں ہے۔ اس وقت ہم بہت سے مسائل میں گھرے ہوئے ہیں، ان کی اہمیت کا تقاضا ہے

کہ ہم ایک دوسرے پر کیچڑ اُچھالنا بند کر دیں اور وہی راستہ اختیار کریں جو ہمیں اتفاق کی منزل تک پہنچا دے، ہم متحد ہو کر ملک کی خدمت کر سکیں۔ علما کا آپس میں لڑنا اور دینی جماعتوں کا ایک دوسرے کے گریبانوں پر ہاتھ ڈالنا، انتہائی قابلِ مذمت فعل ہے۔

مولانا نے سلسلہ بیان جاری رکھتے ہوئے کہا کہ ہم اخبارات کے ممنون ہیں کہ انھوں نے ہمیشہ ہماری ان مصالحانہ مساعی کو سراہا ہے اور ہماری تگ و تاز کی تحسین کی ہے۔[1]

[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۱۷/ اگست ۱۹۶۴ء)

اتفاق واتحاد کی راہیں[1]

﴿لَقَدْ جَآءَ كُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَ هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ﴾ [التوبة: ۱۲۸۔ ۱۲۹]

اجتماعیت کی ضرورت:

ہم ایک ایسے دور سے گزر رہے ہیں، جس میں اجتماعیت کی زیادہ سے زیادہ ضرورت ہے۔ وقت ایسا ہے کہ مسلمان سر جوڑ کر مل بیٹھیں اور اپنی اجتماعی، قومی، وطنی، ملی ضرورتوں کو سوچیں۔ اختلاف دنیا میں رہا ہے، رہے گا، اس کا کلی طور پر اُٹھ جانا بظاہر مشکل ہے۔ ان حالات میں مختلف گروہ اور جماعتیں ان اختلاف کی موجودگی میں بھی اپنے مشترک اور اجتماعی مسئلوں پر سوچنے کے لیے ملیں تو ملک کی خوش قسمتی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ مذہب کا بھی اس میں فائدہ ہے۔

آپ دنیا اور دنیا پرست لوگوں کے حالات کو دیکھیں۔ وہ آپس میں انتہائی مخالفت، مخاصمت اور دشمنی کے باوجود مشترک کاموں میں اکٹھا سوچتے ہیں۔ دنیا کے دو طاقت ور گروہ: رشیا اور مغرب؛ آپس میں سب جانتے ہیں کہ باہم بے حد رقابت ہے، دشمنی ہے، لیکن اس کے باوجود جب کوئی ایسا مسئلہ آئے، جس کا اثر دونوں پر پڑے تو ان کے بڑے لوگ اکٹھے ہوتے ہیں، سوچتے ہیں، کوئی نہ کوئی حل نکالتے ہیں۔ ہمارا اس ملک میں یہ حال ہے کہ روز بہ روز اجتماعی مسائل بڑھ رہے ہیں۔ یہ ضرورت روز بہ روز زیادہ ہو رہی ہے کہ ہم اپنے مسائل کو سر جوڑ کر سوچنے کی کوشش کریں۔ سیاسی حالات، بیرونی دنیا کے ساتھ تعلقات، اندرون مسلم ممالک کے بعض مسئلے، ہندوستان، افغانستان کی غلط روی؛ یہ ایسے مسائل ہیں، جو صرف حکومت پر نہیں، ہم لوگوں پر بھی کسی نہ کسی مقام پر ان کا اثر ہوتا ہے اور ان چیزوں پر سوچنے کے لیے ایک اجتماعی دماغ اور ذہن ہونا چاہیے۔ لیکن اسے بد نصیبی سمجھیے کہ اس وقت تک ملک میں کوئی ایسی صورت نہیں پیدا ہو سکی کہ مختلف لوگ اکٹھا سوچنے کی کوشش کریں۔

سیاسی مسائل تو بڑی بات ہے، معمولی فروعی مسائل، فقہی مسائل اور اس سے زیادہ کچھ ایسے مسائل جن

[1] سہ روزہ کانفرنس ۱۹۶۱ء منعقدہ موچی دروازہ لاہور۔

میں اگر ذرا تحقیق اور سوچ سے دیکھا جائے تو الفاظ کی ہیر پھیر کے سوا اختلاف کی کوئی بنیاد نہیں، ہم ان چند لفظوں کی ہیرا پھیری میں اتنا بگڑتے ہیں کہ ایک دوسرے کو گوارہ نہیں کرتے۔ آپ مجھے برداشت نہیں کرتے، میں اور دوستوں کو برداشت نہیں کرتا۔ یہ ملک کی بد قسمتی ہے اور اس معاملے میں تعجب انگیز صورت یہ ہے کہ ان اختلافات میں وہ لوگ پیش پیش ہیں، جن کو اتحاد کی دعوت میں پیش پیش ہونا چاہیے تھا، میری مراد اس سے حضرات علمائے کرام ہیں۔

غیر مسلموں کو دعوت:

ہماری ابتدائی زندگی سے یہ اتحاد کی دعوت مساجد کے مقام سے ہوئی ہے۔ مختلف اسلامی گروہوں کو ہی نہیں، بلکہ غیر مسلموں کو مساجد میں دعوت دی گئی ہے۔ ﴿یٰٓاَھْلَ الْکِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَۃٍ سَوَآءٍ بَیْنَنَا وَ بَیْنَکُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰہَ وَ لَا نُشْرِکَ بِہٖ شَیْئًا﴾ [آل عمران: ٦٤] حضرت محمد رسول اللہ (ﷺ) کی مبارک زبان سے مدینے کے منبر سے یہ آواز اسلام کے دشمنوں اور اُن مخالفین کو دی گئی، جن کے ساتھ اساسی اختلافات تھے۔ ان کو بھی فرمایا ہے کہ ﴿تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَۃٍ سَوَآءٍ بَیْنَنَا وَ بَیْنَکُمْ﴾ کہ اجتماعی مسائل جو ہمارے اور آپ کے یکساں ہیں، ان پر سوچنے کے لیے آؤ۔ ﴿اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰہَ وَ لَا نُشْرِکَ بِہٖ شَیْئًا﴾ خدا ایک کی عبادت اور اس میں شرک کی نفی؛ اس پر ہم دونوں اور مختلف لوگ مل کر باہم سوچنے کی کوشش کریں۔ یہ آواز سب سے بڑے منبر اور ایسے پاکباز انسان کی زبان سے نکلی، جس سے بڑا آدمی اور زیادہ پاک باز ساری دنیا میں کوئی نہیں۔ صلی اللّٰہ وعلیٰ آله وأصحابه وسلم.

اگر آنحضرت ﷺ یہ دعوت دے سکتے ہیں اور اس دعوت کے مخاطب یہود اور نصاریٰ کو بنا سکتے ہیں تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ ہمارے اختلافات تو اس سے بہت کم ہیں۔ میں اور لاہور کے بعض دوست اتنے دور نہیں ہیں، جتنے کہ یہودی اور عیسائی۔ آپ نے مسئلہ سنا ہوگا کہ ایک دفعہ آنحضرت (ﷺ) کی مسجد میں ایک شخص گرفتار ہو کر آئے، جن کا نام ثمامہ بن اثال تھا۔ یہ غیر مسلم تھے۔ آنحضرت ﷺ نے ان کو اپنی مسجد میں جگہ دی اور کئی دن تک ان کو مسجد میں رکھا،[1] جس کا معنی ہے کہ آنحضرت ﷺ کا ذہن بڑا وسیع، دل بہت کھلا تھا۔ غیر مسلم کو اپنے قریب جگہ دی اور انھیں مشاہدے کا موقع دیا اور اس کا اثر کیا ہوا کہ چند دن کے بعد اس کا ذہن بدلا اور وہ بہترین مسلمان ہوگیا۔ تو میں سمجھتا ہوں کہ ہم لوگوں کو اس طرح سوچنے کی عادت سیکھنی چاہیے۔ یہ آپ سے نہیں گزارش کر رہا۔ آپ اس معاملے میں دوسرے نمبر پر ہیں۔ میں ان دوستوں سے گزارش کر رہا ہوں، اگر وہ سنیں

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٤١١٤) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٧٦٤)

یا ان تک یہ آواز پہنچے، جن کے پاس منبر ہے، جن کے پاس زبان ہے، جن کے پاس علم ہے۔ وہ علم کی روشنی میں زبان کی قوت کے ساتھ مسلمانوں کو اکٹھا کرنے کی کوشش کریں۔ اصل مقام یہی ہے۔

اختلافات کی نوعیت:

اور جیسے میں نے عرض کیا کہ اختلاف رہا ہے، رہے گا۔ ان اختلافات کو کسی مقام کے لیے رکھیے، جب اس کا وقت ہو جائے۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہم مختلف مسلمان گروہ بڑے عرصے سے آپس میں جھگڑ رہے ہیں، لیکن ہم میں سے کوئی کسی دوسرے کو اب تک مٹا نہیں سکا، بلکہ جتنی کسی کی زیادہ نمایاں مخالفت کی گئی، وہ اتنا بڑھا ہے۔ اس لیے محض یہ ہنگامہ آرائی اور اختلاف نوازی؛ یہ کوئی مشغلہ ہے؟

اسے یوں سمجھیے کہ انسان کے جسم کو دو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے، عام طور پر وہ غذا کھاتا ہے اور اس کی زندگی کا انحصار غذا پر ہے۔ دو وقت، تین وقت، چار وقت، جتنا معدہ برداشت کرے، وہ کھانا کھائے، اس کی صحت پر اثر، اس کی قوت پر اثر، یہ اس کی ضرورت کی چیزیں ہیں، لیکن اسی جسم میں جب کوئی خرابی پیدا ہو تو پھر دوا کھائی جاتی ہے۔ دونوں چیزیں زندگی کے لیے ضروری ہیں۔ لیکن غذا اصل چیز ہے، دوا ضرورت کے وقت۔ لڑائی جھگڑا یہ بھی ایک چیز ہے، کبھی اس کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن وہ دوا ہے، غذا نہیں ہے۔ اب اس وقت میں یہ سوچ رہا ہوں کہ ہم میں سے بعض علما اور بعض بزرگ وہ لڑائی کو غذا سمجھ رہے ہیں اور صلح کو دوا سمجھ رہے ہیں۔ وہ جب سٹیج پر آئیں، ان کا فرض ہوتا ہے کہ کسی نہ کسی کو چھیڑیں اور جب ان کی زبان ہلے، وہ چار پانچ چھے سو دو سو چار سو کو کافر کرلیں۔ پھر وہ سمجھتے ہیں کہ میں نے کام کیا۔ اگر فتویٰ اس سے کم ہو تو وہ سمجھتے ہیں کہ ہوا کچھ نہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ ذہن اچھا نہیں۔ ہمیں اِکفار و تکفیر کو کسی وقت کے لیے رکھنا چاہیے، لیکن ایک دوسرے کو قریب سے سمجھنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ لیکن بدنصیبی یہ ہے کہ اس ضرورت کے باوجود اس وقت تک ملک میں کوئی ایسا ذہن نہیں پیدا ہو سکا۔ اس کا ایک سبب تو یہ بھی تھا کہ آج سے کچھ وقت پہلے اس ملک میں ایک اجنبی حکومت برسرِ اقتدار تھی۔ ان کا ایک مقصد یہ تھا کہ ملک میں مختلف فرقے آپس میں جھگڑیں اور ان کا وقت، ان کی طاقتیں باہم جھگڑوں میں ختم ہوں اور ہم آرام سے حکومت کریں۔ اب انھوں نے ہم لوگوں کو عادی بنا دیا ہے کہ ہم باہم لڑتے رہیں، لیکن آپ یقین کریں کہ اب وہ وقت گزر چکا۔

جہاں تک میرا خیال ہے، موجودہ حکومت یہ ہرگز نہیں چاہتی کہ مسلمانوں کی مختلف جماعتیں لڑیں۔ توازن کے لیے ان جماعتوں کو اپنے اپنے مقام پر رکھنے کے لیے انھوں نے کیا کیا ہے؟ یہ مسئلہ بحث کا نہیں، یہ سوچنے کی چیز ہے کہ اس طرح ہم لوگوں کی مساعی کہاں تک صحیح اور کارفرما ہیں، لیکن اس میں کوئی شک نہیں

ہے کہ جہاں تک ان چند سالوں میں کچھ عرصے میں ہم نے دیکھا کہ موجودہ حکومت کا منشا یہ ہے کہ مسلمان مختلف گروہ آپس میں نہ لڑیں، ایک دوسرے کی عیب جوئی سے اجتناب کیا جائے۔

مَیں سمجھتا ہوں یہ جذبہ صحیح ہے، ہمیں اس سے فائدہ اُٹھانا چاہیے۔ میں آپ کے سامنے کھڑا ہوں، میں کیا ہوں؟ اپنے متعلق میں اپنا عندیہ آپ سے عرض کروں۔ اس کا مجھے حق ہے، اگر مجھ میں کوئی خوبی ہے تو میں اس خوبی کا تذکرہ آپ سے کروں کہ مجھ میں یہ اچھائی ہے، لیکن میں نے کوئی خدمت آپ کی کی ہے یا ملک کی کی ہے تو میں آپ سے یہ عرض کروں کہ فلاں بڑا بے ایمان ہے۔ اس نے ایسا کیا ہے۔ اس کا کوئی خاص فائدہ نہیں۔ اس سے تنفر بڑھے گا۔ حاصل کچھ نہیں ہوگا۔ اس لیے مَیں سمجھتا ہوں کہ ہمیں ان اختلافات کے باوجود ایک دوسرے کے قریب ہو کر سمجھنا چاہیے۔

ایک مشکل یہ ہمارے ملک میں آرہی ہے کہ جب ہم ایک دوسرے کی ترجمانی کرتے ہیں کہ فلاں کا یہ خیال ہے تو وہ دوسرے کا مذہب میں اپنی زبان سے ایسے لفظوں میں بیان کرتا ہوں کہ جن لفظوں کو وہ دوسرا پسند نہیں کرتا۔ بسا اوقات وہ کہتا ہے کہ ہمارا یہ مذہب ہی نہیں، اگر ہم اپنی ہی ترجمانی کریں، دوسرے کی نہ کریں۔ دوسرا اپنی ترجمانی خود کرے، پھر میں سمجھتا ہوں شاید اس میں فائدہ ہو اور ہم قریب ہوں۔

آنحضرت ﷺ کا مقام اور نظریات کی ترجمانی:

میں جہاں تک سمجھتا ہوں، کوئی شخص مسلمانوں میں سے ایسا نہیں ہے، جو آنحضرت ﷺ کو اپنے بھائی کے برابر قابلِ ادب سمجھے۔ گو بھائی بھی ادب کا مقام ہے، لیکن جہاں تک آنحضرت ﷺ کا مقام ہے، وہ بھائی اور باپ دونوں سے اونچا ہے۔ باپ کی رائے سے اختلاف کیا جا سکتا ہے اور ہمیں حق ہے کہ باپ کی رائے سے اختلاف کریں۔ بھائی کی رائے سے اختلاف کیا جا سکتا ہے اور ہمیں حق ہے کہ بھائی کی رائے سے اختلاف کریں۔ بیوی خاوند سے اختلاف کرے، خاوند بیوی سے اختلاف کرے۔ یہ آرا و خیالات پر اختلاف ہو سکتا ہے۔ جو جائز اور درست ہے، لیکن ہم میں سے کوئی حضرت محمد رسول اللہ ﷺ سے اختلاف کرے، یہ قطعی حق نہیں پہنچتا۔ اس کے قائل نہ اہلحدیث ہیں نہ اس کے قائل علمائے دیوبند۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ ہر وہ شخص جس نے آنحضرت ﷺ کو پیغمبر سمجھا، پھر وہ شخص جس نے آنحضرت ﷺ کو خاتم النبیین سمجھا۔ باپ کبھی ایسا کر سکتا ہے کہ بیٹے کو لاوارث کر دے۔ بیٹا کبھی ایسی غلطی کرتا ہے کہ باپ سے تعلقات توڑ لے، لیکن ایک مسلمان یہ کبھی نہیں کر سکتا کہ محمد ﷺ رسول اللہ سے تعلق توڑ لے۔ پھر یہ بڑے بھائی کا وظیفہ کیا ہوتا ہے؟ یہ ایک ایسی ترجمانی ہے کہ اگر میں اس کا ترجمہ کروں تو شاید میں اس سے زیادہ بہتر لفظوں میں عرض کر سکوں اور آپ میری ترجمانی

کریں، وہ ترجمانی شاید صحیح نہ ہو۔

آپ سوچیں آنحضرت ﷺ بیت اللہ میں پیدا ہوئے۔ پھر ایک خاندان میں پیدا ہوئے۔ قریش کے خاندان میں حضرت ﷺ کے والد بزرگوار بھی تھے۔ اس خاندان میں حضرت ﷺ کے چچا بھی تھے۔ اس خاندان میں آپ کے سسرل، ننھیال، ددھیال؛ یہ سب رشتے موجود تھے۔ ان رشتوں کے لحاظ سے کئی لوگ ایسے تھے، جو آنحضرت ﷺ سے چھوٹے تھے۔ حضرت ﷺ ان سے بڑے تھے۔ آپ سے کوئی پوچھے کہ حضرت محمد ﷺ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے کیا لگتے تھے؟ کیا رشتہ تھا؟ تو میں سمجھتا ہوں کہ میں ہوں، آپ ہوں، لاہور کے کوئی اور بزرگ ہوں، وہ یہی کہیں گے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بھائی تھے۔ پھر پوچھیے کہ چھوٹے تھے یا بڑے تھے تو آپ کیا فرمائیں گے؟ بڑے ہی فرمائیں گے؟ پھر اگر یہ لفظ گناہ ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک واقعہ ہے، جہاں تک اس واقعہ کا تعلق ہے، دنیا کا کوئی آدمی اس کا انکار نہیں کرتا۔ جہاں تک حضرت ﷺ کی عزت واحترام کا تعلق ہے، میں سمجھتا ہوں ماں باپ عزیز واقارب کوئی بھی آنحضرت ﷺ کے مرتبے میں نہیں آ سکتا۔

«لَا یُؤْمِنُ أَحَدُکُمْ حَتّٰی أَکُوْنَ أَحَبَّ إِلَیْهِ مِنْ وَّالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ وَالنَّاسِ أَجْمَعِیْنَ»[1]

فرمایا کوئی شخص تم میں سے مومن بن نہیں سکتا، جب تک اس کے دل میں آنحضرت کی محبت اولاد، اپنے ماں باپ سے اور ساری دنیا سے زیادہ نہ ہو۔ اب بھائی چھوٹے یا بڑے کا بھی ایک مقام ہے۔ بیٹے اور باپ کا بھی ایک مقام ہے اور نبوت کے لحاظ سے عزت واحترام کا بھی ایک مقام ہے تو اگر دوسرے کے مقصد کی صحیح ترجمانی کریں تو شاید یہ دقت نہ پیدا ہو۔

قرآن نے ہمیں بتایا کہ ﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَ اَخَوَیْکُمْ﴾ فرمایا: مسلمان سب آپس میں بھائی ہیں۔ ان بھائیوں میں صلح کروانے کی کوشش کرو۔ بڑی صحیح اور سنجیدہ تعلیم ہے کہ مخلوق ساری ہے کنبہ خدا۔ ہم سارے اللہ کی مخلوق ہیں اور بہ لحاظ مخلوق کے اور حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہونے کے ایک تعلق ہے اور بحیثیت مومن ہونے کے ایک تعلق ہے۔ اگر قرآن کا یہ ارشاد صحیح ہے کہ ﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ﴾ تو پیغمبر ﷺ بھی اس اخوت میں آتے ہیں۔ اور چوں کہ ہم نے ایمان سیکھا ان سے ہے، اس لیے سب سے بڑا مومن اگر دنیا میں ہے تو اپنے وقت میں پیغمبر ﷺ اور حضرت محمد رسول اللہ ﷺ پوری دنیا کے لیے ایمان اور دیانت کے داعی ہیں۔

﴿اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ﴾ [البقرة: ٢٨٦]

فرمایا: حضرت محمد رسول اللہ ﷺ خود بھی اس وحی پر ایمان لائے، جس وحی کی حضرت ﷺ نے دعوت دی۔ مومن بھی ایمان لائے تو ایمان کی اخوت دنیا میں موجود ہے، جو ایمان کا سب سے بڑا سرمایہ دار ہے، وہ

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (١٥) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٤٤)

سب سے بڑا ایمان دار ہے۔ دوسرے کی ترجمانی اگر آپ صحیح کرنے کی کوشش کریں تو میں سمجھتا ہوں کہ ہم ایک دوسرے کے اور زیادہ قریب ہوں گے اور ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ اختلافات کم ہوں گے، لیکن بدنصیبی یہی ہے کہ اس وقت تک ایسا ماحول پیدا نہیں ہو سکا کہ ہم ایک دوسرے کے قریب ہوں اور ایک دوسرے کے خیالات کو اس کی زبان میں سمجھنے کی کوشش کریں، اس کے نقطہ نگاہ سے سمجھنے کی کوشش کریں۔ اگر ہم ایسا کر سکیں تو میں سمجھتا ہوں ملت کی خدمت ہوگی۔ اسلام کی اس میں سربلندی ہوگی اور ملک کی اس میں آبرو ہوگی۔

لیکن محترم دور ایسا ہے کہ جس میں بظاہر میں دیکھتا ہوں کہ دو ہی راہیں ہیں، یا تو انسان مذہب سے بالکل الگ ہو جائے، ایک ایسی زندگی بسر کرے، جس کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں، جیسے: سوشلسٹ کمیونسٹ اور اس قسم کے گروہ ہیں، جنھیں مذہب سے کوئی واسطہ اور تعلق ہی نہیں۔ شریعت اور مذہبی جھگڑوں میں آئیں گے ہی نہیں، لیکن یہ زندگی میرے نقطۂ نگاہ سے اور ہر آدمی کے نقطہ نگاہ سے جس کا ایمان سے تعلق بنتا ہے، اچھی زندگی نہیں ہے، ہم اس زندگی کو صحیح زندگی نہیں سمجھتے۔ ہم بس سمجھتے ہیں کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی غلامی، اسلام کی خدمت اس میں زندگی گزرے، یہ اصل زندگی ہے اور اس میں رہ کر پھر ان اختلافات کو گوارہ کر کے ہم ایک دوسرے سے ملنے کی کوشش کریں، یہ صحیح راہ ہے، جو ہمارے سلف نے ہمیں بتائی ہے۔

ائمہ اربعہ کے اختلافات کی نوعیت:

آپ غور فرمائیں اس امت میں فہم و فراست، علم و دانش کے لحاظ سے اور وقت و ماحول میں صحیح کام کرنے کے لحاظ سے حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا نام خاص طور پر لیا جا سکتا ہے، جو ایک سنگلاخ زمین میں ایسے ماحول میں جہاں مختلف بدعی گروہوں کی منڈی تھی، وہاں صحابہ رضی اللہ عنہم کے دشمن، وہاں اہلِ بیت کے دشمن، وہاں اعتزال اور جاہلیت اور اعتقادی بدعت کا مرکز؛ اللہ تعالیٰ نے وقت کے لحاظ سے ایک ایسے انسان کو وہاں پیدا کیا، جس نے واقعی بصیرت، روشنی، دانش اور فراست سے کام کیا، جو میں سمجھتا ہوں، اس وقت کا حصہ تھا (اللہ ان کی قبر کو نور سے بھرے) اس زمانے کے لوگوں کو حضرت سے کئی مسئلوں پر اختلاف تھا، لیکن حضرت امام کے اس مقام کی رفعت، ان کے علم کا یہ رسوخ؛ اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا اور اگر کوئی انکار کرتا ہے تو وہ جاہل ہے یا احمق۔ حضرت امام شافعی رحمہ اللہ اپنے وقت کا نہایت ذکی ترین اور ذہین آدمی، جس کے متعلق زاہد جیسا آدمی کہتا ہے کہ یہ مطلبی اس زبان سے گفتگو کرتا ہے، جو آسمان کی زبان ہے، یعنی اتنا ذہین آدمی ہے، ان کے مقام کی رفعت معلوم ہے، لیکن یہ بھی معلوم ہے کہ ان دونوں بزرگوں کے خیالات میں بعض جگہ اختلاف ہے۔

حضرت امام شافعی رحمہ اللہ اور طریق سے قرآن وسنت کو سمجھتے ہیں۔ حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور طریق

سے۔ اختلاف ہے، لیکن کسی کے متعلق کوئی بدگمانی، کوئی سوءِ ظنی، کوئی بے ادبی موجود نہیں۔ امام مالک اور امام احمد ہیں، یہ چاروں اپنے وقت میں یکتائے روزگار ہیں۔ اپنے اپنے لحاظ سے عزت، برتری، خلوص، دیانت، ایمان؛ یہ ان لوگوں سے ہم نے سیکھا۔ اس کے باوجود ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ آپس میں اختلاف ہے، پھر یہ اختلاف معمولی نہیں۔ بعض جگہ مسائل میں حلال وحرام کا اختلاف ہے۔ ایک بزرگ ایک چیز کو حلال فرماتے ہیں، ایک حرام۔ فتوے کی صورت میں کہتے ہیں، لیکن کوئی دوسرے کو حرام خور نہیں کہتا۔ یہ اور مقام ہے اور یہ اور مقام ہے۔ حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے ارشد تلامذہ میں استاد اور شاگرد میں اختلاف ہے اور اسی قسم کے سنگین اختلاف ہیں، لیکن اس کے باوجود ایک دوسرے کے لیے بھی صحیح ادب، صحیح احترام موجود ہے۔ تو اس کا یہ معنی ہے کہ ایک دوسرے کو قریب سے سمجھا۔ اختلاف کی موجودگی میں بھی اس کے موقف کو سمجھا کہ ان کا نقطۂ نگاہ یہ ہے۔ اس لیے اجتہاد میں ان کی بات نہیں مانی، لیکن اس کے خلاف بے ادبی کا کوئی لفظ نہیں کہا۔ ان بزرگ ائمہ یا ان کے اَتباع میں سے کوئی کسی کو کافر یا فاسق نہیں کہتا۔

مسائل میں اختلاف کرتے تو اس کا یہ معنی ہے کہ ایک دوسرے کو قریب سے سمجھنے کے بعد وہ دوسرے کی نیت، اس کے طریقۂ اجتہاد کو محسوس کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپس میں بغض اور عداوت نہیں، اختلاف ہے۔ اس کے بعد بھی اس وقت تک کہ فرقہ بازی کا جمود نہیں سامنے آیا تھا، اس وقت تک مختلف گروہ اور ان ائمہ کو ماننے والے بزرگ ایک سٹیج پر کھڑے ہو کر اسلام کی خیر اندیشی کے لیے سوچتے۔ بوقتِ ضرورت ایک نے دوسرے کے مذہب پر، دوسرے نے اس کے مذہب پر فتویٰ دیا۔ یہ بغض، جو آج ہم میں موجود ہے اور کچھ دوست کھڑے ہوتے ہیں تو ان کو سوائے تکفیر کے مشغلہ ہی اور کوئی نہیں ہے، مَیں سمجھتا ہوں یہ بڑی نا اہل چیز ہے۔

حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ ان کی زندگی میں آپ نے بارہا سنا کہ حکومت کے مقاصد نے ان کی دعوت کو مسترد کر دیا۔ امام مالک، امام احمد اور امام شافعی رحمہ اللہ یہ وہ پاک باز لوگ ہیں کہ اپنے وقت میں بے نیاز ہو کر جس کو حق سمجھا، اس کی حمایت کی ہے۔ عوام کیا کرتے ہیں؟ حکومت کیا کہتی ہے؟ دونوں چیزیں نظر انداز کر دیں۔

علمائے حق اور علمائے سو میں بنیادی فرق:

تو گویا مخصوص مقاصد اور علمی ضرورتوں کو ملحوظ رکھ کر اس کا ساتھ دیں۔ سچائی کو دنیا کے سامنے پیش کریں، بے پروا ہو کر کہ عوام کیا کرتے ہیں اور اسے پسند کرتے ہیں یا نہیں پسند کرتے۔ حضرت مجدد الف ثانی، حضرت شاہ ولی اللہ، حضرت شاہ اسماعیل شہید، حضرت سید احمد شہید (رحمہم اللہ) یہ وہ پاکباز لوگ ہیں کہ جن لوگوں نے عوامی ذہن کو سوچا، ان کے سامنے عوام کی زندگی تھی، ان کی رسوم، عادات، شادی بیاہ؛ جو کچھ ہو رہا تھا، وہ ان کو معلوم تھا،

اس کو سمجھنے کے باوجود بھی ٹکرا گئے، کہا یہ بھی غلط ہے۔ عوام نے جو چاہا کہا۔ فارسی میں شاہ ولی اللہ نے قرآنِ عزیز کا ترجمہ کیا، عوام برا فروختہ ہوئے، انھوں نے کہا کہ خدا کا کلام اور سمجھے شاہ ولی اللہ؟ یہ عوامی ذہن ہے، لیکن ولی اللہ بے نیاز تھا اس چیز سے کہ عوام خوش ہیں یا ناخوش، انھوں نے جو کرنا تھا کیا اور بالکل اپنی قوتِ ایمان کے سہارے پر کیا، نہ دنیا سے نہ دنیا والوں سے کوئی چیز طلب کی۔

اسماعیل شہید رحمہ اللہ نے جان دی عوام کی نصیحت کے لیے، ایک گروہ یہ ہے، ایک گروہ علما کا وہ ہے جو عوام سے اس طرح گفتگو کرتے ہیں کہ وہ سوچتے ہیں کہ عوام کیا کر رہے ہیں۔ وہ جو غلط کر رہے ہیں، اس کے لیے وہ دلیل تلاش کرتے ہیں کہ یہ بھی صحیح ہے، تاکہ عوام خوش ہوں۔ میں اس کو عوامی ذہن سمجھتا ہوں، تو اس ذہن کے علما جو آپ سے اس زبان میں گفتگو کرتے ہیں، جو آپ کو خوش کرے، آپ نماز نہیں پڑھتے، وہ تقریر کے لیے کھڑے ہوں گے تو وہ نماز کا ذکر نہیں کریں گے، کیوں کہ آپ کو تکلیف ہوگی، آپ تو بے نماز ہیں، اب آپ کہیں کہ نماز نہ پڑھنا بڑا جرم ہے، انسان کفر کی حد تک پہنچ جاتا ہے تو جتنے بے نماز ہیں، وہ مولوی پر ناراض ہوں گے، وہ بات وہاں سے شروع کرے گا، وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف کرے گا، جس میں کوئی اختلاف نہیں، اس عوامی ذہن کے علما، جو عوام کی رضا کو اپنے وعظ و نصیحت کا مرکز سمجھتے ہیں، ان لوگوں کو سوچنا چاہیے کہ ان کی زندگی اسلام کے لیے مفید زندگی نہیں ہے، عوام کو خوش کرنا یہ اسلام کے مقاصد سے نہیں ہے۔

اگر اسلام کا یہ مقصد ہوتا کہ عوام خوش رہیں تو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم عوام سے جنگ لیتے ہی نہیں، وہ وہی کرتے جو مکہ میں ہو رہا تھا، اسی کی حمایت کرتے، جو مکہ میں کیا جا رہا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دو ذہن کے علما موجود ہیں، ایک وہ ذہن ہے کہ وہ نقائص کی نشاندہی، خرابیوں کی نشاندہی، بدعملیوں کی نشاندہی، انسانی کمزوریوں کا پتا دیتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ غلط ہے، اسے چھوڑو۔ شادی، موت ہر مقام پر جتنی ہم نے غلطیاں اور لغو کیے ہیں، ایک ایک پر نقد کرتا ہے، وہ کہتے ہیں کہ یہ غلط ہے، ہماری مذہبی رسوم کو دیکھتے، وہ اس نگاہ سے دیکھتے کہ یہ رسوم اپنے مقام سے کہاں ہٹی ہیں۔ وہ فرماتے ہیں، یہ بدعت ہے، یہ بدعت ہے۔ اب عوامی ذہن اس سے ناراض ہوتے ہیں۔ یہ میں نے عوامی ذہن کہا، یہ کچھ میری بھی غلطی ہے۔

بدنصیبی یہ ہے کہ خواص میں بھی ایک طبقہ ایسا ہے، جو اس ذہن سے متاثر ہے۔ پڑھے لکھے لوگ سرکاری عہدوں اور بڑی بڑی کرسیوں پر قابض، لیکن ذہن عوامی۔ وہ عوام کی چیزوں کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس انداز میں زندگی گزارنا چاہتے ہیں کہ گویا لوگ ان سے خوش ہوں۔ اس انداز کے اہلِ علم سے گزارش ہے کہ وہ اپنے موقف کو سوچیں، اپنے مقام کو سمجھیں اور وہ سوچنے کی کوشش کریں کہ اس دنیا میں اگر یہ راہ صحیح ہوتی تو علمائے حق عوام سے مخاصمت نہ کرتے۔ ائمہ تجدید، یعنی وہ لوگ جن کو قدرت نے یہ توفیق بخشی کہ دنیا کی

بیماریوں کو دیکھیں، پھر ان بیماریوں کا علاج اور مداوا کریں، اس قسم کے لوگ دنیا میں کم ہوئے، لیکن دنیا کی نظر میں قابلِ تعریف وہی ہیں۔ ایسا وقت جب کہ ملک میں یہ رواج ہے اور عوام اس انداز سے سوچتے تھے کہ جدھر کی ہوا اُدھر کو چلو، زمانے کا جو رنگ ہے، اس رنگ میں رنگ جانا چاہیے۔ بادشاہ سلامت کے دربار میں جائیں تو بادشاہ کو سجدہ کریں، سب ہو رہا تھا۔ مغل بادشاہ بیٹھ کر سجدے کرواتے تھے۔ مجرے ان کے سامنے ہوتے تھے۔ حضرت مجدد الف ثانی نے اس رسم سے مقابلہ کیا کہ ایسا نہیں ہوگا۔ بادشاہ کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ ایک مسلمان ان کے سامنے جھکے۔ اپنے وقت میں بادشاہ سے لڑ گئے اور اس تمام معاشرے سے لڑ پڑے، جو اس برائی میں بادشاہ کو تنبیہ نہیں کرتے تھے۔ بادشاہ کو خوش کرتے تھے، آج ان کا نام مجدد الف ثانی ہے۔ وہ حضرت مجدد ہیں۔ اس لیے میں اس عوامی ذہن کے علما سے گزارش کرنا چاہتا ہوں کہ وہ اپنے موقف پر اب غور کریں۔ عوام کو خوش کرنا یہ مقصد نہیں ہے۔ بلکہ دنیا میں عوام کی غلطیوں کی نشان دہی اصل مقصد ہے۔

اوامر و نواہی کی حقیقت:

﴿كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾

اگر یہ عوام کو خوش کرنا مقصد ہوتا تو اس امت کے پیدا کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ یہودی یہ کام کر رہے تھے۔ عیسائی یہ کام کر رہے تھے۔ مشرکینِ عرب یہ کر رہے تھے کہ جو لوگ کر رہے ہیں، ان کے ساتھ ہو جاؤ۔ بت پرستی اس لیے رائج ہوئی، حضرت مسیح علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہنا اسی لیے رائج ہوا۔ عزیر علیہ السلام کو ''ابن اللہ'' کہنے کی اس لیے عادت پڑی کہ عوام اس کے ساتھ ٹکرانا نہیں چاہتے تھے۔ جب لوگوں نے کہا تو علما نے کہا ٹھیک ہے۔ فرمایا اب ضرورت محسوس ہوئی، ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ﴾ ایک ایسی جماعت پیدا کی جائے جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرے۔ امر بالمعروف کا کیا مطلب ہے کہ عرف اور سچائی بھلائی کی تلقین دنیا کو کرے۔ اس کے لیے ایک جماعت موجود ہونی چاہیے۔ جب وہ دنیا میں دیکھے کہ اس وقت ضرورت ہے کہ لوگوں کی راہنمائی کی جائے نیک کاموں میں، وہ میدان میں اُترے اور نیکی کی طرف راہنمائی کرے۔

﴿تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ جب وہ دیکھے کہ دنیا بدی کی طرف جا رہی ہے تو برائی سے روکنے کے لیے کھڑے ہو جائیں اور اس وقت تک لوگوں کو نہیں چھوڑیں، جب تک برائی کو مٹا نہ دیں، تو گویا اس امت کی نصیحت، دنیا میں اسلام کا وجود، حضرت محمد ﷺ کی بعثت، آپ کے ساتھ ایک ایسی جماعت جس نے اسلام کے پھریرے کو اُٹھایا اور سات سمندروں کو چیرتی اور پہاڑوں کو روندتی ہوئی چلی گئی، اس جماعت کو پیدا کرنے کی ضرورت کیا تھا؟ ﴿تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ جس کا دوسرا معنی ہے عوام سے ٹکر کہ جو

لوگوں میں برائی ہے ان برائیوں کا قلع قمع کرنا اور جو نیکی ہے اس کی طرف دعوت، یہ دو کام اگر امت نہیں کرتی تو اس کی ضرورت ہی نہیں۔ حضرت (ﷺ) نے فرمایا کہ سب سے پہلی چیز جو نیک عادات سے امت میں مفقود ہوگی اور لوگ اسے چھوڑیں گے، وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ لوگ نیکی کا حکم چھوڑ دیں گے۔ برائی سے روکنا چھوڑ دیں گے۔ ذہن یہ ہوگا کہ میاں ہمیں کیا مصیبت ہے۔

عیسیٰ بدین خود   موسیٰ بدین خود

کوئی جو چاہے، کرے، آپ کو کیا؟ یہ عام ذہن ہے اس وقت دنیا میں۔ جو ہوندا اے سب ٹھیک اے۔ یہ ذہن اسلامی ذہن نہیں۔ مجھے اور آپ سب کو یہ کوشش کرنا چاہیے، اچھے لفظوں میں۔ میرا یہ قطعی مقصد نہیں کہ آپ لڑیں، قطعی مقصد نہیں کہ آپ لوگوں کو گالیاں دیں۔ مقصد یہ ہے کہ آپ اچھے سے اچھے طریق پر بہتر سے بہتر لفظوں میں آپ اگر برائی سے روک سکتے ہیں تو روکیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کو آنحضرت ﷺ نے یمن کی طرف رخصت کیا اور فرمایا کہ دیکھو علی! تم جا رہے ہو۔ میرا یہ مقصد نہیں کہ تم وہاں سے سرخ اونٹ اور وہاں کا سونا اور دولت جمع کر کے لاؤ۔ اگر تیرے سبق سے ایک آدمی کو کلمہ حق معلوم ہو کر ہدایت آ جائے۔ فرمایا: مجھے اس سے بہت زیادہ پسند ہے کہ تم اونٹ اکٹھے کر کے لاؤ۔[1] گویا دنیا کی راہنمائی اور سچائی کی طرف دعوت اور عوام کی آواز کو راستی اور صلاحیت کی طرف لانا یہ اصل مقصد ہے انبیاء علیہم السلام کا۔

عوام کو خوش کرنے والے علما یقین فرمالیں کہ ان کی روش ائمہ کی روش نہیں ہے، ان کی روش اہلِ تجدید کی روش نہیں ہے، وہ دنیا کے جاہلوں میں سے ایک جاہل ہیں کہ جہلا کا ساتھ دے رہے ہیں۔ میرے یہ الفاظ سخت ہیں، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ میں اس سے زیادہ بہتر لفظوں میں ان کی پوزیشن کو واضح نہیں کر سکتا کہ وہ جہلا کی طرح اپنے علم کو جہلا کے ساتھ ملا رہے ہیں۔ جہلا ایک بدعت کرتے ہیں، میں اس کے جواز کے دلائل تلاش کرتا ہوں کہ یہ ٹھیک ہے۔ جہلا ایک شرک کی بات کرتے ہیں، میں اس شرک کے جواز کے لیے دلائل تلاش کرتا ہوں۔ مجھ میں اور جہلا میں کیا فرق ہے؟ وہی میں نے کیا، جو جہلا کر رہے ہیں۔ اسی لیے گزارش کی ابتدا میں جو آیت میں نے پڑھی ہے، اس میں ایک اختلاف کا حل ہے۔

حضرت امام احمد رحمہ اللہ کے زمانے میں اعتقادی بدعت کا بڑا زور تھا تو کسی نے ان سے عرض کی کہ حضرت حق اور باطل میں سچ اور جھوٹ میں امتیاز (فرق) کیسے ہے؟ آپ بھی قرآن اور حدیث سے سناتے ہیں۔

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۲۸٤۷) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲٤۰٦)

جہمیہ اور معتزلہ وہ بھی قرآن اور حدیث پڑھتے ہیں۔ تو حضرت امام نے ایک فرق بتایا کہ ”الفرق بیننا وبینھم یوم الصلاۃ“ فرمایا کہ جنازے کے دن آپ کو فرق معلوم ہوگا کہ ان کی موت پر لوگ ہنسیں گے اور ایک اہلِ سنت اور امامِ حدیث کی موت پر لوگ روئیں گے، وہ سامنے نہیں ہوگا۔ لوگ اس پر افسوس کریں گے، یہ بھی ایک راہ ہے۔ واقعی ایسا ہوتا ہے کہ بادشاہ مرتا ہے، لوگ ہنستے ہیں۔ امام احمد کا انتقال ہوتا ہے تو یہودیوں کے گھر میں ماتم کی صف بچھنے کے لیے کافی صفیں ہوتی ہیں۔

یہ بھی ایک فرق ہے، ایک یہ بھی فرق ہے، جیسے میں گزارش کر رہا ہوں کہ ﴿وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ﴾ کہ آپ مختلف گروہوں میں جب قرآن تقسیم ہو چکا ہو، سب قرآن پڑھ رہے ہوں، سب حدیث سے بیان کریں تو آپ میں اُلجھن پیدا ہوگی کہ کون سچا ہے؟

اس میں ایک صورتِ تصفیہ یہ بھی بتائی ہے کہ دیکھو اگر میں آپ کے سامنے کھڑا ہو کر اپنی دعوت دیتا ہوں کہ مجھے مانو، میری بیعت کرو، میری پیروی اور مریدی کو چلاؤ تو یہ اللہ کی طرف دعوت نہیں۔ فرمایا: ﴿وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا﴾ دنیا میں سب سے بہترین شخص وہ ہے کہ دعوت الی اللہ ذات کے لیے نہیں، اللہ کے لیے دعوت دیتا ہے۔ وہ دنیا کو خدا کی طرف بلاتا ہے۔ اس کا اپنا کوئی مقصد اس میں نہیں ہے۔ حضرت محمد ﷺ آئے، وہی رفعت، برتری اور یہ معلوم کہ آپ سے بڑا آدمی دنیا میں کوئی دوسرا نہیں۔ لیکن اپنی طرف دعوت بلحاظ محمد ﷺ نہیں دی، بلحاظِ رسول دعوت دی ہے۔ ﴿اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ﴾ فرمایا رسول کی اطاعت کرو، اس کا معنی کیا ہے کہ میرے پاس وہ پیغام ہے، جو آسمان سے مجھے خدا نے دیا۔ یہی سبب ہے کہ ہم نے اور تمام اہلِ سنت نے صرف حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کو ان کی ذات کے لحاظ سے، ان کے جسم کے لحاظ سے قبول نہیں کیا، ہم نے آنحضرت ﷺ کو ان کی رسالت کے لحاظ سے قبول کیا ہے کہ جو کچھ فرماتے ہیں، یہ خدا کا فرمان ہے۔ اس لیے ہم نے جہاں خدا کے براہِ راست فرمان قرآن کو قبول کیا، ٹھیک اسی طرح اس پیغام کو جو سنت کی صورت میں محمد رسول اللہ ﷺ قرآن کی تشریح میں لائے، اسے بھی قبول کیا، ہم نے جس طرح قرآن کے انکار کو کفر سمجھا، حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی سنت کے انکار کو کفر سمجھا۔ اس لیے کہ وہ بحیثیتِ رسول آئے۔

بہترین دعوت... دعوت الی اللہ!

﴿اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ﴾ [النساء: ٥٩]

فرمایا کہ اللہ کی اطاعت اور رسول کی اطاعت اور رسول کے ماننے والے ﴿اُولِي الْاَمْرِ﴾ تم میں سے

مسلمان بادشاہ ان کی اطاعت کرو۔ ﴿فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ﴾ اگر تم میں اور بادشاہ سلامت میں اختلاف ہے، حکومتِ وقت اور رعایا میں کوئی اختلاف ہے تو فرمایا کہ دونوں مسلمان ﴿فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ﴾ محمد رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر پوچھو کہ حضرت کا حکم کیا ہے تو اس کا یہ معنی ہے کہ قرآن اور اس کے ساتھ سنت، یعنی آنحضرت ﷺ کا فرمان وہ بحیثیت ''الرسول'' ہے۔ اسی لیے قرآن نے ایک مقام پر نہیں، کئی جگہ ''الرسول'' کی اطاعت کو فرض قرار دیا اور یہی میں سمجھتا ہوں کہ مسلکِ اہلِ حدیث اور ائمہ سنت کے اعتقادات کی اساس اور بنیاد ہے تو ﴿وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَاۤ اِلَى اللّٰهِ﴾ گویا آنحضرت ﷺ نے اللہ کی طرف دعوت دی اور یہی اصل دعوت ہے۔ اب ایک بزرگ آتے ہیں، آپ کے سامنے وہ تقریر کرنے کے بعد آپ سے مطالبہ کرتے ہیں کہ میری بیعت کرو، آپ کو ایک معیارِ حق ہاتھ آ گیا کہ یہ اپنے لیے کہہ رہے ہیں، لہٰذا وہ ''داعیا إلی اللّٰہ'' نہیں ہیں۔ اس پر اس معنی سے غور کریں، ایک طبیب اپنی دکان پر بیٹھتا ہے، وہ آپ کو دعوت دیتا ہے کہ میری طرف آؤ، اس کا مقام بحیثیت الرسول نہیں۔ بحیثیت طبیب ہے کہ آپ علاج کے لیے اس کے پاس جاتے ہیں، ایک انجینئر جو اپنے فن کی طرف آپ کو دعوت دیتا ہے۔ میرا یہ مقصد نہیں کہ یہ دعوتیں غلط ہیں، اپنی حد تک تو ٹھیک ہیں، وہ طب کے لیے، وہ اپنے کاروبار کے لیے، ہر دکان دار اپنی دکان کی دعوت دیتا ہے، لیکن ﴿اَحْسَنُ قَوْلًا﴾ جس کو قرآن فرماتا ہے کہ یہ سب سے بہتر چیز اور اچھی بات ہے، وہ دعوت الی اللہ ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مختلف گروہوں اور فرقوں میں دیکھیے، جہاں پر شخصی دعوتیں اپنے مقاصد کے لیے ہوں، آپ اس کو اس معنی سے جانچیں۔ آپ کو وہ پسند آئے، قبول کریں، نہ پسند آئے نہ قبول کریں، لیکن ایک معیار کی چیز جو ہے سچائی، وہ اس جماعت میں ہوگی ''مَنْ دعا إلی اللّٰہ'' کہ وہ اللہ کی طرف دعوت دے۔ ﴿عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ ان کی زندگی میں عملِ صالح موجود ہو۔ ﴿وَقَالَ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ﴾ اور فرمایا: خدا کے سامنے تسلیم اور امتیاز اس کو اپنا شیوا بنائے، خدا کے احکام کو قبول کرے، دنیا میں ﴿اَحْسَنُ قَوْلًا﴾ سب سے بہترین قول اس شخص کا ہے۔

اب محترم میں گزارش کروں اس خلفشار اور اختلاف کی زندگی میں جو اس وقت دنیا میں موجود ہے۔ اس مشکل میں جس میں مَیں آپ مبتلا ہیں، اس جماعتی اور حربی بحث میں جو دنیا میں موجود ہے۔ وہابی، حنفی، چکڑالوی، دیوبندی کتنے نام ہیں، جن پر مختلف جماعتیں دعوت دے رہی ہیں، تو میں سمجھتا ہوں کہ اس معنی سے آپ ہر جماعت پر غور کریں اور اس انداز سے سوچیں کہ ﴿وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَاۤ اِلَى اللّٰهِ﴾ کہ ان سب میں سے اساسی اور بنیادی طور پر خدا کی طرف دعوت کون دے رہا ہے؟ اس لحاظ سے میں گزارش کروں گا کہ دنیا

میں ہمیشہ ہی لوگوں نے حق کی دعوت دی اور حضرت ﷺ کا ارشاد ہے:

«لَا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِّنَ النَّاسِ ظَاهِرِينَ عَلَى الْحَقِّ لَا يَضُرُّهُمْ مَّنْ خَذَلَهُمْ...»[1]

فرمایا: ایسی جماعت دنیا میں ہمیشہ رہے گی، یہ ناپید نہیں ہوسکتی۔ فرمایا: "ظَاهِرِينَ عَلَى الْحَقِّ" وہ سچائی کے غلبے کے ضامن ہیں۔ "لَا يَضُرُّهُمْ مَّنْ خَذَلَهُمْ..." ان کو کوئی شخص ذلیل کرنا چاہے، ان کو ذلیل نہیں کر سکتا، ان کی عزت کو پامال کرنا یہ انسانوں کے لیے ناممکن ہے۔ اپنے وقت میں فرعون نے پوری کوشش کی کہ موسیٰ علیہ السلام کی آواز دبے اور دنیا کی نگاہ میں موسیٰ گرے، لیکن آج فرعون، اس کی تاریخ، موسیٰ علیہ السلام اور اس کی تاریخ موجود ہے۔ آپ فرمائیں کہ نیک نام کون ہے اور بدنام کون؟ نمرود اور حضرت ابراہیم علیہ السلام دونوں کی ایک دعوت ہے، وہ چاہتا ہے کہ دنیا میرا ساتھ دے اور واقعی دنیا نمرود کے ساتھ ہے۔ ابراہیم علیہ السلام لڑ رہے ہیں، بہت تھوڑے قلیل آدمی ہیں۔ اپنے گھر کے آدمی ساتھ نہیں ہیں، لیکن ہے دعوت الی اللہ، ذاتِ ابراہیم کے لیے کوئی دعوت نہیں، اللہ کے لیے دعوت ہے۔ وقت گزر گیا۔ نمرود بھی آپ کے سامنے نہیں، ابراہیم علیہ السلام بھی آپ کے سامنے نہیں۔ علیه وعلىٰ نبينا الصلاة والسلام.

آپ فرمائیں کہ نیک نام کون ہے اور بدنام کون؟ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ اور آپ کے مخالفین کی جماعت ہے، جن کی قوت اتنی قوت کہ مجبور کیا کہ وطن ترک کر کے مدینے چلے جائیں۔ پھر مدینے میں نفاق نے آخری وقت تک تصادم اور ٹکر لی ہے۔ غزوۂ تبوک ۹ ہجری میں حضرت جاتے ہیں، غزوۂ تبوک میں جانے کے بعد مسجد ضرار مدینے میں بن گئی۔ اس کا معنی ہے کہ سنہ ۱۰ھ کو تو حضرت خود رخصت ہوئے تو گویا آخر ۹ ہجری تک کفر کا تصادم رہا حضرت محمد رسول اللہ ﷺ سے، لیکن ان کی دعوت کیا تھی: "دعا إلى الله" آج عبداللہ بن ابی جا چکا۔ ابوجہل جا چکا، ابولہب جا چکا۔ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ بھی ہمارے سامنے نہیں ہیں، لیکن میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ نیک نام کون ہے اور بدنام کون ہے؟ "من دعا إلى الله" جس نے اللہ کے لیے دعوت دی، وہ آج سرخرو اور نیک نام ہے اور ہزاروں نہیں کروڑوں کی زبانیں اس کے لیے درود پڑھتی ہیں اور کروڑوں زبانیں اس کے کلمہ توحید کو پڑھتی ہیں۔

یہ ایک فرق ہے، وہاں دعوت شخصی تھی۔ یہاں دعوت اللہ کے لیے ہے تو اس فرق میں اگر جماعتی تصادم میں آپ سوچنا چاہیں تو میرے نزدیک قرآن کا یہ ایک اصول ہے کہ ہر دعوت کو آپ دیکھیں، جہاں دعوت میں اپنی ذات کے لیے دے رہا ہوں، اسماعیل کے لیے، اسے نکال دو، بے کار آدمی ہے۔ دعوت الی اللہ نہیں ہے۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٨٨١) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩٢٠)

اس ضمن میں محترم ان لوگوں نے جن کو کتاب وسنت سے شرف تھا، انھوں نے کیا کیا کہ دعوت الی اللہ کے لیے زمین کو ہموار کیا، کیسے ہموار کیا؟ حضرات اب آپ سوچیے کہ جو کچھ مکہ میں ہو رہا تھا، اس وقت جبکہ حضرت محمد ﷺ ہیں، اس وقت کیا کیا کہ لات کی قبر طائف میں بج رہی تھی۔ وہ بت خود حرم بیت اللہ میں بج رہے تھے۔ انسان کی پرستش، جنوں کی پرستش، غیر اللہ سے ڈر، مخلوق کے سامنے سجدوں کا کرنا اور جھکنا۔ غیر اللہ کی عبادت یہ موجود تھی۔ اگر یہ عوام کی روش صحیح تھی تو آنحضرت ﷺ کا آنا بے سود تھا۔ آنحضرت ﷺ تو یہ چیز نہیں کہتے تھے کہ اب کیا ہوگا۔ حضرت ﷺ نے ان سب کی دعوت کو چھوڑ کر اللہ کی طرف دعوت دی۔

فرق ایک پیدا ہوا ہے، اب میرے لیے کوئی دقت نہیں، میں ابوجہل کو غلط سمجھتا ہوں۔ ابولہب کو غلط سمجھتا ہوں۔ اس تمام گروہ کو جو بدر سے لے کر تبوک تک ہمارے آقا حضرت محمد ﷺ سے لڑے، میں سب کو غلط اور جھوٹا سمجھتا ہوں، اس لیے کہ ان کی دعوت اپنی ذات کے لیے تھی۔ اپنی قوم کے لیے تھی، محمد ﷺ کی دعوت اللہ کے لیے تھی۔ آپ نے ابوجہل کا وہ خطبہ سنا، جو اس نے بدر کی لڑائی شروع ہونے سے پہلے دنیا کے سامنے اپنی پوزیشن کو واضح کرنے کے لیے دیا، شاید آج کی اصطلاح میں اسے وائٹ پیپر کہتے ہیں، اس نے اپنا عندیہ بتایا کہ ہم اس مصیبت میں کیوں پھنسے، اس نے دو چیزیں بتائیں کہ "إن محمداً شتت أمر العرب..." کہا: ہم اس لیے لڑ رہے ہیں کہ حضرت ﷺ نے عرب میں تفریق پیدا کی ہے۔ یہ وہ ٹھیک کہتے تھے، آنحضرت ﷺ نے واقعی تفریق پیدا کی۔ انھوں نے عرب میں سے اہلِ کفر کو اپنا ساتھی نہیں رکھا۔

دوسری بات کی: حضرت نے آبا کے دین کو جو سب لوگوں کا پرانا آ رہا تھا، اسے ترک کر کے ایک نیا دین پیش کیا۔ کیا معنی کہ عوام کی دعوت، عوام کے اندازِ فکر، جس طرح عوام سوچتے تھے، اس اندازِ فکر کو سردارِ عالم نے بدلا۔ یہ محترم وہی آواز ہے، جو آپ کو کہا جا رہا ہے اور آج ہماری قیادت بڑی ہائی اتھارٹی کے لوگ ہمیں یہ فرماتے ہیں کہ اسلام کو عوام کا ساتھ، لوگوں کا ساتھ، زمانے کا ساتھ دینا چاہیے۔ اگر یہ ساتھ نہ دیا گیا تو کہا کہ اسلام مٹ جائے گا اور دنیا میں یہ فیل ہو جائے گا۔ یہ کیا کہتے ہیں؟ وہاں یہ سوچا کہ حق اور صحیح بات کیا ہے۔ تو ان نقرانے بالکل اس روش پر جیسے آنحضرت ﷺ کے زمانے میں عوام کی ایک آواز تھی اور ایک آنحضرت ﷺ کی آواز تھی۔ وہ آواز عوام کی عوام کے لیے تھی۔ اپنے مفاد کے لیے تھی، اپنے آبا و اجداد کے لیے تھی، اپنے قومی مفاد کے لیے تھی، جس کو وہ قوم سمجھتے تھے، حضرت محمد ﷺ کی دعوت ان سب سے مختلف تھی۔ آپ کی نظر میں قوم بت تھی، آپ کی نظر میں بادشاہت کوئی چیز نہیں تھی۔ آپ کی نظر میں ایک ہی چیز تھی کہ "من قاتل لتكون كلمة الله هي العليا..."[1]

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٢٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩٠٤)

حق کی آواز بلند ہو اور دنیا خدا کی طرف آئے، یہ ایک آواز تھی، جس پر آنحضرت ﷺ نے لوگوں کو جمع کیا۔ یہی ہے: ﴿وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ﴾ کہ اللہ کے لیے دعوت دی۔ کوئی شخص کوئی ملی کسی بت کے لیے کوئی دعوت نہیں دی۔ اب آپ سوچیں کہ اگر وہ عوامی مسلک ٹھیک تھا تو وہ عرب کر رہے تھے، ان میں اتحاد اور وحدت تھی، وہ شرک پر متحد تھے۔

﴿كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ﴾ [البقرة: ۲۱۳]

فرمایا: لوگ کفر پر جمع تھے، اللہ نے پیغمبروں کو بھیج کر ان میں سے نیک لوگوں کو علاحدہ کر دیا، تفریق پیدا کی، اس تفریق کو پسند کیا اور یہ وحدت! وحدت صحیح نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس میں دعوت الی اللہ نہیں۔ اب آگے بڑھیے! اس دور میں جس میں ہم گزر رہے ہیں۔ آج سے تقریباً دو سو سال پہلے دسویں صدی سے شروع ہو کر قریب قریب اس دعوت الی اللہ کی داغ بیل ڈالی اور حضرت شاہ ولی اللہ اس دعوت کے سب سے اہم داعی ہیں۔ اب وہاں کیا ہے کہ دنیا کے رسوم و عادات، ان سے تخالف ہے۔ گھروں کے رسم و رواج اس پر نشان دہی ہے کہ یہ غلط ہے۔ لڑکیاں بیوہ ہوتی ہیں، وہاں کی عام عادت یہ ہے کہ اب دوبارہ نکاح نہیں ہوتا، لیکن کچھ پاکباز لوگ ہیں کہ عوام کی روش کے خلاف ہیں، وہ کہتے ہیں کہ نہیں حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی سنت یہ ہے کہ یہ ہونا چاہیے۔

لڑکیوں کے لیے حالات پر رحم اور ان کی ضروریاتِ زندگی کا تقاضا یہ ہے کہ جب تک عمر اس چیز کا تقاضا کرتی ہے، یہ تعلق قائم رہنا چاہیے۔ وہاں حضرت کیا ہے کہ قبروں کے سامنے لوگ سجدے کرتے ہیں۔ اگر یہ روش صحیح ہے جو عوام کر رہے ہیں۔ آپ کے شہر میں حضرت ہجویری رحمہ اللہ کا مزار ہے۔ حضرت شاہ محمد غوث کا مزار ہے۔ آپ دیکھیے کہ وہاں سجدے ہوتے ہیں یا نہیں؟

۵۳ء کے جیل میں آپ کے لاہور کے بڑے بزرگ موجود تھے۔ انھوں نے کہا کہ یہ سجدہ نہیں ہے۔ یہ تو زمین بوسی ہے، یہ خوب نقطہ تھا۔ انھوں نے بڑی سنجیدگی سے کہا کہ آپ لوگ غلط سمجھتے ہیں، یہ سجدہ نہیں۔ سجدہ تو وہ ہے جس میں وضو ہو، سجدہ وہ ہے کہ جس میں تسبیح پڑھی جائے۔ ہم نہ وضو کرتے ہیں، وہ سجدہ قبر پر بے وضو ہی کرتے ہیں اور نہ اس میں تسبیح پڑھتے ہیں۔ بات خوب تھی، میں نے عرض کیا کہ حضور قرآن نے جن کو مشرک کہا ہے، وہ بتوں کے سامنے وضو کر کے سجدہ کرتے تھے؟

طلبا کی ذمے داریاں[1]

محترم مولانا نے خطبہ مسنونہ کے بعد قرآن پاک سے ذیل کی آیتِ کریمہ تلاوت فرمائی:

﴿وَ قَضٰی رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاهُ وَ بِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا﴾ [الإسراء: ٢٣]

اس آیتِ کریمہ کی روشنی میں مولانا نے درد بھرے لہجے میں پورے خلوص کے ساتھ طلبہ کو مخاطب فرمایا کہ آپ حضرات اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے دین کی تعلیم سیکھنے کے لیے علم کے اس چشمے پر حاضر ہوئے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ تم لوگ امتِ محمدیہ میں سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کے مقرب ہو۔

«خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَه»[2]

لیکن محض علم، بغیر عمل کے کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ علم و عمل کی ہم آہنگی میں نجات ہےاور دین و دنیا کی فلاح ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خواہ دین کی تعلیم ہو یا دنیا کی تعلیم، تین گروہوں نے اس میدان میں قابل قدر کارنامے انجام دیے ہیں اور بدکرداریوں اور سیاہ کاریوں میں بھی یہی لوگ سرِ فہرست ہیں۔

امام عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ کا قول: "هل أفسد الدين إلا الملوك، وأحبار سوء ورهبانها"[3] نشان دہی کر رہا ہے کہ مفاسد کی سب سے زیادہ آبیاری ان تین گروہوں نے کی ہے، حضرت عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ کے دور میں بادشاہوں میں بداعمالیاں موجود تھیں، خصوصاً اموی بادشاہوں نے جن غلط لائنوں پر لوگوں کو چلایا تھا، ان سے حضرت عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ سخت متاثر معلوم ہوتے ہیں۔

عزیز طلبہ یہ درست ہے کہ آپ کو بدکردار بادشاہوں کے نتائج و عواقب سے تعلق نہیں ہے۔ ابھی آپ علم کی راہ میں چل رہے ہیں اور آپ نے کتاب و سنت کی مشعلوں سے اپنے چراغوں کو روشن کرنا ہے، ماں باپ کی اطاعت کے ساتھ ساتھ دینی علوم سے اپنے دامنوں کو بھرنا ہے، اور اساتذہ کرام، والدین سے زیادہ احسان و مروت کے حق دار ہیں، اس لیے کہ والدین آپ کے لیے جسمانی غذا کی تگ و دو کرتے ہیں، لیکن یہ حضرات آپ کی

---

[1] جامعہ سلفیہ فیصل آباد میں طلبہ کے سالانہ امتحان کے سلسلے میں منعقدہ تقریب پر ایک خطاب، جسے مولانا محمد صادق صاحب نے ترتیب دیا تھا۔

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٧٣٩)

[3] سير أعلام النبلاء (١٢/ ٢١٣)

روحانی غذا بہم پہنچانے میں کوشاں رہتے ہیں۔ سلطنتِ مغلیہ کے بعد متحدہ ہندوستان میں علم دو حصوں میں بٹ گیا۔ دنیا کے حصول کے لیے علم کی راہ مختلف ہوگئی، لیکن انگریز نے اس ملک پر قبضہ کرنے کے بعد دنیاوی علوم کو پروان چڑھایا اور علمِ دین کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کی، تاہم ہمارے اسلاف نے پورے خلوص کے ساتھ کتاب وسنت کی جو خدمت انجام دی ہے، اس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔

ہمیں اس وقت اپنی ذمے داریوں کے متعلق سوچنا ہے اور اسلام میں جو تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں، ان کا دفاع کرنا ہے اور جو غیر اسلامی رسمیں آئے دن ہم میں رواج پذیر ہو رہی ہیں، ان سے اسلام کو پاک وصاف کرنا ہے۔ ہمارے پاس دولت کی فراوانی اتنی ہے کہ جتنی دوسرے لوگوں کے پاس ہے، لیکن ہمیں اپنی ذمے داریوں کا احساس کرنا چاہیے اور میدانِ عمل میں آنا چاہیے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ پاکستان بننے کے بیس سال بعد بھی اسلام کا نام اس ملک میں ضرورت کے وقت استعمال ہوتا ہے اور عام اَذہان اسلام سے متاثر نہیں ہیں۔ اس لیے دین کو پھیلانے کے لیے ہمیں کمربستہ ہونا ہے اور لوگوں کے دلوں میں اس کی تعلیمات کو اُتارنا ہے۔

مغلیہ عہدِ سلطنت میں علما، دینی، ملی دنیاوی سبھی علمی کام کرتے تھے۔ ہمیں بھی اس وقت میں اِن تمام علوم سے دل چسپی لینا چاہیے اور کام کے میدان میں نکلنا چاہیے۔ میں تجربے کی بنا پر کہتا ہوں کہ آپ یقین رکھیں کہ عوام ہمارے ساتھ ہیں اور ہم جب بھی ان سے کوئی اِعانت چاہیں گے، وہ فوراً ہماری دعوت پر لبیک کہیں گے۔ ہمارے اکابر میں جو خلوص تھا، اس کی مثال حضرت مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی تھے۔ آپ تین چار گاؤں کے مالک تھے۔ وہ سب مال اللہ کی راہ میں خرچ کر دیا کرتے تھے۔ علامہ عین الحق پھلواری رحمہ اللہ گدی کے مالک تھے۔ میاں نذیر حسین دہلوی رحمہ اللہ سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور پوری زندگی کتاب وسنت کے لیے وقف کر دی اور شاہانہ تزک واحتشام کو چھوڑ کر فقیرانہ زندگی بسر کرنا شروع کی۔

مولانا عبدالجبار غزنوی اور مولانا عبدالواحد غزنوی؛ انتہائی مخلص اور پرہیزگار ولی اللہ گزرے ہیں اور ان میں سے کسی کا مشاہرہ بیس روپے ماہانہ سے زیادہ نہ تھا۔ حضرت الاستاذ حافظ عبدالمنان رحمہ اللہ کا مشاہرہ دس روپے ماہانہ تھا۔ یہ سب بزرگ اپنے دور میں دین کی خدمت انجام دیتے ہیں اور خاص کر دین کو اپنے ہاتھوں سے کبھی نہ چھوڑا اور کبھی علم کو دکان کی حیثیت میں نہ لیا۔ عزیز طلبہ آپ بھی علم کو دکان کی حیثیت نہ دیں اور نہ اس ارادے سے تعلیم حاصل کریں، محض رضائے الٰہی مقصود ہو اور پورے خلوص اور سوچ کے بعد اس راہ میں گامزن ہو کر اسلاف کا نمونہ بننے کی کوشش کریں۔ آپ کا اخلاق اتنا بلند ہو کہ لوگ آپ کو دیکھ کر اسلام کا نمونہ سمجھیں۔ آپ کے ظاہر و باطن میں فرق نہیں ہونا چاہیے۔ آپ اپنے اخلاق کو بلند رکھیں اور زندگی کی ضروریات میں نفس کی دھوکے بازیوں سے اپنے آپ کو بچائیں اور حصولِ زر کے لیے اپنے آپ کو مارکیٹ میں پیش نہ کریں۔ یہ

صورت اسلامی اخلاق کے منافی ہے۔ آپ کے سامنے آپ کی تاریخ ہے۔ اسلام کے ابتدائی دور میں آپ دیکھیں گے کہ صحابہ کرام فقرا تھے، صاحبِ ثروت نہ تھے، یہاں تک کہ بعض صحابہ کرام کو فوت ہونے کے بعد پورا کفن بھی حاصل نہ ہوسکا۔

صحابہ کرام کی زندگی، آنحضرت ﷺ کی زندگی سے تربیت یافتہ تھی اور اس اعلیٰ اخلاق سے ہی انھوں نے دنیا کو فتح کرلیا تھا۔ آپ اپنے دلوں کو ٹٹولیں، خدارا آپ روپے کی ریل پیل اور دنیا کی خوبصورتی کی طرف للچاتی ہوئی نظروں سے نہ دیکھیں، لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ اس دور میں اخلاق کی بلندی عنقا ہے۔ اخلاص کا تلفظ مہمل ہے، میں نے اخلاص کو تلاش کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے اور اسے خوب ٹٹولا ہے، لیکن میں اسے پا نہیں سکا۔ میں دیکھتا ہوں کہ عورتیں فیشن کی باتیں کرتی ہیں اور ہمارے رفقا تنخواہ کی باتیں۔

اب کیا ہوگا، بس ہم تو بازار کا مال ہیں، جہاں نیلام ہوا بک گئے۔ اساتذہ کا یہ کردار دیکھ کر تلامذہ کیا سبق حاصل کریں گے؟ بچے کی پہلی تربیت گاہ ماں باپ کا گھر ہے۔ بچے ماں باپ کے اخلاق سے متاثر ہوتے ہیں، اگر ماں باپ کے اخلاق بہتر ہوں گے تو اولاد کے اخلاق بھی بہتر ہوں گے۔ دوسری تربیت گاہ اساتذہ ہیں، ان کے اخلاق سے بھی طلبا متاثر ہوں گے۔

عزیز طلبہ! آپ جب جامعہ سے جائیں تو لوگ آپ کے اخلاق سے متاثر ہوں اور اگر یہاں سے جا کر آپ اخلاقی گراوٹ دکھائیں اور شرارتوں و سازشوں سے آپ کو چین نہ ہو تو لوگ سمجھیں گے کہ جس ادارے سے آئے ہیں، اس کا نظام ہی ایسا ہے۔ یاد رکھو! ہم دنیا کی نگاہوں میں نشانہ اور کھٹکا ہیں۔

دراصل میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ آپ شعائرِ اسلامی کی پابندی خصوصاً نماز کے مسئلے میں سستی نہ کریں، یہ ایک بنیادی مسئلہ ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ ہمارے مدارسِ عربیہ میں نماز کی سستی ہے کہ طلبہ گپیں ہانکتے رہتے ہیں اور ادھر نماز ہو رہی ہوتی ہے۔ آپ کو سبق حاصل کرنا چاہیے، اگر اس راہ میں چلنا ہے تو ہمیں اس زندگی کو صاف کرنا ہوگا۔ خذ ما صفا و دع ما کدر!

ہمارے اسلاف کے دور میں طلبہ جس انداز سے زندگی بسر کرتے تھے، اب وہ دور نہیں ہے اور جو صورتِ حال اس وقت موجود ہے، اس پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔ ہم نے جس وقت جامعہ سلفیہ کی بنیاد رکھی تھی تو ہمارے پیشِ نظر طریقۂ سلف کی حمایت اور محدثین کے مسلک کی تلقین و تائید تھی اور اسلاف کے نقشِ قدم کے مطابق ایک تربیت گاہ تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ ان بنیادوں پر کوئی لائحہ عمل سوچیں۔

میں دیکھتا ہوں کہ اساتذہ محنت کرتے ہیں، لیکن طلبہ میں محنت کا داعیہ نہیں ہے۔ اساتذہ کے پاس انجکشن تو نہیں ہے کہ آپ محنت بھی نہ کریں اور علم بھی حاصل ہو جائے۔ یاد رکھیے کہ محنت ہی سے آپ کو کچھ حاصل

ہوگا۔ دراصل جو طلبہ ابتدائے سال میں کام چور رہتے ہیں، وہ سال کے اختتام پر بھاگنے کی کوشش کرتے ہیں یا پاس کروانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتے ہیں یا جعلی سند سرٹیفکیٹ حاصل کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔

علم در جلد خویش باید نہ در جلد کتاب [1]

ان کی یہ حالت ہوتی ہے کہ جہاں استاذ سے پڑھتے ہیں، وہیں کتاب رکھ دیتے ہیں۔ مطالعہ نہیں کرتے یا برائے نام مطالعہ کرتے ہیں۔ یاد رکھو کہ جو مطالعے کی عادت نہیں رکھتے، ان کو مطالعے کی توفیق نہیں ہوتی اور پھر وہ لوگ اُردو کی کتاب لے کر اس سے وعظ کرتے ہیں۔ [2]

---

① ''علم اپنی جلد (جسم) میں (اترا ہوا) ہونا چاہیے نہ کہ کتاب کی جلد میں۔''

② ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (یکم ستمبر ۱۹۶۷ء)

امیر منتخب ہونے کے بعد پہلی تقریر[1]

مولانا نے فرمایا:

حضرت مولانا سید محمد داود غزنوی بے شمار خوبیوں کے مالک تھے۔ اللہ نے ان کی ذاتِ گرامی میں بہت سی صلاحیتیں جمع فرما دی تھیں۔ ان کی وفات سے ملک کے دینی حلقوں میں بالعموم اور جماعتِ اہلِ حدیث میں بالخصوص جو خلا پیدا ہوگیا ہے، اس کا پر ہونا ممکن نہیں۔ علما اس دنیا سے رخصت ہو رہے ہیں۔ بے شمار علما ہماری آنکھوں کے سامنے ہم سے جدا ہوگئے، جو شخص یہاں سے اُٹھ جاتا ہے، بعد میں اس کی جگہ لینے والا کوئی نہیں ہوتا۔

اب حضرت مولانا غزنوی رخصت ہوئے ہیں تو اپنا مقام خالی چھوڑ گئے ہیں۔ ہم ابھی اس کے لیے تیار نہیں تھے کہ ان کی خبرِ وفات سنیں، لیکن نہایت افسوس ہے، جس بات کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے تھے، وہ حقیقت اور واقعہ بن کر رہی اور حضرت مولانا غزنوی موت کی آغوش میں چلے گئے۔ إنا لله وإنا إليه راجعون.

(یہ لفظ جب مولانا کہہ رہے تھے تو ہونٹ کپکپا رہے تھے، زبان رک رہی تھی اور آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور تمام حاضرین بہت ہی متاثر تھے اور ان کی آنکھوں سے بھی آنسو رواں تھے)

مولانا موصوف نے مجلسِ شوریٰ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

آپ نے مجھے اپنا امیر منتخب کر کے جہاں شکریے کا موقع دیا ہے، وہاں مَیں اس احساس کے بوجھ تلے دبا جا رہا ہوں کہ آپ نے مجھ پر بہت بڑی ذمے داری عائد کر دی ہے۔ میں اس عظیم ذمے داری کو صحیح طور پر اسی صورت میں ادا کر سکتا ہوں، جب کہ آپ پوری طرح میرے ساتھ تعاون کریں گے۔ میں اس میدان میں نووارد ہوں اور آپ کی اِمداد کا طالب!

مجھے پورا احساس ہے کہ جو بات حضرت مولانا میں تھی، وہ ہم میں نہیں ہے۔ میرا معاملہ "کبرني موت الکبراء" والا ہے۔

میں جماعت کے ہر فرد اور ہر رکن سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ موقع کی نزاکت کا خیال فرمائیں اور جماعت کے مفاد کو ہر چیز پر ترجیح دیں۔ جماعت اور اس کی تنظیم میں ہی ہماری عزت ہے اور اس مسلک کی

---

[1] یہ تقریر ۱۹/ جنوری ۱۹۶۴ء کو امیر منتخب ہونے کے بعد مجلسِ شوریٰ کے اجلاس میں ہوئی تھی۔ ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۳۱/ جنوری ۱۹۶۴ء)

پابندی ہمارے فرائض میں داخل ہے۔ یہی ہماری زندگی کا مقصد اور یہی ہمارا اوڑھنا بچھونا ہے۔ ہمیں اس کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دینا چاہیے۔ ہمارا کام اس دنیا میں اللہ کے دین کی خدمت ہے۔ اگر ہم نے اس میں کوتاہی کی اور اپنے آپ کو غلط رخ پر ڈال دیا تو یہ ہماری بہت بڑی بدقسمتی ہوگی اور ہم دنیا میں بھی خسارے میں رہیں گے اور آخرت میں بھی!

جماعت اہلِ حدیث ایک مذہبی اور دینی تنظیم ہے اور ایک خاص مسلک کی پابندی کی تعلیم دیتی ہے، ہمارا فرض ہے کہ اس کا خیال رکھیں اور مسلکِ محدثین جو عین کتاب و سنت ہے، اس پر عمل پیرا ہوں۔ جماعت اہلِ حدیث کی ایک تاریخ ہے اور اس کے پیچھے خاص روایات ہیں۔ ہمارے لیے ضروری ہے کہ اس کو زندہ دیکھیں اور اپنے عمل و کردار کو صحیح سانچوں میں ڈھالیں۔

جامعہ سلفیہ کا افتتاح

[۲۱/ جون ۱۹۵۶ء بروز جمعرات تقویۃ الاسلام ہال میں ''جامعہ سلفیہ'' کے درجۂ تکمیل کا افتتاح ہوا، جس میں جامعہ کے طلبا، اساتذہ، دار العلوم تقویۃ الاسلام کے طلبا، اساتذہ، مرکزی جمعیت کے دفاتر کا تمام عملہ اور لاہور شہر کے معززین جماعت نے شرکت فرمائی۔ اس مبارک تقریب کا آغاز تلاوتِ قرآنِ مجید سے ہوا۔ مدرسہ تقویۃ الاسلام کے شعبہ تجوید القرآن کے استاذ قاری غلام محی الدین صاحب اور ان کے شاگردوں نے تلاوتِ قرآنِ مجید کی۔ اس کے بعد مولانا سید محمد داود صاحب غزنوی (صدر مرکزی جمعیت اہلِ حدیث مغربی پاکستان) اور مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمہ اللہ نے افتتاحی تقریر فرمائی۔ ذیل میں مولانا سلفی رحمہ اللہ کی تقریر نقل کی جا رہی ہے، جو مولانا ابراہیم کمیرپوری نے مرتب کی تھی]

ہندوستان میں تحریکِ اہلِ حدیث دینی اور اعتقادی حیثیت میں اگرچہ پہلے بھی موجود تھی، لیکن یہ تحریک تعلیمی حیثیت سے حضرت میاں صاحب رحمہ اللہ کی کوششوں کی مرہونِ منت ہے۔ حضرت میاں صاحب رحمہ اللہ نے اپنے اخلاص اور اپنی قوتِ قدسی سے اس میدان میں وہ کام کر دکھایا کہ آج بڑی سے بڑی جماعت بھی وہ کام نہیں کر سکتی۔ حضرت میاں صاحب کا درس کیا تھا، ایک بحر بے پایاں کہ عرب و عجم سے تشنگانِ علوم نبویہ ﷺ آ رہے ہیں اور نہ صرف یہ کہ اپنی پیاس بجھاتے، بلکہ اپنے اپنے ظرف کے مطابق یہ آبِ حیات بھر لے جاتے۔ حضرت میاں صاحب رحمہ اللہ نے اپنی تمام تر زندگی صبح سے شام تک علومِ نبویہ ﷺ کی تدریس میں صَرف کر دی۔ ان کے بعد انھیں کے فیض یافتہ حضرات غزنویہ اور حافظ عبدالمنان صاحب رحمہ اللہ نے اس کام کو جس خلوص اور جانفشانی سے سرانجام دیا، آج جو کچھ ہے انھیں کے باقیات الصالحات میں سے ہے۔

آج ہم ہر کام میں مادیات پر سہارا کرتے ہیں، لیکن ہمارے اسلام کا سرمایہ مادیات سے کہیں زیادہ روحانیت اور اخلاص پر تھا، اور اسی دولت پر ان کا سہارا تھا اور یہی ان کی کامیابی کا اصل سبب تھا۔ ہم بھی اگر اپنے نیک مقاصد میں کامیاب ہونا چاہتے ہیں تو مادی وسائل سے کہیں زیادہ اپنے دلوں کو اِخلاص کے زیور سے آراستہ کرنا چاہیے۔

علومِ عالیہ (قرآن و حدیث) کی تعلیم کے ساتھ یہ امر نہایت ضروری ہے کہ ان پر عمل بھی کیا جائے۔ یہ

علوم ہمارے دین کی اصل اساس اور عمل کے لیے صحیح معیار ہیں۔ لیکن علومِ آلیہ (منطق، فلسفہ وغیرہ) محقق ہتھیار ہیں۔ ان علوم کو آپ دین کی حمایت اور مخالفت دونوں جگہ صَرف کر سکتے ہیں۔ تاریخ ہماری راہنمائی کرتی ہے کہ فلاسفہ یونان کے شیدائیوں نے ان علوم کو دین اور دین کے بنیادی عقائد کے خلاف استعمال کیا، لیکن ائمہ اہلِ سنت نے انہی علوم سے ان اعتراضات کا رد کیا اور اسلامی عقائد کا اِثبات فرمایا۔

اس لیے میں عزیز طلبا سے عرض کروں گا کہ قرآن وحدیث کو عمل کی نیت سے پڑھیے اور دیگر علومِ آلیہ کو اس نیت سے پڑھیے کہ آپ ان سے قرآن وحدیث کی حمایت کا کام لے سکیں اور ان علوم کے شیدائی ملاحدہ اور زنادقہ کے سامنے انھیں کی زبان میں اسلام کی حقانیت ثابت کر سکیں۔[1]

[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۲۹ر جون ۱۹۵۶ء)

جامعہ سلفیہ فیصل آباد انڈونیشی سفیر کی آمد پر تقریر

مغل دورِ حکومت سے لے کر آج تک تعلیم پر کیا کیا انقلاب آئے، اہلِ حدیث نے علمی خدمت اور علومِ دینیہ کی اشاعت میں کہاں تک حصہ لیا اور آج قیامِ پاکستان کے بعد جامعہ سلفیہ کی علاحدہ تاسیس کی ضرورت کیوں پیش آئی؟

معلوم ہے کہ مسلمان فاتحین نے ہندوستان پر دو طرف سے حملہ کیا۔ پہلا حملہ عرب فاتحین نے ۹۲ھ میں کیا۔ اس وقت ولید بن عبدالملک بن مروان تختِ خلافت کی زینت تھے اور ان کی نیابت عراق کی سرحدوں پر حجاج بن یوسف ثقفی کر رہے تھے۔ حملہ نوجوان فاتح محمد بن قاسم کی قیادت میں ہوا۔ اس وقت عرب دنیا میں آج کے مروجہ مذاہبِ اربعہ کا ذکر تک بھی نہ تھا۔ حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی عمر اس وقت قریباً دس یا بارہ سال کی ہوگی۔ یہ لشکر مسلک کے لحاظ سے وہی کچھ تھا، جس کی دعوت آج اہلِ حدیث دے رہے ہیں۔ یعنی مجتہد ہو یا غیر مجتہد، اپنی بساط کے مطابق قرآن اور سنت پر غور کرے اور اگر معاملہ سمجھ میں نہ آئے تو بلاتعیین کسی عالم کی طرف توجہ کرے۔ بالفاظ دیگر یہ بزرگ مسلکاً اہلِ حدیث تھے اور اسی نوعیت کی دعوتِ اسلام لے کر یہ مقدس لشکر ہند کے ساحل پر لنگر انداز ہوا۔

ان کی یادگار آج سندھ میں وہ قیمتی کتب خانے ہیں، جن میں حدیث اور رجال کے ہزاروں مخطوطات اس وقت موجود ہیں۔ ہماری جماعت کے قابلِ احترام بزرگ پیر سید بدیع الدین آف پیر جھنڈا تشریف فرما ہیں، ان کے پاس مخطوطات کا اتنا بڑا ذخیرہ ہے، جو بعض لحاظ سے یورپ کے مکاتب پر بھی فضیلت رکھتا ہے۔ لیکن یہ عرب فاتحین مرکزی خلفشار کی وجہ سے جلد ہی واپس چلے گئے اور اپنے اَخلاق کا دیرپا اثر نہ ڈال سکے۔

فاتحین کا دوسرا گروہ افغانستان کی طرف سے آیا۔ یہ حضرات مسلکاً حنفی تھے۔ یہ حضرات ہندوستان میں آ کر استقلال کے ساتھ مقیم ہوگئے۔ گو فارس اور ایران وغیرہ ممالک میں پہلے ائمہ حدیث کا طوطی بولتا رہا، پھر ان کی جگہ شوافع نے لے لی۔ لیکن آگے آنے والے لوگ چوں کہ حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی فقہیات کو مانتے تھے، اس لیے اطرافِ ہند پر احناف بتدریج چھا گئے۔ ان کے ساتھ جو اہلِ علم آئے، وہ بھی مسلکاً حنفی تھے۔ اس لیے یہاں اسلام کی ترجمانی اور تبلیغ حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مکتبِ فکر کے مطابق کی گئی۔

آج سے قریباً ڈیڑھ صدی قبل تک اس ملک میں فقہ حنفی کے خلاف کوئی موثر آواز نہ تھی۔ مغل تاجداروں میں اکبر اور داراشکوہ جیسے ملحد اور بے دین بھی تھے۔ تاہم اورنگ زیب عالمگیر رحمہ اللہ نے اسلام کی آخری خدمت اپنے ماحول کے مطابق اس طرح کی کہ علما کی ایک مقتدر جماعت کی نگرانی میں ایک کتاب تالیف کرائی، جس میں اسلامی قانون کی ترجمانی فقہ العراق کے لب و لہجے میں کی گئی تھی۔ یہ کتاب فقہ حنفی کی جامع اور سنجیدہ ترجمانی ہے اور اس کے سوا اس وقت کوئی دوسری چیز ممکن بھی نہ تھی، کیوں کہ اس وقت ملک میں کوئی دوسرا مسلک تھا ہی نہیں۔ اس کتاب کی ترتیب اور تدوین میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ کے والد شاہ عبدالرحیم رحمہ اللہ بھی شامل تھے۔ اس کا نام فتاویٰ عالمگیری ہے۔

اسلامی قانون کی آخری کتاب:

فتاویٰ عالمگیری حکومت کی سطح پر آخری کتاب ہے، جس میں اسلام کی تعبیر حنفی نقطہ نظر سے کی گئی ہے۔ گو اس وقت قرآن وسنت کو شرعی حجت سمجھا جاتا تھا، لیکن اس کی تعبیر وہی صحیح تصور ہوتی تھی، جو فقہ العراق کی روشنی میں کی گئی ہو۔ اس وقت عمومی ذہن یہ پیدا ہو چکا تھا کہ چوں کہ اسلام اور فقہ حنفی دونوں معروف ہیں، اس لیے اس میں زیادہ زور فقہ حنفی اور اصولِ فقہ پر دیا جانا چاہیے۔ براہِ راست قرآن اور سنت پر غور ضروری نہیں۔ دینی اکابر ائمہ کی تعبیر اعتماد کے لیے کافی ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ فقہی جمود اور عصبیت کی صورت میں ظاہر ہوا اور ایسا ہونا ان اسباب و دواعی کا لازمی انجام تھا۔

ایک حساس شخصیت:

حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کی حساس شخصیت نے آنے والے خطرات کو بھانپا۔ اکبر اور داراشکوہ کی لادینی فتنہ انگیزیاں ان کی نظر میں تھیں۔ مغربی طاقتوں کی بڑھتی ہوئی عقابی نگاہوں کی فتنہ سامانیاں شاہ صاحب کے دور بین دماغ پر پوری طرح اثر انداز ہو رہی تھیں۔ اسلام کے خلاف مسیحیت کے شبہات حضرت سے پوشیدہ نہ تھے اور ملک میں شیعہ سنی اختلاف کی خلیج بھی ذہن میں تھی۔ اس کا علاج قرآن وسنت کی براہِ راست تعلیم کے سوا کچھ نہ تھا۔ فقہی نظریات اور فقہا کی فرعی موشگافیاں ان بیماریوں کا علاج کسی صورت بھی نہیں ہو سکتی تھیں۔ شاہ صاحب اپنے والد کی پرانی مسندِ درس چھوڑ کر سفرِ حج کے لیے ۱۱۴۳ھ میں حجاز تشریف لے گئے اور حجاز کے مشہور مہاجر ابو طاہر کردی (۱۱۴۵ھ) کی خدمت میں حاضر ہوئے اور فنونِ حدیث کا استفادہ فرمایا اور واپس آ کر مسندِ تدریس کو زینت بخشی۔

شاہ صاحب نے اندازِ تعلیم بدل دیا۔ قرآنِ عزیز کا فارسی ترجمہ لکھا۔ فارسی اس وقت ملک کی علمی زبان

تھی۔ اس کے خلاف اس وقت علما نے کافی ہنگامہ بپا کیا۔ لادینی شبہات کے خلاف ''حجۃ اللہ البالغہ'' لکھی۔ اندرونی جھگڑوں کے متعلق ''ازالۃ الخفا'' لکھی۔ موطا پر عربی اور فارسی میں دو شرحیں لکھیں۔ مختلف فیہ مسائل میں شوافع کے معمولات کو عموماً ترجیح دی۔ فقہ اور اصولِ فقہ پر سنجیدہ اور معقول تنقید فرمائی۔ مذاہبِ اربعہ کی فقہوں کا تذکرہ مآخذ کی روشنی میں فرمایا۔ شاہ صاحب کے ہونہار بیٹوں نے کافی حد تک شاہ صاحب کا تتبع فرمایا۔ سابقہ جمود توڑ دیا۔ فقہ کے ساتھ حدیث اور قرآن کا بھی درس دیا۔ اسی قسم کی تعلیم جماعت اہلِ حدیث کا مطمحِ نظر ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ کوشش کامیاب ہے۔ اب تمام مکاتبِ فکر نے اپنا پروگرام بدل دیا اور تمام مدارس میں، گو اپنے مقصد کے مطابق ہو، قرآنِ عزیز اور صحاح پڑھائی جاتی ہے۔

شاہ عبدالعزیز، شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالقادر، شاہ عبدالغنی اپنے باپ کے نقشِ قدم پر چلے۔ فقہی اور تعلیمی جمود کو توڑتے رہے۔ وقت کے تقاضوں کے مطابق اس پروگرام کی تکمیل ہوتی رہی۔

شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ کا مقامِ عزیمت:

حضرت شاہ اسماعیل شہید دہلوی رحمہ اللہ اپنے دادا اور والد کے سچے جانشین تھے۔ شاہ اسماعیل رحمہ اللہ نے شاہ ولی اللہ صاحب کے پروگرام کی تکمیل میں اپنی جان تک قربان کر دی۔ سیاسی اصلاحات اور اقامتِ دین جیسے مسائل کا حل شاہ صاحب مصلحت اندیشی کے ساتھ سنجیدگی سے کر رہے تھے۔ شاہ اسماعیل رحمہ اللہ نے سید احمد شہید رحمہ اللہ کی قیادت میں اسے کھلی جنگ میں بدل دیا۔ ابتداءً یہ جنگ براہِ راست سکھوں سے تھی، لیکن سکھوں نے فرنگی جرنیلوں سے اس میں مدد لی۔ ادھر علمائے سو کی ایک جماعت نے بھی اس کے خلاف کفر کے فتوے دیے۔ چناں چہ آخری جنگ بالاکوٹ کے میدان میں لڑی گئی، جس میں شاہ اسماعیل اور سید احمد دونوں شہید ہوئے اور سیکڑوں مجاہد اس میدان میں کام آئے۔ یہ معرکہ جمعہ کے روز ۶/ مئی ۱۸۳۱ء مطابق ۱۲۴۶ھ میں ہوا۔ اس کے بعد جہاد کی تحریک انڈر گراؤنڈ چلی گئی، جس کی راہنمائی مولانا ولایت علی اور مولانا عنایت علی صادق پوری کرتے رہے، جو ۱۴/ اگست ۱۹۴۷ء تک جاری رہی۔ اس کی پوری ذمے داری ۱۸۳۱ء کے بعد جماعت اہلِ حدیث پر تھی۔

تقسیمِ کار:

تقسیمِ کار کے طور پر تصنیف و تالیف، درس و تدریس کا شعبہ حضرت سید میاں نذیر حسین صاحب رحمہ اللہ اور ان کے تلامذہ کے حصے میں آیا۔ نواب صدیق حسن خاں رحمہ اللہ والیِ بھوپال نے اس راہ میں بے نظیر خدمات انجام دیں۔ دہلی کے اس مدرسے نے علومِ کتاب و سنت سے پوری دنیا کو جگمگا دیا۔ حضرت میاں صاحب رحمہ اللہ کے تلامذہ حجاز، نجد، شام، عراق، اقصیٰ، مغرب، کابل، قندھار، بخارا تک پھیلے ہوئے تھے اور دین کی خدمت کر رہے تھے۔

عاملینِ حدیث اور اہلِ توحید علما کی یہ عظیم الشان قربانی تھی کہ جب انگریز نے اپنے مفاد اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے لیے دینی اور دنیوی تعلیم کو الگ الگ کر دیا اور ملک میں خانہ جنگی اور فرقہ پرستی قائم رکھنے کے لیے مشنریوں کو ملک پر مسلط کر دیا، اس وقت کھاتے پیتے تمام لوگ سکولوں اور کالجوں کی طرف اُمڈ پڑے۔ مشنریوں نے اسلام اور آنحضرت ﷺ پر تہمتیں تراش کر مسلمانوں کے دلوں کو مجروح کرنا شروع کیا۔ مسلمان علما غربت اور فلاکت کے باوجود دینی تعلیم کے چراغ کو لادینی کے جھکڑوں میں زندہ رکھتے رہے اور اسلام پر جس طرف سے حملہ ہوا، وہ سینہ سپر ہو گئے۔ جماعت اہلِ حدیث کی صد سالہ مساعی اور جامعہ سلفیہ اور دیگر مدارسِ اہلِ حدیث انہی مقاصد کے لیے تھے کہ دینی جمود سے محفوظ رہا جائے۔ تمام ائمۂ سنت کے ساتھ یکساں محبت کا تعلق ہو اور ان کی اطاعت قرآن اور سنت کی راہنمائی میں کی جائے۔ آج بھی ہم انہی مقاصد کے لیے زندہ ہیں اور خدا تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ آیندہ بھی ہمیں اس سچائی کی حمایت کی توفیق مرحمت فرمائے۔

گذشتہ صدی کے اوائل میں اس قسم کی ایک تحریک نجد میں اُٹھی، جس کی قیادت شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی رحمہ اللہ نے فرمائی اور اس سے ملتی جلتی تحریک سید جمال الدین افغانی رحمہ اللہ کی قیادت میں ایران سے شروع ہو کر مصر اور قسطنطنیہ میں پھیلی اور عرب کے ساتھ اس نے یورپ کو بھی متاثر کیا۔ نجد کی تحریک غیر سیاسی ہونے کے باوجود سیاسی طور پر بھی کامیاب ہوئی، جس کے اثر سے آج پورے نجد اور حجاز پر ایک دینی حکومت کا پرچم لہرا رہا ہے۔ سید جمال الدین افغانی کے اثرات عرب ممالک پر محیط ہو گئے۔ انھوں نے سب سے زیادہ مصر کو متاثر کیا۔

آخر میں مَیں اپنے مقتدر اور معزز مہمان کا ممنون ہوں کہ انھوں نے اپنی گوناگوں ذمے داریوں اور سفارتی مشاغل کے باوجود ہماری استدعا کو قبول فرمایا اور جامعہ کو اپنے قدوم کا اِعزاز بخشا۔[1]

---

[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۱۹؍ اپریل ۱۹۶۳ء)

جماعتی خلفشار اور انتشار و افتراق کی مذمت[1]

خطبہ مسنونہ کے بعد آپ نے حافظ محمد یحییٰ صاحب کی خدمات کو سراہا۔ آپ نے فرمایا کہ حافظ صاحب ضلع لاہور میں جماعت کی جو خدمات بجا لا رہے ہیں، وہ قابلِ قدر ہیں۔ آپ کے اخلاص اور محنت کا نتیجہ ہے کہ آپ ایک گاؤں میں اتنی بڑی تبلیغی کانفرنس کا شاندار نظارہ دیکھ رہے ہیں۔ اس کے بعد آپ نے مسلکِ محدثین، محدثین کی دینی خدمات، جماعت اہلِ حدیث کی تنظیم اور مرکزی جمعیت اہلِ حدیث کی خدمات پر ایک بصیرت افروز تقریر فرمائی۔

آپ نے فرمایا کہ محدثین کا وہ مقدس گروہ ہے، جس نے شروع سے اسلام میں فرقہ بندی کے بجائے وحدتِ اسلامی پر زور دیا اور تمام فرقوں میں اتفاق و اتحاق پیدا کرنے کی سعی مبارک فرمائی۔ انھوں نے دلائل کی روشنی میں بڑی فراخ حوصلی اور وسعتِ نظری سے کام لیتے ہوئے جہاں امام شافعی رحمہ اللہ کا فتویٰ صحیح اور مدلل نظر آیا، اسے ترجیح دی۔ جہاں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مسئلہ قابلِ ترجیح نظر آیا، اسے مرجح قرار دیا۔ اس کے لیے امام المحدثین امام بخاری رحمہ اللہ کی کتاب صحیح بخاری اور دیگر کتبِ صحاح ستہ شاہد عدل ہیں اور اس طرح انھوں نے فرقِ اسلامیہ میں اتفاق و اتحاد اور وسعتِ نظری کی طرح ڈالی اور تعصب و تنگ دلی کو دور کرنے کی مبارک کوشش کی۔ جزاهم الله عنا وعن جميع المسلمين خير الجزاء.

اس کے بعد آپ نے مختلف ممالک میں اسلامی فرقوں میں اختلافات سے نقصانات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ ترکی اور روس میں علما کی تنگ نظری اور تعصب نے اسلام کو سخت نقصان پہنچایا اور آج پاکستان میں جو حالات پیدا ہو رہے ہیں، وہ حد درجہ افسوس ناک اور وحدتِ ملی کے لیے تباہ کن ہیں۔ مساجد میں اور مساجد سے باہر لاؤڈ سپیکرز پر ایک دوسرے کے خلاف اس قدر اشتعال انگیز اور منافرت آمیز تقریریں ہو رہی ہیں اور فرقہ وارانہ جذبات کو برانگیخت کرنے کے لیے ایسی زہریلی تقریریں ہو رہی ہیں کہ العیاذ باللہ!

آپ نے فرمایا کہ ہماری جماعت کا مقصد یہ ہے کہ کتاب و سنت کی روشنی میں صحیح اسلام پیش کیا جائے اور تمام اسلامی فرقوں میں حتی الامکان صلح و آشتی پیدا کی جائے۔

---

[1] یہ خطاب جمعیت اہلِ حدیث ضلع لاہور کے زیرِ اہتمام ایک تبلیغی کانفرنس میں ہوا تھا، جو ۲۹ راگست ۱۹۵۹ء کو موضع گہلن ہٹھار میں منعقد ہوئی۔ اسے مولانا عبدالعظیم انصاری (ناظم دفتر مرکزی جمعیت اہلِ حدیث) نے ترتیب دیا تھا۔ دیکھیں: ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۱۱ر ستمبر ۱۹۵۹ء)

پھر مرکزی جمعیت اہلِ حدیث کی تنظیم کے سلسلے میں آپ نے ابتدائی حالات بیان فرمائے۔ آپ نے فرمایا کہ تقسیمِ ملک کے بعد جماعت سخت انتشار کا شکار ہوگئی۔ ہمارے بیشتر کتب خانے، مدارس، مساجد ہندوستان میں تباہ و برباد ہوگئے۔ اکثر علمائے کرام شہید ہوگئے اور جو بچ کر پاکستان پہنچے، ان سے اکثر کوٹھیوں، مکانوں اور دُکانوں کی الاٹمنٹ کے چکر میں پھنس گئے۔

ہم نے اس وقت خیال کیا کہ اگر اس وقت جماعت کو سنبھالا نہ دیا گیا تو جماعت کا ہمیشہ کے لیے شیرازہ بکھر جائے گا اور جماعت کا نام لینے والا کوئی بھی نہ رہے گا۔

مَیں نے صدر محترم مولانا سید محمد داود صاحب غزنوی کی خدمت میں عرض کی کہ جماعت کی تنظیم کے لیے کوشش کی جائے۔ اُس وقت حالات یکسر نامساعد تھے۔ عام طور پر اُداسی اور مایوسی چھائی ہوئی تھی، لیکن آپ نے میری گزارشات کو قبول فرمایا اور توکلاً علی اللہ ہم نے جماعت کی تنظیم کا کام شروع کر دیا۔

اس سلسلے میں ہم نے ملک کے طول و عرض میں تمام علمائے کرام کے نام خطوط لکھے اور اکثر علمائے کرام کی خدمت میں ہم خود بھی حاضر ہوئے، مگر افسوس کہ جو علما اپنے حلقۂ اثر کے لحاظ سے اکابر سمجھے جاتے تھے، ان میں سے اکثر کی طرف سے ہمیں تسلی بخش جواب نہ ملا۔ بالآخر ہم نے خود قدم بڑھایا اور جماعت کی تنظیم کا کام توکلاً علی اللہ شروع کر دیا۔ ہم بعض اکابر کی عدمِ شرکت سے گھبرائے نہیں، اس لیے کہ ہمارا ایمان اللہ تعالیٰ پر مضبوط تھا۔ ہم سمجھتے تھے کہ ہمارا کوئی ذاتی مفاد اس کے ساتھ وابستہ نہیں ہے۔ اللہ کے دین کی خدمت کے لیے ہم جمع ہو رہے ہیں۔ اس کی نصرت ان شاء اللہ ہمارے شاملِ حال ہوگی، چناں چہ ہم نے بسم اللہ کر کے کام شروع کر دیا۔

بحمد اللہ ہمیں توقع سے زیادہ تھوڑے عرصے میں کامیابی ہوگئی۔ قوم نے لبیک کہا اور ہم بفضلہ تعالیٰ کامرانیوں سے ہمکنار ہوتے چلے گئے۔ خدا کے فضل و کرم سے دس سال کی اَنتھک کوششوں سے جب جماعت ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوگئی اور ملک کے طول و عرض میں شہروں اور دیہات و قصبات میں جماعت کی شاخیں قائم ہوگئیں اور جماعت نے ملک میں اپنا بلند مقام حاصل کر لیا اور حکومت و عوام میں اسے عزت کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا تو چند اصحاب نے دس سال کی معنی خیز خاموشی کے بعد جماعت میں افتراق پیدا کرنے کی تجاویز شروع کر دیں اور صدارت و امارت کا لفظی نزاع کھڑا کر دیا۔

ہم نے انتہائی کوشش کی کہ کسی طرح جماعت اس نزاع میں مبتلا نہ ہو اور جماعت ایک پلیٹ فارم پر جمع رہے۔ ہم نے اپنے خرچ پر لاہور میں ایک کنونشن بلایا اور اس میں کوشش کی کہ تمام جھگڑے ختم کیے جائیں، لیکن مولوی محی الدین صاحب، جنھوں نے قصور کے ایک اجتماع میں کنونشن کے فیصلے پر پابند ہونے کا اعلان کیا تھا، اس سے منحرف ہوگئے اور اس کے فیصلے سے منحرف ہونے کے لیے یہ حیلہ تراشا گیا کہ فیصلہ کثرتِ رائے سے

نہیں ہوا۔ ہم نے جماعت کو ذلت اور رسوائی سے بچانے کے لیے یہ منظور کر لیا کہ ایک سب کمیٹی کی تشکیل کر لی جائے، جو فریقین میں سمجھوتے کی راہ ہموار کرے، اس سب کمیٹی میں میرا نام بھی تھا، مگر بعض اہم مصروفیتوں کی وجہ سے میں اس سب کمیٹی کی میٹنگ میں شامل نہ ہو سکا تو فریقِ ثانی نے یہ عذر لنگ پیش کر دیا کہ میں صلح کے حق میں نہیں ہوں، حالاں کہ اس عذر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ جب فریقِ ثانی کے نزدیک دونوں نے فیصلہ نہیں کرنا تو پھر ہمارے سب کے سب اراکین کا شریک ہونا ضروری نہیں تھا۔ ہماری طرف سے صدرِ محترم کو کلی اختیارات تھے، وہ جو فیصلہ کرتے ہمیں قبول ہوتا۔

میں اب پھر اعلان کرتا ہوں کہ اگر وہ اس معاملے میں مخلص ہیں تو اب بھی جماعت کے سرکردہ علمائے کرام اور سمجھ دار اصحاب کو بلا کر یہ معاملہ پیش کیا جائے۔ جو فیصلہ ہو، ہم اسے منظور کریں گے۔

میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ ایک ملک میں جب مسلمانوں کا ایک مسلمان حاکم اور والی ہو تو اس کی موجودگی میں ایک اور امارتی نظام قائم کرنے کا کیا مقصد ہے اور ایسی محکوم اور بے اختیار امارت کا کیا فائدہ ہے؟

آپ نے عباسی، اموی اور ترکی دَور کے واقعات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ اس وقت کے بادشاہ اچھے تھے یا بُرے، لیکن امت نے ان کے ہوتے ہوئے کبھی ایسا اِقدام نہیں کیا کہ اس ملک میں ایک الگ امارت قائم کر لی جائے۔ البتہ اہلِ علم نے تنقید یا تائید کا فرض ہمیشہ ادا فرمایا۔

ان حکومتوں کے عہد میں اہلِ حدیث علما اور محدثین کرام کو بڑی بڑی تکلیفیں دینِ برحق کی راہ میں سلاطین اور خلفا کی طرف سے دی گئیں، لیکن کبھی انھوں نے ایک مسلم حکمران یا حکومت کے اندر کوئی دوسرا نظامِ امارت قائم نہیں کیا۔ اسلام کی پوری تاریخ اس پر شاہد ہے اور تمام ائمہ اہلِ سنت کا اس پر اتفاق ہے۔ اس لیے یہ اجماعی مسئلہ ہے کہ جس ملک میں مسلمان حکمران ہوں، وہ عادل ہوں یا ظالم، متبع سنت ہوں یا مبتدع، اس ملک میں کوئی دوسرا نظامِ امارت قائم نہیں ہو سکتا۔

ہندوستان میں جب مغل حکومت کا آخری دور تھا اور انگریزوں کی آمد آمد تھی، اس وقت تبلیغِ دین اور احیاے اسلام کے فریضے کو حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے ادا فرمایا۔ آپ نے انگریزوں کے علم و فلسفے کے مقابلے میں اسلامی علم و فلسفہ پیش کیا اور آپ کے خاندان سے شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ نے جب دیکھا کہ ہندوستان میں اسلام کو ختم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے تو آپ نے دہلی سے چل کر دور دراز کا سفر اختیار کیا اور آزاد علاقے کو اپنا مستقر قرار دیا۔ وہاں امارت قائم کی، جو صحیح شرعی امارت تھی۔ اس جماعت نے اسلام کی بہت بڑی خدمت سرانجام دی اور انگریز کو سو سال تک مضطرب اور بے قرار رکھا۔

اسلام میں محکوم امارت اور بے اختیار امامت کا کوئی تصور نہیں ہے۔ اسلام میں غیر مسلم حکومت کے خلاف بغاوت اور مسلم حکومت کے ساتھ معروف میں اطاعت کے سوا کوئی تیسری راہ نہیں۔

وہ کیا امیر ہے جو اپنے ملک کی سرحدوں کی حفاظت نہ کر سکے! کتاب و سنت کا قانون نافذ نہ کر سکے! حدودِ شرعیہ جاری نہ کر سکے!

آپ بتا سکتے ہیں کہ مولانا محی الدین صاحب باوجود اپنی ظاہری نیکی، شرافت اور تقوے کے یہ کام سرانجام دے سکتے ہیں؟ وہ بیعتِ توبہ لیں، جیسا کہ ان کے بزرگ بیعتِ توبہ لیتے تھے، تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں، لیکن ان کا بیعتِ امارت لینا شرعی نقطہ نگاہ سے قطعاً جائز نہیں، بلکہ جیسا کہ کہہ چکا ہوں، امت کے اجماع کے خلاف ہے، کیوں کہ اس ملک میں مسلمان حکمران ہیں، وہ کیسے بھی ہوں، اس ملک میں دوسرا نظامِ امارت قائم کرنا جائز نہیں ہے۔

جب جماعت کی تنظیم کے سلسلے میں ہماری شبانہ روز سرگرمیاں جاری تھیں، مولانا محی الدین صاحب جماعتِ اسلامی کے مداح، ان کے موید اور ان کے جلسوں کی رونق بنے ہوئے تھے اور جماعتِ اسلامی والے ہماری تنظیم کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ ان دنوں مولانا محی الدین صاحب جماعتِ اسلامی کے محاذ کو مضبوط بنانے اور جماعت اہلِ حدیث کو کمزور کرنے کے لیے یہ ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ ''اہلِ حدیث کہلانا بدعت ہے۔''

مگر قدرت کی نیرنگی دیکھیے کہ اب وہ جماعتِ اہلِ حدیث کے امیر کہلا رہے ہیں۔ مگر ان کی سرگرمیوں کا اس وقت جو ماحصل تھا، آج بھی وہی ہے کہ جماعت اہلِ حدیث منظم نہ ہو سکے اور وہ مختلف گروہوں میں تقسیم ہو کر کمزور ہو جائے، پھر وہ دوسروں کے لیے لقمہ تر بن جائے۔

آپ انصاف سے کہیے کہ اس ملک میں صدر محمد ایوب خاں کی حکومت ہے اور اس کی حکومت کے ارکان بحمد اللہ سب مسلمان ہیں اور اس کی حکومت نے کئی اچھے کام بھی کیے ہیں۔ اس کی موجودگی میں ایک اور امارت کھڑی کرنا شرعاً کہاں تک درست ہے؟

جب ان لوگوں سے مسئلے کی اس نوعیت کا ذکر کیا جاتا ہے تو اس کے سوا ان کے پاس کوئی جواب نہیں ہوتا کہ ﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ اور صاف لفظوں میں کہتے ہیں کہ ہم اگرچہ شرعی امارت اس وقت تک قائم نہیں کر سکتے، لیکن آہستہ آہستہ ہم اس ملک میں شرعی امارت قائم کر لیں گے۔ کیا اس کا معنی یہ ہے کہ یہ لوگ اس ملک میں شرعی امارت قائم کرنے کے لیے خفیہ تحریک چلائیں گے اور دیہات کے بھولے بھالے مسلمانوں کو کئی قسم کے مغالطوں میں مبتلا رکھیں گے؟ میرے نزدیک یہ قطعاً ناجائز ہے اور جماعت کے لیے تباہ کن۔

مَیں ان سے کہوں گا کہ خدا کے لیے اپنے آپ پر رحم کرو اور ملک پر اور جماعت پر بھی رحم کرو اور اس باطل خیال سے باز آجاؤ۔

جامعہ سلفیہ فیصل آباد کے قیام کے بعد مدارس کا الحاق وادغام[1]

جماعت کا نظم تقریباً پچاس برس سے انتشار اور پراگندگی میں مبتلا تھا۔ کوئی ہمارا جماعتی نظام صحیح طور پر نہ تھا۔ لامرکزیت نے ہماری جماعت کو دوسروں کا لقمہ بنا رکھا تھا۔ جماعتی نظام نہ ہونے کی وجہ سے ہمارے کارکن دوسری جماعتوں میں شریک ہو کر اپنے مسلک کو بھی خیر باد کہہ رہے تھے۔ ہماری جماعت کا سرمایہ، ہماری جماعت کے کارکن اور ہماری جماعت کے علما دوسری جماعتوں کی آبادی اور ترقی کے باعث بن رہے تھے اور اپنی جماعت کس مپرسی کے عالم میں تھی۔

مَیں نے اور چند مخلص دوستوں نے اس صورتِ حال کا جائزہ لیا اور مولانا سید داود صاحب غزنوی سے درخواست کی کہ آپ اپنی دوسری مصروفیات کو ختم کر کے یا کم کر کے جماعتی نظام کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیں۔ اگرچہ ہم سب کا یہ فرض ہے، لیکن ہم نے مولانا صاحب سے عرض کی کہ آپ کے خاندان کے بزرگوں نے مسلک اہلِ حدیث کی حفاظت و اشاعت کے لیے جو خدمات سرانجام دی ہیں، وہ سب سے وقیع اور ہمہ گیر ہیں۔ اس لیے آپ سے خاص طور پر ہم یہ توقع رکھتے ہیں کہ اس مسلک کی حفاظت اور تبلیغ اور جماعت اہلِ حدیث کی تنظیم کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیں اور جماعتوں کے نظم ونسق کے متعلق جو تجربہ آپ کو حاصل ہے، اب اسے اپنی جماعت کی تنظیم کے لیے استعمال کریں۔ مولانا صاحب نے جماعت کے انتشار اور پراگندگی کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ صورتِ حال کوئی زیادہ اُمید افزا نہیں۔ علما نے اپنے اپنے حلقے بنا رکھے ہیں۔ ان سے یہ توقع کرنا بے حد مشکل ہے کہ وہ ان حلقوں کو توڑ کر ایک مرکزی نظام کے تحت آ جائیں، مگر ان تمام مشکلات کے باوجود ہم سب نے مل کر جماعتی نظام قائم کرنے اور اس کو مستحکم بنانے کا خداوند تعالیٰ کے توکل پر فیصلہ کر دیا۔

---

[1] جب فیصل آباد میں جامعہ سلفیہ کا قیام عمل میں آیا تو فیصل آباد شہر اور گرد ونواح کے مدارس نے اپنے طلبا اور کتب خانے جامعہ سلفیہ فیصل آباد کے سپرد کر دیے، تاکہ ایک مرکزی جامعہ کا خواب شرمندہ تعبیر ہو سکے۔ اس سلسلے میں فیصل آباد میں مولانا عبداللہ ویرو والوی سے بھی استدعا کی گئی کہ وہ بھی اپنے مدرسے ''دار القرآن والحدیث'' کا ادغام جامعہ سلفیہ میں کر دیں، لیکن وہ آمادہ نہ ہوئے تو جماعت کی مرکزی قیادت مولانا داود غزنوی اور مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمہ اللہ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسی موقع پر حضرت سلفی رحمہ اللہ نے مذکورہ بالا تقریر فرمائی، لیکن یہ مذاکرات کامیاب نہ ہو سکے اور وہ مدرسہ علاحدہ ہی کام کرتا رہا۔ دیکھیں: ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۱۳؍ جولائی ۱۹۵۶ء)

آج خدا کے فضل و کرم سے ہماری جماعت کی تنظیمی حالت ایسی ہے کہ آج سے ایک سو برس پیشتر بھی یہ حالت نہ تھی۔ آج بحمد اللہ ہمارا ایک مرکزی نظام ہے اور اس کی شاخیں تمام ملک میں قائم ہیں، وہ جماعت جسے دوسرے جماعتیں اپنے لیے لقمہ تر سمجھتی تھیں، اب اس سے مایوس ہوگئی ہیں کہ وہ جماعت اہلِ حدیث کو اپنے میں مدغم کر سکیں گی، بلکہ آج وہ مجبور ہیں کہ جماعت اہلِ حدیث کو ایک زندہ جماعت سمجھیں اور اس کے تعاون کے حاصل کرنے کو اپنے لیے باعثِ عزت سمجھیں، نہ صرف پاکستان، بلکہ انڈیا کی جماعت اہلِ حدیث بھی ہمارے جماعتی نظام کو عزت اور احترام کی نظر سے دیکھتی ہے۔ ان کے اخبارات ہمارے جماعتی نظام کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔

جامعہ سلفیہ:

اس کے بعد ناظم اعلیٰ صاحب نے جامعہ سلفیہ کے فیصلے کی مختصر تاریخ بیان فرمائی اور بتایا کہ ہمارے مدارس کے ناقص نصابِ تعلیم اور جماعت بندی کے فقدان نے طلبا کے تعلیمی معیار کو اس بری طرح گرا دیا ہے کہ اچھے مستعد طلبا کا ملنا بے حد دشوار ہوگیا ہے۔ جب ہم نے جامعہ سلفیہ کے درجہ تکمیل کے لیے طلبا سے درخواستیں طلب کیں اور ان سے انٹرویو میں معمولی سوالات کیے تو ان کی اکثریت ان کے جوابات بھی صحیح طور پر نہ دے سکی۔ وہ سب اپنے اپنے مدرسے کے فارغ التحصیل طالب علم تھے، لیکن ان کی حالت یہ تھی کہ صحاحِ ستہ تو پڑھا ہے، لیکن اصولِ فقہ میں اصول الشاسی تک نہیں پڑھی، منطق میں مرقاۃ تک نہیں پڑھی۔ ویسے وہ فارغ التحصیل ہیں، لیکن اُردو کے ایک معمولی جملے کا عربی میں ترجمہ نہیں کر سکے۔

صرف تین طالب علم درجہ تکمیل میں لے سکے۔ کئی درخواستیں بالکل مسترد کر دی گئیں اور نو طالب علم اس شرط پر رکھے گئے کہ ایک سال وہ درجہ خاص (سپیشل کلاس) میں تعلیم حاصل کریں اور جن علوم میں کمی ہے اس کو پورا کریں، تا کہ یہ آیندہ سال درجہ تکمیل میں داخل ہوسکیں۔

ثانوی مدرسہ:

اپنے مدارس کی ناقص تعلیم کو دیکھتے ہوئے ہم مجبور ہوگئے کہ ہم ثانوی تعلیم کے لیے ایک ایسی درس گاہ جامعہ سلفیہ کے نظام کے ماتحت قائم کریں، جہاں طلبا کی ابتدائی اور ثانوی تعلیم کا ایسا انتظام کیا جائے کہ طلبا میں اچھی استعداد پیدا ہو اور وہ اس مدرسے سے فارغ ہو کر جامعہ سلفیہ کے درجہ اعلیٰ میں شامل ہونے کی صلاحیت رکھیں۔

اس مقصد کے لیے لائل پور میں ہم نے جامعہ سلفیہ کے نظام کے تحت ثانوی مدرسہ قائم کیا ہے۔ افسوس! جن حضرات سے ہمیں توقع تھی کہ وہ جماعتی نظام کے ساتھ تعاون کریں گے، وہی جماعتی نظام کے مقابل صف آرا ہو رہے ہیں۔

مولانا عبداللہ صاحب (ویرووالی) کے متعلق ہم یہ خیال بھی نہیں کر سکتے تھے کہ وہ اس قسم کا رویہ اختیار کریں گے! بہر حال ہم آج اسی مقصد کے لیے حاضر ہوئے ہیں۔ ہم پوری کوشش کریں گے کہ لائل پور میں اپنی جماعت کے دو مدرسے نہ ہوں۔

یہ کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ یہ اختلاف کسی عقیدے کے اختلاف کی وجہ سے نہیں، کسی مسئلے کے اختلاف کی وجہ سے نہیں۔ ہماری جماعت میں تفسیرِ قرآن کے سلسلے میں جو اختلاف تھا، وہ آج ہماری جماعت یعنی مرکزی جمعیت میں اس قسم کا کوئی اختلاف نہیں۔

بحمد اللہ ہم سب سلفی العقیدہ ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب کسی اصول یا عقیدے کی بنا پر یہ اختلاف نہیں تو سوائے اس کے کہ ہم کہیں کہ یہ اختلاف ذاتی اغراض پر مبنی ہے اور کیا ہو سکتا ہے؟ مَیں اپنے رفقا سے عرض کروں گا کہ وہ جماعتی مفاد کے لیے ہر ممکن ایثار سے کام لیں۔

افرادِ جماعت کی ذمے داریاں[1]

ہمارے سامنے ملک میں دو قسم کی جماعتیں ہیں: دینی اور لادینی۔ لادینی جماعتوں سے ہمیں کوئی سروکار نہیں۔ ہمارا راستہ ان سے قطعی الگ ہے۔ دینی جماعتوں سے جماعتِ اسلامی اسلام کی ہمہ گیری کا دعویٰ کرتی ہے اور اس ملک میں اسلامی دستور کے لیے جدوجہد بھی کر رہی ہے، لیکن کیا جماعتِ اسلامی ان ذمے داریوں کو ادا کر سکتی ہے، جن کے لیے ہمارے اسلاف نے عظیم قربانیاں دیں؟ میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ جو کام ہم نے کیا اور کر رہے ہیں، وہ کوئی دوسری جماعت سرانجام نہیں دے رہی۔ ہم نے اسلامی دستور کے معاملے میں جماعتِ اسلامی سے پورا تعاون کیا، لیکن مَیں محسوس کرتا ہوں کہ ہماری ذمے داریاں کچھ ایسی بھی ہیں، جہاں جماعتِ اسلامی خاموش ہو جاتی ہے اور ان مسائل کو فروعی کہتے ہوئے اپنی عوامیت کو محفوظ رکھنا چاہتی ہے، لیکن ہم ان مسائل کو کسی مصالح کی بھینٹ نہیں چڑھا سکتے، کیوں کہ ہمارے نزدیک وہ مسائل فروعی نہیں، بلکہ اصولی اور بنیادی ہیں۔ بعض مسائل توحید و شرک اور بعض سنت و بدعت کے ذیل میں آتے ہیں اور ہمارے اسلاف نے ان کی خاطر مصائب جھیلے اور قربانیاں دی ہیں۔

اگرچہ اس وقت بھی ہمارے بیسیوں مدارس موجود ہیں اور ہماری جماعت ان پر لاکھوں روپیہ صَرف کر رہی ہے، تاہم یہ حقیقت تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ یہ مدارس آج ہمارے لیے قطعی ناکافی ہیں۔ یہ جماعت کی علمی تشنگی کو پورا کرنے، جید علما کا قحط دور کرنے اور زمانہ حاضر کے مسائل سے باخبر علما تیار کرنے سے قاصر ہیں۔

ہم مرکزی دار العلوم سے ایسے جامع علما تیار کرنا چاہتے ہیں، جو اسلامی علوم کے ساتھ عصرِ حاضر کے مسائل سے باخبر ہوں اور زمانہ حاضر کے الحاد کے مقابلے کی پوری اہلیت رکھتے ہوں اور تعلیمی، تدریسی، تصنیفی اور تبلیغی خدمات بااحسن وجوہ سرانجام دیں۔

آج نہ صرف وہ تمام گمراہیاں موجود ہیں، جن کے خلاف ہمارے اسلاف نے جہاد کیا، بلکہ عصرِ حاضر کا

[1] یہ خطاب تاندلیانوالہ میں ۱۶ر فروری ۱۹۵۵ء کو جماعتی احباب کی ایک مشترکہ میٹنگ میں ہوا تھا۔ دیکھیں: ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۱۱ر فروری ۱۹۵۵ء)

الحاد اس پر مستزاد ہے۔ آج بھی ہمارے مخالف پوری قوت سے ہمیں ختم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ آج بھی شرک و بدعت پورے زور پر ہے تو ہم کیوں نہ اپنی زندگی کا ثبوت دیں اور کفر، شرک، بدعت اور الحاد کے مقابلے میں کیوں نہ میدان میں آئیں اور کیوں نہ اس راہ میں تن مَن دَھن کی بازی لگا دیں؟

ہم نے تعاون علی البر کے اصول پر ہر جماعت سے تعاون کیا ہے اور کر رہے ہیں اور کرتے رہیں گے، لیکن ہم اپنی جماعت، اپنی تنظیم اور اپنے مسلک کو ہرگز نظر انداز نہیں کر سکتے۔

اتحاد بین المسلمین

جمعیت اہلِ حدیث قصور کی طرف سے ۳۱ر مئی کو بعد از نمازِ عشا ایک عظیم الشان تبلیغی جلسہ زیرِ صدارت چودھری محمد اسلام صاحب سلیمی (بی اے ایل ایل بی صدر انجمن اہلِ حدیث) ہوا، جس میں حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب (ناظمِ اعلیٰ مرکزی جمعیت اہلِ حدیث) اور مولانا محمد ابراہیم صاحب خادم نے شرکت فرمائی۔ مولانا محمد یحییٰ صاحب عزیز (صدر جمعیت اہلِ حدیث ضلع لاہور) کی تلاوتِ قرآن پاک اور مولانا محمد ابراہیم صاحب خادم کی نظم کے بعد مولانا محمد اسماعیل صاحب نے تقریر شروع کی۔ مجمع بہت تھا۔

حضرت مولانا نے اتحاد المسلمین کے موضوع پر سوا گھنٹا نہایت موثر اور دلکش انداز میں اسلافِ امت اور ائمہ دین کا بعض مسائل میں اختلاف ہونے کے باوجود ایک دوسرے کو عزت و احترام سے ملنا اور اتفاق و اتحاد سے رہنا بیان فرمایا اور اختلاف کے ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھنا ثابت کیا۔ جو افتراق وتشتت مسلمانوں میں پیدا ہو رہا ہے، اس کی مذمت کی اور حکومت کو توجہ دلائی کہ جو لوگ فتنہ فساد برپا کرنے والی تقریریں کرتے پھرتے ہیں، ان کو اسلام کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں اور علم کے ساتھ ان کا کوئی تعلق نہیں۔ یہ پیشہ ور اور بزنس مَین ہیں، جو عوام کو خوش کرنے کے لیے اپنے مخالف مسلک کو گالیاں اور طعنے دیتے ہیں۔ اس کا سدِ باب ہونا چاہیے۔

جماعتِ اہلِ حدیث کی حقانیت اور اس کی دینی خدمات پر مخالفین کی طرف سے بہتان طرازیوں اور افترا پردازیوں کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ حق و باطل کی ہمیشہ آویزش رہی ہے۔ اس لیے گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ ایک رقعہ کہ نانی کا نکاح پوتے سے اہلِ حدیث کے نزدیک جائز ہے اور آنحضرت ﷺ کو بڑے بھائی جیسا سمجھتے ہیں؟ جواب دیتے ہوئے آپ نے فرمایا: کسی اہلِ حدیث عالم کا فتویٰ نانی کے نکاح کے متعلق نہیں ہے۔ یہ بہتان ہے۔ بڑے بھائی کے متعلق آپ نے فرمایا: قرآن مجید کی رو سے تمام مومن بھائی ہیں اور چوں کہ انبیاے کرام افضل المومنین ہیں، اس لیے وہ امت کے اس معنی کے لحاظ سے بھائی ہیں۔ ہاں اگر کوئی آدمی عام بھائیوں کی طرح بھائی سمجھے تو وہ بے ادب گستاخ اور بے ایمان ہے۔

آخر میں آپ نے عوام سے فرمایا کہ آپ ان فتنہ پرور اور پیشہ ور مولویوں کے وعظوں سے متاثر نہ ہوں، جو محض اپنی دکانداری کے لیے عامۃ المسلمین میں نفاق اور عداوت کا بیج بو رہے ہیں۔ جس مسئلے میں شک ہو، قرآن وسنت کی روشنی میں اس کا حل سوچیے۔[1]

[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۵ر جون ۱۹۵۹ء) ترتیب: مولانا عبدالعظیم انصاری۔

ساتویں سالانہ کانفرنس میں تقریر

جمعیت اہلِ حدیث مغربی پاکستان کے ناظمِ اعلیٰ مولانا محمد اسماعیل صاحب نے ۳رنومبر کو رات کے اجلاس میں ''حدیث و محدثین'' یعنی ''مقامِ حدیث اور خدماتِ محدثین'' کے عنوان پر مدلل تقریر کی۔ مولانا نے یہ واضح فرمایا کہ شریعتِ اسلامی میں حدیث کا کیا مقام ہے اور اس کی جمع و تدوین میں محدثینِ کرام نے کیا خدمات انجام دیں۔ آپ نے اس سلسلے میں منکرینِ حدیث کے دلائل کا بھی جائزہ لیا اور ان کو تاریخی اور شرعی اعتبار سے غلط اور ناقابلِ فہم قرار دیا۔

آپ نے کہا: یہ بات قطعی طور سے غیر علمی اور واقعات و حقائق سے دور ہے کہ احادیثِ رسول ﷺ کی جمع و تدوین کا کام تیسری صدی ہجری میں ہوا اور اس سے پہلے پورے دو سو سال تک صحابہ کرام، تابعین اور ائمہ سلف نے اس طرف توجہ ہی مبذول نہیں کی۔

آپ نے کہا: یہ بات علم کی نفسیات کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے۔ ہر علم کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ مختلف مراحل سے گزرتا اور مختلف منازل طے کرتا ہے۔ اس کی ابتدائی شکل اس کی آخری اور مکمل صورت سے بالکل دوسری نوعیت کی ہوتی ہے، مثلاً سائنس اپنے ابتدائی دور میں کچھ اور تھی اور آج کچھ اور ہے۔ آج کا فلسفہ اپنے آغاز سے متعدد امور میں مختلف ہے۔ سیاسیات اپنے ابتدائی دور میں کچھ اور قسم کی تھی، آج اس کی ترقی کی تگ و تاز کچھ دوسرے ہی نہج و اسلوب کی حامل ہے۔

آج کا طالب علم جب ان علوم کی پرانی کتابیں پڑھے گا تو کیا یہ کہہ سکے گا کہ یہ کتابیں فلسفہ یا سائنس یا سیاسیات کی نہیں ہیں؟ وہ نہ اس کی ابتدائی منازل سے انکار کر سکے گا اور نہ اس کی تکذیب کے درپے ہوگا، بلکہ ترقیِ علم کے لیے سب سے استفادہ کرے گا۔

اسی طرح احادیثِ رسول اللہ ﷺ کا معاملہ ہے۔ ان کی جمع و تدوین کا مسئلہ اپنے ابتدائی دور سے گزر کر انتہائی اور ارتقائی مراحل میں پہنچا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں احادیث غیر مرتب نوٹس کی صورت میں معرضِ تحریر میں آ چکی تھیں اور بعض صحابہ نے انھیں جمع کرنے کا فرض انجام دیا تھا، مثلاً: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی ان کوششوں کا تاریخِ اسلامی واضح ثبوت پیش کرتی ہے۔ پھر آنحضرت ﷺ کی

حیاتِ مقدسہ ہی میں تدریسِ حدیث کے حلقے کسی نہ کسی شکل میں قائم ہو چکے تھے اور مختلف لوگ پیش آمدہ مسائل کی تحقیق کے لیے ان حضرات کے پاس پہنچتے تھے، جن کے بارے میں انھیں معلوم ہو جاتا تھا کہ وہ علمِ حدیث اور آنحضرت ﷺ کے ارشادات کا زیادہ عالم اور سمجھنے والا ہے۔ یہ سلسلہ عصرِ صحابہ میں بھی جاری رہا اور دور دراز کے مقامات سے سفر کر کے لوگوں نے ایک دوسرے سے احادیث حاصل کیں۔ پھر پہلی صدی ہجری میں محدثینِ کرام موجود تھے اور یہ احادیث کا درس دیتے اور احادیث لکھواتے تھے۔

دوسری صدی ہجری میں اس کوشش نے اور ترقی کی اور دنیا کے مختلف گوشوں سے شائقین علمِ حدیث نے اس کے حصول اور جمع وتدوین کا ایک وسیع سلسلہ شروع کر دیا۔ اس کے بعد تیسری صدیق ہجری میں اس فن نے ترقی کی مزید منزلیں طے کیں۔ یعنی فنِ رجال کا علم دریافت ہوا اور محدثین نے اس میں اتنا کمال اور درک حاصل کیا کہ آج اس کو مسلمانوں کا ایک عظیم اور لافانی کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔ اس کی روشنی میں ہم آج بھی نہایت آسانی کے ساتھ احادیث کے بارے میں یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ تمام تر ذخیرہ احادیث سے کون سی حدیث کس نوعیت کی ہے اور کس طبقہ کے راوی نے اسے کب اور کس سے روایت کیا ہے اور اس کے حالات کیا ہیں؟

مولانا نے کہا: حدیث کی جمع وتدوین کا پہلا مدرسہ مسجدِ نبوی تھا اور وہیں سے آنحضرت ﷺ کی حیاتِ مقدسہ میں یہ مبارک سلسلہ شروع ہوا۔ اسے عجمی سازش کہنا لاعلمی اور جہالت کی دلیل ہے اور واقعات وحقائق سے قطعی دور![1]

[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۹/ نومبر ۱۹۶۲ء)